سرمایۂ تحقیق

یعنی

آرگس بے حجاب بجواب غالب بے نقاب

(از جناب پروفیسر سید نجو موہانی ایم اے پروفیسر شیعہ کالج لکھنؤ)

اب میں جناب آرگس اور جناب تنہا کے مضمونوں کو تنقید کی کسوٹی پر کستا ہوں ؛

غالب ؎ عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

مولانائے روم ؎ مرحبا اے عشق خوش سودائے ما اے طبیب جملہ علتہائے ما

ملا ظہوری ؎ شد طبیب ما محبت منتش بر جان ما محنت ما راحت ما درد ما درمان ما

ارشاد جناب آرگس :- ظہوری اس خیال کو اس طرح ادا کر چکا تھا۔ مضمون اور طرز ادا دونوں ایک ہیں۔ اس مضمون کو مولانائے روم نے یوں ادا کیا ہے ؛

ارشاد جناب تنہا۔ ظہوری اور مولانا روم کے شعر یقیناً ہم مضمون ہیں اور پامال خیال ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ ظہوری نے مولانا روم کا چربہ اُتارا ہے لیکن غالب کا تو مضمون ہی فلسفیانہ ہے۔ ظہوری محبت کو راحت جاں اور درمان درد کہتا ہے مولانا روم بھی تمام امراض کا طبیب لکھتے ہیں۔ مگر فیلسوف غالب خود زیست کو ایک درد یا مرض مستقل تسلیم کر کے اس درد زندگی کا درماں درد لا دوائے عشق کو قرار دیتا ہے۔ چنانچہ غالب کا یہی نکتہ حدِ فاصل اور شانِ امتیازی ہے۔ جو اُس کے شعر کو بلند کر دیتی ہے ؛

التماس نجو موہانی۔ حضرت آرگس سے تو اتنا ہی عرض کرنا ہے کہ جناب نے سرقہ کے متعلق جمہور کا وہ قول فیصل فراموش کر دیا جسے خود بھی تسلیم کیا تھا۔ اور جسے مرزا غالب کا بھی مسلک بتایا تھا۔ آپ کے فحوائے کلام سے ثابت ہوتا ہے کہ ظہوری نے ملائے روم سے اور غالب نے ظہوری سے سرقہ کیا۔ میرا خیال یہ ہے کہ مولانائے روم نے عشق کا خیر مقدم کیا ہے اور اُسے تمام بیماریوں کا معالج قرار دیا ہے۔ لفظ 'مرحبا' (خوش آمدید) سے ایک آنے والے کی چلتی پھرتی تصویر دکھا کر بیان واقعہ کو واقعہ کر دکھایا ہے مگر الفاظ نے ہیکل شعر میں محبت کی روح نہیں پھونکی اور شعر حکیمانہ ہو کر رہ گیا۔ اس لئے کہ جملہ علتہا مخصوص اوصاف ذمیمہ بشری تک پہنچ کر رہ جاتا ہے یعنی اے عشق تو انسان کو تمام اخلاق ردیہ سے پاک کر دیتا ہے۔ اور بس ؛

اب ظہوری کے شعر پر نظر ڈالئے:-
محبت مجھ بیمار کے علاج کی طرف مائل ہوئی۔ میں دل و جان سے اُس کا منت گزار ہوں۔ محبت میری تکلیف میری راحت میرا درد میرا درمان ہے +
ظہوری نے اس مفہوم کو جسے ملائے رومی نے سیدھے سادے طریقہ پر بیان کیا تھا۔ اتنے ٹکڑوں کے اضافہ کے ساتھ بیان کیا +
منتش بجان ما۔ محنت ما۔ راحت ما۔ درد ما۔ (درمان ما کا مفہوم دونوں میں مشترک ہے)
ظہوری نے محبت کی کرشمہ سازیاں اور آن سے اپنے متکیف ہونے کی حالت بیان کی۔ اور اس طرح کہ مرتبۂ کرامت تک پہنچ گئی +
اب رہا غالب کا شعر وہ ظہوری کے شعر سے کہیں بالاتر ہے۔ مرزا نے زندگی کو ایک درد قرار دیا اور یہ بتایا کہ جبتک عشق نہ ہو زندگی بے کیف ہے۔ دوسرے مصرع میں اور ترقی کی یعنی ابھی تک زندگی کو صرف بے مزہ کہا تھا۔ اب کہتا ہے کہ زندگی بے کیف ہی نہ تھی بلکہ درد بھی، مرض بھی۔ اور مرض بھی ایسا جس کی دوا عشق کے سوا کچھ اور تھی ہی نہیں مگر یہ دوا ہے کیسی خود ایک درد لا دوا۔ ظاہر ہے کہ عشق مجازی ہو یا حقیقی، بہرحال لذت زندگانی کا کفیل ہے۔ اور اہل تحقیق جانتے ہیں کہ محبت کا جذبہ فنا ہو جائے تو انسان کہنے کو زندہ حقیقت میں مردہ ہے +
بیخود موہانی ؎ مری تصویر میرا بُت سراسر قد ہے تن میرا کبھی تھا تو اسی دنیا میں لیکن اب کہاں ہوں میں
غالب کے شعر میں دو باتیں ظہوری کے شعر سے زیادہ ہیں۔ ایک تو وہی جس کی طرف جناب سہا نے اشارہ فرمایا ہے۔ یعنی خود زندگی کو درد قرار دینا۔ دوسرے یہ کہ جہاں محبت درمان درد زیست ہے وہیں خود درد لا دوا بھی ہے جس سے خیال عشق کے غیر فانی ہونے کی طرف فوراً منتقل ہو جاتا ہے۔ جناب آرگس اور جناب سہا کو مضمون کے ارتقائی مدارج دکھانا تھے۔ جناب آرگس تو اسے سرقہ کہکر چلتے بنے۔ جناب سہا نے ملائے روم اور ظہوری کے اشعار کو یقیناً کی تاکید کے ساتھ ہم مضمون کہا اور خیال کو پامال اور مبتذل بنایا۔ گر میرا خیال یہ ہے کہ اگر غالب کے شعر میں فلسفیت اور شعریت نظر آتی ہے تو ملائے روم کے شعر میں حکمت اور ظہوری کے شعر میں حکمت اور شعریت جلوہ دکھاتی ہے۔ جب اتنی ترقیاں موجود ہیں تو شعر کو چربہ کہنا غلطی ہے

غالب ؎ شمار سبحہ مرغوب بُت مشکل پسند آیا تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
غنی ؎ بگوشم این صدا از مقری تسبیح می آید که صد دل مضطرب گردد چو یکدل یاد آرامے

ارشاد آرگس۔ غالب کے شعر میں جاندار ٹکڑا بیک کف بردن صد دل، ہے اور وہی غنی کے ہاں سے لیا گیا ہے +
خلاصہ ارشاد حضرت سہا۔ فرماتے ہیں جناب آرگس کہ غالب کے شعر میں جاندار ٹکڑا بیک کف بردن صد دل ہے اور وہی غنی کشمیری کے ہاں سے لیا گیا ہے۔ غالب محبوب کی دلبری کو تسبیح صد دانہ سے تشبیہ دیتا ہے۔ غنی کشمیری دانوں کی اُلٹ پھیر سے تمثیل کرتا ہے کہ اگر دنیا میں ایک شخص کو سکون میسر آتا ہے تو سو دلوں کے اضطراب کے معاوضہ میں۔ ممکن ہے کہ غنی کی تمثیل کبھی یا کہیں صادق آجائے مگر بالالتزام ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اس تمثیل نے خود شعر کا مفہوم مہمل سا کر دیا ہے۔ یعنی شعری

تسبیح سے یہ آواز آتی ہے کہ ایک دل آرام پاتا ہے تو سو دل بے چین ہو جاتے ہیں۔ اب خدا ہی جانے مقری تسبیح کی صدا
ایک دل کے آرام اور کن سو دلوں کے اضطراب کا پیغام ہے۔ پھر مقری تسبیح نہیں معلوم کوئی محبوب چاردہ سالہ پارسا ہے
یا زاہد صد سالہ۔ کیونکہ مرد کی تحصیتوں کا تعین مفہوم میں متعین نہیں ہو سکتا ہے۔ مزید برآں مقری تسبیح کی ترکیب کیسی بھدی اور غیر مانوس
ہے اور سب سے آخر میں یہ بات کہ تسبیح بالجہر قطعاً غیر معمول ہے یہ ہے: دیکھ۔ دو غنی کا شعر لفظی اور معنوی دونوں، عتبار سے ناقص
اور لغو سا ہے۔ برخلاف اس کے غالب کا شعر محبوب کی ایک ادا ناز کا آئینہ دار ہے۔ دانہ و دل کی تشبیہ عام ہے۔ تشبیہات
کسی شاعر کی ملک نہیں ہوتے۔ پھر نہ معلوم آرگس صاحب کس بنا پر کہتے ہیں کہ غنی کے ہاں سے لیا گیا ہے۔ الفاظ شعر یا مضمون
التماس نیخود۔ جناب آرگس سے تو اتنا ہی کہنا ہے ع خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست۔ جناب نے ایک بے سروپا بات
کہدی اور آگے بڑھ گئے۔ جناب والا غنی اور غالب کے اشعار میں 'صد دل' کا ٹکڑا مشترک ہے۔ اتنی سی بات پر کسی کو سارق
کہدینا آپ ہی پر زیبا ہے ع ابر اگر باز تو آید و مرداں چنیں کنند۔ اس ارشاد سے لازم آتا ہے کہ ہر شاعر و نثار کو اپنے لئے نئے
الفاظ تراشنا چاہئے۔ غالب کے یہاں بیک گردش صد دل ایک ترکیب ہے۔ غنی کے ہاں ترکیب کا وجود ہی نہیں لفظ
اور مرکبات میں فرق کیا ضرور ہے +

لیکن جناب تنہا نے تو قیامت ہی کردی۔ آپ فرماتے ہیں کہ غالب محبوب کی دلبری کو تسبیح صد دانہ سے تشبیہ دیتا ہے
غنی کشمیری دانوں کی الٹ پھیر سے تمثیل کرتا ہے۔ حالانکہ غنی کے ہاں ایک دعویٰ ہے کہ سو دل بے چین ہو لیتے ہیں جب کہیں
ایک دل آرام پاتا ہے۔ اور اسے تسبیح کے سو دانوں کے اضطراب اور امام تسبیح کے سکون کی تمثیل سے ثابت کرتا ہے۔ غا
کے شعر میں تشبیہ کا کہیں نام نہیں ہے ہاں ایک تشابہ ہے اس نے کام نکالا ہے وہ کہتا ہے میرا معشوق مشکل پسند ہے
آسان کام اسے پسند ہی نہیں آتا اسے شمار تسبیح پسند آیا اور صرف اس لئے پسند آیا کہ جس طرح وہ خود ایک ایک ہتھے پر
سو سو دل لے اڑتا ہے۔ اسی طرح تسبیح پڑھنے والا بھی دانوں پر ایک بار ہاتھ پھیر لیتا ہے یعنی معشوق نے شمار سبحہ کو صرف ا
پسند کیا کہ اس کی دلربائی کا انداز اس میں نکلتا ہے +

جناب تنہا نے غنی کے شعر پر تیر باراں کیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہر تیر نے خطائی اور غنی کے شعر کی جگہ حضرت تنہا کی قابلیت
بری طرح مجروح ہو گئی۔ اور اب اس کی حالت بالکل ایسی نظر آتی ہے جیسے کوئی لاش تیروں پر ٹھہری ہو +

جہاں تک میں سمجھتا ہوں حضرت تنہا کی بیراہ روی کا مجرم صاحب غیاث اللغات ہے۔ غیاث میں مقری کے صرف
معنے لکھے ہیں۔ پڑھنے والا۔ وہ شخص جو بچوں کو قرآن سکھائے۔ اس لئے کہ انہیں دونوں معنوں کی جھلک اس ارشاد میں نظر آ
پھر مقری تسبیح نہیں معلوم کوئی محبوب چاردہ سالہ پارسا ہے یا زاہد صد سالہ، اگر جناب تنہا نے 'بہار عجم' پر نظر ڈالی ہوتی تو
عبارت صاف نظر آتی:۔

مقری تسبیح: مقری سبحہ بضم مہرہ کلانے کہ بر سر تسبیح باشد و آنرا در عرف امام تسبیح و اہل ہند سمیر خوانند +

ملا طغرا ۔ چو یاد آورد زاہد از جام مے — دند مقری سبحہ اش بانگ نے

محسن تاثیر ۔ محض نہفت بہنر مندئی کس حجت نیست — کسی از مقری تسبیح اذاں نشنیداست

مخلص ؎ ہر کہ شد بالائیش محروم شد از یادِ حق — مقرنی تسبیح ازاں بے بہرہ از ذکر خداست

قدسی ؎ خندہ چو مقرنی تسبیح در گلوش گرہ — مو ذنے کہ نگوید علی ولی اللہ

بہارِ عجم صفحہ ۲۰۶۔ ۴۹ مطبع نولکشور مطبوعہ ۱۹۱۶ء

دیکھئے اب بےچین ہونے والوں اور مضطرب ہونے والے کی تعیین کس آسانی سے ہوگئی۔ مضطرب ہونے والے تسبیح کے سو دانے جن کو حرکت ہوتی ہے اور آرام پانے والا امام تسبیح جسے حرکت نہیں ہوتی۔ تسبیح با لجہر کا ذکر بے محل ہے۔ اس لئے کہ امام تسبیح نے غنی سے جو کچھ کہا ہے زبان حال سے کہا ہے۔ برائے خدا یہ تو ارشاد ہو کہ مقرنی تسبیح کی ترکیب بھدّی کیوں ہے۔ کونسا قاعدہ آپ کے اس قول کی تائید کرتا ہے۔ اس ترکیب کو غیر مانوس کہنا بھی اُسی شخص پر زیبا ہے جس نے اساتذہ ایران کے کلام پر نظر ڈالی ہو اور یہ ترکیب اُسے غرابت کے ساتھ استعمال ہوتی ہوئی نظر آئی ہو۔ آپ کے اس ارشاد کو بہارِ عجم کی چار سندیں باطل کئے دیتی ہیں۔ سنئے غنی کی قبر سے آواز آرہی ہے ؏ سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست۔

غالب ؎ دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلّی نہ ہوا — ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

سعدی ؎ یا وفا خود نبود در عالم — یا مگر کس دریں زمانہ نکرد

حضرت آرگس۔ غالب کا یہ شعر سعدی کے اس شعر سے لیا گیا ہے۔

التماس بیخود۔ اس شعر کے متعلق جناب سہا کا خامۂ ندرت نگار حرکت فراموش ہے۔

جناب سعدی نے بڑی سادگی سے فرمادیا کہ یا تو وفا دنیا میں کبھی تھی ہی نہیں۔ یا ہمارے زمانے میں کسی نے نہ کی۔ اور غالب نے اس عامتہ الورود مفہوم کے لئے ایک نیا پیرایۂ بیان پیدا کیا۔ پہلے وفا کو نقش (تعویذ کے معنوں پر) کہا اور کہا کہ اس سے کبھی تسلّی نہ ہوئی۔ دوسرے مصرع میں اُسے لفظ بے معنی کہا یعنی کوئی وفادار نہ نکلا جس پر اس لفظ کا اطلاق صحیح ہوتا۔ اگر حضرت آرگس اسے بھی سرقہ کہتے ہیں تو پھر بات کرنا مشکل ہوجائیگا۔ اہلِ زمانہ کی بیوفائی کا رونا سبھی روتے آئے ہیں۔ اگر جناب آرگس کا قول قابلِ اعتنا ہو تو پھر سب سے پہلے کشتۂ بیگناہ یعنی ہابیل (پسر آدمؑ) کے سوا جو دنیا کی بیوفائی کا تذکرہ کرے وہ سارق قرار پائے۔

غالب ؎ میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں — وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

عالی شیرازی ؎ خواستم آتشِ دل را بنشانم بہ سرشک — آنقدر ہم جگر سوختہ ام آب نداشت

حضرت آرگس۔ دونوں خیال بظاہر جدا ہیں۔ مگر انداز بیان اور مقصد شعر دونوں ایک ہیں۔

جناب سہا۔ آرگس صاحب کا ارشاد ہے کہ۔ دونوں خیال بظاہر جُدا ہیں۔ مگر انداز بیان اور مقصد دونوں ایک ہیں۔ کیا خوب۔ انداز بیان اگر ایک ہے تو بظاہر دونوں خیال کیوں جُدا ہیں جبکہ مقصد ایک ہے۔ ذرا اپنی عبارت کی منطقیت کو سنبھالے رکھئیے۔ مطلب بالکل خبط ہوگیا ہے انداز بیان ایک اور بظاہر جدا یعنی چہ آپ چاہتے ہیں کہ متضاد مفہوم کے جملوں کو ترتیب دیکر اپنے دعوے کو ثابت کردیں۔ یہ ناممکن ہے قارئین کے سامنے آپ کی عبارت آپ کے تذبذب کی غماز ہے۔ پھر یہ فرمانا کہ انداز بیان اور مقصد دونوں ایک ہیں۔ کیسی مضحکہ خیز سخن سنجی ہے "کیا آتشِ دل" اور اندوہ وفا ایک ہی چیز ہے؟ کیا جگر

سوختہ ام، اور "ستمگر" ایک ہی شخص کے دو نام ہیں؟ اور کیا "راضی نہ ہوا" "آب نداشت" کے ایک ہی معنی ہیں؟ "بعد مرنے" "چھوڑوں" اور "نشانم بسر شک کسی" کتاب لغت میں ہم مفہوم ہیں۔ غالب کا شعر محبوب کی انتہائی ستمگری ظاہر کرتا ہے اور عالی کے شعر میں اپنی ہی مجبوری کا اظہار ہے۔ علاوہ ازیں عالی کے شعر سے مترشح ہوتا ہے کہ گویا جگر سوختہ بھی پانی کا کوئی مخزن ہے جہاں سے آنسو نکلتے ہیں اور یہ ایک غلطی ہے۔ جس پر عالی کی نظر رعایات لفظی کے اجتماع میں نہیں گئی +

خاکسار بیخود۔ اللہ اکبر اہل خبر کے تغافل اہل نظر کے تجاہل کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ اب ہر طرف سے حضرت نیاز کے ملامت خیز انداز تحریر کی صدائے بازگشت آنے لگی ہے ہمارے تنہا صاحب بھی بے ارادہ قارئین اور مضحکہ انگیز سخن سنجی ایسے الفاظ اور ترکیبیں لکھتے ہوئے نہیں جھجکتے +

میری رائے میں حضرت تنہا کی منطقیت قابل حیرت ہے کیا انداز بیان اگر ایک ہو تو مطالب و مقاصد مختلف نہیں ہو سکتے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ عالی کے شعر سے مترشح ہوتا ہے کہ گویا جگر سوختہ بھی پانی کا کوئی مخزن ہے۔ جہاں سے آنسو نکلتے ہیں اور یہ ایک غلطی ہے جس پر عالی کی نظر رعایات لفظی کے اجتماع میں نہیں گئی۔ مقصد یہ ہے کہ یہ ایسے اعتراض ہیں جن کا جواب خاموشی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ عالم اور حکیم غلطی نہیں کرتے۔ مگر معترض کو پہلے اپنی قابلیت پر نظر کر لینی ضرور ہے جسے مقری تشبیح کے معنے یاد نہ ہوں اور جو یہ بھول جائے کہ جتنی تری جگر میں ہوتی ہے اُتنے ہی زیادہ آنسو نکلتے ہیں۔ اُسے کیا حق ہے کہ نعمت خاں عالی سے علامۂ دوراں پر حرف گیری کرے۔ ماشاء اللہ آپ کا انداز بیان بھی حضرت نیاز سے کسقدر ملتا جلتا ہے۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ ایسے ہی شخصوں کے متعلق آہلی شیرازی نے کہا ہے ؎

آہلی مگو کہ عقل و دل و دیں ز دست رفت فارغ نشیں کہ بردہ ویراں خراج نیست

جناب تنہا نے غالب کے شعر کا یہ نکتہ بھی نہیں بیان کیا کہ اگرچہ عاشق کی حالت ایسی ہے کہ جان دیدینے پر آمادہ ہے۔ مگر ہائے ری وفا کہ مرنے کے لئے بھی معشوق کی مرضی کا پابند ہے +

غالب ؎ بقدر ذوق ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

علی سرہندی ؎ تو چوں ساقی شوی در تنگ ظرفی نمی ماند بقدر بحر باشد وسعت آغوش ساحلہا

جناب آرگس - بجز ایک آدھ لفظ کے اور کوئی کمی بیشی خیالات میں نہیں ہوئی +

جناب تنہا - آرگس صاحب مطلب پر قطعاً التفات نہیں فرماتے۔ لفظی اشتراک ہوا اور وحدت معنویت کا کلمہ پڑھ لیا گیا۔ متذکرہ صدر دونوں شعرا اپنے مطلب میں کسقدر مختلف ہیں۔ یعنی غالب وسعت شوق بیان کرتا ہے۔ اور علی سرہندی تنگ ظرفی +

بیخود۔ حضرت آرگس نے تو شعر کے نہ سمجھنے کی قسم کھائی ہے۔ اُن سے تو کچھ کہنا ہی بیکار ہے۔ ہاں جناب تنہا سے یہ عرض کرنا ہے کہ نہ غالب وسعت شوق بیان کرتا ہے۔ نہ علی سرہندی عدم تنگ ظرفی +

علی سرہندی کہتا ہے کہ جب تو شراب پلانے لگے تو جتنی بھی پلا دے میکش کا ظرف تنگی نہ کریگا۔ یہ تیری ساقی گری کا اعجاز ہے۔ دوسرے مصرعہ میں تمثیل سے کام لیتا ہے۔ کہ دیکھ لے جتنا دریا کا پاٹ بڑھتا جاتا ہے۔ اُتنی ہی ساحل کے آغوش کی وسعت بڑھتی جاتی ہے +

غالب کا انداز بیان بتاتا ہے کہ یہ کشش کے اصرار پر آس سے کہا گیا ہے۔ یا وہ خود ساقی کو شراب دینے میں تامل کرتے ہوئے دیکھ کر یہ سمجھا ہے کہ ساقی مجھے تنگ ظرف سمجھتا ہے۔ اس کا جواب دیتا ہے اور مدلل کر کے ساقی میں اپنی تشنہ کامی کے اندازہ کے لئے تجھے ایک پیمانہ بتائے دیتا ہوں۔ وہ یہ کہ جسقدر مجھے ذوق مے ہے اُسیقدر خمار تشنہ کامی بھی ہے۔

یہاں تک تو عاشق نے پردہ پردہ میں گفتگو کی اور بادی النظر میں معلوم ہوتا تھا کہ شراب کا تقاضا کر رہا ہے۔ مگر دوسرے مصرعہ میں کچھ اور ہی عالم نظر آنے لگا۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ تیرے ہاں شراب کا دریا بھرا ہوا ہے۔ بلکہ یہ کہتا ہے کہ اگر تو دریائے مے ہے تو میں خمیازۂ ساحل ہوں۔ یعنی مجھے تیری تمام اداؤں کا تحمل ہے۔ اور میری انتہائی خواہش پر میرے شوق کی انتہا خاہد ہے۔ یعنی تو ناز آفرینی کرتے ہوئے کیوں ڈرتا ہے میں ہرگز یہ نہ کہونگا ؎

کم تر شراب جلوہ کہ پرشد ایاغ ما ۔۔۔ روغن چناں مریز کہ میرد چراغ ما

میرے نزدیک دونوں شعر لطیف ہیں۔ مگر قلعہ اور عرش کے کنگروں میں فرق ہے ؛

غالب ؎ محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا ۔۔۔ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

عرفی ؎ ہر کس نشناسندۂ راز است وگرنہ ۔۔۔ ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

" ؎ مگو کہ نغمہ سرایان عشق خاموشند ۔۔۔ کہ نغمہ نازک و اصحاب پنبہ در گوشند

ارشاد آرگس - (۱) یہ غالب کا نہایت مایۂ ناز مشہور شعر ہے - (۲) ممکن ہے کہ دونوں شعر جدا سمجھے جائیں۔ مگر غور کرنے پر ذوق سلیم ایک ہی طرف رہبری کرتا ہے۔ دوسرا شعر بھی ویسا ہی ہے ؛

ارشاد تنہا۔ جناب آرگس ان دونوں شعروں کو پیش فرما کر بہت نازاں ہوئے ہونگے۔ کیونکہ اشعار تقریباً ایک ہی خیال پر مبنی ہیں۔ لیکن شاید ان کو معلوم نہیں کہ یہ مضمون عرفی کا دماغ زادہ (کیا خوبصورت ترکیب ہے) نہیں ہے۔ بلکہ متصوفانہ ہے اور خود عرفی نے بھی خانقاہ نشینوں سے سن لیا ہے اس قسم کے متصوفانہ عقاید کسی شاعر کی جاگیر نہیں ہوتے کہ جن کے اشعار پر سرقہ و توارد کا الزام دیا جا سکے۔ اب رہا بیان کا سوال تو ارباب ذوق سلیم تصفیہ کر سکتے ہیں کہ غالب کا شعر اسلوب ادا کے لحاظ سے عرفی کے شعر سے مراتب بہتر اور مکمل تر ہے۔ غالب کے شعر میں الفاظ نہایت شاعرانہ اور بندش بے ربط ہے۔ نیز عرفی کے شعر میں 'معلوم عوام است' کے ساتھ ساتھ 'ہر کس نشناسندۂ راز است' نظم ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ نے عرفی کے ساتھ اظہار مفہوم میں مساعدت تامہ نہیں کی۔ اس لئے کہ بحالت موجودہ یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ جو راز معلوم عوام ہے وہ خواص کے لئے کیونکر نا قابل علم ہوگا ؟

تاہم یہاں تک آرگس صاحب مغالطہ دہی میں کچھ سنجیدہ بھی تھے۔ لیکن آگے چلکر تو ناظرین نگار سے تمسخر فرمانے لگے یعنی ایک اور شعر پیش کر دیا جس کی بابت لکھتے ہیں کہ دوسرا شعر بھی ویسا ہی ہے اور شعر پیش ہوتا ہے یہ ؎

مگو کہ نغمہ سرایان عشق خاموشند ۔۔۔ کہ نغمہ نازک و اصحاب پنبہ در گوشند

ہمیں اُمید ہے کہ اس کے جواب میں خود ناظرین نگار کہد ینگے کہ اگر شاہنامہ فردوسی کا ماخذ رباعیات عمر خیام ہیں تو بیشک اس

شعر اور غالب کے شعر میں توارد ہے ◆

التماس بیخود۔ مجھے ہنسی آتی ہے کہ حضرت آرگس ہوں یا جناب ستمہا کوئی اور صاحب فیصلہ سب ذوق سلیم ہی پر اُٹھا رکھتے ہیں۔ اور انداز عبارت یہ بتاتا ہے کہ ذوق سلیم انہیں کا موید ہے۔ حالانکہ ذوق سلیم ایسی صورت میں ایک ہی طرف ہوسکتا ہے خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔ مجھے حضرت آرگس اور جناب ستمہا دونوں بزرگوں سے یہ عرض کرنا ہے کہ آپ حضرات اظہار مطالب میں اسقدر کوتاہ قلم کیوں ہیں جب یہ ظاہر ہے کہ اہل خبر کو آپ کے ارشادات سے کچھ سیکھنا نہیں پھر اشاروں میں باتیں کیوں ہوتی ہیں۔ عوام و متوسلین بھلا ان عبارتوں سے کیا سمجھ سکتے ہیں۔ الفاظ نہایت شاعرانہ ہیں۔ بندش بدیع ہے۔ با غور کرنے پر ذوق سلیم ایک طرف ہی رہبری کرتا ہے ◆

حضرت ستمہا کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ اشعار تقریباً ایک ہی خیال پر مبنی ہیں اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ خیال عرفی کا دماغ زادہ نہیں۔ عرفی نے خانقاہ نشینوں سے سُن لیا ہوگا۔ میرے نزدیک ان اشعار کے خیالوں میں مشرق و مغرب کا فرق ہے۔ اور اس کے لئے خانقاہ نشینوں سے سُن لینے کی ضرورت نہیں۔ میں ہر شعر کا مطلب عرض کئے دیتا ہوں ◆

غالبؔ ؎ محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

حل[1] ساز کی حقیقت نمائیں اگر تیری سمجھ میں نہیں آتیں تو اس میں تیرا ہی قصور ہے۔ ورنہ یہاں (دنیا میں) جتنے پردے ہیں وہ ساز کے پردوں کی طرح آوازدے رہے ہیں۔ اور اسرار الٰہی اور قدرت قادر مطلق ظاہر کر رہے ہیں۔ یعنی جن چیزوں کو تو وجود باری کے سمجھنے میں مانع سمجھتا ہے وہی باآواز بلند و باآہنگ دلکش اس کے وجود اور اس کی یکتائی کا ترانہ گا رہی ہیں ◆

حجاب تعین ہستی۔ وجود (موجودات) یعنی ماسوی اللہ میں ذرہ ذرہ وجود و قدرت باری کا گواہ ہے۔ حاشیہ۔ قانون۔ بین۔ ستار۔ ہارمونیم۔ چنگ۔ رباب وغیرہ کے پردوں سے راگ نکلتے ہیں۔ مگر ان کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جن کو موسیقی میں دخل ہے۔ اس شعر میں یہ بھی مضمر ہے کہ جس طرح ساز کے ذریعہ سے نغمہ کا ظہور ہوتا ہے۔ اسیطرح اگر خدا موجودات عالم کے پردے میں جلوہ نہ دکھاتا تو اُس کے وجود کا ادراک ناممکن تھا۔ اس لئے کہ وہ چشم و جسمانیات سے منزہ ہے ◆ اس شعر میں نوا۔ حجاب۔ پردہ۔ ساز۔ محرم۔ راز۔ سب الفاظ مناسب جمع ہوگئے ہیں۔ اور اسے صنعت مراعاۃ النظیر کی جلوہ گری نے اور چمکا دیا ہے ◆ مگر غالب کے ہاں ایسی معمولی بات کی تعریف کرنا اُس کی تحسین نہیں تہجین ہے ◆

عرفیؔ ؎ ہر کس نشناسندۂ راز است وگرنہ ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

ہر کس و ناکس میں راز سے آگاہ ہونے کی قابلیت نہیں۔ ورنہ وہ باتیں جو عوام کو بھی معلوم ہیں۔ سراپا راز ہیں ◆

اس مثال سے یہ فرق نہایت واضح ہوجاتا ہے :۔

کھانوں کے مسالے اب جن سے عام مرد ہی نہیں پردے کی بیٹھنے والیاں بھی واقف ہیں اور اُن سے روز کام پڑتا ہے

[1] شرح غالب غیر مطبوعہ از بیخود موہانی صفحہ ۳۱ و ۳۲ ◆

فن کے مصالح سے اہل نظر کے سوا بالعموم لوگ بے خبر ہیں۔ حالانکہ ان کی ایجاد و انکشاف حکما کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ یہ معنے معلوم عوام ہونے کے ساتھ ساتھ راز ہونے کے ہیں۔ مندرجہ ذیل شعر پر نظر کرنے سے جناب تنہا کی سمجھ میں عرفی کا شعر آ جائے گا اور یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ الفاظ نے عرفی کے ساتھ مساعدت تامہ کی ہے +

تری دنیا کو تجکو کون سمجھے جب نہیں کھلتا کہ ایک اک ذرہ کی دنیا کہانتک ہے کہانتک ہے

حکما سے پوچھئے تو یہی جواب ملیگا کہ آجتک ایک ذرہ کی حقیقت و ماہیت بھی پورے طور پر معلوم نہ ہوئی +

عرفی ؎ مگو کہ نغمہ سرایان عشق خاموشند کہ نغمہ نازک و اصحاب پنبہ در گوشند

مطلب۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ عارفان خدا اسرار معرفت کے بیان کرنے میں تامل کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اسرار نازک ہیں۔ اور اس پر طرہ یہ ہے کہ اہل دنیا دنیا میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ پھر یہ سمجھ میں آئیں تو کیونکر +

اب جناب آرگس اور جناب تنہا اور نکتہ سنجان نگار فیصلہ فرمائیں کہ ان اشعار کو ہم مضمون کہنا کہانتک روا ہے۔ یہ بجا ہے کہ عرفی کے اشعار حکیمانہ و عارفانہ ہیں۔ مگر غالب کے شعر سے ان کا تقابل بےجوڑ سی بات ہے۔ غالب کچھ اور ہی کہتا ہے۔ شعر غالب کے مضمون کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں اُس نے دُنیا کے ذرہ ذرہ کو (پردہ تعین) حجاب بنا کر قیامت کر دی ہے۔ میرے نزدیک حضرت آرگس کی ژرف نگاہی اور جناب تنہا کی سخن سنجی اُن کی فارسی دانی کا پردہ فاش کئے دیتی ہے +

غالب ؎ بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

عالمگیر ؎ انچہ برجستیم و کم دیدیم بسیار است و نیست نیست جز انساں دریں عالم کہ بسیار است و نیست

ارشاد آرگس۔ شعر کی جان غالب کا دوسرا مصرع اور اُس کا انداز بیان ہے۔ مگر عالمگیر کے ہاں دونوں مصرعے برابر کے ہیں۔ اور دونوں کے انداز بیان میں بھی فرق نہیں ہے +

ارشاد جناب تنہا۔ کہتے ہیں کہ شعر کی جان غالب کا دوسرا مصرعہ اور اُس کا انداز بیان ہے۔ مگر عالمگیر کے یہاں دو مصرعے برابر کے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا صرف دوسرا مصرع اچھا ہے۔ اور عالمگیر کے یہاں چونکہ دونوں مصرعے برابر کے ہیں اس لئے دونوں مصرعے اچھے ہیں۔ مصرعوں کی برابری اچھائی کی تازہ ترین دلیل ہے۔ برابری سے نہیں معلوم آرگس صاحب کی کیا مراد ہے۔ وزن میں پیمائش میں کیونکہ بندش کی چستی کے اعتبار سے تو دونوں مصرعے ناقص ہیں۔ غالباً آرگس صاحب کی مراد برابری سے وزن و پیمانہ ہی ہوگی تو جناب وزن کے لحاظ سے غالب کے بھی دونوں مصرعے برابر ہی ہیں۔ البتہ اگر طول و عرض کی پیمائش بھی قواعد شعر میں داخل ہو گئی ہے تو ممکن ہے کہ غالب کے مصرعین (کیا خوب) میں کمی بیشی ہو گئی ہو۔ بہرحال کی ایک مجہول المفہوم توجیہ سے آرگس صاحب غالب کے شعر پر عالمگیر کے شعر کو ترجیح دینا چاہتے ہیں۔ مطلب سے کوئی غرض نہیں۔ برابری کا مرحلہ طے ہو رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عالمگیر کے دونوں مصرعوں میں چونکہ ایک ہی مضمون کا اجمال و تفصیل ہے اور چونکہ شعر مطلع ہے اور ردیف مکرر لہذا آپ کو مصرعے بہت زیادہ محسوس ہوئے۔ غالب کے مضمون میں تکرار کسی قسم کی نہیں ہے۔ بلکہ دوسرا مصرع پہلے کی تمثیل و تفسیر ہے۔ رہا یہ معاملہ کہ غالب کا شعر عالمگیر کے شعر کا ہم مضمون ہے یہ بات بھی

نہیں ہے۔ غالبؔ اپنے شعر میں حصول آسانی کی نفی کرتا ہے۔ اور اس نفی کی تمثیل میں دوسرا مصرعہ شعر کی جان بھی فرما چکے ہیں۔ اور غالبؔ کی نگاہ دقیقہ رس نے تمثیل میں ایک خاص رعایت ملحوظ رکھی الفاظ میں پیدا نہ ہو سکی اور وہ آدمیت اور انسانیت کے نازک فرق کی جانب اشارہ جس نے تمثیل میں تازگی کر دی ہے +

التماس نیچو۔ پہلی بات تو یہ کہنا ہے کہ جہاں تک مجھے یاد ہے یہ شعر عالمگیر کا نہیں مرزا بیدل علیہ الرحمہ کا ہے۔ اور جس طرح اسے جناب آرگس نے لکھا اور جناب تنہا نے نقل کیا ہے یہ مطلع نہیں شعر ہے اس لئے کہ قافیہ ہی غائب ہے۔ یہ شعر یوں ہے ؎

انچہ ما جستیم و کم دیدم کہ بسیار است و نیست بیست جز انساں درین عالم کہ بسیار است و نیست

اس صورت میں ایک ردیف برائے بیت ٹھہرتی ہے۔ اس لئے کہ مضمون شعر نیست حرف ان پر تمام ہو جاتا ہے۔ اور کہ بسیار است و نیست چھٹی انگلی کی طرح بیکار زائد نظر آتا ہے۔ باقی اس شعر کے متعلق حضرت تنہا کی رائے سے مجھے اتفاق ہے۔ ہاں یہ بات رہی جاتی ہے کہ آدمیت اور انسانیت کا نازک فرق جس کی طرف جناب تنہا نے اشارہ فرمایا ہے۔ ضرور داد کے قابل ہے +

یہ بھی عرض کرنا ہے کہ جناب تنہا کی ظرافت اور عبارت متانت کو آنکھیں دکھاتی ہے۔ اور مذاق کو مذاق عامیانہ و سوقیانہ کی حد سے باہر نہیں نکلنے دیتی +

مرزا بیدل علیہ الرحمہ کے دونوں مصرعے برابر کے نہیں بلکہ شعر کا شعر سقیم ہے۔ مرزا بیدل کے شعر کا مطلب صرف اتنا ہے کہ کہنے کو انسان بہت ہیں مگر انسان کامل ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔ مرزا غالبؔ کہتے ہیں کہ دنیا میں کوئی کام آسان نہیں دیکھ لو کہ آدمی کا انسان بننا کتنا مشکل کام ہے۔ غالبؔ نے شعر میں تمثیل سامنے کی ہے۔ مگر ایسی کہ جس طرف عوام تو عوام خواص کا ذہن بھی آسانی سے متبادر نہیں ہوتا۔ اور یہ بات اُسی طرح داد کے قابل ہے جس طرح گلستاں کی حمد میں جہاں بلبلِ شیراز نے پیش پا افتادہ چیزوں سے کام لے کر اس مقام کو ایک مقام بنا دیا ہے +

سعدیؔ :- "ہر نفسی کہ فرو میرود ممد حیات است و چوں برمی آید مفرح ذات۔ در ہر نفسی دو نعمت موجود است و بر ہر نعمتے شکرے واجب"

غالبؔ ؎ کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حافظؔ ؎ آفریں بر دل نرم تو کہ از بہر ثواب کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدہ

آرگس۔ خیال دونوں کا یکساں ہے غالبؔ کے یہاں زود پشیماں ہے اور حافظؔ کے ہاں دل نرم۔ غالبؔ کے یہاں جفا سے توبہ۔ حافظؔ کے ہاں بہر ثواب بنماز آمدہ +

نیچو۔ مرزا کی قبر سے آواز آ رہی ہے ؎ کسا نکہ ہیچ نفہمیدہ اند در سخن من — بعیب جوئی من جملہ نکتہ داں شدہ اند +

رہا۔ بقول جناب آرگس زود پشیماں اور دل نرم جفا سے توبہ اور بہر ثواب بنماز آمدہ ہم معنی فقرے ہیں لیکن آرگس صاحب کو کون سمجھائے کہ دونوں شعر مضمون کے لحاظ سے قطعاً مختلف ہیں۔ حافظ علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ تیری نرم دلی کے کیا کہنے ہیں۔ کہ اپنے کشتۂ غمزہ کے جنازے کی نماز پڑھنے ایصال ثواب کے لئے آیا ہے۔ شعر میں خوبی یہ ہے کہ کشتۂ غمزہ کو ایصال ثواب کیا گیا ہے۔ مگر کشتۂ غمزہ کو ایصال ثواب کوئی خاص نرم دلی بھی نہیں ہے۔ معشوق بیچارہ حسب دستور نادان ہوگا اُس کو کیا معلوم کہ یہ اُسی کے کشتۂ غمزہ ہیں یا غمزہ بھی کسی کو کشتہ کر سکتا ہے بیچارہ مذہبی رسم سمجھکر نماز ادا کرنے پہنچ گیا مگر غالب کے شعر میں جو مضمون ادا ہوا ہے سیکڑوں غزلوں کا خلاصہ اور جان شعر ہے۔ آرگس صاحب یہاں کشتۂ غمزہ نہیں بلکہ جفا کار از قتل عمد ہو چکا ہے اس قتل عمد کے بعد زود پشیماں اور جفا سے توبہ کو دیکھئے اسی کو سحر حلال کہتے ہیں۔ اور اسی اسلوب پر تو غالب کے پرستار مٹے جاتے ہیں +

بیخود موہانی۔ جناب تنہا کا یہ ارشاد صحیح ہے کہ زود پشیماں اور دل نرم جفا سے توبہ اور بہر نماز آمدہ ہم معنی فقرے نہیں ہیں۔ مگر حافظ کے شعر کا جو مطلب ارشاد ہوا ہے اُس سے مجھے اتفاق نہیں۔ اس شعر میں ایصال ثواب کا کہیں ذکر نہیں۔ اور دل نرم سے مراد دل سخت ہے۔ اور راہ بہر ثواب کے معنی خود ثواب حاصل کرنے کی غرض سے۔ یعنے تو ایسا سنگدل ہے کہ کشتۂ ناز کے جنازے کی نماز پڑھنے اس غرض سے آیا ہے کہ نماز میت کا ثواب حاصل ہو۔ مراد یہ ہے کہ اللہ ری سنگدلی کہ جسے خود خاک میں ملایا اُس کے جنازے کی نماز بھی حق محبت ادا کرنے کی نیت سے نہ پڑھی۔ اور یہ کہنا کہ معشوق حسب دستور نادان ہے۔ اُسے کیا معلوم کہ عاشق اُسی کا مارا ہوا ہے۔ یا غمزہ میں بھی قتل کرنے کی قابلیت ہے۔ یہ خیال آرائیاں اور موشگافیاں اس محل پر کچھ بے محل سی ہیں۔ اگر معشوق ایسا ہی بھولا ہے تو اُس پر دل نرم کی تعریض ہی لایعنی ہے۔ شاعر ہو یا شارح الفاظ و مفہوم شعر کا تابع ہے +

آپ فرماتے ہیں کہ اس قتل عمد کے بعد زود پشیماں اور جفا سے توبہ کو دیکھئے اسی کو سحر حلال کہتے ہیں۔ للہ ارشاد فرمائیے کہ یہ بھی کوئی تنقید یا شرح ہے۔ اس سے وہ شخص جو خود سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو کچھ بھی سمجھ سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مرزا غالب کا یہ شعر دو پہلو رکھتا ہے (۱) زود پشیماں کا مفہوم یہاں جلد پشیمان ہونے والا (۲) اور بہت دیر میں یا کبھی پشیمان نہ ہونے والا ہے +

(۱) مرزا کہتا ہے کہ معشوق ایسا ظالم تھا کہ جب تک مجھے قتل نہ کر لیا پشیمان نہ ہوا۔ یعنی پشیمان ہوا ہی نہیں +

(۲) میرے قتل کرتے ہی اُس کو ندامت ہوئی۔ کاش پہلے ہی خیال کیا ہوتا۔ عاشق کو معشوق کی ندامت پر رحم اور پیار آگیا ہے۔ اب سارے ظلم فراموش ہوگئے ہیں پہلی صورت میں اظہار سنگدلی ہے۔ دوسری صورت میں شان عاشقانہ ہے۔ اور یہ صورت زیادہ لطیف ہے۔ یعنی معشوق کے ذرا سے التفات سے سارے گلے محو ہوگئے۔ وہ پشیمان ہوا اور یہ مضطرب ہوئے +

غالب ۔ دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا ۔ زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائینگے کیا

ناطق گرانی — لذت ز زخم بسکہ دل زار من گرفت   ناخن ز دوم بسینہ اگر بہ شدن گرفت

آرگس - جو میں لکھتا آرہا ہوں اُس موضوع کے خلاف ایک مزیدار بات سنئے۔ غالب نے ناطق گرانی کے شعر سے استفادہ کیا یا نہیں مگر حضرت شاد لکھنوی پیرو میر مرحوم نے تو کمال ہی کر دیا۔ سنئے

بیخود - یہ عبارت لکھ کر جناب آرگس نے شاد کے وہ شعر لکھے ہیں جو مرزا کے اشعار کی بگڑی ہوئی تصویر معلوم ہوتے ہیں لیکن اُن کے متعلق اظہار رائے کی ضرورت نہیں ؛

جناب تنہا - غالب کہتا ہے- چونکہ میں زخموں کو ناخن سے چھیل دیتا ہوں - احباب میرے ناخن ترشواتے ہیں مگر یہ عبث ہے کیونکہ زخم کے اندمال سے قبل ہی ناخن بڑھ آئینگے۔ اور پھر خراش زخم کا سامان مہیا ہو جائے گا۔ حاصل یہ ہے کہ احباب کی چارہ فرمائیاں بے سود ہیں۔ ہمارے سامانِ خرابی میں تخفیف نہیں ہو سکتی۔ ناطق گرانی اپنی ایذا پسندی بیان کرتا ہے۔ یہاں احباب کی چارہ فرمائیاں نہیں ہیں۔ دونوں شعروں کے مضمون کا تفاوت اگر آرگس صاحب کو نہیں نظر آتے تب بھی اس میں کیا کلام ہوگا کہ خیال مختلف پیرایہ اور مخصوص اضافہ کے ساتھ لوا ہوا ہے ؛

بیخود - جناب تنہا نے بہت کچھ لکھا۔ مگر افسوس کہ نہ حضرت ناطق کے شعر میں مزہ ملا نہ حضرت غالب کے شعر میں۔ میں دونوں کا مطلب عرض کرتا ہوں دونوں کا فرق آئینہ ہو جائیگا۔ میرے نزدیک جناب غالب یہ فرماتے ہیں کہ ہمارے سامان خرابی میں کوئی تخفیف نہیں ہو سکتی۔ اور نہ حضرت ناطق اپنی ایذا پسندی کا اظہار فرماتے ہیں +

غالب کا شعر عاشق کی ایک مجنونانہ ادا کا آئینہ دار ہے۔ اُس کے احباب ناخن اس لئے ترشواتے ہیں کہ کہیں زخم کو بڑھا نہ لے مگر عاشق ہے شوریدہ سر۔ اس لئے وہ اپنے دوستوں کو دوست نہیں دشمن جانتا ہے اور یہ سمجھکر خوش ہے کہ زخم بھرنے سے پہلے ناخن بڑھ آئینگے اور میں پھر اپنے جسم پر زخموں کا گلزار کھلا دونگا۔ یہ ایک وحشی کے خیال کی مرقع کشی ہے اور خوب ہے۔ جناب تنہا کا بیان مراد شاعر کے خلاف ہے اور شعر اُس سے جسم بے روح ہو کر رہ گیا ہے ؛

ناطق ایذا پسندی کا اظہار نہیں کرتا بلکہ لذت زخم عشق کو بیان کرتا ہے کہ جہاں زخم اچھا ہونے لگا میں نے ناخن مارا اور پھر وہی مزے آنے لگے۔ ان ظالموں کو سمجھاتے کون کہ ہر جگہ زخم سے زخم اور ناخن سے ناخن مراد لینا ضروری نہیں ہے ناطق کہتا ہے کہ عشق کی تکلیفوں میں وہ مزہ ملتا ہے کہ جب محبت کم ہونے لگتی ہے تو اُسے بڑھا لیتا ہوں + نکتہ۔ اس حقیقت کو کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ جس طرح دیوانہ اپنے بہی خواہوں کو دشمن اور اُن کی چارہ گری کو دشمنی سمجھتا ہے۔ اسیطرح عاشق شوریدہ سر بھی ترک عشق کے مشورہ کو بدخواہی اور احباب کی تدابیر کو عداوت سمجھتا ہے کیا قیامت ہے کہ جہاں استعارے اشارے کنائے میں باتیں ہونے لگیں دور حاضرہ کے سخن فہموں پر قیامت ٹوٹی +

مجھی حضرت آرزو کے اس شعر کا بھی یہی عالم ہے ؎

جوش جنوں میں وہ ترے وحشی کا چیخنا   بند اپنے ہاتھ سے در زنداں کئے ہوئے

اور یہی شان غالب کے اس شعر میں ہے ؎

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن   ہماری جیب کو اب حاجت رفو کیا ہے

اب واضح ہوگیا کہ دونوں شعروں کی شاہراہ خیال الگ ہے اور کسقدر الگ +

غالب ؎ آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا

عرفی ؎ منم آں سیر ز جاں گشتہ کہ با تیغ و کفن تا در خانۂ جلاد غزل خواں رفتم

آرگس عرفی کے یہاں غزلخواں رفتم واللہ مدّعا ان قیامت کا ہے کہ جواب ہی نہیں +

سنہا۔ غالب کہتا ہے کہ وہ میرے قتل کے لئے روز کوئی نہ کوئی بہانہ کردیتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ تلوار نہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ کفن کا کیا انتظام ہے۔ پس آج تمام اسباب جمع کرکے جاتا ہوں تاکہ انہیں کوئی عذر نہ رہے۔ عرفی جان سے اپنی بیزاری بیان کرتا ہے۔ یہی دونوں شعروں کا فرق ہے +

بیخود۔ جہاں تک مجھے یاد ہے تمام شارحین دیوان غالب نے اس شعر کا مطلب بتغیر یہی بیان کیا ہے کہ تلوار اور کفن دونوں لے کے چلا ہوں اب تو انہیں میرے قتل میں کوئی عذر نہ ہوگا۔ ہاں جناب حسرت موہانی نے اس کی شرح فرمانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ مگر اس خاکسار کے نزدیک اس شعر کا یہ مطلب ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ اس سے بالالتزام سمجھ میں آتا ہے کہ عاشق یا تو انتہا کا غلس تھا یا دیوانہ (اور ان میں کوئی صورت دلکش نہیں۔ دیوانہ نہ ہونے پر آنکا یہی قول شاہد ہے) اس لئے کہ جب معشوق نے اُس سے کبھی تلوار کبھی کفن نہ ہونے کا عذر کیا تھا تو اُس نے دونوں چیزیں پہلے ہی کیوں نہ بہم پہنچالیں۔ کہ بار بار عذر تراشنے کی نوبت ہی نہ آتی حقیقت یہ ہے کہ اس شعر کی بنا عرب کے اس دستور پر قائم ہے کہ جب وہاں کوئی جان پر کھیل جانے کے لئے قتل جاتا تھا تو سر سے کفن باندھ کر اور تلوار لیکر نکلتا تھا۔ پھر کوئی اُسے جان دینے کے ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش نہ کرتا۔ شب عاشور جب اسلام کے زندہ کر دینے والے ایمان کے مرتبہ کو معراج پر پہنچانے والے (امام حسینؑ) نے اپنے انصار سے فرمایا تھا کہ میں اپنی بیعت تمہاری گردنوں سے اٹھا۔ لے لیتا ہوں پردۂ شب میں جدھر جا ہو نکل جاؤ۔ تو اُن وفا کے پتلیوں نے سر سے کفن باندھ لئے اور تلواروں کے نیام توڑ کر پھینک دیئے تھے۔ اس کے بعد مولائے دوجہان نے پھر اُن سے ایسا نہیں فرمایا +

عاشق اپنے دل میں غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ میں نے ابتک جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے والوں کی صورت ہی نہیں بنائی اور یہی سبب ہے کہ وہ کسی نہ کسی بہانے سے مجھے ٹال دیا کرتا ہے۔ آج اس ساز و سامان سے جاتا ہوں۔ اب تو کوئی عذر ہو ہی نہیں سکتا۔ اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ عاشق معشوق کے ہاتھ سے قتل ہونے ہی کو مآل زندگی سمجھتا ہے۔ عرفی کے شعر میں سیر ز جاں گشتہ کا ٹکڑا جب تک موجود ہے اُس وقت تک۔ غزلخواں رفتم، کے ہوتے ہوئے بھی غالب کے شعر کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے کہ جان سے بیزار ہونے پر مرنے کی یہ خوشی اور چیز ہے۔ اور معشوق کے ہاتھوں قتل ہو جانے کی تدبیر سمجھ میں آنے پر پھولے نہ سمانا اور چیز ہے۔ عرفی کا یہ شعر جہاں واقع ہے وہاں عشق کا کہیں ذکر نہیں، دونوں شعروں کو ہم مضمون سمجھنا سخن سنجی کے مشرب کے خلاف ہے۔ اب جناب آرگس اور اُن کے ہمنوا غور فرمائیں کہ ایسے شعر کو دروپدی کے چیر کی طرح سرقہ یا توارد کی طرف کھینچنا کہاں تک روا ہے +

غالب ؎ ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غم الفت اسدؔ ہم نے یہ مانا رہے دلّی میں تو کھائینگے کیا

سعدیؔ ؎ سعدیا حبِ وطن گرچہ حدیثے است صحیح نتواں مرد بسختی کہ من ایں جا زادم

آرگس۔ یہاں خیال بالکل ایک ہے گو ظاہر الفاظ میں فرق ہے مگر موضوعِ مضمون سے باہر نہیں +

سمہا۔ لیجئے اب تو آرگس صاحب لفظوں کی ظاہر پرستی میں ایسے گم ہو گئے کہ محاوروں اور استعاروں کی بھی شناخت نہ رہی۔ جناب غم الفت روٹی نہیں ہے نہ اس کا کھانا اس کھانے میں داخل ہے جو لفظ "کھانا" کا مفہوم ہے۔ زیادہ سے زیادہ غم الفت کو غذائے روحانی سمجھ لیجئے چنانچہ غالب تو صرف یہ کہتا ہے کہ دلّی میں کیسے (کیونکر) گذر ہوگی۔ یہاں ہیں غم الفت تو میسّر ہی نہیں جس کے ہم عادی ہیں۔ البتہ سعدیؔ معاش ہی کے شاکی ہیں۔ کہئے کیا واقعی دونوں اشعار ہم مضمون ہیں +

بیخود۔ افسوس غم الفت غم الفت کی تکرار اہی ہوئی۔ مگر حضرت تمنا نے یہ نہ فرمایا کہ غم الفت ہے کس بلا کا نام۔ کہہ دینا تھا کہ اب اہل دل۔ اہل محبت۔ اہل درد۔ اہل وفا سے دلّی خالی ہو گئی اور ہم تنہا محبت کے بھوکے۔ اب دلّی ہمارے رہنے کے قابل نہیں رہی +

ملکہ۔ اس شعر میں یہ لطیف نکتہ بھی مضمر ہے کہ اہل دل کے نزدیک وطن اہل وفا و اہل محبت کا دوسرا نام ہے یہ نہ ہے تو وطن کہاں رہا۔ یہ لطافت بھی ہے کہ غالب غم الفت ہی پر اپنی زندگی کا انحصار سمجھتا ہے۔ اور یوں اہل دنیا کو مہر و وفا کا سبق دیتا ہے ....

اور بلندئ خیال کے یہی معنی ہیں حضرت سعدیؔ اس شعر میں کچھ ایسے نظر آتے ہیں کہ غم معاش کا تحمّل ان کے بس کی بات نہیں معلوم ہوتا۔ اور غالب وہ بلند خیال ہے کہ اگر غم الفت نہ ہو تو زندگی کو محال سمجھتا ہے ترکِ وطن کا خیال دونوں کو ہے۔ مگر یہ دیکھنا چاہئے کہ کون کس وجہ سے ترک وطن کر رہا ہے اور وہ وجہ اہل دل کی نظر میں کیا رتبہ رکھتی ہے۔ ترک وطن کا ارادہ عامۃ الورود مضمون ہے۔ جو ایسے حالات میں ہوگا یہی قصد کریگا۔ معلوم نہیں کہ اسے سرقہ یا توارد سے کیا تعلق ہے +

غالب ؎ ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا کہ خوشی سے مر نجاتے اگر اعتبار ہوتا

نیلی ؎ ہیم از وفا مدار بدہ وعدۂ کہ من از ذوقِ وعدۂ تو بفرد انمی رسم

آرگس۔ نیلی نے کہا تھا کہ تو وعدہ کر اور ایفائے وعدہ کا خیال ہی نہ کر۔ ادھر تو نے وعدہ لیا ادھر خوشی سے ہمارا دم نکلا بالکل یہی خیال غالب کے یہاں ہے۔ مگر نیلی کے یہاں قبل وعدہ ہے اور یہاں بعد وعدہ +

سمہا۔ نیشاپوری وعدہ کے ذوق میں مرجانے کا یقین دلا کر محبوب سے پیمان لینا چاہتا ہے۔ غالب صدق و کذب وعدہ کا ایک اچھوتا معیار پیش کرتا ہے۔ اختلاف مضمون مستزاد براں۔ غالب کا حُسن بیان شعر کو نیشاپوری کے شعر سے بلندتر کئے ہوئے ہے +

بیخود۔ میری رائے میں حضرت آرگس کا خیال صحیح ہے۔ میں تو یہ کہونگا کہ دونوں خیال یکساں ہی نہیں بالکل ایک ہیں۔ حضرت

سہا جس کو اچھوتا مضمون قرار دیتے ہیں۔ وہ بالکل اُسی طرح بلکہ اُس سے کہیں بہتر صورت میں تسلی کے ہاں پایا جاتا ہے۔ قبل وعدہ اور بعد وعدہ کی تکرار لایعنی ہے۔ مگر یہ مضمون ہے عام اس لئے کہ انتہائی خوشی میں مرجانا مشہورات میں سے ہے۔ جس پر "شادیٔ مرگ" کی شہرت شاہد عادل ہے۔ پھر وعدۂ وصل یار کی خوشی میں مرجانا کونسی بڑی بات ہے۔ اس لئے اسے نہ ترجمہ کہئے نہ سرقہ۔ یہ توارد کہا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک تسلی کا شعر نزاکت و بلندیٔ خیال کے اعتبار سے مرزا غالب کے شعر سے کہیں بالاتر ہے۔ اس لئے کہ کہاں وعدۂ یار کی خوشی میں مرجانے کی معذرت کرنے کے لئے زندہ رہنا اور کہاں قبل وعدہ۔ وعدۂ وصل کی خوشی میں مرجانے کا یقین ہونا۔ غالب کا شعر تسلی کے شعر سے پست ہے اور بہت پست ہے +

مجھے غالب سے اتنی ارادت ہے کہ جس کا اندازہ علام الغیوب کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ مگر ع انصاف شیوہ ایست کہ بالائے طاعت است۔ کسی کو رستم داستاں بنانا میرا شیوہ نہیں اور خدا مجھے اُس دن کو نہ رکھے جب میری زبان اور میرا قلم میرے ارادہ سے اخفائے حق میں سعی کرے +

علاوہ بریں غالب کا شعر پست ٹھہرا ہے تو تسلی ایسے بلائے بے درماں کے شعر سے۔ اس کے سوا نہ ایک شعر کا بڑھ جانا کوئی حقیقت رکھتا ہے۔ نہ گھٹ جانا

غالب　　ہوئے مرکے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا　　نہ کبھی جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

لااعلم　　غرقۂ بحر یم مارا در دیار ما مپرس　　لقمۂ کام نہنگیم از مزار ما مپرس

آرگس۔ غالب کے شعر میں جان خیال یہی بات ہے کہ دریا میں ڈوب جاتے نہ تو جنازہ اُٹھتا نہ مزار بنتا۔ دوسرے شعر میں بھی یہی ہے۔ مگر غالب کے یہاں حسرت غرق ہے۔ اور فارسی شعر میں اخبار بعد الغرق +

بیخود۔ حضرت سہا اس شعر کے متعلق خاموش ہیں +

حضرت آرگس کا یہ ارشاد واقعیت سے بے نیاز ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ مرزا غرق ہو جانے کی حسرت کرتا ہے اور کہتا ہے کاش دریا میں ڈوب مرے ہوتے کہ جنازہ نہ اُٹھتا۔ مزار نہ بنتا اور مرنے کے بعد رسوائی نہ ہوتی۔ جنازہ کے اُٹھنے میں انگشت نمائی کا موقع زیادہ ہے۔ اور مزار کا بننا ملامت پائدار کا سبب ہے۔ یعنی نہ جنازہ اُٹھتا۔ نہ انگلیاں اُٹھتیں کہ یہ وہی کم حوصلہ ہے جس نے عشق کی کڑیاں جھیلی نہ گئیں۔ جو مرکے اپنے آپ کو۔ اپنے معشوق کو۔ خود بیچارہ عشق کو بدنام کر گیا۔ مزار نہ بنتا تو لوگ یہ نہ کہہ سکتے کہ یہ وہی ننگ وفا ہے۔ اب جب تک نشان مزار باقی ہے۔ ہم ہیں اور ملامت خلق +

فارسی کا شاعر صرف اپنی مصیبت کی موت کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے میرے شہر میں نہ ڈھونڈو۔ میں گھڑیال کا لقمہ ہو گیا۔ اب مجھے تو کہاں پا سکتا ہے۔ ایک شعر میں اپنی بے نام و نشان کر دینے والی موت کا ماتم ہے۔ دوسرے میں ایسی موت کا ذکر ہے جو مرنے والے کو ہمیشہ کے لئے بدنام کر گئی۔ نہ یہ پہلے شعر کا ہم مضمون ہے نہ ضد نہ جواب۔ خدا کے

بسیر حضرت آرگس کو سو کی جگہ دو آنکھیں دے۔ مگر ایسی جن سے دکھائی دیتا ہو +

غالب ؎   دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر   ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

مُلّا غنیمت ؎   زمہرش بسینہ ام چو لانہ برق   دل ہر ذرہ در جوش انا الشرق

آرگس۔ ذرّہ اور قطرہ۔ انا البحر اور انا الشرق میں کوئی فرق ظاہر نہیں ہوتا +

تنہا۔ دونوں شعر متصوفانہ یا وحدۃ الوجود کے رنگ کے ہیں۔ اس لئے نہ مُلّا غنیمت کا شعر مرجح ہو سکتا ہے نہ غالب کا۔ تاہم یہ فرق بھی موجود ہے کہ مُلّا صاحب افراد و کلیات کی عمومیت بیان کرتے ہیں۔ اور غالب اپنی گرانقدر حقیقت کی طرف ایک توحیدی تمثیل سے اشارہ کرتا ہے +

بیخود۔ مولانا آرگس صاحب سے التماس ہے کہ ذرّہ اور قطرہ انا البحر اور انا الشرق میں فرق نہیں ہے۔ مگر اسے نہ سرقہ کہتے ہیں نہ توارد اسے جواب کہتے ہیں۔ ان اشعار میں تشابہ محمود پایا جاتا ہے +

جناب تنہا کی خدمت میں یہ گذارش ہے کہ اگر دونوں شعروں کی بنا وحدۃ الوجود کے مسئلہ پر ہے تو ان میں سے کسی کو ترجیح کیوں نہیں ہو سکتی: اہلِ دنیا سے نفرت ایک مضمون ہے۔ دو شاعر اس پر قلم اُٹھاتے ہیں۔ ایک کہتا ہے ؎

صدمے ہمیشہ اہلِ جہاں سے اُٹھائے ہیں   اب زندگی کرینگے بسر چارپاؤں میں

دوسرا کہتا ہے ؎

مرا بروز قیامت غمے کہ ہست اینست   کہ روئے مردم دنیا دوبارہ باید دید

پہلا یہ کہکر رُک جاتا ہے کہ ان انسانوں سے تو جانور ہی اچھے۔ اب انہیں میں زندگی بسر کرینگے۔ دوسرا کہتا ہے کہ قیامت کے دن (روز قیامت میں مصیبتوں اور آفتوں کا طوفان جوش مار رہا ہے) مجھے اگر کوئی غم ہے تو یہ کہ اہل دُنیا کا منہ پھر دیکھنا پڑیگا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان دونوں شعروں میں آفتاب اور ذرّہ کی نسبت بھی ہے +

جب ایک ہی مضمون پر بنائے خیال ہوتی ہے تو دیکھا جاتا ہے کہ کس نے کیونکر ادائے مطلب کیا +

مرزا غالب فرماتے ہیں ہر قطرہ کا دل ایک ساز ہے جس سے انا البحر کے نغمے نکلتے ہیں۔ یعنی قطرہ کا دل چیر کر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ وہ ساز کی طرح نغمہ ریزی کر رہا ہے کہ بحر میں ہوں۔ یہانتک مرزا نے جو کچھ کہا ہے اُس میں مُلّا غنیمت کے دونوں مصرعوں سے زیادہ مضمون ہے۔ اس پر اور ترقی کی گئی ہے اور فرمایا ہے کہ ہم کو چشم کم سے نہ دیکھنا ہم اُسکے ہیں ہمارا پوچھنا کیا۔ اور اتنا ہی نہیں کہ غالب صرف اس حقیقت کا اظہار کر رہا ہو بلکہ اُس پر اُسے ناز بھی ہے۔ اور دوسرے مصرع میں جو اترانے کی شان نکلتی ہے وہ بھی اہلِ ذوق سے کچھ کہتی ہے۔ شاہ تراب علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

بھلا ہم کو نصیبوں سے ملا غمخوار ساقی ہے   ہمیں اب مے کی کیا کمتی ہمارا یار ساقی ہے

متصوفانہ رنگ۔ ہم سے یہاں ماسوی اللہ مراد ہے یعنی کسی ذلیل سے ذلیل موجود کو بھی حقارت کی نظر سے نہ دیکھنا اس لئے کہ تعینات کا پردہ اُٹھا دیا جائے تو ہر شے بلکہ ہر ذرّہ وہی ہے +

ایک نازک فرق دونوں شعروں میں یہ بھی ہے کہ مُلّا غنیمت نے مہر (محبت یا وجہ خدا) کی قید لگادی ہے یعنی اُس کی محبت یا اُس کے جلوے کے صدقے میں ہر ذرہ انا الشرق کا دعویٰ کر رہا ہے۔ غالب کوئی قید نہیں لگاتے اور فرماتے ہیں کہ حقیقت ہی یہ ہے کہ ہر شے وہی ہے۔ اور تصوف سے قطع نظر کرلی جائے تو بھی یہ قول اظہر من الشمس ہے۔ اس لئے کہ جب ہر شے کا ظہور اُسی کی قدرت سے ہے اور ہر شے سے اُس کی ہستی نظر آتی ہے۔ تو کسی قید کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ وسعت مضمون کے اعتبار سے غنیمت کے شعر کو غالب کے شعر سے کوئی نسبت نہیں +

سہے یوں کہ اگر مولانا آرگس نے کبھی جلترنگ سُنا ہو تو قطرہ کے ساتھ ساز کا لفظ مزہ دیتا۔ غنیمت نے در جوش انا الشرق کہکر طوفانی کیفیت دکھادی ہے اور مرزا نے ساز انا البحر کہہ کر شعر کو نغمہ کی موجوں میں ڈبو دیا ہے۔ غنیمت نے انا الشرق کہا (میں آفتاب ہوں) غالب نے انا البحر کہا یعنی میں خودمند ہوں۔ دل کی لفظ باطن (حقیقت) کی طرف اشارہ کرتی ہے (متصوفانہ رنگ) ایک باریک فرق یہ بھی ہے کہ مرزا کا پہلا مصرعہ حقیقت یعنی عینیت کے چہرہ سے نقاب اُٹھاتا ہے اور دوسرا مقام ظہور کی صورت سے +

غالب ؎ بلائے جاں ہے غالب اُسکی ہر بات	عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

آمانی ؎ ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم	کرشمہ دامنِ دل میکشد کہ جا اینجاست

آرگس۔ اگرچہ ظاہرا الفاظ میں فرق ہے۔ گر مضمون دونوں ایک ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ غالب نے زیادہ صراحت سے کام لیا ہے +

سہا۔ آرگس صاحب الفاظ اور صراحت کا فرق ہی تو بڑا فرق ہے اور اسی سے شعر توارد و سرقہ کی کمرلفیات سے نکل جاتا ہے +

بیخود۔ خواجہ شیراز فرماتے ہیں کہ معشوق کے سر سے لیکر پاؤں تک جہاں بھی نظر پڑتی ہے ادا دل کے دامن کو کھینچتی ہے کہ ارے ظالم تیری جگہ یہی ہے۔ یعنی معشوق سراپا جمال ہے۔ اُس کی ہر چیز دلکش ہے۔ خواجہ نے ادا کو ذی روح قرار دیکر ایک چلتی پھرتی تصویر دکھادی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ ایسے شعر آیات کمال سے ہوتے ہیں +

اب دیکھنا یہ ہے کہ مرزا بالکل یہی بات کہتا ہے یا کچھ اور +

مرزا کہتا ہے کہ معشوق کی عبارت (گفتگو۔ تقریر۔ تحریر۔ حسن خطاب۔ سوال جواب وغیرہ) یا اشارت (خواہ چشم و ابرو سے ہو خواہ تحریر و تقریر میں) یا ادا ہو۔ ہر بات بلائے جان ہے۔ خواجہ و تناسب اعضا کے ثناخواں ہیں جسے مرزا لفظاً بالکل چھوڑے دیتا ہے۔ مگر سامع کا ذہن اس کمی کو خود پورا کرلیتا ہے یعنی جس کی ہر بات یعنی عبارت اشارت۔ ادا بلائے جان ہو اُس کے باجمال ہونے میں کسی کافر ہی کو شک ہوگا۔ حافظ نے جو کچھ اس مصرعہ میں کہا ہے ع کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست۔ وہ سب غالب نے بلائے جان کے ٹکڑے میں بھر دیا ہے۔ زور کلام مستزاد براں +

باقی آیندہ

بے زبانوں کی زبان

عقل و دانائی کے دعویدار منطقی فلاسفرو! جذبات و فطرت کے چابکدست مصور ادیبو! طبائع انسانی میں ہیجانِ عظیم پیدا کر دینے والی شاعری کے مدعیو! اے مردہ جسموں میں جان ڈال دینے کا اشتہار دینے والے ڈاکٹرو، حکیمو۔ ویدو! اور مصنوعی انسان بنا کر دنیا کو دکھانے والے سائنس دانو! کہاں ہو۔ آؤ میرے سامنے۔ کیا بتا سکتے ہو کہ خدا کی وہ بظاہر بے زبان مخلوق جو بصورت انسان تم میں موجود ہے۔ عالم حیوانی یا بالفاظ دیگر بے زبانی میں کس طرح ہو گئی۔ اور کہ اُن کے حقیقی جذبات و محسوسات عام انسانوں سے کسقدر مختلف واقع ہوئے ہیں۔ اور یہ کہ خدا کی یہ بے زبان مخلوق اپنے اندر کیا کیا جوہر پوشیدہ رکھتی ہے . . . . تم ابتدائے آفرینش سے آجتک خاک چھانتے رہے مگر اُن کا حقیقی جوہر اور اصلیت تم پر ظاہر ہونی پر نہ ہوئی۔ آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ خدا کی اس قابل رحم مخلوق کے حالات کیا ہیں۔ اس کے جذبات و محسوسات کیا ہیں جن سے تم آجتک بےخبر رہے ہو . . . . میں جانتا ہوں تم نے ہزار کوشش کی لاکھ سر پٹکا۔ مگر تم اس کی اصلیت کو نہ جان سکے اور شاید نہ جان سکتے۔ اگر قدرت کا ہاتھ تمہاری دستگیری کر کے مجھے اس طبقہ میں شامل کرتے ہوئے اس کی ترجمانی کی سعادت نہ بخشتا۔ تو ناممکن تھا کہ تم پر اس کی حقیقی عظمت و بزرگی ہوتی اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ قدرت کا علم انسان پر بہت بڑا احسان ہے پھر کیا کیا نعمتیں تم پروردگار اپنے کی جھٹلاؤ گے +

میں جانتا ہوں تم نے بلی کو شیر، شیر کو لومڑی بنا کر اپنی منطقیانہ فلاسفری کا لوہا دنیا سے منوالیا۔ میں آگاہ ہوں کہ تم نے نازک سے نازک جذبات و محسوسات کی تصویر کھینچ کر عالم سے ادب آموز مصور کا خطاب حاصل کیا۔ مجھے علم ہے کہ تم نے مردہ قوموں کو اپنی شاعرانہ لفاظی سے زندہ کر دکھایا۔ میں مانتا ہوں تم نے ایک کا سر کاٹ کر دوسرے کے دھڑ سے جوڑتے ہوئے جانداروں کی ہیئت تبدیل کر دی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم نے زہریلی گیسوں کی ایجاد سے زندہ اور بارونق شہروں کو آناً فاناً میں تباہ اور مردہ کر دینے پر قدرت بہم پہنچائی ہے۔ مگر کیا تم نے اپنے ہم جنس اور بے زبان طبقہ کی ماہیت دریافت کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے؟ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ بے زبان طبقہ جسے تم "گونگا" کہتے ہو شکم مادر سے بے زبان پیدا ہوا ہے۔ یا دنیا میں آنے سے پہلے ہی یہ عارضی بیماری یا نقص ساتھ لایا ہے۔ تو تمہارے علم و دانش پر افسوس ہے یہ تمہاری جہالت و کم علمی کی دلیل ہے۔ تمہارے فہم فراست کا قصور ہے۔ تمہارا یہ خیال حقیقت سے بعید اور اصلیت سے کوسوں دور ہے۔ اور محض بحث بے دلیل اور دعوے بے ثبوت ہے۔ قدرت پہ اتہام ہے جو ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ تمہاری مجرمانہ غفلت ولاپرواہی کا نتیجہ ہے۔ جو اشرف المخلوقات انسان کی شان علمی پر بدنما داغ ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے اس کے دل میں محبت و اخلاص اور دماغ میں عقل و فراست عطا کرنے میں انتہائی فیاضی سے کام لیا ہے +

میں پورے زور سے ڈاکٹروں، حکیموں اور ویدوں کو

چیلنج دیتا ہوں، کہ آجتک دنیا میں کوئی شخص شکمِ مادر سے زبان گنگ اور کان بے سماعت لے کر پیدا نہیں ہوا جیس کسی کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان دنیا میں آنے سے قبل ہی زبان یا کان میں کسی قسم کا نقص لیکر پیدا ہوا ہے۔ اُس کا یہ عقیدہ انتہائی جہالت پر مبنی ہے +

حقیقت یہ ہے کہ پیدائش سے چند منٹ۔ گھنٹے، دن ہفتے یا مہینے کسی کرخت آواز یا شدت بخار سے کانوں سے قوت سماعت زائل ہو جاتی ہے +

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محض قوت سماعت کے چلے جانے سے زبان کیونکر گنگ ہو جاتی ہے۔ یہ ایک آسان امر ہے جو معمولی سمجھ کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے +

انسان گونگا کیونکر ہوتا ہے

بات یہ ہے گونگوں کی زبان پر کوئی عارضہ نہیں ہوتا۔ اُن کی زبان اہلِ زباں سے زیادہ صاف اور رواں ہوتی ہے مگر چونکہ قوت سماعت انسانی آواز کے اُلٹ پھیر کو دماغ تک نہیں پہنچا سکتی، اس لئے اُن کے حافظہ پر کسی قسم کے الفاظ منقش نہیں ہوتے۔ اور وہ قدرتاً الفاظ کے اُلٹ پھیر کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں +

میں اپنے مطلب کو کھلے الفاظ میں ظاہر کرتا ہوں ابتدائے ہوش میں بچے کے سامنے جو الفاظ بولے جاتے ہیں وہ اُس کی قوت سماعت دماغ کے حوالے کرتی ہے اور دماغ حافظہ پر انہیں منقش کرتا جاتا ہے۔ اسی ذخیرہ کو جو حافظہ پر منقش ہوتا ہے ہم زبان کہتے ہیں۔ اور بوقت ضرورت دماغ حافظہ کی مدد سے زبان کو حکم دیتا ہے کہ جو آواز ذہن سے پیدا ہو اُس کو اُلٹ پلٹ کرنے میں دماغ کی مدد کرے تاکہ وہ اپنے تکلم پر اپنا ارادہ اور خواہش ظاہر کر سکے۔ بس اسی مجموعۂ الفاظ کو جو زبان کے اُلٹ پلٹ کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم زبان کہتے ہیں۔ اور چونکہ بچپن کے زمانے میں جبکہ ہوش حواس پیدا نہ ہوئے ہوں اور دماغ نے نشو نما پاکر قوت حافظہ بہم نہ پہنچائی ہو۔ اگر سماعت کی قوت زائل ہو جائے تو حافظہ پہ کوئی الفاظ منقش نہیں ہوتے۔ تو زبان عبث ناکارہ ہو جاتی ہے۔ اور زبان کو ناکارہ کرنے کی تمام تر ذمہ داری کانوں کی قوت سماعت پر ڈالی جاتی ہے۔ اور اگر قوت حافظہ پیدا ہونے یا بالفاظ دیگر ہوش و حواس پیدا ہونے کے بعد قوت سماعت زائل ہو جائے تو اس صورت میں انسان زبان پہ قدرت رکھے گا۔ کہ الفاظ کی اُلٹ پلٹ ادا کر سکے۔ دونوں صورتوں میں زبان ویسی کی ویسی ہوگی +

چونکہ میری اپنی قوت سماعت اُسی وقت زائل ہوئی جبکہ میں عمر کی پانچ منزلیں طے کر چکا تھا۔ نیز اُردو قاعدہ کے الفاظ کے جوڑ سے واقف ہو چکا تھا۔ اور میرے حافظہ پر انسانی آواز کی اُلٹ پھیر جسے الفاظ کہتے ہیں چڑھ چکی تھی۔ لہٰذا یہ نتیجہ ہے کہ میں اپنے مطلب کو آسانی سے ادا کر سکتا ہوں اگر ابتدائے ہوش سے قبل سماعت چلی جاتی تو میں یقیناً گونگوں میں شمار کیا جاتا۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ شاید قدرت نے اس بے زبان طبقہ کی ترجمانی ہی کے لئے اس حکمت سے کام لیا ہے۔ تاکہ دنیا نے جو زبان پر خواہ مخواہ عارضہ کا الزام تھوپ دیا ہے، یہ منور حقیقت اُس پر منکشف ہو جائے +

بے زبانوں کا اخلاص اور محبت باہمی

میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ قدرت نے اس بے زبان طبقہ کو اخلاص اور محبت کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ ایک تصویر جو لاہور کے چند بے زبانوں کی ہے۔ اور جو شاید اسی رسالہ میں شائع ہو رہی ہے جس میں ہندو۔ سکھ۔ عیسائی اور مسلمان سبھی بے زبان ہیں۔ شہر کے مختلف حصوں میں رہتے ہیں۔ باہم بڑا فاصلہ ہے۔ لیکن باوجود اختلاف مذہب و ملت کے یہ

لوگ جب بھی ملتے ہیں۔ بھائیوں کی طرح محبت اور اخلاص باہمی
سے ایسے وقت میں کہ ملک میں فرقہ وار فسادات رونما ہوتے
ہیں۔ ان کے باہمی تعلق میں فرق نہیں آتا +

شاید آپ سوال کریں کہ ان بے زبانوں کو فرقہ دار
فسادات اور ملکی جھگڑوں کا کیا علم۔ آپکا یہ خیال غلط ہے
یہ لوگ ملکی حالت سے بعض اخبار بینوں کی نسبت زیادہ باخبر
ہوتے ہیں۔ آپس میں تبادلۂ خیالات اور نازک سے نازک
جذبات کا اظہار اس خوبی سے کرتے ہیں کہ شاید اپنا مافی الضمیر
ظاہر کرنے کی ایسی قدرت بہت کم دعویداران زبان کو ہوگی
یہ لوگ اشاروں اور کنایوں میں باریک سے باریک بات اس
طرح ایک دوسرے پر ظاہر کر دیتے ہیں کہ آپ لمبی لمبی تقریروں
سے اسقدر مطلب حاصل نہیں کر سکتے۔ جسقدر کہ یہ آپس میں
ایک دوسرے کے ذہن نشین کر دیتے ہیں۔ اور اگر آپ انکی باہمی
باتوں کو سمجھنے کی آپ استعداد رکھتے ہوں تو سنکر ورطۂ
حیرت میں غرق ہو جائیں اور بے اختیار سبحان اللہ اور واہ واہ
کا نعرہ بلند کر دیں +

گونگوں کی دماغی قابلیت کا ثبوت

گونگوں کی دماغی قابلیت کے لئے سب سے پہلے میں
خود آپ کے روبرو پیش ہوتا ہوں۔ باوجود اس کے کہ میں نے
صرف پانچ سال کی عمر میں پہلی جماعت میں ابتدائی قاعدہ پڑھا
اور بعد میں بغیر کسی اُستاد کی مدد کے آج اس قابل ہوں کہ
اچھی یا بُری اردو لکھ کر آپ کے سامنے ادیبانہ طور پر
اپنا مضمون پیش کروں۔ گو نا قابل ہوں مگر معجزہ سے کم نہیں
کہ اپنے مطلب کو آپ کے ذہن نشین کرنے پر قادر ہوں +

اسے بھی جانے دیجئے جن چودہ بے زبانوں کی تصویر
آپ کے روبرو پیش کی گئی ہے۔ ان میں کوئی زرگر ہے۔
کوئی ٹیلر ماسٹر کوئی کچھ، کوئی کچھ۔ مگر سب کے سب اپنے اپنے
ہنر میں یگانۂ روزگار۔ گو مجھے افسوس ہے کہ میری تجارتی
مصروفیت نے کبھی ان بے زبان دوستوں کی محفل سے
لطف اندوز ہونے نہیں دیا۔ مگر یہ محبت کے پتلے ہفتہ میں
دو چار بار میری دوکان پر درشن دے جاتے ہیں۔ اور بسا
اوقات زبان بے زبانی (اشاروں کنایوں) میں گفتگو کرتے
ہوئے زبان دانوں کے لئے باعث تفریح بھی بنا کرتے ہیں
ان ہی بے زبان دوستوں میں میرے عزیز دوست مسٹر
محمد ایوب حسن صاحب برادر حکیم محمد یوسف حسن صاحب ایڈیٹر
نیرنگ خیال بھی ہیں جن کی تصویر انہی چودہ دوستوں میں
شامل ہے۔ تصویر دیکھئے اور لطف اندوز طراوت ہوجئے +

معراج الدین ڈورا

[ہندوستان کے ہر شہر میں گونگے ہیں۔ لیکن لاہور میں
ان لوگوں کے درمیان اس قسم کا اتفاق اور یک جہتی ہے کہ
دوسری جگہ اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ یہ تمام نہایت خوش پوش
اور کاروباری آدمی ہیں تمام دن اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ شام کو
سیر کو نکلتے ہیں تھیئٹر بھی کبھی کبھی جاتے ہیں۔ لیکن سنیما کو بہت
پسند کرتے ہیں۔ آخر وہاں بھی اشارہ و کنایہ سے گفتگو ہوتی ہے
جب پانچ دس خوش پوش گونگے اکٹھے جا رہے ہوں اور آپس
میں اشارہ و کنایہ سے گفتگو کریں تو راہ چلتے لوگ سمجھتے ہیں
کہ یہ گونگے نہیں ہیں۔ بلکہ جان بوجھکر ایسا کر رہے ہیں۔ چند
سال ہوتے چند بدمعاشوں نے ان کو ستانا شروع کیا۔ اس
پر یہ گونگے ایک وفد بنا کر ڈپٹی کمشنر بہادر کے بنگلے پر جا پہنچے
اور کچھ اشارہ کنایہ سے کچھ لکھ کر سمجھایا کہ بعض آدمی انہیں ستاتے
ہیں۔ اس پر ایک ہیڈ کنسٹبل نے جا کر ان لوگوں کو تنبیہ کی۔ یہ
لوگ سیاسیات سے بھی باخبر ہیں۔ گو لیڈروں کی تقریریں
نہ سن سکیں۔ لیکن یہ جانتے ہیں کہ یہ کیا کہتے ہیں۔ لالہ لاجپت رائے
کی وفات پر یہ سب غمگین نظر آتے تھے۔ اور صرف یہ کہتے تھے

کہ ایک بڑا آدمی مرگیا ہے۔ جو ہمارا خیر خواہ تھا ✦

ان لوگوں نے اپنی ایک جدید زبان ایجاد کی ہوئی ہے اس کے علاوہ ان میں سے اکثر لکھنے پڑھنے لگے ہیں۔ وہ قوم لکھ لیتے ہیں اپنا اور اپنے رشتہ داروں کا نام لکھ دیتے ہیں۔ اکثر کھانے پینے کی چیزیں بھی لکھ کر بتلا دیتے ہیں انہیں ایک ایک حرف بڑی محنت سے یاد کرانا پڑا ہے۔ آپس میں خط و کتابت بھی کرتے۔ جب ان کا کوئی دوست باہر چلا جائے تو وہ وہاں سے خطوط بھیجتا ہے۔ جس میں اپنی سیر و سیاحت کا ذکر لکھواتا ہے۔ اور گونگے اشاروں سے اُس کا خط کسی سے سمجھ کر پھر اشاروں سے جواب لکھواتے ہیں۔ خط لکھنے اور خط کا جواب دینے کے بڑے پابند ہیں۔ ہم ملک سراج الدین کے مشکور ہیں کہ اُنہوں نے ان لوگوں کے متعلق ایک مضمون لکھا جو اس کے لئے ہر نوع مستحق تھے ✦

[ایڈیٹر]

فروری کے پرچہ کا انتظار کیجئے

اور مفصل اطلاع شذرات میں ملاحظہ فرمایئے۔ فروری اور مارچ کا عید نمبر یکم مارچ کو عید سے ۱۵ دن قبل شائع ہو جائے گا۔ جس کا حجم نیرنگ خیال کے چار نمبروں کے برابر ہوگا۔ اور جس کی تصاویر کی تعداد ۳۰۔۴۰ کے برابر ہو گی مضامین اور تصاویر نہایت پسند ہوں گی۔ امید ہے کہ آپ اپنا وی پی بھی یکم مارچ کے بعد وصول فرمائیں گے۔ اور اپنے دوست و احباب کو بھی رسالہ کی ترقی اشاعت کے لئے خریدار بنائیں گے

"منیجر"

شیخ الرئیس کے نادر الوجود نسخہ کا انکشاف

آجکل طب یونانی کی بڑی شد ومد سے مخالفت ہو رہی ہے جو لوگ اس کے کرشمہ سے ناواقف ہیں وہ ذیل کے مضمون کا مطالعہ کریں جو رسالہ الحکیم سے پبلک کے فائدہ اور اطلاع کیلئے اقتباس کیا گیا ہے۔

رنگون کے ایک صاحب ثروت سروا کر اسباب نامعلومہ کیوجہ سے ... موذی کا شکار ہو کر بالکل ... ہو گئے تھے۔ مدت تک مشہور و معروف اطبا کا علاج کرایا۔ حسب منشا فائدہ نہ ہوا۔ یہ قاعدہ ہے کہ مایوس العلاج مریض دلیں سے دلیس طریقہ علاج کیطرف مائل ہو جاتا ہے۔ انہوں نے بھی عطائیوں اور اناڑیوں سب ہی کی رجوع کیا۔ اور آخر میں ناکامیاب رہنے پر یہ قصد کر لیا کہ ہندوستان کے تمام مشہور مقامات پر جا کر دعائیں مانگیں اور دوران سفر میں جو فقیر یا طبیب ملے گے ان سے بھی رجوع کریں وہ اپنے اسی دورہ پر تھے کہ اتفاقاً درگاہ حضرت محبوب الٰہی میں مجھ سے شناسائی ہوئی اور یہ معلوم ہونے پر کہ میں طبیب ہوں اپنا حال مجھے سنا دیا اور ایک ٹھنڈا سانس بھر کر چپ ہو رہے۔ مجھ پر انکے طرز بیان کا کچھ ایسا اثر ہوا کہ فوراً علاج کرنیکا وعدہ کر لیا چنانچہ میں نے انکا علاج نہایت محنت اور جانفشانی سے شروع کیا۔ لیکن کچھ فائدہ مرتب نہ ہوا قریب تھا کہ وہ بددل ہو کر واپس چلے جائیں کہ حسن اتفاق سے ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ گوڑگانوہ میں کوئی نذیر احمد صاحب ہیں جن کے پاس مرض کا **نادر نسخہ** موجود ہے لیکن نہ وہ طبیب ہیں نہ صاحب غرض بلکہ گھر کے رئیس اور کھاتے پیتے ہیں۔ نسخہ کسیکو نہیں بتلاتے۔ البتہ اگر کوئی زبردست سفارش لیکر پہنچ جائے تو دوا تیار کر کے دیدیتے ہیں۔ اسقدر تعریف سنکر میں ایک تعارفی خط لیکر سیدھا گوڑگانوہ پہنچا وہ بہت اخلاق سے پیش آئے اور دوا مجھے دیدی میں نے سیٹھ صاحب پر اسکا استعمال شروع کر دیا۔ **سیٹھ صاحب کی قوت حیرت انگیز طور پر ترقی** کر گئی اور اسقدر **طاقت** پیدا ہوئی کہ بیان سے باہر ہے اور میں نے اسکو متعدد مریضوں پر مختلف حالات میں آزمانے پر بھی ہمیشہ تیر بہدف پایا۔ یقیناً میرے علم میں ایسا پُر اثر نسخہ کسی دوسرے شخص کے پاس نہیں ہے۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا کہ یہ نسخہ **بوعلی سینا** کی خاص دماغی کوششوں کا نتیجہ ہے جو کسی بادشاہ کیلئے تجویز کیا گیا تھا اور یہ ایک **معمولی لوح** پر کندہ ہے جو اس [illegible] سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے اسلئے میری یہ استدعا بیجا نہ ہوگی کہ ایسے صاحب کمال کے اس نسخہ کو "الحکیم" میں شائع کر کے تمام اطبا ہند کو [illegible] کا موقعہ دیں۔ (خادم الاطبا مسعود الرحمن)

ایڈیٹر صاحب الحکیم کا نوٹ

یہ مکتوب کوئی دو تین ماہ ہوئے ہمارے پاس پہنچا تھا لیکن اشاعت سے قبل ہم نے ان واقعات کی مزید تحقیق کیلئے اپنے کرمفرما خان بہادر ملک سردار علی صاحب کو تکلیف دی جو حسن اتفاق سے آجکل گوڑگانوہ میں قیام پذیر ہیں چنانچہ صاحب موصوف کا جو جواب ہمیں موصول ہوا ہے درج ذیل ہے:-

مکرمی جناب حکیم صاحب السلام علیکم میں کل نذیر احمد قریشی سے ملا تھا وہ حکیم نہیں ہیں۔ مولوی برکت علی صاحب وکیل لاہوری کے فرزند ہیں۔ **انکے پاس واقعی قوت کا ایک عجیب نسخہ ہے۔**

تابعدار سردار علی ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولس۔ مارچ ۱۹۲۸ء

نوٹ:- یہ دوا پبلک کی فرمائش سے بارہا تیار ہو چکی ہے۔ چونکہ اس نسخہ کے اجزا بہت مشکل سے فراہم ہوتے ہیں اسلئے اس دفعہ بھی صرف ننو اشخاص کے لئے دوا تیار کی جا رہی ہے جس میں سے بہت سے نام رجسٹر ہو چکے ہیں۔ ضرورتمند اصحاب قیمت **جلد** روانہ کر کے اپنا نام رجسٹر کرا لیں۔

قیمت:- اکسیر سینا پانچ روپیہ۔ طلا سینا پانچ روپے محصول ڈاک وغیرہ بذمہ خریدار چھ آنہ (۶/)

ملنے کا پتہ

نذیر احمد قریشی صیغہ (د) برکت منزل گوڑگانوہ (پنجاب)

شذرات

نیرنگ خیال کے نئے سال کا پروگرام

الحمد للہ کہ آج نیرنگ خیال نے پانچویں سال میں قدم رکھا ہے۔ اور ہم نے اس سال کا جو پروگرام مرتب کیا ہے۔ وہ ناظرین نیرنگ خیال کے پیش کر رہا ہوں:۔

جنوری نیرنگ خیال	تصاویر	فوٹو	میزان تصاویر	صفحات مضامین
	آرٹ ۴	۲	۶	۶۴
فروری و مارچ	" ۱۲ یکرنگی ۴	۱۶	۳۲	۱۵۰

[عید نمبر خریداروں کو بطور فروری مارچ کے رسالہ کے ملیگا یعنی انہیں قریباً ۸ ۔ر میں وصول ہوگا۔ باقی غیر خریداروں کو ایک روپیہ میں ملیگا۔ علاوہ محصول ڈاک۔ اس طرح سے خریداروں کو ۸ ر کی رعایت رہیگی]

	تصاویر	فوٹو	میزان تصاویر	صفحات مضامین
اپریل	۳	۳	۶	۵۶
مئی	۴	۲	۶	۵۶
جون	۴	۲	۶	۵۶
جولائی	۴	۳	۷	۶۴
اگست	۴	۳	۷	۵۶
ستمبر	۴	۳	۷	۵۶
اکتوبر	۴	۳	۷	۵۶
نومبر	۴	۳	۷	۵۶
دسمبر	۴	۴	۸	۶۴
میزان	۵۵	۴۴	۹۹	۷۳۴

وقتِ ضرورت صفحات میں اضافہ بھی ہوگا۔ اور کبھی کبھی دو رنگی یا سہ رنگی تصاویر بھی شایع ہو سکینگی حسب دستور ایک رسالہ بھی ویسے شایع نہیں ہوگا۔ اب آپ ہی اندازہ لگائیے کہ سوا تین روپے چندہ میں ہم نے اتنے بڑے سائز پر اتنے زیادہ مضامین اور اتنی زیادہ تصاویر آپ کے پیش کرنی ہیں۔ اور اس میں " زیادتی " ہی کی خوبی نہیں۔ بلکہ تصاویر او مضامین دونوں بشوق اور اعلیٰ ترین ہونگے۔ یقین کیجئے کہ سوا تین روپے کی قلیل رقم جس میں سے ڈاک ٹکٹ ۸ر کے خرچ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے اخراجات کو مشکل سے پورا کر رہی ہے۔ مالی مشکلات اور نقصانات ہمیں ہمیشہ چندہ بڑھا دینے پر مجبور

اطلاع ۔ کریمی پریس لاہور کے نئے سال کا کیلنڈر رنگین تین آنہ کے ٹکٹ آنے پر مفت ارسال خدمت ہوگا (مینجر)

کرتے ہیں۔ لیکن ہم نہیں چاہتے کہ اپنی خوبیوں میں سے "ارزانی" کی خوبی کو ضایع کردیں +

"عظیم اخراجات جن کی تعداد پندرہ ہزار روپیہ سالانہ کے قریب ہے اس میں اگر اس رقم کو بھی شامل کرلیا جائے جو ہر ماہ ڈیڑھ دو سو رسایل ناظرین کو دوبارہ بھیجنے کی صورت میں اٹھانی پڑتی ہے۔ نیز وی۔ پی کی واپسی سے جو ٹکٹوں کا نقصان ہوتا ہے۔ تو ہم موجودہ اشاعت میں آمد وخرچ کی میزان کو بمشکل برابر رکھ سکتے ہیں +

ہماری آرزو ہے بلکہ التجا ہے کہ ناظرین نیرنگ خیال ایک بار پھر از سر نو توسیع اشاعت کی کوشش کریں۔ دسمبر میں ہم نے جب آپ کو توجہ دلائی تھی تو اکثر احباب نے توجہ فرمائی اور خریدار بھجوائے۔ امید ہے کہ جن احباب نے ابھی توجہ نہیں فرمائی۔ یا جن کا حلقہ اثر بہت وسیع ہے۔ وہ توسیع اشاعت میں زیادہ سرگرمی سے کام لینگے +

نیرنگ خیال کا خاص نمبر یعنی عید نمبر

ہم کوشش کر رہے ہیں کہ امسال نیرنگ خیال عید نمبر جدید خوبیوں سے آراستہ کیا جائے۔ انشاءاللہ آپ اس عید نمبر کو بہترین مضامین اور اعلیٰ ترین تصاویر کی البم پائینگے۔ اگر آپ بازار سے اچھی سے اچھی کتاب بھی سوا تین روپے میں خرید فرمائیں تو اسکیلئے ہمارے عید نمبر کا کسی پہلو سے بھی مقابلہ نہ کرسکیگی۔ اس لئے جو اصحاب عید نمبر سے خریدار ہوئے تھے وہ عید نمبر کے وی پی کو ضرور بالضرور وصول فرماکر ہماری اعانت اور سرپرستی کا سلسلہ جاری رکھیں۔ اور باقی خریدار نئے نئے خریدار بنائیں اور انہیں بتلائیں کہ سوا تین روپیہ میں عید نمبر بھی ملیگا۔ جو تنہا دس، روپے کی کتابوں سے بہتر ہوگا +

عید نمبر پندرہ روز قبل شایع ہوگا

گذشتہ سال بھی عید نمبر جنوری اور فروری کا مشترکہ نمبر تھا۔ جو ۲۰ مارچ کو شایع ہوا تھا۔ اس لئے ہم یکم اپریل کو نیا رسالہ نہ نکال سکے۔ اور ہمیں مجبوراً اپریل مئی کا رسالہ یکجا شایع کرنا پڑا۔ اگرچہ ہم نے حجم اور تصاویر میں اضافہ کردیا تھا مگر ہمارے مشتاق ناظرین جو ایک ماہ کا انتظار نہیں کرسکتے۔ اس سے ناراض ہوئے تھے۔ وہ نہیں چاہتے کہ نیرنگ خیال انہیں کبھی لمبے وقفے سے ملے۔ اس لئے امسال یہی تجویز کیا گیا ہے کہ عید نمبر عید سے پندرہ روز قبل یکم مارچ کو شایع ہوجائے۔ اس سے کئی فواید ہیں مثلاً (۱) ہر شخص کو وی پی یکم تاریخ کے بعد مل جائیگا۔ (۲) عید نمبر عید سے قبل ہر شخص کے ہاتھ میں ہوگا۔ (۳) آپ نہایت آسانی کے ساتھ زاید پرچے خرید کر اپنے دوستوں کو تحفہ بھیج سکینگے (۴) ہمیں نیرنگ خیال کا کوئی اور نمبر مشترکہ شایع نہیں کرنا پڑیگا۔ اور یکم اپریل کا رسالہ وقت پر شایع ہوجائیگا +

اس لئے یکم فروری کو کسی رسالہ کا انتظار نہ کیجئے۔ بلکہ یکم مارچ کو ٹھیک عید سے ہفتہ دو ہفتہ قبل عید نمبر وصول کیجئے جسکے متعلق ہم صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اپنا پورا زور لگادیا ہے اور پانچ ہزار کی گرانقدار رقم اس کے لئے وقف کردی ہے۔ آپ عید نمبر کو دیکھ کر محو حیرت رہ جائیں گے۔ انشاءاللہ تعالیٰ

عید نمبر میں اشتہار دیجئے

مشتہرین سے گذارش ہے کہ وہ عید نمبر میں اشتہار دیکر فائدہ اٹھائیں۔ ارادہ ہے کہ عید نمبر چھ سات ہزار شایع کیا جائے۔ اُجرت فی صفحہ ۱۶ روپیہ۔ نصف صفحہ ۸ روپیہ ہوگی اس سے ارزاں موقع اشتہار دینے کا پھر کبھی حاصل نہ ہوگا۔ اور یہ اشتہار برسوں تک آپ کی تجارت کو فروغ دینے کا باعث ہوگا۔

کچھ سالنامہ کی نسبت

سالنامہ کی نسبت گذشتہ نمبروں میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس کے بعد سالنامہ پبلک کے ہاتھوں میں پہنچ گیا ہے۔ جن اصحاب نے آرڈر درج کرائے تھے اُن کے نام ۱۰ سے ۲۰ جنوری تک سالنامہ بذریعہ رجسٹرڈ وی پی روانہ ہوتا رہا۔ کسی دن دو سو کسی دن تین سو کسی دن ایک سو۔ جن اصحاب کو وی پی نہ ملا ہو وہ سمجھ لیں کہ اُن کا خط دفتر تک نہیں پہنچا۔ اس لئے وہ دوبارہ اطلاع دیں تاکہ سالنامہ اُن کی خدمت میں بھیجا جائے۔

سالنامہ کسقدر مقبول ہوا ہے۔ اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ اچھی چیز سبھی پسند کرتے ہیں۔ سالنامہ کے لئے ایجنٹوں اور خریداروں کے جسقدر تار دفتر میں موصول ہوئے ہیں وہ اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ سالنامہ کسقدر پسند کیا گیا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے اتنی رقم صرف کرنے اور اتنی محنت کے بعد اپنے لئے منافع اسقدر کم رکھا کہ ہم اخبار فروش ایجنٹوں جتنا منافع بھی حاصل نہیں کر سکے۔ اگر ہزار دو ہزار زاید چھاپ لیتے تو ہمیں مالی طور پر بھی سالنامہ سے کافی فائدہ حاصل ہوتا۔ بہر حال یار زندہ صحبت باقی۔ اگلے سال سہی +

موجودہ صورت یہ ہے کہ ہمارے پاس صرف ۱/۴ حصہ سالنامہ کا رہ گیا ہے جس کے متعلق اُمید ہے کہ وہ چند ہی دنوں میں فروخت ہو جائیگا۔ اس لئے ہم آج اعلان کرتے ہیں کہ جو اصحاب ۳۱ جنوری تک سالنامہ طلب نہیں فرمائینگے۔ اُن کو دو روپے علاوہ محصول ڈاک میں ملیگا۔ خواہ وہ صاحب نیرنگ خیال کے خریدار ہی کیوں نہ ہوں۔ گذشتہ سالنامہ کی قیمت پانچ روپے کر دی گئی ہے۔ جس کی دفتر میں اب صرف ۲۰ کاپیاں محفوظ پڑی ہیں +

عید نمبر کیلئے مضامین

جو صاحب عید نمبر کے لئے کچھ لکھنا چاہتے ہوں وہ ۱۵-۲۰ جنوری تک اپنا مضمون دفتر میں بھیج دیں۔ مشکور ہونگا +

ناظرین نیرنگ خیال مندرجہ ذیل باتوں کو ہمیشہ یاد رکھیں :-

(۱) ہم پابند قواعد ہیں آپ بھی قواعد کی پابندی کیجئے۔ (۲) نیرنگ خیال آپکا اپنا رسالہ ہے۔ (۳) نیرنگ خیال کا وی پی ہمیشہ وصول فرمائیے۔ (۴) نیرنگ خیال کی اشاعت بڑھانے کا ہمیشہ خیال رکھئے۔ (۵) نیرنگ خیال کی بہتری اور اصلاح کیلئے ہمیشہ اپنے مشوروں سے مستفید فرماتے رہیئے۔ جو اصحاب ہمیں مشورہ دیتے ہیں ہم اُن کے ارشادات پر ہمیشہ غور کرتے ہیں +

ناول ثریا

محترمہ نذر سجاد حیدر صاحبہ کا ناول ثریا نیرنگ خیال کی متعدد اشاعتوں میں شایع ہوتا رہا ہے۔ اور اس دلچسپی سے پڑھا جاتا رہا ہے کہ جب اس کی اشاعت میں تویق ہو جاتی ہے تو ناظرین گھبرا اُٹھتے ہیں۔ لیکن اس طرح سے ایک اچھے ناول کو شایع کرنا اُس کی مٹی پلید کرنا ہے۔ اس لئے ہم نے ارادہ کر لیا ہے کہ اُس کو علیحدہ کتابی صورت میں شایع کر دیا جائے۔ اور ناظرین نیرنگ خیال کو رعایتی قیمت پر دیا جائے۔ اس کے لئے نیرنگ خیال کی آیندہ اشاعت کا انتظار کیجئے +

سالنامہ آج ہی منگوا لیجئے۔ اور اپنے دوستوں کو بھی توجہ دلائیے۔ ورنہ بعد میں یہ نمبر نہ مل سکیگا۔ - منیجر

مطبوعہ لریمی پریس لاہور۔ بزدکونوالی قدیم باہتمام میر قدرت اللہ پرنٹر۔ حکیم محمد یوسف حسن پبلشر نے دفتر نیرنگ خیال لاہور سے شایع کیا

حیرت انگیز رعایت
مضبوط پائیدار تین گھڑیاں صرف دس روپے میں
آپ کے لئے • آپکے گروہ کے لئے • بیوی کے لئے
ملنے کا پتہ: امریکن واچ ہوس اشاکسٹ ویسٹ اینڈ واچ کمپنی مقام دہلی

بیسویں صدی کی بہترین ایجاد

گلفام۔ گل اندام

گورے صاف خوبصورت بننے کیلئے اور چہرے کے داغ دھبے کیل چھائیاں دور کرنیکے لئے یہ ایک کامیاب ترین ایجاد ہے۔ اسکے استعمال سے چہرے کی تمام چھائیاں دور ہو کر گلاب کی پتی کی طرح نرم اور خوبصورت نکل آتا ہے۔ رنگت کی سیاہی اسقدر سفیدی اور سرخی میں بدل جاتی ہے۔ چہرہ کی جھریاں اور داغ دھبے اسطرح غائب ہو جاتے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔ خوشبو اسقدر کہ پسینہ سے بھی کستوری اور عنبر کی خوشبو نکلنے لگتی ہے۔ یورپ کے تیار شدہ صابن اور پریس پوڈر اور سفارے اس کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔ ہندوستان میں جسقدر اشیا اس قسم کی فروخت ہو رہی ہیں وہ اس قدر ناقص اور بدنما ہیں کہ معززین اور شرفا انہیں استعمال نہیں کرتے۔ نیز ایک ہی دوا عورت اور مرد کے لئے مفید ثابت نہیں ہوسکتی۔ دونوں میں عظیم فرق ہے۔ اس لئے ہم نے مردوں کے **گلفام** اور عورتوں کیلئے گل اندام کے نام سے دوائیں تیار کی ہیں۔ عورتوں کی دوا بچے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ خوبصورتی کی چیز ہر گھر میں موجود ہونی چاہیئے۔ فضول اور ناکارہ چیزیں استعمال کرکے اپنے چہرہ کو نہ بگاڑیئے۔

قیمت گل اندام عمہ گلفام عمہ اسکے علاوہ بال اڑانے کی بہترین دوائی فی شیشی عمہ سرمہ نورانی عمہ شمیم ہیر آئل فی شیشی عمہ یاسمین ہیر آئل فی شیشی عمہ۔ محصولڈاک علاوہ

ملنے کا پتہ

دانش پرفیومری کمپنی شاخ، سنہری منڈی

گوجرانوالہ

تازیانہ

حیرت انگیز مقبولیت

تازیانہ کا پہلا اور دوسرا نمبر ایک ایک ہزار شائع ہوا تھا۔ تیسرا نمبر ۲ ہزار شائع ہوا۔ لیکن اب یہ اشاعتی چھپ رہا ہے۔ اور یہی اس کی مقبولیت کی روشن دلیل ہے۔ اس کی توسیع اشاعت میں قدردانِ نیرنگ خیال کا بہت زیادہ حصہ ہے۔ ہر ڈاک میں خریداروں کی درخواستیں چلی آتی ہیں۔ جو شخص ایکدفعہ خریدار ہو چکا ہے وہ مزید خریدار بھجوا رہا ہے۔ ہر ہفتہ علمی۔ ادبی۔ تاریخی۔ سیاسی مضامین ہوتے ہیں۔ نظموں۔ کارٹونوں۔ اور مزاحیہ مضامین کے علاوہ ہر نمبر میں ایک دلچسپ افسانہ بھی ہوتا ہے۔ چندہ سالانہ صرف چار روپے۔ آج ہی درخواست بھیج دیجئے۔

منیجر تازیانہ دفتر نیرنگ خیال [illegible]

لاہور

سب اشیاء کی یکجائی قیمت صرف دس روپے ۱۰/
نوٹ نمبر (۱)
نوٹ نمبر (۲)
ملنے کا پتہ چیپ واچ ہاؤس اجمیری گیٹ دہلی

تصانیف و تراجم پروفیسر فضل الرحمٰن صاحب

(پروفیسر طبیہ کالج دہلی)

یونانی کتابیں اردو

تشخیص عملی معہ مطب یونانی و ڈاکٹری: تشخیص کا جدید ترین اصول بہترین یونانی مطب معہ مجربات ڈاکٹری مطب اور بیتا لوں کے مجربات کا بے بہا خزانہ اسکی خوبی اس سے ظاہر ہے کہ چند ماہ میں پہلا ایڈیشن قریب الختم ہے۔ قیمت عہ

مجربات مسیح الملک کی جد امجد کے مجربات اور ان عظیم الشان طبی مدارس کے اصول علاج اور اکسیر الاثر مرکبات مردوں اور عورتوں کے مخصوص امراض کے علاوہ سر سے پیر تک تمام بیماریوں کی بہترین مجربات قیمت ستہ

دہلی کے مشہور اطبا کا مطب: اس سے بہتر یونانی مطب کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا میں طب یونانی کا مرکز دہلی ہے۔ اور دہلی کے نامور طبیبوں کا مطب ہے کتابی صورت میں عہ

ڈاکٹری کتابوں کے اردو ترجمے

فن الولادت یعنی علم القابلہ (مڈوائفری) کتاب حاملہ۔ زچہ۔ بچہ وضع حمل کے متعلق امراض کے علاج و تدابیر ڈاکٹری کی مستند اور جدید ترین کتابوں سے منتخب کر کے لکھے گئے ہیں صاحب طبیہ کالج دہلی کی تعلیمی سب کمیٹی نے مدرسہ زنانہ اور طبیہ کالج کے کورس کیلئے تالیف کرایا ہے۔ اور جس کی پانچ سو جلدیں طبیہ کالج دہلی نے خرید کی ہیں۔ یہ کتاب دیگر گورنمنٹ طبی و یونانی کالجوں و اسکولوں کے نصاب میں بھی داخل ہے۔ صفحات ۳۰۰ تصویریں ۲۷۵ قیمت بلا جلد ۲ روپے مجلد ۲ روپے بارہ آنہ

کتاب اباتولوجیا یعنی ڈاکٹری پیتھالوجی: کا ترجمہ بیماریوں کی حقیقت اور ماہیت جدید سائنس نے جو خوردبین اور کیمسٹری کی مدد سے مشاہدہ کی ہیں وہ اس میں بیان کی گئی ہیں یہ کتاب طبیہ کالج دہلی گورنمنٹ طبی سکول لکھنؤ اور گورنمنٹ طبی اسکول پٹنہ کے کورس میں ہے۔

اور طبیہ کالج دہلی نے اسکی پانسو جلدیں خرید کی ہیں قیمت عہ

کتاب الکیمیا: (ترجمہ جدید کیمسٹری) یہ بھی طبیہ کالج دہلی اور گورنمنٹ طبی سکول پٹنہ کے کورس میں ہے اس کی بھی پانچ سو جلدیں طبیہ کالج دہلی نے خرید کی ہیں۔ کیمسٹری پر نہایت آسان کتاب ہے۔ قیمت عہ

طب قانونی: (ترجمہ میڈیکل جورس پروڈنس) اس کتاب کو پڑھ کر طبیب اور وید عدالت میں گواہی دینا زخمیوں اور بیماروں کو سرٹیفکیٹ دینا سیکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ اب بہت جلد طبیبوں اور ویدوں کو گورنمنٹ یہ حقوق ملنے والے ہیں جو ڈاکٹروں کو ملے ہیں اسلئے یہ کتاب طبیب اور وید کیلئے ضروری ہے قیمت چار روپے

استقصار البول: (قارورہ کا ڈاکٹری امتحان) اگر کوئی طبیب اور وید قارورہ کا امتحان کرنا چاہیں اس کتاب سے مدد لیں تو اسکو ان بیماریوں کی تشخیص میں کچھ دقت بھی نہ ہوگی جن کا پتہ امتحان کیمیاوی سے لگتا ہے

ہومیوپیتھی کی کتابیں

ہومیوپیتھی کی بہترین کتاب: (مینول سے اقتباس) کا اردو ترجمہ انگلستان کے مشہور ہومیوپیتھ ڈاکٹر ہوجز کی اس کتاب کا ترجمہ ہے جو آجکل نہیں ملتی یہ کتاب اتفاق سے ڈاکٹر حبیب الرحمان خاں مرحوم پرنسپل کے پاس سے ملی تھی یہ ایک کا ترجمہ ہے۔ اصل انگریزی کتاب کی قیمت ۱۰ روپے ہے اور اس ترجمہ کی قیمت صرف عہ

نوٹ:- ان کے علاوہ ہر قسم کی یونانی۔ ڈاکٹری۔ ہومیوپیتھی کی اردو عربی۔ اور انگریزی کتابیں اور طبیہ کالج دہلی کے کورس کی کتابیں

ملنے کا پتہ:- منیجر طبی دار الترجمہ باڑہ ہندو راؤ کچا باغ دہلی

تیرہ ضخیم جلدیں چار ہزار صفحات

جلد اول - تین حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول شاعرانہ و عاشقانہ مضامین ضخامت ۲۹۴ صفحات قیمت عہ حصہ دوم ۱۹۱ صفحے قیمت ۸ تیسرا حصہ ۱۸۹ صفحے قیمت عہ۔ **جلد دوم** - تاریخی و جغرافیائی مضامین یہ جلد دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول ضخامت ۴۰۸ صفحے قیمت عہ حصہ دوسرا ۲۶۲ صفحے قیمت عہ **جلد سوم** - اس جلد میں نامور مردوں اور عورتوں کے سوانح حیات درج ہیں۔ یہ جلد بھی تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ نامور مردوں کی سوانح حیات کیلئے وقف ہے۔ حجم ۲۵۴ صفحے قیمت ہے۔ بقیہ دو حصوں میں نامور عورتوں کی سیرتیں درج ہیں۔ ان میں سے اول کی ضخامت ۲۵۰ صفحے قیمت عہ دوسرا حصہ قیمت عہ **جلد چہارم** - ادبی مضامین ضخامت ۲۴۸ صفحے قیمت عہ **جلد پنجم** - اصلاح قوم ۲۷۶ صفحے قیمت عہ **جلد ششم** - تاریخی واقعات پر خیال آرائی ۲۴۰ صفحے قیمت عہ **جلد ہفتم** - ۲۷۶ صفحے قیمت عہ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ - قیمت عہ

سیرۃ احمدی حصہ اول - حصہ دوم - حصہ سوم - مختصر تاریخ اسلامی حصہ اول - دوم - سوم - چہارم

ذکر فتح اندلس - من کی موج - صبح وطن - بے گناہ مجرم - سیرۃ النعمان قسم اول - قسم دوم

نیلا بیگم عہ سوز عہ حسرت عہ آہ عہ آئینہ روزگار عہ واہ عہ گلبدن ۱۲ سرخ حرف عہ مکافات عمل ۱۲

ملنے کا پتہ

گیلانی بکڈپو ہسپتال روڈ لاہور

وکٹوریہ پریس لوامنڈی لاہور میں چھپا

نیرنگِ خیال

قیمت پانچ آنہ

Copies 5,250

نیرنگِ خیال ہندوستان بھر کے علمی ادبی رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

تعدادِ اشاعت ۵۲۵۰

جلد ۹ | نمبر ۵

فہرستِ مضامین

بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۲۹ء

قیمت فی پرچہ پانچ آنہ
ویلیو پے ایبل پارسل پرچہ آنہ

قیمت سالانہ بذریعہ وی پی معہ محصولڈاک تین روپے
ممالک غیر سے ۸ شلنگ

کریمی پریس لاہور میں باہتمام میر قدرت اللہ پرنٹر چھپا اور (۲۶۳) حکیم محمد یوسف حسن پبلشر نے دفتر نیرنگِ خیال ... لاہور سے شائع کیا

شذرات

کلکتہ والوں کے حق میں چند کلمات

کہتے ہیں کہ فتنہ زمین پر سے نہیں بلکہ گذشتہ عید نمبر کی طباعت اور اشاعت کے موقعہ پر ہمیں اس قول کی قدر و قیمت بخوبی معلوم ہو گئی۔

بدقسمتی سے ہم نے عید نمبر کے و بلاکس کی تصاویر کا کلکتہ میں بلاکس بننے اور چھپنے کا انتظام کیا اور قریباً ڈیڑھ دو ماہ قبل وہ مختلف چھاپہ خانوں کو یہ کام دیکر انہیں وقت پر تصاویر بھیجنے کی تاکید کی +

لیکن ہماری حالت کا اندازہ اس وقت لگانا چاہئے تھا جب یکم مارچ کو نیرنگ خیال عید نمبر تمام و کمال مکمل پڑا تھا اور ہم ان دو تصویروں کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے۔ اگر عصہ آتا تو بانتار گلہ دوڑے جاتے۔ تھے یا ہمت ہار کر کرسی پر دراز ہو جاتے +

بڑی تگ و دو اور کوشش کے بعد ۵ تاریخ کو تصویریں پہنچیں۔ اس پر دفتریوں نے اتنے بڑے رسالہ کو بنانے میں کئی دن صرف کر ڈالے۔ جوں جوں رسالہ آتا رہا ہم اسے روانہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ ۱۸ تاریخ تک جاری رہا +

کلکتہ والوں کی ستم ظریفی یہاں پر ہی ختم نہیں ہو گئی تھی بلکہ ایک تصویر تعدادی ۱۰۰ الکم وصول ہوئی تھی جو تا دم تحریر نہیں پہنچی۔ (۲۲ مارچ سنہ) اس کا انتظار ہو رہا ہے۔ امروز فردا پہنچنے کی امید ہے جب تک تصویریں نہ پہنچیں ہم بعض ایجنٹوں، بک کمپنی اور بقایا ۵۰-۶۰ خریداروں کی مانگ کو پورا نہیں کر سکتے +

۵ مارچ سے لیکر ۱۵ مارچ بلکہ ۱۸ مارچ تک نیرنگ خیال کی ہر ڈاک میں ۲۰-۴۰ خطوط شکایتی الفاظ سے بھرے ہوئے پہنچتے تھے شکایتیں بھی تھیں۔ شکوک بھی۔ نوٹس بھی۔ گالیاں بھی۔ اور یہ سب کچھ ہم کلکتہ والوں کی بدمعاملگی کے طفیل برداشت کرنے پر مجبور تھے۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ اور تعداد الرکے کل پرسوں سے اب ۰۰ ڈاک آنی شروع ہوئی ہے جس کے انتظار میں ہر صاحب ہمت "ایڈیٹر کی آنکھیں شیم براہ ہوتی ہیں۔ اب تعریفیں ہیں اتنی تعریفیں کہ نیرنگ خیال کے تلخ گذشتہ عید نمبر انہیں مات نظر آتے ہیں۔" ہندوستان بھر میں لاجواب اور بےمثل عید نمبر کی اشاعت پر مبارکباد دیتے "عید نمبر کو دیکھ کر آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہوا" "چاہتا ہوں کہ عید نمبر کو دل میں رکھ لوں" "... بات درست نکلی" "عید نمبر دیر سے پہنچا مگر اتنا اچھا کہ تعریف سے باہر ہے" "خدا کی قسم یہی ایک عید نمبر تو تین روپے میں ارزاں ہے" "آپ نے دکھلا دیا کہ عید نمبر اس کو کہتے ہیں ... زیب اور نظر فریب ... دل ... ہوں۔ سیاہ اس سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے" "عید پر عید نمبر نہ ملا۔ عید افسردگی میں گزر گئی لیکن اب جو عید نمبر پہنچا تو ایک نئی عید کی خوشی حاصل ہوئی"۔

اردو رسائل کو اس شان تک پہنچانا آپکا ہی کام ہے۔ ہماری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

اور اس پر ہی بس نہیں ہمارے کرمفرما ان تعریفوں کے ساتھ نئے خریدار بھی بھیج رہے ہیں۔ اس وقت آٹھ دس کی روزانہ اوسط ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس مہینہ میں کم از کم تین سو نئے خریدار بن جائینگے لیکن اسکے ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہمارے پانچہزار ناظرین میں سے صرف تین چار سو اصحاب نے ہماری محنت۔ کوشش۔ مالی قربانی کا خیال کرتے ہی اس طرف توجہ فرمائی۔ کیا باقی خریداروں کے فرائض میں یہ بات داخل نہیں۔ میں آج مجبور ہو کر آپکو توجہ دلاتا ہوں۔ پھر توجہ دلاتا ہوں۔ ہر خریدار سے کم از کم ایک خریدار چاہتا ہوں۔ کیا آپ میری درخواست پر اتنی سی کوشش نہ کرینگے میں آپ کے خطوط کا چشم براہ ہوں۔

خاکسار محمد یوسف حسن ایڈیٹر نیرنگ خیال

نیرنگ خیال کی خوبیوں میں اضافہ

نیرنگ خیال کی کتابت اور طباعت میں مزید خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں انشاء اللہ آیندہ نمبر سے یہ زیادہ دیدہ زیب ہو جائیگا۔ اور مضامین تو اس قسم کے اور ایسے ایسے ادیبوں کے فراہم ہو گئے ہیں کہ آپ انہیں پڑھ کر مسرت سے جھومنے لگیں گے۔ نیرنگ خیال جس قسم کے افسانے شائع کرتا ہے اسکے لئے **دنیا بھر** کے رسایل اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس ذخیرہ میں اب اور اضافہ ہوا ہے۔ اور آپ دیکھیں گے کہ کس پایہ کے افسانے شایع ہونگے۔ علمی ادبی اور تاریخی مضامین سیر و سیاحت۔ متفرق معلومات کا ایک لاجواب ذخیرہ فراہم کیا گیا اور مزاحیہ مضامین جو نیرنگ خیال کی خصوصیت رہی ہے وہ اس کثرت سے لکھوائے گئے ہیں کہ انشاء اللہ یہ نمبر ان سے مزین ہونگے ہم نیرنگ خیال کو بہتر سے بہتر بنانے میں ساعی ہیں۔ اور اس کے لیے ہر قسم کی قربانی ملحوظ رکھتے ہیں۔ ابھی ابھی فیصلہ کیا کہ ہم لاہور سے دہلی۔ کانپور اور کلکتہ تک چلے جائیں اور ملک کے بہترین ادیبوں سے ملیں انہیں نیرنگ خیال کے لئے مخصوص کر لیں۔ چنانچہ ایڈیٹر نیرنگ خیال یہاں سے ۲۶ تاریخ کو روانہ ہو جائیں گے۔ امید غالب ہے کہ نیرنگ خیال کے مقاصد کو بلند تر بنانے میں کامیاب ہونگے۔

اس سفر کی سب سے بڑی غایت

نیرنگ خیال کے [illegible] سالنامہ کو مرتب کرنا ہے۔ ہمارے سالنامہ والا نمبر کل ہے وہ [illegible] اور اتنا لاجواب ہے کہ ہم اس کا تصور کرتے ہی جھومنے لگتے ہیں خداوند تعالیٰ کا فضل شامل حال رہا اور ہمارے مہربانوں اور مددگاروں نے میری اعانت کی تو میں اس وجہ سے لازم میں ایک ایسا نمبر پیش کرونگا جو ہر حالت میں مغربی رسائل کا مقابلہ کر سکیگا۔ گذشتہ سال سالنامہ استقدر ترقی اور گرانمایہ تھا کہ اس نے رسائل کے خاص نمبروں کو پیچھے کر دیا اور صرف ۲۲ دن میں تمام کا تمام نمبر ختم ہو گیا۔ یہ کتنی حیرت انگیز کامیابی تھی مگر اس سال ہم گذشتہ سال سے دو ہزار جلدیں زیادہ چھپوائینگے تاکہ خواہشمندوں کی فرمائش کو چند دنوں تک تو پورا کر سکیں۔ اس سالنامہ کی ایک سو جلدیں جرمنی روس فرانس۔ اٹلی۔ ترکی۔ مصر۔ انگلستان جاپان اور امریکہ کے بڑے بڑے اخبارات اور رسائل کے دفتروں میں بھیجی جائینگی تاکہ انہیں معلوم ہو کہ ہندوستانی زبان کے رسائل بھی کچھ شان رکھتے ہیں۔ الغرض آیندہ سالنامہ ہر نوع لاجواب و بے مثل ہوگا اور اسکے لئے جو کچھ امداد ناظرین نیرنگ خیال سے طلب کروں امید ہے کہ وہ اس سے دریغ نہ کرینگے۔ یہ میری مدد نہیں ہوگی بلکہ اپنی

زبان اور اپنے علم و ادب کی مدد ہوگی +

مرقع چغتائی مرقع چغتائی کے متعلق دفتر میں ہر روز درخواستیں موصول ہو رہی ہیں۔ اور اکثر احباب بار بار تاکید کرتے ہیں کہ کتاب جلد بذریعہ وی پی بھیج دیجئے۔ اس کے متعلق ہم کئی بار لکھ چکے ہیں کہ کتاب چھپ رہی ہے ہم زیادہ سے زیادہ دو ماہ تک کتاب شایع کر سکینگے تا آپکے نام درج ہو رہے ہیں۔ اور شایع ہوتے ہی سب سے اول کتاب آپ کے نام بھیج دی جائے گی +

ناظرین نیرنگ خیال اس بےمثل کتاب کے لئے اپنے آرڈر رجسٹر کرا دیں۔ اس قیمت میں تو یہ مفت کے برابر ہوگی۔ ستر روپے تو اسکی تصاویر کی قیمت ہے۔ ورنہ بعد میں آپ کو برسوں تک یہ کتاب نہ مل سکیگی +

اپریل نمبر کی تصاویر

مولانا وحید الدین سلیم مرحوم۔ ناظرین نیرنگ خیال اور ہندوستان کی علمی ادبی دنیا مولانا وحید الدین سلیم کے نام سے بخوبی آشنا ہے۔ مولانا موصوف نے آخر عمر تک ملک و قوم کی گرانقدر علمی ادبی خدمات سرانجام دی ہیں جس کا نقش ہمیشہ ہمارے دلوں پر قایم رہیگا۔ مولانا کی تصویر رسالہ اردو میں شایع ہوئی تھی جس کے ساتھ مولانا فرحت اللہ بیگ کا ایک مضمون بھی ہے۔ ہم مضمون کو کسی دوسری جگہ نقل کرتے ہیں اور تصویر کا بلاک ہم نے لاہور میں تیار کیا ہے۔ تاکہ ناظرین نیرنگ خیال اردو زبان کے اس بہت بڑے محسن کے "آخری دیدار" سے فیض یاب ہو سکیں اور ان کے حق میں دعائے خیر کریں۔ خدا مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا +

مولانا علم الدین سالک بی اے۔ دوسری تصویر مولانا علم الدین سالک بی اے کی ہے جو عہد حاضرہ کے مشہور مورخین میں سے ہیں۔ آپکے تاریخی مضامین نیرنگ خیال میں اکثر شایع ہوتے رہتے ہیں اور ملک میں بہت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں +

مغربی اور مشرقی معاشرت کا نمونہ۔ ہم دو مرقعے شایع کر رہے ہیں۔ ایک مغلیہ عہد کی تاریخی عورتوں کا مرقع ہے جنہیں اکثر شہزادیاں اور شاہی بیگمات ہیں۔ بادی النظر میں یہ تمام کی تمام ایک ہی شکل و صورت کی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہر ایک کے خد و خال میں فرق ہے۔ دوسرا مرقع عہد حاضرہ کی اُس عُریاں تہذیب کا ایک منظر ہے جس کے مطیع مغربی عورتیں بال کٹواتی ہیں اور نئے نئے فیشن اختراع کرتی ہیں۔ مغرب میں اسوقت سب سے بڑا فیشن برہنگی ہے۔ ٹخنوں سے آگے بڑھ کر گھٹنوں تک اور اب اُس سے بھی اوپر تک جسم کو برہنہ رکھا جاتا ہے۔ گردن۔ چھاتی اور بازو چھپانے گناہ سمجھے جاتے ہیں۔ ان دو مرقعوں کا موازنہ کیجئے۔ ایک وقت تھا کہ دنیا بھر میں مشرقی تہذیب اپنا نظیر نہ رکھتی تھی اور اپنے انتہائی عروج کے وقت بھی جادہ اعتدال سے منحرف نہیں ہوئی تھی اُس کے مقابل مغربی تہذیب کو دیکھئے کہ اپنی موجودہ کامیابی کے بر تے پر اخلاق و عادات کا دیوالہ نکال رہی ہے۔ یہ موازنہ ہمیں بتلاتا ہے کہ انسان کو ہر معاملہ میں اعتدال کو مدنظر رکھنا چاہئے۔ شرم و حیا عورت بلکہ انسانیت کا خاصہ ہے۔ جو قوم یا ملک اس خصوصیت سے خالی ہے وہ آج تباہ نہیں ہوا تو کل ہوگا۔ ضرور تباہ ہوگا۔ ہندوستانی مستورات اور ہندوستانی مردوں دونوں کو لازم ہے کہ وہ مغربی تہذیب و معاشرت سے صرف اُس حد تک متاثر ہوں جس حد تک ہم اپنی مشرقیت کو قایم و برقرار رکھ سکتے ہیں۔ ان دونوں مرقعوں کے شایع کرنے پر ہمیں یہی تحریک ہوئی تھی۔

مرحوم کی ملاقات کا دوسرا سین ہونے والا ہے۔ جب میری اور اُن کی ہڈیاں پسلیاں گلے ملتے ملتے تھک کر چور ہو گئیں تو اُس وقت انہوں نے فرمایا۔ میاں فرحت! مجھے تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا جب سے تمہارا نذیر احمد والا مضمون دیکھا ہے۔ کئی دفعہ ارادہ کیا کہ گھر پر آ کر ملوں۔ مگر موقع نہ ملا قسمت میں ملنا تو آج لکھا تھا۔ بھئی مجھے مولوی نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ تجھ جیسا شاگرد اُس کو ملا۔ مرنے کے بعد بھی اُن کا نام زندہ کر دیا۔ افسوس ہے ہم کو کوئی ایسا شاگرد نہیں ملتا۔ جو مرنے کے بعد اسی رنگ میں ہمارا حال بھی لکھتا"

میں پریشان تھا کہ یا اللہ یہ ہیں کون اور کیا کہہ رہے ہیں۔ مگر میری زبان کب رکتی ہے میں نے کہا "مولوی صاحب! آپ گھبراتے کیوں ہیں بسم اللہ کیجئے مر جائیے مضمون میں لکھ دوں گا" کیا خبر تھی کہ سال بھر کے اندر ہی اندر مولوی صاحب چل بسیں گے اور مجھے اُن کی وصیت کو پورا کرنا پڑیگا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ مولوی وحید الدین سلیم ہیں تو واقعی مجھے بہت پشیمانی ہوئی میں نے معذرت کی۔ وہ خوش شگفتہ طبیعت لے کر آئے تھے۔ رنج تو کجا بڑی دیر تک ہنستے اور اس جملے کے مزے لیتے رہے۔ سر ہو گئے کہ جس گاڑی میں تو ہے میں بھی اسی میں بیٹھونگا۔ شاگردوں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اُن کا سامان لا میرے درجے میں رکھ دیا۔ ادھر ریل چلی اور اُدھر اُن کی زبان چلی۔ رات کے بارہ بجے۔ ایک بجا۔ دو بج گئے مولوی صاحب نہ خود سوتے ہیں۔ اور نہ سونے دیتے ہیں۔ درجہ اوّل میں ہم تین آدمی تھے۔ مولوی صاحب۔ میں۔ اور رفیق بیگ۔ رفیق تو سو گئے ہم دونوں نے باتوں میں صبح کر دی۔ اپنی زندگی کے حالات بیان کئے۔ اپنے علمی کارناموں کا ذکر چھیڑا۔ اصطلاحات زبان اردو پر بحث ہوتی رہی۔ شعر و شاعری ہوئی دوسروں کی خوب خوب برائیاں ہوئیں۔ اپنی تعریفیں ہوئیں۔ مولوی عبد الحق کو برا بھلا کہا کہ اس بیماری میں مجھے کھینچ بلایا۔ غرض چند گھنٹے بڑے مزے سے گزر گئے۔ صبح ہوتے ہوتے کہیں جا کر آنکھ لگی۔ شاید ہی کوئی گھنٹہ بھر سوئے ہونگے کہ اُن کے شاگردوں [illegible] نے گاڑی پر یورش کر دی۔ پھر اٹھ بیٹھے اور پھر وہی علمی مباحث شروع ہوئے جب تک [illegible] اُس کو بے وقوف بنایا۔ اس کی تعریف کی ہنسی اور قہقہوں کا وہ زور تھا کہ درجے کی چھت اڑی جاتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھ کو نواب سعود جنگ اپنے پاس لے گئے اور یہاں اورنگ آباد تک وہی غل غپاڑہ رہا +

میں شاعر نہیں ہوں۔ ہاں بعض دفعہ دوستوں کی فرمائش سے زبردستی شعر کہتا ہوں۔ مجھے بڑا تعجب ہوا جب مولوی صاحب نے کہا "فرحت تو شاعر ہے۔ کیوں اس جوہر کو خاک میں ملا رہا ہے۔ ہو سکے تو تجھ کو لینا" میرے ایک قطعہ تاریخ سے ایسے خوش ہوئے کہ اسی وقت اٹھ قلم دوات نکال۔ وہ قطعہ لکھ دیا۔ آپ بھی سن لیجئے۔ کہتے ہیں کہ نئے طرز کی تاریخ ہے۔ ہوگی۔ ہم کو تو نہ اس کے لکھنے میں دماغ سوزی کرنی پڑی۔ اور نہ اس کی کوئی قدر ہے۔ ہاں قطعے سے پہلے اس کی شان نزول سن لیجئے واقعہ یہ ہے کہ میرے ایک نہایت عزیز دوست کے دماغ میں یورپ جانے کے خیالات ہمیشہ چکر لگاتے تھے۔ پیسہ پاس نہیں تھا۔ مگر چاہتے تھے کہ ساری دنیا میں پھروں۔ اور وہ بھی اس طرح نہیں جس طرح امریکہ والے پھرتے ہیں۔ بلکہ اس طرح جیسے پہلے زمانے کے سیاح پھرتے تھے۔ ادھر کوشش کی۔ اُدھر کوشش کی۔ آخر سرکار سے منظوری ہو گئی۔ باقی تین برس میں سارا یورپ

تاریخ خاندانِ تیموریہ کا ایک عدیم المثال مصور نسخہ

از

(جناب محمد سردار علی صاحب اڈیٹر "تجلی" حیدرآباد دکن)

کتب خانہ مولوی خدا بخش خاں (یا اورینٹل لائبریری پٹنہ) ہندوستان کے کتب خانوں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کتب خانہ کیا ہے ایک لاقیمت خزانہ ہے جس کے علمی جواہر پارے بے نظیر و بے مثال ہیں اس کی عظمت و شان کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس میں وہ کتابیں ہیں جو جامع ازہر کے ایک غریب طالب علم نے اپنے لئے لکھی تھیں۔ اور وہ کتابیں بھی ہیں جن کو اکبر و شاہجہان نے خاص اہتمام سے لاکھوں روپے کے صرف سے تیار کرائی تھیں۔ بہت سے نسخے ایسے بھی ہیں جو شاہانِ اسلام کے کتب خانوں کی زینت بنے ہوئے تھے۔ بہت سی کتابیں ایسی ہیں جو خود مصنفوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں غرض اس کتب خانہ کے علمی نوادر کی تمام دنیا میں شہرت ہے۔ ۱۹۱۱ء میں جب ملک معظم تخت نشینی کے لئے تشریف لائے تھے تو آپ کے معائنہ کے لئے یہاں کی ایک کتاب بادشاہ نامہ ایک خاص افسر کی نگرانی میں وہاں بھیجی گئی تھی۔ چنانچہ اس کتاب پر ملک معظم و ملکہ معظمہ کے دستخط ثبت ہیں۔ اسی طرح یورپ کے مشاہیر نے بھی اس کتب خانہ کی زیارت سے اپنی آنکھیں روشن کی ہیں ✦

لارڈ کرزن وائسرائے ہند کے عہد میں یہ کتب خانہ سرکار انگریزی کے قبضہ میں آیا۔ سرکار نے ترتیب فہرست کا کام خان بہادر مولوی عبدالمقتدر خاں کے سپرد کیا چنانچہ خان صاحب موصوف اس کتب خانہ کی توضیحی فہرست جدید اصول پر ترتیب دے رہے ہیں۔ ابتک فہرست کی چودہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ اور فہرست نویس کا کام جاری ہے موصوف نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے ان دستاویزوں کو ترتیب دیا ہے۔ اور یورپ کے مشہور فہرست نویس ریو اور ایتھے وغیرہ نے جو غلطیاں کی تھیں ان کی بھی اصلاح کی ہے۔

تاریخ خاندان تیموریہ اسی کتب خانہ کی ایک بے مثال کتاب ہے جس کا دنیا میں کوئی دوسرا نسخہ موجود نہیں ہے۔ یہ نہایت نفیس اور مصور نسخہ ہے مصوری اور خطاطی کا بہترین نمونہ ہے تیمور سے لے کر اس کے جانشینان ایران و

ہمایوں اور اکبر کے سنہ ۲۲ جلوس تک کے حالات و واقعات
اس میں درج ہیں۔ سرورق پر شاہجہان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی
یہ عبارت درج ہے :-

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایں تاریخ کہ مشتمل است بر مجمل احوال حضرت صاحبقران
گیتی ستان و اولاد و امجاد آنحضرت و سوانح ایام
حضرت عرش آشیانی انار اللہ برہانہ تا سال
بیست و دوم در عہد دولت شاہ بابا تصنیف
شدہ۔ حررہ شاہجہان بادشاہ بن جہانگیر بادشاہ
بن اکبر بادشاہ +

یہ نسخہ دونوں طرف سے ناقص ہے۔ دیباچہ کے درمیان
سے اس کا آغاز ہے۔ آغاز اس عبارت سے ہوتا ہے:-

موجب حکم جہان مطاع بسود اوراق جز شرح
احوال کہ مقصود بالذات ازیں تاریخ است نمی
نویسد +

جلوس کے اُنیسویں سال (۹۸۱ھ = ۱۵۷۳ء) اکبر
نے گجرات پر جو فوج کشی کی تھی اُس کے بعد کے واقعات
جس حصہ میں درج تھے کتاب کا وہ حصہ غائب ہے۔ مصنف
اور کتاب کے نام کا پتہ نہیں چلتا۔ حالات و واقعات کے
لحاظ سے فہرست نویس نے اس کتاب کا نام تاریخ خاندان
تیموریہ رکھا ہے۔ دیباچہ میں مصنف نے ظفرنامہ کی بڑی
تعریف کی ہے جو تیمور کی ولادت سے وفات تک کی مفصل
تاریخ ہے۔ ظفرنامہ کا مصنف شرف الدین علی یزدی المتوفی
(۸۵۸ھ = ۱۴۵۴ء) ہے۔ اس کے آخری حصہ میں تزک بابری
کا بطور ماخذ کے حوالہ دیا گیا ہے۔ سلطان حسین مرزا اور دیگر
مشاہیر وقت کے حالات اسی کتاب سے اخذ کئے گئے ہیں +

سلطان حسین مرزا بادشاہے بود با اکثر صفات حمیدہ
آراستہ . . . . حضرت فردوس مکانی
چند کلمہ از احوال او در واقعات خود بقلم درآوردہ
اند کہ ترجمہ آں عبارت کہ بزبان ترکیست لفظاً بلفظ
ہمیں است بے ہیچ گونہ تفسیر و تبدیلی نوشتہ
می شود +

تاریخ خاندان تیموریہ کے مضامین کی فہرست حسب ذیل ہے۔

تاریخ کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے جب تیمور امیر حسین کی
تلاش میں روانہ ہوا تھا +
تیمور کی معرکہ آرائیاں سمرقند میں +
تیمور کی کابل پر فوج کشی +
تیمور کی مہم ہرات +
تیمور کی لشکر کشی عراق اور فارس پر +
تیمور کی مہم ہندوستان +
تیمور کی مہم بغداد +
تیمور کی وفات +
مرزا خلیل کی تخت نشینی۔ تاریخ مرزا شاہرخ +
مرزا شاہرخ پر مسجد میں حملہ +
مرزا شاہرخ کی علالت و صحت +
شاہرخ کی وفات +
تاریخ الغ بیگ۔ عبداللطیف۔ عبداللہ۔ ابوسعید +
ابوالقاسم بابر +
سلطان حسین مرزا +
سلطان حسین کی اولاد +
سلطان حسین کے درباری امراء علماء و شعراء +
بابر کی تخت نشینی +

بابر کی مہم سمرقند +

بابر کی مہم کابل +

ھمایوں کی ولادت +

بابر کا قندھار پر حملہ کر کے مرزا کامران کے حوالہ کرنا +

بابر کا ہندوستان پر حملہ +

ہندال کی ولادت +

بابر کی جنگ سلطان ابراہیم سے +

رانا سانگا کی شکست +

بابر کی وفات +

ھمایوں کی تخت نشینی +

چپانیر پر ھمایوں کا قبضہ +

اکبر کی ولادت +

ھمایوں کی ملاقات شاہ ایران سے +

ھمایوں کی ایران سے واپسی اور سکندر کی شکست +

ھمایوں کی وفات اور اکبر کی تخت نشینی +

اکبر کی جنگ ہیمو سے۔ ہیمو کی شکست و قتل +

بیرم خاں کی بغاوت +

اکبر کی مہم گجرات +

اکبر کی فتح چتوڑ +

سرنال کی فتح +

سورت کی فتح +

اکبر کی دوسری مہم گجرات (یہاں اکبر کی ۱۹ سالہ حکومت کی تاریخ ختم ہوئی +

اکبر جب گجرات کی مہم سے فتح پا کر واپس ہوا تو ... میں بمقام سروہی قیام کیا۔ جن لوگوں نے جنگ میں دادِ مردانگی دی تھی اُن کو حسبِ مراتب انعامات تقسیم کئے۔ ان واقعات

تک پہنچکر کتاب ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد کے اوراق غائب ہیں۔ آخری عبارت یہ ہے:-

و روایات نصرت آیات مقرون فتح و ظفر عازم

سعاودت گشت و در نواحی سروہی......

یہ کتاب تصاویر کے اعتبار سے نہایت شاندار ہے اس کی تمام تصویریں اکبر نے اپنی سرپرستی میں مشہور مصوروں سے بنوائی تھیں۔ ہندوستان کے عہدِ مغلیہ میں اعلیٰ درجہ کی مصوری کا آغاز بابر کے زمانہ سے ہوتا ہے جو ایرانی آرٹ کا بہت بڑا شائق تھا۔ اور جس کے دربار سے بڑے بڑے مصور متوسل تھے۔ اکبر نے بھی اس فن کی قدر افزائی میں بڑی فیاضی دکھائی۔ اور اس کی ترقی میں کافی حصہ لیا +

اس کتاب میں کل ۱۱۲ تصاویر ہیں۔ بعض تصویریں بڑی ہیں۔ جو ایک دوسرے کے محاذی دو صفحوں پر مشتمل ہیں۔ ہر تصویر کے نیچے مصور کا نام درج تھا۔ لیکن بدقسمتی سے کسی ظالم جلد ساز نے نیچے کا حاشیہ اس قدر کاٹ دیا ہے کہ مصوروں کے تمام نام کٹ گئے ہیں۔ جس قدر نام پڑھے جاتے ہیں وہ یہ ہیں:-

(۱) مسکین (۲) کیسو (۳) بسا ون (۴) ... (۵) علی (۶) کاند (۷) کیم (۸) جگنا تھ (۹) سانولا (۱۰) راداس (۱۱) سرولہ (۱۲) ناتھا (۱۳) تلسی (۱۴) نند گوالیاری (۱۵) ... (۱۶) بھوراو (۱۷) ... تنت (۱۸) سانولو (۱۹) سرج (۲۰) دیو یا دیو جیو گجراتی (۲۱) دھرم داس (۲۲) کنک (۲۳) سنک (۲۴) جگ جیون (۲۵) آسی (۲۶) مکوان (۲۷) ... اس (۲۸) ... بیمہ جیہ گجراتی (۲۹) سنلو (۳۰) جگن (۳۱) نرائن (۳۲) کانتھا (۳۳) ... کمن سنگتراش (۳۴) منوہرا (۳۵) ... گجراتی (۳۶) نانا ... (۳۷) منصور (۳۸) بہزاد (۳۹) ... ہیں۔

(۴۰) کھیم کرن (۴۱) منوہر (۴۲) لوہنگا (۴۳) ملا شاہ محمد (۴۴) حسین نقاش (۴۵) محمد کشمیری (۴۶) حیدر کشمیری (۴۷) کمال کشمیری (۴۸) مخلص (۴۹) فرخ (۵۰) مسکین (۵۱) علی ولد نلص +

اس فہرست کے اول الذکر ۱۷ اور آخر الذکر تین مصوروں کا تذکرہ ابوالفضل نے اکبر کے درباری مصوروں میں کیا ہے۔ نمبر ۱۱ و ۱۳ کا ذکر ونسنٹ اسمتھ کی تاریخ ہسٹری آف فائن آرٹ انڈیا اینڈ سیلون میں علی الترتیب صفحات ۲۴۴ - ۲۴۸ و ۳۲۸ میں موجود ہے۔ جن مقامات پر ایک ہی نام کے دو مصوروں کے نام آ گئے ہیں وہاں امتیاز کے لئے نام کے ساتھ خورد و کلاں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مثلاً تلسی کلاں، تلسی خورد۔ بعض جگہ ایک ہی تصویر کے نیچے دو مصوروں کے نام ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خاکہ ایک نے تیار کیا ہے اور دوسرے نے رنگ آمیزی کی ہے۔ شاذ حالتوں میں تین نام آ گئے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ خاکہ ایک نے بنایا۔ رنگ آمیزی دوسرے نے کی اور چہرہ تیسرے نے بنایا۔ اس کے متعلق مسٹر اسٹ بی ہیول کا بیان ہے کہ یہ تقسیم صرف اکبری عہد کے مصوروں میں پائی جاتی ہے (ہندوستانی سنگتراشی و مصوری سنہ ۱۹۰۸ء)۔

اکبر کی سرپرستی میں جو فارسی مصور کتابیں تیار ہوئیں ان میں ابوالفضل نے حسب ذیل ۹ کتابوں کا ذکر کیا ہے:

(۱) داستان امیر حمزہ ۱۲ جلدوں میں جس میں مشہور مصوروں کی ۱۴۰۰ مختلف واقعات کی تصویریں ہیں (۲) چنگیز نامہ (۳) ظفر نامہ (۴) اکبر نامہ (۵) مہابھارت (۶) رامائن (۷) نل دمن (۸) کلیلہ و دمنہ (۹) عیار دانش۔

سوائے چنگیز نامہ کے یہ کتابیں شہرت عام حاصل کر چکی ہیں اور کہیں نہ کہیں پائی جاتی ہیں۔ چونکہ اس وقت چنگیزی خاندان کی بہت سی تاریخیں موجود ہیں لیکن کسی کتاب کا نام چنگیز نامہ نہیں ہے۔ اس لئے فہرست نویس کی رائے ہے کہ کچھ عجب ہے کہ یہی کتاب (تاریخ خاندان تیموریہ) چنگیز نامہ ہو۔ چنانچہ اپنی رائے کی تائید میں حسب ذیل ثبوت پیش کئے ہیں:-

(۱) یہ کتاب عہد اکبری میں لکھی گئی ہے۔ خود شاہجہان کے الفاظ سے ثابت ہے +

(۲) مصنف نے اکبر کے نام کے ساتھ زمانہ حال کا استعمال کیا ہے +

(۳) اس کتاب میں عہد اکبری کے مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں +

(۴) ابوالفضل کے بیان کردہ چنگیز نامہ کا دنیا میں کہیں پتہ نہیں ہے +

ان دلائل پر غور کرنے کے بعد دل میں یہ بات کھٹکتی ہے کہ اکبر کا تیار کرایا ہوا چنگیز نامہ یہی کتاب ہے لیکن قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا +

یہ نسخہ جس عمدگی کا لکھا ہوا ہے۔ اس عہد کی مصور مخطوطات نایاب ہیں۔ پروفیسر ولیم جیکسن نے اپنے کیٹلاگ میوزیم آف آرٹ نیو یارک میں بہزاد کی جو نامور ایرانی مصوروں میں بہت مشہور ہے بہت سی تصویروں کا ذکر کیا ہے +

[illegible] نے بھی خمسہ نظامی کے ایک نہایت نفیس نسخہ کا ذکر کیا ہے [illegible] ۹۴۸ھ ۱۵۳۹-۱۵۴۲ء [illegible] کے لئے مشہور [illegible] شاہ محمود نیشاپوری نے لکھا تھا اس میں [illegible] کی ۱۴ تصویریں ہیں جس میں [illegible]

میر سید علی۔ آغا میرک و مظفر علی نامی درباری مصوروں کے دستخط ہیں +

ریوؔ نے ایک کتاب داراب نامہ کا بھی ذکر کیا ہے جس میں دربارِ اکبری کے مصوروں کے ہاتھ کی بنائی ہوئی کئی تصویریں ہیں مسٹر اسمتھ نے لکھا ہے کہ اس میں ایک تصویر بہزاد کے ہاتھ کی ایسی ہے جس کی خواجہ عبدالصمد نے اصلاح کی ہے۔ خواجہ عبدالصمد پہلے دربار ہمایوں سے متوسل تھا۔ بعد میں اکبر کی قدر افزائی نے دربار کے مصوروں میں اس کا مرتبہ بلند کیا۔ خواجہ عبدالصمد اور میر سید علی اشاعی الاکرشی، طہماسپ کا درباری مصور تھا) کے نام اس کتاب میں شہنشاہ ہمایوں کے استادوں کی حیثیت سے لئے گئے ہیں +

ریوؔ نے ایک اور کتاب واقعات بابری کا بھی ذکر کیا ہے جس میں پورے صفحہ کی ۶۸ تصویریں ہیں اور جن پر اکبری دربار کے مصوروں کے دستخط ہیں +

حال میں وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم (انگلستان) ام ایک قلمی کتاب کا ایک حصہ خریدا ہے جس میں اکبری دربار کے مصوروں کی بنائی ہوئی ایک سو دس تصویریں ہیں +

مہاراجہ جے پور کے ہاں ایک مصور رزم نامہ مہا بھارت ہے جس کی تیاری کے لئے اکبر نے ۴ لاکھ روپے صرف کئے تھے کسی دوسری جگہ تاریخ خاندان تیموریہ کی تصاویر کی تعداد درج کی جا چکی ہے۔ ان میں قابلِ ذکر تصویریں یہ ہیں:-

(۱) تیمور کا بچپن میں بچوں کے ساتھ کھیل رہا ہے اور سب کا بادشاہ بنا ہوا ہے +

(۲) تیمور اور امیر حسین کے درمیان صلح مینوں نامی جگہ پر ہو رہی ہے۔

(۳) تیمور کی معرکہ آرائی شاہ منصور سے جس میں اول الذکر قتل ہوتا ہے مرزا شاہ رخ ۱۷ سال کی عمر میں تیمور سے آتا ہے +

(۴) شہزادہ عمر شیخ کی ہلاکت ایک تیر سے

(۵) تیمور کی قلعہ اوزنک پر چڑھائی اور اس کی فتح +

(۶) تیمور کا حملہ بغداد۔ تیمور پل پر کھڑا ہے۔ بغداد کا گورنر اور اس کی دختر ایک کشتی میں بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تیمور کے تیروں کے خوف سے دونوں دریا میں کود کر جان دیدیتے ہیں تیمور کے حکم سے ملاح لاش نکال کر لاتے ہیں۔ اس کے بعد تیمور شہر کو لوٹنے کا حکم دیتا ہے +

(۷) تیمور شہزادہ محمد سلطان کی وفات پر ماتم کر رہا ہے۔ اس موقع پر مرحوم شہزادے کے دونوں بچے سامنے آجاتے ہیں تیمور کو بہت زیادہ رقت طاری ہو جاتی ہے +

(۸) تیمور شہزادگان مرزا الغ بیگ۔ ابراہیم سلطان، جہانگیر کی شادیوں کی تیاری کے لئے احکام جاری کرتا ہے سمرقند میں چار شاہی خیمے نصب کئے گئے ہیں۔ امیر زادہ پیر محمد غزنی سے آتا ہے۔ نہایت پیار و اخلاص سے تیمور اس سے ملاقات کرتا ہے۔ سفیر مصر تیمور کی خدمت میں تحائف پیش کر رہا ہے +

(۹) تیمور کی وفات +

(۱۰) مرزا خلیل کی تخت نشینی +

(۱۱) مرزا شاہ رخ تخت خراسان پر جلوہ افروز ہے +

(۱۲) مرزا بدیع الزماں اپنے باپ سلطان حسین سے معافی چاہنے آیا ہے۔ مظفر حسین مرزا (بدیع الزماں کا چھوٹا بھائی)

(۱۳) اس کی دلجوئی کے لئے یہ باپ اپنے بیٹے کا قصور معاف کر کے اس کو گلے لگا رہا ہے +

(۱۳) بابر کی مہم سمرقند +

(۱۴) ہمایوں کی ولادت پر بابر خوشی منا رہا ہے +

(۱۵) ہمایوں کی تخت نشینی +

(۱۶) چنار کی مہم۔ تیمور شب کے وقت چٹانوں کی درازوں
میں لوہے کی سلاخیں لگا کر بیرم خاں اور ۳۹ افسروں کو
لے کر فصیل کے اندر داخل ہوتا ہے۔ اسی طرح دن نکلنے سے
پہلے اپنی تمام فوج کو قلعہ میں داخل کرتا ہے۔ تیمور شمشیر ہاتھ
میں لئے ہوئے اپنی فوج کو لے کر دشمن کے مجمع کو چیرتا
ہوا قلعہ کے دروازہ تک جا پہنچتا ہے۔ اور دروازہ کھول کر
اپنی فوج کو قلعہ کے اندر داخل کرتا ہے۔ محافظ فوج ہتھیار
رکھ دیتی ہے +

(۱۷) اکبر کی ولادت۔ ہمایوں کی بیوی حمیدہ بانو بیگم کے بطن
سے قصر امر کوٹ میں اکبر تولد ہوا ہے۔ ماں سبز لباس میں
ایک کوچ پر لیٹی ہوئی ہے۔ اکبر دایہ کی گود میں ہے۔ کلاہ
تتری سر پر ہے۔ حرم میں خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔
تصویر کے حصہ زیرین میں طرزی بیگ خاں کی تصویر ہے
جو ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہو کر اکبر کی ولادت کی خبر
سناتا ہے +

(۱۸) اکبر آگرہ کو جا رہا ہے +

(۱۹) علی قلی خاں کے خلاف اکبر کی مہم۔ پہلے اکبر اپنے
خاص ہاتھی بال سندر پر سوار ہوتا ہے۔ مرزا عزیز کوکہ
بھی اکبر کے ساتھ بیٹھا ہے۔ جب جنگ شدید صورت اختیار
کرتی ہے اکبر ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔
علی قلی خاں تیر سے زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑتا ہے
ہاتھی اس کو پاؤں سے کچل دیتا ہے +

(۲۰) اکبر کی مہم چتور۔ اکبر سائبان کے نیچے کھڑا ہے۔ سردار
قلعہ جے مل فصیل پر کھڑا ہے۔ اکبر نشانہ لگاتا ہے۔ جے مل
دیوار پر سے نیچے گر پڑتا ہے۔ قلعہ کی فوج اپنے سردار کے
مارے جانے سے ہتھیار ڈال دیتی ہے +

(۲۱) اکبر حضرت شیخ فرید شکر گنج کی درگاہ کو زیارت کیلئے جاتا ہے
جس صفحہ پر شاہجہان کی عبارت درج ہے اسی پر امرائے
ذیل کی مہریں بھی ثبت ہیں +

(۱) عبداللہ چلپی ۔ ۲۲ شوال سنہ ۲۲ جلوس مبارک
(۲) خواجہ سہیل (۳) خواجہ ہلال (۴) عبدالغفور (۵) محمد باقر
(۶) نور محمد +

ان دستخطوں اور مہروں کے بعد آخر میں گلاڈون کے
دستخط ہیں۔ یہ گلاڈون مشہور مستشرق فرانسس گلاڈون ہے جو
بنگال میں فوجی افسر تھا جس نے آئین اکبری (ایک حصہ کا)
گلستاں اور دیگر فارسی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔
فارسی ہندوستانی انگریزی لغت لکھی۔ فورٹ ولیم کالج میں
فارسی کا پروفیسر رہا اور ۱۸۱۳ء میں وفات پائی +

کتاب کے اسی صفحہ پر اس نسخہ کی قیمت آٹھ ہزار روپیہ
لکھی ہے +

کتاب نہایت خوبصورت۔ کاغذ نہایت نفیس خط نستعلیق
ہے۔ کل ۳۲۸ ورق ہیں۔ ۱۲ سطری مسطر ہے[1]

محمد سردار علی

[1] یہ مضمون فہرست کتب خانہ پٹنہ سے ماخوذ ہے
اس کی ترتیب کے وقت مضمون "کتب خانہ
خدا بخش خاں" مندرجہ معارف اور یورپ کے
مشرقی کتب خانوں کی فہرستیں بھی پیش نظر
رہی ہیں +

یا "اصطبل" اور اس کی بول و براز نے گھاس تک یوں بکھرے
پڑے رہتے ہیں کہ اگر ننھا ارگڑھا چاہے تو ان میں سے ہر
قیمتی قمیص، ہر شیروانی کو آسانی سے کھا لے یا پاپ ڈالے
دھوبی کپڑے دھونے سے پہلے اپنے گھر میں انہیں یوں
استعمال کرتا ہے کہ ان میں بازار سے سودا سلف لاتا ہے
انہیں بچھاتا ہے۔ اوڑھتا ہے۔ دھوپ روکنے کے لئے
تان لیتا ہے اور انہیں پر اس کے "ننھے میاں" کھیلتے ہیں۔
کودتے ہیں۔ اچھلتے ہیں۔ دوڑتے ہیں اور پیشاب بھی
فرما دیتے ہیں۔ مگر دھوبی کو اس کی پروا نہیں ہوتی۔ اگر
کبھی نظر پڑ گئی تو اپنی اُن سے کہہ دیا

"اری دیکھ وہ لونڈا کپڑے خراب کر رہا ہے"

اور بس۔ دھوبی کے گھر میں بڑا اہتمام اس "فیکٹری" کا ہوتا
ہے جسے دیسی قسم کے لوگ بھٹی یا بھٹا کہتے ہیں۔ یہ بھٹی
جب گرم ہو جاتی ہے تو پھر ٹھنڈا ہونا نہیں جانتی۔ جب
کپڑوں کا تقاضہ کیجئے یہی جواب ملیگا کہ

"میاں ابھی بھٹی چڑھی ہوئی ہے"

دوسری چیز دھوبی کا گھاٹ ہے۔ جہاں وہ کپڑے
دھوتا کیا ہے پھاڑتا ہے اور دھجیاں اڑاتا ہے۔
گھاٹ کی رونق یا مالکہ وہ "دھوبن" ہوتی ہے جو
دھلے ہوئے کپڑوں پر نہایت بے فکری سے لیٹ کر
اپنے بچوں کو اپنی چھاتی سے چمٹا کر دودھ پلاتی ہے۔ اور
اسی حالت میں وہ ان کپڑوں ہی پر سو بھی جاتی ہے۔
حقیقت میں دھوبی کی ساری کائنات میں یہی دھوبن
نہایت خطرناک چیز ہے۔ یہ دھوبی سے ہمیشہ چار ہاتھ
آگے یا یوں کہو قدم آگے ہوتی ہے اور بہت تیز اور تند بولتی
ہے۔ اس کا پہلا ہی فقرہ انسان کی ادبیت مرنے کے
لئے کافی ہوتا ہے۔ وہ جب کہتی ہے تو صرف یہ کہ

"دھرے ہیں کپڑے۔ وہ پچھلے مہینہ کے دام
تو دو پھر کپڑے لینا۔ تو آپ کے ہاتھ کون
روکتا ہے۔ اور کہیں دھلوالو"

ہمارے خیال میں دنیا کا بڑے سے بڑا مقرر، لیکچرار، فلسفی
منطقی اور دلیل دھوبن کے "تقریری مقابلہ" سے عاجز ہے
کیونکہ اس کے ہر فقرہ سے ثابت ہوتا ہے کہ دراصل آپ
اس کے قرضدار ہیں۔ اور اس کے اس فقرہ کا جواب دکھانے
کسی بڑے سے بڑے سر علی امام سے کہ

"ہاں ایک دھوبن ہیں سارے گھر کے
کپڑے کون دھو سکتا ہے؟"

اور جو یہ دھوبن ذات ہوئی خدانخواستہ "چھوٹی عمر کی" تو
پھر پناہ ڈھونڈئیے اس کی گفتار سے اور کردار کا عالم تو
امیرانہ ان کے افراد ہی سے دریافت کیجئے؟

ان حالات کے ساتھ دھوبی عید کے زمانے میں
نہایت جابر و ظالم حاکم کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ گویا اس
زمانہ میں وہ بھی ایک قسم کا چھوٹا موٹا بچہ سقہ ہو جاتا ہے۔
جس سے آجکل اپنے بڑے مولوی صاحب بھی پناہ ڈھونڈ
رہے ہیں۔ نصف رمضان ہی سے اس سے کہدیا جاتا ہے کہ

"دیکھ بے، یہ میرے عید کے کپڑے ہیں،
ان پر استری نہایت عمدہ کرنا۔ اور دیکھ یہ
شیروانی ریشمی ہے سنا کہ نہیں کہیں
اسے بھٹی کی نذر نہ کر دینا۔ اور دیکھ "الوداع"
کے دن لے آنا۔ اور یہ لے ململ کا منہ
ہے اسے بہت سنبھال کر دھونا" اور اس دماغ

کو بالکل صاف کر دینا۔ اسے کچہری میں دوات الٹ گئی تھی۔ اور سن، ان دونوں پتلونوں پر استری ترچھی نہ ہو جائے۔ ورنہ میرے پاس اور پتلون نہیں ہے۔ ہاں ہاں انعام پہلے لے لے۔ مرا کیوں جاتا ہے؟ اور دیکھ کہے دیتا ہوں۔ اگر "الوداع" کے دن نہ لایا تو پھر تو ہے اور میں۔ گھاٹ ہی پر سے مارتا ہوا لاؤنگا۔ اور لے یہ "ننھے میاں" کا کوٹ ہے۔ دیکھ لے یہ ریشمی ہے۔ بس اس کے پھول خراب نہ ہوں ورنہ جان ہی سے مار ڈالونگا۔ اب لے تو چھر گن لے۔ ایک کم چالیس نہیں، نہیں ایک اوپر چالیس۔ ہاں ہاں چالیس اور یہ لیا ہے اب تو ہوئے اکتالیس؟ لاحول ولا یہ تو اماں کا دوپٹہ ہے۔ بس اس کا رنگ نکال دینا تاکہ وہ لہریا رنگ لیں۔ اسے بھی ساتھ ہی لانا۔ لے یہ اس مہینے کے سوا دو روپے۔ اب دیکھ صرف چار آنے باقی رہ گئے۔ واللہ اب نہیں ہیں۔ او نہ جیب یہ دیکھ پامیاں بول رہی تھیں۔ جیب میں ہوتے تو دے نہ دیتا ہاں ہاں کوئی کوٹ ہوا تو وہ دے دونگا۔ چل چل اس وقت تو دفتر جا رہا ہوں۔ مگر سن کپڑے مرضی کے موافق ہوں۔ دیکھ پھر کہتا ہوں تہوار کا موقع ہے تنگ نہ کرنا۔

ان تمام نصائح اور ہدایات کے بعد جب "الوداع" کا دن آیا تو آپ ہی کو فکر ہوئی کہ دھوبی نہیں آیا۔ مگر دھوبی کو آپ کی فکر نہ ہوئی اور وہ برابر دوسروں کے کپڑے دھو رہا ہوگا اور دے رہا ہوگا یہاں تک کہ جب چاند رات سر پر آ جائیگی تو آپ اپنے نوکر کو دھوبی کی خدمت میں بھیجیں گے۔ تو یہ دھوبی اس سے کہدیگا

"میاں بس تم چلو میں ابھی لایا۔ بس یہ ایک شیروانی اور دگنی ہے"

نتیجہ یہ کہ عشا کی نماز پڑھکر آپ خود اس کے غریب خانہ پر جائینگے تو یہ آپ سے منس کر کہے گا

"میں نے کہا تو دیا تھا کہ ابھی لاتا ہوں۔ کیا کروں حضور ایک جان ہے۔ بس یہ حویلی والے حاجی جی کے اور رہ گئے تھے۔ نہیں بنا کر آپ ہی کے تیار کرنا تھا۔ ارے نہیں حضور۔ آپ بھی تنخواہ دیتے ہیں۔ چلو چلو بانٹے دو۔ نجوا کی قسم ابھی دو منٹ میں لایا۔ آپ چلئے تو لیں ابھی لایا۔ کیا کہوں حضور وہ یہ نجوا کی ماں بیمار پڑ گئی کل؟ میاں روزی کی قسم کل تو برادری میں میت ہوگئی تھی۔ نہیں تو میں کل ہی فارغ کر چکا ہوتا"

اب یہاں سے معاملہ دو ہی صورتیں اختیار کرتا ہے۔ یا آپ خون کا گھونٹ پی کر گھر چلے آئے یا وہیں بیٹھ گئے اور بس اپنے سامنے بنوا کر لیتے آؤ گے۔ گھر پر کپڑے دیکھ کر معلوم ہوا کہ کسی کپڑے کے داغ اپنی اصلی حالت پر ہی باقی ہیں۔ کسی کی استری ترچھی کی ترچھی ہی دھری ہوئی ہے۔ دوپا جامے دھوبی ہی کے گھر رہ گئے۔ کسی پر استری ہی ندارد۔ خلاصہ یہ کہ نتیجہ آئیگا کہ آپ عید گاہ تک اور عید گاہ سے گھر تک کپڑوں کی خرابی پر تاؤ کھاتے جائیں گے اور تاؤ کھاتے ہی آئیں گے۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ آیندہ بھی اسی دھوبی سے کپڑے دھلوائینگے

گرمائیں اس کے سوا دوسرا دھوبی بھی تو نہیں رہتا۔

درزی۔ ہندوستان میں جب تک مشرقی تہذیب اور ملکی معاشرت کی حمیت اور عصبیت باقی رہی اس وقت تک تو درزی کی قیمت اتنی ہی تھی کہ گھروں کی "مغلانیوں" سے اگر کوئی کپڑا نہ سِل سکا تو بازار میں درزی کے پاس چلا گیا لیکن جب سے یورپ کی "سنگر مشینیں" آئیں اور علوم جدیدہ نے ہندوستانیوں کے تمدنی و معاشرتی رسوم کے دیکھنے والے دیدوں کو بالکل ہی گم کردیا۔ گرلز اسکول قائم ہوئے تو "بہو بیٹیاں" تو وہ گئیں صرف زنانہ نمائشوں کی زینت کے لئے، اور درزی صاحب ہوگئے "ٹیلر ماسٹر" اب نہ وہ آبائی لباس رہے نہ شلوکے۔ نہ انگرکھے رہے نہ کرتے اس لئے ماں بہنیں سوٹ تیار کریں تو کس طرح۔ اس لئے درزی صاحب کی شان خواہ مخواہ دوبالا ہوگئی پس ہندوستان کا درزی بھی اپنے وقت کا "گورنر جنرل باجلاس کونسل" ہوا کرتا ہے جسے شہری آبادی کے ہر حصہ پر "درزیانہ نمایش لا" جاری کرنے کے اختیارات حاصل ہوا کرتے ہیں۔

درزی نہایت شاندار آدمی ہوتا ہے۔ اس کی دکان کرایہ کی، نہ تو یہ ہے کہ ایک پرانی سی مشین لیکر بازار یا کسی سڑک کے کنارے چھوٹے سے کمرہ میں بیٹھ گئے۔ اور اس طرف سے جس قسم کا گنوار اور کسان گزرا اس کے کپڑوں پر بخیہ کردیا۔ ایسے تھرڈ کلاس درزیوں سے یا تو کبھی محلّے کے ایسے مفلوک الحال بوڑھے بھی پٹ جاتے ہیں جو اپنے اسکول میں پڑھنے والے فیشن زدہ لڑکے کی شیروانی چار و ناچار سلواتے ہیں۔ ان کی ناواقفیت سے یہ درزی فائدہ اٹھا کر کپڑا بھی چراتا ہے اور اجرت بھی دوگنی لیتا ہے۔ مگر شیروانی اس قدر غلط سیتا ہے کہ اسکول میں تمام فیشن شناس لڑکے اس شیروانی پر اعتراضات اور پھبتیوں کی بوچھاڑ کرکے اس بیچارے لڑکے کا ناطقہ بند کردیتے ہیں۔

درزیوں کا دوسرا طبقہ "طبقۂ متوسط" ہے کیونکہ طبقۂ اعلیٰ تو لندن میں رہتا ہے یا پیرس میں لیکن یہی طبقہ متوسط ہوتا ہے جو صاحب ہندوستانیوں کی گاڑھی کمائی کا خون پیتا رہتا ہے۔ مگر کسی کو محسوس بھی نہیں ہوتا۔ اس قسم کے درزی کی دکان میں ایک سے لے کر دس تک سنگر مشینیں ہوتی ہیں اور برقی پنکھے نہیں تو برقی روشنی ضرور ہوتی ہے اس کے پاس ہر قسم کی سلائی آتی ہے۔ اس لئے ذرا "ملداری" کا نخرہ مزاج میں پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ درزی مسلمانوں کیلئے ماہ رمضان کے آغاز ہی سے اذیت رساں ہوجاتا ہے۔ آپ کے ذہن میں کبھی عید کا خیال ابھی پیدا نہیں ہوتا لیکن اگر رمضان کی پہلی ہی تاریخ کو آپ کوئی معمولی کپڑا لے کر اسکے پاس چلے گئے تو یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ بھی عید ہی کا کپڑا ہے۔ اسلئے اس کی اجرت دوگنی وصول کرتا ہے۔ اور جو آپ اجرت کی زیادتی پر اس سے حجت کریں تو یہ کپڑا سینے ہی سے انکار کردیتا ہے۔ اور دوسرے درزی بھی چونکہ اسی رنگ میں رنگ جاتے ہیں اسی لئے چار و ناچار اسی سے معاملہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ درزی سے ناراض ہوکر کپڑا گھر میں لے آئیں کیونکہ اب "گھر کے لوگ" تو سوٹ سینا جانتے ہی نہیں اب تو آپنے درزی سے کہا کہ

"اچھا تو یہ لو دس روپیہ کا نوٹ اور باقی دونگا کپڑے تیار ہونے پر۔ مگر دیکھو بھی ۲۸ رمضان تک سب سلے ہونگا۔ اور ہاں اس شیروانی کا گلا ذرا ڈھیلا رکھنا کہیں پہلی شیروانی کی طرح تنگ نہ کردینا۔ واللہ میں نے اُسے کرمالو دے دیا۔"

مجھ سے تو نہ پہنا گیا۔ میرا نہیں ننھے میاں کی؟

تم بھی بچہ سینا ورنہ کیا کہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

واللہ بچہ کے لئے ہے

ہاں تو پھر پہروں آؤں!

کیا بٹن بھی ادھار ہیں تین دن تم اپنی طرف سے

لگا دینا دام دیدونگا!

آپ اس بکواس سے بھی کچھ زیادہ گھبرا گئے۔ اور اب اطمینان ہو گیا کہ عید سے تین دن پہلے کپڑے تیار ہو جائیں گے۔ ادھر درزی صاحب نے لمبی سی انگڑائی لی اور آپ کے کپڑوں کو الماری میں یوں رکھ دیا گویا انہیں بارش بعد سینا ہے۔ اتفاق سے اگر ایک دن پہلے آپ درزی کی دکان کے سامنے سے گزرے اور آپ نے یاد دہانی کر دی تو درزی صاحب نے نہایت یقین اور زور سے فرمایا

"بس کل اسی وقت آکر لے جائیگا۔ سب تیار ہیں صرف شیروانی کا کاج رہ گیا ہے۔ مگر کچھ روپے ہوں تو دے جایئے۔ آج ضرورت ہے۔ اور کوئی گاہک بھی نہیں آیا۔ ورنہ میں آپ سے ہرگز نہیں مانگتا" اس پر آپ نے بقیہ دام بھی ادا کر دیئے اور اب آپ کو بالکل قطعی، حتمی، یقینی اور آخری اطمینان ہو گیا کہ کل تو کپڑے ہر حال میں مل ہی جائیں گے۔ مگر درزی صاحب دوسرے گاہکوں سے کپڑے برابر لیتے رہے اور سیتے رہے لیکن آپ کے کپڑوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اب آپ عین وعدہ کی تاریخ پر پہنچے تو درزی صاحب نے بڑی آؤ بھگت اور بڑے تپاک سے آپ کو بٹھایا۔ مگر فوراً ہی آپ سے سوال فرمایا

"کیا آپ چوک کی طرف جا رہے تھے؟

ہاں تو میرا مطلب یہ تھا کہ اگر آپ چوک تک تشریف لے جائیں تو اس وقت بازار میں بٹن بھی لگا دونگا کیونکہ وہ دھاری والے کوٹ میں تین بٹن رہ گئے ہیں"

روزہ کی حالت میں شام کے وقت چوک تک جانا ویسے بھی داخل ثواب ہی سمجھا گیا ہے۔ اس لئے آپ نے بھی سوچا کہ چلو چوک تک ویسے ہی ٹہل آئیں۔ وقت بھی گزر جائے گا اور کپڑے بھی تیار ہو جائیں گے۔ یہ سوچ کر آپ چوک تک گئے اور واپس جو آئے تو دکان ہی بند پایا درزی صاحب [illegible] دکان کے دوسرے ملازم نے کہہ دیا۔ ذرا وہ بھی چوک تک چلے گئے ہیں۔ اب وہ آپ کا عید سے تین دن پہلے والا اطمینان تو گیا گزرا ہی، کل شب کو آپ نے درزی صاحب کو دیکھا ادھر درزی صاحب نے آپ کو دیکھتے ہی انتہائی شریفانہ لہجہ میں گفتگو شروع کی۔ یہ نیچی نظروں سے تکتے رہے۔ اور پھر آپ سے جس طرح بھی ہوا تین گھنٹہ کی فرصت یا مہلت اور طلب کر لی اور آپ پھر تاؤ کھاتے ہوئے گھر آگئے تو آپ کی وہ بولیں

"کیا اب بھی کپڑے نہیں لائے؟

"تو آخر سبب!

"تو کیا بچہ اس عید پر بھی ننگا ہی رہیگا؟

اجی چولہے میں جائے اس کا وعدہ میں تو بیٹھی تھی کہ اس وقت وہ جاگ رہا ہے اسے ایک مرتبہ پہنا کر دیکھ لونگی۔

تو پھر دکان ہی پر بیٹھے رہتے۔ یہاں آنے کی کون سی ضرورت تھی۔

تو میں نے کہا تھا کہ تم اس بے ایمان کو کپڑے دے آؤ۔ ہزار بار تو اس کا تجربہ کر لیا۔ خدا جانے

تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے؟

... میری شیروانی؟

اچھا تو یہ بہانہ نہیں تو اور کیا ہے؟

خیر مگر ننھے کے کپڑے آ جاتیں؟

اچھا کھا قسم، ... بتایئے؟

ہاں ہاں مجبور تو ہوں کہ شیروانی سینا مجھے نہیں آتا۔ ورنہ یہ تو اب تک ایسی ویسی شیروانیاں سی کر پھینک دیتی بھلا بچہ کی شیروانی بھی کوئی شیروانی ہوتی ہے جو اس بے ایمان نے اتنی دیر کی۔

والد ننھے میاں کی اس طرح ارشاد فرمانے سے آپ کو درزی پر پھر تاؤ آیا اور سیدھے کرتے پھینک کر آپ پھر اس کی دکان پر پہنچے۔ درزی نے پھر تپاک سے آپ کو سمجھایا۔ اب فرق یہ ہوا کہ دو چار کپڑے تو تیار پیش کر دیئے۔ اور بقیہ کے لئے پھر وہی ایک گھنٹہ اور کی مہلت، اب آپ کے تابو سے باہر ہونے کے لئے کونسی رکاوٹ تھی۔ اس لئے آپ نے بھی

... . ابے مردود تو نے مجھ سے وعدہ ہی کیوں کیا تھا؟

رکھ یہاں کپڑوں کی قیمت

اب میرے کس کام کے تیرے کپڑے نہیں

نہیں۔ مجھے نہیں لینا۔

تو۔ تو نے سمجھا کیا تھا؟

اور یہ تو دیکھ بے ایمان یہ تو نے شیروانی کا گلا تو ویسا ہی رہنے دیا۔ اب کیا خاک درست کریگا

وہ تو ہو گئی غارت۔

کیا میں، ابے میں تو تیرے باوا سے وصول کرونگا

کیوں زبان خراب کرتا ہے۔

حضور کا بچہ، بے جا کہیں گا۔ ابے تو میں لیتا ہی

کہ پھر آخر تو نے پھٹیچری ایوان میں کر دکھایا

درزی کی دکان ظاہر ہے کہ بازار میں ہوا کرتی ہے۔ اب آپ کی اس لے شرکی تو تو میں میں سے دو منٹ ہی میں خاصا ہجوم ہو گیا اور اب حاجی درزی نے آپ کے جرح کا یوں جواب دینا شروع کیا اور سوالات کا جواب دینا پڑا۔

... قصہ مختصر کیا ہے۔ اس اللہ کے بندے کو آج سے پندرہ دن پہلے یہ کپڑے دیئے تھے اور تاکید کر دی تھی کہ "الوداع" کے دن سب دے دینا۔ مگر یہ آج تک ٹالتا رہا۔

آپ ہی بتایئے کہ یہ صبح سے عید اور کپڑوں نے ابھی تک ملنے کا نام نہیں لیا۔ یہ کل کم بیچ کپڑے تیار ہوئے ہیں۔ اور دیکھئے تو ذرا یہ اس نے شیروانی سی ہے؟

مجھے اپنے کپڑوں کا تو اتنا خیال نہیں جتنا کہ بچہ کے کپڑوں کا ملال ہے۔ آپ ہی کہئے کہ اس معصوم بچہ کو آج کے دن کیا یہی شیروانی پہنا دوں؟

ارے صاحب یہ کون نہیں جانتا۔ مگر آپ ہی انصاف کیجئے کہ اس میں بھی کیا میری ہی خطا تھی؟

اس وقت تو روزہ وزہ بھی نہیں ہے۔

میاں چھ روپیہ فی شیروانی دیئے ہیں۔

اونہہ یہ دیکھئے بخیہ تک نہیں کیا۔

جی نہیں آپ نہ بولئے ہیں تو آج اس مکار کو

دوستی کرکے چھوڑ دیگا +

دیکھئے تو آپ بالکل نہ بولئے۔ اچھا تو یا تو
چھوڑ دیجئے۔ ہاں ہاں میں بیٹھا جاتا ہوں۔ تو
اُس نے بھی تو کئے کہ اُس نے آپ کی یا پینے
ابھی حضرت یہ یوں تھوڑا ہی باز آئیگا۔ وہ بیٹیکا
صاحب بھی ابھی یہی شکایت کے ملنے تھے
ہاں ہاں یہ وہ تو اُس نے اپنی عادت ہی بنالی
ہے۔ وہاں بس بے غیرت آدمی ہے ملا ولا
ملا۔ استغفراللہ +

خدا گواہ ہے اس کے ماموں کی آنکھوں کا
خیال ہے۔ وہ بیچارہ اسقدر بے زبان آدمی
ہے کہ آپ سے کیا بیان کروں۔ مگر یہ میاں
نکلے ہیں اپنے وقت کے تیس مار خاں۔ کہنے
لگے ہیں نا اب دو پیسے "+

غرض سرِ بازار اسقدر تو تو میں میں پر جب بازار کے لوگ
آپ کو ٹھنڈا کر چکے تو آپ خوشی سے دکان پر بیٹھ گئے اور
تھوڑی دیر میں درزی صاحب نے کپڑے اُلٹے سیدھے
کرکے آپ کے حوالے لئے۔ مگر اس طرح کہ کپڑوں میں دو چار
عیب ایسے ضرور باقی رہ گئے جن کو دیکھ دیکھ کر عید گاہ
تک آپ کا خون کھولتا رہا +

بعض مواقع پر یہ بھی ہوتا ہے کہ درزی صاحب عید
سے دو ایک دن قبل ہی کپڑے لیکر کسی دوسرے شہر کو
بھاگ جاتے ہیں۔ اور اسی طرح بعض تیز قسم کے روزہ دار
معدد درزی کوتوالی میں بھی دیکھے گئے ہیں +

چمار۔ اب تو کیا، لڑکیاں آج سے چند سال پہلے کی
بات ہے کہ چمار بھی بڑی چیز ہوا کرتا تھا۔ اس کے اقتدار
کا زور بھی عید کے موقع پر بیحد اذیت رساں ہوا کرتا تھا۔ لیکن جب
سے ہندوستان میں یورپ کے علوم جدیدہ اور فنون لطیفہ
آئے دیسی چمار کا زور کسقدر گھٹ گیا۔ "ڈاسن" کی چمار گری
نے ہندوستان میں "چماری ذوق" کو بیدار کیا۔ اِدھر غلامانہ
ذہنیت نے ہر غیر ملکی چیز سے محبت کرنا سکھا دیا۔ اس لئے
ڈاسن کے جوتے آئے اور بڑی سے بڑی قیمت پر ہندوستانیوں
کے "سر منڈھے گئے" پھر ابتدائی اسکولوں اور اسلامیہ کالجوں
سے جو نوجوان "تعلیم یافتہ" ہوکر نکلے اُنہوں نے ماسٹروں
اور پروفیسروں کی غلامانہ یورپ پسندی کے صدقہ سے
اپنے ہاں کا دیسی "تیرھواں، چودھواں، اور پندرھواں"
چھوڑکر "چھ چار، سات چار اور آٹھ چار" خریدنا شروع
کردیا تو "چرم سواد اکبرآباد" میں "فٹ ویر" اور "ولیتھ فیکٹری"
قایم ہوگئی۔ اُدھر پنجاب کو "دی بھاٹہ شو فیکٹری" نے ان انگریزی
جوتوں سے مالا مال کردیا۔ پھر اپنے ہاں کے چماروں نے بھی
یورپ کے جوتوں کی تعلیم جو دینا شروع کیا تو ہزاروں بی اے
پاس "اشرافِ ہند" "جوتا ساز" "جوتا گر" "جوتا شناس"
اور "جوتا دان" ہوگئے۔ لیکن جس طرح شادی کے پیغام میں علاوہ
تعلیم و تنخواہ کے سارے خاندان کے ارکان کا تذکرہ بھی
اس روشنی کے زمانہ میں کہیں کہیں ضروری سمجھا جاتا ہے اُسی
طرح آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو اب بھی دیسی جوتا ہی پسند
کرتے ہیں۔ اور تعداد کے لحاظ سے ایسے ہی دیسی جوتا پسند
افراد زیادہ ہیں +

پس ایسے لوگوں کے لئے یہ دیسی چمار عید کے موقع
پر اذیت اور نقصان کا خاصا سامان فراہم کردیتا ہے +

اس دیسی چمار کی شان یہ ہے کہ یہ شہر کے ایک ایسے
گندے اور تاریک حصہ میں رہتا ہے جہاں شہر کی میونسپلٹی

کا "ایست بوٹ اینڈ کنٹ گھر" بھی ہوتا ہے۔ اس کا کمرہ یا کوٹھڑی "لیدر ڈپارٹمنٹ" اور غلاظت کا چھوٹا سا کارخانہ ہوتی ہے۔ اس کے اہل و عیال کی وہ کثرت ہوتی ہے کہ الامان۔ دین ہے اور پھر اس کے بال بچوں کا میلاپن اور شور و غوغا وہ کہ "والحفیظ" امیں آمیں۔ بقدر ستر دھوتی کے سوا یہ "چمار" دوسرا کپڑا اسی وقت استعمال کرتا ہے جب اسے کسی قومی زیارت پر جانا از بس لازم و ضروری ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے لال پیلے جوتوں سے آج ہندوستان کے کروڑوں مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ اشراف ہند کی بھی بات بنی ہوئی ہے۔ یہ بہتر سے بہتر جوتے کے دام آج بھی سوا چار روپیہ سے لے کر پانچ روپیہ تک ہی لیتا ہے۔ اشراف ہند تنگ دستی کے باعث اس دیسی چمار کا خاصہ فطرت یہ ہے کہ یہ گاہکوں کی کثرت سے کبھی دل تنگ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے جسقدر بھی گاہک آئیں یہ سب کی فرمائشیں قبول کرتا جاتا ہے۔ یہ ہر گاہک سے چار دن کا وعدہ کرتا ہے۔ اس کے ہاں تیار شدہ جوتے نہیں ملتے بلکہ تازہ بتازہ۔ اور "نو بنو" بہم پہنچتا ہے۔ یہ جب جوتا بنانے کے لئے "زبان کر لیتا ہے" یا "زبان ہار دیتا ہے" تو اسے اسی وقت بیعانہ کے طریق پر کچھ رقم دینا ضروری ہو جاتا ہے درزی اور دھوبی کی طرح یہ بھی عید سے ایک دن قبل جوتا دینے کا وعدہ کر لیتا ہے۔ اس کے ہاں غریب لوگ اپنا۔ اپنے ننھے میاں کا۔ ننھی کا۔ والدہ کا۔ خالہ کا۔ دادی کا۔ نانی کا۔ چچی کا۔ پھوپی کا۔ بہو کا اور اگر موقع ملا تو ملازمہ کا بھی جوتا بنواتے ہیں۔ چونکہ یہ چمار ان جوتوں پر طلائی اور نقرئی رنگ کے ستاروں کے پھول بیل اور نقش و نگار فرماتے ہیں اس لئے غریبوں کے بچے عید پر ایسے جوتوں کا بڑے شوق سے انتظار کرتے ہیں۔ اور تقریباً روزانہ ہی اپنے "ابا میاں" سے تقاضہ کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے ابا میاں چمار صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو وہی "درزیانہ زبان" نظر آتا ہے بس کل پہنا حضور۔ مگر یہ "کل" لے جانا حضور کبھی عین عید کی رات ہی کو پورا ہوتا ہے۔ پھر اتنا فرق کہ جوتا جو گھر لے گئے تو یا بالکل تنگ یا بالکل ڈھیلا۔ درزی اور چمار کی لڑائی میں صرف اتنا فرق ہے کہ چمار کی تو تو میں میں میں اس کے ننھے کی ماں بھی حصہ لیتی ہے اور درزن سے کچھ زیادہ بولتی ہے۔ چمار کے تحمل کا یہ عالم ہوتا ہے کہ آپ کی ہر گالی پر نہایت ادب سے "بس بس حضور" کہہ دیتا اور سر نیچا کئے جوتا سینے میں مصروف رہتا ہے۔

یہ ہیں عید کے وہ "ارکان ثلاثہ" جن سے ہزار بار توبہ کے بعد بھی ہر عید پر معاملہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ ان لوگوں کی ذات سے علاوہ بے شمار پیدا خلاقیوں کے بے قیاس و بے اندازہ مالی نقصان بھی پہنچ رہا ہے۔ کیوں؟ محض اس لئے کہ ہندوستانیوں نے اپنے باپ دادا کی معاشرت اختیار کر لی ہے اور یہ وبا اصل میں پھیلی ہے اسکولوں اور کالجوں کے ان غلام طینت اور غلام سرشت ماسٹروں اور پروفیسروں سے جو اپنی بے دماغی کی وجہ سے کم عمر اور کم سمجھ طلبہ کے سامنے ہر وقت پوری وضع و قطع میں موجود رہتے ہیں۔ ہندو بھائیوں کے رہنما اور لیڈر تو "لیجسلیٹو اسمبلی" میں بھی اپنی قومی دھوتی پہنکر جاتے ہیں۔ مگر ایک پچاس روپے کے مسلمان ماسٹر صاحب سے اسکول میں کبھی بغیر بوٹ پہنے جانا محال ہے۔

دھوبی، درزی، اور چمار جو کل سے آج دس گونہ زیادہ اُجرت لیتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کا کام اب وہ نہیں جو کل تھا۔ پس ملک کی فراغت اسی امر پر موقوف ہے

موسیو ڈیمانش ۔ میں تہ دل سے حضور کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ڈان ژوین ۔ لا وائیلیٹ میں ابھی تم سے سمجھتا ہوں۔ اور تم کو سکھاتا ہوں۔ کہ میرے ملاقاتیوں سے کیسے پیش آنا چاہئے۔ بدتمیز کہیں کا!

موسیو ڈیمانش حضور یہ کوئی بڑی بات نہیں +

ڈان ژوین ۔ تم نے موسیو ڈیمانش سے جو میرے بہترین دوست ہیں یہ کہا تھا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ خوب!

موسیو ڈیمانش حضور میں آپ کا خادم ہوں۔ میں صرف اس لئے آپ کی خدمت . . . ؛

ڈان ژوین ۔ (نوکر سے) اچھا جلدی سے موسیو ڈیمانش کے لئے ایک کرسی لاؤ +

موسیو ڈیمانش ۔ حضور میں اسی طرح . . . ؛

ڈان ژوین ۔ نہیں میں چاہتا ہوں کہ تم میرے مقابل بیٹھو +

موسیو ڈیمانش ۔ حضور اس کی کیا ضرورت ہے +

ڈان ژوین (نوکر) یہ سٹول اٹھاؤ۔ اور اس کی جگہ ایک آرام کرسی لے آؤ +

موسیو ڈیمانش حضور آپ خواہ مخواہ تکلیف کرتے ہیں

ڈان ژوین نہیں نہیں میں جانتا ہوں کہ کیا کرنا چاہئے میں نہیں چاہتا کہ ہم دونوں میں کوئی فرق . . . . ؛

موسیو ڈیمانش ۔ حضور . . . ؛

ڈان ژوین ۔ لو اب بیٹھ جاؤ ؛

موسیو ڈیمانش ۔ حضور میں ایسے ہی ٹھیک ہوں یہ اس لئے

ڈان ژوین ۔ جب تک تم نہیں بیٹھو گے میں ایک نہیں سننے کا ؛

موسیو ڈیمانش (بیٹھتے ہوئے) جیسے حضور کی مرضی ؛

ڈان ژوین ۔ ہاں ایسے ۔ اب کہو تمہاری صحت کسقدر قابل رشک ہے +

موسیو ڈیمانش ۔ میں حضور کے لئے . . . ؛

ڈان ژوین ۔ اچھا یہ بتاؤ کہ مسز ڈیمانش کیسے ہیں ؛

موسیو ڈیمانش ۔ خدا کے فضل و کرم سے اچھی طرح ہیں

ڈان ژوین ۔ کتنی بہادر عورت ہے

موسیو ڈیمانش ۔ حضور وہ آپ کی خادمہ ہے ۔ میری نہایت خدمت والا میں حاضر ہونے سے . . . ؛

ڈان ژوین ۔ اور ننھی کلاڈین کا مزاج کیسا ہے ؛

موسیو ڈیمانش ۔ وہ بہت اچھی ہے ؛

ڈان ژوین ۔ کیا اچھی بچی ہے مجھے اس سے بہت محبت ہے ؛

موسیو ڈیمانش ۔ یہ حضور کی مہربانی ہے ۔ اور میں حضور سے یہ . . . ؛

ڈان ژوین ۔ اور چھوٹا کولین کیسا ہے۔ کیا اب بھی وہ باجا بجاتا رہتا ہے ؛

موسیو ڈیمانش ۔ ہاں حضور ہر وقت شور مچاتا رہتا ہے ؛

ڈان ژوین ۔ اور تمہارے کتے برسک کا کیا حال ہے۔ کیا اب بھی وہ آنے والوں پر بھونکتا ہے ؛

موسیو ڈیمانش ۔ ہاں حضور اس کی یہ عادت کہاں جاسکتی ہے ؛

ڈان ژوین ۔ اچھا اب اپنے گھر کے متعلق اور کچھ کہو۔ مجھے دراصل اس میں نہایت دلچسپی معلوم ہوتی ہے ؛

موسیو ڈیمانش ۔ ہم تمام حضور کے نہایت شکرگزار ہیں ؛

ڈان ژوین ۔ (ہاتھ بڑھاتے ہوئے) ہاتھ ملاؤ کیا واقعی تم بھی مجھے اپنا دوست سمجھتے ہو ؛

موسیو ڈیمانش: میں حضور کا خادم ہوں۔

ڈان ٹروین: مجھے تم سے بہت عقیدت ہے۔

موسیو ڈیمانش: حضور یہ میری عزت افزائی ہے۔

ڈان ٹروین: یقین جانئے میں تمہاری بہت قدر کرتا ہوں۔

موسیو ڈیمانش: مجھے اس بندہ نوازی میں کوئی شک نہیں۔

ڈان ٹروین: اچھا تو اب کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ گے نا؟

موسیو ڈیمانش: نہیں حضور مجھے ابھی واپس جانا ہے۔ میرا صرف یہ عرض۔ . . .

ڈان ٹروین: (اٹھتے ہوئے) لا فلیور! جلدی سے مشعل لے آؤ اور چار پانچ آدمیوں کو موسیو ڈیمانش کی مشایعت کے لئے بھیج دو۔

موسیو ڈیمانش: حضور اس تکلیف کی کیا ضرورت ہے میں اکیلا ہی چلا جاؤنگا۔

(سگنارل جلدی سے کرسیاں ہٹا لیتا ہے)

ڈان ٹروین: نہیں نہیں انہیں ضرور مشایعت کرنی چاہئے مجھے تم سے بہت دلچسپی ہے۔ علاوہ ازیں میں تمہارا قرضدار بھی ہوں +

موسیو ڈیمانش: آہ حضور . . .

ڈان ٹروین: مجھے اس حقیقت کا اعتراف ہے۔ اور میں بھری مجلس میں اسے کہنے کو تیار رہوں۔

موسیو ڈیمانش: حضور کیا ہی اچھا . . .

ڈان ٹروین: کیا میں اور کچھ تمہارے ساتھ چلوں؟

موسیو ڈیمانش: اچھا تو یہ سب تو معاف کرو میں پھر کہتا ہوں کہ میں تم سے بہت عقیدت رکھتا ہوں۔ اور تمہاری بہت قدر کرتا ہوں +

(چلا جاتا ہے)

سگنارل: (مصاحب) ان کو آپ سے بہت محبت ہے۔ اور وہ آپ سے بہت خوش ہیں +

موسیو ڈیمانش: سچ کہتے ہو انہوں نے مجھے اتنا زیر بار احسان کر دیا ہے کہ اب میں ہرگز ان سے روپے کا مطالبہ نہیں کر سکتا +

(مولیئر)

عبد البشیر انور بی اے
اسلامیہ کالج لاہور

عالمِ وجد میں

ہے کچھ تو ہیولائے باطن کی دل آویزی | تزئین ہے وحدت میں اظہارِ تجسس کی
ہے بحرِ تخیل کی موجوں میں ہم آہنگی | پیاسہ بھی نہ مرتب ہوں جذبات ہم آغوشی
مسحور ہے ضبط ایسا تصویر بنا گویا | کیا حسن کی طاقت ہے محسوس ہوا الفت
مطرب نے طبیعت کو بیتاب کیا اتنا | ٹوٹی نہ مگر پھر بھی مُہرِ لبِ خاموشی

سرمستی کا وہ عالم اور گوشۂ خلوت میں | لمحاتِ نشاط آگیں محبوب کی جلوت میں
اس سازِ حقیقت پر اس نغمۂ وحدت میں | بیخودی شارق! یہ بادہ کی سرجوشی

ابن حسن شارق
دہلوی

بہن کی محبّت

از جناب حامد اللہ صاحب افسر بی اے

سحرآباد کے ضلع میں پنا نامی ایک چھوٹی سی بستی ہے چودھری جان محمد عرف جونو خاں اس بستی کے زمیندار تھے۔ سحرآباد میں بھی ان کی کافی جائداد تھی۔ اور ایک روئی کا پیچ تھا۔ خاندانی مزاج کے اچھے نہ تھے۔ مغرور اور متکبر مشہور تھے۔ لیکن ایک بات سب جانتے ہیں۔ جونو خاں کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ دل کے بُرے نہ تھے۔ اُنہوں نے کبھی کسی کو دُکھ نہیں پہنچایا کبھی کو ستایا نہیں۔ اُن کا غصہ آندھی کی طرح چڑھتا تھا۔ مگر سخت سست الفاظ کا جامہ پہن کر نکل جاتا۔ وہ بادلوں کی طرح کڑکتے مگر اُن کی کڑک بے ضرر تھی کبھی دل میں بُرائی نہ رکھ سکتے تھے جس سے ناراض ہوں اُسے بُلوائیں گے۔ اُس کے گھر خود جائیں گے۔ کھیت پر ہو۔ قصبہ میں ہو۔ جہاں کہیں ہو اُسے تلاش کرینگے۔ اور اُس سے حرف حرف سب کہ دینگے۔ بس پھر اُن کا دل صاف ہے۔

یہی وجہ تھی کہ جونو خاں سے ساری بستی کے لوگ گھبراتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کا اچھا خاصا اثر تھا۔ ان کی کافی وقعت تھی اور لوگ ان کا لحاظ کرتے تھے۔

جونو خاں مال و متاع اور وجاہت و امارت کے لحاظ سے خوش نصیب تھے۔ لیکن اولاد کے اعتبار سے بدنصیب تھے۔ خدا نے ایک لڑکی دی سو وہ بھی گونگی۔ صفیہ صورت شکل کی ہزاروں میں ایک تھی۔ مگر خدا نے اُسے قوتِ گویائی سے محروم رکھا تھا۔ جب صفیہ کے دماغ میں کوئی خیال آتا اور اس کے اثر سے اُس کے ہونٹ پھول کی پتی کی طرح کانپنے لگتے تو اس کی ماں ٹھنڈے سانس بھرتی۔ صفیہ بہت بھولی اور سیدھی لڑکی تھی۔ پاس پڑوس کے لڑکے کھیلتے کودتے۔ وہ بیچاری سب کا منہ تکا کرتی۔ کوئی اُس سے بات نہ کرتا۔ کوئی اُس کے پاس نہ آتا۔ گھر میں ایک نیم کا درخت تھا۔ برسات آتی نیم میں جھولا پڑتا۔ لڑکیاں جھولتیں گیت گاتیں۔ بے زبان صفیہ کی کوئی بات نہ پوچھتا۔ تاروں بھری راتوں میں صاف و شفاف آسمان کے نیچے بیٹھکر سب کہانیاں کہتیں۔ پہیلیاں بوجھتیں۔ مگر صفیہ الگ کھٹولے پر پڑی ہوئی تارے گنا کرتی۔ معلوم ہوتا تھا کہ تارے اُسکے ہم زبان ہیں اور وسیع خاموش اور پُر عجب آسمان اسکا ہم آواز ہے جب گرمیوں کی دوپہر میں سب سو جاتے۔ جب دنیا کی مصروفیتیں غنودگی میں آجاتیں جب چڑیاں چُپ بیٹھ جاتیں تو نیم کے سایہ میں ایک بے زبان لڑکی خاموش فطرت سے ہمکلام نظر آتی۔

لیکن صفیہ دنیا میں تنہا نہ تھی۔ اس کے لئے بھی خدا نے ایک ہمدرد سہیلی مہیا کر دی تھی۔ جونو خاں کے یہاں ایک گائے تھی کیلی اُس کا نام تھا۔ یہ صفیہ کی سہیلی تھی کیلی نے صفیہ کے منہ سے اپنا نام نہ سُنا تھا۔ لیکن وہ اُس کے پاؤں کی آہٹ پہچانتی تھی۔ صفیہ گائے کے تھان پر آتی۔ اُس کے گلے میں باہیں ڈال دیتی۔ جب صفیہ کو گھر میں کوئی بُرا بھلا کہتا اور

[illegible] وس [illegible] ست کمل [illegible] پنچی [illegible]
[illegible] آتی [illegible] اسلام [illegible] تمالکیلی اس کے
[illegible] کے اس [illegible] مدد لیتی تھی [illegible] اپنا
[illegible] بالوں [illegible] آس [illegible] بازوں سے اس کے منہ
[illegible] مقدور بھر تسلی اور دلاسا دینے کی کوشش کرتی
[illegible] گزرتے رہے - آخر بیٹی جوان ہوئی [illegible] کے
بیاہ کا خیال اس کے ماں باپ کے لئے سوہان روح تھا۔
کہیں سے نسبت نہ آتی تھی - گاؤں میں لڑکے تھے - نیک
بھی، خوش کردار بھی، سمجھدار بھی - مگر صفیہ کے لئے نہیں
اس غریب کی ایک بے زبانی نے ساری خوبیوں کو ڈھانپ
رکھا تھا - صفیہ کی ماں بظاہر مدد [illegible] حاصل کرنے کے
لئے بباطن کسی اور مقصد سے بستی کی عورتوں سے ذکر کرتی -
"کیا کروں جوان لڑکی گھر میں بیٹھی ہے کہیں سے بات نہیں
آتی - کوئی عیب نہیں - کوئی برائی نہیں - ایک ہاں خدا نے
بے زبان کر دیا ہے - آخر کب تک اسے کوٹھے سے لگائے
بیٹھی رہوں - میں تو کہتی ہوں خدا فوج کسی کو لڑکی دے - پالو
پوسو - کھلاؤ - پہناؤ - جب جوان ہو تو گھر سے دھکیلنے کی فکر
پڑے" مگر اس تمام گفتگو کا اس کے سوا کوئی جواب نہ ملتا
"خدا سب کی مشکل آسان کرتا ہے - آخر کہیں نہ کہیں تو
نصیب لڑے ہی گا"

صفیہ کے بیاہ کا مسئلہ بناری کے لوگوں کے لئے
فرصت کے اوقات میں گفتگو کا خاص موضوع بن گیا تھا - عام
رائے یہ تھی کہ جونو خاں اور اُن کی بیوی لڑکی کے بیاہ میں
تاخیر کے ذمہ دار ہیں - جوان بیٹی کو گھر میں بٹھا رکھا ہے - یہ
بھی نہیں کہ بھوکے مرتے ہوں - خدا کا دیا سب کچھ ہے -
اگر کسی غریب نادار کے ہاں اس طرح خدانخواستہ بے بیاہی

تھی ہوتی تو اس [illegible] سارے گاؤں [illegible] نکو بنا دیتے -
[illegible] رہنے دیتے - [illegible] اپنی [illegible] کا شہتیر کیسے نظر آتا ہے
[illegible] موقع [illegible] اگلا دور کے رشتے سے جونو خاں
کی ایک [illegible] ایک لڑکا تھا شہباز نام -
[illegible] زیادہ [illegible] بھلا [illegible] سوا درست [illegible] ہے
[illegible] پڑھا لکھا [illegible] قرآن شریف
کے سوا [illegible] پڑھنے کا تو سوال ہی نہ تھا - کیونکہ شہباز کے
باپ کا یہ خیال تھا کہ پڑھنا ہمارے خاندان میں منحوس
ہے جس بچہ کو قرآن شریف کے سوا اور کچھ پڑھایا - وہی مر گیا
لیکن شہباز نے قرآن شریف بھی نہ پڑھا - دو تین برس تک
گھیر گھار کے کوشش کی مگر ڈیڑھ سپارہ سے زیادہ نہ پڑھ سکا -
نکھٹو اور بیکار آدمی گو خود اپنے گھر میں لعنت اور ملامت
کا نشانہ بنائے جاتے ہیں لیکن عام طور پر لوگ انہیں پسند
کرتے ہیں - اور وہ ہر دلعزیز اور مقبول عام ہوتے ہیں اور
پبلک کی ملکیت سمجھے جاتے ہیں - جیسے ہر گاؤں اور قصبہ میں
کسی کھلی ہوئی جگہ کی ضرورت ہوتی ہے - جو پال ہو یا پارک
جہاں کام سے فارغ ہو کر بے فکری سے اُٹھیں بیٹھیں اور
آزادی سے وقت صرف کریں اسی طرح ہر گاؤں کو دو تین
ایسے شخصوں کی ضرورت ہوتی ہے جنہیں دنیا کا کوئی کام
نہ ہو تاکہ فرصت کا وقت دلچسپی سے گزر سکے - چنانچہ شہباز
کو بناری کا بچہ بچہ جانتا تھا اور قریب قریب ہر شخص اُسے
پسند کرتا تھا -

شہباز میں کچھ خوبیاں بھی تھیں - وہ دلیر تھا - کفایت شعار
تھا - ملنسار تھا - خوش آواز تھا - اس وقت اُس کی عمر بیس
سال کے قریب تھی شکل و صورت کا اگر اچھا نہ تھا تو برا بھی
نہ تھا - ورزشی جسم تھا اور چھوٹا قد -

اپنی ماں کی تجویز پر صفیہ سے شادی کرنے کے لئے شہباز اس لئے راضی ہوگیا کہ وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ جونو خاں کی جائداد اور اس کے سارے مال و متاع کی تنہا وارث تھی۔ سیدھی تھی۔ نیک تھی۔ بے زبان تھی۔ قسمت میں پھوڑا اُٹھا تھا۔ جونو خاں لاکھ بل کھائیں۔ تیوریاں چڑھائیں۔ نیلے پیلے ہوں کیا ہوتا ہے۔ شادی ہوکر رہی جب مخالفت کی۔ بیوی نے آڑے ہاتھوں لیا "اللہ رکھے اٹھارہویں برس میں ہے۔ اب یوں کب تک لئے بیٹھی رہونگی۔ میں نے تو زبان دیدی۔ میں تو اب اپنے قول سے پھرونگی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر لڑکے میں بُرائی کیا ہے۔ تم تو دشمنوں کے کہنے سننے میں آ گئے ہو۔ ابھی بچہ ہے۔ کام کرنے کے دن آئینگے تو کام بھی کریگا۔ رہی صحت۔ سو اول تو کوئی ایسی برائی نہیں ہے۔ پھر ایک سے ملنے جلنے میں عیب کیا ہے۔ سب ہماری طرح گھر گھسنے ہوجائیں۔ تو دنیا کا نام کیونکر چلے۔ پھر صحت کا تو یہ ہے کہ تم درست کرسکتے ہو۔ یہ کوئی گونگے پن کی طرح لاعلاج مرض تو ہے نہیں کہ کسی طرح جا ہی نہیں سکتا۔ صحت کا درست کرنا تمہارے اختیار میں ہوگا۔ جیسے کہوگے کریگا"+

صفیہ کے بیاہ کو چار برس گزر گئے۔ بے زبان لڑکی نے خاوند کی خدمتگزاری کا حق ادا کردیا ادھر شہباز بھی سنبھل گیا۔ جونو خاں کے اشاروں پر چلنے لگا۔ سحر آباد کے روئی کے بیج کا سارا انتظام اس نے اس خوبی سے کیا کہ پہلے سے دوگنی آمدنی ہوگئی۔ لیکن اس دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے شہباز کی ساری آرزوئیں خاک میں ملادیں۔ خلاف امید جونو خاں کے ہاں بڑھاپے میں لڑکا پیدا ہوا۔ صفیہ کے ماں باپ کی اس بے موقع۔ بے جا۔ غیرواجب اور نامناسب حرکت سے شہباز کے دل پر ایک تیر سا لگا اور خود صفیہ نے اس نووارد حقدار کو پسندیدہ نظروں سے نہ دیکھا+

شہباز کے مزاج میں یکایک زبردست تغیر واقع ہوا۔ پہلے وہ جسقدر ملنسار اور مجلس دوست واقع ہوا تھا۔ اب اُسیقدر تنہائی پسند ہوگیا۔ دوست احباب سے ملنا جلنا ترک کردیا۔ سحر آباد والا روئی کا بیج بھی عدم توجہی کا شکار ہوا۔ پچھلے برس آمدنی اور خرچ برابر رہا۔ اس مہینے نقصان کا اندیشہ ہے۔ شہباز کی صحت بھی کچھ خراب ہوچلی۔ شکستہ اور خاموش رہنے لگا۔ جو غم درد الفاظ کی اعانت سے بے نیاز رہتا ہے وہ دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں اُتر جاتا ہے۔ اور اندر ہی اندر اپنا اثر کرتا رہتا ہے+

یہ صفیہ کی مصیبتوں کی ابتدا تھی۔ ان آوازوں سے بھری ہوئی دنیا میں بے زبان ہونا بدقسمتی کا مترادف ہے۔ تھوڑے دن بعد صفیہ کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ مرتے وقت اُس نے سال بھر کی جان سلطان کو صفیہ کے سپرد کیا۔ بے ماں کے بھولے بچے نے اپنی معصوم شرارتوں سے بہن کو ایسا گرویدہ کرلیا کہ وہ ایک منٹ کو اُسے گود سے نہ اُتارتی۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر اُس پر گرتا۔ اپنے چھوٹے سے منہ میں صفیہ کا منہ اُس کی ناک۔ اُس کے کان۔ اُس کی آنکھیں لینے کی کوشش کرتا۔ چھوٹی سی مٹھی میں اُس کے بال پکڑ لیتا اور پھر چھڑائے نہ چھوڑتا۔ پَو پھٹنے سے پہلے بیدار ہوجاتا۔ اور پوپلے منہ سے غوں غوں کرتا۔ اور صفیہ کو جگائے بغیر باز نہ آتا+

جب سلطان دو برس کا ہوا تو اُس کے باپ کا بھی انتقال ہوگیا۔ اب شہباز سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ جونو خاں کی جائداد کے انتظام میں سوائے اُس کے اور کسی کا ہاتھ نہ تھا۔ لیکن سلطان

شام ہوگئی۔ ہر طرف لوگ آنے جانے لگے۔ مگر ابھی سلطان گھر واپس نہ آیا۔ صفیہ کی بے چینی ہر منٹ بڑھتی رہی۔ وہ سینکڑوں مرتبہ دروازے پر آکر کھڑی ہوئی۔ مگر غریب نے زبان سے کسی کو نہ کہا کہ میرا بھائی ابھی تک گھر واپس نہیں آیا۔ تھوڑی دیر بعد شہباز گھر میں آیا۔ صفیہ نے بے تاب اشاروں میں سمجھایا کہ آج سلطان دوپہر باہر کھیلنے گیا ہوا ہے۔ اور ابھی تک گھر واپس نہیں آیا۔ شہباز نے بیوی کو کافی تسلی دی۔ مگر اس تسلی میں اپنی ہمدردی اور پریشانی کا اظہار مقصود تھا۔ وہ پریشان اور افسردہ خاطر تھا۔ مگر اس لئے نہیں کہ سلطان ابھی تک گھر واپس نہیں آیا۔ بلکہ اس لئے کہ کہیں راز افشا نہ ہو جائے +

رات ہوئی۔ سارے گاؤں میں شور مچ رہا تھا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ کوئی کچھ کہتا تھا۔ کوئی کچھ۔ لیکن چناری کا سنجیدہ طبقہ صحیح واقعہ کی تہ تک پہنچ گیا تھا +

صفیہ کا برا حال تھا۔ خدا نے زبان بھی نہ دی تھی کہ پاس پڑوس میں اپنا دکھڑا رو لیتی۔ ساری رات دروازہ میں کھڑے کھڑے گزاری۔ صبح ہوتے سحر آباد سے بھی خبر آگئی کہ وہاں کے سارے گلی کوچے چھان مارے۔ مگر سلطان کا کہیں پتہ نہ چلا +

دوپہر کے وقت وہی دونوں جلّاد کاشتکاروں کے بھیس میں شہباز کے پاس اپنی محنت کا معاوضہ وصول کرنے کے لئے آئے۔ جب شہباز کو یقین ہوگیا کہ اب سلطان دنیا میں موجود نہیں ہے تو روپے کا لالچ آیا، پانچسو روپے کی رقم کچھ کم نہیں ہوتی۔ پھر رقعہ نہ پرچہ۔ اور یہ کام اس قسم کا تھا جس کے اظہار سے خود ان پر الزام عائد ہوتا تھا۔ شہباز نے سوچا کہ اگر میں موعودہ رقم نہ دوں تو یہ لوگ کسی طرح مجھ سے وصول نہیں کر سکتے۔ چنانچہ اس نے صاف انکار کر دیا۔ فرضی کاشتکاروں نے ہر چند سہولت کے ساتھ روپیہ وصول کرنے کی کوشش کی۔ مگر جب کسی نتیجہ کا برآمد نہ ہوئی تو یہ کہہ کر چل دیئے "اب ذرا ہوشیار رہنا" +

شہباز کچھ کھٹکا۔ مگر یہ سوچ کر بے فکر ہوگیا کہ یہ لوگ میرا کر ہی کیا سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ مجھے بدنام کرنے کی کوشش کریں گے اور سلطان کی موت کا الزام میرے سر دھرینگے۔ مگر اس کا ثبوت کیا دینگے؟ خیر دیکھا جائیگا +

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہر طرف تاریکی چھا رہی تھی۔ کبھی کبھی ہلکے جھونکوں کی سرسراہٹ خاموشی کو عمیق تر بنا دیتی تھی کہ یکایک شہباز کے مکان کی چھت پر دھماکا ہوا۔ صفیہ بخار میں پڑی تپ رہی تھی۔ شہباز بے خبر سو رہا تھا۔ ایک چشم زدن میں دو قوی ہیکل دیو نما انسان ہاتھوں میں خنجر لئے زینے سے اترے اور دم کے دم شہباز کے پلنگ پر پہنچ کر ان میں سے ایک نے اس کے سینہ میں خنجر بھونک دیا۔ صفیہ بیہوش ہوگئی دونوں سفاک قاتل جس قدر نقد و جنس ان کے ہاتھ آیا لے کر خاموشی کے ساتھ جس راستہ سے آئے تھے اسی راستے سے چلے گئے اور مصیبت زدہ بے زبان صفیہ دنیا میں تنہا رہ گئی +

حامد اللہ افسر میرٹھی

....

نوروز

زندگی کے احساسات اور اس کی کیفیتیں عمر کے مختلف مراحل کے ساتھ رونما ہوتی رہتی ہیں۔ ایامِ طفلی کا لطف کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ اور عالمِ شباب کی کیفیتیں کچھ نوجوانوں ہی کو خوب معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح عالمِ پیری میں گذشتہ زمانہ کی یادیں جو پیر کے دل پر لگا کرتے ہیں اُن سے سال خوردہ لوگ ہی کچھ آشنا ہوتے ہیں +

ہرمزجی اب گذری کا تماشہ دیکھنے والوں میں سے تھے۔ سن و سال انہی کے لگ بھگ۔ اس لئے گذشتہ کی یاد اس بڑھاپے کے لئے نوکِ پیکاں سے بھی تیز تھی۔ یہ وہ یاد تھی جس کی سینہ کاوی سے ہرمز تڑپ اُٹھتا تھا۔ ہرمزجی شہر کے بڑے بڑے لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ وہ ایک تاجرِ کتب تھا۔ اور سوسائٹی میں اُس کی بہت عزت تھی۔ لوگ جب اُس سے ملتے تو ادب کا پہلو لئے ہوئے گفتگو کرتے۔ اُس کا خوبصورت مکان لبِ ساحل واقع تھا۔ اوپر کی منزل میں وہ رہتا تھا۔ اور نچلے حصے میں اُس کا کتب خانہ تھا لیکن وہ صرف کمیاب کتب کا ہی سوداگر تھا +

ہرمزجی عجیب طبیعت کا آدمی تھا۔ اُسے صنفِ نازک سے سخت نفرت تھی۔ وہ عام تقریبوں میں شامل تو ہوتا۔ لیکن ہمیشہ سب سے الگ تھلگ بیٹھا رہتا۔ لوگ صرف اُسے اس کی سرمایہ داری کے باعث ملا کرتے تھے۔ ورنہ عام طور پر اُسے پسند نہ کرتے تھے۔ ہرمز نے تمام عمر شادی نہ کی تھی۔ گھر کا انتظام اس کی ایک بیوہ ہمشیرہ کیا کرتی تھی لیکن اُسے بھی ملکِ عدم کو سدھارے برسیں ہو چکی تھیں۔ وہ اپنی اولاد کا ایک خوبصورت بچہ جس کا نام طاؤس تھا چھوڑ گئی تھی۔ ہرمز نے طاؤس کی پرورش بہت ناز و نعمت سے کروائی تھی۔ لیکن اُسے طاؤس سے کچھ الفت نہ تھی صرف ایک قسم کا اُنس تھا +

لوگ حیران تھے کہ ہرمز نے باوجود اس قدر مالدار ہونے کے شادی کیوں نہیں کی۔ اسی شہر میں بہت لوگ ایسے تھے جنہوں نے وہ زمانہ بھی دیکھا تھا جب ہرمز ایک چھوٹی سی دکان میں بیٹھا کتابیں بیچا کرتا تھا۔ ان دنوں وہ ایک کشیدہ قامت نوجوان تھا۔ بڑا زندہ دل اور با مذاق سمجھا جاتا تھا۔ مشکل تھا کہ گاہک اس کی دکان سے خالی ہاتھ نکلے۔ ان دنوں ہرمز بڑی کاوش سے سرمایہ دار بننے کی دھن میں لگا ہوا تھا +

گاہے گاہے ایک بڑی حسین لڑکی موٹر میں بیٹھ کر اُس کی دکان پر آیا کرتی تھی۔ اور بہت دیر تک بیٹھی کتابیں دیکھا کرتی تھی کبھی کبھی ہرمز اور یہ پارسی حسینہ ساحلِ سمندر پر شام کے وقت سیر کرتے بھی نظر آیا کرتے تھے۔ ہرمز کا کام برابر ترقی پر تھا۔ ایک قلیل مدت میں وہ شہر کے بڑے بڑے تاجروں میں شمار ہونے لگا تھا۔ اور اب وہ زیادہ تر نایاب اور نادر کتب کی تلاش میں رہتا تھا۔ لیکن کچھ دنوں سے نہ تو وہ طرحدار گاہک اس کے پاس آتا۔ اور نہ ہرمز ساحلِ سمندر کی جانب سیر کو جاتا +

طاؤس اس وقت ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ اور سوسائٹی میں بہت ہر دلعزیز تھا۔ غالباً اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ہرمز کی لاکھوں روپے کی جائداد کا وارث تھا۔ طاؤس نے خود بھی تعلیم کا چنداں خیال نہ کیا اور نہ ہرمز نے اس طرف کچھ توجہ کی۔ طاؤس ایک معمولی لکھا پڑھا آدمی تھا۔ اور اپنے ماموں کے کتب خانہ میں کام کیا کرتا تھا ◆

ہرمز اکثر اوقات ضروریات سے بہت زیادہ روپیہ طاؤس کو دیا کرتا تھا۔ طاؤس کو کتابوں کی نقش شناسی میں بڑا ملکہ حاصل تھا۔ اپنے ماموں کی طرح وہ بھی بیدار زندہ دل اور بامذاق نوجوان تھا۔ ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر ہر وقت نمایاں رہتی تھی۔ اس کے دیکھنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ ہر ایک خود بخود مسحور ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ طاؤس میں اور کوئی کمال نہ تھا ◆

ان دنوں شہر میں فیروزہ نام ایک مالدار پارسی حسینہ کا بہت چرچا تھا۔ فیروزہ اچھی تعلیم یافتہ تھی اور اسے نایاب کتب فراہم کرنے کا بہت شوق تھا۔ یہ حسینہ موٹر میں بیٹھی اکثر شہر میں چکر لگایا کرتی تھی لیکن اس کا بیشتر وقت ہرمز جی کے کتب خانہ میں ہی گزرتا تھا ◆

فیروزہ ہر روز ہرمز کے ہاں آیا کرتی اور ایک آرام کرسی پر بیٹھی مختلف کتابیں دیکھتی رہتی۔ ابتدا میں تو طاؤس الماریوں میں سے کتابیں نکال نکال کر بڑے ادب سے اسے دکھایا کرتا تھا۔ لیکن کچھ دنوں سے اب دونوں جانب سے کتاب کے پکڑنے اور پکڑانے میں کچھ دیر سی لگ جاتی۔ اور اکثر ایسا بھی ہوتا کہ کتاب لیتے وقت فیروزہ کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی طاؤس جھک کر کتاب اٹھا لیتا اور مسکرا کر پیش کر دیتا۔ کتاب گرنے کی آواز سن کر ہرمز اپنی جگہ پر بیٹھا بیٹھا ایک دوبار کھانس دیتا ◆

فیروزہ اور طاؤس میں اکثر باتیں بھی ہوا کرتی تھیں لیکن وہی کاروباری گفتگو ہوتی۔ لیکن اب کتاب لینے دینے کے ڈھنگ کچھ اور ہی تھے۔ اب دونوں کے ہاتھ بھی اکثر مل جاتے اور آنکھیں بھی چار ہونے لگیں ◆

یہ غیر ممکن تھا کہ طاؤس کا مردانہ حسن فیروزہ جیسی طرحدار حسینہ کے دل پر کچھ اثر نہ کرے۔ جب ہاتھ ملنے لگے تو دلوں میں بھی ایک قسم کی دھڑکن پیدا ہونے لگی۔ کتابوں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے جب دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے کی طرف اٹھتیں۔ تو دیکھنے کے یہ انداز کچھ اور ہی ہوتے۔ وہ باتیں کرتے کرتے رک جاتے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہتے۔ آخر فیروزہ مسکرا کر آنکھیں بند کر لیتی۔ اور پھر آہستہ آہستہ کھولتی لیکن ان نرگسی آنکھوں کے بند کرنے اور کھولنے کے انداز میں ہزاروں جذبات اور احساسات مضمر ہوتے۔ اس وقت کی خاموشی ان خوابیدہ جذبات کی ترجمان ہوتی جو دو کیف ہستی سے سرشار دلوں میں پنہاں تھے لیکن حجاب کا پردہ دونوں کے درمیان اب حائل ہوتا ◆

موسم بہار کے یہ دو تازہ پھول ایک دوسرے کی طرف مائل تو ہوتے۔ سب اظہار روا بھی ہوتا لیکن گفتگو کا موضوع پھر وہی کاروباری ہی ہوتا۔ بوڑھا ہرمز اپنی کرسی پر بیٹھا صرف ایک دوبار اچانک کھانس دیتا۔ گو حجاب دل کی امنگوں اور جوانی کے جذبات کی پردہ دری تو کرتا۔ لیکن کیوپڈ کا بے پناہ تیر مدت سے دونوں کے نوخیز دلوں میں پیوست ہو چکا تھا۔ فیروزہ اور طاؤس کے تمنا بھرے دل ایک دوسرے کی محبت کے الفت سے معمور ہو چکے تھے۔ اور کچھ عرصہ سے پوشیدہ ملاقاتیں

بوڑھا ہرمز ان باتوں سے آگاہ تھا لیکن دل میں
عہد کر چکا تھا کہ وہ ایک جنبش لب سے دونوں کے ارمانوں
اور تمناؤں کا خاتمہ کر دیگا۔

ایک روز فیروزہ ہرمز جی کے کتب خانہ میں بیٹھی مختلف
کتابیں دیکھ رہی تھی۔ اُسے ایک خاص کتاب کی بہت تلاش
تھی۔ جب اس نے طاؤس سے اس کا ذکر کیا۔ تو اُس نے
وعدہ کیا کہ وہ اگلے روز تلاش کر لیگا۔ کچھ دیر بعد فیروزہ
چلی گئی اور طاؤس اپنے کام میں لگ گیا۔ اُس وقت بوڑھا ہرمز
اپنی جگہ سے اُٹھا۔ چپکے سے ایک الماری کھول کر وہی
کتاب جس کی فیروزہ کو تلاش تھی اُٹھا کر اپنے کمرے میں لیگیا
اور پھر دوسرے دن جب فیروزہ کے آنے کا وقت تھا طاؤس
کو کسی کام کے لئے باہر بھیجدیا۔ طاؤس کے چلے جانے کے
بعد فیروزہ بھی آگئی۔ ہرمز اُسے دیکھتے ہی استقبال کیلئے
اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا:-

"کل آپ نے جس کتاب کے دیکھنے کا اشتیاق ظاہر
کیا تھا وہ موجود ہے"۔

فیروزہ اشتیاق سے بولی:-

"تو دکھلایئے"

ہرمز۔ اگر تکلیف نہ ہو تو میرے کمرے میں تشریف لے چلیں
وہاں اطمینان سے بیٹھکر دیکھئے۔

فیروزہ بوڑھے ہرمز کے ساتھ اوپر کی منزل میں گئی۔
ہرمز کا کمرہ بہت قیمتی اسباب سے آراستہ تھا۔ بڑے بیش قیمت
ایرانی قالین بچھے ہوئے تھے دیواروں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی
الماریاں رکھی تھیں۔ اور ان کے آئینوں میں سے کتابوں کی
مختلف قسم کی جلدیں نظر آرہی تھیں۔ آبنوس کی ایک چھوٹی سی

میز پر شیشہ کے ایک مرتبان میں ننھی ننھی مچھلیاں تیر رہی تھیں
سامنے کی دیوار پر ایک نہایت حسین سرو قد لڑکی کی تصویر
لٹک رہی تھی اس کے علاوہ دیواروں کی زیبائش کے لئے
جسقدر تصویریں آویزاں تھیں سب قدرتی مناظر کی تھیں۔

فیروزہ مخمل کے گدیلوں والی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور
ہرمز نے ایک الماری سے وہ ادبی کتاب نکال کر اور ذرا
جھکتے ہوئے اُسے پیش کی۔ فیروزہ نے مسکرا کر کتاب لے لی
اور بڑے اشتیاق سے دیکھنے لگی۔

کچھ دیر بعد ہرمز جو پاس ہی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ بولا:-

"اگر اجازت ہو تو ایک بات کہوں"

"فرمایئے" فیروزہ نے کتاب پر سے نظر اُٹھائے
بغیر جواب دیا۔

ہرمز ایک دوبار کھانس کر بولا:-

"آپ بہت تعلیم یافتہ معلوم ہوتی ہیں۔ کہاں تک تعلیم
حاصل کی ہے؟"

فیروزہ۔ کچھ بہت زیادہ تو نہیں۔ یہی کالج کی ایک دو ابتدائی
جماعتیں پاس کر چکی ہوں۔

ہرمز۔ لیکن طاؤس تو بالکل کورا ہی ہے۔ . . . . کمبخت
نے کوئی ہنر بھی تو نہیں سیکھا جو وقت پر کام آئے"۔

فیروزہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ ہرمز پھر بولا:-

"میرا خیال ہے کہ طاؤس آپ کو بہت چاہتا ہے۔
کتنا ناعاقبت اندیش ہے"۔

لیکن فیروزہ نے پھر بھی کچھ جواب نہ دیا۔ اور ہرمز پھر بولا

"میرا خیال ہے کہ آپ بھی اُسے پسند کرتی ہیں"۔

فیروزہ نے کتاب چھوڑ کر ہرمز کی طرف دیکھا اور کہا:-

"اس قسم کی باتیں کرنے سے آپکا مطلب؟"

ہرمز: آپ کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ طاؤس میرا بیٹا نہیں۔ میں
جسے چاہوں اپنا وارث قرار دوں"
فیروزہ: ہرمز جی! مجھے ان باتوں سے کیا مطلب میں
کسی کے خانگی معاملات میں دخل تھوڑا ہی دیتی ہوں"
ہرمز: ہاں یہ تو فرمایئے کہ کبھی طاؤس نے شادی کی درخواست
بھی کی؟"
فیروزہ کچھ پس و پیش کرتے ہوئے بولی
"کی تو نہیں۔ لیکن۔۔۔۔"
ہرمز: "آپ خاموش کیوں ہوگئیں۔ لیکن کیا؟"
فیروزہ (کتاب دیکھتے ہوئے) "اگر کرینگے تو کچھ بیجا نہ ہوگا"
ہرمز: "بہت بیجا ہوگا۔۔۔۔ بہت ضرر رساں"
فیروزہ: "تو کیا آپ مجھے یہاں اس قسم کی باتیں سنانے
کے لئے لائے تھے؟"
ہرمز: "جس روز آپ طاؤس سے شادی کا وعدہ کرینگی
وہ دن اُس کی تباہی کا دن ہوگا۔ سُن لیا آپ نے!"
فیروزہ (حیران ہوکر) "وہ کیسے!"
ہرمز: "میں طاؤس کو اپنی جائداد میں سے ایک کوڑی
بھی نہ دونگا۔ اور فوراً گھر سے نکال دونگا۔ اگر وہ میری
مرضی کے خلاف شادی کریگا تو وہ اور اُس کی بیوی
دونوں مفلسانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں گے۔
سُن لیا آپ نے؟"
فیروزہ کا چہرہ غصہ سے تمتما اُٹھا۔ وہ غضبناک ہوکر کرسی سے
اُٹھی قلمی کتاب فرش پر گر پڑی۔ "او ہو یہ تو بہت نایاب
کتاب ہے" کہتا ہوا ہرمز بھی اپنی جگہ سے اُٹھا لیکن فیروزہ
نے پاؤں کی ایک ٹھوکر سے کتاب دور پھینک دی۔ اور کمرہ
سے نکل کر نیچے آئی اور موٹر میں سوار ہوگئی۔

آج "نوروز" تھا۔ ہرمز اپنے کمرے میں ادھر اُدھر
آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا کہ اتنے میں طاؤس ایک بہت
خوبصورت لباس پہنے کمرے میں داخل ہوا۔ اور آتے ہی
بولا!۔
"ماموں جان! کل فیروزہ یہاں آئی تھیں۔ کیا وہ کتاب
لے گئیں"
"نہیں" ہرمز نے ٹہلتے ہوئے جواب دیا۔
"تو لایئے مجھے دیدیجئے۔ میں خود پہنچا آؤں"
"کیوں؟"
"آج نوروز ہے۔۔۔" طاؤس کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
"ہاں آج نوروز ہے" بوڑھے ہرمز نے لڑکی کی تصویر
کی طرف جو آتشدان کے اوپر لٹک رہی تھی دیکھتے ہوئے
کہا "تمہیں فیروزہ سے کیا واسطہ ہے"
"کچھ بھی نہیں"
"تو اب فیروزہ یہاں آنے کی جرأت کبھی نہ کرسکیگی"
"کیوں خیر باشد" طاؤس نے حیران ہوکر پوچھا۔
"کل میں نے اُسے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ تم
سے کچھ سروکار نہ رکھے" بوڑھا ہرمز ایک دو بار کھانس
کر بولا "تم جس راز کو مجھ سے چھپاتے ہوئے تھے وہ اس
احمق لڑکی نے خود ہی مجھے بتلا دیا۔ تمہاری ملاقاتیں آج سے
بند ہیں۔ سنتے ہو طاؤس؟"
"لیکن کچھ وجہ بھی؟"
"مجھے عورت سے سخت نفرت ہے۔ بہت سخت"
"لیکن کچھ وجہ بھی؟"
ہرمز: "اس تصویر کی طرف دیکھو۔۔۔ دیکھتے ہو طاؤس؟
یہ نوشابہ ہے۔ طاؤس میں بھی کبھی تمہاری عمر کا تھا کبھی میرے

دل میں ابھی وہی اُمنگیں موجزن تھیں جو آج تمہارے دل کی گہرائیوں میں طلاطم خیز ہیں۔ مجھے بھی نوشابہ سے . . . جس کی یہ تصویر ہے بہت محبت تھی اسے دیوانگی یا جنون کہو تو زیادہ مناسب ہوگا۔ نوشابہ کے حُسن کے دل آویزی دیکھنی ہو تو اس کی تصویر کی طرف دیکھو لو سنتے ہو طاوس۔ وہ ہر روز مجھ سے ملنے آیا کرتی تھی۔۔ ایک سرمایہ دار باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ نوشابہ کو غرور حُسن بھی تھا اور غرور ثروت بھی مجھے علم نہ تھا کہ وہ مجھ سے محض دل لگی کرتی ہے مجھے ان دنوں بھی نایاب کتابیں فراہم کرنے کا خبط تھا۔ مجھے تصویروں کی ایک بہت نادر کتاب کہیں سے اتفاقاً مل گئی۔ تم ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ بہی نور زور تھا۔ میں نے حنا سے اس کتاب کے پہلے صفحہ پر نوشابہ کا پیارا نام لکھا اور سُرخ گلاب کے دو تازہ پھول جلد کے اندر رکھ کر کتاب اپنی محبوبہ کو بھیج دی +

"میں اُس روز بہت خوش تھا۔ نوشابہ نے میرا تحفہ قبول کر لیا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اُس کا خادم کتاب واپس لے آیا۔ سنتے ہو طاؤس! یہی روز تھا میری حسرتوں اور آرزؤں کے خون کا دن میری تمناؤں اور اُمیدوں کی بربادی کا دن۔ نوشابہ کی سرد مہری اور بے وفائی نے میرے ارمانوں بھرے دل کو مسوس کر رکھ دیا۔ اس بیوفا سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ کاغذ کے ایک پُرزے پر تحفہ واپس بھیجنے کی وجہ تو لکھ دیتی۔ میں نے کتاب اُٹھا کر الماری میں رکھ دی۔ طاؤس سنتے ہو۔ اس واقعہ کو آج پورے پچاس سال گزر چکے ہیں۔ یہ کتاب اُس روز سے اُسی جگہ پڑی ہے۔ لیکن سمجھتے ہو کہ نوشابہ نے کیوں ایسا برتاؤ کیا۔ احمق! یہ سرمایہ داری کا غرور تھا . . . . لیکن وہ بھی میری آہ کا شکار ہو کر رہی۔ اسی شام کو اُسے بخار ہو گیا اور ایک ہفتہ کے بعد مینار خاموشاں پر سمندر کے پرندوں نے اس کے گوشت پر دعوت اُڑائی" +

بوڑھا ہرمز خاموش ہو گیا۔ طاؤس کچھ دیر بعد بولا:-

"لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر ایک عورت نوشابہ کی طرح بے وفا ہو" +

"میں بحث نہیں کرنا چاہتا میرا فیصلہ قطعی ہے"

طاؤس پھر بولا:-

"فیروزہ اتنی مالدار بھی نہیں۔ اور مجھے یقین جانیئے اس سے ایسی ہی محبت ہے جیسی کبھی آپ کو نوشابہ سے تھی"

ہرمز:- "خاموش رہو۔ کہہ جو دیا کہ فیروزہ سے تم شادی ہرگز نہ کر سکو گے" +

طاؤس:- "یہ ناممکن ہے"

ہرمز:- "تو اس گھر میں تمہارا رہنا بھی ناممکن ہے" +

طاؤس:- "معلوم نہیں یہ آپ کیا فرما رہے ہیں" +

ہرمز:- "یہی کہ تم میری مرضی کے خلاف کبھی شادی نہیں کر سکتے" +

طاؤس:- "اور اگر کر لوں"

ہرمز:- "اگر کر لو۔ تو میری جائداد میں سے ایک کوڑی کی بھی اُمید نہ رکھنا" +

طاؤس:- "تو کیا یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے"

ہرمز:- "قطعی"

طاؤس کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل جاتا ہے +

طاؤس کے چلے جانے کے بعد بوڑھا ہرمز کچھ دیر تو اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر آتشدان کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

اور تصویر کی طرف دیکھ کر بولا:-

"نوشابہ! آج بھی نوروز ہے۔ آج پھر ایک بار دُنیا میں اکیلا اور تنہا رہ گیا ہوں۔ . . . بیشک عورت انسان کے لئے رحمت کا فرشتہ بھی بن سکتی ہے۔ لیکن اگر چاہے تو اس کی زندگی کو برباد بھی کر سکتی ہے"۔

اب اچانک اُس کی نگاہ اُس الماری پر پڑی جس میں وہ کتاب رکھی تھی۔ ہرمز نے جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور الماری کھول کر کچھ دیر اس کتاب کی طرف خاموش کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے وہ کتاب وہاں سے اُٹھالی۔ لیکن اُس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کتاب فرش پر گر پڑی۔ اور گرنے کے ساتھ ہی سرخ گلاب کا ایک پھول جو سوکھ کر کاغذ ہو چکا تھا۔ کتاب سے گرا۔ بوڑھے ہرمز نے جھک کر یہ پھول اُٹھالیا اور بولا

"پھول بھی واپس کر دیا ظالم نے. . . . . لیکن میں نے تو دو پھول بھیجے تھے"۔

یہ کہتے ہوئے وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دوسرا پھول تلاش کرنے کے لئے کتاب کھولی تو پہلے ہی صفحہ پر جہاں اُس نے آج سے پچاس سال پیشتر حنا سے "نوشابہ" لکھا تھا اُسے کاغذ کا ایک پُرزہ ملا۔ اس پُرزہ پر لکھا تھا:-

"پیارے ہرمز

نوروز کا تحفہ جو آپ نے مجھے بھیجا ہے۔ اس سے مجھے وہ مسرت حاصل ہوئی ہے۔ جو شاید ہفت اقلیم کی دولت مل جانے سے بھی نہ ہوتی لیکن جہاں آپ نے حنا سے اپنی نوشابہ کا نام لکھا ہے۔ اُس کے نیچے وہ نام بھی جو آپ کی نوشابہ کو جان سے زیادہ عزیز تھا کر کتاب واپس بھجوا دیں۔ تاکہ میں اپنی سہیلیوں کو اپنے ہرمز کا تحفہ دکھلا سکوں +

گلاب کا ایک پھول جس کی پتی پتی سے مجھے اپنے ہرمز کی خوشبو آرہی ہے میں نے اپنے پاس رکھ لیا ہے لیکن دوسرا پھول جس سے شاید آپ کو اپنی نوشابہ کی محبت کی خوشبو آئے تحفے کے طور پر واپس بھیجی ہوں +

آپ کی دلدادہ

نوشابہ"

ہرمز نے یہ خط پڑھ کر اپنے سینہ پر زور سے ہاتھ مارا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اُس کی آنکھوں سے سیلابِ اشک رواں تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ اور نوشابہ کی تصویر کی طرف دیکھتا تھا کبھی تو اپنی عمرِ عزیز کے یوں برباد ہونے کا وہ ماتم کرتا۔ اور کبھی اس خیال سے اُس کا کلیجہ پاش پاش ہونے لگتا کہ اُس کی وفا شعار نوشابہ کو اس کی خاموشی سے کسقدر قلق اور صدمہ پہنچا ہوگا۔ کاش وہ اُس وقت اتنا تو کرتا کہ کتاب کھول کر ایک نظر ہی دیکھ لیتا +

اُس روز جب شام تک نوشابہ کو ہرمز کا کوئی پیغام نہ پہنچا تو اُس کے نازک دل کو اسقدر ٹھیس لگی کہ اُسی روز وہ بیمار ہوگئی اُسے تپ آنے لگی اور ایک ہفتہ کے بعد غمِ ہجراں میں گھل گھل کر اُس نے جان دیدی +

موت نے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ ایک دوسرے سے مل کر غلط فہمی رفع کر لیتے۔ مگر ہاں نصیب ہرمز اسیطرح بیٹھا اپنی قسمت پر آنسو بہا رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ طاؤس اور

فیروزہ سسکیاں لیتے ہوئے اندر آئی۔ طاؤس بولا

"نوشابہ جان۔ ہم آپ سے الوداع کہنے آئے ہیں"

لیکن ہرمز کو ان کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ وہ اس وقت اور ہی خیال میں تھا طاؤس اور فیروزہ خاموش کھڑے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ہرمز بیٹھی نیند سوتا معلوم ہوتا تھا۔ آخر اس نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا اور بولا

"نوشابہ! مجھے معاف کر دو۔ بیشک میری ہی خطا تھی ... ہاں ہاں میری غفلت شعاری نے تمہاری زندگی برباد کی .. میں تمہارا گنہگار ہرمز ہوں ... نوشابہ مجھے بخش دو .... چلو میں آتشکدہ میں چلکر تمہارے قدموں پر سر رکھ کر معافی مانگونگا .....

ہاں چلتا ہوں نوشابہ ......"

نوشابہ بوڑھے ہرمز کی زبان پر آخری لفظ تھا۔ اس کے چہرے پر موت کی زردی چھا رہی تھی۔ وہ ایک بار مسکرایا۔ اور پھر خود بخود اس کا سر جھک گیا۔ جب ڈاکٹروں نے اسے دیکھا تو وہ مرچکا تھا۔ دل کی حرکت بند ہوجانے سے موت واقع ہوئی تھی +

ایم-اسلم

غزل

(از چودھری رحم علی الہاشمی بی-اے- ایڈیٹر ہمدم)

انداز جفا دلِ مضطر سے پوچھئے ویرانگی کی حد کو مرے گھر سے پوچھئے
فرقت کا راز مردمکِ تر سے پوچھئے دریا کی تہ کا حال شناور سے پوچھئے
تاثیرِ حسن ٹوٹے ہوئے دل بتائیں کیا آئینہ پیش کرکے برابر سے پوچھئے
اقرار جرم عشق کروں گا ہزار میں اب سادگی سے یا اُسے چکر سے پوچھئے
تاثیر جنبشِ نگہِ مست مے فروش جام و سبو سے پوچھئے، ساغر سے پوچھئے
بربادِ دل کی خاک کا کچھ تو ملے نشاں بادِ صبا سے پوچھئے صرصر سے پوچھئے
کیا راز تھا جو دل سے زباں تک نہ آسکا مسند نشین عرصۂ محشر سے پوچھئے
قطرہ لہو کا ایک تھا سرمایۂ حیات وہ کس کے نذر ہوگیا نشتر سے پوچھئے
ہر جنبشِ ارادی سے باطن کی سرگذشت قاتل کی دل کی بات کو خنجر سے پوچھئے
گاندھی سے درد قوم کا پوچھا جو کچھ علاج کہنے لگے کہ آپ یہ لیڈر سے پوچھئے
اصرار پر یہ باولِ ناخواستہ کہا مجھ سے نہ پوچھئے مرے کھدر سے پوچھئے
قومِ غریب ہند کہاں جائے ہاشمی یہ بات آپ اب مرے دفتر سے پوچھئے

کامران مصوّر

(سراج الدین احمد نظامی کے قلم سے)

[فرہاسیس مشہور مصوّر ایوے فرالفی ساس کا بیٹا۔ ہجرت نبویؐ سے تیرہ سو برس پہلے کی پیدائش تھا۔ اسے اپنے فن پر کامل مہارت حاصل تھی۔ بالخصوص وہ تیز و تند جذبات کا برجستہ طاقت سے اظہار کر سکتا تھا۔ اسے مبدءِ فیض سے حیرت انگیز قوت اختراع عطا ہوئی تھی۔ اس کے بے رنگ انگاروں میں ایک خاص کشش پائی جاتی تھی اس کا مختلف کارناموں کی بدولت تمام ملکوں میں نام نکل چکا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ شہرت اسے اس تصویر کی وجہ سے حاصل ہوئی جس میں اُس نے ایتھنز کے شہریوں کا نقشہ۔ اُن کی تمام ناانصافیوں۔ نرمیوں بیوفائیوں۔ کمزوریوں۔ سرکشیوں اور گمراہیوں کے ساتھ جو اس حیرت انگیز قوم کے طبعی خواص تھے۔ ہو بہو کھینچکر رکھدیا تھا ایک مرتبہ وہ زیوکسس سے نبرد آزما ہوا۔ اور جب اُنہوں نے اپنے اپنے شاہکار نمایش کے لئے رکھے۔ تو پرندے ان انگوروں کے خوشوں کی طرف جنہیں زیوکسس نے رنگا تھا منقاریں کھولے ہوئے لپک کر آئے۔ فرہاسیس نے فوراً اپنی تصویر معائنہ کے لئے پیش کی۔ زیوکسس نے کہا "یہ پردہ ہٹادو تاکہ تصویر دکھائی دے" فرہاسیس کی تصویر یہی پردہ تھا۔ زیوکسس نے اپنی شکست کا یہ کہکر خود اعتراف کیا۔ "زیوکسس نے پرندوں کو مغالطہ میں ڈالا۔ مگر فرہاسیس نے خود زیوکسس کو مغالطہ میں ڈالدیا"

فرہاسیس کو اپنے فن پر اسقدر ناز تھا کہ وہ ہمیشہ ارغوانی لباس پہنتا تھا اور سر پر سونے کا تاج رکھتا تھا اور اپنے آپکو ددملک المصوّرین کہتا تھا۔ وہ اپنی تعریف میں آپ ہی رطب اللسان رہتا تھا۔ اُس کا یہ غرور لبا اوقات اُس کے دشمنوں کو سامانِ تضحیک فراہم کر دیتا تھا]

سفید مرمری دیواروں والے شہر ایفی ساس کے سبز زمردی باغوں میں دو نوجوان نوآموز تلامذہ بوڑھے سنگتراش پرانی نیکس کے پاس کام سیکھتے تھے۔ بوڑھا سنگتراش ایک پتھر کی تراشی ہوئی مسند پر جو اُس کے چہرے کی طرح بے آب و رنگ تھی۔ خاموش بت بنا بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے عصے کی نوک سے زمین کو ٹھکرا دیتا تھا۔ ہم دونوں اس کی بڑی عمر اور اس سے زیادہ بڑی ناموری کے لحاظ سے صنوبر کے سیاہ درختوں کا سہارا لئے ہوئے باادب کھڑے تھے۔ ہم ساکت و صامت اُس کے الفاظ کے منتظر تھے۔ اور اُسے بڑی عقیدت کے ساتھ جس کا اُسے خود بھی احساس تھا بغور دیکھ رہے تھے ہمیں معلوم تھا کہ وہ ان سب لوگوں کا ہمعصر تھا جنہیں دیکھنے کی ہمیں آرزو تھی۔ اور ہم اس خلقی ذہنیت کی پردہ کشائی چاہتے تھے۔ جو اُسے اور اُس کے ہمعصر ناموروں کو یکجنس کرتی تھی اس کی پیشانی میں کبھی وہ تصورات رقصاں تھے جن کی ہدایت میں ان ہاتھوں نے شاہنشاہ کاریا کے مقبرے کا ایک ایوان بنایا

تھا۔ وہ مجسمہ پانچ۔ تھون جو شہر تودولیہ کے دروازے پر استادہ ہیں۔ وہ پاسی فائی کا سانڈ جو عورتوں کو عجیب عجیب خواب دکھاتا ہے۔ اور اپولو کا برنجی مجسمہ اور محراب کا سرانی!! میں ان کے سنگتراش کو جتنے غور سے دیکھتا اسی قدر متیقن ہوتا کہ اس سنگتراش کو آسمانی قوتوں نے دست خاص سے تیار کیا ہوگا تاکہ وہ دنیا پر اُن کا مظہر بن کر اُن کے مصائص کو نمایاں کردے +

یکایک پاؤں کی عامیانہ آہٹ سنائی دی اور خوش دلی کی صدا آئی۔ نوجوان او فیلیئن چھلانگتا ہوا آ پہنچا اور چلّا کر کہنے لگا "برائی فیکس سنا! آپ نے شہر میں کیا چرچا ہو رہا ہے؟ اگر آپ کو سب سے پہلے یہ قصہ میں سنانے لگا ہوں تو میں اس خوشی میں آرطیمس کی نیاز دونگا۔ لیکن پہلے میں آداب تو بجالاؤں۔ میں بھول ہی گیا تھا"+

اب وہ ہماری طرف متوجہ ہوا۔ گویا وہ کہہ رہا تھا "میں جو کچھ تمہیں سنانے لگا ہوں اس کے لئے تیار رہو جاؤ"۔ پھر وہ یوں گویا ہوا "محترم اُستاد یہ تو آپ جانتے ہیں کہ کلیری ڈس ملکہ کی تصویر بنا رہا تھا!"

"ہاں لوگوں نے مجھ سے اس کا ذکر کیا ہے"+

"لیکن اس کہانی کا آخری حصہ! — کیا آپ وہ بھی سن چکے ہیں؟"

"تو کیا اس کے متعلق کوئی قصہ بھی ہے؟"

"قصہ بھی ہے؟ ...... تم میں سے کسی کو خبر نہیں! سنو کلیری ڈس ایتھنز سے خاص طور پر آیا تھا۔ اُسے محل میں لے گئے۔ ملکہ ابھی تیار نہ تھی۔ آخر دیر کے بعد آئی اور مصوّر کو خوش آمدید کہے بغیر تصویر کے لئے بن ٹھن کر نشست دینے لگی۔ وہ مسلسل اس عذر کی آڑ میں حرکت کرتی رہی کہ محبت نے اُسے بیتاب کر رکھا ہے۔ کلیری ڈس بڑی بے دلی سے تصویر بنا رہا تھا۔ اُس کا معمولی خاکہ بھی ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ ملکہ نے اپنی پیٹھ کی تصویر بنوانے کی خواہش کی"

"بغیر کسی وجہ کے؟"

"اس وجہ سے کہ (یہ اُس نے کہا تھا۔) اُس کی پیٹھ بھی اُس کے باقی جسم کی مانند خوبصورت ہے۔ اور تصویر میں یہ ضرور ہونی چاہئے۔ کلیری ڈس نے بجا طور پر کہا کہ وہ ایک مصوّر ہے سنگتراش نہیں۔ اور یہ کہ ایک شخص تصویر کو اُس کی پیٹھ دیکھنے کے لئے اُلٹ نہیں سکتا۔ اور کوئی شخص کسی عورت کی ایسی تصویر نہیں بنا سکتا جو کاغذ کی ہموار سطح پر ہر طرف سے دیکھی جا سکے ... ان باتوں کے جواب میں ملکہ نے صرف یہ کہا کہ یہ اُس کی خواہش ہے اور مصوّری کے قوانین اُس کے قوانین نہیں۔ اُس نے اپنی بہن کی وہ تصویر دیکھی ہے جو اُس نے پرسیفون کے بھیس میں اُتروائی تھی۔ اور اپنی والدہ کی بھی دیکھی ہے جو دیمینر کے لباس میں ہے اور وہ ملکہ ستراتونائیس اپنی دلی تمنا ظاہر کرتی ہے کہ وہ تین دیویوں کے لئے نشست دیکر تصویر اُتروائے+

"اُس کا یہ خیال کچھ زیادہ احمقانہ نہ تھا"+

ہمارا ساتھی اس رائے پر کچھ بگڑ سا گیا+

"تمہارا خیال ہے کہ کلیری ڈس نے انکار کر دیا۔ گو وہ ایسا کرنے کے لئے آزاد تھا۔ یہ دستور نہیں کہ مصوّر کو احکام دیئے جائیں۔ ایسی بات ہم برداشت نہیں کر سکتے۔ ملکہ کے والد دیمیترائیس نے بھی یہ بات کبھی نہیں کی تھی۔ جب اُس نے رودلیہ کا محاصرہ کیا جہاں اُس وقت پروتوجنیس کام کر رہا تھا۔ تو اُس نے شہر کے اُس حصہ کو آگ لگانے سے انکار کر دیا جہاں وہ سنگتراشی کے کام میں مشغول تھا+

برائی فیکس نے کہا: "مجھے یہ سب کچھ معلوم ہے۔ تم

آ گئے چلو"+

"بہت اچھا میں اسے مختصر کر دیتا ہوں، ہاں تو کلیری ڈس بڑا ناراض ہوا۔ لیکن اُس نے اپنا غصہ ظاہر نہ ہونے دیا ابھی اُس نے اُس کی پیٹھ کا انگارہ ختم کیا تھا کہ ملکہ اُٹھ بیٹھی اور اُسے کل آنے کو کہہ کر چلی گئی۔ اُس نے مان لیا اور چلا گیا۔ دوسرے دن اُس کا کون منتظر تھا؟ ملکہ کی جگہ ایک خادمہ جس نے کہا کہ ملکہ تھکی ہوئی ہے۔ اور اب وہ تصویر کے لئے کھڑی نہیں ہو سکتی۔ اُن کی جگہ میں تصویر کے خاتمہ تک کھڑی ہونگی۔ یہ ملکہ کی خواہش ہے!"

ہم ہنسی سے لوٹ لوٹ گئے۔ اور اس میں برائی فیکس بھی ہمارا شریک تھا+

اوفیلیئن نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے خوشی سے کہا۔ "خادمہ کا جسم بھی کچھ بھدا نہ تھا۔ کلیری ڈس نے اُسے بھی کھڑا کر کے تھکا دیا۔ اور پھر سرد مہری سے کہا کہ اُسے اب اُس کی ضرورت نہیں۔ اور پھر وہ اپنی تصویر مکان پر لے گیا۔

"ہاں تو گھر جاتے وقت اُس نے ایک ملاح کو دیکھا۔ جس کے متعلق کسی نے اُسے بتایا تھا کہ ملکہ اُس پر بُری طرح فریفتہ ہے۔ گو اس کا ثبوت کوئی نہیں۔ وہ کھلا کن تھا۔ تم اُسے اچھی طرح جانتے ہو کلیری ڈس اُس نوجوان کو اپنے ساتھ اپنے مکان پر لے گیا۔ اور چار دن تک اُس کی تصویر بناتا رہا اس کے بعد اُس نے دو ہلچل ڈالنے والی چھوٹی سی تصاویر بنانی شروع کیں جن میں ملکہ کو ملاح کی شکل میں دکھایا گیا تھا۔ پہلے ملاح کی طرف منہ کئے ہوئے۔ اور پھر پیٹھ۔ اُس نے ان تصاویر کو رات کے وقت سیلوکس کے محل کی دیوار سے لٹکا دیا۔ پھر وہ اس پورے انتقام کے بعد کسی جہاز پر سوار ہو کر فوراً مفرور ہو گیا۔ اور اب اُس کا کچھ پتہ نہیں۔ ملکہ اس بات کو جانتی ہے۔ اور اگر وہ غضب آلود ہے تو وہ اسے حیرت انگیز طریقہ سے چھپائے ہوئے ہے+

"سارا دن ایک ہجوم ان تصاویر کے سامنے جمع رہا ستر اٹوناٹیس کو اس کی خبر دی گئی۔ اور اُس نے بنفسِ نفیس دیکھنے کی خواہش ظاہر کی وہ اپنے دربار کے پچیس آدمیوں کے ہمراہ ان دونوں تصاویر کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ کبھی آگے بڑھتی کبھی پیچھے ہٹتی۔ گویا وہ اُن کی شکل و صورت کو بالتفصیل جانچ رہی تھی میں بھی وہاں موجود تھا اور خوف سے اُس کی نگاہوں کو دیکھ رہا تھا۔ اور حیران تھا کہ جب اُس کا غصہ انتہائی درجہ پر پہنچ گیا تو وہ کس کو قتل کریگی۔ اُس نے کہا: "میں نہیں جانتی کہ ان میں بہترین کونسی ہے! دونوں اپنی اپنی جگہ خوب ہیں"

. . . .

برائی فیکس نے ہماری اس شادمانی کے دوران میں صرف اپنی بھویں اوپر اُٹھائیں اور اُس کے چہرے پر جھُریاں پڑ گئیں جو اُس کی حیرت کو ظاہر کرتی تھیں+

اُس نے کہا: "اُس نے ثابت کر دیا کہ وہ اگر مغرور ہے تو نکتہ رس بھی ہے۔ ساری کہانی ہی عجیب ہے۔ لیکن تم اس کے ہیرو کی وجہ سے اسقدر نازاں یا خوش کیوں ہو؟ مجھے یہ دکھائی دیتا ہے کہ جو پارٹ ملکہ نے ادا کیا ہے۔ وہ بھی قابلِ قدر ہے"+

اوفیلیئن نے کہا: "اگر ملکہ جرأت کرتی تو وہ دور دراز سمندروں تک کلیری ڈس کا تعاقب کر سکتی تھی۔ اور اُسے ایک کتے کی موت مار سکتی تھی۔ اُس وقت وہ یونان کے خوبصورت ملک میں ایک وحشی عورت کے سوا اور کچھ نہ سمجھی جاتی۔ وہ جو ایتھنز کا باشندہ کہلانے کی خواہشمند ہے۔ ستر اٹوناٹیس اسوقت سارے ایشیا پر حکومت کرتی ہے۔ لیکن ایک ایسے شخص سے

شکست کھائی ہے۔ جس کا ہتھیار صرف ایک آہنی قلم ہے ۔ ۔۔۔ اس کی وجہ سے مصوّر بادشاہوں کا بادشاہ ہے۔ وہ اس سورج کی روشنی میں ایک لازوال ہستی ہے۔ اب آپ کو معلوم ہوگیا کہ ہم کیوں اتنے نازاں ہیں!"

بوڑھے مصوّر نے منہ کی ایک حرکت سے اپنی حقارت ظاہر کی۔ اُس نے جواب دیا "تم بچے ہو۔ ہم بھی ایسا ہی کہا کرتے تھے اور شاید معقول تر وجوہ سے کہا کرتے تھے۔ جب سکندر نے جھجکتے ہوئے یہ بیان کرنے کی کوشش کی کہ ایک تصویر عمدہ کیوں معلوم ہوتی ہے تو میرے دوست ایپی لیس نے اُسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ وہ اس بات سے رنگ پیسنے والے لڑکوں کو اپنے اوپر ہنسنے کا موقعہ دے رہا ہے۔ سکندر خاموش ہوگیا اور عذر کرنے لگا! مگر میں ایسے واقعات بیان کرنے کچھ مفید نہیں سمجھتا۔ ہمعصر بادشاہ کا مصوّروں کے متعلق اچھا یا برا جو بھی خیال ہو۔ اس سے تصویر کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تصویر کا معیار الگ ہے بلکہ ہوسکتا ہے کہ مصوّر اپنے آپ کو ایک کامران بادشاہ سے ہی نہیں۔ جو فاتح فوجوں کے ساتھ شہر میں داخل ہو رہا ہو۔ بلکہ دنیا کے تمام قوانین اور تمام سماوی قوانین سے بھی بالاتر سمجھے اور محض اس الہام کی پیروی کرے جو اُسے رعشہ براندام کر رہا ہو۔"

برائی فیکس اب کھڑا ہوگیا۔ ہم حیرت سے سرگوشیاں کرنے لگے۔ لیکن یہ کس نے کیا؟ آپ کس کے متعلق کہہ رہے ہیں؟"

بوڑھے نے جواب دیا: "شاید کسی نے بھی نہیں"

اُس کی آنکھیں نیم فراموش کردہ خوابوں میں کھوئی ہوئی معلوم ہونے لگیں اور وہ کہنے لگا: "ہاں مگر عظیم الشان فرہاسیس نے ... کیا یہ دانشمندی تھی؟ پہلے میں بھی ایسا ہی یقین کر لیا کرتا تھا۔ لیکن آج مجھے شک ہے۔ اور میں نہیں جانتا کہ اُس کے متعلق کیا رائے قایم کروں"

اوفلیئن نے میری طرف حیرت انگیز نگاہوں سے دیکھا۔ لیکن میں اُسے وہ معانی سمجھانے میں ناکام تھا۔ جو اس معمّر مصوّر کے الفاظ میں مضمر تھے۔

اُس نے کہا: "**برائی فیکس** ہم تمہارا مطلب نہیں سمجھے"

اُس نے ہمیں سمجھانے کے لئے اشارہ کیا "**فرہاسیس** کی تصویر **پرومی تھیس**"

"ہاں، ہمیں اُس کے متعلق کچھ بتاؤ"

"کیا تم نہیں جانتے کہ کس طرح **فرہاسیس** نے **ایکرلوپس** کا **پرومی تھیس** بنایا"

"نہیں ہمیں کسی نے نہیں بتایا کہ وہ کس طرح بنایا گیا"

"کیا تمہیں اس حیرت انگیز منظر کا کچھ پتہ نہیں۔ اس ہیبتناک کھیل کا جس میں سے یہ تصویر خون آلودہ ہو کر نکلی؟"

"ہمیں سارا واقعہ سناؤ ہمیں اس کا کچھ علم نہیں"

ایک لمحہ کے لئے **برائی فیکس** بڑی توجہ سے ہمارے چہروں کی طرف دیکھنے لگا گویا اسے ہماری روحوں کو ایسی پُر غم یاد سے بوجھل کرنے میں پس و پیش تھا۔ پھر اُس نے کہا:-

"بہت اچھا میں تمہیں سارا واقعہ سناتا ہوں"

(۲)

یہ واقعہ جو میں تمہیں بتلانے والا ہوں اُس سال کا ہے جس میں **افلاطون** فوت ہوا۔ میں اُسوقت **ہائی کارناسس** میں لمبے بالوں والے **ماسولاس اعظم** کے یادگار عالم مقبرہ میں مشغول تھا۔ یہ ایک نہایت بے داد کا کام تھا۔ **سکوپس** نے جو ہم سب کو ہدایات دیتا تھا فیصلہ کیا کہ وہ سامنے کا شرقی

حصہ خود منقش کریگا۔ یہ حصہ روشنی میں جگمگاتا تھا اور سب اسی کو دیکھتے اور داد دیتے تھے۔ باقی کے حصے یونہی بے توجہی کا شکار رہتے تھے +

اپنے ہمراہی تیمو تھیس کو اس نے پہلو کا حصہ دیا جو جنوب کی طرف تھا اور وہ کچھ ایسا اچھا نہ تھا۔ لیو کارس مغربی ماتھے پر مشغول تھا۔ میں نے اپنے لئے وہ حصہ منتخب کیا تھا۔ جس کی کسی نے خواہش نہ کی تھی۔۔ شمالی حصہ کا ایک بہت وسیع کام جو ہمیشہ سایہ میں رہتا تھا +

پلیتھس بھی اس عالیشان یادگار کے اوپر اہرام بلند کرنے میں مصروف تھا۔ اور چوٹی پر ایک رتھ ایستادہ کرنی تھی۔ جس کے آگے چار گھوڑے جُتے تھے۔ اس عمارت کے اخراجات اسقدر زیادہ تھے کہ فلاسفر انیکساگورس اسے دیکھ کر حیرت سے کہنے لگا: "آہ کتنی دولت پتھروں میں تبدیل ہوگئی!"

پانچ سال میں ننھی ننھی دیویاں اور جنگجو عورتوں کے مجسمے بناتا رہا۔ جو سورج کی روشنی میں زندہ عورتوں کی مانند معلوم ہوتے تھے۔ لیکن ہر دفعہ جب میں ایک مجسمہ بناتا تھا۔ تو میرے لئے یہ ضروری تھا کہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس عمارت کے سایہ میں نصب کردوں۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تاریکی میں رکھنے سے تمام زندگی پتھر سے نکل گئی ہے۔ اور اس وقت میرے آنسو نکل آتے۔ آخرکار میرا کام ختم ہوگیا۔ اور میں اٹیکا واپس جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس سال بھی بحیرۂ ایجین زیادہ محفوظ نہ تھا۔ ہر جگہ جنگ کا میدان گرم تھا۔ اور ہر ایک شہر کے درمیان آتش فساد بھڑک رہی تھی۔ اس دن جب میرا جانے کا ارادہ تھا مجھے کوئی ایسا جہاز نہ ملا جو مجھے پریس لیجاتا۔ کیریا کے باشندے جو بہت عمدہ سوداگر تھے فاتحین کی طرف ہوگئے۔ اور اس وقت سے جبکہ اولانتھس کے قبضہ سے کالس الی مقدونیہ کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ ہارلی کارناسس کے تمام سوداگروں نے یونانی جانے کے لئے اپنے جہاز بھر لئے۔ تاکہ وہ کاس کے ریشمی لبادے کینڈس کی رقاصہ عورتوں کے ہاتھ بیچیں۔ وینس سب سے بڑی دیوی تھی!!

میں بھی کالسس کی طرف روانہ ہوا۔ سمندر کا سفر میرے لئے ناخوشگوار تھا۔ میرے ساتھ جہاز کے اس اچھوتے گوشہ میں بھی اچھا سلوک نہ کیا گیا۔ جو میں نے مطمئن بیٹھنے کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ ان دنوں میرا نام اسکل کی طرح مشہور نہ تھا اور ماسولاس کی عظیم الشان یادگار ابھی لوگوں کے لئے بالکل نئی تھی۔ جہاز کے مسافر یہ معلوم کرکے مطمئن ہوگئے کہ میں ایتھنز کا باشندہ ہوں۔ بس اتنا کافی تھا وہ مجھے تمسخر میں اڑانے لگے۔ کیونکہ ایتھنز ان دنوں ایک بدقسمت شہر مانا جاتا تھا۔ ایک دن جبکہ سورج بلند تھا ہم کالسس پہنچ گئے۔ میں نے جہاز سے اتر کر اپنے تئیں ایک ہجوم کثیر کے درمیان کھو دیا۔ ایک شخص سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شہر کے باہر ایک غیر معمولی مینا بازار قایم ہے فیلقوس نے اولانتھس کے زوال پر شہر کو برباد کرکے ساری آبادی کو قیدی اور غلام بنالیا تھا +

وہاں تقریباً پینتالیس ہزار لوگ تھے۔ غلاموں کی منڈی انہیں ٹھکانے لگانے کے لئے دو دن سے قایم تھی۔ اور شاید اسے تین ماہ تک جاری رہنا تھا۔ شہر تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا تھا۔ اجنبیوں سے۔ خریداروں سے اور تماش بینوں سے! مجھے یہ سب کچھ بتانے والا شراب کا بیوپاری تھا۔ اس نے مجھ سے کسی قسم کی شکایت نہ کی بلکہ کہا کہ اسکا پڑوسی جو عمدہ غلام

بہت مہنگے بکتا ہے۔ تباہ ہو گیا ہے۔ میں نے شراب خانہ کے مالک کو بڑے ہاتھ ہلا ہلا کر یہ کہتے سنا ہے: "سوچو تو، تھریس کے ایک بیس سالہ باشندہ کی نسبت ہر شخص جانتا ہے کہ اُس کی کیا قیمت ہے۔ جب کوئی زمین کاشت کرنے کے لئے بارہ غلام خریدتا ہے تو وہ سونے کی بارہ تھیلیوں کی امید رکھتا ہے۔ اب واقعیت پر غور کرو پچاس ڈراچمس تک گر گئی ہے۔ اسی سے دوسروں کا اندازہ کر لو۔ ایسی بات کبھی نہیں سُنی گئی۔ بازار میں تین ہزار دوشیزہ لڑکیاں قابلِ فروخت ہیں۔ وہ پچیس ڈراچمس فی لڑکی کے حساب سے فروخت ہونگی۔ اور جناب یہ خیال نہ کریں کہ میں اس موضوع پر بے سوچے سمجھے گفتگو کر رہا ہوں۔ شاید زیادہ سفید چمڑے والوں کیلئے چند ڈراچمس زیادہ مل جائیں۔ آہ! فیلقوس واقعی ایک عظیم الشان بادشاہ ہے!!"

اس آدمی کی باتوں سے میں جلد اُکتا گیا۔ اور وہاں سے ہٹ کر ہجوم کے پیچھے ہو لیا۔ شہر کے کھلے دروازوں کے باہر دیہات کے وسیع میدانوں تک جہاں اہلِ اولانتھس خیمہ زن تھے۔ بڑی تکلیف کے بعد میں نے اُن گروہوں میں سے ایک راستہ بنایا جو بازار میں گھوم رہے تھے۔ معاً میں نے اپنے پاس سے ایک جلوس گزرتے دیکھا جو شاہانہ انداز کا تھا۔ لوگ دائیں بائیں ہٹ گئے +

چھ مسلح غلام دو دو کی قطار میں آگے آگے تھے۔ اُنکے پیچھے ایک حبشی نے دیودار کا ایک علم اُٹھا رکھا تھا۔ جو سونے سے مرصع تھا۔ یہ اُستادوں کا علم تھا۔ آخر میں نے فرماسیس کو دیکھا جس کے سر پر پھولوں کا تاج تھا۔ داڑھی میں خوشبو لگی تھی اور اُس نے ایک قرمزی جبہ پہن رکھا تھا۔ جب وہ چلتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ زمین کو ذلیل سمجھ کر پاؤں سے ٹھکرا رہا ہے۔ اُس کے دونوں بازو دو خوبصورت لڑکیوں کے کندھوں پر تھے اور وہ ہندوؤں کے فرضی دیوتا کی مانند معلوم ہوتا تھا +

اُس کی نظریں مجھ پر پڑیں۔ اور اُس نے کہا "مگر تم برائی فیکس نہیں تو کس نے تمہیں اجازت دی ہے کہ تم اُس جیسا چہرہ رکھو؟"

"اور تم اگر سیملی کے بیٹے نہیں ہو تو کس نے تمہیں یہ دیوتاؤں کا سا قد اور یہ قرمزی جبہ دیا ہے۔ جسے دیویوں کے نازک ہاتھوں نے بُنا ہے؟"

اس پر وہ مسکرایا اور خوبصورت لڑکیوں کے کندھوں پر سے ہاتھ ہٹائے بغیر اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر ہلایا اور اُسے ایک لڑکی کی عریاں چھاتی کے ساتھ دبایا +

"چارکلو" یہ اُس نے دائیں جانب کی نوجوان لڑکی سے کہا "میرے دوست کا ایک بازو تھام لو۔ اور آگے بڑھو۔ سورج کی روشنی بہت تیز ہو رہی ہے"

اُس کی خواہش کے مطابق ہم آگے بڑھے فرماسیس جسم کو تول تول کر اک شانِ خودنمائی کے ساتھ چلتا تھا۔ عورتوں کے چھوٹے چھوٹے قدم مصرعہ ہائے موزوں کے مانند معلوم ہوتے تھے۔ چند الفاظ میں اُس نے مجھ سے کام کے متعلق پوچھا میرے ہر جواب پر وہ چہک کر کہتا "ہاں، میں بخوبی سمجھتا ہوں" وہ ہر طویل گفتگو کو مختصر کرنا چاہتا تھا۔ پھر اُس نے اپنے متعلق کہنا شروع کیا: "اچھی طرح سمجھ لو کہ اب تم میری حفاظت میں ہو۔ کیونکہ میرے سوا ایتھنز کا ہر باشندہ جو اہلِ مقدونیہ کے قریب ہے۔ خطرے سے خالی نہیں۔ اگر ایک معمولی سی تکلیف تمہیں اُن کی عدالتِ انصاف میں لیجاتی تو میں تمہاری آزادی کی قیمت دو تانبے کے سکے بھی نہ دیسکتا

لیکن اب سنتی رہو۔

میں نے جواب دیا "میں خوف کو کچھ نہیں سمجھتا لیکن یہاں تمہارے نام کے سایہ میں ــــ"

اُس نے کہا "ہاں جب فیلقوس کو معلوم ہوا کہ میں اُس کے نئے شہر کی عزت افزائی کرنے لگا ہوں۔ تو اُس نے ایک افسر میرے استقبال کے لئے بھیجا جو میرے لئے شاہی تحائف لایا۔ اُن میں چھ قوی ہیکل غلام اور دو خوبصورت لڑکیاں ہیں جو تم دیکھ رہے ہو۔ قوت میرے جلو میں میرے آگے سے تکالیف دور کرنے کے لئے ہے اور حسن میری صحبت کو زینت بخشنے کے لئے ہے!"

میں نے سوال کیا "یہ مقدونیہ کی لڑکیاں ہیں؟"

اُس نے ہنس کر جواب دیا "رودیسہ میں رہنے والے اہلِ مقدونیہ کی لڑکیاں ہیں"

اور پھر فرہاسیلیس نے عجیب انداز سے کہا "یہ دو لڑکیاں آج رات تمہارے بستر کی زینت ہونگی۔ میرے لئے اور بہت سی ہیں۔ لیکن تم اکیلے ہو دوست۔ گو فرت و بو کے ان گلابی پھولوں کو میری طرف سے قبول کرو۔ ان کے جوان چکدار نرم جسم نہایت حسین معلوم ہونگے جب گہرے قرمزی رنگ کے بستر پر ــــ"

ہم اب اُس عظیم الشان منڈی کے پاس پہنچ گئے وہ ٹھہر گیا اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگا "تم تو مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھتے کہ وہ کونسی شے ہے جس کی تلاش میں مَیں یہاں آیا ہوں؟"

"مجھے یہ جرأت نہیں"

"پوچھ سکتے ہو کیا؟"

"نہیں۔ یقیناً نہیں میرا خیال نہیں کہ تم غلاموں کے خواہش نہیں ہوسکتے کیونکہ انہوں نے تمہیں اپنے غلام دے دیئے ہیں۔ اور نہ لڑکیوں کے کیونکہ جیسا تم کہتے ہو کہ۔۔۔۔؟

"میں اتھینز سے یہاں ایک ماڈل کی تلاش میں آیا ہوں، میرے دوست، اب تو تم حیران معلوم ہوتے ہو"

"تمہارے لئے ایک ماڈل! تو کیا اکاڈیمی اور پیرے اس میں کوئی نہیں جس کی تم تصویر اُتار سکو!"

اُس نے شاہانہ انداز سے کہا "ہیں، آدھ لاکھ کے قریب۔ میرے لئے تمام اتھینز تیار ہے اور تاہم میں اہلِ اولانتھس کی فروخت پر ایک ماڈل کی تلاش میں ہوں۔ تم سن لو گے کہ کیوں اور تم سمجھ جاؤ گے"

یہ کہہ کر اُس نے غرور سے اپنا سر اوپر اُٹھایا۔ پھر کہنے لگا "میں پرومی تھیس بناؤنگا!"

ان الفاظ کے بعد اُس کے چہرے نے اُس دہشت کا اظہار کیا جو پرومی تھیس کا موضوع ہے۔ وہ کہنے لگا۔ "تم جانتے ہو کہ ہر ایوان کے نیچے کسی نہ کسی قسم کا پرومی تھیس ضرور موجود ہے۔ یتماگورس نے بنایا اور پچا اپالوڈورس نے بھی بنانے کی کوشش کی۔ زیوکسس نے یقین کر لیا کہ اُس میں طاقت ہے کہ ــ لیکن ہم ایسی واہیات مصنوری کی یاد سے دماغ کو کیوں پراگندہ کریں۔ پرومی تھیس ابھی تک دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا گیا"

میں نے اُستاد کو جواب دیا "میرا بھی یہی یقین ہے!"

"مصوروں نے اپنی تصاویر میں دہقانوں کو عریاں اور لکڑی کی بنی ہوئی چٹانوں سے بندھا ہوا پیش کیا ہے۔ ان تمام کے چہرے بگڑے ہوئے ہیں۔ جیسے داڑھ میں درد ہو رہا ہو۔ عوام اسے جذبات کہہ لیں مگر پرومی تھیس، آگ کو چرانے اور ڈھالنے والا، انسان اور عقاب دیوتا کی کشمکش

کا مظہر، تمام عالم کے درد کا مجسمہ! نہیں نہیں، پراکسی ٹیلیس وہ پرومی تھیس آج تک تخلیق نہیں ہوا۔ مجھے اُس وقت بھی وہ صاف صاف تمہارے چہرہ کی طرح واضح نظر آ رہا ہو۔ میرا دماغ اسے بنا چکا ہے۔ اب میری آنکھیں اسکا انسانی نمونہ تلاش کر رہی ہیں!"

یہ کہکر اُس نے اپنی ساتھ والی لڑکی کا سہارا چھوڑ دیا۔ اپنا طلائی اور آبنوسی عصا اُٹھایا اور ہوا میں ایک خاکہ کھینچنا شروع کیا +

دو ماہ تک میں نے اپنی اس عظیم الشان تجویز پر کام کیا میں نے کریٹس کی سرزمین میں الیثی پولس کی راس پر کئی ایک عمدہ چٹانیں منتخب کی ہیں۔ ابتدائی کام سب ختم ہو گئے ہیں۔ میری تصویر کا مصالحہ تیار تھا۔ تصویر کا خاکہ مکمل تھا کہ معاً میں نے اپنا راستہ مسدود پایا۔ میں تصویر کے لئے سر کی تلاش کرنے میں ناکام رہا۔ اگر یہ صرف ایک ہرمز ایک اپالو یا بیتن کی تصویر کا سوال ہوتا تو ایتھنز کے تمام باشندے میرے سامنے فخر سے کھڑا ہونے کو تیار ہوتے مگر ایک ایسا آدمی ماڈل بنانا جس کا چہرہ الہام کی روشنی سے ملتہب ہو۔ اور پھر اُسے ہاتھوں اور ٹخنوں سے باندھ دینا! نہیں نہیں۔ یہ کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اور پھر ایک غلام کی طرح اُسکا بند بند جدا نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ایسے غلام کہاں جن کے سر آزاد لوگوں کے سے شاندار ہوں مگر فیلقوس نے کئی ایسے نمونے غلاموں کی منڈی میں جمع کر دیئے ہیں اور میں فیلقوس کا مال خریدنے آیا ہوں!"

میں تھرتھرا اُٹھا اور کہنے لگا "اولانتھس کا ایک باشندہ، مفتوحوں میں سے ایک، تم اس تصویر کو کس جگہ ختم کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"ایتھنز میں"

"ایتھنز کی آزاد سرزمین پر پہنچتے ہی تمہارا غلام خود بخود آزاد ہو جائیگا"

"درست ہو جائے گا لیکن اُس وقت جب میری خواہش ہو گی۔ اس سے پہلے نہیں"

"لیکن اُس وقت اگر تم اپنے قیدی سے یہ سلوک کرو گے تو کیا تمہیں قانون کا خوف نہ ہو گا؟"

فرہاسیس نے تبسم کے ساتھ سوال کیا "قانون؟ قانون! اس لبادے کی شکنوں کی مانند میری مٹھی میں ہے۔ یہ ارغوانی لبادہ جو میں اس وقت کاندھے پر ڈالے ہوئے ہوں!"

اُس نے ایک شاہانہ حرکت سے اپنے آپ کو لبادہ میں لپیٹ لیا۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ ساتھ ہی اس کی وسیع آغوش میں سورج بھی آ گیا ہے!

(۳)

اب ہمارے سامنے اولانتھس کے غلاموں کی منڈی تھی! ایک پورے شہر کی آبادی دوسرے شہر کی آبادی کے روبرو تھی۔ ایک فروخت ہونے کے لئے اور دوسری خریدنے کے لئے پچیس ہزار مرد عورتیں اور بچے جن کے ہاتھ اُن کی پشت پر جکڑے تھے، اور اُن کے ٹخنے ڈھیلی رسیوں سے بندھے تھے۔ اور نامعلوم مالکوں کے منتظر تھے جو ابھی ابھی انہیں خریدنے اور کسی نامعلوم مقام پر لیجانے کے لئے آنیوالے تھے۔ ایک سپاہی چالیس چالیس کی حفاظت پر مقرر تھا۔ خدام کا ایک گروہ ان میں روٹی اور پانی تقسیم کرتا۔ اُنہوں نے شور و غوغا سے آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی عظیم الشان دعوت ہو رہی ہے +

فرہاسیس۔ غلاموں کے بڑے "بازار" میں داخل
ہوا جہاں نوجوان مرد اور دوشیزہ لڑکیاں فروخت کے لئے
موجود تھیں۔ اور جنہیں دیکھ کر یہ خطرہ ہوتا تھا کہ وہ بڑی بڑی
قیمتوں پر بکیں گے۔ میں از حد حیران ہوا جب میں نے دیکھا
کہ اُن کے چہروں پر حزن وملال کے کوئی آثار نہیں۔ وہ
صرف متجسس معلوم ہوتے تھے۔ انسانی غم اور تکلیف جوانی
میں ایک خاص حد رکھتی ہے۔ اب وہ یہی سوچتے کہ اُن کا
غم ایک آقا کی حفاظت سے دور ہونے یا خفیف ہونے کو
ہے۔ اپنے گھروں کے تباہ ہونے کے بعد یہ خوبصورت
انسان اُس مایوسی کا پورا تجربہ کر چکے تھے جو رات اور دن
اُنہیں دے سکتے تھے۔ نوجوان مردوں نے بلا شبہ اپنے
آئندہ فرار کی اُمید باندھ رکھی تھی۔ دوشیزہ لڑکیاں شاید
ایک جنت کا خواب دیکھ رہی تھیں جو شاید اُنہیں کچھ آرام
دے۔ آئندہ حالات سے لاعلمی یا بختر کی وجہ سے ان میں
ایک قسم کی خوشدلی پائی جاتی تھی۔ ہجوم اُن کے گرد جمع تھا۔
اور اُنہیں بغور دیکھ رہا تھا۔ عام لوگ خریدنے سے پہلے
متذبذب تھے۔ بہت کم اشخاص ایسے وسیع انتخاب کے
درمیان جلدی سے فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اکثر غلاموں کو چھوتے
تھے اور اُن کے ہاتھ اور ٹانگوں کے پٹھوں جسم کی ملائمت
اور چھاتی کی سختی کو جانچتے تھے۔ اور خوب دیکھ بھال کر آگے
گزر جاتے تھے۔ اس خیال سے کہ شاید آگے اس سے اچھا
سودا بن جائے۔

فرہاسیس ایک لمحہ کے لئے ایک نوجوان لڑکی کے
سامنے ٹھیرا جس کا سفید لمبا ڈھانچہ رعنا خطوں کی ہم آہنگی
کا عمدہ نمونہ تھا۔

اُس نے کہا "دیکھو یہ ایک خوبصورت لڑکی ہے"۔

ایک سوداگر فوراً آگے بڑھا اور بلند آواز میں کہنے لگا
"یہ بہت حسین ہے میرے آقا! اس سے زیادہ کوئی سوداگر
نہیں دے سکتا۔ ذرا دیکھئے کیسی سرو قد ہے اور کیسی سفید!
کل تک اُس کی عمر سولہ سال تھی"۔

نوجوان لڑکی نے ٹوک کر کہا "نہیں اٹھارہ سال"۔

"زیوس کی قسم تم جھوٹ بولتی ہو! میرے آقا اسکی
عمر صرف سولہ سال کی ہے۔ اگر یہ کچھ کہے تو اس کی باتوں پر
یقین نہ کریں۔ ذرا اس کی سیاہ زلفیں تو دیکھیں جب یہ بال
کھولتی ہے تو وہ اس کے گھٹنوں تک گرتے ہیں۔ اس کی
لمبی لمبی سفید انگلیاں دیکھیں جو کسی قسم کی محنت سے آشنا
نہیں۔ یہ ایک رئیس کی بیٹی ہے"۔

لڑکی نے ڈانٹ کر کہا "میرے والد کی نسبت ایک
لفظ زبان سے نہ نکالو"۔

"یہ ایک جل پری کی مانند خوبصورت ہے۔ تلوار کی مانند
تیز اور بالکل باکرہ! جیسے وہ اپنی پیدائش کے وقت تھی"۔

پھر اس نے بڑے بے دریغ ہاتھوں سے اُس کا لباس
اُتار دیا۔ لیکن فرہاسیس نے زمین پر چھڑی مار کر کہا "کنواری
مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ وہ کنواری ہے یا نہیں۔ مجھے صرف
یہ چاہئے کہ وہ کافی خوبصورت ہو۔ اس کی بیڑیاں کھول دو
تاکہ وہ اچھی طرح لباس پہن سکے۔ میں اسے خرید لونگا۔ اس کا
کیا نام ہے؟"

اُس نے کہا "آرٹیمیڈورا"

"آہ خوب۔ ہاں تو آرٹیمیڈورا یہ جان لو کہ آئندہ تم
فرہاسیس کے جلوس میں رہوگی"۔

اُس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول دیں اور ادا سے
جھک کر کہا "تم ہی وہ فرہاسیس ہو جو ——"

سرمایۂ تحقیق

یعنی

آرگس بے حجاب بجواب غالب بے نقاب

(از جناب محمد احمد صاحب بیخود موہانی ایم اے پروفیسر شیعہ کالج لکھنؤ)

بسلسلۂ اشاعت گزشتہ

ادا کا لفظ بھی اس محل پر کس قدر جامع واقع ہوا ہے۔ اس لئے کہ اتنا عام ہے۔ جیسے دیکھنے کی ادا۔ سونے کی ادا۔ آنکھ ملانے کی ادا۔ آنکھ چرانے کی ادا۔ مسکرانے کی ادا۔ ہنسنے کی ہنسی روکنے کی ادا وغیرہ وغیرہ مصحفی کہتا ہے ؎

تنہا نہ ہنسانے کی ادا نے لی دل کو ٭ مکھڑے کے چھپانے کی ادا لے گئی دل کو

مختصر یہ کہ معشوق کی ہر بات اور اس کا ہر فعل ادا ہے ٭

اب جناب آرگس ملاحظہ فرمائیں کہ غالب نے اس پیش پا افتادہ مضمون کو آنی کے بے مثال شعر سے لیتے ہوئے کتنا اچھا کہا ہے ٭

غالب - بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم ٭ اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

عرفی وقت عرفی خوش کہ نگشود ند چوں در بر رخش ٭ بر درِ نکشودہ ساکن شد در دیگر نزد

آرگس - غالب کہتے ہیں کہ بندگی اور ذوقِ طاعت گذاری میں بھی ہم آزاد ہیں۔ اگر کعبہ کا دروازہ بھی نہ کھلا تو واپس آگئے۔ عرفی کا خیال ہے کہ دردوست نہ کھلا تو اسی بند دروازہ کے پاس ٹھہر گئے۔ مگر دوسرے دروازہ پر نہیں گئے۔ تقریباً ایک خیال دوسرے خیال کی ضد ہے ٭

سُہا - آرگس صاحب کہتے ہیں کہ تقریباً ایک خیال دوسرے کی ضد ہے۔ گویا سرقہ کی ایک قسم میں داخل ہے۔ اگر وفا اور خودداری آپس میں ضد و مقابل ہیں تو یقیناً ایک خیال دوسرے کی ضد ہے۔ مگر آرگس صاحب وفا کی ضد بیوفائی ۔ خودداری کی ضد بے غیرتی ہے۔ عرفی اپنے شعر میں ایک شانِ وفا اور غالب آن خودداری کا مضمون ادا کر رہا ہے ٭

بیخود - ان اشعار کے متعلق حضرت سہا نے بہت سمجھ کر لکھا ہے۔ اس لئے مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ انکی عبارت

میں نے اس لئے نقل کر دی کہ داد دینے کے محل پر خاموشی میرے مشرب میں گناہ ہے +

غالب　گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگئ جا کا　گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

بیدل　دل شوریدہ ما شور دریا در نظر دارد　گہر زدیدہ است ایجاز بانِ موج دریا را

آرمحس - تقریباً ایک مضمون ہے جس میں کوئی خاص فرق سوائے زبان کے نہیں ہے +

سہا - کیا خوب فرماتے ہیں جناب آرگس صاحب کہ تقریباً ایک مضمون ہے جس میں کوئی خاص فرق سوائے زبان کے نہیں ہے - چونکہ گہر اور دریا کے استعارے دونوں اشعار میں آ گئے - لہذا مضمون تقریباً ایک - اگر کوئی شخص کہے کہ لکھنؤ میں دریائے گومتی ہے اور کلکتہ میں دریائے ہگلی - آرگس صاحب فرما دینگے کہ چونکہ یہاں بھی دریا ہے وہاں بھی دریا - پس لکھنؤ کلکتہ ہے اور کلکتہ لکھنؤ - یا کوئی کہہ دے کہ طہران میں نگاران رنگیں ادا کی جلوہ طرازیاں عام ہیں تو آپ فرما دینگے کہ لکھنؤ بھی طہران ہے - کیونکہ یہاں سے رسالہ نگار نکلتا ہے - اس سخن سنجی کی منطقیت کے ساتھ آپ جس شاعر کے شعر کو چاہیں دوسرے شاعر کے کسی قسم کے شعر سے مطابقت دے سکتے ہیں +

غالب شوق یا عشق کی وسعت طلبی بیان کرتا ہے کہ دل کی وسعت اس وسیع جذبہ کے لئے ناکافی ہے - اور اس کی مثال میں دوسرا مصرعہ پیش کرتا ہے - یعنی جس طرح موتی میں بوجہ عدم وسعت اضطراب دریا کی گنجائش باقی نہیں رہتی - اُسی طرح میرے دل محدود (تنگ) میں داعیاتِ شوق و عشق کی تکمیل نہیں ہوتی +

بیدل کا مضمون کچھ اور ہے وہ کہتا ہے کہ میرے دل میں تمام عالم امکان کے مد و جذر (جزر) موجود ہیں - جس طرح کسی جزو میں اپنے کل کے تمام خواص پائے جاتے ہیں - اسی طرح ہر وجود ممکن میں تمام عالم امکان کے خصوصیات موجود ہیں کیا اب بھی دونوں مضمون ایک ہیں +

بیخود - میرے خیال میں اس وقت تک دیوان غالب کی جتنی شرحیں لکھی گئی ہیں - یہ شعر کسی میں حل نہیں ہوا - دل نہیں چاہتا کہ ناظرین کرام شارحین علام کی نکتہ نوازیوں سے محروم رہیں - اس لئے میں اپنی شرح کا یہ مقام نقل کئے دیتا ہوں +

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگئ جا کا　گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

جناب طباطبائی بالقابہ - یعنی شوق دل میں سما کر تنگئ جا کے سبب سے جوش و خروش نہیں دکھا سکتا - گویا دریا گہر میں سما گیا کہ اب تلاطم باقی نہیں رہا +

جناب حسرت موہانی اور جناب شوکت میرٹھی بھی بہ تغیر الفاظ یہی فرماتے ہیں - ہاں جناب واجد دکنی کا ارشاد قابلِ داد ہے - فرماتے ہیں +

واجد دکنی - شاعر نے اس شعر میں شوق کو دریا سے اور دل کو گہر سے تشبیہ دی ہے اور کہتا ہے کہ دریا یعنی شوق - گوہر یعنی دل میں محو ہو گیا - باوجود اس کے شوق تنگئ جا کا گلہ مند ہے - حالانکہ دل کی وسعت معلوم ہے کہ قلوب المومنین

عرش اللہ تعالیٰ عرش کی وسعت تمام آسمانوں سے بڑھ کر ہے مگر پھر بھی گلا باقی ہے تو یہ غضب کا شوق ہے۔ اگرچہ سچا موتی جثہ اور مقدار میں چھوٹی چیز ہے۔ مگر قیمت میں گراں ہوتا ہے۔ اسی طرح دل اگرچہ بظاہر ایک ذراتی چیز ہے۔ مگر کمالات باطنی اور روحانی کے لحاظ سے ایک بہت بڑی اور وسیع چیز سمجھی جاتی ہے۔ اس شوق کو تمام زمین و آسمان کی گنجائش کافی اور مکتفی نہ ہوگی +

قائل کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا شوق بے حد و حساب ہے۔ اس شعر میں اپنے شوق کی وسعت و فراخی کو بیان کرتا ہے مگر مرزا کا یہ طرز بیان اہل فصاحت کے پسند نہیں ہو سکتا +

دوسرے معنے اس طرح ہو سکتے ہیں کہ پہلا مصرعہ سالم استفہام انکاری مان لیا جائے۔ یعنی شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا گلہ نہیں ہے۔ کیونکہ دل بحیثیت جثہ ایک چھوٹی چیز ہے۔ اور گوہر سے مشابہ ہے۔ جس طرح دریا کا اضطراب گوہر میں نہیں ہوتا۔ اسی طرح شوق کا گلہ بھی دل میں نہیں ہے۔ کیونکہ وہ تو یعنی شوق دل میں فنا ہو گیا۔ اضطراب دریا تلاطم امواج سے مراد ہے۔ مگر ان معنوں کو بھی کا لفظ مزاحم ہے۔ یا بھی حشو سمجھ لیجئے کہ وزن کے لئے آ گیا اور معنا کوئی تعلق نہیں رکھتا مگر اس صورت میں حشو قبیح ہونا موجب ہے +

حضرت بیخود دہلوی - مرزا صاحب تعجب کے لہجے میں فرماتے ہیں۔ شوق کو تنگی جا کا گلہ دل میں بھی ہے بھی کا لفظ بتا رہا ہے کہ دل ایسی وسیع چیز ہے کہ دونوں عالم اس میں سما جاتے ہیں اور پھر خالی رہتا ہے۔ باوجود اس وسعت کے شوق کو جگہ کی تنگی کا گلہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ شوق کی وسعت بھی دل کی وسعت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اب تنگی جا کا ثبوت ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں گھر میں دریا کی روانی محو ہو گئی یعنی کوزہ میں دریا سما گیا۔ گرہ پڑ جانے کے سبب سے موجوں کی حرکت بند ہو گئی۔ دل کو گوہر سے اور شوق کو دریا سے تشبیہ دی ہے جو بالکل نئی تشبیہ ہے۔ سچ ہے کہ اس مطلع میں دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ اور لطف یہ کہ چستی بندش۔ تناسب الفاظ۔ طریق بیان (طرز ادا) میں فرق نہیں۔ دونوں مصرعے ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں +

حضرت نظامی بدایونی - شوق کو۔ اضطراب شوق کو۔ گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا۔ دریا گہر میں سما گیا۔ گوہر کو دل سے اور شوق کو اضطراب دریا سے مشابہت دی ہے +

خاکسار بیخود موہانی - مجھے اس مطلب سے اتفاق نہیں۔ اور اس کی دو وجہیں ہیں +

اوّل۔ موجودہ صورت کو اضطراب عشق کی مذمت کہہ سکتے ہیں مدحت نہیں کہہ سکتے یعنی بیقراری شوق کچھ ایسی تھی کہ دب کر یہی سمٹ کر سہی۔ کسی طرح دل میں سما تو گئی اور اپنا سارا جوش و خروش کھو بیٹھی +

دوم۔ نہ اس میں اتنی وسعت تھی کہ دل اس کا ظرف نہ بن سکتا۔ اور نہ اتنی قوت تھی کہ ظرف تنگ میں بھر دیئے جانے کے بعد اسے توڑ کر نکل آنے پر قدرت ہوتی۔ یہ عام قاعدہ ہے کہ جب کوئی شے (خاصکر سیال شے) جو قوی بھی ہو مقدار میں بھی زیادہ ہو۔ کسی چھوٹے ظرف میں بھری جاتی ہے تو سماتی نہیں۔ اور اگر سما بھی جائے اور ظرف کی مضبوطی سے اس شے کی قوت زیادہ ہو تو ظرف کے ٹکڑے اڑ جاتے ہیں۔ شوق کا ظرف دل میں پورے طور پر سما جانا اس کی وسعت اور

توڑ کر نکل نہ آنا اضطراب کے منافی ہے۔ فافہم +

اور اگر مرزا کو یہی کہنا ہوتا جس میں اتنی خرابیاں موجود ہیں تو یوں فرماتے ؎

محو ہے شوق کو بھی دل میں تنگیٔ جا کا　　گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

یعنی جس طرح دریا کو گہر میں اظہار اضطراب کا موقع نہ ملنے سے تنگیٔ جا کی شکایت ہے۔ اسی طرح اضطراب شوق کو دل میں مایۂ ناز دعلی حضرت بیخود بالقابہ کا یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ گہر اور دل کی تشبیہ نئی ہے۔ اس قول کو بیدل کا یہ شعر باطل کئے دیتا ہے ؎

دل آسودۂ ما شور دریا در نظر دارد　　گہر دزدیدہ است اینجا زبان موج دریا را

اب مجھے حضرت آسی اور جناب تمنا (شارح دیوان غالب) سے کچھ عرض کرنا ہے۔ حضرت آسی فرماتے ہیں

جناب آسی۔ میرا شوق اتنا زیادہ ہے کہ اس کو میری تنگدلی کی شکایت ہے۔ یہ واقعہ ایسا ہے کہ جیسے ایک موتی میں تمام دریا سما گیا۔ مگر یہ مضمون مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی کے یہاں یوں بندھا ہوا ہے۔ صفائی وغیرہ وہاں بھی نہیں ہے۔ مگر ہم مضمون ہونے کی وجہ سے شعر لکھتا ہوں ؎

بیدل　　دل آسودۂ ما شور دریا در نظر دارد　　گہر دزدیدہ است اینجا زبان موج دریا را

یعنی ہمارا دل جس کو آسودہ دیکھتا ہے اس میں ایک عالم کا شور سمایا ہوا ہے۔ گویا موتی میں دریا بھر کا اضطراب ہے +

التماس بیخود موہانی۔ اس فاضل شارح نے کچھ اس طرح دونوں شعروں کا مفہوم بیان کر دیا ہے کہ بیساختہ پیار آتا ہے اس پر غضب یہ کیا کہ دونوں کو ہم مضمون بھی کہہ دیا۔ اور بیدل کے شعر کا مطلب تو اس طرح سمجھا کر لکھ دیا ہے کہ سخن فہمی بلائیں لے۔ نکتہ سنجی صدقے ہو۔ حالانکہ بیدل علیہ الرحمہ صاف صاف کہتے ہیں :-

ہمارا نفس مطمئنہ (دل آسودہ) عالم امکان کے تمام شور و شر نظر میں رکھتا ہے۔ عجب تماشا ہے کہ موتی نے موج دریا کی زبان چرا لی ہے یعنی جو لوگ ہنگامۂ ہستی کے شور و شر میں الجھے ہوئے ہیں وہ اس کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ لے ہم لوگ (اصحاب نفس مطمئنہ) خوب سمجھتے ہیں۔ اور ہم اسے بیان بھی کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد حیرت سے کہتا ہے کہ عجیب بات ہے کہ یہ موتی (دل آسودہ) موج دریا کی زبان بن گیا ہے یعنی بالعموم سمندر کے تلاطم کا حال موجوں سے معلوم ہوتا ہے لیکن یہاں موتی (جس میں خوابیدگی کے بجائے آرمیدگی ہے) طوفان کی حالت ظاہر کر رہا ہے۔ اب اہل انصاف نظر فرمائیں کہ ایسے دو شعر جن میں صرف گہر اور دریا مشترک ہے کہاں تک ہم مضمون کہے جانے کے قابل ہیں۔ اور بیدل کے شعر میں صفائی نہیں کہ جدت نہیں۔ بلندی نہیں کہ لطافت نہیں۔ مختصر یہ کہ کیا نہیں ہے +

اہل خبر جانتے ہیں کہ غالب نے اقتباس کی ہے یا دان اہلانہ نے پردگی کی ہے جس کا جلوہ کیفہ آسی (شرح دیوان غالب) میں نظر آتا ہے۔ صرف اتنا فرق ہو گیا ہے جتنا انسانی آواز اور قرنا کی صدا میں ہوتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اب یہ آواز کچھ زیادہ ہیبتناک اور زیادہ سامعہ خراش ہو گئی ہے۔ ہم جناب آرگس کو جانتے ہیں۔ مگر جب انہوں نے خود آرگس کا روپ بھرا ہے تو پردہ دری کچھ ضرور نہیں۔ اور عجب نہیں جو یہ پردہ اسی روز بد کے خوف سے اختیار فرمایا گیا ہو +

گویا گفتہ جناب تنہا کا حضرت آرگس نے دل آسودہ کو دل شوریدہ سے بدل دیا تھا۔ اس فارس مضمار نکتہ نوازی نے اشہب خامہ کو اسی میدان میں گرم جولاں کر دیا۔ اور فرمایا کہ بیدل کہتا ہے کہ میرے دل میں تمام عالم امکان کے مدوجذر (جزر) موجود ہیں جس طرح کسی جزو میں اپنے کل کے تمام خواص پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر وجود ممکن میں تمام عالم امکان کے خصوصیات موجود ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ مطلب اسقدر سمجھا کر لکھا ہے کہ سرسری نظر میں غلطی کا احتمال بھی نہیں ہوتا۔ مگر ان کو دیکھنا چاہئے تھا کہ اگرچہ دل شوریدہ اور قلزم طوفانی عالم امکاں میں مشابہت ہے لیکن گہر سے اس کا استعارہ غلط ہے اور کسقدر غلط۔ اس لئے کہ گہر میں آرمیدگی ہوتی ہے شوریدگی نہیں ہوتی +

اب میں مرزا کے شعر کا وہ مطلب عرض کرتا ہوں جس کی طرف کسی شارح کی نظر نہیں گئی اور جو نہایت صاف ہے کسی اعتراض کو بجوت نہیں دیتا +

حل۔ شاعر حیرت و استعجاب کے لہجہ میں کہتا ہے کہ اضطراب دریا تو گہر میں مٹ جاتا ہے مگر اضطراب شوق کو دل میں بھی گنجائش کی شکایت ہے +

حقیقت یہ ہے کہ شاعر نے نظر ڈالی تو سب سے زیادہ مضطرب۔ سب سے بڑھ کر طوفاں خروش چیز دریا (سمندر) کو پایا۔ اُس کے اضطراب۔ اُس کے جوش و خروش کا مقابلہ اضطراب شوق (عشق) سے کر کے ایک کو انتہا کا پست۔ دوسر کو انتہا کا بلند دکھا دیا۔ ظاہر ہے کہ بجلی کی تڑپ اگرچہ ضرب المثل ہے۔ مگر اس میں یہ بات کہاں۔ ابھی تڑپی ابھی غائب مگر دریا کا اضطراب آٹھ پہر چونسٹھ گھڑی رہتا ہے۔ اُس کی روانی کبھی رکتی نہیں۔ پھر جوش و خروش کا جو منظر دریا میں نظر آتا ہے۔ وہ بجلی میں کہاں +

مرزا کہتا ہے۔ کہ اضطراب دریا کو اضطراب شوق سے کیا نسبت۔ اضطراب دریا کی بساط صرف اتنی ہے کہ اُدھر دریا (پانی) نے موتی کی صورت اختیار کی۔ اُدھر اُس کا اضطراب (جو خاصۂ طبعی کی حیثیت رکھتا ہے) کافور ہوگیا اگرچہ موتی میں گنجائش ہی کتنی ہے۔ اُس کے مقابلہ میں اضطراب شوق کی وسعت دیکھئے۔ کہ دل ایسے مقام میں بھی تنگی جا کا شاکی ہے۔ جس کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اس میں صرف کونین ہی نہیں جلوہ ہائے ربانی بھی سما سکتے ہیں +

خواجہ میر درد ؎　ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے　میرا ہی دل وہ ہے کہ جہاں تو سما سکے

غالب　ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہوں　کرے ہے ہر بنِ مو کام چشم بینا کا

فیضی　ز ہر بنِ مو کہ می شنی گوششس　فوارۂ فیض او ست در جوششس

آرگس۔ غالب کا خیال ہے کہ ہر بن مو چشم بینا بن گیا ہے۔ مگر میں ابتک محرم نہیں ہوا۔ فیضی کہتا ہے کہ ہر بال ایک فوارہ جوشان فیض الٰہی ہے۔ بنائے اشتراک خیال بن مو پر رکھی گئی ہے +

تنہا۔ (جناب آرگس) بعد شرح اشعار کہتے ہیں کہ بنائے اشتراک خیال بن مو پر رکھی گئی ہے۔ یعنی آرگس صاحب کے نزدیک چونکہ ہر دو اشعار میں بن مو موجود ہے۔ لہذا دونوں شعروں کا مفہوم بھی ایک ہوگا۔ مگر بھی لفظ بن مو دونوں

شعروں میں ایک ہی مفہوم پر استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ فیضی کے یہاں واقعی لغوی مفہوم میں آیا ہے۔ لیکن غالب کے شعر میں محاورہ ہے جس کے معنی ہمہ تن کے ہیں مضمون کا فرق یہ ہے کہ غالب کہتا ہے کہ ہمہ تن چشم بینا ہو جانے پر بھی نظارۂ حسن سے کماحقہ محروم ہوں +

فیضی کہتا ہے کہ کائنات کا ایک ایک ذرّہ فیوض غیب سے طوفان بکنار ہے۔ مناسب تو یہ ہوتا کہ آرگس صاحب فیضی کے اس شعر کو ملا غنیمت کے شعر

غنیمت ؎ زمہرش سینہ ہا جولانگاہ برق ہا دل ہر ذرّہ در جوش انا الشرق

یا سعدی کے شعر ؎ برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

یا فیضی کے خود دوسرے شعر ؎

ہر گیاہی کہ از زمیں روید ہا وحدہٗ لاشریک لہ گوید ہا

کا ہم مضمون قرار دیتے۔ نہ کہ غالب کے مختلف المضمون شعر کا +

بیخود۔ جناب تمہا نے غالب اور فیضی کے اشعار میں جو فرق بیان کیا وہ صحیح ہے۔ میں اتنا اضافہ اور کرنا چاہتا ہوں کہ غالب کے شعر میں محرم کی لفظ لاجواب ہے۔ محرم وہ ہے جس سے پردہ نہ ہو۔ یعنی سراپا چشم بینا بن گیا ہوں پھر بھی ذات الٰہی جو حسن مجسّم ہے میری نظروں سے پنہاں ہے۔ لیکن آگے بڑھ کر جناب تمہا بہکنے لگے ہیں۔ غنیمت و سعدی و فیضی کے مذکورہ بالا اشعار کو ہم مضمون کہنا روا نہیں۔ یہاں حضرت تمہا نے وہی غلطی کی ہے جو جناب آرگس نے (یعنی موضوع بحث) اور مضمون شعر میں فرق نہیں کیا۔ میں سب کا خلاصۂ مطلب لکھے دیتا ہوں +

فیضی۔ در ہر بن مو الخ۔ جس بن مو پر نظر کیجئے اور کان لگا کر سنئے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے فیض کا فوارہ جوش میں ہے۔ جو طلب اور معرفت میں فیضی کے مرتبہ پر فائز ہو وہ اس شعر کا پورا لطف اٹھا سکتا ہے +

غنیمت ؎ زمہرش سینہ ہا الخ۔ اس کے آفتاب جمال یا عشق کے صدقے میں ہر سینہ برق زار بنا ہوا ہے اور ہر ذرّہ انا الشرق کا دعویٰ کر رہا ہے +

سعدی ؎ برگ درختان سبز الخ۔ ہرے بھرے درختوں کے پتّے اہل نظر کے لئے معرفت پروردگار کا دفتر ہیں +

فیضی ؎ ہر گیاہے الخ۔ زمین سے جو گھانس اگتی ہے وہ کہتی ہے کہ خدا ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔ لطف یہ ہے کہ جب کوئی درخت یا گھانس زمین سے نکلتی ہے تو پہلے صرف اس کی ایک پتّی باہر آتی ہے۔ فیضی نے اسی سے حسن تعلیل کی جلوہ گری کی ہے۔ جناب تمہا نے کماحقہ کا استعمال بے محل کیا ہے۔ جس سے عبارت مراد تامل سے بیں بچیں نظر آتی ہے۔ ہاں اگر جناب آرگس یا جناب تمہا نے نظیری کے اس شعر کا ذکر فرمایا ہوتا تو اس میں ضرور بہت سے الفاظ اور مفہوم کا بہت بڑا حصّہ مشترک نظر آتا۔ لیکن پھر بھی مآل ہی رہتا۔ اور غالب کا شعر بہت سی ایسی چیزیں اپنے دامن میں لئے نظر آتا جو نئی ہوتیں

نظیری ؎ بزیر ہر بن مو چشم روشنی است مرا بر وشنائی ہر ذرّہ روزنی است مرا

ترجمہ۔ میرا ہر بُن مو ایک چشم بینا ہے۔ اور سر ذرّے میں جو روشنی ہے میں اُس کے لئے ایک روزن پاتا ہوں۔ یعنی میں حکیم و عارف ہوں اور ذرہ ذرہ میں خدا نے جو شان ودیعت رکھی ہے مجکو نظر آتی ہے +

اس شعر میں بھی وہ بات نہیں جو غالب کے شعر میں ہے۔ نظیری ابھی اُس مقام میں ہیں جہاں اُن کو ہر شے میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اور اسی کو منتہائے معرفت سمجھ رہے ہیں۔ نظیری کے اس شعر میں ؟ کچھ بھی ہے۔ وہ غالب کے صرف دوسرے مصرع کا مضمون ہے۔ پہلا مصرع۔ ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہوں۔ پڑھے کا پورا زاید پڑتا ہے۔ اور یہ وہ مقام ہے جو نظیری کے مقام سے زیادہ بلند ہے۔ اور صاف کیوں نہ کہہ دوں۔ یہ وہ مقام ہے کہ صاحب معراج حضرت خاتم الانبیا جس کے سالک ہیں اور یہ ترانہ ما عرفناک حق معرفتک ہے۔ اس لئے زیادہ بلند مقام تک پہنچنے میں پرواز بشر شکستہ پر ہے۔ اس مصرع میں دو ٹکڑے نہایت بلیغ رکھ دیئے ہیں۔ محرمی اور ترستا ہوں۔ محرم کے معنی جس سے پردہ نہ ہو۔ اور ترستا ہوں کا مفہوم یہ ہے کہ حد کی آرزو ہے اور قطعاً محروم ہوں +

غالب میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

بیگی دختر امیر علی طالار۔ من اگر توبہ زمے کردہ ام اے سروِ سہی تو خود ایں توبہ نکردی کہ مرامے ندہی

شیخ علی حزیں۔ چہ شد از توبہ اگر دامن خشکے دارم پیش ابر کرم پیر مغاں اینہمہ نیست

جناب آرگس۔ بجنسہ یہ خیال بیگی کے شعر سے ملتا ہے۔ رہا علی حزیں کا شعر وہ بھی کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ غور کرنے پر اُسی منزل پر جا پہنچتا ہے +

بیخود۔ جناب ستمہا مُہر بہ لب +

میں پہلے جناب آرگس کے پیش کردہ اشعار سے بحث کرونگا۔ پھر اپنی شرح غالب غیر مطبوعہ کی نقل حاضر خدمت کرونگا فیصلہ ارباب نظر فرمائینگے +

بیگی من اگر توبہ زمے کردہ ام اے سروِ سہی تو خود ایں توبہ نکردی کہ مرامے ندہی

یعنی تو خود کیوں نہیں پلا دیتا +

اگرچہ لب جوئبار بھی متعلقات مے کشی سے ہے جہاں سرو کی بالیدہ قدرتاً ہوتی ہے یا لگائی جاتی ہے۔ مگر یہاں ساقی اور معشوق کو سروِ سہی کہہ کر شاعر نے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ اور یہ ٹکڑا شعر کو مطلع کرنے کے شوق میں رکھا گیا ہے۔ اور برائے بیت ہے۔ پھر بھی ایمان کی یہ ہے کہ بیگی کا شعر آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس رند کے توبہ کرنے کا علم ساقی کو تھا۔ جب وہ اُسے دور میں چھوڑ کر آگے بڑھا ہے۔ تو اُس نے مذکورہ بالا مضمون ادا کیا ہے۔ اس میں ساقی سے نگاہوں کے ملنے اور شکوہ کرنے کے انداز نے (جس کا تصور ہونے لگتا ہے) بڑا مزہ پیدا کر دیا ہے +

حزیں چہ شد توبہ اگر دامن خشکے دارم پیش ابر کرم پیر مغاں اینہمہ نیست

ترجمہ۔ اگر توبہ کی وجہ سے میرا دامن خشک ہے تو ہو۔ پیرِ مغاں کے ابرِ کرم کے سامنے یہ کونسی بڑی بات ہے۔ جب آتش نمائی اور ابرِ کرم جوش میں آیا۔ میرا دامن شراب میں شرابور ہو جائیگا۔ یعنی جب وہ برسرِ کرم ہوا تو یہ ٹوٹ جائے گی۔ اور پھر وہی ہونگا اور میکشی کے مزے +

نکتہ۔ جب انسان توبہ کرتا ہے۔ اور زاہدانہ خیالات اُس کے دل میں موجزن ہوتے ہیں۔ تو اُسے زمانۂ رندی کی تمام حالتیں! مثلاً دامن کا آلودہ شراب ہونا۔ بدمستی میں اُٹھ اُٹھ کر گرنا۔ اور گر گر کے اُٹھنا) نہایت نفرت انگیز معلوم ہوتی ہیں مگر جب پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے اور دل میں شکستِ توبہ کا خیال قیامت برپا کر دیتا ہے۔ تو اُسے زندگیٔ زاہدانہ کی تمام ادائیں زہر معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اور اُس کا دل چاہنے لگتا ہے کہ میں پھر شراب پیٔوں اٹھا، پھر میرے دامن پر شراب کے دھبے نظر آتے ہیں پھر رندوں کے جمگھٹے میں بیٹھنا وغیرہ وغیرہ۔ حزیں کے دل میں یہ آخری کیفیت قیامت برپا کر رہی ہے۔ اب تائب ہو کر پچھتائے ہیں اور توبہ ٹوٹا ہی چاہتی ہے +

غالب مَیں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

وجوع بلاغت۔ اس شعر میں کئی ٹکڑے معنی خیز ہیں +

'میں اور' اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ میکش وہ عادت کا پینے والا تھا۔ اس کے فضائل رندانہ سے ساقی اور رندوں کا سارا گروہ خوب واقف تھا۔ یہ وہ تھا جس کی رندی پر لوگ ایمان لا چکے تھے۔ جو خرابات کے ناداروں کا مایۂ ناز تھا جو بدنامیوں کو نیک نامی سمجھتا تھا۔ تمام رندوں کی نظر میں جس کا وقار تھا۔ جس پر ساقی کی خاص نظرِ عنایت تھی۔ جسے شراب نہ ملنے سے اتنی تکلیف ہوتی تھی ہر رند کو نہ ہوتی اور جسے شراب نہ ملنے کی تکلیف کے ساتھ ساتھ رندوں میں اپنی بے آبروئی پر چشمکیں ہونے کی بھی تکلیف تھی۔ وغیرہ وغیرہ +

'یوں' سے سننے والے کی نظر میں ایسے رندِ ناکام کی تصویر پھر جاتی ہے۔ جیسے اپنی ناکامی پر انتہا کا ملال۔ حکا غصہ ہو۔ اور تکلیف خمار جس کی جان لئے لیتی ہو۔ جسے جمائی پر جمائی۔ انگڑائی پر انگڑائی آ رہی ہو۔ جس کی رگیں ٹوٹ جانے پر جس کی نبضیں پھوٹ جانے پر آمادہ ہوں۔ رنج ناکامی و بے آبروئی سے جس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے ہوں۔ جس کا سر تکلیف خمار سے اُٹھتا نہ ہو۔ اس کے سوا کس مپرسی کی تصویر بھی سامنے آ جاتی ہے۔ کہ رند تو رند ساقی نے بھی بات نہ پوچھی جس کی حالت میزبان کی سی ہوتی ہے +

'تشنہ کام' سے حلق اور زبان کے کانٹوں کا تصور ہونے لگتا ہے۔ جو شدتِ تشنگی کا ترجمان ہے +

'آؤں' سے بزمِ شراب میں تشنہ کام مگر دل پر اُمید لئے ہوئے جانے اور لب تشنہ اور دل مایوس لئے ہوئے بیٹھنے کی حالت آئینہ ہو جاتی ہے +

حاشیہ۔ جب انسان کو دفعتہً زیادہ رنج پہنچتا ہے یا غصہ آتا ہے۔ یا بے آبروئی ہوتی ہے تو ہونٹ پپڑا جاتے ہیں۔ زبان اور حلق میں کانٹے پڑنے لگتے ہیں۔ آنکھوں سے کم دکھائی دینے لگتا ہے۔ جسم کی تری دھواں بنکر اُڑ جاتی ہے۔ خاصکر ایسے شخص پر اس کا اثر اور زیادہ قوی ہوتا ہے۔ جس کے اعضائی تری کو آتشِ سیال کی گرمی نے بھاپ بنا کر پہلے

شرح: بیخود: صفحہ

"ہاں یہاں فرہاسیس ہوں"

پھر اُسے اپنے محافظوں کی حفاظت میں دیکر وہ آگے بڑھا اُسی وقت وہ مجھ سے کہنے لگا "کوہ قاف کی چٹانوں سے بلند۔ گو یہ لڑکی واقعی خوبصورت معلوم ہوتی ہے تاہم یہ میرے پروہتی تعلیم کے قابل نہیں۔ ہاں یہ چند خاص عاشقانہ تصاویر کے لئے ماڈل کا کام دیگی۔ نہ یہ میری قسمت کا دل بہلا سکیگی نہ میری زندگی کا بہترین کام بن سکیگی"۔

ہم آگے بڑھے ہجوم بہت زیادہ ہوگیا تھا۔ اور اس وسیع چٹیل میدان میں سورج کی گرمی زیادہ ہوگئی تھی کسی طرف کوئی سایہ نہ تھا۔

آرٹمیدورا نے ایک سفید کُرتہ، ایک کمربند اور نقاب پہن رکھا تھا۔ وہ اکثر ہمیں مُڑ مُڑ کر دیکھتی تھی اور مجھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر اُسے عمدہ لباس پہنایا جائے تو وہ کچھ اور ہی معلوم ہو۔ اُس کے چہرے پر ایک عجیب علامت پیدا ہوگئی تھی۔ اور وہ ہم میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کی مشتاق تھی جس کی اطاعت کرنا اُس کی قسمت میں تھا۔ ابھی ہم بڑے بازار کے نصف میں تھے کہ فرہاسیس ٹھہر گیا اور کہنے لگا "نہیں۔ جس کی میں تلاش میں ہوں وہ یہاں نہیں۔ جسم کی جوانی اور چہرہ کا حسن اکٹھے نہیں ملتے میرا خیال ہے کہ مجھے اُس آدمی کی تلاش کے لئے دوم درجہ کے غلاموں میں جانا چاہئے"۔

ہم مشکل سے تین قدم چلے ہونگے کہ اُس نے اپنا ہاتھ پھیلایا اور چلاکر کہا:- "وہ! اُسے دیکھو!"

میں نزدیک ہوگیا اور حیرت سے دیکھنے لگا۔ جس آدمی کی طرف اُس نے اشارہ کیا تھا وہ پچاس سال کے لگ بھگ تھا۔ اُس کا قد خوبصورت اور اعضا کا تناسب عمدہ تھا۔ چہرہ بڑا، ابرو کی محرابیں طاقتور تھیں۔ ناک اور کان بھی خوب سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ بال سفید لیکن داڑھی بھوری اور گھنی تھی۔ گردن کی مضبوط رگیں اُس کے خوبصورت سر کے لئے ایک قسم کا ستون بنی ہوئی تھیں۔ اُس سے ایک الوہیت ایک خاص جبروت ٹپکتی تھی۔

فرہاسیس نے اُس سے سوال کیا "تم اپنے تئیں کیا پکارتے ہو؟"

"اولس"

"میرے بہادر میں تم سے کچھ نہیں پوچھتا بلکہ وہ نام پوچھتا ہوں جو تمہارے والد نے رکھا تھا"۔

"ایک مہینہ سے میں اپنے تئیں اولس پکارتا ہوں مگر میرا کبھی ایک دوسرا بڑا نام تھا تو بتانا مجھے اچھا معلوم نہیں ہوتا"۔

"کیوں نہیں بتاتے؟"

"میں نے جو کہہ دیا کہ تمہیں بتانا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ کتے کے بچے"۔

فرہاسیس غصہ سے دیوانہ ہوگیا۔ غلاموں کا سوداگر گھبراکر لچکتی بانہوں کے ساتھ آگے بڑھا اور کہنے لگا۔ "میرے آقا اس کی کوئی بات نہ سنیں۔ یہ ایک عقل باختہ آدمی ہے۔ یہ محض بددیانتی کر رہا ہے۔ کیونکہ اس کی دماغی طاقت مجھ سے بدرجہا زیادہ ہے۔ یہ ایک حکیم ہے سارے اولانتھس میں علم و حکمت میں اس کا کوئی ثانی نہیں۔ میں وہی باتیں کہتا ہوں جو تمام دنیا کہتی ہے۔ کیونکہ یہ مقدونیہ میں بھی مشہور تھا۔ لوگوں نے مجھے بتایا ہے کہ تیس سال کے عرصہ میں اس نے اتنے اہل اولانتھس تندرست کئے ہیں کہ ہم بھی شہر کی فتح کے وقت اُتنے نہیں مار سکے۔ جب یہ پابہ زنجیر ہوگا اور اسپر کوڑے برسے تو یہ ایک قیمتی غلام ثابت ہوگا۔ اب یہ گستاخ ہے۔ لیکن یہ جلد اپنا

لیے تبدیل کر دیگا۔ جیسا تم سوداگروں نے کر دیا ہے یا کر دینگے۔ اگر آپ اسے لے جائیں تو وہ سو سال تک آپ کے نزدیک نہیں آسکتی! مجھے تیس ڈراچمس عنایت فرما دیں اور یہ نیکوسٹراٹس تمام عمر کے لئے آپ کی ملکیت ہے "

فرہاسیس نے میری طرف دیکھ کر دہرایا " نیکوسٹراٹس! اس نام کے ایک شاعر کو میں جانتا ہوں لیکن علم طب کی طرف میں کبھی متوجہ نہیں ہوا "

غلاموں کے سوداگر کی طرف متوجہ ہو کر اس نے حکم دیا۔ " اس کے کپڑے اتار دو "

نیکوسٹراٹس نے کپڑے اتارے جانے میں بالکل مزاحمت نہ کی وہ بے بس تھا مگر بارعب! فرہاسیس حکم پر حکم دیتا جاتا تھا کہ قیدی پہلے ایک حالت میں کھڑا ہو۔ پھر دوسری میں، آخرکار سوداگر ٹھہر گیا اور فرہاسیس نے کہا " عظیم الشان! "

لیکن میں نے بالکل جواب نہ دیا۔ کیونکہ مجھے حسد سا ہونے لگا۔

پچاس سال ہو گئے ہیں ۔۔۔ ایک زندگی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے سینکڑوں ماڈل دیکھے ہیں۔ لیکن مجھے کوئی ایسا نہیں ملا جو اولانتھس کے باشندے نیکوسٹراٹس کا مقابلہ کر سکے۔ وہ انسان کا مکمل مجسمہ تھا، انسان کی جزئیات کے کمالات اور جبروت کا! ۔۔۔ مجھے اسے ماڈل بنانے کا کبھی اتفاق نہ ہوا۔ کیونکہ وہ بدنصیب فقط ایک ہی بار اس کام آیا۔ تم ابھی جان لو گے کہ یہ کیسے ہوا۔

(۴)

میں گھوڑے پر سوار ہو کر اٹیکا میں سے ہوتا ہوا اپنی جائے رہائش پر پہنچا۔ میری غیر حاضری کے پانچ سالوں کے عرصہ میں قرضخواہوں نے وہ چند معمولی اشیاء فروخت کر دی تھیں۔ جو میری ملکیت تھیں۔ اس لئے میں کئی ہفتوں تک ایتھنز کی ایک سرائے میں بڑے سادہ طریقہ سے رہا۔ فرہاسیس بھی میرے بعد چند دنوں تک آگیا۔ اور جب اس نے میری ادنیٰ درجہ کی رہائش کا حال سنا۔ اس نے فوراً مجھے اپنا مہمان بننے کی دعوت دی۔ میں فوراً اس کے مکان پر شکریہ ادا کرنے اور دعوت نامنظور کرنے گیا۔ وہ اس وقت اکاڈیمی کے قریب سنگِ مرمر اور دھات کے ایک محل میں رہتا تھا۔ جو اس مکان کے قریب تھا جس میں افلاطون رہا کرتا تھا۔

محل کے باغات دریا کی طرف بڑھے چلے گئے تھے۔ اور محل درختوں سے گھرا ہوا تھا۔

ذہن کی کسی کمزوری کی وجہ سے جس کا ہونا ایسے انسان میں واقعی تعجب خیز تھا فرہاسیس بڑا خود پسند اور نمود کا بندہ تھا۔ اس کی دولت بے بہا تھی۔ اور وہ کسی شخص کو اس کے خلاف خیال کرنے کا موقعہ نہ دیتا تھا۔ سنگِ مرمر، ریشم۔ سونا اور حسین عورتوں کا جھرمٹ، غرضیکہ اس کا محل راجہ اندر کا اکھاڑہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنے لمبے لمبے بازو میری طرف کھول دیے اور میں اس کے ہمراہ اس مشہور کمرے میں داخل ہوا جو بے شمار شاہکاروں کا مخزن تھا۔

اس نے میرے سوال کے جواب میں کہا " میرے پرومی تھیس کی بات پوچھتے ہو؟ میں ابھی تک اس پر غور کر رہا ہوں۔ چند دنوں تک میں اسے بالکل مکمل دیکھونگا۔ یہ چھوٹی سی تصویر دیکھو۔ یہ حیرت انگیز ہے۔ میں نے اس سے زیادہ خوبصورت تصویر کبھی نہیں بنائی "

یہ ایک خوابیدہ پری اور دیوتاؤں کی تصویر تھی۔ میں نے

قریب ہی آرٹیمیڈورا اور مسٹر مارتھ کی دو لڑکیوں کو دیکھا اور میں نے فوراً معلوم کر لیا کہ یہ تصویر کے لئے ایستادہ ہوئی تھیں +

اُس نے پھر انہیں ایستادہ ہونے کا حکم دیا۔ اور میرے سامنے تصویر کو مکمل کرتا رہا +

پھر ایک مہینہ میں ایتھنز میں رہا۔ اور اپنے ذاتی معاملات میں ایسا مصروف رہا کہ مجھے اتنی فرصت نہ ملی کہ میں اس ماہر مصور مسٹر کو دوبارہ مل سکوں۔ ایتھنز واقعی اہلِ اولانتھس کے زوال پر ماتم کر رہا تھا۔ کالسس کی غلاموں کی منڈی! انسانوں کی فروخت! ایک ایسی ذلت اور بے عزتی تھی کہ ہر شخص کی زبان پر اسی کا چرچا تھا۔ اور جو خاموش تھے انہیں اسی کے ڈراؤنے خواب آتے تھے +

ایک دن یہ ظاہر ہو گیا کہ ایتھنز میں ایک شہری نے اولانتھس کی ایک عورت کو قید کر رکھا ہے۔ وہ شہری مجرم قرار دیا گیا اور قتل کر دیا گیا +

اس غلو کی خبر پاکر میں دوڑا دوڑا فرہاسیس کے مکان پر پہنچا وہ تصویر بنانے میں مشغول تھا۔ اور کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ تھی لیکن میری منت سماجت سے مجھے آپکے پاس جانے کی اجازت مل گئی میں اُس وقار اور تمکنت کو ہرگز نہیں بھول سکتا جسکے ساتھ فرہاسیس نے مجھے سلام کیا۔ جب میں کمرہ میں داخل ہوا وہ کھڑا تھا اور تصویر بنا رہا تھا۔ بعد ازیں میں نے اُس کی نگاہوں کا تعاقب کر کے نیکوسٹراٹس کو دیکھا جو برہنہ تھا اور ایک بیچ میچ کی چٹان کے ساتھ بندھا تھا +

"چیخو!" فرہاسیس نے چلا کر کہا اور اُس کے خوفزدہ قیدی نے ایسا ہی کیا اور اس پر غشیں اور غشیاں بھیجنے لگا۔ اُس کے منہ سے جھاگ جاری تھے +

فرہاسیس کا چہرہ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ اس پر تغیر کی ایک لکیر بھی نہ تھی۔ اُس نے مسٹر مارتھ کے ایک غلام سے کہا "ہاں دائیں جانب، محض گھونپنا!" نیکوسٹراٹس نے اس غلام کو آگے بڑھتا دیکھا تو اُس کی پتلیاں پھر گئیں۔ اور اُسکی پیشانی پر جانکنی کا پسینہ آگیا۔ اُس کے منہ سے آہیں نکلنے لگیں پھر اُس نے بچے کی مانند سسکی لی۔ فرہاسیس بدستور کھڑا اُسکے چہرہ کا مطالعہ کرتا رہا۔ پھر اچانک چلا اُٹھا "آہ ناتوان افسوس! یہ بہت جلد مر گیا!"

....

جب یہ مشہور ہوا کہ کس طرح فرہاسیس نے اپنا پرومی تھیس بنایا ہے۔ تو لوگوں کا ایک طوفان اُس کے مکان کی طرف اُمڈ آیا۔ اور "قاتل! قاتل! موت! موت!" پکارنے لگا۔ آخر فرہاسیس اپنی تمام شان و شوکت کے ساتھ ہجوم اور اُس کے شور و غوغا کے سامنے شاہانہ وقار سے کھڑا ہو گیا۔ پھر آہستہ سے اُس نے اپنی تصویر کو اُٹھایا جیسے کوئی دیوتا دنیا پر رحمت برسانے کے لئے ہاتھ پھیلائے۔ اور اُسے ایتھنز کے حسن پسند اور آزادی کے متوالے باشندوں کے سامنے پیش کر دیا!

ہمارے مجمع کے بدن میں ایک کپکپی دوڑ گئی حیرت اور مسرت کی لہریں اپنے پورے عروج سے اُمڈ اُمڈ کر لوگوں کو اِدھر اُدھر جھلانے لگیں۔ تصویر کیا تھی! انسانی درد و کرب اور موت سے بے پناہی کا مجسمہ تھی! لوگ پہلی مرتبہ "تخلیق" کے پر ہیبت حسن کا مطالعہ کر رہے تھے۔ کچھ دیر ایک کامل سکوت رہا جیسے عبادت گاہوں میں ہوتا ہے۔ سب کو روکے رکھا۔ پھر چند ایک معاندانہ آوازیں اُٹھیں۔ مگر بے سود۔ اور اُٹھتے ہی گنتی کی شاندار گونج میں فنا ہو گئیں!!

(از فولسن)

جادو برحق کرنے والا کافر

مگر عملیات مسیح ہیں کرنیسے انسان کافر نہیں ہوتا

خدا نے اپنے کلام میں بہترین اثرات پیدا کئے ہیں۔ اور اس فن پر یہ کتاب بہترین ہے۔ ہر قسم کے عملیات و عملیات و تعویذات بروح کا صاحب ... تمام باتیں ایسی آسان عبارت میں لکھی گئی ہیں کہ اس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔ حجم تقریباً ۴۰۰ صفحات قیمت تین روپے۔

کلید مراد قضا مانگنے کا طریقہ اور مدت سے وظائف ۸ر

کتابت طباعت کاغذ بہترین

ملنے کا پتا

منیجر نیرنگ خیال بکڈپو بارود خانہ لاہور

ایک روپیہ میں گیارہ افسانے

یہ افسانوں کا ایک نہایت دلچسپ سلسلہ ہر ایک افسانہ مکمل اور ہر ایک کتاب مکمل۔ افسانے وہ ہیں جن کو پڑھکر آپ کی زندگی پر گہرا اثر ہوگا۔

اس سلسلہ کی کتابیں پانچ ہیں۔ اور ہر ایک میں دس گیارہ افسانے ہیں

درس عبرت عہ طوفان زندگی عہ زندگی کی صبح و شام عہ عروج زندگی عہ تعمیر معاشرت عہ

ملنے کا پتہ

منیجر نیرنگ خیال بکڈپو بارود خانہ لاہور

اسلامی کتابیں

بلوغ مقصود یا مسلمانوں کی دینی و دنیاوی تمام ضروریات کیلئے یہ کتاب جامع معلومات کا ذخیرہ ہے۔ اسکی ضرورت اور اہمیت اس سے واضح ہو سکتی ہے۔ یہ کتاب چوتھی بار طبع ہوئی ہے۔ حجم ۴۰۰ صفحات للعہ (۲) اسلامی زندگی مسلمانوں کی ہر ایک مذہبی ضرورت کا جواب تفصیل سے درج ہے حجم ۵۰۰ قیمت عہ

فیضان قدسی۔ رسالت نامہ۔ کربلا نامہ۔ مذہبی معلومات

عہ ۸ر عہ ۸ر عہ

برگزیدہ نبی کے برگزیدہ فضائل

۲ر

ملنے کا پتہ

منیجر نیرنگ خیال بکڈپو بارود خانہ لاہور

میاں بیوی کی ازدواجی زندگی

سات دلچسپ اور مفید کتابیں یہ سلسلہ مکمل ہے۔

مرد و عورت عہ۔ میاں بیوی عہ۔ دولہا دلہن عہ زن و شوہر عہ۔ عیش و نشاط عہ۔ دوشیزہ سے گھر عہ چالیس تصاویر حجم ۸۰۰ صفحہ کل سیٹ ۸ روپے لکھائی چھپائی عمدہ

اسی سلسلہ میں

اولاد کی تربیت عہ سارا سٹ منگوانے پر اولاد کی تربیت مفت ہے محصول ڈاک ذمہ خریدار۔ ہر ایک کتاب علیحدہ علیحدہ بھی مل سکتی ہے

ملنے کا پتہ

منیجر نیرنگ خیال بکڈپو بارود خانہ لاہور

ہی اُڑادیا ہو +

بزمِ شُمے - اس ٹکڑے نے بھی معنی شعر میں زور پیدا کردیا ہے - اگر تنہائی میں ساقی نے یہی برتاؤ کیا ہوتا تو ناگوار ضرور ہوتا مگر یہ اتنی +

دوسرے مصرع میں کہتا ہے کہ میں نے تو شراب اس لئے نہ مانگی کہ توبہ کرچکا تھا۔ آخر ساقی نے ضیافت کیوں نہ کی لیتے اس ظالم کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ رندوں کی توبہ ہی کیا۔ اور اگر اسے پینا منظور نہ ہوتا تو رندوں کے جھگڑے میں آتا ہی کیوں ہمارا مقصد یہی تھا کہ توبہ کی لاج رہے اور رند پلادیں۔ یہاں رندوں کا کیا ذکر (جو مہمان کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کے متعلق مشہور ہے کہ مہمان را بافضولی چہ کار) ساقی کمبخت نے بھی جھوٹوں نہ پوچھا۔ اور ظالم کی زبان سے اتنا بھی نہ نکلا کہ آج پیتے بھی جاؤ +

ساقی کو کیا ہوا تھا۔ اس کے بہت سے مفہوم ہوسکتے ہیں صرف لہجہ میں تغیر پیدا کرنے کی ضرورت ہے مثلاً:-

(۱) کیا اُس نے بھی توبہ کی تھی - اس مفہوم کو بیگی نے یوں ادا کیا ہے ؎ توخود ایں توبہ نکردی کہ مرا مے ندہی +

(۲) کیا ہوش میں نہ تھا +

(۳) یہ اتنا اتراتا کیوں ہے +

(۴) حیرت ہے کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی +

(۵) حریفوں کی دراندازی کا سبب تو نہیں ہے +

(۶) سمجھیں گے - انتقام لیں گے +

(۷) اُس پر میرا احترام واجب تھا +

(۸) اللہ ری بے دردی - اللہ ری سنگدلی +

(۹) رندوں کی حالت کا صحیح اندازہ رکھتے ہوئے ایسی غلطی +

(۱۰) کیا مجھے دیکھا نہیں +

(۱۱) کیا میرے توبہ کرنے پر خفا ہے +

(۱۲) کیا مجھ سے رنجیدہ ہے (اور یہ وہ حالت ہے جو رندوں یا عاشقوں سے دیکھی نہیں جاتی)

(۱۳) کیا کسی خیال میں محو تھا۔ وغیرہ وغیرہ +

اب ہر صاحب ذوق فیصلہ کرسکتا ہے کہ بیگی اور حزیں کے شعر ملکر بھی مرزا کے شعر کا پاسنگ نہیں ٹھہرتے - اور یہ سرقہ تو ہو نہیں سکتا۔ توارد اسے کہہ نہیں سکتے۔ ہے یوں کہ ان سب نے ایک ہی عنوان (مضمون) پر قلم اٹھایا ہے اب جسے خدا دے +

اس شعر کی لذت میں سب کو اپنے برابر کا شریک بنالینے کی غرض سے میں ایک مثال سے اس کی توضیح مناسب سمجھتا ہوں۔ ہر جگہ ساقی سے ساقی سمجھنا کچھ ضروری نہیں۔ یہ شعر ایسے ہر موقع پر پڑھا جا سکتا ہے - جہاں کوئی توبہ کرنے والا اپنے

ہمرنگوں میں ایسے ہی خیال سے جا بیٹھے +

مثال:- جب کبھی کسی ایسے دوست سے چل جاتی ہے جس کی محبت کے ترک پر دل کسی طرح راضی نہیں ہوتا۔ تو احباب کے جلسے میں خاصکر ایسے وقت جا بیٹھتے ہیں جس میں محبوب بھی موجود ہو۔ اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم کو خود ایسے شخص سے کچھ کہنا نہ پڑے۔ جس سے غصہ یا ملال کی حالت میں کہدیا تھا۔ کہ اب تجھ سے بل چکے۔ اور احباب صلح کرا دیں۔ پھر جب کوئی اس طرف متوجہ نہیں ہوتا تو اور احباب پر کم اور صاحب خانہ پر سخت غصہ آتا ہے کہ توبہ تو ہم نے کی تھی۔ ان ظالموں نے پلا کیوں نہ دیا +

غالب مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو یک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہئے

عمر خیام۔ رباعی۔ مے خوردن من نہ از برائے طرب است نے بہر فساد دین و ترک ادب است
خواہم کہ ز بیخودی بہر آرم نفسے مے خوردن و مست بودنم زیں سبب است

آرگس۔ یہ کہنا بیکار سی بات ہے کہ دونوں مضمون ایک ہیں۔ مگر یہ کہنا ہے کہ یہ مضمون عمر خیام کا خاص مضمون ہے۔ جو اکثر ان کی رباعیوں سے ظاہر ہوتا ہے +

بیخود۔ میں عمر خیام کے کمال شاعری کا کم سے کم ویسا ہی معترف ہوں۔ جیسے جناب آرگس بالقابہ۔ لیکن جناب موصوف نے غالب پر سرقہ کا الزام لگایا ہے۔ اس لئے میرا فرض ہے کہ اُن کی پیش کردہ رباعی اور مرزا کے شعر کا مقابلہ کر کے دکھا دوں کہ کس کی حالت کیا ہے۔ مگر پہلے یہ عرض کر دوں۔ کہ یہ بحث جس پر ان بزرگوں نے قلم اُٹھایا ہے۔ وہ ایران و ہندوستان کے شعرا میں خواہ وہ میکش ہوں یا نہ ہوں عامۃ الورود ہے۔ پھر غالب اور عمر خیام میں تو بادہ کشی بھی مشترک ہے +

خیام نے رباعی کے چار مصرعے پُر کرنے کے لئے تفصیل سے کام لیا ہے اور کہا ہے:- میں نہ عیش و طرب کی خاطر سے شراب پیتا ہوں۔ نہ ہنگامہ آرائی کی غرض سے۔ نہ مذہب کے قیود سے آزادی کی تمنا میں۔ نہ اصول ادب کے توڑ دینے کی آرزو میں۔ بلکہ میں اس لئے پیتا ہوں کہ بیخودی کی لذت اُٹھاؤں۔ چوتھے مصرع میں مے خوردن کے بعد مست بودنم کو عوام حشو و زواید سے تعبیر کرینگے۔ مگر نہیں حقیقت اس کے خلاف ہے۔ اور اس ٹکڑے نے بیان واقعہ کو دوگنا کر دکھایا۔ اور اب ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ واقعہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ اس لئے خیام کی رباعی کا یہ ٹکڑا کلام کو زیادہ موثر بنا دیتا ہے۔ اور داد کے قابل ہے +

مختصر یہ کہ خیام صرف بیخودی کی لذت اُٹھانے کی غرض سے شراب پیتا ہے۔ اب دیکھنا چاہئے کہ مرزا کیا کہتا ہے +

میرا خیال یہ ہے کہ خیام جتنا چار مصرعوں میں نہ کہہ سکا اُس سے کہیں زیادہ غالب نے دو مصرعوں میں کہہ دیا ہے۔ اور خیام کی تفصیل سے غالب کا اجمال کہیں زیادہ وقیع ہے +

میری نظر میں اس طرح کے کئی شعر ہیں۔ میں مرزا کے شعر سے سب کا موازنہ کئے دیتا ہوں +

یزید ملعون انا المسموم و ما عندی بتریاق و لا راقی اور کاساً و ناولہا الا یا ایہا الساقی

یعنی میرے جسم میں زہر جنبک رہا ہے۔ اور نہ تریاق میرے پاس ہے۔ نہ جھاڑنے والا مجھے میسر ہے۔ اے ساقی شراب کا دور چلے۔ مختصر یہ کہ زہر میری جان لے کر رہیگا۔ اس لئے جو وقت رہ گیا ہے اس میں دور جام ہو۔ تاکہ جو گھڑیاں باقی رہ گئی ہیں وہ موت کے خوف سے بےلطف نہ گذریں عجب نہیں جو یہ شعر بعد شہادت مولانا نے نویں حضرت امام حسینؓ کہا گیا ہو۔

خواجہ حافظ۔ الا یا ایہاالساقی ادر کاساً وناولہا کہ عشق آساں نمود اول وے افتاد مشکلہا

یعنی پہلے عشق آسان نظر آتا تھا۔ اب مشکلوں کا سامنا ہے۔ اے ساقی دور شراب ہو تاکہ نشہ میں عشق کی تکلیف تکلیف نہ معلوم ہو۔ "مشکلہا" کا تکرار نہایت معنی خیز ہے۔ او تمام مشکلات عشق پر حاوی ہے۔ وہ تکلیف انتظار یاد فراق یار وغیرہ وغیرہ +

اب مرزا کا شعر ملاحظہ ہو۔

غالب مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو یک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے

مرزا صرف نشاط کا استثنا کرتا ہے یعنی میں شراب عیش و نشاط کی نظر سے نہیں پیتا۔ بلکہ ایک طرح کی بیخودی مجھے ہر وقت چاہیئے +

یہ شعر اتنا وسیع المعنی ہے جس کی شرح آسان نہیں۔ نشاط کے سوا جتنی ضرورتیں شراب پینے کی ہوسکتی ہیں سبھی تو اس میں موجود ہیں۔ اس لئے کہ ان کے سمجھنے کا بار مصنف نے ذہن سامع پر ڈال دیا ہے۔ بہت سے مختلف پہلو اس شعر میں دکھائے جاسکتے ہیں +

(۱) اب میں حصول نشاط کی غرض سے شراب نہیں پیتا۔ بلکہ عادت پڑ گئی ہے۔ نہ پیوں تو انگڑائیاں آئیں بدن ٹوٹے جان پر بن جائے +

(۲) گناہوں کی ندامت میری جان لئے لیتی ہے۔ نہ بیخودی میں وہ یاد آئینگے نہ میں تڑپ تڑپ کر رہونگا +

(۳) دنیا والوں سے اس حد کی نفرت ہوگئی ہے کہ حواس میں رہونگا۔ تو زندگی دوبھر ہو جائیگی +

(۴) غم بھولا رہیگا +

(۵) کسی کو مجھ سے آزار نہ پہنچے گا +

(۶) مجھ کو کسی سے آزار نہ پہنچیگا +

(۷) بہت سی برائیوں سے محفوظ رہونگا۔ صرف میکشی کا گناہ میرے سر رہیگا۔ (یاد رہے کہ یہ قول ایک رند کا ہے)

(۸) قید خرد سے آزاد رہونگا +

(۹) قید ادب سے چھوٹ جاؤنگا +

(۱۰) مجھے جو درد ہے لا علاج۔ اس لئے بیخودی کی ضرورت ہے +

(۱۱) غم فراق جو ہر وقت رہتا ہے اس سے نجات رہیگی +

دیکھنے میں یہ شعر بہت صاف ہے۔ مگر قریب قریب اس کا ہر لفظ معنی کثیر پر حاوی ہے + مثلاً:۔

(۱) روسیاہ۔ ظاہر کرتا ہے کہ اگر میں نے نشاط کی غرض سے شراب پی ہو تو گنہگار۔ کون کمبخت اس نظر سے پیتا ہے +

(۲) یک گونہ۔ کا مطلب یہ ٹھہرتا ہے کہ مجھے ایک طرح کی بیخودی کی ضرورت ہے یعنی شراب ہی پر منحصر نہیں بیخودی کا حصول مقصود ہے سو کسی طرح حاصل ہو جائے۔ اور کوئی نشہ نہ کھایا شراب ہی پی لی +

(۳) دن رات۔ کا لفظ قیامت کا ہے یعنے دن بھر انتہا کی تکلیف پہنچانے والے خیالات میرے دل میں رہتے ہیں اور رات کو سوتا ہوں تو ہولناک مناظر نظر آتے ہیں۔ مختصر یہ کہ سوتے جاگتے مجھے چین نہیں ملتا۔ اس لئے شراب پیتا ہوں +

(۴) چاہئے۔ سے شعر کے معنی میں انتہا کا زور پیدا ہو گیا ہے۔ یعنے مجھے بیخودی کا شوق نہیں بلکہ یہ میرے لئے لازمی ہو گئی ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ میری دوا ہے +

میں نے ایک آئینہ رکھدیا ہے جس میں ہر شعر کے خط و خال صاف نظر آتے ہیں۔ اور الحمدللہ کہ ہندوستان ابھی اندھوں کی محفل نہیں +

جناب آرگس صاحب مجھے بھی معلوم ہے کہ یہ مضمون عمر خیام کا خاص مضمون ہے۔ مگر برا نہ مانئے تو کہوں کہ یہ رباعی تو شعر غالب کے سامنے کچھ روکھی پھیکی سی معلوم ہوتی ہے۔ آپ کو داد دینا چاہئے تھی کہ غالب نے خیام کے خاص مضمون پر قلم اٹھایا تو ایسی تصویر کھینچکر رکھدی کہ خیام کے (مرقع) البم میں مشکل سے ملیگی +

یہ شعر قلیل الالفاظ کثیر المعنی کی بہترین مثال ہے +

غالب ؎ مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

فیضی ؎ آں شکارم من کہ نالایق بکشتن نیستم شرم می آید مرا زانکس کہ صیاد من است

آرگس ۔ بناے خیال دونوں شعروں میں یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ فیضی کہتا ہے میں ایسا شکار ہوں کہ مار ڈالنے کے قابل نہیں ہوں۔ اسی وجہ سے مجھے اپنے صیاد سے شرم آتی ہے۔ غالب بھی یہی کہتے ہیں کہ میں اس لایق نہیں کہ مجکو وہ ہلاک کرے۔ لہذا کوئی اور تدبیر کرنی چاہئے +

بیخود ۔ جناب ممتحن نے اس شعر سے بحث نہیں کی +

علامہ فیضی کا شعر سادہ سادہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں صید زبوں ہوں اور ایسا جو اس قابل بھی نہیں کہ کوئی اسے مار ہی ڈالے۔ قسم کا لفظ بتاتا ہے کہ شوق سے پالنے کے قابل ہونا تو درکنار اور صدقے میں اترنے کے لایق ہونا تو بہت دور ہے میں اس کا بھی اہل نہیں کہ کوئی مجھے ذبح کر ڈالے۔ مجھے اپنے صیاد سے شرم آتی ہے۔ یعنے میں اپنے صیاد کا احسانمند ہوں کہ باوجود اس کے کہ میں ایسا صید ہوں پھر بھی اس نے مجھے اپنے کرم سے صید کیا۔ یعنی معشوق کی ذرہ نوازی تھی جو مجھے صید کرنے کے قابل سمجھا۔ انسان کے دل میں ایسی باتیں ایسے وقت آتی ہیں جب اس کی قدر ایسی کی جائے کہ وہ خود کو اس کا اہل نہ سمجھتا ہو۔ اس کے دل میں خودشناسی کا مادہ موجود ہو اور وہ قدر اسمیں غرور نہ پیدا کر سکے۔ یہ جذبہ شریفانہ

شرح بیخود صفحہ ۹۰

ہے۔ اکثر ایسے برتاؤ سے اپنے کو بھول جایا کرتے ہیں +

غالب کے شعر سے یہ بات نہیں معلوم ہوتی کہ قاتل نے اُسے قتل کرنے کے قابل نہیں سمجھا۔ بلکہ وہ خود اپنے دل سے کہہ رہا ہے (اس لئے کہ دل انسان کے ہر گناہ ہر ثواب سے اتنا واقف ہے کہ علام الغیوب کے سوا اُس سے زیادہ کوئی واقف ہو نہیں سکتا) کہ اب مرنے کی کوئی اور ہی تدبیر کر (جیسے زہر کھا کر مر جانا۔ ڈوب مرنا وغیرہ) اس لئے کہ اب میں اس قابل نہیں رہا کہ وہ مجھے اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔ اور اس قابل نہ رہنے کی کوئی وجہ خود نہیں بتاتا۔ سامع جو چاہے سمجھ لے۔ کون مانع ہے کہ اس کا سبب بے حوصلگی و بے دلی نہ ہو۔ انسان تجربہ سے قبل اپنے کو بڑے سے بڑے کام کا اہل سمجھتا ہے۔ مگر جب اپنی کم جراتی اور کم حوصلگی کا امتحان کر لیتا ہے تو دل میں پانی پانی ہوتا ہے اور اگلے دعوے ست جاتے ہیں۔ علاوہ اس کے کوئی ایسا گناہ اُس سے سرزد ہو گیا ہو جو کیش محبت میں بخشے جانے کے قابل نہ ہو۔ مثلاً ممکن ہے کہ غیر معشوق کا خیال محبت کے ساتھ دل میں آیا ہو۔ جفائے یار پر ترک محبت کا ارادہ ہوا ہو۔ معشوق پر جان نثار کرنے کا موقع آیا ہو۔ اور جان عزیز کی گئی ہو۔ یہ شعر بلندیٔ فطرت کی تصویر ہے کہ کسی خطا یا ترک اولیٰ کی بنا پر وہ اب اپنے کو شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں سمجھتا۔ بلندیٔ فطرت کی شان فیضی کے شعر میں بھی نکلتی ہے مگر بلندیٔ فطرت کے بھی مدارج ہیں اور فیضی کا شعر غالب کے شعر کو نہیں پہنچتا۔ اس تمام مطلب پر جس کا ذکر کیا گیا۔ صرف "نہیں رہا" کا ٹکڑا دلالت کرتا ہے یعنے اب سے پہلے اس قابل تھا +

(۲) اور ہی تدبیر کر۔ کچھ کھا کے سو رہ اور بعض صورتیں خودکشی کی ممکن ہیں سب پر یہ ٹکڑا حاوی ہے +

مولانا آرگس بیخود کا شاد کا یہ شعر پڑھئے۔ شاید غالب کا شعر سمجھ میں آجائے +

بیخود موہانی ؎ ہاں یہ ترے خیال کے قابل نہیں رہا | اس دل میں رہ چکی ہے تمنا گناہ کی

غالب ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے | بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

عرفی از من بگیر عبرت و کسب ہنر مکن | با بخت خود عداوت ہفت آسماں مخواہ

آرگس۔ ہنرمندی پر آسمان کا دشمن ہونا دونوں شعروں میں موجود ہے۔ یہی بنائے اشتراک خیال ہے +

بیخود۔ حضرت تمہارے اس پر کچھ نہیں کہا +

آسمان ہنر والوں کا دشمن ہے۔ یہ امر مسلمات سے ہے اور مسلمات کسی کی ملک نہیں ہوا کرتے۔ مولانا یہ وہی چیز ہے جسے اہل فن غرضے از اغراض یا اس کے حکم میں قرار دیتے ہیں۔ دیکھنا یہ چاہئے کہ ایک مشہور بات سے کس نے کام لیا +

شرح اُردو

عرفی کہتا ہے کہ میری حالت سے سبق لو اور کسب ہنر نہ کرو۔ ورنہ ساتوں آسمان تمہارے دشمن ہو جائینگے۔ عرفی نے اپنی حالت کی طرف متوجہ کر کے اس قول مشہور کی صداقت ذہن نشین کرانا چاہی ہے اور اس میں کامیاب ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی اہل ہنر کی تباہ حالی خود جو اثر دیکھنے والوں پر کرتی ہے اتنا اثر محض اس کا حال بیان کر دینے سے نہیں پڑ سکتا +

اب غالب کے شعر پر نظر فرمائیے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم عقلمند تھے نہ عالم نہ کسی ہنر میں یکتا۔ آسمان نے ہم سے بے وجہ دشمنی کی۔ اس شعر میں دو پہلو ہیں۔ اور وہ عرفی سے بالکل الگ جا رہا ہے +

(۱) اس قول کی شہرت بے بنیاد ہے۔ ہماری حالت دیکھو ہم سراپا بے ہنری ہیں اور پھر تباہ حال ہیں۔ اور یہ قول واقعیت سے دست و گریبان ہے۔ روزمرہ کے مشاہدے اس پر شاہد ہیں کہ جس طرح اہل ہنر تباہ رہتے ہیں۔ خدا کے لاکھوں بے ہنر بندے در بدر خاک بسر پھرتے ہیں۔ اہل ہنر کی پریشاں حالی زیادہ نمایاں نظر آتی ہے جس کا سبب یہ ہے کہ ان کے ہنر اور ان کے کمال پر دنیا کی نگاہیں پڑتی ہیں۔ اس لئے ان کی آشفتہ حالی کا رونا زیادہ رویا جاتا ہے۔ علاوہ بریں وہ خود اپنی حالت زار کا ماتم کیا کرتے ہیں۔ اور ان کی آواز جس میں زور کمال ہوتا ہے فضا میں گونجتی ہے۔ اور زمانہ اس کو فرہاد بے ہنر کی طرح فنا کر دینے پر قدرت نہیں رکھتا +

(۲) دوسرا پہلو زیادہ لطیف ہے وہ یہ کہ شاعر کو باوجود کمال اپنے میں کوئی علم کوئی ہنر نظر نہیں آتا۔ اور حقیقت میں یہی دلیل کمال ہے حکیم سقراط کی حالت جس کی شاہد ہے۔ شاعر کو حیرت دامنگیر ہے کہ پھر ایسی حالت میں آسمان میرا دشمن کیوں ہے +

غالب پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

عالی ز مردم یار می پرسد کہ عالی کیست طالع بیں کہ عمرم در محبت رفت و کار آخر رسید اینجا

آرگس - اگرچہ پہلا مصرع بالکل ملتا جلتا ہے۔ مگر مضمون بالکل عام اور پیش پا افتادہ ہے۔ جو ہر شخص کے ذہن میں آ سکتا ہے +

بیچو - جناب تنہا نے اس شعر پر بھی نگاہ کرم نہیں فرمائی +

جناب آرگس سے یہ عرض کرنا ہے کہ جب مضمون عام ہے تو پھر اس شعر پر التفات فرمانے کی ضرورت کیا تھی آپ فرمائینگے کہ کثرت توارد دکھانے کے لئے۔ تو میں عرض کرونگا کہ زیادہ توارد اشعار و مصرعوں کا ہوتا ہے۔ اگر صرف ایک مصرع ملتا جلتا ہے تو اسے توارد کہنا کہاں تک روا ہے۔ علاوہ بریں اس مضمون کو عام کہنا بھی سراسر ظلم ہے۔ اس لئے کہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ عمر بھر محبت کرنے والے کو معشوق پہچانے تک نہیں۔ میں دونوں شعروں کا فرق نہایت واضح طور پر بیان کئے دیتا ہوں۔ ماننے نہ ماننے کا اختیار آپکو ہے +

معشوق لوگوں سے پوچھتا ہے کہ یہ عالی کون ہے میں نہیں جانتا۔ عالی (عاشق) اپنے کسی ہمراز سے اس واقعہ کو نقل کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ میری بدنصیبی دیکھ کہ ساری عمر محبت کرتے جان دیتے گزر گئی۔ اور انجام یہ ہوا کہ مجھے آج تک پہچانتے بھی نہیں +

اس شعر میں اپنے صدر سے 'طالع بیں' کہ عمرم در محبت رفت و کار آخر رسید اینجا کہتے وقت نگاہوں سے ٹپکتی ہوئی مایوسی اور کم طالعی کے رنج سے چہرے کے اڑے ہوئے رنگ کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے اور بیان واقعہ میں شان واقعہ پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ شعر کا اثر کہیں سے کہیں جا پہنچتا ہے۔ عالی کا شعر شوق کی

بیگانہ وشی و بے التفاتی، اور عاشق کی بے دست و پائی کا مرقع ہے +

اب دیکھنا چاہیئے کہ غالب کے شعر میں اس کے سوا کچھ اور بھی ہے یا نہیں +

شرح مجود معنوی

غالب ؎　　پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے　　کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

اس شعر میں "پوچھتے ہیں وہ" کو اس ٹکڑے سے ملا دیکھئے۔ "کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا" تو صاف نظر آئیگا کہ یہ بھی اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ معشوق نے کسی اور سے یہ سوال کیا ہے۔ اور یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ خود عاشق ہی سے براہ راست پوچھا ہے۔ حالی کے ہاں ازدحام یا رمی پرستی ہے۔ یعنے معشوق صرف اور لوگوں سے پوچھتا ہے غالب کے یہاں معنی میں اتنی زیادتی تو نہیں موجود ہے +

زائد

اس شعر سے معشوق کی بیگانہ خوئی۔ شوخی، اور عاشق کی سراسیمگی و بے دست و پائی (یہ باتیں حالی کے شعر میں بھی پائی جاتی ہیں) کے علاوہ محبوب کی ستم ظریفی۔ بلندیِ مرتبہ اور عاشق کی حالت زار اور اثر ہول فراق و گرفتاریِ درد محبت و یاس و نصب وغیرہ بھی سامنے نظر آتا ہے +

۲ زائد

(کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا) سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ بھری محفل میں ہو رہا ہے۔ ایسی حالت میں یہ سوال سنتا ہے تو بجلی سی گر پڑتی ہے۔ اور گھبرا کر اس مجمع کی طرف خطاب کرتا ہے کہ للّٰہ تم تو دو یہ کیا جواب دوں شعر کا شعر بیان واقعہ نہیں واقعہ ہے۔ وہاں "طالع ہیں" سے مایوسی ٹپکتی تھی۔ تو یہاں "کوئی بتلاؤ" سے حیرانی اور دل میں چھپی ہوئی مایوسی برستی ہے +

۳ زائد

مساوی

حالی اور غالب دونوں کے اشعار میں مفہوم مشترک ہے ؎

امروز عیاں شد کہ نداری سرِ آبلی　　بیچارہ غلط داشت بہر تو گمانہا

مشترک

ترجمہ:۔ آج معلوم ہوا کہ تجھے آبلی کا خیال بالکل نہیں۔ اس غریب کو تیری محبت کے کیا کیا گمان تھے +

معشوق جان بوجھ کر انجان بن رہا ہے۔ جو ایک طرح کی چھیڑ بھی ہو سکتی ہے۔ مگر حالی کے شعر میں اسکی گنجائش نہیں زمانۂ فراق نے اتنا طول کھینچا ہے اور صورت ایسی بدل گئی ہے کہ وہ پہچانتے ہی نہیں

۴ زائد

۵ زائد

بالالتزام یہ بھی نکلتا ہے کہ جب تک معشوق نے اس کے متعلق پوچھا نہ تھا۔ عاشق کو خبر نہ تھی کہ میری حالت ایسی متغیر ہے

۶ زائد

ایک خوبصورت پہلو اور بھی ہے یعنی معشوق نے پوچھا ہے تو دل میں آتا ہے کہ کہدوں

۷ زائد

؎ آپ کی جان سے دور آپ پہ مرنے والے

پھر یہ کہتے ہوئے ڈرتا ہے کہ کہیں بنتا ہوا کام بگڑ نہ جائے۔ اسی گھبراہٹ میں اُس کے حاشیہ نشینوں سے پوچھتا ہے کہ تم لوگ اس کے مزاجداں ہو بتاؤ کہ جواب میں کیا کہوں +

۸ زائد

اب میرے خیال میں دونوں شعروں کا فرق صاف ظاہر ہو گیا۔ ایسے اشعار کو توارد کی کارفرمائی سمجھنا اور کہنا ناحق گناہ ہے۔ یہ اعتبار اختصار بھی مرزا کے شعر کو ترجیح دینی چاہیئے +

نکتہ۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ رفتہ رفتہ بلبری دلربائی معشوقوں کا شیوہ ہو جاتی ہے۔ اُن کی ہر بات۔ اُن کی ہر نگاہ ادا

ہو جاتی ہے۔ بے ارادہ لگاوٹ اپنے کرشمے دکھاتی ہے اور گرفتارانِ دامِ محبت فریب وفا و محبت میں گرفتار رہے ہیں۔
جب ان کی طرف سے حق محبت کا اظہار ہوتا ہے تو ایسے جواب ملتے ہیں کہ بے اختیار زبان سے نکل جاتا ہے ؎

امروز عیاں تر کنی اسرارِ دلی بیچارہ غلط داشت بھر تو گماں

غالب۔ کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

لا اعلم۔ گرد فنا شدند حریفانِ بزمِ عشق برخاک ریز جرعۂ مرد آزمائے ما

آرگس۔ مئے مرد افگن اور جرعۂ مرد آزما مشارکتِ خیال کا سبب ہیں اور خیال بھی تقریباً یکساں ہیں۔ مرزا فاخر مکین کا بھی یہی مضمون ہے ؎ زن سیرتانِ دورِ جہاں را خبر کنید ساقی گرفت جرعۂ مرد آزمائے ما

سُہا۔ اس کے اشعر غالب کے مقابلہ میں دو دو ماز کار اشعار پیش کئے گئے ہیں جن میں محض الفاظ (ترکیب) مرد آزما ہونے کی وجہ سے طبع آزمائی فرمائی گئی ہے مطلب سے حسب عادت کوئی سروکار نہیں +

بیخود۔ پہلے پتہ کو پتے سے بدل لیجئے۔ جناب آرگس کی حالت تو وہی ہوگئی ہے جسے ملا جامی نے اپنے لاجواب مطلع میں ظاہر کیا ہے ؎ ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی۔ لفظوں کی جھلک غلط انداز نگاہ سے دیکھی اور سرقہ یا توارد کی تان لگائی۔ جناب سہا کے جواب کا انداز بھی سوال سے کچھ کم دلکش نہیں +

"مطلب سے کچھ سروکار نہیں" اتنا کہا اور حق جواب ادا ہوگیا۔ اب میں نفس مطلب سے بحث کرتا ہوں +

بیخود۔ مے مرد آزما۔ وہ شراب جس سے مردوں کا امتحان لیا جا سکے یعنی جسے وہ اُلٹ نہ دے وہ مرد ہے +

مے مرد افگن۔ مردوں کو زیر کر لینے والی شراب ہے +

لا اعلم:- گرد فنا شدند الخ

حریفانِ بزمِ عشق گرد فنا (خاک) ہوگئے۔ اے ساقی اب ہماری (عشاق کامل میکشانِ کامل) مرد آزما شراب زمین پر لنڈھا دے یعنی اب اس کا کوئی پینے والا نہیں رہا +

مرزا فاخر:۔ زن سیرتاں دورِ جہاں را خبر کنید ساقی گرفت جرعۂ مرد آزمائے ما

دورِ دنیا کے بودوں سے کہ دو کہ ساقی نے اب ہماری (عشاق کامل میکشانِ کامل) مرد آزما شراب اُٹھائی ہے یعنی کہیں بھول کر جرأت نہ کر بیٹھنا۔ ورنہ خیر نہ ہوگی۔ تم اس کے حریف نہیں ہو سکتے +

غالب۔ کون ہوتا ہے حریف الخ اس کے دو پہلو ہیں

(۱) میرے مرجانے کے بعد ساقی بار بار کہتا ہے کہ ہے کوئی جو عشق کی مرد افگن شراب کا حوصلہ رکھتا ہو۔ اس میں اتنا ٹکڑا مقدر ہے "اور کوئی نہیں بڑھتا" +

باقی آئندہ

سرورق اور تمام تصویریں وکٹوریہ پریس ریلوے روڈ لاہور

Regd. No. L. 1708.

May 1929.

چھ نئی لاجواب تصاویر

"میاں چھجو"

سید حسن برنی۔ بی۔ اے
عطاء الرحیم۔ ایم۔ اے
مرزا فرحت اللہ بیگ
فخر نظامی
خواجہ عبدالرؤف عشرت
مولانا بیخود موہانی
کے مضامین

قیمت پانچ آنہ
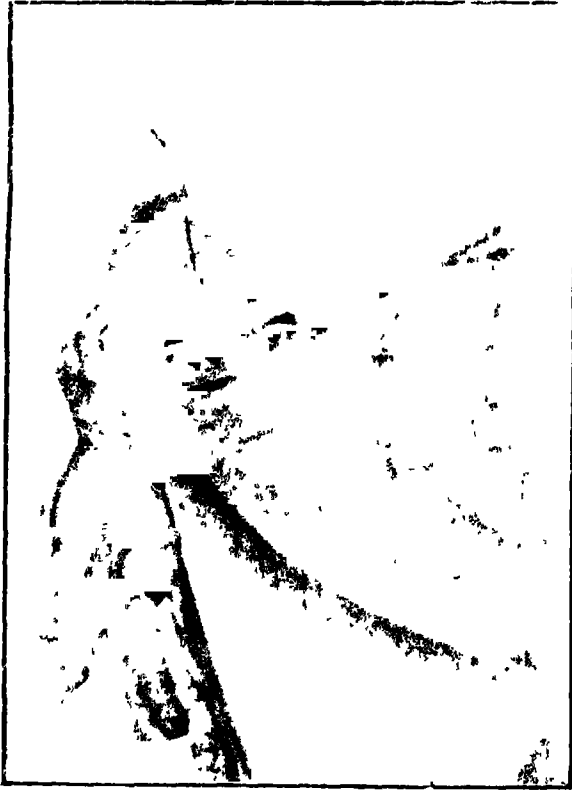
(۴۷۶)

نیرنگ خیال ہندوستان بھر کے علمی ادبی رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

تعداد اشاعت (۵۰۰۰)

جلد ۱۰ — نمبر ۵۹

مختصر فہرست مضامین

بابت ماہ مئی ۱۹۲۹ء

قیمت فی پرچہ (پانچ آنہ) ویلر کمپنی بک سٹال پرچہ چھ آنہ

قیمت سالانہ بذریعہ وی پی مع محصول ڈاک ۔ روپے ۔ ممالک غیر سے ۔ شلنگ

کریمی پریس لاہور میں باہتمام میر قدرت اللہ پرنٹر چھپا اور
حکیم محمد یوسف حسن پبلشر نے دفتر نیرنگ خیال بارود خانہ لاہور سے شائع کیا

شذرات

خاص نمبر اور عام نمبر

نیرنگِ خیال کے خاص نمبروں کے متعلق کچھ لکھنا غیر ضروری ہے۔ اُن کے متعلق تو ہندوستان بھر میں یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ وہ بے مثل اور لاجواب ہوتے ہیں۔ اور دوسرے رسایل کا بہتر سے بہتر خاص نمبر بھی گو حجم و سائز یا وزن میں کچھ مقابلہ کر سکے۔ لیکن ان کے مضامین بلند پایہ تصاویر اور بہترین ترتیب و کتابت وغیرہ کے لحاظ سے وہ اس کے پاسنگ بھی نہیں ہوتے۔ اور یہی حالت عام نمبروں کی ہے۔ بلکہ نیرنگِ خیال کے عام نمبر دیگر رسایل کے عام نمبروں سے اتنے اچھے ہوتے ہیں کہ زمین آسمان کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے اکثر معاصرین نے جو اس میدان میں ابھی ابھی تشریف لائے ہیں۔ باوجود استعداد بلند بانگ دعووں کے پرانی اور شایع شدہ تصاویر کے بلاکس ادھر اُدھر سے جمع کر کے شایع کر دئیے ہیں۔ اور دو دو مہینوں کے یکجا رسایل بھی اسی ڈھب سے نکل رہے ہیں۔ پرانی شایع شدہ تصاویر کو دوبارہ شایع کرنا کوئی عیب اور گناہ نہیں۔ لیکن موقع اور محل سے ہی ہر چیز اچھی معلوم ہوتی ہے۔ دفتر نیرنگِ خیال کو ہر ماہ قریباً دو سو روپے نئے بلاکس کی تیاری پر صرف کرنے پڑتے ہیں۔ اگر یہی بلاک ہم اپنے معاصرین سے عاریتاً لیکر شایع کر دیں تو خرچ میں اتنی بچت ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے ناظرین پر برا اثر پڑتا ہے۔ اور رسالہ کی دلآویزی میں چنداں دلچسپی پیدا نہیں ہو سکتی ✦
نیرنگِ خیال کے ہر نمبر کے مضامین اور تصاویر بہت ہی قیمتی ہوتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اس کی اشاعت میں اس سرعت سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اور اس کے پڑھنے والے ہر روز نئے نئے خریدار بھیجکر اپنے رسالہ کو مزید تقویت پہنچا رہے ہیں ✦

تصاویر کا خاص انتظام

اپنے سفر لکھنؤ اور دہلی کے دوران میں خاکسار نے پرانی تصاویر کی اشاعت کا خاص انتظام کر لیا ہے۔ اسوقت قریباً چار ہزار روپے مالیت کی قدیم قلمی تصاویر نیرنگِ خیال کے لئے محفوظ کر لی گئی ہیں۔ ہم ہر ماہ ایک بلاک ان تصاویر کا پیش کرتے رہینگے۔ اس قسم کی نادر تصاویر یا تو انگریزی رسایل کو میسر آسکتی ہیں یا نیرنگِ خیال کو ✦

رسالہ پیشوا کی ذرہ نوازی

دہلی کا مشہور و مقبول رسالہ پیشوا اپنی تازہ اشاعت میں نیرنگِ خیال کے عید نمبر پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

"نیرنگِ خیال کے مدیر اعلیٰ میرے محترم اور محنت سے کبھی نہ تھکنے والے اور اُردو رسایل میں عید نمبر نکالنے کے باوا آدم جناب حکیم محمد یوسف حسن صاحب ہیں۔ جن کی ذاتی محنت سے رسالہ نے اتنی جلدی ترقی کی ہے کہ اکثر معصر اس ترقی سے آتش در بغل ہیں۔ پیشِ نظر رسالہ میں چالیس کے قریب نظم و نثر کے بہترین مضامین ہیں اور کئی رنگ کے فوٹو بلاک اور رنگین تصاویر ہیں میں جانتا ہوں کہ اتنے اعلیٰ پایہ کے مضامین حاصل کرنے اور ایسے اعلیٰ درجہ کے شاہکار شایع کرنے میں حکیم صاحب نے کسقدر محنت کی ہوگی اور کتنا روپیہ خرچ کیا ہوگا۔ اور مضمون نگار صاحبان کے کیسے نخرے برداشت کئے ہونگے۔ اس لئے صحیح معنوں میں حکیم صاحب کی محنت کا اندازہ کچھ اخبار نویس ہی کر سکتے ہیں۔ اور میرے دل میں تو حکیم صاحب کی

محنتِ شاقہ کا اثر اس لئے بھی زیادہ ہوجاتا ہے کہ ابھی ایک مہینہ گزرا کہ وہ ایک لمبا چوڑا سالنامہ شائع کرچکے ہیں۔ خدا جانے اس شخص کے پاس کہاں کا خزانہ ہاتھ آگیا ہے اور کیسا دماغ حاصل ہوگیا ہے کہ نہ خرچ کرنے سے چوکتا ہے اور نہ محنت کرنے سے تھکتا ہے۔

بہر حال میں اس کامیاب نمبر پر محترم حکیم صاحب کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ اور قارئین کرام سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ نیرنگِ خیال کے عید نمبر کو ضرور خریدیں۔ جو ایک روپیہ میں بہت سستا ہے"۔

ہم اپنے دوست کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ان شاندار الفاظ میں میری حقیر محنت کی داد دی۔ دفتر نیرنگِ خیال میں کوئی خزانہ نہیں۔ جو اس عظیم خرچ کا بار اٹھائے ہوئے ہو۔ سوائے اس کے خریداروں کے جذبہ کے جو نیرنگِ خیال سے عشق رکھتے ہیں۔ اور جو اس کی ترقی اشاعت میں ہر وقت کوشاں ہیں۔ ہم جو کچھ ان سے حاصل کرتے ہیں اس سے زیادہ خرچ کرکے ان کے سامنے پیش کردیتے ہیں۔ اور یہی نیرنگِ خیال کی کامیابی کا راز ہے۔

عید نمبر اور ڈاکخانہ کے چور اس دفعہ نیرنگ خیال عید نمبر بکثرت چوری ہوا ہے۔ ہم نے امسال رجسٹری کے لئے ٹکٹ طلب نہیں کئے تھے۔ کیونکہ گذشتہ سال صرف چار سو آدمیوں نے توجہ کی تھی۔ اور بقیہ خریداروں کو ہمیں عید نمبر بغیر رجسٹری ہی بھیجنا پڑا تھا۔ امسال کم از کم دو سو عید نمبر ہم دوبارہ بھیج چکے ہیں۔ اور تادم تحریر شکایات موصول ہو رہی ہیں۔ ہمارے معاونین کو خیال رکھنا چاہئے کہ شکایت وقتِ مقررہ کے اندر اندر ہونی چاہئے یعنی اشاعت سے ایک ہفتہ تک۔ اس کے بعد اگر آپ شکایت کریں تو آپ کو قیمت بھیجنی چاہئے۔ یہ صحیح ہے کہ آپ کو رسالہ نہیں ملا ہوگا۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ دفتر سے روانہ ہوگیا تھا۔ پھر راستہ میں کسی جگہ محکمۂ ڈاک کے ظالم اور بددیانت دشمنِ علم ڈاکو نے اسے اپنے لئے یا اپنے کسی دوست کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ سمجھکر اڑا لیا تو دفتر کیوں ایک روپیہ کا نقصان برداشت کرے؟ موجودہ چندہ معہ محصول ڈاک صرف ہے۔ اس میں کسی قسم کا منافع نہیں۔ اور سال بھر میں بعض خریداروں کو متعدد رسائل دوبارہ بھیجنے پڑتے ہیں۔ یہ صورتِ حال سخت ناگوار ہے۔ آپ کو رسالہ ملنا چاہئے۔ ہم دوبارہ بھیجنے سے معذور ہیں۔ پس خاص نمبروں کے لئے تو رجسٹری کے ٹکٹ ضرور آنے چاہئیں۔ عام نمبروں کے لئے آپ بھی قواعد کی پابندی کیجئے اور ہم بھی۔ آپ بھی کبھی نقصان برداشت کیا کریں اور ہم بھی۔ خلاصہ

(۱) رسالہ کی عدم رسیدگی کی اطلاع ۱۰ تاریخ تک ہوگی۔ تو ہم رسالہ مفت دوبارہ بھیج دینگے (۲) اگر آپ نے پتہ تبدیل نہیں کرایا۔ یا آپ سفر میں تھے اور رسالہ آپ کو نہیں ملا تو ٹکٹ بھیجئے۔ (۳) خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھئے۔ ورنہ آپ کا نام کسی طرح بھی تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ (۴) شکایات صاف الفاظ میں اختصار سے لکھئے۔ طویل عبارت سے چنداں فائدہ نہیں ہوتا۔ (۵) وقت پر شکایات موصول ہونے پر ہم رسالہ دوبارہ بھیجدینگے۔ لیکن اگر کوئی دوست اٹھا کر لے گیا ہو یا آپ کی کسی غلطی سے رسالہ آپ کو نہ ملا ہو تو دیانتداری سے ۵ کے ٹکٹ بھیجدیجئے۔ اسکا بار دفتر پر نہ ڈالئے۔

ایڈیٹر

زمزمۂ تغزّل

(از حضرت اظہر علی صاحب آزاد۔ ایم اے۔ آر ایس)

این چہ میگوئی کہ ہنگامِ وداعِ ہوش بود ہش نیدارم چگویم ہوش خود بیہوش بود

باحجابِ جلوۂ حسنِ شعلۂ ہم آغوش بود خود فراموش امتیاز و فہم ناحق کوش بود

ریختم اشکے و سیلابے چمن بردوش بود قطرہ بالید آنقدر بر خود کہ قلزم نوش بود

دیدہ و دل سوختم بیمِ جلوۂ برقِ جمال داستانم رنگِ رخ گفت و زبان خاموش بود

بود اندر حجلۂ من لیلیِ محمل نشیں واۓ محرومی کہ از نامحرماں روپوش بود

من چہ کردم من چہ کردم از من افتادم خراب چشمِ ساقی بود ساقی عالمے بے نوش بود

می سراید مست آزاد ست خاموش انجمن

تا تو خیزی مست می یابی کہ او خاموش بود

فقیر اظہر علی آزاد تحصیلدار ایم اے آر ایس

غزل

(از جلیل قدوائی، بی۔ اے)

وفا کی رسم نہیں ہے جو اِن حسینوں میں
الٰہی! دل نہیں رکھتے ہیں کیا یہ سینوں میں

کیا ہے جس نے مرے حالِ دل کو سخت تباہ
چمک ہی ہے یہ کیا شے ان آبگینوں میں

کہاں کہاں دلِ صد چاک اشکِ خوں روئے
دبے ہیں سیکڑوں افلاک ان زمینوں میں

غمِ فراق میں حسرت سے یاد آتی ہے
وہ زندگی جو گذاری ہے مہ جبینوں میں

ضیائے برقِ تبسم جو اُن لبوں پر ہے
وہی چمک ہے مرے اشک کے نگینوں میں

وہ اُٹھ رہے ہیں سرِ بزمِ عام کچھ کہنے
تڑپ رہے ہیں دلِ بیقرار سینوں میں

جو پونچھتے تھے کبھی اشک آج یہ دن ہے
چھپائے رہتے ہیں نشتر وہ آستینوں میں

صدائیں دیں تو صدا کچھ نہ آئے قبروں سے
وفا ذرا نہیں اس شہر کے مکینوں میں

اک آہِ سرد میں کاٹی وہ راہِ عشق جلیل
جو راہ اوروں سے ہوتی ہے طے مہینوں میں

جلیل قدوائی

گلہائے چیدہ

"وہ لطافت" کہ تڑپ اُٹھتا ہے نظارہ بھی　　جلوۂ صبح میں ہے یا شفقِ شام میں ہے
"رنگ و بوُ" بن کے وہ ہو جاتی ہے آوارہ بھی　　کون کہہ سکتا ہے گل، کس ہوسِ خام میں ہے

~~~~~

چن لئے پھول وہ میں نے چمنستانوں کے　　مایۂ ناز تھے جو فصلِ بہاراں کے لئے
ہیں خصائص یہی اس دہر میں انسانوں کے　　کہ ہر اقدام ہے اک خواہشِ پنہاں کے لئے

~~~~~

میں نے کی سعی کہ اس حُسنِ عمل تک پہنچوں　　تازگی جس سے میسّر ہو دماغ و دل کو
لے کے پیغام اک، اقوامِ مِلل تک پہنچوں　　دستۂ گل سے مزیّن کروں ہر محفل کو

~~~~~

"رنگِ" ہر گل سے ہو ظاہر یہ ادائے خاموش　　"وجہِ آرائشِ دنیا یہی نیرنگی ہے"
"بوئے" ہر گل سے ہو اپیدا یہ صدائے خاموش　　"اختلافات میں بھی ایک ہم آہنگی ہے"

~~~~~

فرقِ آئین و عقائد، مگر انسانوں میں　　کس لئے برق پئے خرمنِ عافیت ہے
ہیں یہ سب حشو و زوائد، مگر انسانوں میں　　ایک تخلیق ہے اس نوع کی اک فطرت ہے

~~~~~

کاش ہر نفس کو ہو، وحدتِ نفسی معلوم　　جذب باہم سے ہو مربوط نظامِ ہستی
دور ہو جائے جہاں سے یہ فضائے مسموم　　میرے پھولوں سے مہک اُٹھے مشامِ ہستی

~~~~~

ارشد تھانوی

غزل

(حضرت آرزو لکھنوی کے قلم سے)

نگہِ کرم کا خواہاں جو میں دل فگار ہوتا — کوئی اور تیر چلتا کہ جگر کے پار ہوتا

جو صبا چمن سے آئی وہ نوید پھر نہ لائی — کہ خزاں رسیدہ دل پر اثرِ بہار ہوتا

یہی حد نہ تھی وفا کی کہ قضا پہ ختم کر دی — ابھی اور کیا نہ کرتے اگر اختیار ہوتا

تمہارا کل کا وعدہ کوئی حشر کا تھا وعدہ — کہ وفا نہ ہونے پر بھی مجھے انتظار ہوتا

غم میں لطف کیا ہے یہ مگر عجب مزہ ہے — کوئی تلخ گھونٹ اترتا نہیں ناگوار ہوتا

میں چپ آسرا لگائے اور اسے یہی بہانہ — کہ یہ منہ سے کچھ تو کہتا جو امیدوار ہوتا

نہ زمیں کی طرح پڑتا ترے دل پر اک نشاں بھی — مرا ایڑیاں رگڑنا کہ یہیں مزار ہوتا

ہوئی غم کی آگ پانی کہ جو آنکھ تر ہے ورنہ — جسے دیکھتے ہو قطرہ یہی اک شرار ہوتا

ترے نازِ جانستاں سے یہ لگاؤ تھا اسی کو — کہ جدھر یہ تیر چلتا مرے دل کے پار ہوتا

وہ کہیں کہ آرزو کو مری غفلتوں نے مارا؟
ابھی ہم یہ بات کہتے تو نہ اعتبار ہوتا

آرزو

ایک گیت

سبزہ کے ایک کھیت میں — بیٹھا ہوا ہوں گا رہا
کھیت ہے کتنا دلفریب — گیت ہے کتنا جانفزا
کھیت کے وسط میں ہے ایک — ریت کا ٹیلا خوشنما
جیسے جزیرہ ہو کوئی — جھیل کے درمیاں کھڑا ق
سبزہ ہے کس کا؟ کیا خبر! — کھیت ہے کس کا؟ کیا پتا
آنکھ ہے یہ مگر مری — گیت ہے یہ مگر مرا

گیت ہے یہ مگر مرا

بادِ نسیم جانیئے — آتی ہے کس جہان سے
پھولوں سے کہہ رہی ہے کچھ — منہ کو لگا کے کان سے
سرسوں کے پھول زرد زرد — ملتے ہیں زعفران سے
دن کو ستارے ٹوٹ کر — گر پڑے آسمان سے
جاری ہے آج خود بخود — گیت مری زبان سے
رقص میں دل بھی آگیا — رُوح کی ایک تان سے

رُوح کی ایک تان سے

بستی بھی ہے وہ سامنے — اُڑتا ہے جس جگہ غبار
ایک غموں کا آشیاں — ایک مصیبتوں کا غار
اُس کے مقابلہ میں ہے — کیا یہ مقام خوشگوار
اُس جگہ تودہ ہائے خاک — اِس جگہ پاک سبزہ زار
اُس جگہ فکر اور ہراس — اِس جگہ صدق اور قرار
اُس جگہ موسمِ خزاں — اِس جگہ موسم بہار

اس جگہ موسمِ بہار

روشن دین وکیل

میاں چھجّو

ایک صاحبِ کرامت بزرگ

(از جناب محمد عطاء الرحیم صاحب ایم اے ایل ایل بی - علیگ)

میں یہ تو یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ کرامت کی قوت ان میں اکتسابی تھی یا قدرتی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ تیس برس کی عمر تک وہ کرامت کے قائل ایک دن بھی نہ ہوئے۔ اور اُنھوں نے روحانیت کا ہمیشہ ہی مذاق اُڑایا۔ ان کا حلیہ یہ تھا:۔ پست قد۔ رنگ سفید سرخی مائل۔ آنکھیں چھوٹی فرنچ کٹ ڈاڑھی۔ مونچھیں انور پاشا کی طرح چڑھی ہوئی۔ نام کیا تھا یہ کسی کو بھی خبر نہ تھی۔ اس لئے کہ دلّی والوں کو عرف رکھنے میں ایک خاص مہارت ہوتی ہے اور بعض دفعہ وہ عرف اس قدر مشہور ہو جاتا ہے کہ بچّہ بوڑھے جوان چھوٹے بڑے سب کی زباں پر وہ عرف رہ جاتا ہے۔ اور نام سب بھول جاتے ہیں۔ چنانچہ یہی قصہ یہاں بھی ہوا "میاں چھجّو" خدا معلوم کس نیک گھڑی عرف گھڑا گیا تھا کہ بمبئی کی تو خبر نہیں ہاں دلّی والا کوئی سوائے میاں چھجّو کے ان کا اصلی نام نہیں جانتا تھا۔ نام سے کون کہہ سکتا ہے کہ یہ شخص ایک دن وہ نکلیگا کہ تمام دنیا کو اپنی کراماتوں سے حیرت میں ڈال دیگا +

میاں چھجّو بمبئی میں سیٹھ جوسپ حاجی ہٹولا بھائی کچّھی کے کپڑے کے کارخانہ میں نیجر تھے۔ بمبئی کی تہذیب یافتہ سوسائٹی میں رہ کر وہ اس تہذیب کے ہر لوازم سے اس قدر آشنا تھے کہ اُن کو ٹھیٹ معنوں میں تہذیب یافتہ بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا تھا۔ جب کبھی اب آتشیں کی ایک بھی چنگاری ان کے جسم میں پڑ جاتی تو بس ان کی زبان گویا موجِ شرر ہوتی۔ اور اس وقت وہ ہر موضوع پر نہایت ہی مدلل بحث فرماتے۔ چنانچہ قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ عین اُس وقت جبکہ وہ کرامات کا ہونا محال ثابت کر رہے تھے اُن کو پہلی دفعہ اس بات کا احساس ہوا کہ وہ خود صاحبِ کرامت ہیں یہ بحث اُس وقت چھڑی جبکہ میاں چھجّو بیوپار کے سلسلہ میں اپنے وطن دلّی آئے ہوئے تھے۔ اور وہاں کے ایک بڑے مہذّب ہوٹل میں وہ خود اور اُن کے دوست نواب نور آور خاں کے علاوہ لالہ ہرچنداس موجود تھے۔ سنگِ مرمر کی چھوٹی سی خوشنما میز کے اطراف جو چوتھی کرسی خالی پڑی۔ اُس پر مس ایف گلاس صاف کرتے کرتے بحث میں حصہ لینے کی غرض سے بیٹھ جایا کرتی تھیں +

بحث دراصل نواب صاحب اور میاں چھجّو میں ہو رہی تھی نواب صاحب اپنے حریف کی ہر مدلّل بحث کے جواب میں

کوئی ثبوت یا دعویٰ پیش نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنے حریف کے ہر ثبوت کے اختتام پر نہایت جوش سے فرماتے تھے

"کیا خوب!"

اب چونکہ یہ جواب بہتر سے بہتر اور مدلّل سے مدلّل دلیل پر حاوی تھا۔ اس لئے ہر "کیا خوب!" کے بعد میاں چھجو جھنجھلا کر پہلے کے مقابلہ میں زیادہ زور سے ایک نئی دلیل کرامت کے محال ہونے کے ثبوت میں پیش کرتے تھے۔ لیکن نواب صاحب کی ایک "کیا خوب!" ان کی بہت دیر کی محنت کو خاک میں ملا دیتی تھی۔ الغرض جب معاملات حد سے تجاوز کر گئے تو میاں چھجو نے ایک دم گلاس خالی کیا اور بار دیگر بنت عنب کو شیشہ میں اتارا۔ اب جو گویا ہوئے تو ان کے دریائے فصاحت نے حاضرین کو حیرت میں ڈال دیا "جناب نواب صاحب گستاخی معاف ہو۔ شاید ہم کرامت کے ممکن یا محال پر بحث کرنے سے پہلے خود کرامت کے مفہوم کو نہیں سمجھے۔ کرامت اسی واقعہ کو کہتے ہیں نا کہ جو قانونِ قدرت کے خلاف کسی شخص کی قوتِ ارادی کی وجہ سے ظہور پذیر ہو"۔

"کیا خوب!" نواب صاحب نے فرمایا۔

میاں چھجو نے لالہ ہرچنداس کی طرف دیکھا۔ لالہ جی نے پہلے نواب صاحب کی طرف دیکھا۔ کچھ جھجکے۔ پھر ایک نفرہ کھانس کر میاں چھجو کی طرف رخ کر کے سر ہلا دیا مس ایف جبتک کہ ساغر کا دور چل رہا تھا اس بحث سے بہت خوش تھیں اور ان کا سر باری باری دونوں کی طرف دیکھ کر ہل جایا کرتا تھا۔ چنانچہ میاں چھجو اپنی بحث کا اچھا اثر دیکھ کر خوش ہوئے اور کہنے لگے

"مثلاً یہ لمپ جو سامنے رکھا ہے اوندھا ہو کر نہیں جل سکتا۔ اب اگر کوئی اس کو حکم دے کہ الٹ جا اور روشن رہ۔ اور وہ اس کا حکم مانے تو یہ کرامت ہوگی"۔

"کیا خوب لمپ الٹا ہو کر نہیں جل سکتا"۔

"تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جل بھی سکتا ہے"۔

"نہیں" ذرا رک کر نواب صاحب نے ایک بات اپنے حریف کی مانی کہ لمپ الٹا ہو کر نہیں جل سکتا۔

"نواب صاحب اب آپ ذرا سمجھ کی باتیں کر رہے ہیں" میاں چھجو نے کہا "مثلاً میں اگر مدعی ہوں صاحب کرامت ہونے کا اور یہیں کھڑے ہو کر اس لمپ کو حکم دوں کہ الٹ جا اور اسیطرح روشن رہ۔۔۔" میاں چھجو کا ارے کہنا تھا کہ ہر ایک کی زبان سے "ارے" نکلا۔ اس لئے کہ وہ ناممکن الوقوع امر ان کی آنکھوں کے سامنے ظہور پذیر ہوا۔ اور اس کمرہ میں ہر ایک نے دیکھا کہ لمپ الٹا ہو گیا ہے اور اس کی لو برابر اسی طرح ہے۔ اور کمرہ کی روشنی میں کسیطرح کا فرق نہیں آیا۔ نواب صاحب مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اور لالہ جی توند سنبھالتے ہوئے ایک دم کھڑے ہو گئے مس ایف کے منہ سے زور کی چیخ نکلی۔ اتنے میں میاں چھجو کی آواز سنائی دی:-

"میں اب اس کو وہاں قایم نہیں رکھ سکتا سنبھالو لمپ گرتا ہے!" یہ کہنا ہی تھا کہ لمپ میز پر گرا اور نواب صاحب کے آدھے بھرے ہوئے گلاس کو الٹتا ہوا نیچے آ رہا اور بجھ گیا۔ سب نے خدا کا شکر ادا کیا کہ لمپ بھڑکا نہیں اور تیل نیچے نہیں گرا نہیں تو ہر ایک اس میں سے جل جاتا ع رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت۔

اس حادثہ کے بعد سب سے پہلے جس شخص کی آواز سنائی دی وہ لالہ ہرچنداس تھے کہ جنہوں نے نہایت بدتہذیبی سے میاں چھجو کے حسب اور نسب کے بارہ میں نہایت

ہی غیر ممکن، غلط اور فطرت کے خلاف واقعات بیان کئے۔ میاں جھجو پر لالہ جی کی خفگی کا مطلق اثر نہیں ہوا۔ اس لئے کہ اُن کا سر شریف ایک واقعات کی اہمیت کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکا تھا۔ ان کو اس بات کا تعجب ضرور ہوا کہ نواب شبّو اور یہاں بھی لالہ جی کی خلاف عقل باتوں میں ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مسٹر ایف کی باریک آواز اونچے سُروں میں سُنائی دی اور وہ میاں جھجو کو "بانا ری شہزادہ" کہہ رہی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میاں جھجو اس تمام فصاحت کا جواب بلاغت میں دیدیتے۔ مگر اس وقت وہ اتنا سمجھ گئے کہ اُن کے ہم پیالہ اور ہم نوالہ دوست اُن سے خفا ہو گئے ہیں۔ اور جس کا عملی ثبوت ان دونوں نے یوں دیا کہ اُن کو یا بدستے دگرے دست بدست گھسے ہوٹل سے نکلوا دیا +

دلّی کی رات۔ سردی کا زمانہ۔ انگور کی بیٹی کا ساتھ اور اس پہ ایک طوفان خیال۔ غرض کہ اُفتاں و خیزاں گھر چلے ہوٹل کے دروازہ پر جو قدِ آدم آئینہ لگا ہوا تھا اُسی کی چلتے چلتے جو سیر فرمائی تو عجیب منظر دیکھا۔ بال جو کہ بہترین ولایتی کریم لگا کر جمائے گئے تھے پریشان۔ آنکھیں سرخ۔ چہرہ پہ نیم کریم کے بجائے گرد اور جھریاں۔ داڑھی بے ترتیب مونچھ صرف ایک طرف کی درست۔ بوٹائی ٹیڑھی۔ کالر میں کئی شکن۔ اپنی صورت گو ایسی کبھی اس سے پہلی نہیں دیکھی تھی۔ مگر آج کا دن نئی نئی چیزوں کے لئے بنا تھا۔ اور سب سے نئی چیز وہی چراغ کا واقعہ تھا۔ جس کا خیال عجیب سے عجیب واقعہ کو ان کے سر سے نہیں نکال سکتا تھا۔ راستے میں جتنے بھی سڑک کے لمپ ملتے تھے اُن کو بھی ڈرتے ڈرتے دیکھتے تھے کہ کہیں یہ بھی اُلٹ نہ جائیں۔ لیکن چلنے والوں کی کثرت میں ان کو سوچنے کا اچھی طرح موقع نہ ملا۔ جامع مسجد پہنچ کر اپنے گھر کی طرف مڑے اور گھر پہنچ کر دروازہ بند کرنے کے بعد میاں جھجو شام کے تمام واقعات کی چھان بین میں مشغول ہو گئے۔ اور بار بار یہ سوال اُن کے ذہن میں گشت کرتا رہا کہ "آخر یہ ہوا کیسے"! اسی عالمِ خیال میں کوٹ اُتارا۔ پلنگ پر بیٹھ کر پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر سوچنے لگے۔ بار بار کہہ رہے تھے کہ "میرا ارادہ کبھی بھی لمپ کو اُلٹ دینے کا نہیں تھا میں تو یونہی کہہ رہا تھا" یہ خیال انہیں دفعہ آیا ہوگا کہ انہوں نے خیال کیا کہ عین اُس وقت جبکہ اُن کی زبان سے تحکمانہ الفاظ نکلے، فوراً لمپ اُلٹ گیا اور جب انہوں نے لمپ کو معلق اور اُلٹا ہوا دیکھا تو اُن کو دفعتہ یہ محسوس ہوا کہ لمپ کا ہوا میں قائم رکھنا اُن کے قوتِ ارادی پر ہے۔ گو اس حماقت آمیز خیال کی وجہ اُن کے ذہن میں بالکل نہیں آتی +

میاں جھجو نے کالج میں فلسفہ یا سائنس کی تعلیم تو پائی نہ تھی کہ ذہن کی کیفیات کا تجزیہ کرتے یا اس واقعہ کے ممکن یا محال ہونے پر حکم لگاتے۔ اُن کے ذہن میں صرف اتنی بات آئی کہ انہوں نے بغیر سوچے ہوئے لمپ کو حکم دیا کہ اُلٹ جا۔ چنانچہ وہ اُلٹ گیا۔ اس کے بعد ہی فوراً انہوں نے اپنی کرامات کے عملی تجربات شروع کر دیئے۔ پلنگ کے پاس میز پر ایک موم بتی جل رہی تھی اُس کو حکم ہوا "ہوا میں معلق ہو جا"۔ اس بات کے ذہن میں آتے ہی اُن کو خود اپنی حماقت پر ہنسی آئی اور ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ مگر ابھی ہنسی پوری طرح ختم نہیں ہوئی تھی کہ انہوں نے دیکھا کہ موم بتی اوپر اُٹھی اور ایک لمحہ کے بعد میز پوش پر گر کر بجھ گئی۔ اور آخری چنگاری کے گل ہونے کے بعد میاں جھجو اندھیرے میں سخت پریشانی کی حالت میں ہکا بکا رہ گئے۔ تھوڑی دیر تک تو پلنگ پر اپنے خیالات میں مبہوت۔ ساکت بت بنے بیٹھے رہے۔ پریشانی یہ عجیب

عالم تھا۔ آخر بیکار کہنے لگے کہ

"کرامت پھر ہوگئی کس طرح ہوئی۔ گو اس کا اب تک مجھے علم نہیں" یہ کہہ کر اپنی جیب میں ماچس کا بکس تلاش کرنے لگے۔

"کاش اس وقت میرے پاس ماچس کی ڈبیا ہوتی" ان کی زبان سے نکلا اور وہ مایوسانہ حالت میں اپنی جیب پھر ٹٹولنے لگے۔ کہ اتنے میں پھر ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ کرامت ماچس کے ساتھ بھی ہو سکتی ہے۔ فوراً اندھیرے میں ہاتھ پھیلا کر حکم دیا کہ "میرے ہاتھ میں ایک ماچس آجائے" الفاظ زبان سے نکلے ہی تھے کہ اندھیرے میں کوئی ہلکی سی چیز ان کی ہتھیلی پر گری اور انہوں نے فوراً مٹھی بند کر لی۔

کئی دفعہ جلانے کی بے سود کوشش کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ وہ سیفٹی ماچس تھی۔ اور ڈبیا بغیر جل نہیں سکتی تھی مجبوراً اس کو زمین پر پھینک دیا۔ اس کے بعد خیال آیا کہ اسکو جلنے کا حکم کیوں نہ دوں چنانچہ حکم دیا اور ماچس دری پر پڑے پڑے جلنے لگی۔ انہوں نے جلدی اس کو اٹھایا۔ لیکن وہ اٹھاتے ہی گل ہو گئی۔ مگر اب ان کے ذہن میں دائرہ ممکنات بہت وسیع ہو گیا تھا چنانچہ انہوں نے ٹٹول کر موم بتی کو شمعدان میں لگا کر حکم دیا کہ "جل جا"۔ وہ فوراً روشن ہوئی۔ روشنی میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ میز پوش میں سوراخ ہو گیا ہے اور دری میں ماچس کے جلنے سے ایک سیاہ دھبہ پڑ گیا ہے۔ سر جو اٹھایا تو سامنے کے آئینہ میں اپنی صورت نظر پڑی۔ اپنے عکس سے آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ گفتگو کرتے رہے۔ پھر یکبارگی زور سے کہنے لگے "میاں چھجو اب کہو" لیکن وہاں بھی حکم کی دیر تھی فوراً رفو ہو گیا۔ میاں چھجو کیلئے اب تک کرامت ایک عجیب چیز تھی۔ چنانچہ اس کے بعد وہ بہت دیر تک کچھ سوچتے رہے۔ بے خیالی میں ایک کاغذ جیب سے نکالا پھر کچھ سوچ کر اس کو ایک گلاس میں رکھا اور حکم ہوا کہ "پانی بن جا" فوراً خط پانی بن گیا۔ پھر پانی کو کبھی ہرا کبھی سرخ۔ کبھی آسمانی رنگ میں تبدیل کرتے رہے۔ بعدش پانی پھینک دیا۔ فوراً ایک کاغذی مینڈک بنایا۔ اور آن کی آن میں اس کو غائب بھی کر دیا۔ اتنے میں خیال آیا کہ دانت صاف کرنے کا برش خراب ہو گیا ہے۔ خیال کے آتے ہی حکم دیا اور برش حاضر ہو گیا۔ اس وقت میاں چھجو کی دماغی کیفیت یہ تھی کہ انکو اس بات کا احساس ہو چلا تھا کہ کرامت کی قوت خدا نے ہمیشہ سے ان کو ودیعت کی تھی اور اپنی غلطی سے انہوں نے کبھی اس کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ حیرت اور تحیر اوّل اوّل ضرور تھا۔ مگر اسکی جگہ بہت جلد فخر اور غرور نے لے لی۔ ان خیالات اور تجربات میں اسقدر انہماک ہو گیا تھا کہ جب پولیس کی چوکی میں ایک کا گھنٹہ بجا تب ان کو خیال آیا کہ رات بہت زیادہ آگئی۔ تھکے کل کے کاموں کا خیال پریشان کر رہا تھا۔ سونے کے کپڑے پہننے کے لئے قمیص اتار ہی رہے تھے کہ خیال آیا اور آتے ہی حکم دیا کہ "میں بستر پر فوراً لیٹ جاؤں"۔ چنانچہ وہ آن واحد میں بستر پر تھے۔ بعد کو حکم ہوا کہ "یہ کپڑے سب اتر جائیں" حکم کی تعمیل فوراً ہوئی پلنگ کی ٹھنڈی چادر نے کچھ تکلیف دی تو ایک بیش قیمت اونی نائٹ ڈریس کا حکم دیا اور اپنے کو پہنے ہوئے پایا اس دن کا آخری حکم تھا کہ

"فوراً مجھے نیند آجائے........."

صبح اٹھ کر رات کے واقعات پر غور کرتے رہے کہ آیا جو کچھ کل رات گزرا وہ خواب تھا یا خیال۔ مگر رکابی پر تیسرا انڈا صاحب کرامت ہونے کا بہترین ثبوت تھا۔ ان کے نوکر ہمیشہ لے صرف دو انڈے چھوٹی حاضری کے ساتھ لگاتے تھے لیکن تیسرا

انڈا کرامت سے پیدا ہوا۔ کرامت ہی سے پلا اور کرامت ہی سے پیٹ پر آگیا۔ اس انڈے کا خدا بھلا کرے میاں چھجو کو اس انڈے کی وجہ سے نہایت سکونِ قلب حاصل ہوا۔ اس کے چھلکے کا ایک حصہ غلطی سے ان کی جیب میں چلا گیا اور دن بھر ان کو تشفی دیتا رہا۔ تمام دن کسی کام میں جی نہ لگا گزشتہ شب کے واقعات برابر ذہن میں آتے رہے۔ مگر جب کبھی اپنے صاحبِ کرامت ہونے میں شک ہوتا تو فوراً اپنی جیب سے انڈے کا چھلکا نکال کر دیکھ لیتے اور یک گونہ اطمینان ہو جایا کرتا۔ الغرض اسیطرح تمام دن ابسر ہوگیا۔ شام کے وقت خیال آیا کہ آج کام تو کچھ ہوا نہیں ۔ سیٹھ جوسپ کو رپورٹ میں کیا لکھونگا۔ مگر ذرا پریشان ہوئے بغیر حکم دیا اور دس منٹ میں تمام دن کا کام ختم ہوگیا۔

شام ہوتے ہوتے تو ان کے خیالات تعجب سے فخر میں مبتلا ہو چکے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ گذشتہ شب کے واقعات اور خصوصاً ہوٹل سے نکالے جانے کا سانحہ یاد کرتے تھے دل ہی دل میں خفا ہوتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی خیال آیا کہ نازک چیزوں کو اُٹھانے میں احتیاط برتنی چاہئے۔ اس خیال سے کہ کرامت سے کتنی باتیں ممکن ہیں نہایت خوش ہوئے۔ کبھی خیال آیا کہ " میں روپیہ پیسہ سونا چاندی اپنے واسطے بہت سا بنالونگا۔ تاکہ پھر عمر بھر کسی کی ملازمت نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ فوراً ہی قمیص کے بٹن ہیرے کے بنا لئے۔ مگر چونکہ ایک آدمی ان کی طرف آرہا تھا۔ اس لئے انہوں نے فوراً ہی ان کو غائب کر دیا۔ دل میں کہنے لگے " کرامات کے لئے ہوشیاری اور عقلمندی کی بہت ضرورت ہے۔ اگر وہ آدمی ابھی ہیرے کے بٹن دیکھ لیتا تو خدا معلوم کیا کیا شک کرتا۔" یہ بات مگر ان کو بائیسکل پر بیٹھنے سے زیادہ مشکل معلوم ہوئی۔ بائیسکل چلانے کی وقت اور کل شب کی ہوٹل میں ہتک عزت غرضکہ دونوں خیالات نے مجبور کیا کہ آج شب وہ اپنے رفیق ہوٹل میں نہ جائیں۔ چنانچہ وہ ایک کم چلنے والی سڑک پر ہوکر سوچنے لگے کہ کیا کرنا چاہئے۔ ہاتھ کی لکڑی کی طرف نظر پڑی۔ حضرت موسیٰؑ کا معجزہ یاد آیا۔ مگر اس خیال سے بہت ڈرے کہ کہیں یہ اژدھا نہ بن جائے سوچتے سوچتے لکڑی کو زمین پر رکھکر حکم دیا کہ " گلاب کا درخت بن جا۔" فوراً گلاب کا ایک درخت جس میں نہایت اعلیٰ قسم کے گلاب کے پھول لگے تھے سڑک کے بیچ میں اُگ آیا۔ پھولوں سے اسقدر خوشبو نکل رہی تھی کہ تمام سڑک مہک رہی تھی ۔ میاں چھجو اپنی کرامت پر بہت خوش ہوئے اور وہیں اینٹھ میں ٹہلنے لگے ۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ میاں چھجو بہت سٹ پٹائے کہنا چاہتے تھے " غائب ہو جا۔" زبان سے نکلا " واپس ہو جا۔" الفاظ کا زبان سے نکلنا تھا کہ درخت کئی گز پیچھے ہٹ گیا اور ایک آدمی کی چیخ سنائی دی۔ آگے بڑھکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ چھوٹے خاں ہیڈ کنسٹبل زمین پر پڑا ہوا ہے اور کانٹوں سے تمام چہرہ لہولہان ہو رہا ہے۔ چند ناشائستہ الفاظ تمہیداً کہنے کے بعد چھوٹے خاں کہنے لگا

"او ہو تم وہی آدمی ہو نا جس نے کل ہوٹل میں لیمپ توڑا تھا"

" بھائی اتفاق تھا"

" اتفاق تھا یا شعبدہ بازی"

" یار جانے بھی دو"

" یار تمہارے کہیں گھانس کاٹتے ہونگے۔ پولیس میں تمہارا کوئی یار نہیں۔ کل تم نے لیمپ توڑ دیا اور آج تم نے

مجھے اس خاردار جھاڑی سے زخمی کیا۔ میں تم کو گرفتار کرتا
ہوں۔"

"بھائی جان میری بھی تو سنئے میں صاحب کرامت
ہوں۔"

"او ہو! ابھی اتفاق تھا اور اب کرامت ہو گئی۔ کل تک
تو کرامت کے خلاف بحث کر رہے تھے۔ اور آج سرکاری
آدمیوں کو زخمی کر کے کرامت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اگر جیل خانہ
میں کچھ دن رہنا پڑا تو ساری کرامت نکل جائیگی"۔

میاں چھجو اپنے آپ کو اب اتنا بڑا آدمی سمجھے
تھے کہ وہ ایک پولیس کے ہیڈ کانسٹبل کو کب خاطر میں
لا سکتے تھے۔ اس بات کا ان کو ضرور غصہ آیا کہ انہوں نے
چھوٹے خاں سے اپنا راز کیوں کہہ دیا۔ کیونکہ اب اس
راز کا چھپانا نہایت ہی مشکل تھا۔ اسی خیال میں کھڑے
پیچ و تاب کھا رہے تھے کہ چھوٹے خاں نے غضب یہ کیا
کہ ان کو گرفتار کرنے کو آگے بڑھا۔ میاں چھجو ایک دو قدم
پیچھے ہٹے اور زور سے کہا

"تو جہنم میں جا"

بہت آنکھیں مل مل کر دیکھا مگر وہ سڑک۔ پر اکیلے کھڑے
تھے اور چھوٹے خاں کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس کے بعد رات
میں کوئی اور تجربہ نہیں کیا۔ کئی دفعہ یہ خیال ضرور ذہن میں
آیا کہ "جہنم جگہ کیسی ہے"۔ رات ہو گئی تھی۔ کل شب دیر
تک جاگے تھے۔ آج جلدی سونے کی تیاری شروع کر دی۔
ایکدم ترس آ رہا تھا۔ دوسرے کے بند کھل رہے تھے۔
کہ چھوٹے خاں کی حالت پر رحم آ گیا اور فوراً اس کو ٹمبکٹو
تبدیل کر دیا۔ سو گئے۔ مگر رات بھر یہ خواب دیکھتے رہے کہ
چھوٹے خاں کھڑا گالیاں دے رہا ہے +

صبح اٹھکر انہوں نے دو خبریں سنیں ایک تو یہ کہ ایک
سڑک پر کسی نے عجیب قسم کا گلاب کا درخت لگا دیا ہے۔
اور دوسری یہ کہ چھوٹے خاں کی تلاش جتنا میں دو دو میل
تک کی جائے گی۔ آج تاریخ ۸ نومبر ۱۹۲۲ء تھی۔ میں ناظرین
کی توجہ خاص طور سے اس تاریخ کی طرف مبذول کرانا چاہتا
ہوں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ بہت سے حضرات دو اعتراضات
کرینگے یا کر چکے ہونگے۔ اوّل یہ کہ اتنے بڑے واقعات
ہو جائیں اور نا ممکن ہے کہ اخبارات میں ان کا تذکرہ نہ ہو
دویم یہ کہ تمام دنیا تباہ ہو جائے اور یہ کیسے ممکن ہے کہ لوگ
اس کو محسوس نہ کریں۔ مگر آپ ذرا توقف فرمائیں۔ اس پراسرار
افسانہ کو آپ کی خدمت میں ابھی پورا پیش نہیں کیا گیا ہے۔
ابھی اس لئے نہیں کہتا کہ آپ کا سب لطف خاک میں مل جائیگا
فی الحال صرف اسقدر عرض ہے کہ کرامت اسی واقعہ کو تو کہتے
ہیں جو خلاف عقل اور قرین قیاس ہو۔ اگر کوئی پان کھائے
یا ٹوپی سر پر رکھے یا سگرٹ پیئے تو اس کو تو آپ کرامت
نہیں کہیں گے۔ اس لئے میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ
اس تاریخ کو تمام دنیا فنا ہو گئی تھی۔ اور اس کا کوئی متنفس
زندہ باقی نہیں رہا تھا۔ ہاں سوائے میاں چھجو کے اب
اگر آپ اس واقعہ کا یقین نہیں کرینگے تو یہ اس کرامت کی بین
دلیل ہوگی۔ اور تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ اتنا تحت ساتھ
ہو جائے اور کسی پر اس کا اثر تک نہیں۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ
تھا۔ آمدم برسر مطلب +

میاں چھجو دن بھر اپنے خیالات میں مستغرق رہے۔
اور دن بھر کوئی کرامت ظہور پذیر نہیں ہوئی۔ صرف چھوٹے
خاں کے لئے ٹمبکٹو میں سامان خورد و نوش و لباس مہیا کر دیا
گیا۔ دن بھر کام کرتے کرتے اندھیرا ہو گیا تھا۔ شام کو باہر نکلے

تھا کہ جب عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ میاں چھجو سے سوچا کہ "چلو آج نماز پڑھ آئیں"۔ نماز کے بعد حافظ جی نے وعظ فرمایا۔ اور دوران وعظ میں سخاوت کی تعریف کے ضمن میں بہت سی اگلی باتیں کر گئے ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ "جادو کفر ہے اور جادوگر ہے کافر"۔ میاں چھجو اس سے بہت متاثر ہوئے اور وعظ نہایت غور سے سنا۔ بعد میں حافظ جی سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔ حافظ جی اپنی تعلی سبب کو پورا ہونے کے خیال سے ایک ہاتھ سے تسبیح پھیرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے میاں چھجو کا ہاتھ پکڑ کر اپنے حجرے میں لے گئے۔

حجرے میں پہنچکر حافظ جی خود مسند پر جو بیٹھے اور میاں چھجو دوزانو سامنے بیٹھ گئے۔ حافظ جی نے اوّل تو کچھ تسبیح پر اور کچھ انگلیوں پر وظیفہ پڑھا۔ پھر تھوڑی دیر تک ڈاڑھی میں انگلیوں سے شانہ فرمایا اور تقریباً آدھ گھنٹہ کے بعد میاں چھجو سے آنے کی وجہ دریافت کی انہوں نے لمپ کے واقعہ سے لیکر درخت کے واقعہ تک سنایا اور کہا "حافظ جی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان واقعات کو کرامت کہوں یا جادو۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ مجھ میں یہ قوت کیسے پیدا ہوئی۔ آپ سے آپ میں ایک دن صاحب کرامت ہو گیا"۔

اثنائے گفتگو میں کئی دفعہ چھوٹے خاں کا خیال آیا اور ہر خیال کے ساتھ ایک جھرجھری آتی رہی۔ اخیر میں جب ضبط نہ ہو سکا تو وہ واقعہ بھی سنا دیا۔ حافظ جی ذرا خوفزدہ ہوئے اور لگے ادھر ادھر دیکھنے کہ دیوار ہم گوش دارد۔ مگر میاں چھجو نے فوراً ہمت کر کے کہنا شروع کیا۔ "حافظ جی آپ گھبرائیے نہیں۔ گو میں یہ جانتا ہوں کہ چھوٹے خاں دلی آنے کی سخت کوشش کر رہا ہوگا۔ مگر میں ایک دو گھنٹہ کے بعد اس کو ہیئت نے کے لئے شبکتو واپس بھیجدونگا۔ مجھے بیچارہ پر رحم بہت آتا ہے کہ جاڑے میں اسکے کپڑے بدل گئے ہونگے گرمیوں کے تھیں دو اس کو ٹمبکٹو بھیجا۔ فوراً ہی لباس وغیرہ کا کافی انتظام کر دیا ہے۔ اب اس سے زیادہ میں کر ہی کیا سکتا ہوں۔ اب آپ سے یہ بات دریافت کرنی ہے کہ یہ سب جادو تو نہیں جو کفر کے درجہ تک پہنچ جائے"۔

"بھائی میری سمجھ میں یہ کوئی بات آتی نہیں"۔

"اگر آپ بھی تجربہ چاہتے ہیں تو ابھی لیجئے"۔ میاں چھجو نے جواب دیا۔

حافظ جی کے پاس ایک فرشی حقہ رکھا تھا اس کو میاں چھجو نے حکم دیا کہ "پھولوں کا گلدستہ بن جا"۔ تعمیل حکم فوراً ہوئی۔ حافظ جی کچھ دیر تک تو آنکھیں ملتے رہے۔ پھر اس کو اٹھا کر جو سونگھا تو نہایت ہی تازہ اور اچھے قسم کے پھول تھے۔

"اور کچھ بھی کر سکتے ہو"۔ حافظ جی نے تھوڑی دیر میں کہا۔

"جو آپ فرمائیں" میاں چھجو نے جواب دیا۔ اتنے میں ایک شعبدہ کا خیال آیا آتے ہی انہوں نے گلدستہ کو ایک پیالہ اور اس میں مچھلیاں بن جانے کا حکم دیا۔ گلدستہ ایک بدنما مٹی کا پیالہ بن گیا اور اسمیں کئی چھوٹی چھوٹی سیاہ مچھلیاں تیرتی نظر آئیں۔ میاں چھجو بہت سٹ پٹائے کہ ان کے الفاظ کے ذرا سے رد و بدل سے کسقدر فرق ہو جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے حکم دیکر ایک نہایت ہی خوبصورت شیشہ کا پیالہ بنایا اور اس میں سنہری مچھلیاں

تیرتی نظر آئیں۔ اس کے بعد ان سب کو فنا کر کے ایک کبوتر بنایا اور وہ کمرے میں حافظ جی کے سر کے اوپر سے اُڑنے لگا۔ پھر اس کو ہوا میں ساکت کر دیا۔ اس کا پھر گلدستہ بنایا اور گلدستہ بالآخر حافظ جی کا حقہ بن گیا۔ حافظ جی اپنا حقہ دیکھ کر ذرا مطمئن ہوئے اور بڑی دیر تک اس کو پکڑے بیٹھے رہے۔ کہ سچ مچ یہ وہی حقہ ہے یا صرف خیال۔ دیکھا تو واقعی اُن کا پرانا حقہ تھا۔ اپنی چیز واپس ملی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا +

یہ تمام واقعات اتنی دیر تک ہوتے رہے کہ شب کے کھانے کا وقت ہو گیا حافظ جی کی بی بی تھیں بہت چڑچڑے مزاج کی۔ مگر حافظ جی خدا جانے "نسیان" کے کون سے "طاق" میں بیٹھے تھے کہ میاں چھجو کو کھانے پر روک لیا۔ بی بی نے جو سنا تو سخت تز بز ہوئیں اور غصہ میں جل بھن کر کباب ہو گئیں۔ کیا یہ کہ سالن اور دال میں تھوڑا تھوڑا پانی ملا کر باہر بھیجدیا۔ حافظ جی کھانے کی صورت دیکھ کر نہایت خفیف ہوئے۔ مگر میاں چھجو بولے

"حافظ جی یہ کونسی پریشانی کی بات ہے۔ جو کہئے ابھی منگوائے دیتا ہوں"+

چنانچہ بریانی۔ مزعفر۔ قورمہ۔ فیرنی۔ شامی کباب۔ پراٹھے۔ شیرمال۔ الغرض جو جو ذہن میں آیا منگوا ڈالا۔ بیچارے حافظ جی نے ایسا کھانا عمر بھر نہ کھایا تھا چنانچہ سیر ہو کر کھایا۔ اور میاں چھجو کی خوب خوب تعریف کی اپنی تعریف سنکر میاں چھجو پھول کر کپا ہو گئے اور کہنے لگے

"حافظ جی یہ کیا بڑی بات ہے۔ آپ کہیں تو میں آپ کی بی بی کو خوبصورت اور نیک سیرت ابھی کئے دیتا ہوں"+

اور فوراً ہی احکام جاری کر دیتے۔ ان تمام تجربات کے باوجود حافظ جی اپنی بی بی کو خوب جانتے تھے۔ جیسا کہ صرف ایک خاوند ہی جان سکتا ہے۔ دل میں کہنے لگے کہ بی بی درازالذنبا کرامت کی حد سے کہیں اونچی ہیں ان کو درست کرنے کے لئے تو معجزہ کی ضرورت ہے۔ مگر مہمان کی دل شکنی نہ ہو اس لئے چپ ہو رہے خیر اور تذکرہ ہوتا رہا۔ اتنے میں حافظ جی پان لینے اندر گئے۔ مگر دل ہی دل میں ڈر رہے تھے کہ مشین گن کی طرح کئی سو الفاظ فی منٹ کی رفتار سے ان کا خیر مقدم ہوگا۔ مگر ٹاٹ کا پردہ اُٹھا کر جونہی اندر داخل ہوئے تو اُنکی بیوی نہایت ادب سے اُٹھیں جھک کر سلام کیا۔ پان پیش کئے اور تاکید کر دی کہ ضرورت ہو تو اور لے جائیگا۔ حافظ جی اس معاملہ میں ابتک کرامت کو محال سمجھتے تھے۔ چنانچہ سر کھجلایا ڈاڑھی میں آگے اور پیچھے سے انگلیوں سے کنگھا کیا آنکھیں ملیں لیکن جب بی بی کو اسیطرح کھڑا دیکھا تب وہ سمجھے کہ میاں چھجو کی کرامات میں کس بلا کی قوت ہے۔ اس کے بعد اور باتیں شروع ہوگئیں اور سلسلۂ گفتگو نے یہاں تک طول کھینچا کہ جب رات کے تین بجے کا گھنٹہ بجا تب دونوں کو ہوش آیا کہ باتیں ختم کرنی چاہئیں۔ حافظ جی میاں چھجو کے ہمراہ تھوڑی دور تک ہو گئے +

ان دونوں نئے دوستوں کو اگر بغور دیکھا جائے تو دونوں کے دماغی احساسات اور مطمح نظر میں بہت زیادہ فرق تھا۔ میاں چھجو ایک تجارت پیشہ آدمی تھے اُن کا مطمح نظر روپیہ پیدا کرنا۔ کھانا پینا اور سو رہنے کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ حافظ جی تحریک ترکِ موالات میں لیڈری فرما چکے تھے اور قوم و ملک ہی نہیں بلکہ دنیا کی بہبودی کے لئے صدہا اسکیمیں ان کے ذہن میں تھیں۔ میاں چھجو کے لئے کرامت جھاڑ بنانے اور کبوتر بنانے

تک موجود تھی۔ اگر بہت دماغ پر زور دیا تو میرے کئے بھی بنا ڈالے۔ مگر حافظ جی کی پرواز تو نہایت بلند تھی۔ راستے میں بچوں کے کھیلنے کا میدان تھا اُس کی گھاس بالکل خشک ہوگئی تھی۔ حافظ جی نے سفارش کی کہ اس میں ہری گھاس اگوا دو۔ چنانچہ حکم دے دیا گیا اور ہرا ہرا سبزہ لہلہانے لگا راستے میں ایک شکستہ مسجد تھی اُس کی مرمت کر دی گئی۔ ایک قطعہ زمین خالی پڑی تھی وہاں ایک مدرسہ تعمیر کر دیا گیا۔ دلی کا اسٹیشن سوچا گیا کہ بمبئی کے اسٹیشن سے چھوٹا ہے حکم کی دیر تھی کہ ایک نہایت عالی شان اسٹیشن بن گیا۔ یہ دونوں بہت خوش ہوئے کہ صبح صبح لوگوں کو کتنا اچنبھا ہوگا۔ اس کے بعد حافظ جی کہنے لگے کہ جمنا کا پل کچھ اچھا نہیں۔ میاں ججو نے فوراً سنگِ مرمر کا پل بنا ڈالا۔ حافظ جی کہنے لگے

"بھائی دنیا میں وہی لوگ زندہ رہ جاتے ہیں جو قوم وملک وملت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیتے ہیں۔ اور جو قوم کی خدمت کو فخر سمجھتے ہیں جیسے کہ ہم تم دونوں اس وقت کر رہے ہیں۔" اتنے میں ساڑھے تین کا گھنٹہ ہوا یوں سمجھئے تو آدھے گھنٹے میں بہت سا کام ہو چکا تھا۔ گھاس لگائی گئی۔ مسجد مرمت ہوئی۔ مدرسہ تعمیر ہوا۔ اسٹیشن اور پل بنایا گیا۔ مگر حافظ جی تھے لیڈر آدمی کہنے لگے:۔

"ہم تو کام میں مشغول ہیں اور وقت ہے کہ نکلا جا رہا ہے میاں ججو وقت کو روک دو۔"

"وقت کو کس طرح روک دوں؟"

"اس چاند کو روک دو" علم دین کے علاوہ کچھ جغرافیہ سے بھی حافظ جی واقفیت رکھتے تھے۔

"چاند تو ذرا دور ہے" میاں ججو نے کچھ غور کرنے کے بعد جواب دیا۔

"اچھا تو زمین کو روک دو" حافظ جی نے فرمایا۔

"یہ کونسی مشکل بات ہے" میاں ججو نے کہا اور فوراً حکم دیا کہ "اے زمین تو رُک جا۔"

کیا ہوا یہ تو معلوم نہیں۔ مگر میاں ججو کئی درجن میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوا میں پرواز فرمانے لگے۔

ہر صاحبِ کرامت کو اپنے الفاظ کا بہت زیادہ خیال رکھنا چاہئے۔ پہلے بھی لمبے اور چھوٹے خاں کی چوٹ کا مادہ ہو چکا تھا۔ اور اب بھی وہی ہوا۔ زمین کی رفتار تقریباً ہزار میل فی گھنٹہ ہے۔ اس کو تو روک لیا۔ مگر زمین کے ساتھ جو چیزیں متحرک ہیں اُن کو روکنا بھول گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر آدمی جانور مکان درخت وغیرہ تقریباً قریب قریب نو میل فی سکنڈ کی رفتار سے حرکت میں آ گئے۔ یعنی کہ اگر کوئی میاں ججو کو توپ میں رکھ کر گولے کے ساتھ چھوڑ دیتا تو بھی اتنی تیز رفتاری ناممکن تھی۔ کچھ دیر تو ہوا میں قلابازیاں کھاتے رہے۔ پھر خیال آیا اور حکم دیا کہ "میں حفاظت سے زمین پر اُتر جاؤں" چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ زمین پر اُترے ہی تھے کہ ایک لیمپ، لوہے اور اینٹوں کا بنا ہوا گھنٹہ گھر ان کے قریب ہی زمین پر آ کر گرا اور گیند کی طرح گڑا کھا کر کہیں اور تنکے کی طرح اُڑ کر چلا گیا۔ ایک گائے اُڑ کر آئی اور زمین سے ٹکرا کر انڈے کی طرح ٹوٹ کر رہ گئی۔ اس کے علاوہ ہوا کا طوفان اس تیزی سے بپا تھا کہ میاں ججو کئی دفعہ اُڑتے اُڑتے بچے۔

"یا اللہ یہ کیا حشر بپا ہے؟ یہ سب حافظ جی کی کارستانی ہے۔ مجھے یوں پھنسا کر خدا معلوم آپ کہاں چلے گئے۔ ایک منٹ پہلے کیسی اچھی چاندنی رات تھی اور اب یہ ہولناک طوفان اور یہ بجلی کی گرج۔ یا اللہ میں تو بجلی سے ہمیشہ ڈرا کرتا تھا۔"

میاں چھجو نے بڑبڑانا شروع کیا۔ پھر زور زور سے حافظ جی کو آواز دی۔ کئی دفعہ کھڑے ہونے کی ناکام کوشش کی۔ مگر ہوا کے جھونکوں نے ہمیشہ ان کو گرا دیا۔ ناچار پڑے پڑے دیکھنا شروع کیا۔ ان کے ذہن میں اس نمونۂ قیامت کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ مکانات شکستہ۔ درخت ہوا میں اُڑتے ہوئے یہ سب کب ہوا اور کیوں ہوا ان کے ذہن میں بالکل نہ آیا۔ وہ صرف اسقدر سمجھ سکے کہ اُن کی کرامت میں درخت یا بجلی کی کرامت کی طرح کچھ غلطی ہو گئی۔ اس وقت ان کو تمام کرامتوں سے سخت نفرت ہو گئی۔ اسی پس و پیش میں تھے کہ پانی کے چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ ذرا غور سے جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ پانی کا ایک پہاڑ کئی سو فٹ اونچا ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میاں چھجو کے رہے سہے اوسان خطا ہو گئے اور لگے "حافظ جی! حافظ جی!!" کرنے۔ حافظ جی بیچارے خدا معلوم کہاں اُڑتے پھر رہے ہونگے۔ پاس ہوتے تو بولتے مرتا کیا نہ کرتا۔ انتہائی یاس و نا اُمیدی کی حالت میں کہنے لگے کہ "اے پانی رُک۔ خدا کے لئے رُک جا" پانی رُک گیا

"تم دونوں بھی ذرا رُک جاؤ" بجلی اور ہوا کی طرف اشارہ کر کے حکم ہوا۔ "مجھے ذرا سوچنے کا موقع تو دو" چند منٹ کے لئے دونوں رُک گئے۔ "یا اللہ سب چیزیں درست ہو جائیں تو کیسا اچھا ہو" دونوں ہاتھ اور پاؤں پر پڑے پڑے انہوں نے سوچا۔ اور کہا "کوئی بات اُس وقت تک میرے حکم کے مطابق نہ ہو جب تک کہ میں پورا حکم دینے کے بعد زور سے "گو" نہ کہوں" بجلی اُسی طرح چمک رہی تھی اور ہوا پھر زور سے چل رہی تھی کہ میاں چھجو نے اپنی نحیف آواز میں کہنا شروع کیا:-

"اوّل تو یہ کہ جو کچھ کہ میں چاہتا ہوں جب وہ ہو جائے تو مجھ سے کرامت کی قوت سلب کر لی جائے۔ اور میری قوت ارادی دوسرے انسانوں کی سی ہو جائے۔ تاکہ ان تمام خلاف واقعات کا جو کرامت سے ظہور پذیر ہوتے ہیں خاتمہ ہو جائے کاش مجھ میں یہ قوت پیدا ہی نہ ہوتی +

دوئم یہ کہ میں اور تمام دنیا اس حالت پر آجائے جیسے کہ کرامتوں کے شروع ہونے سے پہلے تھی۔ اور ہر چیز اُس کمبخت لیمپ کے آ لٹنے سے پہلے جس طرح تھی اُسی طرح ہو جائے۔ گو یہ کام بہت بڑا ہے کہ تباہ شدہ دنیا کو اصلی حالت میں لے آیا جائے۔ مگر میں اسکے بعد اور کوئی کرامت کرنا نہیں چاہتا۔ میں اگر دوبارہ اپنے لبریز جام کے پاس ہوٹل میں اسی طرح پہنچ جاؤں تو اس سے زیادہ خوشی کسی اور بات سے نہیں ہو سکتی" اس کے بعد انہوں نے کانوں میں انگلی بڑے زور سے رکھی اور آنکھیں بند کر کے پوری طاقت سے کہا:-

"گو.......گو.........گو"

....

میاں چھجو نے تھوڑی سی غنودگی کے بعد محسوس کیا کہ وہ کھڑے ہوئے ہیں۔ "کیا خوب" ایک آواز سنائی دی +

آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ نواب زور آور خاں کرامتوں کے ممکن ہونے کی تائید میں بحث کر رہے ہیں۔ میاں چھجو کے دماغ سے وہ تمام باتیں لیمپ کے گرنے سے دنیا کے تباہ ہونے تک یکقلم مٹ گئیں چنانچہ وہ کرامتوں کو محال ثابت کرنے کیلئے پھر مستعد ہو گئے +

"میں ابھی ثابت کر دونگا کہ کرامت کا ہونا محال ہے" +

"کیا خوب!" نواب صاحب نے فرمایا +

"دیکھئے کرامت کہتے ہیں کہ کوئی خلافِ عقل واقعہ کسی کی قوتِ ارادی . . . ."

کرسیاں ہلنے لگیں۔ دیوار کو جنبش ہونے لگی۔ نواب صاحب کے تین تین سر بیک وقت نظر آئے۔ شاید خبر کا جام کی اثر تھا یا شاید خمارِ چشم ساقی نے [illegible]

سلاطینِ دہلی کے سکّہ جات

حملۂ بابر سے قبل

(۶۰۲ھ ۱۲۰۶ء - ۹۳۲ھ ۱۵۲۶ء)

از جناب سید حسن برنی - بی - اے - ایل ایل بی (علیگ)

[سنہ ۱۹۱۵ء میں میں نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی "انجمن تاریخی" کے لئے ایک انعامی تاریخی مضمون بعنوان "نظامِ حکومتِ سلاطینِ دہلی، قبل حملۂ بابر" انگریزی زبان میں تحریر کیا تھا۔ یہ مضمون دو حصّوں پر منقسم ہے۔ پہلے حصّہ میں دیباچہ و تمہید کے بعد بارہ ابواب ہیں جن میں حکومت کے متعلقہ شعبوں مالیات۔ عدل۔ فوج۔ تعلیم جنگ۔ خبر رسانی۔ ڈاک۔ ملکی تقسیمات۔ پولیس۔ قید خانہ۔ امورِ مفادِ عامّہ۔ کارخانجات سرکاری سے بحث کی گئی ہے۔ اور دوسرے حصّے میں اُس عہد کی عام سیاسی۔ معاشی۔ تمدّنی اور اخلاقی حالات لکھے گئے ہیں ۔

یہ مضمون، جو بآسانی ایک متوسط ضخامت کی کتاب کے لئے کافی ہے، ابھی تک غیر مطبوع ہے میں اُسے نظرِ ثانی اضافوں اور ترمیمات کے بعد شائع کرنا چاہتا ہوں۔ جس کے لئے فرصت کا منتظر ہوں آج اُس مضمون کے باب نہم کا ترجمہ ناظرین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جسمیں اُس عہد کے سکہ جات سے بحث کی گئی ہے۔ بعض دیگر ابواب بھی انشاء اللہ وقتاً فوقتاً ترجمہ کر کے شائع کئے جائیں گے

سید حسن برنی]

سکّہ جاری کرنے کا اختیار قدیم الایّام سے ایک اہم شاہی عمل تصوّر کیا گیا ہے۔ آج بھی معاشی مصالح کی بنا پر دُنیا کی متمدن حکومتیں سکّہ کی نگرانی حکومت کا تنہا حق قرار دیئے ہوئے ہیں۔ عہدِ ماضیہ میں بھی بعینہٖ اسی طرح جیسا کہ آجکل ہے۔ سکّہ کا آزادانہ رواج حکومت کے دائرۂ اقتدار کو ظاہر کرتا تھا ۔

سلاطینِ دہلی نے غزنوی اور غوری سلاطین کے اتباع میں اپنے سکّہ جات کے نظام کو ہندوؤں کے "سکّہ جات" سے اخذ کیا تھا۔ مفتوحہ اہلِ ہند کے خیال کا پاس نہ صرف سکّہ جات میں تانبے اور چاندی کے میل کو قائم رکھ کر کیا گیا ۔۔۔

ہندوستانی اوزان اور بعض اوقات سنسکرت کلمات اور ان پر تصاویر مثلاً بیل، گھوڑے کا سوار، اور لکشمی کی مورت کو بھی اختیار کیا گیا۔ چونکہ اس قسم کے سکّے ہندوستان کے مسلمان سلاطین کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ نیز اُن سے سلطانِ کے پیشرو مسلمان سلاطین دہلی کے ہندوؤں کے ساتھ رواداری کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ اس لئے ہم ذیل میں اس قسم کے سکوں کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں:۔ محمود غزنوی نے ہندوستان میں جو سکّے جاری کئے اس میں سنسکرت اور عربی عبارت نقش تھیں سکہ کے

ایک طرف یہ نقش تھا ॰अव्यक्तमि इ.मे ॰अयं टंकं तता महमूदपुर संवति ४१८

"اَبِیَکتیہ نامے اَیَن ٹنکم تتا محمود پور سموت ۴۱۰"

یعنی یہ ٹنکہ (مسکوک ہوا محمود پور میں سمت ۴۱۰ھ

(۲) محمد غوری نے بھی اپنا سکّہ ہندوستانی لباس میں جاری کیا۔ چنانچہ قنوج کا طلائی سکّہ اس وضع کا تھا:۔

ایک طرف "شری ہمیر (امیر) محمد بن سام" श्री हमीर मुहम्मद बिन साम

دوسری طرف لکشمی دیوی کی مورت +

(۳) (ا) شمس الدین التمش کے سکّہ جات دہلی:۔

ایک طرف سوار اور "سری ہمیر" (امیر) श्री हमीर

دوسری طرف "سلطان سری سمس الدین" (شمس الدین) सुरिताण श्री समसुदिन

اب، التمش کا سکّہ رنتھمبور:۔

ایک طرف "شری سلطان لتمش سمت ۶۸۳" (ہجری) श्री सुलतां लिलिमिस सं ३८३

(۴) سلطان علاء الدین (خاندان غلامان) کا چاندی اور تانبے کا مخلوط سکّہ:۔

ایک طرف شیو کا بیل اور "سلطان سری علاودین" (علاء الدین) सुरिताण श्री अलावदिन

دوسری طرف سوار، طغرا اور "سری شلیف" (خلیفہ) श्री खलीफ

(۵) بلبن کا مخلوط سکّہ:۔

ایک طرف (حاشیہ پر) "سری سلطان گیاس دین" (غیاث الدین) श्री सुलतां गयासुदी

(۶) علاء الدین خلجی:۔

ایک طرف "شری سلطان علاودین (علاء الدین) ۷۱۰" (ہجری) श्री सुलतां अलावदी ७१०

(۷) محمد بن تغلق:۔

ایک طرف "شری محمد" श्री मोहमद

(ان کے علاوہ دیکھو طامس کی تاریخ پٹھان سلاطین دہلی" ص ۹۰، ۹۵، ۱۰۰، ۱۰۳، ۱۱۹ و ۱۲۳ و ۱۳۵ و ۱۴۷ و ۱۴۸ و ۱۴۲ و ۱۴۵ و ۱۶۲ و ۱۹۱ و ۲۵۱ اور پلیٹ ۱ و ۲ مشمولۂ کتاب ہذا میں تصاویر سکہ جات ۷۹ و ۹ و ۱۰ و ۱۴ و ۱۵)

۱۹، ۳۲، ۳۶، ۴۳، ۴۴، ۴۷ و ۵۱)

اس قسم کے سکّہ جات کو چھوڑ کر اس عہد کے سکّوں پر بالعموم عربی نسخ و کوفی حروف میں نقش ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض کلمات تو مذہبی قسم کے ہوتے تھے سب سے زیادہ مروّج کلمہ "لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" اور "اطیعوا اللہ والرسول واولی الامر منکم" تھے۔

سکّوں میں معاصرین عبّاسی خلفاء کو خاص وقعت حاصل تھی۔ اور اسلامی ممالک میں اُن کی منظوری بادشاہ بننے کے لئے درکار ہوتی تھی۔ بعض اوقات دار الضرب کا نام اور سکّہ کی تاریخ بھی درج ہوتے تھے۔

شکل و صنعت اور نقوش کے لحاظ سے بہترین سکّہ جات سلطان محمد تغلق کے ہیں جس کے متعلق معاصر مورخ ضیائے برنی نے بیان کیا ہے کہ یہ بادشاہ بذات خود بڑا خوشنویس تھا۔

اس عہد کے سکّہ جات کی مفصّل کیفیت پیش کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے ان دار الضربوں کی فہرست جو کہ سکّہ جات ہی سے معلوم کی گئی ہے۔ درج کر دی جائے۔ ان ناموں کے معلوم ہونے سے دو فائدے ہیں ایک طرف تو ہمیں اس دور میں ہندوستان کے بعض مشہور مقامات، اور دوسری طرف سلاطین دہلی کے ان سوا تین صدیوں میں حدود اختیارات و اقتدار معلوم ہو جاتے ہیں۔ فہرست حسب ذیل ہے:-

آگرہ۔ بھولپور۔ بیان پور۔ بیانہ۔ چنار۔ دولت آباد۔ دہلی۔ دیوگیر۔ گوالیار۔ حصار۔ کالنجر۔ کالپی۔ کرنیان۔ قطب آباد۔ لکھنوتی۔ لاہور۔ ملتان۔ ناگور۔ پرلول۔ پیشاور۔ رنتھمبور۔ سندھ۔ سنارگاؤں۔ سلطان پور اور وارنگل۔

جو مواد کہ دستیاب ہوتا ہے۔ وہ اس عہد کے سکّوں کے پیمانۂ اوزان کو نظری طور پر متعین کرنے کے لئے کافی ہے۔

پہلا بادشاہ جس نے کہ سکّہ جات کا ایک باضابطہ نظام قایم کیا التتمش تھا۔ اُس نے اپنے سکّوں کا آئین ہندوستان کے مختلف مروّجہ آئینوں سے اخذ کیا تھا۔ اسی بادشاہ نے سب سے پہلے چاندی کے ٹنکہ کا وزن ۱۷۵ گرین ٹرائے قایم کیا۔ بعد ازاں بلبن نے طلائی سکّہ کے لئے اسی وزن کو اختیار کیا (دیکھو لین پول کی میڈیول انڈیا ص ۲۰)

اس عہد کے سکّہ جات کے متعلق ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ تانبے اور چاندی کے میل سے تیار کئے جاتے تھے۔ اور ان دھاتوں کا میل نقرئی ٹنکہ کی تقسیم کے مطابق مختلف تناسبوں میں ہوتا تھا۔

سکّوں کی شکل بالعموم مدوّر ہوتی تھی۔ قطب الدین مبارک (۱۳۱۶ء تا ۱۳۲۰ء) نے مربّع شکل ایجاد کی جو اسی زمانہ سے وقتاً فوقتاً شاہجہان کے زمانہ تک جاری رہی۔ (امپیریل گزیٹیر ج ۲ ص ۱۳۵)

ہندوستان کے قدیم رواج کے مطابق یہ مخلوط سکّے قیمت کے لحاظ سے نقرئی ٹنکہ کے ½، ¼، ⅛ و $\frac{1}{64}$ میں تقسیم کئے گئے تھے۔ خالص تانبے کا سکہ بھی تھا۔ جس کے چار عدد ملکر $\frac{1}{64}$ نقرئی ٹنکہ کے مساوی ہوتے تھے۔

سونے اور چاندی کی قیمتوں پر سلطان محمد تغلق سے پہلے اور اُس کے بعد ایک اور آٹھ (۱ : ۸) کا تناسب تھا لیکن لیکن محمد تغلق کے زمانہ میں ایک اور سات (۱ : ۷) کا تناسب رہا +

تقسیم سکہ جات کا یہ نظام جو چار اور اُس کے اجزا و ضروب پر مبنی تھا اخیر تک قایم رہا۔ بلکہ تمام تاریخی انقلابات کے بعد بھی ابتک باقی ہے۔ اور موجودہ ہندوستانی سکہ جات بھی اسی پر مبنی ہیں +

معاصر مورخان ہند نے سکہ جات کے متعلق بہت کم تذکرہ کیا ہے۔ ایک باہر کے مصنف شہاب الدین الدمشقی مصنف مسالک الابصار کی بدولت اس عہد کے سکہ جات کا مکمل آئین معلوم ہو جاتا ہے۔ اور اُس کے بیانات کی تصدیق کامل طور پر موجودہ تحقیقات سے بھی ہوتی ہے۔ مندرجہ ذیل نقشہ اسی مصنف کے بیانات پر مبنی ہے :-

۴ فلس مسی	=	۱	یگانی
۲ جیتل	=	۱	دوگانی
۶ "	=	۱	ششگانی
۸ "	=	۱	ہشتگانی
۱۲ "	=	۱	دوازدہ گانی
۱۶ "	=	۱	شانزدہ گانی
۶۴ "	=	۱	ٹنکہ سفید (نقرئی)
۲۵۶ فلوس	=	۱	"
۳۲ دوگانی	=	۱	"
۸ ہشتگانی	=	۱	"
۴ شانزدہ گانی	=	۱	"

(دیکھو الیٹ و ڈوس کی تاریخ ہند ج ۳ ص ۵۸۲ و طامس کی تاریخ ص ۲۱۹)

سکہ جات کا یہ آئین محمد تغلق کے عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ اس بادشاہ کے سکہ جات کا بیان کسی حد تک مکمل ہو اُس کے متعلق ابھی کچھ کہنا باقی ہے +

مسٹر طامس محمد تغلق کو "سکہ سازوں کا بادشاہ" لکھتا ہے۔ اور واقعی وہ اسی لقب کا مستحق ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اُس کے سکے دیگر سلاطین ماسبق مابعد کے سکہ جات سے صنعتی کمال، وضع اور حسن میں بدرجہا فائق ہیں۔ وہ سکہ جات ملکی کے معاملہ کو اسقدر اہم سمجھتا تھا کہ اُس کے عہد کے اولین انتظامات میں سے یہ بھی تھا۔ کہ اُس نے سکہ جات کی ترتیب کو سونے اور چاندی کے اُس وقت کے نرخوں کے لحاظ سے از سر نو مرتب کیا۔ اور جدید اور زیادہ صحیح تقسیم قایم کی +

فتوحات کی وجہ سے دکن سے سونا ہندوستان میں اسقدر مقدار میں داخل ہوا تھا کہ اُس کی وجہ سے اُس زمانہ میں سونے

اور چاندی کی قیمتوں میں ایک اور سات (۱ : ۷) کا تناسب قایم ہوگیا تھا۔ اس لئے محمد تغلق نے ایک نیا سونے کا سکہ بنایا جس کا وزن بجائے ۱۷۵ گرین کے ۲۰۰ گرین کردیا۔ اس نے چاندی کے ٹنکہ کو جس کا نام "عدلی" تھا بڑی تعداد میں جاری کیا۔ یہ سکہ (عدلی) سب سے پہلے علاء الدین نے اپنی اُن تجاویز کے سلسلے میں جن کا مقصد نرخوں کی ارزانی پیدا کرنا تھا جاری کیا تھا۔ عدلی کی قیمت پچاس جیگانی (جیتل) تھی۔ لیکن سب سے زیادہ مقبول عام سکہ ہشتگانی جو وزن میں کلیتاً اور شکل میں تقریباً نقرئی ٹنکہ کی مطابق ہوتا تھا۔ علاوہ ہشتگانی کے محمد تغلق ہی کی ایجاد دوگانی بھی تھا۔ جو اُس کے بانی کی مناسبت سے "سلطانی" کہلاتا تھا۔ دوگانی بڑا کارآمد سکہ تھا۔ چار دوگانیاں ایک ہشتگانی کے اور تین ایک ششگانی کے مساوی ہوتی تھیں +

مختلف سکوں کی قابلیت تبادلہ کے متعلق ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ پہلی شرح ۱ : ۸ کی روسے ۸ نقرئی ٹنکے اور ۱۰ عدلیاں ایک طلائی ٹنکہ کی جس کا وزن ۱۷۵ گرین تھا ہوتے تھے :-

۱ : ۸　　۱۷۵ × ۸ = ۱۴۰۰ گرین نقرہ
۸ × ۱۷۵　　۱۴۰ × ۱۰ = ۱۴۰۰ 〃 〃
= ۱۴۰۰

لیکن شرح تبادلہ ۱ : ۷ کے رو سے طلائی سکہ "دینار" کا وزن ۲۰۰ گرین ہوگیا تھا، اور وہ بدستور ۸ نقرئی ٹنکوں اور ۱۰ عدلیوں سے تبدیل ہوتا تھا +

۱ : ۷　　۱۷۵ × ۸ = ۱۴۰۰
۷ × ۲۰۰　　۲۰۰ × ۷ = ۱۴۰۰
= ۱۴۰۰

سونے اور چاندی کے ٹنکوں کا یہ جدید آئین جس کا زمانہ قریب ۷۲۵ھ (۱۳۲۴ء یا ۱۳۲۵ء) کے ہے، زیادہ عرصہ تک قایم نہیں رہا۔ سونے کا نرخ بڑھنے سے رفتہ رفتہ سونے کے دام بڑھکر پرانی شرح پر پہنچ گئے، اور جلد ہی سونے کا ٹنکہ ۱۷۵ گرین کا بنانا پڑا +

سب سے اہم جدت جو محمد بن تغلق نے سکہ کے آئین میں کی وہ پیتل کے سکوں کا اجرا تھا جنہیں محض چاندی کے سکوں کا بدل قرار دیا گیا تھا۔ ان سکوں پر سرکاری مہریں ہوتی تھیں جن میں لوگوں کی اطلاع کے لئے اُن سکوں کی قانونی قیمتیں ظاہر کی جاتی تھیں۔ یہ سکے صرف چاندی کے کم قیمت سکوں کے بدل میں جاری کئے گئے تھے۔ سب سے زیادہ قیمت کا سکہ "عدلی" تھا جس کا وزن ۱۴۰ گرین تھا، اور جس سکہ کا اُسے بدل قرار دیا گیا تھا وہ "سکۂ رائج" کہلاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ پیتل کے سکے بھی اوپر کے درجوں کے سکوں کی بدل میں بہت کم تعداد میں جاری کئے گئے تھے۔ صرف نیچے کے درجہ کے کم قیمت سکے ہی زیادہ باضابطگی اور کثرت کے ساتھ جاری ہوئے +

اس میں شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ تمام آئین بادشاہ کی نیک نیتی پر مبنی تھا۔ اور اُس میں کسی طرح کی طماعی کو دخل نہ تھا +

جو سکّے دستیاب ہوئے ہیں اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زر بدل کم از کم ایک برس تک جاری رہے۔ لیکن اس جبری معاشی اصلاح کی ناکامی کا باعث یہ ہوا کہ شاہی دار الضرب میں ایسی مکمل اور اعلیٰ قسم کی مشینیں نہیں تھیں کہ اُن کے بنائے ہوئے سکّوں کی نقل نہ ہو سکتی۔ جب محمد تغلق کو معلوم ہوا کہ ان سکّوں کا اعتبار نہیں رہا۔ اور یہ آئین آئندہ جاری نہ رہ سکیگا تو اُس نے حکم دیا کہ تمام پیتل کے سکّے خزانہ میں واپس کئے جائیں۔ اور اُن کے بدلے میں خالص چاندی کے اور مخلوط قسم کے سکّے لے لئے جائیں۔ ان پیتل کے سکّوں کا ایک بڑا ڈھیر تغلق آباد کے قلعہ میں لگ گیا تھا۔ اور یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ خزانہ نے کس طرح اس پیش آمدہ خطرہ سے نجات پائی +

سلطان محمد تغلق کے بعد سلطان فیروز نے سکّہ جات کے آئین کی توسیع اور چاندی کے سکّہ کے جدید حصص، دو گانی و بست و چہار گانی اور چہل و ہشتگانی ایجاد کئے اور ایک سکّہ بست و پنجگانی جاری کیا۔ جو عدلی کا نصف ہونے کی وجہ سے "نصفی" بھی کہتے تھے۔ فیروز شاہ نے مخلوط سکّے جو یکگانی کے نصف و چہارم کے برابر تھے جاری کئے اور اُن کا نام "آدھا" اور "بھیگ" رکھا۔ سکّہ جات کا یہ آئین سلطان بہلول لودی کے وقت تک قایم رہا۔ سلطان بہلول نے ایک سکّہ ایجاد کیا جس کا نام "بہلولی" رکھا۔ چالیس بہلولیاں اور اسّی نیم بہلولیاں اور ایک سو ساٹھ ربع بہلولیاں ایک نقرئی ٹنکہ کے برابر ہوتی تھیں۔ ہر بہلولی کا وزن ۱۴۰ گرین تھا۔ سکندر لودی نے سکندری ٹنکا ایجاد کیا جس کے ۲۵ عدد ایک نقرئی ٹنکہ کے برابر ہوتے تھے +

یہ جدید کوششیں اس نظر سے کی گئیں کہ وہ پیچیدہ نظام جو ۶۴ کی تقاسیم پر مبنی تھا۔ منسوخ ہو جائے۔ سکندری ٹنکہ چاندی اور تانبہ کا ایک مخلوط سکّہ تھا جس کا وزن ۱۴۰ گرین تھا۔ از انجملہ ۶۴ء۵ گرین تو چاندی اور ۵۵ء۳۴ گرین تانبہ تھے۔ اور اُس کی قیمت نقرئی ٹنکہ وزنی ۱۷۵ گرین کے $\frac{1}{4}$ کے برابر تھی +

سکّہ کا مار شمار اس تمام دور میں قدیم تانبے کے سکّے پر مبنی رہا۔ اور تمام ملک میں یکساں پھیلے ہونے کی وجہ سے اُس کی قیمت میں بہت کم ردّ و بدل کا امکان تھا۔ جیسا کہ آئین اکبری کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ اکبر کے زمانہ میں بھی تانبے کا سکّہ ہی باضابطہ طور پر مالی شمار کی بنیاد قرار دیا گیا تھا +

یہ ماننا پڑیگا کہ اس تمام نظام سکّہ جات کی خوبی اُن کے موزوں جسامت میں تھی۔ لیکن اُس کے ساتھ ہی یہ عیب بھی تھا کہ مخلوط سکّہ جات کی قیمت کا اندازہ یا تو تپا کر ہو سکتا تھا۔ یا ہاتھ سے پرکھ کر۔ پرکھ کر مخلوط دھاتوں کے تناسبوں کو جانچنا بڑی مہارت چاہتا۔ اور اس وجہ سے ہمیشہ بھروسہ کے قابل نہیں ہو سکتا تھا +

سیّد حسن برنی

مشاغلِ سلطانی

(از جناب خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی)

حضرت مرزا واجد علی شاہ بہادر تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوچکیں۔ ملک کے انتظام میں مشغول ہوئے:-

دیوان خاص۔ یہ بادشاہ کی کچہری تھی۔ اس میں تمام حکم احکام بادشاہ کی زبان سے جاری ہوتے تھے۔ اس کا دفتر در دولت کے قریب تھا +

دوسری کچہری دیوان عام تھی اس میں عرائض اور خبریں پیش ہوتی تھیں +

دفتر خزانہ۔ یہ خزانہ کی کچہری تھی +

دفتر بیت الانشا۔ اس دفتر سے تمام احکام سلطانی کے نقول ملتے تھے +

دفتر معلی دیوانی۔ یہ دیوانی کی کچہری تھی +

دفتر عدالت عالیہ۔ اس میں عدالت دیوانی کی اپیل ہوتی تھی +

محکمہ کوتوالی۔ اس محکمہ کے ماتحت تمام شہر کے تھانے تھے۔ اس کے سپرنٹنڈنٹ مرزا علی رضا بیگ تھے جن سے اقرار نامہ لکھوالیا گیا تھا۔ کہ اگر مال دزدی کا پتہ نہ لگے تو سپرنٹنڈنٹ پولیس مال مسروقہ کی قیمت خود ادا کرے گا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو حسن انتظام کے صلہ میں منتظم السلطنت کا خطاب ملا تھا +

عدالت مرافعہ۔ اس میں تمام عدالت دیوانی و فوجداری کی اپیل ہوتی تھی +

دفتر وزارت۔ یہ دفتر متعلق مدار الدولہ علی نقی خاں وزیر ممالک تھا۔ جتنے احکام جاری ہوتے تھے وہ سب دفتروں میں بھیجدیئے جاتے تھے +

سررشتہ اخبار۔ ہر تحصیل اور چکلہ میں ایک منشی رہتا تھا جو تحصیل کی مختلف رپورٹیں روزانہ کچہری میں بھیجتا تھا۔

سررشتہ اخبار دفتر شاہی۔ اس محکمہ کا افسر تھا جو کچہریوں کے فیصلے کی مختصر رپورٹ شاہی دفتر میں پیش کرتا تھا +

دفتر بخشی گری۔ اس محکمہ سے تمام احکام بحالی و موقوفی کے جاری ہوتے تھے +

تحصیل حضور۔ بعض تعلقداروں نے اپنا تعلق ناظموں سے نکال کر اپنی مالگذاری متعلق خزانہ شاہی کردی تھی۔ اس کچہری کا نام تحصیل حضور تھا +

محکمہ انسداد ڈکیتی۔ یہ محکمہ حسب تجویز کرنیل رجنبدرزیڈنٹ مقرر ہوا تھا۔ اس میں بیرون شہر کی ڈکیتیوں کا انسداد کیا جاتا تھا +

بیت الضرب۔ اس محکمہ میں سکہ طلائی و نقرئی و مسی تیار ہوتے تھے۔ اس کے افسر راجہ امراؤ سنگھ بہادر تھے +

محکمہ صدر امانت۔ اس محکمہ میں تنازعہ اراضیات کا فیصلہ ہوتا تھا +

دفتر نیت الاجرا۔ اس محکمہ سے عدالت کے احکام مُہر ثبت ہو کر جاری ہوتے تھے +

کوٹ گشتی۔ یہ محکمہ خفیہ پولیس کا تھا۔ اس کے ملازم بے وردی شہر میں گشت کرتے تھے اور جو بے عنوانی اور بے انصافی سرکاری ملازم یا سرکش رعیت کی طرف سے عمل میں آتی تھی اُسے نوٹ کرکے سررشتہ دار کی معرفت عدالت میں پیش کرتے تھے +

سررشتہ اخبار حضور۔ یہ بھی ایک محکمہ خفیہ پولیس کا تھا جس کی اہم خبریں گوشگذار بادشاہ ہوتی تھیں +

محکمہ نزول۔ اس کے مہتمم اہتمام الدولہ حیدر حسین خان تھے

محکمہ پرمٹ۔ اس کے منتظم لالہ جگنا تھ قوم اگروال مخاطب بہ شرف الدولہ غلام رضا خاں تھے +

محکمہ آبکاری۔ اس محکمہ میں شہر کے اندر شراب فروشی کی سخت ممانعت تھی۔ مگر جو غیر مذہب والے اپنے گھر میں شراب کشید کرتے تھے اُن سے مواخذہ نہ ہوتا تھا۔ تمام مذاہب کے شرفا شراب سے پرہیز کرتے تھے +

آٹھ لاکھ روپیہ مقبرہ امجد علی شاہ بادشاہ مرحوم کی تیاری کے لئے نواب امین الدولہ بہادر کو مرحمت فرمایا +

تمام اہلِ دربار ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ سارے شہر کا بندوبست اچھی طرح انجام پاتا تھا۔ دستور کے موافق سب احکام جاری تھے +

انیس الدولہ۔ رضی الدولہ۔ نجیب الدولہ۔ مصاحب الدولہ مستقیم الدولہ۔ میرزا کی مرثیہ خواں مصاحب خوش اخلاق و خوش بیان تھے۔ لطافت ظرافت میں انتخاب تھے۔ حاضر جوابی میں مشہور زمانہ تھے۔ ان کی تقریر میں عجب مزہ تھا +

اسی صحبت میں شاعرانِ بے نظیر بھی شامل تھے۔ نواب مقبول الدولہ قبولؔ۔ مہتاب الدولہ مرزا محمد مہدی درخشاںؔ۔ میر علی خاں بہارؔ۔ آفتاب الدولہ خواجہ اسد قلقؔ۔ فتح الدولہ مرزا محمد رضا برقؔ۔ تدبیر الدولہ مرزا مظفر علی آسیرؔ سب کاملان فن شاعری۔ خاقانی و انوری تھے۔ رواق معانی کی بنیاد اور کلیم زمانہ تھے +

بہت سے اہلِ سخن اصلاح سے فیضیاب ہوتے تھے۔

حکماء میں مسیح الدولہ حکیم مرزا علی حسن۔ شفاء الدولہ حکیم میر نواب طبیب الدولہ وغیرہ فلاطون عالم اور مسیح زماں تھے +

نتھو خاں گویئے اپنے وقت کے تانسین تھے۔ طرہ پکھاوجی لاجواب تھے +

غلام علی خاں اور غلام محمد خاں بین کار مشہور زمانہ تھے فدا حسین خاں ربابئے بمثل سرود بجاتے تھے +

جواہر رقم خاں۔ یاقوت رقم خاں۔ گوہر رقم خاں شاہی خوشنویسوں کے نقاب تھے۔ بادشاہ اکثر ان سے خوشنویسی کی اصلاح لیتے تھے +

امانی رقم خاں و بہزاد رقم خاں مصوّری کے فن میں اُستاد تھے۔ بادشاہ نے اس فن کو بحد کمال حاصل کیا تھا +

بڑے بڑے مغنی اس آستاں پر پڑے رہتے تھے +

نجومیوں کی ایک جماعت ملازم بارگاہ تھی +

ثابت الدولہ قوال اپنے فن میں کمال رکھتا تھا +

ایک دفعہ منجموں نے بادشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ زائچہ حضور سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے جس میں حضور کی قسمت میں جوگی بننا لکھا ہے +

بادشاہ نے پوچھا ان نحس ایام کا کچھ تدارک بھی ہو سکتا ہے۔ نجومیوں نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ اگر خداوند نعمت کسی وقت فقیری جوگیانہ لباس بھی پہن لیا کریں تو یہ نحوست دور ہو سکتی ہے۔ بادشاہ نے اس کا تدارک اس طرح فرمایا کہ حضور نے دو مثنویاں تیار فرمائیں۔ ایک کا نام ماہ پیکر اور دوسری کا نام غزالہ ماہرو جس کو دریائے تعشق بھی کہتے ہیں۔ اس مثنوی کے مطابق دو رہس تیار کئے +

اس میں بہت سے ایکٹر ملازم ہوئے حسین حسین لڑکے۔ خوبصورت رنڈیاں اور بہت سی عورتیں نو مرد ملازم ہوئے +

ایک ناٹک کی ہیرو ملکہ سیمتن تھی +

ایک مرد طاؤس جادو کے نام سے مشہور کیا گیا +

ایک آدمی ہرن بنا +

پریاں بہت تھیں۔ سرو قامت پری۔ سروبھی پری۔ مشتری خطاب مردوں کا تھا جو عورت بنتے تھے۔

ایک پری کا نام ماہ پیکر تھا۔ ایک شہزادہ بدر الدجا بنا۔ ایک بادشاہ بنا۔ بہت سے رمّال بنے جب دونوں رہس تیار ہوئے اور تعلیم پا چکے تو اشتہار دیا گیا کہ بحکم بادشاہ قیصر باغ میں عام رہس ہوگا۔ ہر شخص اس میں شریک ہو سکتا ہے لیکن سب لوگوں کو جوگیا لباس پہن کر آنا چاہئے جس کا لباس گیروا سرخ نہ ہوگا وہ تماشے میں داخل نہیں ہو سکتا۔ پھر تو قیصر باغ کے چاروں طرف میلہ لگنے لگا۔ بادشاہ کی طرف سے تمام ملازمین کے لئے کھانے پکنے لگے اسی ہزار اہلکار ملازم شاہی کو کھانا بادشاہ کے باورچیخانے سے ملتا تھا +

تمام محلات شاہی اپنے اپنے محل میں چکیں ڈالے رہس کا تماشہ دیکھ رہے تھے۔ بادشاہ سلامت خود ایک ارسی زرنگی، پر جو گلابی تھی جوگیا لباس، زیب جسم کئے ہوئے تاج زریں پہنے ہوئے صدر مقام پر جلوہ فرما تھے۔ ایک دربار عام تھا۔ تین روز تک یہ تماشا ہوتا رہا۔ شیخ نظامی جو مہندی کی ٹھمریاں بہت اچھی کہتے تھے۔ اس تماشے کے مہتمم تھے۔ اور دیانت الدولہ بہادر منتظم اعلیٰ تھے +

اس کے بعد مرزا ولی عہد بہادر کی شادی کا جشن در پیش ہوا۔ سال بھر پیشتر سے تمام ملازمین شاہی کو جوڑے تقسیم ہونا شروع ہوئے۔ خاص خاص ارکان سلطنت کو خلعت اور توڑے عطا ہوئے بس انتہا یہ ہے کہ کئی من عطر تقسیم ہوا۔ مہینوں پیشتر سے پخت طعام جاری ہوئی۔ خاص و عام کو کھانے کے توڑے جانے لگے۔ شاہی فصہ کی اسقدر افراط تھی کہ ملذذ زردہ کھاتے کھاتے لوگ اکتا اکتا گئے +

روشنی کے ٹھاٹھ اسقدر افراط سے تھے کہ اس کے واسطے تیل کے حوض قایم کئے گئے۔ نقار خانہ زری کے شامیانے میں قایم ہوا +

شاہی تخت گاہ یعنے لال بارہ دری کی زیب و زینت بیان سے باہر ہے۔ وہیں نوشاہ کی مسند بچھی اور وہیں بادشاہ اپنے تخت شاہی پر متمکن ہوئے۔ طائفوں نے مجرا شروع کیا +

محل خانہ شاہی میں تو کان پڑے آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ تمام بیگمیں قصر شاہی میں جلوہ افروز تھیں بادشاہ کے تمام محل ایک جگہ تھے +

محلدار مغلانیاں سرخ ریشمی جوڑے پہنے ہوئے ادھر ادھر ٹہل رہی تھیں چٹھی نویسیاں پس پردہ کرسیوں پر بیٹھی ہوئی خریدشدہ چیزوں کو قلمبند کر رہی تھیں +

ایک او۔ ادہ بیگمی نے روتے سے پکار کر کہا۔ ارے کمبخت تجکو پانوں کی پہچان بھی نہیں ہے۔ یہ پان پھیر دے اور پتلی پتلی سرخ رگوں کے گول سفید بیگمی پان کے ڈیوڑھے لانا +

ڈومنیاں بیگموں کو مخاطب کرکے انعام نچھاور اور بیل مانگ رہی تھیں۔ اور کچھ اس خوش آوازی سے گاتی تھیں کہ بیبیاں تو بیبیاں خواجہ سرا تک بسمل ہوئے جاتے تھے۔ سارے مکانات شاہی عورتوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ رات بھر یہی جلسہ رہا۔ صبح کو یہ شور ہوا مبارک ہو نوشہ برآمد ہوئے۔ چہرے پر زر خوش آب کا سہرا پڑا ہوا۔ دولہا محفل میں داخل ہوا +

اسی وقت حکم ہوا کہ سب محلات شاہی سوار ہوں۔ دیر نہ کریں بیگمیں سکھپالوں میں سوار ہوئیں اور سب عورتیں پینسوں میں بیٹھیں کچھ رتھوں میں سوار ہوئیں +

ہاتھی کی عماری میں دہنی طرف نوشہ بیٹھے۔ بائیں طرف بادشاہ بیٹھے۔ سب لوگ ہاتھیوں پر سوار ہوئے۔ سوار دو رویہ کھڑے ہوئے۔ جلوس کی حد نہ تھی سنہری روپہلی ہزاروں جھنڈیاں تھیں۔ دہنے بائیں پلٹنوں کی قطار تھی۔ آگے آگے سب اہلکار سوار تھے۔ سب کے گلنار جوڑے تھے۔ بادشاہ شہدوں کو دونوں مٹھیاں بھر بھر کر اشرفیاں لٹاتے تھے

یہ سب جلوس شاہی محل سے مکانِ عروس تک قطار در قطار کھڑا تھا۔ جب نوشہ کی سواری اس شان و شوکت سے عروس کے مکان تک پہنچی۔ وہاں بھی سارا مکان کنول جھاڑ سے آراستہ پیراستہ تھا۔ جب اہلِ محفل قرینے سے بیٹھے تو سب سے پہلے نکاح ہوا۔ مبارک سلامت کی ہر طرف سے آواز آرہی تھی جہیز جس کی تیاری سال بھر سے ہو رہی تھی سر راہ نکالا گیا۔ سونے چاندی کے برتنوں کی انتہا نہ تھی۔ جواہر نگار چھپر کھٹ تھے۔ ہزاروں صندوق پوشاکوں سے بھرے ہوئے ہاتھی اور اونٹوں پر لادے گئے۔ قریب شام دلہن سوار ہوئی جب شاہی محل تک دلہن کا سکھپال پہنچا تو محل میں سواری اتاری گئی۔ دولہا دلہن دونوں آرامگاہ میں گئے۔ عقد کے بعد یہ جشن دس دن تک برقرار رہا +

عمارت کی طرف جب بادشاہ کی طبیعت راغب ہوئی تو تخت شاہی پر قدم رکھتے ہی قیصر باغ کی بنیاد ڈالی۔ پانچ برس تک یہ عمارت بنتی رہی۔ ہزاروں معمار ملازم ہوئے۔ سنگ مرمر کی کوٹھی بنائی گئی۔ لال پتھر کی بارہ دری بنی سنگی تصویریں بہت سی نصب کی گئیں۔ وسط صحن میں حوض بنوایا۔ اس پر لوہے کا پل بنا اسی کوٹھی میں کئی برس تک میلا رہا +

خواجہ عبد الرؤف عشرت

بین الاقوامی تجارت

بین الاقوامی تجارت جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہے دو یا دو سے زاید ملکوں کی آپس میں تجارت کو کہتے ہیں بین الاقوامی تجارت کا تعلق اس بات سے ہے کہ ایک ملک دوسرے ممالک کو کیا بھیجتا ہے۔ اور دوسرے ممالک سے خود کیا خریدتا ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی بین الاقوامی تجارت امپورٹ اور اکسپورٹ ہوگی +

بین الاقوامی تجارت کا ملکی تجارت سے مقابلہ

بہ حیثیت تجارت ملکی اور بین الاقوامی تجارت ایک ہی ہیں۔ دو شخص ایک ملک میں ایک دوسرے کے ساتھ تجارت کرتے ہیں۔ اسی طرح دو شخص ایک ملک میں ایک دوسرے کے ساتھ تجارتی سلسلہ قایم کر لیتے ہیں۔ روپیہ۔ ذرائع آمد و رفت اور خبر رسانی کا انتظام جہاں اچھا ہوگا۔ تجارت زیادہ بڑھے گی +

فرق

مختلف ممالک میں نقدی مختلف ہے۔ چنانچہ بین الاقوامی تجارت میں نہ صرف اسباب بھیجنے اور منگوانے کی دقت ہوتی ہے۔ بلکہ دوسرے ممالک کی نقدی کو اپنے ملک کی نقدی میں تبدیل کرنے کا اہم معاملہ پیدا ہو جاتا ہے جب ہم یہاں سے ایک شخص کو جاپان میں مال بھیجتے ہیں تو وہ ہمیں اس کی قیمت ین (Yens) میں ادا کرے گا۔ اور ہمیں وہ ین روپیہ میں تبدیل کرنے پڑینگے یا وہ ین کو روپیہ میں تبدیل کر کے بھیجے گا +

غیر ملکی تجارت پر اکثر بہت سی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں جو کہ ملکی تجارت پر نہیں ہوتیں۔ ان پابندیوں کی وجہ قومیت یا نسل کا فرق اور سیاسی معاملات ہوتے ہیں +

ملک میں سرمایہ اور لیبر ایک صنعت سے دوسری صنعت میں تبدیل کئے جا سکتے ہیں جبکہ مقابلتاً فائدہ نظر آئے۔ مگر غیر ملکوں میں ایسا کرنا آسان کام نہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ قیمتوں کا گھٹاؤ بڑھاؤ مقابلہ کی وجہ سے ملکی تجارت میں جسقدر جلد ہو سکتا ہے۔ غیر ملکی تجارت میں نہیں ہو سکتا مثلاً اہل یورپ کسی صنعت میں کثیر منافع اٹھا رہے ہیں۔ مگر ہندوستانی سرمایہ اور لیبر وہاں جا کر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور نہ ہی خود اس لوٹ میں شامل ہو سکتا ہے +

ہندوستان کی غیر ملکی تجارت

سنہ ۱۹۲۴-۲۵ء میں ہندوستان کی کل غیر ملکی تجارت ۶۵۳ کروڑ تھی جس میں سے ۲۵۳ کروڑ امپورٹ اور ۴۰۰ کروڑ اکسپورٹ تھی +

اسی سال ہندوستان کی اکسپورٹ تمام گزشتہ سالوں کی نسبت زاید تھی۔ ہندوستان کے لئے یہ سال ہر طرح کامیاب تھا۔ گزشتہ ۲۰ سال سے ہندوستان کی تجارت زوروں پر ہے۔ سنہ ۱۹۱۰-۱۵ء کے درمیان اوسط ۴۲۱ کروڑ تھی۔ جنگ عظیم سے پہلے یعنی سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء کے سال ۴۰۷ کروڑ تھی +

سنہ ۱۹۲۶-۲۷ء تک یہ رقم ۶۰۰ کروڑ سے اوپر پہنچ گئی +

ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ۱۹۱۳-۱۴ء سے لیکر ۱۹۲۴-۲۵ء تک قیمتوں میں بھی خاصہ اضافہ ہو گیا ہے۔ اشیا کی مقدار جو امپورٹ و اکسپورٹ کی گئی ہیں قریباً اتنی ہی رہی ہے۔ اگرچہ ہمیں ظاہرا روپیہ کی تعداد دیکھ کر بہت بڑا اضافہ معلوم ہوتا ہے۔ تاہم ہندوستان کی بین الاقوامی تجارت ترقی کر رہی ہے تمام ممالک میں امن بہت بڑھ گیا ہے۔ ہندوستان کی بہت بیکار زمین آباد ہو گئی ہے۔ اور لوگوں کو دنیا کا پتہ چل گیا ہے۔

ذرائع آمد و رفت و خبر رسانی نہایت مکمل ہیں۔ ملک بھر میں پختہ سڑکوں اور ریلوں کی کثرت ہے جس کی وجہ سے مال ایک جگہ سے دوسری جگہ نہایت آسانی سے پہنچایا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کو یورپ کے لوگوں کا اور یورپ کے لوگوں کا ہندوستانیوں کو اچھی طرح پتہ معلوم ہے۔ اس لئے ان دونوں ممالک کی تجارت خوب بڑھی چڑھی ہوئی ہے۔

ہندوستان زراعتی ملک ہے۔ ۷۰ فیصدی سے زاید لوگوں کا دارومدار زراعت پر ہے۔ ہندوستان میں جو غلہ یا Raw Material پیدا ہوتا ہے وہ ہندوستانیوں کی ضروریات سے بہت زیادہ ہے۔ اس لئے ملک کی مانگ پوری کر کے دوسرے ممالک کو بھیجدیا جاتا ہے۔ ہماری چیف اکسپورٹ چاول۔ کپاس۔ تیلوں کے بیج۔ سن اور گندم ہے۔ ہماری امپورٹ زیادہ تر ساختہ اشیا میں جب ہم ہندوستان کی بین الاقوامی تجارت کے اعداد و شمار دیکھتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کی اکسپورٹ امپورٹ سے کہیں زیادہ ہے۔ گذشتہ زمانہ میں جب بارش نہیں ہوتی تھی تو ہماری اکسپورٹ بالکل ندارد کے برابر ہوتی جیسا کہ ۱۸۹۵-۹۶ء اور اس کے بعد ۱۹۰۶-۰۷ء میں ہوا۔ مگر اب نہروں کی کثرت نے انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ انہار پنجاب و دکن اور دوسرے صوبوں کی نہروں نے اس بات کی ضمانت دے دی ہے کہ کوئی زمانہ نہیں آئیگا جب ہندوستان میں فصل بالکل پیدا نہیں ہوگی۔ چنانچہ آئندہ ہماری غیر ملکی تجارت کبھی اتنی زیادہ گھٹے بڑھے گی نہیں۔ جیسا گذشتہ زمانہ میں ہوا کرتا تھا۔

ہندوستان کی امپورٹ

سوتی کپڑا ہماری امپورٹ میں سب سے زیادہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے ۱۹۲۴-۲۵ء میں ہم نے ۸۶ کروڑ کا کپڑا منگوایا۔ مقابلۃً ۱۹۱۳-۱۴ء میں ۶۷ کروڑ کا۔ ۱۹۲۲-۲۳ء میں ۶۰ کروڑ کا اور ۱۹۱۳-۱۴ء میں ۶۸ کروڑ کا۔ موجودہ وقت ۲۹ فیصدی امپورٹ سوتی کپڑا ہے۔ مندرجہ ذیل نقشہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان کو کپڑا سپلائی کرنے میں دنیا کے ممالک کا کیا حصہ ہے:۔

	۱۹۱۳-۱۴ء	۱۹۲۰-۲۱ء	۱۹۲۱-۲۲ء	۱۹۲۲-۲۳ء	۱۹۲۳-۲۴ء	۱۹۲۴-۲۵ء
برطانیہ کلاں	۹۷.۱	۸۵.۲	۸۶.۲	۹۱.۲	۸۸.۸	۸۸.۵
جاپان	۰.۳	۱۱.۳	۸.۳	۶.۸	۸.۲	۸.۵
امریکہ	۰.۳	۰.۹	۲.۱	۰.۵	۰.۷	۰.۶
نیوزیلینڈ	۰.۸	۰.۹	۱.۱	۰.۸	۰.۷	۰.۶
دیگر ممالک	۱.۵	۱.۳	۰.۹	۰.۷	۱.۸	۱.۹
	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰	۱۰۰

آون اور اونی سامان

ہم نے آسٹریلیا سے کچھ کچی آون دھاریوال اور کانپور کی اونی مشینوں کے لئے امپورٹ کی ۲۵-۱۹۲۴ء میں جو اون ہم نے امپورٹ کی اس کی قیمت ۹۰ لاکھ اور اونی سامان کی قیمت ۱۰۸ لاکھ تھی +

سلک - کچی اور ساختہ سلک بھی ہماری امپورٹ میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ ۲۵-۱۹۲۴ء میں اس کی مجموعی قیمت قریباً ۲½ کروڑ تھی +

کھانڈ - سوتی کپڑے کے بعد ہماری امپورٹ میں شاید کھانڈ ہی کا درجہ ہے۔ ۲۵-۱۹۲۴ء میں کھانڈ اور کھانڈ کی بنی ہوئی اشیا جو ہم نے امپورٹ کیں۔ اس کی قیمت ۲۱ کروڑ تھی۔ ۲۰ فیصدی جاوا سے منگوائی گئی +

دھات اور دھات کی بنی ہوئی اشیا

۲۵-۱۹۲۴ء میں ہم نے لوہا اور سٹیل ۱۹ کروڑ کا منگوایا۔ اس کا ہماری امپورٹ میں تیسرا درجہ ہے۔ اگر ہم اس کے ساتھ مشینری ریلوے لائن کے تختے گاڑیاں اور دیگر ایسا سامان شامل کرلیں تو اس کی قیمت ۵۹ کروڑ ہو جاتی ہے۔ جس میں سے ایلومنیم کی قیمت ۵۸ لاکھ ہے ۲۵-۱۹۲۴ء میں ریلوے کا سامان ۷۳ لاکھ کا تھا۔ اور ۱۹۲۳ء میں ۱۴۰۰ لاکھ۔ اس کی اوسط ۹۰۰ لاکھ تھی ہے۔ گذشتہ دس سالوں میں موٹر گاڑیوں کی امپورٹ نے بہت ترقی کی ہے۔ ۲۵-۱۹۲۴ء میں اس کی تعداد ۳۲۰ لاکھ تھی +

دیگر امپورٹ میں مندرجہ ذیل مشہور ہیں:-

	۲۴-۱۹۲۳ء	۲۵-۱۹۲۴ء
اوزار وغیرہ	۴۲۳ لاکھ روپے	۹۹۴ لاکھ روپے

	۲۴-۱۹۲۳ء	۲۵-۱۹۲۴ء
کیمیکل	۳۰۵ لاکھ روپے	۲۰۶ لاکھ روپے
ادویات	۱۸۱ " "	۱۸۱ " "
کاغذ	۲۸۱ " "	۳۰۳ " "
خوردنی اشیا	۲۸۰ " "	۳۹۲ " "
شراب وغیرہ	۳۱۴ " "	۳۲۸ " "
نمک	۱۱۰ " "	۱۴۳ " "
اوزار آلاتِ کری و انجنیری	۳۲۶ " "	۳۰۲ " "
مصالحہ جات و رنگ روغن	۲۹۶ " "	۲۹۱ " "
شیشہ اور شیشے کا سامان	۲۴۶ " "	۲۴۰ " "
تمباکو	۲۲۶ " "	۱۹۸ " "
قیمتی پتھر و موتی وغیرہ	۱۸۰ " "	۱۲۰ " "
کول و کوک	۱۶۷ " "	۱۳۲ " "
دیا سلائی	۱۴۷ " "	۸۹ " "
سیمنٹ	۷۵ " "	۶۹

مشہور ایکسپورٹ

ہماری چیف ایکسپورٹ سامان خوردنی وغیرہ ساختہ سامان ہے۔ جو غیر ممالک کے لوگ کھانے اور ساختی سامان تیار کرنے کے لئے منگاتے ہیں +

	۲۴-۱۹۲۳ء	۲۵-۱۹۲۴ء
کپاس	۹۸۰۰ لاکھ روپے	۹۱۰۰ لاکھ روپے
سوتی دھاگا	۳۶۶ " "	۳۷۰ " "
سوتی کپڑا	۹۶۳ " "	۹۸۶ " "
سن اور سن کی بنی ہوئی اشیا	۶۲۰۰ " "	۸۶۰۰ " "
سامانِ خوردنی و گندم		
چاول- آٹا وغیرہ)	۵۱۰۰ " "	۶۵۰۰ " "

	۱۹۲۳-۲۴ء	۱۹۲۴-۲۵ء
کھالیں	۶۹۳ لاکھ روپے	۷۷۶ لاکھ روپے
چائے	۳۱۶۶ " "	۳۳۳۳ " "
تیل نکالنے کے بیج	۹۲۸۸ " "	۳۳۱۷ " "
گوٹا	۹۰۶ " "	۷۵۵ " "
تیل	۲۸۰ " "	۳۴۴ " "
لوہا	۱۲۸ " "	۲۱۷ " "
سکہ	۱۸۰ " "	۲۳۰ " "
میگنز	۱۷۸ " "	۱۶۲ " "
دیگر دھاتیں	۹۲ " "	۱۱۰ " "
کھادیں	۱۵۴ " "	۱۲۷ " "
قلمی شورہ	۲۷ " "	۲۷ " "
قہوہ	۱۵۷ " "	۲۰۹ " "
افیون	۲۶۶ " "	۱۴۷ " "
موم	۱۱۴ " "	۱۳۷ " "
رنگ	۱۳۲ " "	۱۳۶ " "
تمباکو	۱۰۳ " "	۱۲۵ " "
شیشم کی لکڑی	۱۰۷ " "	۱۰۶ " "
ابرق	۸۹ " "	۱۱۳ " "

جنگِ عظیم سے قبل ہماری امپورٹ میں جاپان کا حصّہ ۲۰۵ تھا- ۱۹۱۵-۱۶ء میں ۹۰۸ فیصدی ہو گیا- ۱۹۲۴-۲۵ء میں ۶۰۹ فیصدی ہوا اور ۱۹۲۵-۲۶ء میں ۸ فیصدی ہو گیا۔ ہم جاپان سے زیادہ تر کھلونے- سوتی و ریشمی کپڑا- گھڑیاں- شیشے- بساط خانہ کا سامان منگواتے ہیں +

امریکہ جنگ سے قبل ۲۰۶ امپورٹ کرتا تھا- ۱۹۲۳-۲۴ء میں اس کی تعداد ۷۰۵ اور ۱۹۲۵-۲۶ء میں ۷۰۶ فیصدی ہو گئی

جرمنی جنگِ عظیم سے قبل ۱۹۱۲-۱۳ء میں ۶۰۹ فیصدی حصّہ سپلائی کرتا تھا- ۱۹۲۵-۲۶ء میں اس کی تعداد ۶۰۵ رہ گئی- خیال کیا جاتا ہے کہ اس تعداد میں بہت جلد اضافہ ہو جائیگا +

ہندوستان جو اشیا دوسرے ممالک کو بھیجتا ہے اُن میں سے پھر بعض واپس منگوا لیتا ہے ۱۹۲۴-۲۵ء میں واپسی اکپورٹ کی ۱۳ کروڑ تھی ۱۹۲۳-۲۴ء میں یہ تعداد ½۱۳ کروڑ تھی- ۱۹۲۲-۲۳ء میں یہ تعداد ۱۵ کروڑ تھی ۱۹۲۵-۲۶ء میں یہ تعداد ½۱۰ کروڑ رہ گئی- اس کا ایک سبب یہ ہے کہ ہندوستان میں کارخانے ترقی کر رہے ہیں اور ملک میں اشیاء پیدا کی جا رہی ہیں +

ہماری اوسط سے زیادہ امپورٹ برطانیہ سے آتی ہیں- ۱۹۱۳-۱۴ء میں ۶۴۰۱ فیصدی حصّہ برطانیہ کا تھا + لڑائی کی وجہ سے امریکہ اور جاپان ترقی کر گئے ہیں۔ مندرجہ ذیل نقشہ سے ہندوستان کی دیگر ممالک کیساتھ امپورٹ اور اکپورٹ کے تناسب کا پتہ چلتا ہے:-

	اکپورٹ		امپورٹ	
	۱۹۲۳-۲۴ء	۱۹۲۴-۲۵ء	۱۹۲۳-۲۴ء	۱۹۲۴-۲۵ء
برطانیہ	۲۵۰۵	۲۵۰۵	۵۷۰۸	۵۴۰۱
جرمنی	۶۰۱	۷۰۹	۵۰۲	۶۰۳
جاپان	۱۴۰۱	۱۴۰۳	۶۰۱	۶۰۹
امریکہ	۹۰۴	۸۰۸	۵۰۷	۵۰۷
فرانس	۵۰۵	۵۰۳	۱۰۰	۱۰۰

	اکسپورٹ		امپورٹ	
	۱۹۲۳-۲۴ء	۱۹۲۴-۲۵ء	۱۹۲۳-۲۴ء	۱۹۲۴-۲۵ء
بلجیم	۰.۸	۳.۵	۲.۴	۲.۷
آسٹریا و ہنگری	۰.۴	۰.۲	۰.۵	۰.۴
لنکا	۳.۹	۳.۷	۰.۶	۰.۶
ایران و عرب	۱.۸	۱.۵	۱.۱	۱.۱
اٹلی	۹.۰۰	۵.۹	۱.۳	۱.۲
ہانگ کانگ	۱.۳	۰.۹	۰.۵	۰.۵
چین	۲.۹	۳.۴	۱.۵	۱.۱
نیوزیلینڈ	۱.۶	۱.۲	۱.۰۰	۲.۲
آسٹریلیا	۱.۲	۱.۸	۰.۵	۰.۳
مشرقی افریقہ و زنجبار	۱.۱	۱.۲	۱.۴	۲.۲
جاوا	۱.۱	۰.۷	۹.۲	۹.۳
سوئٹزرلینڈ	—	—	۱.۴	۲.۴

توازن تجارت

Balance of Trade

امپورٹ اور اکسپورٹ کی قیمت کے تناسب کو توازن تجارت کہتے ہیں۔ اگر اکسپورٹ کی قیمت امپورٹ سے زیادہ ہو تو توازن تجارت کو خوشگوار (Favourable) کہا جاتا ہے۔ اگر امپورٹ کی قیمت اکسپورٹ سے زاید ہو تو توازن تجارت ناخوشگوار (Unfavourable) کہا جاتا ہے +

جب ہم کسی ملک کے بین الاقوامی تجارتی اعداد و شمار کا مطالعہ کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاذ ہی کسی ملک کی اکسپورٹ امپورٹ کے برابر ہو۔ ہندوستان کی اکسپورٹ بھی امپورٹ سے زاید ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہندوستان کا توازن تجارت خوشگوار ہے۔ انگلستان کا توازن تجارت ناخوشگوار ہے۔ مگر جب ہم اس بات کا پتہ لگانا چاہیں کہ کونسا ملک بین الاقوامی تجارت سے فائدہ اٹھاتا ہے اور کون سا نقصان۔ تو ہمیں اشیائے امپورٹ و اکسپورٹ ہی کو صرف مدنظر رکھنا نہیں چاہئے۔ بلکہ اس ملک کے مجموعی سرمایہ کا خیال بھی رکھنا چاہئے۔ جو وہ دوسری صورتوں میں وصول کرتا ہے۔

کسی ملک کا Credit مندرجہ ذیل اشیاء پر حاوی ہو سکتا ہے +

اکسپورٹ شدہ اشیاء کی قیمت +

خدمات جہازرانی +

انگلستان نے جہازرانی کے ۶۰ فیصدی حصہ پر قبضہ جما رکھا ہے اور یہ خدمت انگلستان کو اس بات کا حق دلاتی ہے کہ وہ دوسرے ممالک سے روپیہ طلب کرے +

ملکی سرمایہ کا سود جو غیر ملکوں کو بطور قرض دیا جائے۔ بنکوں کی آمدنی جو دیگر ممالک میں جاکر تبادلۂ زر کا کام کرتے ہیں +

ان لڑکوں کا خرچ جو دوسرے ممالک سے پڑھنے کے لئے آتے ہوں یا سیاحوں کا جو سیر کرنے کے لئے۔

اس لحاظ سے ہندوستان برطانیہ کو کثیر رقم ادا کرتا ہے۔ اوّل انگلستان کا بہت سا سرمایہ ہندوستان میں لگا ہوا ہے اور ہمیں اس کے عوض سود ادا کرنا پڑتا ہے۔ انگریزی جہاز خیرات کے طور پر کام نہیں کرتے۔ بلکہ اس خدمت کے عوض کثیر رقم بطور کرایہ وصول کرتے ہیں۔ ہمیں بہت بڑی رقم ان انگریزوں کو بطور پنشن دینی پڑتی ہے جو ہندوستان میں ملازمت کر چکے ہوں یا لمبی رخصت لیکر گھر گئے ہوں +

کسی ملک کا Credit دوسرے ملکوں پر۔ اس سے ہوتا ہے کہ وہ دوسرے ممالک اشیاء اکسپورٹ کرتا ہے۔

اور اُس کی قیمت دوسرے ملک پر واجب الادا ہوتی ہے۔ ملک کے لوگ دوسرے ممالک میں جاکر نوکریاں یا کاروبار کرتے ہیں۔

فوائد

سب سے فائدہ مندبات اس میں یہ ہے کہ ہر ملک وہ اشیا تیار کرتا ہے جو وہ نہایت آسانی سے اور مقابلتہً کم خرچ کرکے تیار کرے۔ اور امپورٹ وہ چیزیں کرتا ہے جو دیگر ممالک اس سے کم قیمت پر اور آسانی سے تیار کرسکیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ بعض ممالک قدرتی طور پر بعض اشیا کی پیداوار کے لئے موزوں ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں بنگال ایسی جگہ ہے جہاں "سن" تمام دنیا سے مقابلتاً سستی پیدا کی جاسکتی ہے۔ اور کی جاتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں بنگال کی سرزمین قدرتی طور پر سن کی پیداوار کے لئے بنائی گئی ہے۔

بعض ممالک نے اپنا سرمایہ اور لیبر اس طرح کی صنعت کو خاص ترقی دی کہ بعض اشیا بہت سستی مہیا کرسکتے ہیں۔ وسطی اشیا اور ایران کے رہنے والوں نے قالین بنانے میں اسقدر قدرت حاصل کرلی ہے کہ کوئی اور ملک اُن کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

لنکاشائر اور برمنگھم وغیرہ کے کارخانوں نے گذشتہ صدی میں کپڑے کی صنعت میں اسقدر ترقی کی ہے کہ کوئی اور ملک آسانی سے انکا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

بین الاقوامی تجارت کو ملکی تجارت کی طرح بے دریغ پھیلنے دینا چاہئے۔ دوسرے الفاظ میں اس پر کوئی سخت پابندیاں عاید نہیں کرنی چاہئیں۔

آب و ہوا کی وجہ سے بعض ممالک کے لئے بعض اشیا پیدا کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ یہ چیزیں دوسرے ممالک سے امپورٹ کی جاسکتی ہیں۔ مثال کے طور پر انگلستان کے لئے چاول پیدا کرنا ناممکن ہے۔ ہندوستان میں چاول کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ انگلستان ہم سے خرید لیتا ہے۔ فائدہ دونوں ممالک کو ہے۔ انگلستان کو چاول نصیب ہو جاتے ہیں اور ہندوستان نقدی سے ہاتھ رنگتا ہے۔

ملک اپنے لئے غلہ پیدا کرنے کے واسطے بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی ضروریات زندگی دوسرے ممالک سے امپورٹ کرے۔ اگر امپورٹ کرنے کا سلسلہ مفقود ہو جائے تو بہت لوگوں کو بے موت فاقوں سے مرنا پڑے۔

بین الاقوامی تجارت سے لیبر کی بہت بچت ہوتی ہے۔ اگر ہم ہندوستان میں موٹر یا انجن بنالیں تو ہماری لاگت امریکہ سے بہت زیادہ آئیگی۔ کیونکہ ہمارے پاس تجربہ کار لیبر اور اعلیٰ قسم کی مشینیں موجود نہیں۔ بین الاقوامی تجارت کی وجہ سے کوئی ملک کسی چیز کا اجارہ (Monopoly) قایم نہیں کرسکتا۔ دیگر ملکوں کا مقابلہ قیمتوں کو کم کردے گا۔

شخصی تقسیم کار (Division of Labour) سے بہت فائدے پہنچے ہیں۔ کیونکہ ہر فرد وہی کام کرتا ہے جس میں اُس کو خاص مہارت ہو۔ اسی طرح بین الاقوامی تجارت میں ملکی تقسیم کار کا اصول پنہاں ہے۔ ہر ملک وہی چیز پیدا کرتا ہے جس کے لئے قدرتی طور پر وہ موزوں ہو۔

یہاں ملک افراد خیال کئے جاتے ہیں۔ اور باہمی تقسیم کار سے سب کو فائدہ پہنچتا ہے۔

مثال

ہندوستان گیہوں بہت سستا پیدا کرتا ہے۔ اور

انگلستان کپڑا۔ اس لئے دونوں اپنے اپنے کام میں رہ کر فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اگر ہندوستان کو کپڑا خود بنانا پڑے اور انگلستان کو گیہوں پیدا کرنا پڑے تو دونوں ملکوں کو نقصان ہوگا۔ سرمایہ زیادہ خرچ ہوگا اور منافع بہت کم ہوگا۔

ہر ملک وہی چیزیں تیار کرتا ہے جس کے لئے وہ قدرتی طور پر موزوں ہو۔ چیزیں اکپورٹ کرنے سے ہمیں روپیہ ملتا ہے اور اسی روپیہ سے ہم وہ اشیا دیگر ممالک سے خرید سکتے ہیں جن کا پیدا کرنا ہمارے لئے نفع رساں نہ ہو۔

جب کوئی ملک کسی خاص صنعت کے پیچھے پڑ جائے تو اس میں خاص مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ جس کی وجہ سے اُس کے اخراجات کم ہو جاتے ہیں۔ اور پبلک کو فائدہ پہنچتا ہے۔ انگلستان نے جہاز بنانے میں اسقدر ترقی کی ہے کہ وہ تمام دنیا بھر میں کم قیمت پر جہاز بنا سکتے ہیں۔

نتائج

امپورٹ اور اکپورٹ اسی حالت میں مکمل ہو سکتی ہے جبکہ طریق تبادلہ زر بہتر ہو۔ اگرچہ تجارت کی وجہ سے بعض اوقات خوفناک لڑائیاں ہوتی ہیں۔ طاقتوروں نے کمزوروں کو دبا لیا ہے۔ تاہم آپس میں اتحاد قایم کرنے کا بھی یہی ذریعہ ہے۔ ایک ملک کے لوگ دوسرے ملک کے لوگوں کی عادات و خصائل سے واقف ہو جاتے ہیں۔ اور آپس میں خیالات تبدیل کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ بین الاقوامی تجارت نے باہمی ہمدردی اور محبت بھی پیدا کر دی ہے۔ مثال کے طور پر عرب تاجروں نے افریقہ کے حبشیوں کے خیالات کو بہت روشن کر دیا ہے نئی نئی منڈیاں تلاش کرنے کی خواہش نے کولمبس سے امریکہ دریافت کروا ڈالی۔ اور نہاں خزانے سیاحوں کو معلوم ہو گئے۔

جب اقتصادی تعلقات اُستوار ہو جائیں تو ہر ملک یہ چاہتا ہے کہ لڑائی کی لعنت ختم ہو جائے۔ کیونکہ لڑائی کی صورت میں اقتصادی تعلقات قایم نہیں رہ سکتے۔

آزاد تجارت اور حفاظت

Free Trade & Protection

جب کوئی قوم یا ملک غیر ملکی تجارت پر محصول یا سخت ڈیوٹی عاید نہ کرے اور اُسے ملکی تجارت کی طرح چلنے دے تو اُسے آزاد تجارت کہتے ہیں۔ آزاد تجارت کے حامی اپنے ملک کے اپنے ملک کے لئے بہت مفید خیال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر وہ پابندی جو بین الاقوامی تجارت پر لگائی جائے تجارت کے حق میں زہر قاتل ہے۔ تجارت میں رکاوٹیں پیدا ہونگی۔ ملکوں میں بغض و عناد پھیلے گا اور پبلک کو نقصان پہنچیگا۔

حفاظت (*Protection*) موجودہ زمانہ میں بعض ایسی اقوام ہیں جو تجارت کو بیرونی مقابلہ سے محفوظ رکھنا ضروری خیال کرتی ہیں۔ وہ بین الاقوامی تجارت پر بہت سی پابندیاں عاید کر دیتے ہیں۔ ان کی یہ صورت ہوتی ہے کہ وہ اسباب جو ملک سے باہر جائے یا ملک کے اندر باہر سے آئے اُس پر کافی ٹیکس لگا دیا جاتا ہے۔ حفاظت کا مقصد گھریلو تجارت کو ترقی دینا اور اُسے بیرونی مقابلہ سے محفوظ رکھنا منظور ہوتا ہے۔

زیادہ ٹیکس لگانے کا یہ بھی مقصد ہوتا ہے کہ امپورٹ شدہ اشیا کی قیمت ملکی ساختہ اشیا سے بڑھ جائے۔ اس طریقہ سے ملکی ساختہ اشیا زیادہ مقبول ہوتی ہیں۔

مندرجہ ذیل دلائل اس کے حق میں دیئے جاتے ہیں:-

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہر ملک کو چاہئے کہ ہر وہ ضرورت

جو درکار ہو اپنے لئے اپنے ہی ملک سے مہیا کرے۔ ہر چیز کی منڈی ملک ہی میں ہونی چاہئے۔ بیرونی منڈی دور ہونے کی وجہ سے تکلیف دہ ہیں۔ اور جب جنگ چھڑ جائے تو یہ منڈیاں بند ہو جاتی ہیں اور ملک کو سخت نقصان پہنچتا ہے +

حفاظت کی وجہ سے بیکار لوگ کام پر لگائے جاسکتے ہیں۔ جب بیرونی مقابلہ بند ہو جائے۔ نئی نئی صنعتیں کھل جاتی ہیں۔ اور بہت سے بیکار لوگوں کو ذریعہ روزی مل جاتا ہے۔ یہ دلیل اتنی معقول نہیں جب حفاظت کی وجہ سے نئی صنعتیں کھل جائینگی تو ایکسپورٹ کی صنعتیں بند ہو جائیں گی۔ ممکن ہے کہ نئی صنعتیں ملک کے لئے زیادہ آسان اور نفع رساں ہوں +

حفاظت مال کی وجہ سے مزدوریاں بڑھ جاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے غریب لوگوں کی زندگی آرام سے گزرتی ہے

نئی صنعتوں کی حفاظت

جب کوئی ملک نئی صنعت قایم کرے تو وہ مقابلۃً ان ممالک کے جو دیر سے اس کام میں لگے ہوتے ہیں گھاٹے میں رہتا ہے۔ کسی صنعت کو کامیاب بنانے کے لئے مندرجۂ ذیل چیزیں ضروری ہیں:-

(۱) قدرتی ذرائع +

(۲) تجربہ کار لیبر +

(۳) مشینوں کی بہترین اقسام +

(۴) انتظامی قابلیت +

آخری تینوں اشیا کے مکمل ہونے کے لئے بہت وقت درکار ہوتا ہے۔ اگرچہ کسی ملک کے پاس کسی صنعت کو ترقی دینے کے لئے قدرتی ذرائع موجود ہوں۔ تاہم اسے کافی عرصہ باقی تینوں اشیا کو ضروری سطح پر لانے کے لئے درکار ہے۔ اگر نئی صنعت کو شروع ہی میں غیر ملکی صنعت سے مقابلہ پڑ جائے تو وہ ناکام رہ جائیگی۔ لیکن اگر اسے کچھ عرصہ کے لئے 'حفاظت' دے دی جائے تو اتنے وقت میں وہ اپنے آپ کو مکمل کر کے اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائیگی اور آسانی سے بیرونی صنعت کا مقابلہ کر سکیگی +

یہ دلیل نہایت معقول ہے۔ حفاظت ابتدائی حالت میں نہایت ضروری ہے۔ جاپان۔ امریکہ۔ اور جرمنی میں بھی اس پر عمل کیا گیا ہے۔ اور کچھ عمل ہندوستان میں بھی ہونا شروع ہو گیا ہے۔ حفاظت کی وجہ سے ہم اپنی لیبر اور سرمایہ کو زیادہ نفع رساں اور تجربہ کار بنا سکیں گے۔ اگر حفاظت نہ دی جائے۔ تو ہم بیرونی قیمتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان کی قیمت لازمی طور پر ہم سے کم ہوتی ہے۔ لوگ ہماری اشیا کو خریدنا بند کر دینگے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہماری صنعتیں بند ہو جائینگی +

ہاں یہ ضروری ہے کہ صنعت جب اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے تو حفاظت کو ہٹا دیا جائے +

ملک میں ایک ہی صنعت نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ لوگوں کے ذہن اور دانش کو مختلف میدانوں میں فکر و عقل کے گھوڑے دوڑانے چاہئیں۔ ایک ہی صنعت سے لوگوں کے دماغ بوسیدہ ہو جاتے ہیں۔ اور اس صنعت کے بند ہو جانے سے ملک کا بیشتر حصہ بیکار ہو جاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ قحط اور فاقوں کی موتیں ہوتا ہے۔ ہندوستان میں صرف ایک ہی صنعت زیادہ اہم ہے اور وہ زراعت ہے۔ اگر کسی سال فصل نہ ہو تو ملک میں قحط پھیل جاتا ہے +

سیاسی دلایل

آزاد تجارت جنگ ہے درمیان کمزور اور طاقتور کے

جو غریب ہوگا وہ کچلا جائیگا۔ جو سرمایہ دار ہوگا پھلے پھولیگا غریب کا خیال رکھتے ہوئے اس سرمایہ داری کی لعنت کو نیست و نابود کرنا چاہئے۔ ہر ملک کو چاہئے کہ وہ کسی غیر ملک سے جنگی سامان نہ خریدے۔ اس صنعت کو خاص طور پر ترقی دینا چاہئے۔ کیونکہ ایسے اہم معاملہ میں کسی دوسرے ملک پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

جب کوئی صنعت تباہ ہو رہی ہو تو اسے ضرور بچانا چاہئے۔

حفاظت کے نقصانات

(۱) یہ سرمایہ کو بعض غیر ضروری اور کم نفع رساں صنعتوں پر تقسیم کر دیتی ہے۔ وہ صنعت جو ملک کے لئے قدرتی طور پر موزوں ہو اور اس کے لئے ہر طرح کی سہولتیں موجود ہوں۔ حفاظت کی وجہ سے مجبوراً بند کرنی پڑتی ہے۔

(۲) جب بیرونی مقابلہ بند کر دیا جائے تو اقتصادی ترقی بوجہ سستی کے محدود ہو جاتی ہے۔ کیونکہ مقابلہ کا خوف جاتا رہتا ہے۔ تجارت کی نئی نئی تجویزیں نہیں سوچتے کیونکہ وہ جانتے ہیں جیسا چاہینگے کرینگے۔

(۳) حفاظت کی وجہ سے قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ کارخانہ والے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور لوگوں کو نقصان ہوتا ہے۔

(۴) حکومت کو لوگوں کے معاملات میں دخل دینا پڑتا ہے اور یہ دخل اقتصادی ترقی کے لئے مفید نہیں۔ اسی سبب سے لڑائیاں اور سازشیں شروع ہو جاتی ہیں۔ جیسا امریکہ میں ہوا۔

ہندوستان اور حفاظت

بہت لوگ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ ہندوستان میں بھی یہ پالیسی جاری کر دی جائے خصوصاً کارخانہ دار اس بات پر زیادہ زور دے رہے ہیں۔ اس بات کو معلوم کرنے کے لئے کہ آیا ہندوستانی صنعتوں کو حفاظت کی ضرورت ہے یا نہیں۔ حکومت ہند نے اکتوبر ۱۹۲۱ء میں ایک کمیشن قایم کیا۔ جس کا نام فیشل کمیشن تھا۔ کمیشن کا مقصد تحقیقات کرنا اور ضروری باتوں کی گورنمنٹ سے سفارش کرنا تھا۔ کمیشن نے بہت تحقیق و تدقیق کے بعد سفارش کی کہ خاص حالات کے تحت خاص صنعتوں کو حفاظت دے دی جائے۔ رپورٹ میں مندرج ہے کہ حفاظت کے لئے مندرجہ ذیل اشیا کا ہونا ضروری ہے۔

(۱) صنعت کی ترقی کے لئے ملک میں قدرتی ذرائع بکثرت موجود ہوں۔

(۲) صنعت ایسی ہو جو حفاظت کے بغیر پروان نہ چڑھ سکتی ہو

(۳) بغیر حفاظت کے اس کی ترقی کچھ عرصہ بعد ممکن ہو۔

ایک ٹیرف بورڈ اس کام کے لئے مقرر کیا گیا کہ وہ مختلف صنعتوں کے حقوق کا معائنہ کرے۔ اور حفاظت کی سفارش کرے۔ اس بورڈ کی سفارش پر صنعت لوہا و سٹیل کو حفاظت مل گئی ہے۔

بین الاقوامی تجارت کے نقصانات

جب بیرونی اشیا بہت بڑی تعداد میں امپورٹ کی جاتی ہیں تو ملک کے لوگ جو اس کام میں لگے ہوئے ہوتے ہیں بیکار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان کی قیمتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہندوستان میں ہزاروں نورباف ولایتی کپڑا آنے کی وجہ سے بیکار ہو گئے ہیں۔

بین الاقوامی تجارت کا نتیجہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ اشیا کثرت سے پیدا کی جاتی ہیں۔ مگر ان کی مانگ نہیں ہوتی۔ یہ ملک کا فیشن بدل جاتا ہے۔ اسی لئے تمام روپیہ اکارت جاتا ہے۔

مثال کے طور پر انگلستان ہندوستان کو سوتی کپڑا مہیا کرتا ہے۔ بالفرض اگر ہندوستان میں ریشمی کپڑا پہننے کا فیشن عام ہوجائے تو بہاولپوری لوگ بھوکے مر جائیں +

زمین کی قوت روئیدگی دن بدن کم ہو رہی ہے اگر غلہ کثرت سے ایکسپورٹ کرنے کی خاطر پیدا کیا جائے تو وہ وقت بھی آجائے گا۔ جب زمین میں سے غلہ پیدا کرنا مشکل ہوجائے گا جس کی وجہ سے ملک کی اقتصادی حالت کو سخت نقصان پہنچے گا +

اقبال قریشی

ریویوز

پرشین ٹیچر | مصنفہ سید عنایت علی (منشی فاضل فرسٹ اورنٹیل ٹیچر رنگ محل مشن ہائی سکول لاہور۔ طباعت کتابت کاغذ گوارا۔ حجم چھوٹی تختی کے ۱۶۸ صفحات۔ قیمت ۱۲/ ملنے کا پتہ: منیجر سردار بک ڈپو ۲۳ گندی گراں سٹریٹ لاہور +

یہ کتاب اس خیال سے لکھی گئی ہے کہ طلباء مڈل۔ ہائی منشی عالم منشی فاضل وغیرہ کو اردو یا انگریزی سے فارسی میں ترجمہ کرنا آجائے۔ یہ کوشش کامیاب نظر آتی۔ اور طلبا کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی۔ قیمت ذرا گراں ہے اور مکرر غور چاہتی ہے +

واقعاتِ عالم | حاجی خطیب قادر بادشاہ صاحب مدراس کے ایک مشہور و معروف شاعر اور کثیر التصنیف مصنف بیان کئے جاتے ہیں۔ یہ ۴ صفحہ کا رسالہ اُن کے کلام کا اقتباس ہے جس میں مشہور واقعات کی تاریخیں درج ہیں۔ اور اپنے رنگ میں مزے کی چیز ہے۔ کتاب شوق سے چھاپی گئی ہے۔ مدراس کے لحاظ سے زبان بساغنیمت ہے اور ۴ر میں یاسین ایرس ترل کچہری مدراس سے مل سکتی ہے +

ہندوؤں کا عروج و زوال | اس پرلطف نظم کے ذریعے منشی شمبھو دیال صاحب دانش سول جج ریاست جھالاوار نے قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ دانش صاحب کلیات میں اردو زبان پر انہیں اعلیٰ قدرت حاصل ہے۔ حیرت ہوتی ہے راجپوتانہ میں ٹھیکرا ایسی پاکیزہ زبان میں شعر کہنا دانش صاحب نے کس طرح کیا۔ گو یہ نظم ہندوؤں کو مخاطب کرکے لکھی گئی ہے۔ مگر دیگر اقوام بھی اسے دلچسپی سے پڑھ سکتی ہیں۔ دانش صاحب اس خدمت کے لئے مادری زبان کے شکریہ کے مستحق ہیں۔ قیمت ۲ر +

ملنے کا پتہ:۔ سنٹرل جیل پریس۔ جھالاوار (راجپوتانہ) +

"سالنامۂ نیرنگِ خیال پر تبصرہ"

حضرت فخر نظامی کے فونٹین پن سے

یوں سمجھ لیجئے کہ خدا کی جسقدر جاندار مخلوق ہے۔ بس اسی کے لگ بھگ ماشاء اللہ ہمارے ہندوستانی رسالوں اور اخباروں کی تعداد بھی ہے۔ ہر ہفتہ آپ دس بیس سو پچاس۔ نئے اخبارات اور نئے رسالوں کی اجرائی کی کیفیت سنیں گے۔ لیکن دنیا جانتی ہے ستارے بہت سے ہیں۔ پر چاند کی بات سب میں تھوڑے ہی آسکتی ہے ظاہرا بھاری بھرکم جسم والے لیڈر بہت سے ہیں۔ لیکن جو کام ہمارے دُبلے پتلے جسم والے مہاتما گاندھی کر جاتے ہیں وہ سب سے ہونا مشکل ہے۔ ہم بلا جبر و اکراہ "بلا کمیشن" کہتے ہیں کہ جسقدر اردو رسالے نہ صرف لاہور بلکہ ہندوستان سے نکلتے ہیں ان کا مقابلہ چشم بد دور ہمارے "نیرنگِ خیال" سے کر لیجئے۔ پھر دیکھئے کہ آپ کے دل کی حرکت خود بخود تیز ہو جاتی ہے کہ نہیں۔ یہ تو ہم کہتے ہیں کہ آپ اگر رسالہ "سودمند" بھی دیکھنے والے ہیں اور کفایت شعاری کا جذبہ آپ میں پیدا ہوکر بدرجہ اتم موجود ہے تو رسالۂ نیرنگِ خیال دیکھنے کے بعد کوئی وجہ نہیں کہ آپ چپکے سے صندوقچہ کھول کر (روپے) نہ نکال لیں۔ اور دوسرے روز قریب کے ڈاکخانہ میں معہ ایک عدد منی آرڈر فارم نہ نظر آئیں جس میں روپیوں کی جگہ تین روپے ۴ آنہ۔۔۔۔ پتہ کی جگہ حکیم محمد یوسف حسن صاحب اڈیٹر رسالہ نیرنگِ خیال بارود خانہ لاہور۔ عبارت کی جگہ براہ کرم اپنا قیمتی رسالہ "نیرنگِ خیال" جاری کر دیجئے نہ لکھا ہو٭

کیونکہ "نیرنگِ خیال" اپنی ظاہری و معنوی خوبیوں کے لحاظ سے روپے میں سستا نہیں بلکہ مفت ہے۔ پھر اسکے علاوہ سال میں دو عدد ضخیم رسالے "خاص نمبر" و "عید نمبر" کے نام سے بھی دیئے جاتے ہیں۔ آپ کو رسالے کا رسالہ ملا اور ضخیم نمبر بھی ملے۔ گویا رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی۔ مضامین کے متعلق صرف اسقدر کہنا کافی ہے (منجانب ہمارے) وہ کونسا ہندوستان کا بہترین ادیب ہے جس کے مضامین نیرنگِ خیال میں بالتزام شائع نہیں ہوتے تصاویر کے متعلق صرف اسی قدر کہنا ہے کہ جسقدر تصاویر ابتک شائع ہو چکی ہیں۔ ہو رہی ہیں۔ یا ہونگی وہ بہترین آرٹ و مصوری کا نمونہ ہیں۔ اور تعداد ایسی کہ بلا مبالغہ کوئی رسالہ اتنی تصاویر نہیں شائع کرتا اس کا اقرار دوست اور دشمن سب کو ہے۔ دوست اگر تعریف کر کے اقرار کرتے ہیں تو دشمن یہ کہکر اپنی شرمندگی کو مٹاتے ہیں کہ ہم بعض رسالوں کی طرح اپنی متانت کو تصاویر کی نذر نہیں کرنا چاہتے۔ اس سے ملک کا مذاق بگڑ جاتا ہے وغیرہ۔ گویا اس طریقہ سے خریداران رسالہ کا "حق تصاویر" بھی ہضم کر جانے کی فکر کرتے ہیں ——

حکیم صاحب کا بہترین مضامین شائع کرنیکا شوق،
عمدہ تصاویر خریداروں کو دینے کی آرزو، قیمت لاگت
کے مساوی رکھنے کی خواہش جب اس پر بھی پوری نہ
ہوئی تو آپ نے گذشتہ سال سے ایک نیا شعبدہ نکالا جس
کا نام رکھا "سالنامۂ نیرنگ خیال" ——— "سالنامۂ
نیرنگ خیال" یا "انویل نیرنگِ کھیال" ——— لیکن بڑی
مہربانی کا اپنے حال پر یہ کی کہ کہیں اس کو بھی "خاص نمبر"
و "عیدنمبر" کی طرح مفت دینے کا اعلان نہ کیا۔ بلکہ صرف
کتابت و طباعت و تصاویر کا حقیقی خرچ ۱۲ مقرر کردیا۔
تقریباً چھ ماہ کی دردسری اپنے "شوقِ صحافت" کی سزا
میں قبول کرلی۔ دیکھئے ایسے بھی لوگ دنیا میں ہیں ———
ایک دو مضمون نگار حضرات بھی ہیں جو عالم و فاضل ہونے
کے علاوہ "عاشقِ ادب" بھی کہلاتے ہیں لیکن جب کسی اڈیٹر
کا خط پہنچتا ہے کہ براہِ کرم مضمون بھجوا دیجئے تو ناک بھوں چڑھا کر
جواب دیدیتے ہیں کہ "آجکل بالکل فرصت نہیں ہے"
ذرا آپ کے دن "نام "ٹائم ٹیبل" یا "نظام العمل" کا اندازہ
لگائیے تو معلوم ہوگا کہ...... خیر بارے ازیں قصہ کہ گاؤ
آمد و خر رفت۔ دراصل اب ہم کہنا یہ چاہتے تھے کہ سالنامۂ
نیرنگ خیال ۱۹۲۹ء شائع ہو چکا ہے جو ہمارے پیش نظر
ہے..... لیکن واضح رہے کہ درمیان میں عینک کے
گول گول شیشے بھی ہیں۔ اور ہم کچھ...... جی ہاں کچھ اسکے
متعلق عرض کرنا چاہتے ہیں ———

سالنامہ اب کی دفعہ "اینویل ٹائمز آف انڈیا"
کے سائز پر شائع ہوا ہے یعنے طول اور عرض پون گز اور
وزن ٹھیک تین تولہ کم تین پاؤ ہے۔ صفحے مع اشتہارات
(۱۴۰)..... سرورق یا ٹائٹل نہایت دبیز اور چکنے
کاغذ پر عمل چغتائی ہے۔ یعنی آدھی تصویر ٹائٹل پر بنی ہوئی ہے
جس کی خصوصیت وہی مخروطی لانبی لانبی انگلیاں۔ مخمور پھیلی
ہوئی آنکھیں۔ ستواں لانبی ناک۔ بیضاوی چہرہ ———
ہاتھ میں ایک کتاب بتلائی گئی ہے۔ غالباً "سالنامۂ" ہی
ہے ——— دوسرے ورق پر وہی عبارت ہے جو آپ
ہرماہ دیکھتے ہیں یعنے پتہ...... اڈیٹر... "سب سے
زیادہ چھپتا ہے" قیمت...... لیکن واضح رہے کہ "جملہ
حقوق محفوظ" بھی لکھا ہوا ہے۔ یہ اس لئے ہم نے لکھ دیا کہ
کہ بعض رسائل کو جن کا مذہب "سارا جہاں ہمارا" ہے یہ فقرہ
دکھائی نہیں دیتا اور وہ نہایت اطمینان اور خلوص سے
مضمون چن لیتے ہیں اور پھر اس پر نہ مضمون نگار کا نام ہوتا
ہے نہ رسالہ شائع کنندہ کا۔ جس کے صریح معنے اصول صحافت
کی رو سے "اڈیٹر کے قلم سے" ہوتے ہیں ——— فہرست مضامین
میں درجنوں مشہور اور بلند پایہ ادیبوں کے نام ہیں بیسیوں
نازک خیال، قادر الکلام شعرا کے اسما گرامی ہیں جس کے
سلسلہ میں اڈیٹر صاحب نے کچھ "شکریہ" اور کچھ "اعتذار"
لکھا ہے ——— "پیرایۂ آغاز" جناب حکیم صاحب کے قلم
سے۔ اس میں آپ نے اپنی محنت، جانفشانی اور کامیابی کا
ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد ناظرین کی صحیح المذاقی اور قدردانی
کا تذکرہ کرکے سالنامے کے مضامین پر ایک چھچلتی نظر ڈالی۔
لیکن دیکھئے یہ چھچلتی نظر بھی اتنے بڑے سائز کے پانچ صفحوں
پر جاکر کہیں ٹھہری ہے۔ اس چھچلتی نظر کے درمیان ایک
موٹے سے کاغذ پر ایک "رنگین" "چغتائی تصویر" ہے جس میں بتلایا
گیا ہے کہ ایک عروس سنگھار کر رہی ہے۔ ہم مستور نہیں
اس لئے تصویر پر تنقید کرنا ہمارے فرائض میں داخل نہیں۔

"ابو الفضل بیہقی" فارسی زبان کا ایک قدیم ادیب و مورخ" ایک تاریخی مضمون ہے جو ۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ جناب سید حسن برنی صاحب بی اے۔ ایل ایل بی (علیگ) نے بڑی تحقیق و محنت سے لکھا ہے۔ اسی مضمون کے درمیان ایک رنگین مشرقی تصویر ہے۔ جس کے نیچے "ایک باوفا اپنے حرم میں" لکھا ہوا ہے۔ تصویر کے بعض حصے اسقدر خوبصورت ہیں۔ کہ ہم ایسے بد ذوق شخص نے بھی پسند کر لئے۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہ آئی پر نہ آئی کہ خادمہ کی موجودگی میں اختلاط کیسا؟ اور لطف تو یہ ہے کہ بیگم اور خادمہ کے لباس و شکل میں ذرا سا بھی فرق نہیں۔ دراصل پہلے کے مصور بہت بھولے ہوتے تھے۔

"کتب خانہ ٹیپو سلطان کی مخطوطات" بھی ایک تاریخی اور تحقیقی مضمون ہے۔ جس کو محمد سردار علی صاحب ایڈیٹر التجلی حیدرآبادی نے لکھا ہے۔ دو صفحے کا مضمون ہے۔ جس میں حضرت ٹیپو سلطانؒ کے کتب خانے کی اردو کتب کی فہرست دی گئی ہے۔ جیسا کہ خود مضمون کی سرخی سے ظاہر ہے +

"حالی ایک غزل گو کی حیثیت میں" جناب جلیل قدوائی کا ۸ صفحہ مضمون ہے جس میں حالی کو (اس کی اعلیٰ قابلیتوں اور محاسن سے ہٹ کر) صرف غزل گو کی حیثیت میں پیش کیا گیا ہے۔ اگرچہ سرخی دیکھتے ہی ہم کو یہ اعتراض ہوا کہ حالی کی ایک ایسی صفت کی تعریف کرنا جو دوسری صفات کے مقابلہ میں ذرہ کی بھی مقدار نہیں رکھتی۔ کچھ زیادہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن مضمون پڑھنے پر یہ معلوم ہوا کہ خود فاضل مضمون نگار نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ حالی جیسی زبردست شخصیت کے لئے ایک غزل گو ہونا فخر کی بات نہیں۔ لیکن فن غزل کے لئے یہ بات باعثِ افتخار ہے کہ حالی جیسا شخص بھی غزل کہہ گیا ہے ـــــ اس کے بعد بات صاف ہو گئی۔ ورنہ حالی کو غزل گو کی حیثیت میں پیش کرنے کے معنے یہ ہوتے کہ خواجہ حسن نظامی صاحب کی تبلیغی بہترین خدمات نظر انداز کر کے صاف یہ کہا جائے کہ آپ کا لباس بڑا مشائخانہ ہوتا ہے ـــ دراصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ غزل گوئی بعض بڑے بوڑھوں کے پاس وہ فعل ہے جس کی سزا "حبس دوام بعبور دریائے شور" سمجھی جاتی ہے۔ قدوائی صاحب نے اس مضمون میں بتلایا ہے کہ "نئیں بڑے حضرت آپ جس حالی کی قومی شاعری کے مداح ہیں اور اکثر پوپلے منہ سے مسدس حالی پڑھا پڑھا کر تے ہیں وہ حالی غزل گو بھی تھے۔ لہذا غزل گوئی بری بات نہیں۔ اس کے بعد "تخیلات" اور "سنگار نمبر ۳" دو تصاویر علی الترتیب ہیں۔ تخیلات کی تصویر میں پیچ در پیچ تخیل میں ایک صنف نازک کی تصویر بتلائی گئی ہے۔ جتنی تصاویر اب تک تخیلات کے نام سے شائع ہوئی ہیں ان میں "عورت" ضرور بتلائی گئی ہے۔ کیا ایک مرد کے تخیلات کا عورت جزو لاینفک ہے؟ ہوگی! جبھی تو حضرت آدم کے احساس تنہائی اور پریشانی پر قدرت نے ایک عورت ہی کو پیدا کیا۔ سنگار نمبر ۳ والی تصویر خود ناظرین ملاحظہ فرمالیں۔ ہم کو ایسی تصویریں کبھی بھی پسند نہ آئیں۔ ممکن ہے کہ فن کی ندرت ایسی ہو ـــ

"درسِ محبت" دو صفحے کا ایک ایسا مضمون ہے جسمیں محبت و عشق کے منازل کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اسکے مصنف ابو الجمال محمد احسن صاحب "سخن بہاری" ہیں۔ چونکہ نام میں ابو الجمال۔ سخن اور بہاری تین شاعرانہ الفاظ ہیں۔ اس لئے مضمون میں رنگینی ہو تو تعجب نہ کرنا چاہئے۔ "سخنہائے گفتنی" یہ غالب کے چغتائی مصور ایڈیشن کا دیباچہ ہے جسکی ہندوستان اور ہندوستان کے باہر ایک دھوم مچی ہوئی ہے۔ اس میں جناب چغتائی نے فن مصوری پر عالمانہ بحث کی ہے۔ پچھتین

صفحے پر یہ دیباچہ ختم ہوا ہے۔ صفحہ کے اختتام پر جناب آفسر میرٹھی
کے پانچ اشعار ہیں جن کی سرخی ہے "شکن کے آنسو" پہلا
شعر کیا خوب ہے۔ —

آنسو جب بھر آتے ہیں اُن پیاری پیاری آنکھوں میں
پتھر بھی پانی ہو جائے اِن تو پھر دل ہوتا ہے

ہم نے بار بار شعر پڑھا "واہ کیا خوب شعر کہا ہے" دل تو پھر
دل ہوتا ہے۔ خاص تازہ ہے +

"یہ کون ہیں: آپ ہی ہیں بھائی امتیاز علی تاج
مصنف "چچا چھکن"۔ یہ فقرہ تھا جو جناب سید امتیاز علی صاحب
تاج کی تصویر دیکھنے کے بعد ہماری زبان سے بے ساختہ نکلا
تصویر بڑے سائز پر ہے۔ اڈیٹر صاحب نے آپ کے بارے
میں لکھا ہے کہ آپ تصویر سے ماشاءاللہ ایک ادیب معلوم
ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے اپنے خیال میں تصویر کے نیچے
رائٹ آنریبل مسٹر امتیاز علی ہوتا تو مناسب تھا۔ کیونکہ
آپ ادیب سے زیادہ "جج" یا "کونسل کے ممبر" معلوم ہوتے
ہیں۔ آپ کی تصویر دیکھنے سے آپ کے متعلق ہمارا علم قیافہ
بتلاتا ہے کہ آپ ایک تیز فہم ذکی الحس۔ صاف باطن اور
رحمدل انسان ہیں۔ آپ کی صحت بہت ہی اچھی ہے۔ مصائب
دنیوی سے آپ کو بہت کم دوچار ہونا پڑا ہے +

"انگلستان کا جدید ترین تھیٹر" جناب پطرس کا
مضمون ہے۔ جو سوا تین صفحات پر مشتمل ہے۔ چونکہ ہم بھی
اس فن سے دلچسپی رکھتے ہیں اس لئے دو تین دفعہ ہم نے
مضمون پڑھا۔ مضمون اعلیٰ درجہ کا ہے لیکن ہم جناب پطرس کو
یقین دلاتے ہیں کہ ہندوستان ابھی تھیٹر کے مقاصد اور ایکٹنگ
کے نکات وغیرہ سمجھنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ یہاں تھیٹر کے
معنے یہ ہیں کہ دو چار آسٹلے سیدھے پردے رنگوا لئے جائیں
جن کو "سینریز" کہا جاتا ہے۔ اور آٹھ دس بیہودہ لباس تیار کر لئے
جائیں جن کو "زرق برق پوشاک" کہا جائے ——
دو چار ماسٹر لال ... ماسٹر فلاں مس تنی بائی کابلی والی
مس کالی جان آگرہ والی ... بس خیریت۔ اشتہارات
میں لکھ دیا جائے کہ آج مس ... کا ناچ قابل دید ہے۔
ماسٹر ... کا کام لائق ملاحظہ ہے۔ اس پر عوام ٹوٹ پڑتے
ہیں۔ ڈراموں کی "آورگی" "جنایت" اور "اخلاقیت" تو اظہر من الشمس
ہی ہے۔ ایکٹروں کی بیہودگیوں پر تالیاں خوب بجتی ہیں
دھوم سے واہ واہ ہوتی ہے۔ — جیب کو دو بجے گھر چلے
آئے۔ کمپنی کے منیجر کو کافی رقم مل گئی۔ لیکن ملک کے نونہالوں
کے دل و دماغ پر اب چھچورپن نقش ہو گیا کہ وہ تا عمر نہ گیا ——
غالب نے شاید انہیں تھیٹروں کے بارے میں کہا ہے کہ "دل
کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے"۔ اس مضمون کے
سلسلہ میں آٹھ تصاویر انگلستان کے تھیٹر کی دی گئی ہیں
ان تصاویر کو دیکھنے کے بعد تھوڑا سا غور کر لیا جائے تو "تھیٹریکل
کمپنی آف کلکتہ" "تھیٹریکل کمپنی آف بمبئی" سے قطعی نفرت
ہو جائے۔ — در اصل یورپ نے ہر چیز کو عروج پر
پہنچا دیا ہے۔ اس کے بعد خود جناب پطرس اور جناب
سید سجاد حیدر صاحب یلدرم کی تصاویر ہیں۔ پطرس کی
تصویر نے پہلی نگاہ میں ہم کو بتلایا کہ پطرس کی فطرت صحیح
طالب علمانہ اور متجسس واقع ہوئی ہے۔ وہ ہر چیز کو غور سے
دیکھتے ہیں۔ انہوں نے گذشتہ زندگی میں بڑی بڑی
تکالیف برداشت کی ہیں لیکن آئندہ زندگی نہایت خوشگوار
اور مطمئن ہے —— جناب یلدرم صحت پروفیسر معلوم
ہوتے ہیں —— "بھینی" منشی پریم چند صاحب کا ایک افسانہ
ہے۔ جیسا کہ مزاحیہ نگاری کو ہم نے اپنے لئے مخصوص کر لیا

ہے۔ اسی طرح پریم چند صاحب نے بھی مختصر افسانہ نویسی چن لی ہے۔ آپ مسافوں میں مشاہدات سے بڑی مدد لیتے ہیں ان کا لب لباب یہ ہے کہ۔۔۔ ایک ذات بزرگ کو پان زیادہ کھانے کی عادت ہے۔ گھر سے قریب ایک پان کی دکان کھلتی ہے۔ اس لئے خوش ہوجاتے ہیں۔ ایک وہ تمولن اس کے ہاتھ سے ہنسی کرانے میں تامل کرتی ہے یہ برامانتے ہیں۔ اس کے بعد ایک پروپگنڈا کرتے ہیں جس سے تمبولن کے پان خوب بکتے ہیں۔ اس میں ان کا بھی نقصان ہوتا ہے۔ بعد ازاں وہ ہوشیار ہوتے ہیں۔ اور اپنے نقصان کی تلافی کرنے کے لئے گھر، محلہ، بستی سب چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن یہ جہاں پہنچتے ہیں۔ بی تمبولن بھی سایہ کی طرح محض ہنسی کرانے وہیں جا پہنچتی ہیں۔ افسانہ کے آخر میں انہوں نے تنگ آکر پوچھا ہے کہ مصیبت سے نجات پانے کی ترکیب بتائیے تو ممنون ہونگا۔ ـــ بھلا ہم اس کی ترکیب نہیں بتلاسکتے۔ بس ذرا سی بات ہے + پلدی لگے نہ پھٹکری رنگ چوکھا آئے۔ ا۔۔۔ و۔۔۔ ن سکھئے۔ آپ نہ صرف ہنسی کیجئے! بلکہ دھرم کے موافق ہنسی کر بھی لیجئے۔ پھر آپ کو گھر چھوڑ کر ضلع ضلع بھاگنے کی ضرورت ہے نہ اس بیچاری کو آپ کے پیچھے سی۔ آئی۔ ڈی کے ملازم کی طرح دوڑ دوڑ سے پھرنے کی حاجت ہے۔

"منازلِ کیفیات" ایک فسانہ ہے جو چار صفحوں میں ختم ہوا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ایک لڑکی اپنی زندگی کے ایک خاص حصہ کو خطوط ہی خطوط میں اپنی ایک سہیلی کو لکھتی ہے اثناء مطالعہ میں بعض مواقع پر ہم پر ایک خاص کیفیت طاری ہوئی اور آنکھیں بار بار پُرنم ہوگئیں۔ دراصل خواجہ ظہیر علی صاحب ایم اے ایل ایل بی علیگ کا قلم تاثرات سے پُر نظر آتا ہے ـــ

" شاہ روم کا تحفہ ملکہ مصر کے پاس" والی تصویر ہمیں پسند آئی۔ تحفہ ایک چیتا ہے جس نے اپنا سر ملکہ کے زانو پر رکھدیا ہے مضبوط محافظ زنجیر تھامے ہوئے ہے ملکہ چیتے کے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہے۔ اس تصویر سے انسانی طاقت کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ کیسے خونخوار درندوں کو اپنے بس میں کرلیتی اور بھیگی بلی بناکر چھوڑتی ہے۔ اسی تصویر کے دوسرے صفحے پر ایک اس شخص کی تصویر ہے جس نے سب سے پہلی مرتبہ انسان کا موت سے تعارف کرایا تھا"۔ ایک حسین عورت مجسم فتنہ باقی بیداد جس کے پاؤں کے قریب طشت میں ایک انسان کا سر رکھا ہوا ہے۔ تصویر ایسی ہے کہ سارا نامہ بھر میں حسن و خوبصورتی کے لحاظ سے ایسی تصویر نہیں۔ اس سے متعلق ایک ڈرامہ بھی ہے۔ یا ایک ڈرامہ سے متعلق یہ تصویر ہے۔ ڈرامہ کا مصنف "اوسکر وائلڈ" اور ڈرامہ کا نام "سالومی"۔ تصویر کے نیچے بھی سالومی لکھا ہوا ہے۔ مترجم جناب محمد دین صاحب تاثیر ہیں۔ ایک تو ڈرامہ ہی پُراثر اور پھر ترجمہ تاثیر کا۔ نور علیٰ نور ـــ ڈرامہ اور تصویر میں اسقدر مناسبت ہے کہ اگر تصویر کی ایک ایک کاپی آغا حشر، بھائی تاج اور بیدم کو دے دی جاتی تو سب شایع شدہ ڈرامہ کے لگ بھگ ہی ڈرامہ لکھتے ڈرامہ سے "تریاہٹ" اور "تریاچرتر" بخوبی ظاہر ہے۔ تصویر سے معلوم ہوتا ہے کہ "دو" کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔ غلط ہے۔ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ابھی آمادہ قتل سے گویا۔ تشنہ کامی خنجر کیا کریں نہیں جاتی ـــ۔

"قدیم ہندوستانی مصوری کا ایک شاہکار"۔ نہ معلوم فن کے اعتبار سے کیسی تصویر ہے۔ مگر آنکھوں کو کچھ زیادہ نہیں بھاتی۔

"یادِ ایامِ عشرتِ فانی" پونے دو صفحوں کا مضمون جناب مرزا فرحت اللہ بیگ، صاحب سابق، و ماوی حال حیدر آبادی کا ہے۔ بچپن، مکتب اور سابقہ تعلیم کی تصویر خوب کھینچی ہے۔ مضمون مذکور بار بار دیکھنے کو طبیعت چاہتی ہے۔ موصوف واقعات کا منظر کھینچنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں حیدر آباد سے باہر کے پرچوں میں نیرنگِ خیال یقیناً پہلا پرچہ ہے جس پر آپ نے نظرِ عنایت فرمائی۔ اور نظرِ عنایت میں استقلال بھی پایا جاتا ہے۔

اب جگا تھام کے میٹھوری باری آئی۔ "کہاں گیا مرا بچپن خراب کر کے مجھے" اس مضمون کے بارہ میں اڈیٹر صاحب نے کسی "اتفاقی غلطی" سے لکھ دیا ہے کہ۔۔ "حضرت فخر نظامی کا مضمون کہاں گیا۔۔۔۔۔۔ الخ "مزاحیہ" مضمون ہے" ہاں مزاحیہ۔ لیکن ایسا مضمون لکھنا مذاق نہیں۔ ہمراہ جیسیوں اردو انگریزی کے مزاحیہ مضامین پڑھنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ لیکن ایسی آپج ایسی جدت ایسا اسلوبِ تحریر برسوں کے بعد دکھائی دیتا ہے۔ حضرت فخر نظامی اب بھی مزاحیہ نگاروں کے صفِ اوّل میں ہیں اور اگر ان کی بڑھتی ہوئی طبع یونہی ترقی پر رہی تو اولین جگہ متمکن ہونگے"! یہ مضمون ڈھائی صفحہ کا ہے چونکہ اپنی چیز کی آپ تعریف کرنا دیوانگی ہے۔ اس لئے ہم تعریف کرتے ہیں کہ مضمون بڑا ہی اچھا ہے۔ ہمارے احباب عزیز و اقارب۔ ملاقاتی اور تحریر کے معتقدوں نے اس کو خوب پسند کیا ہے ـــــ

"مشاعرہ" بھی ایک مزاحیہ مضمون ہے جناب شوکت تھانوی کے قلم سے۔ اس میں بھی بچپن ہی کا تذکرہ ہے اور خوب ہے۔ گویا جناب مرزا فرحت اللہ بیگ۔ فخر نظامی اور جناب شوکت تھانوی تینوں نے مضمون "بچپن" ہی پر لکھا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اڈیٹر صاحب نے خواہش کی تھی کہ ایک ہی موضوع پر لکھا جائے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ اس کو مضمون نگار حضرات کی ایک "اتفاقی غلطی" سمجھنا چاہئے ـــــ

"دور کے ڈھول سہانے" جناب تمام بی۔ اے کا مختصر "یون صفوی" مضمون ہے۔ لیکن رنگارنگی میں خاصا ہے ـــ

اس کے بعد ایک "خط" شائع ہوا ہے۔ لیکن غلط فہمی نہ ہو جائے کہ خط کسی گم شدہ عزیز کی تلاش، اور پتہ بتلانے والے کو (مثلاً) انعام کے بارہ میں ہوگا۔ جی نہیں! یہ خط نسوانی رسائل کی مشہور مضمون نگار محترمہ مس حجاب اسماعیل" کا لکھا ہوا ہے اپنی سہیلی کے نام۔ خط شروع سے آخر تک شاعری میں ڈوبا ہوا ہے۔ دلچسپی تو کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ ایسا طرزِ تحریر کم از کم ہم نے تو کسی مضمون نگار کے قلم سے نہیں دیکھا۔ ہم لے دو تین بار پڑھا۔۔ کوئی شاعری کے نقطۂ نگاہ سے ہٹ کر اس خط کو دیکھے تو ایک دو اعتراض پیدا ہو سکتے ہیں! ـــــــــــ

"موت کا درخت" ایک انگریزی فسانہ کا ترجمہ ہے جو تقریباً ۲ صفحہ طویل ہے۔ دلچسپی میں بے نظیر اور تاثیر میں لاجواب۔ جناب غلام عباس صاحب نے ترجمہ کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ خوب ترجمہ کیا ہے۔ ایکبار شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔ کاش! اس زمانہ میں بھی ایسا کوئی موت کا درخت ہوتا۔ کہ کشتگانِ الفت، اسیرانِ زلف اور فریب خوردہ عشق، معشوق دلارام کے نہ ملنے پر اور جہانِ فانی کی آغوش میں جگہ نہ پانے پر خود کو اس درخت کی آغوش میں دیدیتے۔ یا پھر ہندوستان کی وہ ہستیاں فائدہ حاصل کرتیں جن کو تن ڈھکنے کو کپڑا ہے نہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے روٹی۔ اس فسانے کے درمیان دو تصاویر ہیں۔ ایک "نوجوان لڑکا" مشہور یہودی مصور "کافتین" کا شاہکار ہے

یہ ایک اچھی تصویر ہے۔ دوسری تصویر حضرت شاہجہان کی ہے۔ یہی تصویر ہم کو پسند آئی ✦

"فریبِ محبت" بھی ایک افسانہ ہے جو تین صفحوں پر ختم ہوا ہے۔ ایک ادنیٰ مالی ایک راجہ کا خاص مالی مقرر ہوتا ہے۔ اس مالی کو رفتہ رفتہ راجہ کی بیٹی سے محبت ہو جاتی ہے۔ جب یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے تو راجہ کی لڑکی مالی کو قید کرا دیتی ہے لیکن "مہرباں ہو جائینگے" "دو جگر ہونے" کے تحت خود معشوق کے دل میں بھی عشق کی چنگاری پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ باپ کی بغیر اجازت۔ اس کو رہا کر دیتی ہے۔ تھوڑے دنوں بعد راجہ کی لڑکی کی شادی ایک راجہ سے ہوتی ہے۔ لیکن انجام کا یقیناً آپ کو لطف ملیگا۔ جناب ممتاز اشرف صاحب قادری اس کے مصنف ہیں۔ اس فسانے کے درمیان..... "بہزاد کی ایک تصویر" اور "روپ متی اور باز بہادر" نامی ایک تصویر ہے فن اور قدیم مصوری کے اعتبار سے یہ تصاویر بہترین اور لاجواب ہیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ ہمارے مانند کوئی رندِ بادہ مست صرف حسن و شباب کی تصاویر ہی پسند کرے۔ یا پھر ان تصاویر سے خوش ہو جن کے نیچے "عمر خیام کی ایک رباعی" لکھا ہوا ہوتا ہے ——————

"بیٹا" جناب تاثیر ایم اے کا ایک فسانہ ہے۔ جو "مختصر مفید" کہا جا سکتا ہے۔ اسقدر پر پیچ ہے کہ ذہن بار بار دھوکہ کھا جاتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ صرف ایک ہی صفحہ میں وہ شروع بھی ہوا ہے اور ختم بھی ہو گیا ہے ہم اس طرزِ تحریر کو بہت پسند کرتے ہیں ✦

"اعترافِ شکست" ایک انگریزی نظم کا ترجمہ ہے لیکن اس کو ترجمہ کہنا "اعترافِ تجاہل" ہے۔ کاش! یہ فسانے کے شروع میں "اڈیٹر کے قلم سے" لکھا نہ ہوتا کہ ہم اس کی خوب دل کھول کر تعریف کرتے۔ بصورتِ حال میں تعریف کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ کہیں زمانہ یہ نہ کہے کہ اڈیٹر صاحب فخر نظامی کی تعریف کرتے ہیں۔ اور فخر نظامی اڈیٹر کی تعریف کرتا ہے "من ترا حاجی بگویم تو مرا قاضی بگو" کا مضمون ہے۔ کچھ کم چار صفحے کا فسانہ ہے لیکن جسنے دیکھا ہو اس کو کیونکر بتاؤں کہ کسقدر تیر اپنے اندر رکھتا ہے جو ٹھیک قلب میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ کیسی عطر بیز ہوائیں اور مسرور کن صدائیں اس کے اندر پوشیدہ ہیں جو روح کو مست کر دیتی ہیں۔ اس کو جب ہم نے ختم کر دیا تو خاتمہ کا افسوس ہوا۔ دل چاہتا تھا کہ اس کی طوالت ایک عرصہ تک قایم رہتی۔ اس فسانہ میں بھی بعض مواقع پر ہم کو رقت ہونے لگی۔ ایک رقیق القلب۔ سریع الحس اور شاعرانہ قلب رکھنے والے سے پوچھئے کہ عشق میں ضبط اور ستمگار کی ستمگری پر صبر کیا اثر رکھتا ہے۔ پھر جب اس کے بعد معشوق ظلم کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو جو "مجسمۂ آئینہ پشیمانی" اس کو ہوتی ہے وہ کیسی لطیف چیز ہے۔ اس کے بعد... آہ...... وہ مناظر کہ جو سر غرورِ حسن اور نخوتِ شباب سے اکڑا رہتا تھا استقلالِ عشق کے آگے جھک جاتا ہے......

ان باتوں کا لطف اٹھانا ہو تو "اعترافِ شکست" دیکھئے۔ بلا مبالغہ ہم نے اس کو چار دفعہ دیکھا ہے۔ اس فسانے کے بیچ میں دو تصاویر "بسیرا" اور "فخری پاشا" کے نام سے موسوم ہیں ✦

"آسیبِ الفت" کامل اٹھارہ صفحے کا ایک افسانہ ہے جو ترکی زبان سے لیا گیا ہے۔ مترجم ہمارے جناب سید سجاد حیدر صاحب یلدرم ہیں۔ بہت دلچسپ، دلپذیر

پُراسرار اور سنسنی خیز فسانہ ہے۔ ہمیں بھی تعجب ہوتا ہے کہ جسٹرار کی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود موصوف نے اس قدر طویل فسانہ کا ترجمہ کیسے کیا ہوگا۔ جبھی تو حکیم صاحب نے جناب جلیل قدوائی اور محترمہ نذر سجاد حیدر کا بہت بہت شکریہ ادا کیا ہے جن کے توسط سے یہ نایاب چیز حاصل ہوئی۔ اس فسانے کے درمیان تین تصاویر ہیں۔ پہلی تصویر میں پانچ ہزار قبل کی تہذیب اور اُس وقت بھی عورتیں بال کٹواتی تھیں، بتلایا گیا ہے۔ یہ تصویر اپنی ہیئت کی وجہ اس قابل ہے کہ بھائی "تاج کے" ہیبتناک فسانے" والی کتاب میں چسپاں کر دی جائے۔ دوسری تصویر نگار نمبر ۲ کی ہے اس کو دیکھئے اور حظ حاصل کیجئے۔ تیسری رنگین تصویر محبت کے نام سے موسوم ہے۔ یہ تصویر بھی "چغتائی" ہے +

"باغبان" کے عنوان کے تحت ٹیگور کے شاہکار گارڈنر کے چند جواہر پارے دیئے گئے ہیں جس کا ترجمہ مولانا سالک اڈیٹر انقلاب نے کیا ہے۔ یوں تو سب ٹکڑے اچھے ہیں لیکن ہم کو تیسرا اور چوتھا ٹکڑہ بہت پسند ہے +

"چارپائی" جناب رشید احمد صاحب پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا دو صفحوں کا مضمون ہے۔ اس کے متعلق صرف اسی قدر کہنا ہے کہ موصوف نے چارپائی کا کوئی پہلو، کوئی کونہ یا نواڑ کا کوئی خانہ نہیں چھوڑا۔ مزاح لکھنے میں رشید صاحب کو خاص ملکہ ہے۔ ہم انگریزی میں "نمونیہ" اور اُردو میں ذات الجنب کا شکار ہو گئے تھے۔ چارپائی ہماری شریکِ حال تھی اور ہم چارپائی کے رفیق۔ اس لئے ہم نے چارپائی ہی پر پڑے پڑے مضمون مذکور دیکھا ہم بے انتہا کمزور ہو گئے تھے لیکن پھر بھی سچ جانئے کہ مضمون کے بعض حصوں نے ہماری پژمردہ "بخار خوردہ" رگوں میں بھی خون دوڑا دیا ——

"انجام بخیر" جناب پطرس کا لکھا ہوا بالکل مختصر یعنی دو صفحے کا ایک ڈرامہ ہے۔ اس میں زمانہ کا جو رنگ پیش کیا گیا ہے وہ قابلِ دید ہے +

"اندھی لڑکی" سوا دو صفحے کا ایک افسانہ ہے۔ جن کے لکھنے والے جناب حامد اللہ افسر بی۔ اے ہیں۔ فسانہ عشق و محبت کے جذبات کا صحیح آئینہ ہے۔ اندھی اور بدصورت کا جوڑ خوب ملایا ہے۔ واقعات بھی اسی طرح پیش آئیں تو کسقدر اچھا ہو کہ بدصورت مرد اگر خواہش رکھتے ہوں کہ حسین عورت اُن کو ملے تو وہ اندھی لڑکیوں سے عقد کر لیا کریں تاکہ بدصورت آنکھ والے حُسن سے فیضیاب ہوں اور حُسن والی اندھی کو بدصورتی نظر نہ آئے +

"فریاد ہے" جناب عطاءالرحمٰن صاحب بی اے کا ایک چٹکلہ ہے تو یوں ہی صفحہ کا مگر بہت دلچسپ اور پُر اسرار۔ کس طرح ایک شخص بے بسی کی حالت میں آپ کے ہاں آتا ہے۔ اور کس طرح آپ کے تمام گھر والے اُسکو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ پھر کس طرح وہ قوی اور تندرست ہو جاتا ہے ساتھ ہی عطاءالرحمٰن صاحب ضعیف و مضمحل ہوتے جاتے ہیں آخر کس طرح اس اجنبی کا اقتدار گھر بھر میں قایم ہو جاتا ہے — اور لطف تو یہ ہے کہ ایسے اجنبی آپ کے اور ہمارے ہاں بھی آتے ہیں اور آہستہ آہستہ ہمارے عزائم و استقلال کو اپنے عزائم و استقلال میں جذب کر لیتے ہیں +

"ساحل" جناب چغتائی کے قلم کا ایک صفحہ والا مضمون ہے۔ جو لطیف شاعرانہ تخیلات کا مجموعہ ہے ——

"پروانہ" اڈیٹر کے قلم کا ڈرامہ ہے بہت دلچسپ و دلآویز جس کو تاریخی رنگ دیدیا گیا ہے (۹) صفحے اسی سے

پر ہے۔ آخر میں شمع اور پروانہ کی گفتگو بہت پُر اثر ہے +

"ہندوستان کا مستقبل صنعتی ہے یا زراعتی؟"

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ یہ ایک اقتصادی مضمون ہے۔ جناب ریاض بی اے نے لکھا ہے۔ چار صفحے پر مشتمل ہے مضمون محنت اور تحقیق کے بعد لکھا گیا ہے۔ اسی سے اندازہ لگا لیجئے کہ سارا رسالہ کس طرح "ہر قسم" کے مضامین کا مجموعہ ہے۔۔۔

"چارلی چپلن" یہ مضمون سینما کے اسی مشہور "مسخرہ ایکٹر" کے حالاتِ حیات کے بارہ میں ہے جس کا کھیل دیکھنے امیر۔ غریب۔ لیڈر۔ فقیر سب بائسکوپ کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ اور جس کے ڈرامے کو دیکھنے کے لئے ہم اپنی نازک طبع کا بھی خیال نہیں کرتے اور "اُن" کے منع کرتے رہنے پر بھی سیٹی بجاتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ ہم کو بھی سینما کا مرض آجکل کے نوجوانوں کی طرح ایک عرصہ سے ہے۔۔۔ اور چشم بد دور ہم اپنے حلقۂ احباب میں سینما کے بڑے ناقد اور نکتہ چیں مانے جاتے ہیں۔ ہمارے خیال میں چارلی سے اچھا کام "ہرلڈ لیڈ" کرتا ہے جو "چشمے والے" کی عرفیت سے موسوم ہے۔ اس مضمون میں پنڈت دیوان آتم صاحب آشفتہ بی اے نے چارلی کی مختصر سوانح عمری اور اس کی ترقی اور ایکٹنگ وغیرہ کے حالات بیان کئے ہیں۔ اسی مضمون کے درمیان "میاں چپلن" کی سنجیدہ اور ظرافت تصاویر ہیں۔ مضمون سوا دو صفحے طویل ہے۔ چارلی کی خانگی زندگی کی بے لطفی کے اکثر واقعات اخبارات میں چھپ گئے ہیں۔ اور اس مضمون میں بھی ان کا ذکر تفصیل سے ہے۔ یہ پہلو بڑا افسوسناک ہے۔ پنڈت صاحب کو بائسکوپ سے بڑی دلچسپی معلوم ہوتی ہے معلومات بھی غلط ہیں +

اسی مضمون کے درمیان تین تصاویر اور رسالے ہوئی ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کی تصویر ایک، جلیل احمد صاحب قدوائی کی تصویر دو۔ مولانا تمکین کاظمی کی تصویر تین ۔۔۔ مرزا صاحب کی تصویر کے بارہ میں اتنا کہنا ہے کہ یہ تصویر بہت پرانی ہے۔ غالباً اس وقت کی ہوگی جب آپ طالب علم تھے۔ یا دہلی سے پہلے پہل حیدرآباد تشریف لائے تھے۔ جلیل احمد صاحب قدوائی کی تصویر بہت سادہ لباس میں ہے۔ آپ مضامین کی پختگی سے ایک کہنہ سال معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن تصویر آپ کو جوان بتلاتی ہے۔ مولانا تمکین کاظمی تصویر سے بلند خیال، ذی فہم اور سادہ مزاج معلوم ہوتے ہیں ۔۔۔

حصۂ نظم بھی اپنی رنگارنگی میں لاجواب ہے چنانچہ جگر مرادآبادی۔ جلیل قدوائی۔ مولانا تمنا۔ مرزا یگانہ۔ تبسم ایم اے۔ تپش۔ تمکین۔ حزیں۔ جوش ملیح آبادی۔ امجد حیدرآبادی۔ شوکت تھانوی کا کلام ہائے دلپسند و دلپذیر زیب رسالہ ہے۔ "گوئٹے" اور "شیلے" کی نظموں کے بھی تراجم موجود ہیں جن کے تمکین صاحب۔ روشن دین صاحب۔ ابراہیم علیگ صاحب مترجمین ہیں ۔۔۔

مشہور فارسی شاعر عزیز لکھنوی کا کلام بھی زینتِ رسالہ ہے +

"فریب وفا" ڈرامہ ہے۔ مگر ترجمہ۔ باتم صاحب اس کے مترجم ہیں۔ ساڑھے سات صفحے اس سے بھرے پڑے ہیں۔ دلچسپ تو ہے لیکن بعض امور میں اعتراض پیدا ہو سکتے ہیں ۔۔۔

"مجلس علوم شرقیہ ہند کا پانچواں اجلاس" جیسا کہ نام

سے ظاہر ہے۔ علوم مشرقیہ کے پانچویں اجلاس کی کاروائی ہے۔

"باز بہادر اور روپ متی" ایک مختصر تاریخی مضمون ہے اصغر صاحب مؤلف ہیں۔ ایک تصویر جو رسالہ میں دی گئی ہے جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ اس مضمون کو اس سے متعلق سمجھنا چاہئے ——

"چچا چھکن نے وعدہ کو کپڑے دیئے" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ تاج بی اے کا مضمون ہے "شرلاک ہومز" کے مصنف کی طرح آپ بھی چچا چھکن کا ایک کیرکٹر پیش کرکے بار بار نئے انداز سے اس پر خامہ فرسائی کرتے ہیں اگرچہ کہ حال ہی میں ایک اور صاحب نے اسی موضوع پر (اخبار تازیانہ میں) قلم اُٹھایا تھا۔ لیکن اس میں اور اسمیں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بات اس کی اس میں ہے تصویر کی تصویر میں۔ یہ مضمون آخر میں شایع ہوا ہے۔ اگرچہ کہ ابتدائی حصہ میں شایع ہونے کے قابل ہے۔ لیکن اس کی وجہ جیسا کہ اوڈیٹر صاحب نے لکھا ہے مضمون کا دیر سے پہنچا ہے۔ ایک "بی اے" اور ایک "ادیب" کو جسقدر مصروفیتیں ہوتی ہیں ظاہر ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ آپ نے اپنے والد محترم کی طویل علالت کی وجہ سے نسوانی رسالہ "تہذیب نسواں" کی عنانِ ادارت اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے۔ چنانچہ آپ کی گوناگوں مصروفیت کے منجملہ ایک مصروفیت رسالہ تہذیب میں "ہم خود" لکھنا بھی ہے ‎•

"انارکلی" پروفیسر علم الدین صاحب سالک بی اے کا ایک تاریخی مضمون ہے۔ بیشک آپ کی تاریخ دانی اظہر من الشمس ہے۔ اکثر رسایل میں آپ کے وہ اعلیٰ مضامین دیکھنے میں آئے ہیں جنھوں نے "تاریخی دروغگوئی" کی چادر کو ہمیشہ حقایق کی چادر سے ہٹایا۔ "قوس قزح" کے آپ اڈیٹر ثانی بھی رہ چکے ہیں جو لاہور کا ایک ہونہار رسالہ تھا لیکن افسوس کہ ہمنے اس پر ایک زمانہ ہوا کہ فاتحہ پڑھ دی ... کیونکہ وہ مر گیا ——

بس جناب ختم ہو گیا سالنامہ جس کے مختصر تبصرہ کے لئے بھی پانچ کاغذ اور کافی وقت صرف ہوا۔ علاوہ اسکے "ممتاز محل" نیس آدھا گھس گیا۔ آخر میں تقریباً ۴۰ صفحات کے اشتہارات ہیں ہم نے بہت دیکھا مگر "ہمزاد کا عمل" "معشوق عاشق کے قدموں میں" "لاہور میں مردہ زندہ ہوگیا" والے اشتہارات افسوس کہ نظر نہ آئے۔ بس سالنامہ میں اسی ایک چیز کی کمی ہے ——

فخر نظامی

پرملا

ہندی زبان کا ایک دلچسپ افسانہ

پرملا ایک پنڈت کی بیوہ تھی۔ اُس کے مکان کے پیچھے ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ پرملا روزانہ صبح و شام اس مندر میں پوجا کرنے جایا کرتی تھی۔ مندر کے پاس ایک چھوٹا سا کنواں تھا جس کے چاروں طرف دھتورے۔ ارہٹیا اسی اور کنیر کے درخت لگے ہوئے تھے۔ کنوئیں سے ہٹ کر بیل کا بھی ایک درخت تھا۔ پرملا انہی درختوں سے پھول پتے جمع کر کے پوجا کیا کرتی تھی۔

پرملا سولہ سالہ دوشیزہ تھی۔ اتنی نفس کشی۔ اتنی پوجا۔ ریاضت پر بھی اُس کے اعضاء کا قدرتی حسن زائل نہ ہو سکا۔ بلکہ اُس کے اعضا کی کشش اور دل آویزی میں روز بروز ترقی ہوتی جاتی تھی۔ گمان ہوتا تھا کہ گویا اس کی مملکت جسم پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے نفسانیت و روحانیت کے درمیان شدید ترین کشمکش کے جذبات برانگیختہ ہو گئے ہیں۔ مگر حالات کے تمام تر ناموافق ہوتے ہوئے بھی نفسانیت کو شکست نہیں دی جا سکتی۔ اور روحانیت کی فوجیں جو نفسانیت کے پایہ تخت کے گرد خیمہ زن ہیں اندر دخل نہیں پا سکتیں۔ پرملا جس وقت پھولدانی کو کنیر کے درخت کے نیچے رکھ کر سرخ کنول سے ہاتھوں کو اوپر کو اٹھاتی اور منہ کو اوپر کر کے ایک ہاتھ سے کنیر کی ڈالی کو پکڑتی۔ اور دوسرے ہاتھ سے پھولوں کو توڑتی۔ آنچل سر سے کھسک کر کندھوں کے نیچے آ جاتا۔ پیچ و خم کھائے ہوئے بال پشت پر رقص کرنے لگتے۔ وہ ایک لمبی آنکھوں کے سامنے آ جاتیں۔ کانوں تک پھیلی ہوئی بڑی آنکھیں اور بھی لمبی ہو جاتیں۔ دونوں سینے اپنے پورے ابھار کے ساتھ اوپر چڑھ کر پتلی کمر کو خم کر دیتے۔ اس وقت سرکش نفس مرتاض پرملا کو تیز نگاہ سے دیکھتا۔ مندر کے اس سنسان مقام میں حسن و شباب کے ان غیر معمولی کرشموں کو دیکھنے والا کون تھا؟ -

ایک شخص ۔

مندر کے پاس پران ناتھ زمیندار کا ایک سہ منزلہ مکان ہے تیسرے درجہ پر اُس کے بیٹے رام ناتھ کے مطالعہ کا کمرہ ہے۔ اُس کی کھڑکی مندر کی طرف ہے۔ اس مکان اور مندر کے درمیان میں کنواں ہے۔ رام ناتھ کالج میں پڑھتا ہے۔ خوبصورت اور خوش سیرت ہے۔ مرتاض پرملا کی پوجا پاٹ سے واقف ہے۔ کنوئیں پر جونہی برتنوں کی آواز ہوتی رام ناتھ اپنی کتاب ایک طرف ڈال دیتا اور کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ اس وقت ملٹن شیکسپیر اور کالیداس کی دل آویز کتابوں ہی سے کیوں نہ لطف اندوز ہو تا رہتا مگر انہیں فوراً الگ کر دیتا۔ کیونکہ بلا زیور جسم پر سفید ساڑی پہنے ہوئے حسین پرملا کے پوجا میں محو ہونے کا اور رام ناتھ کو جو لطف حاصل ہوتا وہ لطف تمام دنیا کی انگریزی اور سنسکرت نظموں۔ ڈراموں اور ناولوں کے مطالعہ سے نہ حاصل ہوتا وہ مقررہ وقت پر اپنے تمام کاموں کو چھوڑ کر مشتاق نگاہ

کی طرح چاندنی دیکھنے کے لئے کھڑکی کے پاس کھڑا ہو جاتا۔ کھڑکی میں لوہے کے چھڑ لگے ہوئے تھے۔ وہ انہیں کو پکڑ کر مہتاب کی سیر کرتا۔ اس نادان سائنسدان کے دل میں کسی خاص غرض سے نہیں بلکہ فطرتاً یہ سوال پیدا ہوتا کہ اس مرتاض چاندنی چٹکانے والی دوشیزہ کے دل میں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں یا وہ صنانیہ کی طرح ہمیشہ سرد رہتا ہے

کڑاکے کے جاڑے میں جب پرملا نہا کر گیلا کپڑا پہنے ہوئے ہتیلی پر پانی کا لوٹا رکھ کر ایک مقام پر کھڑی آنکھیں بند کئے اپنے خیال میں محو گھومتی اور آہستہ آہستہ پانی گراتی جاتی تو رام ناتھ کانپ جاتا۔ اور کوٹ اور سویٹر سے دبے ہوئے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ اس ناز و نعمت سے پلے ہوئے نوجوان کے قیاس میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ کسی معمولی شخص کو اس جاڑے کی صبح کو نہا کر گیلا کپڑا اسطرح پہنے ہوئے رہنے کا حوصلہ ہو سکتا ہے۔ اس لئے پرملا واقعی طور پر اس کے نزدیک کسی مقدس عالم کی رہنے والی ہستی معلوم ہوتی تھی۔ اور ریاضت کا نور جو اس کے چہرہ پر جلوہ گر رہتا تھا۔ اس کو دیکھ کر مرتاض پرملا کے متعلق رام ناتھ کے دل میں خوش عقیدگی اور ارادت کے جذبات پیدا ہو جاتے تھے۔

(۳)

ایک روز شام کے وقت معمول کے مطابق رام ناتھ پرملا کے پوجا پاٹ کے نظارہ سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ کہ اس کا دوست بگیان گھن اس کے کمرہ میں داخل ہوا۔ یکلخت کو آہٹ معلوم ہوئی تو اس نے بگیان کی طرف نگاہ پھیری گیان ہنستا ہوا اس کے پاس جا کر کہنے لگا کہ کس خیال میں محو ہو۔ اس سوال کے ساتھ ہی سجی ہوئی ارتی لئے ہوئے مندر میں داخل ہونے والی پرملا پر اس کی نظر پڑ گئی۔ اس وقت کچھ اندھیرا ہو چلا تھا۔ پرملا کے پورے جسم پر اس کی نظر نہ پڑ سکی۔ وہ صرف ارتی کی روشنی سے چمکتے ہوئے چہرے ہی کو دیکھ سکا۔ چاروں طرف کے اندھیرے میں پرملا کے روشن چہرے کی ناگہانی جھلک نے بگیان کی آنکھوں میں چکا چوندھ پیدا کر دی۔ پرملا مندر میں چلی گئی۔ اس نے رام ناتھ سے پوچھا کہ یہ کون ہے؟ گیان کے بجائے کوئی اور ہوتا تو ممکن تھا کہ رام ناتھ کوئی حیلہ کر دیتا۔ لیکن بگیان سے اس کا خاص دوستانہ تھا۔ اس نے کہا سدانند جی کی بیوہ بھتیجی ہے یہ سنکر بگیان کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ پوچھا شادی کرنیکا ارادہ ہے کیا؟ یہ سوال سنکر رام ناتھ متحیر ہو گیا۔ کبھی اس کے وہم میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ پرملا کے بارہ میں کوئی اس سے اس طرح کا سوال کریگا۔ اس نے کہا تم جانتے ہو یہ کیسی عورت ہے؟ یہ بیاہنے کے لائق نہیں بلکہ پوجنے کے لائق ہے۔ بگیان نے کہا جب ایسا ہے تو تمہیں اس سے ضرور شادی کرنا چاہئے۔ رام ناتھ نے کہا تم پرملا کو نہیں جانتے وہ عورت نہیں دیوی ہے،

بگیان کے جانے کے بعد رام ناتھ کو ایسا معلوم ہونے لگا کہ پرملا کا برہم کن عالم حسن و شباب اس کے دل پر اپنی پوری قوت سے بار بار حملہ کر رہا ہے۔ اس نے ملامکانی متواتر حملوں کو روکنے کی کوشش کی۔ مگر وہ جوں جوں اس کی کوشش کرتا تھا۔ اس کی بے چینی اور تیزی سے بڑھتی جاتی تھی۔ اور اضطراب کے کانٹے دل میں چبھ چبھ کر میٹھا میٹھا درد پیدا کر رہے تھے۔

وہ سوچتا تھا کہ وفا پرست پرملا اپنے آنجہانی شوہر سے ملنے کی آرزو میں شدید ترین ریاضت میں مصروف ہے۔ اور تمام خیالات کو دل سے دور کر کے یکسر عابدہ بن گئی ہے۔ ایسی وفا پرست ہندو بیوہ کے دل میں دوسری شادی کا تصور بھی

سکتا نہیں سکتا۔ پھر وہ اس قسم کے بے نتیجہ خیالات سے اپنے لئے نئی مصیبت کیوں پیدا کر رہا ہے؟ اُسے گیان پر بہت غصہ آیا کہ وہ زوجیت کے احترام سے بالکل بے بہرہ ہے جو وقتاً فوقتاً اس قسم کی بکواس کر بیٹھتا ہے۔ اس میں غور و فکر کا بالکل مادہ نہیں ہے۔

شب بھر پرملا ہی رام ناتھ کے خواب کا موضوع رہی دوسرے روز صبح کو رام ناتھ میں اس کی بالکل ہمت باقی نہ تھی کہ وہ معمول کے مطابق اُس کو دیکھے۔ اور اُس کی پوجا پاٹ کی سیر کرے۔ مگر جب برتنوں کے بولنے کی آواز آئی تو اُس کے مشتاق پاؤں خود بخود اُس کے لئے رُکے بغیر کھڑکی کے پاس پہنچ گئے۔

رام ناتھ نے بہت چاہا کہ وہ پرملا کو محبت کی نگاہوں سے دیکھے۔ مگر جرأت نہ ہوئی۔ پرملا اسی طرح اُس کے لئے قابلِ احترام بنی رہی۔ اُس نے اپنے ناروا خیالات کے لئے دل ہی دل میں اُس سے معافی مانگی۔

(۳)

آج سات بج گئے لیکن ابھی تک وہ کان آشنا آواز جو پرملا کے آنے کی اطلاع دیا کرتی تھی رام ناتھ کی سامعہ نواز نہ ہوئی۔ اس لئے اُس کی پریشانی بڑھنے لگی۔ کھلی ہوئی کتاب رام ناتھ کے سامنے پڑی تھی۔ مگر سوتی کی طرح وہ رام ناتھ کی توجہ کو اپنی طرف مائل نہ کر سکتی تھی۔ گویا کتاب کی تمام ادبیت اور انشا پردازی رام ناتھ کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اور اُس کے خیالات کے تسلسل کو شکست کرنا چاہتی تھی۔ مگر رام ناتھ پر اس کا مطلق اثر نہ ہوتا تھا۔ اس کے دل کے سمندر میں خیالات کی لہروں پر پرملا کی دلربا صورت تیر رہی تھی۔ مگر اس صورت میں ہمیشہ کی طرح عبادت کا جلال اور وقار نہیں تھا۔ بلکہ اس کی بجائے دماغی تردداتِ اور قلبی تاثرات کی اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا رام ناتھ کی بیقراری ترقی کرتی جاتی تھی۔ اُس نے سوچا کہ آج میرے کانوں نے مجھے دھوکہ دیا پرملا آئی اور چلی گئی۔ اسے اپنی کھلی ہوئی کتاب پر بہت غصہ معلوم ہوا کہ اسی میں مصروف ہونے کی وجہ سے وہ آج اپنے روز کے لطف سے محروم رہا۔ اُس نے کتاب بند کر دی۔ اور اُٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ اُس نے دیکھا کہ حورشمائل پرملا مندر کی سیڑھی پر پاؤں لٹکائے چپ چاپ غمگین بیٹھی ہے۔ سامنے کے سنسان میدان کی طرف اُس کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں۔ اور آنکھوں سے آنسو کے قطرے مسلسل آنچل پر ٹپک رہے ہیں۔ سامنے ڈیوڑھی کے نیچے لوٹا، تھالی پھولدانی اور پوجا کے پھول پتے رکھے ہوئے ہیں۔ رام ناتھ کو دفعتہً یقین نہیں ہوا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے سچ اور واقعہ ہے۔ کچھ دیر تک وہ پرملا کو بغور دیکھتا رہا۔ اور اُس کے خیالات کی رَو کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن ایک معنی ناآشنا مترجم کی طرح وہ پرملا کے خیالات کو نہ سمجھ سکا۔ اسے اپنی ناکامی پر بہت مایوسی ہوئی۔ اُس نے سوچا کہ اس نے آنجہانی شوہر کے درشن کے لئے اتنی پوجا پاٹ کی تھی لیکن وہ اپنے مدعا کو نہ پہنچ سکی۔ اسی سے رنجیدہ ہو کر وہ مندر کی ڈیوڑھی پر بیٹھ کر آنسو بہا رہی ہے۔

اس خیال سے پرملا کی نسبت رام ناتھ کا جذبۂ احترام اور بھی قوی ہو گیا۔ اور وہ مستقل طور پر پرملا کو دل ہی دل میں مرحبا کہنے لگا۔

صبح کی ہوا کے ایک ہلکے جھونکے سے پرملا کا آنچل نیچے کھسک گیا۔ کنیر کا ایک پھول اُس کے پاس آ گرا۔ ادھر کے آم کے درخت سے کوئل کوک اٹھی۔ پھولوں کے رس سے تسکین پا کر

ایک بھونرا اُس کی سنبلیں زلفوں کے پاس آکر گونجنے لگا اسکو دور کرنے کے لئے پرملا نے اپنے سڈول ہاتھ کو اوپر اُٹھایا اور ایک نازو انداز سے ہاتھ کو حرکت دے کر بھونرے کو الگ کر دیا۔ ہاتھ کی حرکت سے حُسن کی ایک لہر پیدا ہوکر فضا کی طرف چلی گئی۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوا کہ رام ناتھ کے کتابی لٹریچر کو صحیح ثابت کرنے کے لئے حُسن نے اپنے تمام جمال کو مندر کی ڈیوڑھی پر بیٹھی ہوئی آنسو بہانے والی دوشیزہ کی نذر کر دیا ہے ✦

فطرت کے اس پوشیدہ طنز کو نہ سمجھ کر بھی رام ناتھ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ اور وہ کچھ شرما سا گیا ✦

اتنے میں کسی کی درشت آواز سے فضا لرز گئی مکان کا دروازہ کھلا۔ بھیانک چہرا کھلے بال۔ ٹیڑھی بھویں۔ سرخ آنکھیں کانپتے ہوئے ہونٹ۔ بھاری جسم ایک ادھیڑ عورت پرملا کے پاس گرجتی ہوئی آئی۔ معلوم ہوتا تھا گویے رنگ کی "کالی" اس نازنیں دوشیزہ کو ہضم کر جانے کیلئے آموجود ہوگئی ہے ✦

اس نے آتے ہی کرخت آواز سے کہا کہ او دیوانی! اسی طرح رو رو کر تو شوہر کو کھا گئی۔ اب کس کو ہضم کرنا چاہتی ہے؟ لوٹا۔ ڈول لیکر نہانے آئی ہے۔ اسی طرح نہایا جاتا ہے؟ اتنا دن آگیا۔ انہیں کچہری جانا ہے۔ یہ یہاں بیٹھکر رو رہی ہے۔ یہاں کوئی تیرا شوہر بیٹھا ہوا ہے جو آئے گا۔ آنسو پونچھ بدبخت کہیں کی" اسی حالت میں اُس کی نگاہ اوپر کی طرف اُٹھ گئی۔ رام ناتھ اُس فیل تن کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ رام ناتھ کو دیکھ کر لمبا گھونگھٹ نکال کر پیر پٹکتی ہوئی چلی گئی۔ پرملا بھی اپنے معمول کو مختصر طور پر انجام دے کر گھر چلی گئی ✦

(۴)

میں آپ کو کس نام سے یاد کروں؟ پانچ برس کے نابالغ شوہر نے جب اپنی شدید ترین ریاضت سے ایشور کو راضی کر لیا اور ایشور اُس کے سامنے آکر موجود ہوگئے تو اس کمسن مرتاض کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس مجسمۂ نور سے کس طرح اظہار نیاز کرے۔ آخر غیب کی بات جاننے والے ایشور نے اپنے کمسن بھگت کی بے اختیاری دور کرنے کے لئے اپنے سنکھ سے اُس کے گال کو چھو کر اُسے گویا کر دیا لیکن اتنے دنوں کی سخت ریاضت کے بعد بھی مجھے کسی نے کسی طرح کی طاقت سے نہ نوازا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسمت زدہ کا سارا کیا دھرا اکارت گیا۔ یہی سبب ہے جو مجھے آج آپ کو یاد کرنے کے لئے الفاظ کے لئے ترسنا پڑ رہا ہے۔ اب یہ کمی کیا کبھی پوری ہوسکتی ہے؟

میں پندرہ دن سے مندر میں نہیں جاتی۔ میرے چچا نے ہدایت کی ہے کہ میں باہر پوجا کو نہ جایا کروں۔ وہ مجھے شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے یہ بندش کی ہے کہ میں چہار دیواری کے باہر نہ جا سکوں۔ یہ سب کیوں کیا گیا ہے؟ اس کی کہانی ذرا تفصیل سے لکھتی ہوں:۔

میرے چچا کی ایک داشتہ ہے جس کا حال میری چچی کو بھی معلوم ہے۔ وہ یہاں بھی آیا کرتی ہے۔ ایک روز اُس نے میرے حُسن و شباب کی تعریف کی اور مجھ سے ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ "سندری! یہ حُسن و جمال ایشور نے فقیری کے لئے نہیں دیا ہے بلکہ اس سے لطف اُٹھانے کے لئے دیا ہے"✦

اُس روز میں نے اُس کی بات کا کچھ جواب نہیں دیا خاموش اپنے کام میں مصروف رہی۔ کچھ دنوں کے بعد اُس

نے پھر اسی قسم کی باتیں کیں اور کسی دولتمند آدمی کا ذکر کرکے مجھے اُس کی طرف مائل کرنا چاہا۔ میں اُس کی باتوں کو برداشت نہ کرسکی اور میں نے کہا پھر ایسی باتیں کریگی تو زبان کھینچ لونگی اُس روز سے وہ میری دُشمن ہوگئی۔ وہ جب موقع پاتی ہے چچا سے میری شکایت کرنے سے باز نہیں آتی۔ اس طرح اس نے چچا کے دل میں میری بُرائی ذہن نشین کردی ہے۔ یہی وجہ ہے جو چچا اکثر مجھے ننگ خاندان کے نام سے یاد کرتے ہیں ✦

ابتک میرے چال چلن کے خلاف کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے وہ میرے متعلق کوئی بات طے نکر سکتے تھے۔ لیکن آپ کو یاد ہوگا کہ ایک روز میری بچی مجھ پر بگڑتی ہوئی مندر میں آئی اور اُس نے آپ کو کھڑکی کے پاس کھڑا دیکھ لیا اُس نے اس واقعہ کو چچا سے خوب نمک مرچ لگاکر بیان کیا جس سے چچا کے غم و غصہ کی حد نہ رہی۔ اُس روز سے اُنہوں نے مجھ پر نگرانی قایم کردی۔ جب یہ باتیں میرے چچا کی داشتہ کو معلوم ہوئیں تو اُس کی خوب بن آئی۔ اُس نے میرے اور آپ کے تعلقات کو چشم دید واقعہ کی طرح بیان کرکے یہاں تک کہدیا کہ میرے حمل ہے۔ پس ننگ خاندان کی عزّت و آبرو قایم رکھنے کے لئے میرے چچا نے طے کرلیا کہ مجھے کسی طرح زہر دیکر مار ڈالا جائے ✦

اس تجویز کو سُنکر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اگرچہ اس دُنیا میں رہکر میں نے اس کا کوئی لطف نہیں اُٹھایا پھر اس کے چھوٹنے کا مجھے بڑا صدمہ ہورہا ہے۔ پہلے میں نے سوچا کہ یہاں سے بھاگ کر کہیں چلی جاؤں۔ اور کسی طرح اپنی جان بچاؤں۔ مگر خونخوار جانوروں سے بھرے ہوئے آدمیوں کے اس جنگل میں کہاں امن سے رہ سکونگی اور اس بے مہر و بے وفا زمانے میں میرا کس طرح گذر ہو سکیگا اسلئے میں نے اس خیال کو ترک کردیا ہے۔ اب میں نے بھی یہ طے کرلیا ہے کہ میں خاندان کی عزّت و آبرو برقرار رکھنے کے لئے زہر کھالونگی۔ اس طرح گو جان چلی جائے گی مگر امن تو مل جائے گا ✦

آپ شاید یہ جانتے ہونگے کہ میں بچپن کی بیوہ ہوں۔ ماں نے مرنے سے پہلے مجھے سہاگن دیکھنا چاہا تھا۔ اسی سے بچپن ہی میں میری شادی ہوگئی تھی۔ بیاہ کے کچھ ہی دنوں بعد میرے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ مجھے اُن کی صورت سیرت کا کچھ بھی علم نہیں ہے۔ ایسی صورت میں میں کس طرح اُن کو اپنے دل میں جگہ دے سکتی تھی وہ تو پرماتما سے بھی زیادہ میرے لئے پُراسرار اور وہم خیال ہو رہے تھے۔ اس لئے میں کسی کی محبت اور پیاری باتوں کیلئے ترسنے لگی۔ میرے دل میں آپکی دلکش صورت بس گئی اور میں مندر میں جاکر آپکو پانے کیلئے پوجا کرنے لگی۔ اس جنم میں پانے کیلئے نہیں بلکہ دوسرے جنم میں پانے کیلئے کیونکہ اس جنم میں تو ہندو بیوہ کیلئے دوسری شادی دھرم کے خلاف ہے۔ میں نے آجتک آپکی طرف پوری نگاہ سے نہیں دیکھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ پاک محبت میں نفسانیت شامل نہو جائے لیکن ہمارا دل مقناطیس کی سوئی کی طرح آپکے لئے حرکت کرتا تھا۔ میں اسطرح خط لکھنے کی جرأت کبھی نہ کرتی جو آج کر رہی ہوں لیکن موت کو قریب سمجھکر دنیاوی ننگ و عار کا خیال دور کرکے میں آپکے پاس یہ خط بھیج رہی ہوں۔ اگر اپنے دلی خیالات کو آپ تک نہ پہنچاتی تو اطمینان سے اس قالب کو تبدیل نہ کرسکتی لیکن اب مجھے ایسا محسوس ہورہا ہے کہ میں ملک الموت کے خیر مقدم کیلئے سراپا مستعد ہوں۔ جسوقت یہ خط آپکے پاس پہنچیگا اُسوقت میں چتا کی آگ سے دو چار ہو رہی ہونگی میرے قصوروں کو معاف کیجیئگا" "بدنصیب پدما" خط پڑھکر رسم ناتھ سکتہ کے عالم میں خاموش آسمان کیطرف دیکھنے لگا موسم بہار کی ہوا گلدستے میں سجے ہوئے پھولوں کی خوشبو سے کمرے کو معطر کر رہی تھی ✦ ترجمہ از ہندی (ابو محمد امام الدین رامنگری)

ایک وصیّت کی تعمیل

(از جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب۔ بی۔ اے)

[بسلسلہ اشاعت گذشتہ]

برس روز ہو چکا ہے۔ مگر ابتک وہ آواز گونج رہی ہے میں نے بڑے بڑے لکچر دینے والوں کو سنا ہے۔ مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ لکچر پڑھ کر ایسا اثر پیدا کرنے والا میری نظر سے کوئی نہیں گزرا۔ کچھ تو بات تھی کہ آخر زمانے میں سرسید مرحوم اپنے اکثر لکچر انہیں سے پڑھوایا کرتے تھے۔ یا تو لکچر پڑھتے پڑھتے یہ خود منجھ گئے تھے یا یہ اُن کی خداداد قابلیت تھی جس کو دیکھ کر سرسید مرحوم نے اس کام کے لئے اُن کا انتخاب کیا تھا۔ غرض کچھ ہی ہو۔ اس میدان میں اُن کا مدِّ مقابل نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے +

اُسی روز ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ اُس کا خیال کر کے اب تک مجھے ہنسی آتی ہے۔" ۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ اس جلسے میں زندہ کیا گیا تھا۔ وہی ساز و سامان وہی کپڑے اور وہی لوگ، سو برس کے بعد پھر سامنے لائے گئے تھے۔ اسٹیج کے انتظام ہی کے لئے مولوی عبدالحق صاحب نے مجھے پکڑ بلایا تھا۔ پہلے بہروپ اور نقلیں ہوتی رہیں۔ آخر پردہ گرا اور مشاعرے کا نمبر آیا۔ تھوڑی دیر میں اسٹیج کا رنگ بدلنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ دریاں، چاندنیاں، قالین بچھانا۔ گاؤ تکیے لگانا، سامان جمانا، مشعلیں جلانا، غرض اتنا کام تھا کہ پردہ گرے گرے بڑی دیر ہو گئی۔ اور لوگوں میں ذرا ہل چل ہونے لگی۔ مجھے اُس وقت سوا اس کے اور کچھ نہ سوجھا کہ ایک چھوٹی سی تقریر کر کے اس بے چینی کو کم کروں۔ میں نے کہا "یارو! ذرا جلدی کرو۔ دیر ہو رہی ہے مزا کرکرا ہو جائے گا۔ میں باہر جا کر کچھ بولنا شروع کرتا ہوں تمہارا کام جب ختم ہو جائے تو سیٹی بجا دینا۔ میں اپنی اسپیچ ختم کر دونگا" اتنا کہہ میں جھٹ باہر پردے کے سامنے آ گیا مضمون سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس وقت یہی سمجھ میں آیا کہ اپنے مضمون کی تمہید کی ذرا مذاق میں ادا کر دوں۔ جن صاحبوں نے وہ مضمون پڑھا ہے وہ واقف ہیں کہ میں نے اس مضمون کو مولوی کریم الدین صاحب مولف "طبقات الشعراء" سے منسوب کر کے یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ مشاعرہ انہیں کے مکان پر نواب زین العابدین خاں کی مدد سے ہوا تھا چنانچہ میں نے اپنے لکچر میں ابتداءً اُس زمانے کی دہلی کا نقشہ کھینچا اور پھر مولوی کریم الدین صاحب کا پانی پت سے دہلی آنا مذاقیہ پیرائے میں بیان کیا۔ ان کی پھٹی ہوئی جوتیوں ان کے خاک آلودہ کپڑوں۔ ان کی وحشت زدہ شکل اور ان کی مفلسی کا نقشہ۔ خدا جانے کن کن الفاظ میں کھینچ گیا پھر ان کے دہلی میں آ کر تعلیم پانے مسجد کی روٹیوں پر پڑے رہنے۔ دوسروں کی مدد سے مطبع کھولنے کا ذکر کر کے یہ بتایا کہ آخر کس طرح اس

مشاعرے کی اجازت ہوئی اور کس طرح دہلی کے تمام شعراء اس میں جمع ہوئے۔ میں اسٹیج دینے میں سیدھا کھڑا نہیں رہتا کچھ ہاتھ پاؤں بھی ہلاتا ہوں نہ خدا معلوم مولوی کریم الدین کا حال بیان کرنے میں کیوں میرے ہاتھ کا اشارہ کئی دفعہ مولوی وحید الدین تسلیم کی طرف ہوگیا۔ مجھے تو معلوم نہیں مگر جلسہ میں اس نے کچھ اور ہی معنی پیدا کر لئے۔ مولوی صاحب کے والد بھی پانی پت سے دہلی آئے تھے۔ کتابوں کا بیوپار کرتے تھے۔ لوگ سمجھے مولوی کریم الدین ہی مولوی وحید الدین کے والد تھے۔ ناموں کے ایک سا ہونے نے اس خیال کو اور تقویت دی۔ اب جو ہے وہ مولوی صاحب سے پوچھتا ہے "مولوی صاحب! مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے؟" مولوی صاحب کے تاؤ کی کچھ نہ پوچھو۔ دل ہی دل میں اونٹے رہے۔ خدا خدا کر کے ڈیڑھ بجے مشاعرہ ختم ہوا۔ اسٹیج کے دروازہ سے جو نکلتا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ مولوی صاحب دیوار سے چپکے کھڑے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بپھر گئے کہنے لگے "فرحت! یہ سب تیری شرارت ہے کریم الدین کو میرا باپ بنا دیا۔" میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ بڑی مشکل سے مولوی صاحب کو ٹھنڈا کیا۔ وہاں سے لے جا کر خیمے میں بٹھایا۔ پان بنا کر دیا۔ سگریٹ پیش کیا جب جا کر ذرا نرم پڑے۔ اور واقعہ بیان کیا۔ میں نے کہا "مولوی صاحب! بھلا مجھ سے ایسی گستاخی ہو سکتی تھی۔ اوّل تو اس مذاق کا یہ موقعہ ہی کیا تھا۔ دوسرے مجھے کیا معلوم کہ آپ کے والد کون تھے۔ کہاں کے تھے۔ دہلی آئے بھی تھے یا نہیں۔ کتابیں بیچتے تھے یا کیا کرتے تھے؟" کہنے لگے "تو گھڑی گھڑی ہاتھ سے میری طرف کیوں اشارہ کرتا تھا؟" میں نے کہا "مولوی صاحب! اسٹیج دینے میں ہاتھ کا اشارہ خود بخود اسی طرح ہوتا ہے۔ اب اگر اگلی صف میں بیٹھ کر آپ اس اشارہ کو اپنے سے متعلق کر لیں تو میرا کیا قصور ہے؟" بہرحال یہ بات لوگوں کے دلوں میں کچھ ایسی جم گئی کہ مٹائے نہ مٹی۔ جب تک اورنگ آباد میں رہے ہر شخص مولوی صاحب سے یہی سوال کرتا تھا "مولوی صاحب! کیا مولوی کریم الدین صاحب آپ کے والد تھے؟" کبھی تو غصہ کر چپ ہو جاتے کبھی صرف بھڑک دیتے کبھی ہنس کر کہتے "جی ہاں میرے والد تھے، کچھ آپ کا دینا آتا ہے؟"

اورنگ آباد سے واپس آنے کے بعد میرا اُن کے ہاں آنا جانا بہت ہوگیا تھا جب کچھ لکھتا چلے اُن کو جا کر سناتا۔ بڑے خوش ہوتے۔ تعریفیں کرتے۔ دل بڑھاتے۔ ہائے اُن کے گھر کا نقشہ اس وقت آنکھوں میں پھر گیا گھر بہت بڑا تھا۔ مگر خالی ڈھنڈار۔ ساٹھ روپے مہینہ کرایہ دیتے اور اپنی اکیلی جان سے رہتے۔ نہ بال نہ بچہ۔ نہ نوکر نہ ماما۔ میں گیا۔ باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ آواز آئی "کون"۔ میں نے کہا "فرحت"۔ اسی وقت کرتہ پہنتے ہوئے آئے دروازہ کھولا۔ اندر لے گئے۔ برآمدے میں ایک بان کی چارپائی پڑی ہے دو تین تختے جڑی ٹوٹی پھوٹی کرسیاں ہیں۔ اندر ایک ذرا سی دری بچھی ہے۔ اس پر میلی چاندنی ہے۔ دو چار چیکٹ تکئے اور ایک سڑی ہوئی رضائی رکھی ہے۔ دیواروں پر ایک دو سگریٹ کے اشتہاروں کی تصویریں اور تین چار پرانے کیلنڈر لٹکے ہیں۔ سامنے دیوار کی الماری میں پانچ چھ گندی ٹوٹی چائے کی پیالیاں۔ کنارے جھڑی رکابیاں۔ ایک دو چائے کے ڈبے رکھے ہیں۔ سامنے کے کمرے میں کھونٹیوں پر دو تین شیروانیاں۔ دو تین ٹوپیاں لٹک رہی ہیں۔ نیچے دو تین پرانے گھڑ ٹنگ جوتیوں کے جوڑے پڑے ہیں۔ بیچ

مولوی صاحب کے گھر بار کا یہ خلاصہ ہے۔ مولوی صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے دو انگیٹھیاں رکھی ہیں۔ ایک پر پانی دوسری پر دودھ جوش ہو رہا ہے۔ چائے بن رہی ہے۔ خود پی رہے ہیں دوسروں کو پلا رہے ہیں۔ ایک نمک کا ڈلا پاس رکھا ہے چائے بنائی نمک کے ڈلے کو پیالی دو ایک چکر دے نکال لیا۔ بس سارے دن یہی ان کا شغل تھا۔ گھر میں برتن ہی نہیں تھے۔ کھانا کیسے پکتا اور روٹی پکاتا۔ خبر نہیں کہاں جاکر کھاپی آتے تھے کبھی میں گیا دیکھا کہ دروازے میں یہ بڑا قفل لٹک رہا ہے سمجھ گیا کہ مولوی صاحب کہیں چرنے چگنے تشریف لے گئے ہیں۔ میں نے کئی دفعہ پوچھا "بھئی مولوی صاحب! آپ کے ہاں کچھ پکتا پکاتا نہیں"۔ کہنے لگے "نہیں بھئی، میں نے تو ۔۔ توں سے کھانا چھوڑ دیا ہے۔ صرف چائے پر گزران ہے"۔ تم مانو یا نہ مانو میں تو نہیں مانتا میں نے خود اپنی آنکھوں سے اُن کو کھاتے اور خوب کھاتے دیکھا ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ اپنے گھر کا پکا نہیں کھاتے تھے۔ اور کھاتے تو کیونکر کھاتے۔ پکانے کا انتظام کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ماما رکھنی پڑتی۔ سامان منگوانا ہوتا۔ لکڑی کا خرچ تیل کا خرچ۔ نون کا خرچ۔ غرض اتنے خرچ کون اپنے سر باندھے اور اپنی بھلی چنگی جان کو بیٹھے بٹھائے روگ لگائے۔ چائے بنائی اور پی لی۔ ادھر اُدھر گئے پیٹ بھر لیا۔ گھر آئے بان کی کھرّی چارپائی پر لوٹ ماری۔ چلو زندگی کا ایک دن کٹ گیا۔ ان کی بان کی چارپائی بھی نمائش میں رکھنے کے قابل تھی۔ ننگی پیٹھ اس پر اتنا لوٹے تھے کہ بان صاف اور چمکدار ہوکر کالی اطلس ہو گیا تھا۔ ادوان خود کھینچتے تھے اور ایسی کھینچتے تھے کہ ہاتھ مارو تو طبلے کی آواز دے۔ خدا معلوم اب یہ چارپائی کس کے قبضے میں ہے۔ کسی کے پاس ہو، سونے میں تو بڑا آرام دیگی +

مولوی صاحب کو مٹھاس کا بڑا شوق تھا۔ خدا شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ اُن کے بھی یار دوست شاگرد۔ غرض کوئی نہ کوئی ان کو مٹھائی پہنچا ہی دیتا تھا۔ یہ کچھ کھاتے کچھ رکھ چھوڑتے مٹھائی کی ٹوکریوں میں جو کاغذ آتے۔ اُن کو پونچھ پانچھ صاف کر جمع کرتے جاتے۔ انہی کاغذوں پر خط لکھتے مضمون لکھتے۔ غزلیں لکھتے۔ غرض جو کچھ لکھنا پڑھنا ہوتا۔ بس انہی کاغذوں پر ہوتا۔ خدا معلوم ایسے جھر جھرے کاغذ پر یہ لکھتے کیونکر تھے +

مولوی صاحب دنیا میں کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ ہاں ڈرتے تھے تو مولوی عبدالحق صاحب سے۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ مولوی عبدالحق صاحب کے متعلق ان کی رائے معلوم کروں۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح ٹال گئے۔ تھوڑے دن اور جیتے تو پوچھ ہی لیتا۔ دوسروں کے متعلق مجھے اُن کی رائے معلوم ہے۔ اگر انہی کے الفاظ میں لکھوں تو ابھی فوجداری ہو جائے +

مولوی صاحب کو اصطلاحات وضع کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ ایسے ایسے لفظ دماغ سے اُتارتے کہ باید و شاید جہاں ثبوت طلب کیا اور اُنہوں نے شعر پڑھا۔ پڑھا اور کسی نہ کسی بڑے شاعر سے منسوب کر دیا۔ اب خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ خود اُن کا شعر ہوتا تھا یا واقعی اُس شاعر کا۔ بھلا ایک ایک لفظ کیلئے کون دیوان ڈھونڈتا بیٹھے۔ اگر کوئی تلاش بھی کرتا اور وہ شعر دیوان میں نہ ملتا تو یہ کہہ دینا کیا مشکل تھا کہ یہ غیر مطبوعہ کلام ہے۔ انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے۔ مگر انگریزی اصطلاحات پر پورے حاوی تھے۔ یہی نہیں بلکہ یہاں تک جانتے تھے کہ اس لفظ کے کیا ٹکڑے ہیں۔ ان ٹکڑوں کی اصل کیا ہے اور اس اصل کے کیا معنی ہیں۔ اس بلا کا حافظہ لے کر آئے

تھے۔ کہ ایک دفعہ کوئی لفظ سنا اور یاد ہو گیا۔ الفاظ کے ساتھ انہوں نے اس پر بھی بہت غور کیا تھا کہ انگریزی میں اصطلاحات بنانے میں کن اصولوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ انہیں اصولوں کو وہ اردو کی اصطلاحات وضع کرنے میں کام لاتے اور ہمیشہ کامیاب ہوتے۔ میری کیا اس وقت سب کی یہی رائے ہے کہ اصطلاحات بنانے کے کام میں مولوی وحید الدین سلیم اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اور اب اُن کے بعد اُن کا بدل ملنا دشوار تو کیا ناممکن ہے۔ عربی اور فارسی میں اچھی دسترس تھی۔ مگر وہ اُردو کے لئے بنے تھے اور اردو اُن کے لئے۔ خوب سمجھتے تھے۔ اور خوب سمجھاتے تھے۔ زبان کے جو نکات وہ اپنے شاگردوں کو بتا گئے ہیں یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ کالج کے لونڈے وہ مضمون لکھ جاتے ہیں جو بڑے بڑے اہلِ قلم کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتے۔ مولوی صاحب کیا مرے زبان اردو کا ایک ستون گر گیا۔ اور ایسا ستون گرا کہ اس جیسا بننا تو کجا اس حصے میں از دوار بھی لگانی مشکل ہے۔ ان کی جگہ بھرنے کے لئے دوسرے پروفیسر کی تلاش ہو رہی ہے۔ مگر عثمانیہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد لکھ رکھیں کہ چاہے اس سرے سے اس سرے تک ہندوستان چھان مارو۔ مولوی وحید الدین سلیم جیسا پروفیسر ملنا تو بڑی بات ہے۔ ان کا پاسنگ بھی مل جائے تو غنیمت اور بہت غنیمت سمجھو۔

(اُردو) فرحت اللہ بیگ

کلامِ اعظم

(از ڈاکٹر اعظم کریوی)

ملتا نہیں سکون جہانِ خراب میں — دل نے مرے پھنسا دیا مجھکو عذاب میں

پڑھکر اسے وہ پھنس گئے کس اضطراب میں — بھیجا طرہی خط مرے خط کے جواب میں

اس بات چیت سے بھی تمہیں اجتناب ہے — تم تو کچھ اور ہو گئے عہدِ شباب میں

تارِ نفس بھی کھنچ گئے دل کی رگوں کے ساتھ — سن لی صدا کسی کی جو چنگ و رباب میں

نالوں نے پچھلی رات سے بیدار کر دیا — افسوس رہ سکے نہ وہ مصروف خواب میں

دل کے گناہ اشکِ ندامت نے دھو دیئے — توبہ ہوئی قبول خدا کی جناب میں

جسکو نہ موج بحرِ محبت نظر پڑی — گویا وہ پھر رہا تھا جہانِ سراب میں

مدت کے بعد آج وہ تشریف لائے تھے — میں اُن سے بات کر نہ سکا اضطراب میں

غافل ہے کہہ دو بیٹھ کے ساحل پہ سن تو لے — کیا ذکر ہے چھڑا ہوا موج و حباب میں

مطلب یہ ہے کہ اب نہ پیام و سلام ہو — لکھا نہ اُس نے کچھ مرے خط کے جواب میں

اعظم کسی کے کھوج میں ملتا نہیں ہے چین — پھرتا ہوں میں خراب جہانِ خراب میں

اعظم

سرمایۂ تحقیق

یعنی

آرسیِ بے حجاب (بجواب) غالبِ بے نقاب

(از جناب محمد احمد صاحب یجوؔ موہانی ایم۔ اے۔ پروفیسر شیعہ کالج لکھنو)

(بسلسلہ اشاعت گذشتہ)

۲۔ ساقی کے صلائے عام پر بھی جب کوئی ہمت نہیں کرتا تو وہ افسوس کے لہجہ میں زیرِ لب کہتا ہے:۔ کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق، اور اس طرح شعر میں یہ خوبصورتی پیدا ہو جاتی ہے کہ پہلے مرتبہ صلائے عام کی آواز۔ دوسری بار حسرت کے لہجہ میں انہیں الفاظ کا اعادہ۔ یہ باتیں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں اور ساقی کی تصویر پہلے نظر آتی ہے۔ پھر اُس کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگتے ہیں اور مزہ مضمون میں جان پڑ جاتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ مرزا فاخر کے شعر میں کچھ یونہیں سا بانکپن نکلتا ہے۔ دوسرے شعر میں یعنی گر رند فنا شدند۔ الخ میں دل کو لہو کر دینے والا اثر ہے۔ اور یہ کیفیت محسوس ہونے لگتی ہے جو اس شعر میں ہے ؎

کدام مرغ اسیر از قفس صفیر کشید　　　کہ بلبلانِ ہمہ منقار از نوا بستند

اب رہا مرزا غالب کا شعر اُس میں ایسا اثر ہے جس سے دل کی رگیں ٹوٹنے لگتی ہیں۔ اس لئے کہ ساقی (یا معشوق) رندوں کی جان ساقی کو صلائے عام دینے کی ضرورت پڑے اور پھر اس دعوت کی اجابت کرنے والا کوئی نہ ہو جس کی سب مشق کرتے رہے ہوں آج وہ ایسا یوسفِ بے کارواں ہو جائے۔ اگر معشوق مراد ہو تو یہ مفہوم ہوگا کہ حسن و ادا سب بیکار ہو گئے۔ رندوں کے رنج اور ساقی کے رنج میں فرق ہے اور بہت فرق ہے۔ یجوؔ دناشاد کا یہ شعر پڑھیئے تو مرزا کے شعر کا پورا لطف آسکے

اُمنگ کا یہ رنگ ہے ہجوم رنج و یاس میں　　　کہ جس طرح کوئی حسین ہو ماتمی لباس میں

غالب　　　چھوڑوں گا میں نہ اُس بُتِ کافر کا پوجنا　　　چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

خسرو — خلق میگوید کہ خسرو بت پرستی می کند ۔ آرے آرے میکنم با خلق و عالم کار نیست

آرگس - خیال عام اور معمولی ہیں مگر اتنے قریب ہیں کہ جدائی مشکل ہے +

سُہا - گرہ بزبان +

نیچو - جب خیال عام ہیں اور معمولی تو پھر یہاں پیش کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس قدر دلی فہرست میں ایک بہر اور بڑھ گیا مگر اتنا اور کہدوں - کہ نہ چھوڑ نگاہیں اور چھوڑے نہ خلق کو ان ٹکڑوں سے غالب کے شعر کا حسن بڑھ گیا ہے +

غالب — گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر ۔ دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

عرفی — نہ کرتہی ز عطاے تو عشق میداند ۔ کہ برکرشمہ تنگ بود خلعت طور

آرگس - عرفی نے جو کہا تھا کہ ہم پر جو برق تجلائے طور نہیں گری تو یہ عطائی کوتاہی نہ تھی عشق کو یہ راز معلوم ہے کہ ہمارے جسم پر خلعت طور تنگ تھی (تھا) یعنی وہ ہمارے قابل نہ تھی۔ غالب کے یہاں خیال اس سے گھٹا ہوا ہے۔ وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ طور پر برق تجلی کیوں گری ہم پر گرتی +

سُہا - عرفی کے شعر کی غلط شرح کرنے کے بعد مسٹر موصوف فرماتے ہیں کہ غالب کے یہاں خیال اس سے گھٹا ہوا ہے وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ طور پر برق تجلی کیوں گری ہم پر گرتی +

جناب آرگس نے دوسرے مصرعہ کو نظر انداز فرما دیا۔ اگر عرفی کے شعر کے یہی معنے فرض کر لئے جائیں جو آنہوں نے بیان کئے ہیں۔ پھر بھی غالب کا خیال عرفی سے گھٹا ہوا نہیں ہے۔ کیونکہ دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر عرفی کے دوسرے مصرع کے مقابلہ کا مصرع ہے۔ گویا آپ کی تخریب (تشریح) کے باوصف بھی غالب کا شعر عرفی کے شعر سے کم پایہ نہیں +

لیکن اگر آپ کی غلط شعر فہمی (اے سبحان اللہ، اور غلط شرح کی تصحیح (یہ بھی خوب ہے) کر دی جائے تو غالب کا شعر عرفی کے شعر سے مختلف المضمون اور کہیں بہتر ثابت ہو جائیگا۔ یعنی آپ نے خلعت طور کا ترجمہ برق تجلی غلط کیا ہے۔ خلعت طور سے مراد خلعت نبوت موسوی یا خلعت پیغمبری و کلیمی ہے +

چنانچہ عرفی کہتا ہے کہ مجھے اگر نبوت نہ ملی تو اس سے عطا و موہبت کا نقص نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ خلعت نبوت میرے لئے کوتاہ تھی (تھا) گویا مجھے اس سے بہتر خلعت دیا گیا یعنی خلعت عشق، چنانچہ عشق میداند کا قرینہ اسی مطلب کی توضیح ہے

اور غالب کہتا ہے کہ خود وہ برق تجلائے طور (جس کو عرفی عطا کے لفظ سے ظاہر کرتا ہے) جو طور کو سوختہ کر سکتی ہے۔ اور خلعت نبوت و عشق عطا کرتی ہے۔ ہم پر گر پڑنی چاہئے تھی۔ کیونکہ ہمارا ہی ظرف ایسا ہے کہ ہم اس کو دل میں رکھ لیتے اور کسی کو خبر بھی نہ ہوتی - ہم طور کی طرح سوختہ (چشم بددور) نہ ہوتے اور موسیٰ کی طرح ہوش و حواس نہ کھو بیٹھتے، کہئے آرگس صاحب اب شعر کس طرح ہم مضمون ہیں اور کس کا شعر بہتر ہے +

نیچو - ان دونوں بزرگوں کی تحریر دیکھ کر منہ سے بیساختہ انا للہ و انا الیہ راجعون نکل جاتا ہے۔ بس خدا ہی رحم کرے۔ قصائد

عرفی عنقا نہیں مگر معترض و مجیب کسی کو اُس کے دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت نہ ہوئی حضرت آرگس نے فرمایا کہ عرفی کہتا ہے کہ خلعتِ طور ہمارے قابل نہ تھا۔ جناب شُہما نے فرمایا کہ خلعتِ طور سے خلعت نبوت موسوی یا خلعت پیغمبری (معلوم نہیں خلعت نبوت موسوی اور خلعت پیغمبری وکلیمی میں کیا فرق ہے) اور ارشاد کیا کہ عرفی کہتا ہے کہ پیغمبری ہمارے قابل نہ تھی۔ حالانکہ عرفی وہ کہتا ہے نہ یہ عرفی کے یہاں۔ یہ شعر ان اشعار کے بعد ہے:۔

پپیدہ دم چو زدم آستیں بشمع شعور | شنیدم ایت استفتحوا از عالم نور
بدل زشہر بزم ازل ندا آمد | کہ اے تمام وفا از رضائے ماہیں دور
نہ ہے اطاعت چنیں کہ اوب بخشے طاعت | کہ با اجازت مائی ز وصلِ ما مجور
زیادہ زیں نہ حلالست دوری از ما | اگر بحوصلہ نازی در آ ببزم حضور
طلب بیار و مترس از متاعِ منع کلیم | بساطِ عذر میار اکہ نیستی معذور
اگر بچشمۂ مقصود دستِ عشوۂ ما | شکست ساغرِ امید او بسنگ فتور
نہ کوتہی ز عطا بود عشق میداند | کہ بر کرشمۂ ما تنگ بود خلعتِ طور

اور اس کے بعد یہ شعر ہے:۔

تو در معاملۂ اہبطوا اتباع مخسر | کزنا صحیح بود بیج وسعیٔ نا مشکور
در ملاطفتِ آشنا کشا و در آ | کہ آشتی طلب است این سعیکم مشکور

متاع منع کلیم۔ لن ترانی۔ تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا +

میں ان اشعار کا مختصر مطلب عرض کئے دیتا ہوں:۔

صبح ہوتے جب میں نے عقل کی شمع گل کی یعنی استدلال سے قطع نظر کر کے مراقبہ کیا تو (مجھے ایسا معلوم ہوا) میرے دل کے کانوں میں عالم نور سے آیۂ استفتحوا کی آواز آئی۔ کہ اے سراپا دفا جو میری خوشنودی سے کوسوں دور ہے۔ کیا کہنا اس طاعت و اطاعت کا کہ میری اجازت کے ہوتے ہوئے بھی میرے وصل سے ناکام ہے۔ اس سے زیادہ دوری حرام ہے۔ اگر تجھے اپنے حوصلہ پر ناز ہے تو میری جلوہ گاہ میں آ عشق اور سچی آرزو پیدا کر اور میں نے جو کلیم (حضرت موسیٰ) سے لن ترانی کہدیا تھا اس پر تکیہ نہ کر اور یہ نہ کہہ کہ اُدھر سے صاف جواب ہو چکا ہے۔ اب کس توقع پر دیدار کی تمنا کریں اگر ہمارے عشوہ کے ہاتھوں کلیم کی امید کا ساغر چشمۂ مقصود پر سنگِ فتور سے چور چور ہو گیا (یعنی اُس کی یہ تمنا پوری نہ کی گئی) تو عشق خوب جانتا ہے کہ اس کا سبب کرم کی کوتاہی نہ تھی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے کرشمہ کے لئے خلعت طور تنگ تھا۔ طور میں اتنا تحمل نہ تھا جو ہمارے جلوہ کا متحمل ہوتا یعنی موسیٰ نے اگر دل کی آنکھ اور عشق کی نگاہ سے دیکھنا چاہا ہوتا تو اُن کی یہ آرزو ضرور پوری کی جاتی۔ اُنہوں نے اپنی قوم کے اصرار پر دیدۂ ظاہر سے دیکھنے کی تمنا کی تھی اور چونکہ میں (خدا) جسم و جسمانیات سے منزہ ہوں۔ اس لئے صاف انکار کیا گیا تھا۔ تو عشق کا در کھول اور چلا آ اور یہی اشارہ ان سعیکم

مشکور۔ بیشک (تمہاری کوشش پسندیدہ ہے) ایں کیا گیا ہے ۔

اب اہلِ انصاف نظر فرمائیں کہ عرفی کہیں بھی پیمبری کو اپنے قابل نہ سمجھنے کا نام لیتا ہے۔ یا یہ کہتا ہے کہ مجھکو خلعتِ عشق دیا گیا ہے۔ جو خلعتِ نبوت سے بہتر ہے۔ اے من چہ پیمبری سرایم و طنبورۂ من چہ بیرائی کرشمہ سازیاں نہ سمجھنے تو کیا سمجھے

غالب کہتا ہے کہ ہم بارِ امانت کے حامل ہیں۔ برقِ تجلی کا تحمل ہم کو ہو سکتا ہے۔ طور پر تجلی کی ضرورت کیا تھی۔ یہ وہی ہے جس نے تیرے بارِ امانت کے تحمل سے انکار کیا تھا۔ آخر طور پر تجلی ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ زلزلہ پیدا ہو گیا اور ایک حصّہ اُس کا جلکر سرمۂ طور بن گیا ۔

عرفی کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے مجھ سے کہا کہ لن ترانی پر نہ جا۔ سچّے دل سے تمنا کر تیری آرزو پوری کی جائیگی ۔

غالب نے بارِ امانت کے حامل اور مستحقِ تجلیات باقی ہونے کا ذکر کیا ہے اور اس کا افسوس کرتا ہے کہ تیری ایک تجلی رائیگاں گئی ۔

غالب — یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھکو زباں اور

خسرو — زہے شوخِ من ترکی و من ترکی نمیدانم — چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہانِ من

آرگس۔ دونوں مصرعوں میں ایک قسم کا فرق ہے۔ خسرو کا مصرع نہایت چُست ہے۔ اگرچہ غالب کا بھی فلسفیانہ انداز کا نہایت کامیاب مصرع ہے ۔

جنابِ تنہا۔ مُہر بہ لب ۔

بیخود۔ معلوم نہیں کہ ان دونوں شعروں میں خیال کیونکر مشترک ہے۔ حضرت آرگس کوتاہ فہم ہیں بھلا کوئی اس عبارت سے کیا سمجھ سکتا ہے کہ دوسرے مصرعوں میں ایک قسم کا فرق ہے۔ خسرو کا مصرع نہایت چُست اور غالب کا مصرع فلسفیانہ انداز کا کامیاب مصرع ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ خسرو کے مصرع میں شوخی اور بندش میں چستی ہے۔ مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ غالب کا مصرع نہایت چست کیوں نہیں۔ روانی اس کے سامنے پانی بھرتی ہے ع دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھکو زباں اور مجھے تو اس میں کہیں سے جھول نظر نہیں آتا۔ ہاں یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ غالب کے مصرع میں فلسفیانہ انداز ہے۔ یا میں فلسفہ کے معنی نہیں سمجھتا یا خدا نا کردہ حضرت آرگس نہیں سمجھتے ۔

میرے نزدیک دونوں شعر بالکل الگ الگ ہیں خسرو کہتا ہے کہ میرے چنچل معشوق کی زبان ترکی ہے۔ اور ترکی مجھے آتی نہیں۔ کیسا اچھا ہوتا اگر اُس کی زبان میرے دہن میں ہوتی کہ اپنی کہتا اُس کی سُنتا۔ ہاں اس ٹکڑے میں کہ بودے زبانش در دہانِ من میں مزے کا ایہام پیدا ہو گیا ہے ۔

غالب کہتا ہے اے میرے پروردگار وہ (معشوق) ابتک میرا مدعا نہیں سمجھے اور نہ سمجھینگے۔ اگر تو مجھکو ایسی زبان نہیں دیتا جس کا اثر اُن کے دل پر پڑے تو اُن کے دل کو بدل دے ۔

اس ایک پہلو تو یہ کہ معشوق ایسا کمسن ایسا بے پروا۔ ایسا بھولا بھالا ہے یا اُس نے ایسی تربیت میں پرورش پائی ہے کہ دلِ عشاق کی تمنا سے بےخبر ہے۔ ورنہ آج میری سمجھتا ہے نہ ابھی سمجھنے کے آثار پائے جاتے ہیں (نہ سمجھیں گے بیتابیٔ شوق نے کہلوا دیا ہے) اور عشق کو تابِ انتظار نہیں (کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک) اگر تو میری زبان میں اثر نہیں دیتا تو اُس کے دل میں شوق کے ویسے ہی جذبات پیدا کر دے جو میری جان لئے لیتے ہیں +

اس صورت میں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ جب معشوق ایسا کمسن یا سادہ دل ہے تو پھر اس دعا کے کیا معنی۔ اسکا جواب یہ ہے کہ اس دعا سے عاشق کی بیتابیٔ شوق اور تکلیف انتظار کا اندازہ ہوتا ہے ع نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غربال

۲۔ مرزا کا کلام مشکل تھا اس پر گویم مشکل وگرنہ گویم ہی نہیں سارا دیوان اور شروح دیوان غالب کی آشفتہ بیانی دال ہے۔ لوگ کے نہ سمجھنے سے تنگ آ کر یہ دعا کرتے ہیں +

نکتہ ۔ مرزا نے یہ نہیں کہا کہ جو اُن کا دل نہیں بدلتا تو میری زبان بدل دے۔ بلکہ اس کے برعکس یعنے اگر مجھے اور زبان نہیں دیتا تو اُن کو اور دل دے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اہلِ زمانہ کی نافہمی سے اتنا دل دُکھا ہے کہ اب یہ دعا نہیں کی جاتی کہ اُن کا دل بدل دے۔ بلکہ یہ کہتے ہیں کہ اس اندازِ بیان اور اس زبان سے مجھے نجات دے میں اپنی سزا کو پہنچ گیا۔ میں ایسی زبان سے درگزرا جس کے سمجھنے والے نہیں ملتے +

پہلے مطلب میں جو نہ دے مجھکو زباں اور سے یہ منشا ہوگا کہ اُس کا دل تو یہی چاہتا ہے کہ خود اُس کی زبان میں اثر ہوتا۔ کہ معشوق اس سے متاثر ہو کر رام ہوتا تو اس کا کیا کہنا تھا۔ یہ نہیں کرتا تو بلا سے اُسی کا دل بدل دے۔ بیتابیٔ شوق میری جان لئے لیتی ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو نہ دے مجھکو زباں اور سے کوئی خاص دور پیدا کرنا مقصود نہیں ہے۔ بلکہ مساوات کے معنی پیدا کرنا مقصود ہے۔ یعنی یہ نہ کر تو وہ کر +

اب ظاہر ہے کہ دونوں شعر بجائے خود ایک چیز ہیں اور نہ اسے توارد کہہ سکتے ہیں نہ سرقہ +

غالب صفائے حیرت آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر — تغیر آب برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر

در طینت فسردہ صفا ہا کدورت است — آئینہ میکند ہمہ زنگار آب را

آرگس ۔ دونوں شعر اُلجھے ہوئے ہیں سلجھائیے تو ماحصل ایک نکلیگا +

سُہا ۔ شعر دونوں سلجھے ہوئے ہیں۔ غالب جمود کے معائب بیان کرتا ہے۔ اور بیدل افسردگی کے۔ اور یہی فرق دونوں اشعار میں مابہ الامتیاز ہے +

تجزیہ۔ افسردہ طینت پست فطرت پست ہمت۔ پانی اور برسات کی ہوا سے آئینہ فولادی میں زنگ دوڑ جاتا ہے +

مرزا بیدل فرماتے ہیں پست فطرتوں اور کم ہمتوں کے لئے سامان خوبی کدورت کا باعث ہو جایا کرتا ہے۔ دیکھو آئینہ فولاد پانی کو سراپا زنگار بنا دیتا ہے یعنی پانی ہر جگہ صفائی اور سیرابی و شادابی پیدا کرتا ہے۔ مگر آئینہ فولادی کی پست فطرتی [illegible]

(بنگالی سے)

(۱)

دُنیا کے پھول

اے دُنیا میں نے تیرا پھول توڑ لیا اور اپنے سینہ سے لگایا۔ لیکن کانٹا چُبھ گیا +

دن رخصت ہوا اور رات ہوئی تو میں نے دیکھا کہ پھول مُرجھ چکا تھا۔ مگر کانٹے کی چُبھن ابھی تک باقی تھی +

اے دُنیا بہت سے نکہت بداماں پھول تیرے پاس آئینگے۔ مگر میری گل چینی کا زمانہ ختم ہو چکا۔ اندھیری رات میں میں اپنے گلاب کے پھول سے جدا ہوں۔ صرف چُبھن باقی ہے +

(۲)

دیوانہ

ایک آوارہ گرد دیوانہ۔ پارس کا متلاشی تھا۔ اُس کے پریشان بال بھورے اور خاک آلود تھے۔ اُس کا جسم صرف سایہ ہی سایہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس کے ہونٹ اس طرح بند تھے جیسے اُس کے پژمردہ دل کے بند دروازے۔ اُس کی شعلہ بار آنکھیں دو ایک شب تاب معلوم ہوتی تھیں۔ جو اپنے ہم نشین کی جویا ہوں ———

اُس کے سامنے ایک بحرِ ناپیدا کنار شور مچا رہا تھا۔ بکواس کرنے والی لہریں، پوشیدہ خزانوں کا پتہ بتا رہی تھیں۔ اور اُس احمق پر خندہ زن ہو رہی تھیں جو اُن کے معنی سمجھنے سے قاصر تھا۔ اب وہ اُمید سے کنارہ کش ہو چکا تھا لیکن اُسے اطمینان حاصل نہ تھا۔ کیونکہ اُس کا وجود ہمہ تن جستجو ہو چکا تھا۔ جیسے سمندر، آسمان کی طرف اپنے بازو پھیلا دیتا ہے کہ کسی ناممکن الحصول چیز کو حاصل کرے۔ یا جیسے ستارے کسی منزلِ مقصود کی تلاش میں چکر کھاتے رہتے ہیں۔ جو اُن کو نہیں مل سکتی۔ اُسی طرح اُس تنہا ساحل پر وہ خاک آلود، بھورے بالوں والا دیوانہ پارس کا متلاشی تھا +

ایک دن، ایک دیہاتی چھوکرا اُس کے پاس آیا اور پوچھا کہ "تم نے یہ سنہری زنجیر کہاں سے لی!" دیوانہ چونک پڑا کہ اُس کی آہنی زنجیر بدل کر سنہری ہو گئی تھی۔ یہ عالمِ خواب نہ تھا۔ لیکن وہ نہ جانتا تھا کہ یہ تبدیلی کیونکر واقع ہوئی ———

اُس نے وحشیانہ انداز سے اپنا سرپیٹ لیا۔معلوم نہیں کہاں اور کب اُس نے بے خبری میں فتح حاصل کرلی تھی۔اُس کی عادت ہوگئی تھی کہ وہ سنگریزے اُٹھاتا اور آہنی زنجیر سے مس کرتا اور بلا توجہ کئے پھینک دیتا۔کہ اُس میں کوئی تبدیلی ہوئی یا نہیں۔اس طرح اُس نے پارس پایا بھی اور گنوا بھی دیا +

آفتاب مغرب میں آشیاں نشیں ہورہا تھا۔اور آسمان پر زریں رنگ جھلک رہا تھا۔دیوانہ اُلٹے قدم واپس ہوا کہ پھر اپنا گمشدہ خزانہ تلاش کرے۔لیکن اب اُس کی طاقت جواب دے چکی تھی۔اُس کا قد جھک گیا تھا۔اُس کا دل بجھ چکا تھا۔اور اُس کی حالت ایک درخت برکندہ جیسی تھی +

(۳)

طائر

باوجودیکہ شام دھیمے دھیمے قدم اُٹھاتے ہوئے آرہی ہے۔اور اُس نے تمام نغموں کے ختم کردینے کا اشارہ کردیا ہے۔ باوجودیکہ تیرے تمام ساتھی بسیرا لینے چلے گئے ہیں۔اور تو خود بھی تھک گیا ہے۔تاریکی سے خوف برس رہا ہے۔اور آسمان کے چہرے پر نقاب پڑ چکی ہے۔

مگر اے طائر، میرا کہا مان اور اپنے پر مت جوڑ ———

یہ جنگل کی پتیوں کی تاریکی نہیں ہے۔یہ سمندر ہے جو کالے سانپ کی طرح بل کھا رہا ہے۔یہ چنبیلی کے پھولوں کا مستانہ رقص نہیں ہے۔یہ خوفناک کف ہے۔آہ وہ سیراب آفتاب، زمردیں ساحل کہاں ہے؟ جہاں تیرا آشیانہ ہے +

طائر۔اے میرے طائر۔میرا کہا مان۔اور اپنے پر مت جوڑ ———

تیرے راستے میں شب تنہائی ہے۔صبح، سایہ دار پہاڑیوں کے پیچھے محوِ خواب ہے۔ستارے سانس روکے گھڑیاں گن رہے ہیں۔چاند عمیق رات میں تیر رہا ہے +

طائر، اے میرے طائر، میرا کہا مان، اور اپنے پر مت جوڑ ———

تیرے لئے امید وبیم کی کشمکش نہیں۔کوئی لفظ نہیں۔کوئی سرگوشی نہیں۔کوئی نوا نہیں۔کوئی آشیاں نہیں۔کوئی آرامگاہ نہیں۔صرف تیرے پر تیرے مونس اور ہمدم ہیں۔یا پھر بے سراغ آسمان +

طائر۔اے میرے طائر۔میرا کہا مان۔اور اپنے پر مت جوڑ ———

(ٹیگور) عزیز احمد عثمان آبادی

نر ہے یا مادہ
حیرت انگیز قینچی
گولڈن رسٹ واچ
دودھ چھاننے کا آلہ
سینماٹوگراف
گراموفون
لڑکیوں کے لئے کپڑے کی مشین

ایک نئی ایجاد
ہزاروں کا بھرم صرف چند روپوں میں
یہ چندن ہار بالکل اصلی سونے کی مانند چمکدار سنہری ہے اور خوبصورتی میں اپنا جواب خود ہے۔ طلائی زیور کے ہمراہ یا تنہا اپنی قیمت اصلی سونے کی بتاکر محفل میں تعریف کا اعلیٰ رتبہ حاصل کرتا ہے۔ اور اپنے سنہری لباس کو ہمیشہ قایم رکھ کر اپنے مالک کی عزت کو دوبالا کرتا ہے۔ نیز گلے میں زینت دیکر صحیح اندازہ پانچسو روپیہ کا بتاتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ بہت مقبول ہے +
کیا آپ اپنی محبوب بیوی یا عزیز دختر کے لئے طلب کر کے اُنکے ارمان کو پورا کرینگے؟
قیمت قسم اول پانچروپیہ (۵)، قسم دوم تین روپے (۳)
تاجروں کے لئے خاص رعایت +
پانچسو روپیہ کا کیمیکل گولڈن چندن ہار صرف پانچروپیہ میں
چیپ واچ ہاؤس اجمیری گیٹ دہلی
چھ چندن ہار ایکدم طلب کرنیوالے کو ساتواں ایک چندن ہار مفت بطور انعام روانہ کیا جائیگا
زندگی کا بیمہ
بڑھاپے کا سہارا۔ عورت کا محافظ اور آپکے بچوں کا نگہبان ہے
یہ ہر فرض شناس انسان کیلئے ضروری ہے۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں کہ کب اس جہانِ فانی سے کوچ ہو جائے۔ یا اگر وفات نہ بھی ہو تو بڑھاپا ہر انسان کے لئے لابدی ہے۔ اس وقت روزی کا کمانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ وہ وقت انسان کے آرام کے لئے ہے۔ اس لئے اس سے پیشتر کہ آپکی عمر زیادہ ہو جائے اور آپ بیمہ کرانے کے قابل نہ رہیں۔ آپکو دور اندیشی کی نظر سے جانچ کر بیمہ کروا لینا چاہیئے۔ تاکہ اُن آفات سے جن میں ناعاقبت مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بچے رہیں +
ونیس کمپنی اعلیٰ پایہ کی بیمہ کمپنیوں میں سے ہے۔ نرخ بھی دوسری کمپنیوں سے کم ہیں مینجمنٹ نہایت اعلیٰ۔ پالیسی ہولڈروں کی تسلی ونیس کا نصب العین +
یہ ونیس کی ترقی کا مظہر ہے کہ اُنہوں نے ہر شہر اور قصبے میں اپنی برانچیں کھول دی ہیں۔ اس میں آپ بغیر پریمیم ادا کرنے کے بھی بیمہ کروا سکتے ہیں پراسپکٹس وغیرہ برانچ سکرٹری (برائے شمالی ہندوستان)
ونیس انشورنس بنک لمیٹڈ دہلی سے طلب کریں

ایڈیٹر: حکیم محمد یوسف حسن

Copies, 5,000

لت پانچ آنہ

جلد ۱۰ ایڈیٹر: حکیم محمد یوسف حسن نمبر ۳ ۷

قیمت فی پرچہ ۸ر۔ ۱۰ روپیہ کمپنی یکسال ۸ر۔ سالانہ بذریعہ وی پی مع محصول ڈاک ۵ر روپے۔ ممالک غیر سے ۸ شلنگ

نیرنگِ خیال

جولائی سنہ ۱۹۳۰ء

ایڈیٹر نمبر

(جس میں تمام مضامین حکیم محمد یوسف حسن ایڈیٹر نیرنگ خیال کے قلم سے لکھے گئے ہیں)

(اشاعت پانچہزار)

آپس کی بات چیت

بعض عوارضات زمانہ اور نیرنگ خیال کی ادارت کے فرائض ان ذمہ داریوں پر مستزاد ہیں جن میں دفتر، دواخانہ اور تصنیفات کے کام کی دیکھ بھال بھی شامل ہے۔ ایک طرف سالنامہ کی تیاری ہے تو دوسری طرف خاص نمبر کی فکر اور سب سے زیادہ یہ ہے کہ آئندہ نمبر سے نیرنگ خیال کا سائز بڑھا کر مستقل طور پر سالنامہ کے سائز ۲۲×۲۰/۸ پر کر دیا جائیگا گویا ہم اپنے خرچ میں ایک معقول اضافہ کریں گے۔ اس لئے اس کی ترتیب صوری و معنوی میں عظیم تغیر مدنظر ہے +

ان حالات میں اس نمبر کو تمام وکمال تنہا مکمل پیش کرنا صرف فضلِ خداوندی ہے۔ اس لئے اگر اس نمبر میں کچھ فروگذاشتیں یا خامیاں نظر آئیں تو درگذر فرمائیے گا +

رستم کی داستان ایک افسانہ ہے جو ہندوستان کی ایک چھاؤنی کے متعلق انگلستان کے مشہور رسالہ لندن میگزین میں شائع ہوا تھا یہ اس کا ترجمہ ہے۔ افسانہ نہ صرف دلچسپ ہے۔ بلکہ اس سے سات سمندر پار کے رہنے والوں کا اصول حکمرانی بھی واضح ہوتا ہے +

کامیڈی یا خوش انجام ڈراما کی نفسیات اردو زبان میں پہلی چیز ہے۔ یہ مضمون انگلستان میں اس قدر مقبول ہوا تھا کہ بذریعہ آلہ نشر صوت تمام بڑے بڑے کالجوں اور علمی مرکزوں میں منتشر کیا گیا تھا +

دیواروں پر کے نقش و نگار بھی اردو زبان میں پہلی چیز ہے۔ میورل پینٹنگ فن مصوری کی ایک مستقل شاخ ہے یہ مضمون بھی اس عنوان پر بالکل پہلی مرتبہ لکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا +

خودکشی کے اکیس ذرائع۔ گو مزاحیہ مضمون میرے وسیع حلقۂ تخیل سے باہر ہیں۔ پھر بھی یہ مضمون جس کی بنیاد "نفسیات" پر رکھی گئی تھی "مزاحیات" پر ختم ہوا ہے۔ اور دیگر مضامین کی طرح یہ بھی جدت کا پہلو لئے ہوئے ہے +

سنہ ۱۹۹۲ء ایک سائنٹفک مضمون تھا جس کا انجام سیاسیات پر ہوا ہے۔ اس ایک مضمون میں بہت سی دلچسپ باتیں جمع ہو گئی ہیں +

نو دپشیمانی ایک افسانہ ہے جو ہندوستانی زندگی کے ایک المناک واقعہ سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔ "ناول" کے شائقین اسے بغور مطالعہ کریں +

حور بانو۔ (ایک افسانہ بطرز ڈراما) ہے۔ یہ ایک جدت ہے۔ افسانہ کا افسانہ ہے اور کہانی کی کہانی ہے بعض احباب کا خیال ہے کہ یہ ڈائیلاگ ہے۔ بہرحال یہ دلچسپ افسانہ سپین کے ایک مشہور افسانہ نگار کے شاہکار کے تاثرات کا نتیجہ ہے اسی ڈرامہ کو افسانہ کی شکل میں لاہور کی مشہور فلم ساز کمپنی دی یونائیٹڈ پلیرز کارپوریشن کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ جس کی کارکنان کمپنی بڑے اہتمام کے ساتھ فلم بنا رہے ہیں۔ انشاء اللہ ایک ماہ تک یہ فلم مکمل ہو جائے گی۔ اور ناظرین اسے

پردۂ تصویر پر دیکھ سکینگے۔ اس ڈراما اور اس فلمی کہانی میں مناسب فرق ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مسٹر ہیرالال اور مس گلزار بائی اس فلم میں پارٹ کر رہے ہیں جن کی تصویر بھی اس افسانہ کے ساتھ شایع کی جارہی ہے +

ناظرین نیرنگ۔ خیال یہ سن کر مسرور ہونگے کہ **حور بانو** کے بعد ایڈیٹر نیرنگ خیال کے دو طبعزاد افسانے **خواب طرب** اور **ہاؤس بوٹ** بھی فلم کے لئے مرتب کر لئے گئے ہیں۔ اور یکے بعد دیگرے اُن کی بھی فلمیں بنائی جائینگی۔ یہ دونوں افسانے ہندوستان کی صنعت فلم سازی اور فلمی افسانہ نگاری میں تغیر عظیم پیدا کرنے والے ثابت ہونگے +

نیرنگ خیال کا آیندہ نمبر اس کی ترقی کا دور نیا آپ کے سامنے پیش کریگا۔ انتظار کیجئے۔ انشاءاللہ +

ایڈیٹر

سالنامہ نیرنگ خیال } سالنامہ نیرنگ خیال کی تیاریاں زور شور سے شروع ہیں۔ اس وقت تک اس کے اس کے ٹائٹل کا بلاک بنکر ہمارے پاس آچکا ہے۔ جو بہت ہی نظر فریب اور گذشتہ سال کے سالنامہ سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے۔ مضامین بھی موصول ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ بعض احباب سے خاص طور پر مضامین طلب کئے گئے ہیں انشاءاللہ سالنامہ کیا بلحاظ مضامین اور کیا بلحاظ آرٹ کے یقیناً لاجواب ہوگا۔ جن اصحاب نے پچھلے سال کا سالنامہ وی پی منگوایا تھا وہ اپنا نام درج نہ کرائیں۔ انہیں ہم خود بخود وی۔ پی کر دینگے۔ ان کے نام و پتے ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ جو صاحب کسی وجہ سے پچھلے سال کا سالنامہ خرید نہیں سکے وہ اپنا نام ضرور درج کرائیں +

سالنامہ ۱۹۳۰ء کی صرف ۵۰ کاپیاں دفتر میں باقی ہیں۔ طلب فرمالیجئے۔ بعد میں کسی قیمت کو بھی نہ ملیگا۔ سالنامہ ۱۹۲۸ء و سالنامہ ۱۹۲۹ء کی کوئی کاپی اب دفتر میں باقی نہیں +

دوشیزہ کا دوسرا ایڈیشن۔ سلسلہ تربیت الانسان کی یہ پہلی لاجواب کتاب ہے جو صنفی اور زوجی کتب ماخوذ میں مفید تسلیم کی گئی ہے۔ پہلا ایڈیشن ختم ہو چکا تھا۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن تیار ہوا ہے۔ جن اصحاب نے کتاب وی پی طلب کی تھی انکی خدمت میں گذارش ہے کہ ایک ہفتہ تک کتاب آنکی خدمتمیں پہنچ جائیگی۔ جن اصحاب نے ابھی تک یہ کتاب نہیں خریدی وہ فی الفور توجہ فرمائیں + اس سلسلہ کی دوسری کتاب صنف نازک ابھی تک زیر تیاری ہے۔ یہ ۸۰۰ سو صفحات پر مشتمل ہوگی۔ اس کے لئے شائقین کو ایک سال تک انتظار کرنا پڑیگا +
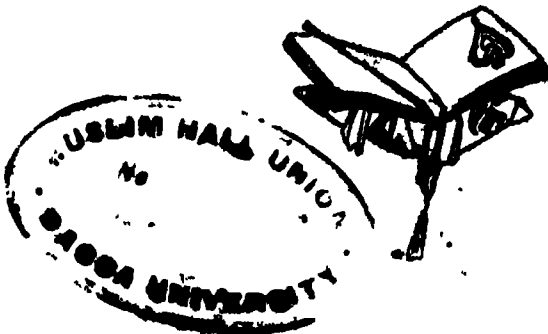
تعارف

(از جناب پروفیسر محمد دین صاحب تاثیر ایم۔اے)

ادبی رسالہ کے ایڈیٹر کے لئے ادیب ہونا لازمی نہیں۔ کئی ایسے رسالے موجود ہیں جن کے ایڈیٹر خود ایک سطر نہیں لکھتے۔ نہیں لکھ سکتے۔ لیکن میں اسے کوئی عیب تصور نہیں کرتا۔ ایڈیٹر کا کام ہے۔ اچھے برے کی پرکھ صحیح ذوقِ ادب رکھنا۔ جس طرح خوان چننے والے کے لئے ضروری نہیں کہ وہ باورچی بھی اچھا ہو۔ جیسے ذیابیطس کے معالج کے لئے اس مرض کا شکار ہونا لازم نہیں۔ اسی طرح ایڈیٹر اگر خود شاعر یا مصنف نہیں تو نہ ہو لیکن اگر کسی ایڈیٹر میں یہ دونوں خوبیاں ہوں تو بہتر ہے۔ نیرنگِ خیال کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا ایڈیٹر نبض شناس ہی نہیں۔ خود اہلِ درد میں سے ہے۔ قارئین نیرنگ کو اپنے مضامین سے بھی خوش کر سکتا ہے۔ اور انکی پسند کا انتخاب بھی کر سکتا ہے ٭

زیرِ نظر ایڈیٹر نمبر مدیر نیرنگ کی تنقیدی اور تخلیقی ہر دو صفات کا مظہر ہے۔ نیرنگِ خیال کن باتوں کیلئے مشہور ہے

تصاویر کے لئے۔ چنانچہ ایڈیٹر کا مضمون "نقوشِ دیوار" جمالیاتی تنقید کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ ساتھ تصویریں بھی ہیں تاکہ دعویٰ بلا ثبوت نہ رہے۔ ایڈیٹر خود اس بات کا معترف ہے کہ بمبئی اسکول کی تصاویر بہت اعلیٰ درجہ کی نہیں۔ مگر یہ کہنا کسقدر بجا ہے کہ وہی شوخ رنگ جو کھلی ہوا میں بھونڈے معلوم ہوں گے۔ کمرے کے اندر دیوار پر ایسے سوقیانہ نہ رہیں گے ٭

نیرنگِ خیال کی ایک خصوصیت صنفِ ڈرامہ کی ترویج ہے اس میں دوسرے رسالوں سے زیادہ ڈراموں پر تنقیدیں اور ترجمہ شدہ و طبعزاد ڈرامے چھپتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایڈیٹر کا مضمون "کامیڈی" ایڈیٹر کی ڈرامہ شناسی پر شاہد ہے۔ حکیم صاحب خود ڈرامہ لکھتے ہیں۔ زندہ سٹیج کے لئے بھی اور سنیما کے لئے۔ حور بانو جلد سیلما کے پردہ پر جلوہ فگن ہونے والا ہے ٭

نیرنگِ خیال کے افسانے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ رستم کی داستان اور زودپشیمانی دونوں لوکل کلر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی کے ترجمان ہیں۔ ایسی ایسی باتیں درج ہیں جنہیں بادی النظر میں غیر ضروری سمجھا جاتا ہے مگر وہی اصل فن ہیں ٭

نیرنگِ خیال ایک اور بات کے لئے ممتاز ہے اور وہ ظریفانہ مضامین ہیں۔ سید امتیاز علی تاج۔ میرزا فرحت اللہ بیگ۔ پطرس۔ شوکت تھانوی ایسے حضرات کے بہترین مضامین اس میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

ایڈیٹر کا مضمون خودکشی کے اکیس ذرائع بھی اسی ڈھب کی چیز ہے۔ واقعی ہنستا ہنسانا یونہی ہنسی کی بات نہیں +

حکیم یوسف حسن محض ادبی اشتغال میں ہی منہمک نہیں رہتے۔ سیاسی اور معاشرتی اصلاح کے لئے بھی کوشاں رہتے ہیں۔ ان کا ہفتہ وار اخبار تازیانہ اسی قسم کی سرگرمیوں کا آئینہ دار ہے +

سنہ ۱۹۹۰ء کا نقشہ بھی اسی قبیل سے ہے اور قارئین کے تخیل کے لئے تازیانہ کا کام دے گا۔ ہر ایک کو نئی نئی باتیں سمجھائے گا۔ اس میں قوم پرست۔ رجعت پسند۔ مذہب پرست۔ انقلابی ہر ایک سیاسی جماعت کے لئے کافی سامان غور و فکر ہے ہنسی ہنسی میں بڑے پتے کی باتیں کہہ گئے ہیں۔ کیوں نہ ہو کہنہ مشق لکھنے والے ہیں۔ ہر صنف میں پورا دخل رکھتے ہیں۔ سیاسیات۔ ظرافت۔ افسانہ۔ ڈرامہ۔ تنقید۔ غرض ع
ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا کے پورے پورے مصداق ہیں +

مجھے حکیم صاحب کے اس ارادے سے بہت خوشی ہوئی ہے۔ کہ آپ نیرنگ خیال میں مستقل طور پر نئی خوبیوں کا اضافہ کرنے والے ہیں۔ اور اس طرح دوسرے رسالوں کے لئے ایک نیا نمونہ پیش کریں گے۔ اردو صحافت کی تاریخ لکھنے والے کے لئے نیرنگ خیال کی تدریجی ترقی مشعل راہ کا کام دے گی۔ یقیناً نیرنگ خیال کی تاریخ ایک بڑی حد تک دور حاضرہ کے اردو رسائل کی تاریخ ہے +

تاثیر

تعارف

(از جناب سید امتیاز علی صاحب تاج - بی-اے)

میرے دوست حکیم محمد یوسف حسن کی ادب نوازی اور جدت پسندی نیرنگ خیال میں ہمیشہ طرح طرح کی خصوصیات پیدا کرتی رہتی ہے ◆

تاثیپ کی عدم موجودگی میں رسالے کے ظاہری محاسن کو جسقدر بھی ترقی دی جا سکتی تھی حکیم صاحب نے اسمیں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ خوشنما سرورق آرٹ اور ہنگامی دلچسپی کی تصاویر۔ تزئین نقش و نگار اور اسی قسم کی بہت سی دلاویزیوں سے پہلی مرتبہ انہوں نے ہی اردو صحافت کو آشنا کیا۔ اور بہت کم چندے میں خریداروں کو ان تمام تکلفات کا ایسا عادی بنایا۔ کہ تقریباً تمام نئے اور اکثر پرانے رسایل شائستہ اعتنا بننے کے لئے ظاہری محاسن کا ایک خاص معیار قایم کرنے کا فخر حکیم محمد یوسف حسن اور اُن کے رسالہ نیرنگ خیال ہی کو حاصل ہے ◆

مضامین و ترتیب کے اعتبار سے بھی حکیم صاحب نیرنگ خیال کو بہترین رسالہ بنانے کی پوری کوشش کرتے رہے ہیں۔ رسالوں کے معنوی محاسن کا انحصار بہت کچھ اس کے مضمون نگار معاونین پر ہوتا ہے۔ حکیم صاحب کے ذوق اور استقلال نے مشہور انشا پردازوں کو رسالے کا قلمی معاون بنا لیا ہے۔

اب وہ ایک ایسا نمبر شایع کر رہے ہیں جس میں ان کی جدت پسندی نے یہ خصوصیت رکھی ہے۔ کہ اس کے تمام مضامین خود ان ہی کے قلم سے ہیں۔ اسی قسم کا ایک نمبر چند سال ہوئے وہ پہلے بھی شایع کر چکے ہیں۔ جو بہت دلچسپی کی نظر سے دیکھا گیا تھا۔ مجھے اصولاً اس قسم کا نمبر شایع کرنا پسند نہیں ہے۔ کہ رسائل کا لطف اسی میں ہے کہ اس میں کئی مضمون نگاروں کے مضامین ہوں۔ تاہم حکیم صاحب نے اس کے مرتب کرنے اور مضامین کے اعتبار سے اسے متنوع بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کی میرے دل میں بڑی قدر ہے۔ پھر اسی قسم کے خاص نمبر کا یہ فایدہ بھی ضرور ہے۔ کہ اسے پڑھ کر خریداروں اور مضمون نگاروں کو واضح طور پر معلوم ہو سکتا ہے کہ خود ایڈیٹر کا رجحان طبیعت اور معیار قابلیت کیا ہے۔ اردو رسالے میں کس قسم کی خصوصیات ہونا ضروری سمجھتا ہے۔ اور کس قسم کا پرچہ شایع کرنا اسکا اپنا نصب العین ہے ◆

اس نمبر میں کئی علمی ادبی مضامین ہیں۔ جو حکیم صاحب کی قابلیت۔ وسعت مطالعہ۔ حسن انتخاب اور ذوق ادب پر دال ہیں۔ تین افسانے رستم کی داستان۔ زود پشیمانی اور حور یا تو ایک مزاحیہ مضمون خودکشی کے اکیس ذرایع۔ دو مختصر کامیڈی اور دیوار پر کی مصوری اور ایک سائنٹفک مضمون ۱۹۹۲ء خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ میں نے اتنی

ہم۔ گیر طبیعت نہیں پائی۔ کہ ان سب مضامین پر تفصیل سے اظہار رائے کر سکوں۔ اور حقیقت میں تنقید اس تحریر کا مقصد بھی نہیں۔

میں نے اڈیٹر نمبر کے تمام مضامین نہایت ذوق و شوق سے پڑھے۔ ان کے مطالعے سے بہت لطف اندوز ہوا۔ اس نمبر کے لئے مختلف موضوع بڑی خوش مذاقی سے جمع کئے گئے ہیں۔ اور حکیم صاحب نے اپنے مخصوص و مقبول انداز میں ان پر علاوہ تیرہ مضامین تحریر فرمائے ہیں۔ شاعری اور مصوری کی کمی انتخاب درج کر کے پوری کر دی گئی ہے اس طرح حکیم صاحب نے خریداران نیرنگ خیال کی ضیافت طبع کے لئے جو دستر خوان بچھایا ہے۔ اس کے پُر لطف ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔

مجھے اندیشہ ہے کہ اگر حکیم صاحب کی یہ جدت مقبول ہوئی اور انہوں نے اس طرح زیادہ اڈیٹر نمبر شایع کرنے شروع کر دیئے اور دوسرے رسایل کے لئے بھی ان کی تقلید کرنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ تو ہم مضمون نگار یوسف بے کارواں ہو کر رہ جائیں گے۔

سید امتیاز علی تاج

ہندوستان کے مشہور ظریف
مولانا شوکت تھانوی
کے
وہ معرکہ آرا اور ہنگامہ آفرین مزاحیہ مضامین جو ہندوستان کے مقتدر رسائل میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں مع ان غیر مطبوعہ گرانقدر مضامین کے جن میں کا ہر ایک بجائے خود شاہکار ہے
بصورت مجموعہ موج تبسم زیر طبع ہیں
آج ہی آرڈر دیجئے اس لئے کہ اسقدر زیادہ آرڈر رجسٹر ہو چکے ہیں
موج تبسم
شوکت تھانوی
جزو

رستم کی داستان

(کوہاٹ کا ایک تانگہ والا)

داناؤں کا قول ہے کہ کوئی کلیہ مستثنیات سے خالی نہیں ہوتا۔ تمہیں ایک ہی جنس کے سیاہ پرندوں میں کبھی سفید جانور بھی نظر آئیں گے۔ پولیس مین بالعموم قدو قامت اور جسمانی طاقت کے لحاظ سے گرانڈیل ہوتے ہیں لیکن بعض ان میں منحنی اور دُبلے پتلے بھی ہوتے ہیں ٹیکسی ڈرائیوروں کا پایہ عام طور پر اخلاقی پہلو سے بلند نہیں ہوتا۔ لیکن بعض ان میں اخلاق کا نمونہ مجسمہ نظر آتے ہیں +

ہمارے قصہ کا تعلق کوہاٹ چھاؤنی کے ایک تانگہ ڈرائیور سے ہے جس کی سیرت کا ایک امتیازی پہلو یہ تھا کہ اُسے اپنے ٹٹو سے بڑی محبت تھی۔ یہ ایک ایسا وصف ہے جو بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ تانگہ ڈرائیور کا نام رستم خاں تھا۔ جو ضلع پاراچنار کا رہنے والا تھا۔ رستم خاں کو اپنے تانگہ کی ظاہری حیثیت پر ناز تھا اور بجا ناز تھا۔ وہ اپنی عمر کی تقریباً ساٹھ منزلیں طے کر چکا تھا۔ ہندوستانیوں کے لئے یہ عمر بہت زیادہ سمجھی جاتی ہے۔ رستم خاں لڑکپن سے یعنی جب اُس کی عمر بارہ برس کی تھی صاحب لوگوں کو اپنے تانگہ میں بٹھایا کرتا تھا۔ اور وہ سوا لے اُن کے عام

گاہکوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتا تھا۔ جب ٹانگہ یا ٹٹو وقت اور موسم کے اثرات سے اُس کے معیار کے مطابق ناکارہ ہو جاتا تو رستم خاں اپنے پیشہ کو فروغ دینے اور اپنی شہرت کو برقرار رکھنے کے لئے فوراً دوسرا ٹانگہ یا جانور خرید لیتا تھا۔ اس طور پر اس طویل زندگی کے دوران میں خبر نہیں کتنے ٹانگے اور گھوڑے اس کے پاس آئے اور پھر دوسروں کے ہاتھ اونے پونے بک گئے لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے وہ اپنے ٹانگہ اور جانور کو بہت عمدہ حالت میں رکھتا تھا۔ لوگ رستم خاں کی غیر معمولی احتیاط اور نگہداشت کا اعتراف کرتے تھے۔ ٹانگے والے بھی اس کا نام ادب اور احترام سے لیتے تھے۔

ہر انسان کو اُس کے اچھے کام کا معاوضہ یقینی طور پر مل جاتا ہے۔ اس معاملہ میں رستم خاں زیادہ خوش نصیب نکلا۔ کیونکہ فوجی جنرل کی معمر اور متمول بیوہ نے رستم خاں کے اس وصف کا فیاضانہ طور پر اعتراف کیا کہ وہ اپنے ٹانگے اور ٹٹو کی صفائی اور نگہداشت کو اپنے دوسرے فرائض پر مقدم سمجھتا ہے۔ میم صاحب ٹانگہ کے ایسے مریل گھوڑوں کو دیکھنے کی ہرگز روادار نہ تھیں جن کی پیٹھ پر جا بجا زخم پڑ جاتے تھے۔ اور ان پر ہر وقت مکھیوں کا جھنڈ بیٹھا رہتا تھا جن کی پسلیاں نمایاں طور پر دکھائی دیتی تھیں۔ گھوڑے کیا تھے چمڑے اور ہڈیوں کا ایک نہایت گھناؤنا ڈھانچہ تھے یہ خاتون ایسے ٹانگوں میں بیٹھنا پسند نہیں کرتی تھی جن کے بدتمیز ڈرائیور بیہودہ کفایت شعاری یا سستی کی وجہ سے چرمی ساز کے بجائے میلا رسہ استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے۔ جب تک جنرل کی بیوہ کوہاٹ میں رہی۔ وہ رستم خاں کے ٹانگہ کے سوا اور کسی ٹانگہ میں نہیں بیٹھتی تھی۔ اور یہ کرایہ بھی معمولی شرح سے دگنا ادا کرتی تھی۔ جب ولایت کو روانہ ہوئی تو جانے سے پہلے رستم خاں کو ایک خوبصورت ٹانگہ اور ایک چھوٹا سا اعلیٰ نسل کا گھوڑا بطور انعام دیا۔ ٹانگہ کی خوبصورتی اور نفاست کا اس امر سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کے لیمپ چاندی کے تھے اور گدیلے نہایت مکلف۔ تمام کوہاٹ میں کسی بڑے سے بڑے آدمی کے پاس بھی ایسا ٹانگہ نہ تھا۔ جسمانی اعضا کے حسن کے اعتبار سے گھوڑا ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی بڑے رئیس یا فوجی افسر کا ہے۔ زین انگریزی ساخت کی تھی۔ جس میں سنہری بکل لگے ہوئے تھے۔ جب فیاض خاتون نے رستم خاں کو ایسا نادر اور قیمتی تحفہ دیا۔ تو وہ حیران و ششدر رہ گیا اور اُس کے دل میں قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں "میم صاحب" کا دماغ تو نہیں چل گیا لیکن جب حیرت اور استعجاب کی دم بخود کرنے والی کیفیت زائل ہو گئی تو رستم خاں نے اپنی محسنہ کا شکریہ ان آنسوؤں کی شکل میں ادا کیا جن کی ترجمانی زبان یا قلم سے نہیں ہو سکتی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ رستم خاں ہر سال اپنی محسنہ کو کرسمس کی تقریب پر کوئی نہ کوئی شے بطور تحفہ بھیجا کرتا ہے۔

سارے کوہاٹ میں رستم خاں کے ٹانگے کی دھوم مچ گئی لوگ دور دور سے اسے دیکھنے کے لئے آتے تھے۔ کوہاٹ کے سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر انڈرسن کی نئی موٹر بھی رستم خاں کے ٹانگے کے سامنے ہیچ معلوم ہوتی تھی۔ جب چھاؤنی کی صاف اور سیدھی سڑکوں پر رستم خاں کا ٹانگہ دکھائی دیتا تو لوگوں کی نگاہیں بے اختیار اس کی طرف اٹھ جاتیں۔ گو رستم خاں ایک ڈرائیور تھا۔ مگر اُس کے چہرہ سے ایک خاص شان اور تمکنت پائی جاتی تھی۔ رستم خاں کا ٹانگہ شاذ و نادر ہی سواری کے بغیر دکھائی دیتا تھا لیکن اگر کسی دن سوءِ اتفاق سے اُسے سواری نہ ملتی تو وہ خود تفریح کی غرض سے مال روڈ پر نکلتا۔

اور جب سورج کی کرنیں تانگے کے نقرئی لیمپوں پر پڑتیں اور اس کے صبار فتار گھوڑے کی ٹاپ کی آواز چلنے والوں کے لئے بجلی کا کام دیتی تو رستم خاں پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

رستم خاں اپنی اس حالت میں مست اور اس حقیقت سے بالکل بے خبر تھا۔ کہ کوہاٹ میں ایسے آدمی بھی ہیں جنہیں اس کی آسودگی اور خوشحالی کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ بڑھاپے میں اچھی خوراک آرام اور بے فکری سے رستم خاں زیادہ فربہ ہو گیا تھا اب اس میں ترچھی نگاہوں کے ناپاک اثر کو زائل کرنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ اگر وہ معاملہ فہم اور مآل اندیش ہوتا۔ تو وہ اپنے تانگے کے رنگ و روغن کو ایسا درخشاں نہ رکھتا کہ اس سے دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتیں۔ رستم خاں کے بعض ہم پیشہ بھائی اس کی نسبت یہ خیال کرتے تھے کہ اس کی قسمت کا تارا اسی طرح چمکتا رہے گا۔ لیکن جب کوہاٹ میں دو نئے گورے پرائیویٹ سنکس اور پرائیویٹ بسکنس لوم شائرس رجمنٹ میں پہنچے۔ تو رستم خاں کی قسمت کا ستارہ گردش میں آ گیا۔

جب سنکس اور بسکنس چھاؤنی کے سنیما سے بدمستی کی حالت میں نکلے تو ان کی نظر رستم خاں کے تانگہ پر پڑی۔ دونوں دوست تھے۔ گر آوارہ منش تہذیب اور شائستگی کے نام سے بالکل ناواقف تھے تو وہ سپاہی۔ مگر علی سپاہیانہ اوصاف سے بالکل معرا۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ ان میں اچھے سپاہی ہونے کا مادہ موجود تھا۔ اور عجب نہیں کہ کسی زمانہ میں حکومت اور قوم ان کی ذات پر فخر کرتی لیکن اس وقت وہ ایک ناتربیت یافتہ اور اکھڑ سپاہی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ انہیں ہندوستان میں آئے صرف چار ماہ گذرے تھے۔ وہ تمام ہندوستانیوں کو نگر (حبشی) سمجھتے تھے۔ فوجی بیرق کی پابندیوں کی وجہ سے۔ وہ گرد و پیش ملک کے حالات سے بالکل بے خبر تھے۔ انہوں نے اپنے نام نہاد وقار۔ اور عزت نفس کی شان کو برقرار رکھنے کے لئے یہ وطیرہ اختیار کر رکھا تھا۔ کہ بغیر کسی وجہ کے بھتیوں اور بھنگیوں پر اپنے غصہ کا نزلہ گرانے میں ذرا تامل نہیں کرتے تھے۔ ہر ہندوستانی کو "نگر" کہہ کر اس کے قلب پر اپنے تحکم کا سکہ جمانا اپنا دلچسپ مشغلہ سمجھتے تھے۔ ان کی کھوپڑی کچھ ایسی سخت اور ان کا دماغ کچھ ایسا بھدا واقع ہوا تھا۔ کہ انہیں اس بات کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ کہ اگر ہندوستانیوں کو "کالا آدمی" کہا جائے تو ان کے سینہ میں غیظ و غضب کا طوفان بپا ہو جاتا ہے۔

یہ تھے وہ جنٹلمین جنہوں نے سنیما کے باہر بوڑھے رستم خاں اور اس کے خوبصورت تانگے کو دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا کہ آج اس کی سواری کا لطف اٹھانا چاہئے سنکس نے تحکمانہ انداز میں کہا "بوڑھا تانگے والا ہم سواری کرنا مانگتا چلو ٹین"

رستم خاں نے گورے کی آواز سن تو لی لیکن اس کی طرف مطلق توجہ نہ کیا جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گورا کسی اور کو بلا رہا ہے۔ رستم خاں خوب جانتا تھا کہ اس کا تانگہ گوروں کی سواری کے لئے نہیں ہے۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ سوائے فوجی افسروں کے کسی کو اپنے تانگہ میں بٹھاتا۔

رستم خاں کی بے التفاتی سے گورے نے جوش میں آ کر کہا:- "یو کالا آدمی ادہر آؤ (ادھر آؤ)" دوسرے گورے بسکنس نے ان الفاظ میں اپنی زبان دانی کا ثبوت

دیا۔ "یو نو مالم (تم نہیں جانتے) میرا حکم۔ ہم تمہارا سر پھوڑ دے گا۔ ایدر آؤ۔ چلو۔ جلدی کرو (زیادہ جلدی) یو مالم مائی بات آل رائٹ"
رستم خاں نے کسی قدر تامل کے بعد جواب دیا: "میں یہاں ایک صاحب (افسر) کا انتظار کر رہا ہوں"

سمکس نے غصہ اور جوش میں آکر کہا: "ہم بھی افسر صاحب افسر۔ چلو یو کالا آدمی"
دونوں گوروں کے اس حکم کے سامنے رستم خاں کے لئے سر تسلیم خم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ گوروں کے

ناشائستہ اور اشتعال انگیز الفاظ سے غصّہ کے مارے کانپ رہا تھا مگر بڑھاپے کی وجہ سے بے بس تھا۔ اُس نے بادل ناخواستہ گوروں کو ٹانگہ میں بٹھا لیا۔ ٹینکس رستم خاں کے ساتھ آگے بیٹھ گیا۔ اور سٹنکس پیچھے۔ جس نے اپنے دونوں پاؤں گدیلے پر رکھدیئے۔ سنیما کے احاطہ سے باہر نکل کر گوروں نے بلند آواز سے گانا یا شور مچانا شروع کر دیا۔ رستم خاں

نے گوروں سے دریافت کیا کہ کیا قلعہ کو واپس جاؤ گے ؟"

سٹنکس نے کہا "ناہ۔ تم چھاؤنی مالم۔ دیکھو ہم سیر کرنا مانگتا ہم سین دیکھے گا۔ جلدی کرو۔ یو حبشی"

لیکن رستم خاں نے اپنے گھوڑے کو جو تھکا ہوا تھا معمولی رفتار سے زیادہ تیز چلانا چاہا۔ بنکس نے رستم خاں سے باگیں چھین لیں۔ اور گھوڑے کو بید مارنے شروع کر دیئے۔ گھوڑا جو اس سلوک کا عادی نہ تھا ہوا ہو گیا۔ چاندنی رات میں جبکہ سڑک بالکل صاف تھی رستم خاں گوروں کی اس بے اعتدالی پر لعنت بھیج رہا تھا۔ مگر گورے خوش تھے اور اپنے گلے کی پوری طاقت سے جھوم جھوم کر گا رہے تھے ۔

کامل ایک گھنٹہ تک گورے کوہاٹ کے گرد چکر لگاتے رہے۔ وہ ان سڑکوں سے بچتے رہے۔ جن پر رات کے وقت فوجی پولیس کا پہرہ رہتا تھا۔ روشنی گل ہونے سے قبل وہ قلعہ میں پہنچ گئے جہاں ان کی رجمنٹ متعین تھی رستم خاں نے جس کی غصہ کی شدت نے قوت گویائی سے محروم کر دیا تھا۔ بدقت تمام گوروں سے سات روپے کا مطالبہ کیا جو اس کا جائز کرایہ تھا ۔

بنکس نے لال پیلا ہو کر کہا "لعنت ہو تم پر اور تمہارے سات روپیوں پر۔ جاؤ کوئلہ کھاؤ۔ او حبشی اگر میں تمہیں تین چپیڑ دوں تو تم اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھو"

رستم خاں (ہاتھ پھیلا کر) سات روپے ٹھیک کرایہ ہے۔ اگر تم یہ رقم آج نہیں دو گے تو میں کرنل صاحب سے کہہ دونگا۔ سات روپے ٹھیک کرایہ ہے"۔

بنکس۔ (گھونسہ دکھا کر) "او حبشی اگر اب کوئی لفظ تمہاری زبان سے نکلا تو پھر تمہارے کان کی خیر نہیں"

یہ کہہ کر بنکس نے رستم خاں کو ایک بید رسید کرکے بتا دیا کہ زیادہ تکرار فضول ہے۔ رستم خاں جو فطرتاً جنگجو نہیں تھا۔ روتا ہوا واپس چلا گیا۔ دونوں گورے اس یقین کے ساتھ کہ ہم ہندوستان میں بہترین اشخاص ہیں اپنی بیرک کے کمرہ میں چلے گئے۔ جہاں وہ اپنے اس شجاعانہ کارنامہ سے خالی الذہن ہو کر سفید چوہوں کی طرح خاموش ہو گئے۔ جو ٹنگروٹ بیرک کے اندر ہو اور جو ٹنگروٹ بیرک کے باہر ہو وہ ایک دوسرے سے باعتبار سیرت بالکل مختلف ہوتے ہیں ۔

مذکورہ بالا واقعہ رستم خاں کے مصائب کے سلسلہ کی پہلی کڑی تھا۔ یہ رستم کی بدقسمتی تھی کہ اس کا تانگہ خاص و عام کی نگاہ کا مرکز بن گیا تھا۔ بنکس اور بیلنس اس کے لئے بلائے بے درماں ثابت ہوئے۔ چھاؤنی میں جہاں انہیں رستم کا تانگہ نظر آتا وہ اس میں بلا تکلف سوار ہو جاتے اور ایک پیسہ کرایہ دئے بغیر اس کی سواری کا لطف اٹھاتے ان کی اس غاصبانہ اور بے رحمانہ روش سے تانگے اور گھوڑے کو جس قدر نقصان پہنچا وہ ظاہر ہے۔ اس ستم کا بھی کچھ ٹھکانا ہے کہ نہ صرف ان گوروں نے تانگے کو اپنے باوا کی ملکیت قرار دے رکھا تھا۔ بلکہ تفنن طبع کے طور پر رستم کی ہنٹر سے خبر لیتے تھے۔ ایک دفعہ جب تانگہ پوری تیزی کے ساتھ جا رہا تھا۔ تو ایک پولیس مین نے تانگہ کا نمبر نوٹ کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غریب رستم کو بے تحاشا تانگہ دوڑانے کے جرم کی پاداش میں دس روپے جرمانہ کی سزا دی گئی۔ رستم نے عدالت میں مجسٹریٹ کو اس بات کا یقین دلانے کی کوشش کی کہ حضور ایک گورا سپاہی شراب کے نشہ میں تانگہ چلا رہا تھا" لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی مجسٹریٹ نے ہندو تھا اور پٹھانوں کو اچھا نہیں سمجھتا تھا یہ کہا کہ "تمہارا بیان ناقابل پذیرائی ہے۔ اگر دوبارہ اس جرم کا ارتکاب ہوا۔ تو لائسنس ضبط کر لیا جائے گا"۔

رستم اپنی قسمت کو روتا ہوا عدالت کے کمرہ سے نکل آیا کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ وہی رستم جو پہلے صاحب لوگوں کا

محبوب تھا۔ آج اس قدر ذلیل و خوار نظر آتا ہے۔ جاگرینڈ افسر رستم کے سرپرست اور مربی تھے وہ کوہاٹ سے چلے گئے۔ لوم ستائز میں ایک نئی رجمنٹ تھی۔ میجر انڈرسن جو پولیس کے سپرنٹنڈنٹ تھے وہ بھی کوہاٹ میں نئے نئے آئے تھے۔ پہلے پولیس افسر کے ساتھ رستم کے تعلقات بڑے اچھے تھے۔ میجر انڈرسن کی نسبت اس نے لوگوں سے یہ سن رکھا تھا کہ وہ بڑا سخت آدمی ہے۔ مگر رعایا کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہے ❖

جب رستم نے اپنے ایک دوست کو جو تانگہ والا تھا اپنے مصائب کی داستان سنائی تو اس نے رستم کو یہی مشورہ دیا کہ "سیدھا انڈرسن صاحب کے پاس جاؤ جو پہاڑ کی طرح اپنی بات پر قائم رہتا ہے۔ اور ایسا منصف مزاج ہے کہ کسی کی رعایت نہیں کرتا۔ اور اُسے اپنا تمام قصہ سناؤ۔ وہ بلاشبہ ان گوروں کو سزا دیگا جنہوں نے تمہیں اسقدر نقصان پہنچایا ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ وہ ان گوروں سے محض اس بنا پر کہ وہ اُس کے ہمقوم ہیں کسی قسم کی رعایت کریگا۔ وہ ہمیشہ سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے"

بوڑھے رستم نے اپنے دوست کے اس مشورہ پر کاربند ہونے کا تہیہ کر لیا۔ اُس نے اچھے اچھے کپڑے پہنے۔ پھولوں کا ایک ہار اپنے سفید گھوڑے کے گلے میں ڈالا۔ اور تانگہ میں سوار ہو کر کوتوالی پہنچا۔ جہاں انچارج افسر مقدمات کی سماعت کر رہے تھے۔ رستم نے میجر صاحب کو دور سے دیکھا کہ ایک لمبے قد کے دبلے پتلے آدمی ہیں۔ اُن کے بال سرخ ہیں۔ آنکھیں ایسی تیز جو انسان کی اندرونی کیفیت تک سراغ لگا لیتی ہیں۔ رستم کے دل میں قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوا کہ کاش میجر انڈرسن پہلے پولیس کمشنر کی طرح ہو جو اسقدر زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھا کہ رستم سے مذاق کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا تھا ❖

لیکن رستم کو میجر انڈرسن تک پہنچنے کی اجازت نہ ملی۔ ایک بابو نے یہ دیکھ کر کہ رستم صاحب سے ملنا چاہتا ہے اُسے دھتکار دیا اور یہ کہا کہ "صاحب اس وقت کام میں مصروف ہیں۔ اور وہ ایک تانگہ والے سے ملاقات کرنے میں اپنا وقت ضایع نہیں کرنا چاہتا" بابو کے جواب کا آخری حصہ ایجاد بندہ تھا۔ لیکن رستم اس ایجاد بندہ سے بے خبر تھا۔ وہ مایوس اور افسردہ ہو کر کوتوالی سے واپس چلا گیا۔ اور یہ خیال اُس کے دل میں بیٹھ گیا کہ اب صاحب لوگ اچھے آدمی نہیں رہے ❖

اُسی شام ٹسکن اور بکنس نے پھر رستم کے تانگہ کو پکڑ لیا اور اس پر سوار ہو گئے۔ اس مرتبہ تانگہ ایک بیل گاڑی سے ٹکرایا۔ ٹکر سے چاندی کا ایک لمپ کسیقدر ٹیڑھا ہو گیا اور گرشتہ تانگہ کا روغن اُڑ گیا۔ گوروں کی یہ ستم ظریفی قابل داد ہے کہ اُنہوں نے نہ صرف رستم کو ڈانٹ بتائی۔ بلکہ اُس کے سر پر ایک دھول جمائی۔ اور پھر اُسے دیوانہ سمجھ کر چلے گئے۔ واضح رہے کہ جب ایک دفعہ پٹھان دیوانہ ہو جاتا ہے تو اُس سے بہت جلد غیر مترقبہ حرکات سرزد ہوتی ہیں ❖

جو اصحاب اٹلی کی تاریخ کا مطالعہ کر چکے ہیں اُنہیں یاد ہو گا کہ اس ملک میں ایک ایسا دور بھی گزر چکا ہے جبکہ قاتل ایک مقررہ رقم کے معاوضہ میں اُن لوگوں کو اپنی خدمات پیش کرتے تھے جو اپنے دشمنوں سے نجات پانا چاہتے تھے۔ اس زمانہ میں ایسے قاتلوں سے کام لینا اسی طرح کا معمول تھا جس طرح کہ آج انگلستان میں کھانا پکانے یا چمنی صاف کرنے کے لئے لوگوں کو اُجرت اد

ادا کی جاتی ہے۔ اگر تم کسی ایسے شخص کے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتے ہو جو تمہارے سدِ راہ ہو تو تمہیں صرف اسقدر زحمت گوارا کرنی پڑے گی کہ ایک ایسے شخص سے ایک مقررہ رقم کے عوض معاملہ طے کر لو جس کے لئے انسان کی اس طرح جان لینا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ ایک خاص حد تک یہ رسم صوبہ سرحدی میں اسوقت بھی جاری ہے۔ اگر ایک مالدار بنیا اپنی تجارتی اغراض کی تکمیل کے لئے اپنے حریف کو موت کے گھاٹ اتارنے کا مصمم ارادہ کر لیتا ہے تو وہ اسی طریق کار کو اختیار کرتا ہے۔ جس پر آج سے چند صدی پہلے اطالوی امیر کاربند تھا۔ چھرا، گولی یا زہر یہ تمام چیزیں قیمتاً مل سکتی ہیں۔ قیمتیں قاتل کی ضرورت کے اعتبار سے کم و بیش ہوتی ہیں۔ ایک چابکدست اور ہوشیار قاتل کی اجرت لازمی طور پر ایک ناتجربہ کار یا نوآموز قاتل کے مقابلہ میں زیادہ ہوگی۔ کیونکہ دوسرے پیشوں کی طرح قتل و غارت کے پیشہ میں بھی شخصیت اور نام کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے ✦

جب رستم کے غیظ و غضب نے دیوانگی کی صورت اختیار کر لی۔ تو یہ خیال اُس کے دماغ پر مسلط ہو گیا کہ سنگس اور بیکنس کو اس دنیا سے جلد رخصت ہو جانا چاہئے لیکن اس خوفناک کام کو انجام دینے کی نہ اس میں جرأت تھی نہ طاقت۔ اور چونکہ وہ زیادہ مالدار نہ تھا۔ اس لئے اُس نے ایسے ماہر کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا جو گوروں کو واجبی معاوضہ پر ٹھکانے لگا دے ✦

وہ جانتا تھا کہ اُسے اس کام کے لئے کہاں جانا چاہئے؟ کوہاٹ میں ایک خاص گلی ہے۔ جہاں نامی بدمعاش اور چور رہتے ہیں۔ کوئی بھلا اور شریف آدمی اس گلی کا رُخ نہیں کریگا۔ فوجی پولیس کے سپاہی بھی اُس گلی سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ سرحد کے بدترین آدمی اس گلی میں اپنا ڈیرہ جماتے ہیں۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سرحدی حملوں کے منصوبے بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ باوجودیکہ قاتلوں اور ڈاکوؤں کی گرفتاری کے لئے حکومت کی طرف سے انعام مقرر ہو چکے ہیں لیکن وہ دن دہاڑے گلی میں ادھر اُدھر پھرتے ہیں۔ کیونکہ انہیں یقین ہے کہ کوئی شخص انہیں ترچھی نگاہ سے دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ یہی وہ گلی ہے جو اپنے بہت سے اسرار اور ناگہانی اموات کے لئے ایک ناقابلِ رشک شہرت حاصل کر چکی ہے ✦

رستم نے اس خوفناک گلی کا رُخ کیا تاکہ کسی ایسے شخص سے اس کا معاملہ طے ہو جائے جو اسے سنگس اور بیکنس سے ہمیشہ کے لئے نجات دلانے کا بیڑہ اٹھائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لئے وہ پچاس روپے خرچ کرنے کو تیار تھا۔ رستم ایک ڈوگرے کے پاس پہنچا۔ جس سے اس کی معمولی جان پہچان تھی۔ گلی کے وسط کے قریب اس شخص نے ہندوؤں کے لئے قیام گاہ بنا رکھی تھی۔ رستم نے ڈوگرے کو اپنی تمام کہانی سنائی اور اس سے مشورہ طلب کیا ✦

ڈوگرا (تشکک کی حالت میں) "یہ گورا لوگ ہیں اور سپاہی ہیں انہیں گولی کا نشانہ بنانے یا اُن کے سینہ میں چھرا یا فولادی پھل گھونپ دینے میں خطرہ ہے۔ اور سنا بھی جاتا ہے کہ انیڈرسن صاحب ایسا شیطان ہے کہ کوئی بات اس سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی ✦

رستم (مصر ہو کر) "کچھ ہو مگر ان ملعون گوروں کا کام تمام کر دینا چاہئے۔ اگر یہ گورے ہلاک نہ ہوئے تو بوڑھی میم صاحب کا خوبصورت تانگہ جو مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ تباہ ہو جائیگا۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں لیکن جیتے جی اس تانگے کی بربادی گوارا نہیں کر سکتا ✦

ڈوگرا۔ اگر یہ بات ہے تو سنو زہوب میں قبیلہ مخو کا ایک نوجوان ہے جسے کوہاٹ میں آئے صرف چند دن گزرے ہیں۔ پولیس والے اُسے نہیں جانتے۔ سنا ہی جاتا ہے کہ وہ ایک باغی اور ڈاکو ہے۔ جو اپنے علاقہ سے بھاگ کر یہاں پہنچا ہے۔ ایک یا دو مرتبہ میں نے اپنے مکان میں اُس سے ملاقات کی ہے۔ آج کل اُس کا کیسہ روپے سے خالی ہے۔ اس کی زبان بھی ویسی ہی تیز ہے جیسا کہ اُس کا چاقو۔ اپنی دلیری اور جانبازی کی بدولت اُس نے سب سے دوست پیدا کر لئے ہیں۔ میرے خیال میں یہ شخص یقیناً تمہارا کام کرنے پر آمادہ ہو جائیگا۔

رستم۔ "میں اُسے کہاں مل سکتا ہوں؟"

ڈوگرا۔ "شاید وہ آج شام کو اسی مکان میں آجائے لیکن پہلے تمہیں قسم کھانی چاہئے کہ تم اس معاملہ کا ذکر کسی اور شخص سے تو نہیں کرو گے۔ میں پھر تمہیں تنبیہ کئے دیتا ہوں کہ میجر انیڈرسن واقعی شیطان ہے جس سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔"

رستم نے اپنے مشیر کی ہدایت کے مطابق حلف اُٹھایا۔ اُسی شام کو رستم ڈوگرے کے مکان پر دوست سے ملا۔ زہوب کا یہ ڈاکو ایک لمبے قد کا آدمی تھا۔ جس کے چہرہ سے غیر معمولی درشتی پائی جاتی تھی۔ اُس کے دانت موتیوں کی طرح سفید تھے۔ مونچھیں اوپر کی طرف چڑھی ہوئی تھیں۔ اُس کی رفتار اور گفتار سے صاف پایا جاتا تھا کہ اسے نہ خدا کا خوف ہے نہ آدمی کا۔ شیطان کا۔ پوستین کے نیچے ہاتھی دانت کے دستہ والا خنجر اُس کی پیٹی سے لٹک رہا تھا۔ اُس کا چہرہ پگڑی سے ایسا ڈھپا ہوا تھا۔ کہ مخاطب کو صرف اُس کی چمکیلی آنکھیں دکھائی دیتی تھیں۔

رستم نے نوجوان محمود کو اپنی دردناک کہانی سنائی کہانی کے دوران میں اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے بتایا کہ اُسے اپنے نئے خوبصورت تانگے کے مل جانے سے کس قدر بے پایاں خوشی حاصل ہوئی تھی اور کس طرح صاحب لوگ جنہیں وہ اس تانگے کی بدولت اپنا دوست خیال کرتے تھے۔ ڈوگرے کوہاٹ سے رخصت ہو گئے۔ رستم نے تلخی سے کہا "یہ ہے برٹش راج کا انصاف۔ چونکہ میں بوڑھا اور غریب ہوں اور تانگے والا ہوں۔ اس لئے میری کوئی شنوائی نہیں ہوتی اگر بابو کی مٹھی گرم کرنے کے لئے میرے پاس روپیہ ہوتا تو میں اینڈرسن صاحب تک پہنچ جاتا۔ اور اُسے اپنے مصائب کی داستان سناتا۔ دو سفید چمڑی والوں کے مقابلہ میں ایک غریب تانگے والے کی بات کا کون اعتبار کرتا ہے؟ نہیں میرے خیال میں تو اس مشکل کا صرف ایک ہی حل ہے اور وہ یہ کہ ان گوروں کو ہلاک کر دیا جائے۔"

محمود۔ "بڑے میاں کیا تم نے اس بات پر بھی غور کیا ہے کہ جس قدر نقصان تمہارے تانگے کو پہنچ چکا ہے وہ دو آدمیوں کی جانوں کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتا؟ اس کے علاوہ ان گوروں کا قتل کرنا ایک خطرناک معاملہ ہے کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ تم ایک دفعہ پھر اینڈرسن صاحب کے پاس جاؤ۔ سب کہتے ہیں کہ وہ بڑا منصف مزاج ہے اور سیدھے راستہ پر چلتا ہے۔"

رستم۔ "مجھے تمہاری اس رائے سے اتفاق نہیں۔ سنو برٹش راج کا انصاف میرے جیسے غریب آدمیوں کے لئے نہیں ہے۔ گوروں کی جان لینے میں کوئی خطرہ نہیں کیونکہ تم اجنبی ہو اور پولیس تمہیں نہیں جانتی۔ خنجر کے

صرف دو وار سے قصہ ہمیشہ کے لئے پاک ہو جاتا ہے۔ کام کر چکنے کے بعد اپنا روپیہ سیو قت گنوا لو اور یہاں سے فرار ہو جاؤ۔ لیکن اگر تم ڈر گئے ہو تو پھر مجھے کسی کے پاس جانا پڑیگا ؛

محمود:۔ "اچھا تم کس قدر روپیہ دینے کے لئے تیار ہو؟"

رستم:۔ "چالیس روپے۔ اس قدر رقم سے تمہارے جیسے آدمی کا نصیبا جاگ اُٹھے گا۔"

اس کے بعد فریقین میں گفت و شنید کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ محمود نے کہا کہ "میں نے تیس روپے سے کم رقم کے معاوضہ میں کبھی کسی شخص پر خنجر کا وار نہیں کیا۔ پھر گورے کے قتل کی قیمت تو اور بھی زیادہ ہونی چاہئے۔ میں دو گوروں کے قتل کے لئے ستر روپے لونگا۔ آخر پچپن روپے پر معاملہ طے ہو گیا۔ اُنہوں نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے اور خوفناک قسمیں اٹھائیں کہ وہ ایک دوسرے کا راز افشا نہیں کریں گے ؛

پھر دونوں میں اس انتظام پر تبادلۂ خیالات ہوا کہ گوروں کا کس جگہ کام تمام کرنا چاہئے۔ اس بارے میں رستم نے پہلے ہی سب کچھ سوچ رکھا تھا۔ قرار یہ پایا کہ محمود رستم کی جگہ تانگہ چلائے اور چھاؤنی کے سینما کے باہر گوروں کا انتظار کرے۔ سنکس اور بلسکس یقیناً تانگہ میں سوار ہونگے محمود انہیں چھاؤنی کی ہوا خوری کے لئے لے جائے گا۔ تا آنکہ وہ قلعہ کی دیوار کے نیچے نیچے جائیں گے جہاں محمود ٹھہر جائے گا۔ اور اپنے کرایہ کا مطالبہ کرے گا۔ گورا لوگ حسب معمول کرایہ دینے سے انکار کریں گے۔ معاً محمود کا خنجر بجلی کی چمک کی طرح نمودار ہو گا۔ یہ چمک صرف دو دفعہ نظر آئے گی کوہاٹ کی سرزمین سے دو بے ایمانوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد محمود سرحد کی طرف بھاگ جائے گا ؛

اب رہا رستم کا معاملہ۔ قتل کے اس واقعہ سے تانگہ کا تعلق نمودار پایا جائیگا۔ اس لئے رستم کی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے عینی شہادت کا بہم پہنچانا ضروری ہو گا لیکن اس معاملہ میں زیادہ دقت پیش نہیں آئے گی۔ وہ اس امر کی شہادت پیش کریگا کہ اُس نے اپنا تانگہ اسی شام محمود کو کرایہ پر دیا تھا جیسا کہ تانگہ والے اکثر کیا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ رستم نے اپنے ڈوگرا دوست کو اس بات کی قسم کھانے کے لئے آمادہ کر لیا تھا کہ گوروں کے قتل کے وقت رستم اُس کے مکان پر تھا۔ لیکن اصلی تجویز یہ قرار پائی کہ رستم قلعہ کے قریب چھپا رہے گا۔ کیونکہ اُسے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھنا ہے کہ آیا پچپن روپے لینے سے پہلے محمود نے اپنے معاہدہ کو پورا کر دیا ہے؟

غرضکہ رستم کو اس امر کا اطمینان ہو گیا کہ اس معاملہ میں اُس پر کسی قسم کی آنچ نہیں آئے گی۔ صرف یہی بات کہ وہ ایک معمر اور کمزور آدمی ہے اور اچھے چال چلن کا ہے اسے ہر قسم کے شبہ سے محفوظ رکھے گی۔ لیکن اگر اس مہم میں خطرات دس گنا زیادہ ہوں تو وہ بھی وہ اپنا قدم اب پیچھے نہیں ہٹائے گا۔ وہ گوروں سے انتقام لینے پر تلا ہوا تھا۔ گوروں کے خلاف غصہ اور انتقام کے جوش نے اس کی دیوانگی کو جنون کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ اور جب پٹھان پاگل ہو جاتا ہے۔ تو پھر وہ نتائج اور عواقب کی کچھ پروا نہیں کرتا ؛

تصویر کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ "گورا لوگ" ان تمام حالات سے بے خبر تھے۔ رستم کے تانگے پر بلا تکلف بیٹھ جانا۔ اسے چاندنی رات میں تیز دوڑانا اور تانگے کی پوری طاقت سے گانا یا شور مچانا ان کا دلچسپ ترین مشغلہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے

"گورا لوگ" کی زندگی اسی طرح سے گزرا کرتی ہے۔ رستم سنکس اور لیکنس کے عادات و اطوار سے خوب واقف ہو چکا تھا۔ دونوں "گورا لوگ" سینما میں چارلی چپلن کا تماشہ دیکھنے کے لئے پہنچے۔ تماشے کے دوران میں انہوں نے بیر کے جام پر جام چڑھائے جب تماشہ ختم ہو چکا تو چاندنی رات میں انہیں چھاؤنی کے گرد چکر لگانے کا خیال سوجھا۔ اور جب ان کی نظر لاغر دُبلے اور سفید گھوڑے والے تانگے پر پڑی تو وہ خوشی کے مارے اچھل پڑے۔ انہیں اس تانگے سے محبت تھی۔ کیونکہ اس کی سواری سے وہ پورے طور پر لطف اندوز ہوتے تھے۔ انہوں نے تانگے کو دیکھ کر چیخنا اور چلانا شروع کر دیا۔ رستم کی نسبت انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ بید کی ضرب سے کانپ جاتا ہے۔ وہ اس کی کمزوری اور بڑھاپے سے پورا فائدہ اٹھانا اپنا حق سمجھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جب چاہتے رستم کے تانگے کو جبراً پکڑ لیتے اور اس پر اس طرح سوار ہو جاتے کہ گویا رستم ان کا نوکر ہے۔

مگر اس رات انہوں نے تانگے پر رستم کے بجائے ایک اور ڈرائیور کو دیکھا۔ نوجوان محسود نے پگڑی سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔

سنکس (محسود کو دیکھ کر) ہیلو ایک نیا حبشی۔ تمہارا باوا کیسا؟

محسود: میرا باپ بیمار ہے۔ میں ایک صاحب کے انتظار میں ہوں۔

لیکنس: اویو جھوٹا! ہم کو تمہارا جھوٹ مالم۔ تم اچھا نہیں۔ تمہارا باپ اچھا۔ تم حبشی؟ یو چلو۔ ہوا کی مافک چلو۔ جلدی جلدی مالم حبشی؟

محسود۔ "اچھا صاحب چلئے"

اس موقع پر اس امر کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کسی ہندوستانی کو "نگر" یا حبشی کہہ دینا اس کی سخت توہین ہے۔ اس رات سنکس اور لیکنس کا طرز عمل سخت ناپسندیدہ اور تکلیف دہ تھا۔ انہوں نے گھوڑے کو جو اپنی روزمرہ کی چال کے مطابق اچھی رفتار سے جا رہا تھا۔ بید سے مارنا شروع کر دیا۔ جب محسود نے بآواز بلند ان کی اس حرکت کے خلاف احتجاج کیا تو انہوں نے پہلے محسود کے سر کو زور سے جھنجھوڑا اور پھر تانگے سے پھینک دینے کی دھمکی دی۔ انہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ راہ چلتوں پر ردی اور ناکارہ چیزیں پھینکیں۔ غرضکہ ننگا پن اور شہدپن کا انہوں نے ایسا شرمناک مظاہرہ کیا کہ دیکھنے والے انگشت بدنداں رہ گئے ان کے دل میں یہ خیال سمایا ہوا تھا کہ وہ ان حرکتوں سے اپنی مردانگی اور تیس مار خانی کا ایک نمایاں ثبوت دے رہے ہیں۔ اور انسانیت کے ایک بہترین نمونہ ہیں۔ انہیں کبھی محسوس نہیں ہوا کہ ان کی ان ناشائستہ حرکتوں سے ان کی رجمنٹ اور قوم ہندوستانیوں کی نظروں میں ذلیل ہو رہی ہے۔

آخرکار گورے قلعہ کی دیوار کے پاس پہنچے۔ قلعہ کے دروازہ سے پچاس گز کے فاصلہ پر محسود نے تانگہ ٹھہرا لیا رستم بھی پاس ہی قلعہ کی کھائی میں چھپا ہوا دھڑکتے ہوئے دل سے خونیں سین دیکھنے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ اس کی سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ اس کے دشمن کیفر کردار کو پہنچ جائیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ رستم پٹھان تھا۔ اور وہ توہین اور بے انصافی کو اسی طرح محسوس کرتا تھا جس طرح ایک آزاد انسان کرتا ہے۔

محسود نے تانگہ سے اتر کر کہا "سات روپے لاؤ"

شنکس نے جواب دیا "سات روپے نہیں سات لاتیں ملینگی۔ جاؤ نہیں تو ہم تم کو اسی طرح ماریگا جس طرح تمہارے بابا کو مارا تھا" ۔

اس پر محسود نے چپکے سے پوستین میں اپنا ہاتھ ڈالا۔ اس نے اپنے جوتے ایک طرف ہٹا دیئے اور ننگے پاؤں حملہ کرنے کے لئے پینترا بدلا ۔

شنکس نے محسود کا یہ رنگ دیکھ کر کہا "تم لڑنا مانگتا؟ چلے جاؤ۔ ہم کالے آدمی کو کرایہ نہیں دینا مانگتا" اس کے بعد گورے نے محسود کو ایک بید رسید کیا۔ مگر دفعتاً واقعات نے ایک نیا رنگ اختیار کیا۔ محسود نے گورے پر وار کیا۔ خنجر سے نہیں بلکہ گھونسے سے شنکس اس کے گھونسے کی تاب نہ لاسکا اور چاروں شانے چت گر پڑا۔ شنکس نے اپنے رفیق کی مدد کے لئے بڑھا۔ مگر محسود نے اس کی کنپٹی پر اس زور سے مکا جمایا کہ وہ تیورا کر گر پڑا۔ لیکن ایک لمحہ کے بعد دونوں گورے اٹھ کھڑے ہوگئے۔ اور انہوں نے غیظ و غضب اور جوش کی حالت میں "کالے آدمی" پر پھر حملہ کیا۔

گوروں کی چیخوں سے فوجی گارڈ کی توجہ اس لڑائی کی طرف منعطف ہوگئی۔ پہلے تو گارڈ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ قتل کی واردات ہے۔ لیکن جب لوم شائر میں سے کئی گورے باہر نکل آئے اور انہوں نے یہ دیکھا کہ دو گورے ایک پٹھان پر حملہ کر رہے ہیں تو وہ اسی جگہ ٹھہر گئے۔ انکے لئے پٹھان اور دو گوروں کی لڑائی ایک دلچسپ تماشہ تھا وہ بڑے زور سے قہقہے لگا رہے تھے ۔

ایک معمر سارجنٹ نے کہا کہ "ان کتے کے پلوں کی یہی سزا ہے کہ ایک ہندوستانی ان کی خوب خبر لے۔ اب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ بازار میں بیہودہ بکواس کرنا اور رجمنٹ کو بدنام کرنا اچھا فعل نہیں ہے۔ "گڈ اولڈ جانی پٹھان"۔ انہیں اچھا سبق دے رہا ہے۔ "جانی پٹھان نہیں آگے بڑھ کر خوب رگید دو"۔

محسود نے دونوں گوروں پر گھونسوں اور مکوں کا ایسا تار باندھا۔ کہ سوائے پسپا ہونے کے ان کے لئے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ محسود کے گھونسوں اور مکوں کی اس بارش سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ مکہ بازی کے فن کا ماہر ہے۔ آخر گوشت اور خون کے یہ دو زندہ مجسمے محسود کی گھونسہ بازی کی تاب نہ لاسکے اور جب لگاتار مکوں سے ان کے سر بلبلے ہوگئے۔ تو انہوں نے اپنی عافیت اسی میں دیکھی کہ لومڑی کی طرح اپنی بیرق کی طرف بھاگ جائیں۔ اور جب وہ قلعہ کی طرف افتاں و خیزاں فرار ہو رہے تھے تو رجمنٹ کے سپاہیوں نے ان پر آوازے کسے اور شرم شرم کے نعرے بلند کئے ۔

معمر سارجنٹ نے ہنس کر کہا کہ "اب یہ گدھے یہاں کے باشندوں پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہیں کرینگے پٹھان نے انہیں اچھا سبق دیدیا ہے۔ آئندہ یہ ایسی حرکت نہیں کریں گے کہ کوئی پٹھان مشتعل ہوکر ان کی پسلیوں میں چاقو گھونپ دے۔ شاباش جانی پٹھان تم اعلیٰ درجہ کے شکاری ہو"۔

محسود نے سپاہیوں کے چیئرز کے جواب میں اپنا ہاتھ ایک خاص انداز سے ہلایا۔ اس کے بعد وہ تانگے کی طرف مڑا اور اس کا رخ پھیر کر گارڈ کی نظر سے اوجھل ہوگیا اتنے میں قلعہ کی دیوار کے سایہ سے ایک شکل نمودار ہوئی یہ رستم تھا جو خوف سے کانپ رہا تھا ۔

رستم نے پوچھا "تو کون ہے؟ تو یقیناً ہماری نسل سے نہیں ہے۔ کیا تو کوئی "افسر صاحب" ہے جس نے یہ بھیس

تمہیں اختیار کر رکھا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تو محمود نہیں ہے کیونکہ تو نے چاقو کے بجائے تلوار سے کام لیا ہے۔

محمود نے جواب دیا۔ "یہ نہ پوچھو کہ میں کون ہوں صرف اسقدر بتا دینا کافی ہے کہ میں برٹش راج کا ایک ملازم ہوں اور میرا یہ فرض ہے کہ میں غریب اور امیر دونوں کے ساتھ یکساں انصاف کروں۔ اور برٹش راج کا یہی قانون ہے۔ بڑے میاں پھر کبھی [illegible] تمام پیسے [illegible] خیال کو اپنے دل سے جدا کر دینا۔ میں صرف اس خیال سے کہ تم ایک بوڑھے آدمی ہو اور غصہ میں قتل کر چکے سو تم سے درگزر کرتا ہوں۔ ورنہ میں اس رات تمہیں اقدام قتل کے جرم میں تھانہ بھیج دیتا لیکن اب معاملہ رفع دفع ہو گیا ہے"۔ یہ کہہ کر اس نے دس دس روپے کے دو نوٹ اپنی جیب سے نکالے اور سیٹھ کے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں رکھ دیئے۔

دراصل محمود نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "چونکہ برٹش راج کے نوکروں کی بے اعتدالی کی وجہ سے تمہارے تانگے کو نقصان پہنچا ہے۔ اس لئے راج کو اس نقصان کی تلافی کرنی چاہئے۔ بڑے میاں [illegible] اب تانگے میں بیٹھ جاؤ اور چلے جاؤ۔

سیٹھ شکریہ ادا کرنے نہ پایا تھا کہ ابھی اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا کہ برٹش راج کا افسر تاریکی میں غائب ہو گیا۔ لیکن [illegible] سیٹھ پر بہت جلد یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ جس شخص نے آج ان کو دو فوجی گوروں کی [illegible] "گورہ شاہی" سے نجات دلائی وہ محمود نہیں بلکہ [illegible] تھا۔ جو رعایا کے حالات سے باخبر ہونے کے لئے ہر قسم کا بھیس بدلنے اور معاملات کی تہہ تک پہنچنے میں خاص مہارت رکھتا ہے۔

(ترجمہ)

اقوال زریں

قابلِ رشک خصوصیت

بعض لوگ اس لئے قابلِ رشک ہیں کہ دوسرے اپنا اثر ان پر نہیں ڈال سکتے۔ سوا اس صورت کے جب اول الذکر کے حق میں جلب نفع کا پہلو نکلے۔

"مارشل"

تعلیم گاہوں کی ایک خاص خوبی

یونیورسٹیاں دار العلوم کیا ہیں۔ ایک قسم کے پاگل خانے ہیں۔ جو نوجوانوں کو شرارتوں سے باز رکھتے ہیں۔

"بشپ کریٹن"

کامیڈی

"خوش انجام" ڈراما کی نفسیات

کامیڈی کیا چیز ہے ؟

یہ سوال ایک ایسا آسان فہم معمہ معلوم ہوتا ہے کہ سننے والا اس کا جواب دینے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھتا۔ وہ خیال کرتا ہے کہ یہ کوئی ایسی مشکل بجھارت نہیں جسے ایک بچہ بھی حل نہ کرسکے بعض ایسے اشخاص ہونگے جو اس کا جواب دینے میں محض اس لئے تامل کریں گے کہ شاید اس میں کوئی لفظی شعبدہ بازی ہو۔ مثلاً اکثر آدمی دوسروں کے پریشان کرنے کے لئے پوچھا کرتے ہیں کہ "قسطنطنیہ" کتنے حروف سے مرکب ہے۔ کیا تم اس کے ہجے کرسکتے ہو ؟"

ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب ہر شخص آسانی سے دے سکتا ہے لیکن جواب دینے والا اس میں کچھ نہ کچھ گھبراہٹ محض اس لئے محسوس کرے گا کہ ہو نہ ہو اس میں کوئی نہ کوئی لفظی پیچ ضرور ہے۔ ورنہ ایسا سوال ہی پیش نہ کیا جاتا +

لیکن کامیڈی کیا ہے ؟ ایک ایسا سوال ہے جو متذکرہ مثال سے بالکل مختلف ایک سنجیدہ اور ٹھوس سوال ہے۔ چنانچہ جب اس قسم کا سوال تعلیم یافتہ اصحاب کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ کہ "کامیڈی کیا چیز ہے؟" تو اس کے جواب میں ہمیں اُسی بیان کی توقع ہے جس پر تمام تعلیم یافتہ اصحاب متفق الرائے ہیں یعنی "کامیڈی ایک دل بہلانے والا ناٹک ہے جو ہمیں ہنساتا ہے۔ ہمیں محظوظ و مسرور کرتا ہے۔ اور اس کا انجام خوشی اور شادمانی پر ہوتا ہے" +

مجھے اس موقع پر یہ بھی عرض کردینا چاہئے کہ کامیڈی کی اس تعریف کو توڑ مروڑ کر اس کے مفہوم کو بدل دینا مقصو

نہیں، نہ کسی نئے مطلب کی تخلیق منظور ہے۔ میرا مدعا فقط یہ ہے کہ کامیڈی کی تعریف کے ہر دو اجزا یعنی

(الف) کامیڈی ایک ناٹک ہے جو ہمیں ہنساتا ہے۔

(ب) کامیڈی ایک ناٹک ہے جس کا انجام خوشی پر ہوتا ہے۔

ان سیدھے سادے معانی کے علاوہ اُن میں اگر کوئی محض نکتہ یا بین السطور رمز پوشیدہ ہو تو اُسکا اظہار کیا جائے۔

آئیے ہم اس مقصد کے حصول کے لئے کامل غور و تعمق سے کام لیں۔

"کامیڈی کیا چیز ہے؟"

اس سوال کے متعلق ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کامیڈی "زندگی کی ضرورتوں" "زندگی کے آرام اور آسائشوں" اور "زندگی کے عیش و طرب کے سامانوں" کی طرح ایک قسم کا مال ہے جو ہم دام دیکر خریدتے ہیں۔

کامیڈی کے خریدنے کا ایک وسیلہ یہ ہے کہ ہم وہ کتاب خریدلیں جس میں یہ طبع ہوتی ہے۔ مگر کامیڈی کے خریدنے کا رائج الوقت قاعدہ یہ ہے (اور اس کے خریداروں کی اکثریت اسی کی پابند ہے) کہ کسی تماشاگاہ کا ٹکٹ خریدا جائے اور کامیڈی کو ناٹک کے تختہ تمثیل کے جملہ لوازمات کے ساتھ ہنستی بولتی چلتی پھرتی تصویر کی حیثیت لئے ہوئے دیکھا جائے۔ پھر یہ زن و مرد یہ ایکٹرسیں اور ایکٹر قصہ کے کرداروں کا روپ دھاریں نقل کو اصل کر دکھائیں۔ اشخاص افسانہ کی چال ڈھال وضع قطع، رفتار گفتار کا ایسا صحیح عکس اتاریں کہ دیکھنے والے کو نقل پر اصل کا گمان ہو۔

حضرت انسان کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ جب وہ کسی مال کے دام دینے لگتے ہیں تو خوب سوچ بچار کرتے ہیں۔ کہ مول کے بدلے جو مال ملا ہے اُس میں کوئی دھوکا تو نہیں ہوا۔ مال کا معیار مول کی اہمیت سے ٹکر کھاتا ہے یا نہیں۔

پس جب ہم کسی کامیڈی کے لئے قیمت ادا کرتے ہیں تو لامحالہ پوچھتے ہیں کہ ہمارے روپے کا معاوضہ کافی ہے یا نہیں؟

القصہ یہی وہ اصلی سوال ہے جس کا جواب دینا اس مضمون کا مقصد ہے۔

کامیڈی کے چہارگانہ پہلو

اب دیکھئے کہ کامیڈی بیچنے والے دکاندار کی فہرست میں ضرور ہے کہ مندرجہ ذیل چار امور درج ہوں۔ یعنی

(الف)۔ یہ ایک ڈراما ہے۔

(ب)۔ یہ ایک تماشا ہے۔

(ج)۔ یہ خریداروں کو ہنسائیگا۔ انہیں مسرور و شادماں کرے گا۔

(د)۔ اس قصہ کا انجام خوشی پر ہوگا۔

لیجئے ان چار پہلوؤں سے کامیڈی پر نظر ڈالئے کیونکہ بائع و مشتری ہر دو کے نقطۂ نظر سے کامیڈی کا معیار یہی ہے۔ اب ہمیں ہر ایک سوال کو علیحدہ علیحدہ لینا چاہئے۔ اوّل یہ کہ ڈراما کسے کہتے ہیں اور وہ چیز جو "ڈراما" کہلانے کی مستحق ہے۔ اُس سے ہم کن کن خوبیوں اور خاصیتوں کا مطالبہ کرسکتے ہیں؟ اس کے جواب میں ہم سے اکثر کہیں گے کہ "ڈراما" کے لئے تعجب زا، ولولہ انگیز، حیرت خیز، اور غیر معمولی ہونا ضروری ہے۔ ادبیات سے شغف رکھنے والے جانتے ہیں کہ "ڈرامیٹک" یا اُردو

میں یوں کہئے کہ "ڈرامائی" کس چیز کو کہتے ہیں۔ مثلاً اخبارات
میں اکثر یہ عنوان دیکھنے میں آتا ہے "مفرور دھوکے
باز ہندوستانی ملکہ تپی کی حیرت خیز گرفتاری ایران میں"
یہاں حیرت خیز سے مراد وہی ڈرامیٹک یا ڈرامائی ہے
اور حیرت خیز اس لئے لکھا گیا کہ یہ گرفتاری اسقدر اہم
تھی سنسنی پھیلانے والی تھی اور مزید برآں غیر متوقع
تھی۔کہ عامۂ خلائق۔کے دلوں کے لئے ایک خاص
جاذبیت رکھتی تھی۔اسی طرح اخبار میں جلی قلم سے لکھے
ہوئے اس عنوان پر غور کرو:۔"کروڑ پتی جوہری
لاکھوں روپے کے جواہرات لے اُڑا" اس کا دوسرا
عنوان بالمحالہ یہ ہوگا:۔"ایک تعجب انگیز واقعہ"+

یہاں تعجب انگیز "ڈرامائی" کے معنی میں استعمال
کیا گیا ہے یعنی ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا ہے جو
یکایک لوگوں کو حیرت میں ڈالتا ہے اور حقیقت میں
غیر معمولی ہے +

ایک اور مثال سے "ڈرامائی" کا مفہوم زیادہ
واضح ہوگا۔کرکٹ کی ایک ٹیم جو اپنی ہوشیاری چابکدستی
اور مہارت میں مشہور تھی ایک دوسری ٹیم سے جو بدرجہا
کمزور تھی ہار جاتی ہے۔اس واقعہ کا عنوان اخبار نویس
یوں لکھتا ہے :۔

"پنجاب یونین کی سنسنی خیز فتح"
"لاہور کلب کی حیرت انگیز شکست"

مطلب اس سے یہ ہے کہ ایک کرکٹ میچ کا انجام
بالکل خلاف توقع ہوا جس سے لوگ ششدر ہو گئے۔
کھیل کے دوران میں ان کے دل دھڑکنے لگتے تھے۔
جب کمزور ٹیم کا گیند پھینکنے والا طاقتور ٹیم کے سب سے
بڑے کھلاڑی کو وہی چار منٹ میں آؤٹ کر کے
کھیلنے سے معذور کر دیتا تھا۔تو حاضرین یکایک دیکھتے
تھے کہ انہوں نے بلا ارادہ اپنی سانس روک لی اور
آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کھیلنے والوں کی طرف دیکھنے لگے۔

الغرض ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ڈرامانویس نے ہمیں ڈراما
نہیں دیا تاوقتیکہ اس نے کوئی ایسی چیز مہیا نہیں کی
جس نے ہمارے دل و دماغ کو برانگیختہ نہ کیا ہو۔اگر
اس نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جو سنسنی خیز نہ تھی جس
سے ہمارے رونگٹے کھڑے نہیں ہوئے۔جس سے
ہم گویا پسینہ پسینہ نہیں ہو گئے اور جس کے واقعات کے
اُتار چڑھاؤ نے ہمیں کہانی کے انجام کی پیشین گوئی کرنے
میں ذرہ برابر مدد نہیں دی تو ہمیں اپنی قیمت کے عوض
ڈراما وصول نہیں ہوا۔اگر ہم دوران ڈراما میں تذبذب
واضطراب امید و بیم اور پس و پیش کا شکار ہوتے رہتے
تو البتہ یہ ڈراما ہوتا۔نتیجہ یہ ہوا کہ اگر ہم دو روپیہ صرف
کریں تو اس قسم کی بیقراری اور ولولہ انگیزی جس کا اوپر
ذکر ہوا زیر بحث ضرور ہونی چاہیئے +

ڈراما کی خوبیوں کا پتہ لگانے کے لئے غالباً یہ غیر موزوں
نہ ہوگا بلکہ بہت درست ہوگا۔اگر ہم اپنی نبض کی حرکات
کی کمی و بیشی کا تخمینہ کریں اور یوں ڈراما کی قوت تاثیر کا
اندازہ لگائیں۔قصہ مختصر ہماری کامیڈی میں ڈراما کے
نقطۂ نگاہ سے ایک کامیاب پلاٹ ہونا چاہیئے جس میں
مطلوبہ قسم کا تذبذب۔برانگیختگی۔ولولہ انگیزی ہو۔اس قسم
کی تجارت نہ صرف ناٹک نویس ہی کرتے ہیں بلکہ دوسرے
اشخاص بھی اس جنس کے تاجر ہیں۔مثلاً افسانہ نگار چنانچہ
ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ناٹک نویس اور افسانہ نگار کے ہاں
جو سنسنی اور کشمکش فروخت ہوتی ہے ان میں فرق کیا ہے؟
ناٹک نویس زیادہ دام اور افسانہ نگار کیوں کم رقم وصول

کرتا ہے۔ آخر ڈراما لکھنے والے نے اپنی قوت تاثیر میں کونسی خصوصیت رکھی ہے کہ ہمیں افسانہ نگار کے کام پر ترجیح دینے کا ارشاد ہوتا ہے۔ اس سوال کا جواب کیا ہے؟ کامیڈی کی کامیابی کی دوسری شرط پر بحث افسانہ نگار اور ڈرامہ نویس جس میں کامیڈی لکھنے والا شامل ہے۔ گو اپنی اپنی جگہ ولولہ انگیزی اور برانگیختی کے لئے کوشش کرتے ہیں مگر ڈراما نویس اس کام کو ایک خاص طریق سے کرتا ہے اس کی کہانی پڑھی نہیں جاتی۔ بلکہ دیکھی اور سنی جاتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ افسانہ نویس کی کہانی اگر خاموش کہانی ہے تو ڈراما نویس کی کامیڈی ایک مکمل ہوبہو قصہ کی تمثیل معلوم ہوتی ہے۔ جبھی تو ان تمام کہانیوں کو جو تختہ ناٹک پر کھیل کر دکھائی اور سنائی جاتی ہیں اور جن کا مدعا اصل واقعہ کی صحیح تصویر دکھانا ہوتا ہے۔ ان سب کو "پلے" (PLAY) یا کھیل کہتے ہیں ⁘

ڈراما اور پلے میں فرق

اس بحث سے ظاہر ہوگا کہ لفظ "ڈراما" "ڈرامیٹک یا ڈرامائی" نظم اور نثر قصہ اور ناٹک سب پر حاوی ہے بشرطیکہ اُن میں ڈراما کی خوبیاں ہوں جن کا ذکر کیا گیا۔ موجود ہوں۔ لیکن "پلے" "کھیل" اصطلاح میں صرف اُس کہانی کی نسبت استعمال کر سکتے ہیں جو تختہ ناٹک یا سٹیج پر کھیلی جائے۔ اس میں شبہ نہیں۔ بعض اوقات لفظ ڈراما کو لفظ پلے کے مرادف کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ بلکہ بالعموم خاص و عام ڈراما اور پلے میں چنداں فرق نہیں سمجھتے۔ اور ہر اُس قصہ کو جو سٹیج پر لایا جاتا ہے۔ ڈراما یا پلے کہدیتے ہیں۔ اس قسم کے استعمال میں مضائقہ بھی نہیں۔ کیونکہ جب کھیل یا "پلے" پر "ڈراما" کا اطلاق کیا جاتا ہے تو ہر ذی فہم سمجھتا ہے کہ سٹیج کے قصہ کا ذکر ہے ⁘

کامیڈی کی دوسری شرط پر مزید بحث

اب اصل مطلب کی طرف رجوع کیا چاہئے۔ یہ ہم کہہ چکے ہیں کہ کامیڈی کے لئے لازم ہے کہ وہ ڈراما کی طرح قوت تاثیر سے بھرپور ہو۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ کامیڈی اور کتابی کہانی میں فرق یہ ہے کہ کامیڈی زندہ زن و مرد کے ذریعہ سٹیج پر دکھائی اور سنائی جاتی ہے۔ مگر ہم نے یہ سوال اُٹھایا تھا۔ کہ کامیڈی دوسری کہانیوں کی نسبت مجسّم دموں کیوں بجتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جو کامیڈی سنسنی خیز ہوتی ہے۔ مگر کتابی کہانی سے بڑھ کر اس میں قوت تاثیر بھی ہوتی ہے۔ وجہ یہ کہ جب زن و مرد کہانی کے کرداروں کا روپ دھار کر سٹیج پر "ایکٹ" "عمل" کررہے ہوتے ہیں تو اس ایکٹ کی نوعیت اور خاصیت ہی ایسی ہوتی ہے کہ قدرتاً دیکھنے والے کے دل و دماغ پر کتاب پڑھ لینے کی نسبت زیادہ بہتر اثر ہوتا ہے۔ مثلاً قصہ کے ممدوح یا ہیرو کی جان کے درپے ایک نالائق شخص ہے جسے انگریزی اصطلاح میں ولین (VILIAN) کہتے ہیں۔ اب یہ واقعہ بجائے خود کافی سنسنی خیز ہے۔ خواہ کتاب میں ہو۔ خواہ سٹیج پر۔ مگر افسانہ نگار ہمارے ساتھ اس امر کا ذکر کرسکتا ہے۔ لیکن ناٹک نگار یا کامیڈی نویس ایک بہتر طریق اختیار کرے گا۔ وہ جیتا جاگتا ممدوح اور چلتا پھرتا دشمن دونوں کو سٹیج پر لا کھڑا کرے گا۔ پھر ہم اپنی آنکھوں سے اُن کی حرکات دیکھیں گے اور اپنے کانوں سے اُن کے جذباتِ تنفر کو سنینگے کہ دشمن کس طرح ممدوح کی جان لینے کے لئے سازشیں کررہا ہے۔ اور کیسے کیسے جال پھیلا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کیفیت کے دیکھنے سے

اور ان باتوں کے سننے سے ہمارے دل پر کہانی پڑھنے کی نسبت زیادہ اثر ہوگا +

اب ایک قدم اور آگے بڑھایئے اور دیکھئے کہ جب قتل کی کوشش عمل میں آرہی ہوتی ہے تو ہم نہ صرف "دشمن" یا "رقیب" کی باتیں سنتے ہیں۔ بلکہ وہ ساتھ ہی ساتھ جو کام کرتا ہے اُسے بھی دیکھتے ہیں۔ وہ جوش میں آکر بتا جاتا ہے کہ میں یہ کرونگا میں وہ کرونگا۔ اور ساتھ ہی اپنی جوتی کے تلے پر گھسا کر چھری تیز کرتا ہے۔ اس طرح جو کچھ وہ کہہ رہا ہے اور جو کچھ وہ کر رہا ہے یہ دونوں ضروری چیزیں مل کر ہمیں زیادہ بیقرار کرتی ہیں۔ اسی واقعہ کو اور بھی اہمیت اور جذبہ آفرینی کی طاقت حاصل ہوتی ہے جب ہم اُس ماحول کو دیکھتے ہیں جس میں یہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ مثلاً "رقیب کینہ ور" آمادۂ قتل ہے۔ چھری تیز کر رہا ہے لیکن دیوار کی آڑ میں پولیس کا افسر ہتھکڑی لئے کھڑا ہے جو قتل کی واردات نہ ہونے دیگا "دشمن" کو اُس کے فعل بد سے پہلے ہی گرفتار کرلے گا۔ ہم آپ تماشائیوں میں بیٹھے ہیں۔ ہمیں علم ہوگیا ہے۔ کہ اب رقیب کی خیر نہیں۔ لیکن آخر الذکر اُس تلوار سے بالکل بے خبر ہے جو اُس کے سر پر لٹک رہی ہے اور کوئی دم میں گرا چاہتی ہے۔ اس ماحول نے کوشش قتل کے واقعہ کو اور بھی زیادہ سنسنی خیز تعجب زا بنا دیا +

اس کے یہ معنی ہوئے کہ اُن دو روپے کے عوض جو ہم نے تمثیل کنندہ کو دیئے۔ ہمیں افسانہ نویس کی پیدا کی ہوئی برانگیختی سے کہیں زیادہ سیری حاصل ہوئی مگر اس کی وجہ کیا تھی؟ ڈراما نگار کے پاس وہ دو بھیا۔ وسائل اور وہ دو ذرائع موجود ہیں جس سے بیچارا افسانہ نگار محروم ہے یعنی سٹیج اور ایکٹر +

یہ صحیح ہے کہ ڈراما نویس کو افسانہ نگار پر اس لئے فوقیت حاصل ہے کہ اوّل الذکر کے پاس سٹیج ہے۔ ایکٹر ہیں۔ ناٹک نگار بجا طور پر ان ہر دو کو اپنی تجارت کا جزو لاینفک سمجھتا ہے۔ اور اپنی ساری کامیابی کا سبب انہیں ٹھیراتا ہے۔ مگر واضح ہو کہ ناٹک نویس اپنے کو ناٹک نویس بتاتا ہے نہ کہ "مصور" ناٹک نویس چاہتا ہے کہ وہ تصویریں (جیتے جاگتے۔ چلتے پھرتے زن و مرد کے ذریعے) جو وہ ہمیں دکھاتا ہے۔ ہم اُنہیں دیکھ کر خوش ہوں اس موقعہ پر اگر ہمیں منظور ہے کہ اپنے روپیہ کا معاوضہ کافی و وافی حاصل کریں تو ہمیں بہت ہوشیار ہونا پڑیگا +

نفسیات سے تو آپ واقف ہیں ہی کہ اس کے ماہرین انسان کے دل و دماغ کی کیفیت۔ اُس کے جذبات کا مد و جزر اُس کی خواہشات کی تخلیق اور اُن کی موت ان سب کی بوقلمونیاں ایسی خوبی سے دکھاتے ہیں کہ ہمیں حیات انسانی کے رموز سے آگاہی حاصل ہوتی اور کتاب حیات کی ورق گردانی میں لطف حاصل ہوتا ہے +

پس معلوم ہوا کہ ہمارے کامیڈی نویس کے لئے یہی کافی نہیں کہ اپنے ممدوح (ہیرو) اور اُس کے رقیب کے درمیان شمشیر آزمائی کا تماشہ دکھادے۔ کیونکہ یہ تو صرف تصویر ہوئی مصور بھی اسے کھینچ سکتا ہے۔ ڈراما نویسی تو جب ہو کہ ڈراما نگار ہمیں اپنے ممدوح کے دلی اور دماغی حالات سے باخبر کرے۔ وہ ایسی کہانی انتخاب کرے۔ اُس کے کردار اس خوبی سے تجویز کرے۔ اُن کی زبان پر ایسے الفاظ لائے۔ اُن سے ایسے کام کرائے۔ اور یہ سب چیزیں کسی ایسی کہانی کے پیرائے میں ہوں کہ ہمیں نہ صرف رقیب اور ممدوح کے درمیان جسمانی لڑائی کا نظارہ نظر آئے۔ جیسے عام طور پر دیکھا جاتا ہے۔ بلکہ ڈراما کا وہ پہلو بھی صاف دکھائی

دے اور سمجھ میں آئے جسے خالص ڈرامائی پہلو کہہ سکتے ہیں۔ مثلاً شکسپیر کے شہرۂ آفاق کردار "میکبتھ" کے کارزارِ دل کی وہ لڑائی جو ہوسِ جاہ اور وفاداری و مودت کے درمیان ہوئی۔ جبکہ خوفِ مرگ اور خوفِ شکست پاس کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ اور جس لڑائی کے فاتح کو میکبتھ کی روح پر قبضہ حاصل ہوتا تھا +

اب آپ ہی فرمائیے کہ نفسیات کی نیرنگیاں اگر ذرہ ڈرامانہ ہوسکیں تو کامیڈی اس بوٹ کی طرح کیوں نہ سمجھی جائے جس کی شکل صورت تو خاصی اچھی ہے۔ مگر تلا ندارد۔

کامیڈی کی تیسری شرط مسرت بخش انجام

دیکھئے جب ہم نے دو روپے اس ڈرامانویس صاحب یا اُن کے گماشتے منیجر صاحب کے حوالے کئے تو اس شرط پر کہ اس "ڈراما" یا اس "پلے" یا اس "کھیل" کا انجام خوشی پر ہوگا۔ ممدوح اور ممدوحہ اپنی زندگی کی ایک خاص منزل تک پہنچکر باقی عمر آرام و آسائش سے بسر کریں گے۔ اور ہم آپ اُن دونوں کو ایک دوسرے کی آغوش میں دیکھ کر گھر کو سدھاریں گے۔ یہ تیسری شرط بظاہر بہت آسان معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسے پورا کرنے کے لئے اعلیٰ درجہ کے دل و دماغ کی ضرورت ہے۔ یہ ڈرامانویس اپنا ممدوح انتخاب کرتا ہے اور اسے اس کہانی یا اس واقعہ میں اپنا حصہ لینے کے لئے چھوڑ دیتا ہے جسے پلاٹ کہتے ہیں۔ اب اگر پلاٹ کے واقعات کچھ ایسے بے ڈھب واقع ہوئے ہیں کہ دوسرے ایکٹ کے اختتام پر حضرت ممدوح کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں تو ڈراما نگار کی محنت خاک میں مل گئی۔ پس معلوم ہوا کہ ڈرامانگار کو ایک ایسا ممدوح تلاش کرنا ہوگا جو کسی رکاوٹ کو بھی خاطر میں نہ لائے۔ سب کو سرپائے استحقار سے ٹھکراتا اپنی دماغی اور جسمانی قوتوں سے ان پر فتح پاتا منزلِ مقصود کی طرف نکل جائے۔ اور وہاں زندہ و سلامت پہنچ جائے۔

غرض کچھ بھی ہو ہمارے کامیڈی نگار کو اپنے ممدوح سے اس بات کا اقرار صالح کرنا ہوگا کہ چاہے کیسی مصیبت پیش آئے حضرت ممدوح مرینگے نہیں +

یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ ٹریجیڈی یا غم انجام ناٹک کے لئے ضروری ہے کہ ڈرامانگار اپنے ممدوح کو مار ڈالے لیکن یہ بھی ظاہر ہو کہ ڈرامانگار نے اپنے کسی [illegible] کے لئے مار ڈالا ورنہ درحقیقت ممدوح کے مرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی +

القصہ کامیڈی ہو یا ٹریجیڈی ممدوح کو زندہ و سلامت رکھنا منظور ہو یا مار ڈالنا۔ یہ دونوں باتیں ایک قدرتی نتیجہ ہونی چاہئیں۔ پلاٹ کے اتار چڑھاؤ کرداروں کی خصلتوں کا۔ واقعات کے ایک دوسرے پر موثر ہونیکا ڈراما خواہ ٹریجیڈی ہو یا کامیڈی اس میں ڈرامانگار اپنی ہستی کو بالکل چھپائے رکھے۔ ممدوح کا مرجانا یا زندہ رہنا ایک ایسا واقعہ نظر آئے کہ ڈرامانویس کے اختیار میں ہی نہ تھا۔ ڈرامانگار اگر چاہتا بھی کہ مرنے والے کو زندہ رکھے یا زندہ رہنے والے کو مار ڈالے۔ تو ایسا نہ کر سکتا۔ یہانتک کہ تماشا دیکھنے والے بھی سمجھ لیتے کہ واقعات حالات۔ کرداروں کے تنازعات۔ کرداروں کی خصلتیں وغیرہ یہ جملہ چیزیں ایسی تھیں کہ جو نتیجہ اور جو انجام سٹیج پر دکھایا گیا وہی منطقی انجام اور وہی منطقی نتیجہ ہو سکتا تھا۔ وہ ڈرامانگار جو حالاتِ زندگی نوعِ انسان اور نفسیاتِ حیاتِ انسانی سے الگ ہو کر نام نہاد کامیڈی لکھتا ہے

اور دیدہ و دانستہ ایک غم انجام کہانی کو کھینچ تان کر خوشی پر ختم کرتا ہے۔ ڈراما نگار کہلانے کا مستحق نہیں۔ وہ ڈراما نگاری کا منہ چڑاتا ہے۔

نیرنگ خیال خوشی کا انجام حاصل کرنے کے لئے کامیاب ناٹک نویس ایک ایسا موقع تلاش کرے گا جس پر اس بات کا بھروسہ کیا جا سکے کہ وہ آخر کار جیت کر رہے گا۔ اس سلسلہ میں کچھ عرصہ سے عامہ خلائق نے ایک اور مطالبہ شروع کر دیا ہے کہ ڈراما کے ذریعہ سے ہمیں انواع و اقسام کے خیالات اور آرائے سے بھی واقفیت حاصل ہونی چاہئے۔ چونکہ یہ سوال اس مضمون کے موضوع سے چنداں تعلق نہیں رکھتا۔ اسلئے اس کی نسبت صرف چند جملے کافی سمجھے جائیں۔ وہ آراء و خیالات ایک ناٹک نویس اپنے کرداروں کی زبان سے ادا کرتا ہے بالکل سطحی معلوم ہوتے ہیں۔ باریک بین دیکھ لیتے ہیں کہ صرف سطحی نظر رکھنے والوں کی تسلی کے لئے یہ ایک اجنبی عنصر شامل کیا گیا۔

مزہ تو جب ہے کہ خیالات اور آرا کا اظہار نہ کیا جائے۔ بلکہ کرداروں کی گفتگو اعمال اور قصہ کے واقعات بجائے خود لوگوں کے دلوں میں خیالات آ کسائیں یعنی وہ خیالات جو پس پردہ رہے ہیں۔ ایک کامیاب کامیڈی لکھنے والے کے ممدوح میں چونکہ یہ خوبی ہے کہ وہ دنیاوی رکاوٹوں پر غالب آئے اور چونکہ خود ڈراما نگار جس نے یہ قوت۔ یہ دنیاوی دانائی اپنے ممدوح کے دل میں ڈالی ہے اس قسم کی دانائی کا اہل ہے۔ اس لئے ثابت ہوا کہ یہ بھی ایک اعجاز قدرت ہے کہ ڈراما نگار کو یہ غیر معمولی فہم و فراست عطا ہوئی۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ کامیڈی (یعنی صرف کامیاب کامیڈی) ایک ایسی چیز ہے جو دنیاوی مشکلات پر غالب آنے اور ذہانت کو کام میں لانے کی راہ دکھاتی ہے۔ وہ یہ بھی سکھاتی ہے کہ خوشی اور مسرت کے حصول کے ذرائع کیا ہیں۔ الغرض وہ ہمیں "شادمانی" اور "کامرانی" کا سبق پڑھاتی ہے۔ پس اگر دو روپے صرف کرنے سے آپ کو شادمانی اور کامرانی کی کنجی مل جائے تو کیا برا ہے۔ رہا یہ امر کہ آپ اس کنجی سے کام لیں یا نہ لیں یہ آپ کی اپنے میلان طبع اور دماغی قوٰی پر منحصر ہے۔

کامیڈی کی چوتھی شرط

اب ہم کامیڈی کی چوتھی شرط کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ شرط یہ تھی کہ کامیڈی ہمیں ہنسائے لیکن واضح ہو کہ ہنسنے میں خوشی اور سرور شامل ہے لیکن خوشی ہونے کے وقت یہ ضروری نہیں کہ ہم ہنسیں بھی۔ چنانچہ جس کامیڈی پر اس وقت تک ہم نے بحث کی اور جس کو ہم نے اپنے دو روپے کا کافی معاوضہ قرار دیا۔ گو یہ کامیڈی ہمارے لئے شادمانی کی کنجی مہیا کرتی ہے۔ تاہم یہ ضرور نہیں کہ یہ ہمیں ہنسائے بھی اور اتنا ہنسائے کہ پیٹ میں بل پڑ پڑ جائیں۔ ممکن ہے کہ یہ کامیڈی ہمیں محظوظ و مسرور کرے اور بس مگر اس میں مضائقہ نہیں کیونکہ یہ ہنسی گویا ہماری روح کی فرحت ہوگی۔ اگرچہ ہم منہ سے نہ ہنسینگے۔ گویا ہنسی کی بھی دو قسمیں ہیں یعنی

(۱) ایک وہ ہنسی جو ہمارے دل و دماغ اور روح پر طاری ہوتی ہے۔ اور کامیڈی ہمیں اپنے عمل کے دوران میں خوش اور مسرور کرتی چلی جاتی ہے۔

(۲) دوسری وہ ہنسی جو ہم کامیڈی کے واقعات کو دیکھکر ہمارے منہ سے قہقہوں کے ذریعے فضا میں گونجتی ہے اس لئے چاہئے کہ ہم ہر دو قسم کی ہنسی کا مطالبہ کریں بشرطیکہ

ہمیں اپنے روپیہ کا کامل مطالبہ مقصود ہو

ہنسانے والے واقعات

جب ڈراما نگار ہمیں ایسے غیر معمولی اور غیر اغلب واقعات اور کرداروں کی خصوصیات دکھاتا ہے کہ انہیں دیکھ کر ہنسی آتی ہے اور ہم ہنستے ہنستے بے قرار ہو جاتے ہیں تو گویا ہمیں ایک قسم کا حظ حاصل ہوتا ہے۔ مگر اس کے پہلو بہ پہلو کامیڈی لکھنے والے کا یہ بھی فرض ہے کہ ہماری روح ہمارے دماغ ہمارے دل کو فرحت و انبساط حاصل ہو۔ وہ ہمیں اپنے ممدوح کی طبیعت اور اس کے اقوال و اعمال میں قدرت کی وہ غیر فانی صداقتیں اور لطافت کی وہ نیرنگیاں دکھائے کہ ہمیں شادمانی اور کامرانی کی کنجی ہاتھ آ جائے۔ ہمیں قانون قدرت کے ساتھ انسان کی وہ یک رنگیاں نظر آئیں جو ہمیں پہلے اپنی روزمرہ کی سیدھی سادی زندگی میں نظر نہ آتی تھیں +

قوت حیات

کامیاب کامیڈی لکھنے والا ہمارے دل پر یہ صداقت نقش کر دیتا ہے کہ دنیا کے مرد اور دنیا کی عورتیں اگر چاہیں تو پورے طور سے زندہ رہ سکتی ہیں۔ اس لئے نہیں کہ ایک دوسرے پر فتح پائیں اور اپنی نوع کو بڑھائیں۔ بلکہ ایک دوسرے کی دستگیری کرتے ہوئے اپنا منشائے حیات کا حصہ پورا کریں یعنی فرحت و انبساط اور صبر و شکر کی زندگی بسر کریں۔ حضرت انسان میں جذبہ رحم و کرم پیدا کریں اور اقوام کے جنگی جذبہ کو مٹا کر امن و سلامتی کی راہ پر لائیں +

ایڈیٹر

اقوالِ زرّیں

ناکامی کی وجہ

آدمی کی زندگی ایک نغم انجام ناٹک اس لئے نہیں بن جاتی کہ اس میں بہت سے اوصاف یا گن نہیں۔ اور صرف ایک ہی قابلیت کا اہل ہے۔ بلکہ اس لئے کہ وہ اس ایک استعداد سے پورا پورا کام نہیں لیتا +

تلاش اوصاف

جب کسی شخص سے تمہیں سابقہ ہو تو ہمیشہ اس کی خوبیوں اور برائیوں پر نظر ڈالے اور انہیں ڈھونڈھ نکالے +

"رسکن"

بزرگوں کا وصف

دنیا کے قریباً سب بزرگ آدمی حلیم الطبع تھے +

"مارشل"

ہندوستان میں جسقدر رسایل اُردو زبان میں شایع ہوتے ہیں۔ اُن کا مطمح نظر صرف تقلید میں تصویر شایع کر دینا ہے اور پھر تصویر کی امنگ قبول عام کی شرمندہ احسان ہو رہی ہے۔ دو چار پانچ عورتوں کی عامیانہ و گھٹیا درجہ کی تصاویر جو فن مصوّری کے کسی مبتدی کی نقالی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ رسالہ کی زینت کے لئے شایع کی جاتی ہیں۔ عام پبلک ان تصاویر میں صرف حُسن کی متلاشی ہوتی ہے۔ کسی نے زیادہ توجہ کی تو اُس کے چمکیلے رنگوں کو بھی بہ نظر غائر دیکھ لیا۔ ورنہ فن کے لحاظ سے نہ اُن تصویروں پر غور ہوتا ہے۔ نہ وہ فن کے لحاظ سے پیش ہی کی جاتی ہیں سچ پوچھئے تو اس تصویر بازی سے اُردو رسایل ملک کی کوئی خدمت نہیں کر رہے +

مصوّری ایک فن شریف ہے۔ کتاب کی جلد پر خوبصورت قطعات کے اردگرد جو بیل بوٹے ہیں۔ آپ کے بستر کی چادر کا حاشیہ آپ کے برتنوں کی وضع قطع آپ کے مکان کی دیواروں پر کے نقش و نگار۔ آپ نے جو کپڑے پہن رکھے ہیں اس کا رنگ اور بناوٹ۔ الغرض مصنوعاتِ عالم میں کونی چیز ہوگی۔ جہاں مصوّری کا نمونہ پیش نظر نہ ہو جاتا ہو۔ سنار زیورات پر نقش و نگار بناتا ہے۔ نقاش لکڑی اور دیواروں پر اپنا کام دکھاتا ہے۔ مصوّر کپڑے اور کاغذ پر تصاویر بناتا ہے۔ الغرض ہر صنعت گر کو نقاشی اور مصوّری سے کچھ نہ کچھ واسطہ ضرور پڑتا ہے۔ اس لئے

اس فن کے متعلق اردو زبان میں جس قدر مبسوط اور مدلل مضامین شائع ہوں گے۔ اتنا ہی پبلک کو فائدہ پہنچیگا۔ اور اتنا ہی ہماری زبان کا لٹریچر اس سے مالا مال ہوگا ٭

نیرنگ خیال واحد رسالہ ہے جو آرٹ اور لٹریچر کے موضوع پر بہترین مواد پیش کرتا ہے۔ اس کا تخیل بلند ہے یہ تصویر کو نہ "عورت" کے لحاظ سے شائع کرتا ہے نہ "حسن" کے لحاظ سے۔ اس کا مقصد صرف آرٹ کے بلند ترین شاہکاروں کو پیش کرنا ہے۔ اگر صرف عورت کی تصویر شائع کرنا ہی مقصد ہوتا تو ہمیں تصاویر کی بہم رسانی اور ان کے بلاکس بنوانے پر ہزاروں روپے صرف کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ ہندوستانی پریسوں میں سینکڑوں کیلنڈروں اور پوسٹ کارڈوں کی تصاویر کے بلاکس موجود ہیں جو ۵۰ سال تک بھی ختم نہیں ہو سکتے اور صرف چھپائی کے دام دیکر ہم اپنا مقصد حاصل کر سکتے تھے۔ جس طرح سے بیشتر ادبی رسایل کر رہے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ بلند ترین اور اچھوتے تخیل میں مصور نے اپنا موضوع "عورت" رکھا ہو۔ پس جس طرح سے عورت عورت میں فرق ہے۔ اسی طرح سے بلند ترین آرٹ کی مخلوق اور ادنیٰ ترین نقالی میں بھی فرق ہوتا ہے۔ جب لوگ اس فرق کو سمجھنے لگیں گے تو وہ یقیناً آرٹ کے مفہوم و منشا کو بھی سمجھنے لگیں گے۔ اور اس دن سے وہ اچھے اور برے رسالوں میں بھی تمیز کر سکیں گے

اس نمبر میں ہم آرٹ کی ایک اہم ترین قسم "دیواروں پر کی نقاشی" پر ایک مضمون ہدیہ ناظرین کر رہے ہیں۔ اس مضمون کی محرک وہ تصویر ہے جو "مصوری" کے عنوان سے جولائی نمبر کی زینت ہے۔ یہ تصویر نئی دہلی کی دیواروں پر کی نقاشی کے سلسلہ میں بمبئی سکول آف آرٹ کے زیر اہتمام بنائی گئی تھی ٭

دیواروں پر کی نقاشی کی تاریخ پر ایک جھلکتی ہوئی نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آج سے ہزاروں سال قبل اس کی ابتدا ہو چکی تھی۔ اور مصوری کی کوئی قسم بھی ایسی نہیں جسے دیواروں کی نقاشی کے سلسلہ میں استعمال نہ کیا گیا ہو۔ زمانہ قدیم کی مصوری کے نمونے آپ کو نہ تو کاغذ پر مل سکتے ہیں نہ چمڑے پر۔ بلکہ اس زمانہ کی مصوری کے لئے آپ کو ایسی کئی ہزار سالہ پرانی عمارتوں کی دیواروں کو دیکھنا پڑے گا۔ جن پر مصوری کی سرگزشت کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں ٭

(۱) قدیم ترین دیواروں کی نقاشی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مصور بڑے بڑے پتھروں پر تصاویر بناتے تھے اور سنگتراش انہیں نقوش کی متابعت میں اس طرح سے تراشتے تھے کہ تصاویر ابھری ہوئی اور نمایاں ہو جاتی تھیں یا سنگتراش خود ہی تصاویر بناتے ہوں گے اور خود ہی تراشتے ہونگے۔ اس نوع کے بیشتر نمونے آپ کو اہرام مصر کی پُراسرار عمارتوں کی دیواروں پر بکثرت مل سکتے ہیں۔ یا بابل و نینوا کے ان کھنڈروں میں مل سکتے ہیں۔ جو آجکل محکمہ آثار قدیمہ عراق کے زیر اہتمام کھودے جا رہے ہیں۔ فن مصوری کی اس شاخ کو انگریزی زبان میں ریلیف سکلپچرڈ کہتے ہیں۔ مصری اور نینوی صنعت گروں کے بعد مصر اور ترکی کے مسلمان مصوروں اور صنعت گروں نے قسطنطنیہ اور قاہرہ کی بعض عمارتوں کی دیواروں پر اسی قسم کی نقاشی سے کام لیا ہے ٭

(۲) دیواروں کی نقاشی کی دوسری قسم سنگ مرمر کی ہلکی تہ چڑھانا ہے یعنی دیواروں پر سنگ مرمر کی باریک سلیں اس طرح لگائی جاتی ہیں کہ ان کی ملاوٹ سے نقش و نگار صورت پذیر ہونے لگیں۔ اس قسم کا کام زیادہ تر روما و یونان

کے قدیم معبدوں میں پایا جاتا ہے۔ روضہ تاج گنج بھی
اسی نوع سے ہے +

(۳) دیواروں کی نقاشی کی تیسری قسم آبدار اینٹوں اور
آئینی ٹکڑوں کی ملاوٹ سے مختلف اقسام کے پھول پتے
بنانا ہے۔ اس قسم کے لئے رنگدار اینٹیں جو آئینہ کی طرح
چمکدار ہوتی ہیں مہیا کی جاتی ہیں۔ ان کو اس ترتیب سے
دیواروں پر جوڑا جاتا ہے کہ وہ کسی خاص تصویر یا پھول
کو مکمل طور پر نمایاں کر دیتی ہیں۔ جزیرہ روڈس۔ ایران
اور دمشق کے گیارھویں اور بارھویں کے مسلمان مصوروں
اور کاریگروں نے اس نوع میں اپنا کمال دکھایا ہے۔ اس
طرز کے اصل موجد ساسانی اور شامی کاریگر تھے۔ جہاں
سے مسلمانوں نے اس فن کو سیکھ کر اسے درجہ کمال تک
پہنچا دیا تھا۔ اندلس کے مور مسلمانوں نے مصوری کی
اس قسم کو ایسی جلا دی کہ آج اقطاع عالم سے سیاح
سرزمین اسپین پر الحمرا کی دیواروں کو دیکھنے کے لئے
جوق در جوق چلے آتے ہیں +

(۴) اٹلی کی سیاہ سفید پچی کاری۔ دیواروں پر کی نقاشی
کی چوتھی قسم جسے سیاہ سفید پچی کاری کہتے ہیں۔ اٹلی میں
بکثرت پائی جاتی ہے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ دیواروں
پر اول سیاہ رنگ کی ریت اور کوئلہ کی ملاوٹ سے
ایک باریک تہہ چڑھائی جاتی ہے۔ جب یہ خشک ہو جاتی
ہے۔ تو اس پر سفید تہہ جمائی جاتی ہے۔ اور پھر سفید تہہ
میں سے تراش خراش کر سفید سفید دیواروں میں سے سیاہ سیاہ
بیل بوٹے نمایاں کرتے جاتے ہیں۔ اس قسم کا کام دور
سے بہت ہی خوشنما معلوم ہوتا ہے +

(۵) چمڑے پر سنہری روپہلی کام۔ دیواروں کی نقاشی
کی یہ پانچویں قسم ہے جس میں بکری اور بھیڑ کی کھالوں کو
نہایت عمدگی سے صاف کیا جاتا ہے۔ اور پھر ان پر
چاندی کے بیل بوٹے چسپاں کر کے تانبے کا رنگ
اس خوبی سے چڑھایا جاتا ہے کہ وہ خالص طلا معلوم ہونے
لگتا ہے۔ یہ مرصع کھالیں دیواروں پر اس خوبی سے چسپاں
کی جاتی ہیں کہ وہ دیوار کا ایک حصہ بن جاتی ہیں۔ سترھویں
صدی میں یہ طرز اسپین میں بہت رائج تھی +

(۶) منقش کپڑا۔ دیواروں کی نقاشی کی ایک طرز منقش کپڑا ہے
جس طرح سے تھیئٹر کے پردے رنگے جاتے ہیں۔ بالکل
اسی طرح سے ذرا موٹے کپڑے پر نقاشی کر کے دیواروں
پر چسپاں کی جاتی ہے۔ یہ کام ارزاں ہے +

(۷) منقش کاغذ۔ کپڑے کی ارزانی اور مقبولیت کے بعد
"وال پیپر" دیواروں کا چھاپہ کا کاغذ ایجاد کیا گیا۔ یہ چونکہ
بہت ارزاں تھا۔ اس لئے امیر غریب سب گھروں میں
استعمال ہونے لگا۔ لیکن بعد میں یہ دیکھ کر کہ اس کاغذ کی خوبیاں
قیمتی سے قیمتی کام کا ارزاں ترین بدل ہیں۔ اس کی تیاری
اور استعمال میں بہت مبالغہ ہونے لگا۔ اور آج مغرب
میں بیشتر مکانات کی دیواریں اسی وال پیپر سے مزین
ہوتی ہیں +

(۸) دیواروں پر تصویر کشی۔ دیواروں پر فن مصوری کی یہ
قسم بھی ابتدا ہی سے دیکھی جاتی ہے۔ مصریوں۔ یونانیوں
اور رومیوں نے دیواروں پر اپنے اپنے کمالات فن دکھائے
ہیں۔ نیپلز کے قدیم ترین کھنڈرات کی دیواروں پر واٹر کلر
کا کام بکثرت پایا گیا ہے۔ اٹلی میں عیسائی مصوروں نے
گرجا گھروں کی دیواروں کو انجیل مقدس کے واقعات سے
منقش کر دیا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ حضرت مریم علیہا السلام
اور ان کے حواریوں اور فرشتوں کی تصاویر دیواروں پر نہایت
حسن و خوبی سے بنائی گئی ہیں۔ یہیں سے عیسائی مصوری کی

حجازی جہاز کو آگ

مسلمان کے خون کی ہر بوند جہاز کا نام سنتے ہی زندگی کی حرارت سے تڑپنے لگتی ہے۔ مسلمان فرط مسرت سے جھومنے لگتا ہے۔ اس کا سر نیاز عقیدت و محبت کے جذبات سے مغلوب ہو کر جھک جاتا ہے۔

اس عقیدت و محبت کا امتحان بارہا ہوا اور مسلمان اس امتحان میں ہمیشہ کامیاب و بامراد رہا ہے۔ آج یہ سطریں جہاز ایشیا کے اُن حاجیوں کی یاد میں لکھی جا رہی ہیں جنہوں نے قیامت خیز آگ کی بلاکت بار یوں میں بھی ثابت قدمی کا جوہر دکھایا اور رہتی دنیا تک اپنی محبت و عقیدت کا نہ مٹنے والا نقش تاریخ کے صفحات پر ثبت کر دیا۔

جہاز کی آگ کوئی معمولی آگ نہیں ہوتی۔ ایک طرف آگ کے شعلے ہوتے ہیں تو دوسری طرف بحیرۂ خار کی پُر زور لہریں منہ پھاڑے کھانے کو آتی ہیں عرصۂ حیات اُن پر تنگ ہو جاتا ہے جہاز لوہے کا ہوتا ہے۔ جب وہ آگ کی تپش سے گرم ہو جاتا ہے تو اسکی حدت سے اُڑتے ہوئے پرندے بھی کباب ہو ہو کر گرنے لگتے ہیں لوہے کی سلاخیں لوہے کے گارڈر لوہے کی تختیاں اور لوہے کے فرش جب آگ سے سرخ ہو گئے تو قریب کے حاجیوں کی [illegible] زور سے پھٹنے لگیں گویا کسی نے بتول چلا دیا۔ انسانی مغز کی کھوپڑیاں اس طرح [illegible] طرح سے تھیلا ہوا ہو۔ پچاس حاجیوں نے ایک لوہے کے گارڈر کے پیچھے پناہ لینے کی کوشش کی مگر جب [illegible] کوئی ریلو تھیں تو ان بہادروں نے اپنے اپنے گلے خود کاٹ ڈالے۔

جب بہت سے حاجی جوانمردی سے اپنے گلے کاٹ رہے تھے تو سینکڑوں حاجیوں نے اس ناقابل برداشت منظر کے درمیان بھی منہ کعبہ کی طرف پھیر دیا اور سربسجود ہو گئے۔
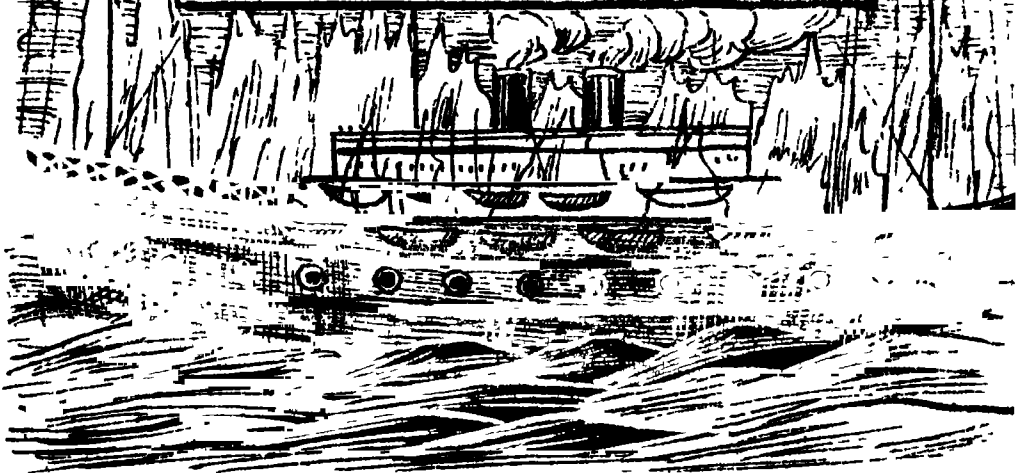
خودکشی کے

خودکشی کے اسباب و علل پر ایک روز غور کرتے کرتے میں عجیب و غریب نتائج پر پہنچا۔ یورپ کے ایک مصنف نے وینٹی فیئر میں خودکشی کے ایکسٹرا ذرائع پر بحث کی ہے اور بتلایا ہے کہ اس "فن شریف" کو بہت سے نااہل لوگوں نے اختیار کر رکھا ہے +

خودکشی کو "فن شریف" اور خودکشی کرنے والوں کو "نااہل" لکھنے پر آپ حیران و ششدر رہ گئے ہوں گے۔ لیکن تعجب کی چنداں ضرورت نہیں۔ آخر یہ بھی ایک آرٹ ہے۔ مرنا کوئی آسان فعل نہیں ہے۔ اور اپنے آپ کو مار ڈالنا اور ایک انسانی زندگی کا خاتمہ کر دینا ایک عظیم الشان کام ہے۔ اس لئے اس مغربی نقاد نے اسے ایک شریفانہ فعل قرار دیا ہے اور سب سے زیادہ دکھ اُسے اُن آدمیوں کی حرکتوں سے ہوتا ہے۔ جو اس شریف فن کو اختیار کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے اور اپنی جان دے دیتے ہیں +

مغربی نقاد کا خیال ہے کہ جتنے لوگ خودکشی کرتے ہیں درحقیقت یہ خودکشی کے قابل نہیں ہوتے۔ اور اس قسم کی غلط خودکشیاں ہی اس مضمون لکھنے کی محرک ہوئی ہیں۔ کیونکہ قرضوں کے بوجھ سے۔ بدنامی کے خوف سے شراب کے نشے میں کسی گناہ سے خوف زدہ ہونے پر خودکشی کر لینا اس فن شریف کی توہین کرنے کے مصداق ہے۔ اس قسم کی خودکشیاں درحقیقت خود غرضیوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو دیکھیے جب کوئی شخص خودکشی کرتا ہے تو دوسرے دن اخبارات لکھتے ہیں کہ "وہ محنتی، جفاکش۔ قابل اور دانا آدمی تھا۔ وہ اپنے بعد سات بچے چھوڑ گیا ہے جن کی قوت لایموت کا وہی سہارا تھا"۔ ان حالات میں آپ انکار کر سکتے ہیں کہ اس نے اس فن شریف کی ہتک

اکیس ذرائع

۲۱
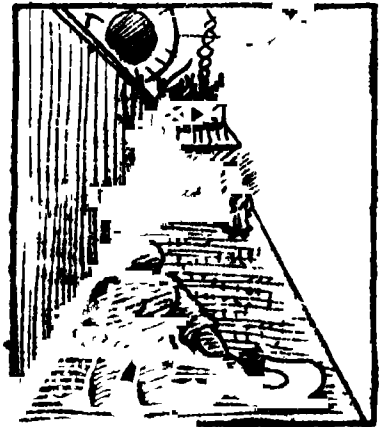
نہیں کی۔ اور یہ کہ وہ اس فعل کا اہل نہ تھا۔

میں کوئی خون کا پیاسا یا ظالم انسان نہیں ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے نااہل ابنائے جنس نے ہمیں اپنی کرتوتوں سے بدنام کر رکھا ہے۔ میں اپنے ایک دوست کے سامنے خودکشی کی تعریف شروع ہی کی تھی کہ اُس کے چہرہ پر کراہت و حقارت کے جملہ نشانات ظاہر ہونے لگے۔ اُس نے ناک بھوں چڑھا کر مجھے اس قسم کے ذکر سے روکا۔ ورنہ دراصل خودکشی اتنی بُری چیز نہیں۔ جتنے خودکشی کرنے والے بدرجہ غلط ہیں۔ یورپ کے بڑے بڑے لکھ پتی دلال کمرکی سے محض اس لئے کود پڑتے ہیں کہ سٹہ میں اُن کا دیوالہ بول گیا تھا۔ اب بتلایئے کہ اس قسم کی خودکشی کو کیا کہا جائے؟
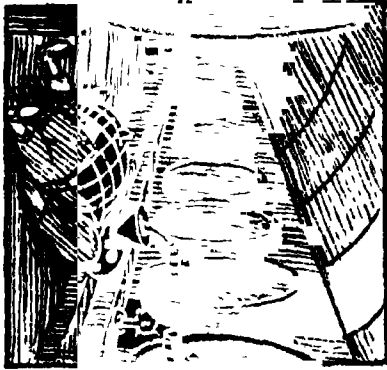
مغربی نقاد نے مغرب میں خودکشی کرنے والوں کے سامنے ایک مختصر سا نقشہ پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر وہ ان سوالات کا جواب اثبات میں دیں تو خودکشی اُن کے لئے اور ابنائے جنس کے لئے مفید ہو سکتی ہے۔ اگر تمام انسان خودکشی کے حقیقی فلسفہ کو سمجھ سکیں تو آج ہی ملک سے قتل و غارت کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ عدالتیں بند ہو جائیں اور جیل خانے اپاہج خانوں اور فقیر خانوں میں تبدیل کر دیئے جائیں۔ نقشہ حسب ذیل ہے:۔

(صرف سوشل خدمت کے لئے)

(۱) اگر تم کسی مصوّر کے لئے ماڈل بنے ہو۔ تو پھانسی کی رسّی سے لٹک جاؤ۔

(۲) اگر تم اپنے مال و اسباب پر اس قسم کے لیبل لگائے رکھتے ہو جس سے یہ معلوم ہو کہ تم نے یورپ کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں

قیام کیا ہے۔ تو زہر پی لو +

(۳) اگر تم بھیڑ میں چھتری لگائے پھرتے ہو اور بلاتکلف اپنے سے آگے چلنے والے کے سر کو بارش کی بوندوں سے شرابور کرتے اور اپنے سے پیچھے چلنے والے کی آنکھ میں چھتری کی سلائی چبھوتے ہو تو (بذریعہ ڈائنامیٹ) بھک سے اڑ جاؤ +

(۴) اگر تم ایک دستانہ پہنے رکھتے ہو۔ اور ایک دستانہ دوسرے ہاتھ میں پکڑے رکھنے کے عادی ہو تو فاقہ کشی سے جان دے دو +

(۵) اگر میاں اور بیوی دونوں ایک ہی کمرہ میں سوتے ہوں تو تنہائی میں جان دے دو +

الغرض اس قسم کے اکیس پُر لطف سوالات اس مغربی نقاد نے کئے ہیں۔ اور ہر قسم کے شخص کے لئے مختلف سزا تجویز کی ہے۔ ہم ان سوالات کے بستہ کو اپنی بغل میں داب کر حضرت اکال انکل کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور اُن سے بذریعہ ایک ملاقات خصوصی کے استفسار کیا کہ کیا ہم ہندوستانیوں کے لئے آپ اس قسم کے سوالات وضع فرما سکتے ہیں؟ یہاں کے لوگ تو خودکشی محض فاقہ۔ قرض۔ بیماری۔ ناکامیاب محبت اور غیرت کے جوش میں کرتے ہیں۔ مغربی نقاد کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستانی خودکشیاں سراسر ناواجب لوگوں کی گمراہیوں کا نتیجہ ہیں +

حضرت اکال انکل نے جوش مسرت کو دباتے ہوئے کسی انتقامی جذبہ سے متاثر ہو کر ہندوستانی سوشل خدمت کے لئے مندرجہ ذیل خودکشیاں تجویز فرمائیں:-

(۱) اگر چھوٹا بھائی اپنے بڑے بھائی کو ندجرفرو ہیچ کرے اور چھڑی سے اُس کو پیٹے۔ تو ایسے شخص کو دس سیر سیویاں کھا کر جان دیدنی چاہئے +

(۲) اگر شراب کی دکانوں پر پکٹنگ کی جائے تو شرابیوں کو شراب کی دکانوں اور دانشیروں کے سامنے مٹی کا تیل اس قدر پینا چاہئے کہ اُن کا دم نکل جائے +

(۳) اگر کوئی شخص محض اپنے خوبصورت بالوں کے لئے بازاروں میں ننگے سر پھرے تو اُس شخص کو سرکس کے پنڈال میں کود کر اپنا سر شیر کے مُنہ میں دیدینا چاہئے +

(۴) ریل کی پٹڑی پر وہی لوگ اپنا سر رکھا کریں۔ جن کے والدین مقروض ہوں +

(۵) جن لوگوں کے قد بہت چھوٹے ہوں اور لوگ انہیں بُونا سمجھیں وہ اپنے گلے میں ایک رسّی اور اُس کے ساتھ ایک پورے آدمی کا بوجھ باندھ کر سمندر کی تہ میں چلے جائیں +

(۶) جو لوگ اس قدر لمبے ہوں کہ اُن پر ٹل طویلاً احمقاً کی پھبتی کہی جاتی ہو وہ کوہ ہمالیہ کی چوٹی سے پھاند پڑیں +

(۷) جس شخص کی چار بیویاں ہوں اُس کا تو شاید گزارا ہو سکیگا۔ لیکن دو بیوی والے کو پھانسی کا رسّہ اپنے گلے میں ضرور ڈال لینا چاہئے +

(۸) جو عورت یا مرد اپنے بچوں کی شادی بیاہ پر ہزاروں روپے خرچ کرتا ہو اُسے شادی کے ایک دن بعد زہر پی لینا چاہئے +

(۹) جس کارخانہ دار کے مزدور سٹرائک کر دیں اُسے مشین روننگ میں سے گذر کر جان دیدنی چاہئے +

(۱۰) جو شخص اپنی ننھی بچی کی شادی ایک بڈھے آدمی سے کرے اُسے اُسی شام کو اپنے آپ کو زندہ زمین

میں گاڑ دینا چاہئے +

(۱۱) جو شخص ہر بار ملک کی سیاسی تحریک سے متاثر ہوکر کھدر پہن لیتا ہو اور ہر بار تحریک کے ختم ہو جانے پر پھر ولایتی پارچات پہننے لگتا ہو اُسے چرخے کے تکلا کو اپنے کان کے راستہ سے دوسرے کان تک گذار کر جان دینی چاہئے +

(۱۲) جو شخص اپنے ہیڈ کلرک کے جبر و ستم سے نالاں ہو اُسے ہیڈ کلرک کے تانگہ کے نیچے آکر مرنا لازم ہے +

(۱۳) جس شخص پر کسی قومی فنڈ کے خورد برد کرنے کا الزام لگایا جائے۔ اُسے سیلاب کے دنوں میں ڈوب مرنا چاہئے +

(۱۴) جس ڈاکٹر کے علاج ٹیکہ سے اور جس حکیم کے نسخۂ مسہل سے کسی کی جان جاتی رہے۔ اُسے روغن بادام تلخ اس مقدار میں پینا چاہئے جس سے اُسے پھر معالجہ کی توفیق باقی نہ رہے +

باقی سات طریقے بالکل مخفی رکھے گئے ہیں۔ اس لئے جو لوگ اس فن شریف کے اہل ہوں وہ حضرت (کمال) الکل سے بذریعہ خط و کتابت معلوم کر سکتے ہیں +

ننھی بچی کی خودکشی

ہمارے گھر کے آدمی، میری ماں اور میری بہنیں اور میرے ابا مجھے ہر بات پر ٹوکتے ہیں۔ جب میں کوئی بات کرتی ہوں۔ تو وہ مسکرا کر کہہ دیتے ہیں کہ "تو ابھی ننھی بچی ہے۔" "تو بے سمجھ نادان لڑکی ہے۔" "تو نہیں سمجھتی چھوٹی صغریٰ۔" وہ مجھے ناکارہ۔ جاہل۔ کاہل اور سست سمجھتے ہیں وہ مجھے نہیں سمجھ سکتے اور شاید کبھی نہ سمجھ سکیں۔ اس لئے میں دنیا سے نفرت کرتی ہوں۔ دنیا کی ہر چیز سے مجھے نفرت ہے۔ اس لئے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنی اس بے معنی زندگی کا خاتمہ کر دوں۔ کوئی مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ مگر مجھے اپنے آپ سے محبت ہے۔ اس لئے خود کو مار ڈالنا ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ میں اپنے رفیق پیپل کے درخت سے محبت کرتی ہوں۔ اس کے پتے مجھے جانتے ہیں۔ مجھے سمجھتے ہیں۔ وہ مجھ سے سرگوشیاں کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "ہم تمہاری قبر کو مرغزار بنا دینگے۔ جب موسم سرما کی برف ہمارے جسم کو مردہ بنا دیتی ہے ہم اس وقت بھی تمہاری قبر کو پتوں سے لاد دینگے۔" ان پتوں کی زندگی مختصر ہوتی ہے مگر وہ ہر سال پھر پیدا ہو جاتے ہیں۔ میں پتوں کی باتوں پر مسکراتی ہوں۔ ان کے سبز سبز دانشمند چہروں پہ پیار دیتی ہوں۔ کبھی کبھی کوئی ننھا سا پرندہ چہچہاتا ہوا پاس سے گذر جاتا ہے۔ وہ اپنی آنکھوں سے میرا آداب بجا لاتا ہے۔ اس وقت ہوا میرے بالوں کو منتشر کر دیتی ہے۔ اور میری ناک موسم سرما کی بھینی بھینی خوشبو سے معطر ہو جاتی ہے۔

مگر وہ سب چیزیں مر جاتی ہیں۔ یہ بھی اور وہ بھی۔ اور ایسا ہی میں بھی۔ گو یہ خدا کی مرضی سے پیشتر ہی ہوگا۔ میں اپنے درخت کے پتوں کی طرح سے گر پڑونگی۔ پھر جو کوئی دیکھیگا وہ یہی کہے گا کہ "بے پرواہ نادان لڑکی!" مگر افسوس وہ حقیقت کو نہ جان سکینگے۔

میں اس شاخ پر رینگتی ہوئی پہنچ جاؤنگی۔ میں ایک چمگادڑ کی طرح سے شاخوں پہ لٹکتی نظر آؤں گی۔ یہاں تک کہ میں اپنے ہاتھوں کی گرفت کو چھوڑ دوں گی۔ اور گر پڑونگی۔ اور پھر میرا خاتمہ ہو جائیگا۔ آہ کون پرواہ کرے گا۔ میرے خرگوش اور کتیا کے بچے مجھے کھانے پہ نہ پائیں گے۔ کیا مجھے رک جانا چاہئے؟!!

میں گر پڑی اور مجھے چوٹ لگی۔ اب میں بستر پر پڑی ہوں۔ ہر شخص کو میرا افسوس ہے۔ میری ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ اور چونکہ درخت زیادہ بلند نہ تھا۔ اماں بہت اچھی ہے۔ پیار کرتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا مر جانا ٹھیک نہ تھا۔ مجھے موت کا انتظار ہی کرنا پڑیگا۔

(برمنڈزی بکم)

۱۹۹۲ سنہ ع

محوِ حیرت ہوں کہ دُنیا کیا سے کیا ہو جائیگی

دنیا کی رفتار ترقی پر ایک چھیلتی ہوئی نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ہم کہاں تھے اور کہاں جا رہے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے چند ہی سالوں میں جو تغیرات رونما ہوئے ہیں۔ وہ اس قدر اہم ہیں۔ کہ اگر پچاس قبل کا انسان دوبارہ دنیا میں واپس آجائے۔ تو موجودہ تغیرات کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ جائے۔ آج وہ زمانہ آن پہنچا ہے کہ ہم لاہور اور لندن کے درمیان بغیر کسی تار کے سلسلہ کے گھنٹوں گفتگو کر سکتے ہیں۔ اور نہ صرف گفتگو کر سکتے ہیں بلکہ ایسے آلات بھی عالم وجود میں آگئے ہیں جن کی امداد سے ہم ایک دوسرے کو دیکھ بھی سکتے ہیں۔ انسانی اعمال کی تصویریں تمثیل کی صورت میں پردہ تصویر پر بظاہر ہو کر حرکت کرتیں اور باہم گفتگو کرتی ہیں۔ آپ لندنی نغموں کی دلکش تانیں گھر میں بیٹھ کر سن سکتے ہیں۔ صبح سے لے کر شام تک لاکھوں کی تعداد میں اخبارات چھپ سکتے ہیں۔ جن میں دنیا کے ہر حصہ کی خبریں درج ہوتی ہیں۔ تار برقی کے ذریعہ سے تصویریں نئی سے پرانی دنیا میں منتقل ہو سکتی ہیں۔ ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے ہزاروں میل کا سفر دنوں میں طے کر سکتے ہیں۔ زہریلی گیسوں کے ذریعہ سے ایک فوج کی فوج کو چشم زدن میں موت کے گھاٹ اتار سکتے ہیں۔ کہن سال انسان کی بوسیدہ اور کھڑکھڑاتی ہڈیوں میں زندگی کا تازہ پیوند لگا کر اُسے جوان سال بنا سکتے ہیں الغرض ہر وہ بات جو آج سے بیس قبل ایک پرواز تخیل سے زیادہ وقیع نہ تھی وہ اس وقت ایک زندہ حقیقت بن گئی ہے۔

لیکن کیا انسان کا واہمۂ ترقی ختم ہو گیا ہے؟ یا اُسکی ترقی کی رفتار منزلِ مقصود کے قریب آن پہنچی؟ نہیں ہرگز نہیں ہمارے خیال میں ابھی تو ترقی کی ابتدا ہوئی ہے۔ اس کے انتہائی مناظر سے صرف ہماری آئندہ نسلیں ہی لطف اندوز ہو سکینگی۔

بیس پچیس یا پچاس سال میں جو کچھ ہوا ہے اُس کو سامنے رکھ کر ایک صدی بعد کی دنیا کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں۔ انگلستان کے مشہور سیاسی رہنما لارڈ برکن ہیڈ نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام سنہ ۲۰۳۰ء ہے اس تصنیف میں آج سے ایک صدی بعد کی دنیا کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور لارڈ برکن ہیڈ نے لکھا ہے کہ اُس زمانہ میں سائنس کی ایجادات کی اسقدر کثرت ہو گی کہ ۲۰۰ گھوڑے کی طاقت کا انجن ایک قلم کے برابر ہو گا۔ ہر کام بجلی کی قوت سے سرانجام دیا جائے گا۔ اس لئے صرف چند گھنٹے کام کرنے سے ہفتہ بھر کا کام پورا ہو سکیگا۔ اُس زمانہ کی عورتیں بچے جننا چھوڑ دینگی۔ البتہ حسب ضرورت اُن کے جسم کی کھال

سے اوپر ایک شیشے کا حلقہ قایم کیا جائے گا جس میں جنین پرورش پا سکیگا۔ انسانوں کی عمریں اسقدر بڑھ جائیں گی کہ ڈیڑھ سو سال تک زندہ رہنا معمولی بات ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی پیرانہ سالی جوان سالی میں تبدیل ہو جائیگی +

سنہ ۲۰۳۰ء کی جنگ عہد حاضرہ کی جنگوں سے بعید قیاس ہوگی۔ جنگ کا دارومدار زہریلی گیسوں پر یا ایک قسم کی آبدوز کشتی پر ہوگا۔ جو سمندر کے اوپر اور سمندر کے نیچے کام کرنے کے علاوہ ہوا میں بھی اڑیگی اور دشمن کی ہلاکت کا باعث ہوگی۔ اس زمانہ میں عملی طور پر جنگیں بند ہو جائینگی لیکن زرد اقوام کا گوری اقوام پر حملہ ناگزیر ہوگا۔ زرد اقوام کے علاوہ نیگرو قوم (حبشی) بھی کروٹ لیں گے اور اسقدر زور پکڑیں گے کہ اپنے قدیم وطن براعظم افریقہ پر قابض و متصرف ہوکر ایک حبشی سلطنت کی بنیاد رکھیں گے +

سنہ ۲۰۳۰ء کی دنیا میں جسقدر انقلابات ہوں گے اُن میں ایک ایجاد مصنوعی گوشت بھی ہوگا، جو سائنس کے ذریعہ سے بنایا جائے گا۔ اُس وقت مرغی اور بیل کاٹنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ یہ مصنوعی گوشت بھی اصلی سے لذیذ تر ہوگا"+

لارڈ برکن ہیڈ نے اپنی کتاب میں جو پیشین گوئیاں کی ہیں۔ یہ اُن کا مختصر سا خاکہ ہے۔ ہمیں صرف دو تین باتوں سے اختلاف ہے۔ اوّل تو یہ کہ عورت بچے جننے کی مصیبت سے آزاد ہو جائے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ اس معاملہ میں انسان کی تمام ایجادیں بے کار ثابت ہونگی دویم لارڈ برکن ہیڈ نے اس کتاب میں زرد اقوام کے خروج اور حبشی النسل سلطنت کے قیام کا جو تذکرہ کیا ہے خواہ یہ ایک حقیقت ہی ثابت ہو لیکن سیاسیات حاضرہ میں ان خطرات کا بطور ایک واہمہ کے پیش کرنا بھی خالی از علت نہیں۔ امریکہ اور انگلستان کے موجودہ تعلقات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اسے امریکہ کے لئے ایک دھمکی سمجھتے ہیں۔ جاپان زرد اقوام کا انگلستان ہے۔ پس امریکہ اور جاپان کی آنے والی جنگ کو اٹل ثابت کر کے زرد اقوام کے خروج سے امریکہ کو اتنا متاثر کیا جا سکتا ہے کہ وہ انگلستان کو بطور ایک رفیق کے قبول کرے۔ دوسرا خطرہ حبشی النسل اقوام کا ہے۔ حبشی قوم کی ترقی پذیر جماعت صرف امریکہ میں ہے۔ وہاں حبشی قانون دان بھی ہیں۔ دولتمند بھی ہیں۔ اُن کی جمعیتیں اتنی منظم اور اُن کے مطالبات اتنے وسیع ہیں کہ ایک دن حبشیوں کا مسئلہ امریکہ کے لئے سوہان روح ثابت ہوگا۔ اُس وقت امریکی قوم کو اپنے بچاؤ کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے پڑینگے۔ اُس آنے والے خطرہ کا سدباب صرف افریقہ میں ایک حبشی جمہوریت قایم کرنا اور انہیں امریکہ سے خارج کرنے میں مضمر ہے۔ اور یہ کام اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک انگلستان امریکہ سے موالات نہ کرے۔ پس لارڈ برکن ہیڈ کی یہ تصنیف بھی سیاسی چالوں سے خالی نہیں۔ اور اس میں سب سے بڑی چیز یہی ہے کہ کسی طرح سے امریکہ انگلستان کا دوست اور رفیق بن جائے +

ایک صدی بعد کا دوسرا تخیل

ہفتہ وار "تازیانہ" کے لئے "آب سے ایک صدی بعد کی ڈائری" کے عنوان سے ایک مضمون موصول ہوا تھا جس کا تخیل لارڈ برکن ہیڈ سے بھی بلند تر ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ باتیں ایک سو سال تک نہ ہو سکیں لیکن ہزار پانسو سال تک انسان کا وہاں تک ترقی کر لینا ناممکن نظر نہیں

آتا۔ اُس زمانہ کے انسان تبدیل آب وہوا کے لئے چاند اور مریخ میں چلے جایا کریں گے۔ ہوائی جہاز بچوں کو بطور کھلونا دیا جایا کریگا۔ ابتدائی تعلیم چھ ماہ میں ختم ہو جایا کریگی غذا فیکٹریوں اور ڈیریوں کے ذریعہ سے ہر شخص کے مکان پر مقررہ اوقات پر پہنچ جایا کریگی۔ فضا میں ریلوے اسٹیشن آرام گھر اور تفریح کے پارک ہونگے۔ ٹیلیفون اور تار کی ضرورت باقی نہیں رہیگی۔ بارش برسانے کے آلات فروخت فروخت ہوا کریں گے۔ اور جب کوئی شخص چاہے گا بارش برسا لیا کریگا۔ پیکن دارالخلافہ چین کا کوئی مزدور شام کا کھانا قاہرہ دارالخلافہ مصر میں کھا سکیگا۔ موجودہ زمانہ کے لوگوں کو اُس زمانہ کے علما جاہل اور بے وقوف سمجھیں گے۔ دنیا میں کوئی جنگ نہ ہوگی۔ ستاروں کے باشندے دنیا پر سیر و سیاحت کے لئے آئیں گے اور لوگ تعلیم صرف روحانی مفاد کے لئے حاصل کیا کریں گے"۔

ہندوستان کی سیاسی کیفیت

سردار اقبال علی شاہ جو بطور ایک افغان مصنف کے ہندوستان اور یورپ میں کافی مشہور ہو چکے ہیں۔ وہ گرافک اخبار میں سنہ ۱۹۵۰ء کے ہندوستان کی حالت پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:۔

ہندوستان کا سوراج سنہ ۱۹۵۰ء

دھوئیں سے بھرے ہوئے کرہ سے ایک آواز سنائی دی:۔

"آپ اپنی زبان سمیت واپس تشریف لیجائیں"

میں بیس سال بعد ہندوستان کو واپس آیا تھا۔ اس لئے ساحل ہند پر پہنچتے ہی ایسی آواز کو سن کر چونک پڑا۔ اور اُس کھڑکی میں سے اندر جھانکنے لگا جہاں سے یہ آواز آرہی تھی۔

ایک انگریز کھڑکی کی طرف پشت کئے ایک ہندوستانی بابوجی کے سامنے بیان کر رہا تھا کہ چونکہ اُس نے پاسپورٹ انگریزی حکام سے حاصل کیا تھا۔ لہذا وہ اس بات سے بری الذمہ ہے کہ اُس پر ہندی بھاشا کے دستخط نہ تھے۔ لیکن اگر اس غلطی کے لئے کچھ جرمانہ بھی دینا پڑے تو وہ دینے کو تیار ہے۔ لیکن اس پر بھی جب اُس نے یہ دیکھا کہ اُس کی شنوائی نہیں ہوئی۔ تو اُس نے آخری درخواست کی کہ اُسے کسی انگریز افسر سے ملنے کا موقع دیا جائے۔ تاکہ وہ اس کی وساطت سے اس معمولی سے جھگڑے کا تصفیہ کرا سکے۔

بابو نے ناک بھوں چڑھا کر کہا کہ صاحب بہادر کو شاید اپنی حیثیت کے متعلق غلط فہمی ہو رہی ہے۔ ہندوستان ایک آزاد ملک ہے۔ ہم اپنے قانون پر کسی کی برتری تسلیم نہیں کر سکتے کیسی انگریز افسر۔ قہ قہ قہ (بابوجی نے ایک فربہ جسیم منشی کی طرف دیکھ کر کہا) انگریز افسر کو منشی کیسی کہی۔

پنڈت جی (منشی جی) نے اپنی گاندھی کیپ کو سر پر درست کرتے ہوئے کہا ست ہے مہاراج۔ اب تو وہ نئے ہندوستانی صاحب بہادر پر آوازے کستا ہے (انگریز کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے) آپ جہاں سے آئے ہیں وہیں آپ کو واپس جانا ہوگا۔ کیونکہ پاسپورٹ پر ہندوستانی زبان میں دستخط ہونا ضروری ہے۔

بابوجی نے فیصلہ کن انداز میں منشی جی کی تقریر پر ان فقروں کا اضافہ فرمایا۔

میں سیدھا اُس ہوٹل میں پہنچا جس کو میں اپنے شباب کے زمانے میں آرام و آسایش کا گہوارہ سمجھا کرتا تھا۔ اُس کی عمارت مرمت طلب دکھائی دے رہی تھی۔ اسمیں

صرف انڈین نیشنل کانگرس کے معزز ممبر ہی قیام کیا کرتے تھے یا چند غیر سرکاری مشہور و معروف آدمی جن کو ہوٹل والے ٹھیرنے کی اجازت دے سکیں +

جب میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو نصف ساورن (اشرفی) دے باقی طلب کی تو وہ حیرت سے اچھل پڑا انگریزی سکہ! اور پھر اس نے پگڑی کے پیچ گھوستے ہوئے میری ہتھیلی پر پیتل اور چاندی کے غیر حروف سکے رکھ دیئے۔ میں نے اپنا بیگ ہوٹل کے ہال دروازہ کے چپراسی کی طرف بڑھایا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ گھڑیال آٹھ بجا رہا تھا۔ سامنے ہال میں تمام مسافر جمع ہوکر موسیقی کی دلکش تانوں میں بندے ماترم گا رہے تھے۔ ایک دیوار پر قومی جھنڈے کی تصویر منقش تھی۔ باقی دیوار پر مہاتما گاندھی اور ان کے مشہور معاونوں کی تصویریں تھیں۔ ان سب میں دلچسپ تصویر وہ تھی جس میں مہاتما جی ایک کنول کے پھول میں آلتی پالتی مار کر براجمان تھے۔ اور دیوتا ہیکل محمد علی گاندھی جی . . . . کے سر پر مور چھل ہلا رہے تھے۔ یہ تصویر ہندو مسلم اتحاد کی یادگار تھی +

طعام خانہ میں منتظم کی طرف سے ایک اعلان چسپاں تھا۔ کہ لوگوں کو جوتا اتار کر اندر آنا چاہئے (۲) گوشت صرف پرائیویٹ کمروں میں مہیا کیا جا سکتا ہے۔ (۳) ہوٹل میں داخل ہونے پر ہر شخص کو اپنے مذہب سے آگاہ کرنا لازمی ہے +

جب میں اپنا اسباب رکھ کر فارغ ہو گیا تو میں طعام خانہ کے افسر کے پاس پہنچا۔ اس نے میری لمبی لمبی ڈاڑھی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا:-

"تم مسلمان ہو یا سکھ؟ تم دوسرے کمرے میں کھانا کھا سکتے ہو کیونکہ یہ اونچی ذات کے ہندوؤں کے لئے مخصوص ہے" +

خادم آستینیں چڑھاتے ہوئے پیتل کے برتنوں میں چٹنی کھچڑی، ترکاری، سرکہ، دہی اور موٹی موٹی چپاتیاں لئے ہوئے دوڑے پھرتے تھے۔ کھانے والے آلتی پالتی مار کر چھوٹی چھوٹی چوکیوں کے سامنے بیٹھے تھے۔ ہال پر ہانی تصور ہوٹل تھا۔ کہیں سے چٹنی کہیں سے پیاز کی صدا آ رہی تھی۔ بس یہی اس ہوٹل والے ہندوستانی امرا کے مذاق کے لئے انگریزی ہوٹلوں کی بات میں دیسی کھانے کا اسلوب رکھا تھا ایک گویا اپنے دلکش نغموں سے مسافروں کو محظوظ کر رہا تھا۔ اور کھانے والے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد واہ استاد واہ!! کا نعرہ لگاتے تھے۔ واہ استاد واہ! کی آواز کے ساتھ پیتل کے برتنوں کی آواز شامل ہو کر اس تمام منظر کو زینت بناتی تھی۔ چٹنی اور پیاز کا مطالبہ کرنے والوں کے چہروں پر حزن و ملال کے آثار نمایاں تھے کہیں دو دو چار چار آدمیوں کی جماعتیں کسی اہم معاملہ پر بحث کرتی معلوم ہوتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی قریبی خطرے کا احساس انہیں متفکر بنائے ہوئے ہے آخر ایک عمر رسیدہ مرہٹے نے جو پارلیمنٹ کا ممبر تھا حقے کا ایک مباکش کھینچ کر کہا:-

"دو بہت اچھا۔ ذرا ان کو قریب آنے دو۔ اگر ڈاکوؤں کے سردار خانصاحب کے ہمراہی لاہور کے قریب آ گئے ہیں تو کیا ہوا۔ سنو دلی دور است۔ اس وقت کئی ممبر کمرے میں گھس آئے اور انہوں نے آتے ہی ہاتھ باندھ کر کہا

نمستے مہاراج نمستے!!

پھر وہ اس جم غفیر میں جو کھانے میں مشغول تھا گم ہو گئے +

ٹیلیفون کی گھنٹی کی آواز پر منیجر دوڑا ہوا گیا۔ اور ٹیلیفون میں منہ ڈالکر گھبرا گھبرا کر باتیں کرنے لگا +

م م میرا مکان۔ اور لاجی۔ میرا گرو۔ مہاتما انہوں
نے آگ لگادی۔ اس نے مار ڈالا۔ کیا کیا۔ کس نے مار
ڈالا۔ کس نے مار ڈالا۔ میں تباہ ہوگیا۔ بلوہ۔ ہندو مسلم فساد"

مجمع غم و غصّہ سے اپنے بال نوچنے لگا۔ اس خبر
سے تمام آدمیوں پر مردنی چھاگئی۔ شہر کے ہر حصّے سے
چیخ و پکار کی دلخراش آوازیں سنائی دینے لگیں۔
گاہے گاہے ایک گڑگڑاہٹ سی پیدا ہوتی اور
پھر ہو کا عالم۔ سیں سوں کرتی ہوئی دو گولیاں ہال کمرے
کے شیشوں کو توڑتی ہوئی نکل گئیں۔ ہندوستانی پارلیمنٹ
کے ممبر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ میں نے دیکھا کہ ایک
ہجوم اژدھے کی طرح تخت کف چھوڑتا۔ اور پارلیمنٹ کے
ممبروں کے خون کا مطالبہ کرتا ہوا بڑھا چلا آرہا تھا! یہ ہجوم
گولی چلانے والی جماعت پر پل پڑا۔ اور انہیں پاؤں
تلے روندتا اور کچلتا ہوا آگے نکل گیا۔ میں بازار کے ایک
کونے میں دبکا ہوا ہوٹل کو دیکھ رہا تھا۔ جو اب شعلوں کی
لپیٹ میں دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔

ہندوستانی پارلیمنٹ میں جس کے چاروں طرف
مرہٹوں اور گورکھوں کی فوجیں پہرہ دے رہی تھیں
داخل ہونے کے قبل مجھے اپنی داڑھی کی بھینٹ چڑھانی
پڑی۔ کھدر پہنے ہوئے میں محافظ کو بندے ماترم کہہ کر
اندر داخل ہوگیا۔ شام کا وقت تھا۔ اس لئے ہال
کے دروازہ پر بجلی کے سُرخ سبز جھنڈے جھلملا رہے
تھے۔ اس وقت ایک ممبر کھڑا ہوکر تقریر کر رہا تھا:۔

"دوستو۔ بھارت ماتا کے پوتر نام پر ہم سب یہاں
اہم قومی معاملات پر غور کرنے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں
(تالیاں) اب میرا فرض ہے کہ میں اس نازک اور
خطرناک وقت میں کوشش کروں کہ قوم کے سر سے
یہ مصیبت دور کروں (نعرہ ہائے تحسین) آج شام
ہوٹل کی آتشزدگی کا واقعہ دہرانے کی چنداں ضرورت
نہیں۔

ایک آواز "شاباش بیٹا!"

میرا مطلب یہ ہے کہ

ایک آواز تمہارا مطلب کیا ہے؟

میرا مطلب یہ ہے کہ زیر دفعہ ۲۴ ہمیں مسلمانوں
سے اچھے سلوک کا مطالبہ کرنا چاہئے۔"

ایک ممبر نے غراتے ہوئے ایک نسوار کی ڈبیہ
دے ماری جو مقرر کی بجائے سوہان جی کو جا لگی (خاموش
خاموش کی آوازیں۔ مارو مارو کی آوازیں) یکایک بجلی بجھ
گئی۔ جب پھر روشنی ہوئی تو میری نگاہیں اس منظر کو ایک
خواب سمجھنے لگیں۔ جو میرے سامنے تھا۔ میں نے آنکھیں
مل مل کر دیکھا کہ کہیں یہ بیداری خواب نہ ہو۔ لیکن یہ
حقیقت تھی۔ میں نے دیکھا کہ ایک تنومند گرانڈیل وضع کا
قد آور شہ زور پٹھان اپنے دائیں ہاتھ میں تلوار اور بائیں
سے مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا بڑے دروازے میں کھڑا
تھا۔

ہال کے باقی سات دروازوں پر بھی ستواں ناک
اور باز کی سی تیز آنکھوں والے خیبر کے پٹھان راستہ
روکے کھڑے تھے۔ ہندوستانی صدر سیدھا کھڑا ہوگیا
اور کڑک کر پوچھا کہ ایوان حکومت میں اس ناشائستہ
حرکت کی وجہ بیان کی جائے۔ اور بیان کیا جائے کہ
قانونی نکتہ نگاہ سے یہ فعل جائز ہے؟

سرنگا سردار کی نگاہیں تمام ہال کا جائزہ لے رہی
تھیں۔ اس نے اپنا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا "ٹھہرو"
"ماش کی دال اور کھچڑی کھانے والو۔ زبان کو لگام

دو۔" اُس نے ہندو پردھان کی طرف متوجہ ہو کر کہا:۔

"...تمہاری باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔" افغان سردار نے اپنے سکھ ہمراہی سے کہا۔ کیا تم اس چڑیا کی چوں چوں سمجھ کر ہماری پہاڑی زبان میں بتلا سکتے ہو کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ بہادر سردار سندر سنگھ نے جو جنگجو پٹھانوں کی دلیری کا ثنا خواں تھا۔ اُس نے ایوان حکومت کو مخاطب کر کے کہا کہ

"بابو لوگوں نے ہندوستان پر کافی سے زیادہ حکومت کر لی ہے۔ اب پنجاب کی جنگجو قوموں اور افغانوں نے عزم کر لیا ہے کہ وہ ہندوستان میں انگریزوں کی گدی کو سنبھال لیں۔"

ایک ممبر نے جس کے سر پر ایک گول سی ٹوپی تھی اور جو پان چبا رہا تھا۔ اسے سکھ بہادر کی باتوں پر یقین نہ آتا تھا۔ اُسے شک تھا کہ اکبر خاں کے تیس ہزار جانفروش ساتھی دہلی پر چھائے ہوئے ہیں۔ اس نے وحشیانہ طاقت کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے اس معاملہ کو جمعیت الاقوام میں پیش کرنا ضروری سمجھا۔ "پردھان جی۔ میں التوائے اجلاس کی تحریک پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ تاکہ اُن اشخاص کے خلاف عملی کارروائی کی جا سکے جنہوں نے ایوان حکومت کی شان...."

"بس بس"! اکبر خاں نے ممبر کو کالر سے پکڑتے ہوئے گرج کر کہا۔ اکبر خاں اپنے بھاری پاؤں سے اس بنگالی منطقی ممبر کو کچلنے ہی لگا تھا کہ سردار سندر سنگھ نے روک دیا اور خوفزدہ بابو کو چھڑا لیا۔ اکبر خاں نے بابو جی کو مخاطب کر کے کہا:۔

خدا کا شکر کرو کہ اُس نے تم پر نظر کرم کی ہے۔ مجھے اپنے خالصہ دوست کا لحاظ نہ ہوتا تو میں تمہیں مسل ڈالتا۔

اکبر خاں نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ ان تمام کو پکڑ لو اور باہر لے چلو۔

چند منٹوں کے بعد پارلیمنٹ کے دو سو ارکان ایک احتجاجی جلوس کی شکل میں پٹھانوں اور سکھوں کے نرغہ میں لال قلعہ کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دیئے جہاں انہیں قید کر دیا گیا۔ اگلے دن پہاڑی جنگجو سردار فتحمندانہ انداز میں گھوڑے پر سوار جامع مسجد میں نماز کے لئے جا رہا تھا۔

ہندوستانی پارلیمنٹ کے ممبر اس ناگہانی اُفتاد سے بددل نہیں ہوئے۔ اور اُنہوں نے اپنا دارالسلطنت بجائے دہلی کے ناگپور تبدیل کر لیا۔ وہ شمالی ہند سکھوں اور مسلمانوں کے چھوڑ گئے۔

ناگپور میں جب کانگرس پارلیمنٹ کا پہلا اجلاس ہوا تو یہ وحشت اثر خبر سنی گئی کہ مرہٹوں نے بمبی پر قبضہ کر لیا ہے۔ بنگالیوں نے ناگپور کی پارلیمنٹ میں اس امر کا نوٹس دیدیا کہ وہ بنگال کے لئے خود حکومت قایم کرینگے۔ اچھوتوں کے مدراس پر قبضہ کرنے کی خبر پہنچی یہاں تک کہ ناگپور میں کانگرس پارلیمنٹ کا کچھ بھی باقی نہ رہا۔

یہ ہے ۱۹۵۰ء کے سوراج کی تصویر جو ایک افغان مصنف نے کریفک میں دکھائی ہے۔ بلاشک قوم پرستانہ نکتہ نگاہ سے یہ تحریر دل آزار سمجھی جائے گی لیکن ہندوستانی ذہنیت اور تنگ خیالی کو اگر ملحوظ رکھا جائے جس کے ہندو مسلمان دونوں شکار ہیں۔ تو یہ منظر ہماری بدبختی پر دال ہے۔ "افغان ہوا" کا غل مچانے والے دیکھ لیں کہ انگلستان کے مشہور اخبار میں "ہندوستانی قوم پرستی" کا بھانڈا کس بے عزتی کے چوراہے میں پھوڑا گیا ہے۔

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے۔ جسے ایک اقلیم
سمجھنا چاہیئے یہاں اس حالت میں مرکزی حکومت صرف اسی
صورت میں قایم رہ سکتی ہے جب کہ مضبوط اتحاد و
پر اقتدار ہو۔ ہندوستانی سرحد کا مسئلہ اسقدر پیچیدہ اور
لاینحل ہے کہ انگریزی حکومت اپنے پچاس سالہ دور
امن و اقتدار میں بھی ایک پیچ بن رہی ہے اور ہندوستانی
مالیہ کا بیشتر حصہ فوجی ضروریات پر خرچ ہوتا رہا ہے۔ کہ
مشہور مسلمان مدبر نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ہندوستان میں
سوراج قایم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ کراچی سے ...
تک اور ... سے لیکر پشاور تک ایک اسلامیہ جمہوریہ
حکومت قایم ہو جائے۔ جسے ہندوستانی حکومت باوجود
اکثریت طاقت کے بھی مٹا نہ سکیگی۔ اور دنیائے اسلام
میں ایک اور آزاد اسلامی حکومت کا اضافہ ہو جائے گا۔
جس کی پشت افغانستان و بلوچستان۔ ایران۔ عراق۔ عرب
اور ترکی سے ملی ہوگی۔ اس مدبر نے سکھوں اور مسلمانوں
کے مسئلہ پر بھی روشنی ڈالی تھی اور کہا تھا کہ سکھ ایسے بیوقوف
نہیں کہ وہ کسی کمزور جماعت کا ساتھ دینگے۔ بلکہ وہ اس وقت
بھی مسلمانوں کا ساتھ دینے پر مجبور ہوں گے اور دونوں اقوام
کا اتحاد ہندو سکھ اتحاد سے زیادہ ممکن ہے۔ سردار اقبال علی
شاہ نے بھی اس مضمون میں اکرم خاں کے ساتھ ایک سکھ
نائب دکھا کر اس نظریہ کی تائید کی ہے ⁂

افغانی یا اسلامی ہونے کا اثر ہندوستانی سیاسیات
پر اسقدر گہرا ہے کہ ہم نیرنگ خیال سے غیر سیاسی اور غیر
فرقہ وار پرچہ میں بھی چند سطریں لکھنے سے اپنے آپ کو بچا
نہیں سکے۔ ہمارے خیال میں ہندو مسلم اتحاد باہمی رواداری
اور ایک دوسرے کی عزت کرنے میں مضمر ہے۔ جب تک
ہندو مسلمانوں کی اتنی مدد نہ کریں گے کہ انکی کمزوریاں دور
ہو جائیں اور مسلمان ہندوؤں کی اتنی امداد نہ کریں گے کہ انکی
خامیاں پوری ہو جائیں۔ تب تک آزاد اور متحدہ ہندوستان
کا خواب کبھی بھی درست ثابت نہ ہوگا ⁂

ایک صدی بعد کی معاشرتی کیفیت

سنہ ۲۰۳۰ء کی دنیا پر جسقدر بیانات ہم اوپر شایع کر چکے ہیں۔
ان میں سب سے دلچسپ وہ ہے جو ایک صدی بعد کی معاشرتی
کیفیت کو بے نقاب کرتا ہے۔ مسٹر ... سیاسیات کے ماہرین
کا اندازہ ہے کہ سنہ ۱۹۹۲ء میں عورت اور مرد کے تعلقات
کسی صورت میں میاں بیوی کے تعلقات نہ ہوں گے۔
مسٹر اینڈر موروث کا بیان ہے کہ سنہ ۱۹۴۰ء تک بہت سے
لوگ شادی بیاہ کی بندھنوں سے آزاد ہو جائیں گے۔
سنہ ۱۹۵۰ء میں ایک ایسے شخص پر مقدمہ چلایا جائے گا جو اپنی
بیوی کا وفادار خاوند ہوگا۔ گویا سنہ ۱۹۵۵ء میں کسی مرد کا اپنی
بیوی سے وفا کرنا یا ایک ہی بیوی سے محبت کرنا سوسائٹی
کی توہین قرار دے کر اس پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ سنہ ۱۹۶۰ء
میں عورتیں اور مرد کپڑے پہننا ترک کر دیں گے اور ننگوں
کی نوآبادیاں جرمن اور سویڈن و ناروے میں بن جائینگی۔
یورپ کی تمام آبادی مادر زاد برہنہ ہوگی ⁂

مندرجہ بالا تصریحات کو ہم طوالت دینا پسند نہیں کرتے اور نہ ہی
مسٹر اینڈر موروث کے مضمون کو یہاں نقل کرنا چاہتے ہیں مسٹر
اینڈر موروث کا خیال ہے کہ سنہ ۱۹۹۲ء تک تمام یورپ میں برہنگی
تہذیب اور شرافت کی سب سے بڑی نشانی ہوگی۔ مسٹر اینڈر موروث
نے اپنے مضمون کیساتھ جو تصاویر دی ہیں انمیں سے ہم صرف ایک یہاں پیش
کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ اسمیں ایک ننگ دھڑنگ سپاہی دو مردوں اور
عورتوں کو اس جرم میں گرفتار کئے لئے جاتا ہے کہ انہوں نے کپڑے پہن رکھے ہیں
دیکھئے سنہ ۱۹۹۲ء تک مشرق اپنی روایات قدیم کو قائم رکھنے میں کامیاب ہوگا یا نہیں

۱۹۹۲ء - میں سپاہی لباس پہنے والے مردوں و عورتوں کو گرفتار کرلیں گے -
کیونکہ اُس وقت برہنگی ہی تہذیب کی سب سے بڑی علامت ہوگی -

آرام جان مسہری
مکھیوں اور مچھروں سے خدا کی پناہ، رات کی نیند دوپہر کا آرام حرام کر دیتے ہیں اور مچھروں کے کاٹنے کا نتیجہ تو تپ ملیریا کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔ آج آپ ہی اپنے اور اپنے بال بچوں کے لئے ہم سے اعلیٰ درجے کی ولایتی نفیس جالی کی نفیس مسہریاں طلب فرمایئے اور چین کی نیند سوئیے ان کے استعمال سے موسمی بخار کا خطرہ بالکل نہیں رہتا
قیمت صرف چھ روپے آٹھ آنے فی عدد سائز ۶ فٹ x ۴ فٹ معمولی چارپائی اور بڑے پلنگ کے لئے یکساں کارآمد
اخبار کا حوالہ دینے سے پیکنگ مفت
ملنے کا پتہ ایس احمد اینڈ کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۱۴۵ لاہور

حُورؔبانو

ایک افسانہ بطرزِ ڈراما

(کوہستانی علاقہ کی ایک پیچ دار سڑک پر ایک بند گاڑی سرپٹ دوڑی چلی آ رہی ہے۔
کوچوان گھوڑوں کو تیز کرنے کے لئے [illegible] پر سانٹے رسید کئے چلا جاتا ہے۔ ایک خاتون
گاڑی کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر گھوڑوں کو تیز کرنے کی بار بار تاکید کرتی ہے۔ یکایک
گاڑی رُکتی ہے۔ اور خاتون بڑی گھبراہٹ اور پریشانی سے نیچے اترتی ہے +
ٹھیک اسی وقت مقابل سمت سے ایک سوار گذرتا ہے۔ خاتون [illegible])

خاتون۔ خدا کے لئے ذرا رک جائیے!!! اس جنگل میں دو
نوجوان بھوکے شیر کی طرح ایک دوسرے کو ہلاک
کرنے کی کوشش کر رہے ہیں میرے ساتھ میرے
پیچھے تشریف لائیے!!!
(خاتون سوار کے جواب کا انتظار کئے بغیر دیوانہ وار
جنگل میں گھس جاتی ہے۔ نووارد بھی گھوڑے
کی باگ کوچوان کو دے کر خاتون کے پیچھے لپکتا ہے)
(جنگل کے اندر دو نوجوان برہنہ تلواریں لئے
ایک دوسرے پر وار کر رہے ہیں]
خاتون۔ ٹھیرو! ٹھیرو!! خدا کے لئے یوں ایک دوسرے
کو ہلاک نہ کرو!
مردِ خدا! نہیں، رکو۔ کیا تم نہیں دیکھتے۔ یہی ہیں وہ
دو نوجوان جو ایک دوسرے کا خون بہانا چاہتے ہیں۔
(نووارد نے تلوار میان سے کھینچ کر ان دونوں
کی تلواروں پر زور سے ماری اور خود کو دونوں
کے درمیان ڈال دیا]

نووارد۔ بس رُک جاؤ۔ شریف انسان بنو +
(دونوں علیحدہ علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اور حیرت سے
نووارد کا منہ دیکھنے لگتے ہیں)
نووارد۔ تم کون ہو تم کیوں لڑ رہے ہو۔ یہ عورت کون
ہے!!! ؟
افضل خاں۔ (لڑنے والوں میں سے ایک) یہ عورت اس تمام
فساد کی بنیاد ہے۔ یہ خوبصورت اس علاقہ کی حسین
ساحرہ ہے۔ جس کے حسن و جمال پر ہم دونوں رقیب
پروانہ وار مٹنے والے ہیں۔ یہ حور بانو ہے۔
کوہستان کی حور +
نووارد۔ لیکن اس جنگ کا سبب؟
اکبر خاں۔ (دوسرا آدمی) دونوں میں سے ایک کو راستہ
سے ہٹانے کا ذریعہ۔ جب تک ہم دونوں زندہ ہیں
یہ ایک کو پسند نہیں کرے گی۔ کمزور عورت دو سال سے
ہمارے درمیان فیصلہ نہیں کر سکی۔ ہمارا فیصلہ اب
تلوار کرے گی +

نووارد۔ تم دونوں کون ہو؟

افضل خاں۔ میرا نام افضل خاں اور میرے رقیب کا نام اکبر خاں ہے۔ ہم اس علاقہ کے باشندے اور حوربانو کے قصبہ کے معزز آدمی ہیں +

نووارد۔ بہت خوب! دوستو! لیکن ایک عورت سے محبت کرتے ہو تو اس کی عزت کی نگہبانی کرنا اور اُسے بدنامی سے بچانا بھی تمہارا فرض ہونا چاہئے اگر تم دونوں میں سے ایک مر گیا تو تمام علاقہ میں حوربانو کی بدنامی کا باعث ہوگا۔ بہادرو تلواریں میان میں کرو۔ حوربانو! اب اس جنگ کا خاتمہ تمہارے صرف ایک لفظ پر موقوف ہے۔ تمہارے ایک لفظ میں ان دو بہادروں کے لئے امان پوشیدہ ہے +

حوربانو۔ نہیں نہیں۔ آپ مجھے اس بات پر مجبور نہ کیجئے میں ان دونوں کی منت کرتی ہوں۔ ان کے پاؤں پڑتی ہوں لیکن ....

نووارد۔ لیکن تمہیں دونوں میں سے ایک کو پسند کرنا ہوگا۔

حوربانو۔ یہ میرے لئے ناممکن ہے +

نووارد۔ دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں۔ دونوں میں سے ایک کو دوسرے پر فوقیت ضرور ہوگی۔ ایک کو دوسرے پر معمولی سی ترجیح دینے سے ایک بہت بڑے جھگڑے کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ جلدی۔ محترمہ خاتون جلدی +

حوربانو۔ اے میرے خدا میں کیا کروں؟

نووارد۔ ایک شریفانہ فیصلہ۔ بولو۔ بولو۔ دونوں میں سے ایک کی طرف اشارہ ہی کردو +

حوربانو۔ یہ ہے۔ یہ ہے۔ ہائے میرے اللہ اب کیا ہوگا۔ (افضل خاں کی طرف اشارہ کرتی ہے)

(افضل خاں فتح و نصرت کا نعرہ لگاتا ہوا حوربانو کے قدموں پر گر پڑتا ہے۔ اور اُس کے دامن پر بوسہ دیتا ہے حوربانو منہ پھیرے کھڑی ہے]

اکبر خاں گھوڑے پر سوار ہو کر کہتا ہے:۔

"حوربانو اس ظلم کا بدلہ خوفناک ہوگا" اور جنگل میں غائب ہو جاتا ہے +

[تینوں سر جھکائے خاموشی کے ساتھ آہستہ آہستہ سڑک کی طرف آتے ہیں۔ حوربانو گاڑی میں بیٹھ جاتی ہے۔ اور افضل خاں اور نووارد گاڑی کے ساتھ ساتھ روانہ ہوتے ہیں]

دوسرا منظر

افضل خاں کا دیوانخانہ

[ایک مسند پر افضل خاں اور دوسری پر نووارد بیٹھا ہے۔ ان کے درمیان یوں گفتگو شروع ہوتی ہے]

افضل خاں۔ میرے محسن کا نام؟

نووارد۔ شیر گل +

افضل خاں۔ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں۔ اور کدھر کا ارادہ ہے؟

شیر گل۔ میں ذخ پور سے آ رہا ہوں اور جلد از جلد غیر علاقہ میں پہنچ جانا چاہتا ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ میری منزل مقصود کیا ہے۔ لیکن جتنی جلدی میں اس سرزمین سے چلا جاؤں اُتنا ہی بہتر ہوگا +

افضل خاں۔ کیوں۔ وہ کیا اسباب ہیں جنہوں نے تمہیں وطن عزیز سے تمہیں اتنا متنفر بنا دیا؟

شیر گل۔ دنیا میں ایسے واقعات بکثرت پیش آتے ہیں۔ جو انسان کی مسرتوں کو ملیا میٹ کر دیتے ہیں

افضل خاں۔ عزیز دوست جس وقت سے میں تم سے ملا ہوں۔ میرے دل میں تمہاری محبت کا گہرا نقش جم چکا ہے۔ تمہاری مصیبت اب میری مصیبت اور تمہاری پریشانی اب میری پریشانی ہے۔ کاش کہ آپ مجھے آپ بیتی سنا سکیں ٭

(شیر گل کچھ پس و پیش کے بعد اپنی کہانی یوں سناتا ہے)

شیر گل کی آپ بیتی

میں فرخ پور کا رئیس اور جاگیردار ہوں۔ میرا خوبصورت مکان سبزہ زار کے کنارے آباد ہے۔ وسیع املاک میرے قبضہ میں ہیں۔ پہلی بیوی کے فوت ہو جانے پر میں نے ایک حسین عورت سے شادی کی۔ اور ہم دونوں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے لگے۔ لیکن فلک کج رفتار کسی کو چند گھڑیاں آرام سے بسر کرتے نہیں دیکھ سکتا۔ ہماری مسرتوں کی بہار پر سردار شیر علی کی آمد خزاں کی طرح چھا گئی۔ شیر علی میرے علاقہ کی مختصر ریاست کا مالک اور بہت با اثر اور صاحب حشمت و جاہ سردار تھا۔ ایک دن وہ شکار سے تھکا ماندہ ہمارے سامنے طالب امداد پہنچا۔ اُس وقت ہم میاں بیوی دونوں باغ میں مصروف گلگشت تھے۔ اس حرکت اضطراری کے دوران میں میری بیوی کی نگاہ اُس پر اُس کی میری بیوی پر پڑی۔ اس ایک لمحہ میں کاتب قدرت نے ہماری زندگی کی کتاب میں جو نیا باب شروع کیا میں اُس سے قطعاً لاعلم تھا ٭

میں سردار شیر علی کی ہر طرح سے خاطر و مدارات کی۔ اُس کے آدمیوں کے آرام و آسایش کا انتظام کیا لیکن افسوس کہ یہی ملاقات میری بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ شیر علی میری خوبصورت بیوی کی محبت میں گرفتار ہو کر میری رسوائی کے لئے دوستی کے پردہ میں دشمنی سے کام لینے لگا ٭

شیر علی نے مجھ سے راہ و رسم بڑھانے میں مبالغہ سے کام لیا۔ وہ بار بار مجھے اپنے علاقے میں سیر و شکار کے لئے دعوت دیتا اور بار بار میرے مکان پر خود آتا۔ وہ تحائف سے مجھے لاد دیتا۔ افسوس کہ اُس کی تمام حرکتوں کو میں اخلاص پر مبنی سمجھتا رہا ٭

ایک دن میں شکارگاہ میں تھا کہ ایک وفادار خادم ہانپتا کانپتا میرے پاس پہنچا۔ اُس نے مجھے بتلایا کہ میری غیر حاضری میں مرزا شیر علی اکثر بھیس بدل کر اکثر وہاں آیا کرتا ہے۔ اور آج بھی میری بیوی کے کمرہ میں موجود ہے ٭

دنیا میری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ میں بگولے کی طرح اُٹھا اور آندھی کی طرح اپنے مکان پر پہنچا۔ اور پیشتر اس کے کہ وہ سنبھلتے میں نے ان دونوں کو پیار و محبت کے ساتھ ایک ہی پلنگ پر بیٹھے ہوئے پایا ٭

مجھے غیض و غضب کی حالت میں دیکھ کر شیر علی نے پستول کمر سے نکال کر مجھ پر داغ دیا۔ لیکن جلدی میں اُس کا وار نشانہ پر نہ بیٹھا۔ میں نے اپنی بے پناہ تلوار کو نیام انتقام سے کھینچا اور اُس پر پل پڑا۔ تلوار پہلے ہی وار میں اُس کے سینہ سے پار نکل گئی ٭

شیر علی سے فارغ ہو کر میں اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا۔ جو زندہ تھی مگر مردوں سے بدتر۔ خوف و ندامت سے نڈھال ہو رہی تھی۔ میں نے کہا بدمعاش اپنی کرتوت کا بدلہ لے۔ یہ کہتے ہوئے میں نے وہی تلوار جو اُس کے عاشق کے خون سے تر تھی۔ اُس کے سینہ میں بھونک دی۔

جس وقت میں ان دونوں گنہگاروں کو ذلت کی نیند میں سلا چکا۔ تو میں نے وہاں سے فرار ہونے میں یکلخت

بھی ضایع نہیں کیا۔ میں نے قیمتی زر و جواہر جمع کر کے اپنی
کمر میں باندھے۔ اور باد رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے
بھاگ نکلا۔ اس سفر کے دوران میں مجھے سڑک کے کنارے
حور بانو سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ جس نے دو انسانوں کی
جان بچانے کے لئے مجھ سے امداد طلب کی۔ اس کے
بعد جو کچھ ہوا وہ تمہیں معلوم ہے۔

افضل خاں۔ (شیر گل سے ہاتھ ملاتے ہوئے اور اس کے
کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے) بھائی تم بہادر اور
غیور ہو۔ آج سے تم مجھے اپنا دوست، رفیق اور بھائی
سمجھو۔ یہ گھر تمہارا گھر اور یہ مال و دولت تمہارا ہے۔
تم اطمینان رکھو کہ حکومت کے کارندے میری امان
سے تمہیں چھین کر نہیں لیجا سکتے۔ میرا ماموں اس
علاقہ کا گورنر ہے۔ میں اس کی وساطت سے تمہاری
معافی اور تمہاری جائداد کی واپسی کی سفارش بھجواتا
ہوں۔ جبتک تمہیں معافی نہ ملے۔ تم یہاں کامل
آزادی اور امن و حفاظت سے رہو۔

(شیر گل افضل خاں سے بغلگیر ہوتا ہے۔ اور
دونوں دوست چائے پینے میں مشغول ہو جاتے ہیں)

منظر سویم

حور بانو کا مکان

(ایک پرانی وضع کا محل۔ ڈیوڑھی پر دو مسلح
پہرہ دار کھڑے ہیں۔ ایک آراستہ کمرہ میں چمکیلے
فرش پر قالین وغیرہ بچھے ہیں۔ حور بانو نقاب
اوڑھے بیٹھی ہے۔ ایک شخص کچھ کاغذات پیش
کر رہا تھا۔ وہ ہدایات لے کر چلا جاتا ہے۔ حور
بانو نقاب الٹ کر ایک ریشمی رومال پر پھول
کاڑھنے میں مشغول ہو جاتی ہے۔ حور بانو کا تخیل
اس کے سامنے شیر گل کا تصور پیش کرتا ہے۔ وہ
آہ سرد بھرتی ہے۔ ایک سیاہ فام حبشی النسل
خادمہ آ کے شیر گل و افضل خاں کی آمد کی اطلاع
دیتی ہے۔ حور بانو انہیں کمرہ میں طلب کرتی ہے
دونوں آ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ خادمہ پنکھا کرتی ہے]
حور بانو رومال کاڑھتی جاتی ہے۔ اور کنکھیوں سے
شیر گل کو بار بار دیکھتی ہے۔

حور بانو۔ (افضل خاں سے) محترم مہمان کا اسم گرامی؟

افضل خاں۔ آپ کا نام شیر گل ہے۔ ایک معزز رئیس ہیں
دنیا کی سیاحت کے لئے گھر سے نکلے تھے۔ مگر میں نے
انہیں روک لیا ہے۔ آج سے ہم دونوں بھائی ہیں۔

شیر گل۔ میں افضل خاں کی مہمان نوازی کا شکرگذار
ہوں۔ آپ نے مجھے اپنا بھائی بنا کر میری عزت
افزائی کی ہے۔ انشاءاللہ وہ مدت العمر مجھے اس کا
اہل پائینگے۔

حور بانو۔ میری دعا ہے کہ معزز مہمان ہمیشہ ہماری مسرتوں
کی نگہبانی کرتا رہے۔

شیر گل نے اشارہ سے شکریہ ادا کیا۔
افضل خاں نے شطرنج شیر گل کے سامنے بچھا دیا۔
اور دونوں دوست کھیل میں مصروف ہو گئے۔ حور بانو
بھی ان کے کھیل میں کسی وقت دلچسپی کا اظہار کرتی اور
رومال پر پھول کاڑھنے لگتی۔ شطرنج کے کھیل میں وہ شیر گل
کی حمایت کرتی تھی۔ اور اس کی بات کا خاص توجہ سے
جواب دیتی۔ حور بانو کی ہمراز خادمہ نے پہچان لیا کہ حور بانو
افضل خاں سے نہیں شیر گل سے محبت کر رہی ہے۔

منظر چہارم سیرگاہ

[افضل خاں اور شیر گل چند خادموں کے ساتھ شکار کھیل رہے ہیں۔ پرانی وضع کی چند توڑے دار بندوقیں کچھ بارود اور شکاری ہمراہ ہیں۔ شکار میں خوب کامیابی ہوتی ہے۔ چھوٹا سا کیمپ ایک سبزہ زار میں نصب ہے۔ شیر کو ہلاک کیا جا رہا ہے۔ شیر گل اور افضل کیمپ سے دو چار قدم چل قدمی کرتے ہوئے بڑھتے ہیں۔ ان کا موضوع گفتگو صرف حور بانو ہے]

افضل خاں۔ دوست وہ تمہیں یاد کرتی ہے؟

شیر گل۔ مجھے یقین نہیں آتا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟

افضل خاں۔ مگر وہ تمہاری طرف ترچھی نظروں سے دیکھتی۔ تمہاری باتیں دلچسپی سے سنتی اور تمہاری بے حد مدارات کرتی ہے۔

شیر گل۔ اس لئے کہ میں تمہارا عزیز مہمان ہوں۔

[دو سامنے چند ہرن نظر آتے ہیں]

افضل خاں۔ وہ دیکھو شکار۔ (بیتابی سے)

شیر گل۔ چھوڑو بھی۔ حسن و عشق کی پر لطف باتوں میں شکار کا شغل کیسا۔ وہ دیکھو آفتاب مغرب میں چھپ کر تمام فضا کو شفق سرخ میں تبدیل کر رہا ہے۔ کیا تمہیں اس میں حور بانو کے سرخ سرخ عنابی ہونٹوں کی رنگینی معلوم نہیں ہوتی۔ کیا تم محسوس نہیں کرتے کہ قدرت نے اپنے پاؤں حنائی رنگ میں رنگین کر لئے ہیں۔ ابھی چند لمحوں میں ماہتاب انگڑائی لیتا ہوا نمودار ہوگا۔ اور پھر ———

افضل خاں۔ (آہ سرد بھرتے ہوئے) اور پھر؟

شیر گل۔ سنسان رات اپنی خاموش زبان سے ایک افسانہ موہوم تمہاری آنکھوں کے سامنے پیش کر دیگی۔ جب تمام دنیا تمہارے ہمراہیوں سمیت نیند کی آغوش میں مدہوش پڑی ہوگی۔ تم ماہتاب کے حسن و جمال میں کیا کچھ تلاش نہیں کرو گے۔ اور کیا کچھ نہیں پاؤ گے۔ خوشگوار ہوا سرسراتی ہوئی تمہارے کان میں کیسی کیسی سرگوشیاں کریگی۔ اور تنہائی کی یہ گھڑیاں خیالات کی لہروں پر تمہیں کہاں سے کہاں لیجائینگی؟

افضل خاں۔ دوست تم ہندوکش کی پہاڑی کی جگہ عمر خیام کے ایران میں پیدا ہوتے تو زیادہ موزوں تھا۔ تم میرے دل کو اپنی رسیلی اور پیاری پیاری باتوں سے موہ لیتے ہو۔

[دونوں گلاب کے پھولوں کے تختہ کے پاس پہنچے ہیں۔ شیر گل دو خوبصورت پھولوں کو جو ایک ٹہنی میں لگے ہوئے تھے اتار کر افضل خاں کو پیش کرتا ہے۔ ایک چشمہ کے کنارے پہنچ کر دونوں اس کے سرد اور شفاف پانی کو پیتے۔ منہ ہاتھ دھوتے اور کمر بند کھول کر لیٹ جاتے ہیں شیر گل اپنی مخفی محبت کے راز کو چھپاتے رکھنے کی پوری پوری سعی کرتا ہے]

افضل خاں۔ مگر جتنی بار میں حور بانو کے پاس تنہا جاتا ہوں۔ وہ مجھ سے تمہاری غیر حاضری کا جواب طلب کرتی ہے۔

شیر گل۔ تم کہدیا کرو کہ اسے کوئی کام تھا۔ وہ باہر گیا ہوا ہے۔ وہ نہیں آتا۔ وہ مصروف ہے۔

افضل خاں۔ مگر اسے ان باتوں سے مطلق تسلی نہیں ہوتی۔ بلکہ طیش میں آکر اس نے کہا کہ مجھ سے نہ ملنے کی بھی کوئی وجہ ہو سکتی ہے؟

شیر گل۔ میری محبت کا اظہار نہ کردیا ہوتا!
افضل خاں۔ آخری ملاقات کے وقت میں نے تمہاری غیر حاضری کا سبب اُسے یہ بتلایا کہ وہ ایک حسین عورت کے عشق میں دیوانہ ہو رہا ہے۔ اور ہر روز اُس سے ملنے کے لئے چلا جاتا ہے +
شیر گل۔ اس سے اُس کی تسلی ہوگئی ہوگی +
افضل خاں تسلی؟ نہیں صاحب وہ اس سے اور زیادہ پریشان ہوگئی وہ کہنے لگی کہ ایک عورت کی محبت اُسے دوستوں سے تو علیحدہ نہیں کر سکتی +
شیر گل۔ یہ عجب مصیبت ہے +
افضل خاں۔ مگر تمہیں حور بانو سے نہ ملنے میں کیا لطف آتا ہے۔ یہ کج روی کوئی معنی نہیں رکھتی
شیر گل۔(بات ٹالنے کی غرض سے) اُٹھتے ہوئے آؤ کیمپ کی طرف چلیں +
افضل خاں۔ مگر شہر پہنچتے ہی تمہیں حور بانو کے پاس ضرور جانا ہوگا!

منظر پنجم

حور بانو کا مکان شیر گل اور حور بانو کی ملاقات

(شیر گل تازہ شکار کے خوان دو خادموں کے سروں پر رکھوائے ہوئے داخل ہوتا ہے حور بانو انہیں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور باورچی خانہ میں بھجوا دیتی ہے۔ شیر گل رخصت چاہتا ہے۔ حور بانو اصرار کرتی ہے کہ تازہ شکار کے کباب بن کر آتے ہیں وہ کھا کر جانا)

حور بانو۔(از راہ تمسخر) کہئے آپکی محبوبہ کا کیا حال ہے؟
شیر گل۔ محبوبہ؟ با خوش و خورم ہے اور آپکی خدمت سلام عرض کرتی ہے!
حور بانو۔(غصہ اور رنج کو دباتے ہوئے) کون ہے؟
شیر گل۔ افسوس کہ میں اُس کا نام نہیں بتلا سکتا!
حور بانو۔ تم۔ تم جو ایک جانفروش بہادر ہو۔ ایک عورت کے سامنے یوں ہتھیار ڈالدیتے ہو اور اُس کا نام تک نہیں بتلاتے۔ ایک عورت کی خاطر اپنے دوستوں کو پس پشت ڈال دیتے ہو اور اُن سے ملاقات تک کرنے نہیں آتے۔ تمہاری اس قابل اعتراض روش کی تمام ترذمہ داری صرف اسی صورت میں تم پر عائد نہیں ہوسکتی کہ تم اس بات کا اقرار کرو کہ تمہاری محبوبہ نے تمہیں دوستوں سے ملنے سے روک رکھا ہے۔ اور یہ کہ تم میں اُس کے احکام کی خلاف ورزی کی جرات نہیں +
شیر گل۔(سر جھکا کر) محترمہ میں اپنے فیصلہ سے گریز نہیں کر سکتا۔ میرا فیصلہ صحیح اور بہتر ہے +
حور بانو (کھڑی ہوکر) نہیں تمہیں بتلانا ہوگا۔ کیا تم میری خواہش کو پورا نہ کرو گے!
شیر گل (بیتاب ہوکر) جو کچھ مجھے بتلانے پر مجبور کیا جارہا ہے۔ اُس کی تمام ترذمہ داری آپ پر عاید ہوگی۔ سنئے میں اپنے دل کا راز مجبوراً آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں +
میرے فرار کی داستان تم افضل خاں سے سن چکی ہو میں بڑی عجلت کے ساتھ اپنے وطن سے بھاگا۔ یقیناً اُس وقت میرے دل میں عورتوں کے لئے کوئی جگہ باقی نہ تھی۔ کہ سڑک کے کنارے تم عجب سراسیمگی کی حالت میں مجھے ملیں۔ اور تم نے اس انداز میں مجھ سے امداد طلب کی کہ میں پہلی نگاہ میں

ہی تیر نظر کا گھائل ہو گیا۔ اور مجھے خود تعجب ہوتا ہے
کہ کس طرح سے میرے دل میں تمہارے لئے
محبت پیدا ہو گئی۔ اس کے بعد تمہاری سلیقہ مندی
حسن ملائک اور دانشمندانہ عادات نے اس محبت
کو میرے دل کی گہرائیوں تک پیوست کر دیا تم
نے مجھے ہر طرح سے فتح کر لیا۔ اور میں ایک مغلوب
و مفتوح کی حیثیت سے تمہارے سامنے آنے لگا۔
کیا ان حالات میں مجھے آپ کے پاس بار بار
آنا چاہیئے تھا؟

حور بانو۔ (جوشِ مسرت کو دباتے ہوئے) مگر تم نے افضل خاں
سے کیا قصہ بیان کیا تھا؟!

شیر گل۔ وہ ایک فریب تھا۔ افضل خاں بار بار
مجھے ہمراہ چلنے پر مجبور کرتا اور میں اپنی محبوبہ کے پاس
جانے کا بہانہ کر کے اُسے ٹال جاتا تھا۔ کیا میری
غیر حاضری حق بجانب نہ تھی۔ حور بانو مجھے معاف
کر دو۔

حور بانو۔ معاف کر دو! شیر گل یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟
کیا تم نہیں جانتے کہ جو چیز تمہارے دل کا راز تھا۔
وہی میرے دل کا راز ہے۔ کیا تم کو معلوم نہیں
کہ جس تیر نے بے خبری کی حالت میں تمہیں اُس
ویران سڑک کے کنارے زخمی بنا دیا تھا۔ وہی
تیر میرے سینہ میں اُتر چکا تھا۔ تم نے جس جانبازی
اور شجاعانہ انداز میں افضل خاں اور اکبر خاں کو
جنگ سے روکا اور جس دانشمندی سے اس
قضیہ کا فیصلہ کیا تھا۔ اُس نے میرے دل پر
تمہاری شجاعت اور فرزانگی نقش کر دی تھی۔ اور
تم نہیں جانتے تھے کہ حور بانو دنیا میں صرف
ایک شخص سے محبت کر سکتی ہے اور وہ تم تھے۔

شیر گل۔ اس پر بھی تم نے افضل خاں کو منتخب کیا!؟

حور بانو۔ اس سے مجھے انکار نہیں۔ تمہاری تمام روش
میں یہی ایک چیز ناگوار تھی۔ تم خوددار تھے اور میں
تمہارے حکم کے مطابق دونوں میں سے ایک کو
منتخب کرنے پر مجبور تھی۔ اُس وقت بھی میں نے
افضل خاں کو صاف صاف الفاظ میں یقین نہیں
دلایا تھا اور نہ ہی اس کے بعد میں نے آج تک
اُس سے شادی کا وعدہ ہی کیا۔ میں نے تم سے
دو آدمیوں سے منتخب کیا تھا نہ کہ تین آدمیوں میں سے

[شیر گل پژمردہ اور پریشان ہو کر ایک تپائی پر
بیٹھ جاتا ہے]

گریہ کیا! اس وقت جبکہ میں اپنی بے پایاں محبت
کا راز تمہارے قدموں پر نچھاور کر رہی ہوں
تم سست کمزور اور بددل نظر آنے لگے ہو۔ تم پر
حزن و ملال کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ میرا اقرار
محبت تمہاری آنکھوں میں جذبات جوشِ مسرت
کی آگ پیدا کرنے کے لئے کیوں قاصر رہا ہے؟
آہ میں کمزور عورت ہوں اور عورت اپنے دل کا
راز ظاہر کر کے ہمیشہ پچھتاتی ہے۔

شیر گل۔ حور بانو! میرے دل پر تمہاری محبت کا
اثر اس کے سوا اور ہو بھی کیا سکتا تھا؟ جسقدر زیادہ
تم مجھ سے محبت کا اظہار کرتی ہو اُس سے زیادہ
میں اپنے آپ کو بدقسمت سمجھتا ہوں۔ تم جانتی ہو
کہ افضل خاں میں اور مجھ میں کس قسم کے تعلقات
ہیں۔ افضل خاں نے مجھ پر اپنی دولت اور حفاظت
کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ وہ مجھے اپنا حقیقی

بھائی سمجھتا ہے۔ اور نہیں معلوم ہے کہ میرے دل میں اپنے اس محترم دوست کے لئے کتنی عزت پوشیدہ ہے۔ آؤ دنیا میں اُسکی پیاری اُمیدوں کے کھنڈروں پر اپنی مسرتوں کا محل تعمیر کر ڈالیں۔

حور بانو۔ (شیر گل سے لپٹ جاتی ہے) نہیں نہیں۔ یہ نہ ظلم ہوگا نہ بے انصافی۔ میں نے اُس سے کبھی شادی کا وعدہ نہیں کیا۔ میں نے کبھی اُس کا دل نہیں بڑھایا۔ میں نے کبھی اُس کے سامنے ان الفاظ میں محبت کا اقرار نہیں کیا۔ تمہارے دوست کو تھوڑا سا رنج ضرور ہوگا۔ لیکن اس بے پایاں مسرت کا خیال کرو۔ جو ہم دونوں کے دائمی اتحاد سے پیدا ہوگی؟

شیر گل (مضبوطی سے حور بانو کو ہٹاتے ہوئے) نہیں تمہارا خیال غلط ہے۔ افضل خاں کی دوستی کا اثر تمہاری محبت سے زیادہ میرے رگ و پے میں طاری ہے۔ اگر تم اُس گہری محبت کا اندازہ کر سکو جو میرے دل میں افضل خاں کے لئے ہے۔ تو تم مجھ پر رحم کرنے پر مجبور ہو جاؤ گی۔ اگر مجھے تمہاری محبت کا پیشتر علم ہوتا تو میں افضل خاں کو اپنا رقیب بنا لیتا۔ لیکن اب تو اب میں اُس کا خادم اور غلام ہوں۔ اور تمہاری محبت کی پیشکش ٹھکرانے پر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

حور بانو۔ نہیں نہیں۔ فیصلہ کرنے سے پہلے ایک دفعہ پھر سوچو۔ میرے پاس لاکھوں روپے کے زر و جواہر ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو کل صبح ہماری آنکھیں کسی آزاد سرزمین پر انمول محبت کی فضا اور زر و جواہر کے قیمتی ڈھیروں پر کھل سکتی ہیں۔ نہ وہاں افضل خاں ہوگا۔ اور نہ یہ دنیا ہوگی۔ ہمارے کان اُن کی آواز سے بہرے اور ہماری آنکھیں اُن کی دید سے محروم ہونگی۔ ہم صرف ایک دوسرے کو دیکھیں گے اور آزادی کے ساتھ شاہانہ عیش و مسرت کی زندگی بسر کرینگے۔

شیر گل۔ نہیں ہو سکتا۔ شیر گل سے ایک دوست کی محبت یوں نہیں چھینی جا سکتی۔ بیگم رخصت۔

حور بانو۔ ٹھہرو [روتی ہے۔ آنسو اُس کے رخساروں پر ڈھلکنے لگتے ہیں]

[شیر گل جو اس وقت تک اپنے ارادہ پر مضبوطی سے قائم تھا۔ کمزور ہونے لگتا ہے]

شیر گل۔ نہیں نہیں۔ حور بانو میرے استقلال کو اپنے آنسوؤں سے شکست نہ دو۔ میں ان آنسوؤں کے حملوں کو کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ (ٹوٹی پھوٹی آواز میں) مجھے اپنی عزت کی حفاظت کے لئے یہاں سے بھاگ جانا چاہئے رخصت بیگم رخصت۔ ہمیشہ کے لئے میرا آخری سلام۔

منظر ششم

شیر گل اور افضل خاں

[شیر گل علالت طبع کا بہانہ کئے بستر پر پڑا ہے افضل خاں عیادت کیلئے آتا ہے]

افضل خاں۔ برادر خیریت تو ہے۔ آج تیسرا روز ہے تم کمرہ سے باہر نہیں نکلے۔

شیر گل۔ یونہی طبیعت خراب سی ہے۔ سر میں درد رہتا ہے کبھی ہلکی ہلکی حرارت ہو جاتی ہے۔

افضل خاں۔ تو بھائی مجھے بتلانا تھا۔ اس طرح سے چھپ

چپ کر بیمار پڑنا تو اچھا نہیں۔ جسم کو تو دیکھو ٹھنڈا ہے
برف کی طرح ٹھنڈا۔ بخار تو بالکل نہیں۔ پھر آؤ۔ آٹھو!!
شیرگل۔ آپ بیٹھ جائیے۔ کمزوری معلوم ہو رہی ہے۔ کوشش
کروں گا۔

[ایک خادم داخل ہو کر ایک وحشت اثر خبر سناتا ہے]

خادم۔ ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ حور بانو آج صبح اپنے
دیہاتی محل میں رہنے کے لئے چلی گئی ہے؟

[شیرگل اُٹھ بیٹھتا ہے۔ افضل خاں کھڑا ہو جاتا ہے]

افضل خاں۔ کیا بک رہے ہو۔ دیہاتی محل۔ وہ تو یہاں
سے ساٹھ کوس کے فاصلہ پر ہے۔ تمہیں غلط اطلاع
ملی ہوگی۔ یہ جھوٹ ہے۔
خادم۔ نہیں حضور سچ ہے۔ مجھے حور بانو کی ڈیوڑھی کے
دونوں خادم ابھی ابھی ملے ہیں۔ انہوں نے بتلایا
ہے کہ وہ اچانک دیہاتی محل کی طرف چلی گئی ہے
اور رہائش و آرائش کا بیشتر سامان بھی ساتھ لے
گئی ہے۔
افضل خاں۔ تعجب۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا قصہ
ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو میں اسے فالِ بد سمجھتا ہوں

(بیٹھ جاتا ہے)

شیرگل (خادم سے) تم خود حور بانو کے محل پر جا کر
پوری پوری تحقیقات کرو۔

(خادم جاتا ہے)

افضل خاں۔ ہمیں چلنا ہوگا۔
شیرگل۔ کہاں؟
افضل خاں۔ حور بانو کے پیچھے۔
شیرگل۔ جب وہ بغیر اطلاع دئیے چلی گئی ہے۔ تو
اُس کے پیچھے جانا وقار کے خلاف ہے۔
افضل خاں۔ میرا وقار خاک میں مل چکا۔ میں ایک لمحہ بھی توقف
نہیں کر سکتا۔
شیرگل۔ تو آپ کو اختیار ہے۔ آپ خود تشریف لیجائیے
افضل خاں۔ چلئے تیار ہو لیجئے۔
شیرگل۔ کیا میں بھی چلوں؟
افضل خاں۔ ضرور۔ تمہیں میرے ہمراہ چلنا ہوگا
شیرگل نہیں صاحب مجھے تو معاف کیجئے۔ میں
ایک عورت کے پیچھے نہیں جا سکتا۔
افضل خاں۔ میری خاطر سے چلے چلئے۔
شیرگل۔ لیکن جو گفتگو تم دونوں کے درمیان ہونے
والی ہے۔ اُس کے سننے کے لئے تیسرے آدمی کی
موجودگی یقیناً آپ کے لئے مضر ثابت ہوگی۔
افضل خاں۔ حور بانو تمہاری موجودگی سے مطلقاً متاثر
نہ ہوگی۔ وہ جانتی ہے کہ جو راز میرے سینے میں
دفن ہیں۔ وہ شیرگل کے لئے کوئی راز نہیں رہے۔
شیرگل۔ آپ میری دوستی کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائیے۔
میں ہرگز ہرگز جانا نہیں چاہتا (منہ پھیر لیتا ہے)

[افضل خاں حیرت سے شیرگل کا منہ دیکھنے
لگتا ہے۔ کیونکہ اس قسم کے روکھے جواب کی اُسے
توقع نہ تھی]

افضل خاں۔ شیرگل! تم!! میرے بھائی!! میری
باتوں کا اس طرح سے جواب دیتے ہو۔ تم جو میرے
دل کا راز میری زندگی کی راحت ہو۔ یوں مجھ سے
دور بھاگتے ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ خدایا یہ کیسے
ممکن ہے۔ شیرگل کیا اس کشیدگی کا باعث تم
بیان نہیں کرو گے؟
شیرگل۔ اگر آپ سننا ہی چاہتے ہیں تو سنئے۔ لیکن

اس کے لئے مجھے ذمہ دار نہ گردانئے گا +

میرے دوست جس عورت کی محبت میں تم گرفتار ہو وہ میرے دل پر قابض و متصرف ہے جس شمع حسن کے تم پروانے ہو میں بھی اُسی کا ایک ادنیٰ جاں نثار ہوں +

افضل۔ (غصے سے کانپنے لگتا ہے۔ اُس کا چہرہ زرد ہو جاتا ہے۔ وہ چیخ کر کہتا ہے)

تم میرے رقیب شیر گل! میرے رقیب!!
کیا یہ ممکن ہے؟!!!

شیر گل۔ جس وقت سے حور بانو کے لئے میرے دل میں جذبۂ محبت پیدا ہوا ہے۔ اُسی وقت سے میں متواتر کوشش کر رہا ہوں کہ اس جذبہ کو دبا دوں۔ میں حور بانو سے ملاقات کرنے اور اس کے سامنے جانے سے دیدہ و دانستہ اغماض کرتا رہا ہوں لیکن مجھے اس کا اقرار ہے کہ میں اپنے جذبات کو پورے طور پر تباہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ تاہم بھی میں اُس پر غالب ضرور آ گیا ہوں۔ کل میں حور بانو کے مکان پر آپ کا بھیجا ہوا پہنچا۔ تو اُس نے میری غیر حاضری۔ لاپروائی اور بے توجہی کا سبب پوچھا۔ میں نے حیلہ و حوالہ سے اُسے ٹالنا چاہا۔ کئی عذر تراشے اور اُس کی تسلی کرنی چاہی۔ لیکن وہ میرے بیانات سے مطلقاً مطمئن نہیں ہوئی۔ اس لئے مجھے مجبوراً تسلیم کرنا پڑا کہ مجھے اُس سے محبت ہے۔ اسلئے میں اُس کے سامنے جانا گناہ سمجھتا ہوں +

افضل خاں۔ پھر اُس نے کیا کہا؟

شیر گل۔ میرا یہی خیال تھا کہ میرے اس بیان سے وہ مطمئن ہو جائیگی۔ میرا تمسخر اڑائے گی۔ یا مجھ سے نفرت کرنے لگے گی لیکن تمہیں یہ سنکر تعجب ہوگا کہ حور بانو نے مجھ سے بڑی گرمجوشی سے اظہار محبت کیا +

افضل خاں (غصہ سے دیوانہ ہو کر) رُک جاؤ۔ ایک حرف نہیں۔ اس قسم کی باتیں سنانے سے یہ بہتر ہے کہ تم اپنا خنجر میرے سینہ میں بھونک دو +

(سینہ کھول دیتا ہے اور کچھ دیر شیر گل کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ پھر آنکھیں جھکا لیتا ہے)

آہ تم میرے دوست ہو کر اپنی فتحمندی کی داستان یوں میرے منہ پر سنانے کی جرأت کرتے ہو۔ کیا یہی تمہاری دوستی ہے۔ افسوس میں نے تمہیں دوست بنانے میں کیسی غلطی کھائی تم نے میری راحت۔ میری خوشی۔ مجھ سے چھین لی
تم فریبی اور جھوٹے دوست ہو +

شیر گل۔ ٹھہریئے! ٹھہریئے!! پہلے میری بات سُن لیجئے۔ میں جو کچھ بھی ہوں۔ مگر ایک دغا باز دوست نہیں ہوں۔ آہ ایک حسین عورت کے اقرار محبت کے بعد جس کی بلوریں باہیں میری گردن میں حمائل تھیں۔ جبکہ اُس کے سُرخ سُرخ رسیلے ہونٹ بوسوں کے لئے میرے قریب ہی تھے جبکہ ایک دھڑکتا ہوا دل۔ ایک گرم اور گرمجوش آغوش میں راحت کے لئے تڑپ رہا تھا جب کہ مجھ سا خطاکار انسان محبت کے جوش میں اپنا ایمان تک نثار کر دینے والا تھا۔ دوستی نے محبت پر فتح حاصل کر لی +

آہ میرے دوست یقین کرو۔ کہ میری لرزتی

ہوئی کمزور انگلیاں جو اُس کے شانوں کو تھامے
ہوئے تھیں فولاد کی طرح سخت اور کرخت ہوگئیں۔
میری آنکھیں جن سے محبت کا جوش ٹپک رہا
تھا اور جس کے سامنے حور بانو کا سحر زا چہرہ تھا۔
نفرت و حقارت سے بدل گئیں۔ میرا خون جو رگ
رگ میں جوش سے لرزاں و تڑپ رہا تھا یکسر سرد
اور زرد ہوگیا۔ میں نے اُسے ایک بیجان لاش
کی طرح اُٹھاکر پھینک دیا۔ اُس وقت میرا کمزور
دل طاقتور تھا۔ اور میں تن کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔
محبت پر فتح پانے کے بعد میرا سر بلند تھا اور فتح و
نصرت کا پھریرا دوستی کی مضبوط چٹان پر بڑی
شان سے لہراتا ہوا نظر آرہا تھا۔

اُس حسین ساحرہ کا آخری حربہ اُس کے آنسو
تھے۔ جو اُس کے پیارے پیارے رخساروں
پر ڈھلک کر ایک جانباز کے ایمان کو پھسلانے
کے لئے کافی سے زیادہ تھے۔ مگر میں نے اپنے
آپ کو اور زیادہ امتحان میں ڈالنا پسند نہیں کیا۔
اور فوراً وہاں سے نکل آیا۔ اور اس کے بعد میں
اپنے کمرہ میں بیمار بن کر پڑا رہا۔ لیکن درحقیقت میں
سامان سفر کی تیاری میں مصروف تھا۔ اب میں
بالکل تیار ہوں اور کل صبح اس سرزمین سے ہمیشہ
ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاؤنگا۔ میرے دوست
اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کردو۔

افضل خاں۔ (جس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے)
"نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میرے پیارے دوست!"
(دوڑ کر لپٹ جاتا ہے اور رونے لگتا ہے)
تم بے قصور ہو۔ میں سب کچھ سمجھ گیا۔ میں اپنے
الفاظ واپس لیتا ہوں۔ اُن واجب الفاظ کے لئے
مجھے معاف کردو۔ جو جوش میں میرے منہ سے نکل
گئے تھے۔ تم ایک وفادار دوست ہو۔
حور بانو کی یہ بے توجہی میری بدقسمتی پر دال ہے!
میرے دوست! ان حالات میں کیا اب یہ
میرا فرض نہیں کہ میں اپنے جذبات کو دبا دوں
اپنی محبت کی داستان کو یکسر فراموش کردوں۔ اپنے
خیالات کی دنیا کو بھول جاؤں۔ اور تمہارے
لئے اپنی محبت کو قربان کردوں۔ اگر چہ میرا دل تنہائی
میں شاید کسی وقت افسردہ ہو لیکن وہ تم دونوں کو
مسرور و شادماں دیکھ کر مسرت سے لبریز رہیگا۔
یہ صرف تم ہو جو حور بانو کو خوش رکھ سکتے ہو۔ مجھ
بدقسمت کو میرے حال پر تنہا چھوڑ دو۔ میں اپنی
زندگی کسی دوسرے ملک میں جاکر تباہ کردونگا۔

شیر گل۔ نہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں تمہاری
عیش و مسرت کی دنیا پر ایک اچانک وبا کی طرح
نازل ہوا ہوں۔ آہ مجھے کیا معلوم تھا کہ حالات
یوں بدل سکتے ہیں۔

افضل خاں۔ نہیں نہیں شیر گل تمہیں میرا کہا ماننا پڑیگا۔

شیر گل۔ نہیں نہیں۔ افضل خاں تمہیں میرا کہا ماننا
پڑیگا۔

(اسی طرح سے دس دن گذر گئے اور دونوں
دوست کچھ بھی فیصلہ نہ کر سکے۔ یہاں تک کہ اب
انہوں نے حور بانو کا تذکرہ کرنا بھی چھوڑ دیا
گیارہویں دن خادم ایک خط پیش کرتا ہے)

افضل خاں (خط کے پڑھتے ہی غصہ سے لرزنے لگتا
لگتا ہے۔ اور اُسے مروڑ کر زمین پر پھینکدیتا ہے۔

[شیر گل اُسے دوڑ کر اُٹھا لیتا ہے اور پڑھتا ہے]

خط کا مضمون

افضل خاں۔ آگاہ رہو۔ آج میرے انتقام کا وقت ہے۔ جس دن تمہیں یہ خط ملیگا۔ اُس دن میرے غلام حور بانو کو اُس کے گاؤں سے اُٹھا لانے کے لئے اُسکی نواحی پہاڑیوں میں پہنچ چکے ہونگے۔ اور پیشتر اس کے کہ تم اُس کی امداد کو پہنچو وہ میرے قبضہ میں ہوگی۔ اور اگر تم نے اُس طرف قدم اُٹھانے کی ذرا بھی جرأت کی تو تمہارا خاتمہ بڑا بھیانک ہوگا +

اکبر خاں

شیر گل۔ بدمعاش کمینہ۔ ایک قول قسم کے بعد اب پھر شرارت پر آمادہ ہے +

افضل خاں۔ آہ شیر گل! تم نہیں جانتے۔ اکبر خاں نے جو کچھ لکھا ہے وہ کر دکھائے گا۔ آہ معلوم نہیں کہ اس وقت حور بانو کی کیا حالت ہو +

شیر گل۔ تو ایک لمحہ بھی ضایع نہ کیجئے۔ ہمارے بادِ رفتار گھوڑے ساٹھ میل کا فاصلہ چند گھنٹوں میں طے کر سکتے ہیں۔ اور ہماری تلواریں اُس کے سپاہیوں کا خاتمہ +

[شیر گل تلوار کھینچتا ہے۔ افضل خاں بھی تلوار کھینچتا ہے۔ اور دونوں دیوانہ وار باہر دوڑتے ہیں۔ اور گھوڑوں پر سوار ہو کر انہیں سرپٹ ڈال دیتے ہیں۔ خادم پیچھے لپکتا ہے۔ افضل خاں اُسے حکم دیتا ہے کہ حور بانو کے دیہاتی محل کو تمام سپاہی لیکر فوراً پہنچو]

منظر ہفتم
حور بانو کا دیہاتی محل

[ایک چھوٹا سا قصبہ ایک پہاڑی کے دامن میں ہے۔ حور بانو ہر روز سیر کے لئے گرد و نواح میں دور دور تک جانے کی عادی ہے۔ ایک دن وہ سیر کر رہی تھی کہ اُسے ایک طرف سے چند نقاب پوش سوار آتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ خطرہ کو محسوس کر کے گاؤں کی طرف واپس لوٹتی ہے۔ سوار اُس کا پیچھا کرتے ہیں۔ اس پر وہ زیادہ تیزی سے بھاگتی ہے۔ حور بانو گاؤں کے قریب پہنچ جاتی ہے۔ لیکن سوار اُس کو پکڑنے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں۔ گاؤں کے چند آدمی مدد کو دوڑتے ہیں۔ بعض نہتے تھے۔ اور بعض کے ہاتھ میں لٹھ۔ کوئی ایک دو آدمی تلوارے کر بھی نکل آتے ہیں۔ مختصر سی لڑائی ہوتی ہے۔ لیکن نقاب پوش ڈاکوؤں کا گروہ لڑتا بھڑتا حور بانو کو اُٹھا کر صاف نکل جاتا ہے۔ ایک نقاب پوش زخمی ہو کر گر پڑتا ہے اور وہیں رہ جاتا ہے +

جس وقت نقاب پوش گروہ پہاڑیوں میں غایب ہو جاتا ہے۔ اُس وقت شیر گل اور افضل خاں پہنچتے ہیں۔ لوگ اُنہیں بتلاتے ہیں کہ ڈاکو اُس طرف گئے ہیں۔ چنانچہ دونوں تعاقب میں روانہ ہوتے ہیں۔ ایک دو میل کا چکر کاٹ کر واپس آجاتے ہیں۔ کیونکہ زمین پتھریلی تھی گھوڑوں کے پاؤں کے نشانات نہیں ملتے۔ گاؤں میں واپس آکر وہ اُس زخمی نقاب پوش پر سوالات کرتے ہیں]

افضل خاں۔ کپڑا لاؤ۔ پانی اور روئی۔ اس کی مرہم پٹی کرو یہ تو بری طرح زخمی ہے +

نقاب پوش۔ خدارا مجھے بچاؤ۔ میری مدد کرو +

شیر گل۔ بے فکر رہو۔ تمہاری جان بچانیکی پوری پوری کوشش کی جائیگی +

افضل خاں۔ تم اکبر خاں کے ملازم ہو؟

نقاب پوش۔ جی ہاں +

افضل خاں۔ اکبر خاں کہاں رہتا ہے؟

نقاب پوش۔ کوہ دامن کے پاس ایک بستی ہے۔ جسے مرشد آباد کہتے ہیں۔ وہاں وہ سوداگر کے بھیس میں رہتا ہے۔ اُس کے پاس بیس غلام ہیں۔ جن کی مدد سے وہ ادھر اُدھر ڈاکے ڈالتا ہے۔ حور بانو کو بھی ڈاکو وہیں لے جائینگے +

ایک آدمی مرہم پٹی کرتا ہے +

(شیر گل اور افضل خاں دونوں تلواریں نکال انہیں ملا دیتے ہیں۔ اور انتقام لینے کی قسم کھاتے ہیں)

"ہم دونوں میں جو بھی زندہ رہے وہ حور بانو کا انتقام اکبر خاں سے ضرور لے" +

منظر ششم

(ایک قافلہ جس میں شیر گل اور افضل خاں دونوں سوداگروں کے بھیس میں موجود ہیں۔ رات کے وقت ایک وادی کے درمیان میں قافلہ نے پڑاؤ ڈالا ہوا ہے۔ اردگرد پہاڑیاں ہیں۔ آگ روشن ہے جانور بندھے ہوئے ہیں۔ سامان پڑا ہے)

رات کی تاریکی میں گولی چلنے کی آواز آتی ہے پہاڑی پر سے ڈاکوؤں کا ایک گروہ نمودار ہوتا ہے ڈاکوؤں اور قافلہ والوں کے درمیان خونریز جنگ ہوتی ہے۔ افضل خاں اور شیر گل خوب خوب دادِ مردانگی دیتے ہیں۔ ڈاکوؤں میں کمزوری کے آثار نمودار ہوئے ہی تھے کہ پہاڑی کے دوسری طرف سے ایک اور جماعت حملہ آور ہوتی ہے اور پھر دونوں جماعتیں ملکر قافلہ والوں کو مغلوب کر لیتی ہیں۔ بہت سے آدمی مر چکے تھے۔ باقی آدمی جو بچ جاتے ہیں انہیں باندھ لیا جاتا ہے

ڈاکوؤں کی ایک جماعت کا سردار۔ یہ ہے مال غنیمت ہم دو مختلف جماعتیں ہیں۔ ایک کی مدد سے دوسرا کامیاب ہوا ہے اس لئے برابر کی تقسیم ہونی چاہئے +

دوسرا سردار۔ نہیں ہمیں زیادہ حصہ ملنا چاہئے۔ ہماری مدد سے تم کامیاب ہوئے ہو +

پہلا سردار۔ ہمیں آپس میں کشت و خون سے گریز کرنا چاہئے تمہاری آمد سے قبل ہم کافی قربانی دے چکے تھے کیا یہ کافی نہیں؟

(ڈاکو مال غنیمت کے دو ڈھیر لگا کر باہم تقسیم کر لیتے ہیں۔ یعنی قرعہ ڈالتے ہیں۔ جس کے نام قرعہ نکلتا ہے وہ ایک ڈھیر لے لیتا ہے دوسری جماعت دوسرا ڈھیر۔ پھر آدمیوں پر قرعہ ڈالتے ہیں۔ اتفاق سے شیر گل ایک جماعت کے پاس اور افضل خاں دوسری جماعت کے ہاتھ آتا ہے)

شیر گل۔ (دونوں سرداروں سے) دیکھو ہم معزز اور شریف انسان ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ ہم دونو کو ایک ہی جماعت اپنے پاس رکھے اور ہمیں جدا نہ کیا جائے +

پہلا سردار۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم دونوں دولتمند رئیس ہو اس لئے تم دونوں کی تقسیم میں قدرت نے انصاف سے کام لیا ہے۔ دونوں ڈاکو ایک ایک معزز مرد کو اچھے داموں پر فروخت کر سکیں گے۔ اگر تم دونوں ایک ہی ڈاکو کے حصہ میں آتے تو قدرت یقیناً بے انصافی کرتی اور دوسرا ڈاکو اتنے بڑے مال غنیمت سے محروم رہ جاتا

افضل خاں۔ ہمیں ایک ہی ڈاکو کے پاس ایک ہی جگہ رہنے دیجئے۔ ہم دوسرے ڈاکو کے نقصان کی تلافی کر دیں گے۔

ڈاکو۔ اس کی ضمانت کیا ہے؟

شیر گل۔ ہمارا قول صادق۔

ڈاکو۔ ہم کسی کے قول و قرار کی صداقت پر یقین نہیں رکھتے۔

جاؤ انہیں علیحدہ کر دو۔

بہت سے آدمی ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور بڑی مشکل سے انہیں جدا کرتے ہیں۔ شیر گل اور افضل خاں کے آنسو رواں ہیں۔ بادل ناخواستہ وہ ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور پیچھے مڑ مڑ کر ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔

شیر گل۔ خدا حافظ۔

افضل خاں۔ اپنے حلف کو نہ بھولنا اور دشمنوں سے انتقام ضرور لینا۔

ادہم خاں کا دیوانخانہ

(ادہم خاں ایک پہاڑی علاقہ کا نواب ہے اپنے دیوان خانہ میں بیٹھا ہے۔ چند خادم نئے غلاموں کو لاتے ہیں)

(عصر کے وقت ادہم خاں باغ میں سے گذرتا ہے۔ شیر گل ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا کوئی گانا گا رہا ہے)

(ادہم خاں رک جاتا ہے اور اس کا گانا سنتا ہے۔ شیر گل کی حرکات و سکنات کا مطالعہ کر رہا ہے)

ادہم خاں۔ ادھر آؤ۔

(شیر گل گھبرا کر اٹھتا ہے۔ اور حاضر ہو جاتا ہے)

ادہم خاں۔ "تمہارا نام"

شیر گل۔ "اکبر خاں"

(شیر گل نے اپنا نام اکبر خاں محض اس لئے رکھا ہے تاکہ اکبر خاں کی یاد اس کے دماغ سے زائل نہ ہو۔ اور جوش انتقام ایک لمحہ کے لئے بھی سرد نہ ہو)

ادہم خاں۔ اکبر خاں تم تعلیم یافتہ اور معزز آدمی معلوم ہوتے ہو۔

شیر گل۔ میں تو محض ایک غلام ہوں۔

ادہم خاں۔ لیکن شرافت اور عالی نسبی تمہاری پیشانی سے ظاہر ہو رہی ہے۔ تمہارا طرز نشست و برخاست کے طریقوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کوئی معزز آدمی ہو رہے ہو۔ ٹھیک۔

شیر گل۔ ہوگا۔ اس سے اب کچھ سروکار نہیں اپنی قسمت اور خاندان کو اس دن سے بھول چکا ہوں جب حیوانوں کی طرح مجھے ایک منڈی میں ۵۰۱ اشرفیوں کے بدلے فروخت کر دیا گیا تھا۔

ادہم خاں (کوئی غلام اس لہجہ میں گفتگو نہیں کر سکتا!) تم ابھی

ایک گیت گا رہے تھے +

شیرگل۔ جب انسان غلام ہو۔ وطن سے دور ہو۔ تو اُس کے سینے سے المناک نغمے اُٹھا کرتے ہیں +

ادھم خاں۔ مگر ان نغموں میں محبت کی شیرینی بھی ملی ہوئی تھی +

شیرگل۔ محبت نہ ہوتی تو مجھ سا انسان ایک نادان کی منڈی میں فروخت نہ کیا جاتا +

ادھم خاں۔ ایک کام کرو گے؟

شیرگل۔ آپ آقا ہیں اور میں غلام۔ آپ کے ہر حکم کی تعمیل میرا فرض ہے +

ادھم خاں۔ کام مشکل نہیں۔ مگر کٹھن ضرور ہے۔ کوئی شریفانہ فعل نہیں۔ مگر ایک ٹوٹے ہوئے دل کو جوڑنا بھی گناہ نہیں +

شیرگل۔ یعنی +

ادھم خاں۔ وہ دیکھتے ہو سامنے ایک قصر ہے۔ اس قصر کے اندر ایک عورت قید ہے۔ جو غلاموں کی طرح خریدی گئی تھی۔ وہ میرے پاس لونڈی کی حیثیت سے لائی گئی۔ میں اُس کا آقا تھا۔ لیکن بُرا ہو اُسکے حسن عالم سوز کا۔ میں نہ صرف اُس کا غلام ہوں۔ بلکہ دیوانہ ہوں +

شیرگل۔ ایک لونڈی اور پھر عشق۔ وہ تو آپ کے ہر حکم کی پابند ہے +

ادھم خاں۔ قانون یا ظلم کی نظروں میں۔ لیکن عشق و محبت کی درگاہ میں وہ آقا اور میں غلام ہوں۔ اگر مجھے محبت نہ ہوتی تو میں جبراً اسے اپنی خواہشات کا تابع بناتا۔ اب میری دلی خواہش ہے کہ میری محبت کے جواب میں وہ مجھ سے محبت کرے +

شیرگل۔ لیکن میرے پاس نہ تو کوئی محبت کا عمل ہے نہ حُب کا تعویذ جانتا ہوں +

ادھم خاں۔ مگر تم گا سکتے ہو تمہارے جسم میں محبت کا خمیر موجود ہے۔ اپنی لے سے اُسے قایل کر سکتے ہو آہستہ آہستہ اس کے دل میں میرے لئے محبت پیدا کر سکتے ہو۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ تمہارے ملک سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ تمہاری باتیں غور سے سنیگی۔۔۔ اپنے دل کا راز تم پر کھول دیگی +

شیرگل۔ میں۔۔۔ کوشش کرونگا۔۔۔۔

ادھم خاں۔ اور ناکامیابی کی صورت میں نہ صرف تمہیں آزاد کر دونگا۔ بلکہ مالا مال کر دونگا +

شیرگل ــ جھکتا ہے۔ ادھم خاں ایک سردار کو جو فاصلہ پر کھڑا تھا بلاکر حکم دیتا ہے کہ اکبر خاں (شیرگل) کو قصر جنت تک پہنچا دے اور اسے وہاں آنے جانے میں کوئی ملازم مزاحم نہ ہو +

(شیرگل آہستہ آہستہ قصر جنت کی طرف جاتا ہے)

قصر جنت۔ ادھم خاں کی زر خرید لونڈی

(شیرگل جس کا ایک ہاتھ اُس کی کمر کی زنجیر سے بندھا ہوا ہے۔ ایک سردار کے ساتھ قصر جنت کے دروازہ پر پہنچتا ہے۔ سردار پہرہ داروں کو ادھم خاں کے حکم سے آگاہ کرتا ہے۔ اور شیرگل کو اندر جانے کی اجازت دیتا ہے۔ شیرگل آہستہ آہستہ داخل ہوتا ہے +

ایک آراستہ کمرہ جس میں ایک عورت تنہا بیٹھی ہے (نظریں جھکائے ہوئے) ایسا ہی شیرگل نظریں جھکائے داخل ہوتا ہے +

دونوں ایک دوسرے سے نظریں چھپا رہے ہیں]

شیرگل۔ (دل میں) اے خدا۔ کیسا نزول کام معلوم نہیں ہمارے وطن کی کونسی شریف خاتون اس موذی کے پھندے میں گرفتار ہوگی +

[عورت اٹھ کر کھڑکی کی طرف چلی جاتی ہے اور وقت گذارنے کی خاطر باہر دیکھتی ہے شیرگل نیچی نظریں کئے کھڑا ہے۔ آہستہ آہستہ نظریں اٹھاتا ہے۔ مگر عورت کی پشت پر نگہ ڈال کر پھر نظریں نیچی کر لیتا ہے۔ عورت آہستہ آہستہ پلٹتی ہے۔ پہلے اس کے پاؤں پر نگاہ ڈالتی ہے پھر آہستہ آہستہ اوپر دیکھتی چلی آتی ہے۔ شیرگل بھی آنکھیں اٹھاتا ہے۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ عورت ایک چیخ مار کر شیرگل کی طرف دوڑتی ہے۔ شیرگل دیوانوں کی طرح لپکتا ہے +

شیرگل۔ یا خدا۔ حور بانو۔ یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں +

[گرتا ہے]

حور بانو۔ شیرگل۔ اے میرے خدا۔ یہ کیا ہوا۔ یہ تمہاری حالت (ہتھکڑیوں کو دیکھ کر) یہ تم اور غلام۔ ادہم خاں کے غلام۔ شیرگل تم یہاں +

شیرگل۔ (آہستہ آہستہ اٹھکر بیٹھتا ہے) حور بانو معلوم نہیں۔ فلک کجرفتار ہمیں کیسے کیسے دن دکھائے گا میں اس کمرہ میں اس خیال سے داخل نہیں ہوا تھا۔ کہ یہاں حور بانو قید ہوگی۔ کیا میری آنکھیں تو دھوکہ نہیں دے رہیں۔ کیا تم واقعی حور بانو ہو۔

حور بانو (شیرگل کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے) میری محبت کے آنسوؤں کو دیکھو جو تمہیں دیکھ کر میری آنکھوں سے بہ نکلے ہیں۔ آہ تم زنجیروں میں بندھے ہوئے غلام اور ادہم خاں کے فرستادہ ہو +

شیرگل۔ ہاں۔ اور ایک ذلیل خدمت کے لئے +

حور بانو۔ یعنی +

شیرگل۔ تم کو پھسلاؤں اور ادہم خاں سے محبت کرنے کے لئے آمادہ کروں +

حور بانو۔ استغفراللہ۔ مگر تم ادہم خاں کے ہاتھوں کیسے گرفتار ہوئے +

شیرگل۔ میں اور افضل خاں تمہارے دیہاتی محل پر تمہاری حفاظت کے لئے پہنچے۔ لیکن افسوس کہ ہماری آمد سے قبل اکبر خاں کے آدمی تمہیں اٹھا کر پہاڑیوں میں گم ہو چکے تھے۔ دوسرے دن ہم سوداگروں کے بھیس میں تمہاری تلاش میں نکلے تو راستہ میں ڈاکوؤں کے دو گروہوں نے ہمارے قافلہ کو لوٹ لیا۔ اور ہمیں گرفتار کر کے غلاموں کی منڈی میں فروخت کر ڈالا +

حور بانو۔ اور افضل خاں ؟

شیرگل۔ قسمت کے پانسہ نے اسے ڈاکوؤں کی دوسری جماعت کے قبضہ میں ڈال دیا۔ معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہوا ہوگا +

حور بانو۔ دیکھئے اب ہمارا انجام کیا ہوتا ہے ؟

شیرگل۔ ہمارا انجام۔ ہمارا انجام بالکل ہمارے سامنے ہے۔ میرا خنجر اس گرفتاری کی حالت میں بھی ادہم خاں کے سینہ میں اتر جائیگا +

حور بانو۔ نہیں نہیں خدا کے لئے۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو تمہاری اس وحشیانہ حرکت کا انجام۔ موجودہ صورت سے بھی بھیانک ہوگا۔ تم ظالموں کے جور و جفا

سے پارہ پارہ کر دیئے جاؤ گے - اور اس کے بعد
میری قسمت کسی زیادہ وحشی اور درندے سے وابستہ
کر دی جائیگی - ان خیالات کو دماغ سے نکالدو
اور ٹھنڈے دل سے اپنی رہائی کے کسی تجویز پر
غور کرو +

شیر گل - میں کوشش کرونگا +

حور بانو - اور میں اس کوشش میں تمہاری رہنمائی
کرونگی - کیونکہ عورتوں کا دماغ واقعات کی تلخی اور
رقابت کی گرمی میں بھی حقایق کو پیش نظر رکھ سکتا ہے

شیر گل - ہماری امید کا راستہ صرف باغبان کے
ہاتھ میں ہے - میں قرینہ سے پہچان گیا ہوں کہ
وہ ادہم خاں کا دشمن اور یہاں سے بھاگ نکلنے
کی فکر میں لگا رہتا ہے - اگر اس نے ہماری امداد
کی تو رہائی کی کوئی صورت پیدا ہو سکیگی +

حور بانو - تم نہایت احتیاط اور توجہ سے کوشش
جاری رکھو - اور دریں اثنا ادھم خاں کو امید کا
سبز باغ دکھاتے رہو - میں ادھم خاں سے اس
طرح ملنے لگونگی گویا تمہاری کوششیں بر روئے
کار آرہی ہیں - تاکہ وہ نہیں میرے پاس بھیجنے
میں نہ ہچکچائے - اور ہم باہم مشورہ سے اپنی رہائی
کے لئے کوئی سبیل نکالنے میں کامیاب ہو جائیں +

[دونوں ایک دوسرے کے بازو پر سر رکھ کر
آنکھیں بند کر لیتے ہیں]

شیر گل کی باغبان سے ملاقات

شیر گل (باغبان سے) - میرے آقا - تم ہم پر بہت
مہربان ہو - میں اس کے لئے آپکا شکریہ ادا کرتا ہوں -

باغبان - آپ میری تعریف میں کوئی لفظ زبان سے
نہ نکالئے - میں ایک غریب مصیبت زدہ ہوں +

شیر گل - کچھ بھی ہو - آپ اس وقت تمام غلاموں کی
نگرانی پر مقرر ہیں - اس لئے آپ ہمارے آقا
ہیں - کیا نہیں؟ آپ ادہم خاں کے معتبر آدمی ہیں؟

باغبان - ادھم خاں؟ (دانت پیستا ہے)

شیر گل - کیوں؟ کیا بات ہے؟

باغبان - ظالم، اور جابر - غلاموں کو کوڑوں سے پیٹنے
والا - تم نہیں جانتے مجھے باغبان کی خدمت تک
پہنچنے میں کتنی بار شکنجوں اور کوڑوں کے مراحل سے
گذرنا پڑا ہے - میرے جسم کا ہر حصہ اس کے
ظلم و ستم کی جیتی جاگتی تصویر ہے (قمیص پھاڑ کر نشانات
دکھاتا ہے)

شیر گل - اے خدا کیا تیرا انصاف کبھی ظاہر نہ ہوگا؟

باغبان - ہوگا اور ضرور ہوگا - کیا تم ہمارا ساتھ دینے پر
آمادہ ہو؟

شیر گل - (دل و جان سے) میرے سینہ میں ایک
قوی دل اور میری روح ایک مضبوط جسم کی مالک ہے
میں دس آدمیوں سے تنہا لڑ سکتا ہوں +

باغبان - خدا اس کا موقعہ نہ لائے (ادھر ادھر دیکھ کر)
کیا تم ہمارے ساتھ بھاگ نکلنے پر آمادہ ہو؟

شیر گل - صرف ایک صورت میں +

باغبان - وہ کیا؟

شیر گل - قصر جنت میں جو عورت قید ہے - وہ ہمارا
ساتھ دیگی؟

باغبان - ناممکن! اگر وہ عورت ضرور ہمارے راز کی
تباہی کا باعث ہوگی +

لکھا تھا۔ میں نے اپنا نام اکبر خاں محض اس لئے رکھا ہوا تھا۔ کہ اُس بدبخت کا نام ہر وقت مجھے یاد رہے۔ ہر شخص مجھے اکبر خاں کے نام سے پکارتا تھا۔ آہ اُس ظالم کا نام آخری گھڑی میں بھی ہماری جانیں لے کر رہا

حور بانو۔ (روتے ہوئے) آہ تم نہیں جانتے۔ تم نہیں جانتے۔ اکبر خاں تو اسی دن مارا گیا تھا جس رات ڈاکوؤں نے اُس سے مجھے چھینا تھا۔ آہ تمہیں کیا معلوم کہ تمہارا زیب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تم سے رخصت ہو چکا ہے۔

شیر گل۔ اللہ کی مرضی میرے بھائی افضل میری خطا معاف کرنا۔

افضل خاں۔ میرے بھائی شیر گل آؤ ہم آخری بار مل لیں۔

(افضل خاں آہستہ آہستہ اُٹھتا ہے۔ اُس کا ملو اُسے سہارا دیتا ہے اور شیر گل کی معافی کے کاغذات افضل خاں کے ہاتھ میں دیتا ہے)

افضل خاں۔ یہ کیا ہے؟

"یہ شیر گل کا معافی نامہ۔ آج کی ڈاک میں جو کاغذات موصول ہوئے اُس میں شیر گل کا معافی نامہ بھی وزیر اعظم کے دستخطوں سے موصول ہوا ہے۔ افضل خاں یہ تمہاری کوششوں کا ثمرہ ہے۔ اور تم نے ہم سے جدا ہونے سے بیشتر شیر گل کی ہر خواہش پوری کر دکھائی"

(شیر گل افضل خاں سے گلے ملتا ہے۔ اور اُسکے ہاتھوں پر بوسے دیتا ہوا زار زار روتا ہے۔ حور بانو اور شیر گل دونوں کا ہاتھ ایک دوسرے کے ہاتھ میں دیتا ہوا افضل خاں دم توڑتا ہے)

(ماخوذ) ――――

زُود پشیمانی

رحمان، دنا، شنو اور جمال تو بھوکے سو چکے ہیں۔ لیکن اس کمبخت جبی کو نیند نہیں آتی۔ اگر دو پیسے بھی ہوتے تو اسے دودھ لا کر پلا دیتی۔" ماں نے دو سال کی بچی کو تھپکاتے ہوئے کہا۔

باپ نے جلتے ہوئے حقے کا ایک کش لیا۔ اور بڑبڑا کر کہنے لگا۔ "سوا سات آنے کا کل کام ہوا اور وہ بھی آج وصول نہیں ہوئے۔ اس لئے یہ رات تو فاقہ ہی سے کٹیگی!"

بیوی۔ اور کیا صبح ہی صبح کہیں سے پیسے مل جائیں گے؟ یہ پانچوں اللہ کے جی سویرے ہی رو رو کر پریشان نہ کر دینگے؟!

میاں۔ رحیمو قلچہ والا صبح آئے گا۔ اس سے ایک ایک قلچہ سب کو لے دیجو۔ پیسے شام کو مل جائیں گے۔ اور ایک آنے کے چنے میں اور بھجوا دونگا۔ ذرا شفو کو دکان پر بھیج دینا۔

اتنے میں جبی بہت پیچ پیچ کر رونے لگی۔ میاں، یا دستگیر کہتا ہوا اٹھا۔ اور تام چینی کا ایک بڑا سا گلاس اٹھا کر باہر نکل گیا۔

بیوی بچی کو تسلیاں دینے لگی "جبی کا ابا دودھ لینے گیا ہے! جبی کا ابا دودھ لینے گیا ہے!!"

جبی دودھ کا نام سنتے ہی جلدی سے اٹھ بیٹھی اور بڑی بے تابی سے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ اور جب میاں دودھ لے کر آیا تو جبی اٹھ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی۔ میاں نے بچی کو بہت بہت پیار کیا اور اسے دودھ پلایا۔

میاں۔ بچے۔ ماں کے قربان جائیے کیسے کیسے دل دیتے ہیں ایک۔ وہ ہیں جو خالی گود دیکھ کر آنسو بہاتے ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ پانچ بچے ہیں اور کھانے کو بھی نہیں ملتا۔

بیوی۔ دودھ کہاں سے لائے؟

میاں۔ ہاں۔ اس نے مجھے ہی آواز دے کر کہہ دیا تھا "لو میاں کریم اللہ جب پیسے ہوئے۔" اچھا اللہ مالک ہے۔

بیوی۔ تمہارے چچا کو ذرا بھی ترس نہیں آتا۔ اتنی دولت کے مالک ہوتے ہوئے دو پیسے۔ بچے کی غرض بھی پوری نہیں کر سکتے؟

میاں۔ تم چچا کو کہتی ہو۔ سگا بھائی دو پیسے بھی دینے کو تیار نہیں۔ تیس روپے مہینہ لاتا ہے۔ اور اکیلا کھا جاتا ہے۔ ماموں سینکڑوں روپے رنڈیوں کے ہاں جا کر خرچ کر دیتا ہے۔ لیکن ان بچوں کے ہاتھ پر ایک پیسہ بھی نہیں رکھتا۔ اپنوں کا تو خون سفید ہو گیا ہے اب غیروں کا کیا گلہ کریں۔

اس طرح سے میاں بیوی نصف رات تک اپنوں اور بیگانوں کی باتیں کرتے کرتے سو گئے۔ علی الصبح میاں سوت کا تھیلا اٹھا کر دکان کی طرف چلا گیا۔ اور بیوی اٹھ کر جھاڑو دینے میں مصروف ہو گئی۔

کریم اللہ امرتسر کے ایک غیر آباد بازار میں ایک ٹوٹی پھوٹی دکان کے اندر کھدر بنتا تھا۔ صبح سے لیکر شام تک کرتا تو مشکل سے سات آٹھ آنے جمع ہوتے تھے۔ اُسمیں سے دو روپے دکان کا کرایہ دینا ہوتا تھا۔ ڈیڑھ روپیہ گھر کی کوٹھری کا کرایہ۔ اس کے علاوہ تھا۔ پانچ بچے اور ماں بیوی اس آمدنی میں گذارہ کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی شفیع بھی دو تین روپے مہینہ بھر میں گھر سلامت سے آتا تو وہ کام میں آجاتے تھے۔ اس طرح سے بسر اوقات ہو رہی تھی مہینے میں کئی دن فاقے کاٹنے پڑتے۔ اور کبھی صرف بھنے ہوئے چنوں پر ہی کفایت کرنی پڑتی +

باوجود اس عسرت کے بھی کریم اللہ مہمان نواز تھا۔ اگر کبھی کوئی جولاہہ اُس کے پاس آ جاتا تو جو نان نمک ہوتا وہ اُس کے سامنے ضرور رکھتا۔ ایک دن اتفاق کہ شام کے پانچ بجے ایک نہ دو پورے پانچ مہمان اُسکی دوکان پر آ نکلے۔ کریم اللہ نے اُٹھ کر اُن کا استقبال کیا حقہ بھر کر اُن کے سامنے رکھا اور خیر و عافیت پوچھی۔ ایک مہمان بولا بھائی کریم اللہ ہم آج یہاں ایک مقدمہ کی تاریخ پر آئے تھے۔ بڑی مشکل سے اب خلاصی ہوئی ہے۔ گاؤں دور ہے۔ اس لئے ارادہ ہے کہ آج تمہاری دوکان میں ہی پڑ رہیں۔ کریم اللہ نے کہا بسم اللہ یہ آپکا ہی گھر ہے شوق سے آرام کیجئے۔ تھوڑی دیر بعد کریم اللہ اُن کے کھانے کے انتظام کی فکر میں اُٹھا اِس وقت اُس کی جیب میں صرف تین پیسے تھے بیوی کے پاس پہنچا۔ اُس سے مشورہ کیا۔ اُس نے کہا کہ دو آنے اُس کے پاس بھی رکھے ہیں۔ مگر ان پونے تین آنوں سے پانچ آدمیوں کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ شہامت کی دوکان بند تھی ورنہ اُس سے ہی کچھ پیسے قرض مل جاتے سوچ سوچ کر کریم اللہ گھر سے باہر نکلا اور سیدھا اپنے چچا کے ہاں پہنچا۔ معلوم ہوا کہ چچا اپنے دوست کرامت اللہ کے مکان پر گیا ہے۔ وہاں گیا تو دیکھا کہ اُس کا چچا اور کرامت اللہ دونوں شراب پینے میں مصروف ہیں +

کریم اللہ۔ چچا جان کچھ عرض کرنی ہے +

چچا۔ ہاں کہو بیٹا +

کریم اللہ۔ علیحدگی میں کہونگا +

چچا جان۔ اجی کہہ بھی۔ وہ کرامت اللہ سے کیا پردہ ہے +

کریم اللہ۔ کچھ پیسے چاہئیں۔ چند مہمان آ گئے ہیں۔

چچا جان۔ پیسے ہوتے تو دوسری بوتل نہ منگواتا۔ بھلا کیا رکھا ہے۔ اگر غریب ہو تو مہمانوں کو کیوں بٹھا رکھا ہے۔ یہ چالبازیاں کسی اور سے کرنا۔ جاؤ میرے پاس کچھ نہیں +

کریم اللہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ آہ سرد بھر کر اُٹھا۔ اور اپنے بھائی کے ہاں پہنچا۔ معلوم ہوا کہ وہ سنیما دیکھنے گیا ہے۔ کریم اللہ سینما ہال پہنچا۔ وہاں سیکڑوں آدمی بھاگ بھاگ کر چلے آ رہے تھے۔ اور ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے آگے جم غفیر تھا۔ کریم اللہ اُن کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ یہ وہی پیسے تھے جن کے لئے وہ دن بھر ترستا رہتا تھا۔ اور جو اس بیدردی کے ساتھ ٹکٹوں کے بدلے لٹائے جا رہے تھے۔

بارے خدا خدا کر کے اُس کی نظر اپنے بھائی پر پڑی۔ لپک کر اُس کے پاس پہنچا۔ اور اپنی ضرورت بیان کی بھائی نے کہا مہینہ کا اخیر ہے۔ آٹھ آنہ کا ٹکٹ لیا ہے۔ باقی میری جیب میں ہیں۔ بارہ آنہ ہیں۔ اُن میں سے کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ پرسوں تنخواہ ملیگی اُسوقت آنا۔ تو ایک دو

روپے دے سکونگا۔ یہ کہکر وہ جلدی سے تھیٹر میں گھس گیا۔ اور کریم اللہ منہ دیکھتا رہ گیا۔

اب کریم اللہ کا جی بیٹھ گیا۔ اُس کا ایک ایک قدم من من کا ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے چل کر سڑک پر پہنچا۔ اب اُس کو کوئی ٹھکانا نظر نہیں آتا تھا۔ ماموں کا مکان بہت فاصلہ پر تھا۔ اور جانے [illegible]۔ پھر بھی تب اُس نے ٹمٹم والے کو دو آنے کے پیسے نکال کر دیئے اور اُسے کہا کہ مجھے کارخانے تک لے چلو۔ اور بالآخر وہ اپنی آخری اُمید یعنی ماموں کے در دولت پر پہنچا۔ لیکن ماموں ایک فاحشہ عورت کے ساتھ رنگ رلیاں کرنے میں مصروف تھا۔ کریم اللہ نے بہت سے پیغام اندر بھجوائے مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ اور اگر جواب ملا تو یہی کہ میں اس وقت آرام کر رہا ہوں۔ پھر کسی وقت آنا۔ روپے مانگے تو جواب ملا کہ اس وقت میں کچھ مدد نہیں کر سکتا۔

اب کریم اللہ کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ پونے تین آنوں میں سے دو آنے ٹمٹم والے کو دیدیئے پانچ بجے سے لیکر سات بجے تک پریشان بھی ہوا۔ مگر ایک کوڑی بھی کہیں سے نہ ملی۔ پانچ آدمی اُس کے انتظار میں دیوان پر بیٹھے تھے۔ گھر میں بیوی اپنے بچوں کو لئے اُس کی راہ تک رہی تھی۔ بھائی۔ چچا۔ ماموں سب نے مدد دینے سے انکار کر دیا۔ عرصہ حیات اُس پر تنگ تھا اُس کا دماغ بگولے کی طرح چکر لگا رہا تھا۔ آنکھوں سے راستہ بھی نہ سوجھتا۔ پریشانی اور بے عزتی کے خیال نے اُس پر دیوانگی مسلط کر دی۔ اور وہ دیوانوں کی طرح خود بخود باتیں کرنے اور بڑبڑانے لگا۔

وہ تھک کر ایک پرانے کوئیں کی منڈیر پر بیٹھ گیا شام چاروں طرف تاریکی پھیلا رہی تھی۔ پانچ مہمانوں کی شکلیں یکے بعد دیگرے اُس کے سامنے آتیں اور محو ہو جاتیں۔ بیوی اور بچوں کی روتی اور بلکتی ہوئی صورتیں نمایاں ہو کر مٹ جاتیں۔ یکبار اُس نے محسوس کیا کہ اُس کے دائیں ہاتھ اُس کے پانچ بچے اور بائیں ہاتھ پانچ مہمان بیٹھے روٹیاں کھا رہے ہیں۔ پانچ! پانچ!! کا ہندسہ اور اُسکا شمار اُس کے دماغ کو مختل کئے دیتا تھا۔ ایک بار چکرا کر جو اُٹھا تو سیدھا کوئیں میں تھا۔

دھڑام کی آواز سنکر سامنے سے چند آدمی دوڑ کر آئے۔ ایک گھنٹہ کی کوشش کے بعد کریم اللہ کو باہر نکالا گیا۔ لیکن اب وہ زندہ نہ تھا۔ اُس کی لاش تھی جو باہر نکالی گئی تھی۔ صبح اُس کے پانچ مہمانوں اور محلہ داروں نے اُس کا جنازہ اُٹھایا۔ اُس کے پانچ بچے ابا میاں کہکر رو رہے تھے۔ اُس کی بیوی اس انداز سے نالہ و بکا کرتی۔ کہ سننے والوں کے دل ہل جاتے تھے۔ اُس کا ماموں بھائی اور چچا بھی جنازے کے ساتھ تھے اور کفن دفن سے فارغ ہو کر جب لوگوں نے اس تمام واقعہ کو سنا تو سب نے اُس کی بیوی اور بچوں کی امداد کی۔ چچا نے دو سو روپے اور ماموں نے پانچسو روپیہ بیوہ کے آگے رکھے۔ بھائی نے دس روپے دیئے۔ اور پانچ روپے ماہوار کا وعدہ کیا اہل محلہ نے بھی بہت کچھ دیا۔ یہانتک کہ بیوہ کے آگے روپیوں کا انبار لگ گیا۔ مگر کوئی اُس کے دل کو پوچھتا کہ یہ روپے اُسے سنگ و خشت سے بھی بدتر معلوم ہو رہے تھے۔ عزیزوں اور رشتہ داروں کی پہلی کجروی کے بعد اس نوازش کو دیکھکر ہی شاید شاعر نے یہ شعر کہا تھا

کی مرے قتل کے بعد اسنے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

آگے بڑھو یا پیچھے ہٹو

کارزار حیات کا ایک اٹل قانون

بیشتر سرمایہ داروں کو اس بات کی شکایت ہے کہ ان کے ماتحت کام کرنے والے ہزارہا مزدوروں میں سے بہت کم ایسے ہوتے ہیں جن کی طبیعت میں جدت ودیعت کی گئی ہو۔ ہر کارکن لکیر کا فقیر معلوم ہوتا ہے مشین کے چلنے پر اس کے ایک پرزہ کی طرح کام کرتا نظر آتا ہے۔ وہ اپنی طرف سے کوئی نئی بات پیدا نہیں کر سکتا۔ حالانکہ روزمرہ کی محنت و مشقت میں سینکڑوں ایسے مواقع پیش آتے ہیں جب کسی سمجھدار مزدور نے فطرتی ذہانت سے کام لیکر کام کی کسی ادنیٰ سی شاخ میں ایسی تبدیلی کی بنیاد رکھی جس سے کام میں کوئی خاص سہولت کی راہ نکل آئی اور اس کا نتیجہ سرمایہ و محنت اور دونوں کیلئے یکساں منفعت بخش نکلا۔

چھٹی کا منتظر ہر وہ مزدور یا تربیت یافتہ کاریگر جو ہر وقت اپنی نگاہ گھڑی کی طرف رکھتا ہے اور انتظار کرتا ہے کہ کب گھنٹے کی سوئی چھٹی کے وقت پر پہنچے اور کب یہ پاپ کٹے۔ ایسے شخص کیلئے دنیا کے ہاں عطیات نہیں۔ اسے کم سے کم مزدوری اور زیادہ سے زیادہ محنت کرنا ہوگی۔

کامیابی کا راز جو شخص دلی رغبت کے ساتھ اپنے کام میں منہمک رہتا ہے اور ہر وقت آگے بڑھنے کی برابر کوشش کئے جاتا ہے۔ وہ یقیناً اپنی زندگی کامیاب بناتا ہے۔ وہ شخص گھر کے اندر اور گھر کے باہر دونوں جگہ مسرور و شاد کام نظر آتا ہے۔ کیونکہ گھر کے اندر اس کے متعلقین اسکی آمدنی سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ اور گھر سے باہر وہ اپنے کارخانہ میں یا اپنے کام پر عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

جو شخص ان دونوں پہلوؤں میں کامیاب ہو وہ ہمیشہ مسرور نظر آتا ہے۔

بڑھو یا پیچھے ہٹو قدرت کا یہ اٹل قانون ہے کہ آگے بڑھو یا پیچھے ہٹو مطلب یہ ہے کہ جو شخص دھکیلتا نہیں وہ ضرور پیچھے کیطرف دھکیلا جاتا ہے اسے ہٹا دیا جاتا ہے۔ دونوں حالتوں میں سے ایک حالت سے آپکو ضرور سامنا کرنا ہوگا۔

قسمت! جو شخص شاہراہ کامیابی سے ہٹا دیا جاتا ہے وہ ایک طرف بیٹھا اپنی قسمت کو روتا ہے۔ وہ قسمت کو کوستا ہے اور قسمت کا دشمن اور صاحب نصیب قرار دیتا ہے۔ وہ کبھی تسلیم نہ کریگا کہ وہ لوگ آگے بڑھنے والے تھے۔ نکہ پیچھے ہٹنے والے جو لوگ پیچھے رہ گئے ہوں اور منزل مقصود سے دور ہٹا دیئے گئے ہوں وہ اپنوں اور بیگانوں میں حقارت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ لوگ انہیں ناکام و نامراد کہتے ہیں اور اسکی کم ہمتی اور نقائص کو با تفصیل بیان کرتے ہیں۔

پس اگر بڑھنا چاہتے ہیں تو بڑھنے کی کوشش کیجئے۔ اور کبھی بھی پیچھے ہٹنے کا نام نہ لیجئے۔

بقیہ صفحہ ۳۲

ابتدا ہوتی ہے ◆

اس مضمون میں ہم دیوار کی نقاشی کی اسی طرز پر اظہار خیال کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان کی قدیم عمارات اس قسم کی نقاشی سے مزین ہیں۔ لنکا کے قدیم معبد اور ایلورا و اجنتا کی غاروں میں بدھ کی پیدائش کی کہانیاں اور مذہبی روایات نقش کی گئی ہیں۔ یہیں سے ہندوستانی دیواروں کی نقاشی کی ابتدا ہوتی ہے۔ ۱۸۷۲ء میں مسٹر جوہن گرفتھ پرنسپل بمبئی سکول آف آرٹ کے زیر اہتمام اجنتا کی غاروں کی نقاشی کی نقول آتارنی شروع کی گئیں جو چھٹی صدی عیسوی کے بدھ مصوروں کے قلم کا نمونہ ہیں حکومت ہند نے اس کام کے لئے پچاس ہزار روپے منظور کئے تھے۔ اس کام کا مقصد صرف ہندوستانی پبلک کے سامنے ایسے نمونے پیش کرنا تھا جو سب سے پرانے اور سب سے وقیع تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ غرض پوری نہ ہو سکی اور جب تصویریں تیار ہو گئیں تو مسٹر گرفتھ کی مخالفت کے باوجود یہ تصویریں انڈین میوزیم لندن کے لئے بھیج دی گئیں جہاں وہ آتشزدگی وغیرہ میں ضائع ہو گئیں چونکہ بمبئی سکول آف آرٹ کو ابتدا ہی سے دیواروں کی نقاشی سے مناسبت پیدا ہو چکی تھی۔ اس لئے ۱۹۲۰ء میں لارڈ لائیڈ بہادر کی تجویز کے مطابق مصوری کی اس طرز کے لئے علیحدہ کلاس کھول دی گئی۔ اور جب نئی دہلی کی آرائش کے لئے اس قسم کے مصوروں کی ضرورت پیدا ہوئی تو بمبئی سکول آف آرٹ کے وہ طلبا جو ان کلاسوں میں تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ اس کام کے لئے آمادہ و مستعد پائے گئے ◆

بمبئی سکول آف آرٹ ہندوستان میں شاید قدیم ترین مدرسہ ہے جہاں آرٹ کا کام سکھایا جاتا ہے آجکل اس سکول کے ڈائرکٹر مسٹر گلیڈ سٹون ہیں جو فن مصوری کے ایک ممتاز ماہر ہیں۔ مدرسہ نے آپ کی زیر نگرانی ہر قسم کی ترقی کی ہے۔ اور یہ آپ کی مستعدی اور دقت نظر کا نتیجہ ہے کہ بمبئی سکول آف آرٹ نے اپنے جوہر نئی دہلی کی شاہی عمارتوں کو مزین کرنے میں دکھائے ہیں اور بلا شبہ وہاں جس قدر کام دوسرے صوبوں یا دوسرے مدرسوں کے ماہرین نے دکھایا ہے۔ اُن سے بمبئی سکول آف آرٹ کا کام سب سے بہتر اور افضل رہا ہے ◆

نئی دہلی کے شمالی حصہ میں پہلی منزل کے کمیٹی روم نمبر الف کی تمام تر نقاشی بمبئی سکول آف آرٹ کے ماہرین کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس کمرہ کی دیواروں کا رقبہ ۱۵۰۰ مربع فٹ ہے۔ آٹھ ماہرین فن نے آبی رنگوں کے ذریعہ سے دیواروں پر تصاویر بنائی ہیں۔ ان ماہرین کے ساتھ درجنوں مبتدی بھی تھے جو بطور مددگار کام کر رہے تھے۔ کام کی ابتدا نومبر ۱۹۲۷ء میں ہوئی اور فروری ۱۹۲۸ء میں اسکی تکمیل ہو گئی۔

اس کمرہ میں جتنی تصویریں بنائی گئی ہیں اُن میں سے ہر تصویر ۲ فٹ گیارہ انچ بلند دو فٹ ۴½ انچ چوڑی ہیں اور ۲ فٹ ۹½ انچ گہرائی میں ہے ◆

اس نمبر میں ہم اس عظیم الشان کام کی ایک تصویر رنگ شائع کر رہے ہیں جس کا نام "پینٹنگ" یعنی مصوری ہے تصویر ۲ فٹ ۱۱ فٹ ہے۔ تصویر کو دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ راجپوت طرز کی مظہر ہے۔ یہ جے ایم داسی کا کارنامہ ہے۔ لڑکی ایک مرصع پیڑھی پر بیٹھی ہوئی ہے۔ زانو پر ایک لکڑی اور اُس پر ایک کاغذ رکھا ہے۔ بائیں ہاتھ میں رنگ کی پیالی اور دائیں ہاتھ میں موقلم ہے۔ جس سے لڑکی تصویر

بنانے میں مصروف ہے سامنے ایک چوکی ہے جو مرصع رومال سے ڈھانپی گئی ہے۔ اس پر رنگ کی پیالیاں اور قلمدان رکھا ہے۔ عورت نے تحمہ۔ چوڑیاں۔ چمپاکلی آرسی اور اسی قسم کے زیورات پہنے ہوئی ہے۔ پوری تصویر میں دوسری طرف ایک عورت بیٹھی مطالعہ کر رہی ہے جو عورت کی سہیلی ہوگی۔ پشت پر ایک تصویر تیار رکھی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس تصویر میں جو ہم شایع کر رہے ہیں یہ تمام چیزیں موجود نہیں ہیں +

بمبئی سکول آف آرٹ کا کام تخلیق کے لحاظ سے زیادہ اچھا نہیں ہوتا لیکن بمبئی سکول کا مطمح نظر یہی ہے۔ کہ جہاں تک ہوسکے نیچر کی متابعت کی جائے۔ رسالہ جامعہ میں ایک مضمون شایع ہوا ہے جسمیں بمبئی سکول آف آرٹ کے رنگوں پر سختی سے نکتہ چینی کی گئی ہے اور انہیں سرسر غیر موزوں قرار دیا ہے ہوسکتا ہے کہ آپ رنگوں اور کاغذی تصویروں کے مطابق یہ رنگ زیادہ شوخ اور بھدے ہوں لیکن دیواری مصوری کے لحاظ سے یہ شاید زیادہ موزوں ہوں اس تصویر کا صرف وہ حصہ جس میں صرف مصورہ دکھائی گئی ہے علیحدہ یک رنگ شایع کیا جا رہا ہے تاکہ ناظرین مصور کے کام کا بغور مطالعہ کر سکیں۔ ہم بمبئی سکول آف آرٹ کے ڈائرکٹر مسٹر ڈبلیو ای گلیڈسٹون سالومن کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انکے شاگردوں کی کامیابی اور صنعت گری نے ہمیں مجبور کیا کہ ہم دیواروں کی نقاشی پر ایک مضمون لکھیں۔ اور اسے اردو کے سب سے بڑے رسالہ کے ذریعہ سے ملک کی تعلیم یافتہ جماعت کے سامنے پیش کردیں۔ ہم بمبئی سکول آف آرٹ کی اس طرز کی مصوری کے ایک دو اور نمونے بھی شایع کریں گے۔ تاکہ اردو داں پبلک اس کام کی اہمیت اور نوعیت سے بخوبی آگاہ ہو جائے۔ انگریزی خواں طبقہ کو میورل پینٹنگ آف دی بمبئی سکول مصنفہ ڈبلیو ای گلیڈسٹون سالومن نامی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ جس میں اس طرز کی مصوری پر نہایت مبسوط بحث کی گئی ہے +

حصہ نظم
انتخاب
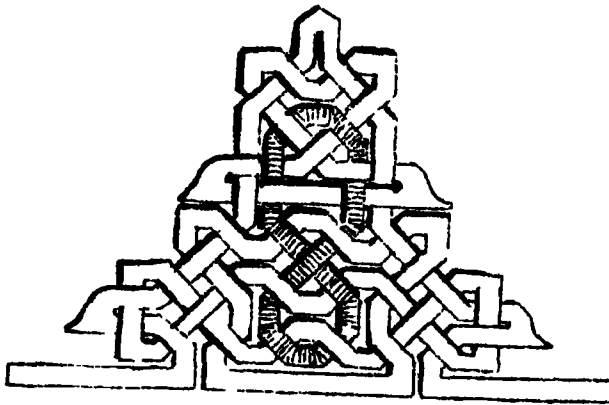
ذاکسار ایڈیٹر نیرنگ خیال شاعر نہیں اس لئے ہندوستان کے "چار کروڑ شعراء" کی صف آخر میں بھی جگہ پانے کے قابل نہیں ہے۔ البتہ سخن فہم ضرور ہے۔ اس لئے ایڈیٹر کے لئے اس ماہ کے رسائل سے پسند کامیاب غزلیں اور رباعیاں ناظرین نیرنگ خیال کے ذوق کی مدارات کے لئے پیش کرتا ہے۔ رسالہ حاتم میں حضرت عزیز لکھنوی کی چار رباعیاں شائع ہوئی ہیں۔ جو قابل ملاحظہ ہیں۔ لکھتے ہیں:۔

(۱)

دل ہی نہیں وہ بات کہاں سے لاؤں　　عشرت کے خیالات کہاں سے لاؤں
وہ دانت ہیں موتی سے نہ وہ موئے سیاہ　　اب تاروں بھری رات کہاں سے لاؤں

(۲)

سب محو تحیّر ہیں کوئی کیا بولے　　غنچہ کہ ہے لب بستہ زباں کیا کھولے
پرواز پہ مائل ہے چمن کا عالم　　جو پھول شگفتہ ہے وہ ہے بے پر تولے

(۳)

پیمانہ جہاں کا حسن سے مملو ہے　　شاخوں میں نزاکت ہے گلوں میں ضو ہے
آنکھوں میں کھپے نہ کیوں جمالِ ہستی　　رنگینیٔ نقشِ آفرینش تو ہے

(۴)

ہر پھول میں تیرے گلِ عارض کی مہک　　ہر نور میں تیرے رخِ روشن کی چمک
میرے دلِ تاریک کو بھی چمکا دے　　روشنگرِ جاں انجمن افروزِ فلک

مندرجہ بالا رباعیوں کے علاوہ حضرت عزیز لکھنوی کی چار رباعیاں "معصر عالمگیر" کے خاص نمبر میں شائع ہوئی ہیں جو درج ذیل ہیں:۔

جلوہ ترا خمخانہ فروز اے ساقی　　[illegible] تجھ سے بہار شب و روز اے ساقی
اندیشۂ باطل ہے فریب ہستی　　[illegible] وہ وسوسہ سوز اے ساقی

(۲)

حاصل ہو اگر تجھکو بصیرت کا شرف — بہتر ہے کہیں لعلِ بدخشاں سے خزف
جب نور ترے دیدۂ دل میں ہوگا — ہر ذرہ نظر آئے گا خورشید بکف

(۳)

قوت صفت سیل بہی ہے کیونکر — سختی اجل سب نے سہی ہے کیونکر
جو قلعۂ فولاد ہلا دیتے تھے — خاک اُن کی ہوا پہ اُڑ رہی ہے کیونکر

(۴)

آنکھوں کو دمِ نظارگی سی نہ سکے — تقسیم ہوئے جام مگر پی نہ سکے
ہو ننگے کوئی راحت سے ہوئی جنکی بسر — ہم چین سے دو روز بھی تو جی نہ سکے

عزیز لکھنوی

عالمگیر کے خاص نمبر میں ایک اور کامیاب غزل ہے۔ یہ حضرت جلیل کی تراوش فکر کا نتیجہ ہے۔ پڑھئے اور لطف اُٹھائیے۔

یہ دل میں اے خدا کس برق وش کی یاد آتی ہے — کہ بیتابی مجھے دینے مبارکباد آتی ہے
ترے ظلم و ستم کی داد دینے کو مرے لب پر — فغاں آتی ہے نالے آتے ہیں فریاد آتی ہے
تصور جب کیا تصویر جاناں پھر گئی دل میں — تجھے صورتگری ایسی کہاں بہزاد آتی ہے
تصور اس کرم کے میں کبھی تنہا نہیں رہتا — کہ جس دن تم نہیں آتے تمہاری یاد آتی ہے
تمنائے شہادت چوسے لیتی ہے لہو میرا — تجھے غیرت نہیں اے خنجرِ جلاد آتی ہے
شجر جو کوہ پر اُگتا ہے اُسکی پتی پتی سے — اگر سونگھو تو بوئے حسرتِ فرہاد آتی ہے

جلیل آنکھوں سے پیمانے چھلک جاتے ہیں بھر بھر کے
وہ اگلی صحبتِ پیرِ مغاں جب یاد آتی ہے

جلیل

لکھنؤ کے مشہور رسالہ ادب میں ایک غزل حضرت تجو دہلوی کی شائع ہوئی ہے جو ہر طرح سے قابلِ تعریف ہے درج ذیل کی جاتی ہے۔

معجزہ صور قیامت سے دکھایا نہ گیا — آج بھی طالع خوابیدہ جگایا نہ گیا
[illegible] — [illegible] یوں کہ سمجھایا نہ گیا
ذوق تردامنی دل کی جو کشتی ہے یہی — تو کہیں لیتا جہنم سے جھلایا نہ گیا
میرے تم ناز اُٹھاتے ہو کہ اپنے دل کے — مجھ سے ظالم کا یہ الزام اُٹھایا نہ گیا
آہ تجھ بجھ کے جلے روز شب زوں کے چراغ — آگ ہے بجھے دل کا کنول ظالم کہ جلایا نہ گیا
کیسے کوئین ہے دل کو خبر خلوت ناز — اور ظالم کبھی گھر سے کہیں آیا نہ گیا

ذرّے ذرّے سے تمنا کرتے ہیں جلوہ اپنی | راز دل تا بزباں گو کبھی لایا نہ گیا

لن ترانی کے ترانے ارنی سے بدلے | شبِ معراج وہی ناز دکھایا نہ گیا

میں محبت کو مٹاتا مری ہستی کیا تھی | آپ نقاش تھے یہ نقش مٹایا نہ گیا

اللہ اللہ تری حیرت تری رفعت اے عشق | آبِ رحمت سے ترا شعلہ بجھایا نہ گیا

عشق نے اُن سے نہ جانے کے ستم اُٹھوائے | جن سے اپنا ہی کبھی ناز اُٹھایا نہ گیا

موت کی نیند سے دنیا کو جگایا اے حشر | میری سوتی ہوئی قسمت کو جگایا نہ گیا

محفلِ دہر سے آپ اُٹھ گئے غیرت والے | کون مہماں تھا جو آخر کو اُٹھایا نہ گیا

جب سے جانا کہ یہ سب جلوہ گری تیری ہے | ایک فتنے کو بھی نظروں سے گرایا نہ گیا

حشر کیا قبل ازل بعد ازل بعد ابد
تیرے بیخود سے کبھی آپ میں آیا نہ گیا — بیخود

رسالہ ادبی دنیا کا حصّہ نظم خاص طور پر کمزور ہوتا ہے۔ پھر بھی اُسمیں حضرت عابد کا کلام اس کمی کو کسی نہ کسی حد تک پورا کر دیتا ہے۔ اس ماہ کے تازہ نمبر میں ایک نظم شیطان کے نام سے شایع ہوئی ہے جو حضرت عابد کا مخصوص اور کا نیا رنگ ہے۔ ملاحظہ ہو:-

شیطان

(اپنے آپ سے مخاطب ہو کر)

مری دنیا میں تصویرِ مسرت کا نشاں کیوں ہے؟ | فروغِ کہکشاں کیوں ہے بہارِ گلستاں کیوں ہے؟

پرندِ نیلگوں پر گوہرِ انجم درخشاں ہیں | بنی سنوری ہوئی آخر عروسِ آسماں کیوں ہے؟

چراغِ مہر طوفانِ فنا میں کیوں نہیں بجھتا | نشاطِ زندگی سے اس کا چہرہ ارغواں کیوں ہے؟

گلستاں میں رواں ہیں کاروانِ رنگ و بو کیسے؟ | ربابِ دلبری میں نغمۂ عشرت رواں کیوں ہے؟

زمانے بھر میں رُسوا ہو گئیں کیوں میری تدبیریں | کہولت کیوں بدی پر چھا گئی نیکی جواں کیوں ہے؟

زمینِ ہندوستاں کی شعلہ پرور کیوں نہیں ہوتی؟ | یہاں کا ذرّہ ذرّہ گلطراز و گلفشاں کیوں ہے؟

یہاں باغوں میں کیسے پھول کھلتے ہیں تمنّا کے؟ | یہاں کی سرزمینِ دلکشا جنّت نشاں کیوں ہے؟

اُسے دنیا میں دنیا کی طرح رہنا نہیں آتا! | تعجب ہے مجھے دسرتھ پہ قدرت مہرباں کیوں ہے؟

بہارِ زندگی کیوں ہے محبت رام و سیتا کی | مرے فتنوں کا رنگیں باغ پامالِ خزاں کیوں ہے؟

کروں گا خرمنِ اُمید پر برقِ بلا بن کر
ذرا ہشیار رہنا جا رہا ہوں منتھرا بن کر — عابد

ان کامیاب غزلوں کے انتخابات کے علاوہ ہم ناظرین نیرنگ خیال کی خدمت میں ایک تازہ ترین غزل حضرت احسن مارہروی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی بھی پیش کرتے ہیں جو ہمیں ابھی ابھی وصول ہوئی ہے ۔

احسن الکلام

میری غفلت نے بنایا ہادیِ منزل مجھے
آنکھ والے چونک اُٹھے دیکھ کر غافل مجھے

کوئی حسرت ہے نہ حسرت ہے نہ کچھ حاصل مجھے
سوچتا ہوں یا الٰہی! کیوں ملا ہے دل مجھے

شورشِ بحرِ فنا سے پائی تسکینِ بقا
موجِ طوفاں میں ملا ہے دامنِ ساحل مجھے

دیکھنا ہو جس کو اعجازِ مسیحا دیکھ لے
قتل کرتا ہے جلانے کے لئے قاتل مجھے

چھان لی ہیں سب گزرگاہیں طریقِ عشق کی
پیش پا اُفتادہ ہے ہر جادۂ منزل مجھے

چھا نے ہیں تیرے ہی جلوے کل فضائے دہر میں
ہر جگہ تو ہی نظر آیا سرِ محفل مجھے

یہ تصرف ہے تصور کا کہ اے محمل نشیں
کوئی پردہ اب نظر آتا نہیں حائل مجھے

حسرتِ دیدار بھی در پردہ بسمل ہو گئی
قتل گہ میں جب نقاب الٹو ملا قاتل مجھے

میں نے نازِ حسن اٹھایا اور اس نے بارِ عشق
میں دعا دیتا ہوں دل کو کوستا ہے دل مجھے

ضعفِ دل نے جوشِ وحشت کو دبایا اسقدر
ہاتھ اٹھانا بھی گریباں تک ہوا مشکل مجھے

چھوڑ کر فریادِ بے ہنگام نے تہذیبِ عشق
رازداروں میں نہ رکھا بات کے قابل مجھے

یہ وفاداری زمانے کے وفاداروں کی ہے
اُن کا دامن تھامتے ہی چھوڑ بیٹھا دل مجھے

شکوۂ جور و جفا کا آپ کیوں دیتے جواب
آپ کی خاموشیاں ہی کر گئیں قائل مجھے

راہِ مقصد تک پہنچ کر پا شکستہ ہو گیا
اب لئے بیٹھی رہے آرام سے منزل مجھے

عشق کی دنیا کا ہے احسن یہ حسنِ خاتمہ
لے چلی ہے حشر میں اُمیدِ مستقبل مجھے

احسن مارہروی

ایک اور تازہ نظم موصول ہوئی ہے ۔ یہ ایک شریف عورت کے جذبات ہیں جس کا خاوند دور دراز سفر پر چلا گیا ہے ۔ (ملاحظہ ہو اگلا صفحہ)

انڈمان کا سفر

"کر کے تنہا مجھے اے دوستو! گلفام گیا
رنج و غم سونپ گیا راحت و آرام گیا"

انڈمن جب سے مرا ہائے دلارام گیا ۔ چین دل سے گیا راحت گئی ۔ آرام گیا
ہند کے قصۂ پارینہ کو تازہ کر کے ۔ چھوڑ کر سیتا کو بن باس مرا رام گیا
سیر سے سیر نہیں ہوتا وہ سیلانی ہے ۔ ترکی و فارس و روم و عرب و شام گیا
مصر و بلقان و فرنجیس سے سیری نہ ہوئی ۔ انڈمن اب وہ ستم کیش گل اندام گیا
دل بسمل کو وہ ٹھکرا کے غرض چل ہی دیا ۔ آہ و نالہ مرا صد حیف کہ ناکام گیا
ہجر کو کاٹئے بیہوشی میں پھر کیا کیجیے؟ ۔ مئے گلرنگ گئی ۔ شیشہ گیا ۔ جام گیا
سیر کہسار سے ہے عار گلوں سے نفرت ۔ جب سے غربت میں ہمارا وہ گل اندام گیا

اب مرے پاس نہیں کچھ جو تجھے نذر کروں
دل گیا جاں گئی ۔ ناموس گیا ۔ نام گیا

علامہ راشد الخیری کی معرکۃ الآرا تصانیف

الزہراء

بنت رسول خاتون جنت حضرت بی بی فاطمہؓ کی اردو زبان میں بہترین سوانح عمری - تاریخ میں بیش بہا اضافہ کے علاوہ الزہرا بتاتی ہے کہ مائیں بچوں کو کس طرح پالتی ہیں - دنیا کے ساتھ دین کیونکر میسر آتا ہے - واقعات اسقدر دردانگیز کہ پڑھتے پڑھتے ہچکی بندھ جاتی ہے - خاتمہ پر واقعہ کربلا پر بحث ہے - آٹھواں اڈیشن + قیمت ۱۲ر

صبح زندگی

نسیمہ کے کنوار پنے کے حالات نہایت دلچسپ پیرایہ میں لڑکیوں کی تربیت پر صبح زندگی سے بہتر کتاب آجتک اردو زبان میں نہیں لکھی گئی صبح زندگی کا ایک ایک حرف موتیوں میں تولنے کے قابل ہے قیمت عہ

شام زندگی

قصہ کے پیرایہ میں موثر انداز میں بتاتی ہے کہ عورت کو کیسا ہونا چاہئے - مرد اور عورت یعنی میاں اور بیوی دونوں اسے پڑھیں پھر بچوں کو پڑھائیں - علاوہ مفید ہونے کے دلکش اتنی ہے کہ چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا - قیمت عہ

بنت الوقت

ہماری مستورات کی موجودہ تعلیم و تربیت کا بےمثل مرقع آجکل کی مہذب بیبیوں کی لاثانی تصویر - وقت کی اندھی تقلید کرنے والی ایک ناعاقبت اندیش لڑکی کا عبرت انگیز انجام + تعلیم نسواں کے سلسلہ میں اس کتاب کا مطالعہ اشد ضروری ہے - چھ دفعہ چھپ چکی ہے قیمت ۸ر +

سراب مغرب

تعلیم نسواں کے مسئلہ میں غیر مسلم ذرائع سے مستفید ہونا کہاں تک جائز ہے - اس موضوع پر علامہ محترم کی معرکۃ الآرا تصنیف تقلید مغربی کے دردناک نتائج پائینیر کا حشر فیشن جدید کا عبرتناک انجام - ماں باپ کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے خاندان سادات کی بدنامی ایسے باب ہیں کہ آنسو نکل پڑتے ہیں قیمت عہ

فسانہ سعید

بیوہ کا نکاح ثانی اسلام کا حکم ہے - مگر سعید کا دوسرا نکاح مولانا نے جس قابلیت سے بے سود ثابت کیا ہے وہ حق رکھتا ہے کہ ہر مسلمان اس کتاب کو پڑھے - سعید کی جگر خراش داستان دل ہلا دیگی سنگدل باپ نے بچی پر وہ ستم توڑے کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے - سوتیلے رشتوں پر نہایت سبق آموز کتاب قیمت صرف ۸ر +

نوحہ زندگی

بیوہ کے نکاح ثانی پر علامہ محترم کی مشہور تصنیف - رسم رواج میں پھنسکر مسلمان کس طرح تباہ ہوئے اس کتاب سے معلوم ہوگا یہاں ایسا قبرستان ملیگا جہاں عصمت کی لاج رکھنے والی بیوی اور عزت پر قربان ہونے والی ماں روئیں بائیں اپنے معصوم بچوں کو لئے گہری نیند سو رہی ہے نہایت موثر کتاب ہے ساتویں مرتبہ چھپی ہے قیمت ۱۲ر

ملنے کا پتہ منیجر نیرنگ خیال بکڈپو - ماروخانہ لاہور

نیرنگ خیال کا اگست نمبر

سات سال کے بعد نیرنگ خیال کا دور جدید

اب نیرنگ خیال مستقل طور پر سالنامہ کے سائز پر طبع ہوگا

چند مضامین کی فہرست جو اگست نمبر میں شائع ہو رہے ہیں

مقالات

مضمون	مصنف
قاآنی کے اخلاق و عادات	از جناب محمد عبد القوی صاحب ایم۔ اے علیگ لکھنؤ یونیورسٹی
نائٹ ایڈیٹر (مزاحیہ)	از جناب مفتی غلام جعفر صاحب بی۔ اے۔
علی گڑھ سے ڈربن	از جناب عبد الشکور صاحب ایم اے سابق پرفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
آرٹ کا ایک مجسمہ جنوبی افریقہ (افسانہ)	از جناب محمد عطاء الرحیم صاحب ایم اے ایل ایل بی
دنیا کے نامور ترین جرنیل کی حیات معاشقہ	منظور سروش۔ مولوی فاضل
پُراسرار رومال (افسانہ)	از جناب خواجہ عبد الکریم صاحب ایم اے
میر باقر حسین صاحب مرحوم	کنور محمد یٰسین علیخاں صاحب
کاہلی	جناب شرف الدین احمد بی۔ اے۔ علیگ عظیم آبادی
ایکٹرس (ایک ایکٹ کا ڈرامہ)	جناب بدر الدین صاحب بدر
کاش میں حسین ہوتی۔ (معاشرتی)	محترمہ قدسیہ بیگم صاحبہ لکھنؤ کے قلم سے۔
گمشدہ ستارے (ادبی)	اے یو کے۔ خاں۔ ملکہ

اس کے علاوہ نظموں اور تصاویر وغیرہ سے پرچہ مرصع ہوگا۔ لٹریچر سابقہ پرچوں سے ڈیڑھ گنا۔
قیمت وہی سالانہ للعہ محصولڈاک۔

منیجر رسالہ نیرنگ خیال بارود خانہ لاہور

مرقع چغتائی

ہندوستان کی سب سے بڑی تصنیف جس کی تصاویر کے بلاکس یورپ میں تیار ہوئے۔ اور جسکی تصاویر لندن میں چھاپی گئیں بہترین آرٹ پیپر پر طبع ہوا۔ جس کی جلد ولایت سے بنکر آئی اور جو ایک سو دس روپے کو فروخت ہونے کے بعد اب صرف ... روپیہ میں مل رہا ہے۔ ہر شخص اور ہر کتب خانہ میں ہندوستان کے شاعر اعظم حضرت غالب کا یہ دیوان ضرور موجود ہونا چاہئے۔ پچاس رنگین تصاویر کا مجموعہ ہے +

اسکا دیباچہ مشہور نقاد ڈاکٹر کزنز پی۔ ایچ ڈی نے لکھا ہے۔ اس کا تعارف ناصر علامہ سر اقبال نے لکھا تھا۔ مشہور نقادانِ فن کی آراء ملاحظہ فرمائیے :-

لندن کا مصور رسالہ سٹوڈیو لکھتا ہے :- چغتائی کی تصویریں نظمیں ہیں۔ جو سازِ موسیقی سے آزاد۔ رنگ اور خطوط سے آراستہ شاعری جذبات سے گداز کیفیت پیدا کرتی ہیں +

لندن ٹائمز - چغتائی اس سے قبل یورپ میں دورِ جدید کی مصوری کا اوّلین پیشرو اور ایشیائی دورِ احیا کا صحیح ترین مظہر قرار دیا جاچکا ہے +

لندن امپائر ریویو (لندن) دہلی کی نمائش میں ایشیائی مصوری میں جدید ترین دورِ احیا کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ عبدالرحمن چغتائی کی تصاویر نے بہترین نمایندگی کی ہے +

لندن انڈین آرٹسٹ - چغتائی نے رباعیات عمر خیام کی جو تصویریں کبھی بنائی ہیں وہ اُن رباعیات عمر خیام کی تصویروں سے جو اسوقت دنیا میں پیش کی جاچکی ہیں۔ بلند ترین ہیں۔ اور اس بات میں وہ مغربی مصوروں تک سے بھی بڑھ گیا ہے جس کی تصویروں کی مغرب میں دھوم ہے +

نیوسٹے امریکہ - چغتائی اور روسی مصور نکلاسک کی تصویریں فن کی خصوصیات اور اُسکی خوبیوں کی ترجمان ہیں۔ مگر روسی مصور ایک فکر ہارے کا کام کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور چغتائی کی تصاویر ہاتھی دانت کے شاہکار ہیں۔ چغتائی اپنے فن کا بہترین اُستاد ہے۔ اُس کی تصاویر تخیلی نہیں بلکہ تخیلی ہیں۔ اُسکا ہر پہلو مادیت کی آسودگی سے بالکل پاک ہے اُسکی تمام تصاویر مکمل ہیں +

آبزرور گارڈین لندن - چغتائی بنگال سکول کے مصوروں سے الگ اور بالکل مختلف ہے۔ اسمیں بنگالی مصوروں سے بہت رنگوں کا کمال۔ خیال کی شعریت اور احساس حیات بہت زیادہ ہے +

باقی آرا آیندہ ماہ درج ہونگی۔ آپ اس مرقع کو خرید لیجئے۔ ایسی کتابیں بار بار نہیں چھپا کرتیں یہ ایڈیشن ختم ہوچکا تو بعد میں مایوس ہونا پڑیگا۔ قیمت سترہ روپے علاوہ محصول ڈاک +

(پتہ) **مینیجر رسالہ نیرنگ خیال - بارود خانہ لاہور**

کیا آپ نے کامل دائی یا لیڈی ڈاکٹر باتصویر نہیں خریدی

گورنمنٹ آف انڈیا سے رجسٹری شدہ

اگر نہیں! تو آج ہی کارڈ لکھدیں۔ اس کتاب کا ہر گھر میں ہونا ضروری ہے

کتاب کا اشتہار رسالہ نیرنگ خیال میں کئی ماہ سے جاری ہے روزانہ تعریف کرنے سے کاغذ سیاہ کرنا ہے مختصر یہ
۔ اس میں مستورات کی تمام پوشیدہ بیماریوں کا حال مع علاج اور مجرب نسخے درج ہیں۔ **دائی جنائی** کا مفصل کام مکمل باتصویر
کیا گیا ہے۔ ہمارا دعوی ہے کہ ہندوستان میں اس سے پہلے ایسی مکمل کتاب شائع نہیں ہوئی ہر مرد عورت، ڈاکٹر حکیم کو اس
کا مطالعہ کرنا اور اپنے پاس رکھنا ضروری ہے۔ آج ہی منگوا لیں۔ دوسرا ایڈیشن بھی قریب ختم ہونے کے ہے قیمت مجلد ایک روپیہ بارہ آنے
علاوہ محصولڈاک ۲ر دو دا اکٹھی خریدنے پر محصولڈاک معاف۔

پتہ یہ ہے

منیجر کارخانہ احسان اینڈ کمپنی تسنتی کوٹھی نمبر ۲ لودھیانہ پنجاب

دوسرا ایڈیشن چھپ کر نصف فروخت ہو گیا ہے جلد طلب کریں

عمل کامل اس نادر و نایاب کتاب میں قلمی کتابوں سے ہر مقصد ہر مطلب دلی خواہش من کی مراد کرنے والے ایسے ایسے نقش عملیات
تعویذ گنڈے ٹوٹے ٹوٹکے لکھے ہیں کہ جسکو جی چاہیے اپنا بنا لو۔ روٹھے ہوئے بگڑے دل احباب کو مہربان کرلو۔ مقدمہ کار و بار تجارت
ملازمت داری وغیرہ میں حسب دلخواہ فائدہ حاصل کرلو۔ دولت حشمت، رزق، روزگار میں ترقی کرنا بیماری بیکاری مشکل مصیبت
سے نجات پانا۔ ہر قسم کی بیماریوں سحر طلسم، نظر بد سے رہائی پانا ہو تو یہ کتاب ضرور خریدیں۔ اس میں فالنامہ۔ خواب نامہ تسخیر
قلوب دعائے دستگیر نقش مشکلات اور دست غیب دریافت چند مفرور حیوانات اور کھیتی باڑی کی حفاظت کے لئے
نقش اور تعویذات درج ہیں۔ کوئی ضروری بات کوئی ایسا کام نہیں رہا جو اس کتاب سے پورا نہ ہوگا صفحہ ۲۰۰ مجلد کاغذ لکھائی
چھپائی نہایت عمدہ قیمت فی جلد دو روپے چار آنے۔ محصول ڈاک ۲ر دو اکٹھی منگوانے پر محصولڈاک معاف عاملوں کے پھندے
سے بچیں۔ اور خود عامل کامل بن جاویں۔

منیجر صوفی بکڈپو نمبر ۲ لودھیانہ پنجاب

مفرح اعظم یا

یاقوت۔ زمرد۔ مروارید۔ مشک۔ عنبر۔ زعفران۔ ورق طلا۔ ورق نقرہ | وغیرہ وغیرہ کا

عجیب الاثر مجموعہ

رؤساء۔ اُمراء۔ وکلاء۔ مصنفین اور دماغی محنت کرنے والوں کیلئے قابل استعمال

کمزوری اور سرعت کا واحد علاج

مفرح اعظم حکمائے قدیم کا ایک منفعت بخش مرکب ہے جو زمانہ حال کی ایجادات اور ضروریات کو مدنظر رکھکر حکیم یوسف حسن صاحب مہتمم دار التجارت طبی مؤلف و مصنف طب مخفی۔ صنعت اکبر۔ تربیت الانسان۔ قوت ہاضمہ کی نشو و نما۔ قلمی بیاضوں کے منتشر اوراق وغیرہ وغیرہ سو سال کے پے در پے تجارب کے بعد تجویز کی ہے اور اب اس سے بہتر ایجاد آپکو کسی جگہ سے نہ مل سکیگی۔ اور بغیر اشتہار کے برسوں سے بکثرت بک رہی ہے

دماغ۔ قلب۔ معدہ اور گردوں کی تقویت میں بالخاصہ مفید ہے

پڑھنے لکھنے کے شوقین یا جن لوگوں کے دماغ کثرت مطالعہ یا غلط کاریوں سے ناقص ناکارہ ہو چکے ہوں اور حسب ضرورت کام نہ کرتے ہوں۔ وہ چند روزہ استعمال کے بعد دیکھ لینگے کہ کام کاج پر کسقدر طبیعت لگتی ہے ہر قسم کی تھکاوٹ کو منٹوں میں رفع کر کے انسان کو از سر نو کام کے قابل بنا دیتی ہے اسکے استعمال سے مفرح اسقدر طبیعت میں فرحت اور خوشی کی رَو بجلی کی طرح دوڑ جاتی ہے دل میں امنگ پیدا ہوتی ہے دماغ کا تخیل بلند پروازی دکھانے لگتا ہے

بھوک اس کثرت سے پیدا ہوتی ہے

کہ اگر آپ کوئی چیز نہ کھائیں تو آپ تکلیف محسوس کرنے لگینگے۔ وہ دودھ گھی بکثرت ہضم ہوتا۔ کھانا دو گنا کھایا جاتا ہو اور فوراً ہضم ہو جاتا ہے اسکے تمام مردانہ قوتیں اور جوہر زندگی کا جوہر پیدا کرتی ہے اور وہ کام جو یورپ کی قیمتی سے قیمتی دوا سے بھی پورا نہیں ہو سکتا تھا اس سے پورا ہو نکلتا ہے قوت باہ کے علاوہ صحت کو دو گنا کر کے اسقدر پیدا کرتی ہے

اپنا دیوانہ بنالے گی

یہ دوا آپکو اپنا دیوانہ بنالیگی نہایت قلیل مقدار میں کھائی جاتی ہے مزہ خوشگوار ہے اور اس قسم کی جملہ ادویات بے ضرر بھی ہے کسی قسم کا نقصان نہیں کرتی۔ اور ایک سے دو رتی ایک ماشہ تک برداشت کرنا کسی مضبوط آدمی کا کام ہے قیمت فی ڈبیہ چار تولہ تین روپے نمونہ کی ڈبیہ دو تولہ دو روپے

ملنے کا پتہ: مہتمم دار التجارت (طبی) ہندی و یونانی دواخانہ لاہور اندرون مستی دروازہ

ناظرین نیرنگ خیال میں ایکہزار روپیہ کی تقسیم

ہر شخص انعام حاصل کرسکتا ہے

آم کے آم گٹھلیوں کے دام

نیرنگ خیال کے ہزارہا ناظرین میں ایکہزار روپیہ نقد کے انعامات تقسیم کئے جائینگے۔ یہ روپیہ نیرنگ خیال برادری کے ایک عزیز بھائی نے بطور امداد عطا فرمایا ہے اس لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اسے ناظرین میں تقسیم کردیں ہر خریدار اور غیر خریدار اس کام میں حصہ لیسکتا ہے آپ کسی دوست یا شائق علم و فن کو رسالہ نیرنگ خیال دکھاکر اس سے وعدہ لیں کہ وہ رسالہ کا وی پی سال بھر کے لئے ۳ معہ محصولڈاک خرچہ وی پی وفیس منی آرڈر وغیرہ میں وصول کرے۔ اور اس کا نام و پتہ ہمارے پاس بھیجدیں ہم ان کے نام وی پی کردینگے وی پی وصول ہونے پر آپکے نام کے سامنے ایک خریدار درج کیا جائیگا۔ یہانتک کہ جسقدر خریدار آپکی وساطت سے ہوتے جائینگے وہ درج ہونگے اور جسوقت آپ لکھیں گے انعام آپکی خدمت میں بھیجدیا جائیگا۔ انعامات کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

- ایک خریدار بنانے والے کو ایک سوتی رومال
- دو 〃 〃 بلکھڑیاں قیمتی ۸ یا صابن کا ایک بکس
- تین 〃 〃 پکچر البم مفت یا ایک نکٹائی
- چار 〃 〃 کتاب نمبر بیوی مفت یا تیل کی ایک شیشی
- پانچ 〃 〃 ایک ریشمی رومال
- دس 〃 〃 کتاب دوشیزہ قیمتی ۱۲ مفت یا عطر اعلم کی ایک ڈبیہ یا گراموفون کا ایک ریکارڈ
- پندرہ خریدار بنانے والے کو ایک چھاتہ (چھتری)
- بیس 〃 〃 ایک افغانی یا ایرانی کی ٹوپی یا سلیپر قیمتی للعہ روپیہ
- پچیس 〃 〃 ایک ترکی ٹوپی یا زنانہ سلیپر قیمتی چھ روپیہ
- تیس 〃 〃 آگرہ کا بہترین شو (بوٹ) 〃 آٹھ روپیہ
- چالیس 〃 〃 زنانہ یا مردانہ سوٹ کا کپڑا 〃 بارہ روپیہ
- پچاس 〃 〃 مرقع چغتائی ایک جلد 〃 سترہ روپیہ
- سو خریدار بنانے والے کو ایک سائیکل قیمتی پچھتر روپیہ

ہر آرڈر روانہ کرتے وقت کارڈ کے اوپر انعامی مقابلہ کا لفظ ہونا لازمی ہے۔ صرف اُنہیں آرڈروں کو شمار کیا جائیگا جو وصول ہونگے۔ دو انعامات حاصل کرنیکا یہ طریقہ ہے کہ ایک شخص نے پندرہ خریدار بنائے ہیں وہ چھاتہ لینا نہیں چاہتا وہ دس خریدار کا انعام کتاب دوشیزہ اور پانچ خریدار کا انعام ریشمی رومال لے سکتا ہے۔ جو صاحب صرف کتابیں لینی چاہیں اور وہ لاہور سے ملسکتی ہوں تو ہم وہ بھی بھیج سکینگے۔ بشرطیکہ وہ اُسی قیمت کی ہوں۔ محصول ڈاک ذمہ خریدار۔

نیرنگ خیال کے ہر خریدار کو اس معاملہ میں پوری پوری دلچسپی لینی چاہئے۔ انعام بھی حاصل کیجئے اور رسالہ کی اشاعت بھی بڑھائیے۔ ہندی کا رسالہ چاند پندرہ ہزار چھپتا ہے۔ مگر اردو کا کوئی علمی ادبی رسالہ پانچہزار سے زیادہ نہیں چھپتا اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ لوگ مانگ کر پڑھنے کے شائق بن گئے ہیں۔ پس اس اعلان کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کام میں امداد دیجئے۔ پتہ:۔

مینیجر رسالہ نیرنگ خیال۔ بارود خانہ لاہور

نیرنگ خیال بکڈپو کی وہ کتابیں جو دفتر نیرنگ خیال سے مل سکتی ہیں

دوشیزہ

دوسرا ایڈیشن چھپ گیا

علم نوعی پہلا جواب اور بے مثل کتاب

یہ کتاب سلسلہ تربیت الانسان کا پہلا حصہ ہے جو اپنی جگہ پر اور مکمل ہے اسمیں عورت اور مرد کے ازدواجی اور نکاحی تعلقات پر طبی اور سائنٹفک اصولوں کے مطابق تحقیقی نظر ڈالی گئی ہے جرمن فرانسیسی امریکن اور انگلستان کے تمام ڈاکٹروں کی تحقیقات کا مطالعہ کرنے کے بعد تمام کام کی اور ضروری باتیں انتخاب کر دی گئی تھیں۔ ہندوستان کے فارسی اور سنسکرت زبان کے کوک شاستروں کی لایعنی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے تمام باتیں چھانٹ کر اور اس پر تمام تحقیقات جمع کر کے ایک کتابی صورت میں جمع کیا گیا ہے۔ زمانہ حمل سے لیکر بچپن اور جوانی تک کی تمام حالتوں اور ضرورتوں پر نظر ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب دلی والوں کی ان کتابوں کی نقل یا ان کی تقلید نہیں ہے جو عریانی اور جذباتی باتوں سے لبریز نظر آتی ہیں۔ بلکہ شروع سے لیکر اخیر تک تمام چیزیں اصول اور اخلاق کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ ہزاروں آدمی اس کتاب کی برکت سے فیضیاب ہو چکے ہیں جوانی کو قایم رکھنے اور حسن و شباب کی جملہ ضروریات کو پورے طور پر بے نقاب کرنے کے ساتھ بہترین اور صحیح مجرب نسخہ جات اس پیرایہ میں پیش کئے گئے ہیں کہ ہر شخص مستفید ہو سکے ہر پڑھے لکھے گھر میں یہ کتاب موجود رہنی چاہئے۔ سائز کلاں حجم ۲۰۰ صفحات خوشنما بلاک کی چالیس تصاویر۔ دستی تصاویر علیحدہ مجلد قیمت علاوہ محصول ہے ۳ روپے

دولہا دلہن کے خطوط — یہ شراب محبت میں ڈوبی ہوئی کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے قیمت صرف ۸ر

میاں بیوی کے خطوط — یہ کتاب الفت و محبت کے خطوط سے لبریز ہے جو میاں بیوی کی سچی محبت کی تصویر ہے قیمت ۸ر

میاں بیوی کے کھیلنے — اس کتاب میں وہ تڑپا دینے والے لطیفے ہیں کہ ان کے پڑھنے کے بعد میاں بیوی دونوں بیتاب ہو جاتے ہیں۔ قیمت صرف ۸ر

ثریا

عہد حاضرہ کا بہترین معاشرتی ناول

نذر سجاد حیدر کے قلم سے

(دفتر میں صرف ایک دو جلدیں باقی ہیں)

ہندوستان کی مشہورہ آفاق ادیبہ محترمہ نذر سجاد حیدر صاحبہ کا لاجواب شاہکار ہے۔ یہ ایک ضخیم ناول ہے جو نیرنگ خیال میں بالاقساط چند ماہ تک شایع ہوتا رہا۔ لیکن اس طرح سے اس کا لطف زائل ہو رہا تھا۔ ہم نے اس کی اشاعت کو روک کر اسے کتابی صورت میں شایع کر دیا ہے۔ یہ ناول اسقدر دلچسپ ہے کہ بغیر ختم کئے چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا حجم ۲۱۱ صفحہ۔ قیمت رعایتی صرف ۱۲ر

میاں بیوی کیلئے پانچ نئی کتابیں

عیش و نشاط	۴ر	دولہا دلہن	۴ر
میاں بیوی	۴ر	مرد عورت ۴ر زن و شوہر	۴ر

ملنے کا پتہ:- منیجر نیرنگ خیال بکڈپو۔ بارود خانہ لاہور

شادی سے پہلے اور شادی کے بعد

پڑھنے کی کتابیں جنمیں شادی کی تمام ہدایات پوشیدہ ہیں

(غیر شادی شدہ منگائیں کیونکہ یہ صرف شادی کیلئے کار آمد ہیں)

دولہا دلہن۔ یہ کتاب نئے شادی شدہ نوجوانوں کو اپنی بیویوں سے حقیقی محبت کرنا سکھائے گی اور ناتجربہ کاروں کو ناتجربہ کاری سے جو نقصانات پہنچ جاتے ہیں ان سے بچائیگی یہ اردو میں لاجواب اور دلچسپ کتاب ہے۔ اس کتاب میں دوسو کے قریب مضامین ہیں۔ قیمت صرف ۱۲؍

عیش و نشاط۔ اس کتاب میں شادی شدہ حضرات کیلئے وہ تجارب ہیں جن کے معلوم ہونے کے بعد کیف تندرستی تندرست اولاد خوبصورت اولاد۔ لائق اولاد عورت کی محبت چند دن کے مطالعہ کے بعد حاصل کیجا سکتی ہے مصنف کا دعویٰ ہے کہ اس سے بہتر کتاب کسی مشرقی زبان میں کبھی شائع نہیں ہوئی۔ اس کتاب میں پونے دوسو کے قریب مضامین ہیں۔ قیمت صرف ۱۲؍

میاں بیوی۔ یہ کتاب دراصل بے تکلف احباب کیلئے لکھی گئی تھی۔ اس کتاب میں زن و شوہر کے تمام تعلقات پر بحث کی گئی ہے۔ اور ان تعلقات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جنہیں لوگ اپنی بیوقوفی سے خلاف تہذیب سمجھتے ہیں۔ قیمت عہ؍

مرد عورت۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد مرد اپنی بیوی کی تمام ضرورتوں کو نہایت خوبی کے ساتھ پورا کرسکیں گے۔ اس کتاب میں عورت اور مرد کے تعلقات خانگی کے متعلق وہ تجارب ہیں جو اسی سال کے بوڑھے بھی ناواقف ہیں۔ قیمت صرف عہ؍

زن و شوہر۔ طلسمی کتاب نئے شادی شدہ نوجوانوں کو زندگی کی راحتوں سے لبریز کردیگی۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہر مرد ایک پرانے تجربہ کار کی طرح عورت کی ہر ایک فطرت سے آگاہ ہوجائیگا۔ قیمت صرف ایکروپیہ (عہ)

نیرنگِ خیال پکچر البم

تین تین پیسہ میں ایک ایک تصویر

یعنی نیرنگ خیال کی ان تصویروں کا انتخاب جو وقتاً فوقتاً نیرنگ خیال میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اس مجموعہ میں کل تیس تصاویر ہیں جنمیں سے دس تصاویر سہ رنگی اور بیس تصاویر یکرنگی ہیں۔ تمام بڑے بڑے اور بہترین بلاک انتخاب کر لئے گئے ہیں۔ اور یہ تصویریں آرٹ پیپر کے صرف ایک ہی طرف شائع کی گئی ہیں۔ یہ مجموعہ اپنی لائبریری میں رکھنے یا آرائش کے لئے چوکھٹوں میں لگوا کر رکھنے کے لئے بہترین اور لاجواب ہے۔ ٹائٹل بھی خوشنما لگایا گیا ہے۔ اس قسم کی تصویری البم جو کلکتہ کے انگریزی رسائل شائع کیا کرتے ہیں۔ ان کی قیمت دو روپیہ ہوتی ہے۔ مگر ہمنے اسکی قیمت صرف ۱۲؍ رکھی ہے۔ حالانکہ بعض تصاویر اتنی قیمتی اور نظر فریب ہیں۔ کہ ایک ہی تصویر اس قیمت میں بازار سے دستیاب نہیں ہو سکتی۔

اس مجموعہ کو فی الفور طلب کیجئے۔

نیرنگ خیال کے خریداروں کو محصولڈاک معاف۔

پنکھڑیاں

مغرب اور مشرق کے جواہر رقم ادیبوں کی ادبی کاوشوں کا لاجواب مرقع ہے۔ تخیل کی پرواز کے ساتھ ندرت و عظمت کا گرانمایہ شاہکار ہے۔ فلسفہ جوش عمل۔ اخلاق محبت اور قانون فطرت کے متعلق سینکڑوں قیمتی چیزیں لکھی گئی ہیں۔ یہ چیزیں قلم سے نہیں خون دل سے لکھی گئی ہیں۔ آپ اس کتاب کو منگا کر لطف اٹھائیے۔ اسمیں ہندوستان کے بیسیوں مشاہیر ادبا کے مضامین درج ہیں۔ قیمت۔ از خریداران نیرنگ خیال سے عہ؍

ملنے کا پتہ منیجر نیرنگ خیال بکڈپو۔ بارود خانہ۔ لاہور

دو بادشاہ
جیسے شیر حیوانات کا بادشاہ
ہے ویسے ہی امرت دھارا کا ایک
ایک قطرہ نباتات کا بادشاہ ہے
امرت دھارا
امرت دھارا کے ایک قطرے سے امراض ایسے ڈر کر بھاگتی ہیں جیسے شیر کی ایک ہی آواز سے تمام حیوان ڈر کر بھاگتے ہیں۔ امرت دھارا
مہینوں کی امراض دنوں میں اور دنوں کی گھنٹوں میں اور گھنٹوں کی منٹوں میں دور کر دیتا ہے کوئی دوائی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی
اور طرفہ یہ ہے کہ ایک ہی دوائی تقریباً کل امراض کو دور کر دیتی ہے ایک صاحب جناب محمد حسین خان مقام ... سے تحریر فرماتے
جناب پنڈت صاحب تسلیم بعد تکریم کے بعد گذارش ہے کہ یہ حقیر راقم الحروف ایک لاعلاج
مایوس مریض تھا جسکو دوران مرض کے درمیان کلکتہ کے اعلیٰ ڈاکٹروں
میڈیکل کالج کے پروفیسروں تک نے جواب دیدیا تھا کہ یہ مرض لاعلاج ہے۔ صحت ناممکن چنانچہ آپ نے بھی مجھے دردناک حالت میں اپنی دوران
سیاحت کے درمیان جس وقت کلکتہ تشریف لائے تھے میری عاجزانہ التماس پر
غریب خانہ پر تشریف لا کر بچشم خود میری حالت زار کو
آپنے ملاحظہ فرمایا تھا۔ اس دردناک حالت کو خیال کرنے سے مرض کانپ جاتا ہے
جس وقت آپنے میری حالت زار کو ملاحظہ فرمایا تھا۔ اس وقت آپنے مجھے بہت کچھ
امید دلائی تھی کہ یہ مرض اگر خدا نے چاہا تو اچھا ہو سکتا ہے۔ صرف ... کا فساد ہے
سو میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کرتا ہوں۔ کہ خدا نے آپکی دعا قبول کی آپکی موجب
جیسا آپ بذریعہ خط کے علاج کے بدلے میں رائے دیتے رہے ہیں اس پر کاربند
ہو آج اللہ تعالےٰ شافی مطلق کے فضل و کرم سے میں ایک سال کے قریب ہونے پر
بتدریج تندرست ہو کر اس قابل ہو گیا کہ اپنی قوت لایموت کو بذریعہ اپنی قوت بازو کے
حاصل کر سکوں یہ سب کرشمہ آپکی عجیب و غریب امرت دھارا کا ہے لے
خداوند کریم تو اس امرت دھارا کے موجد کی عمر میں دن دگنا ... تاکہ اس کی
فیض رسانی سے تیری مخلوق کو لامحدود فائدہ پہونچے اے غفور الرحیم تو
امرت دھارا کے موجد کی دولت و اقبال کو ہمیشہ قایم رکھ اس نے تیری مخلوق
پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس کی آل اور اولاد میں برکت عطا کر
تو نے اپنے بندوں کو عجیب نعمت عطا فرمائی ہے۔ جو کسی کے خیال
میں بھی نہیں آسکتا ہے مکان میں ہر خورد و بزرگ صرف امرت دھارا ہی کا آسرا
رکھتے ہیں ڈاکٹروں کے فیس دے کر بلانے کی ضرورت نہیں۔ جہاں کسی کو
شکایت ہوئی فوراً امرت دھارا سے اسکا خیر مقدم کیا گیا۔ اور خدا نے
رحم فرمایا۔ پس میں آپکے احسان کا شکریہ کسی طرح نہیں کر سکتا۔ سمندر
درمیان اسٹیمر یعنی جہازوں سے جس قدر فرمائش آپکے پاس جایا کریگی
وہ سب بالکل مجھ ضعیف کی کوشش کا نتیجہ خیال فرما لیجئے گا۔ کیونکہ
پیشہ جہازی ہے جسکو میں آپکے سامنے مفصل بیان کر چکا ہوں اور
خدا کی عنایت سے تندرست ہونے کے بعد میں اپنی تبدیلی جگہ پر لازم ہو
آیا ہوں۔ والسلام۔ نیازمند محمد حسین خان از مقام ... جہاز
قیمت امرت دھارا سالم شیشی دو روپے آٹھ آنے نصف شیشی ایک روپیہ چار آنے۔ نمونہ آٹھ آنے
ترکیب استعمال کی کتاب شیشی کے ساتھ ہوتی ہے۔ ہندوستان کی جس زبان میں چاہئے خط میں لکھدیں مفصل حالات کیواسطے رسالہ امرت منگوا لیں
کارخانہ کی دیگر چار سو ادویات کی فہرست اور طبی کتب مصنفہ پنڈت صاحب کی فہرست اور رسالہ ... جس کی ضرورت ہو مفت بھیجا جاتا ہے
ہر شہر میں ملتی ہے یا اس پتہ سے منگوالیں :- امرت دھارا — لاہور
المشتہر
مینیجر امرت دھارا اوشدھالیہ۔ امرت دھارا بھون۔ امرت دھارا روڈ۔ امرت دھارا ڈاکخانہ لاہور

The Nairang-i-Khiyal, Lahore.

نمک سلیمانی تمام شکایتوں کو دور کرکے معدہ کو مقوی کرتا ہے اور بدن میں خون صالح بافراد پیدا کرکے تندرستی بڑھاتا ہے اور امراض ذیل کو تیر بہدف فائدہ بخشتا ہے:۔

دائمی قبض۔ بدہضمی۔ شکم میں درد اور نفخ ہو جانا۔ کمی اشتہا یعنی بھوک نہ لگنا۔ کھٹے ڈکار آنا۔ سینہ جلنا۔ منہ سے بدمزہ پانی چھوٹنا۔ طحال یعنی تاپ تلی۔ ضعف معدہ۔ وبائی امراض۔ ہیضہ۔ اسہال۔ پیچش۔ بواسیر۔ درد کمر۔ درد گردہ۔ اوجاع اورام مفاصل یعنی گنٹھیا۔ درد سر۔ ضعف دماغ۔ ضعف بصر وغیرہ اور دیگر امراض میں مثل تریاق کے حکمی تاثیر رکھتا ہے۔ بچوں کو دانت نکلنے کی حالت میں نفع پہنچاتا ہے۔ عورتوں کی خاص بیماریوں کے لئے ایام ماہواری میں کسی قسم کا خلل ہو تو فائدہ کثیر بخشتا ہے۔ بھوک بڑھاتا ہے اور غذا کو فوراً ہضم کرتا ہے۔ جس کے باعث انسان کے جسم میں خون معمول سے زیادہ پیدا ہوتا ہے۔ اور ہر قسم کی سستی اور غمگینی دور کرتا ہے۔ اور طاقت مردانگی بڑھاتا ہے۔ فاسد خون کو زائل کرکے رنگ بدن صاف شفاف رکھتا ہے قلب کو قوت اور فرحت بخشتا ہے۔ پژمردہ طبیعت کو خورسند کرتا ہے اور وہم و فکر کو زائل کرتا ہے اور معدہ کی تمام خرابیوں کو دور کرکے اس کی قوت کا محافظ رہتا ہے۔ ہیضہ اور طاعون کے دنوں میں اس کا استعمال اکسیر کا کام دیتا ہے۔ ہر گھر میں اس نمک کی ایک شیشی موجود رکھنی نہایت ضروری ہے۔ اس سے وقت پر جادو کا سا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

جو لوگ نمک سلیمانی کا باقاعدہ استعمال کرتے ہیں ان کی رائے ہے کہ دو تین ماہ میں دس پونڈ سے زیادہ وزن بڑھ جاتا ہے۔ جن لوگوں کو دودھ ہضم نہ ہوتا ہو وہ اس کو ضرور باقاعدہ روزمرہ استعمال کرتے رہیں

قیمت فی شیشی ۱۲ار تین شیشی عہ۲؎ چھ شیشی للعہ۸؎ علاوہ محصول ڈاک ؎

خضاب لاجواب

افسوس ہے کہ اکثر لوگوں نے خضاب کے اشتہار دیکر اپنی لفاظی اور جھوٹے وعدوں کے ذریعہ پبلک کو دق کر دیا۔ ہمارا یہ دعویٰ تو ہرگز نہیں ہو سکتا کہ خضاب لاجواب کے صرف ایک دفعہ لگانے سے ہی بال سیاہ ہو کر عمر بھر کے لئے چھٹکارا ہو جاتا ہے۔ بلکہ ہم اس کی واجبی تعریف ناظرین کی خدمت میں بلا پس و پیش درج کرتے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ اگر آپ کو کسی بلا نقص خضاب کی ضرورت ہے تو یہی خضاب ہے جو سفید بالوں کو تھوڑی دیر میں قدرتی سیاہ رنگ دیتا ہے۔ بال مثل ریشم کے نرم رہتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اس کے لگانے سے بیشتر جتنے بال سفید ہوں گے اتنے ہی رہیں گے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ اس خضاب سے اچھا دنیا بھر میں آجتک کوئی خضاب ایجاد نہیں ہوا اہل ملک نے اس خضاب کی خوبیوں کا اندازہ کر لیا ہے۔ آجتک کہیں سے بھی کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں ملا۔ خضاب کی تصدیق میں صرف معززین کے ہزاروں خطوط موجود ہیں اور اکثر نامی گرامی رؤسا و جاگیرداروں کی خدمت میں بکثرت جاتا ہے۔ اگر مہندی و وسمہ کی تکالیف سے بچنا اور پیری میں جوانی چاہتے ہو تو آزماؤ۔

قیمت فی سٹ دو روپے آٹھ آنے

ملنے کا پتہ:۔ مینیجر کارخانہ آب حیات۔ پنڈی بہاؤالدین۔ ضلع گجرات پنجاب

اعوان ہیئر آئل یعنی بالوں کے لگانے کا خوشبودار تیل

ہندوستان میں جس قدر خوشبودار تیل مروج ہیں وہ علی العموم سفید تیل سے مختلف ذرائع سے خوشبودار بنائے جاتے ہیں۔ جاہل تیل ساز عموماً ترکیب کیمیائی خواص الادیہ سے چونکہ لاعلم ہوتے ہیں۔ ان کو بالوں کی شناخت۔ دماغ کی تشریح۔ دواؤں کے افعال و خواص معلوم نہیں ہوتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بیچارے تُسنے گھنائے لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔ اور دار و مدار خوشبو تیل میں بسا کر فروخت کرنا ہے۔ پس اگر وہ یہ جانتے کہ تل کا تیل دماغ کو خشک۔ بالدار اعصاب کو خراب کرتا ہے تو آج یہ اندھیر نہ ہوتا۔ کہ جس کو دیکھو بال سفید۔ داڑھی مونچھ بے معنی اور رادنی ادنی باتوں سے زکام میں مبتلا۔ دانت خراب چہرہ پژمردہ اور اس پر چھائیاں وغیرہ موجود۔

کارخانہ آب حیات نے طبی اصول کے موافق بالوں کی اصلیت اور روئیدگی وطریق پرورش اور قیام وغیرہ کے حالات پر غور کر کے مندرجہ بالا قباحتوں، موجودہ تیلوں کے اجزائے مروجہ کے تمام نقصانات کو مدنظر رکھکر یہ تیل سولہ برس سے ایجاد کیا ہوا ہے۔ جو سر پر لگانے سے بالوں کو تقویت دیتا ہے اور اعصاب وعروق کو مضبوط کرتا ہے۔ درد سر و سر کا چکر بہوت سے بالوں کا گرنا اور بدخوابی دور ہو جاتی ہے۔ بالوں کی جڑیں تر رہتی ہیں اور بال لمبے و چمکدار رہتے ہیں۔ دماغ کو طاقت رہتی ہے۔ مسامات میں اس کے اثر سے وہ رطوبت بلہ تر تبدیل ہوتی ہے جس سے بال سفید ہو جایا کرتے ہیں۔ قیمت علاوہ محصول ڈاک فی شیشی ایک روپیہ . . . . . (عہ)

چشمۂ فیض

آنکھیں خواہ کیسی ہی کیوں نہ دکھتی ہوں چشمۂ فیض کی ذرا سی چٹکی ڈالنے سے فوراً آرام آجاتا ہے۔ ایک شیشی میں دو سو بیماروں کے لئے دوا ہوتی ہے۔ بچوں۔ جوانوں اور بوڑھوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ مفت تقسیم کرنے والوں کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ . . . . . (عہ)

محافظِ دندان

دانت مشین خدائی ہیں۔ ان چیزوں کا جن سے ہمارے جسم کی پرورش ہوتی ہے۔ غذا وغیرہ تمام دنیا کی نعمتیں جو معدہ میں داخل کریں ان کی درستی ابتداءً انہیں دانتوں سے ہوتی ہے۔ بس ہر وقت ان کو صاف رکھنے کی فکر رکھیں۔ اس مسنون سے ملنے دانت مضبوط۔ مسوڑوں کا گوشت درست۔ خون آنا بند۔ بدبو میل دور۔ دانت گرنے سے محفوظ اور کیڑا نہیں لگتا۔ دانت ہمیشہ موتیوں کی طرح چمکدار رہتے ہیں۔ قیمت چار تولہ ایک روپیہ . . (عہ)

ملنے کا پتہ:۔ مینیجر کارخانہ آب حیات۔ پنڈی بہاؤالدین۔ (پنجاب)

مطبوعات صوفی کمپنی لمیٹڈ

سیر الصحابہؓ صحابہ کرام جیسی مقدس ہستیوں کے عقائد۔ عبادات معاملات۔ حسن معاشرت۔ فضائل۔ اخلاق۔ تدبیر و سیاست۔ علوم و فنون اور زندگی کے مفصل حالات اس کتاب میں درج کئے گئے ہیں۔ تمام حالات نہایت تصدیق و تحقیق کے بعد لکھے گئے ہیں۔ مؤلفہ مولینا سعید انصاری رکن دار المصنفین اعظم گڑھ۔ قیمت پانچ روپے (صہ)

صحابیات یہ کتاب اکثر اسلامیہ زنانہ اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس میں ۸۵ صحابیات کے حالات درج ہیں۔ سر ڈاکٹر محمد شفیع صاحب، آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اور دیگر کئی معززین نے اس کتاب کو زنانہ تعلیم کے لئے بے نظیر کتاب مانا ہے۔ مؤلفہ نیاز فتحپوری۔ قیمت ؏

خاتون جنتؑ حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے حالات میں ایک جامع کتاب ہے۔ اس کتاب کی تعریف میں اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ پانچ سال کے عرصہ میں اس کے سات ایڈیشن سولہ ہزار کی تعداد میں بک چکے ہیں۔ قیمت ؏

سیرۃ صدیقہؓ ام المومنین حضرۃ عائشہ صدیقہ کے حالات زندگی۔ آپ کے تفقہ فی الدین۔ علمی تبحر تفسیر قرآن و روایت حدیث میں خاص قابلیت کا بیان۔ مسلمان بچیوں کے لئے قابل مطالعہ اور قابل تقلید ہے۔ قیمت ؏

سیرۃ الکبریٰؓ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی مفصل سوانحعمری معہ فوٹو مزار۔ قیمت ایک روپیہ دو آنے (؏)

سیرۃ الحسینؓ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے حالات زندگی۔ شہادت و واقعات کربلا کی مفصل و مبسوط تاریخ معہ آپ کے مزار کے فوٹو کے چار رنگوں میں چھپا ہوا نفیس سرورق قیمت دو روپیہ دو آنے (؏)

سیرۃ حضرۃ بلالؓ پروانہ شمع رسالت حضرت بلالؓ کے حالات "زمیندار" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر سید وجاہت حسین مرحوم کے زور قلم کا نتیجہ۔ قیمت ؏

تاریخ اسلام اردو زبان میں تاریخ اسلام کے متعلق جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں یہ کتاب بلحاظ واقعات۔ طرز تحریر۔ سیاق عبارت۔ لکھائی چھپائی سب میں بہتر ہے۔ سات رنگوں سے چھپا ہوا نقشہ عرب اور رنگین سرورق نے چار چاند لگا دئے ہیں۔ ہندوستان کے اکثر سرکاری ٹیکسٹ بک کمیٹیوں نے اس کو سرکاری مدارس کے لئے بطور لائبریری و انعامی کتاب کے منظور کیا ہے۔ مصنفہ مولینا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی۔ قیمت حصہ اول ساڑھے چھ روپے للعہ حصہ دوم تین روپے (سے)

تاریخ الحرمین الشریفین بقول امام الہند مولینا ابو الکلام آزاد مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی تاریخ پر اس سے بہتر کتاب آجتک کسی زمانہ میں بھی کسی مصنف نے نہیں لکھی۔ شیخ عبد القادر صاحب وزیر تعلیم صوبہ پنجاب کی رائے میں اس کتاب کا ہر ایک مسلمان کے گھر میں ہونا ضروری ہے۔ بیس کے قریب فوٹو اس کتاب میں ہیں۔ مولفہ مولینا عبد السلام صاحب ندوی۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے ۔ ۔ (عہ؍)

رشد الراشدین شیعہ مذہب کے لغو اور لایعنی سوالات اور رائعۃ الاصول کا خود ان کی کتاب سے جواب دیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔

شرح درود کبریت احمر یہ درود شریف حضرت غوث اعظم عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا لکھا ہوا ہے۔ جس کی علامہ عصر جناب مولوی عبد المالک صاحب سابق مشیر مال ریاست بہاولپور نے کی ہے قیمت ۱۲؍

ہدایت الہدایت یہ کتاب حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے عربی میں لکھی تھی اس میں اخلاق و آداب۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو نہایت خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ ہم نے اس کتاب کا اردو ترجمہ کرا لیا ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت ۱۲؍

امین و مامون علامہ جرجی زیدان ایڈیٹر رسالہ الہلال مصر

ملنے کا پتہ:۔ منیجر صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ پنڈی بہاؤالدین (پنجاب)

کا تاریخی ناول ہے جس میں خلفائے عباسیہ کے دربار کے حالات
اور اس زمانہ کی تاریخ بہت خوبی سے بیان کی گئی ہے۔ قیمت ۱۲؍

فقرائے اسلام } اُن پیشوایان دین کے سبق آموز حالات جنہوں نے فقر وفاقہ کے باوجود
اسلام کے اصول وارکان کو استوار و مستحکم کیا اپنے اوپر تکلیف
برداشت کر کے تبلیغ اسلام کی۔ مصنفہ مولینا عبدالسلام صاحب ندوی ۱۲؍

حضرت ابو ایوب انصاریؓ } ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کی میزبانی کا جس بزرگ کو سب سے پہلے فخر حاصل ہوا وہ آپ
کی ذات ستودہ صفات تھی۔ اس کتاب میں آپ کے حالات
اور مزار کا فوٹو درج ہے۔ قیمت ۶؍

حیات رابعہ } حضرت رابعہ بصری کے حالات زندگی
قیمت چار آنے ۔۔ (۴؍)

ذکر حبیب } عہد حاضرہ کے محبوب الٰہی حضرت پیر حیدر شاہ
صاحب رحمۃ اللہ علیہ جلال پوری کے
حالات، کرامات و ملفوظات۔ قیمت تین روپے (۳ روپے)

مشاہیر اسلام } مختلف صوفیائے کرام علمائے عظام
شہدائے ملت غازیان شمشیر بکف
اور مجاہدین و سلاطین کے حالات زندگی۔
قیمت حصہ اول (۱ روپے) حصہ دوم (۱ روپے)

برزخ } موت کے بعد اور قیامت سے پہلے انسان پر کیا
گزرتی ہے۔ اسکا جواب آپ کو کتاب برزخ
میں ملیگا جو ایک گریجویٹ نے لطیف پیرایہ میں لکھی ہے قیمت ۱۲؍

انور پاشا } سیف اللہ شہید غازی انور پاشا کے حالات
زندگی۔ از مولانا ظہور احمد صاحب وحشی۔ ۸؍

اسلامی سپاہیانہ زندگی } اس کتاب میں تاریخی
واقعات سے ثابت کیا گیا
ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نکبت و افلاس کا باعث یہ ہے کہ انہوں
نے سپاہیانہ زندگی کو چھوڑ کر شاہانہ اور امیرانہ زندگی اختیار کر لی
ہے۔ پھر اس مرض کا علاج تجویز کیا ہے۔ قیمت ۴؍

اکابر قوم } مسلمان عالموں۔ فقیروں۔ امیروں اور
لیڈروں میں جو خرابیاں ہیں انکو بیان کر کے
انکی اصلاح کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ قیمت ۶؍

تاریخ افغانستان } سید جمال الدین افغانی کی مشہور
عربی تاریخ متعلقہ افغانستان کا
اردو ترجمہ افغانی تاریخ پر بہترین کتاب ہے۔ قیمت ۱۲؍

مہدی سوڈانی } جنرل گارڈن اور لارڈ کچنر کی
معرکۃ الآرا لڑائیوں اور حضرت کے
روحانی تصرف اور بزرگوں کے کمالات میں نہایت دلچسپ
کتاب ہے قیمت ایک روپیہ ۔۔۔ (۱ روپیہ)

دختر سمرنا } خالدہ خانم وزیر تعلیم ترکی گورنمنٹ نے تسخیر
سمرنا کے حالات کو ناول کے پیرایہ میں لکھا ہے
چونکہ آپ خود بھی میدان جنگ میں موجود تھیں اس لئے چشم دید
واقعات لکھے ہیں۔ ساتھ ساتھ محبت و عشق کی چاشنی بھی ہے ۸؍

دختران شمشیر } تمام زمانوں اور قوموں کی بہادر جانباز
اور حوصلہ مند خواتین کے حالات جنہوں
نے میدان جنگ میں تلوار کے جوہر اور تخت حکومت پر انتہائی تدبر
جرأت اور شجاعت کا ثبوت دیا۔ اس نادر تالیف میں آپ یہ
دیکھ کر حیران ہوں گے کہ صنف نازک نے کیونکر اپنے زور بازو
سے حکومتوں کے تختے الٹے۔ کیونکر نئی حکومتیں قائم کیں اور
کس طرح زبردست لشکروں کا ماہرانہ کیساتھ مقابلہ کیا (۸؍)

حیات امام مالک } حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ
کے حالات زندگی قیمت ۳؍

حیات امام مسلم } حضرت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے
حالات زندگی۔ قیمت ۴؍

آئینہ خود شناسی } خدا شناسی، خدا رسی کا سچا راہبر
تصوف کے بے نظیر اور لاجواب
مسائل۔ قیمت چھ آنے ۔۔ (۶؍)

میلاد النبی } یعنی سرور کائنات فخر موجودات حضرت
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات
زندگی۔ قیمت بارہ آنے ۔۔ (۱۲؍)

حیات سعدی } حضرت شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی
کے حالات۔ ہر مرد۔ عورت۔ بچے۔
بوڑھے کے پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کے قابل ہیں۔ قیمت ۵؍

حضرت فضل الرحمن } گنج مراد آبادی کے حالات زندگی
قیمت دو آنے (۲؍)

حالات مولانا روم — حضرت مولانا روم کے مفصل حالات زندگی اور فرقہ مولویہ کے رقص کا نظارہ قیمت ۱۲ر

اسلامی کہانیاں — قیمت حصہ اول چار آنے (۴ر) " " دوم چار آنے (۴ر)

یاد رفتگاں — اس کتاب میں پنجاب کے جملہ اولیائے کرام وصوفیائے عظام کے حالات درج ہیں ۱۲ر

شمس تبریزؒ — مولینا روم کے مرشد خواجہ شمس الدین تبریزی کے حالات وخوارق عادات۔ قیمت ۶ر

سیرۃ النعمانؒ — یعنی امام نعمان بن ثابت کے حالات زندگی قیمت چار آنے " " (۴ر)

ذوالنون مصری — حضرت ذوالنون مصری کے بہترین حالات۔ قیمت چار آنے (۴ر)

میر درد دہلوی — ہندوستان کے مشہور صوفی اور اہل دل شاعر کے حالات۔ قیمت دو آنے (۲ر)

تیغ کمال — اگر آپ کو غازی اعظم مصطفٰے کمال کی سوانحعمری یونان کے خلاف مسلمانوں کی کوشش اور فتح منظر دیکھنے ہیں تو اس کتاب میں دیکھیے۔ قیمت ۱۲ر

یاسمین شام — تسخیر شام۔ ہلال وصلیب کے معرکہ لڑنے کے واقعات حضرت عمرؓ کے وقت کی داستان حسن وعشق کا دلچسپ فسانہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عـ۸ر)

عروس کربلا — کربلا کے تاریخی واقعات پہلے ہی سے کچھ کم دردانگیز نہیں۔ اسپر مولانا راشد کے قلم گوہر ریز نے قیامت ڈھادی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عـہ)

جوہر قدامت — مغربی تعلیم اور مشرقی تربیت کا مقابلہ۔ دو بہنوں کی پرتکلف داستان دل کے پیرایہ میں لکھی گئی ہے ۱۲ر

موؤدہ — ایک لڑکی کی نہایت دردانگیز کہانی۔ مسلمانوں کو اپنی اصلاح کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ازحد مفید ہے۔ قیمت ۸ر

فطرت نسوانی — لڑکیوں کی میں بہترین کتاب ہے جو فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی اور اسکا ترجمہ یورپ کی تمام زبانوں میں ہوا ہے مصر کے اخبار الہلال نے اسکا عربی ترجمہ شائع کیا اور ہم نے اردو کا لباس پہنایا۔ قیمت ۱۲ر

الرسالۃ والنبوۃ — مولفہ مولوی عبدالمالک صاحب جس میں خدا کی ہستی اور حضرت رسول محمد صلعم کی نبوت اور رسالت کو دلائل عقلیہ سے ثابت کیا گیا ہے قیمت ۲ر

شرح قصیدہ غوثیہ — مولفہ مولوی عبدالمالک صاحب سابق مشیر مال ریاست بہاولپور قصیدہ غوثیہ حضرت غوث الثقلین جس کے یمن وبرکت سے مشکلات دینی ودنیوی حل ہوتی ہیں۔ آجتک اس کے حل کا حوصلہ کسی بزرگ نے نہیں کیا بلکہ دریا بکوزہ بند ہے۔ قیمت ۱۲ر

درس محبت — محبت خدا ومحبت رسول صلعم کے بیان کے بعد ان امور پر بحث کی گئی ہے جن کی وجہ سے اہل سنت والجماعت کو دیگر فرق ومسلک پر تفوق وامتیاز حاصل ہے از سجادہ نشین جلال پور شریف قیمت ۲ر

رسالہ علم لدنی — حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ قیمت ۴ر

آداب المریدین — شیخ الاکبر حضرت محی الدین ابن عربی قدس سرہ کی تصنیف ہے۔ پیر و مرید کے تعلقات اور آداب پر بہترین کتاب ہے مترجمہ مولوی غلام ربانی صاحب بی۔ اے۔ قیمت ۳ر

میزان عمل — مولفہ حضرت امام غزالی کا اردو ترجمہ۔ خواہشات اور روح کی جنگ۔ تزکیہ نفس۔ جملہ فضائل کی تفصیل اور غرض دنیا جہان کی کل کامیابیوں کی یہ کتاب کلید ہے ۱۲ر

سات ستارے — اس کتاب میں سرزمین پنجاب کے سات درخشندہ سیاروں کے حالات نہایت تحقیق سے درج کیے گئے ہیں۔ قیمت ۱۳ر

دربار علم — مولفہ مولانا حضرت عبدالماجد صاحب جس میں ارکان اسلام۔ اسرار و فلسفہ نہایت تفصیل وشرح سے درج ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عـ۸ر)

فلسفہ خواب — خواب کا فلسفہ قدیم وجدید بیان کیا گیا ہے اس موضوع پر اردو کی یہ پہلی کتاب ہے ۱۰ر

تحقیق الروح — اس میں روح کے متعلق مفصل بحث کی گئی ہے ۱۲ر

انسان کامل — انسان کامل کی تعریف اور کامل و اکمل انسان کے صفات۔ مصنفہ عارف ربانی حضرت سید عبدالکریم رحمۃ اللہ علیہ۔ ترجمہ اردو۔ قیمت ۸ر

سوانح احمدی — حضرت سید احمد بریلوی اور ان کے رفیق کار سید اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے حالات جہاد اور سکھوں کے ساتھ معرکہ کی جنگ۔ آپکے خوارق عادات اور روحانی تصرفات کا ذکر قیمت دو روپے

المسئلۃ الشرقیہ مصطفےٰ کمال پاشا کی تصنیف یہ کتاب سیاسیات اسلامیہ کے اسرار کا محرم راز ہے۔ مترجمہ نیاز فتحپوری قیمت دو روپے۔

عرفان کی پہلی تجلی حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات۔ قیمت ۶ر

قسطاس المستقیم حضرت امام غزالی کی اس نام کی عربی کتاب کا ترجمہ۔ تصوف کی اعلیٰ پیمانہ کی کتاب ہے قیمت دس آنے

حیات داغ۔ حضرت داغ دہلوی کے باتصویر حالات قیمت ۱۶ر

نفحات یہ کتاب حکیم الامۃ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی نایاب تصنیف ہے۔ جس کا اردو ترجمہ کرایا گیا ہے۔ تصوف میں بڑے پایہ کی کتاب ہے قیمت ۱۰ر

فوٹو جلالپور شریف جلالپور شریف کے شہر کا عام نظارہ اور حضرت قبلہ عالم پیر حیدر شاہ صاحب کے روضہ شریف کا دلفریب خاکہ قیمت سادہ ۲ر رنگین ۳ر

ابن یمین شعرائے ایران میں سعدی اور ابن یمین نے اخلاقی شاعری میں خصوصیت کے ساتھ نام حاصل کیا ہے۔ فارسی شاعری میں تصوف اور اخلاق کا جو ذخیرہ موجود ہے وہ زیادہ تر انہیں دونوں بزرگوں کا جمع کیا ہوا ہے شیخ سعدی کا نام تو بچہ بچہ کی زبان پر ہے لیکن ابن یمین اس بارہ میں بہت بدقسمت تھے۔ ملک کو مولینا عبدالسلام ندوی کا مشکور احسان ہونا چاہیے جنہوں نے اردو لٹریچر میں ابن یمین کے حالات جمع کردیے ہیں۔ ان کے اخلاق۔ مذہب۔ خاندانی تعلقات۔ محاسن و جائداد اور شاعری سے بحث کی ہے۔ حجم ۲۲۰ صفحات۔ قیمت عہ

مجموعہ وظائف خاندان چشت اہل بہشت نظامی کا سلسلہ معہ دیگر وظائف جو روزمرہ معمول سے پڑھے جاتے ہیں قیمت مکمل مجموعہ مجلد ۱ر مجموعہ وظائف خورد ۳ر

تفسیر سورہ یوسف یہ دس سورہ کی مکمل تفسیر ہے۔ سورہ یوسف کو اللہ تعالیٰ نے احسن القصص لکھا ہے قیمت ۸ر

پھل ہر قسم کے پھل دار بوٹے اور درخت و باغات لگانے کے طریقے اور پھل محفوظ رکھنے کی ترکیبیں ایک آرائن گریجویٹ کی لکھی ہوئی۔ قیمت ۸ر

صابن سازی صابن بنانے کے آسان سہل اور کم قیمت نسخے۔ قیمت ۲ر

رشوت رشوت کے اقسام۔ رشوت کیونکر پکڑی جاتی ہے اور اس کی اصلاح۔ ایک ریٹائرڈ مجسٹریٹ کلکٹر کے مشاہدات۔ قیمت چھ آنے .. .. (۶ر)

سید جمال الدین افغانی موجودہ ترک احرار۔ بانی کے تحریک کے سب سے پہلے بانی کے حالات۔ قیمت تین آنے (۳ر)

حیات حالی۔ حضرت مولانا حالی کے باتصویر حالات ۶ر

کالا پانی وہابیوں کے مشہور مقدمہ میں جبکہ بہت سے علمائے کرام کو حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی تھی مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری نے مقدمہ کے حالات اور اپنے زمانہ قید کے حالات کو قلمبند کیا ہے قیمت ۸ر

ترکاریاں ترکاریوں کی کاشت اور اُسے تجارتی اغراض کے فائدہ اُٹھانے کے علم پر زمانہ حال کی تحقیق کے بعد لکھی گئی ہے۔ قیمت آٹھ آنے (۸ر)

ہر ایک مرغی سونے کا انڈا دے سکتی ہے

بشرطیکہ کسی شخص میں مرغیوں کے ذریعے سے سونے کے انڈے حاصل کرنے کا ملکہ پیدا ہو جائے۔ اگر آپ مرغیوں کے ذریعے سے دولت کمانا چاہتے ہیں تو

کلید مرغی خانہ

باتصویر کا مطالعہ کیجیے۔ صرف مرغی کی تجارت ایسی تجارت ہے جس کے ذریعہ سے بہت کم سرمایہ لگا کر ہزاروں روپیہ ماہانہ پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اس کتاب میں مرغیوں کی تجارت۔ انڈوں کی تجارت۔ مرغیوں کی پرورش۔ مرغیوں کا علاج اور ان کے ذریعے دولت کمانا بتایا گیا ہے۔ نہایت مفید کتاب ہے۔

ناپسند ہو تو واپس کر دیجیے

اس کے مصنف سرکاری مرغی خانہ کے سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب کس قدر جامع اور مفید ہوگی۔ جملہ قسم مرغیوں کی تصویریں بھی درج ہیں جو رنگین اور فوٹو بلاک سے تیار کرائی گئی ہیں اور مرغیوں کے ڈربوں کے فوٹو بھی دیے گئے ہیں۔ قیمت فی جلد مجلد تین روپے چار آنے .. .. (للعہ)

چھ کتابیں

بازاری عورتوں کے پھندوں سے بچنے کیلئے

پڑھیئے۔ نوجوانوں کی میز پر رکھئے تاکہ وہ بھی پڑھ لیں اور اپنی دولت اور عمر کو بے خبری کی حالت میں ضائع نہ کردیں ✦

(۱) سعید (۲) سعادت (۳) شاہد رعنا (۴) سزائے عیش (۵) انجام عیش (۶) سراب عیش۔ ان کتابوں کا حجم بہ حیثیت مجموعی پونے چھ سو صفحہ ہے۔ کتابت کاغذ بہترین۔ مجموعی قیمت ساڑھے چار روپیہ (للعہ) محصولڈاک معاف۔ ملنے کا پتہ:۔

منیجر نیرنگ خیال بک ڈپو۔ لاہور

عملیات

اگر آپ اس فن کی معتبر صحیح اور لاجواب تصنیف مطالعہ میں رکھنا چاہتے ہیں جس میں قدیم و جدید عملیات کو صحیح اور سمجھ میں آنیوالے طریقہ سے پیش کیا گیا ہے تو اس کتاب کو منگوا لیجئے۔ اسمیں اعمال۔ تعویذ۔ نقش۔ فالنامے وغیرہ ہر چیز موجود ہے۔ حجم تین سو صفحات۔ لکھائی چھپائی کاغذ بہترین قیمت سے ؎ علاوہ محصولڈاک ✦

پتہ:۔ منیجر نیرنگ خیال بک ڈپو بارودخانہ لاہور

فلاح دین و دنیا

یہ کتاب تیسری بار چھپی ہے اسے شریعت اسلامیہ کی سائیکلوپیڈیا کہنا چاہیئے۔ مذہب اسلام کے متعلق اسمیں ہر ایک ضروری مسئلہ موجود ہے حجم پونے چھ سو صفحہ۔ کاغذ وغیرہ بہترین۔ قیمت للعہ ✦

میاں بیوی کی دائمی محبت کے لئے

ذیل کی کتابوں کو پڑھیئے۔ میاں بیوی کی ازدواجی زندگی کو کامیاب اور خوشگوار بنانے کے لئے۔ اور گھر میں جنت کے مزے لوٹنے کیلئے اس سے بہتر لٹریچر آپ کو نہ مل سکیگا دولہا دلہن عہ ✦ میاں بیوی عہ ✦ مرد عورت عہ ✦ فن خوشو

ملنے کا پتہ

منیجر نیرنگ خیال بکڈپو۔ بارودخانہ لاہور

اسلامی زندگی

جس میں اہل سنت والجماعت کے عقاید کے ماتحت اسلامی معاشرت سے تعلق رکھنے والے تمام ضروری و نازک مسائل کو نہایت تحقیق و تصدیق کے بعد معتبر کتب سے جمع کیا گیا ہے۔ جن کی اس پُر آشوب زمانہ میں مسلمانوں کو سخت ضرورت ہے۔ حجم اڑھائی سو صفحات قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔ منیجر نیرنگ خیال بکڈپو۔ بارود خانہ۔ لاہور

تذکرہ اولیائے ہند

اس کتاب میں ہندوستان بھر کے اولیا اللہ کے سوانح نہایت تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔ اسمیں قریباً تین سو اولیا اللہ کا ذکر ہے۔ جن کے کشف و کرامات۔ درود و وظائف اور احکام و نصائح وغیرہ سب کچھ درج ہے کتاب مجلد ہے۔ قیمت للعہ ✦

منیجر نیرنگ خیال بک ڈپو۔ بارودخانہ لاہور

جلد ۹ | جملہ حقوق محفوظ | نمبر ۶۳

نیرنگِ خیال ہندوستان بھر کے علمی ادبی رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا اور سب سے زیادہ مقبول ہے

مضامین کے لحاظ سے نیرنگِ خیال ادبی رسائل میں یکتا اور لاثانی ہے

تعداد اشاعت ۵۰۰۰

فہرست مضامین

بابت ماہ ستمبر ۱۹۲۹ء

کریمی پریس لاہور میں باہتمام میر قدرت اللہ پرنٹر چھپا اور حکیم محمد یوسف حسن پبلشر نے دفتر نیرنگِ خیال دوخانہ لاہور سے شائع کیا

شذرات

نیرنگ خیال کا ہر پرچہ گوناگوں خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ زیر نظر پرچہ کو دیکھئے دلچسپ اور سبق آموز افسانے اور بلند پایہ علمی ادبی مضامین کا مرقع ہے۔ سہ رنگی تصویر سے یہ پرچہ محروم ہے۔ اس کا باعث صرف یہ ہے کہ سالنامہ کے لئے جو بلاک بن رہے ہیں انہیں کے ساتھ عام پرچوں کے بلاک بھی تھے اور بلاک سازوں نے سب کو سالنامہ کے لئے سمجھ کر کچھ دیر ہی کر دی۔ اس لئے پانچ نئی اور ایک پرانی تصویر اس نمبر میں پیش کی جا رہی ہے۔ رسائل کی تصاویر میں جو کساد بازاری نظر آ رہی ہے اُس کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ مجموعہ کم شاندار نہیں پانچ نئے بلاک بڑے بڑے دعوے کرنے والے رسایل کو بھی میسر نہیں۔ کیونکہ اُن کی شب و روز کی دوڑ دھوپ ہر ماہ چار پانچ منقول بلاک مہیا کر لیتی ہے لیکن نیرنگِ خیال کی تصاویر کی گیلری اتنی وسیع ہے کہ پانچ سال تک متواتر تصاویر شائع کرنے پر بھی اُس میں ذرہ برابر کمی واقع نہیں ہوئی +

ان تصاویر میں علامہ سر اقبال مدظلہ العالی کی تصویر خاص طور پر قابل دید ہے۔ علامہ موصوف کی علمی او سیاسی خدمات زریں حروف میں لکھی جائیں گی۔ یہ بلاک بالکل نئی وضع کا ہے۔ اور ہم نے ایک ہمعصر سے قیمتاً خرید لیا ہے +

سلومی کے دو مختلف مناظر ہم نیرنگ خیال میں پیش کر چکے ہیں۔ آج تیسرا منظر بھی پیش ناظرین ہے۔ اس مصور کے کمال دیکھئے اور داد دیجئے +

تیسری تصویر ایک مصری شہزادی کی ہے۔ اس میں مصوّر نے مصری معاشرت لباس اور فرنیچر سے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

چوتھی تصویر ایک قیمتی تاریخی تصویر ہے۔ نادر شاہ کی تصویر ہے۔ جس کی تلوار کی کاٹ کا لوہا آج تک دنیا تسلیم کرتی چلی آتی ہے۔ اور جس کے تصوّر سے آج بھی بڑے بڑے سورماؤں کا زہرہ آب آب ہوتا ہے +

پانچویں تصویر۔ یہ معصومیت کی ہے۔ اس تصویر کے ہر نقطہ سے معصومیت کا جذبہ ٹپکتا ہے +

مرقع چغتائی کا وی پی آپ کو مل چکا ہوگا! اگر آپ نے آرڈر رجسٹر کرایا تھا اور ابھی تک آپ کو مرقع چغتائی کا وی پی نہیں ملا تو آج ہی اطلاع دیجئے تاکہ وی پی بھجوا دیا جائے۔ مرقع چغتائی کا یہ ایڈیشن اسقدر ارزاں اور قیمتی ہے کہ جو شخص طلب کرتا ہے وہ اُسے دیکھ کر مایوس نہیں ہوتا +

ایک جلد ساز نے دیکھتے ہی کہا کہ اس قسم کی جلد بنانے کے میں آٹھ روپے کم کم نہ لوں اور اگر سو پچاس اکٹھی بندھوائی جائیں تو پانچ روپیہ فی جلد کے حساب سے +

ایک کاتب کا بیان ہے کہ اس سے پاکیزہ۔ سلجھا ہوا اور خوشخط دیکھنے میں نہیں آیا۔ پھر بلاکس نے اس خط کی تمام

خوبیوں کو قایم رکھنے میں بڑی بھاری امداد دی ہے"۔

ایک مصوّر کا بیان ہے کہ اُردو زبان میں ایسا مصوّر ایڈیشن کسی کتاب کا شایع نہیں ہوا۔ اگر تمام تصاویر کو ہی چوکھٹوں میں جڑ کر کسی مکان میں لگا دیا جائے تو اس قسم کی آرائش ہوسکتی ہے جو دو سو روپے کی تصویروں سے بھی ہونی محال تھی"۔

ایک پبلشر نے کتاب کو دیکھ کر آنکھوں سے لگایا اور اُس پر تین بوسے دیئے۔ اُس نے کہا کہ اُردو مطبوعات میں یہ کتاب لاثانی ہے۔ اس کتاب کی کامیابی نے ہندوستان بھر کے پبلشروں کے لئے راستہ کھول دیا ہے۔ اور اُن کے حوصلے بلند کر دیئے ہیں"۔

ایک صاحب علم کی رائے ہے کہ ہر پڑھے لکھے اور ہر غالب کے مداح۔ ہر شاعری کے شیدا۔ ہر آرٹ اور مصوّری کے دلدادہ کا فرض ہے کہ وہ ایک کتاب مرقع چغتائی دیوان غالب کی خرید کر اپنی لائبریری میں رکھے۔ اور دوست و احباب کو جب کوئی نایاب تحفہ دکھانا ہو تو اس سے بہتر اور کوئی چیز نہ ہوگی"۔

ہماری رائے ہے کہ آپ اس کتاب کو ضرور خریدیئے۔ اگر آپ نے ابھی تک آرڈر نہیں بھیجا تو دیر کس بات کی ہے۔ یہ سترہ روپے کی کتاب پچاس روپے میں بھی ارزاں ہے۔ فی الفور توجہ فرمایئے۔ آرڈر دفتر نیرنگ خیال لاہور میں جمع کئے جاتے ہیں اور کتاب جہانگیر بک کلب کی طرف سے وی پی روانہ ہوتی ہے۔

سالنامۂ نیرنگ خیال کی تمام سرگرمیوں کو امسال پردۂ اخفا میں رکھا گیا ہے۔ اس وقت تک جتنی کامیابی حصول مضامین اور تصاویر جمع کرنے میں ہو چکی ہے۔ اُسے دیکھ کر ہم جامہ میں پھولے نہیں سماتے۔ جی چاہتا ہے کہ یہ کریں اور وہ کریں۔ ایک ایک مضمون کو کئی کئی بار پڑھ چکے ہیں اور اُن کی خوبیوں اور دلچسپیوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں بلاکس دھڑا دھڑ بن رہے ہیں۔ ڈیزائن تیار ہو رہے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سال کا سالنامہ گذشتہ سالوں سے بہر صورت بہتر اور افضل ہوگا۔ بلکہ ہم خود اپنے گذشتہ سالناموں اور عید نمبروں کو شکست دینے میں کامیاب ہوں گے۔

ہمارے فرائض جو ہیں ہم اُن کی بجا آوری میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ آپ بھی اپنا فرض ادا کیجئے۔ کیا سال بھر میں بغیر محصولڈاک میں ایک ایسا با تصویر مرقع خریدنے میں کوئی نقصان یا اسراف ہے جس کی قیمت دس پندرہ روپیہ کی کتابوں کے برابر ہو۔ اتنا ارزاں اور اتنا اچھا سالنامہ خریدنے میں کسی قسم کا پس و پیش کرنا علم و ادب کی سرپرستی سے انحراف کرنے کے برابر ہے۔ اس وقت تک دفتر میں جو درخواستیں موصول ہو چکی ہیں۔ گو وہ بہت کچھ حوصلہ افزا ہیں۔ لیکن جہاں تک ہمارا خیال ہے ہر چار خریداروں میں سے ابھی تین خریدار ایسے ہیں جنھوں نے سالنامے کی خریداری کے لئے ابھی تک نام درج رجسٹر نہیں کرایا۔ اگر آپ نے ابھی تک نام درج رجسٹر نہیں کرایا تو انتظار کس بات کا ہے۔

اس طرف فوری توجہ کیجئے اور آج ہی اپنے لئے ایک کاپی محفوظ کرا لیجئے۔ اور چار آنہ کی رعایت حاصل کر لیجئے +

ایک بات جو سو فیصدی سچ ہے آپ نے دیکھا کہ ہم نے پانچ سال بعد ناظرین نیرنگ خیال کی خاطر اور اپنا سٹاک صاف کرنے کے لئے چند خاص نمبر رعایتی قیمت پر دیئے ہیں۔ جنہیں لوگ بڑی تیزی سے خرید رہے ہیں۔ کیونکہ ۸ ر یا ۱۰ ر میں عید نمبر مفت کے برابر ہے۔ اس کے ساتھ آپ نے یہ بھی ملاحظہ کر لیا ہوگا کہ اس رعایت میں **سالنامہ** کوئی پرچہ نہیں دیا جا رہا۔ بلکہ اُن کی قیمتوں میں ہر روز اضافہ ہو رہا ہے اس کا باعث یہ ہے کہ دفتر میں کوئی فالتو پرچہ موجود نہیں۔ گذشتہ سال صرف ۲۸ دن میں تمام کا پیاں ختم ہو گئی تھیں۔ اور آج تک ہزاروں آدمی مایوس اور ناراض ہیں۔ کہ اُنہیں پرچہ کیوں نہیں بھیجا گیا۔ پس ان حالات میں آپ ۱۹۳۰ء کے سالنامہ کے لئے نام درج کرا لیجئے۔ ورنہ آپ کو بھی اس قیمتی اور دلچسپ خاص نمبر سے محروم رہنا پڑیگا +

نومبر اور دسمبر کے رسائل نومبر اور دسمبر کے نیرنگ خیال اپنے اپنے وقت پر علیحدہ شایع ہونگے۔ اور نیرنگ خیال کی کسی اشاعت میں کسی قسم کا التوا نہیں ہوگا۔ سالنامہ عام ماہواری نمبروں کے علی الرغم بالکل جداگانہ حیثیت سے چھپ کر صرف اُن ناظرین کے ہاتھوں میں پہنچیگا جنہوں نے اس کی خریداری کے لئے اپنے نام درج رجسٹر کرائے ہونگے۔ اور وُہی اس رعایت کے مستحق ہونگے +

آج ہی ایک کارڈ لکھ کر اپنا نام درج کرا لیجئے

دفتر نیرنگ خیال میں رسائل اور کتب کے انبار جمع ہو گئے ہیں جن پر ریویو کرنے کے فرائض ہمارے ذمہ ہیں مگر اتفاق سے پانچ چھ ماہ سے نیرنگ خیال کے مضامین اتنی جگہ گھیر لیتے ہیں کہ کتابوں پر کچھ لکھنے کی جگہ ہی نہیں رہتی ہم کوشش کریں گے کہ آیندہ تین مہینوں کے اندر تمام کتابوں پر ریویو لکھ کر شایع کر دیں +

رسایل کے خاص نمبروں میں سے پیشوا کا رسول نمبر۔ نظام المشائخ کا پیغمبر نمبر۔ رسالہ دین و دنیا اور مجلہ عثمانیہ ہمارے سامنے رکھے ہیں۔ پیشوا کا سالانہ چندہ صرف ۶ ؏ اور اُس کے خاص نمبر کی قیمت ۸ ؍ ہے۔ ٹائیٹل رنگین ہے۔ دو سو صفحہ کے قریب مضامین اور کوئی درجن بھر تصویریں ہیں۔ تمام مضامین رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے متعلق جمع کئے گئے ہیں۔ مضمون نگاروں میں بڑے بڑے مشہور اہل قلم شامل ہیں۔ پیشوا کا رسول نمبر واقعی لاثانی ہے۔ اور ہندوستان بھر میں جسقدر خاص نمبر میلاد النبی کے دن شایع ہوئے ہیں ان میں یہ سب سے بہتر ہے۔ ۸ ؍ میں ایک نمبر طلب فرمایئے۔

پتہ۔ منیجر رسالہ پیشوا دہلی +

نظام المشائخ ہندوستانی رسایل میں عمر کے لحاظ سے شاید سب سے پرانا ہو مگر مضامین کی دلبستگی اور تازگی

کے لحاظ سے بالکل جواں سال معلوم ہوتا ہے۔ نظام المشائخ کا پیغمبر نمبر بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر کے مصداق بہت ہی مفید اور پاکیزہ نمبر ہے۔ اس کے مضمون نگار تمام کے تمام چوٹی کے اہل قلم ہیں۔ ٹائیٹل سادگی کا نمونہ ہے۔ مضامین سے عشق رسول کے جذبات ٹپکتے ہیں۔ بچوں۔ عورتوں اور نوجوانوں کے لئے یہ لاجواب تحفہ ہے قیمت صرف ۸ر پتہ منیجر نظام المشائخ دہلی +

رسالہ دین و دنیا۔ یہ ہندوستان کے مذہبی رسایل میں مخصوص رتبہ رکھتا ہے اور بلاشبہ اس کے مضامین دین اور دنیا دونوں کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس رسالہ نے اب نیا چولہ بدلا ہے اور مضامین کے ساتھ تصاویر کا انتظام بھی کیا ہے۔ ہم نے معاصر موصوف کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اس سنگلاخ زمین پر قدم نہ رکھے۔ مگر زمانہ کی ہوا کا مقابلہ جو آندھی کی طرح چل رہی ہے کرنا ہر پبلشر کے لئے لازمی ہو گیا ہے۔ اب گویا دین و دنیا ایک ہموار مصور رسالہ ہے جس کا چندہ صرف دو روپیہ سالانہ ہے۔ اس قلیل چندہ میں ایسا اچھا رسالہ مہیا کرنا کارکنان دین و دنیا کا ہی حصہ ہے۔ ہم ناظرین نیرنگ خیال سے پُرزور سفارش کرتے ہیں کہ کم از کم وہ اپنی عورتوں اور لڑکوں کے لئے یہ رسالہ ضرور خریدیں۔ پتہ منیجر رسالہ دین و دنیا دہلی +

مجلہ عثمانیہ۔ یہ جامعہ عثمانیہ کا سہ ماہی رسالہ ہے۔ اور گو تبصرہ کے لئے موصول نہیں ہوا لیکن طلبہ کی اس محنت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہمارے خیال میں جو یونیورسٹیوں اور کالجوں کی طرف سے جو رسالے شایع ہوتے ہیں۔ اُن میں مجلہ عثمانیہ کا نمبر اوّل ہے۔ ایک نمبر کی قیمت ۱۲ ہے۔ شائقین منگوا کر لطف اُٹھائیں۔ پتہ: منتظم مجلہ عثمانیہ کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن +

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور اُردو کی ریڈرشپ

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا رتبہ اور عزّت ہندوستان میں محض اس لئے قایم ہے کہ اُس میں ہندوستان کے بہترین اساتذہ کا اجتماع پایا جاتا ہے۔ جہاں کہیں بھی کوئی قابل شخص نظر آیا۔ مسلم یونیورسٹی کے ارباب حل وعقد نے جوں توں کر کے اُسے اپنے حلقہ میں لے لیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے نتائج شاندار ہوتے ہیں اور وہاں کے تعلیم یافتہ ملک بھر میں عزّت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں +

آجکل مسلم یونیورسٹی میں اُردو کی ریڈرشپ کی جگہ خالی ہے۔ اس کے لئے ملک کے ہر حصہ سے عرضیاں چلی آ رہی ہیں مگر چراغ تلے اندھیرا کے مصداق ارباب حل وعقد یہ نہیں دیکھتے کہ خود اُن کے حلقۂ اثر میں کیسے کیسے قابل آدمی موجود ہیں۔ جنہیں اگر اردو کی ریڈرشپ پیش کی جائے اور وہ اُسے قبول کرلیں تو یونیورسٹی کی اس میں نہ صرف عزّت ہے۔ بلکہ یونیورسٹی کا ایک قابل فرزند بھی دوبارہ یونیورسٹی کے حلقہ میں داخل ہو جاتا ہے +

ہماری مراد سیّد سجّاد حیدر صاحب یلدرم سے ہے۔ جو اُردو کے بہترین نظم اور نثر نگار ہیں۔ جو اس سے پہلے مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار کے عہدہ پر ممتاز رہ چکے ہیں۔ مگر اب سبکدوش ہو کر وطن تشریف لے گئے ہیں۔ ایسے قابل اور مشہور اہل قلم کو کھونا

یونیورسٹی کے لئے صدمہ سے کم نہیں۔ ہمارے خیال میں اس عہدہ کے لئے ارکانِ یونیورسٹی کا فرض ہے کہ وہ یلدرم صاحب سے بات چیت شروع کریں ۔

یلدرم صاحب کو اس عہدہ کو قبول کر لینے میں ایک رُکاوٹ ہے۔ اور وہ کمی تنخواہ کا معاملہ ہے۔ اس عہدہ کی تنخواہ تین سو سے چھ سو تک مقرر ہے۔ لیکن اگر یلدرم صاحب قبول فرمائیں تو یونیورسٹی اس عہدہ کی تنخواہ بڑھا دینے میں بھی کوئی قباحت نہ دیکھے گی۔ ہمیں اُمید ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے ارکان سید سجاد حیدر صاحب کو اُردو ریڈرشپ کے عہدہ کو قبول کر لینے کے لئے ہر ممکن طریقہ سے مائل کریں گے ۔

ایڈیٹر

دوشیزہ حصہ دوم

تربیت الانسان قانون نوعی کا حصہ اوّل دوشیزہ کتاب اسقدر مقبول ہوئی ہے کہ حصہ دوم کے لئے کئی درخواستیں دفتر میں موصول ہو چکی ہیں۔ فرداً فرداً جواب دینے میں چونکہ بہت وقت ضایع ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے بذریعہ رسالہ اعلان کیا جاتا ہے کہ دوشیزہ کا حصہ دوم صنف نازک کے نام سے سال چھ مہینہ میں شایع ہوگا۔ اس کا حجم ایک ہزار صفحات کے قریب ہوگا۔ ناظرین منتظر رہیں ۔

تازیانہ

ایک سال میں بارہ خاص نمبروں کا اعلان

تازیانہ جو وقت پر شایع ہونے والا باتصویر ہفتہ وار اخبار ہے اور جس کے سیاسی مضامین اور مقالات افتتاحیہ و نوٹس کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ ایک سال کی قلیل مدت میں بے حد مقبول ہوا ہے۔ اب تازیانہ کو مزید دلچسپ بنانے کے لئے تجویز کیا گیا ہے کہ ہر ماہ کا آخری پرچہ کوئی خاص نمبر ہو۔ چنانچہ پہلی ششماہی میں افسانہ نمبر۔ حفظانِ صحت نمبر۔ اسلامی دنیا نمبر۔ ڈرامہ نمبر۔ مطائبات نمبر اور کانگرس نمبر شایع ہونگے۔ ہر نمبر کا حجم بڑے اخباری سائز کے ۲۴ یا ۳۰ صفحات کے برابر ہوگا۔ ان نمبروں میں فوٹو بلاک کی تصویریں بھی ہونگی ۔

عام نمبر بھی ۱۴ صفحہ حجم کا ہوتا ہے۔ سال بھر میں قریباً ۱۰۰۰ صفحات ۱۰۰ فوٹو بلاک کی تصویریں شایع ہوتی ہیں ۔
چندہ سالانہ چار روپے۔ ششماہی دو روپے۔ نیرنگ خیال کے خریداروں سے سالانہ تین روپے ششماہی دو روپیہ لیا جائیگا۔

مینیجر رسالہ نیرنگِ خیال۔ بارودخانہ۔ لاہور

نمبر ۱۱   جون

نیرنگ خیال ہندوستان بھر کے علمی ادبی رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا اور سب سے زیادہ مقبول ہے

مضامین کے لحاظ سے نیرنگ خیال ادبی رسائل میں یکتا اور لاثانی ہے

(تعداد اشاعت پانچ ہزار)

قیمت فی پرچہ پانچ آنہ   ویلر کمپنی بکسٹال پر چھ آنہ

فہرست مضامین

تصاویر - سہ رنگی - (تین بلاک)   ایک

"   یک رنگی تصاویر   چھ بلاک

کریمی پریس لاہور میں باہتمام میر قدرت اللہ پرنٹر چھپا اور حکیم محمد یوسف حسن پبلشر نے دفتر نیرنگ خیال بیرون ... لاہور سے شائع کیا

شذرات

تصویریں۔ تصویر شایع کرنا اور تصویر پر کچھ لکھنا رسایل اور اخبارات کے لئے ضروری ہو گیا ہے۔ بعض دفعہ تو تصاویر کے ساتھ نظمیں بھی شایع کی جاتی ہیں جو ہمارے نزدیک قابل تحسین فعل نہیں +

نیرنگ خیال نے ہندوستانی رسایل میں بالتزام تصاویر شایع کرنے کا سنگ بنیاد رکھا۔ اور اگرچہ اس جدت یا بدعت کیلئے آسے ہزار ہا روپے کا خسارہ اٹھانا پڑا لیکن اردو رسایل میں زندگی اور جدت کی خوبیاں پیدا ہوگئیں۔ اور اب ہر اخبار اور رسالہ کی کامیابی کے لئے تصویر شایع کرنا لازمی ہو گیا ہے +

لیکن تصویر کا انتخاب ہر رسالہ کا مدیر اپنی سمجھ اور اپنے مذاق کے مطابق کرتا ہے۔ اسی لئے رسایل میں یا تو تصویریں مدیر کے مذاق کا ثبوت بہم پہنچاتی ہیں۔ یا رسالہ کو مصور بنانے کیلئے جو تصویر یا بلاک کہیں سے مل جائے آسے رسالہ میں شایع کر کے "ایک ضرورت" کی خانہ پری کر لی جاتی ہے +

بفضل خدا نیرنگ خیال کا مسلک اس سے جدا رہا ہے اور ہم تصاویر ہمیشہ آرٹ کے نقطۂ نگاہ سے انتخاب کرتے ہیں۔ اور ہمیشہ بازاری مذاق کی تصویروں اور خوبصورت حسین عورتوں کے پوسٹ کارڈوں کی اشاعت سے پرہیز کرتے ہیں۔ البتہ آرٹ میں حسن کی جتنی بھی تخلیق مصور نے کی ہو آس کی داد دیتے ہیں اور آسکی اشاعت پر فخر کرتے ہیں

آیندہ سے ہم نے نیرنگ خیال کی تصویری گیلری کو زیادہ نمایاں اور مفید بنانے کیلئے اہم تبدیلیاں کی ہیں۔ ہم ہر ماہ کوشش کرینگے کہ ایک سہ رنگہ تصویر شایع کی جایا کرے۔ اور وہ تصویر بھی اس پایہ کی ہو کہ آپ ہر تصویر کو اپنے دل کے چوکھٹے میں جگہ دے سکیں۔ فن کے کمال کی پوری پوری مظہر ہو۔ اور آس کے ساتھ معمولی تصاویر کی اشاعت بند کر دی جائے۔ لیکن ایک مصور مضمون ہر ماہ شایع ہو۔ ہر ماہ مختلف عنوان پر طبع آزمائی کی جائے اور وہ مضمون تصاویر سے مزین ہو۔ اس طرح سے تصاویر کی تعداد میں بھی اضافہ قایم رہیگا۔ اور خریداران نیرنگ خیال کو سال بھر میں کم از کم ۱۲ رنگین اور سو (۱۰۰) کے قریب یکرنگ تصاویر مل جائینگی۔ اگرچہ موجودہ چندہ مع محصولڈاک بہت ہے۔ میں اس صورت کو قایم رکھنا بہت محال ہے لیکن ہم امکان بھر کوشش کرینگے کہ یہ صورت قایم رہے۔ شروع میں ایک سہ رنگ تصویر ہے جسمیں مشہور مصور سر جوزف نیل پیٹن نے دکھایا ہے کہ زمانہ قدیم میں فدایان محبت شام کے ستارہ کو بہت محبوب سمجھتے تھے۔ یہ ایک ایسا منظر ہے جسمیں رخصت کی اجازت طلب کی جا رہی ہے۔ آسمان پر چاند اور ستارہ چمک رہا ہے۔ اسی مصور نے چودہ سال کی عمر میں تصاویر کا ایک کامیاب سلسلہ مکمل کر لیا تھا۔ سر جوزف پیٹن سنہ ۱۸۲۱ء سے سنہ ۱۹۰۱ء تک زندہ رہا +

مضامین

نیرنگ خیال تصاویر کے لئے اتنا مقبول نہیں جتنا مضامین کی وجہ سے پسند کیا جاتا ہے اسکا ثبوت یہ ہے کہ درجنوں رسایل نے اپنے رسایل کو تصاویر سے مزین کیا اور تصاویر کی تعداد کے لحاظ سے وہ شاید نیرنگ خیال سے پیچھے نہ رہے ہونگے۔ لیکن انہیں نیرنگ خیال جیسی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی نہ اُن کی اشاعت ہی نیرنگ خیال کے برابر پہنچ سکی۔ ہم نے ہندوستان بھر کے خاص ادیبوں سے مضامین لکھوانے اور حاصل کرنے کا انتظام کر رکھا ہے۔ اللہ پاک کے فضل و کرم سے نیرنگ خیال کا ہر نمبر بہترین مضامین سے مزین ہوتا ہے +

تازہ زیر نظر نمبر میں دیکھئے "لندن میں طوطی نامے" جناب نصیر الدین ہاشمی نے لندن سے بھیجا ہے۔ آپ کا ایک اور مضمون بھی موصول ہوگیا ہے۔ ایسے محققانہ مضامین ہمیشہ نیرنگ خیال کی زینت رہے ہیں۔ نپولین پر بہت سے "ادبا و علما" اظہار خیال کر چکے ہیں۔ لیکن جناب مولانا محمود الحسن صاحب نے جس رنگ میں نپولین کے واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ بیحد دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ "عورتوں کا درجہ قدمائے مصر کے نزدیک" یہ مضمون ہمیں ایک ایسے اہل قلم نے بھیجا ہے جنہوں نے اس سے پیشتر نیرنگ خیال میں کبھی نہیں لکھا۔ مگر افسوس ہے کہ انہوں نے مضمون کے شروع یا آخر میں کہیں بھی اپنا نام نہیں لکھا۔ اور اُن کا خط کاغذات میں کہیں تلف ہوگیا ہے۔ اُمید ہے کہ ہمارے جدید قلمی معاون اپنا نام اپنے دوسرے مضمون کے ساتھ ضرور ارسال فرمائینگے +

افسانوں میں "نوجوان شہریار" جناب صادق ایوبی صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ جن کے افسانوں کا مجموعہ زیر طباعت ہے۔ ایوبی صاحب کے افسانے ہمیشہ بلند پایہ مصنفین کے شاہکاروں سے ماخذ ہوتے ہیں۔ زبان سلیس ہوتی ہے۔ اس لئے بہت پسند کئے جاتے ہیں۔ لیکن دوسرا افسانہ "کشش محبت" اپنی قسم کی پہلی چیز ہے ایسا دلچسپ انداز تحریر بہت کم اہل قلم کے حصہ میں آیا ہوگا۔ جناب غلام سرور صاحب ایم اے نیرنگ خیال کے قلمی معاونوں کے حلقہ میں "کشش محبت" سے شامل ہوتے ہیں ہمیں امید ہے کہ یہ کشش ہمیشہ قایم رہیگی +

نیرنگ خیال کے آیندہ نمبر میں ایک ایسا لاجواب افسانہ شایع ہوگا جس کی نظیر پچاس سال گذشتہ کے اُردو رسایل میں ڈھونڈھے سے بھی نہ ملیگی۔ یہ طویل افسانہ اگست نمبر میں تمام و کمال شایع کردیا جائیگا۔ ناظرین منتظر رہیں اس کا عنوان پہلا پیار ہے +

"بھول بھلیاں" ایک حیدرآبادی ادیب حضرت "ناکارہ" کے قلم سے ہے مضمون بہت کام کا تھا اس لئے اسے فخر سے شایع کر رہے ہیں۔ خواہ لکھنے والے نے "ناکارہ" کی نقاب اوڑھنے میں ہی کوئی مصلحت دیکھی ہوگی +

"دامان باغباں" کا عنوان مستقل سمجھئے۔ جناب شہنشاہ حسین صاحب رضوی ایم اے ایڈوکیٹ۔ سابق مدیر خیابان اُردو کے متعلق جس قدر نئی تحریکیں دیکھیں گے اُن پر آزادانہ اظہار رائے فرمائینگے۔ یہ کام بہت اہم اور کٹھن ہے۔ لیکن امید ہے کہ رضوی صاحب اسمیں کامیاب ہونگے اور ناظرین نیرنگ خیال اس مفید سلسلہ سے محظوظ ہونگے +

ایڈیٹر

سنجوگتا

(ایک تاریخی واقعہ)

سنجوگتا[1] حسین تھی، خوش رو تھی، نیک تھی
راوی کا یہ بیان ہے "ہزاروں میں ایک تھی"
کم ایسے حسن والے ہوئے ہیں جہان میں
شہرہ تھا اُس کے حسن کا ہندوستان میں
آیا شباب حسن پہ شادی کا سن ہوا
آخر مقرر ایک سوئمبر کا دن ہوا
گل خوشنما ہر ایک چمن سے لیے گئے
راجہ تمام ہند کے مدعو کیے گئے
ہاں ایک پرتھی راج کو دعوت نہ دی گئی
جے چند اور اُس میں بہت تھی چلی ہوئی
سنجوگتا کو اُس کا بہت ہی ملال تھا
لیکن پتا کے حکم کا ٹلنا محال تھا
جے چند کو نہ صبر اسی بات پر ہوا
پرتھی کا بُت بھی در پہ بنا کے کھڑا کیا
مطلب یہ تھا نظر میں کریں سب کی کم اُسے
درباں کی طرح گویا سمجھتے ہیں ہم اُسے

آخر کو راجہ آئے سوئمبر کے دن تمام
قنوج میں تھا ہند کے شاہوں کا اژدہام
سنجوگتا کا جامِ محبت پئے ہوئے
تھے دل میں کیسی کیسی اُمیدیں لئے ہوئے
آئے تھے ایسے ایسے حسیں خوبرو جواں
دیکھے کوئی تو اُس کو فرشتوں کا ہو گماں
مشہور راجپوت ہیں ہندوستان میں
ثانی کہاں ہے اُن کا شجاعت کی شان میں

جے مال ہاتھ میں لئے سنجوگتا چلی
اٹھلاتی گویا باغ میں بادِ صبا چلی
سارے جوان کانپ رہے تھے کھڑے کھڑے
دھڑکا یہ تھا کہ دیکھئے کس پر نظر پڑے
آگے بڑھی وہ ایک نظر سب کو دیکھ کر
دیکھا پھر ایک بار ٹھہر کر اِدھر اُدھر
سنجوگتا کے دل میں بسی تھی کسی کی مجو
آنکھیں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں چہار سو
آخر وہ مورتی کی طرف سوئے در بڑھی
اور مالا پرتھی راج کی گردن میں ڈالدی

افسر

[1] سنجوگتا جے چند والئی قنوج کی لڑکی کا نام تھا۔ پرتھی راج شاہ دہلی سے جے چند کے تعلقات کشیدہ تھے۔ اسی لئے سنجوگتا کے سوئمبر میں اُسے دعوت نہ دی گئی۔ اور اُسکا ایک بُت بنا کر دروازہ پر لگا دیا گیا۔ لیکن سنجوگتا پرتھی راج ہی سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اسلئے اُسنے پرتھی راج کی مورت کے گلے ہی میں جے مال ڈالدی۔ چنانچہ اُسی سے شادی ہوئی۔

اسلامی ارتقا

انیسویں صدی کے علمی انکشافات میں ایک مسئلہ ارتقا (ایولیوشن تھیوری) بھی ہے۔ اس کے محقق ایک یورپین فلاسفر چارلس ڈارون بتائے جاتے ہیں۔ تھیوری کا دعویٰ یہ ہے کہ انسان پہلے بندر تھا۔ مگر اصول ارتقا کے مطابق بندر سے ترقی کر کے انسان بن گیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ (۱) کیا واقعی مسئلہ ارتقا انیسویں صدی کا علمی کارنامہ اور چارلس ڈارون کی دماغ سوزی کا ایک کرشمہ ہے؟ اور (۲) کیا سچ مچ اصول ارتقا کے مطابق انسان ایک ترقی یافتہ بندر ہے؟

۱۔ پہلے سوال کا جواب

ولادت عیسوی سے کئی صدیاں پیشتر جب ہندوستان وید اپنشدوں کے گورکھ دھندے اور پورانک بھول بھلیوں کی بدولت آواگون اور پونر جنم جیسے بھیانک بھنور میں پڑ گئے تو بدھ بھگوان کے "اہنسا پرمو دھرمہ" سے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا۔ مگر سوامی شنکر اچارج کی دور اندیشیوں کے باعث پھر اسی بھنور میں چکر کھانے لگے۔ یہ پونی۔ این۔ کارپنٹر بی۔ ڈی نے غلط نہیں لکھا ہے۔

طرف مائل ہو تو کس طرح۔ یا ایجاد و اختراع کی طرف کاوش کرے تو کیونکر۔ اب وہ جوگی ہے۔ نہ سنڈت۔ یا وشن بنجیز۔ اسی طرح جب کتب الٰہیہ کی بتائی ہوئی توحید مقدس تثلیث شریف سے بدل گئی اور جہالت کی تاریکیوں میں مذہب و تمدن کا خاتمہ ہو گیا تو 'اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَھُوْقًا' رات کے بعد دن آتا ہی ہے غار حرا میں ایک امی کے آگے کتاب فطرت کھل گئی اور ایسا فلسفہ پڑھایا گیا جس کے ایک اشارے نے دکتب خانۂ چند ملت بشست' جس کی ایک ادا پر فلسفہ یونان غرقاب ہو گیا۔ اور وہ انسان جو قردۃ کو نو قردۃ خاسئین کے قریب جملہ علوم و فنون سے بہرہ ور ہو کر جدھر گیا صرف اشرف المخلوقات ہی نہ تھا بلکہ واجب التعظیم و تکریم بھی تھا۔

۱۔ جاحظ (المتوفی ۲۵۵ھ) نے کتاب الحیوان لکھی جس میں انتقال مکانی اور اثرات ماحول سے جو تغیرات انواع حیات و نباتات میں پیدا ہوئے۔ اس کی طرف توجہ کی۔

(۲) علامہ ابن مسکویہ (المتوفی ۴۲۱ھ) نے اپنی کتاب الفوز الاصغر میں ارتقاء انسانی کے مسئلہ کی پوری توضیح کی۔

(۳) نظامی سمرقندی نے بھی چہار مقالہ کی تمہید میں مخلوقات ارضی کی تخلیق کو اسی ارتقائی اصول سے بالترتیب بیان کیا۔

یعنی ہندوستان سے ویدک دیوتاؤں کا گیان بالکل مفقود ہو گیا ہے۔ پھر کوئی ویدک محقق علمی تحقیقات کی

(۴) چوتھی صدی ہجری کے وسط میں جمعیۃ اخوان الصفا جو فلسفہ یونانیہ و شریعت عربیہ کو آمیزش کرنے کی فکر میں مشغول تھی۔ اس نے بھی اخوان الصفا میں یہی دعویٰ کیا کہ جمادات، نباتات، حیوانات اور انسان کے عالم ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔

(۵) مولانا جلال الدین رومی (المتوفی ۶۷۲ھ) نے اپنی مشہور مثنوی کے چوتھے دفتر میں "بیان اطوار خلقت آدمی در فطرت" کے عنوان سے اسی مسئلہ ارتقا پر متصوفانہ روشنی ڈالی جس پر علامہ بحر العلوم کی محققانہ شرح نے کچھ اور ہی دل بستگی بڑھا دی ہے۔

(۶) شیخ سعدی کی بوستاں میں بھی اسی ارتقائی بہار کے چند شعر ملتے ہیں۔

(۷) مولانا محمود التبریزی نے ۷۱۰ھ میں مثنوی گلشن راز لکھی ہے۔ اس میں بھی مسئلہ ارتقا کی بحث موجود ہے۔

(۸) صاحب مراۃ المحققین نے (جو غالباً آخری آٹھویں صدی ہجری کے بزرگ معلوم ہوتے ہیں) اس مسئلہ کو بالکل ہی آئینہ بنا دیا ہے۔

'مولانا روم اور ان کا کام یہ' ایک ہندی کتاب ہے۔ اس میں مولانا روم کی شاعری پر محققانہ تبصرہ لکھا گیا ہے۔ اور واقعی اس قسم کی تصنیفات سے ہندی لٹریچر میں جو مفید اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ غریب اردو کو نصیب نہیں۔ خیر اسی کتاب میں مولانا کے اس شعر 'آمدہ اول باقلیم جماد' پر یہ نوٹ ہے: "ماہر علم النفس ڈارون کے بھی ایسے ہی دعوے تھے۔ یورپ میں بھی اسی سے ملتے جلتے خیالات پائے جاتے ہیں۔ مولانا جیسے چند صوفی مشرب مصنفین و محققین نے بھی انہی خیالات کو قرآن وغیرہ کے مطابق ثابت کیا ہے تعجب ہے کہ ڈارون سے پانچ سو برس پہلے مولانا نے انہی خیالات کو مثنوی شریف میں لکھ دیئے۔" آمدم برسر مطلب اب مزید استدلال کے زعم پر میں بھی کہتا ہوں کہ مسئلہ ارتقا انیسویں صدی کے انکشافات میں شمار نہیں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس مسئلہ کے موجد اگلے ملت اسلامیہ کے ایشیائی محققین ہیں۔ ہاں ڈاروں کا اتنا احسان ضرور ہوا ہے کہ جس طرح کلمبس محقق امریکہ تھا۔ مگر اہل یورپ نے امریکہ کی بدویت اپنی خسرویت سے بدل دی۔ اسی طرح حکمائے اسلام نے جس ارتقا کی داغ بیل ڈالی تھی وہ ڈاروں اور ان کے متبعین کے ہاتھوں مغربی رنگ میں رنگ گیا۔

۲ - دوسرے سوال کا جواب

چارلس ڈاروں کی کتاب 'اصل انواع' بائیس برس کی محنت اور مدتوں کے تجربات پر لکھی گئی ہے ڈاروں کے ان کے شاگرد و متبعین ہیکل۔ ہکسلے وغیرہ نے اور بھی رنگ آمیزی کی۔ مگر اب دیکھنا یہ ہے کہ مسئلہ ارتقا کو صرف دماغی اختراعات سے واسطہ رہا یا اس پر کبھی قلبی روشنی بھی ڈالی گئی۔

مثنوی گلشن راز ۷۱۰ھ میں لکھی گئی ہے۔ اس میں ایک شعر بھی ہے ؎

میان جسم و جاں بنگر چہ فرق است
کہ ایں را غرب گیری واں چو شرق است

یعنی سوال یہ ہے کہ جسم و جان میں کیا فرق ہے؟ اس کا کس قدر پر لطف جواب دیا گیا ہے کہ سنو! جسم کو مغرب

کہتے ہیں۔ کیونکہ اس میں صفات کمال پوشیدہ ہیں اور جاں کو مشرق اس لئے مانتے ہیں کہ اس سے انوار صفات طلوع ہوتے ہیں۔ بعینہٖ اسیطرح دنیائے مغرب صرف تصور شے کی تحقیقات بر مرمٹی اور دنیائے مشرق ہمیشہ تصور شے کے ساتھ ساتھ تصور ذات کی طرف بھی متوجہ رہی ٭

۱۔ ہربرٹ اسپنسر اپنی مشہور کتاب ' اصول اولیہ ' میں لکھتے ہیں کہ علم حقیقی نہ حاصل ہوا اور نہ ہوسکتا ہے''

۲۔ ہیکل۔ اخلاقی و معاشرتی زندگی کے لحاظ سے ہم نے گزشتہ صدی کے مقابلہ میں کچھ نہ کیا''

۳۔ ویلس۔ افسوس ہم اخلاقی و معاشرتی حیثیت سے نااہل ثابت ہوئے''

۴۔ ہکسلے۔ روح کا معمہ حل نہیں ہوتا ہے''

۵۔ رڈالف ورشو۔ مادیات سے توبہ کرتا ہوں''

۶۔ اڈورکلاڈ۔ ہم جسقدر علمی ترقی کر رہے ہیں اسیقدر اسرار کائنات پیچیدہ ہوتے جاتے ہیں ٭

الغرض حل کے مطابق جناب ڈارون نے بھی روح کو بادہوائی سمجھ کے صرف مادی یعنی دماغی مشاہدات سے مسئلہ ارتقا کو ثابت کرتے رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بندر کو انسان کی اصل قرار دے دیا۔ حالانکہ کجا بندر کجا انسان۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ پروفیسر ہنری فیئر فورڈ اوس برن جو امریکن میوزیم آف نیچرل ہسٹری کے مالک ہیں ان کا بیان ہے کہ انسان کے مورث اعلیٰ بندر تھے۔ ایک دفعہ کسی امریکن فلاسفیکل سوسائٹی کے سامنے اظہار خیال کرتے ہوئے یہ فرمائے کہ انسان کے مورث اعلیٰ کا ظہور ایسے جانور سے ہوا ہے جس کا پتہ اب تک نہ لگا ہے۔ پروفیسر اوس برن اپنے دعوے کے ثبوت میں کہتے ہیں کہ ''انسان کو زمین پر پیدا ہوئے ڈیڑھ کروڑ برس سے بھی زیادہ ہوئے۔ انسان اور بندر ایک ہی وقت ظہور پذیر ہوئے۔ اس لئے بندر انسان کے مورث اعلیٰ کبھی نہیں ہوسکتے ہیں۔ انسان کے مورث اعلیٰ وسط ایشیا میں رہتے تھے۔ اس لئے ہمیں جو کچھ تلاش کرنی ہے وہیں کرنی چاہئے۔ اور جو شخص اس کی جستجو میں کامیاب ہوگا وہ یقینی دنیا میں ایک ذی وقار محقق مانا جائیگا'' ٭

آپ کے شاگرد ولیم گرگری بھی کچھ ایسا ہی فرماتے ہیں ٭

دیکھا! یہ ہے مادی گھروندے کا عروج و زوال کل جسے ڈارون نے بنایا تھا وہ آج پامال ہو رہا ہے اب ذرا اسلامی ارتقا پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ واقعی ڈاروینزم کو مسئلہ ارتقا کے سمجھنے میں کیسی فاش غلطی ہوئی ہے ٭

مولانا روم فرماتے ہیں

آمده اوّل به اقلیم جماد	وز جمادی در نباتی اوفتاد
سالها اندر نباتی عمر کرد	وز جمادی یاد ناورد از نبرد
وز نباتی چوں بحیواں اوفتاد	نامدش حال نباتی ہیچ یاد
جز ہماں میلے کہ دارد سوئے آں	خاص در وقت بہار و ضیمراں
باز از حیواں سوے انسانیش	می کشد آں خالقے کہ دانیش
ہم چنیں اقلیم تا اقلیم رفت	تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت
عقلہائے اولینش یاد نیست	ہم ازیں عقلش تحول کردنی ست
عقل پر حرص و طلب	صد ہزاراں عقل بیند بوالعجب

مولانا محمود تبریزی اپنی مثنوی گلشن راز میں لکھتے ہیں:۔

عناصر باد و آب و آتش و خاک
گرفتہ جائے خود در زیر افلاک
ملازم ہر یکے در مرکز خویش
کہ ننہد پائے یک ذرہ پس و پیش
چہار اضداد در طبع و مراکز
بہم جمع آمدہ کس دیدہ ہرگز
مخالف ہر یکے در ذات و صورت
شدہ یک چیز از حکم ضرورت
موالید سہ گانہ گشت از ایشاں
جماد آنگہ نبات آنگاہ حیواں
ہیولیٰ را نہادہ در میانہ
ز صورت گشت صافی صوفیانہ

اوپر کی دونوں نظموں میں پہلی نظم مولانا روم کی علامہ ابن مسکویہ اور دوسری نظم مولانا محمود تبریزی کی مراۃ المحققین سے ملتی جلتی ہوئی ہے ان مصنفین کے طرز تحریر میں کچھ فرق ہو تو ہو ورنہ حق تو یہ ہے کہ اسلوب بیان میں سب ہی بہتر ان میں جو سریلی آواز مولانا روم کی نے سے آرہی ہے وہی ابن مسکویہ کی نے ہے اور جو نغمہ مولانا محمود تبریزی کے گلشن راز میں ڈھلی اسی سے مراۃ المحققین کے مصنف کا خرقہ بھی تر اور ہو رہا ہے۔ خیر متذکرہ بالا استدلال سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ واقعی کائنات کا سلسلہ جو ڈارون نے قایم کیا تھا۔ اس کی بنا صرف نظریہ ہے۔ اور حکمائے اسلام کی بنیاد نظریہ بھی ہے اور عقلیہ بھی اور سریہ بھی۔ اس لئے اب پروفیسر سر ہنری فیئر فورڈ کی علمی تحقیقات اور علمائے اسلام کے روحانی مشاہدات کے مطابق مراد ہونے سے ہے کہ انسان ترقی یافتہ بندر نہیں ہے۔ بلکہ اس کی کچھ اور ہی شان ہے ؎

حوریں بھی سخن اچھی پریاں بھی سخن اچھی
انسان تو انساں ہے، انسان کا کیا کہنا

فتبارک اللہ احسن الخالقین ٭

کیا کروں کرمی جناب حکیم محمد یوسف حسن صاحب نے مختصر مضمون لکھنے کی تاکید فرمائی تھی۔ اس لئے میں نے بھی جہاں تہاں اشارہ ہی سے کام لیا ہے ہاں ممکن ہے میرے کوئی دوست اسلامی ارتقا کی پوری توضیح دیکھنا چاہتے ہوں۔ تو وہ میری کتاب "اسلامی ارتقا" کی طباعت کا انتظار کریں ٭

ابو الجمال محمد احسن سخن بہاری

"پدماوت" کے قصّے

(جناب نصیر الدین ہاشمی نے انڈیا آفس لندن سے نیرنگِ خیال کیلئے لکھا)

چتوڑ کے مہاراجہ رتن سین اور رانی پدماوت کی داستان نے جو مقبولیت حاصل کی تھی وہ واقعی تعجب انگیز ہے گو تاریخی حیثیت سے علاؤ الدین کا چتوڑ پر حملہ کرنا اور پدماوت کا ستی ہو جانا صحیح ہے۔ مگر واقعات جو داستانوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ وہ حقیقت سے دور اور صرف داستان ہی داستان ہیں۔

یہاں میں ان داستانوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ان کے متعلق فارسی اور اردو میں لکھی گئی ہیں۔

سب سے پہلے ۹۴۷ھ میں شیر شاہ سوری کے حکم سے ملک محمد جائسی نے اس کو "بھاکا" میں قلمبند کیا تھا جس کا نام غالباً "پدماوت" تھا۔ یہ کتاب میری نظر سے نہیں گزری اس لئے مزید صراحت سے قاصر ہوں۔

"بھاکا" کے بعد فارسی نظم و نثر میں مختلف اصحاب نے اس کو مرتب کیا جن میں سے دو تین منظوم اور دو نثر کی کتابوں کا پتہ چلا ہے۔

(الف) فارسی میں اوّل ۱۰۲۷ھ میں ملا محمد عبد الشکور بزمی نے جہانگیر کے عہد میں اس کو "پدماوت" کے نام سے منظوم کیا۔ یہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہے[۲]۔

اس میں حسب رواج حمد و نعت و منقبت کے بعد جہانگیر کی مدح کی گئی ہے۔ اور وجہ تالیف کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

یہ کتاب لکھنؤ سے ۱۲۸۴ھ اور ۱۳۰۲ھ میں شائع ہوئی ہے۔ اس کا اردو ترجمہ گلِ شمع و پروانہ کے نام سے عبرت و عشرت نے کیا ہے۔ جس کی صراحت آگے درج ہے

بزمی کے کلام کا انداز ملاحظہ ہو:-

در بحر جریرہ است سنگل ... با قلعہ و کنگرہ مکمل
پہنائے زمیں زساحتش تنگ ... در پائے او سپہر پا تنگ
ہر برج حصار او سپہری ... ہر خشت جہاں فروز مہری

پرسید لبلوطیٔ سخن دان ... کای دیدہ سوائے ہر گلستاں
سنگل کہ بدہر کان حسن است ... ہر کو چہ او دوکان حسن است
تو بلبل باغ ہر دیارے ... اگر رخسراں در بہارے
از دفتر حسن اہل سنگل ... دانی ہمہ مجمل و مفصل
گو راست کہ چوں من نگہباں ... در رفتہ بچشم تو زخوباں

(ب) بزمی کے بعد عاقل خاں رازی نے اس کو شمع

---

[۱] یہ مضمون حسب ذیل کتابوں سے اخذ کیا گیا ہے:- (۱) کیلاگ ریو (۲) کیلاگ ایتھے (۳) کیلاگ بلوم ہارٹ (۴) پدمات بزمی (۵) شمع و پروانہ رازی۔ (۶) پدماوت غلام علی۔ (۷) گل شمع و پروانہ۔ (۸) دکن میں اردو (۹) اردو قدیم۔ (۱۰) روضۃ الشہداء۔ [۲] دیکھو کیلاگ ایتھے نمبر ۱۵۸۲۔

اور پروانہ" کے نام سے منظوم کیا ہے +

عاقل خاں عالمگیر کے عہد کا جلیل القدر امیر ہے جس نے بڑی بڑی ذمہ دار خدمتوں کو بحسن و خوبی انجام دیا ہے۔ ۱۰۸۰ء میں یہ گورنر دہلی بنایا گیا۔ اور اپنے انتقال تک جو ربیع الثانی ۱۱۰۸ھ میں ہوئی وہ اسی خدمت سے سرفراز تھا۔ عمر بھی خاصی پائی۔ کیونکہ ۸۴ سال کے سن میں دنیا سے کوچ کیا ہے +

عاقل خاں جہاں تدبیر و سیاست میں اپنی آپ نظیر تھا۔ کیونکہ عالمگیر کی دوربین نگاہ میں اس کا جچ جانا خود اس امر کی کافی ضمانت ہو سکتا ہے کہ وہ مسلمہ قابلیت رکھتا تھا۔ اسی طرح وہ اپنے وقت کا بہت بڑا شاعر ادیب اور مورخ بھی تھا۔ اُس کی یادگار سے واقعات عالمگیر، ظفرنامہ عالمگیر۔ ایک دیوان اور کئی مثنویاں ہیں جن میں سے بعض یہ ہیں:۔

مہر و ماہ، شمع و پروانہ۔ نغمات عشق وغیرہ۔ ان کے منجملہ مہر و ماہ۔ منوہر و مدمالت کا قصہ ہے۔ جس کو اُس نے ۱۰۶۵ھ میں مرتب کیا تھا۔ جیسا کہ ذیل کے شعر سے واضح ہوگا:۔

ز ہجرت یکہزار و شصت و پنج است
کزیں غمخانہ عنسامہ ظلم لکھ کنجست

P 798

یہ مثنوی برٹش میوزیم[1] میں موجود ہے۔ اور میری نظر سے گذری ہے۔ انڈیا آفس میں بھی موجود ہے۔ نمبر (۱۵۰۰) علاوہ ازیں برلن میں بھی ہے +

اس کی دوسری مثنوی "شمع و پروانہ" ہے جس کی صراحت یہاں مقصود ہے +

اس مثنوی میں رازی نے رتن سین اور پدماوت کے قصہ کو بیان کیا ہے اور ۱۰۶۹ھ میں مرتب ہوئی ہے۔ مولف اردوئے قدیم گلشن عشق کی صراحت میں شمع و پروانہ کو منوہر و مدمالت کا قصہ تصور کیا ہے۔ اور خوافی خاں کی غلطی ثابت کی ہے۔ حالانکہ خوافی خاں نے عاقل خاں کے شمع و پروانہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بلکہ منوہر و مدمالت کا ذکر کیا ہے جس سے "مہر و ماہ" مقصود ہے نہ کہ "شمع و پروانہ"

رازی کے شمع و پروانہ اور بزمی کے پدماوت میں قصہ کے لحاظ سے بہت کچھ کمی اور بیشی ہے۔ جس کی صراحت کا یہ موقع نہیں ہے +

رازی نے حمد و نعت کے سوا اپنے مرشد شیخ برہان الدین کی مدح بھی کی ہے +

برہانے بود شرع و ملت و دیں
دلیل نقشِ مختار المریدین
ازاں عارف با سرار معارف
ازاں کاشف باطوار مکاشف

P 905 B

کلام کا مزید نمونہ ملاحظہ ہو:۔

قصہ پرداز ہندی افسانہ | محرم راز شمع و پروانہ
کہ بہ ہند از شاہا نہ ہندو کیش | بود شاہی بطالع درویش
نام او بود رامی گندرپ سین | سلطنت یافتہ ز انش زیں
در ننگل بیب پائی تخش بود | پائی او در کنار تختش بود
بانوئی داشت در حرم چو پری | بہ پری یاد داد جسکہ گری

---

[1] ریو نمبر ۲ صفحہ 734 و ۔ ۹۹۔۱۵ ملا ملا ملا

خود بخود شد جمال زیبائی خود تماشائی خود تماشائی
زیں سپس سر نہادہ بر زانو سر برارم ز قصۂ ہر نو
کرد اندیشہ کیں خجستہ نوا کشتہ دمساز ناخدا بوسرا

ان دونوں مثنویوں کے سوا دو اور فارسی مثنویوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک حسن غازانہ کی جو برلن میں ہے۔ (۹۱۱-۴) اور دوسری حسام الدین نے ۱۱۰۱ھ میں بنام حسن و عشق مرتب کی تھی۔ یہ بھی برلن میں ہے (۹۱۹-۴)

فارسی نثر سے بھی اس قصہ کو زینت دی گئی ہے۔ جن میں سے (۱) ایک فرح بخش ہے۔ جس کو لچھمی رام متوطن ابراہیم آباد نے مرتب کیا ہے اور دیباچہ میں اس امر کی صراحت کی ہے کہ اس کو عاقل خاں رازی کے شمع و پروانہ سے اخذ کیا ہے +

برٹش میوزیم میں اس کا ایک نسخہ جو ۱۲۱۱ھ کا لکھا ہوا ہے نمبر (۱۰۹۱۸ ad ad ad) پر موجود ہے۔ اس کا ایک نسخہ برلن میں ہے (۹۹۰-۴)

افسوس ہے لچھمی رام کے متعلق "ریو" نے کوئی صراحت نہیں کی ہے۔ چونکہ یہ میرے کام سے جدا ہے اس لئے میں نے مزید کوشش یہاں اس کے متعلق نہیں کی +

عبارت کا انداز ملاحظہ ہو:-

"آوردہ اند کہ در ولایت سنگلدیپ فرماندہی بود کہ او را اکند رپ سین مے گفتند۔ در پیشہ عدل و انصاف از نوشیرواں گوی سبقت می بر بود و سخاوت با حاتم پہلوی ہمسری میزد و در شجاعت

دستی داشت کہ بر رستم دستاں چیرہ دست بود
فریدوں حشمتی جمشید جاہی سکندر شوکتی دارا پناہی
ز عدلش چوں رخ خوباں منور بیک جا گشتہ آب و آتش
نامی راجہ ہای آں ممالک مطیع او بودند و بر آستانۂ
عرش نشانش بعجز و نیاز سر می سودند۔۔۔۔"

اس فارسی کے سوا دو اور ترجموں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک پشتو زبان میں جس کو ابراہیم نے کیا تھا اور دوسرا میر عبد الجلیل بلگرامی نے نصف بھاکا اور نصف ہندی میں کیا تھا +

ایک اور فارسی نثر میں بصورت خلاصہ نواب ضیاء الدین احمد خاں نے اپنے قلم سے مرتب کیا تھا۔ یہ برٹش میوزیم کے نمبر (۱۹۴۱۱ or) پر موجود ہے +

اب اردو داستانوں کی صراحت کرنی ہے جن میں قدیم دکھنی ہیں۔ دکھنی زبان میں اس کو دو شاعروں نے منظوم کیا ہے۔

(الف) بنام پدماوت جس کو غلام علی نے سلطان ابوالحسن تاناشاہ قطب شاہی سلسلہ کے آخری فرمانروا کے عہد میں مرتب کیا ہے۔ اگرچہ سنہ تصنیف معلوم نہیں ہوتا۔ مگر چونکہ سلطان کا زمانہ حکومت ۱۰۸۳ھ سے ۱۰۹۷ھ تک ہے۔ اس لئے اسی زمانہ میں اس کی تصنیف تصور ہوگی۔ اس میں سلطان کی مدح موجود ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو

یو بعد از کروں میں نثار چہار یار کا
شہی بوالحسن اولیا جاہ کا
کتک شاہ اس کا عدالت دیکھت
ہوئے ظالم ست دیکھ عادل نپت
سخاوت میں مشہور جوں آفتاب

کمر حق اوتاریا ہے اُس کے یاب
ہر یک علم میں ہور لطافت منی
نہیں کوئی ہم تا شجاعت منی
سزاوار اچھو اس کے تین جم پو لاج
مبارک اچھو سلطنت تخت و تاج

نہیں معلوم غلام علی نے اپنے قصہ کو کس سے اخذ کیا ہے۔ اس نے کچھ صراحت نہیں کی ہے البتہ کسی اور زبان سے ترجمہ کرنے کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے :-

یو قصا اتھا ہوت شیریں سخن ہوس کر کر لایا ہوں دکھنی بچن

قصہ کے لحاظ سے گمان غالب ہے کہ رازی کی شمع و پروانہ سے کیا ہو +

حسب رواج قدیم حمد و نعت سے ابتدا کی گئی ہے گو صرف ایک ایک شعر کہا گیا ہے

بجا لیا اوّل میں خدا کا سپاس
کیا آ سکے الطاف کا میں سواس
تحیت یو بعد از پیمبر اوپر
بھیجیا بعد از اولاد و عزت اوپر
علی کا جو خادم ہے میری دم میں جم
جو ہے دور اس دم سوں ہم ہور غم

اس کے بعد بادشاہ کے مدحیہ اشعار ہیں جو ذکر ہو چکے اور پھر قصہ کی ابتدا کر دی گئی ہے۔ نمونہ کلام:-

کہ ہے سب جگہ منی سات دیپ
سنگلدیپ اسیں کا ہے ایک دیپ
کہ او دیپ میں ہے سگل پدمنی
نہ چیت نہ ہستی نہیں سنکنی
سنگلدیپ کے نار کا بات ہے
سنو میں کہونگا او کس دھات ہے
اتھا ایک راجا سو ہو کن گنیر
سنگلدیپ کے ملک میں بے نظیر
نکانا دوں گندرو پ سین اتھا
جگت میں برا راج اس بن نہ تھا
نہ تھا کوئی لشکر کوں اُسکی حساب
کہ جوں کہن یہ تاریاں منی ماہتاب
خزینہ بھری کوٹھریاں کئی ہزار
جواہر کی صندوق تھے سو ہزار

اس کتاب کا ایک نامکمل۔ ناقص آخر نسخہ انڈیا آفس کے نمبر ($\frac{۴۳}{III}$) پر موجود ہے۔ ممکن ہے یورپ کے کسی اور کتب خانہ میں مکمل نسخہ ہو +

غلام علی کی پدماوت کا ماحصل یہ ہے کہ سنگلدیپ کے راجہ کی لڑکی پدماوت حسن و جمال میں اپنی آپ نظیر تھی۔ جس کے متعلق نجومیوں نے کہا تھا کہ بارہ سال کی عمر میں ایک راجہ آ کر اس کو لے جائیگا۔ اس خوف سے پدماوت کا باپ اُس کی بہت حفاظت کیا کرتا تھا۔ پدماوت کا ایک طوطی تھا جو اُس کو عشقیہ داستانیں سُنایا کرتا۔ بلّی نے اُس پر ایک دن حملہ کیا اور اتفاقاً یہ بچ کر نکل گیا۔ مختلف ممالک کی سیر کرتا ہوا بنگال پہنچا۔ اور یہاں گرفتار ہو کر چتوڑ گیا۔ جہاں رتن سین نے اُسکو خرید کیا۔ رتن سین کو طوطے کی زبانی پدماوت کے حسن و جمال

کی اطلاع ہوئی اور فقیروں کے لباس میں سنگل دیپ پہنچا۔ پدماوت سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد اسکے باپ کو رتن سین کا حال معلوم ہوا۔ دونوں کی شادی ہوئی اور وطن کو واپس ہوئے۔ راستہ میں طوفان آیا۔ اور جہاز ایک دوسرے ساحل پر جالگا۔ جہاں "راکشس رہا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنا لقمہ بنانا چاہا۔۔۔" اس کے بعد مثنوی نامکمل ہے۔ چند مقامات سے نمونہ پیش کیا جاتا ہے +

طوطی کا بنگال پہنچنا:-

چلیا اوڑ کر سات دریا گذر
تماشے جو دیکھتا ہر ایک ٹھار ٹھار
بنگالی میں یک خوشش باغ تھا
جو جنت کی ہول رشک سوں داغ تھا
اُتر واں لگیا سیر کرنے کے تئیں
جو میوے کے جھاڑ آن پہ پھرنے کے تئیں

جب رتن سین نے طوطی کو خرید کیا تھا وہ بھی اس پر از حد فریفتہ ہوگیا۔ اور کبھی اپنے سے جدا نہ کرتا۔ ایک دن شکار کے لئے روانہ ہوا اور طوطی کو اپنی خاص لونڈی کی حفاظت میں دے گیا۔ اس لونڈی نے خود کو آراستہ کرکے طوطی سے اپنے حسن کی داد چاہی۔ اس کی گفتگو ملاحظہ ہو:-

کہی توں کیا ہے جگت تل اوپر
جو آیا ہے توں سات دریا گذر کر
نظر تل عجائب پڑیا ہے بہوت
بشر ہر دیش کا دیکھا ہے بہوت
کہوں کیا تیرے میں تیا گیان ہے
تجھ گیان کا کوئی انسان ہے
توں سچ بول منجہ روپ سا خوب کیں
دیکھا ہوئیگا روپ اپر روپ کیں
منج ایسی چتور جیت کی ناری اہی
کہ جوں کتون تی میں ہوں پیاری اہی
نظر تل تیری آج کیسی ہوں میں
نہ ڈر بول توں حق سوں جیسی ہوں میں

رتن سین کے سنگلدیپ پہنچنے کے بعد طوطی پدماوت سے ملنے جاتا ہے۔ تاکہ پدماوت کو رتن کے حال سے واقف کرے۔ اس واقعہ کو دیکھو:-

چلیا اوڑ کر شاہ کا لے پیغام
کیا شاہزادی کو جا کر سلام
دیکھی اُس کوں اردا کی رونے لگی
چندر ملک انجوں سات دہونے لگی
کہی کیوں میری سیتی دل تور کر
گیا تھا کہاں منجی چھوڑ کر
گئیں دل کیا کیوں یکایک تیبٹ
کیا عافیت منجہ سیتی دکھوں کست
کیتا [illegible] سوں تج کوں پالی ہوں میں
کتا تج دکھوں اپیس جاتی ہوں میں

. . . .

ہیرا من دلاسا دے کر بہوت وہاں
رتن سین کا سب کہا کھول دہاں

ایک رات رتن سین پدماوت کے محل پر کمند کے ذریعہ پہنچتا ہے مگر گرفتار ہو جاتا ہے

چڑے یک بھی ایک جوان پائے بل
سارا ج تھا سب سوں اپنی اگل
گئی دور تک چڑکے اُس کرا پر
ہوا دھاں کے کتوال کو جوں خبر
لے لشکر اپکا سو دوڑ آئیا تا
اُپر سینی سب کوں تلی لیا ئیا تا
بندیا کھینچ مشکا بجنے تھے فقیر
پڑے بند میں بادشاہ ہوا وزیر

شادی کا ہونا۔

لگے طبل شادی کے سب باجنے
دمامے لگے ہر طرف گاجنے
شہوانی جوانی مندت چوکدھن
کلاونت لگے ناچنے ہر کرمن

طوفان کے بعد جہاز کا کنارے پر پہنچنا اور اہل جہاز کا خوش ہونا +

یکا یک لگیا جہاز آکر کنارہ
رتن سین ہوا نار پائی ادہا رۂ
خوشی سوں لگے شکر کرتے کیتی
کرو فکر خشکی اُترنے کے تیئں

رتن سین کا عفریت سے سوال و جواب :-

رتن سین۔ تولیا او عفریت کون
بڑا ہے دیوانا ہے ای دیت توں
جو ایسی بلا میں جو کوئی آئیا
ہمن کوں یہاں نا سمجھ لیا ئیا
کیا سن اور اکس تہ تج گیان ہے
غرض دند در دند سو ناداں ہے
ہیں راکس تو انسان میرا خوراک
لے آیا ہوں یہاں تجکو کرنے ہلاک
دیوانا ہے توں جو منجی لیا ئیسا
میری بات سُن سات توں آئیا

اس کے بعد اوراق نہیں ہیں جس کے باعث یہ نہیں معلوم ہوتا کہ پھر کیا واقعات ہوئے ہیں

فارسی کتابوں میں راکس کے پاس گرفتار ہونا مذکور نہیں ہے۔ بلکہ جہاز کے غرق ہونے کے بعد ایک تختہ کے ذریعہ دو تو کنارے پر پہنچتے ہیں اور وہاں سے چتوڑ داخل ہو جاتے ہیں۔ اور اس کے بعد علاء الدین کا حملہ ہوتا ہے اور پدماوت ستی ہو جاتی ہے +

بہر حال فارسی کتابوں کے مقابلہ کے ساتھ اسکا ذکر کیا جائیگا +

یہ مثنوی ٹیپو سلطان کے کتب خانہ میں موجود تھی۔ چنانچہ کیلاگ اسٹوارٹ میں اسکا ذکر ہے (XX)

افسوس ہے کہ غلام علی کے متعلق فی الوقت مزید معلومات حاصل نہیں ہیں۔ موجودہ معلومات سے اسکی سوانح پر کچھ روشنی نہیں پڑتی +

(ب) اسی قصہ کو ولی ویلوری نے قلعہ دار سد ھوٹ کے زمانہ میں بنام مثنوی رتن و پدماوت منظوم کیا +

ولی ویلوری کا نام میر ولی فیاض تھا۔ یہ پہلے حراست خاں صوبہ دار سات گڑھ کی ملازمت میں شامل تھے۔ اس کے بعد سدھوٹ آ کر عبد المجید خاں قلعہ دار سدھوٹ کی ملازمت اختیار کی اور یہاں ہی اس نے یہ مثنوی اور روضۃ الشہدا کو منظوم کیا۔ رتن و پدم کے دیباچہ میں اس نے اپنے حال کا ذکر بھی کیا ہے۔ چنانچہ ملاحظہ ہو:۔

حراست خاں امیر ایک نامور تھا
سکونت گاہ اُس کو سات گڑھ تھا
اتھا وہ اہل درد و نیک اعمال
رفاقت میں اتھا میں اُس کے خوشحال
قضا را واں سوں جو قسمت نے بزخاست
سو آیا میں طرف کڑپہ کے درخواست
نواب المجید ابن الحمید ایک
اتھا واں نامور صوبہ سعید ایک
سواد بحر شجاع پروانہ لکھ کر
لبلک نوکراں میں منسلک کر
یقیں کر مجکوں سدھوٹ کو روانہ
کیا او صاحب شمشیر یں زمانہ
سو حسب الحکم میں سدھوٹ کو آیا
رنگا رنگ واں تماشے میں نے پایا

اس مثنوی کا ایک نسخہ کتب خانہ شاہان اودھ میں موجود تھا جس کی صراحت اسپرنگر نے کی ہے۔ لندن اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے۔ ممکن ہے یورپ کے کسی اور کتب خانہ میں موجود ہو۔ اگر ہو تو آیندہ مزید روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ اس مثنوی کا پہلا شعر یہ ہے ؎

خدایا تو ہے پاک پروردگار
نرنکار و آتار و آچھی اتار

ولی کی دوسری مثنوی روضۃ الشہدا ہے جس کی تصنیف سنہ ۱۱۳۰ھ میں ہوئی ہے۔ اس کے دو نسخے انڈیا آفس میں اور ایک نسخہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی میں موجود ہے جس سے معلوم ہوتا ہے ان کا نام میر ولی فیاض تھا +

اردو میں ان دو دکھنی مثنویوں کے سوا ایک اور مثنوی بنام گل شمع و پروانہ مرتب ہوئی ہے۔ اس کو اوّل ضیاء الدین عبرت نے شروع کیا تھا مگر مکمل نہ کر سکے۔ اس کے بعد اس کو غلام علی عشرت نے مرتب کیا۔ اور لکھنؤ سے سنہ ۱۸۵۰ء میں شایع کیا ہے +

عشرت نے صراحت کی ہے۔ اس کو عبرت نے شروع کیا تھا۔ چنانچہ کہتا ہے :۔

کہ عشرت پی کے تو اُلفت کا ایک جام
میری خاطر سے کر دے اس کو اتمام
کہ اس میں روح بھی عبرت کی ہو شاد
دعائے خیر سے تجھکو کرے یاد
غرض قصہ ادھورا رہ نہ جائے
جو ہیں مشتاق اُن کے کام آئے

P 44B. ---

انڈیا آفس میں جو مخطوطہ اس کا موجود ہے۔ وہ مکمل نہیں ہے۔ اسی سلسلہ میں تیسری مثنوی بھی درج ہو گئی ہے۔ اس کا نمبر (۱۶۲) ہے +

تقریباً پندرہ بیس سال قبل حکیم محمد علی مرحوم نے

بھی اس قصہ کو بطور ناول لکھا تھا +

اگرچہ یہاں قصہ کی تفصیل اور اُن کا اختلاف بھی ظاہر کیا جاسکتا تھا۔ مگر چونکہ اس کے لئے وقت درکار ہے۔ لہذا میں بعد واپسی یورپ اپنی تالیف میں مزید روشنی ڈالونگا +

اُمید ہے کہ مندرجہ بالا تفصیل سے "پدماوت" کے متعلق فارسی اور دکھنی مخطوطوں کا حال معلوم ہوجائیگا
(از کتب خانہ انڈیا آفس۔ ۱۷ر اپریل ۱۹۲۹ء)

نصیرالدین ہاشمی

کیا آپ نے نیرنگ خیال کے رعایتی اعلان سے فائدہ اُٹھایا؟

یہ موقع دوبارہ حاصل نہ ہوگا

ہم نے کچھ عرصہ سے نیرنگ خیال کی اشاعت بڑہانے کی طرف توجہ کی ہے۔ چنانچہ ہم نے ایک رعایتی اعلان کیا تھا کہ جو شخص نیرنگ خیال کی خریداری قبول کریگا۔ اُسے اپریل اور مئی کے دو رسالے قیمتی ۸ر مفت نذر ہونگے۔ اور آج ہم نیرنگ خیال میں بھی اس کا اعلان کرتے ہیں۔ اس لئے آپ اپنے دوست احباب کو توجہ دلائیں کہ وہ اس رعایت سے فائدہ اُٹھائیں۔ اُن کی خریداری جولائی ۱۹۲۹ء سے شمار کی جائیگی۔ جہاں سے نیرنگ خیال کا سال شروع ہوتا ہے۔ اور دو رسالے اپریل و مئی کے وی پی کے ہمراہ مفت بھیجے جائیں گے۔ اس رعایت سے فوراً فائدہ اُٹھانا چاہئے +

مستقل خریداران رسالہ شکایت کریں گے کہ نئے خریداروں سے رعایت کی جاتی ہے لیکن مستقل خریداروں سے کوئی رعایت نہیں کی جاتی۔ پس اس شکایت کو رفع کرنے کے لئے صرف ایکماہ کے لئے یہ رعایتی اعلان شائع کیا جاتا ہے کہ اپنا پورا نام و پتہ اور نمبر خریداری لکھ کر آپ مندرجہ ذیل خاص نمبروں کو رعایتی قیمت میں حاصل کرسکتے ہیں

عید نمبر ۱۹۲۷ء
سابق قیمت ۱۲ر۔ رعایتی ۱۲ر

عید نمبر ۱۹۲۸ء
سابق قیمت ۱۲ر۔ رعایتی ۸ر

عید نمبر ۱۹۲۹ء
سابق قیمت ۱۲ر۔ رعایتی ۸ر علاوہ محصولڈاک

اس کے علاوہ نیرنگ خیال کے جسقدر پُرانے رسایل موجود ہونگے وہ آپ کو فائل پورا کرنے کے لئے ۲ر فی رسالہ کے حساب سے دیئے جائیں گے۔ پس آج ہی درخواست بھیجدیجئے۔ جو نئے خریدار رعایتی اعلان کے مطابق خریدار بن جائینگے وہ اپنے آرڈر کے ہمراہ کوئی پُرانا عید نمبر بھی رعایتی قیمت پر منگوا سکتے ہیں۔ اس رعایت سے آج ہی فائدہ اُٹھالیئے۔ صرف چند کاپیاں باقی ہیں +

منیجر

لکھنؤ کی ایک پردہ نشین شاعرہ

(از مولوی سید تمکین الکاظمی۔ منشی فاضل، ایم۔ آر۔ اے۔ ایس)

صنف نازک کی ادبیات کی طرف ہندوستان نے اسقدر کم توجہ کی ہے کہ اب اُن کے کارنامے نظر ہی نہیں آتے۔ تذکرے لکھے گئے مگر وہ اب نایاب ہیں۔ دیوان طبع ہوئے۔ مگر اب ڈھونڈو تو نہیں ملتے ہم نے "اُردو شعر کہنے والی خواتین کا تذکرہ" ترتیب دینا شروع کیا ہے۔ کہیں سے اینٹ کہیں سے روڑا لے کر بہت نہیں تو تھوڑا ہی مواد جمع کر لیا ہے پرسوں ہمیں برادر مکرم مولوی میر قادر علی خاں صاحب بزمی نے شرم کا دیوان اپنے کتب خانہ سے نکالکر دیا۔ تذکروں میں تو شرم کا حال دیکھا تھا۔ مگر دیوان دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ ہم نے کہا چلو دوستوں کو بھی ذرا اُس سے روشناس کرادو۔

اس خاتون کے متعلق مولف تذکرہ "ماہِ درخشاں" لکھتے ہیں:۔

"شرم تخلص شمس النسا بیگم بنت حکیم قمرالدین خاں شاگرد خواجہ وزیر، ثانی سودا و میر بنارسی الاصل لکھنوی المسکن۔ در فن عروض وقافیہ ماہر و شوخیٔ طبع از کلامش ظاہر" (صفحہ ۱۳)

لالہ درگا پرشاد اپنے "تذکرۃ النساء" میں اسی کا ترجمہ کرتے ہیں۔

"شرم تخلص، شمس النسا نام۔ بنت حکیم قمرالدین۔ شاگرد خواجہ وزیر کا ہے۔ اس شاعرہ بنارسی الاصل لکھنوی المسکن صاحب عروض و قافیہ دان کے چند شعر لکھتا ہوں انہیں سے اس کی شیریں کلامی خوش بیانی ظاہر کرتا ہوں" (صفحہ)

مولوی عبدالحی صفا بدایونی اپنے تذکرہ "شمیم سخن" میں نقل کرتے ہیں:۔

"شرم تخلص شمس النسا بیگم بنت حکیم قمرالدین شاگرد خواجہ وزیر لکھنوی۔ وطن اصلی انکا بنارس و مسکن لکھنؤ تھا (صفحہ ۱۳)

حال ہی میں عبدالباری صاحب آسی لکھنوی نے خواہ مخواہ ایک "تذکرۃ الخواتین" لکھا ہے جسمیں "ماہ درخشاں" سے ترجمہ یا "شمیم سخن" سے بالفاظ دیگر نقل کرتے ہیں مگر حوالہ ندارد۔۔۔۔

"شرم تخلص تھا اور شمس النسا بیگم نام حکیم قمرالدین خاں صاحب (جو خواجہ وزیر کے شاگرد تھے) کی دختر نیک اختر تھیں۔ بنارس مولد تھا۔ مگر چونکہ ان کے والد لکھنؤ میں چلے آئے تھے اور یہیں سکونت رکھتے

تھے۔ اس لئے یہ بھی یہاں رہتی تھیں۔
شعروشاعری کا ذوق رکھتی تھیں۔ مگر کبھی
کسی مشاعرہ میں شریک ہوئیں۔ اور نہ اسکے
ذریعہ سے شہرت کا خیال کیا۔ ممکن ہے
کہ ان کے کلام پر اصلاح ان کے والد
کرتے ہوں۔ بہرحال جو کلام دستیاب ہوا
اس سے مشق سخن گوئی کا پتہ لگتا ہے" (ص۹)
آسی صاحب نے یہ حالات "ماہ درخشاں" یا "شمیم سخن"
ہی سے لئے ہیں۔ اس واسطے کہ اس میں دیوان کا
تذکرہ نہیں۔ اگر "تذکرۃ النسا" سے لیتے تو دیوان کا
تذکرہ بھی کردیتے۔ مشاعرہ میں شریک نہ ہونا اور اسکو
ذریعۂ شہرت خیال نہ کرنا آسی صاحب کی ایجاد ہے۔
پردہ نشین خواتین مشاعرہ میں شریک ہی نہیں ہوتی
تھیں۔ پھر یہ لکھنا کیا ضرور تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا +
"تذکرۂ حدیقۂ عشرت" کے صفحہ ۲۶ پر بھی
اس خاتون کے اسیقدر حالات درج ہیں۔ "سخن شعرا
صفحہ" اور "مشاہیر نسواں" صفحہ ۳۶۹ تا ۳۷۱) بھی
انہی حالات سے پر ہے۔ البتہ آخر الذکر نے اتنی
زیادتی ضرور کی ہے کہ "شیعہ مذہب رکھتی تھیں" لکھدیا
ہے۔ دیوان کے مطالعہ سے بھی بہت کچھ معلومات
ہوتے ہیں۔ جو خالی از دلچسپی نہیں۔ زیر نظر دیوان نامی
پریس لکھنؤ میں ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ م اگست ۱۸۸۸ء میں
"عروس مضمون" معروف بہ "دیوان شرم" کے نام سے
متوسط تقطیع کے اسی صفحات اور پندرہ سطری مسطر
پر شایع ہوا ہے۔ سرورق پر
"از حجاب طبع آفتاب سیماے مشتری۔ کہائے
زہرہ چشم عصمت توام نواب شمس النسا بیگم"
لکھا ہوا ہے۔ اختتام پر قمر النسا بیگم حجاب کا خاتمۃ الطبع
ایک خاص چیز ہے۔ کسی تذکرے میں قمر النسا حجاب
کا حال نہیں ملا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شمس (شمس النسا
شرم) وقمر (قمر النساء حجاب) حکیم قمر الدین خاں ہی کے
جگر پارے ہیں۔ ابتدائے خاتمہ میں شرم کی تعریف
کرکے ایک بات بڑے مزے کی لکھی ہے +

"اگرچہ اس سے پیشتر اور بھی حیا پروران
معانی نے حجلۂ افکار ابکار شعراء میں قدم
رکھا ہے۔ اور عصمتیان مضامین نورانی
نے کاشانۂ طبائع اہل سخن کو پرتو جمال برق
خصال سے اپنے بے حجابانہ روشن کیا ہے
مگر یہ نازِ دلربایانہ اور یہ بناوٹ بیباکانہ
جسے خدا دے وہ لے۔ نزاکت طبع و
بندش مضمون کسی کے دست قدرت
میں نہیں، مردوں میں کیا دم لگی ہے جو
عورتوں میں نہیں۔ . . ."
واقعہ یہ ہے کہ حجاب نے بالکل صحیح لکھا ہے۔ مونچھوں
والی صنف (مردوں) میں کوئی خاص بات ایسی نہیں
جو فنون لطیفہ میں چونڈے والی صنف (عورتوں) سے
بڑھ چڑھ کر رہیں۔ اگر عورتیں کوشش کریں تو مردوں
سے زیادہ کام کر سکتی ہیں۔ شرم کے دیوان کے مطالعہ
سے یہ محسوس ہوگا کہ شرم کی شاعری کسی طرح کسی مرد شاعر
کی شاعری سے گھٹی ہوئی نہیں ہے۔ زبان، بیان، طرز
ادا، سلاست و روانی، مضمون آفرینی، معاملہ بندی سبھی چیزیں
موجود ہے +

مگر افسوس ہے کہ بجائے اپنے جذبات اپنی زباں میں ادا کرنے کے مردوں کی زبان میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ تو ظلم ہے کہ کوئی مرد ریختی کہے تو بیگمات بگڑیں کہ "مونڈی کاٹا ہماری ریس کرتا ہے نقل اتارتا ہے" وغیرہ اور جو خود مردوں کی تتبع کریں اور اتنا بڑا جونڈا سر پر رکھ کر ناک میں نتھ یا تھوں میں چوڑیاں پہنکر "اوئی دوّیا" کی بجائے "میں جاؤنگا" "میں گیا تھا" کہیں تو کچھ نہیں! دیکھئے کس مزے سے کہتی ہیں

خدا سے ڈر بتِ بے مہر اب تو دے بوسہ
لبوں پہ دم ہے ترے خاکسار کا پہنچا
نشہ میں قصد کیا اس سے ہم آغوشی کا
کیا کہوں لطف اٹھایا ہے جو مےنوشی کا
کرتا ہوں کب بیان میں وعدہ خلافیاں
سچے اجی تمہیں سہی جھوٹے ہمیں سہی

اس سے قطع نظر شعر نہایت اچھے ہیں اور خود خرم کے متعلق چند نئی باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً ان اشعار سے مولف مشاہیر نسواں کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے کہ "شیعہ مذہب رکھتی تھیں"

لئے پھرتا ہے جاروبِ شعاعِ مہر کیوں گردوں؟
یہ کیا جاروب کش ہے آستانِ شاہِ خیبر کا؟
جسے کہتے ہیں سب کوثر ترے زلفوں کا دھوون ہے
لقب ہے مشکِ جنت نکہتِ زلفِ معنبر کا!
نبیؐ نے لحمک لحمی کہا کس کو سوا تیرے؟
وصی ہے تو بلا فصل اور بھائی ہے برابر کا

نہ صرف یہی بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کی سخت پابند تھیں۔ اور غزل بھی کہتی تھیں تو استغفار کر کے ؎

اک غزل اس بحر میں اے خرم چپکے سے پڑھو
راہ ہی اب دے چکا ہے استغفار آپ کا

لکھنؤ میں زیادہ دن رہنے سے شاید شہر سے محبت ہو گئی تھی کہتی ہیں ؎

حکم اختر نہ رہا ملک نصاریٰ کا ہوا
آج کل ہم نے نئی طرح کا ساماں دیکھا

ایک شعر سے پتہ چلتا ہے کہ شادی ہو چکی تھی اور نہ صرف یہی بلکہ شوہر پر پروانہ وار فدا بھی تھیں ؎

غیر سے خالی ہے گھر اب ہم ہیں اور دلدار ہے
خرم ہم ہیں صورتِ پروانہ صاحبِ خانہ شمع

"صاحبِ خانہ" سے مراد شوہر ہے،

ایک قطعہ بھائی کی آمد پر سبارکباد میں بھی کہا ہے،

ہاتفِ غیب نے آنے کا مرے بھائی کے
مژدہ دیگر یہ سنایا ہے مبارک ہووے

اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی باپ کے قدم بقدم (یعنے حکیم تھے) اور یہ واپسی زیارت عتبات عالیات سے تھی ؎

تھا لقب پہلے تو مشہور حکیم حاذق
زائر اب شہ کا کہایا ہے مبارک ہووے
کیوں نہ ہو دستِ شفا اسکو کہ جو خاکِ شفا
اس نے دے نے سے لایا ہے مبارک ہووے

زوّار نہ جانے نام تھا یا تخلص تھا یا عرف تھا؟

میرے زوّار نے بس آتے ہی بیماروں کو
کیا ہی اعجاز دکھایا ہے مبارک ہووے
خرم اب خوش ہو کہ اللہ میرے زائر کو
ہند میں خیر سے لایا ہے مبارک ہووے

جن تذکروں میں شرم کا حال ہے اُن سے پایا
جاتا ہے کہ وہ خواجہ وزیر کی شاگرد تھیں۔ مولف تذکرۃ الخواتین
نے ان کے والد کو خواجہ وزیر کا شاگرد خیال کیا ہے۔
جو ہماری نظر میں صحیح نہیں۔ اور پھر آسی صاحب کا یہ کہنا
کہ وہ ممکن ہے کہ اُن کے کلام پر اصلاح اُن کے والد
کرتے ہوں؛ اور بھی بعید از قیاس ہے۔ اور پھر خود انکے
دیوان سے ظاہر ہے کہ ان کا اُستاد کوئی اور تھا۔
والد سے اصلاح نہیں لیتی تھیں +

شعر جب کہتا ہوں میں تو ٹکڑے ہوتا ہے جگر
یاد آتا ہے مجھے لطف و کرم اُستاد کا
نہایت رنج ہوتا ہے بہت لے شرم ہوتے ہیں
ذرا بھی یاد جب ہم شفقت اُستاد کرتے ہیں

ظاہر ہے کہ یہ شعر کسی مرحوم اُستاد کو یاد کرکے کہے گئے
ہیں۔ اگر والد ہی سے اصلاح لیتیں تو اس طرح کیوں کہتیں؟
دوسری بات ان اشعار سے یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ
شعر اُستاد کے بعد کہے گئے ہیں اور کسی دوسرے کو
دکھائے نہیں گئے۔ اس لئے کہ ایک اُستاد کے ماتم
میں غزل کہہ کر دوسرے اُستاد کو دکھلائی نہیں جاتی
اور پھر کسی اور شعر میں اُنہوں نے کبھی کسی دوسرے اُستاد
کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔ ایک یگانہ ناسخ کے دیوان کا تذکرہ
آگیا ہے۔ اور بس +

کیا تجھے اے شرم اُستادِ زمانہ سے مثال
تیرا دیواں اور ہے ناسخ کا دیواں اور ہے

شعر عموماً اچھے کہے ہیں اور بعض شعر تو نہایت عمدہ ہیں +

نگاہِ غور سے دیکھو تو میرے دل کی طرف
اس آئینے میں ہے جلوہ تمہاری صورت کا

گر اسیری میں خیالِ رُخِ جاناں ہوتا
رشکِ گلزارِ ارم خانۂ زنداں ہوتا

بات کرنی بھی نہ آتی تھی یہ شوخی کیسی؟
یاد کاہے کو تمہیں ہوگا لڑکپن اپنا؟

جو وعدہ کرکے وہ رشکِ قمر نہیں آتا
قرار دل کو مرے رات بھر نہیں آتا

بے رُخی سے جو کبھی اُس نے نگاہیں ڈالیاں
کیا کلیاں تھیں وہ ہم کو نہیں بھائیں ڈلیاں

دردِ دل دور ہوا سینے کی سوزش بھی گئی
شربتِ وصل میں تیرے ہیں یہ تاثیریں دو

اس پہ عاشق آدمی ہیں اس پہ بلبل ہے فدا
اور ہیں گلہائے خنداں بوئے خنداں اور بھی

جو کہ غیروں کو پیار کرتا ہے
اے دل ایسے کو پیار کیا کیجے

میں اک فقیر ہوں کمبل سیاہ کافی ہے
تمہارے واسطے تزئینِ جامہ دانی ہے

بعض مضامین ایسے عمدہ بندھے ہیں کہ دیکھ کر جی
لوٹ جاتا ہے۔ پہونچے کی نزاکت دیکھئے:۔

پڑے جو عکسِ گلِ تر ہزار بل کھائے
کہ شاخِ گل سے بھی نازک ہے یار کا پہونچا

اور کمر کی نزاکت تو غضب ہے +

نازک زیادہ ہے رگِ گل سے تری کمر
اے جان سر پہ پھول نہ رکھنا گلاب کا

پان کی پیک کو بھی بیکار جانے نہیں دیا +

پیک پھینکی ہمارے لاشے پر
دیدیا تم نے خوں بہا کیا خوب

کان کے پتوں اور گلِ عارض کو دیکھ کر قدِ یار کو درخت بنا ڈالا،

برگ ہیں صاف کان کے پتے
پھول عارض ہیں قدِ یار درخت

ذرا تشبیہیں دیکھئے:-

لب بدخشاں ہیں تو زلفیں ہیں ختن چشم آہو
دانت اختر ہیں مسی شب، مہتاباں عارض،

دانتوں پر مسی کی ریخیں نظر آئیں تو یہ سمجھ لیا کہ الماس میں نیلم جڑے ہوئے ہیں۔ دیکھئے کیسی شاہانہ تشبیہ ہے -

صانعِ عالم نے نیلم جڑ دیا الماس میں
شرم ہے مسی کی ریخیں آسکے دنداں میں نہیں

پان کے اُگال سے کبھی زخم کا خون بند کیا جاتا ہے اور کبھی غیروں سے تھکوایا جاتا ہے :-

جاری رہے گا خون دہنِ زخم سے مرے
جبتک نہ اپنے باندھے گا منہ کا اگال تو
زخموں کی طرح غیر لہو تھوکنے لگیں
منہ سے ملا کے منہ جو ہمیں دے اگال تو

خارِ مژگاں اور خارِ بیاباں کا فرق اور اول الذکر کی اہانت ابتک کسی نے اس عمدگی سے بیان نہیں کی تھی۔ -

ہے جگر سے اسکی کاوش پاؤں میں چبھتے ہیں وہ
خارِ مژگاں اور ہے خارِ بیاباں اور ہے

بیمار کو سبھی ذلیل کرتے ہیں۔ مگر کسی نے چوری اور وہ بھی ... کی چوری نہیں لگائی تھی۔ کس مزے سے انہیں کفن چور بنانے کی کوشش کی ہے :-

... ہیں کس تاک میں اغیار میرے گور پر شرم ہے مجھکو نظر آنے لگے ہیں چور سے

آغازِ محبت ہی میں جفا ہونے لگتی ہے تو انجام کی فکر پیدا ہوئی

آغازِ محبت ہی میں کرتے ہیں جفا وہ
اب دیکھئے کیا ہوتا ہے انجام ہمارا

محبتِ ماتم میں سیہ پوشی کا سبب کس مزے سے بیان کیا ہے

نبی قتلِ ... ہیں ہو گیا ... ایک جہاں
نہیں محرم میں یہ باعث ہے سیہ پوشی کا

کبھی مطلوب کو پتنگ بازی کرتے دیکھتی ہیں تو کہتی ہیں:-

کٹ گئے شمع رو بھی مثلِ پتنگ لوٹنے اس حسن سے لڑایا پیچ

... مجبوری بھی دیکھئے یہ پردہ نشینی کا رونا ہے،

... پہ دروازہ بھی ہم جا نہیں سکتے افسوس
... خوشا بخت پہنچتے ہیں جو دیوار کے پاس

وصل کی تیاری کس طرح کی جاتی ہے،

سیج پھولوں کی بچھا رکھتے ہیں اس گل کیلئے
کرتے ہیں وصل کا ساماں سرِ شام سے ہم

کسی استاد کا مشہور شعر ہے،

صد غنچہ بشگفت ... الا دل من ... دل من ...

اردو میں سینکڑوں نے طبع آزمائی کی مگر یہ بات پیدا نہ ہو سکی شرم نے اردو کی شرم رکھ لی،

آئی بہار پھول کھلے باغ میں مگر
غنچہ ہمارے دل کا ابھی تک کھلا نہیں

دیکھئے کتنا جذبات میں ڈوبا ہوا شعر ہے معلوم ہوتا ہے کہ دل چوٹ کھایا ہوا ہے.

وفا کا نام نہیں بیوفائیاں دیکھیں
ان آشناؤں کی ناآشنائیاں دیکھیں

مجھے خواجہ مسعود علی صاحب فروقی بی اے بیگ نے ...

ہوئی کسی لکھنؤ کی پردہ نشین شاعرہ کا ایک شعر سنایا تھا جو
تقریباً اسی رنگ کا ہے۔ مگر عجیب شعر ہے۔ دیکھئے کسقدر
ڈوبا ہوا ہے،

ابھی تو طفل دبستاں ہو تم کو کیا معلوم؟
وفا وفا نہ کرو دہر میں وفا معلوم؟

گل اندام میں اور بتوں میں بادی النظر میں کوئی فرق نہیں
لوگ دونوں کو بت باندھتے ہیں۔ مگر سنئے،

گل سے ہے نرم ترا جسم مگر سنگ ہے دل
اے صنم اور بتوں کے ہیں بدن پتھر کے

اس سادگی کو ملاحظہ فرمائیے کسقدر بے ساختگی ہے،

فرمائیے تو آپ کے پہلو میں بیٹھ جائیں
پیارے بجائے تکیہ پہلو ہمیں سہی

ذرا اس بھولے پن کو دیکھئے یہی جذبات ہیں جو عورت کو
عورت ظاہر کر دیتے ہیں،

اُس کے کوچے میں جو کل جا کے پکارا عاشق!
سن کے آواز کہا۔ کون ہے؟ کس کا عاشق؟

اپنے پردہ کی تعریف کی ہے اور در پردہ شہرت کا ذکر
بھی کیا ہے،

آج تک چشم فرشتہ نے بھی دیکھا نہیں شرم
مہر کی طرح سے ہاں نام ہے روشن اپنا

شرم و حیا کا تذکرہ اکثر کیا ہے،

شرم ہے اپنا تخلص مجھے آتی ہے حیا
حال دل اپنا کسی کو میں سناؤں کیونکر؟

آساں نہیں وہ جس کو نہ ہووے حیا و شرم
بھاتا ہے جی سے شرم کو عالم حجاب کا

اور پھر اہل عصمت کے غزل سننے کا بھی لحاظ رکھا ہے،

اک غزل اس بحر میں اے شرم لکھنا اور بھی
اہل عصمت سنتے ہیں اکثر ترے اشعار کو

مگر وصل میں شرم و حیا، پاس و لحاظ سب اٹھ جاتا ہے،

وصل میں شرم و حیا شرم کو مشکل ہے بہت
کثرت شوق سے ہو جاتا ہے دشوار لحاظ

اور اس لحاظ کی دشواری میں ایسے ایسے بے حجاب
مضمون بندھ جاتے ہیں کہ پڑھنے والے کو لحاظ ہوتا ہے،

نظر آ جاتی ابھی برق تجلی اے شرم
غسل کرنے کے لئے شوخ جو عریاں ہوتا

پائجامے سے نہ دیکھے کوئی زانو کی جھلک
یہی باعث ہے گل اندا موں کی تہ پوشی کا

آشنا سمجھے آسے مردمک چشم سحاب
غسل کرتے ہوئے دریا میں جو عریاں دیکھا

دل بیتاب کے اے شرم ہوئے سو ٹکڑے
تیغ عریاں کی طرح جب اُسے عریاں دیکھا

نگہ گرم جو کی ناف پہ اپنے تو کہا
برق کو ہم نے کیا حلقۂ گرداب میں بند

کس درجہ صاف ہے شکم صاف یار کا
یہ تو حلب کے آئینے میں بھی صفا نہیں

گرمیاں کرتے ہوئے غیر و نسے دیکھا جو اسے
ہم نے بھی محفل دلدار میں جھانا چھوڑا

قتل کرنے کو یہ کیا کم ہے تری بانکی ادا!
سینہ تن تن کے نہ دکھلا بت ... اپنا
بوسہ ہائے لب میگوں میں جو کیف ... ست

لطف اے بادہ کش وکب ہے وہ میخواری میں
اس پر یہ حال ہے کہ کسی سے محبت نہیں کی،
شکر ہے تجھ کو کسی سے نہیں الفت اے قمر
ورنہ جز رنج و الم خاک نہ حاصل ہوتا
یہ تو خیر مگر ایک چیز بہت کھٹکتی ہے۔ اور اس الفت کے نہ ہونے کا سبب بھی ظاہر کرتی ہے اللہ اللہ کس مزے سے کہتی ہیں،
معشوق کی جانب سے لگاوٹ نہو جبتک
آوارہ طبیعت سے لگائی نہیں جاتی،
مگر باوجود اس قدر مردانہ پن پیدا کرنے کی کوشش کرنے کے فطرت نہیں بدل سکی بعض شعر بے ساختہ نکل گئے،
اس کی بھی کچھ لڑائی ہے اتنا برا نہ مان
ہم خوب نہیں سہی تو ہی حسین سہی
یوسف عزیز تھا جو زلیخا نہ کہہ سکی
ہونگیں شکایتیں سر بازار آپ کی
نہ صرف یہی بلکہ مطلوب کو اپنا کرنے کے لئے "کافور ولیں" سے ڈلیاں پڑھوا کر منگواتی ہیں،
تجھکو اپنا مجھے کرنا تھا بس اتنے کے لئے
کافور ولیں سے پڑھوا کے منگائیں ڈلیاں
آخر میں ایک قصیدہ بھی "لفٹننٹ طامسین" کی مدح میں کہا ہے (۲۹) شعر ہیں اور بالکل معمولی قصیدہ ہے۔ کوئی خاص بات نہیں۔ مطلع ہے،
فیض بہار سے ہے یہ جوبن پہ بوستاں
ہر عروس باغ ہے مشاطہ باغباں
آخر میں دعا کے بعد کہتی ہیں،
اقلیم ساتوں ہوں تہ فرماں یہ ہے دعا
لفٹنٹ طامسین گورنر ہو حکمراں
نتیجہ اشعار کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ شرم کس پایہ کی شاعرہ تھیں۔ انشاء اللہ آئندہ کسی اشاعت میں "مخفی" "چندا" اور دوسری خواتین کے کلام کا انتخاب شائع کیا جائے گا*

السید تمکین الکاظمی

جب میں مطالعہ کے لئے کتابیں اُٹھاتا ہوں اور میری نظر سامنے رکھی ہوئی تصویر پر پڑتی ہے، میرا ہاتھ دفعتاً رُک جاتا ہے اور میں شرمندہ ہو جاتا ہوں . . کیونکہ اُس کو مجھ سے محویت غیر کا شکوہ ہے، . . . . . .

جب میں تخیلات گوناگوں میں محو ہو کر دفعتاً تصویر کو دیکھ لیتا ہوں۔ میری آنکھیں جھپک جاتی ہیں۔ کیونکہ اسکی گہری اور دوربین آنکھیں میرے خیالات کی تہہ تک پہنچ جاتی ہیں اور قلب کی گہرائی میں دور اگر راز کا کھوج لگالیتی ہیں اور اپنی صورت حال سے چشمک زنی کرتی ہیں . . . . . .

جب میں سیر و تفریح کے لئے تیار ہوتا ہوں اور چلنے کا قصد کرتا ہوں "تصویر" میری مجرمانہ کوشش کو مشاہدہ کرتی ہے۔ اور چشم زدن میں مجھے ساکت صامت کرسی پر بٹھا دیتی ہے . . . .

جب میں کالج سے واپسی پر کمرے میں داخل ہوتا ہوں "وہ" متبسم ہونٹوں سے خوش آمدید کہتی ہے۔ اور مسرت کے دو آبشار اُس کی سحر کار آنکھوں سے نکلتے ہیں اور میرے کشت امید کو سیراب کر دیتے ہیں . . . . . .

جب میں ذوق و شوق سے اُس کے حسین چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتا ہوں۔ تو اُس کے لب نازک مرتعش ہو جاتے ہیں۔ اُس کی جبینِ مصفا پر شکن کی موجیں اُٹھتی ہیں۔ اور نرگسیں آنکھیں حیا سے جھک جاتی ہیں۔ گویا میری دلیری پر ملامت کناں ہیں . . . . . .

جب میں کسی گناہ پر نظر عنایت اور نگاہِ ترحم کا طالب اور عفو و رحم کا خواستگار ہوتا ہوں۔ وہ میری دل گرفتگی اور سادہ دلی پر مسکراتی ہے . . . .

جب میں محبت سے اُس کے لینے کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہوں، اُس کا چہرہ شرم سے عرق عرق ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی مخمور اور نرگسیں آنکھوں سے مجھ کو دیکھتی ہے میرے جسم میں ایک برقی لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ اور میں سہم کر رہ جاتا ہوں !!!

جب میں رات کو سونے کا ارادہ کرتا ہوں۔ میری نظر تصویر پر پڑتی ہے تو وہ حزن و الم سے دُھندلی معلوم ہوتی ہے اُس کی چمکدار کشادہ پیشانی اور بارعب آنکھیں شب کی سیاہی میں روپوش ہو جاتی ہیں۔ میں حسرت و افسوس کے ساتھ

اُس کی محبت بھری آنکھوں کو بوسہ دیتا ہوں۔ اور ایک سرد آہ کے ساتھ بسترِ خواب پر دراز ہو جاتا ہوں !!!

فانی علوی (مرزاپور)

عورت

صنفِ نازک دنیا کی بیش بہا چیزوں میں ایک لطیف ترین اور سب سے زیادہ عزیز چیز ہے۔ قدرت نے جب آدمؑ کو پیدا کیا تھا تو اس کے ساتھ ہی اُن کی ضد کی تکمیل کرنا ضروری و لازمی تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور آدمؑ کی غمگساری کے لئے حوّا پیدا کی گئی۔ پھر کیا پوچھنا آدم کے لئے دنیا حقیقی معنوں میں جنت تھی۔

عورت کیا ہے زندگی کا ایک راز ہے۔ راحت کا ایک ساز ہے مسرت کا دریا ہے۔ اس کی محبت میں جسقدر غوطہ لگاؤ لذت بڑھتی جائیگی۔ محبت کیا ہے۔ ایک شراب ہے جس کے نشہ کا اُتار نہیں۔ ایک لذت ہے جو شراروں سے بھری ہوئی ہے۔ اس کی محرک عورت ہے۔ اور صرف عورت!

میں سمجھتا ہوں عورت خود مجسم محبت ہے۔ اور وہ جب کسی سے محبت کرتی ہے۔ تو اس سے منحرف نہیں ہوتی۔ بلکہ اُس کو انجام کو پہنچانے کی کوشش کرتی ہے۔ عورت محبت کرتی ہے تو گویا وہ ہے اُس کی مثال بالکل ایسی ہے

ہر چیزے کہ در کانِ نمک رفت نمک شد

عورت محبت کا مخزن ہے۔ باوجود اس کے قدرت نے اسکی فطرت ایسی بنائی ہے جو اسکی ضد ہے یعنی اُس کی فطرت نسوانی میں حیا اور شرم کوٹ کوٹ کر ہر رگ و ریشہ میں دوڑائی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی نگاہ ہمیشہ مرد کے آگے نیچی رہتی ہے۔ اُس کی نگاہ میں جادو ہے۔ جب کسی پر پڑ جاتی ہے تو بغیر اثر کے واپس نہیں ہوتی۔

عورت محبت کرتی ہے تو دنیا اور مافیہا سے بالکل بے خبر ہو جاتی ہے جس سے محبت کرتی ہے اُس کو اپنا پرستار بناتی ہے۔ نہیں معلوم وہ دل ہی دل میں کیا کرتی ہے۔ بہت خوش نصیب ہے۔ وہ مرد جس سے عورت محبت کرتی ہے۔ عورت کیا ہے ایک تماشہ ہے۔ مرد کے اختیار میں بھی ہے۔ اور آزاد بھی۔ مرد اُس کے عشوہ کی تاب نہیں لا سکتا۔ عورت نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ محبت کی گرم بازاری کا وجود بھی نہ ہوتا عشقیہ شاعری نہ ہوتی۔ افسانۂ محبت کے طومار نہ ہوتے۔ تھیٹر و سینما کا وجود نہ ہوتا۔ مرد کس کے لب و رخسار کی قدر و قیمت کرتا۔ اُس کی خواہش حیوانی کی رانی شریف ترین جذبۂ محبت کے پربت میں بدلی نہ ہوتی۔ یہ سب کچھ نہ ہوتا تو کیا ہوتا مرد ہی نہ ہوتا صرف مادہ ہوتا۔

محمد وزارت علی (حیدرآباد دکن)

سہیلیاں

اسی کشش و پنج میں چاروں ندی کے کنارے کھڑی تھیں لیکن کسی نے موڑ کے قریب سے کسی کے پانی میں

چلنے کی آواز آئی ـــــــ تھوڑی دیر میں اینجل کلیر اُن کی طرف آتا ہوا دکھائی دیا +

جس طرح ساز کے تمام تار صرف ایک مضراب کے پڑتے ہی مرتعش ہو جاتے ہیں اور آواز دینے لگتے ہیں بالکل اُسی طرح ان چار سہیلیوں کے دل یک لخت دھک دھک کرنے لگے ـــــــ چار دھڑکتے ہوئے دلوں کی دھڑکن کیا تھی ایک زور کا دھماکا تھا +

"کیا یہ گرجا تو نہیں جا رہے" میرین نے پوچھا +

"نہیں" ٹیس نے جواب دیا +

فی الحقیقت بہار کے رنگین دنوں میں اینجل کی فطرت عروس بہار کے دل خوش کن اثرات کو گرجا کے وعظ سے کہیں زیادہ پسند کرتی تھی لیکن آج وہ اس جانب یہ دیکھنے آیا تھا کہ سیلاب کی وجہ سے گھاس کو کوئی خاص نقصان تو نہیں پہنچا ہے۔ آتے وقت اُس نے دور ہی سے ان لڑکیوں کو دیکھ لیا تھا۔ مگر یہ چاروں راستے کی مشکلات پر عبور پانے میں اسقدر منہمک تھیں کہ اُس کی موجودگی سے بالکل بے خبر رہیں۔ اُس کو بخوبی علم تھا کہ جس طرف وہ جا رہی ہیں۔ پانی زیادہ چڑھا ہوا ہے اور وہ آگے نہ بڑھ سکینگی۔ چنانچہ دل ہی دل میں سوچتا ہوا کہ وہ کس طرح انکی مدد کرے ـــــــ خصوصاً اُن میں سے ایک کی ـــــــ وہ اُن کی طرف ہولیا تھا +

موسم گرما کے ہلکے ہلکے کپڑے زیب تن کئے ہوئے۔ گلابی رخسار اور پُرضیا آنکھوں والی بھولیاں اسقدر دلکش اور نظر فریب معلوم ہوتی تھیں کہ اینجل اُن کے قریب آنے سے پہلے کچھ لمحوں کے لئے ٹھہر گیا۔ تاکہ اُن کو اچھی طرح سے دیکھ لے۔ اُن کے دامنوں کی ستم نوازی نے لاتعداد تتلیوں کو گھاس کے مسکن سے جدا کر دیا تھا۔ جو اب اُن کے سروں پر بے چینی کے ساتھ چکر لگا رہی تھیں اور ایک ہالہ بنائے ہوئے تھیں۔ آخر کار اُس کی نظر ٹیس پر پڑی جو سب سے پیچھے کھڑی تھی۔ ٹیس نے اُس کی تجسس نظروں کا جواب اپنی ضیاپاش نگاہ کی بجلیوں سے دیا۔ وہ پانی سے ہوتا ہوا اُن کے قریب آیا اور کچھ دیر تک اُڑتی ہوئی تتلیوں کو کھڑا دیکھتا رہا +

"کیا تم گرجا جانے کی کوشش کر رہی ہو؟" اُس نے میرین سے دریافت کیا جو سب سے آگے کھڑی تھی۔ باقی تین میں سے دو اور کو تخاطب میں شامل کر لیا۔ مگر ٹیس کو چھوڑ دیا +

"جی ہاں، اور اب وقت گزرتا جاتا ہے"+

"میں تم کو اس پانی میں سے لیجاؤنگا ـــــــ تم میں سے ہر ایک کو"+

چاروں کے چہرے سرخ ہو گئے گویا ایک دل تھا جو چار سینوں میں دھڑک رہا تھا +

"میرے خیال میں آپ نہیں لے جاسکیں گے!" میرین نے کہا +

"تمہارے اُدھر جانے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔ ذرا توقف کرو ـــــ کیسی باتیں کرتی ہو، تم اسقدر بھاری

نہیں ہو کہ میں تمہیں اُٹھا نہ سکوں۔ میں چاروں کو اکٹھا لے جا سکتا ہوں ——— اچھا میترن دیکھو اپنے بازو میرے کندھوں کے گرد ڈال دو ——— یہ ——— گرفت کو مضبوط کر لو ——— شاباش +

میترن نے اُس کے کہنے کے مطابق اپنے آپ کو اُس کے بازو اور کندھوں پر ڈال دیا۔ اور اینجل اُس کو لیکر روانہ ہو گیا۔ اُس کا اکہرا بدن دُور سے ایک نازک ٹہنی کی مانند معلوم ہوتا تھا۔ اور میترن اُس کے اوپر پھولوں کا ایک بھاری گلدستہ۔ سڑک کے موڑ پر دونوں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ مسٹر کلیئر کے پانی میں چلنے سے اور میترن کے بونٹ کے ہلنے سے اتنا معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ فلاں جگہ پر ہیں۔ چند منٹ میں وہ واپس آ گیا۔ پانی کے کنارے پر اِزّ دوسرے نمبر پر تھی۔ چنانچہ اب اُس کی باری تھی +

"لو وہ آ رہے ہیں" اِزّ نے کہا۔ اُس کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ اُس کے ہونٹ فرطِ شوق سے خشک ہو گئے ہیں۔" اور اب مجھے بھی میترن کی طرح اُن کی گردن میں ہاتھ ڈالنے پڑیں گے" +

"اس میں کیا حرج ہے؟" ٹیس نے جلدی سے جواب دیا +

اینجل کلیئر جو اس مشقت کے تین چوتھائی حصّے کو محض ایک معمولی خدمت کی حیثیت سے انجام دے رہا تھا۔ اِزّ کے قریب آیا تو ریٹی کا اُچھلتا ہوا دل بیچاری کے بدن کو ہلائے دیتا تھا۔ بہرحال وہ اُس کے قریب پہنچا اور جب اُس کو اٹھا رہا تھا تو اُس نے ٹیس کی طرف دیکھا۔ شاید اُس کے ہونٹ زیادہ گویائی سے یہ بات ادا کر سکتے کہ "تھوڑی دیر اور بس پھر ہم اور تم ہونگے!" ٹیس کا دلی احساس بھی اُس کے چہرے پر ظاہر ہو گیا۔ وہ اُس کو چھپا نہ سکی +

غریب ریٹی اگرچہ سب سے ہلکی تھی۔ مگر اینجل کو سب سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئی۔ میترن مثل ایک موزنی سنگ کے تھی۔ کہ جس کے بوجھ کی وجہ سے وہ قریب قریب لڑھک ہی گیا تھا۔ اِزّ خاموشی اور تمیز کے ساتھ چلی گئی تھی۔ لیکن ریٹی تو ماش کے آٹے کی طرح اکڑی ہی جاتی تھی +

خیر خدا خدا کر کے وہ اس چلبلی لڑکی کو بھی لے کر پہنچ گیا اور اُتار کر واپس آیا۔ ٹیس اپنی تینوں سہیلیوں کو پانی کے پار کھڑے ہوئے دیکھ سکتی تھی۔ اور اب اُس کی باری تھی۔ وہ یہ دیکھ کر حیران سی ہو گئی کہ وہی جذبہ جو اُن تینوں میں مسٹر کلیئر کے قریب آنے سے پیدا ہوا تھا اور اُس نے حقارت آمیز نظروں سے دیکھا تھا۔ اب خود اُسکی رگوں میں جوش زن تھا +

"شاید میں خود تمہارے سہارے سے جا سکوں۔ تم بہت تھک گئے ہو گے مسٹر کلیئر!" اُس نے کہا +

"نہیں نہیں ٹیس" اُس نے جلدی سے جواب دیا۔ اور پیشتر اس کے کہ اسکو خبر ہو وہ اُس کے بازوؤں میں کندھے سے سر لگائے بیٹھی تھی +

"تم تین کے بدلے ایک ہو" اُس نے ٹیس کے کان میں کہا +

"مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ سے بہتر لڑکیاں ہیں" ٹیس نے اپنے عزم پر قائم رہتے ہوئے جواب دیا +

"ہاں ——— مگر میرے نزدیک نہیں" +

اُس نے دیکھا کہ وہ یہ فقرہ سُن کر پسینے میں تر ہوگئی۔ اور چند قدم تک وہ خاموش رہا +

"مجھے اُمید ہے میں زیادہ بھاری نہیں ہوں؟" ٹیس نے دبی زبان سے سوال کیا +

"ہرگز نہیں، تمہیں معلوم ہے کہ میں نے تین چوتھائی، بلکہ صرف ایک چوتھائی کی غرض سے برداشت کیا تھا ——— مجھے اُمید نہیں تھی کہ آج ایسا واقعہ ہوگا"

"اور ... مجھے ——— پانی اسقدر جلدی چڑھ آیا"

ٹیس کے سانس کی گھبرائی ہوئی آمدورفت سے اُسے معلوم ہوگیا کہ وہ اُس کے فقرے کا مطلب صرف پانی کا چڑھ آنا ہی نہیں سمجھی ہے بلکہ اصل مفہوم سے واقف ہے ——— کلیئر خاموش کھڑا ہوگیا اور اپنا چہرہ اُس کے چہرے کی کی طرف کرلیا۔ "ہائے ٹیسی!" اُس نے کہا +

لڑکی کے رخسار تپش کے مارے جل اُٹھے۔ اور اُس میں کلیئر کو آنکھ بھر کر دیکھنے کی تاب نہ رہی۔ اینجل کو خیال ہوا کہ وہ اس اتفاقیہ واقعہ کا ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہتا ہے۔ اس لئے اُس نے زیادہ کچھ منہ سے نہ نکالا۔ اب تک کوئی خاص اُلفت آمیز گفتگو اُن کے درمیان نہ ہوئی تھی۔ پس یہ ضروری تھا کہ وہ خاموش ہو جائے۔ پھر بھی وہ آہستہ آہستہ چلتا رہا کہ جہاں تک ہوسکے راستہ دیر میں ختم ہو۔ آخرکار دونوں موڑ کے قریب پہنچ گئے۔ اور اب اُن کی اقتا تینوں لڑکیوں کے سامنے تھی۔ خشک زمین پر پہنچکر اُس نے ٹیس کو اُتار دیا +

تینوں سہیلیاں حسرت بھری اور رشک آمیز نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھیں اور ٹیس معلوم کرسکتی تھی کہ وہ اُس کا ہی ذکر کر رہی ہیں۔ کلیئر جلدی سے خدا حافظ کہہ کر چلا گیا +

چاروں سہیلیاں اب اکٹھی ہوکر سکوت کے عالم میں آگے بڑھیں۔ یہاں تک کہ مرین نے سلسلۂ گفتگو شروع کیا:

"نہیں بہن۔ سچ پوچھو تو ہم ٹیس کے مقابلہ میں کوئی موقعہ نہیں ہے"

"کیا معنی؟" ٹیس نے سوال کیا +

"تم اُن کو سب سے زیادہ مرغوب ہو۔ جب وہ تمہیں لا رہے تھے تو صاف ظاہر تھا۔ وہ تمہاری جبیں کو چوم لیتے اگر تم [illegible]"

"نہیں یہ بات نہیں ہے" +

وہ شادمانی جو روانگی کے وقت نمایاں تھی۔ اب کسیقدر غائب ہوچکی تھی۔ تاہم اُن کے درمیان کسی قسم کا حسد وغیرہ نہ تھا۔ اُن کے سینے نوخیز اور فراخ دلوں کے مسکن تھے۔ وہ دیہات کی اُن تنہا اور معصوم فضاؤں میں پلی تھیں جہاں تقدیر کے مسئلہ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اور نہ ہی وہ ٹیس کو قصوروار ٹھیراتی تھیں۔ چونکہ یہ اُس کی قسمت تھی اور کچھ نہیں + (ٹامس ہارڈی)

اختر انصاری۔ بی۔ اے

کانتی

(قدیم مصری تمدن کا ایک لاجواب افسانہ)

آج سے اڑھائی برس پہلے مصر میں آثار قدیمہ کی کھدائی شروع تھی۔ ہتھوڑوں اور بسولیوں کی آواز سے فضا گونج رہی تھی جنگل میں چلنے والے مسافر آواز آنے والی سمت ایک غلط انداز نگاہ ڈالتے اور پھر چلنے میں مشغول ہو جاتے۔ روز کے سننے والے پرندے دلچسپی سے ادھر اُدھر پرواز کرتے پھرتے تھے۔ کھدائی دریائے نیل کی بائیں جانب بڑے بڑے عظیم ٹیلوں میں ہو رہی تھی۔ مصری حکومت کا افسر اعلیٰ ایک مختصر سی کوٹھری جو کہ ٹیلوں سے کچھ فاصلہ پر نظر آ رہی تھی بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے میز پر بہت سے کاغذ بکھرے ہوئے تھے۔ جس پر روزانہ کھدائی اور مختلف چیزوں کی برآمدگی درج تھی۔ وادئی نیل کی بائیں جانب کا نقشہ اس کے ہاتھ میں تھا جس پر اس کی نظریں پیوست ہو چکی تھیں۔ وہ کبھی کبھی اپنے قلم سے نقشے سے ذرا اوپر خفیف سی کھلی لڑا رہا تھا۔ کوٹھری کے کھلے دروازے پر ایک چق آویزاں تھی۔ جس کی تیلیوں میں سے اُس کی مسرت ناک نگاہیں چھن چھن کر نکلتیں اور سامنے والی چھوٹی سی دیوار جو کہ ہزاروں مزدوروں پر مشتمل تھی پڑتیں اور اسی راستے سے واپس لوٹ کر پھر انہی کاغذات پر پیوست ہو جاتیں۔

افسر نے دو تین بار میز پر ہاتھ پٹکا جس کے جواب میں ایک پستہ قامت مصری ملازم حاضر ہوا۔ اُس نے میز نگاہیں اُٹھائے سہیل جمعدار کو بلانے کا حکم دیا۔ خادم کورنش بجا لایا اور رجعت قہقری کرتا ہوا باہر نکل گیا +

سہیل جمعدار بدوضع سا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ سیاہ رنگ کے مخروطی چہرے پر چند نیم سفید بال اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس کی ہیبت کذائی میں اضافہ کر رہی تھیں خاکی رنگ کا پتلون نما پاجامہ پہنے ہوئے تھا جس کے اوپر سے اُس نے جرسی پہن رکھی تھی۔ ایک مضبوط سی چھڑی ہاتھ میں لئے اِدھر اُدھر ہر ایک مزدور کو ڈانٹتا پھرتا تھا۔ وہ ایک درخت کے سائے کے نیچے کچھ دیر ستانے کے لئے ٹھیر گیا۔ اُس نے اپنی غبار آلود انگلی سے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ اور پھر جیب میں مستعمل سگریٹ نکال کر سلگایا۔ وہ کش پر کش لگا رہا تھا لیکن اُس کی حریص نگاہیں کثیف گرد میں سے نکل نکل کر مزدوروں کی اک اک حرکت پر پڑ رہی تھیں۔ اگر کوئی مزدور کہیں جھک کر کانٹا بھی نکالتا تو وہ دوڑا ہوا جاتا کہ شاید اُسے کوئی چیز ملی ہے +

سہیل جمعدار افسر کے کمرہ میں اندر داخل ہوا۔ اور فرشی سلام کرکے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ افسر نے نگاہ اُٹھا کر مشکوک انداز سے کہا:-

"سہیل آج پورے دو دن ہو گئے ہیں۔ لیکن کوئی نئی چیز برآمدگی کے کاغذات پر درج نظر نہیں آتی۔ میرے خیال میں تمہاری محافظ نظریں کسی کو کوئی چیز چھپانے کی

اجازت نہیں دیتی ہونگی"۔

تسمیں کی رگیں اپنی تعریف سنکر پھڑک اُٹھیں۔ وہ پھولا ہوا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو سمیٹے بغیر کہا۔

"جناب میں ہر بات میں احتیاط اور سختی سے کام لیتا ہوں۔ لیکن آج ایک مزدور نے غیر معمولی طور پر جرأت کرتے ہوئے چھوٹے سے بُت دینے میں انکار کیا۔ میں نے ڈانٹ ڈپٹ بتائی۔ پیار سے بھی کام لیا۔ لیکن وہ کسی طرح ڈھب پہ نہیں آیا۔ وہ بُت غالباً کسی عورت کا ہے جسمیں مصوّر نے اپنا پورا کمال دکھایا ہے"۔

افسر نے اُسے بلانے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک مزدور میلے کچیلے کپڑوں میں اندر داخل ہوا۔ اور معمولی سلام کرکے ایک طرف کھڑا ہوگیا۔ اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں طمانیت کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ وہ حسین تھا گرد آلودہ چہرے میں ایک دمک تھی جو دیکھنے والے کو بیتاب کئے دیتی تھی۔ آہو صفت آنکھوں میں خوف کی یک رمق بھی نظر نہ آتی تھی۔ وہ گاڑھے پسینے کی کمائی کھانے والا بھلا اُسے کیا ڈر ہوسکتا تھا۔ وہ منزل کے آخری دَور میں تھا۔ اس کا کوئی کیا بگاڑ سکتا تھا۔ خوشنا خیال اتفاقی طور پر پیدا ہونے کا احتمال ناممکن تھا۔ پھر اُسے مرعوب کرنے کے لئے شرربار نگاہوں سے دیکھا گیا۔ کہا:-

"تمہارا نام ـــ"

"پرما"

"کیا تم نے وہ مجسمہ جو تمہیں کھودتے وقت ملا تھا، سے انکار کیا؟"

"ہاں"

"کس گھمنڈ پر"

"دل کی دنیا ـــــــ اُسکی اتھاہ گہرائیاں"

افسر جس کے دماغ میں مزدوروں کی کم وقعتی اور بے بضاعتی کا خیال سمایا ہوا تھا۔ اس بے باکانہ جواب کو سُن کر اُسکا چہرہ غصّہ سے تمتما اُٹھا۔ اور بولا:-

"کیا تم نے مزدوروں کی صف میں داخل ہونے سے پہلے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ جو چیز بھی زمین سے دستیاب ہو اُس کے تم کسی صورت میں بھی مالک نہیں سمجھے جاؤ گے"۔

"احساسات اور قوت ارادی کے بدلنے میں صدیوں کی ضرورت نہیں ہوا کرتی۔ اس میں لمحہ بلمحہ تغیر ہوتا رہتا ہے۔ بے شک میں نے اپنی مرضی سے وعدہ کیا تھا اور اپنی مرضی سے ہی توڑ رہا ہوں"۔

"قانون تو ایک طرف تمہیں انسانیت کا بھی پاس نہیں"۔

"انسان مجموعۂ اضداد ہے۔ اس کے ضمیر اور بہیمی ہیجانات میں جنگ چھڑی رہتی ہے۔ کبھی ضمیر غالب آتا ہے اور کبھی انسانی ہیجانات حکمراں ہوتے ہیں۔ آپ چاہے کچھ سمجھیں لیکن تصویر میری ہے اور میری ہی رہیگی"۔

"کیا مجھے تصویر دکھا سکتے ہو"۔

پرما نے اپنی بائیں جانب سے ایک میلے کپڑے کا بنڈل سا نکالا۔ جوں جوں وہ تہوں کو کھول رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کی چمک زیادہ ہورہی تھی۔ چہرے کا رنگ اُڑ رہا تھا۔ کیفیاتِ قلبی کی داستان چہرے پر نمایاں تھی۔

اُس نے آہستہ سے وہ تصویر افسر کے ہاتھ میں دیدی۔ وہ ایک عورت کا چہرہ تھا جنسِ نازک میں ایک منتخب تصویر تھی یکسی نادر و مصوّر کا شاہکار معلوم ہوتا تھا تصویر کی جلد کی رنگت قدرتی معلوم ہوتی تھی۔ بڑی بڑی آنکھوں میں مایوسی ٹپک رہی تھی۔ تصویر بے جان تھی۔ لیکن زندگی کے رشحات اور جذبات نمایاں تھے۔ یہ ایک راز تھا اور تصویر اس راز کو افشا کرنے کی بے سود کوشش کر رہی تھی ———

افسر نے شکست خوردہ سپہ سالار کی طرح تصویر کو واپس کر دیا۔ اور کہا۔ کچھ عرصہ کے لئے تم اسے رکھو لیکن یہ زبردستی چھینی جائیگی۔ اور تمہیں اس راز کو افشا کرنا پڑیگا +

پترما نے سُنا اَن سُنا کر دیا۔ وہ تصویر کو لپیٹتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا۔ "یہ تصویر تو میری ہے اور میری ہی رہیگی" +

"اس وقت تم جاؤ۔ لیکن بہت عرصہ تک یہ مجسمہ تمہارے پاس نہیں رہیگا" +

"آپ کو مجھ سے دو چیزیں جبراً چھینی پڑینگی۔ ایک میری جان اور دوسری یہ تصویر اور غالباً پہلے جان" یہ الفاظ کہتا ہوا پترما باہر نکل گیا +

(۲)

آج شاہ مصر کے دربار میں خلافِ معمول اجتماع تھا۔ اس عجیب و غریب مقدمہ کی شہرت شہر میں ہو چکی تھی۔ بازار تو "جتنے منہ اُتنی باتیں" کا مصداق بنا ہوا تھا

"وہ بُت دینے سے کیوں انکار کرتا ہے؟"

"غالباً وہ کسی دیوی کا بُت ہوگا۔ اس لئے دینے سے انکار کیا!"

"شاید وہ خود بت تراش اور مصوّر ہو۔ اور ایسی تصویر کی تلاش میں ہو جو اُس کی پرستیدہ جذبات ہو سکے۔ اور اُس کی مصوّری کا آخری مطمح نظر ہو!"

"اگر اُس نے بُت کو حکومت کے حوالے نہ کیا۔ تو نتیجہ بُرا ہوگا" +

"ہاں بُرے بُت کی بھینٹ چڑھا دیا جائیگا" +

اکثر خوش فکر سے جوق در جوق دربار کی طرف بڑھے جا رہے تھے۔ اور اپنے اپنے قیاس کے مطابق خوب چہ میگوئیاں اور فیصلے کر رہے تھے +

سب سے پہلا مقدمہ یہی تھا۔ دربار میں تِل رکھنے کی جگہ نہ تھی۔ پترما پابجولاں دربار میں پیش کیا گیا۔ ہر ایک شخص کی آنکھیں اُس پہ لگی ہوئی تھیں۔ وزیر عدالت نے مجرم کو مخاطب کر کے کہا۔ "کیا تم نے افسر آثار قدیمہ کو ایک بُت جو تمہیں زمین کھودتے ہوئے ملا۔ دینے سے انکار کیا۔ پترما نے افسر جو اُس کے بائیں طرف بیٹھا تھا۔ مطمئن نظروں سے دیکھا اور کہا "ہاں!"

"کیا تم نے اس فرصت کے لمحوں میں اسکی پاداش کو سوچا ہے؟ کیا تم اب بھی اس بت کے دینے میں انکار کرتے ہو؟"

"پاداش کا خیال عبث ہے۔ میں صرف بُت کے دینے ہی سے انکار نہیں کرتا۔ بلکہ اب میں اُس کی ایک جھلک دکھانا بھی گوارا نہیں کرونگا" +

وزیر عدالت نے کچھ لکھنا چاہا۔ لیکن کچھ لمحوں کیلئے اُس کا ہاتھ رُک گیا۔ دربار میں سناٹا چھا گیا۔ ہر ایک آنکھ

کھلی کی کھلی رہ گئی۔ ہر ایک سانس فیصلہ سننے کے اشتیاق میں خاموش ہو گیا ٭

وزیر عدالت نے اُٹھ کر پیرا کو غداری کے جرم میں بڑے بُت کی بھینٹ چڑھائے جانے کا حکم سنا دیا مجمع میں ایک خفیف سی حرکت ہوئی۔ اور لوگ مجرم کی طرف دیکھے بغیر آہستہ آہستہ باہر نکلنے شروع ہو گئے ٭

قربانی کی تاریخ اگلے مہینہ کی پندرہ مقرر ہوئی۔ ایسے مجرموں کے واسطے حکومت نے ایک علیحدہ زنداں تیار کروایا تھا۔ جس میں پرندہ بھی پر نہ مار سکتا تھا۔ اور دربانوں کی آنکھیں مجرم کی ہر ایک حرکت کو گھورتی رہتی تھیں پیرا بھی اُسی جیل میں پچیس دن کے لئے داخل کر دیا گیا پیرا کے لئے یہ گھڑیاں نہایت کٹھن تھیں۔ وہ اس وقت کا اندازہ لگانا نہیں چاہتا تھا۔ کبھی وہ موت اور زندگی کے درمیانی وقفہ کو پچیس برس تصور کرتا اور کبھی پچیس لمحے۔ موت کا خیال اُسے پریشان کر رہا تھا۔ اُسے یہی فکر کہ یہ حسین بُت کہیں غیر محرم ہاتھ میں نہ پڑ جائے کھائے جا رہی تھی۔ اس کا اکثر وقت دیوار پر ٹکٹکی باندھے گزرتا۔ اس کی نگاہوں نے زنداں کی دیواروں پر اپنی گزشتہ زندگی کے واقعات حرف بحرف لکھ دیئے وہ کبھی ہنستا کبھی روتا۔ لیکن وہ دیوانہ نہ تھا۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا لیکن وہ مخبوط الحواس نہ تھا ٭

اس زنداں کے مجرموں کی خدمت کے لئے نقاب پوش عورتیں مقرر کی جاتی تھیں۔ جو نہایت احتیاط سے ان کی نگہداشت کرتیں۔ مثلاً ان کو خودکشی سے باز رکھنا نفیس کھانا کھلانا۔ زیادہ غمگین نہ ہونے دینا اور

دراصل یہ سب باتیں بڑے بُت کی خاطر ہوتیں ٭

پیرا کی پچیس روزہ زندگی کے چوبیس دن گزر گئے آج آخری دن تھا وہ بے تاب تھا۔ اس نے اس حسین مجسمہ کو سینہ سے لگا لیا۔ اسے ابتک یقین نہ آتا تھا کہ یہ مجھ سے جدا ہو جائیگا ٭

آہ انسانی فطرت! کچھ عرصہ کے لئے دوست ہمارے پاس ٹھہرتا ہے اور ہماری حیات کے اکثر لمحے اسی خیال میں گزرتے ہیں کہ وہ ہم سے کبھی بھی جدا نہ ہوگا لیکن جب جُدائی کی گھڑی کی خبر سنائی جاتی ہے تو گویا اُسے کسی نئی اور اَن ہونی خبر کی اطلاع دی گئی۔ اس وقت اسے اپنی دھوکا دینے والی فطرت کا احساس ہوتا ہے۔ اور بے قابو ہو کر حسرتوں کا خون کرتا ہے ——

"آہ! صرف ایک رات باقی —— غلط بالکل غلط۔ مجھے تو اسکا خیال بھی نہ تھا —— ہرگز نہیں ہو سکتا —— ہم دونوں اکٹھے رہینگے —— زندگی اسی کا نام ہے —— آہ موت کے بعد زندگی ——"

پیرا کے یہ مجذوبانہ فقرے زنداں کی دیواریں جذب کر رہی تھیں ٭

آج خدمتگار عورت پیرا کے پاس نہیں آئی۔ لیکن پیرا کے دماغ سے وہ اُتری ہوئی تھی۔ اس نے اس کی طرف کبھی توجہ نہیں دی تھی لیکن کئی بار اس نے دیکھا تھا کہ اُس کے قدم کوٹھری سے نکلتے وقت لڑکھڑا جاتے تھے پیرا کو اس کے سوچنے کی فرصت نہ تھی۔ وہ اپنے خیالات میں مگن تھا ٭

حسبِ معمول آفتاب غروب ہوا۔ رات چھا گئی لیکن آج کی رات اور دوسری راتوں میں فرق تھا۔ زندگی اور موت کا فرق ——— پترما اُس تپ رعنا کو چستے چستے بیہوش ہوگیا۔

نقاب پوش رات کے وقت داخل ہوئی وہ بُت لے کر رفوچکر ہوگئی۔ اور ساتھ ہی بائیں بازو پر چاقو سے ایک زخم لگاتی گئی۔ سپیدۂ سحر سے پترما کو موت کی سیاہی دکھائی وہ حزن و ملال کی حد سے گزر چکا تھا۔ وہ یہ معلوم کرکے کہ وہ بُت اُس کے سینہ پر نہیں ذرا بھی نہ گھبرایا۔ گویا وہ چیز اسکے پاس تھی ہی نہیں ———

جلاد کشاں کشاں اُسے قربانگاہ کی طرف لے چلے وہ سر جھکائے بغیر کسی مانعانہ کوشش کے ساتھ ساتھ چلا آرہا تھا۔ چہرے پر اطمینان برس رہا تھا۔ وہ یک لخت چونک اُٹھا۔ گویا کوئی چیز بھول آیا ہے۔ لیکن پھر فوراً ہی سنبھل گیا۔ گمشدہ چیز کے ملنے کی طرح پھر اسے تسلی ہوگئی۔ اب اس کا ذکر کرنا فضول تھا۔ وہ چیخ و پکار کیوں کرتا؟ وہ اپنی بے گناہی کا ثبوت دے کر اپنے نفس کو دھوکا کیوں دیتا۔ مندر کے بڑے کمرے میں وہ داخل ہوا۔ تمام لوگوں نے بڑے بُت کی تعریف میں جے کے نعرے بلند کئے۔ بُت کے سامنے دورویہ پجاری لمبے لمبے سیاہ چغے پہنے کھڑے تھے۔ منتروں کے کاغذات ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔ ناظرین فیصلہ سُن کر غمگین ہوگئے تھے۔ لیکن آج اکثر بشاش تھے پترما کی ہر ایک حرکت کو بنظرِ غور دیکھ رہے تھے۔ پترما نے پہلی دفعہ کمرہ میں نگاہ اُٹھائی اور سامنے وزیر عدالت پر پڑی۔ وزیر عدالت پر اک خوف ساطاری ہوگیا۔ گویا کوئی شخص بوجھ ڈال رہا ہے۔ وہ سانس روک روک کر اس خوف سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اُسے یہی خیال کہ پترما شاید مجرم نہ ہو۔ گھلا جا رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے متعصب دماغ کو قانون کی شعاع دکھاتا تو اُسے صاف مجرم پاتا۔ لیکن اُس کے دل میں وہی چور سا بیٹھا ہوا تھا جو اُس کے جی کو بھاری کر رہا تھا۔

پجاریوں نے سنکھ اور سنگھ پھونکنے شروع کر دیئے۔ نقارے پر چوٹ پڑی۔ پھول کی ٹوکریاں پترما پر نچھاور کی گئیں اور دو جلاد تیز چھریاں ہاتھوں میں لئے آموجود ہوئے۔ پترما کی سکوں ریز نگاہیں ایک دفعہ پھر تمام کمرہ کی اشیاء کا جائزہ لے گئیں اور وہ آہستہ سے بُت کے چرنوں میں لیٹ گیا۔ بڑے پجاری نے زعفران اور مشک سلگا دیا۔ اور جلادوں کو اپنا کام کرنے کا حکم دیا۔

قبل اس کے کہ جلادوں کی چھریاں پترما کا گلا کاٹ کر رکھ دیں۔ بڑے پجاری نے سیاہ ہاتھ بلند کیا اور کہا۔ "ٹھیرو ابھی نہیں۔ اگر پترما کے بدن پر کسی نئے زخم کا نشان ہے تو وہ کسی صورت میں بھی قربانی کے لئے جائز نہیں ہوسکتا"۔

زخم کا نشان ڈھونڈا گیا۔ اور اُس کی رہائی کا حکم برسرِ اجلاس سنا دیا گیا۔ پترما نے اطمینان کی سانس لی۔ اور اُس مچھلی کی طرح جو ماہی گیر کے پنجے سے نکل کر پھر پانی میں چلی گئی ہو۔ وہ بحرِ حیات میں ڈوبتا ہوا بے تحاشا دربار سے باہر کو بھاگ نکلا۔ ایک برقی طاقت اُسے بھگائے لئے جارہی تھی۔ وہ موت سے ہراساں نہ تھا۔ اس مجسمہ کی جدائی کا خیال اُس کے قصرِ حیات کو مسمار کرنے کے لئے کافی تھا۔

وہ انسانوں سے دور بھاگ جانا چاہتا تھا۔ وہ ہر ایک درو دیوار کو بیگانہ سمجھتا تھا۔ وہ اپنی ہیچ ترین ہستی کو کہیں دور سڑے ہوئے گوشت کی مانند پھینک آنا چاہتا تھا۔ اُس کی رفتار میں ابھی جنبش کی نہ ہوئی تھی کہ ایک نازک مگر مضبوط ہاتھ نے دوڑ کر اُسے پکڑ لیا۔ وہی نقاب پوش عورت جو پرتاب کی خدمت کے لئے مامور تھی اُس کے تعاقب میں تھی۔ اُس نے پرتاب کو اپنے گھر چلنے کی دعوت دی۔ پرتاب کے سر پر گویا کسی نے لاکھوں من کا بوجھ رکھ دیا۔ ندی کے چلتے ہوئے دھارے کو یک لخت روک دیا گیا۔ وہ دل کو مسوس رہا تھا۔ لیکن اُسے نجات کا طریق سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اس سوچ بچار میں بیچارگی کا پردہ تھوڑا سا سرک گیا۔ اسے اس عورت کی مشفقانہ خدمت یاد آ گئی۔ اور اُس کے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گیا وہ تنگ گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک مختصر سے مکان میں داخل ہوئے +

"کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ آج رہائی پانے کے باوجود اس طرح کیوں بھاگے جا رہے ہیں؟ گویا نوع انسان سے متنفر ہیں"۔

"میں اپنے سے متنفر ہوں۔ بندوں سے روٹھ گیا ہوں مجھے تمام کائنات بیگانہ معلوم ہوتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ قدرت کا اٹل قانون مجھے گود میں لے کر منائیگا۔ اگر آپ نہ روکتیں تو اس وقت تک ——"

"بندوں سے روٹھ جانا جوانمردی نہیں۔ موت کی تلاش کرنا اپنے آپ کو جہنم میں دھکیلنا ہے۔ کیا آپ مجھ پر اس مجسمہ کا راز افشا کر سکتے ہیں۔ کیا میرا ذرہ میری طاقت میری جان آپ کے اس غم کے ازالہ میں کام آسکتی ہے۔ میں اپنی خدمت کا عوض نہیں مانگتی بلکہ محرم راز ہو کر بار منت سے ہمیشہ ممنون رہنا چاہتی ہوں +

"ہاں! میں ضرور بتا دونگا" یہ کہہ کر اُس نے گریبان میں ہاتھ ڈال کر اپنی غیر متحرک معبودہ حیات کو باہر نکالا۔ اور پُرنم آنکھوں سے گویا ہوا۔ "میں ضرور بتا دونگا میں جان سے زیادہ عزیز راز کو آپ کی غیر معمولی خدمت اور محبت کے صلہ میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں مرنے سے پہلے اپنے سینے کی امانت آپکے حوالہ کر دونگا۔ اور پھر اس راز کو میرے ہونٹ کبھی نہیں دُہرائینگے۔ اگر آپ میرے بعد اس راز کو افشا بھی کر دیں تو میری روح ہرگز انتقام کے لئے بیقرار نہ ہوگی —— میں ضرور جو کچھ میرے دل میں ہے کہہ دونگا +

"عرصہ ہوا میں اور سشیل ہندوستان کے شمالی حصہ میں رہا کرتے تھے۔ ہماری دوستی کی ابتدا تعلیمی درسگاہ سے شروع ہوئی اور ہم یک جان دو قالب کا مصداق ہو گئے۔ بیشک وہ حسین تھا۔ چاندنی رات میں پہروں "کشتی کھینے" کا سماں اور اُس کے سنہری بالوں کا چمکنا مجھے ابتک یاد ہے آہ! اُس کی بڑی بڑی آنکھیں جن کو میں مئے اُلفت سے لبریز سمجھتا تھا بعد میں زہر ہلاہل ثابت ہوئیں۔ اکثر اوقات اُس نے مجھے سفر زندگی کے ساتھ دینے کا اپنی لفاظی سے ازحد یقین دلا دیا۔ زمانے کی دلفریبیوں اور دلچسپیوں کو اُس نے کئی بار "بے حقیقت" چیزیں کہا۔ جس سے اکثر لوگ متاثر ہو کر اپنے جہاں نثار دوستوں سے گریزاں ہو جاتے ہیں لیکن آہ وہ سب کچھ بھول گیا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں کی حقیقت

مجھ پر ظاہر ہو گئی۔ اُس نے میری کتاب زندگی کا شیرازہ بکھیر دیا۔ وہ سنہری ورق اُس کے ہاتھوں سے پرزہ پرزہ ہو گئے۔ اُس نے میری خوشی کو پامال کر دیا +

"وہ تعلیمی زندگی کا آخری سال تھا۔ مجھے کانتی۔ آہ حسین کانتی ——"

"آپ خاموش کیوں ہو گئے۔ ازراہ عنایت میرے شوق کو طول نہ دیجئے"

"ہاں! مجھے کانتی سے آنکھیں چار ہونے کا اتفاق ہوا۔ وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی تھی لیکن حسین اسقدر تھی گویا آسمان سے چاند اُتر آیا تھا۔ وہ صنفِ نازک کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھی۔ تھوڑے ہی دنوں میں اپنے میں ایک روحانیت محسوس کرنے لگا۔ اُس کو دیکھتا تو روح جاگ اُٹھتی۔ محبت کی کاوش بھی شروع ہو گئی۔ راتیں آنکھوں میں گزر جاتیں اور کانتی کا دھیان ہر وقت بیقرار کرتا۔ ایک دن کانتی پھول چڑھا کر مندر سے واپس آ رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر آسمانہ رنگ ٹپکتا تھا۔ آہ میں مندر کی طرف جانا بھول گیا۔ وہ دیوی تھی جس کے قدموں پر میں دل بھینٹ کر چکا تھا۔ میں نے کانتی سے سب کچھ کہہ دیا۔ لیکن کہنے کے بعد یہ معلوم ہوا گویا کچھ بھی نہیں کہا —— میں نے اس ملاقات کا ذکر سوشیل سے بھی کیا۔ اُس کے دل میں حسد کی آگ بھڑک اُٹھی جسکو میں اُس وقت نہ سمجھا۔ تعصب نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ اب میں اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو حقیقت کو بے نقاب پاتا ہوں۔ مجھے اس صحبت کے دنوں میں معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے خفیہ کانتی کے لئے کوشش کر رہا ہے۔ اُس نے کئی دفعہ مجھے کانتی کے ہاں جانے سے بہانے بنا کر روک لیا۔ لیکن یہ چیزیں ہماری محبت کو نہ روک سکیں۔ دن بدن مجھے کانتی کی محبت بڑھتی گئی اور اس کی تصویر میرے دل میں گھر کر گئی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ صرف میں ہی نہ تھا۔ بلکہ کانتی کی محبت جیتنے کے لئے دو قمار باز بساط بچھائے بیٹھے تھے۔ سچی محبت کی فتح ہوئی۔ بازی میرے ہاتھ میں رہی۔ سوشیل کے متعلق اب بھی میرے دل میں ذرہ بھر کھٹکا پیدا نہ ہوئی۔ بلکہ اُس نے اپنی چرب زبانی سے مجھ پر یہ ثابت کیا کہ اس محبت کی فتح کا باعث میں ہی ہوں +

"میری کانتی سے شادی ہو گئی۔ اس عرصہ میں بھی سوشیل میرے پاس آیا جایا کرتا تھا۔ آہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اب میرے لئے نہیں آتا تھا۔ بلکہ کانتی کیلئے میں نے کانتی سے اُس کا تعارف بھی کرا دیا تھا۔ اور اُسکے پس پشت کانتی کے سامنے اُس کی بہت تعریف کی +

ایک دن راز کا انکشاف ہوا۔ میں اور سوشیل بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کانتی بھی اندر آ گئی۔ اُس وقت میرے سامنے راماین کا قلمی نسخہ رکھا تھا۔ میں اُٹھا کر پڑھنے لگا۔ اور راون کا سیتا کو ہرنے جانے والے باب میں مستغرق ہو گیا۔ میں نے اچانک آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو سوشیل کو کانتی کے ساتھ آنکھوں میں باتیں کرتے پایا۔ میں نے حقیقت کو پوری طرح بے نقاب کرنے کی خاطر دیکھا ان دیکھا کر دیا۔ سوشیل کو اور جرأت ہو گئی۔ میں عمداً سوشیل کی آمد کے مقررہ وقت سے چند منٹ پہلے باہر نکل جاتا اور اُس کو کانتی کے ساتھ اکیلے بیٹھنے کا موقع دیتا۔ ایک دن میں نے سوشیل سے کہا کہ میں تین چار دن کے لئے باہر جا رہا ہوں۔ کانتی اکیلی

ہو گئی۔ کبھی کبھی اس کے پاس ہو آتا۔ اُس کا چہرہ بشاش
ہو گیا۔ وہ مجھے گاؤدی اور احمق سمجھتا تھا۔ میں بھی اُس کے
سامنے گاؤدی بنا چاہتا تھا۔ میں مصافحہ کر کے چلا گیا۔
دراصل مجھے کہیں بھی جانا نہ تھا۔ میں صبح کانتی اور سوشیل
سے رخصت ہو کر گلیوں کی نظروں سے چھپ رہا۔ اور اُسی
دن گہری شام کے وقت واپس لوٹا۔ میں دبے پاؤں اپنے
مکان کی پچھلی کھڑکی کی طرف گیا۔ اور ایڑیوں کے بل کھڑے
ہو کر میں نے دیکھا۔ کہ سوشیل کانتی کے ساتھ بغلگیر ہونے
کی بے سود کوشش کر رہا ہے۔ لیکن میں اُس وقت
غصہ سے اندھا ہو رہا تھا۔ مجھے یہی نظر آیا کہ وہ دونوں
بغلگیر ہو رہے ہیں۔ میں نے کمر سے خنجر بے نیام کیا۔ آہ
غصہ کی ابتدا جنون ہے۔ میں فوراً کھڑکی کی راہ سے اندر
کودا۔ دونوں کے سینے میں خنجر گھونپ کر وہاں سے فرار
ہو گیا۔ اور اس جگہ پہنچکر اپنے آپ کو مٹانے کے لئے ان
مزدوروں میں شامل ہو گیا۔ کانتی کا داغ بھلا میرے دل
سے کیسے مٹ سکتا تھا۔ سوشیل کی طرف سے مجھے تسلی ہو گئی
تھی۔ اگر انتقام کا موت سے بدتر بھی ذریعہ ہوتا تو میں اُس
پر استعمال کرتا۔ اُس کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے میرے
خنجر نے خوب کام کیا تھا۔

"آہ! کانتی بے قصور تھی۔ میں گھنٹوں اس واقعہ کو
یاد کرتا۔ دماغ لڑاتا۔ ضمیر کانتی کی صفائی میں پیش ہو جاتا۔
لیکن آنکھیں وہ مشاہدہ پیش کرتیں۔ دن بدن میری بیقراری
بڑھتی گئی۔ آنکھوں کی نظار گئے فریب ظاہر ہو گئے۔ کانتی
کی وفاداری میرے دل پر نقش ہو گئی۔ میں روتا تھا سر
دُھنتا تھا۔ لیکن وقت گزر چکا تھا۔ ایک دن مجھے کھودتے
کھودتے یہ بت مل گیا۔ قدرت نے دل بہلانے کے لئے
سامان مہیا کیا۔ تعصب کہئے یا کچھ اور۔ اس بت میں مجھے
کانتی ہی نظر آنے لگی۔ وہی بڑی بڑی آنکھیں۔ وہی پتلی
سی ناک۔ وہی معجز بیان لب۔ میں نے مجسمہ کو سینے سے
لگا لیا۔ اور اس کو حکومت کے ناپاک ہاتھوں میں دینے
پر میرا دل رضامند نہ ہوا۔ یہ تھا راز جو میں آپ کے سپرد کرتا
ہوں۔ اب مجھ قاتل اور خونی کو اپنے مکان پر بہت دیر نہ
رکھیں۔ مجھے دور بھاگ جانے دو۔ وہ دیکھو کانتی اپنے
ہزار ہا ہاتھوں میں خنجر لئے ہوئے انتقام کے واسطے آسمان
سے جھانک رہی ہے۔ نہیں میں اپنے آپ کو خود سزا
دونگا۔ مجھے نیل کی تہہ میں مچھلیوں کی خوراک بننے دو۔

نقاب پوش عورت۔ (نقاب اُٹھا کر) ٹھہریئے! کانتی
تا عمر وفاداری کا ثبوت دیگی۔ وہ ہرگز انتقام کیلئے بیقرار
نہیں ہے۔ وہ اپنی محبت کا ثبوت لیکر آپ کے سامنے موجود
ہے۔

پرما۔ کانتی!

کانتی۔ خدا کا شکر ہے کہ میں اپنی محبت اور عصمت کو ثابت
کرنے کے لئے اُس زخم سے بچ رہی لیکن آپ کے زندگی
وبالِ جان تھی۔ پتہ لگاتی ہوئی یہاں پہنچ گئی۔

پرما (کانتی کو گلے لگا کر) کیا میں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟
کیا کانتی کی روح انتقام کے لئے تو نہیں آ گئی؟

کانتی۔ (ہنسکر) نہیں۔ آپ بیداری کی حالت میں ہیں۔
لیکن میں نے قہوہ خانہ میں آپ کے بازو پر چاقو کا نشان
لگا کر انتقام لے لیا تھا۔

خلیل (منگری)

"کمرۂ خودکشی"

(ایک دلچسپ افسانہ)

لندن اور پیرس میں نہایت پُراسرار طریقہ پر قتل کی جو مسلسل وارداتیں ۱۹۰۲ء میں ہوئیں۔ اُن سے اب بھی بہت سے حضرات واقف ہونگے۔ ان تابڑتوڑ وارداتوں نے ثابت کر دیا تھا کہ یہ ایک نہایت خوفناک اور مجرمانہ سازش کا نتیجہ ہیں۔ جس کا سرغنہ "ہنوی شان" ایک مشرقی باشندہ تھا۔ جس کو بعد میں کمڑی کا لقب دیا گیا۔ ہنوی شان ایک خوبصورت۔ قدآور اور قوی ہیکل رحمدل اور نیک کردار نوجوان تھا۔ ملک چین کے صوبہ ٹونکن کی عنانِ حکومت اُس کے ہاتھ میں تھی +

ایک دن سدھے ہوئے ہاتھیوں کی مدد سے وہ جنگلی ہاتھیوں کو پکڑنے گیا تھا۔ کہ یکایک ایک جنگلی ہاتھی نے اُس کے ہاتھی پر حملہ کرکے اُسے ہودے سے نیچے گرا دیا۔ اور قبل اس کے کہ کوئی اُس کی امداد کو پہنچے مست ہاتھی نے اُسے سونڈ میں اُٹھا لیا۔ اور خوب چکر دے کر انتہائی غصّہ سے ایک درخت پر دے مارا۔ اس حادثہ کے بعد پھر کبھی وہ اپنی اصلی حالت پر عود نہ کرسکا۔ عرصہ تک ایک فرانسیسی ہسپتال میں زیر علاج رہا۔ لیکن ماہر اطبّا نے اپنی انتہائی کوششوں کے باوجود صرف اُس کی زیست کی موہوم سی اُمید ظاہر کی۔ کچھ عرصہ بعد وہ ہسپتال سے نکلا۔ مگر ہنوی شان اب وہ پہلا ہنوی شان نہ تھا۔ کیونکہ نہایت کریہ المنظر۔ لاغر۔ کوزہ پشت اور چھوٹی ٹانگوں والے ایک بھوت کی ہمشکل تھا۔ اُس کی اگلی نیک نہاد اور ہر دلعزیز طبیعت بھی نہ رہی تھی۔ ہونٹوں پر ہر وقت ایک شیطانی مسکراہٹ چھائی رہتی۔ علیٰ ہذا القیاس ہستیوں سے اُس کی بیرحمی اور سنگدلی بھی ضرب المثل ہوگئی تھی۔ اُس کے مظالم یہانتک بڑھے کہ ملک میں بدامنی پھیل گئی۔ گورنمنٹ نے اُس کو صوبیداری (گورنری)، سے معزول کرکے ساری املاک ضبط کرلی مکان تک سپردِ آتش کرا دیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ ایک خوفناک جماعت نے اُس کا پیچھا بہت بُری طرح شروع کیا۔ ہنوی شان آخر مجبور ہوگیا۔ اور ایک گن بوٹ پر سوار ہو پیرس پہنچا یہاں اُسے کسی ایسے ڈاکٹر کے ملنے کی قوی اُمید تھی جو اُسکی کبڑی کمر کو سیدھا کر دے۔ اور جو نقائص صورت شکل اور دماغ میں پیدا ہو گئے ہیں۔ اُن کا دفعیہ بھی بآسانی ہو جائے لیکن یہ خیال خیال ہی رہا۔ وہاں کسی ڈاکٹر نے عمل جرّاحی کرنے کا ذمہ نہ لیا۔ چنانچہ ہنوی شان جنون سر پر سوار لئے دشمنی اور انتقام کی آگ کو دبائے صرف اس لئے روپوش ہوگیا کہ ایک نہایت جابر اور خوفناک جرائم پیشہ جماعت کا سرغنہ بنکر کر رہا ہو۔ اُس کے جرائم میں عجیب وغریب جدّت تھی۔ اُس کا ہر جرم ایک دیوانے کی سی وحشت۔ مکاری۔ اور مشرقی علم ودانش کا مجموعہ ہوتا تھا +

ہنوی شان ٹونکن چائنا میں پوشیدہ باتوں کے بتانے

علم سفلی کے چلانے اور ہپناٹزم میں پہلے ہی اُستاد مانا جاتا
تھا۔ اِس کا لقب کڑی بھی خالی از علت نہ تھا۔ کیونکہ وہ
کڑی ہی کی طرح اپنی مکاری کے جال پھیلاتا۔ اور مکڑی
ہی کے سے صبر و استقلال سے چھپ کر خاموشی سے
اپنے شکار کو پھانسنے کی تدابیر کرتا تھا۔ جس طرح اُس کے
لمبے ہاتھ اور گاؤدم بازو مکڑی کے پنجوں کی طرح کام
کرتے وقت ہلتے تھے۔ مُنہ بھی لرزتا اور تھرتھراتا تھا۔
یوں تو اس کا ہر جرم عجیب و غریب اور دل ہلا دینے والا
تھا۔ مگر ایمسٹرڈیم ہوٹل میں جو قتل کی مسلسل وارداتیں ہوئیں
اُن سے زیادہ خوفناک شاید ہی کوئی ہو۔ کیونکہ ان کا ارتکاب
صرف بغرض حصول زر نہ تھا۔ بلکہ اُس کے دلی شغف ظلم
کا نتیجہ تھیں ٭

ہنوی شان کو جواہرات سے دلی محبت تھی لیکن
یہ ہے اُس نے اس ہوٹل کو اپنا میدانِ عمل اسی لئے
بنایا ہو کہ اکثر جوہری یہاں ٹھیرا کرتے تھے ٭

(۲)

ریولیونڈ میں ایمسٹرڈیم ہوٹل اٹھارہویں صدی کے
ایک مختصر مکان میں تھا جس سے سارے سوداگر خوب واقف
تھے۔ اور اُس کے قدیم زمانے کے . . . .
گر خاموش اور آرام دہ کمروں کو شہر کے دوسرے ہوٹلوں
کے چمکدار اور با رونق کمروں پر ترجیح دیتے تھے۔ انٹورپ
اور ایمسٹرڈیم کے جوہری اس ہوٹل میں زیادہ تر یوں بھی
ٹھیرتے تھے کہ اس کا مالک ایک ڈچ نوجوان مسٹر
وانڈر ویلڈ بھی پہلے جوہری تھا۔ اس کی بیوی میڈم
کلسٹن ایک خوبصورت خوش طبع فرنچ عورت تھی جو کئی
برس تک اس ہوٹل کی صد باورچن بھی رہ چکی تھی۔ جب
ہوٹل کے مالک کا انتقال ہوا تو اُس نے ایک معقول رقم
صد باورچن کے لئے چھوڑی جس کو میڈم کلسٹن نے اس
ہوٹل کے کاروبار کی خرید میں صرف کیا۔ ہوٹل خریدنے
کے کچھ عرصہ بعد اُس نے وانڈر ویلڈ سے شادی کر لی۔ جو
فرانس اور انٹورپ میں جواہرات کی تجارت کرتا تھا۔ وہ سفر
سے جب واپس ہوتا۔ اسی ہوٹل میں ٹھہرتا۔ شادی کے
بعد اُس نے اپنا کاروبار بند کر دیا اور نہایت کاہلانہ زندگی
بسر کرنے لگا۔ بیوی پر ہوٹل کے کل کام کاج کا دارومدار
تھا۔ اس لئے خود کالے سگار اور شیڈام (شراب کی قسم)
نہایت بے فکری سے دن رات پیا کرتا۔ باوجود شوہر
کی بے التفاتی و کوتاہ نظری کے ہوٹل کا کام نہایت
خوش اسلوبی سے چل رہا تھا ٭

انہی دنوں جنوبی افریقہ سے ایک انگریز بہت سے
ترشے اور بلا ترشے ہیرے اپنی جیبوں میں بھر کر لایا
تھا (تاکہ معمولی شیشہ کے ٹکڑے معلوم ہوں) اور اس ہوٹل
کے کمرہ نمبر ۱۴ میں ٹھیرا۔ یہ کمرہ ہوٹل کی تیسری منزل پر تھا
ایک خوبصورت کمرہ خوابگاہ جس میں سڑک کی طرف دو کھڑکیاں
بھی کھلتی تھیں اس سے متعلق تھا۔ مسٹر کلورٹ (نووارد)
بدھ کے دن یہاں آیا تھا۔ اُسے فرنچ زبان بولنی نہ آتی تھی
اس لئے کئی دن تک مسٹر وانڈر ویلڈ سے ڈچ زبان میں
گفتگو کرتا اور سگار پر سگار دھنکتا رہا۔ کئی دفعہ اپنے جواہرات
کے ذخیرہ کو اُس نے میز کے سامنے پھیلا کر نہ صرف اُس کی
آنکھوں کو خیرہ کیا بلکہ اُس کی کم گویائی پر بھی اس کا بُرا اثر پڑا۔
جمعہ کی رات کو مسٹر کلورٹ جلد ہی تفریح سے واپس

آگیا تھا۔ کوئی اور مہمان اُن دنوں ہوٹل کی تیسری منزل
پر فروکش نہ تھا۔ ہفتہ کی صبح کو جب ہوٹل کا ملازم حسب معمول
کافی لے کر کمرہ نمبر ۱۴ پر پہنچا تو اندر سے کمرہ بند پایا۔ بہت
سی آوازیں دیں۔ کواڑ پیٹے۔ مگر نہ کمرہ کھلنا تھا نہ کھلا۔ اُس
نے اپنی مالکہ کو اطلاع کی۔ جو گھبرا گئی۔ اوپر جاکر دیکھا تو کمرے
کے قفل میں کنجی اندر کی طرف لگی ہوئی ہے۔ اُس نے اپنے
بالوں کے کانٹے سے اُسے نیچے گرادیا۔ اور اُم الکلید
لگا کر کمرہ کھولا۔ جونہی اندر نظر پڑی ایک خوفناک چیخ اُس
کے منہ سے نکلی۔ اُلٹے پیروں نیچے اُتر کر اُس نے پولیس
کو ٹیلیفون کردیا۔ اتفاق سے تھانہ قریب ہی تھا۔ پولیس
کمشنر مسٹر ہیوبرٹ فوراً ہی آپہنچا۔ میڈم لرزتی اور کانپتی
اُسے اوپر لے گئی۔ اور کمرہ کھولا۔ مگر اُس کے منہ سے
"وہ مرگیا" "وہ مرگیا" کے اور کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ وہ بھی
وہ انگریز دیوار میں لگے ہوئے قدیم آہنی قلابے میں لٹکا
ہوا تھا۔ جس میں پردے لگانے کا ڈنڈا لگاتے۔ اور جس
رسی میں لٹکا ہوا تھا۔ وہ بھی پردے کھینچنے کی تھی نعش
کا منہ نیلا اور سوجھا ہوا تھا۔ گو آنکھیں اُبلی پڑی تھیں۔ مگر
نگاہ مقابل کی دیوار پر نہایت وحشتناک طریقہ سے جمی ہوئی
تھی۔ چہرے سے یہ بھی پتہ چلتا تھا جیسے کوئی کسی اچانک
دہشت سے دفعتاً جاں بحق ہوا ہو۔ اس خوفناک منظر کو دیکھ
کر سنگدل پولیس کمشنر بھی کانپ گیا۔ اور فوراً اپنا منہ پھیر لیا
نعش کے معائنہ سے صاف پتہ چلتا تھا کہ خودکشی کی گئی ہے
اور یہ خیال یوں بھی قابل تسلیم تھا کہ نعش کی ٹانگیں اونچی
تھیں جیسے کسی نے عمداً آڑ میں پیر نہ ٹیکنے کے لئے
موڑلی ہوں۔ قلابہ نیچا۔ اور رسی کافی لمبی تھی۔ اگر وہ دم
گھٹنے سے بچنا چاہتا تو زمین پر پیر ٹیک دینے ہی کافی تھے
پولیس کے ایک سپاہی نے جو کمشنر کے ساتھ آیا تھا کہا کہ
یہ تو سمجھدار شخص تھا۔ کوئی اس کی جگہ مجھ جیسا بیوقوف بھی
ہوتا اور اس طرح گلا گھٹنے لگتا تو وہ قطعی پیر زمین پر ٹیک دیتا
کمشنر نے ڈاکٹر کو بھی بلوالیا تھا۔ اُس کی رائے بھی واقعات
کے مدنظر سوائے خودکشی اور کچھ نہ ہوسکی۔ مقتول کی جیبوں
اور صندوق سے تلاشی میں کوئی ہیرا یا قیمتی پتھر برآمد نہ ہوا۔

(۳)

دو ہفتہ بعد اس غمناک حادثہ کو تقریباً سب بھول بھال
گئے تھے کہ ایڈمکلسٹن کا ایک فرانسیسی دوست مقتول انگریز
کی طرح آیا۔ اُس کی آمد سے پہلے ایک اور مسافر جس کے
ساتھ بہت سے بیش بہا جواہرات تھے کمرہ نمبر ۱۴ میں
دو دن سے مقیم تھا۔ جمعہ کی صبح کو اُس کے ایک دوست
نے اُسے خودکشی کا واقعہ سناکر مجبور کیا کہ وہ فوراً کمرہ بدل
دے۔ اُن دنوں ہوٹل کے سارے کمرے بھرے ہوئے
تھے۔ اس لئے میڈم نے، یہ دوست مسٹر وانڈ ایگن کے
کمرے میں اُسے منتقل کردیا۔ یہ کمرہ ہوٹل کی دوسری منزل
پر تھا۔ آخرالذکر نے میڈم کو ممنون کرنے کے لئے کمرہ نمبر ۱۴
کو پسند کیا۔ لیکن افسوس ہفتہ کی صبح کو وہ بھی اسی قلابے
سے لٹکا ہوا پایا گیا۔ پردوں کی رسی کا ایک ٹکڑا گلے میں
بندھا ہوا تھا۔ گو ٹانگیں سکڑی ہوئی تھیں لیکن فرش سے
قریب المس تھیں اور وہی خوفناک علامات جو مسٹر کلوورٹ
کے چہرے سے ظاہر تھیں۔ اس کے چہرے پر بھی عیاں
تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نعش کا طبی معائنہ کرتے ہوئے
آہستہ سے فرمایا اوجہ موت معلوم کرنے کیلئے قوت تشخیص کا

عجیب وغریب امتحان ہے " باآواز " یہ تو ایسا ہی واقعہ ہے
جیسے کوئی شخص عمداً کسی اونچی کھڑکی سے گر کر یا کسی گاڑی
کے نیچے دب کر مرجاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اسے گذشتہ
حادثہ کی خبر تھی۔ اس لئے یہ خود بھی تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ گو
تشخیص کمشنر صاحب کی بھی خودکشی تھی۔ لیکن اس دفعہ کمرے
کی خوب تلاشی لی گئی۔ دیواروں تک کو ٹھونک بجا کر دیکھا
گیا۔ مگر کوئی مشتبہ چیز نہ مل سکی۔ اسی دن سارے مسافر
ہوٹل کو خالی کر کے چل دیئے۔ میڈم پر سخت ناامیدی
طاری تھی۔ اس نے نہایت کرب سے اپنے ہاتھ ملتے
ہوئے کہا۔ ہائے میں لٹ گئی۔ برباد ہوگئی۔ اب کوئی مسافر
یہاں نہ آئیگا۔ اے کاش کوئی ایک رات ہی اس کمرے
میں سو جائے میں صبح کو اسے ایک سو فرانک انعام دونگی
لیکن وہ کوئی دیوانہ نہ ہو جو خودکشی کا طالب ہو۔ اسی دن
پولیس کا سارجنٹ جو پہلے بھی دو دفعہ کمشنر کے ساتھ آچکا
تھا۔ میڈم سے ملنے آیا۔ تھوڑی دیر کھڑے کھڑے ادھر
ادھر پیر بدلے۔ اور کہا بیگم صاحبہ میں ایک غریب آدمی
ہوں مگر قدیم سپاہی ہوں۔ میں نے افریقہ میں دس
سال فوجی خدمات انجام دی ہیں۔ میں ناپاک روحوں یا
بھوت پریت سے نہیں ڈرتا۔ اگر مقررہ انعام آپ مجھے
عنایت فرمائیں تو میں رات کو کمرہ نمبر ۱۴ میں سو رہوں۔
میڈم نے اس کے دونوں گالوں پر بوسہ دیا اور نہایت
شفقت سے " میرے بہادر میرے کرمفرما " کہہ کر معاملہ
طے کر لیا۔ مگر میڈم کے شوہر نے واقعہ کو سنکر اپنی گردن ہلائی
اور ایک اور شراب کا جام چڑھا گیا۔ کیونکہ ان حادثوں کے
بعد سے وہ بجز شراب نوشی کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔

(۴)

پریشان حال میڈم اس رات بہت کم سو سکی۔ پانچ دفعہ
کمرے کے دروازے پر گئی۔ اور بلند خراٹوں کی آوازیں
سن سن کر مطمئن ہوئی۔ صبح کو سارجنٹ مذکور نے مزے سے
لے کر کافی اڑائی اور جوش سے میز پر ہاتھ پٹخ کر کہا اے
کاش میں ہر صبح کو بلا مشقت سو فرانک کما لیا کروں۔ یہ نرم
بچھونا۔ یہ پُر تکلف ناشتہ اور پھر مبلغ علیہ السلام ہا ہا ہا۔
یہ خبر ہوا کی طرح شہر میں پھیل گئی کہ ایک شخص رات کو
کمرہ نمبر ۱۴ میں سویا۔ اور صبح کو صحیح وسلامت اٹھا لیکن توہم
پرست بڈھوں کی تشفی وتسلی نہ ہوسکی۔ انہوں نے گردن
ہلا کر کہا کل جمعہ کی رات کو بھی وہ اس کمرہ میں سو کر صبح زندہ
اٹھے تب ہم جانیں۔ جمعہ وہ منحوس جمعہ یعنی وہ دن جسکی
رات کو کمرہ نمبر ۱۴ میں سونے والے بیوقوف کے دماغ
میں ناپاک روحیں خودکشی کا خیال پیدا کر دیتی ہیں۔ آخر
آ ہی پہنچا۔ میڈم نے کہا میں آج کمرہ بند کر کے اس کے
دروازوں میں کیلیں ٹھونک دونگی۔ بیس برس سے اس
ہوٹل میں رہتی ہوں ابتک کسی دوسرے کمرے میں ایسا
حادثہ نہیں گذرا۔ افترا پرداز لوگوں نے کہا۔ یہ ناپاک
روح اس بیوقوف انگریز کی ہے جو جمعہ کی رات کو کمرے
میں گشت لگایا کرتی ہے۔ اگر تم اس کمرے کو بند کردوگی تو وہ
دوسرے کمرے میں چلی جائیگی۔ بہتر ہے کہ تم اس ہوٹل کو
فروخت کر ڈالو۔

ہوٹل کے دروازے سے ملحق ایک چینی شخص مسٹر لی
ہانگ چھو کی صنادید قدیمہ کی دکان تھی۔ وہ اکثر جواہرات کی
خرید وفروخت بھی کیا کرتا تھا۔ اس نے ہوٹل کی خریداری

کی خریداری کی خواہش ظاہر کی۔لیکن میڈم ضدی تھی سنتے
ہی ایک شال کندھے پر ڈال سیدھی تھانہ چلدی۔بہادر
سپاہی مسٹر کیساوٹ جو رات کو کمرے میں سویا تھا۔پہرے
پر تھا۔میڈم نے اُس سے سسکیاں لیتے ہوئے پوچھا
کیوں بھئی کیا آج کی رات بھی تم اس کمرے میں گذار سکتے
ہو۔میں تمہیں اور سو فرانک دونگی۔کیساوٹ نے اپنی ران
تھپکی اور کہا بیگم صاحبہ مقررہ انعام پر آپ جتنی راتیں فرمائیں
میں اس کمرے میں بسر کروں۔معاملہ طے ہوگیا اور شام
کو نہایت پر تکلف کھانا۔اور اعلیٰ قسم کی ایک بوتل شراب
کمرے میں بھجوادی گئی جس کو سارجنٹ نے اپنی خوش نصیبی
پر محمول کیا +

افسوس بیچارہ دوسرے دن صبح کو انہی حالات
میں مردہ پایا گیا۔مردہ اور اس ہی غلاف میں لٹکا ہوا تھا جسکی
پردوں کی رسی گلے میں اور ٹانگیں مڑی ہوئی۔پیر تقریباً
زمین کو چھو رہے تھے۔انہی وحشتناک علامات خوف نے
اُس کے منہ کو سکیڑ کر دانت نکوس دیئے تھے +

اخبارات نے پھر قلب پیرس میں آسیب زدہ
کمرے کے عنوان سے چیخ پکار شروع کردی۔اور آناً
فاناً وہ کمرہ "کمرۂ خودکشی" کے نام سے مشہور ہوگیا۔ایک
دفعہ اور اُس کی باقاعدہ تحقیقات ہوئی مگر بے سود +

یہ اموات کسی تشدد یا فریب کا نتیجہ نہیں سمجھی گئیں
بلکہ کوئی ایسی گدلی فضا مانی گئی۔جو کمرے کے سونے
والے کو مرض کابوس میں مبتلا کر کے اُسے اقدام خودکشی
پر مجبور کرتی تھی بہت سے اخبارات والوں نے اس راز
کے معلوم کرنے والے کو معقول انعام دینے کا اعلان کیا
میری کلسٹی اور دوسرے عجیب و غریب حادثات کے
حوالے دیئے گئے۔پیرس میں ایک ہفتہ تک ہر جگہ بجز اس
تاریک ہوٹل کے اور کوئی گفتگو ہی نہ ہوتی تھی۔بہت سے
عامل جمع ہوئے۔اور مقتول روحوں (یا جو بھی ہوں) سے
بات کرنے کی کوشش بھی کی۔لیکن سود مند نہ ہوئی اس
واقعہ کے بعد ہی ایک منیجر کے مفقود ہوجانے کا غلغلہ مچا
اور اخبارات میں جو جگہ ہوٹل کے ان حادثات سے بھر
رہی تھی۔اس سیاسی معاملہ نے اُس کی قائم مقامی کر کے
اخباروں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔اور اس طرح ہوٹل کا
معاملہ کچھ دب سا گیا +

(۵)

مسٹر ریکارڈو گری بالڈی ایک نوجوان طبی طالب العلم
تھا۔اُس کو خیال ہوا کہ گو اخبارات میں اب ہوٹل کے متعلق
چرچا نہیں رہا۔مگر انعام مقررہ تو منسوخ نہ ہوا ہوگا۔چنانچہ
وہ ایک دن صبح کو میڈم کلسٹی کے پاس ملنے گیا۔جو پہلے
نہایت خوش طبع اور خوش وضع تھی۔لیکن اب روز بروز
بے پروا اور چڑچڑی ہوتی جاتی تھی۔طالب العلم نے رُکتے
رُکتے اس راز کے متعلق تحقیقات کرنے کی خواہش ظاہر کی
پہلے تو اُس کے الفاظ پر میڈم نے توجہ نہ کی۔لیکن جب
اُس نے پرجوش طریقہ پر اصرار کیا کہ وہ ایک اصول کے
تحت انشاءاللہ ضرور پتہ لگائیگا۔تو میڈم نے اُسے کمشنر
کے پاس بھجوادیا اور کہا کہ کمرے کی کنجی اُس ہی کے پاس
رہتی ہے۔کسی شخص کو اس کمرے میں جانے کی اجازت
نہیں ہے) بہت سی ردوقدح کے بعد نوجوان طالب العلم
نے کمشنر سے کنجی حاصل کر لی جس کے اُس کا طبی معائنہ

ہوا۔ اور وہ تندرست و طاقتور ثابت ہوا۔ تاہم کمشنر نے
چند ضروری امور کے متعلق اُسے متنبہ کیا۔ اُسی دن کمرہ نمبر ۱۴
میں ایک ٹیلیفون بھی لگوا دیا گیا۔ تاکہ وقت ضرورت کمشنر
کو طلب کیا جا سکے۔ اکسچینج والوں کو یہاں تک حکم دیا کہ اگر
ریسیور ذرا بھی اُٹھے تو فوراً میرے دفتر سے تار جوڑ دینا۔
میں ہر وقت اس منحوس کمرے میں گھسنے کے لئے تیار
رہونگا۔ اور اگر احیاناً میں نہ بھی رہا تو میرا کوئی مددگار چلا جائیگا
نوجوان طالب العلم ان احکام کو سنکر ہنسا اور کہا اسکی کوئی
ضرورت نہ ہوگی۔ میں اپنے ایک اصول سے کام کرونگا۔
مجھے پھانسی لینے کا شوق تو ہے نہیں۔ اور پھر جو انعام
اخبارات سے حاصل ہوگا۔ اس رقم سے میں اپنی شادی
پیاری جار جیئل سے کرکے نہایت فارغ البالی اور خوشی
سے اپنی زندگی کے دن گزارونگا۔

یہ ذکر پیر کا ہے۔ اس کے بعد کمشنر صاحب روز دن
میں دو دفعہ اور رات میں ایک دفعہ ٹیلیفون سے اُسکی
خیریت دریافت کرتے اور طالب العلم جواباً کہتا "جناب
بہت مزے میں ہوں بیگم صاحبہ مجھے لذیذ سے لذیذ غذائیں
کھلاتی۔ اور قدیم ترین شرابیں پلواتی ہیں۔ میں تو روز بروز
مجرب ہو رہا ہوں"۔

اس میں شک نہیں کہ جوں جوں دن گزرتے گئے
اور کوئی واقعہ پیش بھی نہ آیا۔ تو ہوٹل کی مالکہ کی دلچسپی ہوتی
گئی۔ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ریکارڈو کو لذیذ غذائیں
بھجواتی۔ نوجوان اپنی کتابیں ساتھ لایا تھا۔ جن کے مطالعہ
میں غرق رہتا۔ البتہ دن میں ایک دفعہ جب کمرہ صاف کیا
تو ٹہلنے کو باہر چلا جاتا۔ اور واپسی میں کمشنر صاحب سے
ملتا آتا۔ اُس نے کمشنر سے کہدیا تھا کہ میں نے اس راز
کو معلوم تو کر لیا ہے۔ لیکن ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا۔ آخر اس
خوفناک اور منحوس جمعہ کا دن آگیا۔ رات کو کمشنر نے دو دفعہ
ٹیلیفون پر اُس کی خیریت دریافت کی۔ اور نہایت تشفی بخش
جواب پایا۔ مگر ہفتہ کی صبح کو ریکارڈو گری بالڈی اُسی آہنی
قلابے میں رسی سے لٹکا ہوا پایا گیا اور مردہ۔ اُس کی ٹانگیں
زاویہ قائمہ پر مڑی ہوئی تھیں۔ اور آنکھیں ہیبت سے باہر
نکلی پڑی تھیں۔ نگاہ سامنے والی دیوار پر گڑی ہوئی تھی۔
ٹیلیفون کا تار کٹا پڑا تھا۔ اور رات کے کھانے کے ساتھ
جو چھری میز پر آئی تھی فرش پر پڑی تھی۔ اور چند ریشمی تاگے
کے پھونسڑے اُس پر لگے ہوئے تھے۔

(۶)

اس دفعہ کمشنر نے کمرہ نمبر ۱۴ پر ایک سپاہی متعین کر دیا اور
مسٹر ڈوفرین کو ٹیلیفون پر کہا کہ یہ خودکشی نہیں بلکہ ناقابل
بیان قتل عمد ہے۔ ڈاکٹر برٹیلون خود میرے ساتھ آگئے
تھے۔ میں نے اس سے قبل ان کو اسقدر متوحش کبھی نہ دیکھا
تھا۔ اُنہوں نے آہستہ سے نعش کو پلٹا کہ میں گلے کی بندھی
ہوئی رسی کھول سکوں۔ نوجوان کی بے وقت موت پر ڈاکٹر
نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا یہ کمبخت اس سے پہلے
بھی ایسا کر چکے ہیں۔ اچھا دیکھو اب ہم پتہ چلاتے ہیں۔ تم نے
رسی پر لگے ہوئے ایک جامنی رنگ کے دھبے کو غور سے
دیکھ کر کہا۔ دیکھ تو لیا مگر کہہ نہیں سکتا کہ اس سے اس کا کیا
مطلب تھا۔ اچھا رسی کی موٹائی کو ناپ لو۔ میں نے نہایت
احتیاط سے اس کام کو انجام دیا۔ پھر اُس نے گردن کے
نشان کو ناپنے کا حکم دیا۔ میں نے اس کی بھی تعمیل کردی۔

اس سے یہ پتہ چلا کہ جس رسی سے اس کا گلا گھونٹا گیا۔ وہ اس رسی سے بہت باریک ہے۔ جو دم نکلنے کے بعد گلے میں باندھی گئی ہے۔ موقع کی تصاویر بھی لی گئیں اور چھری ساتھ لے جانے کے لئے محفوظ کر لی گئی۔ میرے افسر نے آہستہ سے کہا۔ دیکھا قزاق یہاں آئے۔ یہ پہلے ہی بے یار و مددگار تھا۔ گلا دبا کر ٹانگیں اندر کی طرف موڑ دیں۔ اور جب نخم اپنا کام کر چکا تو اس رسی سے باندھ کر قلابے میں لٹکا دیا۔ جنبنی قزاق کہیں کے۔ ٹانگیں اس طرح موڑی ہیں۔ جیسے کسی نے خودکشی کرتے وقت لٹک کر اوپر اٹھائی ہوں۔ اور اسی ترکیب سے لوگوں کو دھوکا دیا گیا۔ کہ وہ خودکشی ہی خیال کر سکیں۔ پھر بھی ایسے لوگ ہمیشہ کچھ نہ کچھ غلطی کر جاتے ہیں۔ اور اس مرتبہ یہ غلطی رسی کی موٹائی ہے۔ میں نے چھری کے متعلق پوچھا تو فرمایا یہ فضول چیز ہے۔ ممکن ہے انہوں نے رومال سے اسے پکڑا ہو خیر اس کے متعلق ہم پھر غور کرینگے +

یکایک اس نے کمرے کے فرش کو غور سے دیکھا اور پریشانی کے عالم میں مگر آہستہ سے مجھ سے چھری مانگی جو میں نے دیدی۔ اس کے بعد بہت احتیاط سے اس نے فرش کا کونہ اٹھا۔ نیچے سے ایک کاغذ کی لپٹی ہوئی سخت گولی نکلی۔ اسے کھولا تو اوپر کے کاغذ پر پنسل کے بہت ہی دھندلے کچھ نشانات نظر آئے۔ آتشی شیشے سے دیکھ کر حسب ذیل الفاظ ہم نے پڑھے۔ جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ مثلاً کوئی چیز۔ حادثہ۔ دیوار ہے۔ اور بھی ایک لفظ غالباً چکدار تھا۔ آخر کا ایک لفظ "قاتل" تھا ڈاکٹر برٹیلون نے پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔ اور بلند آواز سے کہا (یہ صرف جنون کی ایک قسم ہے۔ اب چلو وقت ضائع کرنے سے کیا حاصل) اپنا سامان درست کر کے میں بھی کمرے سے باہر نکل آیا۔ برابر والے کمرے میں مغموم میڈم کھڑی ہمارے انتظار میں ہاتھ مل رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھنے لگی۔ (کیا جناب کیا آپ کو ان اموات کا کوئی سبب بھی معلوم ہوا) جواب میں مسٹر برٹیون نے گردن ہلا کر کہا کچھ نہیں۔ یہ محض اتفاق ہے۔ ایک آدھ دن میں میرے ملازم یہاں آ کر کمرے کو دھوئیں دے کر صاف کر دینگے۔ تاکہ کوئی زہریلی ہوا ہو تو نکل جائے۔ اس کے علاوہ ہم کچھ نہیں کر سکتے جبتک اس نوجوان طالب العلم کی نعش باہر نکلے سپاہی موجود رہیں گے۔ اس کے بعد تم پھر اس کمرے میں کسی کو ٹھہرا سکتی ہو۔ کیونکہ جبتک گذشتہ خودکشیوں کی کسی کو اطلاع نہ ہو۔ کوئی حادثہ پیش نہیں آ سکتا۔ مغموم میڈم کی آہ و زاری پر کان نہ دھرتے ڈاکٹر برٹیون نیچے اتر گیا۔ زینے کے دالان میں میڈم کا شوہر نظر آیا۔ جو شراب کے نشہ میں مست پڑا تھا۔ ڈاکٹر برٹیون نے پاس کھڑے ہو کر اس پر تجسس آمیز نگاہ ڈالی اور جلدی سے سپاہیوں کو کوئی حکم دے کر باہر نکل گیا موٹر میں سوار ہو کر وہ پیچھے کی طرف نیم دراز ہو گیا۔ مگر میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا دماغ اس ہی حادثہ کی گتھی کے سلجھانے میں مستغرق ہے +

(۷)

ایک دن دفتر میں بیٹھے بیٹھے ڈاکٹر برٹیون کا کچھ خیال پلٹا۔ چند رازدار عہدہ داروں کو پے در پے احکام اجرا کئے اور اٹھ کر چل دیا۔ اس لئے مجھے بھی ایک گھنٹہ تنہا بیٹھنے کو مل گیا۔ اس عرصہ میں اس نے متعدد سررشتوں کے عہدہ داران

بالا سے ملاقات کی اور جیب واپس لوٹا تو چہرے پر شگفتگی بخش مسکراہٹ نمودار تھی۔ اُس نے اپنی بڑی میز کے پاس بیٹھتے ہوئے۔ جو مراسلات وغیرہ کے انبار۔ مختلف تصاویر اور بہت سے منتشر کاغذات سے بھری پڑی تھی۔ اور کاغذات پر بجائے حروف کے قدیم مصری اصول کے تحت مختلف جادو بھری تصاویر کھنچی ہوئی تھیں۔ مجھے کہا آپ نہایت آتش بامشہور ہیں جسے میں بھی محسوس کرتا ہوں۔ لیکن آپ سے بھی نہایت احتیاط اور اختصار سے کچھ کہنا چاہتا ہوں اس کے علاوہ یہ بھی چاہتا ہوں کہ آپ ہنگرٹن کی کمپنی کے گماشتہ مسٹر ہنسٹر کو بلوا لیجئے۔ جو آپ کا امریکہ والا لنگوٹیا دوست ہے۔ اُس کے آنے پر آپ پھر تشریف لائیں۔ ہم سب ملکر کچھ مشورہ کریں گے۔ ہائیں آپ تو مجھ سے کچھ خوش نظر نہیں آتے۔ تب تو میں یہ توقع نہ رکھوں کہ آپ کو کسی آسیب زدہ مکان میں بھجوانے میں کامیاب ہوسکونگا۔ جو میں نے یہ سمجھ کر آپ بحیثیت اجنبی بخوبی انجام دے سکیں گے۔ تجویز کیا ہے۔ اس جملہ کے بعد اُس کے چہرہ پر خفیف سی مسکراہٹ جھلکی۔ میں نے اُسکا شکریہ ادا کیا اور جھٹ باہر نکل کر اپنے دل کو ڈھارس دی۔ یہ سوچے بغیر کہ ہنسٹر اس وقت مکان پر ہوگا بھی میں سیدھا رواسکرب روانہ ہوگیا۔ خوش قسمتی سے وہ مکان میں موجود تھا۔ جونہی میں اُس کے کمرۂ مطالعہ میں بلا اطلاع جا دھمکا، اُس نے نہایت متعجب ہوکر میری طرف دیکھ کر کہا۔ کہو دوست کیا بات ہے۔ آج کیسے تشریف لائے +

میں۔ ایمسٹرڈیم ہوٹل کے سلسلہ میں ڈاکٹر برٹیلون نے مجھ سے کہا کہ کسی کو بھجوا کر آپ کو بلواؤں۔ مگر میں خود ہی آنکلا +

ہنسٹر۔ بہت خوب۔ لیکن بھائی صاحب یہ تو فرمایئے کہ کیا ہم کو بھی خودکشی کی ضرورت داعی ہوئی ہے +

مجھے جو کچھ معلوم تھا کہہ دیا۔ اس کے بعد ہنسٹر نے اپنی ٹوپی اُٹھائی اور کہا (اچھا چلئے) ڈاکٹر واقعی ایسے کاموں سے خوب واقف ہیں چلئے سیدھے اُن ہی کے پاس چلیں۔ جب ہم اُس برآمدے میں پہنچے جو ڈاکٹر برٹیلون کے کمرے کو جاتا ہے۔ تو مسٹر لی برن سے ملاقات ہوئی۔ یہ دارالتجربہ کے آفیسر ہیں اور کمرے سے ابھی نکلے تھے اُنہوں نے ہم کو دیکھتے ہی کہا موقع تو خوب ہاتھ لگا ہے لیکن برادران خدا کے لئے کہیں سو نہ جانا میں دروازے پر ہاتھ رکھ کر رُک گیا۔ اور پوچھا کیوں۔ اُس نے کمرے کی طرف اشارہ کرکے کہا ڈاکٹر صاحب خود کہہ دینگے۔ جب ہم کمرے میں داخل ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے ہمیں بیٹھنے کو کرسیاں دیں اور ہنسٹر سے یوں مخاطب ہوئے۔ جناب آپ ہماری طرح کوئی عہدہ دار تو نہیں ہیں۔ غیر سرکاری لوگوں میں بھی کوئی اور شخص موزوں نظر نہیں آتا۔ میں نے آپ کو اس لئے بلوایا ہے کہ آپ کے ذریعہ اُن تمام لوگوں کے خون کا بدلہ لوں جو نہایت بے رحمی۔ فریب اور وحشیانہ طریقہ سے قتل کئے گئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ نڈر ہیں۔ اور مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ میرے مجوزہ اصول کے تحت نہایت کامیاب طریقہ سے مشرقی لوگوں تک کو آپ دھوکہ دے سکتے ہیں۔ نہیں نہیں۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کو آزما رہا ہوں۔ ہنسٹر۔ سٹر جیبں کو معاملہ کے معلوم کرنیکا

اشتیاق تھا۔ اپنی کرسی پر بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔
ڈاکٹر:- میں عام طور پر بھیس بدلنے کے اصول کے خلاف
ہوں۔ مگر اس مقدمہ میں اس کا اختیار کرنا کارآمد ہی نہیں
بلکہ ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ کو جن بندشوں کی ضرورت ہوگی
اب وہ سن لیجئے۔ سب سے پہلے آپ مسلح رہئے! وقت
پر گولی چلانے میں ایک لمحہ بھی دیر نہ کیجئے۔ کیونکہ ان بدمعاشوں
کے لئے ہمارے پاس کسی قسم کا رحم نہیں ہے۔ سررشتہ
کے معتمد افسر کا یہ خوفناک حکم کسیقدر عجیب ضرور ہے لیکن
مقدمہ بھی تو عجیب ہے۔ چنانچہ اگر آپ دونوں میں سے
کسی پر ذرا بھی آنچ آئے تو اس کی تمامتر ذمہ داری بھی
تو مجھ پر رہیگی۔ لیجئے یہ ایک آلہ ہے۔ لیبرن کمپنی نے بطور
خاص آپ کے لئے تیار کیا ہے۔ آپ کو ہوا میں اگر کسی
قسم کی بو ذرا بھی معلوم ہو تو فوراً اس کو ناک سے لگا لیجئے
یہ ہوا کو صاف کرتا ہے۔ ہوٹل کے متصلہ مکان کے مالک
لی ہانگ فو سے قزاق ساز باز رکھتے ہیں لیکن ممکن ہے
ان کے اور بھی بہت سے راستے نکل بھاگنے کے ہوں۔
ہم کو ثبوت جرم کے لئے مکمل شہادت کی سخت ضرورت
ہے۔ اس ہی کی تکمیل کے لئے آپ دونوں کی جانوں کو
خطرے میں ڈال رہا ہوں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔
چارلس بنگم بونن گارڈن کے جوہری کی پُراسرار موت کے
بھی یہی شیطان صفت لوگ ذمہ دار ہیں جس کی نعش ندی سے
ابھی دونوں نکالی گئی ہے۔ اور جس کے متعلق خودکشی کا گمان
ہے۔ اور بہت سی وارداتیں اسی قسم کی لندن اور پیرس
کی ہیں۔ جن کا ذکر یہاں فضول ہے۔ ہم نے اس چینی کو
تو شناخت کر لیا ہے۔ وہ درحقیقت سین فرانسسکو سے
آیا ہے۔ جہاں وہ چین کے بدترین لٹیروں کے نام سے
مشہور تھا۔ قزاقوں کے اس فرقہ کا یہ ادنیٰ شریک ہے۔
اصل سرگروہ جس نے اس جماعت کی بنا ڈالی ہنوی شان
ہے۔ جو ٹونکن چائنا سے آیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ پہنچا ہوا
بھی ہے۔ گو مجھے اس کی سرگذشت بھی معلوم ہے لیکن
یہاں میں اُسے بیان نہ کرونگا۔ تاہم وہ طریقہ عمل جو اس
ہوٹل کی وارداتوں سے متعلق ہے۔ اور مجھے معلوم ہو سکا
ہے۔ یہ ہے کہ کسی مقررہ وقت پر ایک خاص قسم کی گیس
جو کسی مشرقی طریقہ پر تیار کی گئی ہے۔ پوشیدہ نالیوں کے
ذریعہ کمرے میں بھر دی جاتی ہے۔ لیبرن نے مجھے اس قسم
کی نیموں کے بہت سے نام بتائے ہیں۔ جو مختلف طریقوں
سے بیہوشی طاری کرکے اپنے مطلوب نظر کو بے بس کر دیتی
ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کے اثر سے جسم میں سختی تو پیدا
ہو جاتی ہے۔ لیکن دماغ اور عضلات چُست رہتے ہیں۔
اس کے بعد کمرے کے بجلی کے تاروں کو دیوار کے پیچھے
سے ٹھونک کر روشنی خاموش کر دی جاتی ہے۔ (میں نے
اس کی تصدیق اپنے ایک خاص آدمی کے ذریعہ جو بظاہر
اس کمرے میں ٹیلیفون کے کٹے ہوئے تاروں کو جوڑنے
کے لئے بھجوایا گیا تھا) اور پھر دیوار کا ایک حصہ آگے یا پیچھے پھسل
پڑتا ہے۔ اس صنعت کو استقدر ہوشیاری سے عمل میں لایا گیا
ہے کہ جوڑ مطلق نظر نہیں آتا۔ اسی راستہ سے وہ دغاباز قاتل
کمرے میں گھستے ہیں اور ہنوی شان اپنے سودائی دماغ کے
نت نئے اختراع کردہ مظالم اُس پر پورے کرتا ہے۔
آج صبح کے واقعہ کو تفصیل سے میں نہیں بیان کرونگا۔
جو اُس غریب لڑکے پر گذرا۔ آہ نہایت تکلیف دہ ہے مختصراً

جب آس پہ دم گھٹنے لگا وہ گھٹنوں پر کھڑا تھا۔ اور جب اکڑ گیا تو ویسا ہی کر دیا گیا۔ جیسا گذشتہ چار مقتولوں کو کیا گیا تھا۔ ہاں تو نبسٹر صاحب آپ کو اب یہ کرنا ہے کہ بدھ کی سہ پہر کو پانچ بجکر پینتیس منٹ پر جب جیربرگ سے ریل شمالی اسٹیشن پر پہنچیگی تو آپ اُس سے فائز ہونگے اسٹیشن پر ایک قلی ہوٹل کا کارڈ دیگا۔ اور آپ وہاں چلے جائیں گے۔ آپ کا لباس بالکل ایک امریکہ کے اس تجارت پیشہ کا سا ہوگا جو جواہرات کا بیوپار کرتا ہو۔ بہتر ہو کہ میں اس کا فیصلہ آپ ہی کی مرضی پر چھوڑ دوں کہ آپ جیسا بھیس مناسب سمجھیں بدل لیں۔ اس گفتگو کو سنکر مسٹر نبسٹر نے کچھ اس طرح دانت نکوسے کہ ہم دونوں کو بیساختہ ہنسی آگئی ◆

ڈاکٹر مجھ سے مخاطب ہوکر مسٹر الیسٹن ولف چونکہ آپکو ڈچ زبان آتی ہے۔ اس لئے آپ اس ہی صبح کو گویا ہالینڈ سے تشریف لاکر ہوٹل ڈی ایمسٹرڈیم میں فروکش ہونگے میں نے بدھ کا دن اس وجہ سے تجویز کیا ہے کہ نیویارک کا جہاز اسی دن یہاں پہنچتا ہے۔ علاوہ ازیں جمعہ تک کوئی واقعہ بھی پیش نہ آئیگا ◆

نبسٹر۔ لیکن جناب یہ جمعہ کا دن کیوں مخصوص ہے ◆

ڈاکٹر۔ میں نہیں بتا سکتا۔ ممکن ہے اُن لوگوں کے سردار منوی شان کے لئے جمعہ کوئی یوم نیک ہو۔ یا کوئی مشرقی وسواس ہو۔ مجھے تحقیق معلوم نہیں ہے۔ ہاں آپ دونوں کسی خاص کمرے کی نشاندہی نہ کریں۔ بلکہ صرف مصر رہیں کہ ہمیں سب سے اوپر کی منزل پر کمرہ ملے۔ ہم نچلی منزل پر رہنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ گلی میں بہت گرد بڑا شور رہتا ہے آپ دونوں کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے پہلے کی ملاقات کا کسی کو شبہ ہو سکے۔ ہاں جب ہوٹل میں ساتھ ساتھ کھانا کھانے لگیں تو ایک دوسرے سے متعارف ہو جائیں دن کا وقت آپ جس طرح مناسب سمجھیں گزار سکتے ہیں مسٹر نبسٹر آپ کو کمرہ نمبر ۱۴۲ ملیگا۔ کیونکہ جب آپ ہوٹل پہنچینگے میڈم وہاں موجود نہ ہوگی۔ جس کا میں انتظام رکھونگا۔ اُسکا شوہر خود ہی آپ کو اس کمرے میں ٹھہرائیگا ◆

نبسٹر (متعجب ہوکر) ڈاکٹر صاحب یہ آپ کو کیونکر معلوم ہوا۔

ڈاکٹر۔ مجھے اس کا یقین ہے جب میڈم واپس آئے گی تو دونوں کی خوب چونچیں رہینگی۔ لیکن اس کی پرواہ نہیں جمعہ کی شام کو کھانا کھا کر جلد ہی آپ دونوں اپنے کمروں کو لوٹ جائیں۔ مسٹر الیسٹن ولف اس کے کچھ دیر بعد آپ نظر بچا کر کمرہ نمبر ۱۴۲ میں گھس جائیں۔ دروازہ کھلا ہوا ملیگا مسٹر نبسٹر آپ اس وقت ایک لمحے کے لئے چھت کی روشنی گل کر کے میز کا لمپ روشن کر لیں۔ بس اس ہی وقفہ میں آپ کا دوست کمرے میں داخل ہوکر پلنگ کے نیچے چھپ جائیگا لیکن آپ بات چیت نہ کریں۔ بس اپنے متذکرہ آلات تیار رکھ کر موقع کے منتظر رہیں۔ یہ لیجئے یہ آلات ہیں اور آپ کے نتھنوں میں برابر بیٹھینگے۔ خواہ کتنی ہی بدبودار ہو۔ ان آلوں کو آپ ناک سے لگالیں اور سانس ہرگز منہ سے نہ لیں۔ پس پھر خطرہ نہیں ہے۔ میں اور میرے ملازم آپکے اشارے کے منتظر رہیں گے۔ جونہی دروازہ پیچھے کو پھسلے اور وہ لوگ کمرے میں داخل ہوں آپ فوراً اُن کو گرفتار کر لیں اور ذ نیلیں بجاتے ہوئے دوسرے مکان میں گھس جائیں وقت کی قدر کریں جو مزاحم ہو اُس کے اوپر ڈنڈا رسید کیجئے۔

بلکہ گولی مار دیجئے۔ ہم لوگ سیٹی کی آواز پر مکان کو گھیر لینگے
اور اندر آکر آپ سے ملیں گے لیکن یہ ضروری ہے آپ
دونوں ایک ہی قسم کے امتیازی نشان لگائے ہوئے ہوں ہما
ہم کو خانگی طور پر بھید لینے کے لئے ریڈ لینڈ جانا ضروری
تھا۔ مگر نہ جا سکے۔ اور اس طرح بدھ تک کے درمیانی دن
نہایت خاموشی سے گزر گئے۔

بدھ کی صبح کو ایک اوسط درجے کے مسافر کا لباس
میں نے زیب تن کر کے ایک تھیلے میں چند ضروری کپڑے
رکھے جس پر ایک ڈچ ہوٹل کے مصنوعی لیبل لگا دیئے۔ اسکے
بعد ایک کرایہ کی گاڑی میں سوار ہو کر شمالی اسٹیشن چلا گیا۔
گاڑی بان سے کروزگری (جنگلی) کے ناکے پر ٹھہرنے کو
کہہ دیا تھا۔ وہاں اتر کر انسپکٹر کے پرائیویٹ روم کے دروازے
سے نکل کر ان مسافروں میں شامل ہو گیا جو ریل سے اترے
گویا میں بھی اس ہی ریل سے اترا ہوا ایک مسافر تھا۔ کچھ
دیر بعد ہوٹل پہنچا۔ ڈچ لہجہ مگر ٹوٹی پھوٹی فرنچ زبان میں۔
تھوڑی سی ردوقدح کے بعد مجھے تیسری منزل پر گیارہ
نمبر کا کمرہ رہنے کو مل گیا۔

چھ بجے بنسٹر بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس نے اسقدر
صفائی سے خود کو ملبوس کیا تھا کہ امریکہ کا ایک ایسا تجارتی
شخص معلوم ہوتا تھا جو ایک طویل سفر کے بعد ابھی جہاز
سے اتر کر آیا ہو۔ ایک جہازی صندوق اس کے ساتھ
تھا جس پر درجہ اوّل کی ضرورت لکھے ہوئے لیبل لگا
رکھے تھے جو اس کے مسافر ہونے کا ثبوت تھے۔ ناک پر
عینک اور سر پر سنہری ٹوپی تھی۔ پیر میں ایک بادامی بوٹ
تھا جس کی نوک (ٹو) امریکہ کے رائج فیشن کے مطابق چوڑی
تھی۔ میرے آنے کے کچھ ہی دیر بعد میڈم باہر چلی گئی تھی۔
اس لئے جیسی کہ توقع تھی۔ اس کے شوہر مسٹر وانڈنوویلد
نے بنسٹر کو کمرہ نمبر ۱۴ میں پہنچا دیا۔ اب یہاں سے ہمارا کھیل
شروع ہوتا ہے۔ رات میں نے نہایت بے چینی سے بسر
کی۔ صبح کو ناشتہ میں بنسٹر نے مجھے مکھن (مسکہ) لگے ہوئے
توس دیئے اور میں نے روٹیاں اس کے آگے کھسکا دیں۔
ہماری گفتگو اس داد و ستد کی بسم اللہ کے بعد شروع
ہو جانی لازمی تھی۔ اور ہوئی۔ اور گویا مجھے پہلی مرتبہ معلوم
ہوا کہ وہ امریکن تاجر ہے۔ میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی جانتا
تھا۔ اس لئے اب ہماری گفتگو اس ہی میں رہتی۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ کمرہ نمبر ۱۴ میں ایک مسافر کے ٹھہرنے
کی اطلاع جب میڈم کو واپس آنے پر ہوئی ہوگی۔ تو بیوی
میاں میں کیا ٹھنی۔ جو کمرہ تبدیل نہ کرایا گیا۔ ہم دونوں نہایت
احتیاط سے ایک ڈچ شخص پر نگاہ لگائے ہوئے تھے۔
جو اس ہی ہوٹل میں مقیم تھا۔ ہمیں اس پر قزاقوں کے ساتھی
ہونے کا شبہ تھا۔ مگر یہ شبہ ہی رہا۔ کیونکہ اس نے اپنا
بیشتر وقت اپنے کمرے ہی میں گذارا۔ آخر جمعہ کی شام آپہنچی
میں نے کھانے کے بعد ہی سر کے درد کا بہانہ کر کے میڈم
سے تھوڑی اسپرین مانگی اور سونے کے لئے کہہ کر چل دیا۔
بنسٹر کچھ بڑبڑاتا ہوا لکھنے کے کمرے میں گیا۔ ایک دستہ
کاغذوں کا اور کچھ لفافے لیکر کمرے میں دوا [illegible] جلد بھجوانے
کی تاکید کرتا ہوا چلا گیا۔ میں نے کمرے میں پہنچکر ربڑ سول بوٹ
پہنا۔ اور اپنے پستول کو بھرا ہوا دیکھ کر بہت سے فالتو کارتوس
سمیت جیب میں رکھ لیا۔ بجلی کا جیبی لیمپ بھی ساتھ رکھ لیا۔
اور آہستہ سے ۱۴ نمبر کے کمرے کی طرف بڑھا۔ دروازے

پر پہنچکر جونہی میں نے دستے پر ہاتھ مارا۔ فوراً بجلی کے کھٹکے
کی آواز ہوئی اور کمرے میں گھس گیا۔ اور جب نبسٹر نے میز
کے لیمپ کا کھٹکا کھولا۔ میں رینگ کر اُس کے پلنگ کے
نیچے پہنچ چکا تھا۔ اس خاموشی میں صرف ایک طاقتور ہاتھ
مجھے ٹٹولتا ہوا پلنگ کے نیچے گھوما۔ لیکن میں سوائے ہاتھ
ملاکر اُس پر اپنی موجودگی ظاہر کر دینے کے اور کوئی گفتگو
نہ کر سکا۔ یہی اشارہ ہم دونوں کو آنے والی مصیبت کا متفقہ طور
پر سینہ سپر ہوکر مقابلہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ میں نے
جھانک کر دیکھا کہ میرا ساتھی سامنے کی دیوار پر ٹکٹکی جمائے
میز کے پاس بیٹھا ہے۔ اور گاز کا مخروطی آلہ جو خاص طور پر
تیار کیا گیا تھا۔ اُس کے نتھنوں میں لگا ہوا ہے۔ میں نے
بھی اپنا آلہ لگا لیا۔

کوئی ایک گھنٹہ نہایت خاموشی سے گذرا ہوگا۔ جو
دفعتاً کسی گھنٹہ نے گیارہ بجائے۔ آخری گھنٹہ کی گونج ختم
ہوتے ہی سانس کی سنسناہٹ سنائی دی۔ جو نبسٹر کی طرف
سے آرہی تھی۔ خوف کے مارے وہ کرسی پر ترچھا ہوکر
جھک گیا تھا۔ اور آنکھیں دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔ اور
چہرے پر خوف کے آثار نمایاں تھے۔ یہ دیکھ کر میں نیچے
سے نکلنے ہی کو تھا جو لٹکے ہوئے ہاتھ سے اُس نے مجھے
روک دیا۔ میں تاڑ گیا کہ اُس نے کچھ محسوس کیا ہے۔ اور
ابھی میری ضرورت نہیں ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ نادیدہ مفسدوں
کو دھوکے میں رکھ کر اُن پر غالب آئے۔ میں نے تجربتاً اپنا
آلہ ناک سے نکالا ہی تھا کہ ایک خاص قسم کی بدبو نے میرا
دماغ چکرا دیا۔ چنانچہ میں نے اُسے پھر لگا لیا۔ اُس وقت
میز کی روشنی بھی خاموش ہو چکی تھی۔ میں پھسلکر پلنگ کے
پاس بیٹھ گیا۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیوار کو گھورنے لگا
میرا دستی بجلی کا لیمپ اور پستول تیار تھا۔ نبسٹر کرسی پر بیٹھا
ہوا تو تھا۔ لیکن اب اس کے بھی ہاتھ میں ایک کلدار روشنی
کی چیز تھی۔ اس طرح چند منٹ خاموش گزر گئے تو ایک
جھوجری سی خرخراہٹ سنائی دی۔ اور دیوار پر چمکدار گھر
نمودار ہوئی جو زیادہ روشن ہوئی گئی جس میں ایک خونخوار اور
عجیب الخلقت شکل کونے میں کھڑی دکھائی دی۔ میں نے
شکل کہا ہے۔ لیکن وہ ایک نہایت بدہیئت اور پرہیبت
شخص تھا جس کے جھکے ہوئے کندھوں اور بیڈول جسم سے
جو چینی وضع کے کپڑوں سے ملبوس تھا۔ دو لمبے اور پتلے
ہاتھ لٹکے ہوئے تھے۔ جن کی گرہ دار ٹیڑھی انگلیاں جو اپنے
جوڑوں سے ہٹ کر کسی برساتی کیڑے کی طرح بل کھائی ہوئی
تھیں۔ چہرہ بھی نہایت مکروہ ڈراؤنا اور غیر انسانی تھا۔
(ابتک بھی خواب میں اُسے دیکھ کر میں ڈر جاتا ہوں) ایک
شیطانی مسکراہٹ نے اُس کا منہ ٹیڑھا کر رکھا تھا۔ نرم اور
کانپتے ہوئے ہونٹ دم بدم ادھر اُدھر بل کھا رہے تھے
اُس کی آنکھیں شل بلی کے روشن اور چمکدار تھیں جن سے
وہ نبسٹر کی طرف بیہوش کر دینے والی نگاہوں سے استقلال
کے ساتھ گھور رہا تھا۔ صرف چند لمحے یہ درندہ نما انسان اسی
طرح کھڑا رہا اور پھر نہایت ہیبت ناک طریقہ سے مسکراکر دانت
نکوستا ہوا کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے بہت
سے اس کے ساتھی بھی تھے۔ مگر سب شمالی لوگ تھے۔ یہ
جماعت خاموش ڈگ مارتی میرے دوست کی طرف بڑھی
ہمیں اپنا کام اب شروع کرنا چاہئے تھا۔ اس لئے میں دفعتاً
کود کر اُن کی آمد کے راستہ میں جا کھڑا ہوا اور فوراً اپنا دستی

لیمپ بھی روشن کر لیا۔ اور نہایت کرخت آواز میں اُن سے کہا بس خاموش کھڑے رہو اور اپنے ہاتھ اوپر کی طرف اٹھا دو) اب نبسٹر نے نہایت زور سے میز کرسی پر ہاتھ مارے اور سب سے آگے جو آدمی کھڑا تھا اُس کو پکڑ لیا۔ یہ شخص اسقدر بدھنگم اور بے ڈول تھا کہ بالکل بھوت معلوم ہوتا تھا۔ جبتک نبسٹر نے اپنا پستول اُس کے پیٹ میں نہ گڑو دیا قابو میں نہ آسکا۔ لیکن اب بھاگڑ مچ گئی تھی میرے دونوں پیر کسی نے پکڑ کر اندر کی طرف کھینچ لئے۔ اور میرا پستول بھی ہاتھ سے چھین لیا۔ اسی وقت مجھے نبسٹر کے پستول کی گرجتی ہوئی آوازیں سنائی دیں۔ اور بھاری بھاری نعشوں کے گرنے کی بھی آواز آئی۔ کمرے کے باہر سیٹیوں کی آوازیں بہت زور سے آرہی تھیں۔ چند لوگوں نے اس بھاگڑ میں مجھے روند ڈالا۔ میں نے بھی ایک کی ٹانگ پکڑ لی اور دے مارا۔ تب نبسٹر نے مجھے اٹھایا اور ایک پستول میرے ہاتھ میں دیا۔ دیوار سے جو روشنی آرہی تھی اب بند ہو چکی تھی لیکن خوش قسمتی سے نبسٹر کا دستی لیمپ روشن تھا۔ اب جو دیکھا تو سرکی ہوئی دیوار کا حصہ آگے کو پھسل رہا تھا۔ مگر ہم نے فوراً میز کو اس میں اڑا دیا۔ تین آدمی کمرے میں پڑے ہوئے تھے جن میں دو بالکل بے بدھ تھے لیکن تیسرا جس کو میں نے گرایا تھا ضرب سے محفوظ تھا۔ ہم نے فوراً اُس کے ہتھکڑیاں لگا دیں ہم نے سونے کے کمرے کے دروازے کو اس خیال سے کہ کوئی نکل نہ بھاگے مقفل کر دیا تھا۔ اُسے بھی کوئی زور زور سے ٹھونک رہا تھا۔

اب بقیہ لوگوں کو دروازہ ٹھونکنے کے لئے چھوڑ کر ہم دونوں مکان میں گھس گئے۔ جہاں چینیوں، ملادیا اور قسموں نے بتلایا کہ یہاں گھمسان لڑائی ہو رہی ہے۔ تو پولیس کی ایک جماعت کو پولیس ہماری طرف دھکیل رہی تھی۔ جب اُنہوں نے دیکھا کہ ادھر سے ہم آرہے ہیں اور کوئی نکلنے کا راستہ نہیں ہے تو خود کو ہمارے حوالہ کر دیا۔ ان نو آدمیوں میں جو مکان میں گرفتار ہوئے چار چینی تھے تین اور آدمی جن میں سے دو سخت زخمی تھے کمرہ نمبر ۱۴ میں محفوظ تھے۔ لیکن افسوس کہ وہ اصلی بھوت (قزاق) ہنوی شان اُن میں نہ تھا۔ مکان کی تلاش کرنے سے ایک زمین دوز راستہ کا پتہ چلا جو دوسرے محلہ کی ایک دوکان میں نکلتا تھا۔ ڈاکٹر برٹیلون اور مسٹر ڈفرلسن آشار صناوید والے کی دوکان کے نیچے ہماری آمد کے منتظر تھے۔ جب انہوں نے ہمیں صحیح سالم دیکھ لیا تو بہت خوش ہوئے۔ زمین دوز رستہ کا معائنہ کیا گیا تو جگہ جگہ خون کے ڈھیرے نظر آئے۔ اور سارا راستہ خون کی چھینٹوں سے لِسا ہوا تھا۔

نبسٹر نے کہا یہ سب کیا دھرا اُس چمکدار آنکھوں والے درندے کا ہے جس کو یقیناً بھگا دیا گیا۔ میرا دوست الشیطن ولفہ جب گر پڑا تو میں نے سمجھا کہ مارا گیا۔ اس لئے میں نے اس پر دو دفعہ پستول چلایا۔ مگر افسوس بچ نکلا۔

(۸)

لی ہانگ فو کے مکان کی جب تلاشی ہوئی تو بہت سی قتل کی وارداتوں کا سراغ ملا۔ بہت سی اور چیزوں کے منجملہ مسٹر فلورٹ کا جھولا بھی ملا۔ مجھے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ وانڈرویلد ہمارے جاسوسوں سے کھڑا باتیں کر رہا ہے مسٹر ڈفرلسن نے میری اس تعجب خیز نظر کو تاڑ کر کہا جب سے

وہ طالب علم قتل ہوا ہے۔ یہ برابر ہمارا ساتھ دے رہے ہیں۔ اور کوڈ گری کے افسر ہیں جو امریکہ کی طرف سے یہاں اس لئے متعین ہیں کہ جو جواہرات وہاں سے بلا ادائے محصول یہاں آتے ہیں اُسکا انسداد کریں۔ ایشیائی ہنوی شان کی تلاش میں ہم نے بہت خاک چھانی۔ مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ البتہ چند ماہ بعد یوبوس ایرلیس سے محکمہ کو اطلاع ملی کہ ہنوی شان وہاں نظر آیا تھا۔ لیکن گرفتاری سے پہلے نکل بھاگا۔ اب ہوٹل کا نام بدل کر پنشن دی فیملی رکھ دیا گیا ہے۔ بازو کے مکان میں داخل ہونے کا جو راستہ تھا اُسے اینٹوں سے چنوا دیا گیا۔ اور بیچ کا راستہ بھی بند کر دیا گیا۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ اب بھی وقت ضرورت وہ کھلتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض قزاق چالاکی سے فرار ہو گئے۔ لیکن جو گرفتار ہوئے اُنہیں حبس دوام کی سزا ہوئی گو ئی کوئی معقول ثبوت ان کے شریک جرم ہونے کا نہ تھا۔ تاہم ان کے خلاف جو ثبوت مکان میں موجودگی کا ملا تھا اسقدر کافی تسلیم کیا گیا کہ فیصلہ کرنے میں سوچنے کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوئی۔ لی ہانگ فو کو امریکن پولیس نے طلب کر لیا تھا جہاں اُسکو بجلی کی کرسی پر بٹھا کر تحت الثریٰ پہنچا دیا گیا۔ (محمد کلیم الحق حقی)

غزل

(حضرت جگر مراد آبادی)

حال بھی، ماورائے حال بھی ہے — عشق ممکن بھی ہے محال بھی ہے
بے جمالی بھی ہے اک جمال بھی ہے — ہجر تنہا نہیں وصال بھی ہے
پھر بھی تجھ سے ہزار شکوے ہیں — جانتا ہوں مرا خیال بھی ہے
کرتے جاتے ہیں صاف عذرِ کرم — اور پھر پرسشِ ملال بھی ہے
دور ہٹنا نہ منزلِ دل سے — وصل بھی مے میں، ہجال بھی ہے
حُسن کے ہر جمال میں پنہاں — میرے رعنائیِ خیال بھی ہے
ہر ستم ہے کرم کے پردے میں — اس ستم کی کوئی مثال بھی ہے
دل تو برباد کر کے بیٹھا ہوں — کچھ خوشی بھی ہے کچھ ملال بھی ہے
چھائے جاتے ہیں دردِ دل بن کر — اُس پہ تاکید ضبطِ حال بھی ہے

لاکھ رسوا سہی جگر لیکن
خوش نظر بھی ہے خوش خیال بھی ہے

جگر

کشش محبت

(بسلسلہ اشاعت گذشتہ)

(از جناب غلام سرور صاحب ایم اے پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

نواب روشن علی خاں اودھ کے بہت متمول جاگیردار تھے۔ جو جاگیر ان کو ورثہ میں ملی تھی۔ وہ اس جاگیر کا عشر و عشیر بھی نہ تھی جو ان کے دادا نواب حامد علی خاں کو نواب آصف الدولہ کی سرکار سے عطا ہوئی تھی۔ نواب روشن علی خاں کے والد نواب عشرت علی خاں اسم بامسمّیٰ تھے۔ انہوں نے والد کی وفات کے بعد خوب گلچھرے اڑائے۔ اگر چند سال اور زندہ رہتے تو یقین ہے کہ سب کچھ شراب وکباب کی نذر ہو جاتا۔ مگر بیوی بچے کی خوش قسمتی تھی کہ ایک روز ایسا سرور ہوا کہ پھر نشہ نہ اترا۔ ان کی وفات کے وقت ان کے بیٹے کی عمر صرف پانچ سال کی تھی۔ نواب روشن علی خاں کی والدہ ایک شریف مگر غریب گھرانے کی خاتون تھیں کچھ اس لئے اور کچھ اس وجہ سے کہ خاوند کی عین حیات میں ان کی عیاشیوں کی وجہ سے ہر وقت تنگدست رہا کرتی تھیں انہیں روپیہ کی بہت قدر تھی جو بعض اوقات کنجوسی کی حد تک پہنچ جاتی۔ باپ کو اپنی عیاشیوں سے مطلق فرصت نہ ملتی تھی کہ اپنے بچے کی تعلیم و تربیت کا خیال ہوتا۔ لہذا بچپن ہی سے نواب روشن علی خاں اپنی والدہ کی نگرانی میں رہے۔ وہ فطرتاً منکسر اور شریف مزاج واقع ہوئے تھے۔ والدہ کی نگرانی نے اس پر جلا کیا۔ لہذا وہ ان خرافات سے، بالکل مبرا تھے جن کا تعلق اس جماعت سے لازم قرار دیا جاتا ہے اور جسے عوام "شان ریاست" سے تعبیر کرتے ہیں ایسے عیاش و تماش بین باپ کا ایسا منکسر مزاج اور شریف بیٹا! قدرت کی ایک نیرنگی ہے۔ مگر اس کی وجہ یہی نہیں کہ کوئی بنیا اپنے کیسۂ زر کی اتنی حفاظت نہیں کرتا جتنی انکی والدہ نے ان کی کی۔ انہوں نے اپنی محنت اور درستی اخلاق سے اپنی جاگیر کو نہ صرف قرضخواہوں کے دست تصرف سے جو بھوکی بلّی کی طرح تاک لگائے بیٹھے تھے بچا لیا۔ بلکہ اس کو بہت حد تک اس کی پرانی حالت پر پہنچا دیا۔ اپنی وفات پر تین لاکھ سالانہ کی جاگیر اور کئی لاکھ نقد بنک میں چھوڑا جس وقت ان کا انتقال ہوا۔ ان کے اکلوتے بیٹے شوکت علی خاں کی عمر تین سال کی تھی۔ اس لئے جاگیر کا انتظام ان کی بیوی کے سپرد ہوا وہ بہت ہی زیرک اور دور اندیش خاتون تھیں۔ فضول خرچی اور عیاشی کے ہاتھوں اپنے دو بھائیوں ایک ماموں اور چند ایک عزیزوں کی تباہی دیکھ چکی تھیں میلان مذہب کی طرف زیادہ تھا۔ لہذا لڑکے کی نگرانی بہت ہی حزم و احتیاط اور کئی باتوں میں نہایت سختی سے کرتیں گو شوکت اکلوتا بیٹا تھا۔ مگر شفقت مادری کو انہوں نے کبھی اپنی تصدیق پر غالب نہ آنے دیا۔ اس کی تعلیم کے لئے بہت

بہی قابل اور با اعتبار معلم مقرر کئے جنہیں تاکید تھی کہ اسکی
پوری طرح سے نگرانی کریں۔ اس نگرانی کی وجہ سے بچے
کو قدرتی طور پر محنت و فرمانبرداری کی عادت فطرت ثانی
تک ہوگئی۔ دوراندیش والدہ جانتی تھی کہ بچے کو تین
چیزیں خراب کرتی ہیں۔ بے جا لاڈ۔ بیکاری اور فضول خرچی۔
لہذا شوکت کو پندرہ سال کی عمر تک پیسے کی شکل دیکھنی
نصیب نہ ہوئی۔ اس کے لئے اچھے سے اچھا کپڑا۔ اور
اس کی عمر کے مطابق اس کے کھیل کود اور تفریح کا سامان
نہایت فراخدلی سے مہیا کرتیں۔ مگر اس کے ہاتھ
میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ دیتیں۔ جب انٹرنس پاس
کرچکا تو اُس کا جیب خرچ مقرر کردیا لیکن اسے مجال
نہ تھی کہ اُس کا خرچ مقررہ رقم سے ایک پائی بھر تجاوز
کرلے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جب وہ کالج میں آیا تو اُسکو
راہ مستقیم پر چلانے کے لئے کسی بیرونی مدد کی ضرورت نہ
تھی۔ بلکہ سدھے ہوئے گھوڑے کی طرح وہ خود بخود چلا
گیا۔ درستی اخلاق اور نگرانی نے صحت پر لامحالہ خوشگوار
اثر ڈالا۔ ورزش کی اُسے بچپن ہی سے عادت تھی لہذا
وہ ان تمام اخلاقی اور جسمانی کمزوریوں سے مبرا تھا جن
کا وجود اسی فیصدی ہندوستانی طلبا کی ذات سے گہرا
تعلق رکھتا ہے۔ اسے دیکھ کر کوئی شخص خیال نہیں کرسکتا
کہ یہ طالب علم ہے۔ کیونکہ ہمارے ہاں طالب علم کے
لئے ضروری ہے کہ اُس کے گال پچکے ہوئے ہوں۔
آنکھیں اندر دھنسی ہوئی اور اُن کے گرد سیاہ حلقے تک
تند و جیسے چھپکلی کا پیٹ۔ نظر کا یہ عالم کہ دو گز کے فاصلے
پر ہاتھی بھی کبھی نظر آئے۔ ذہن کی یہ حالت کہ ذرا سی تیز
ہوا چلنے کے وقت بے ڈورے کے کنکوے کی طرح
اُڑ جانے کا خطرہ ہو۔ طبیعت میں استقلال اتنا جتنا مینائے
بازاری کی وفا میں۔ جسم تمام حقیقی و خیالی عوارض کی آماجگاہ۔
معدہ یورپ اور امریکہ کی تمام پیٹنٹ ادویات اور ہندی
و یونانی "معجونات" مرکبات و کشتہ جات کا سٹور۔ طبیعت
کا رجحان دن کے وقت خاص قسم کے ناولوں اور کتابوں
کی طرف جن میں عشق و محبت کی داستانیں ہوں اور رات
کے وقت جب سب سو جائیں تو حکمت کی کتابوں کے
اُس حصے کی طرف جس میں "مردوں" کی بیماریوں کا ذکر
ہوتا ہے۔ خاص اُن عوارض کے مطالعہ کی طرف جن میں
معدہ کی خرابی۔ عام جسمانی کمزوری۔ جذبات کی حس۔ دل کے
جنوں یا ہاتھ کی چالاکی کی وجہ سے جوانی قطرات رقیق کی
صورت میں بہہ نکلتی ہے۔ شوکت بفضل خدا اس تصویر کے
بالکل برعکس تھا۔ اس کا چہرہ سرخ و سفید۔ سینہ فراخ اور
جسم سڈول تھا۔ اور اس کے اعضا میں موزونی تھی۔ صحت
نے ذہن اور دماغ کو تقویت دی ہوئی تھی جس سے ذرا
سی محنت سے تمام بات صاف طور پر ذہن نشین ہوجاتی
اس لئے وہ اپنے ہم جماعتوں میں ہمیشہ ممتاز رہتا۔ وہ محض
کورس رٹنے پر اکتفا نہ کرتا بلکہ اس میں تجسس و تحقیق کا مادہ
تھا۔ آزادانہ بحث کی اُسے عادت تھی۔ اور جبتک کوئی بات
اُس کے نفس کو اپیل نہ کرتی اُس کی تسلی نہ ہوتی۔ خواہ وہ
کسی بڑے سے بڑے عالم یا محقق نے کہی ہو۔ وہ اُن
طلبا کی طرح نہ تھا جن کے نزدیک کورس بمنزلہ کتاب مقدس
اور مصنف کا لفظ وحی اور حدیث ہوتا ہے۔ اور جو ہر ایک بات
کو محض اس لئے کہ وہ کسی عالم سے منسوب ہے آمنا و صدقنا

کر اُسے آنکھوں پر رکھتے ہیں۔ یا جن کا کام چند کتابوں کی جگالی کرنا اور اپنے تمام علم کو امتحان میں اُگل دینا ہوتا ہے اجو ایک ہفتہ بعد عیاش کی جیب کی طرح خالی ہوتے ہیں۔ ان امور کو مدنظر رکھ کر کچھ حیرت کی بات معلوم نہیں ہوتی کہ شوکت بی اے کے امتحان میں اوّل رہا۔ عزیزوں کی رائے ہوئی کہ انڈین سول سروس کے مقابلے یا بیرسٹری کے لئے ولایت چلا جائے۔ مگر اُس کی والدہ کو کسی صورت اُس کی جدائی گوارا نہ تھی۔ کچھ تو اس کی جدائی کا خیال اور کچھ یہ ہول کہ لوٹتے ہوئے صاحبزادے کوئی اپنے ہمراہ نشانی کے طور پر "سفید ہاتھی" (یا ہتھنی) نہ لے آئیں۔ اس کے مانع تھا۔ خوب جانتی تھیں کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ اس قید نا نگرانی سے یکلخت نکل کر یورپ کی آزادی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر دے گی ممکن ہے کہ حضرت کھل کھیلیں۔ اس لئے تمام کنبہ ایک طرف۔ اور وہ اکیلی دوسری طرف۔ کسی کی نہ سنی۔ شوکت خود مدت سے ولایت جانے کی آس لگائے بیٹھا تھا۔ دوستوں میں بیٹھتا تو وہاں کا ذکر۔ اکیلا ہوتا تو وہیں کی اُدھیڑ بُن۔ چاہتا تھا کہ پَر لگا کر اُڑ جائے یا بقول شخصے ائرلیس کے ذریعے وہاں جا پہنچے۔ مگر ماں کے آگے ایک نہ چلی۔ بہت گڑگڑایا۔ منت سماجت کی۔ ایک آدھ مرتبہ ڈرتے ڈرتے روٹھ جانے کی دھمکی دی۔ عالمانہ طور پر وہاں کی تعلیم و تربیت کی فضیلت پر تقریر کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ مجبوراً خاموش ہو گیا۔ آخر تجویز ہوئی کہ انڈین سول سروس کے امتحان مقابلہ میں جو ہندوستان میں ہوتا ہے شریک ہو۔ چونکہ امتحان میں ابھی چند ماہ کی دیر تھی۔ اس لئے والدہ کی اجازت لے کر کشمیر کی سیر کو چلا۔ لاہور سے دو دوست اور تیار ہوئے۔ پھر کیا تھا۔ جھٹ تیاری ہوئی اور پٹ روانہ۔ راستہ میں ایک دوست کے اصرار سے دہلی میں دو روز قیام کیا۔ تیسرے روز شام کو وہاں سے روانگی ہوئی۔ پلیٹ فارم پر پہنچا تو دیکھا کہ جم غفیر میں ایک چار سالہ بچی جو لباس سے کسی صاحب حیثیت کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ رو رہی ہے۔ اس کی تنہائی اور بدحواسی سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ اپنے ساتھیوں سے جدا ہو گئی ہے۔ کچھ مشکل نہ تھا۔ شوکت چونکہ اپنے والدین کا ایک ہی بچہ تھا۔ اور چھوٹے بہن بھائیوں کی نعمت سے محروم تھا۔ اس لئے بچوں سے اسے قدرتی طور پر بہت محبت تھی۔ بچی کو گود میں اُٹھا کر پیار کیا تسلی دی۔ جب اُس کی طبیعت بحال ہوئی۔ تو اُس کا حال دریافت کرنا چاہا۔ مگر چار سال کی بچی کیا بتاتی جو کچھ بتایا وہ نہ بتانے سے زیادہ مہمل۔ لاچار اپنی عقل سے کام لیا۔ لڑکی کی پلیٹ فارم پر موجودگی اس بات کی دلیل تھی کہ اُس کے لواحقین کہیں اِدھر اُدھر موجود ہیں۔ چونکہ آتے ہوئے راستہ میں کوئی ایسا صاحب حیثیت شخص نظر نہیں پڑا تھا جس پر اُس کا عزیز ہونے کا گمان ہوتا۔ لہذا اُس نے خیال کیا کہ اُس کے ورثا ضرور آگے گئے ہیں۔ یہ سوچ کر وہ وہ آگے بڑھا۔ اور بھیڑ کو چیرتا ہوا کچھ فاصلہ ہی پر گیا تھا کہ ایک آہنی ستون کے قریب جہاں جگہ ذرا کھلی تھی دو برقعہ پوش خاتونیں ایک نوجوان سے مصروف گفتگو نظر پڑیں۔ ان کے انداز۔ ان کے اشاروں اور ان کی طرز گفتگو سے انکا اضطراب مترشح تھا۔ جب شوکت قریب پہنچا تو ایک خاتون کے

اشارے پر نوجوان نے مڑ کر اُس کی طرف دیکھا اور بچّی کو
پہچان کر لپک کر اُسے لے لیا۔ اور سرسری الفاظ میں
اُس کا شکریہ ادا کیا۔ بچّی کو اپنے عزیزوں سے مل کر قدرتی
طور پر بہت ہی خوشی ہوئی۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا تھا
کہ اُسے شوکت سے کچھ اُنس سا ہو گیا ہے۔ کیونکہ جُدا
ہوتے وقت اُس نے اُسے ایسی نظر سے دیکھا جس میں
جدا ہونے کا افسوس، اُس کی قربت کی خواہش اور تشکّر
معصومانہ کا اظہار تھا۔ اس قلیل وقفہ میں شوکت نے ایک
نظر میں بھانپ لیا۔ کہ ان دو خاتونوں میں ایک تو سن رسیدہ عورت
ہے۔ اور دوسری ایک نوجوان لڑکی۔ گو وہ نقاب پوش
تھیں۔ مگر یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہ تھا۔ کیونکہ جوانی ستر
پردوں میں بھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ حسن و جوانی جہاں بھی
مجتمع ہوں فضا میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے
جس کی برقی لہریں قریب والوں کو متاثر کئے بغیر نہیں
رہتیں۔ اور یہ بھی کچھ قدرتی رو ہے کہ جن لوگوں کے ہاں
پردے کا رواج ہے۔ اُن کو بادل میں بھی چاند پہچاننے
کا خاص ملکہ حاصل ہوتا ہے۔ گو شوکت حجاب کی وجہ سے
اُن کی طرف ٹکٹکی باندھ کر نہ دیکھ سکا۔ مگر وہ محسوس کرتا تھا
کہ وہ اس کی طرف بہت دلچسپی سے دیکھ رہی ہیں۔ ایک نظر
سے اُس کے جسم میں کچھ سنسنی سی پیدا ہو گئی۔ چونکہ گاڑی
پلیٹ فارم پر آ چکی تھی اس لئے وہ زیادہ دیر وہاں ٹھہر نہ
سکا۔ بلکہ زنانہ درجہ سے ملحق ایک سیکنڈ کلاس کے مردانہ
کمپارٹمنٹ میں گھس گیا اور اپنے بستر پر جو اُس کے ملازم
نے ایک سیٹ پر کھڑکی کے پاس لگا دیا تھا لیٹ۔ اپنے
ہمراہ فیشن کے خیال سے کئی یا سفر کی کوفت دور کرنے
کے لئے چند ناول۔ اخبار اور ای آئی آر۔ اور این۔ ڈبلیو
آر کے ٹائم ٹیبل لیتا آیا تھا۔ پہلے ٹائم ٹیبل کی ورق گردانی
کی۔ اشتہارات پڑھے۔ گاڑیوں کی آمد و رفت کے اوقات
دیکھے۔ پھر اخبارات پر سرسری نظر ڈالی۔ اس کے بعد
ایک ناول پڑھنا شروع کیا۔ مگر اس وقت مطالعہ میں وہ
انہماک و یکسوئی نہ تھی۔ جو دو گھنٹہ پیشتر تک تھی۔ آنکھیں الفاظ
پر تھیں۔ مگر دماغ کسی خاص مسئلہ پر غور کرنے میں منہمک
اور دل کسی اُلجھن میں گرفتار تھا۔ خیال آیا کہ شاید ناول دلچسپ
نہیں۔ دوسرا اُٹھایا۔ کچھ دیر ورق گردانی کی۔ اُسے رکھ دیا
تیسرا اُٹھایا۔ پھر چوتھا۔ نتیجہ یکساں تھا۔ طبیعت اُچاٹ
تھی۔ بار بار کوشش کی کہ توجہ کتاب کی طرف مبذول ہو۔
مگر بے سود۔ وہ یکسوئی جس کے بغیر مطالعہ ناممکن ہے
مفقود تھی۔ ننھی بچّی کا واقعہ اور وہ پُر اسرار نگاہ اُس کے
انتشار خاطر کے لئے کافی تھی۔ مجبوراً کتاب رکھ دی اور
دماغ کو پوری آزادی دیدی۔ ایک چست و چالاک
لگام سے آزاد گھوڑا ہو اور کھلا میدان۔ کیا کیا سر زمینیں
نہیں دکھاتا۔ اور دولتیاں نہیں جھاڑتا۔ یہ خواتین کون
ہیں؟ کہاں سے آئی ہیں؟ کہاں جا رہی ہیں۔ کہاں
رہتی ہیں؟ قرائن سے کسی شریف و امیر گھرانے کی معلوم
ہوتی ہیں۔ ننھی بچّی کیسی بھولی بھالی ہے؟ ان دو میں سے
شاید ایک اس کی بڑی ہمشیرہ ہے۔ کیا اس واقعہ سے
اس کے دل میں میری بابت کچھ دلچسپی پیدا ہو سکتی ہے؟
کیا میری قطع وضع۔ میرے خط و خال۔ میرا لباس کسی کی
توجہ کھینچ سکتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ سوالات اس کے دل میں
پیدا ہو رہے تھے۔ شوکت اپنے خط و خال کی موزونی۔

مناسب اعضا۔ رنگت کی صفائی اور عمدہ لباس کی وجہ
سے اپنے ہم جنسوں میں ہمیشہ ممتاز رہتا تھا۔ اور اُس کے
دوست اُس کو عموماً ازراہِ تمسخر "دلبر" کہا کرتے تھے۔ ممکن
ہے ان میں سے بعض "دل جلے" چھپے رستم اپنے دل کی
اصلی کیفیت کا اظہار اس لفظ سے کرتے ہوں اور ان کی
دوستی "محض ایک آرٹ" ہو۔ مگر شوکت میں خودی و خود پسندی
نام کو بھی نہ تھی۔ اُسے اپنی اس "دلبری" کا احساس بالکل نہ
تھا۔ اُس نے اپنی ذات کی طرف کسی کی توجہ مبذول
کرنے کی کبھی کوشش نہ کی تھی۔ اور کرتا بھی کیسے جس شخص
کو قدرت نے ایک چیز عطا کی ہو۔ اُسے اُس کی نمود و
نمائش اور ستائش کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔
یہ صرف کم ظرف لوگوں کا خاصہ ہے کہ "ہمچو ما دیگرے
نیست" کے نعروں سے لوگوں کا دماغ پریشان کرتے
ہیں جس شخص میں جس چیز کی کمی ہوتی ہے وہ اس کے
اخفا کے لئے اس کو ہمیشہ اپنی ذات سے منسوب کرتا
ہے۔ مثلاً مہتر برادری کا اپنی اصلیت کو چھپانے کے
لئے "سائی" (عیسائی) ہوجانا اور باوجود اپنے حبشی کے
"چہار آتشہ" رنگ کے "منہ مروڑ کر" "ٹم کالا لوگ کا پھبک"
کے دو سے صاحب بہادر بننے کی کوشش کرنا۔ بافندوں
کنجڑوں۔ حجاموں اور میراسیوں کا اپنے آپ کو قریشی۔
پٹھان۔ مغل۔ سید وغیرہ ظاہر کرنا۔ یا ایک بڑھیا کھوسٹ
زنِ بازاری کا چہرے پر پوڈر اور غازے کی مدد سے
اور لباس کے نیچے ایک خاص مقام پر پیرس کے بنے
ہوئے سازو سامان کی مدد سے اُبھار پیدا کر کے حسینانِ
چہار دہ سالہ سے صف آرا ہونا۔ یا کسی قلاش "سفید پوش"
کا کسی نواب یا رئیس سے اپنے رشتہ ملانا وغیرہ!
شوکت کے دل میں یہ خیال کبھی بھولے سے بھی نہیں آ
تھا کہ میں خوبرو ہوں اور اپنی طرف کسی کی توجہ منعطف
سکتا ہوں۔ لیکن اس وقت اس کے دل میں خیالات
ہیجان تھا۔ اب اسے اپنے دوستوں کے کلمات تحسین
یاد آئے اور یہ بھی یاد پڑا کہ سڑک پر گزرتے ہوئے جو
کبھی اس کی کرسچان لڑکیوں سے جو قطار باندھ کر
اپنے بورڈنگ سے گرجا کو جاتیں مڈبھیڑ ہوجاتی
ان میں سے جوان جوان کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھتیں
ایک دوسری کو دھکا دے کر ہنستیں۔ سر مٹکاتیں۔ شا
ہلاتیں۔ آنکھیں گھماتیں۔ اور بدن کو عجیب جنبش دیتی ہوئی
گذر جاتیں۔ ان خیالات نے گو اس کی خوبروئی کی تصدیق
کی۔ مگر ان سے کچھ زیادہ تسلی نہ ہوئی۔ تسکین خاطر کے۔
قوی ثبوت کی تلاش تھی۔ ہاتھ بے اختیار میز کی طرف
بڑھا۔ آئینہ نکال کر آج پہلی مرتبہ اُس نے غور سے ا
چہرے کا مطالعہ کیا۔ نتیجہ خاطر خواہ تھا۔ کیونکہ لبوں پر مسکراہٹ
آنکھوں میں چمک اور چہرے پر مسرت کی جھلک آگئی۔ دل
کی دھڑکن بڑھ گئی۔ سانس قدرے زور سے آنے لگا۔ ایک
ہاتھ میں آئینہ تھا۔ دوسرے ہاتھ کی انگلیاں کبھی سر کے بالوں
کو شانہ کرتیں اور پیشانی پر اُن کو ایک دلربایانہ خم دیکر جاتیں
اور کبھی رخسار صاف کا جائزہ لیتیں کہ کہیں کوئی خار تو پیدا
نہیں ہوگیا۔ اس خود مطالعہ میں بیخودی کا یہ عالم تھا کہ تن
من کا ہوش نہ رہا۔ خیالات تمام دنیا کا چکر لگا کر ایک ہی مرا
"وہ اور میں" پر آ جمع ہوتے۔ یہ نقشہ نہ معلوم کتنی دیر تک
رہتا۔ مگر ایک سٹیشن سے گزرتے ہوئے جب گاڑی نے

غیر معمولی گڑگڑاہٹ سے طاقت بدلی تو یہ سحر ٹوٹ گیا۔ اور شوکت کو ایسا معلوم ہوا گویا کسی خواب سے بیدار ہوا ہے۔ آئینہ بیگ میں رکھ دیا اور کچھ دیر کے بعد گہری نیند سو گیا۔

رات کے دو بجے کا عمل ہے۔ گاڑی پوری رفتار سے فراٹے لیتی ہوئی لق و دق میدان میں سے گزر رہی ہے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بہت بڑا سانپ جس کے بدن پر جا بجا چمکیلے دھبے ہوں اپنے منہ میں درخشاں من لئے ہوئے شب کی تاریکی میں گھسا جا رہا ہے۔ یک لخت سکنڈ کلاس کے ایک کمپارٹمنٹ سے جو مستورات کے لئے مخصوص تھا ایک دل خراش چیخ سنائی دی۔ ایسی دل خراش کہ گاڑی کے پہیوں کی بے ہنگم گڑگڑاہٹ بھی اُسے نہ دبا سکی۔ شوکت اُس وقت گہری نیند سو رہا تھا۔ مگر چیخ کی آواز اُس کے کانوں میں انجن کی سیٹی سے زیادہ کرخت سنائی دی۔ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ چونکہ نیند کا غلبہ تھا۔ اس لئے اپنے حواس جلد مجتمع نہ کر سکا۔ بستر پر بیٹھا آنکھیں مل رہا تھا کہ ایک اور چیخ سنائی دی۔ جسے سُن کر وہ بالکل چوکنا ہو گیا۔ کھڑکی کے باہر جھانک کر دیکھا تو ساتھ والی زنانہ گاڑی کے پائدان پر ایک شخص کھڑا ہوا نظر آیا۔ جس نے اپنے داہنے ہاتھ سے گاڑی کے ڈنڈے کو پکڑ رکھا تھا۔ اور بائیں ہاتھ سے اپنی بغل میں ایک صندوقچہ دبائے ہوئے تھا۔ اور چونکہ بھٹنڈا اور اُس کے نواحیات چوری کی واردات کے لئے مشہور ہیں اس لئے اس نے نتیجہ نکال لیا کہ یہ شخص چور ہے۔ فوراً گاڑی

کھڑا کرنے کی زنجیر کو کھینچا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ جونہی گاڑی کی رفتار ہلکی ہوئی چور زقند لگا کر شب کی تاریکی میں غائب ہو جائیگا۔ اس لئے دروازہ کھول کر وہ بھی باہر پائدان پر آ کھڑا ہوا اور چور کی حرکات کو بغور دیکھتا رہا۔ جونہی چور نے چھلانگ ماری۔ شوکت بھی زمین پر آ رہا۔ اونچی پٹڑی سے اُتر کر چور جنگلے کی آہنی تار پر سے چشم زدن میں کود گیا مگر شوکت بھی سائے کی طرح پیچھے تھا۔ لق و دق میدان میں دونوں کی دوڑ شروع ہوئی۔ ایک طرف جان بچانے کا خیال مال ہضم کرنے کی فکر۔ دوسری طرف جوانی کا جوش اور اپنی دلیری کے اظہار سے کسی کی اک نگاہ تشکر و تحسین آمیز کی تمنا معلوم ہوتا تھا کہ دونوں کے پاؤں کو پر لگے ہوئے ہیں۔ شوکت کی خوش نصیبی سے چور کے پاس اس وقت کوئی ہتھیار موجود نہ تھا۔ ورنہ وہ اُسے ضرور موت کے گھاٹ اُتار دیتا۔ نہ معلوم یہ دوڑ کتنی دیر جاری رہتی۔ مگر تھوڑے ہی فاصلہ پر چور نے ٹھوکر کھائی اور بُری طرح منہ کے بل آ رہا شوکت چشم زدن میں اُس کی گردن پر تھا۔ وہ گو جوان تھا۔ جسم اُس کا ورزشی تھا۔ مگر پھر بھی ناز پروردہ تھا۔ اس جنگلی وحشی سے اس کا کیا مقابلہ۔ ایک دو ہاتھ میں بُری طرح پٹخنی دیکر بھاگ جاتا۔ مگر وہ کچھ ایسا گرا کہ ہوش ٹھکانے نہ رہے اس لئے شوکت کو اُس پر پوری طرح سے غلبہ پانے کا موقعہ مل گیا۔ اُس کے زور زور سے پکارنے پر ٹرین سے چند آدمی آ گئے۔ آتے ہی کسی نے چور کو لات۔ کسی نے گھونسا کسی نے ٹھوکر رسید کی۔ جب کوئی شخص کھلے طور پر اپنے دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتا تو اس کے واقعات مغلوب ہو جانے پر اس طریقہ سے اپنی کمزوری کی خفت دور کی جاتی ہے۔

گرے ہوئے دشمن کو سب سے زیادہ ٹھوکریں وہی لگاتا ہے جو زیادہ بزدل ہو۔ مارتے مارتے غریب کو ادھموا کردیا پھر اسے کشاں کشاں ٹرین کی طرف لے آئے۔ یہاں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل چکی تھی۔ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑی تھی سنبھالنے کی فکر تھی۔ مسافر ایک دوسرے کو مشتبہ خیال کرتے تھے۔

جس کمپارٹمنٹ میں واردات ہوئی تھی اس کے سامنے گارڈ۔ ڈرائیور اور کئی لوگ جمع تھے جن میں پولیس والوں کی آواز جو ابھی ابھی نیند سے بیدار ہوئے تھے سب سے بلند تھی "وہ کدھر گیا؟" "کون تھا؟" "کیا گم ہوا؟" "ہم نہ کہتے تھے کہ ہوشیار رہو؟" "ابھی بڑے صاحب کو تار دیتے ہیں!" وغیرہ وغیرہ کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ وہ اس وقت اپنی خفت مٹانے کے لئے اپنی مستعدی کا اظہار کر رہے تھے جب چور سامنے لایا گیا۔ تو ان میں سے فوراً ایک نے آگے بڑھ کر اسکے منہ پر ایک گھونسہ رسید کیا۔ پیچھے سے ایک نے کھینچ کر لگائی اور مغلظات کا تانتا باندھ دیا۔ دوسرے نے لپک کر اُسے ہتھکڑی لگا کر اپنے قبضہ میں اسطرح کر لیا گویا کہ خود ہی اسے گرفتار کیا ہے۔ شوکت نے مسروقہ صندوقچہ آگے کیا۔ اُس کی حیرت کی انتہا نہ تھی جب حامد نے اسے ایکی مرتبہ روکھے پھیکے الفاظ میں شکریہ ادا کرتے ہوئے اُسے لے لیا لیکن حامد کی سردمہری کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ کیونکہ جب اُس نے آنکھ اُٹھائی تو اُس کو اپنی دلیری کا پورا صلہ مل گیا دو آنکھیں اُس کی طرف ایسی نگاہ سے دیکھ رہی تھیں جسکا مطلب باوجود اس کوچہ سے ناآشنا ہونے کے وہ بخوبی سمجھ گیا۔ اس کے علاوہ مسن خاتون کی دعاؤں اور کلمات تحسین و آفرین و تشکر کی آواز اُس کے کان میں پڑی۔

مسافروں نے پیٹھ ٹھونکی اور بہادر کا خطاب دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد گاڑی پھر روانہ ہوئی۔ شوکت کے دل میں اب طوفانی سمندر کی طرح خیالات کا تلاطم تھا۔ وہ کونسی مخفی طاقت تھی جو اسکو اس پُراسرار طریقہ سے ان لوگوں کی طرف کھینچ رہی تھی۔ اور اس کا مقصد کیا تھا۔ یہ محض اتفاقات ہیں۔ یا قدرت کا ایک پروگرام۔ اگر یہ محض اتفاقات ہیں تو قدرت نے کیوں اسے ہی منتخب کیا اور اس کی نظر انتخاب کسی اور شخص پر نہ پڑی۔ یہ اتفاق ہرگز نہیں بلکہ ایک مخفی کشش ہے جو اس کو اس طریقہ سے اس جانب کھینچ رہی ہے۔ جب قدرت کو دو نفوس کی یکجائی مقصود ہوتی ہے تو وہ ایسے "اتفاقات" پیدا کر دیتی ہے۔ عوام انہیں "اتفاقات" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر دراصل یہ قدرت کے پروگرام کی زنجیر کی کڑیاں ہوتی ہیں۔ قدرت اپنے مقاصد کی تکمیل ایسے ہی "اتفاقات" سے کیا کرتی ہے۔ مرد کو اپنی خوبروئی کی نسبت اپنی دلیری پر زیادہ ناز ہوتا ہے۔ شوکت کو یقین ہو گیا کہ اُسکی اس جسارت نے اس اثر کی تکمیل کر دی ہوگی۔ جو شاید اس کی خوبروئی سے ادھورا رہ گیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ جہاں اسے یہ کشش ان تین نفوس (سلیمہ۔ نسیمہ اور اُنکی والدہ) کی طرف کھینچ رہی ہے۔ وہاں اس کے اور ایک اور ہستی (حامد) کے درمیان مغائرت کی خلیج حائل ہو رہی ہے۔ مگر موجودہ حالات میں اُس نے اس کی زیادہ پرواہ نہ کی۔ اسے اب صرف یہ دھن تھی کہ کسی طرح ان لوگوں کا پتہ دریافت کرے۔ صبح جب لاہور کے سٹیشن پر پہنچے تو موقع پاکر ننھی بچی کو الوداع کہنے کے بہانہ سے اسنے حامد سے باتوں باتوں میں تمام حال دریافت کر لیا۔

غلام سرور ایم اے

منظومات

رباعیات

(از چودھری جگت موہن لال رواں، ایم اے ال ال بی)

سب دل کی وفائیں ساتھ لیتے جانا　　اُن کو بھی جو جائیں ساتھ لیتے جانا
سنتا ہوں کہ اُنّاؤ سے جاتے ہو جلیل[1]　　میری بھی دعائیں ساتھ لیتے جانا

چشم نم ناک دیکھنے آئے ہیں　　اک جذبۂ پاک دیکھنے آئے ہیں
اس بزم فنا میں دیدنی کیا ہے رواں　　پروانے کی خاک دیکھنے آئے ہیں

فکر دل دردمند کر لیتا ہوں　　فرق پست و بلند کر لیتا ہوں
دیکھے نہیں جاتے خود جب اپنے اعمال　　میں اپنی آنکھ بند کر لیتا ہوں

کیا چیز ہے عشق، حسن فطرت کیا ہے　　قدرت کیا ہے نمود قدرت کیا ہے
کشتی ہے کہ دھار پر بہی جاتی ہے　　لیکن کس کو خبر محبت کیا ہے

یوں ہی اس راہ سے گزرنا ہوگا　　فطرت کا جو دین ہے وہ بھرنا ہوگا
گر دل میں ہوائے شوق آزادی ہے　　زندان عمل بلند کرنا ہوگا

رواں

[1] کرمی مسٹر جلیل قدوائی بی۔اے (علیگ)

غزل

نذر سرآمد شاعراں، طوطیِ غزل خواں مولانا حسرت موہانی مدظلہ العالی

جب ختم سارے عشق کے آداب ہو گئے
کچھ بن پڑا نہ ہم سے تو بیتاب ہو گئے

قابو نہ رکھ سکے دلِ حسرت نصیب پر
ہم دیکھتے ہی آپ کو بیتاب ہو گئے

اپنوں سے آج تک ہے وہی اُنکو اجتناب
جو غیر تھے وہ داخلِ احباب ہو گئے

وہ داستانِ ہجر وہ ہنگامۂ وصال
قصّے جنونِ عشق کے اب خواب ہو گئے

اللہ رے فیض آپ کے حسنِ لطیف کا
مشتاقِ دید آن میں سیراب ہو گئے

نخلِ مراد خشک تھے جو باغِ عشق میں
پھر آپ کے کرم سے وہ شاداب ہو گئے

تاریک جسقدر تھے مرے داغہائے دل
تیرے ضیائے حُسن سے مہتاب ہو گئے

نازاں ہوا نہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ دل
ہم بھی شریک زمرۂ احباب ہو گئے

اُن جامہ ہائے سادہ کی اللہ رے دلکشی
جو تیرے جسم ناز پہ کمخواب ہو گئے

سادہ سی تھی ہماری حقیقت مگر جلیل
ڈھونڈے گئے ہم اتنے کہ نایاب ہو گئے

حقیر جلیل قدوائی

آنسو

تو سراپا ہے معمائے رازِ سربستہ ہے تو
باوجودِ خارجی میں اپنے پوشیدہ ہے تو

اپنی ہستی کا سراسر آپ ہی پردہ ہے تو
یوں اگر دیکھو تو اک قطرہ نہیں دریا ہے تو

ہے وہ باطن جس پہ کچھ اطلاق ظاہر کا نہیں
تو وہ عقدہ ہے جو ظاہر بیں سے کھل سکتا نہیں

لذتِ دردِ جگر مخفی تری تخمیر میں
سوزشِ زخمِ نہاں مضمر تری تصویر میں

کس غضب کی کاٹ ہے ظالم تری شمشیر میں
کس قیامت کی جگردوزی ہے تیرے تیر میں

کس کی ناکامی کا تو شرمندۂ احساں ہوا
غم کے آئینہ میں کس دن دیدۂ حیراں ہوا؟

نورِ شمعِ چشم پر تو جان دے پروانہ وار
یعنی خونِ آرزو کی بوند بن جائے شرار

یا جوابِ تیرِ مژگاں بن کے ہو سینے کے پار
جذبۂ فریاد بھی بن جائے گوہر آبدار

تو سراپا ہے عرض لِلّٰہ تو جوہر نہ بن
اور رگِ دل کے لئے بہرِ خدا نشتر نہ بن

خانۂ دل میں کسی کے یوں بپھر جانا ترا
ہائے وہ رگ رگ سے کھنچ کر آنکھ میں آنا ترا

وہ سراپا یاس کی تصویر ہو جانا ترا
بیکسی کی آنکھ میں وہ ڈبڈبا آنا ترا

عارفِ حق کے لئے اک نغمۂ وحدت ہے تو
میرے اس دُکھتے ہوئے دل کے لئے عبرت ہے تو

جانتا ہوں گرمئ نظارہ ہم آغوش ہے
اس لئے تیرا لرزنا کانپنا پُرجوش ہے

شبہ کیا ہے آنکھ میں رنگِ شرابِ دوش ہے
حیرت افزائی سے تیری اک جہاں خاموش ہے

میں نہیں بھولا دُرِ نایاب ہو جانا ترا
خاک میں مل کر فنا کی نیند سو جانا ترا

سید ابن حسن شارق دہلوی

اس سال کا لاجواب تحفہ
سالنامہ
سنہ ۱۹۳۰ء
کیا آپ نے
اپنا نام
درج رجسٹر
کرالیا
اگر نہیں تو دیر کس بات کی ہے آج ہی ایک خط
سالنامہ نیرنگ خیال
نومبر ۱۹۲۹ء میں شائع ہوگا
قیمت عہ محصول ڈاک سہ
نیرنگ خیال کے خریداروں کو عہ میں
مینیجر نیرنگ خیال - بارود خانہ - لاہور

بیسویں صدی کی بہترین ایجاد

گل فام ـ گل اندام

گورے اور خوبصورت بننے کے لئے لاجواب تحفے

چہرے کے داغ دھبے کیل اور چھائیاں دور کرنے کیلئے کامیاب ترین ایجاد

اس کے استعمال سے چہرہ کی بدنمائی دور ہو کر گلاب کی پتی کی طرح نرم اور خوبصورت نکل آتا ہے۔ رنگت کی سیاہی آہستہ آہستہ سرخی اور سفیدی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ چہرہ کی جھریاں اور داغ دھبے اس طرح غائب ہو جاتے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔ خوشبو اس قدر کہ پسینے سے عنبر اور کستوری کی خوشبوئیں نکلنے لگتی ہیں۔ یورپ کے تیار شدہ صابن اور پیرس کے پوڈر اور غازے ان کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ ہندوستان میں جس قدر اشیا اس قسم کی فروخت ہو رہی ہیں۔ وہ اس قدر ناقص اور بدنما ہیں کہ معززین و شرفا انہیں استعمال نہیں کر سکتے۔ نا کارہ و رنگین و دیگر قسم کی چیزیں استعمال کر کے چہرہ کو نہ بگاڑیئے بلکہ وہ چیزیں استعمال کیجئے جو سائنٹفک اصولوں پر تیار کی گئی ہیں نیز ایک ہی دوا مردوں اور عورتوں کیلئے مفید ثابت نہیں ہو سکتی کیونکہ قدرتی طور پر دونوں جلدوں میں ایک عظیم فرق ہے۔ اس لئے ہم نے مردوں کیلئے گل فام اور عورتوں کے لئے گل اندام کے نام سے دوائیں تیار کی ہیں۔ عورتوں کی دوا بچے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ ضرورت کی چیزیں ہر گھر میں ہونی چاہئیں۔

قیمت گل فام فی شیشی ایک روپیہ آٹھ آنہ ـ قیمت گل اندام فی شیشی ایک روپیہ بارہ آنہ

ڈینش یاسمین ہیئر آئیل

قیمت کا بہترین معاوضہ۔ یہ تیل خالص شہد تلی کے تیل اور بہت سی مفید ادویات سے تیار کیا گیا ہے۔ بالوں کے بڑھانے اور سیاہ رکھنے کے لئے اس سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ دو ہی شیشی کے استعمال سے آپ پر روشن ہو جائیگا کہ اس کا اثر کتنا جلدی ہوتا ہے۔ قیمت فی شیشی ۱۲/ علاوہ محصولڈاک۔ دو شیشی کے خریدار کو محصولڈاک معاف

ڈینش شمیم ہیئر آئیل

نہایت مفید اور خوشبودار تیل۔ قیمت فی شیشی ۸/ علاوہ محصولڈاک۔

سلطانہ بیوٹی کریم

خود نمائی کے بعد استعمال کرنے کا لاجواب تحفہ۔ قیمت فی شیشی ۱۲/ علاوہ محصولڈاک۔

ڈینش والیولٹی مور ہیڈ

تمام خوشبویات کا شہنشاہ۔ ایک دفعہ لگانے سے چند دن تک خوشبو دماغ میں بسی رہتی ہے۔ نہایت لاجواب تحفہ ہے۔
قیمت فی شیشی ۱۰/
تین شیشی کے خریدار کو محصولڈاک معاف

سول ایجنٹس برائے شمالی ہندوستان: میسرز ریاض کیمیکل اینڈ پرفیومری کمپنی ریاض بلڈنگ لاہور
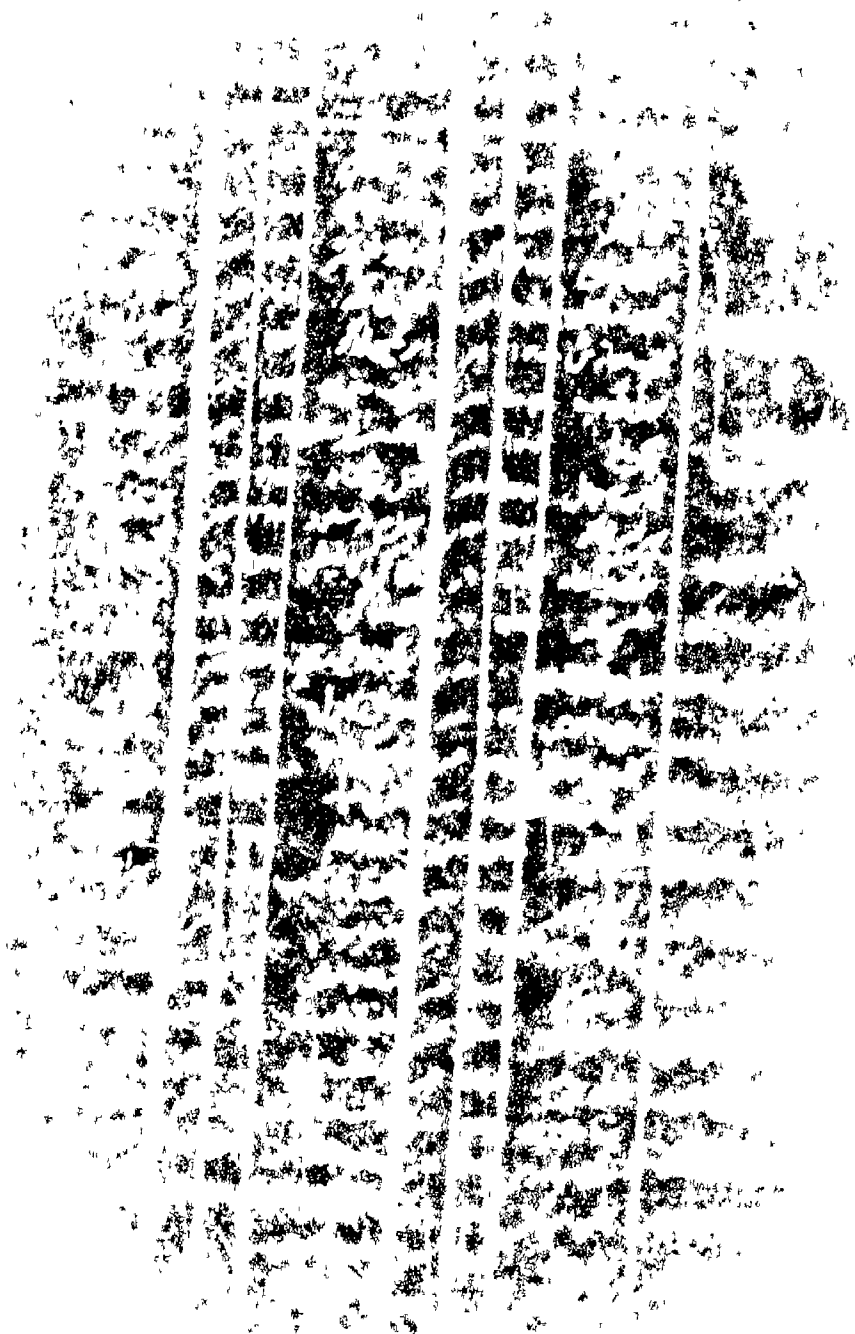
دس روپے سے ایک بڑی تجارت ہو سکتی ہے

دس ہزار آدمی اگر دس دس روپے دے دیں تو ایک لاکھ روپے کا سرمایہ جمع ہو سکتا ہے اور
اس مشترکہ سرمایہ سے بڑے پیمانہ پر کوئی مفید تجارت کی جا سکتی ہے۔ لیکن ایسی مشترکہ تجارتوں کے
لئے گورنمنٹ نے ایک خاص قانون بنا رکھا ہے۔ جس کا نام کمپنیوں کا قانون ہے۔ اس قانون کا مقصد
یہ ہے کہ جو لوگ ایسی مشترکہ تجارتوں میں شریک ہوں ان کے حقوق کی نگرانی کی جائے اور ان کے
نظم پر ایسی پابندیاں عاید کر دی جائیں کہ ان کے لئے بے ایمانی اور دغابازی بہت مشکل ہو جائے
اس کے علاوہ کمپنیوں کے قانون نے مشترکہ کاروبار کے لمیٹڈ کر دینے کا بھی ایک نہایت
مفید طریقہ جاری کیا ہے۔ جس کا یہ مقصد ہے کہ جو لوگ کسی لمیٹڈ مشترکہ کاروبار میں شریک ہوں
ان کو اس کاروبار کی وجہ سے کبھی اتنا نقصان نہ برداشت کرنا پڑے جس کے برداشت کرنے کے
لئے وہ خود تیار نہ ہوں۔ مشترکہ کاروبار میں محدود ذمہ داری نقصان کا یہ مفید اصول جاری ہونے
سے دنیا کو عظیم الشان مالی تمدنی اور اقتصادی فوائد حاصل ہوئے ہیں۔ اور متمدن قومیں مشترکہ سرمایہ
کی لمیٹڈ کمپنیاں قایم کر کے اپنے تموّل اور سیاسی اقتدار میں روز افزوں اضافہ کر رہی ہیں۔
ہم بھی ان تمام فوائد کو حاصل کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم لمیٹڈ کمپنیوں کے معاملات سے واقفیت
اور دلچسپی پیدا کر لیں۔ اور محدود ذمہ داری کی مشترکہ تجارتوں کے فروغ دینے میں تنگ نظری اور
پست ہمتی سے کام نہ لیں۔ دہلی میں ۱۷ر دسمبر ۲۸ء کو مشترکہ سرمایہ کی ایک لمیٹڈ تجارتی کمپنی اشاعت
و طباعت کتب وغیرہ کے کاروبار کے لئے دی حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹڈ کے نام سے قایم
ہوئی ہے۔ آپ اس کمپنی کا پراسپکٹس یعنی ترغیب نامہ شراکت فوراً منگا کر پڑھیں تاکہ اس کمپنی کے
حالات و معاملات سے آپ کو پوری واقفیت ہو اور اگر پراسپکٹس پڑھنے کے بعد مناسب سمجھیں تو
حسب مقدرت اس مشترکہ تجارت میں تھوڑا بہت سرمایہ لگا کر شریک ہو جائیں۔ ابھی ایک خط
پراسپکٹس کے لئے ذیل کے پتہ پر لکھ دیجئے۔

منیجنگ ڈائرکٹر دی حسن نظامی ایسٹرن لٹریچر کمپنی لمیٹڈ دہلی

گوہر مراد

گورنمنٹ آف انڈیا سے رجسٹری شدہ

دنیا کی حالت دیکھتے ہوئے آپکو میری گذارش مبالغہ آمیز معلوم ہوگی لیکن صرف ایک نکتہ کہکر میں آپکی تمام بدگمانیاں دور کردینا چاہتا ہوں۔ لعنت اللہ علی الکاذبین یعنی جھوٹوں پر خدا کی لعنت امید ہے کہ اس آیت قرآنی کو درمیان میں لانے کے بعد آپ میرے بیان کو غلط اور مجھے عام اشتہار بازوں کی طرح نعوذ تصور نہ فرمائینگے۔ اور میں اپنی حیرت انگیز ایجاد لطف حیات کے متعلق جو عرض کرونگا اُسے حرف بحرف صحیح تصور فرمائیں گے۔

لطفِ حیات کیا ہے؟ سفوف اور طلا

اسکا استعمال جملہ اعضا جسمانی کی قدرتی طاقت یا قدرتی ساخت کو جو بے عنوانیوں یا غلطکاریوں کی وجہ سے ضایع ہوچکی ہوں از سر نو واپس لے آتا ہے۔ اعضاء رئیسہ میں بے مثل طاقت پیدا ہوجاتی ہے تمام اعصابی کمزوریاں دور ہوجاتی ہیں مایوس نوجوانوں کو تباہی سے بچا کر نئی امنگ نئی جولانی اور نئی روح سے مالامال کردیتا ہے چہرہ بارونق اور رنگ سرخ و سفید ہوجاتا ہے۔ بوڑھوں کو جوان اور نوجوانوں کو عجیب و غریب طاقت بخشتا ہے انشاء اللہ وہ تمام باتیں آپ اسمیں پائینگے جسکی آپکو جستجو ہے۔ واقعی اکسیر ہے۔ گوہر مراد کی قیمت کل بکس للعہ ر، محصول ۸ ر

خدانخواستہ اگر فائدہ نہ ہو تو حلفیہ تحریر آنے پر قیمت واپس

حکیم مولوی نظیر علی لکھنوی کوچہ چیلاں دھلی

اخبار ہائسکیپ کی رائے

ہم اس بات کو بڑی خوشی سے ظاہر کرتے ہیں کہ حکیم نظیر علی صاحب لکھنوی کی دوا لطف حیات جس کا اشتہار بعنوان گوہر مراد عرصہ چھ سال سے تمام اخبارات میں شائع ہو رہا ہے۔ ہم نے اکثر اس کی تعریف سُنی ہے۔ نیز حکیم صاحب موصوف نے ہم کو بہت سے خطوط اس کی تصدیق میں دکھائے جو لوگوں نے بعد صحت بطور شکریہ دوائی کی تعریف میں حکیم صاحب کو روانہ کئے تھے یہ خطوط مختلف مقامات رنگون کلکتہ پنجاب یوپی مارواڑ حیدرآباد وغیرہ کے تھے ہم بھی سفارش کرتے ہیں کہ جو لوگ ضرورتمند ہوں وہ حکیم صاحب کی دوا آزمائیں

گلدستہ غوثیہ

بڑے پیر صاحب کی درگاہ کا تحفہ

ناظرین یہ وہی نقش معظم ہے جس کو بست و ربست کہتے ہیں۔ اسی کو اسم اعظم مانا گیا ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کی تمام دنیا کو تلاش ہے اور جس کو بڑے بڑے بزرگ اپنے سینوں میں مخفی رکھتے چلے آئے ہیں۔ یہ نقش حضرت غوث الاعظم خواجہ محی الدین شیخ عبد القادر جیلانی کی درگاہ شریف کے دروازہ پر کندہ ہے جو میرے مرشد کامل نے مجھکو بطور یادگار عنایت فرمایا اور اسکی مجھکو باقاعدہ اجازت بخشی۔ یہ نقش ہر کام کیلئے اکسیر ہے۔ یہ نقش جسکے بازو پر ہوگا اُسکو لوگ عزت کی نگاہ سے دیکھیں گے اور اُسکے کاروبار میں بیحد ترقی ہوگی۔ اس نقش کے اکسیر صفت ہونے پر تمام دنیا کے عالموں کا اتفاق ہے مسلمانوں کے تنزل اور غربت کو دیکھتے ہوئے میں اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ جو بھائی بے روزگاری کی مصیبت میں مبتلا ہوں وہ فوراً مجھ سے یہ تحفہ طلب کریں۔ انشاء اللہ بہت جلد ہی روز میں غربت دور ہوگی اور غیب سے روزی ملیگی۔ یہ نقش جمعرات والے دن بڑے پیر صاحب کی نیاز دلاکر اور وہاں کی دھونی دیکر بازو پر باندھا جاتا ہے۔ اور یہ کچھ فیس صرف خرچ اشتہارات اور نیاز بزرگان کیلئے مبلغ ۸ر کے ٹکٹ ارسال فرماکر مفت طلب کریں۔ دعاگو پیرزادہ علیہ السلام

سجادہ نشین حضرت کمبل پوش دھلی

محبّت کے دو عمل

عمل نمبر ۱ سفلی - ہر مذہب والا عامل بن سکتا ہے۔ مسلمانوں کے لئے مناسب نہیں ۔

عمل نمبر ۲ ۔ صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے ۔ بیس سال کا تجربہ ہے کبھی سر مو خطا نہیں ہوتا جب تلاش تھی ہزاروں روپے برباد کئے اسلئے میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر اور گواہ بنا کر بے کم و کاست قلیل ہدیہ پر ان کا اعلان کرتا ہوں ۔ کہ امیر غریب سب فائدہ اٹھائیں جن بھائیوں کو میری گزارش پر اعتبار ہو اور ساتھ ہی ایک حلف نامہ اس اقرار کا ارسال کریں کہ اپنی ذات کے سوا کسی کو نہ بتلائیں گے ۔ طلب فرمائیں ۔

عمل ۱ ۔ اس عمل کے پڑھنے میں پندرہ منٹ صرف ہوتے ہیں ۔ اس کا عامل ایک سال اس پر قابض رہتا ہے ۔ اور دوسرے سال کے لئے دوبارہ پندرہ منٹ صرف کر کے پڑھنا ہوتا ہے ۔ صرف تین منٹ میں تین مرتبہ پڑھ کر معشوق کو تابعدار بنایا جا سکتا ہے ۔ ہدیہ صرف پانچ روپیہ ۔

عمل ۲ ۔ ایک آیت قرآنی ہے جو صرف ایک سطر ہے ۔ اکتالیس سیاہ مرچوں پر اکتالیس اکتالیس مرتبہ پڑھی جاتی ہے ۔ اور مرچیں آگ میں جلائی جاتی ہیں ۔ پہلے دن میں انشاء اللہ مطلوب مسخر ہوگا ۔ ہدیہ دو روپے (عہ)

عمل ۳ ۔ برائے ترقی روزگار عجیب و غریب مجرب عمل ہے ۔ ہفتہ میں صرف چہار شنبہ کو پڑھا جاتا ہے ۔ پڑھنے میں صرف آدھ گھنٹہ صرف ہوتا ہے ۔ اسکی برکت سے روزی روزگار میں اسقدر ترقی ہوتی ہے کہ اللہ کی قدرت کا ظہور نظر آتا ہے ۔ پڑھنا بہت آسان ہے ۔ ایک روپیہ چار آنہ میں دس آدمی پڑھنے کی اجازت لے سکتے ہیں علاوہ ہر سہ عملیات کے پڑھنے میں نہ کسی کا خوف و خطرہ ۔ نہ پرہیز ۔ وقت نہ مکان سے کہیں باہر جانا پڑتا ہے ۔ جو صاحب عمل نمبر ۲ و ۳ ایک ساتھ طلب فرمائینگے ان سے ہدیہ صرف چھ روپیہ لیا جائیگا ۔ اگر بذریعہ منی آرڈر روپیہ روانہ کریں تو محصولڈاک معاف ۔ بذریعہ رجسٹری یا وی پی لفافے میں عمل روانہ کئے جائینگے ۔

فضل شاہ عامل دہلی

دی مینوفیکچرز لائف انشورنس کمپنی

قایم شدہ ۱۸۸۷ء

دفتر بمبئی - ۱۵ - کاؤس جی پٹیل سٹریٹ فورٹ بمبئی

سرمایہ زاید ایک کروڑ ستر لاکھ پونڈ

۱۹۲۸ء میں جو کام کیا گیا۔ اُس کی تعداد ۲۶ کروڑ سے زاید ہے ۔ ہندوستانی

سکوریٹیز میں جو سرمایہ لگایا ہوا ہے اُسکی تعداد ۴۸ لاکھ روپیہ سے زاید ہے

روپیہ کی ادائگی نہایت عجلت سے کیجاتی ہے

جو روپیہ پریمیم کا ادا نہ کرسکیں اُنکے لئے پریمیم جاری رکھنے کے لئے اعلیٰ اسکیم

چارسال جاری رہنے کے بعد پولیسی خود بخود جاری رہیگی اور کسی کام کرنیوالے عضو کے بیکار ہونے پر رقم ادا کردیجاتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایجنسی کمیشن اور کم سے کم پریمیم کیلئے ہیں لکھیں

اس بیمہ کمپنی کے متعلق جملہ معلومات فی الفور نیرنگِ خیال کے حوالہ سے طلب کیجئے ۔

ای - ایم - اے - ایجی روڈ - شملہ

عملیات روحانی کا زندہ کرشمہ

ہزاروں میں سے چند شہادتیں

جناب حکیم محمد علی صاحب :- معتمد و سند یافتہ یونانی و ڈاکٹری طبیہ کالج دہلی چوک فرید امرتسر تحریر فرماتے ہیں۔ کہ قبل ازیں میاں سراج الدین صاحب جو میرے خاص دوست تھے ان کی بیوی کے لئے آپ سے تعویذات لے گئے۔ جن سے ان کو بہت فائدہ ہوا۔ روزانہ میں بھی پیچش کے صرف دو دست رہ گئے۔ اور باقی تعویذوں کے استعمال سے کلی صحت ہوگئی۔ اب دو مریض آپ کی طرف اور بھیجے جاتے ہیں +

جناب عبدالمجید صاحب نیشاپوری بازار کوئٹہ تحریر فرماتے ہیں :- کہ میں نے چار عدد فلیتہ عملیات جلادی ہیں۔ اب پہلے سے مریضہ کو افاقہ معلوم ہوتا ہے۔ پانچویں بتی سے امید ہے کہ صحت کلی ہو جائے گی۔ ۲۵ روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال ہیں۔ رسید سے مطلع فرماویں۔ اور کوئی کارِ خدمت میرے لائق ہو تو تحریر فرمائیں +

جناب ایم۔ ایس۔ عباسی۔ ہوٹل انی سٹریٹ چیمبرلین سٹریٹ ۱۲ بمبئی تحریر فرماتے ہیں :- کہ مریضہ کو افاقہ معلوم ہوتا ہے اور عملیات بذریعہ وی پی ارسال فرمادیں۔ مشکور ہوں گا۔ باقیماندہ عملیات سے امید ہے کہ آرام ہو جائیگا +

جناب ایم۔ اے حمید باغبانپورہ لاہور سے تحریر فرماتے ہیں کہ میں حکیم کریم الدین صاحب انارکلی لاہور کو قبل ازیں صحیح معنوں میں عامل نہیں سمجھتا تھا۔ اور عام اشتہار بازوں کی طرح گردانتا تھا لیکن اب مشکل و مصیبت میں لا علاج بغیر آسیب کے متعلق آزمایا گیا جس سے پورا یقین ہوگیا۔ کہ حکیم صاحب علم و عمل میں مکمل ہیں

نوٹ۔ اگر آپ کسی بیماری میں مبتلا ہوں جس پر دوا اثر نہیں کرتی۔ جادو۔ نظر بد۔ یا کسی سے ناچاقی ہوگئی ہے۔ یا بے روزگاری یا کسی مقدمہ سے حیران ہو چکے ہوں تو بذریعہ عملیات دے سکتے ہیں۔ یہ عملیات فیس پیشگی بذریعہ وی پی بھیج دی جائیں گی۔ آپ کسی قسم کی مصیبت میں مشورہ لینا چاہتے ہیں۔ تو فی مشورہ پیشگی ایک روپیہ۔ بذریعہ وی پی ایک روپیہ جبکہ خط و کتابت جوابی ہو۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔ خط و کتابت کرتے وقت اخبار کا حوالہ دیں +

المشتہر

منیجر دفتر عامل حکیم کریم الدین۔ انارکلی۔ لاہور

اصغر علی محمد علی عطر لکھنؤ

REGD. No. L. 1708.

The Nairang-i-Khiyal, Lahore,

5,000 منیجر رسالہ نیرنگ خیال [illegible] لاہور پانچ آنہ

سلسلہ تربیت الانسان قانون نوعی

دوشیزہ

Price Rs. 3-8 only

نیرنگِ خیال ہندوستان بھر کے علمی ادبی رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا اور سب سے زیادہ مقبول ہے

مضامین کے لحاظ سے نیرنگِ خیال ادبی رسائل میں یکتا اور لاثانی ہے

(تعداد اشاعت پانچ ہزار)

جلد ۹ — نمبر ۶۴

چیف ایڈیٹر اینڈ پروپرائٹر۔ حکیم محمد یوسف حسن — ایڈیٹر۔ حنیف ہاشمی

قیمت فی پرچہ ۵ر — ڈیلر کمپنی بک سٹال پر ۵ر

قیمت سالانہ بذریعہ وی پی معہ محصول ڈاک ۳؎ — ممالک غیر سے سالانہ ۸ شلنگ

فہرست مضامین

بابت ماہ اکتوبر ۱۹۲۹ء

کریمی پریس لاہور میں باہتمام میر قدرت اللہ پرنٹر چھپا۔ اور حکیم محمد یوسف حسن پبلشر نے دفتر نیرنگ خیال بارود خانہ لاہور سے شائع کیا

(۵۹۶)

شذرات

ناظرین نیرنگ خیال یہ سُن کر مسرور ہوں گے کہ نیرنگ خیال کے صیغۂ ادارت میں جناب مولانا حنیف ہاشمی صاحب کا اضافہ ہوا ہے۔ مولانا حنیف ہاشمی ایک نوجوان ادیب ہیں۔ جنہوں نے فلسفۂ مذاہب و تمدن کا عمیق مطالعہ کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ فرانسیسی۔ انگریزی اور فارسی زبانوں کے ادبیات سے اچھی طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ اور اُردو زبان میں ان غیر زبانوں کے اصلی مطالب و مفہوم کو کامیابی کے ساتھ منتقل کر سکتے ہیں۔ مولانا حنیف ہاشمی صاحب کی اعانت سے نہ صرف نیرنگ خیال میں مزید دلچسپی کا سامان پیدا ہوگا۔ بلکہ خاکسار ایڈیٹر نیرنگ خیال کے فرائض کا بوجھ کسیقدر ہلکا ہو جائے گا۔ پورے ایک سال سے ہفتہ وار تازیانہ اور ماہوار رسالہ نیرنگ خیال کے ادارتی فرائض میں یکہ و تنہا بجا لا رہا تھا۔ اب مجھے بھی ذرا سستانے کا موقع ملیگا۔ اور میں نیرنگ خیال و تازیانہ کو بہتر اور دلچسپ بنانے کے لئے زیادہ اطمینان سے توجہ دے سکونگا ◆

عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کی اُردو پروفیسری

اعلیحضرت حضور نظام نے جس قدر کارہائے نمایاں اپنے دورِ حکومت میں کئے ہیں۔ اُن میں عثمانیہ اُردو یونیورسٹی کا قیام ایک بے مثال کارنامہ ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی نے ہندوستان کی مشترکہ زبان اُردو میں طلبا کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ قایم کرکے ملک کی ایک بہت بڑی ضرورت کو پورا کر دکھایا ہے۔ اُردو یونیورسٹی کی علمی کاوشیں ملک کے سامنے ایک گرانبہا اور گرانقدر لٹریچر مہیا کر رہی ہیں۔ جس کی قدر و قیمت کا اندازہ آپ کے احاطۂ اختیار سے باہر ہے ◆

عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی اُردو پروفیسری پر مولانا وحید الدین سلیم نے کچھ عرصہ کام کیا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ عمر نے وفا نہ کی اور آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ مولانا وحید الدین صاحب سلیم مرحوم کا جانشین اس قحط الرجال میں تلاش کرنا بہت مشکل امر تھا۔ لیکن کارکنان عثمانیہ یونیورسٹی کی مردم شناسی کی داد دینی پڑتی ہے کہ اُنہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کی پروفیسری کے لئے مولانا عبد الحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو کو منتخب فرمایا

مولانا عبد الحق صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اُردو زبان کی جتنی منظم خدمت افراد کی مساعی کی شرمندۂ احسان ہوسکتی ہے اُس میں مولانا عبد الحق صاحب کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔ بقول مولانا سید جالب صاحب دہلوی مدیر روزنامہ ہمت لکھنو "اُردو کی دُنیا میں بھلا کون شخص ہے۔ جو مولوی عبد الحق صاحب سکرٹری" انجمن ترقی اُردو" کے نام یا اُن کے علمی وادبی کارناموں سے واقف نہیں۔ یہ صرف مولوی صاحب کی ہمت و جوش کا ایک نتیجہ ہے کہ انجمن ترقی اُردو اپنی زندگی کے

آخری چند سال میں یہ ایسی اہم و قابل قدر کتابیں شایع کرنے کے قابل ہوئی ہے۔ جن کی ہندوستان سے ولایت تک دھوم مچ گئی ہے۔ اور جو اُردو لٹریچر میں ایک بیش قیمت اضافہ تسلیم کیجاتی ہیں۔ اس کے علاوہ انجمن کا رسالہ "اُردو" مولوی صاحب کی زیر ادارت اُردو میں خالص ادبی مباحث کا ایک میدان مہیا کرتا ہے۔ جس سے ملک کے مشاہیر اہل قلم برابر فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مولوی عبدالحق صاحب نے مرزا لطف علی کے تذکرہ "گلشن ہند" سے لے کر لالہ منسارام کے تذکرہ "چمنستان" تک جو چند روز قبل ہی انجمن ترقی اُردو کے دارالاشاعت اورنگ آباد سے شایع ہوا ہے۔ جو بسیط مقدمات لکھے ہیں وہ ان کی زبردست قابلیت و عمیق مطالعہ ادب اُردو کا ایک بیّن ثبوت ہیں اور عثمانیہ یونیورسٹی کی یہ ایک خوش قسمتی ہے۔ کہ وہ مولوی صاحب کی گرانقدر خدمات اپنے ہاں اُردو پروفیسری کے لئے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ سر رشتہ تعلیم کی انسپکٹری یا انٹرمیڈیٹ کالج کی پرنسپلی پر مولوی عبدالحق کا کام خواہ کیسا ہی قابل تحسین رہا ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جس کام کی اُن میں خاص اہلیت ہے۔ وہ اب اُن کو تفویض کیا گیا ہے۔ اور نظام گورنمنٹ نے ایسے جوہر قابل کو جامعہ عثمانیہ میں موزوں مقام پر جگہ دے کر نہ صرف اپنی یونیورسٹی کو فائدہ پہنچایا ہے۔ بلکہ زبان اُردو پر ایک عظیم احسان کیا ہے۔ جو اس کے اسی قسم کے احسانات سے گراں بار ہے۔ مولوی صاحب نے جو وسیع ذخیرہ اُردو ادب کے جواہر پاروں کا گذشتہ تہائی صدی میں ہندوستان کے تمام حصّوں اور یورپ کے کتب خانوں سے فراہم کیا ہے۔ اس سے اب عثمانیہ یونیورسٹی کے منتظمین کو فائدہ اُٹھانے کا موقعہ حاصل ہوگا۔ اور دیگر ذمہ داریوں سے نجات پاکر اُردو کی خالص خدمت پر مامور ہونے کے بعد اُمید ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں وہ اس لٹریچر کو نادر و بیش بہا چیزوں سے مالا مال کر سکیں گے۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں اُردو کی پروفیسری پر مولوی عبدالحق کا تقرر یقیناً یونیورسٹی کے لئے مایۂ ناز ہے۔ اور اس نقصان عظیم کی پوری تلافی کرنے والا ہے جو مولوی وحیدالدین سلیم کی وفات سے یونیورسٹی مذکور کو پہنچا تھا"۔

ہمیں اُمید کامل ہے کہ مولانا عبدالحق کے تقرر سے عثمانیہ یونیورسٹی کو بے حد فائدہ پہنچیگا۔ مولانا عبدالحق کے لیکچر اور اُن کی تصانیف اُردو زبان کو زندہ جاوید بنادیں گے ✦

اسی سلسلہ میں اگر ہم کارکنان مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی خدمت میں ایک بار پھر عرض کریں کہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی اُردو پروفیسری پر اگر جناب سید سجاد حیدر صاحب کا تقرر عمل میں آجائے تو اس سے مسلم یونیورسٹی کے اس شعبہ کو گرانقدر فوائد حاصل ہونے کی توقع ہے۔ اور اتنی بڑی شخصیت کو مسلم یونیورسٹی کے سٹاف میں لینے کے لئے اگر اس عہدہ کی تنخواہ میں کچھ اضافہ بھی کرنا پڑے تو اُس سے دریغ نہیں کرنا چاہئے ✦

ہندوستانی اکاڈمی کے زیر اہتمام لٹریری کانفرنس

صوبہ متحدہ میں ایک علمی مجلس ہندوستانی اکاڈمی کے نام سے قایم کی گئی ہے۔ جسے نیم سرکاری حیثیت حاصل ہے۔ ہندوستانی اکاڈمی کی صدارت کے فرائض جناب ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو سرانجام دے رہے ہیں جن کی رہنمائی میں یہ انجمن ملک کی علمی و ادبی خدمات کے فرائض بحسن و خوبی ادا کر رہی ہے +

حال میں ہی ہندوستانی اکاڈمی کے سکرٹری جناب تاماچند صاحب ایم اے ڈاکٹر آف فلاسفی (آکسفورڈ) کی طرف سے ایک اطلاع انگریزی زبان میں موصول ہوئی ہے جس میں اس امر کا اعلان کیا گیا ہے کہ ہندوستانی اکیڈمی کی زیر سرپرستی دسمبر ۱۹۲۹ء میں ایک لٹریری کانفرنس منعقد کرنے کا ارادہ ہے۔ جس میں اُردو ہندی کے مستند فاضل جمع ہو کر باہمی تبادلۂ خیالات کریں اور ان دونوں زبانوں کے لسانی مسائل کو زیر بحث لائیں۔ اس کانفرنس میں متعدد مضامین بھی پڑھے جائیں گے۔ جن بحثوں پر مضامین طلب کئے گئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :-

(۱) ادبی تنقید (۲) تاریخ ادب (۳) علم اللسان (۴) فلسفہ و سائنس (۵) تاریخ آثارِ قدیمہ +

کانفرنس کا پروگرام حسب ذیل ہوگا :-

(۱) عام کانفرنس - ۱۴ر دسمبر چار بجے شام سے سات بجے شام تک +

(۲) شعبہ وار جلسے اور مباحثے - ۱۵ر دسمبر ۹½ بجے صبح سے ۱۱½ بجے دوپہر تک +

(۳) لیکچر مولوی عبدالحق صاحب پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی - ۲ بجے سے ۶ بجے شام تک، ۱۴ر ۱۵ر دسمبر ۶ بجے شام سے ۷ بجے شام

(۴) لیکچر بابو بھگوانداس صاحب - ۱۶ر و ۱۷ر دسمبر - ۶ بجے شام سے ۷ بجے شام تک +

حضرات اہل قلم سے درخواست ہے کہ اپنے تحریر کردہ مضامین کانفرنس سے ایک ماہ قبل یعنی ۱۴ر نومبر تک بھیج دیں۔ اور ان کا ملخص بھی روانہ کریں +

اہل علم حضرات سے استدعا ہے کہ وہ کانفرنس میں شریک ہوں اور عنوانات بالا پر مضامین لکھیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ کانفرنس بمقام الہ آباد منعقد ہوگی۔ مگر ہمارے خیال میں اس کے اجلاس صوبہ متحدہ کے مختلف شہروں میں ہونے چاہئیں ایک ہی مقام کا تعین اس کی ترقی میں سد راہ ثابت ہوگا +

مسلم اکاڈمی لکھنؤ

لکھنؤ کے اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ وہاں مسلم اکاڈمی بھی قایم ہے جس کے ایک جلسہ کی روئداد سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ذمہ دار اہل علم حضرات شامل ہیں۔ ہم مشکور ہوں گے اگر مسلم اکاڈمی لکھنؤ کے ارباب حل و عقد نیرنگ خیال کے ذریعہ سے اغراض و مقاصد کی تشہیر کریں اور جو کچھ کام انہوں نے آجتک

کیا ہے یا آئندہ کرنا چاہتے ہیں۔ اُس کی تفصیل برائے اشاعت بھیج دیں +

اُردو اکاڈیمی لاہور

اسی سلسلہ میں اگر پنجاب، زندہ دلانِ ہندوستان کا وطن۔ جو اُردو کی خدمت میں کسی دوسرے صوبہ سے کم کوشش نہیں کر رہا۔ اُردو کی خدمت کے لئے کوئی منظم اقدام کرے۔ تو اُردو کی ترقی اور استحکام کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہوگا۔ ضرورت ہے کہ پنجاب میں علامہ سر اقبال مدظلہ العالی کی رہنمائی میں اُردو اکاڈیمی کی بنیاد رکھی جائے اور اُسے بھی وہی نیم سرکاری حیثیت حاصل ہو جو ہندوستانی اکاڈیمی کو صوبہ متحدہ میں حاصل ہے۔ اگر پنجاب کے سربرآوردہ اصحاب نے اس جانب توجہ کی تو پنجاب میں اردو اکاڈیمی قایم ہو جانا چنداں مشکل نہ ہوگا

مخزن کا افسانہ نمبر

نمبر کا لفظ بہت بدنام ہو چکا ہے۔ اب ہر رسالہ اور ہر اخبار کوئی نمبر نکال لینا اپنے بائیں ہاتھ کا کرتب سمجھتا ہے۔ دو چار نئے مضمون۔ اور ایک دو درجن پرانے مضامین جمع کر کے ایک نمبر بنالیا جاتا ہے۔ حجم میں ایک آدھ کاپی کا اضافہ کر لیا۔ ایک دو تصویریں لگادیں۔ بس اس کا نام نمبر ہے۔ نمبروں کی اس ارزانی کو دیکھ کر اب شائقین علم و ادب بہت بدظن ہو چکے ہیں۔ اور جب تک وہ کسی خاص نمبر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لیں انہیں اشتہار بازی سے یقین نہیں آتا +

اگر سچ پوچھیے تو مخزن کا افسانہ نمبر حقیقی معنوں میں ایک خاص نمبر ہے۔ مخزن کا افسانہ نمبر رسائل کے عام سائز کے ڈیڑھ سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ کاغذ اور کتابت کے لحاظ سے اُسے نظر فریب اور دلکش کہہ سکتے ہیں۔ کاغذ نہایت اچھا لگایا گیا ہے۔ چھپائی ایسی ہے کہ مطبع کی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ ٹائیٹل سادگی اور خوشنمائی کا مرقع ہے یہ تین رنگ میں چھپا ہے۔ اور اس میں وہ جذب ہے جو خریدار کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ظاہری حسن و دلکشی میں چند تصاویر نے بھی اضافہ کر دیا ہے جو اس نمبر کی مناسبت سے بہترین کہی جا سکتی ہیں۔ افسانہ نمبر میں مغرب کے بہترین افسانہ نگاروں موپاساں۔ بالزک۔ آسکر وائلڈ۔ برکا چیو۔ ایڈگر ایلن پو۔ کپلنگ۔ گالزوردی۔ ٹرجنیف۔ چیخوف وغیرہ کی تصاویر بھی ہیں۔ شروع میں ایک آرٹ کی تصویر ہے جسے "افسانہ خواں" کا نام دیا گیا ہے۔ مولانا حفیظ بغیر تصاویر کی دلکشی کے رسالہ کو کامیابی سے چلا رہے ہیں۔ اس لئے اگر وہ اس نمبر میں کوئی تصویر بھی شایع نہ کرتے۔ تب بھی یہ نمبر ہر طرح سے کامیاب تھا اور سچ پوچھئے تو تصاویر کی ضرورت مضامین سے ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ تصاویر رسالہ کو صحیح معنوں میں مصور بناتی ہیں۔ اگر ان کے ساتھ چند ہندوستانی افسانہ نگاروں یا اُن اصحاب کی تصاویر بھی شایع کی جاتیں جن کے افسانے اس قسم میں شایع ہوئے ہیں تو بہت بہتر تھا۔ شروع میں مولانا نظامی قدوسی صاحب ایم اے نے فن مختصر افسانہ نویسی کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے۔ شذرات و اشارات کی تحت میں ملا رموزی صاحب نے ملکی قومی اور ادبی "افکار و حوادث"

نظر ڈالی ہے۔ اور ہم اُن کے مشکور ہیں کہ اس طرح سے شاید "ایک غلطی" کا خمیازہ بھگتنے کے لیے چند سطروں سے ہماری بھی تواضع کی گئی ہے۔ اگر اتنی سی بات سے اُن کا کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ تو چشم ما روشن دلِ ما شاد +

افسانوں کے علاوہ پروفیسر آثر ایم اے نے آرٹسٹ نامی کتاب پر ایک تنقید بھی لکھی ہے جو علمی ادبی خصوصاً نکتہ چیں حلقوں میں خاص دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ اس قسم کی تنقیدیں اُردو زبان کے لئے بہت مفید ہونگی اور ہمارے آئندہ کے مترجم مصنف اور مولف ان سے کچھ نہ کچھ سبق حاصل کرینگے +

افسانہ نمبر میں ۱۰ افسانے ہیں اور لطف یہ ہے کہ کوئی طویل افسانہ اس نمبر کے رُبع یا ثلث حصہ پر پھیلا ہوا نہیں۔ افسانہ نگار اگر اس طرح سے مختصر افسانے لکھا کریں تو ایک معمولی نمبر میں بھی پانچ سات افسانے شایع ہو سکتے ہیں +

افسانہ نمبر کے بیشتر افسانے دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ اور ہر ایک افسانہ کے متعلق علیٰحدہ علیٰحدہ لکھنا بہت وقت چاہتا ہے۔ اس لئے صرف اسقدر لکھا جاتا ہے کہ حضرت حفیظ نے اس نمبر کو مرتب کرنے میں بہت زیادہ کاوش سے کام لیا ہے اور ان دنوں جبکہ وہ شاہنامۂ اسلام جیسے مفید ملک و ملت کام میں بیحد مصروف تھے۔ اس قسم کا کامیاب نمبر شایع کرنا اُردو علم ادب کی بہت بڑی خدمت ہے +

مسٹر مجید ملک بی اے ایل ایل بی ایڈیٹر مسلم اوٹ لک نے "ایک مکالمہ" لکھا ہے جو بیحد دلچسپ ہے۔ جن لوگوں نے نیرنگ خیال کے سالنامہ ۱۹۲۸ء میں دو کاٹھ کی پتلیوں کا لطف اُٹھایا تھا۔ وہ اس قسم کے مکالمہ سے بہت لطف اندوز ہونگے۔ قیمت ایک روپیہ۔ منیجر رسالہ مخزن بھاٹی دروازہ لاہور سے طلب کیجئے +

نیرنگِ خیال کا خاص نمبر

نیرنگ خیال کا خاص نمبر سالنامہ ہے جو نومبر کے آخر ہفتہ میں شایع ہوگا۔ اس لئے آپ کو دسمبر کے پہلے ہفتہ سے قبل نہ مل سکیگا۔ جن اصحاب نے درخواستیں بھیجدی ہیں۔ اُن کے نام کی چٹیں تیار کر لی گئی ہیں۔ اور جن اصحاب نے ابھی تک توجہ نہیں کی وہ اس سے محروم رہیں گے۔ یہ آخری اطلاع ہے۔ اس کے بعد کا پرچہ یکم نومبر کا پرچہ ہوگا جس کے بعد کا پرچہ سالنامہ کے بعد ہی شایع ہوگا +

ناظرین نیرنگ خیال کو معلوم ہوگا کہ نومبر اور دسمبر میں شایع ہونے والے رسائل حسب دستور شایع ہوں گے۔ سالنامہ بالکل علیٰحدہ چیز ہوتی ہے۔ وہ نیرنگِ خیال کے خریداروں کو معہ محصولڈاک ۱۲؍ میں ملتا ہے۔ غیر خریداروں کو معہ محصول ڈاک ۱۲؍ ۱ میں۔ پس اس چار آنہ کی رعایت سے فائدہ اُٹھایئے۔ اور وقت پر یہ نایاب گراں پایہ اور بے مثل ادبی مرقع گھر بیٹھے وصول کر لیجئے۔ اگر دس روپیہ قیمت کی کتابوں سے بہتر اور ارزاں نہ ہو تو بیرنگ واپس

منگوا لیجئے ۔

سالنامہ کی تمام تر تیاری کا راز بالکل پردہ اخفا میں رکھا گیا ہے۔ البتہ اس کی ایک ہلکی سی جھلک ہم آئندہ نمبر میں پیش کر سکیں گے۔ آپ سے صرف ایک ہی درخواست ہے کہ آج ہی ایک کارڈ بھیجکر اپنا نام رجسٹر کرا لیجئے۔ تاکہ آپ کا نمبر محفوظ رکھا جائے ۔

کیا آپ نے کارڈ لکھ دیا ہے ؟

کیا آپ آج ہی کارڈ لکھیں گے !!

تصاویر | نیرنگ خیال کے اس نمبر میں ایک سہ رنگی تصویر "ایک غریب لڑکی" شروع رسالہ میں لگائی گئی ہے ۔ یہ تصویر مغربی مصوری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس کے بعد "جوانی کا خواب" ایک تصویر ہے جو بہت کامیاب اور بہت ہی دلکش ہے۔ ایک حسین نوجوان لڑکی کا خواب اس سے دلکش اور سہانا اور کیا ہو سکتا تھا؟! اس کے بعد چار تصویریں ہندوستان کی ایک شمالی ریاست نیپال کے متعلق ہیں۔ گویا یہ ایک مصور مضمون ہے۔ اس قسم کے مضامین انشاء اللہ آئندہ بھی شایع ہوتے رہینگے۔

اور مضامین کے متعلق کچھ لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ نیرنگ خیال کے مضامین اور اس کے قلمی معاون ہندوستان بھر میں بہترین تسلیم کئے جاتے ہیں ۔

تازیانہ کا افسانہ نمبر | تازیانہ ایک ہفتہ وار اخبار ہے جو اخباری دلچسپیوں کے ساتھ علمی ادبی لطافتوں سے بھی لبریز ہوتا ہے۔ تازیانہ بیحد مقبول ہوا ہے۔ اور اس وقت اس کی اشاعت قریباً تمام ہفتہ وار اسلامی اخباروں میں سب سے زیادہ ہے۔ تازیانہ کا افسانہ نمبر شایع ہو گیا ہے جس میں تقریباً بارہ افسانے درج ہیں۔ اس طرح ہر ماہ کا آخری نمبر خاص نمبر ہوتا ہے جس میں کسی نہ کسی عنوان پر بہترین مستقل مضامین لکھوا کر شایع کئے جاتے ہیں۔ تازیانہ کی سالانہ قیمت چار روپے ششماہی دو روپیہ ہے۔ نیرنگ خیال کے خریداروں سے سالانہ تین روپیہ۔ اس رعایت سے فائدہ اٹھایئے اور ملک کے بہترین سیاسی اور ادبی ہفتہ وار باتصویر اخبار کی سرپرستی اختیار کیجئے ۔

ہفتہ وار تازیانہ خریدنا۔ اس میں اشتہار چھپوانا گویا نیرنگ خیال کی امداد کرنا ہے۔ اس لئے بھی ہمارا حق ہے کہ ہم آپ کو تازیانہ کی ہر ممکن ذریعہ سے امداد کرنے پر توجہ دلاتے رہیں ۔

افسانہ کشش محبت کی آخری قسط ہمیں دیر سے موصول ہوئی ہے۔ اس دلچسپ افسانہ کی آخری قسط آیندہ نمبر میں ہدیۂ ناظرین کی جائیگی ۔

ایڈیٹر

العظمت للہ

اس طرح جی کہ بعد مرنے کے　　یاد کوئی تو گاہ گاہ کرے

(مشہور اہل قلم مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی کے قلم سے)

نہ ہوئے مولوی عظمت اللہ خاں صاحب مرحوم ورنہ ان سے کہتا کہ حضرت آپ بہت جدت پسند ہیں۔ خدا کے لئے پرانے محاوروں پر بھی نظر ثانی کروا لیجئے۔ ذرا دیکھئے تو سہی پہلے محاورے موجودہ زمانہ میں کچھ معنی بھی دیتے ہیں۔ یا نہیں۔ مثلاً پہلے "بنئے کا تقاضہ" شدت کے تقاضہ کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ جب سے عدالتیں قایم ہوگئی ہیں۔ بنئے تقاضہ نہیں کرتے۔ بلکہ کھٹ سے نالش ٹھونک دیتے ہیں۔ بجائے اس محاورہ کے اگر "اڈیٹر کا تقاضہ" قایم کیا جائے تو کیا زیادہ مناسب نہ ہوگا۔ بنیا تو کچھ دے کر تقاضا کرتا تھا۔ بھلے آدمی بلا دیئے لئے تقاضے کرتے پھرتے ہیں۔ اور وہ بھی اس زور زوری کے ساتھ کہ خدا کی پناہ۔ اب اڈیٹر صاحب "نمایش" ہی کو دیکھ لیجئے۔ میرے سر ہیں کہ کوئی مضمون لکھو۔ میں کہتا ہوں "بھائی مجھے سرکاری کام سے ایک منٹ کی فرصت نہیں۔ دفتر میں کام کرتا ہوں گھر پر مثلیں باندھ کر لے جاتا ہوں۔ نہ گھر میں فرصت نہ کچہری میں فرصت۔ آخر آپ کا مضمون لکھوں تو کب لکھوں" جواب کی ستم ظریفی دیکھئے۔ فرماتے ہیں کہ "فرصت نہیں ہے تو نہ سہی مگر مضمون لکھ دو"۔ اب آپ ہی بتائیے۔ کہ ان کا تقاضہ سخت ہوا یا بنئے کا۔ جب ان کا تقاضہ سخت ہے تو پھر بچارے بنئے کو کیوں بدنام کیا جائے۔ اس محاورہ کو تبدیل کر کے حالات زمانہ کے لحاظ سے "اڈیٹر کا تقاضہ" کیوں نہ قایم کیا جائے۔ اس سے زیادہ ظلم ملاحظہ فرمائیے عدم تعمیل حکم کی یہ سزا تجویز کی جاتی ہے کہ اگر رسالہ کے اس نمبر میں آپ کا مضمون نہ ہوا۔ تو اردو ادیبوں کی فہرست سے آپ کا نام نکل جائے گا۔ سنتے چلے آئے ہیں کہ علم وہ شے ہے جس کو کوئی نہیں چھین سکتا۔ لیجئے علم بھی مال منقولہ ہوگیا جس کا دینا اور لینا صرف رسالہ اور اخبار کے اڈیٹروں کی مرضی پر منحصر ہوگیا۔ ان تمام باتوں کا میں تو وہی جواب دیتا۔ جو بنیوں کو "خانصاحب" دیا کرتے ہیں۔ لیکن کیا کروں مجبور ہوں مضمون نے لاچار کر دیا۔ بھلا ممکن ہے کہ عظمت اللہ خاں صاحب مرحوم کے حالات لکھنے کے لئے مجھ سے کہا جائے اور میں کہوں کہ میں نہیں لکھتا "اچھا بھائی لکھتا ہوں تم جیتے اور میں ہارا"

حیدرآباد میں تو شاید ہی کوئی ہوگا جو کچھ لکھتا ہو۔ اور عظمت اللہ خاں مرحوم سے مشورہ نہ کرتا ہو۔ محلہ لبستی میں مکان تھا۔ مکان کیا تھا خاصہ قفس خانہ تھا۔ پہلے تو صحن ہی

بہت چھوٹا تھا۔ پھر گملوں کی بھرما نے اس کو اور بھی تنگ کر دیا تھا۔ آ...ٹ ہا تھ کو تپلا سا برآمدہ۔

برآمدہ کے اندر تپلا سا لمبا کمرہ۔ کمرہ میں پانچ چھ کرسیاں۔ دو میزیں اور کتابوں کا انبار۔ لیجئے یہ جگہ تھی جہاں اس بچارے نے اپنی ساری عمر گزار دی۔ کمرہ کے سیدھی جانب جو میز تھی اُس کے پہلو میں اُن کی نشست تھی۔ تمام کرسی پر سب سے عظمت اللہ خاں بیٹھے ہیں۔ اِدھر اُدھر کی کرسیوں پر ملنے والے بیٹھے ہیں۔ کسی کے مضمون کی تعریف کر رہے ہیں۔ کسی کو مشورہ دے رہے ہیں۔ کسی کو سمجھا رہے ہیں۔ کسی کو پڑھا رہے ہیں۔ ایک ادیب کا دربار ہے کہ لگا ہوا ہے۔ جو شخص آتا ہے کچھ فائدہ ہی اُٹھا کر جاتا ہے۔ جس شخص سے ملتے ہیں اُستاد بن کر نہیں ملتے۔ صلاح کار بن کر ملتے ہیں۔ کچھ اُس کو بتاتے ہیں۔ کچھ اُس سے سیکھتے ہیں۔ غرض ایک دریا ہے جو اپنے کناروں کو سیراب کر رہا ہے اور ان شاداب کناروں کا خود بھی لطف اُٹھا رہا ہے۔ میں گیا۔ اور وہ اپنی کرسی سے اُٹھے ہوئے آپہنچے۔ آ کا۔ آئیے۔ بھائی صاحب آپ کی تو صورت ہی نظر نہیں آتی۔ آج کچھ لکھ لائے ہیں۔ ہاں آ کا۔ ہاں سنائیے۔ خدا کے لئے آپ اپنا قلم روکئے۔ آپکی یہ کوتاہ قلمی زبان اُردو پر ظلم کر رہی ہے"۔ مضمون سنتے۔ داد دیتے۔ جہاں کمزوری ہوتی۔ وہاں بہت کچھ اس طرح بتا جاتے کہ مشورہ تو کیا خاصی اصلاح ہو جاتی۔ مگر خدا کی پناہ۔ اُس کرسی پر بیٹھ کر کام کرنا بھی بس انہی کا کام تھا۔ کرسی سے ملی ہوئی ایک کھڑکی تھی۔ کھڑکی کے نیچے موری اور شراب خانہ۔ موری کی تعریف میں اتنا لکھنا کافی ہے کہ یہ موری میونسپل کمیٹی کی موری تھی اور بس۔ ڈاکٹر ہنٹ کی تو یہ رائے ہے کہ عظمت اللہ خاں کی بیماری اور موت کی اصل وجہ یہ موری ہے سامنے شراب خانہ تھا اس کی خوشبو الگ دماغ پھاڑے دیتی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ شام کی چہل پہل اور پینے والوں کی چھیڑ اور افعال بہت کچھ تفریح کا سامان بہم پہنچا دیتے تھے۔

عظمت اللہ خاں مرحوم کی شکل سے تو حیدرآباد کا بچہ بچہ واقف تھا۔ باہر والے اُن کی تصویر دیکھ کر واقف ہو جائینگے۔ مگر تصویر کی توضیح میں جب تک تحریر نہ ہو۔ ان کالے اور سفید دھبوں کا سمجھنا مشکل ہے۔ اس لئے لفظوں میں ان کی صورت کا نقشہ کھینچے دیتا ہوں۔ ان کا قد کوئی چھ فٹ کا۔ اور بدن اُسی قدر بھاری تھا۔ کسرت کرتے تھے۔ اس لئے جسم بہت ...ہ ہو کر سر سے پاؤں تک مردانہ حسن کا ایک نمونہ ... ہوا تھا۔ گول چہرہ۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں لمبی ستواں ناک ذرا چوڑا دہانہ۔ چوڑی ٹھوڑی۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں ... ہلکے بال۔ منڈی ہوئی داڑھی۔ نہایت سرخ سفید رنگ ہونٹوں پر ہمیشہ مسکراہٹ۔ گھر پر باریک ململ کا ... اور ... موری کا پجامہ پہنے رہتے۔ کسی سے ملنے گئے تو ... دار ٹوپی اور شیروانی پہن لی۔ ان پر ہندوستانی لباس خاصکر کالی ٹوپی بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ دفتر ... سوٹ پہن لیتے۔ معلوم نہیں کیا بات تھی کہ انگریزی ... بالکل نہیں کھلتا تھا۔ میں نے کئی دفعہ کہا بھی۔ لیکن ... یہی جواب دیا کہ "آ کا۔ انگریزی لباس سے ... کچھ خستی آجاتی ہے ... مجھے خود بھی اس ... ہے"۔

رسالوں میں ان کے مضمون برسوں نکلتے۔ لیکن خبر نہیں
وہ کب سوچتے تھے اور کب لکھتے تھے۔ دن رات ملنے والوں
سے انہیں فرصت نہ تھی۔ پھر خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان مضامین
کے لکھنے کا وقت کہاں سے نکالتے تھے۔ میں نے تو کبھی انکو
کچھ لکھتے ہوئے نہیں دیکھا +

ان کی تحریر پر کوئی رائے دینا مجھ جیسے کا کام نہیں
ہے۔ میں بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ بہت جدّت پسند تھے۔
خوش مذاقی اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اُن کا کوئی مضمون
اُٹھا لیجئے یہ پہلو اس میں ضرور نظر آئے گا۔ مطالعہ نے اُن کی
معلومات میں بہت اضافہ کر دیا تھا۔ اور مباحث علمی سے
اُن کو خاص دلچسپی تھی۔ اس لئے اُن کے مضامین پر ان دو
متضاد پہلوؤں نے ملکر ایک خاص شکل اختیار کر لی تھی۔ مثلاً
اُن کے مشہور مضمون "بنیا" ہی کو لیجئے۔ اس کی ابتدا اُنہوں
نے محض خوش مذاقی سے کی۔ لیکن رفتہ رفتہ منطقی بحثوں پر
اُتر آئے۔ پھر خیال آیا کہ میں یہ کیا لکھ رہا تھا اور کدھر نکل گیا
سنبھل گئے۔ ذرا سنبھلے تھے کہ بنئے کی شان میں کبیر کا دوہا خیال
میں آگیا۔ اُدھر چل نکلے۔ اور ایک ایسے مضمون کو جو محض
خوش مذاقی سے شروع کیا تھا۔ فلسفۂ الٰہیات پر لا کر ختم کیا۔
مگر باوجود ان تمام پلٹیوں کے کمال یہ کیا کہ مضمون کا سلسلہ نہ
ٹوٹا اور خوش مذاقی کا پہلو نہ چھوٹا۔ یہ ہے عظمت اللہ خاں
کی تحریر کا رنگ جس نے ایک طرف عام لوگوں میں مقبولیت
حاصل کی۔ تو دوسری طرف پختہ کار ادیبوں کے دلوں میں
ان کی عظمت کا سکہ بٹھا دیا +

ان کی دوسری خصوصیت اُردو زبان میں ہندی الفاظ
کا ٹھونسنا تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ جب اردو نے ہندوستان
میں جنم لیا ہے۔ اور جب اس کی بنیاد ہندی پر قائم ہے
تو ضرورت کے وقت الفاظ کیوں نہ اسی زبان سے لئے جائیں۔
وہ خود اس پر عمل کرتے تھے دوسروں کو بھی صلاح دیتے
تھے۔ اور دیکھا جائے تو دو تین لفظ تو اُنھوں نے ہندی کے
زمرہ میں داخل کر ہی دیئے۔ مثلاً لفظ سماج کو اُنہوں نے
اپنی تحریروں میں اتنے پہلوؤں سے بٹھایا کہ رفتہ رفتہ
کان اس لفظ سے مانوس ہو گئے۔ اور اب عام طور سے
"سماج" اور "سماجی" اُردو میں استعمال ہونے لگے ہیں +

وہ شاعر نہ تھے۔ مگر اسی ہندی کے شوق نے ان کو
زبردستی کا شاعر بھی کر دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اردو کی موجودہ
بحروں میں ہندی بحروں کا اضافہ ہو جائے۔ اگر مضمون لکھ
لکھ کر وہ ساری دنیا کو بھی سر پر اُٹھا لیتے تو ان کی کوئی نہ
سنتا۔ اُنہوں نے یہ کیا کہ ہندی پڑھی۔ ہندی بحروں پر
عبور حاصل کیا اور خود ہندی بحروں میں نظم لکھنی شروع کی۔
دیکھا دیکھی لوگوں نے بھی اس طرز کو اختیار کیا۔ اور بلا خوف تردید
کہا جا سکتا ہے کہ اب یہ ایک پختہ رنگ ہو گیا ہے۔ اگر
اس رنگ میں کوئی میر یا مرزا پیدا ہو گیا تو یقین جانئے کہ
موجودہ رنگ بہت ہلکا پڑ جائے گا۔ اور بجائے بلبل و گل
کے اُردو اشعار میں آم پر کوئل کوک سنائیگی +

ان کی ان جدّت پسندیوں پر قدامت پسند ناک بھوں چڑھاتے تھے
اعتراض پر اعتراض کرتے۔ مگر اس اللہ کے بندے کو جو کرنا تھا
وہ کئے گیا۔ یہ بھی پھر کر نہیں دیکھا۔ کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ ہاں
یہ ضرور ہے۔ کہ اپنے مضامین میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے

ہے چنانچہ اُن کے مضمون "بھیڑیا چال" میں یہ پہلو بہت نمایاں ہے۔ مضمون وہی خوش مذاقی سے شروع ہوا ہے۔ اس کے بعد معاشیات اور سیاسیات سے گزر کر آغائن بیگم کی لڑکی کی چوتھی پر آیا۔ اور پھر "ادب میں جو ذہنی بھیڑ چال" ہے اُس پر ختم ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کے لکھنے کی اصل غرض یہی پہلو تھا۔ اُنہوں نے طرح طرح سے اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ اور یہ ظاہر کیا ہے کہ لکھنے والوں کو ہرگز ان پُرانی لکیر کے فقیروں کا خیال نہ کرنا چاہئے۔ ان کو جو کچھ لکھنا ہے۔ وہ لکھے جائیں۔ زمانہ خود بتا دیگا کہ وہ صحیح رستہ پر تھے یا "پُرانی بھیڑیا چال والے"۔ ممکن ہے کہ ان کا طریقہ دوسرے اختیار کرلیں اور ایک نئی "بھیڑیا چال" کی بنیاد پڑجائے۔

اب اس سے زیادہ اس بارے میں کچھ لکھنا صرف مضمون کا بڑھانا ہے جس کے لئے نہ مجھے فرصت ہے اور آپ کو ضرورت۔ رسالہ المعلم میں "یادِ رفتگاں" کے عنوان سے ایک مضمون شایع ہوا تھا۔ مضمون کیا تھا دریا کو کوزہ میں بند کیا تھا۔ چند سطروں میں عظمت اللہ خاں صاحب مرحوم کی تحریر ہی پر تبصرہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ ایک حد تک اُن کی تعلیمی حالت کا بھی اظہار کردیا تھا۔ انہیں چند سطروں کو لکھ کر میں اپنے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں:۔

"مطالعہ کے شوق نے اُن کی معلومات کو وسعت دی اُن کی تحریر میں قوت پیدا کی۔ اُن کے قلم میں زور دکھایا۔ یہی مطالعہ تھا جس نے ان کو مختلف زبانوں کے طرز تحریر سے باخبر کیا مختلف خیالات سے آگاہ کیا۔ اور بالآخر اُنہوں نے اپنے خیالات کا اظہار ایسے طریقہ پر شروع کیا جس میں انگریزی کی متانت۔ فرانسیسی کی خوشی۔ فارسی کی ظرافت اور ہندی کے درد کی جھلک تھی۔ وہ کسی تاریخ دہلی میں پیدا ہوئے ہوں تو ہوئے ہوں۔ اُنہوں نے اجمیر کالج میں کبھی بہ حیثیت طالب علمی نام پیدا کیا ہو تو کیا ہو۔ اُنہوں نے انگریزی میں قطعہ (Sonnet) لکھنے میں کبھی سونے کا تمغہ پایا ہو تو پایا ہو۔ مگر صرف دو تاریخیں اُن کے نام کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہینگی۔ ایک وہ تاریخ جس روز اُنہوں نے اُردو ادب پر قلم اُٹھایا۔ اور دوسری وہ تاریخ جس دن دست قضا نے اُن کے ہاتھ سے قلم چھین کر اُن کو ہمیشہ کیلئے خاموش کردیا۔ للہ بس نی ہوس۔"

(براہِ راست نیرنگ خیال کے لئے)

مرزا فرحت اللہ بیگ

شریفانہ فطرت

درخت کی طرح جسم میں بڑھ جانا انسان کو بہتر نہیں بناتا۔ نہ ایک بلوط کے درخت کی طرح تین صدی تک اونچے کھڑے ہونا اور آخرکار سوکھا ہوا ٹھٹھ بن کر گرنا۔

اس سے کہیں زیادہ خوبصورت مئی کے مہینے کی سوسن ہے جو ایک دن رہتی ہے۔ اگرچہ رات کو گر کر مرجاتی ہے۔ مگر یہ روشنی کا پودا اور پھول تھا۔ خوبصورتی ہم کو دکھائی دیتی ہے۔ اور تھوڑی سی زندگی میں کمال حاصل کرنا ممکن ہے۔ (بی۔ جانسن)

ایم۔ اے۔ بی

بودھ سنگھ

(بودھ مت کے درویش)

[شعرو شاعری کے خوبصورت نشہ میں کچھ ایسے مخمور رہا کرتے تھے کہ علمائے سنسکرت فن وقایع نگاری کی طرف کبھی مائل نہ ہوئے۔ دوسرے ہندو دھرم میں برھما، وشنو، مہیش یہ تین رتن مانے گئے ہیں۔ مگر مہاتما بودھ نے بودھ ایتھ دھرم، بودھ سنگھ کو اپنا ملجاو منجا بنا کے نجات ابدی کی ایک نئی راہ نکالی تھی۔ اس لئے ان کے بعد بودھ دھرم اور ہندو دھرم میں جو تصادم ہوا وہ بڑا ہی خوفناک منظر تھا۔ خود بودھ مت والے کچھ ایسے تارک الدنیا درویش تھے جن کو تاریخ سے بحث تھی نہ جغرافیہ سے غرض۔ پھر اردو اگر مہاتما بودھ کی صحیح لائف یا سچے واقعات کو قلمبند کرنے کا حوصلہ کرے تو کس برتے پر۔ جنگلوں سے اکبار پنڈت جنار دن بھٹ ایم اے کے ایک ہندی مضمون پر نظر پڑ گئی جس میں فاضل ادیب نے جدید وقایع نگاری کے اصول پر اگرچہ صرف بودھ سنگھ کے واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ تاہم عموماً خاک پاک ہندوستان خصوصاً صوبہ بہار کی درویشی پر ایک معنی خیز تبصرہ ہے۔ ارباب تواریخ کے لئے اردو میں منتقل کئے دیتا ہوں۔ مترجم]

گوتم بدھ نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے وطن کے سوا غیر وطن میں بھی "بھکشو سنگھ" (فقرا کی جمعیتہ) قایم کی تھی اور یہ جمعیتہ دنیا کی مذہبی تاریخ میں اپنی وضع کی بالکل نئی نرالی تھی۔ خیال ہے کہ دنیا کی ایسی بہت کم مذہبی جماعتیں ہیں جو بودھ سنگھ (بودھ کی جمعیت) سے زیادہ مکمل ہوں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں یہ جمعیت اپنا جواب نہیں رکھتی۔

بودھ دھرم کی طرح بودھ سنگھ کی بنیاد ہندوستان کے طول و عرض میں پہلے ہی سے پڑ چکی تھی۔ بھکشو (فقیر) تپسوی (نفس کش)، سنیاسی (تارک الدنیا) جتی (ایک قسم کے فقیر) پری وراجک (ایک قسم کے درویش) وغیرہ ہوتے چلے آتے تھے۔ ویدک دھرم کے برہمچریہ، بان پرستھ اور سنیاس آشرم میں بھی بودھ سنگھ کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ بودھ مہاراج نے اپنی جمعیتہ کے واسطے جو اصول قایم کئے تھے۔ وہ گویا وہی تھے جو دھرم شاستر میں برہمچاریوں اور سنیاسیوں کے لئے لکھے گئے ہیں۔ رامائن، مہابھارت اور اپنشدوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت جا بجا مرتاض فقرا کے تپوبن اور آشرم موجود تھے۔ جہاں برہمچاری، بان پرستھی، پری وراجک اور سنیاسی خدا لگی بہت بڑی تعداد مل جل کے اپنی روحانی ترقی میں مشغول رہتی تھی۔ بودھ کی تصنیفات سے بھی اس امر کے کافی ثبوت ملتے ہیں کہ بودھ مہاراج سے پہلے اور

اُن کے وقت میں بھی گروہ کے گروہ پریوراجک اور سنیاسی ساتھ ساتھ گشت کیا کرتے تھے یا ایک ہی جگہ زندگی بسر کیا کرتے تھے "نیہ پٹک" میں لکھا ہے کہ گوتم بودھ کے زمانے میں "اُدبیل کسپ" "ندی کسپ" اور "گئو کسپ" نام کے تین جٹیل اروبیل نام کے گرام میں رہتے تھے۔ جو علی قدر مراتب پان سو تین سو اور دو سو جٹیلوں کے رہنما یا گرو ہوتے تھے۔ جٹیل ایک قسم کے بان پرستھی یا بیکھانس ہوتے تھے مذکورہ بالا تصنیف میں یہ بھی لکھا ہے کہ "سنجے" نام کے ایک پری وراجک راجگیر میں دو سو پچاس پریوراجکوں کے ساتھ بودھ کے زمانے میں رہتے تھے۔ ان کے علاوہ بودھ کی تصنیفات میں "نرگرنتھ" اور "آجی بکسن سدا" کے فقرا کا تذکرہ بھی بار بار آیا ہے۔ اور خود بودھ بھی پریوراجک رہ چکے تھے +

ان تذکروں سے پتہ ثابت ہوتا ہے کہ بودھ مہاراج کے بہت پہلے سے بھکشو، پریوراجک، سنیاسی وغیرہ کسی نہ کسی قسم کی جماعت یا سنگھ بنا کر اک جا رہا کرتے تھے۔ اس لئے بودھ مہاراج نے جو سنگھ قایم کیا تھا وہ کچھ نیا سنگھ نہ تھا۔ اس طرح کی جمعیتیں اُن کے زمانے میں بہت جاری ہو چکی تھیں فرق اتنا ہی تھا کہ بودھ نے صرف اُس زمانے کے مطابق ایک اپنا خاص سنگھ قایم کیا جو بڑھتے بڑھتے تمام ہندوستان ہی میں نہیں کل ایشیائی قوموں میں پھیل گیا +

اب ہم بودھ سنگھ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے آپ کو یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ

(۱) اس سنگھ میں کس قسم اور کس طرح کے آدمی داخل کئے جاتے تھے +

(۲) اس کے اندر فقرا کی زندگی کس طرح بسر ہوتی تھی +

(۳) اس کا آئینہ کار اور نظم کس طرح کے تھے +

۱۔ سنگھ میں داخلہ

سب سے پہلے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سنگھ میں کس قسم اور کس طرح کے آدمی داخل کئے جاتے تھے۔ اور اُن کے داخلہ کا طریقہ کیا تھا۔ لکھا ہے کہ جو عورت یا مرد تارک الدنیا ہو کر فقیرانہ زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔ وہ ذات پات یا اعلیٰ و ادنیٰ کا کچھ بھی خیال نہ کرکے بے تکلف سنگھ میں لے لیا جاتا تھا۔ بودھ کے پہلے "شدر" بان پرستھ، پریوراجک، یا بھکشو نہیں ہو سکتے تھے۔ مگر مہاتما بدھ نے اعلیٰ و ادنیٰ کے جاہلانہ خیالات کو لات مار کے شدروں کے لئے بھی بودھ سنگھ کا دروازہ کھول دیا تھا لیکن نیچے لکھے ہوئے آدمی چاہے وہ کتنے ہی اعلیٰ طبقہ کی ذات سے وابستہ کیوں نہ ہوتے۔ سنگھ میں داخل نہیں کئے جاتے تھے:۔

۱۔ جذامی یا کوئی دوسری چھوت والی بیماری والا +
۲۔ شاہی ملازم +
۳۔ چور، ڈاکو، لٹیرا +
۴۔ شاہی سزا یافتہ +
۵۔ مقروض +
۶۔ غلام +
۷۔ پندرہ سال سے کم عمر کا +
۸۔ نامرد +
۹۔ لنگڑا۔ لولھا۔ عیب دار +
۱۰۔ جس نے کسی کی ہتیا کی ہو +

جب کوئی شخص گھربار چھوڑ کے سنگھ میں داخل ہونے کے لئے آتا تھا تو پہلے یہ سوال ہوتا تھا کہ تم نے پرورجیہ اختیار کیا ہے یا نہیں؟ نہیں کہنے پر۔ پرورجیہ اختیار کرنے کے بعد سنگھ میں داخلہ کے وقت جو تعلیم دی جاتی تھی اُس کو اُپسپدا (توبہ) کہتے تھے۔ اُپسپد کی تعلیم کے بعد مرد فقیر اور عورت فقیرنی کہلاتی تھی۔ اُن کو سنگھ کے کل اختیارات ملتے تھے

بودھ کے ابتدائی زمانہ میں جو سنگھ میں داخل ہونا چاہتے تھے وہ بودھ کے پاس حاضر ہوتے تھے۔ اور خود بودھ مہاراج اُن کو پرورجیہ اور اُپسپدا دونوں کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ سب سے پہلے جن لوگوں نے بودھ کے ہاتھوں پرورجیہ اور اپسپدا سنسکار قبول کئے وہ پانچ فقیر تھے جو ابتدا ہی میں بودھ کو چھوڑ کر کاشی (بنارس) چلے گئے تھے[1] لیکن رفتہ رفتہ جب سنگھ نے ترقی کی اور نت نئے بکثرت فقیر بننے لگے تو بودھ مہاراج نے اپنے شکشوں (خلفا) کو بھی پرورجیہ اور اپسپدا دینے کا اختیار دیدیا۔ جو شخص اپسپدا اختیار کرنے کے لئے آتا تھا۔ پہلے اُس کی حجامت ہوتی تھی۔ اور حجامت کے بعد گروایا پیلے رنگ کا کپڑا دیا جاتا تھا۔ کپڑا (فقیری باما) لے کر وہ فقرا کو پرنام کرتا اور دوزانو بیٹھ کر یہ اقرار کرتا تھا۔

"ابنہ بودھن شرن گچھامی۔ ابنہ دھرم شرن گچھامی۔
ابنہ سنگھ شرن گچھامی"

یعنی بودھ کی پناہ کو قبول کرتا ہوں۔ میں مذہب کی پناہ کو قبول کرتا ہوں۔ میں سنگھ کی پناہ کو قبول کرتا ہوں۔ اس کے بعد اپسپدا کے لئے ایک اور نئی ترکیب نکالی گئی۔

اس جدید ترکیب کے مطابق اپدھیا (اُستاد) سے اپسپدا اختیار کرنا ہوتا تھا [illegible] تھا۔ جو شخص اپسپدا قبول کرنے کے لئے اپدھیا کے پاس آتا تھا وہ سدھی بہارک یا انت باسک کہلاتا تھا۔ اپسپدا اختیار کرنے کے بعد جس فقیر کے دس سال گزر چکے ہوں اور جو قابل و کامل ہو وہی اپدھیا ہو سکتا تھا۔ انت باسک اپدھیا کس طرح اختیار کرتا تھا اس کا طریقہ نیچے لکھا جاتا ہے۔

انت باسک اپنے لباس کو اس طرح پہنکر کہ ایک کندھا کھلا رہے اپدھیا کے پاس آتا تھا اور اپدھیا کے حضور میں [illegible] دوزانو بیٹھ جاتا تھا پھر دست بستہ تین [illegible] "حضور آپ مجھے اپنا انتباسی بنا لیجئے" اگر اپدھیا "ہاں" کہہ دیتا تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کی التجا قبول ہو گئی اس کے بعد فقیروں کی ایک جماعت اُس سے کئی سوال کرتی تھی۔ جب یہ نووارد اُن کے سوالات کے صحیح جواب دیتا۔ تو داخل ہونے کے قابل سمجھا جاتا۔ اور سنگھ کا کوئی فقیر کم از کم دس فقیروں کی جماعت میں یہ پیش کرتا تھا کہ ——— "سنگھ کے سب لوگ سنیں! فلاں شخص فلاں اپدھیا سے اپسپدا حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اگر سنگھ اُسے لینا چاہے اور اجازت دے تو وہ حاضر کیا جائے" اجازت ملنے پر وہ شخص سامنے آتا تھا۔ اور فقیروں کے قدموں کو چھو کے دوزانو بیٹھ جاتا تھا پھر دست بستہ تین بار یہ کہتا تھا "میں سنگھ کے اپسپدا حاصل کرنے کی التجا کرتا ہوں۔ سنگھ مہربانی فرما کے مجھے اس گناہ بھری دنیا سے نجات دلوائے"۔ اس کے بعد ایک کامل فقیر یہی

[1] اس مضمون کے شایع ہوجانے کے بعد میں "سارناتھ" کا ایک تاریخی تذکرہ پیش کروں گا جس میں ان پانچوں فقرا کے حالات اور سارناتھ کی پوری شرح شان کیجائیگی

(التجا) پیش کرتا تھا:- "میں سنگھ کو مطلع کرتا ہوں کہ فلاں نام کا ایک شخص فلاں اپدھیا سے تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اگر سنگھ اجازت دے تو میں اُس شخص سے اس کے متعلق سوال کروں؟" سنگھ کی اجازت ملنے پر اُس شخص سے یہ پوچھا جاتا تھا:-

تمہیں کوڑھ یا اسی طرح کی کوئی دوسری بیماری تو نہیں ہے؟

تم نامرد تو نہیں ہو؟

تم کسی کے غلام تو نہیں ہو؟

تم مقروض تو نہیں ہو؟

تم سرکاری ملازم تو نہیں ہو؟

تمہارے والدین نے تمہیں اجازت دی ہے؟

بیس سال سے کم عمر تو نہیں ہو؟

تمہارے بھیک مانگنے کے برتن اور بستر تو ٹھیک ہیں؟

تمہارا نام کیا ہے؟

تمہارے اپدھیا کا نام کیا ہے؟

ان سوالوں کے تشفی بخش جواب ملنے پر ایک ہوشیار اور قابل فقیر یہ تجویز پیش کرتا تھا:- "میں سنگھ کو واقف کرتا ہوں کہ فلاں نام کا یہ شخص فلاں اُپدھیا سے اُپسمپدا اختیار کرنا چاہتا ہے۔ یہ سب طرح سے اپسمپدا کے قابل ہے۔ اس کے بستر اور بھکشا پتر بھی ٹھیک ہیں۔ اب سنگھ اجازت دے تو یہ فلاں نام کے اپدھیا سے اپسمپدا حاصل کرے۔ اور اگر کوئی اس تجویز کا مخالف ہے تو شوق سے اعتراض کرے۔" اسی طرح تین بار سنگھ کے سامنے اپنے بیان کی تکرار کرتا تھا۔ جب کل سنگھ اس تجویز کو مان لیتے تھے تو وہ سنگھ میں شریک کر لیا جاتا تھا اور اُس کا اپسمپدا اسنسکار پورا ہو جاتا تھا لیکن دو قسم کے اشخاص ایسے تھے جو سنگھ میں داخل نہیں کئے جاتے تھے۔ ایک تو وہ جو پہلے کسی مخالف (بدھ) مذہب میں تھے مگر کسی وجہ سے بدھ سنگھ میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ اور دوسرے وہ جن کی عمر بیس سے کم ہوتی تھی۔

جو شخص دوسرے مذہب کو ترک کر کے سنگھ میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ اُس کو سنگھ کی طرف سے یہ اجازت ملتی تھی۔ کہ چار مہینہ تک دوسری جگہ جا کر رہیں یعنی چار مہینے تک اپنے چال چلن کا امتحان دیں۔ اگر اتنی مدت میں اپنی سلامت روی سے فقراکو مطمئن نہ کرتے تھے تو اُن کا اُپسمپدا سنسکار نہیں کیا جاتا تھا۔ جو شخص پندرہ برس سے زیادہ اور بیس برس سے کم عمر کا ہوتا تھا تو وہ پہلے پرورجیہ سنسکار کے لائق سمجھا جاتا تھا۔ اور اپسمپدا سنسکار کے لئے اُسے بیس برس کی عمر تک رُکنا پڑتا تھا۔ اور مقررہ وقت کو پورا کرنے کے لئے اُس کو سخت قواعد کی پابندی کے ساتھ کسی اُپدھیا کی ماتحتی میں رہنا پڑتا تھا۔ اس مدت میں وہ سامنیر، شرامنیر یا شرمودیش کہلاتا تھا۔ اُسے

(۱) ہنسا (بے رحمی) نہ کرنا +

(۲) چوری نہ کرنا +

(۳) جھوٹ نہ بولنا +

(۴) نشہ کا استعمال نہ کرنا +

(۵) زنا نہ کرنا +

(۶) بے وقت نہ کھانا +

(۷) عطریات وغیرہ کا روزگار نہ کرنا +

(۸) پلنگ یا گدے دار بچھاون پر نہ سونا +

(۹) ناچ گانے سے دلچسپی پیدا نہ کرنا +

(۱۰) سونے اور چاندی کو کام میں نہ لانا +

ان دسوں احکام کی تعمیل صدق دل سے کرنی پڑتی تھی۔ اگر کوئی ان میں سے پانچ قواعد کی خلاف ورزی کرتا۔ بودھ دھرم اور سنگھ کے خلاف کچھ بولتا۔ جھوٹے طریقوں کو رواج دیتا۔ اور اگر کوئی چھ سے دس نمبر تک کے قواعد میں سے کسی قاعدے کی خلاف ورزی کرتا۔ تو پہلے اُسے سزا دی جاتی تھی۔ اپدھیا کی اجازت سے کوئی فقیر بھی سزا دیتا تھا بھکشوں (فقیرنیوں) کی بھی پرورجا اور اپسمپدا اسنسکار اسی طرح ہوا کرتا تھا۔ جس طرح فقیروں کا مقرر تھا +

۲۔ سنگھ کی اندرونی زندگی

اپسمپدا اسنسکار کے بعد نئے فقرا کو سنگھ کے سب قاعدے بتا دیئے جاتے تھے۔ اور یہ بھی بتا دیا جاتا تھا کہ سنگھ میں کس طرح کی زندگی بسر کی جاتی ہے۔ فقیروں کو سنگھ کے اندر کیسی پاک زندگی بسر کرنی پڑتی تھی۔ ذیل کے قاعدے سے ظاہر ہوتا ہے:-

(۱) جس فقیر کو اپسمپدا اسنسکار مل گئی۔ اُس کو زنا سے ہمیشہ بچنا چاہیئے +

(۲) اس کو دوسروں کا ایک تنکا بھی بغیر اجازت نہ لینا چاہیئے۔ نہ چرانا +

(۳) وہ کسی ذی روح کو نہ مارے حتیٰ کہ چیونٹی ہی کیوں نہ ہو +

(۴) اُس کو کسی دیوتا یا دیوی کا دعویٰ نہ کرنا چاہیئے +

سنگھ کے قاعدوں کے مطابق اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے خاص قسم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس لئے یہ قاعدہ تھا کہ نیا فقیر پہلے دس برس تک اپنے اپدھیا کے زیر اختیار رہے دونوں کے درمیان میں کسی طرح کا نظم رہنا چاہیئے یعنی چھک کے نہا بگر۔ کتاب میں بڑی صراحت کے ساتھ لکھا ہوا ہے دونوں کے ~~~~~~ بارے میں گوتم بودھ نے یہ قاعدہ بنایا تھا۔

"اے فقیرو! اپدھیا کو چاہیئے کہ اپنے اسدھی بہارک (بالکوں کو بیٹے کی طرح مانے۔ اور سدھی بہارک کو چاہیئے کہ اپدھیا کو اپنے باپ کے برابر جانے۔ اسیطرح ایک دوسرے کی محبت، یقین اور سہوگ کرتے ہوئے ~~~ ترقی کریں"

سدھی بہارک اپنے اپدھیا کی خدمت غلاموں کی طرح کرتا تھا۔ علی الصباح اپدھیا کے منہ کے دھونے کو پانی اور کھانا لا دیتا۔ نہانے کے لئے پانی لاتا۔ بسترا اسکھلتا اُس کے رہنے کی جگہ جھاڑ دے کر بُہارتا۔ اسی طرح اپدھیا بھی اپنے سدھی بہارک کی اعلیٰ روحانی و جسمانی ترقی کا پورا خیال رکھتا تھا۔ وہ اُسے تعلیم دیتا۔ بیماری میں خدمت کرتا اور بھی ہر طرح سے اُس کی نگرانی کرتا تھا۔ اگر کوئی سدھی بہارک کوئی بہت ہی بُرا کام کر دیتا تو اپدھیا نکال دیتا۔ لیکن معافی مانگ لینے پر معاف بھی کر دیتا تھا۔ اگر اپدھیا کہیں سنگھ چھوڑ کر فرار ہو جاتا یا مر جاتا، یا گرہست آشرم میں لوٹ جاتا۔ یا کسی دوسرے سن پر دنایہ کا مقابل ہو جاتا تو سدھی بہارک کو اپنے

لئے کوئی دوسرا اپدھیا چننا پڑتا تھا۔

اپدھیا کے ساتھ دس سال تک اسی طرح رہنے کے بعد وہ فقیر سنگھ کا ایک رکن ہوجاتا تھا۔ اس کی زندگی میں بل جاتا تھا کہ اس کی [illegible] زندگی گویا غائب ہوجاتی تھی معمولی باتوں میں بھی اسے اپنی زندگی کو سنگھ کے دستور کے مطابق چلانا پڑتا تھا۔ اگر وہ ان دستور کے خلاف کچھ بھی کیوں نہ کرتا۔ مگر جرنہ دیا جاتا تھا کس طرح لباس پہننا چاہئے، کہاں سونا چاہئے۔ کہاں بیٹھنا چاہئے، کیسے کھانا چاہئے۔ کیسے برتن رکھنا چاہئے۔ کیسے نہانا چاہئے وغیرہ چھوٹی چھوٹی باتوں کے بارے میں مختلف اصول تھے جن کی تعمیل کرنا فقیروں پر فرض تھا۔ ان قاعدوں کا تعلق فقیر کی زندگی سے تھا۔ بودھ سنگھ کا یہ قانون تھا کہ "فقیر معمولی سے معمولی اور ضروری سے ضروری کام بھی بغیر سنگھ کی اجازت کے نہ کرے۔"

فقیر کو تین ہی کپڑے پہننے کی اجازت تھی جو "ترچی ورا" کہلاتے تھے۔ انتر باسک، اُکتراسنگ، اور سنگھاٹی یہی تینوں کپڑے ترچی ور کہے جاتے تھے۔ گیروا رنگ کا ہونے کے باعث فقرا کے لباس کو کاشیہ بھی کہتے تھے۔

انتر باسک نیچے کا لباس تھا یہ کمر سے لٹکتا رہتا تھا

اُکتراسنگ اوپر کا لباس اس سے کندھا، چھاتی اور جانگھیں ڈھکی رہتی تھیں۔ یعنی وہ ایک کندھے سے دونوں جانگھوں کے نیچے تک لٹکتا رہتا تھا۔

سنگھاٹی بھی اوپر ہی کا بستر تھا۔ وہ چھاتی اور دو کندھوں کے چاروں طرف لپیٹا جاتا تھا۔ وہ ایک طرح کا لبادہ سا ہوتا تھا۔ جو کندھوں سے جانگھوں تک لٹکتا رہتا تھا۔ اور کمر میں ایک ڈوری سے باندھ دیا جاتا تھا۔

اپاسکوں اور گرہست بودھوں کے لئے یہ بہت بڑا کار ثواب شمار کیا جاتا تھا کہ وہ سنگھ کے فقرا کو کپڑے دیکر ان کی ضرورت پوری کریں۔ ہر برشگال کے بعد ہر ایک سنگھ میں کپڑے تقسیم کئے جاتے تھے۔

کھڑاؤں پہننا فقیروں کے لئے بھوگ بلاس ([illegible]) سمجھا جاتا تھا۔ بودھ گرنتھوں (تصانیف بودھ) میں کئی قسم کے جوتے پہننا خاص طور پر منع کیا گیا ہے۔ چھتری ضروری چیزوں میں گنی جاتی تھی۔ پنکھا اور چھتری کو بھی کام میں لانا منع تھا۔ تین بستروں کے علاوہ فقیروں کی سامگری ([illegible] اثاثہ) تھی۔ ایک بھکشا پتر (بھیک مانگنے کا برتن) ایک کرچھی ایک استرا۔ ایک سوئی اور ایک صافی۔ استرا سر اور داڑھی کے بال بنانے کے کام میں آتا تھا۔ عام طور پر فقرا پندرھویں دن ایک دوسرے کی حجامت کر دیا کرتے تھے۔

برسات میں فقیروں کو گھومنے کی اجازت نہ تھی۔ بلکہ ایک ہی جگہ رہ کر بسر کرنی پڑتی تھی۔ برکھا باس (قیام برشگال) یا چاترماسے (چار ماہ) اساڑھ کی پورن ماسی سے کاتک کی پورن ماسی تک تمام ہوجاتا تھا۔ لیکن اس کا پتہ نہیں لگتا ہے کہ جب بودھ سنگھ کی ابتدا ہوئی تو فقرا چاترماسے یا دوسرے موسم میں کہاں رہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ابتدا شروع میں فقرا کے رہنے کی کوئی خاص جگہ نہ تھی جنگلوں میں درختوں کے سایہ میں، پہاڑ کے غاروں میں شمسان ([illegible]) میں رہتے۔ کھلی ہواؤں میں رہتے یا پھوس کے ڈیرے بچھا کر

کاٹ لیتے تھے۔ یہ دیکھ کر راجگیر کے ایک سیٹھ نے فقیروں کے لئے ایک مکان بنانے کی خواہش ظاہر کی تو مہاتما بودھ نے فقیوں سے کہا "اے فقیرو! میں حسب ذیل پانچ قسم کی جگہوں میں رہنے کی اجازت دیتا ہوں:-

۱- بہار (خانقاہ)
۲- اڈی یوگ (گرڈور کی شکل کے بنے ہوئے مکان)
۳- پراساد (محل۔ بودھ سادھوؤں کے رہنے کا مکان)
۴- گوہا میں +

لکھا ہے کہ سادھوؤں سے یہ سنکر کہ مہاتما جی نے اجازت دے دی ہے اُس سیٹھ نے ایک ہی دن میں ساٹھ مکان بنوا دیئے۔ اس مسرت آمیز خبر کو سنکر بودھ مہاراج نے اُس سیٹھ کو مبارکباد دی +

بہار کا ترجمہ صرف مٹھ ہی نہیں ہے۔ اس سے مندر یا پوجے کی جگہ بھی سمجھی جاتی ہے۔ مٹھ کے لئے دوسرا لفظ 'سنگرام' بھی ہے۔ ہر ایک بڑے سنگرام کے ساتھ ایک بہار یا پوجا مندر ضرور رہتا تھا۔ گوہا ایک طرح کی کوٹھری تھی جو پہاڑ کی چٹان کاٹ کر بنائی جاتی تھی۔ سب قدیم گوہائیں اب تک ملتی ہیں وہ گیا کے پاس دیرابر اور 'نگرجنی' کی پہاڑیوں میں ہے ان گوہاؤں کو اشوک اور اُس کے پوتے دسرتھ نے بنوایا تھا +

فقیروں کے لئے بودھ کا یہ حکم تھا کہ وہ بھیک مانگ کر کھائیں۔ پر ساتھ ہی اس کے یہ بھی قاعدہ تھا کہ وہ بھیک مانگنے کے وقت منہ سے کچھ بھی نہ کہیں۔ یعنی جو کچھ اُنہیں ملے اُسے چپ چاپ قبول کر لیں +

فقرا، بیماری کی حالت میں دوا کی طرح گھی، مکھن، تیل شہد اور چینی استعمال کر سکتے تھے۔ 'بنئی پٹھک' میں نئی نئی قسم کی دوائیاں بنانے اور کچھ سرجری کے قاعدے بھی لکھے ہیں جن سے ہمیں اُس وقت کے علاج و معالجہ کا کچھ پتہ ملتا ہے +

۴- سنگھ کا انتظام

اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سنگھ کا آئین کار اور نظم کیسا تھا۔ جب تک بودھ مہاراج زندہ رہے۔ اُن کے احکام ارشاد سنگھ کے لئے قانون تھے۔ لیکن دو وجہوں سے یہ طریق کار دائمی نہ رہ سکے۔ اولاً یہ کہ سنگھ کا دائرہ ملک میں اتنا وسیع ہوتا جاتا تھا کہ اُس کی نگرانی ایک ہی شخص سے ناکافی تھی۔ دوسرے بودھ مہاراج کے بعد بھی سنگھ کا مستحکم انتظام کرنے کے لئے ایک جدید تنظیم کی ضرورت تھی۔ اگرچہ رفتہ رفتہ اس کا ظہور ہونے لگا۔ مگر یہ تنظیم بہت دنوں کے بعد مکمل ہوئی۔ اور اس صورت میں ہوئی جس کا ہیولیٰ بودھ کی زندگی ہی میں صورت پذیر ہو چکا تھا۔ غرض بودھ بھگوان کے انتقال کے بعد جب سنگھ کا شباب آیا اُس وقت بھی بودھ کے احکام و ارشاد ہی سنگھ کے لئے قانون رہے کیونکہ سنگھ کا متفق الآرا قانون تھا کہ "بودھ مہاراج کے بنائے ہوئے دستور العمل سے چشم پوشی کر کے سنگھ کے لئے کوئی اور قانون نہ بنایا جائے۔ ہاں انکے بنائے ہوئے قواعد کی صرف توضیح ہو سکتی ہے" یہ تجویز بودھ کے انتقال کے بعد راجگیر کے پہلے "بودھ مہاسبھا" میں منظور کی گئی تھی۔ اسی سبب سے ہر سنگھ اپنے اپنے انتظام میں آزاد تھا۔ اور بودھ مہاراج کے بعد کوئی شخص یا کوئی ایسی مجلس نہ تھی جو سب سنگھوں کو ایک

کنڑول میں رکھتی۔ اگرچہ اس سے بہت بڑی کمی کا احساس بودھ کے زمانے ہی سے ہونے لگا تھا (چلا بگّ مٹا) مگر اصلاح نہ ہو سکی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سب سنگھ اپنی اپنی ڈفلی اپنا اپنا راگ الاپنے لگے جس سے سنگھ پر زوال آ گیا۔ بودھ مہاتما نے اپنا نائب نہیں مقرر کیا تھا۔ ہاں ایک بات کی یکجہتی ان سب میں تھی۔ وہ یہ کہ سنگھ کے لئے جو کچھ بودھ جی نے بتایا تھا یا جو قاعدے قانون بنا دیئے تھے۔ اُن کے خلاف کرنے کی کسی سنگھ کو مجال نہ تھی "مہاپری بان ست" میں اپنی رحلت کے وقت بودھ مہاتما نے آنند سے کہا تھا:-

"آنند! اگر تم میں سے کچھ آدمی یہ سوچیں کہ
مہاراج کے بعد ہم کو تعلیم دینے والا کوئی نہ رہیگا
تو یہ خیال خام ہے۔ سنگھ کے لئے جو سچے اصول
و قاعدے ہم نے بنا دیئے ہیں۔ وہی تمہارے
گرو اور اچاریہ کا کام دیں گے"

اب آئیے اور دیکھئے کہ ہر سنگھ کا نظم کس طرح سے ہوتا تھا اس سنگھ میں پہلی بات قابلِ غور یہ ہے کہ سنگھ کا کل انتظام فقرا کے مشورے اور اتفاق آرا سے ہوتا تھا۔ ہر سنگھ میں ایک کمیٹی ہوتی تھی۔ اس کمیٹی کی نشست کب ہونی چاہئے۔ کیسے ہونی چاہئے۔ اور کن کن لوگوں کو اس میں رائے دینی چاہئے اور کیسی رائے دینی چاہئے۔ ان سب کے قاعدے بڑی صراحت سے "مہا بگّہ" میں لکھے ہوئے ہیں۔ جن فقیروں کو اُپسمپدا مل گئی ہو ایسے کل فقرا اپنے سنگھ کے "معمولی ممبر" کمیٹی کے وقت ہو سکتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو اس کمیٹی میں رائے دینے کا پورا اختیار تھا۔ ہاں سزا یافتہ فقرا سے رائے دینے کا اختیار چھین لیا جاتا تھا۔ کمیٹی کی کوئی نشست بھی اُس وقت خلاف دستور (بودھ) نہیں سمجھی جاتی تھی جب تک رائے دینے کا اختیار پائے ہوئے ہر فقیر اُس میں موجود نہ ہوں۔ یا کسی سبب سے غیر حاضر ہونے پر دستور کے مطابق اُنہوں نے اپنی رائے ظاہر کی ہو۔ غیر حاضری کو قواعد کے مطابق "چھند" کہتے تھے۔ مہا بگّہ میں اس کے قاعدے لکھے ہوئے ہیں۔ کہ کم سے کم کتنے درویشوں کی شرکت سے کمیٹی قایم ہو سکتی تھی۔ مختلف کاموں کے لئے مختلف قاعدے بنے تھے۔ کچھ کام تو ایسے تھے جن میں چار ہی درویشوں کی شرکت ضروری سمجھی جاتی تھی مگر کچھ کام ایسے بھی تھے جن کے لئے کم سے کم بیس درویشوں کی شرکت لازمی تھی۔ اگر کبھی کسی ممبر کی رائے میں کمیٹی کی نشست قواعد کے خلاف ہوتی تھی تو وہ اس کی مخالفت کر سکتا تھا۔

جب کمیٹی میں فقرا جمع ہو جاتے تھے تو جو شخص تجویز پیش کرنا چاہتا تھا وہ اپنی تجویز کمیٹی کے سامنے پیش کرتا تھا۔ تجویز کو 'یتی' کہتے تھے۔ یتی کے پہلے 'کمابا چا' ہوتا تھا یعنی شرکائے مجلس سے یہ سوال کیا جاتا تھا کہ آپ مہاشیوں کو یہ تجویز منظور ہے کہ نہیں؟ یہ سوال ایک بار نہیں تین بار کیا جاتا تھا۔ اور جب قاعدے کے مطابق ایک یا تین بار سنگھ کے سامنے پیش کر دیا جاتا تھا تو وہ تجویز خود بخود پاس ہو جاتی تھی۔ اگر کسی وقت کوئی مخالفت کرتا تو بحث و مباحثہ کے بعد کثرت رائے سے فیصلہ کیا جاتا تھا۔ حاضرین مجلس

کی رائیں باقاعدہ لی جاتی تھیں۔ سنگھ کی طرف سے ایک فقیر
ممبروں سے رائے لینے کے لئے مقرر کیا جاتا تھا۔ (چلا بگگ
صلا) +

اگر کوئی ایسا ہی اہم اور پیچیدہ مسئلہ کمیٹی کے سامنے پیش
ہوتا جسے وہ با اختیار خاص فیصل نہیں کر سکتی تھی تو وہ مسئلہ
اسی مقام کے کسی ایسے سنگھ کے پاس بھیجدیا جاتا تھا جس
میں اس سے زیادہ ذی اختیار فقرا رہتے تھے۔ (اس کی
مفصل حالت بنیا پٹک اور چلا بگگا میں موجود ہے) جس سنگھ
کے پاس یہ مسئلہ بھیجا جاتا تھا وہ پہلے یہ طے کر لیتا تھا کہ ہم
جو کچھ فیصلہ کریں گے اُسے تسلیم کرنا پڑیگا۔ اس زبانی بندش
کے بعد غور طلب مسئلہ پیش کر دیا جاتا تھا۔ اگر معاملہ اور بھی
پیچیدہ ہوجاتا تو وہ خاص مجلس (اسپیشل میٹنگ) کے حوالہ
کیا جاتا تھا۔ جس کے ممبر بہت ہی قابل اور مشہور فقرا مقرر
کئے جاتے تھے۔ کاش یہ اسپشل کمیٹی بھی، اس مسئلہ کو حل
نہیں کر سکتی تھی۔ تو اس کو پھر سنگھ کے پاس واپس کر دیتی
تھی۔ جہاں کثرت آرا سے پاس ہوجاتا تھا +

سنگھ کا معمولی کام انجام دینے کے لئے کچھ فقیر سنگھ کی طرف
سے مقرر ہو جاتے تھے۔ ایسے پدادھیکاریوں کی تعداد
سنگھ کی عمر کے مقابل مختلف ہوا کرتی تھی۔ لیکن مندرجہ ذیل
پادھیکاری ہی سنگھ میں رہا کرتے تھے :-

۱ بھکتو دیشک ۔ فقیروں کو کھانا بانٹنے والا +
۲۔ بھنڈار گاریک ۔ بھنڈار کا مہتمم +
۳۔ شیاناس تاگرینک : فقیروں کے سونے اور رہنے کا
انتظام کرنے والا +
۴۔ چی ورد پتی گراہک ۔ فقیروں کے بستر کا منتظم +
۵۔ چی ور بھاجنک ۔ فقیروں کو بستر بانٹنے والا +
۶۔ پاترا گراہک ۔ فقیروں کو بھیک مانگنے کا برتن
بانٹنے والا +
۷۔ آرامک پیر یچھک ۔ مالیوں کا نگراں
۸۔ پانئے پریتک ۔ پانی پینے کا سامان کرنے والا +

کسی سنگھ میں نوکرک نام کا ایک اور پدادھیکاری بھی
رہتا تھا جس کے ذمہ نئی عمارتیں بنوانا اور اُن کی دیکھ بھال
تھی۔ ہر سنگھ میں جسقدر فقرا رہتے تھے اُن کے باہمی اختیارات مساوی
ہوا کرتے تھے۔ صرف عمر اور ذی علم فقرا کی وقعت و عظمت زیادہ
ہوتی تھی۔ فقیروں میں تھیرا، اچاریہ اور بدھوں میں مطابقت
ہوتی تھی۔ مگر ان میں کسی طرح باہمی تفریق نہ تھی +

فقیرنیوں کا سنگھ بالکل الگ رہتا تھا۔ اُن کے لئے بھی
وہی سب قاعدے جاری تھے جو فقیروں کے لئے تھے۔
عام طور پر فقیرنیوں کا سنگھ فقیروں سے جدا رہتا تھا۔ تصنیفات
بودھ میں فقیرنیوں کا درجہ فقیروں سے نیچے رکھا گیا ہے۔
کیونکہ مہاتما بودھ کا مت یہ تھا کہ عورتوں کی شرکت سے
بودھ سنگھ کی پاکیزگی جاتی رہیگی۔ اس لئے اُس قباحت سے
بچنے کے لئے بہت قاعدے قانون مرتب کئے گئے تھے
تاہم اصل اصول سنگھ میں فقرا اور فقیرنیوں میں کوئی تفریق نہ تھی
چلا بگگ میں بھکشونی سنگھ کے متعلق پوری صراحت ملتی ہے۔

آمدم برسر مطلب ۔ اوپر کے مضامین میں جو تذکرہ کیا گیا
ہے۔ اُس تذکرے سے تین باتیں منکشف ہوتی ہیں :-
۱۔ بودھ کے زمانے میں سبھوک (پبلک) کے کام کرنے

کا دستور) بہت زیادہ تھا سنگھ کا لفظ ہی سبھوگ کا مترادف ہے اور اسی سبھوگ کی بدولت بودھ مت نے اتنی ترقی کی +

۲- بودھ کے زمانے میں کثرت رائے کی بڑی قدر تھی۔ اور جو تجویز کثرت رائے سے پاس ہو جاتی تھی وہی مقبول عام ہوتی تھی +

۳- بودھ کے زمانے میں اعلیٰ وادنیٰ کا کچھ بھی فرق نہ تھا برہمن کے ساتھ شدر بھی سنگھ میں داخل ہو سکتا تھا +

یہی تین باتیں تھیں جن کے سبب سے بودھ زمانے کی تاریخ ہندوستان کی تاریخ میں سدا زندہ رہیگی +

ابوالجمال محمد احسن سخن بہاری

اے غنچہ تو پھول نہ بن

اے غنچۂ ناشگفتہ! تو یونہی سوکھ جا۔ کھلنے کا نام نہ لے۔ اس میں شک نہیں کہ تیرے کھلنے سے باغ کی رونق دوبالا ہو جائے گی۔ چمن کی خوبصورتی میں چار چاند لگ جائیں گے۔ نسیم تیرے دم سے فیضیاب ہوگی۔ بادصبا تیری پنکھڑیوں میں سے ہوتی ہوئی تیری بھینی بھینی مہک دور تک پہنچائے گی- تیری موجودگی سے ہر ایک انسان کی آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو فرحت پہنچیگی۔ تو غنچۂ ناشگفتہ نہیں۔ بلکہ "گل" کے نام سے مشہور ہوگا +

" یہ سب جو کچھ ہوگا اچھا ہوگا "

مگر بلبل جب تجھے "گل" کی شکل میں دیکھے گی تو تیری محبت میں مست والست ہو کر تجھ پر اپنا نرم اور نازک سینہ رگڑے گی۔ تو اے غنچۂ ناشگفتہ تو بے رحم و بے پروا ہو جائے گا۔ اور اپنی نادانی سے نہیں بلکہ غرور حسن سے اس سینے میں جو تیری گونا گوں محبت سے لبریز ہوگا . . . . اپنا زہریلا خار چبھو دیگا۔ جنگل کو اس کے ترانۂ شیریں اور نغمات رنگین سے بے نصیب و محروم کر دیگا +

اس لئے اے غنچۂ ناشگفتہ۔ میرا تجھ سے ہمدردانہ پیام ہے کہ تو اپنی معصومیت و پاکدامنی پر دھبہ لگائے بغیر سوکھ جا اور اپنی تر دامنی کا ثبوت نہ دے +

" شاما "

عرب کا مایۂ ناز شاعر متنبّی

شعرائے عرب میں بڑے بڑے صاحبِ کمال موجود ہیں۔ مگر ان میں ابوطیب احمد متنبّی کا درجہ سب سے زیادہ بلند ہے اور متنبّی ہر دلعزیزی اُس نے حاصل کی اُتنی کسی دوسرے شاعرِ عرب کو نصیب نہیں ہوئی۔ اُس کی وفات کو ایک ہزار سال گذر گئے ہیں۔ اور آج تک اُس کے دیوان کو آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ اُس نے بچپن ہی میں شاعری شروع کر دی تھی اور اُسے اپنے حینِ حیات ہی میں زبردست شہرت حاصل ہو گئی تھی۔ ذیل میں ہم قارئین کرام کی دلچسپی کے لئے مجملاً اُس کے سوانح حیات درج کئے دیتے ہیں

"ابوطیب احمد جو متنبّی کے نام سے مشہور ہے۔ زبان عربی کا ایک بلند رتبہ اور ہر دلعزیز شاعر ہے اس کے کمالِ فن کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اسقدر عرصہ گزر جانے کے باوجود اُدباء و فصحاءِ عرب آج تک اُسکو اُستاد مانتے آئے ہیں۔ المتنبّی 'کوفہ' کے محلہ 'کندہ' میں ۳۰۳ھ میں پیدا ہوا۔ اسی لئے اُسے 'کندی' بھی کہتے ہیں بعض مصنفوں نے اُسکے "کندی" کہلانے کا یہ سبب بتایا ہے کہ وہ کوفہ کے مشہور قبیلۂ "کندہ" سے تھا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال درست نہیں کیونکہ دوسرے کثیر التعداد مصنفوں نے لکھا ہے کہ وہ ایک اوسط درجہ کے تاجر "الحسین بن عبدالصمد" کا بیٹا تھا۔ جو کوفہ کے محلہ "کندہ" کے قبیلہ "جعفی" سے تعلق رکھتا تھا۔ ان مصنفوں میں واحدی

خاقانی، ابن الفعاث وغیرہم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اُس وقت "مقتدر باللہ بن معتضد عباسی" کرسی خلافت پر متمکن تھے لیکن ان کا اقتدار برائے نام تھا +

متنبّی بچپن ہی سے اشعار کا بیحد شائق تھا۔ اور اپنے بزرگوں سے اشعار سننے کے لیے ضد کیا کرتا تھا۔ چنانچہ جب وہ اُسے اشعار سناتے تھے۔ تو وہ اُنہیں نہایت خاموشی اور توجہ سے سنتا تھا۔ وہ اپنے قبیلہ کی لڑائیوں کے حالات بہت پسند کرتا تھا۔ سن شعور کو پہنچنے تک تو اکثر رزمیہ اشعار اُسے ازبر ہو چکے تھے۔ جنہیں وہ تنہائی میں بڑے جوش سے گایا کرتا تھا۔ والدین نے بچے کا یہ شوق دیکھ کر اُسے ایک قابل اُستاد کے سپرد کر دیا جس سے اُس نے اپنی خداداد ذہانت اور محنت کے باعث تھوڑے ہی عرصہ میں تمام کتب متداولہ پڑھ لیں۔ اس کے بعد بھی اُس نے اپنا مطالعہ جاری رکھا اور کتبِ لغت و شعرائے قدیم کے کلام پر عبور حاصل کیا چھوٹی عمر ہی میں وہ شعر کے حسن و قبح اور اُس کے نواممض سے ایسا آگاہ تھا جیسے ایک مشّاق اہل فن کو ہونا چاہیئے اسی زمانہ میں اُس نے شعر گوئی بھی شروع کر دی۔ طبیعت میں روانی تو تھی ہی۔ ایک مدت قلیل ہی میں وہ کوفہ کے گرد و نواح میں مشہور ہو گیا اب اُس کے اشعار کی خوبی اس حد تک ترقی کر چکی تھی کہ سامعین اُس کے اشعار سُن کر وجد میں آجاتے تھے۔ اور بیخود ہو کر جھومنے لگتے تھے۔ اُس کے مکان پر

شائقین کا جمگھٹا لگا رہتا تھا +

سرزمین عرب کا یہ بلبل شیریں کلام "متنبّی" کے لقب سے اس لئے مشہور ہے کہ اُس نے "بادیہ ساوہ" میں نبوّت کا دعویٰ کیا تھا۔ اور اپنے اشعار معجزہ کے طور پر پیش کرتا تھا چنانچہ بنی کلب اور چند دوسرے قبیلوں کے بہت سے لوگ اُس پر ایمان لے آئے آخر اس بڑھتے ہوئے فتنہ کی روک تھام کے لئے خلیفۂ وقت (ملیح باللہ بن مقتدر) کی طرف سے ابو لولو نے (جو اخشید یہ کا حاکم تھا) متنبّی پر حملہ کرکے اُس کی جماعت کو منتشر کردیا۔ اور اُسے قید کرلیا۔ متنبّی ایک عرصہ تک محبوس رہا۔ اور اس اثنا میں اشعار بھی لکھتا رہا۔ آخر جب ۳۲۲ھ میں اُس نے نبوّت کے دعوے سے توبہ کی تو وہ رہا کردیا گیا +

قاضی ابن خلکان کی کتاب "وفیات الاعیان" کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء نے اُس کے کلام کی بہت قدر و منزلت کی۔ اور اُس کے دیوان کی بہت سی شرحیں لکھی گئیں۔ ہماری نظر سے صرف چار شرحیں گزری ہیں۔ پہلی 'ابن القطاع' کی جو کسیقدر مختصر ہے۔ دوسری علامہ واحدیؔ کی جو نسبتاً اچھی ہے۔ تیسری 'حذاق' کی تصنیف ہے جو پہلی دونوں شرحوں سے بہتر ہے۔ لیکن یہ سب عربی میں ہیں۔ چوتھی شرح مولوی ذوالفقار علی دیوبندی نے اُردو میں لکھی ہے۔ یہ زیادہ تر مذکورہ شرحوں پر مبنی ہے۔ البتہ اُردو میں ہونے کی وجہ سے قابل قدر ہے۔ ہم متنبّی کے صرف تین اشعار بطور مشتے نمونہ از خروارے ذیل میں درج کرتے ہیں۔ جو اگرچہ اُس شاعر اعظم کے کلام کا بہترین انتخاب نہیں کہے جاسکتے۔ پھر بھی یہ اُس کے کمال فن کی دلیل ضرور ہیں :-

(۱) اِنْ کُنْتِ ظَاعِنَۃً فَاِنَّ مَدَامِعِیْ
تَکْفِیْ مَزَادَکُمْ وَتَرْوِیْ الْعِیْسَ

(ترجمہ) اے محبوبہ اگر تو جانے والی ہے تو بیشک میرے آنسو مشکیزوں کو بھرنے کے لئے کافی ہیں۔ اور کثرت گریہ کے سبب تمہارے شتروں کو بھی سیراب کردیں گے +

(۲) مَا اَجْدَرَ الْاَیَّامَ وَاللَّیَالِیَ
بِاَنْ تَقُوْلَ مَالَہٗ وَمَالِیَ

(ترجمہ) اور لوگ زمانہ کی شکایت کرتے ہیں۔ لیکن میں ایسا زبردست ہوں کہ زمانہ میری شکایت کرے تو بجا ہے +

(۳) اَزُوْرُہُمْ وَسَوَادُ اللَّیْلِ یَشْفَعُ لِیْ
وَاَنْثَنِیْ وَبَیَاضُ الصُّبْحِ یُغْرِیْ بِیْ

(ترجمہ) میں محبوب کے پاس رات کو جاتا ہوں۔ اور اُس کی سیاہی میری شفاعت اور مدد کرتی ہے کہ اُس کی تاریکی کے سبب کوئی میرے آنے کی خبر نہیں پاتا۔ اور آخر شب میں وہاں سے لوٹتا ہوں تو صبح کی سفیدی مخالفوں کو میرے گرفتار کرنے پر اُبھارتی ہے۔ کیونکہ وہ میرا آنا ظاہر کردیتی ہے +

حذاق کہتے ہیں کہ یہ شعر متنبّی کے تمام دیوان کی جان ہیں۔ اس کے پہلے مصرع میں شاعر نے پانچ چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ زیارتؔ۔ سیاہیؔ۔ لیلؔ۔ شفاعتؔ۔ لیؔ۔ جو اُس کے لئے مفید ہیں۔ پھر دوسرے مصرع میں پانچ مخالف چیزیں بالترتیب لایا ہے :- اِنْثَنِیْ۔ بیاضؔ۔ صبحؔ۔ یُغْرِیْ۔ بیؔ۔ جو اُس کے خلاف ہیں۔ بااینہمہ الفاظ معنوں کی خوبی خود

ظاہر ہے۔

متنبیؔ نے اپنے عہد کے فرمانرواؤں مشہور جرنیلوں اور اپنے محسنوں کی تعریف میں بہت قصیدے لکھے ہیں۔ مثلاً ابوعلی ہارون بن عبداللہ الکاتب، محمد بن اسحاق سیف الدولہ وغیرہم۔ اُس نے اپنے مصر سے بھاگنے کا حال نہایت عمدہ پیرایہ میں بالتفصیل بیان کیا ہے۔ اُس میں وہ کافور حاکم مصر اور اس کے وزیر کے مظالم کی پُر زور الفاظ میں مذمت کرتا ہے۔ اپنی تیز رو اور جفاکش اونٹنی کی بہت تعریف کرتا ہے۔ اور بڑے فخر سے بیان کرتا ہے کہ وہ کس بہادری اور جرأت سے اپنے دشمنوں کے نرغہ سے بچ نکلا اور اپنی تلوار کے کیا کیا جوہر دکھائے۔ اُس کی اس نظم سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ "سیف[1] الدولہ" کا جاں نثار دوست تھا۔ متنبیؔ اُسے امیر عرب کہا کرتا تھا۔

کوفہ کے ایک شخص ضبّۃ بن یزید العتبی کے باپ کو ایک عرب نے قتل کر دیا تھا۔ اور اُس کی ماں سے نکاح کر لیا۔ یہ ضبّۃ اپنے مہمانوں کی خاطر مدارات نہیں کیا کرتا تھا۔ جو ایک عرب کے لئے باعث ذلت و رسوائی ہے۔ متنبیؔ بھی ایک روز جان بوجھکر اُس کے گھر گیا۔ مگر اُس نے مہمانداری نہ کی۔ بلکہ وہ ہمیشہ متنبیؔ اور اُس کے دوستوں کو گالیاں دیا کرتا تھا۔ متنبیؔ نے اپنے دوستوں کے اصرار پر اُس کی ہجو لکھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ضبّۃ کی عادتیں بہت حد تک ٹھیک ہو گئیں۔

متنبیؔ اسقدر ہجو گو نہیں تھا جتنا سودا تھا۔ جو بات بات پر ناراض ہو جاتا تھا اور غصہ سے بے اختیار ہو کر کہا کرتا تھا کہ "ارے غنچہ لاؤ میرا قلمدان۔ ذرا میں اس کی خبر تو لوں۔ یہ مجھے سمجھا کیا ہے!" پھر بقول آزادؔ شرم کی آنکھیں بند اور بے حیائی کا منہ کھول کر وہ وہ بے نقط سناتے تھے کہ شیطان بھی امان مانگے"۔ متنبیؔ کے سارے دیوان میں آپ کو چار پانچ سے زیادہ ہجو یہ نظمیں نہ ملینگی۔

الغرض متنبیؔ جس موضوع پر قلم اُٹھاتا ہے۔ اُسمیں کمال کر دیتا ہے۔ اور اُسے نہایت خوش اسلوبی سے نباہتا ہے۔ کسی کی تعریف ہو، یا ہجو۔ رزم ہو یا بزم۔ واقعہ نگاری ہو یا خیال آرائی۔ ہر رنگ میں دلوں پر اپنا سکہ بٹھا دیتا ہے اُس کے دیوان میں مزاحیہ اشعار کی بھی کمی نہیں۔ حافظ ذہبیؒ نے اصحاب ذیل کو اپنے اوصاف کے لحاظ سے بے مثل مانا ہے:

"نسب" حضرت ابا بکر صدیقؓ۔ "عبادت" خواجہ فضیل ابن عیاضؒ۔ "نحو" علامہ سیبویہ۔ "انشاء" قاضی الفاضل "فلسفہ" شیخ الرئیس بوعلی سینا۔ "شعر" متنبیؔ "لغت" متنبیؔ

متنبیؔ زبان اور لغت کا امام مانا جاتا ہے۔ اُسے عام مشہور لغات کے علاوہ بہت عجیب اور نادر لغات کا بھی علم تھا۔ جب اُس سے کہیں محاورہ وغیرہ کے متعلق دریافت کیا جاتا تو وہ سند میں فوراً ادبائے عرب کے الفاظ اور عبارت

[1] نوح بن منصور نے سلطان محمود غزنوی کو ایک فوجی مدد کے صلے میں سیف الدولہ کا خطاب دیا تھا۔ لیکن یہ ۳۸۵ھ متنبیؔ کی وفات کے بعد کا واقعہ ہے۔ یہ سیف الدولہ، عضدالدولہ کا بیٹا تھا۔ جو سلاطین دیالمہ کا سب سے بڑا بادشاہ گزرا ہے۔ عضدالدولہ کی تعریف بھی متنبیؔ نے کئی جگہ کی ہے:

پیش کو تیا۔ چنانچہ شیخ ابو علیؒ فارسی نے ایک روز اُس سے پوچھا کہ عربی میں فِعلی کے وزن پر کون کون سی جمع آتی ہیں۔ متنبّی نے بلا تامّل جواب دیا کہ حِجلی اور ظِربی۔ شیخ مذکور کہتے ہیں کہ میں برابر تین دن کتب لغت کی ورق گردانی کرتا رہا لیکن مجھے ان دو کے سوا اس وزن پر اور کوئی جمع نہ ملی۔ اس علمی وسعت کا کیا ٹھکانا ہے ؛

آخر ماہ رمضان ۳۵۴ھ میں اس بےمثل شاعر کو مع اپنے بیٹے محمّد اور اپنے غلام مفلح کے ساحلِ دجلہ پر ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سلا دیا گیا۔ قاتل اُس کا دیرینہ دشمن فاتک ابن ابو جہل اسدی تھا۔ اس حساب سے اُس کی عمر کل ۵۱ برس کی ہوئی۔ اُس کے دوست ابو القاسم مظفر بن علی طبسی نے اُس کا مرثیہ اس طرح لکھا ہے :-

ما رای الناس ثانی المتنبّی ای ثان یُریٰ لبکر الزمان
کان من نفسہٖ الکبیرۃ فی جیش وفی کبریا ذی سلطان
ھو فی شعرہٖ نبیٌّ ولکن ظھرت معجزاتہ فی المعانی

اگرچہ اُس کی وفات کو تقریباً ایک ہزار سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن اُس کا مجموعہ کلام باغِ بے خزاں ہے اور آج تک زمانہ کی بادہائے مخالف سے اُسے کوئی گزند نہیں پہنچا۔ اب تک اُس کی شیریں بیانی، چستی بندش، خوبی بیانی، جوش، پاکیزگی، اور مضامین کی دقّت مسلّمہ ہے۔ اور اُس کے اشعار روزمرّہ کے معاملات۔ مباحثوں، تقریروں اور بزم و رزم میں۔ اہلِ کمال اور عوام کی زبان پر رہتے ہیں۔ ایران کے مشہور ادیب میرزا محمّد علی خاں مولانا صاحب تبریزی نے متعلق لکھتے ہیں کہ "اگر انہیں ایران کا متنبّی کہیں تو بجا ہے۔ اس لئے کہ وہ متنبّی کی مانند موشگاف نکتہ داں، جدّت پسند اور باریک بیں ہیں" ؛

حال ہی میں ایک مصری چھپی ہوئی کتاب "زیادات دیوان شعر المتنبّی" ہماری نظر سے گذری ہے۔ جس میں متنبّی کے چالیس سے زاید قصائد ہیں۔ جو قلمی نسخوں سے جمع کئے گئے ہیں۔ یہ قصائد بہترین ہیں ؛

امیر حبیب اللہ خاں نظامی
رانا آفتاب احمد خاں۔

محبوبہ سے خطاب

محبوبہ —— !!! اپنی ان دو آنکھوں پر مغرور نہ ہو، جو ستاروں کی طرح اپنے افلاک میں درخشندہ ہیں۔
نہ اس پر غرور کر کہ تو تمام دلوں کو اسیرِ محبّت دیکھتی ہے اور تیرا دل ابھی آزاد ہے !!!
اپنی زلفوں کے تموّل پر فخر و ناز نہ کر! جو گرفتارِ محبّت کے ساتھ شوخیاں کر رہے ہیں !!
حالانکہ وہ عقیق، جو تیرے گوشۂ دل میں پیوست ہے۔ اُس وقت کے بعد بھی جبکہ تیری دنیائے حسن پر خزاں آ جائیگی بیش قیمتی پتھر شمار ہوگا !!! (ٹیگور)

عبد العزیز نیاز

موسیقی!!

انسان کی قدر و منزلت کا سارا ہنگامہ صرف اُس کے شعور سے وابستہ ہے۔ شعور ہی اصل میں ہماری خوش نصیبی اور بدنصیبی کا اصلی سبب ہے۔ اور شعور ہی ہمارے عجز و ہماری قوت کا حقیقی مصدر بھی ہے۔ وہ شعور جس میں معرفت کی بھی آمیزش ہو حقیقت میں ایک نعمت کبریٰ ہے۔ جو صاحب شعور انسان دولت معرفت سے محروم ہو، اُس کی مثال اُس قیدی کی مانند ہے جو یہ نہیں جانتا کہ میری تعزیب کا زمانہ کہاں تک دراز ہوگا۔ شعور نفس میں ایک کبھی نہ بھرنے والا زخم ہے۔ ذی شعور اطبا نے ہرچند اس زخم کا علاج کرنا چاہا پر اُس کے مداوا سے عاجز رہے۔ لیکن موسیقی اور صرف موسیقی ہی وہ تریاکِ جاں بخش ہے۔ جو اس زخم کے الم کو تسکین دے سکتا ہے۔

موسیقی کے سوا اور فنون لطیفہ اماکن معینہ میں پائے جاتے ہیں۔ عالی شان محلوں میں ہوں یا دولت مند عجائب خانوں میں۔ بہرحال وہیں پائے جاتے ہیں، جہاں صناعات بدیعہ اور عجائبات نادرہ کی فراہمی کا اہتمام کیا جاتا ہے لیکن موسیقی ہر زمان اور ہر مکان میں پائی جاتی ہے۔

بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج۔ بوندوں کی جھم جھم پانی کا بہاؤ۔ ہوا کا چلنا۔ برگیں کا پھٹنا، تیتروں کی ٹوک بلبلوں کی چہک، عصافیر کی آواز۔ بچوں کا رونا۔ بیواؤں کا بین، صراحی کا قہقہہ، گھوڑوں کی ٹاپ، پہیوں کی گڑگڑاہٹ گھنٹوں کی صدا، ان سب میں ایسے ایسے طرب انگیز نغمے موجود ہیں۔ جو نفس انسانی میں بے شمار عواطف و جذبات کا ہیجان برپا کرتے رہتے ہیں۔ میں نے خود بہتیری دفعہ جنگلوں کے اندر نسیم کے بہنے، شاخوں کے جھومنے۔ پتیوں کے کھڑ کھڑانے، اور حشرات کے رینگنے و چلنے کی آوازیں سنی ہیں۔ اور ان سب نے میرے نفس میں لذیذ ذکریات کا ایک ہیجان عظیم پیدا کر دیا۔

موسیقی درحقیقت ہے کیا چیز کون ہے۔ بعض فلاسفہ کا دعویٰ ہے کہ اجرام سماویہ نظام حسابی کے ساتھ چلتے ہیں۔ اور اُن کی دائمی سیر انسجام موسیقی کے قانون کے تابع ہوتی ہے۔ اگر وہ نظام اور یہ انسجام نہ ہوتا تو میزان وجود مختل، اور دورۂ افلاک معطل ہو جاتا۔

ایک جنگجو اور زور آزما بادشاہ شہروں کو بناتا اور بگاڑتا ہے ایک ماہر سیاسیات شئون دولت کے فریضہ ادارت کو انجام دیتا ہے۔ ایک تجربہ کار طبیب لوگوں کو امراض سے شفا بخشتا ہے۔ ایک جادو بیان خطیب اپنے بلیغ خطبہ کے ذریعہ ذہن کی طرف بڑے بڑے حقایق و معارف کو منتقل کرتا ہے۔ ایک فاضل مہندس خشک زمین سے پانی کو جاری اور مردہ زمینوں کو از سرِ نو زندہ بناتا ہے۔ ایک فیلسوف حیثیاتِ وجود کی تحلیل کرتا ہے۔ لیکن موسیقی صرف اپنی آواز یا باجے سے وہ کام لیتی ہے۔ جو ان تمام اعمال سے کہیں زیادہ وقیع

اور اعظم ہوتا ہے۔ اگر موسیقی نہ ہوتی تو نہ بلاد فتح کئے جاتے
نہ شؤونِ دولت کی تدبیر ہوتی۔ نہ امراض سے مریض شفا پاتے
نہ خطیب خطبے دے سکتا۔ نہ جمہور اس خطبہ کو سن سکتے نہ مہندس
کی انگلیاں خطِ اوتار پر جاری ہوتیں، اور نہ حکیم قلم ثبات
اور عزمِ استوار کے ساتھ چیستانِ حیاۃ کی تحلیل کر سکتا۔

موسیقی حقیقت میں دوشِ حیاۃ کے بھاری بوجھوں کو
ہلکا کر دیتی ہے۔ موسیقی جمالِ حیاۃ کو بڑھاتی ہے۔ اور زندگی
کے دفتر سے حسرت و الم کی سطروں کو مٹا دیتی ہے۔

موسیقی کے ترانوں کو (مطربہ ہوں یا شجیہ، مثیرہ ہوں یا
مسکنہ!) سننے کے بعد خود ہمارے وجود میں ایک عظیم انقلاب
پیدا ہو جاتا ہے۔ اور گلستانِ حیات میں ایسی نئی نئی روح
پرور بہاریں نظر آنے لگتی ہیں جن کو اس کے پہلے ہماری
آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ موسیقی ہمارے مستور ذہنی
طاقتوں کو کھولتی ہے، موسیقی ہمارے دل کے تاریک
گوشوں کو منور کرتی ہے۔ موسیقی ہمارے بیکار اعضا و
جوارح میں حرکتِ عمل پیدا کرتی ہے، موسیقی ہمارے افسردہ
عزایم کو گرماتی ہے۔ موسیقی ہمارے غفلت میں ڈوبے
ہوئے آمال و امانی کو متنبہ کرتی ہے۔ اور موسیقی ہمارے
مردہ احساسات کو از سرِ نو زندگی بخشتی ہے حقیقت یہ ہے
کہ موسیقی انسان کے لئے ویسی ہی ضروری ہے۔ جیسے
زراعت کے لئے پانی!!

ہر فن کے مبادی مختلف ہوتے ہیں۔ ایک فرقہ ہے
جو خیال کا پابند ہے۔ دوسرا ہے جو حقیقت کا مقلد ہے۔
ایک جماعت ہے جو منوال طبیعت پر اپنی کارگہ چلاتی ہے
دوسری ہے جو مسایرۃ اوہام میں اپنی ہمت کو صرف کرتی ہے
لیکن بخلاف اس کے موسیقی کبھی تقلبات کا نشانہ نہ بنی اس
لئے کہ وہ اصل میں وحدت و ثبات کی ایک لطیف رمز
ہے۔ ماہرینِ موسیقی خود اگرچہ متغیر ہوتے ہیں۔ ان میں
تبدیلیاں آتی ہیں۔ ان کے مبادی ترقی کرتے ہیں ان
کے طریقے متنوع ہوتے ہیں۔ پر موسیقی کی ذات ہمیشہ باقی
رہتی ہے۔ موسیقی جوہر فرد کے مانند ہے۔ اور ماسوا جو کچھ ہے
وہ عرض ہے!

لیکن وہ کیا چیز ہے جو موسیقی کو اور فنونِ لطیفہ کے مقابلہ
میں اشرف و افضل بنا دیتی ہے؟ غور کرو تو تم کو خود معلوم ہوگا
کہ تمام فنونِ لطیفہ اپنے ظہور میں مادہ کے محتاج ہیں مصوری
ہو یا بت تراشی۔ تعمیر ہو یا بنا، یہ اس وقت تک کبھی ظاہر
نہیں ہو سکتیں جبتک کہ مادہ موجود نہ ہو۔ ایک تصویر بنانے
کے لئے ضروری ہے کہ مصور کے پاس مختلف رنگوں کا ایک
مجموعہ اور لکڑی و کپڑے کے بہت سے ٹکڑے بھی ہوں۔
میخائیل انجلو جیسا نامور بت تراش بھی بغیر پتھر کے کوئی مجسمہ
نہ گھڑ سکا۔ اور عہد پرکلیس میں اغریقی معمار بھی بغیر مادہ کے
اپنے عالیشان عمارات کی تشئید نہ کر سکے۔

لیکن موسیقی اپنے فن کو اعلیٰ درجات اور حسین مظاہر
میں ہمیشہ بغیر مادہ کے ظاہر کرتی ہے۔ اس موقعہ پر کسی کو
ایتھر کی مداخلت سے دھوکہ نہ ہو۔ ایتھر تو صرف آواز کی موجوں
کو پھیلاتا اور کانوں کی طرف نغمے کے اہتزازات کو نقل کرتا
ہے۔ ورنہ موسیقی خود اپنے فطری آواز میں ایک مغموم کو ہنسا
دینے یا ایک مسرور کو رُلا دینے کا طلسمی اثر رکھتی ہے۔ پیانو

کی کنجیاں یا سارنگی کی تار یہ حقیقت میں محض اخراج صوت کے لئے ہوتے ہیں۔ تو نار و مفاتیح، باجے کے خلاف ہیں۔ آوازیں اعراض ہیں۔ اور نغمے جواہر ہیں۔ مختصر یہ کہ موسیقی کی فضیلت اور فنونِ لطیفہ پر ویسی ہی ہے جیسے روح کی فضیلت مادہ پر!

فنونِ لطیفہ۔ نقاشی، بت تراشی، عمارۃ۔ میں مزید غور سے کام لو تو تم کو صاف نظر آئے گا کہ یہ چیزیں افکار و خواطر کے نتائج پر دلالت کرتی ہیں۔ لیکن اسی حیثیت موسیقی پر اگر نظر ڈالو معلوم ہوگا کہ یہ چیز افکار و خواطر سے نہیں بلکہ عواطف و جذبات سے تعبیر کرتی ہے +

مثلاً دیکھو! نقاشی، تمہارے سامنے کلو پیٹرہ کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتی ہے۔ بت تراشی منروا الٰہتہ حکمتہ کا کا حیرت انگیز مجسمہ آگے رکھتی ہے۔ تعمیر اهیکل کرنک اور قصر انس وجود جیسی فلک بوس رفیع عمارات سامنے لاتی ہے لیکن ان اشیاء جمیلہ کو دیکھنے کے بعد تمہارے حیرت و استعجاب میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ دنیا کی کوئی بڑی سے بڑی صنعت بھی ہمارے نفوس کو اپنی طرف انتہائی حیرت و تعجب کے ساتھ منتقل کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔ چونکہ ایسے فنون مادہ پر محدود ہوتے ہیں اور اشکال معینہ کے ساتھ وہ ہمارے حیرت و استعجاب کا منشا بنتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان میں کچھ زیادہ حیرت انگیز جاذبیت نہیں ہوتی لیکن موسیقی اپنی روحانی قوۃ کے سبب اپنے عدم آمیزش مادہ کے باعث۔ اور اپنے استغنا عن الاشکال کی وجہ سے عواطف و جذبات کی تعبیر پر بالکل قادر رہتی ہے +

رتیس کے ضخیم اور حیرت انگیز مجسمے اگر کسی حسین و جمیل جگہ میں نصب کر کے جواہرات اور سونے سے لیپ دو تو وہ باوجود ان محاسن کے دیکھنے والوں کے ذہن پر کوئی دہشت طاری نہ کر سکیگا۔ ہاں اتنا ہوگا کہ پتھر کی ضخامت اور صناع کے غیر معمولی اقتدار پر استعجابی جذبہ کو ذرا حرکت ہو جائے گی۔ باقی نفوس کے اندر حزن و سرور کو داخل کرنا اس عظیم الشان مجسمہ کے بس سے قطعاً باہر ہوگا +

بخلاف اس کے موسیقی کو دیکھو کہ قوس فنیل کا ایک باریک تار نفس میں وہ کام کرتا ہے جس کے کرنے سے رتیس کا اتنا ضخیم مجسمہ عاجز ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ نفس میں کسی قسم کا جذبہ پیدا کرنا محض موسیقی کا کام ہے۔ یہی ہم کو ہنساتی ہے۔ یہی ہم کو رلاتی ہے۔ یہی ہم کو رقت و حنان، رغبت و محبت کی دعوت دیتی ہے۔ اور یہی ہم کو قوت و شجاعت بسالت و بہادری کے ساتھ میدانِ جنگ کی طرف بڑھاتی ہے +

اور موسیقی ہی تنہا یہ قدرت بھی رکھتی ہے کہ حالات نفس کو متغیر کر دے۔ انبساط سے انقباض کی طرف، انقباض سے انبساط کی طرف، آس سے یاس کی طرف، یاس سے آس کی طرف، خوشی سے غم کی طرف۔ غم سے خوشی کی طرف!

اور ہاں صرف موسیقی ہی کے ہاتھ میں ہمارا سکر بھی ہے، صحو بھی ہے، غفلت بھی ہے، بیداری بھی ہے، راحت بھی ہے۔ سعادت بھی ہے، اور شقاوت بھی ہے۔ اس لئے کہ موسیقی ہی تنہا ایجاد عواطف اور تخلیق جذبات کی قدرت رکھتی ہے +

موسیقی کی قدر ہماری نظروں میں اور زیادہ ہو جاتی ہے جب ہم اس طرح غور کرتے ہیں کہ حیاۃ پر جذبات کا پورا غلبہ ہے۔ اور تحقیق جذبات موسیقی کا کام ہے۔ اس لئے بغیر موسیقی کے نہ کوئی بات کہی جاسکتی ہے۔ اور نہ کوئی کام کیا جاسکتا ہے تم خود اپنے اقوال وافعال کو کسی وقت میں غور سے دیکھو۔ تو سب کو اپنے جذبات کی طرف راجع پاؤ گے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر جذبات نہ ہوتے تو دل و اُمید نہ پائی جاتی۔ اور اگر اُمید نہ ہوتی تو خود حیات کا وجود مشکل ہوتا +

غرض یہ کہ موسیقی کے سوا اور فنونِ لطیفہ کا اثر نفس پر بہت ہی خفیف اور سطحی ہوتا ہے لیکن موسیقی نفس کی گہرائیوں میں افتراق پیدا کرتی ہے +

حیاۃ اصل میں قوۃ ارادہ کی محکوم ہے۔ اور یہی ارادہ کائنات کا جوہر اصلی اور اس کی روح رواں ہے۔ تمام مخلوق روح ہو یا مادہ۔ اسی ارادہ علیا کی قوۃ سے (جس کے مظاہر ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں لیکن اس کی کُنہ اور حقیقت سے ہم بےخبر ہیں) وابستہ ہے +

موسیقی کے سوا اور فنونِ جمیلہ کی غایت اسی ارادہ علیا کے مظاہر کی مادی تخیل ہوتی ہے لیکن موسیقی ارادہ علیا کے ذات کی ایک محسوس اور بےباک تعبیر بیان کرتی ہے۔ اور حقیقت میں موسیقی ہی جبتک سب سے بڑی قوت اور حیات کا سب سے بڑا مظہر ہے!! (بدر اصلاحی)

غزل

ترے کوچہ میں اس طرح ترا دیوانہ آتا ہے
کہ جیسے شمع کی جانب کوئی پروانہ آتا ہے

یہ کس نے پتھروں سے دی ہے ایذا جسمِ لاغر کو
کہاں سے خون میں ڈوبا ترا دیوانہ آتا ہے

وہ رند لاابالی ہوں مری توقیر تو دیکھو
کہ ساقی مجکو لینے تا درِ میخانہ آتا ہے

بُلانے سے شبِ فرقت میں کیوں آتی نہیں یارب
اجل کو بھی کوئی اندازِ معشوقانہ آتا ہے

سنبھل جا خنجرِ قاتل نے لی وہ اُٹھ کے انگڑائی
کہ وقتِ امتحاں اے ہمتِ مردانہ آتا ہے

وہیں کر دیتا ہے ٹکڑے گریباں جوشِ وحشت میں
وہ کہہ دیتے ہیں جب ہنسکر مرا دیوانہ آتا ہے

نہ چھوڑے گا تری اُلفت کوئی گر لاکھ سمجھائے
کہیں ناصح کے کہنے میں ترا دیوانہ آتا ہے

دلِ وحشی کو زنداں میں بھی وحشت گدگداتی ہے
تڑپ جاتا ہے دل جب سامنے ویرانہ آتا ہے

کہوں کیا میں عدم آباد کی حالت کو اسے کوثر
نظر ہر سمت اک ویرانہ ہی ویرانہ آتا ہے

منشی محمد ہادی علی کوثر رامپوری

سورج دیوتا

(افسانہ)

(مشہور افسانہ نگار جناب عبدالباقی کے قلم سے)

ہلیترین کشتی کے اگلے حصہ میں بیٹھا ہوا سمندر کے سیاہ پانی کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ ۲۸۰ قبل مسیح کے ستمبر کا دن اور طلوع آفتاب سے ذرا ہی بعد کا وقت تھا۔ اس وقت تک تو خوب روشنی پھیل جانا چاہئے تھی لیکن دن بہت آہستہ آہستہ نکل رہا تھا۔ آسمان کو عجیب انداز کے نیلگوں دود نما بادل ایک سیاہ جبہ پہنا کر نظروں سے پوشیدہ کر رہے تھے۔ جو طوفان رعد کی علامت معلوم ہوتا تھا۔ نوجوان کی پُراشتیاق آنکھوں سے جو جزیرۂ روڈس کے بندرگاہ اور اُس کے عقب میں ڈھلان پر زینہ بہ زینہ بلند ہونے والے شہر کو دیکھ رہا تھا۔ منظر کی تفصیلات دھندلکے میں پوشیدہ تھیں۔ تاہم ایک چیز وضاحت میں یکتا معلوم ہوتی تھی۔ یہ روشنی کا مینارہ تھا۔ ایسا مینارہ جو دنیا بھر میں سب سے عجیب تھا۔

نشیب میں بندرگاہ کے قریب ایک دیوہیکل مجسمہ کی شکل نمایاں تھی۔ یہی مشہور کلوسس تھا۔ جو سورج دیوتا کا مقدس بت اور دنیا کے ہفت عجائبات سے تھا۔ اپنے داہنے ہاتھ میں مشعل اُٹھائے جس کی روشنی اُس کی سنہری شعلہ نما لٹوں پر پڑتی اور اُس کے کانسہ کے سیاہ جسم میں چمک پیدا کرتی تھی۔ سورج دیوتا کا مجسمہ ایک سو پچاس فٹ فضا میں بلند تھا۔ دھندلکے میں بلندی پر دو بڑی بڑی شمعیں روشن نظر آتی تھیں۔ یہ گویا عفریت کی آنکھیں تھیں۔

تمام دنیا کی طرح نوجوان بھی کلوسس کی شہرت سے یقیناً آگاہ تھا۔ پھر کیا تعجب ہے اگر پہلے پہل نظارہ سے سوائے تحیر کے نہ تو اُس نے کوئی سنسنی خیز جذبہ محسوس کیا۔ اور نہ کوئی قبل از وقت اطلاع کن نشان۔ نہ اُسے واقعات مابعد کا خیال آیا۔ بھلا وہ کیونکر جان سکتا کہ یہی جسیم دیو جو اس وقت دھندلکے میں تھا۔ اُس کی آئندہ زندگی کی پوری رَو کو بدل دیگا۔ وہ کیونکر اندازہ لگاتا کہ اُسے ایک ایسی پرخطر مہم درپیش ہے جس کی جذبات آفرینی دائرۂ تخیل سے باہر۔ تاہم نوشتۂ تقدیر یونہی تھا۔ جوں جوں کشتی بندرگاہ سے قریب ہوتی گئی یہ عظیم شکل بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھی معلوم ہوئی کہ کشتی گویا اُس کے زیر قدم تھی۔ کشتی کے پچھلے حصہ میں ایک نے نواز بیٹھا کشتی رانوں کا نغمہ صاف اور اونچے سُر میں بجا رہا تھا۔ جس کے تال پر چپّو والا جو کُرتہ اُتارے اور جسم پر تیل ملے ہوئے تھا۔ پے بہ پے چپّو چلاتا تھا۔ اب اُس نے بجانا بند کر دیا۔ اور کشتی پشتہ کے پاس سے گزرتی ہوئی اندرونی گھاٹ میں آکر ٹھہر گئی۔ ایک تن تنہا گھاٹ والے نے آنکڑا بڑھا کر اُسے قریب کھینچ لیا اور نوجوان نے کنارے پر قدم رکھا۔

روشنی زیادہ صاف ہوتی جاتی تھی۔ سمندر کے رُخ دو آسمان پر سیسے کے رنگ کا چنچہ پھٹ کر ایک طویل شگاف بن گیا تھا۔ جس میں سے سرخی اس طرح پھوٹ رہی تھی۔ جیسے کسی خشمگیں آنکھ سے نکلتی ہو خشکی پر گرہن کے وقت کی سی عجیب مدھم روشنی پھیلی تھی۔ اس عجیب روشنی میں سمجھنے والے کے لئے ایک علامت بھی ہو سکتی تھی۔ ہلیرین نے تعجب سے آس پاس دیکھا۔ گھاٹ خالی پڑا تھا۔ اُس نے خادم سے کہا "ہیں: تمہارا شہر تو ہُو کا میدان ہے۔ یہ اہل روڈس خوب تڑکوں سے شرط لگا کر سوتے ہیں۔ اس سورج دیوتا کے دربار میں بس تم ہی اکیلے متنفس سورج نکلتے وقت چل پھر رہے ہو؟"

اس شخص نے جس کا رنگ ذرا گندمی تھا حیرت سے آنکھیں سکیڑ کر اُس کی طرف دیکھا "ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ آپ اجنبی ہیں" اُس نے جواب دیا۔ "تاہم اجنبی کو بھی اس بات کے بتانے کی ضرورت نہیں۔ کہ آج سورج دیوتا کا تہوار ہے۔ اور مرد عورتیں اور بچے سب شہر پناہ کے باہر میدان میں کھیل دیکھنے گئے ہوئے ہیں جو طلوع کے وقت شروع ہوتے ہیں۔ دنیا بھر کے ہر گوشہ سے بڑے بڑے نامی زور آزما یہاں آکر آج فتحمندی کے لئے باہم مقابلہ کرتے ہیں۔ میں سمجھا تھا۔ آپ بھی انہیں میں سے ہیں۔ مگر دیر میں پہنچے ہیں۔ لہذا میں نے آپ کی کشتی کا انتظار کیا" پھر اُس نے ہلیرین کی عقابی آنکھوں اور بے آستین کے چغہ میں ملبوا جوان تنومند جسم پر ایک گہری نظر ڈال کر کہا "مجھے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر آپ اُن میں سے نہیں ہیں۔ تب بھی آپ کو بن جانا چاہئے۔ یا تو دوڑنے والا ــــ یا گھونسے باز ــــ نہیں تو پہلوان ــــ"

"پہلوان" ہلیرین نے جواب دیا۔ "تمہارا قیاس ٹھیک ہے پہلوان تو ہوں۔ لیکن آج تو میں اس سے بہت زیادہ اہم معاملہ کے لئے آیا ہوں۔ اور انعام بھی وہ لینا ہے جسے پانے اور بازی جیت کر پھولوں کا ہار پہن لینے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔" گھاٹ والا بولا "آج تو اس شہر میں اس کے معاملہ پر گفتگو ہوگی ہی نہیں۔ لہذا بہتر تو یہ ہے کہ آپ اس معاملہ کو کل پر اُٹھا رکھیں۔ اور میرے ساتھ کھیل دیکھنے چلیں۔ جو ہر طرح دیکھنے کے قابل [illegible] میں پرلے درجہ کا جھوٹا۔ بلکہ جھوٹوں کا سردار [illegible] کھینچنے کا آنکڑا پھینک وہ [illegible] سے روانہ ہو [illegible] تیار ہو گیا۔ "بن سکا تو میں تمہارے [illegible] نے کہا "لیکن پہلے مجھے اپنے اچھے کشتی [illegible] ایک باتیں کہنی ہیں۔ تمہارے اخلاق کا شکریہ [illegible] زیادہ روکنا نہیں چاہتا۔ اچھا خدا حافظ!" "اچھا تو [illegible] گھاٹ والے نے کہا "مجھے پہلے ہی بہت [illegible] (پھر اُداس آسمان کی طرف ایک نظر ڈال کر) اگرچہ سے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ اندیشہ ہے کہ آ [illegible] دوڑ دیکھنی نہ ملے" اور اپنی ظرافت کی اس [illegible] گدگدی محسوس کر کے چپکے چپکے ہنسنے [illegible] سے نکل پوری رفتار سے [illegible] نوجوان نے [illegible] تھا "سینتھنکبس" [illegible]

رہنے دو۔ اس عرصہ میں میں گھوم پھر کر لوٹ آؤں گا پھر تمہیں بھی کام بتلا دوں گا۔ ممکن ہے یہ تمہارے اور میرے لئے مفید مطلب ہو۔

"کونسا مطلب؟" نے نواز نے متجسّسانہ نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ جواب میں ہلیرین نے اُسے حیرت سے گھورا۔ پھر مُسکرا کر کہا "میں تو تمہارے لئے محض اجنبی ہوں۔ یہاں تک آنے کے لئے تمہاری کشتی کرایہ سے کی ہے۔ بس میرے متعلق تم اتنا ہی تو جانتے ہو زیادہ معلوم کرنے سے کیا حاصل ؟"

نے نواز جس کا رنگ گندمی چہرہ حلیم اور آنکھ خندہ اور چمکدار تھی۔ جواب میں دلچسپی سے مُسکرایا۔ "تجسّس" اُس نے جواب دیا۔ "میری ماں عورت ذات تھی۔ اور میں اُسی پر گیا ہوں۔ آپ کے چہرے میں کوئی ایسی بات ہے جو تجسّس کو بیدار کرتی ہے۔ بھلا آپ کی آنکھیں چمکتی کیوں ہیں ؟ اس بات کا مدعا ہے ؟ مہم ؟ خطرہ ؟"

"خطرہ" ہلیرین بول اُٹھا "خطرہ پر تو فتح حاصل ہو سکتی ہے۔ اور حاصل ہوگی بھی" نے نواز اُسے چند لمحوں تک اسی طرح خندہ اور چہرہ بنائے ہوئے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ آخر کار پوچھا "کوئی لڑکی ؟"

نوجوان سُرخ ہوگیا۔ لیکن گھڑی بھر میں مُسکرا دیا "مجھے اقرار ہے کہ لڑکی ہی ہے" اُس نے جواب دیا۔ "لو تم سے سرِ بستہ کہے دیتا ہوں۔ کیونکہ بعد میں تمہیں معلوم ہو جانا ہی ہے۔ یا کم از کم اندازہ تو لگا ہی لوگے"

... خیالات میں محو ہو کر وہ لمحہ بھر چپ رہا۔ پھر کہنا شروع کیا "میں پہلوان ہوں۔ دمشق کا رہنے والا۔ ہلیرین تھوڑا تھوڑا کر کے روپیہ جمع کر رہا تھا۔ تاکہ شام کی ایک نوجوان لڑکی سے شادی کر سکوں۔ میں کسی کام سے دس روز باہر رہا۔ جب واپس لوٹا ہوں تو معلوم ہوا کہ اُس کا چچا ایک ہی کمینہ کنجوس ہے۔ اپنے فائدہ کی غرض سے کمبخت نے اُس کا۔ آہ ابھی کاسہ دل کڑوا تھا۔ انتقام کی خون آشام۔ یونان کی قسم! اُسنے اُسے باندی بنا کر بیچ ڈالا"

وہ تھوڑی دیر چپ ہوگیا۔ مٹھیاں بند ہوگئیں اور آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

"تین ہفتے گزر گئے" وہ پھر کہنے لگا "صرف دو دن ہوئے مجھے پتہ لگا۔ کہ اُس کا آقا یہاں روڈس میں بندرگاہ کا مالک ہے۔ میں نے تمہاری کشتی کرایہ سے کی۔ یہاں آن پہنچا۔ اُسے واپس لینے کے لئے روپیہ تو میرے پاس کافی ہے ہی نہیں۔ اب اُسے چُرانے اور نہیں تو اسی کوشش میں اپنی جان دینے چلا ہوں۔ دوست! خدا سے میری کامیابی چاہو۔ لو خدا حافظ!

یہ پُر ہیجان کہانی کہہ کر جو جوشیلے الفاظ کی رَو میں نکل گئی تھی۔ اور اپنے مخاطب سے ہاتھ ملا کر وہ تیزی سے مُڑا۔ اور بغیر دوسرا حرف تک کہے گھاٹ سے چلدیا۔ اور نے نواز کو کھڑے کا کھڑا ایسے شخص کی سی حالت میں چھوڑ گیا جس نے جنتی کا پٹ کھولا ہو۔ اور لپٹ لگ گئی ہو۔

اُتھل سیڑھیوں پر چڑھ کر ہلیرین تھم گیا۔ اور ہر طرف نظر دوڑائی۔ دہنے ہاتھ پر بڑا بندرگاہ تھا جو جہازوں سے بھرا ہوا تھا۔ لیکن تھا یہی سنسان۔ مگر بند نکل نہیں۔ ایک کشتی کے پاس چند آدمیوں کو دیکھ کر اُسے کسقدر تعجب ہوا۔ ایسا معلوم

ہوتا تھا کہ وہ کشتی کو بحری سفر کے لئے تیار کر رہے ہیں۔ یہ ایک کشادہ اور جاذبِ نظر کشتی تھی۔ دیودار کا بنا ہوا اس کا تفریحی بجرا معدوم ہوتی تھی۔ اس پر آبی جانوروں پر سوار دریائی پریوں کی تصویریں بنی تھیں۔ اور پچھلے حصہ میں رنگین گدے لگے ہوئے تھے ✦

ایک لمحہ بھر انہیں دیکھ کر ہلیرین نے اپنی پُر استعجاب نظر جانبِ چپ پھیری۔ اس طرف ایک بڑا مرمریں مربع چبوترہ ایستادہ تھا۔ یہ کلوسس کی بیٹھک تھی۔ اس رُخ پر ایک متنفس بھی نظر نہ آتا تھا۔ ہاں مگر ایک بے لڑکی کی شباہت تھی۔ وہ دوسری جانب سے بیٹھک کی سمت چلی آ رہی تھی۔ مگر قریب سو گز دور تھی۔ تاہم اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ کیا اتفاقات کا دیوتا جو گرفتارانِ محبت سے اُنس رکھتا ہے اس پر اسقدر مہربان ہوگیا تھا؟ یہ بات امید سے بھی متجاوز معلوم ہوتی تھی۔ مگر پھر بھی اس کا دل اندر سے یہی گواہی دیتا تھا۔ کہ یہ خیال ٹھیک ہے ✦

لڑکی عظیم الشان تودہ کے بعید رُخ کی آڑ میں غائب ہو چکی تھی۔ ہلیرین جھٹ آگے بڑھا۔ کونے پر سے گھوم کر دوسری سمت پہنچا۔ لیکن اُس کا کہیں پتہ نہ تھا ✦

لمحہ بھر وہ محوِ حیرت کھڑا رہا۔ آخر وہ غائب کہاں ہوئی؟ پھر اُسے نظر آ ہی گیا۔ بیٹھک کے نیچے سے اوپر کی سطح تک ایک تنگ زینہ بنا ہوا تھا۔ بس معمہ یہیں حل تھا۔ وہ زینہ پر چڑھ گیا ✦

اب وہ چبوترہ کی بالائی سطح پر تھا۔ سامنے دو پیر کے پنجہ پھیلے ہوئے تھے جن میں سے ہر ایک کئی گز لمبا تھا

ان پر ٹانگوں کے عظیم ستون میناروں کی طرح بلند ہوتے چلے گئے تھے۔ لڑکی اب بھی نظر نہ آئی۔ لیکن ایک لحظہ میں اُس نے دیکھ لیا۔ کہ سیدھے پیر کی ایڑی میں چور دروازہ کی طرح چھوٹا سا دروازہ ہے۔ مگر اس میں کواڑ نہ تھے۔ یقیناً یہی راستہ اُس نے اختیار کیا ہوگا۔ وہ جھپٹ کر دروازے کے قریب پہنچا اور اندر داخل ہو گیا ✦

بُت کی ایڑی کا جوف چھ فٹ چوڑا اور کم و بیش گول تھا۔ اسکے بائیں جانب آہنی سیڑھی کے نچلے ڈنڈے نظر آتے تھے۔ جو راستہ میں پیر کے جوف کے مقابل جمے ہوئے تھے۔ اوپر نظر اُٹھانے سے اُسے مدہم روشنی کا حلقہ جیسا کہ کنوئیں کی تہ سے دکھائی دیتا ہے۔ بلندی پر کم از کم ساٹھ فٹ اونچا نظر آتا تھا۔ لکڑیوں اور بندھنوں کا جال جس سے پیر جکڑا ہوا تھا۔ مکڑی کے جالے کی طرح حلقہ میں آر پار تنا تھا۔ اُس نے کان لگایا مگر کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اُس نے سیڑھی کے ڈنڈے پکڑے اور چڑھنے لگا ✦

مجسمہ چونکہ ٹانگیں پھیلائے کھڑا تھا۔ اس وجہ سے پیر اور ساتھ ہی سیڑھی بھی ذرا ترچھی تھی۔ لہٰذا چڑھائی خاصی آسان تھی جوں جوں وہ اونچا ہوتا گیا۔ روشنی تیزی سے بڑھتی گئی۔ اور ران کی وسعت کی وجہ سے سر کے اوپر کا دریچہ اُس کے اندازہ سے بہت زیادہ معلوم ہوا آخر کار وہ اُس تک پہنچ گیا۔ اور سب سے اوپر کے ڈنڈے سے قدم بڑھا کر ایک طرح کے کمرہ میں داخل ہوا ✦

یہ کمرہ جو ایک طرف سے دوسری طرف تک ۲۵ فٹ ہوگا۔ یقیناً دیدہ کا شکم تھا۔ روشنی چار جھانکی سی گول کھڑکیوں سے

آتی تھی یہ مجسمہ کے بیضوی رُخ سے بیٹی کے اُبھرے ہوئے پھولوں کی طرح معلوم دیتی تھیں۔ ایک طرف تیل کے برتنوں کی ایک قطار کے سوا کمرہ خالی پڑا تھا۔ ہاں دوسری طرف سیڑھی نہیں بلکہ باقاعدہ زینہ مجسمہ کی گردن تک چلا گیا تھا +

ہلیرن نے فقط ایک نظر چاروں طرف ڈالی زینہ کے پاس پہنچا۔ اور گردن تک پہنچکر ایک چھوٹی سیڑھی پر چڑھ گیا اور ایک دوسرے اور بہت ہی چھوٹے کمرہ میں برآمد ہوا یہ بُت کا سر تھا +

یہاں اس کے سامنے ایک عجیب منظر تھا۔ کمرہ کے وسط میں ایک مربع میز تھی جس پر کم از کم گز بھر چوڑی بتی کی بہت بڑی کنڈلی پڑی تھی۔ اور کاٹنے کے لئے ایک چاقو کئی صافیاں۔ برش اور بڑے بڑے گلگیر رکھے ہوئے تھے۔ اس کے دہنے جانب تیل کے دوسرے برتن اور دھات کا ایک ڈونگا یا تیل نکالنے کی پلی دھری تھی۔ اسکے علاوہ دیوار گیر پر ایک چھوٹا سا چراغ تھا۔ جسے ان بڑے چراغوں کے جلانے کے لئے جس سے بُت کی آنکھیں شب کو روشن رہتی تھیں ہمیشہ جلتا ہوا ہی رکھا جاتا تھا۔ یہ چراغ خود تو اُسے نظر نہ آتے تھے۔ کیونکہ دو عظیم آئینوں یا عکس اندازوں کی پشت سے چھپے ہوئے تھے لیکن وہ روشنی جو ان آئینوں کے کناروں سے پھوٹ کر نکلتی تھی تمام کمرہ کو ایک سرخی مائل دمک سے بھر رہی تھی۔ چراغوں تک رسائی ایک بلند چبوترہ سے ہوتی تھی جو ان کے نیچے بنا ہوا تھا اور اس چبوترہ پر لڑکی کھڑی تھی +

اس کے پہنچنے کی آہٹ سے وہ چراغ بجھانے کے لئے ان پر بڑی بڑی بر بچی ٹوپیاں ڈھانکنے کے کام سے رُک کر دیکھنے کیلئے مڑی لیکن اس کا اظہار جذبات محض حیرت کا نہ تھا جیسا کہ ایک غیر متوقع آنے والے پر ہوتا ہے بلکہ خوف کا تھا۔ اور سخت ہول کا۔ ایک مرد کو فرش کے روزن سے نکلتا ہوا دیکھ کر اُس کی ایسی حالت ہوگئی کہ گویا اب چیخیں مارتی ہے۔ اور اس طرح دونوں عرصہ تک ایک دوسرے کے رو برو کھڑے رہے +

اس کا قد بوٹا سا آنکھیں بڑی بڑی جو اس وقت خوفزدہ تھیں اور رنگ نہایت زرد تھا۔ موئے پیچاں لکڑی کی معمولی پن سے بندھے ہوئے تھے۔ ہاتھوں اور کرتی پر تیل کے دھبے تھے۔ محافظ لباس کپڑے پر بھی دھبے تھے۔ جسے غلام کام کاج کرتے وقت سامنے باندھ لیتے ہیں۔ یہ کپڑا سامنے ایک بڑی گرہ دیکر باندھا گیا تھا۔ اس حالت میں بھی وہ ایک خوبصورت چیز معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے اسیر زلف کا بھی جو وہاں کھڑا تھا یہی خیال تھا۔ اور اُس کا خون رگوں میں سنسنا رہا تھا +

آخرکار اُس نے کہا "نیسا"

لڑکی کا چہرہ تبدیل ہوگیا۔ خوف کے اظہار نے استعجاب خوشی کے استعجاب کو جگہ دیدی۔ اُس نے پھولی ہوئی سانس لے کر کہا "ہلیرن! تم! کیا یہ خواب ہے۔ فریب نظر؟" اور چبوترہ سے بے تحاشا دوڑ کر خود کو ہلیرن کے کھلے ہوئے آغوش میں ڈال دیا +

"بیشک نیسا" اُس کے دلدادہ نے کہا "میں ہی ہوں فریب نظر نہیں۔ میں نے تمہیں ڈھونڈ لیا۔ لے جانے کے لئے

آیا ہوں۔ میری کشتی منتظر ہے۔ چلو!"

لڑکی نے آہ سرد بھر کر کہا "بلیرن! مجھے خوف معلوم ہوتا ہے"

"خوف! کس کا؟" اُس کے عاشق نے اُس کی وحشت زدہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"کسادرکا!" لڑکی نے ہنوز کانپتے ہوئے کہا۔

"کسادرو؟" اُس نے دُھرایا "بخدا یہ ہے کون؟"

"سنو" لڑکی نے جلد جلد کہنا شروع کیا "وہ میرے آقا کا بھتیجا ہے اور مجھے خریدنے کی کوشش کر چکا ہے مگر اُس کے چچا کو اُس سے نفرت ہے۔ اُس نے صاف انکار کر دیا۔ آج صبح جب مجھے چراغ گل کرنے کو بھیجا گیا۔ اور پہلے بھی کئی مرتبہ میں یہ کام کر چکی ہوں۔ تو میں نے اُس کی کشتی کو بندرگاہ میں دیکھا۔ جانتی ہوں کہ اُس کا مقصد کیا ہے یہی کہ موقع کی تاک میں رہے۔ اور جب سب تہوار منانے میں ہوں تو مجھے جزیرہ کی دوسری سمت ایا یسس میں جہاں اُس کا گھر ہے بھگا لیجائے۔ میرے یہاں آنے نے اُسے اپنی توقع سے زیادہ موقع دیدیا ہے جب میں نے تمہارے اوپر آنے کی آہٹ پائی۔ تو مجھے خیال ہوا۔ کہ۔۔۔ آہ!"

وہ خوب کانپ رہی تھی۔

"سمجھ گیا" نوجوان نے آہستہ سے کہا "معلوم ہو گیا۔ اب قسم ہے اسفل السافلین کے دیوتا کی" وہ یکایک چپ ہو کر سننے لگا۔ اور اُس کے مُنہ سے "سُنو" بے ساختہ نکل گیا۔ اب دونوں سُننے لگے۔ راستہ کے بہت نیچے سے انہیں آواز آتی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے کوئی چڑھ رہا ہو۔ لڑکی بلیرن سے چمٹ گئی۔ اور آہ سرد بھر کر کہنے لگی "وہی ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ میں یہاں موجود ہوں۔۔۔"

"لیکن یہ نہیں معلوم کہ میں بھی ہوں" اُس کے عاشق جانباز نے غضب آلود چہرہ بنا کر کہا۔ "ورنہ مشکل سے اکیلا آتا۔ شاید میری موجودگی کا علم اُسے اچانک ہی ہو۔ خاموش!"

دونوں کامل خاموشی سے منتظر تھے۔ لڑکی ہنوز کانپ رہی تھی۔ جوں جوں چڑھنے والا نزدیک ہوتا جاتا تھا۔ آواز ہر لحظہ زیادہ واضح ہوتی جاتی تھی۔ جلد ہی اُس کے پیروں کی چاپ نیچے کے کمرے میں تھی۔ اس کے بعد آنے والا کون والے راستے پر چڑھ رہا تھا۔ یکایک اُس کا سر ظاہر ہوا۔ دریچہ کے دونوں طرف ہاتھ جما کر اُس نے خود کو اونچا کیا۔ اور جب فرش پر قدم رکھا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ بد ۔۔۔ خط و خال گٹھے جسم اور موٹی گردن والا نوجوان ہے۔ زعفرانی رنگ کا کرتہ اور ریشمی پھندنے والے جوتے پہنے وہ بانکے کے لباس میں گنوار معلوم ہوتا تھا۔ آنکھیں اوپر اُٹھائیں تو اُسے دو وارفتگانِ محبت کی موجودگی کا علم ہوا۔ بس پتھر بن کر کھڑا ہو گیا۔

"تم کون ہو؟" اُس نے چھائی ہوئی خاموشی توڑ کر پوچھا "یہاں کیوں کھڑے ہو؟ اس لڑکی سے کیا کام ہے؟"

"اُسے بھگا لیجانا ہے" بلیرن نے اطمینان سے جواب دیا۔ "جونہیں کہ تمہیں ہم لوگوں کا پیچھا کرنے سے معذور کر دیا جائے۔"

اُس شخص کا جواب بے ربط بڑبڑاہٹ تھی۔

دوسرے لمحہ میں وہ جھپٹ کر میز پر پڑا ہوا چاقو اُٹھا چکا تھا۔ جب اُس نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ تو لمبے تیز پھل سے فولادی

جھلک پیدا ہوئی۔ وہ ہلیرین پر چاقو پھینکنے چلا تو تھا لیکن ذرا سی دیر کر دی تھی۔ ننیا نے جو دم بخود دیکھ رہی تھی۔ گویا ایک فوری جذبہ سے لکڑی کی ایک چھڑی اٹھا لی تھی یہ ایک طرح کا لکڑی کا گز تھا۔ اور برتنوں میں بچے ہوئے تیل کی گہرائی ناپنے کے کام آتا تھا۔ ٹھیک اسیوقت جبکہ اُس شخص نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ اُس نے اپنی پوری طاقت سے اپنا حربہ اُس کی کلائی پر اُتارا۔ پتلی لکڑی جو مشکل سے اُس کی اُنگلی کے برابر موٹی ہوگی۔ ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ لیکن چاقو گرفت سے چھوٹ کر اُچھلا۔ اور فرش کے روزن میں زینہ سے لگ کر جھنجھناتا ہوا نیچے کے کمرے میں جا رہا +

غصہ اور درد میں قسم کھا کر اور لڑکی پر ایک قہر آلود نگاہ ڈال کر وہ شخص سامنے ہلیرین پر لپک پڑا۔ مگر اس معاملے میں اُس نے غلطی کھائی۔ مضبوط اور تنومند گو وہ ضرور تھا۔ مگر مقابلہ مختصر رہا۔ نوجوان پہلوان نے اُس پر ایک پیچ باندھا۔ اپنا ایک پیر اُس کے گھٹنے میں اڑایا۔ اور ایک خاص داؤ سے جو اُسے ہی خوب معلوم تھا۔ اپنے ہر رگ و ریشہ کی طاقت لگا کر اُسے اُکھاڑ کر دیوار پہ دے مارا جس سے اُس کے گھٹنے کی ہڈی اُتر گئی +

وہ وہاں کیڑے کی طرح پڑا اینٹھ رہا تھا۔ ہلیرین نے آنکھیں اُس کی طرف سے ہٹا لیں۔ اور لڑکی سے مخاطب ہوا:۔

"ننیا! نیچے اُتر جاؤ" اُس نے کہا "یہ شہدا اب اور نہیں ستا سکتا۔ اس کے گھٹنے کے لئے جرّاح کی ضرورت ہوگی۔ اور زمین تک لے جانے کے لئے رسیوں کے ذریعے نیچے اُتارنا ہوگا۔ ہم اُس سے محفوظ ہیں" +

وہ دیکھتا رہا یہانتک کہ لڑکی نظروں سے غائب ہوگئی پھر اُس کی آنکھیں کلبلانے والے جسم پر جم گئیں۔ وہ دریچہ کی طرف آیا۔ اور جب اُس کا سر فرش کی سطح کے برابر نیچا ہوگیا۔ تو ایک آخری نظر اپنے رقیب پر ڈالی۔ بھدّے چہرے نے جو شدّتِ کرب سے اینٹھ رہا تھا۔ اُس کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ ان نگاہوں میں ایسا غضب اور نفرت بھری تھی جسے ہلیرین نے محسوس کر لیا کہ کبھی نہ فنا ہوگی۔ اور اگر بن سکا تو یہ شخص تمام عمر میں دنیا کے اس سرے سے اُس سرے تک اُس کا پیچھا کرتا ہی رہیگا +

اس خوفناک تصویر کو اپنے دماغ پر مرتسم کر کے اُس نے راستہ کے زیرین حصہ کا رُخ کیا۔ جہاں لڑکی اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور جلدی سے کھلی ہوا میں برآمد ہونے ہی کو تھا کہ لڑکی نے اُسے روک دیا اور سرگوشی کے لہجہ میں بولی "دو آدمی وہ منتظر کھڑے ہیں۔ مجھے لانے جاتے وقت وہی انہیں چھوڑ گیا ہوگا۔ ہلیرین! اب ہم تباہ ہوگئے" +

"تباہ! ہرگز نہیں" اُس کے یارِ وفادار نے کہا۔ اگرچہ ایک سنسنی اُس کے جسم میں دوڑ گئی "یہ تو ٹھوس دماغ کے پاگل غلام ہیں۔ جرأت سے ان کے ساتھ پیش آئیں۔ تو ابھی نہیں فریب دیدیں گے۔ ہمّت کرو ننیا! اور چلی چلو" +

پہلو بہ پہلو وہ چور دروازہ سے باہر نکل آئے۔ کشتی والوں میں سے دو آدمی وہاں کھڑے ہوئے تھے۔ اور حیرت سے

لڑکی کے ساتھی کی چونکا دینے والی صورت کو گھور رہے تھے دونوں میں سے بلند قامت جو سرغنہ معلوم ہوتا تھا۔ آگے بڑھا گویا راستہ روکنا چاہتا تھا۔ لیکن صورت معاملات اس کے لئے بالکل غیر متوقع تھی۔ اور اس کی سمجھ بھی موٹی تھی لہٰذا تبدیل شدہ حالات میں کچھ کام نہ دے سکتی تھیں +

وہ اُلّو کی سی آنکھیں بنائے بیوقوف کی طرح بس کھڑا ہی رہا۔ اور ایک حرف تک منہ سے نہ نکالا۔ ہلیرین نیبا کا ہاتھ پکڑے اب بھی اطمینان سے آگے بڑھا جا رہا تھا +

"ہٹ کر کھڑے رہو" اُس نے تیزی سے کہا۔ "لڑکی میرے قبضہ میں ہے۔ مجھے کشتی تک اسے لیجانا ہے تمہارے آقا کو ایک حادثہ پیش آگیا۔ اُس کی مدد کو پہنچو جلدی کرو۔ اپنے آقا کا حکم مانو۔ وقت بہت کم ہے اور یہاں ایک پل بھی گنوانے کے لئے نہیں ہے" +

یہ کہہ کر اور اُسی اطمینانی تحکمانہ شان سے وہ لڑکی کے پہلو بہ پہلو آگے بڑھ گیا +

اُس شخص نے اپنی کھوپڑی کھجلائی اور ہچکچا کر رہ گیا۔ اُس کے حواس بجا کرنے سے پہلے ہی دونوں پچاس گز دور نکل گئے تھے +

پھر شاید یہ سوچ کر کہ اگر کچھ دگرگوں معاملہ ہوا۔ تو بھی وہ آسانی سے پکڑ لئے جائینگے۔ وہ اپنے ساتھی کی طرف مڑا۔ اور اُس کو جھٹ سے زینہ پر چڑھنے اور آقا سے مشورہ کرنے کا حکم دیا +

اس اثنا میں دونوں جلد جلد بڑھے گئے۔ سیڑھیوں سے اُتر کر گھاٹ پر آئے۔ جہاں کشتی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ اُن کا آنا دیکھ لیا گیا تھا۔ اور ہر چیز تیار تھی۔ سلے نواز کشتی کے پچھلے حصہ میں جا بیٹھا تھا۔ اور ملّاح چپّو تھامے آگے جھکا ہوا تھا۔ جونہیں دونوں کود کر کشتی میں داخل ہوئے اور سامنے کی دو نشستوں پر بیٹھ گئے۔ پتوار پانی کاٹنے لگے اور کشتی روانہ ہو گئی +

لیکن ابھی تمام قضیہ ختم نہ ہوا تھا۔ ختم کیسا ابھی تو خاتمہ سے کوسوں دور تھا +

اُسیوقت زینہ کے بالائی حصہ سے ایک للکار فضا میں گونجی۔ ایک شخص جھپٹتا ہوا اُس مقام پر چلا جا رہا تھا۔ جہاں کساندر کی کشتی کھڑی تھی۔ دوڑتا جاتا تھا اور چیخ چیخ کر احکام دیتا جاتا تھا۔ ان احکام کی تعمیل اس تیزی سے کی گئی۔ اور ملّاحوں کی حرکات اسقدر مستعدی اور عجلت سے عمل میں آئیں کہ فرار ہونے والی کشتی سمندر میں ابھی پچاس گز بھی نہ بڑھی ہوگی۔ کہ تعاقب کرنے والوں کی لمبی پتلی کشتی پشتہ کے نیچے سے تیر کی طرح نکلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ یہ اُن کی کشتی سے دوگنی تیزی سے حرکت کر رہی تھی۔ اور ان کی تعداد سے دُگنے آدمی اسے چلا رہے تھے۔ اب سوائے کسی معجزہ کے کوئی چیز انہیں نہ بچا سکتی تھی +

خود ان کی کشتی کے ملاحوں کے ذہن میں بھی معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہی بات گذری۔ پتوار چلانے والا جو دونوں گرفتاران محبت کی طرف رُخ کئے بیٹھا تھا۔ یوبیا کا ایک غلام تھا۔ جلد سیاہ۔ ہونٹ موٹے موٹے اور کان بیٹھے ہوئے تھے۔ اُس نے اپنی سیاہ بھویں سکیڑ کر نیچی کر لیں۔ اور پتوار چلانا

بند کر دیا۔" کیا فائدہ" اُس نے اُداس ہوکر زیر لب کہا۔" موت کی طرح ہمارا فیصلہ بھی اٹل ہے"۔

بلیرین نے گرج کر کہا" کیا"

" مالک! فیصلہ تمام ہے۔ دیوہیکل غلام نے جواب دیا " خون پانی کرنا۔ اور آخر میں گلا کٹوانا کس کام کا۔ دیر میں آنے سے جلد ہی بھلا۔ اس حالت میں ہمیں کچھ موقع بھی مل سکتا ہے"

" چُپ" بلیرین نے غضبناک ہوکر کہا۔ زندگی کی خیر چاہتا ہے تو چپو چلائے جا۔ ورنہ قسم ہے آفتاب کی عظمت کی ......"

اُس کی زبان یکایک رُک گئی۔ جیسے کوئی گونگا ہو جائے غلام ٹکٹکی باندھے گھور رہا تھا اُس کی طرف نہیں بلکہ اس سے گزر کر ساحل کی طرف۔ اس کا چہرہ لحظہ بھر میں تبدیل ہو گیا تھا۔ مسکراہٹ چہرہ سے کافور تھی۔ خط و خال اس ایک لحظہ میں خوف کی مکمل تصویر بن گئے تھے۔ اس کے چہرہ پر کچھ ایسی وحشت تھی کہ دیکھنے والے کا بھی خون رگوں میں منجمد ہو جائے آخر واقعہ کیا تھا؟

اُسیوقت کشتی ایک پہلو پر ڈھلکی۔ سمندر پر بھنور کا نام تک نہ تھا۔ ہوا تو اتنی بھی نہ تھی۔ کہ عجیب طرح کے نیلگوں دودنما بادلوں کو آسمان میں حرکت دے سکے۔ تاہم کشتی نے ایسی زور سے جھکولا کھایا تھا۔ جیسے کہ سمندر کی تہ کا کوئی عظیم الجثہ حیوان جھپٹ کر اُس کے نیچے آ گیا ہو۔

اُسیوقت گرج کی سی مگر اُس سے کہیں زیادہ ہولناک اور عجیب و غریب آواز آئی۔ آواز بھی ایسی جو صور قیامت کی طرح دہلا دینے والی تھی۔

نوجوان مُڑا اور تب اُسے دکھائی دیا!

اللہ اکبر! ــــ ساحل ــــ شہر!

بچہ کے میز پر بنائے ہوئے کھلونے کے شہر کی طرح جیسے میز کو یک درشت ہاتھ ہلا دیتا ہے۔ ہر عمارت کی اینٹ سے اینٹ بج رہی تھی۔ ترچھے ہونے والے چبوتروں سے دیواریں لُڑھکتی ہوئی دھڑا دھڑ نشیب میں گر رہی تھیں۔ زلزلہ کے شور سے اس کے کان بہرے تھے۔ اور دہشت سے سکتہ کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے تمام شہر، عمارت برج اور ہیکل۔ ٹوٹ پھوٹ کر سنگہائے شکستہ کا انبار بن گئے۔ اس ہڑبونگ میں صرف آفتاب کا عظیم بت اب بھی سربلند تھا۔ مگر صرف ایک لحظہ کے لئے غوطہ خور کی طرح وہ آہستہ آہستہ جھکا۔ اور دھڑام سے نیچے جا پڑا۔ ایک جھنکار کیسا تھا جس نے حواس کو سُن کر دیا۔ وہ بت سنگ خارا سے بنے ہوئے گھاٹ سے ٹکرایا۔ مگر سر ــــ وہ سر جس میں اُس کا رُعب تھا!

عفریت کے سنگ فلاخن کی طرح چھوٹ کر خلیج کے اوپر ایک بڑا دائرہ بناتا ہوا ایک خاصے وقفہ تک وہ کرۂ ہوا میں رہتا ہوا معلوم ہوا۔ پھر ٹھیک اُس مقام پر جہاں تعاقب کرنے والوں کی کشتی تیر رہی تھی۔ آن پڑا۔ ایک تڑاخے کی آواز آئی۔ اور پچاس فٹ اونچی پانی کی دھار اُڑی جس کے پھر گر پڑنے سے آس پاس کی جگہ کف لا کر سفید ہوگئی۔ اور نظر کے لئے سوائے پانی کے بھنور کے اور کچھ نہ رہا۔ کاذب کا بڑا سر کشتی کو اپنے نیچے لے کر سمندر کی تہ میں پتھر کی طرح غائب ہو چکا تھا۔

(جان راڈیرو)

عبدالباقی

طلسمی تصویر

میری بوڑھی ماما سسندرینا نے ایک روز یہ طلسمی پیام مجھ تک پہنچایا کہ آرنووادی کے اُس پار ناتم مرو کے رئیس زادے سنتا کرستینا میں اپنا کتب خانہ اور اپنی تصویریں بیچ رہے ہیں۔ جس طور پر مجھ تک خبر پہنچی تھی اس سے حقیقت کا پتہ چلتا تھا۔ نواب صاحب کے پاس اطالیہ کے اور نوابوں کی طرح فلارنس اور روم میں بہت بڑا علاقہ تھا۔ مگر زرِ نقد کی کمی تھی۔ اور اس لئے شانِ فروخت بہت خفیہ رکھی گئی تھی +

ایک روز سہ پہر کے وقت ایک بوڑھا آدمی مجھے ساتھ لے کر سنگنا پل سے گزر کر آرنووادی میں کوئی بارہ میل کے فاصلہ پر لے گیا۔ سفید شاہراہ کے دونوں طرف دیوار اور ساگوان کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ آخر کار ہم تیم برباد گاؤں یعنی تاریخی سنتا کرستینا میں پہنچ گئے۔ جہاں سفید محل دور ہی سے نظر آ رہا تھا۔ دیواریں محبس کی دیواروں کی طرح موٹی موٹی اور بڑی بڑی تھیں۔ اور مینارے قلعوں کے گنبد کی صورت دکھائی دیتے تھے۔ مختصر یہ کہ چودھویں صدی کی مضبوط اور گھری ہوئی عمارتوں کا ایک نفیس نمونہ ہماری نگاہوں کے سامنے تھا +

مجھے اس فضا سے فوراً دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اور خیال آیا کہ ایسے مقام پر ادب لطیف کا جتنا گنجینہ موجود ہو کم ہے مکان کے چاروں طرف تین سوا تین گز کی مضبوط چار دیواری تھی جس میں دو بغلی دروازے تھے۔ اور ہمارے سر پر ایک سلاخ لگی ہوئی کھڑکی تھی۔ میرے ساتھی نے آواز دی تو جواب میں ایک لڑکی کا حسین چہرہ نظر آیا۔ اُس نے میرے رفیق کو پہچانا۔ نیچے اُتر کر ایک دروازہ کھول دیا اور ہم لوگ خاموش صحن در دروازے میں داخل ہوئے +

"ہمارے شفیق یہی ہیں" میرے رفیق نے کہا "اور محل کی تصویریں دیکھنے آئے ہیں" حسینہ مُسکرا دی "خوش آمدید" ایک قوی الجسم آدمی نے بڑھ کر کہا "میں بڑی خوشی سے آپ کو تمام تصویریں دکھا دونگا" +

"میرے خیال میں آپ ہی مختارِ عام ہیں" میں نے اطالی زبان میں پوچھا +

"ہاں جناب نواب صاحب تو یہاں کبھی آتے ہی نہیں۔ وہ زیادہ تر پیرس میں رہا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی موسم بہار میں یہاں آ جاتے ہیں۔ میں یہاں دس برس سے ہوں۔ اس عرصہ میں وہ ایک دفعہ بھی نہیں آئے" +

میں نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں۔ چار دیواری کے مقابل میں قدیم محل استادہ تھا۔ محرابی دروں میں زینے لگے ہوئے تھے۔ جن سے گزر کر پہلی منزل تک رسائی ہوتی تھی۔ صدر دروازہ پر تین طالوں کا خاندانی اعزازی نشان بنا ہوا تھا +

یہ محل بھی کسی زمانہ میں کیسا نظر نواز رہا ہوگا۔ مگر آج اس کی بربادی صاف صاف کہہ رہی ہے کہ

مکیں کے بعد مکاں یوں خراب رہتے ہیں

اب میں اپنے رفیق طریق سے جدا ہوکر مختار عام کے ساتھ نفیس ہال میں گیا۔ جہاں مجھے دس بارہ تصویریں دکھائی گئیں ہر تصویر قرون وسطیٰ کے کمال مو قلمی کا نمونہ تھی۔ مگر بری طرح خراب وخستہ ہوتی جارہی تھی +

اب ہم ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پھرتے ہیں۔ سامان آرائش کہیں بھی نہ تھا۔ فرش فروش سب غائب تھے۔ اور فضا سے خوشبوئے ماضی کی خوشبو آ رہی تھی +

اب ایک لمبا تاریک دالان اور ایک کمرہ کھولا گیا۔ کھڑکیاں جکڑ کر بند کردی گئی تھیں۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ ایک زمانہ سے ہوا یا روشنی کا گذر وہاں نہیں ہوا +

یہاں کی تصویریں بے مثل تھیں۔ اب ہم دوبارہ عالی شان ہال میں آئے۔ جہاں نفیس سین گوئی آ ویزاں تھا

"اگر میں خریدنا چاہوں تو اس کے دام کیا ہونگے"۔

میں نے بے پروائی سے پوچھا +

اُس نے ہاتھ کے اشارہ سے بتا کر کہا "یہ تصویر بہترین ہے"۔ اِس کے بعد اُس نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر دیکھا اور کہا "جناب مجھے یہ ہدایت ہے کہ میں اسکو چارسو روپیہ سے کم ہرگز نہ بیچوں"+

"چارسو روپے"! میں نے گھبرا کر کہا۔ اگرچہ خوب جانتا تھا کہ وہ آٹھ ہزار کی بھی سستی ہے۔ مگر تسکینی میں چیزیں خریدتے خریدتے یہی تجربہ ہو چکا تھا۔

وہ اپنی بات پر مستقل رہا۔ آخر میں نے اپنا بٹوا نکال چارسو نقد گن دیئے۔ اُس نے بغل والے کمرہ میں جاکر چند لفظ نہایت بدخطی سے لکھے۔ اور رسیدی کوریت سے منسب کرکے واپس آیا +

مختار عام کو عام طور پر حساب کتاب لکھنا پڑتا ہے۔ لہٰذا اس کی کم لیاقتی پر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ میں نے کہا "فردوس بھیج کر تصویر منگالوں گا"۔ جس کے جواب میں اُس نے مسکرا کر کہا "خاطر جمع رکھئے اس وقت سے تصویر آپ کے سوا کوئی دوسرا چھو بھی نہیں سکتا"+

میں واپس ہی ہو رہا تھا کہ اُس نے دبی زبان میں کہا "آپ نے وہ سرخ خود والی تصویر اچھی طرح نہیں دیکھی۔ ممکن ہے کہ آپ اُسے کچھ داموں پر خریدنا چاہیں میرے مالک کو روپیہ کی سخت ضرورت ہے"۔ سرگوشی کے لہجہ میں تمام چیزیں خفیہ طور پر بیچ رہے ہیں۔ تاکہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو"+

یہ تصویر نہایت نفیس تھی۔ میں بے چین ہوگیا اور مختار عام کے ساتھ آبدار خانہ میں دوبارہ واپس آگیا +

"آپ کو یہ تصویر بہت سستی مل جائے گی۔ مگر مالک کی تاکید ہے کہ مشتری کو چھوڑ کر کسی اور کو اُن کی مالی مشکلات کی کوئی خبر نہ ہونی چاہیئے"+

میں نے جواب میں اطمینان دلادیا اور ہم دونوں دیدہ زیب کمرہ میں داخل ہوئے۔ وہ کمرہ جو زمانہ ماضی کے جذبہ انگیز واقعات کا مظہر تھا۔ فرش فروش، آرائش ورنگ آمیزی میں ابھی نفاست ولطافت باقی تھی اور اب تک کرسیوں پر زردوزی کے پھٹے ہوئے غلاف پڑے ہوئے تھے +

سرخ خود والی تصویر مو قلمی کا شاہکار تھی اور سرخ خود سے

بتیس رنگ کی کلغی نمایاں تھی۔ میں نہایت شوق سے اُسکے قریب گیا۔ مگر روشنی اتنی کم تھی کہ اُس کا پورا جوہر اس زاویۂ نگاہ سے جہاں میں کھڑا تھا پورے طور پر نہیں کھلتا تھا +

مختار عام نے انگلی کے اشارہ سے بتا کر کہا "جناب اُس دروازہ کے پاس کھڑے ہو کر آپ اس تصویر کو ٹھکانے سے دیکھ سکیں گے" میں تصویر پر نگاہیں جمائے ہوئے چُپ چاپ اُس طرف چلا گیا +

مطلّا و منقش گنگا جمنی دروازے کے پاس پہنچا ہی تھا کہ یکایک پتھر کا ایک چوکا سرک گیا اور میں سنبھلتے سنبھلتے تاریک جہنم کے اندر تھا +

میرا سانس رُک گیا۔ حواس جاتے رہے۔ مگر فطرتاً میں نے ہاتھ پاؤں مارے کہ شاید کسی طرح بچ سکوں۔ میں کیسے بچا۔ اس کا مجھے کچھ پتہ نہیں۔ مگر ایک ہی لمحہ کے بعد میں نے اپنے آپ کو پتھر کی ایک ڈھالو چٹان پر ہاتھ پاؤں سے چھپکلی کی طرح چمٹا ہوا پایا۔ چونکہ میں کائی لگی ہوئی تھی۔ اور وہ دھیرے دھیرے میرے لنگر کی وجہ سے سرک رہا تھا +

غار میں گھپ اندھیرا تھا۔ میرے ہاتھ باربار پھسل رہے تھے۔ اور میں کوشش کر کے ہر بار اپنی گرفت مضبوط کرتا جا رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ میں کسی نہایت گہری اور بدبودار باؤلی میں ہوں۔ مگر کہاں ہوں، زمین سے کتنا نیچا ہوں یہ سب ذرا بھی معلوم نہ تھا +

یکایک میرے کانوں میں کھڑکھڑ اور زائیں زائیں کی سخت آوازیں آنے لگیں۔ گویا کوئی زنگ آلود مشین چلائی گئی ہو۔ میرے دماغ میں حقیقت کی بجلی فوراً ہی کوند گئی۔ میں دامِ فریب کا شکار تھا اور چرخ پر چڑھایا جا رہا تھا۔ یہ سزائے موت زمانۂ وسطیٰ کی نہایت ظالمانہ ایجاد تھی۔ چرخا پن چکی کی طرح پانی کے زور سے چلتا تھا +

میرے کانوں میں پانی کی آواز برابر آ رہی تھی۔ جب وہ چکّے میں آتا تو سائیں سے ہوتا تھا۔ اور جب گھوم کر نکل جاتا تو خوفناک زناٹا ہوتا تھا۔ میرے ذہن میں فوراً حضرت غالب کا وہ مصرعہ تاریخ آیا جو بے نظیر ہے ع

کیا چرخ نے "نوابی سہراب" کو اُلٹا

نوابی سہراب کو اُلٹ دیکھئے بارہ سو باون (۱۲۵۲ھ) تاریخ نکل آئے گی اور آنکھوں کے سامنے موت کی بھیانک تصویریں پھرنے لگیں +

کتنے آدمی چرخ کے زنگ آلود فولادی خنجروں پر چڑھائے جا چکے ہونگے۔ یہ خیال آتے ہی میرے جسم میں تھرتھری پڑ گئی جس ڈھلوان پتھر پر میں بڑی مشکل سے جما ہوا تھا۔ وہ غالباً گھستے گھستے دیوار کے باہر آ گیا تھا۔ مگر اس پر اتنی پھسلن تھی کہ میں اپنے اندازہ میں دس منٹ سے زیادہ وہاں قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ میرے ہاتھ کی تمام رگیں اور پٹھے تڑتے جا رہے تھے۔ اور مٹھی کی گرفت آہستہ آہستہ ڈھیلی ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ میں پورے لنگر سے گھومتے ہوئے تیز خنجروں کی دھار پر گروں گا اور پرزے پرزے ہو جاؤں گا۔

میں نے بچاؤ کی تدبیر سوچنی چاہی۔ مگر میرے دماغ نے جواب دیدیا۔ اب کوئی صورت باقی نہ تھی۔ میں شل ہو چکا تھا۔ قوت گھٹتی جاتی تھی اور پھسلن کی وجہ سے جتنی مضبوط گرفت

سے کام لیتا تھا۔ میرے ہاتھ اُتنے ہی زیادہ پھیلتے جاتے تھے کہ یکایک میں نے اپنے چوکے سے دو گز نیچے ایک ٹمٹماتی ہوئی موم بتی دیکھی اور اُسی کی مدھم روشنی میں دو آدمیوں کی صورت نظر آئی +

"یہ کیا!" ایک بدمعاش نے گھبرا کر کہا "وہ تو یہاں نہیں ہے" چاروں طرف دیکھنے لگا +

"حیرت ہے" دوسرے نے کہا جس کی آواز سے میں نے فوراً پہچان لیا کہ وہی مختار عام ہے +

اب پہلے بدمعاش نے اوپر دیکھا۔ مگر غضب کا اندھیرا تھا۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ چرخ کے سوراخ میں سے گر کر باؤلی کی تہ پر پہنچ گیا۔ پچھلے ہفتے وہ جرمن بھی اسیطرح گرا تھا، اب ہم کو وہ تینوں خنجر جو گم ہو گئے ہیں پورے کر لینے چاہئیں۔ ورنہ یہی وقت رہے گی" +

"بہرکیف" مختار عام نے کہا "ہم نے چار سو آس سے اینٹھ لئے ہیں۔ اور باؤلی کی تہ میں وہ کسی سے کوئی داستان بیان نہیں کر سکتا۔ آؤ ہم لوگ اس بیوقوف خریدار کی خوشی اور اس سرخ خود والی طلسمی تصویر کی مسرت میں جی بھر کے پئیں جس کو ہر شخص پسند کرتا ہے +

"مگر اُس کے بٹوہ میں ابھی ایک ہزار سے زائد زائد تھا" +

"بہشت" مختار عام نے کہا "اب اس کی فکر ہی بیکار ہے۔ ابھی تو ہر طرف سے لوگ تصویریں دیکھنے آ رہے ہیں۔ فلارنس سے وہ امریکن تاجر کل ہی آئے گا اور وہ بہت مالدار ہے۔ میں نے لکھ دیا ہے کہ معاملہ بالکل نقد انقد ہوتا ہے" +

یہ کہکر وہ غائب ہو گئے اور دروازہ چھن سے بند ہو گیا مگر اندھیرا ابھی تک ویسا ہی تھا اور خوفناک خنجر اپنی پوری رفتار سے گھر گھر چل رہے تھے +

اس کے بعد کے کچھ لمحے کیسے گزرے اس کی مجھے خبر نہیں۔ میرے ماتھے پر نزع کا سا ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔ گو پن چکی خنجروں والے پنکھے کو ابھی تک چلا رہی تھی جس پر گرتے ہی میں پُرزے پُرزے ہو جاؤنگا +

ان ظالموں کی نظروں سے میں اتفاقاً بچ گیا تھا۔ مگر خوفناک موت اپنا بلا نوش منہ پھیلائے ہوئے میرے گرنے کی ابتک منتظر تھی۔ میں غالباً بیہوش ہو گیا۔ ذرا آپ اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھئے کہ آپ میری جگہ ہوتے تو کیا ہوتا

یکایک میں خوفناک آوازیں سُنکر چونک پڑا۔ پہلے زور سے کھڑکھڑ ہوئی۔ پھر ٹنک ٹنک کی صدا آئی اسکے بعد دھماکا ہوا اور رفتہ رفتہ پانی کی روانی کے سوا اور سب آوازیں غائب ہو گئیں۔ پن چکی چپ تھی۔ چکّا رک گیا تھا اور وہ خونخوار خنجر ساکت ہو گئے تھے۔ جو مجھ سے پہلے خدا جانے کتنے بے گناہوں کو نیمہ کر چکے تھے +

ظالم بدمعاش میری موت کی خوشی منانے کے لئے وہاں سے چلے گئے تھے +

وہ تیز فولادی خنجر اپنی زہر آلود دھار کے ساتھ جو قرون وسطیٰ کے ظالموں کی ایجاد تھی۔ اور جن پر دشمنوں کی جان کبھی کی طرح لی جاتی تھی۔ اب بھی فلارنس سے آنے والے مالدار امریکن تاجر کے منتظر تھے +

میرے ہاتھ تڑپ رہے تھے۔ میرے گھٹنے پھٹے جارہے تھے۔ آخر کار گرفت اتنی ڈھیلی ہوگئی کہ میں پھسل کر دو گز نیچے جاگرا۔ اور کہاں گرا۔ ہلالی خنجروں کی محراب میں جو لوہے کے چھلّے میں لگے ہوئے تھے +

میں نے دیاسلائی جلائی اور اُس کی جھلملاتی ہوئی روشنی میں دیکھا کہ میں پتھر کی ایک سیلی ہوئی سیاہ چٹان کی محراب میں ہوں۔ میرے نیچے وہی خوفناک چرخ تھا اور پہلو میں گھنی ہوئی لکڑی کا ایک تختہ۔ جس کے سرے پر لوہے کا ایک دروازہ تھا۔ اسی دروازے سے وہ دونوں بدمعاش اس باؤلی میں آئے گئے تھے +

دوسری دیاسلائی نے بتایا کہ میں خوش قسمتی سے کھوئے ہوئے تین خنجروں کے درمیانی سوراخ میں نہیں گرا۔ ورنہ بدنصیب جرمن کی طرح میں بھی تہ نشین ہو جاتا۔ میں اپنی قبر کے ٹھیک کنارے پر کھڑا ہوا تھا +

لوہے کا دروازہ رشک ونفرت کے ہزار ہا مقتولین کا مظہر تھا۔ وہی اکیلا راستہ اس جہنم سے باہر آنے جانے کا تھا۔ میں خنجروں کی دھار پر نہایت توازن کے ساتھ ہاتھ پاؤں ہلکے ہلکے رکھتا ہوا، دھیرے دھیرے سرک کر لکڑی کے تختہ پر پہنچا۔ پھر بھی ایک دفعہ اندھیرے کی وجہ سے ٹکرا گیا۔ اور ہاتھ پاؤں لہولہان ہوگئے +

اب دروازہ پر ہاتھ رکھا۔ مگر باہر سے قفل لگا ہوا تھا۔ اور کنگنی دور تک پتھر کے اندر دھنسی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ اب میری جان صرف اسی صورت سے بچ سکتی ہے کہ دروازہ کھلے اور دروازہ کھلنے کی ایک ہی سبیل تھی کہ پتھر کا چوکا نکال لیا جائے۔ مجھے تختہ پر زنگ آلود گر دھار دار لوہے کے کئی ٹکڑے مل گئے۔ جو غالباً خراب شدہ خنجروں کے ٹکڑے تھے۔ انہیں آلات سے مسلح ہوکر میں نے کام کرنا شروع کیا +

اب میرے پاس دیاسلائی بھی ختم ہوگئی تھی۔ میں محض ٹٹول ٹٹول کر کام کرسکتا تھا۔ اور وہ بھی نہایت احتیاط سے کہ کہیں آواز نہ ہو جائے۔ اور وہ بدمعاش ہوشیار نہ ہوجائیں دروازہ اندر کی طرف کھلتا تھا جس کی وجہ سے مجھے بڑی سہولت ہوگئی۔ اور جلد رہائی پا جانے کی اُمید بندھ گئی +

چار گھنٹے کی محنت کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ نیچے کا پتھر کچھ کچھ ہل چلا ہے۔ زخمی ہاتھ ہاتھ ہل رہے تھے، عضو عضو شل ہو رہا تھا، رگ رگ ٹپک رہی تھی۔ مگر جان تو بڑی پیاری ہوتی ہے۔ میں اپنے کام میں لگا ہی رہا۔ اسکے بعد کتنے گھنٹے گزر گئے۔ مجھے کچھ خبر نہیں۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ زخمی، حواس باختہ، شل اور مبہوت آدمی کی طرح میں برابر محنت کرتا رہا۔ آخر خدا خدا کرکے دروازہ میں اتنا درّہ ہوگیا کہ مشکل سے باہر نکلا۔ اب بھول بھلیاں شروع ہوئیں اور پیچ در پیچ راستے ایک ہی قطع وضع کے ملنے لگے۔ مجھے اصلی دروازہ کے ملنے میں کئی گھنٹے صرف ہوگئے۔ میں ہر دس بارہ منٹ کے بعد گھوم پھر کر وہیں آجاتا تھا۔ جہاں سے اتنی محنت کے بعد نکلا تھا +

آخر قسمت نے یاوری کی اور میں باہر نکلا تو پو پھٹ چکی تھی۔ اور دنیا اپنے خواب نوشیں سے کروٹیں بدل بدل کر انگڑائیاں لے لے کر بیدار ہو رہی تھی +

میں محرابوں کے سایہ کی آڑ پکڑتا ہوا چپ چاپ چہار دیواری کے نیچے نیچے دور تک چلا گیا اور پھر دروازہ کھول کر کُھلی ہوئی ہوا میں باہر آ گیا۔ اب میں زخمی تھا، تھکن سے چور تھا، بیماروں سا کمزور تھا۔ مگر زندہ تھا اور آزاد تھا۔

فلورنس کا مالدار امریکن تاجر دوسرے دن تصویریں [illegible] یدنے آیا۔ مگر اُس وقت خود ہی تصویر بن گیا جب اُس کو بتایا گیا کہ اب نواب صاحب اپنی تصویریں علیحدہ نہیں کرینگے۔

وہ دونوں بدمعاش جب یکایک پولیس کے حلقہ میں آ گئے تو اُس وقت ننتے تھے۔ پھانسی اُن کے لئے یقینی تھی۔ لہٰذا ایک بدمعاش اس غار میں کودا۔ دوسرے نے بھی پیروی کی۔ سمجھے تھے کہ بھول بھلیاں میں پولیس کو ڈال کر نکل جائیں گے۔ مگر اتفاق سے گھبراہٹ میں پہلے بدمعاش کے کودنے وقت پن چکی کا تسمہ پانوں میں اُلجھ کر آپ ہی آپ چلنے لگا۔ چکّا گھوما۔ تیز تیز خنجر گھومنے لگے اور دونوں بدمعاش باری باری قیمہ بن بن کر باؤلی کی تہہ میں اپنے مقتولین کے پاس پہنچ گئے۔ سچ ہے ؎

نا وکا غـ[illegible] کی کبھی چلتی نہیں
ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں

زاخوذ از ولیم لے کوئے

طالب الٰہ آبادی

"حُسن!"

اے غریقِ خود پرستی! اے خدائے بیخودی!　　فتنۂ محشر تری آغوش میں خوابیدہ ہے
تو نے جانے کیا کیا؟ کیا افسوں ربابِ عشق پر　　اس کی ہر موجِ ترنم تجھ میں آرامیدہ ہے
ہے کمالِ محویت سے عکس پر تیرا گمان　　جادۂ تارِ نظر میں ورنہ تو پوشیدہ ہے
تجھ سے روشن ہو گیا عالم میں فانوسِ خیال　　شعلۂ تنفیر جس میں سر بسر تابیدہ ہے
باعثِ تزئینِ عالم جنبشِ ابرو تری　　اور ہستی حالِ نِگاہ خوابیدہ ہے
طاقِ ابرو پر ترے روشن ہے شمعِ ہست و بود　　آنکھ جس کی لذتِ خوابِ سحر نادیدہ ہے
چھیڑتا ہے سازِ ہستی کو ترا لطفِ نظر　　جنبشِ لب سے تری تارِ نفس لرزیدہ ہے
تجھ سے حاصل دل کو ہے اے حسن! کیفِ زندگی　　برق بھی لیکن تری نظروں میں آرامیدہ ہے

الغرض ہستی ہے تیری نازِ تخلیقِ جہاں
اور ترے ہی عکس سے بزمِ جہاں تابندہ ہے

محمد میاں جاذب

مُغالطہ... ذرا سامنے سے

مُغالطہ نے ہر پہلو پر روشنی ڈالنا تو مجھ جیسے ابجدخواں کے لئے ایک ناممکن امر ہے۔ اور چونکہ ناظرین نیرنگ خیال جناب رشید احمد صاحب صدیقی جیسے قابل اہلِ قلم کے نہایت عالمانہ و فلسفیانہ مضمون مغالطہ کا جون نمبر میں مطالعہ فرما چکے ہیں اور اس کا خیال کرتے ہوئے میرا پھر اُسی وادی میں سرگرداں ہونا گویا اپنا منہ آپ چڑانا یا ایک صریح مغالطہ میں مبتلا ہونا ہے۔ تاہم میرا اپنا خیال ہے۔ کہ مغالطہ کے فطرتی پہلو کو مدنظر رکھ کر یہ چند سطور خالی از دلچسپی نہ ہونگی۔

.... انسان اپنی روزمرہ کی زندگی میں مغالطہ سے اکثر دوچار ہوا کرتا ہے۔ اور اس مغالطہ کا مالک اس کی شکل کو طرح طرح کی دلربا اداؤں سے معمور کر کے اس کے سامنے پیش کرتا ہے جسے یہ ایک پُرجمال حسینہ سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔ اور اُس کے حسن و جمال کا گرویدہ ہو کر اپنی عقل سلیم کھو بیٹھتا ہے۔ مگر یہ اس مغالطہ کا احساس اُس وقت کرتا ہے۔ جب اُس دلربا حسینہ کے چہرہ کا نقاب اُلٹ جاتا ہے۔ اور یہ اپنی غلطی کا خمیازہ اُٹھا چکا ہوتا ہے...

الغرض مغالطہ ایک ایسا معجون مرکب ہے جس میں عقل انسانی و حیوانی کے کمزور اجزاء کا مرکب اس طرح کیا گیا ہے جو بادی النظر میں تو ایک خوش ذائقہ اور خوشگوار.... شے معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس کے استعمال سے عقل کا وہ جز جو اس میں موجود ہوتا ہے، مختل اور بےحس ہو جاتا ہے اور اس کا استعمال کنندہ مسحور ہو کر آپ ہی اپنے جال میں پھنس جاتا ہے...........

کہتے ہیں کہ انسان کو خلاق عالم نے تخلیق ہی کے وقت سے مرکب خطا و نسیان کا خطاب دے دیا ہے۔ اور کوئی شخص تواریخ عالم کے زرّیں صحیفوں میں خواہ کتنی ہی اعلیٰ حیثیت اور کتنی ہی مکمل شخصیت سے کیوں نہ جلوہ افروز ہو۔ مگر چشم بصیرت اور نظرِ غائر اس کی کسی نہ کسی خامی کو معلوم کر لیتی ہے۔ کیونکہ لاریب کا لفظ صرف اُسی خلاقِ عالم کے لئے مخصوص ہے اور اُس کی مخلوق پر ہرگز عائد نہیں ہو سکتا... چنانچہ جب خالق عالم نے تخلیق عالم کیا۔ تو ہر جاندار اپنے اپنے حصے کی عقل لے کر خوش ہو گیا۔ اور شکر بجا لایا۔ مگر جس وقت حضرت انسان شکریہ ادا کر رہے تھے اُس وقت اُنہوں نے اپنے دل کے اندر ایک عجیب غریب خواہش کا جذبہ اُمڈتے ہوئے محسوس کیا اور جسے اُنہوں نے بعد میں حرص، لالچ وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیا.....

کہتے ہیں کہ یہ خواہش شیطان علیہ اللعن کی ترکش کے تیروں میں کا ایک زہریلا تیر تھا۔ جسے اُس نے ایک خاص قسم کے مسحور کن اور غنودگی آمیز زہر سے بجھایا تھا۔ اور اسی زہر کا نام مغالطہ تھا۔ چنانچہ اُس نے اس تیر کا پہلا وار حضرت آدم علیہ السلام پر جنت سے اپنے بھاگتے وقت کر دیا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ اُنہوں نے جنت کی رہایش اور آسایش پر دنیا کی آزمایش اور آلایش کو ترجیح دی تھی۔ . . . .

کہتے ہیں کہ علاوہ حضرت انسان کے دیگر جانداروں پر بھی مغالطہ طاری ہوتا ہے۔ آپ تعجب نہ کریں کیا آپ مرغی کو بط کے انڈے اٹھاتے نہیں دیکھتے؟ پھر کیا بط کے ننھے بچوں کو اُسے اپنا نونہال سمجھ کر پرورش کرتے نہیں دیکھتے؟ . . . کیا آپ نے کوّے جیسے چالاک پرند کو کوئل کے انڈوں کو اپنا انڈا اور اُس کے برآمد ہ بچے کو اپنا بچہ سمجھ کر پرورش کرتے نہیں سُنا؟ . . . اگر سُنا اور دیکھا ہے تو آپ کو بھی میری طرح ماننا پڑیگا کہ یہ بھی مغالطہ کی تحت میں ہوا اور ہوتا ہے +

کہتے ہیں کہ بھیڑیئے کہ بھیڑیئے کی قسم کا ایک درندہ اکثر آبادیوں کے قریب کے جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔ اسکو صوبۂ بہار کی اصطلاح میں لکڑ بگا یا لاکڑ کہتے ہیں۔ اس کی اصلی غذا کتے کا گوشت ہوتا ہے۔ اور اس کا آبادی سے قریب پایا جانا اسی مصلحت پر مبنی ہے کہ وہاں کتوں کا شکار اُسے مل سکتا ہے۔ یہ کتوں کو مغالطہ دیکر اُن کا شکار کر لیتا ہے۔ وہ اس طرح پر کہ کتے اپنی خاصیت سے مجبور ہیں۔ اور چونکہ لکڑ بگا کتوں سے بہت مشابہ ہوتا ہے اور اُن کی آواز کی نقل بھی اچھی طرح کر سکتا ہے۔ اس وجہ سے کتے اُس کی آواز سن کر ایک اجنبی کتے کا وجود اپنے دائرۂ حکومت میں معلوم کرکے ایک اچھی خاصی جماعت کے ساتھ اس نئے مداخلت کنندہ پر حملہ بول دیتے ہیں اب سنئے کہ یہ درندہ کس طرح ایک دوسرا مغالطہ عمل میں لاتا ہے۔ یعنی جب اُس نے دیکھا کہ وہ کافی طور پر کامیاب ہوا اور شکار قریب آچکے ہیں بس فوراً ہی نہایت عاجز بن کر بطور قدمبوسی یا خیر مقدم زمین پر لیٹ کر چت ہو جاتا ہے کتے اپنا غصہ پی جاتے ہیں۔ اور اُس کو اپنی فطرت کے مطابق سونگھنے لگتے ہیں۔ مگر یہ فریبی عاجز تاک لگائے ہوئے منہ لیٹا رہتا ہے اور جیسے ہی کسی فربہ اور پسندیدہ کتے نے اپنی گردن اُس کی زد میں کی بس اُس نے فوراً اپنے تیز دانتوں کو پیوست کرتے ہوئے جھپٹ کر ایک دو کاری جھٹکوں میں شکار کو اپنے قدموں پر ڈھیر کر لیا۔ دوسرے ہم جنس بھلا کب اس نظارے کی تاب لا سکتے تھے۔ اپنی اپنی دُموں کو پچھلی ٹانگوں میں چھپا کر جدھر سینگ سمائے نکل گئے . . . .

اب آپ ہی اندازہ کریں کہ یہ مغالطۂ صریح نہیں تو اور کیا ہے۔ اور کیا یہ چند مثالیں مغالطہ کے حیوانی پہلو کو کسی حد تک روشن کر سکینگی؟ . . . . . .

اب انسان کے مغالطہ کا فطرتی پہلو بھی ملاحظہ ہو۔ کیونکہ انسان اکثر اپنے فیصلے صادر کرتے وقت عجلت سے کام لے کر کسی بزرگ کے مقولے کے مصداق بن جاتے ہیں۔ "کہ تعجیل کار شیاطیں بود" اور اس طرح گویا شیطان کی پیروی کرتے ہیں اور وہ اپنا وار کر دیتا ہے۔ اس طرح مغالطہ اُن پر بھی مسلط ہو جاتا ہے . . . .

کہتے ہیں کہ امیر کبیر شخص نے اپنی چہیتی بیوی کو محض اس لئے موت کے گھاٹ اُتار دیا کہ اُس نے اُس کے پوشیدہ دراز میں جسے مرحومہ ہمیشہ مقفّل رکھتی تھی۔ چند عاشقانہ خطوط

بڑی احتیاط سے رکھے ہوئے پائے۔ اور اُن پر لکھی ہوئی تاریخ سے یہ بھی ثابت ہوا کہ وہ تازہ وارد تھے..... قتل کا اخفا بھی ہوگیا۔ اور کسی کو شبہ بھی نہیں ہوا۔ مگر ان حضرت کو اپنا مغالطہ کب معلوم ہوا جبکہ اُن کی بیوی کی ایک سہیلی نے اپنی امانت طلب کرنے کو وہی مخصوص راز کھلوائی اور اُن خطوط کو اپنا ایک راز بتا کر لے گئی......

کہتے ہیں کہ ایک بیوی نے اپنے میاں کی محبت پر اسقدر مغالطہ کھایا کہ اس کو دوسری شادی کرنے پر مجبور کیا۔ کیونکہ یہ خود بانجھ تھی۔ اس کا خیال تو یہ تھا کہ دونوں سوتیں مل کر رہیں گی مگر بعد شادی کے اُس کو معلوم ہوا کہ یہ بھی ایک صریح مغالطہ تھا۔ چنانچہ دونوں الگ الگ مکانوں میں رہنے لگیں چھوٹی سوتن بڑی بدمزاج تھی۔ ہرگز پہلی بیوی کا کوئی ذکر میاں کے مُنہ سے سُننا گوارہ نہ کرتی۔ اور نہ کوئی تحفہ تحائف کبھی قبول کرتی۔ میاں بچارے مجبور تھے کسی طرح دونوں کی دلجوئی کیا کرتے۔ کچھ دنوں بعد جب چھوٹی بیوی کو لڑکا ہوا تو بڑی بیوی نے حسب عادت اپنی عقیدتمندی کا اظہار کرتے ہوئے زچہ اور بچہ کے کپڑے۔ بچہ کے سونے کے کڑے تیار کرائے۔ اب یہاں پر ملاحظہ ہو کہ شیطان صاحب نے مغالطہ کو کس طرح سے استعمال کیا۔ چنانچہ جب کل سامان زچہ بچہ کا تیار ہو کر شب کے وقت ایک کمرے میں رکھ دیا گیا مغالطہ بشکل افعی ان کپڑوں کی تہوں میں جا بیٹھا۔ صبح کو تحائف بھیجدیئے گئے۔ اور بڑی ردوکد کے بعد میاں کے سخت اصرار پر منظور ہوئے۔ میاں نے چھوٹی بیوی کو کپڑے دکھلانے کے لئے اُٹھائے جیسے وہ اپنی ابرو پر بل ڈال کر دیکھ رہی تھی کہ اسی موقع پر مغالطہ نکل پڑا اور میاں بیوی دونوں چیخ اُٹھے۔ اب کیا تھا میاں نے فوراً قسم کھالی کہ واقعی بی بی تم سچ کہتی تھیں سوتن سوتن ہی ہے۔ اب اگر میں شریف کی نسل سے ہونگا تو کبھی اُس قطامہ کی صورت نہیں دیکھونگا ..... یہ مغالطہ کی دوسری ہی قسم تھی۔ گو یہ کامیاب ہوئی۔ مگر اس کا شکار سمجھ نہ سکا۔ اور صرف شیطان ہی اس پر مسرور ہوا.....

مغالطہ کی ایک اور صورت یا اس کا ایک انوکھا پہلو بھی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ ایک مسافر شب کو ریل سے ایک ایسے ویران اسٹیشن پر اُترتا ہے جو بستی سے پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اور اسٹیشن ماسٹر صاحب سے آہستہ آہستہ بڑی لجاجت سے کہتا ہے "بابو جی میرے پلے دو ہزار کے نوٹ ہیں۔ میں کلکتہ سے گھوڑے بیچ کر واپس آرہا ہوں۔ مجھے یہاں سے پانچ میل جانا ہے۔ رات زیادہ آگئی ہے۔ راستہ خطرناک ہے۔ اگر آپ ان کو حفاظت سے رکھوادیں تو احسان اور ہم صبح یہاں سے چلے جائیں" بابو جی نے کچھ سوچ کر روپئے لے کر ریلوے کی ٹکٹ والی الماری میں بند کر دیئے۔ اور مسافر کو نے جا کر مسافرخانہ میں ایک خاص بنچ پر سونے کو کہدیا۔ خود اُن کو نیند نہ آئی اور تھوڑی دیر کے بعد ایک فیصلہ کن انداز سے اُٹھے اور تلوار لے کر مسافرخانہ میں پہنچے۔ بنچ پر مسافر بدستور چادر تانے سو رہا تھا۔ آس پاس کوئی بھی نہ تھا۔ ایک وار میں مع چادر مسافر کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ مگر جب وہ ایک چیخ کے ساتھ بنچ سے نیچے گرا تو آپ کی آنکھ کھلی اور دیکھا کہ یہ تو خود آپ ہی کے

فرزند عزیز تھے۔ ابھی ان کے حواس بھی درست نہیں ہوئے تھے کہ وہی مسافر لوٹا لئے ہوئے دوڑتا ہوا آیا اور ماسٹر صاحب بیہوش ہو کر گر پڑے۔۔۔ ۔۔۔ مغالطہ انہیں پھانسی تک لے گیا۔ مگر غالباً یہ لالچی پہلو تھا۔۔۔۔۔۔

مغالطہ کا ایک اور بھی پہلو ملاحظہ ہو۔۔۔ کہتے ہیں کہ ایک پروفیسر علم عامرہ نغمی پر اکثر لکچر دیا کرتا تھا۔ ایک شب اُس کی نیند کسی آہٹ پر کھل گئی۔ لیمپ کی دھیمی روشنی میں ایک پستول کی نالی اپنے سر سے دو تین انچ کی تفاوت پر دیکھی۔ پستول کی نالی کو حرکت ہوئی اور ایک آواز جو آہستہ مگر خوفناک تھی کہتی ہوئی معلوم ہوئی "فوراً چابیاں حوالہ کر دو ورنہ" پروفیسر نے جواب دینے کے بجائے ایک متبسم انداز میں اپنی خمار آلود آنکھیں پھیر کر دیکھا کہ ایک نقاب پوش شخص اُس کے سرہانے کھڑا ہوا ہے۔ اُسکی مسکراہٹ ایک چھوٹے سے قہقہے میں بدل گئی "جلدی کرو۔ ہنسنے کا وقت نہیں۔ اگر دیر کی تو۔۔۔" نقاب پوش نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ پروفیسر نے کوئی گھبراہٹ نہیں ظاہر کی۔ بلکہ ایک اطمینان کے انداز میں انگڑائی لیتے ہوئے کہا "بہت اچھا ابھی لو۔ مگر مجھے ہنسی آتی ہے۔ کہ صرف ایک اکیلے شخص سے کنجی کا مطالبہ کرنے کے لئے دو دو آدمیوں کا اس طرح آگے پیچھے پستولیں لے کر کھڑا ہونا کتنی بڑی بزدلی ہے۔" چور جو تنہا آیا تھا گھبرا گیا۔ اور پروفیسر کی اس با اطمینان اور یقینی گفتگو کا اُس پر بڑا اثر ہوا۔ اُس نے جلدی سے ایک نظر متوحش اپنے عقب کی طرف پھیری۔ ابھی اُسکا سر نصف چکر بھی نہ کھا سکا ہوگا کہ چور کے پستول پر پروفیسر کا قبضہ ہو گیا۔ اور اُسنے چور کو باطمینان گرفتار کر لیا۔۔ ۔۔

اب آپ ہی بتائیں کہ یہ شیطانی مغالطہ تھا یا انسانی؟ اور دونوں مغالطوں میں کون کامیاب رہا؟

نصرت حسین آروی پٹنہ

منظومات

جذباتِ سحر

(از جناب محمد امتیاز علی صاحب سحر جیسلر)

دہانِ زخم سے نے کاٹی زباں تیر و نکے پیکاں کی
مری آہوں نے آنکھیں کھولدیں دیوارِ زنداں کی

جگر میں پھانس چبھتی ہے ترے سوفارِ مژگاں کی
دلونمیں لذتیں باقی ہیں ابتک نوکِ مژگاں کی

مٹے مِٹ کر ہوئے پیدا یہی رفتارِ عالم ہے
حقیقت کھل گئی دردِ جگر کے رازِ پنہاں کی

بھلا دیں سب جفائیں اُنکے الطافِ نمایاں نے
اگر کچھ یاد باقی ہے تو اُنکے لطف و احساں کی

چٹکنا - پھول بننا خشک ہو کر خاک میں ملنا
یہی تعبیر ہے ہستی کے اس خوابِ پریشاں کی

اگر دل میں ہے جلوہ زاہدو نورِ حقیقت کا
شعاعِ طور ہو جائیگی ظلمت اپنے زنداں کی

سرِ شوریدہ قایم ہے تو اک دن ہم دکھا دینگے
کہ زندانِ جفا بھی بن گیا تصویر میداں کی

کھلے ہیں زخمِ دل داغِ جگر بھی خوب روشن ہیں
نمائش دیکھ لو آ کر ذرا گلہائے زنداں کی

تماشا ہو گئیں آنکھیں وہ اُلفت میں مزہ پایا
تمنا بن گئی وحشت مرے ہستی کے زنداں کی

کشش دے جذبِ دل ایسی کہ وہ بے پردہ نقاب آئے
خدایا آبرو رکھ لے مرے چاکِ گریباں کی

مری آنکھوں میں آ بیٹھو اگر ہے شوقِ نظارہ
تو پھر وسعت ذرا معلوم ہو اُلفت کے میداں کی

سحر کیا دیکھ پایا دشتِ غربت میں کہ تم گم ہو
فضائیں بھاگئیں آنکھو نکو کیا اس ہُو کے میداں کی

غزل

(از جناب صغیر احمد جان صاحب صغیر)

اگر شوریدہ سر ہیں ہوں کبھی تو ہم بھی انساں تھے
یہ کل کا ذکر ہے واعظ یہی کافر مسلماں تھے

رہے جیتے جی دل کے دل میں اپنے جتنے ارماں تھے
میں کیا اُنکو نکلنے کے لئے کہتا کہ مہماں تھے

مری دل بستگی کے کچھ اسیری میں بھی ساماں تھے
کہ قطرے خون کے زینت دہِ دیوارِ زنداں تھے

عجب بیچارگی تھی۔ یاس تھی حسرت تھی۔ ارماں تھے
اُدھر گل ہنس رہا تھا اور اِدھر ہم پا بجولاں تھے

نہ سمجھیں غیر اُن کو۔ ہر رگ و ریشے میں پنہاں تھے
اگر تھے ہم سفر اپنے تو بس خارِ مغیلاں تھے

ہمارے قطرہ ہائے خوں بہ خاکِ کوئے جاناں تھے
جو کچھ باقی رہے زینت دہِ دامانِ مژگاں تھے

نہ تھا دل، دل ہمارا جب نہاں تھے تم پسِ پردہ
ہوا جب درد پیدا جلوہ ہائے نازِ عریاں تھے

بھلا ہم دیکھنے جاتے پریشاں حالیٔ مجنوں
ہم اپنے حال پر نالاں اسیرِ زلفِ پیچاں تھے

کہاں کی شمع محفل کیسے۔ کہاں کی فاتحہ خوانی
بھلا کچھ غور تو کیجے کہ کیا کیا عہد و پیماں تھے

یگانہ تھا جو دیکھا ایک جلوہ غیر بن بیٹھا
وہ دل جس کے لئے ہستی کے یہ سب ساز و ساماں تھے

کوئی حد بھی ہے شوقِ دید کی اور سخت جانی کی
رہیں آنکھیں کھلی اور دست و پا سب اپنے بیجاں تھے

غم آدم کا۔ الم یعقوب کا۔ ایوب کی محنت
مرے افسانہ دل کے یہ اجزائے پریشاں تھے

زمانہ ایک حالت پر نہیں رہتا ہمیں دیکھو
عدو نازاں نہ ہو ہم بھی جلیسِ بزمِ خوباں تھے

ہم آئے رہ چلے لیکن نہ سمجھے مقصدِ ہستی
سمجھتے خاک مثلِ نرگسِ بیمار حیراں تھے

جلاتے غیر کو کیا خاک ہم خود جل بجھے اُن میں
ہمارے نالہ ہائے آتشیں بھی دشمنِ جاں تھے

صغیرِ بے نوا تنہا نہ تھے تم دشتِ غربت میں
تمہارے ساتھ یاس و حسرت و اندوہ و حرماں تھے

صغیر

حُسنِ عقیدت

(از پروفیسر عبداللطیف صاحب تپش۔ گورنمنٹ کالج لپسرور)

[امسال خوش قسمتی سے راقم الحروف کو آستانۂ پاک حضرت مخدوم علاء الدین علی احمد صابر کلیری رحمۃ اللہ علیہ پر حاضری کا اتفاق ہوا۔ جب فاتحہ کی غرض سے مزار پُر انوار کے قریب پہنچا تو ذیل کے چند ٹوٹے پھوٹے مصرعے زبان شوق پر اظہارِ تمنا کی صورت میں آ گئے شاید آپ کو پسند آئیں]

ہمہ چیزے کہ پیداست می گردد پدید اینجا
ہمہ عشرت قریب اینجا ہمہ عسرت بعید اینجا
کسے جز معنئ لاتقنطو چیزے ندید اینجا
ز ہر گوشہ و کنجِ غیب می آید نوید اینجا

"درِ فیض است منشیں از کشاکش ناامید اینجا
برنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید اینجا"

مزارِ حضرت صابرؒ ہوا پیشِ نظر جس دم
وفورِ بے خودی نے کر دیا کچھ اور ہی عالم
تمنائیں بڑھیں لاکھوں ہوئی گر ایک حسرت کم
یکایک شوق نے بڑھ کر یہ دل سے کہا تھم تھم

"درِ فیض است منشیں از کشاکش ناامید اینجا
برنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید ایں جا"

عزیزِ مصرِ عرفاں کی یہیں سے ہے جلوہ افزائی
اسی در پر مہ و انجم ہیں صرفِ ناصیہ سائی
یہیں اہلِ یقیں کرتے ہیں اظہارِ زلیخائی
یہاں ہوتی ہے تازہ شاخِ خشکِ نخلِ رعنائی

"درِ فیض است منشیں از کشاکش ناامید اینجا
برنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید اینجا"

خریداروں کا مجمع رات دن رہتا ہے اس در پر　　محبت مول لیتے ہیں متاعِ جان و دل دے کر
عجب دلچسپ ہے واللہ اس دکان کا منظر　　نہیں تھمتی جھڑی بارانِ رحمت کی یہاں دم بھر

"در فیض است منشیں از کشائش نا امید اینجا
برنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید اینجا"

مرادیں دل کی ہوتی ہیں اسی دربار میں حاصل　　یہیں سے اپنی جھولی بھر کے لیجاتا ہے ہر سائل
اسی درگاہ سے ہوتے ہیں حل سب عقدۂ مشکل　　یہیں ہے بابِ رحمت دیکھ آنکھیں کھول کر غافل!

"در فیض است منشیں از کشائش نا امید اینجا
برنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید ایں جا"

یہ وہ دریا ہے جس سے فیض کی ندی نکلتی ہے　　اسی ساحل پہ ہر ڈوبی ہوئی کشتی اچھلتی ہے
یہیں تقدیر پھرتی ہے یہیں قسمت بدلتی ہے　　یہیں شاخِ تمنا پھولنے سے پہلے پھلتی ہے

"در فیض است منشیں از کشائش نا اُمید اینجا
برنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید ایں جا"

یہاں آکر [illegible]اں کی ہے شمع آرزو جس نے　　نہیں کھٹکا اُسے جھونکوں سے کچھ بادِ مخالف کے
چراغ زیرِ دا[illegible] بھی کہیں بجھتے ہوئے دیکھے؟　　[illegible] لو لگا کر بجھ جا دل ـــــ

"در فیض است منشیں از کشائش نا اُمید ایں جا
برنگ دانہ از ہر قفل می روید کلید ایں جا

عبد اللطیف تپش

مُرغِ اسیر

(از جناب چمن لال دیوان دلگیر بی۔اے۔ ال ال بی سینئر اڈیٹر)

اے صبا قایم ترے ہی دم سے ہے شانِ چمن — تجھکو کہتے ہیں سبھی رُوحِ چمن جانِ چمن

ہے تری ہستی سے حاصل غنچہ و گل کو فروغ — پھولتے پھلتے ترے دم سے ہیں مرغانِ چمن

تیرے فیضِ لمس سے سبزے کو ہے بالیدگی — ہے تو ہی وجہ نمودِ سرو و ریحانِ چمن

جانبِ گلشن ہے ہر شام و سحر تیرا گزر — تو شبانہ روز ہے گہوارہ جنبانِ چمن

تیرے صدقے میرا پہنچانا وہاں جاکر سلام — اُن کی خدمت میں جو اُس جا ہوں جوانانِ چمن

پھر مری جانب سے کہنا کرکے یوں اُنکو خطاب — اے حسینانِ چمن۔ اے نونہالانِ چمن

اِک اسیر قیدِ تنہائی و پابندِ قفس — جو کہ تھا خود بھی کبھی مرغ خوش الحانِ چمن

یاد کر کرکے تمہیں رہتا ہے سرگرمِ فغاں — پوچھتا رہتا ہے حالِ [illegible] چمن

ہے مگر شاکی کہ تھا ہمجنس بھی ہمراز بھی — کیوں بھلا بیٹھے ہیں اُس کو ہمسیرانِ چمن

پھر سُنانا داستانِ غم مری یوں اے صبا — سخت مضطر ہے چھٹا ہے جب سے [illegible] چمن

ہے گرفتارِ قفس ٹوٹے ہوئے ہیں بال و پَر — خوں رُلاتی ہے پھر اس پر [illegible] چمن

کشتِ آزادی پہ بجلی گر گئی اُف اب کہاں — [illegible] کے کرنا سیر ہمراہ [illegible]

اب کہاں شاخوں پہ مِل کر جھومنا اور چومنا — اب کہاں اُس کو میسّر [illegible] چمن

وَلولے جلتے رہے ساری اُمنگیں مٹ گئیں — اب فقط یادِ چمن ہے اور [illegible] چمن

حال ابتر، خاک بر سر، جسم لاغر، زَرد و زار — خواب میں اُس کے لئے اب ساز و سامانِ چمن

از غم و سوزِ درون افسردہ و بیمار شد
می طپد در خاک و خوں از زیستن بیزار شد

اے نسیم صبح کیوں آ کر ستاتی ہے مجھے
کیوں سناتی ہے فسانے قمری و شمشاد کے

بوئے گل شورِ عنادل آمد فصلِ بہار
ہیں نشاط انگیز اہلِ گلستاں کے واسطے

میں سراپا درد ہوں کنجِ قفس میں قید ہوں
کیا سروکار عہدِ گل یا رونق گلزار سے

لٹ گیا میرا نشیمن خانماں برباد ہوں
اب کہاں اُڑنا چہکنا اب کہاں پہلے مزے

وہ بھی کیا دن تھے کہ جب تھے شاد بھی آزاد بھی
فکر و غم کوئی نہ تھا رنج و الم مفقود تھے

بل کے کرتے تھے چمن میں زمزمہ پردازیاں
اُن دنوں تھے کسقدر دلکش ہمارے چہچہے

ڈالی ڈالی پر ہمارا آشیاں تھا اُن دنوں
برگِ گل و شاخِ شجر چاہا جہاں بیٹھے رہے

اُڑ گئے اٹکھیلیاں کرتے بطرفِ جوئبار
گلبن و بستاں سرا سے جب کبھی اُکتا گئے

سبزۂ نورستہ سے ہوتے تھے دائم ہم کنار
غنچۂ نوخیز کو مل کر تھے باہم چومتے

سنبل و سرو و صنوبر نسترن۔ شاخ سمن
اُڑ گئے چاہا جہاں سے بس پہ چاہا جا بسے

مرغزار دلپذیر و آبشارِ خوشگوار
کیا ہوئے سب عیش کے ساماں میرے کیا ہوئے

اب کہاں پہلی وہ باتیں اب کہاں عیش و نشاط
طائرانِ باغ کے ساتھ اب کہاں وہ مشغلے

کیا چمن سے یا چمن والوں سے مجھ کو واسطہ
اب قفس ہے یا قفس کی تیلیاں میرے لئے

اس اسیری میں مدد تو ہی کر اے سوزِ دروں
مجھکو بھی میرے قفس کو بھی خدارا پھونک دے

تم رہے زاغ و زغن تو زندگی کے ہیں مزے
ہم رہیں فرطِ الم سے قید میں سر پیٹتے

ہر چند آزاد و شہباز سے گرفتارِ قفس ؏
زاغ شد مائل بہ گل بلبل در آزارِ قفس ؏

دلآرام

نیپال

ایک مصوّر مضمون - از حنیف ہاشمی

بدھ ناتھ کا مندر۔

یہ مختصر سی آزاد ریاست ہندوستان کی شمال مشرقی سرحد پر واقع ہے۔ ریاست کا تمام تر طول ۵۲۵ میل اور عرض ۹۰ سے ۱۴۰ میل تک ہے۔ اس کے شمال میں تبت اور مشرق میں سکم اور برطانوی دارجلنگ۔ جنوب میں پرنیا۔ بھاگلپور۔ دربھنگہ۔ مظفرپور۔ چمپارن۔ گورکھپور اور اودھ کے انگریزی اضلاع اور مغرب میں کماؤں جس سے اسے دریائے کالی

حد کرتا ہے۔ واقع ہیں۔ عوام الناس کے خیال میں اس کی آبادی کا اندازہ باون لاکھ تک لگایا جاتا ہے۔ نیپال میں بہت حد تک مبالغہ کو بھی دخل ہے۔ علاقہ بیشتر پہاڑی ہے۔ اور ریاست کی شمالی حد کے ساتھ ساتھ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹیوں کا سلسلہ دور تک چلا جاتا ہے۔ اور صاف موسم میں جب مطلع ابر آلودہ نہ ہو اور فضا دھند اور غبار کے اثرات سے صاف ہو یہ شاندار چوٹیاں برف کے سفید لباس میں ملبوس کھٹمنڈو کی پہاڑیوں سے صاف نظر آتی ہیں۔ جنوب میں ان کے متوازی کم اونچی گھاٹیوں کا سلسلہ ہے جس کی بلندی سطح سمندر سے ۸ ہزار فٹ سے لے کر ۱۴ ہزار فٹ تک چلی گئی ہے۔ یہ سلسلہ کوہ درمیان میں کہیں کہیں شکستہ ہے اور اس طرح کئی ایک خوبصورت درّے اور پہاڑی راستے پیدا ہو گئے ہیں جو دلکش کوہستانی وادیوں کی طرف رہنمائی کرتے ہیں ✦

ان پہاڑی سلسلوں نے دریاؤں کی روانی کی سمت پر بھی نمایاں اثر کیا۔ اور ان دریاؤں کو چار مختلف قسموں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یہ ڈھلان کی طرف بہتے ہوئے کم وبیش دریائے گنگا میں جا گرتے ہیں ✦

ان دریاؤں اور پہاڑوں نے ملک کو چار قدرتی حصوں میں تقسیم کر دیا ہے ✦

اقوام نیپال میں مختلف اقوام آباد ہیں۔ شمال کے بلند تر پہاڑوں اور وادیوں میں تبت کے لوگ بستے ہیں اور مغرب میں گورنگ اور مگر آباد ہیں۔ وسطی حصص میں مرمین، گورکھے اور توار رہتے ہیں۔ اور شرقی اضلاع کراتی۔ لمبوس اور کاس قوم کے قبیلے سے آباد ہیں۔ ان کے علاوہ اور بہت سے قبیلے ہیں جن کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ باہر سے آئے ہوئے نیچ ذات کے ہندوؤں کی اولاد ہیں۔ مشرقی حصے کے گھنے جنگلوں میں چھوٹی چھوٹی جنگلی قومیں آباد ہیں۔ یہ قومیں عام طور پر منگولین نسل کی ہیں۔ ان کے مضبوط اور توانا جسم۔ پست قد۔ چپٹے چہرے۔ ترچھی آنکھیں زرد رنگ اور سیدھے سیاہ بال بغیر داڑھی مونچھ کے چہرے اس امر کی بیّن دلیل ہیں۔ گورکھوں کو عام طور پر ان برہمنوں اور راجپوتوں کی اولاد خیال کیا جاتا ہے۔ جو ہندوستان کے مسلمان حملہ آوروں کے ڈر سے بھاگ کر نیپال کے کوہستانی علاقے میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ اور کچھ عرصہ کے بعد یہاں کافی اثر و اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ جس کے وہ اب بھی مالک ہیں۔ اگرچہ غیر اقوام میں شادیاں کرنے سے وہ بہت حد تک ان میں مخلوط ہو گئے ہیں۔ لیکن شکل وصورت سے اب تک ان کے آباؤ اجداد کا پتہ لگایا جا سکتا ہے ✦

مذاہب آبادی کا بیشتر حصہ بدھ مت کا پیرو ہے لیکن ان کا مذہب ہندو دھرم سے اسقدر مخلوط ہو چکا ہے کہ اب اسکو بدھ دھرم نہیں کہا جا سکتا ہے۔ وہ جسمانی ریاضت جس کی ساکیا منی تلقین کرتا ہے ان میں نام کو بھی نظر نہیں آتی بدھ مت کی خانقاہیں جو ماضی میں بھکشوؤں سے آباد نظر آتی تھیں۔ اب ویران اور سنسان پڑی ہیں۔ معاشرت پر منو کے ذات پات کے قانون کی حکومت ہے لیکن اب اس کی گرفت بھی ڈھیلی ہوتی جا رہی ہے۔ اور ذات پات کے امتیازات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔ "اہنسا پرمو دھرما" تقریباً فراموش کیا جا چکا ہے۔ یہ لوگ اپنے مردوں کو جلاتے۔ بھینسوں۔ بکریوں۔

بھیڑوں، آبی اور ہوائی پرندوں کا گوشت کھاتے اور شراب پیتے ہیں۔ ان میں چند لوگ ایسے بھی ہیں جو سور کا گوشت تو کھاتے ہیں لیکن بھینس کو مذہبی تقدس کی وجہ سے نہیں چھوتے۔ برعکس اس کے ایسی اقوام بھی ہیں جو بھینس کا گوشت بڑے مزے

مہاراجہ چندرا شمشیر کمانڈر انچیف جنرل بھیم شمشیر اور کمانڈنگ جنرل جودھا شمشیر۔

سے کھاتی ہیں لیکن سور سے نفرت کرتی ہیں۔

زبانیں مختلف اقوام کی مختلف زبانیں یا کم از کم بولیاں ہیں۔ ایک خاص زبان جسے موجودہ زمانہ کی سنسکرت یا سنسکرت کی ایک جدید شکل کہا جا سکتا ہے مغربی اقوام میں کثرت سے بولی جاتی ہے۔ ایک اور زبان بھی جو بہت حد تک

تبت کی زبان سے مشابہ ہے مروج ہے۔ لیکن اب اس میں بہت سے سنسکرت کے الفاظ داخل ہوگئے ہیں۔ اور اس کی ابتدائی صورت تقریباً مسخ ہو چکی ہے۔ لیکن حروف ابجد وہی ہیں جو تبت میں مستعمل ہیں ؛

تعلیم ابھی اسکولوں کی تعداد نہایت ناکافی ہے اور تعلیم کا کوئی خاص انتظام نہیں متموّل اور اوسط درجہ کے خاندانوں میں لڑکوں کو خاندان کا پجاری یا خود والدین تعلیم دیتے ہیں۔ اور اعلیٰ تعلیم کے لئے اُنہیں ہندوستان کے مشہور تعلیمی مرکزوں پٹنہ، بنارس اور کلکتہ میں بھیجا جاتا ہے۔ نیپال کی حکومت ریاست میں تعلیم کی ترقی میں بہت کوشاں ہے۔ جا بجا پرائمری اسکول کھولے گئے ہیں اور ثانوی مدارس کو براہ راست پٹنہ کی انگریزی یونیورسٹی کے ماتحت کر دیا گیا ہے۔ ۱۹۱۹ء میں حکومت کی طرف سے کھٹمنڈو میں ایک انگریزی کالج بھی قایم کیا گیا تھا۔ اس کالج نے ریاست میں تعلیم کی ترویج میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں انگریزی زبان بھی بہت اہمیت حاصل کر رہی ہے۔ اور اسے نہایت سلاست اور روانی اور صحت تلفظ کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ طلبا میں انگریزی زبان کا شوق روز بروز زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۰۱ء میں انگریزی پڑھنے والے طلبا کی تعداد صرف ستر تھی۔ لیکن جب اٹھارہ سال کے بعد ان کا پھر شمار کیا گیا تو وہ ایک ہزار باون سے کم نہ تھے ؛

تعلیم کے ساتھ ساتھ صنعتی اور حرفتی ترقی کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اور مادّی ترقی کی طرف بھی تسلّی بخش قدم اُٹھایا گیا ہے لیکن مغربی تہذیب کے ان عناصر کو جو شاید مغرب میں تو مفید ہوں لیکن مشرق میں اُن کا نتیجہ سوائے اخلاقی اور روحانی تباہی کے کچھ بھی نہیں۔ نہایت ہوشیاری کے ساتھ ریاست میں آنے سے روکا گیا ہے۔ نیپال کے دو مدبّر اور روشن دماغ فرمانروا مہاراجہ جنگ بہادر اور مہاراجہ چندرا شمشیر دل سے اپنی رعایا کے فلاح و بہبود کے متمنی تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے اسکے مفاد کے لئے اس حسن و خوبی سے قدم اُٹھایا کہ ان میں مشرقی روح بھی مردہ نہ ہونے پائی اور وہ اس راستہ پر بھی گامزن ہوگئے جو اُنہیں میدان ترقی میں دنیا کی متمدّن اقوام کے دوش بدوش کھڑا کر دے۔ نیپال کے ارباب حل و عقد کے خیال میں مغربی سیاسیات کے نظریات نے ایشیائی اقوام کے خیالات پر بہت بُرا اثر کیا ہے۔ اور آزادی اور جمہوریت، حکومت الٰہی یا رام راجیہ کے تصوّرات میں تصرّف کرکے انہیں اسی مادیت پرستی کے رنگ میں رنگ دیا ہے جو آخر میں اُن کی روحانی اور اخلاقی زندگی کی مسرّت کا باعث ہوتی ہے ؛

نیپال کے مقتدر خاندانوں کے لڑکوں کو اس غرض کے لئے جاپان بھی بھیجا گیا تھا کہ وہ صنعتی و حرفتی تعلیم حاصل کرکے اسے اپنے ملک میں پھیلائیں۔ اور انجینئرنگ کے جدید اصول سے بہرہ ہو کر ریاست میں اُن کی ترویج کریں۔ مہاراجہ کا خیال تھا کہ اس طرح ریاست اُن غیر ملکیوں کے داخلہ سے محفوظ رہے گی جو اپنے ساتھ ہر جگہ اپنے خطرناک سیاسی عقاید کو بھی ساتھ لے جاتے ہیں۔ پھر بھی مہاراجہ کے اس فعل پر عوام الناس کی طرف سے کافی نکتہ چینی کی گئی ؛

لٹریچر

ریاست کا لٹریچر ابھی اس قابل نہیں ہے کہ اس کا خاص طور پر تذکرہ کیا جائے۔ معاشرتی ترقی کے ساتھ زبان کی توسیع بھی ہو رہی ہے۔ اور اُمید کی جاتی ہے کہ وہ عنقریب کوہستانی شگوفوں کی صورت میں شگفتہ ہوگی جس کی خوشبو میں کوہستانی ندیوں اور وادیوں کے وہ دلکش نغمے بھی شامل ہونگے جو ابھی محض دیہاتی عورتوں کی زبان پر ہیں لیکن قدیم سنسکرت لٹریچر کے لحاظ سے نیپال کو ایک بیش بہا خزانہ کہا جاسکتا ہے۔ اور وہاں ایسے ایسے قدیم مسودے موجود ہیں جن کا دنیا کو علم تک بھی نہیں؛

جنرل رُدرن جودھا شمشیر جنگ بہادر رانا۔

تمدن و معاشرت

مندروں اور خانقاہوں کی کثرت کی وجہ سے جن میں سے صرف خانقاہوں کی تعداد ۲۳۰۰ سے کسی طرح کم نہیں۔ ریاست میں ہندو مذہب اور بدھ دھرم کے پجاریوں کی بھی کثرت ہے۔ مذہبی تہواروں کی تعداد شمار سے باہر ہے جن کی وجہ سے دفاتر اور اسکولوں میں بکثرت تعطیلیں ہوتی ہیں۔ راج گرو یا بڑا پجاری ریاست کا ایک معتمد فرد ہوتا ہے۔ جسے ریاست کے انتظامی امور میں بھی کافی دسترس ہوتی ہے۔ وہ کونسل کا ممبر بھی ہوتا ہے۔ اور حکومت کی آمدنی میں سے ایک کثیر رقم اس کو ملتی ہے۔ وہ اُن لوگوں سے جرمانہ بھی وصول کرتا ہے جن پر مذہب کی طرف سے

کوئی سزا عائد ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر پجاری یا مذہبی راہنما بھی جائداد و املاک کے مالک ہیں۔ ہر ایک ذی استطاعت خاندان کا پجاری علیحدہ ہوتا ہے +

ریاست میں نجومیوں کی بھی کثرت ہے۔ تقریباً ہر ایک امر میں ان سے مشورہ لیا جاتا ہے۔ تاوقتیکہ ان سے دریافت نہ کر لیا جائے مکان کی تعمیر، سفر، لڑائی اور جنگ سب امور کو ملتوی رکھا جاتا ہے یہانتک کہ ان سے شگن دریافت کئے بغیر کسی مرض کی دوا بھی استعمال نہیں کی جا سکتی +

ہر ایک متموّل یا متوسط درجہ کے خاندان کا ذاتی بید یا حکیم ہوتا ہے۔ جو خاندان میں ہر وقت موجود رہتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے لوگ طبابت پیشہ ہیں۔ اب سرکاری شفاخانے بھی کھولے گئے ہیں۔ جہاں ہر وقت غربا کی بھیڑ لگی رہتی ہے +

ریاست میں دیوالیئے کا قانون نہیں ہے۔ بلکہ باپ کے قرض کا ذمہ دار اُس کے بیٹے کو ٹھہرایا جاتا ہے +

شادی کے آئین و قوانین بھی نہایت عجیب و غریب ہیں۔ گورکھوں میں بیواؤں کی شادیوں، کثرت ازدواج اور ستی وغیرہ میں ہندو دھرم کی پیروی کی جاتی ہے۔ گنہگار یا بدکار عورت کو عمر بھر کے لئے قید کر دیا جاتا ہے۔ اور اُس کے شریک گناہ کو عدالت میں جرم ثابت ہونے پر لوگوں کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جاتا ہے۔ عورت کا خاوند کوکری لے کر اُس پر تین بار حملہ آور ہوتا ہے۔ اگر وہ بچکر بھاگ جاتا ہے تو پھر اُسے کچھ نہیں کہا جاتا۔ لیکن اُسے بھاگنے کا کوئی موقع نہیں دیا جاتا اور جس طرف وہ بھاگنے کی کوشش کرتا ہے تماشائی اُسے پھر حملہ آور کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ اکثر پہاڑی قوموں میں ایک عورت کئی خاوند رکھ سکتی ہے۔ ان میں رشتۂ ازدواج کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی +

حال میں موجودہ مہاراجہ کی طرف سے تمدّنی اور معاشرتی اصلاحات کی کوشش کی جارہی ہے۔ غلامی جو نیپال کے نام پر ایک بدنما داغ تھی ریاست سے تقریباً محو ہو چکی ہے +

حکومت اگرچہ نیپال کے مہاراجہ کو مغربی وقائع نگاروں کے الفاظ میں مشرقی تاجداروں کا سا مطلق العنان فرمانروا کہا جاتا تھا۔ لیکن عملی طور پر اب تک تمام انتظام و انصرام حکومت وزیراعظم اور اُس کی جماعت کے ہاتھ میں تھا۔ نیپال کی جدید تاریخ بہت حد تک مختلف جماعتوں کی سیاسی ریشہ دوانیوں اور جوڑ توڑ کی روئداد ہے۔ وزیراعظم کے ماتحت ایک مجلس مشاورت قائم ہے جو شاہی خاندان کے افراد، راج گرو، فوج کے جرنیلوں اور چند دیگر افسروں پر مشتمل ہے۔ اس مجلس مشاورت سے اہم امور میں مشورہ لیا جاتا ہے۔ عدالت کے فیصلوں کی اپیل بھی کی جاتی ہے۔ ریاست میں علیحدہ علیحدہ دیوانی اور فوجداری عدالتیں بھی قائم ہیں +

پہلے ریاست میں بہت سے مجرموں کو نہایت وحشیانہ سزائیں دی جاتی تھیں۔ انہیں آگ سے داغ دیا جاتا تھا یا انکا

جوارح توڑ دیئے جاتے تھے۔ لیکن مہاراجہ سرجنگ بہادر نے انگلستان سے واپس آنے پر ان سب کا ہمیشہ کے لئے انسداد کردیا۔ جنگ کے دنوں میں بغاوت غدّاری اور فوج سے فرار ہونے کی سزا موت سے دیجاتی ہے۔ رشوت ستانی کی سزا ملازمت سے معزولی، جرمانہ اور قید و بند ہے۔ قتل اور گاؤکشی کی سزا پھانسی ہے۔ اور گایوں کے اعضا وجوارح عمداً توڑنے کی پاداش میں مجرم کو عمر بھر کے لئے قید کردیا جاتا ہے۔ ریاست میں تین بڑے قید خانے ہیں جن میں سے دو عورتوں کیلئے

رانا بہادر شاہ نیپال۔

مخصوص ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت قیدیوں کی تعداد مرد قیدیوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے +

سالانہ آمدنی اور فوج

ریاست کی سالانہ آمدنی تقریباً ایک کروڑ روپیہ ہے۔ ریاست کی بیشتر آبادی جنگجو ہے فوجی طاقت کی طرف خاص توجہ دی جاتی ہے۔ موجودہ فوج تقریبا ۲۰ ہزار انفار پر مشتمل ہے جن کو پیدل سپاہیوں کی ۲۶ اور سواروں کی ۲ رجمنٹوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ وہ لوگ ہیں جن کو ضرورت کے وقت طلب کیا جا سکتا ہے۔ وہ کچھ عرصہ فوج میں ملازمت کرنے کے بعد اپنے کام پر چلے جاتے ہیں۔ اور بوقت ضرورت ریاست کی فوجی طاقت کو تقویت پہنچا سکتے ہیں۔ فوج کی تربیت و انتظام بالکل یورپین اصول پر ہے۔ اسلحہ جنگ بھی مختلف ہیں

اور قدیم چقماق کے ٹکڑوں سے لے کر موجودہ زمانہ کے جدید ترین اسلحہ تک استعمال کئے جاتے ہیں +

کیا آپ نے نیرنگِ خیال کے رعایتی اعلان سے فائدہ اُٹھایا؟

یہ موقع دوبارہ حاصل نہ ہوگا

ہم نے کچھ عرصہ سے نیرنگ خیال کی اشاعت بڑھانے کی طرف توجہ کی ہے۔ چنانچہ ہم نے ایک رعایتی اعلان شایع کیا تھا کہ جو شخص نیرنگ خیال کی خریداری قبول کریگا۔ اُسے اپریل اور مئی کے دو رسالے قیمتی ۸ر مفت تذر ہونگے۔ اور آج ہم نیرنگ خیال میں بھی اس کا اعلان کرتے ہیں۔ اس لئے آپ اپنے دوست احباب کو توجہ دلائیں کہ وہ اس رعایت سے فائدہ اُٹھائیں۔ اُن کی خریداری جولائی ۲۵ء سے شمار کی جائے گی۔ جہاں سے نیرنگ خیال کا سال شروع ہوتا ہے۔ اور دو رسالے اپریل ومئی کے، وی پی کے ہمراہ مفت بھیجے جائیں گے۔ اس رعایت سے فوراً فائدہ اُٹھانا چاہیئے

مستقل خریداران رسالہ شکایت کرینگے کہ نئے خریداروں سے رعایت کی جاتی ہے لیکن مستقل خریداروں سے کوئی رعایت نہیں کی جاتی۔ پس اس شکایت کو رفع کرنے کے لئے صرف دو ماہ کے لئے یہ رعایتی اعلان شایع کیا جاتا ہے۔ آپ اپنا پورا نام وپتہ اور نمبر خریداری لکھ کر مندرجۂ ذیل خاص نمبروں کو رعایتی قیمت میں حاصل کرسکتے ہیں:-

عید نمبر ۲۷ء	عید نمبر ۲۸ء	عید نمبر ۲۹ء
سابق قیمت عہ، رعایتی مر علاوہ محصول	سابق قیمت ۱۲ر۔ رعایتی ۸ر	سابق قیمت ۱۲ر۔ رعایتی ۱۲ر

اس کے علاوہ نیرنگ خیال کے جس قدر پرانے رسایل موجود ہونگے وہ آپ کو فائل پورا کرنے کے لئے ۲ر فی رسالہ کے حساب سے دیئے جائینگے۔ پس آج ہی درخواست بھیجئے۔ جو نئے خریدار رعایتی اعلان کے مطابق خریدار بن جائیں گے وہ اپنے آرڈر کے ہمراہ کوئی پرانا عید نمبر بھی رعایتی قیمت پر منگوا سکتے ہیں۔ اس رعایت سے آج ہی فائدہ اُٹھائیے۔ صرف چند کاپیاں باقی ہیں +

منیجر

سالنامہ کی رجسٹری

دفتر نیرنگِ خیال میں نیرنگِ خیال کے جنبل سالنامہ کی خریداروں کی درخواستوں کے انبار لگ رہے ہیں۔ سالنامہ کی دید کے لئے سال بھر سے آپ انتظار کی گھڑیاں کاٹتے ہیں۔ اور سب کی آنکھیں اس تاریخ پر ہیں جب یہ عدیم المثال اور نظر فریب ادبی مصور تحفہ آپ کے پاس پہنچیگا۔ یقین کیجئے کہ اس سال کا سالنامہ ایک مرقع ہوگا جو بیش قیمت سہ رنگ تصاویر کی البم معلوم ہوگی۔ مضامین کے لحاظ سے ہندوستان بھر کے اردو۔ ہندی۔ گجراتی رسایل اور بڑی بڑی اینول شایع کرنے والے انگریزی اخبارات کو چیلنج ہے انشاءاللہ نیرنگِ خیال کے سالنامہ کا مقابلہ کوئی بھی ہرگز نہ کر سکیگا۔ آپ کا خط ابھی تک رجسٹری کیلئے نہیں پہنچا۔ اپنا آرڈر رجسٹر کرا لیجئے ورنہ بعد میں مایوس ہونا پڑیگا۔

چار کتابیں

عملیات

اگر آپ اس فن کی معتبر صحیح اور لاجواب تصنیف مطالعہ میں رکھنا چاہتے ہیں جسمیں قدیم و جدید عملیات کو صحیح اور سمجھ میں آنیوالے طریقے سے پیش کیا گیا ہو تو اس کتاب کو منگوایئے۔ اسمیں اعمال، تعویذ وظائف۔ فالنامے وغیرہ ہر چیز موجود ہے۔ حجم تین سو صفحات۔ لکھائی چھپائی کاغذ بہترین۔ قیمت ؎، علاوہ محصولڈاک۔ منیجر نیرنگ خیال بکڈپو لاہور سے طلب کیجئے۔

فلاح دین و دنیا

یہ کتاب تیسری بار چھپی ہے اسے شریعت اسلامیہ کی سائیکلو پیڈیا کہنا چاہیئے۔ مذہب اسلام کے متعلق اسمیں ہر ایک ضروری مسئلہ موجود ہے حجم ۵۰۰ صفحہ کاغذ وغیرہ بہترین قیمت للعہ ؎

پتہ منیجر نیرنگ خیال بکڈپو بارود خانہ لاہور

اسلامی زندگی

جسمیں اہلسنت والجماعت کے عقائد کے ماتحت اسلامی معاشرت سے تعلق رکھنے والے تمام ضروری و نازک مسائل کو نہایت تحقیق و تصدیق کے بعد معتبر کتب سے جمع کیا گیا ہے۔ جن کی اس پر آشوب زمانہ میں مسلمانوں کو سخت ضرورت ہے حجم ۲۵۰ صفحہ قیمت ؎، ملنے کا پتہ۔ منیجر نیرنگ خیال بکڈپو۔ لاہور

تذکرہ اولیائے ہند

اس کتاب میں ہندوستان بھر کے اولیا اللہ کے سوانح حیات تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔ اسمیں قریباً تین سو اولیا اللہ کا ذکر ہے جنکے کشف و کرامات و ورد و وظائف اور احکام و نصائح وغیرہ سب کچھ درج ہے۔ کتاب مجلد ہے قیمت چار روپیہ (عہ)

پتہ۔ منیجر نیرنگ خیال بکڈپو۔ بارود خانہ لاہور

آپ کے بچوں کے لئے

ایک نہایت ہی مفید اور باتصویر ماہوار رسالہ

ہونہار

زیر سرپرستی جناب حکیم محمد یوسف حسن صاحب اڈیٹر نیرنگ خیال

دار السلطنت دہلی سے اکتوبر ۱۹۲۹ء میں شایع ہوگا

اس رسالہ کا مقصد یہ ہے کہ بچوں میں صحیح قومی اور اخلاقی تعلیم پھیلائی جائے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے قابل اور تجربہ کار اساتذہ کے مضامین اس رسالہ میں شایع ہونگے۔ ملک کے بڑے بڑے مضمون نگار حضرات اس کے معاون ہیں۔ کتابت و طباعت کا بہترین انتظام کیا گیا ہے۔ فوٹو بلاک اور دستی تصویریں ہر ماہ شایع کیجائینگی۔ یہ رسالہ آپ کے بچوں کا ایک اتالیق ہوگا۔ کم پڑھے لکھے مرد اور عورتیں بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔ رسالہ کا سائز ۲۰×۳۰ ضخامت ۴۰ صفحے قیمت صرف ؏ سالانہ خریدار صاحبان اپنے نام رجسٹرڈ کرالیں۔ تاکہ پریس سے نکلتے ہی پہلا شاندار اور خوبصورت پرچہ انکی خدمت میں روانہ کردیا جائے۔ نمونہ ۳ کے ٹکٹ بھیجکر منگوایا جاسکتا ہے ؎

پتہ:- منیجر رسالہ ہونہار دفتر متصل نیشنل واشنگ فیکٹری صدر بازار دہلی

رسالہ مست قلندر لاہور
آپکو رسالہ مست قلندر لاہور کی خریداری کیوں کرنا چاہیئے!
(۱) اسلئے کہ اہل دنیا کیلئے عالمگیر محبت، اطمینان، اور دائمی مسرت کا پیغام لے کر آیا ہے۔ وہ جو حوادثات زمانہ کے ہاتھوں تنگ آ کے ہمیشہ ملول اور آزردہ خاطر رہتے ہیں۔ رسالہ مست قلندر کے مطالعہ سے انہیں اپنے آپ کو خوش رکھنے اور دوسروں کو خوش کرنیکا سلیقہ آجائیگا (۲) اسلئے کہ یہ ظرافت کے گدگدانے والے مضامین۔ عاشقانہ غزلیات، مستانہ کہانیوں طب کے نادر چٹکلوں اور گوناگوں دلچسپیوں کا باتصویر ماہوار رسالہ ہے (۳) اس لئے کہ تمام جہان کی ہنسیوں نیز مذاق اور چہل کے قہقہوں کو رسالہ مست قلندر کے لئے ریزہ ریزہ کر لایا گیا ہے جنکی نوبارش کرنوں سے اسکے ناظرین کے خانہ ہائے تاریک ہر ماہ منور ہوتے رہتے ہیں (۴) اسلئے کہ اس میں دنیا بھر کے چیدہ چیدہ رسالہ اور اخباروں کے انتخاب ہر مہینے شائع کئے جاتے ہیں۔ گویا رسالہ مست قلندر کے پڑھنے والے دنیا کے تمام رسائل کے مطالعہ کا حظ حاصل کر سکتے ہیں (۵) اس لئے کہ قیمت کی ارزانی میں دنیا کا کوئی پرچہ اسکا مقابلہ نہیں کر سکتا یعنی سالانہ چندہ صرف عہ ادا کرنے پر ہر مہینے ۔ صفحات کا ضخیم رسالہ فوٹو بلاکس کی متعدد تصاویر سے مزین ہو کر ناظرین کے ہاتھوں میں پہنچتا ہے۔ اس پر طرہ ہر سنتے خریدار کو ۳۰ عدد چوٹی کے ناول اور کئی بیش قیمت تحائف مفت دئے جاتے ہیں۔ نمونہ آج ہی مفت طلب کیجئے
المشتہر:- مینجر رسالہ "مست قلندر" پوسٹ بکس ایک سو پچاس لاہور

اغوان ہیر آئیل یعنی بالوں کے لگانے کا خوشبودار تیل

ہندوستان میں جس قدر خوشبودار تیل مروج ہیں وہ علی العموم سفید تیل سے مختلف ذرائع سے خوشبودار بنائے جاتے ہیں۔ جاہل تیل ساز عموماً ترکیب کیمیائی خواص علاوہ یہ سے چونکہ لاعلم ہوتے ہیں۔ ان کو بالوں کی شناخت۔ دماغ کی تشریح۔ ادویات کے افعال و خواص معلوم نہیں ہوتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچارے سُنے سُنائے لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔ اور وارد ساز خوشبو تیل میں بسا کر فروخت کرتا ہے۔ پس اگر وہ یہ جانے کہ تل کا تیل دماغ کو خشک۔ جلد اور اعصاب کو خراب کرتا ہے تو آج یہ اندھیر نہ ہوتا۔ کہ جس کو دیکھو بال سفید۔ داڑھی مونچھ بے معنی اور ادنیٰ ادنیٰ باتوں سے زکام میں مبتلا۔ دانت خراب چہرہ پژمردہ اور اس پر جھائیاں وغیرہ موجود۔

کارخانہ آب حیات نے طبی اصول کے موافق بالوں کی اصلیت اور روئیدگی و طریق پرورش اور قیام وغیرہ کے حالات پر غور کر کے مندرجہ بالا قباحتوں موجودہ تیلوں کے اجزائے مروجہ کے تمام نقصانات کو مدنظر رکھکر یہ تیل سولہ برس سے ایجاد کیا ہوا ہے جو سر پر لگانے سے بالوں کو تقویت دیتا ہے اور اعصاب و عروق کو مضبوط کرتا ہے درد سر و سر کا چکر بیت سے بالوں کا گرنا اور بدخوابی دور ہو جاتی ہے۔ بالوں کی جڑیں تر رہتی ہیں اور بال لمبے و چمکدار رہتے ہیں۔ دماغ کو طاقت رہتی ہے۔ مسامات میں اس کے اثر سے وہ رطوبت جلد تر تبدیل ہوتی ہے جس سے بال سفید ہو جایا کرتے ہیں۔ قیمت علاوہ محصول ڈاک فی شیشی ایک روپیہ . . . . . (عہ)

چشمۂ فیض

آنکھیں خواہ کیسی ہی کیوں نہ دکھتی ہوں چشمۂ فیض کی ذرا سی چٹکی ڈالنے سے فوراً آرام آجاتا ہے۔ ایک شیشی میں دو سو بیماروں کے لئے دوا ہوتی ہے بچوں جوانوں اور بوڑھوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ مفت تقسیم کرنے والوں کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ . . . . . (عہ)

محافظِ دندان

دانت مشین غذائی ہیں۔ ان چیزوں کا جن سے ہمارے جسم کی پرورش ہوتی ہے۔ غذا وغیرہ تمام دنیا کی نعمتیں جو معدہ میں داخل کریں ان کی درستی ابتداءً انہیں دانتوں سے ہوتی ہے۔ پس ہر وقت ان کو صاف رکھنے کی فکر رکھیں۔ اس منجن سے ملنے دانت مضبوط۔ مسوڑوں کا گوشت درست۔ خون آنا بند۔ بدبو سیل دُور۔ دانت گرنے سے محفوظ اور کیڑا نہیں لگتا۔ دانت ہمیشہ موتیوں کی طرح چمکدار رہتے ہیں۔ قیمت چار تولہ ایک روپیہ . . . (عہ)

ملنے کا پتہ:۔ مینجر کارخانہ آب حیات۔ پنڈی بہاؤالدین۔ (پنجاب)

مطبوعات صوفی کمپنی لمیٹڈ

سیر الصحابہؓ صحابہ کرام جیسی مقدس ہستیوں کے عقائد۔ عبادات معاملات۔ حسن معاشرت۔ فضائل۔ اخلاق۔ تدبر سیاست۔ علوم و فنون اور زندگی کے مفصل حالات اس کتاب میں درج کئے گئے ہیں۔ تمام حالات نہایت تصدیق و تحقیق کے بعد لکھے گئے ہیں۔ مؤلفہ مولینا سعید انصاری رکن دار المصنفین اعظم گڈھ۔ قیمت پانچ روپے (ﷲ)

صحابیات یہ کتاب اکثر اسلامیہ زنانہ اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس میں ۸۰ صحابیات کے حالات درج ہیں۔ سر ڈاکٹر محمد شفیع صاحب۔ آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب اور دیگر کئی معززین نے اس کتاب کو زنانہ تعلیم کے لئے بے نظیر کتاب مانا ہے۔ مؤلفہ نیاز فتحپوری۔ قیمت عہ

خاتون جنت حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کے حالات میں ایک جامع کتاب ہے۔ اس کتاب کی تعریف میں اس قدر لکھ دینا کافی ہے کہ پانچ سال کے عرصہ میں اس کے سات ایڈیشن سولہ ہزار کی تعداد میں بک چکے ہیں قیمت عہ

سیرۃ صدیقہؓ ام المومنین حضرۃ عائشہ صدیقہ کے حالات زندگی۔ آپ کے تفقہ فی الدین۔ علمی تبحر تفسیر قرآن و روایت حدیث میں خاص قابلیت کا بیان۔ مسلمان بچیوں کے لئے قابل مطالعہ اور قابل تقلید ہے۔ قیمت عہ

سیرۃ الکبریٰؓ ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی مفصل سوانحعمری معہ فوٹو مزار۔ قیمت ایک روپیہ دو آنے (ﷲ)

سیرۃ الحسین حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے حالات زندگی۔ شہادت و واقعات کربلا کی مفصل و مبسوط تاریخ معہ آپ کے مزار کے فوٹو کے چار رنگوں میں چھپا ہوا نفیس سرورق قیمت دو روپیہ دو آنے (ﷲ)

سیرۃ حضرت بلالؓ پروانہ شمع رسالت حضرت بلال کے حالات "زمیندار" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر سید وجاہت حسین مرحوم کے زور قلم کا نتیجہ۔ قیمت عہ

تاریخ اسلام اردو زبان میں تاریخ اسلام کے متعلق جس قدر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ یہ کتاب بلحاظ واقعات۔ طرز تحریر۔ سیاق عبارت لکھائی چھپائی سب میں بہتر ہے۔ سات رنگوں سے چھپا ہوا نقشہ عرب اور رنگین سرورق نے چار چاند لگا دئے ہیں۔ ہندوستان کے اکثر سرکاری ٹیکسٹ بک کمیٹی والے نے اس کو سرکاری مدارس کے لئے بطور لائبریری و انعامی کتاب کے منظور کیا ہے۔ مصنفہ مولینا اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی۔ قیمت حصہ اول ساڑھے چھ سو صفحے للعہ، حصہ دوم تین روپے (ﷲ)

تاریخ الحرمین الشریفین بقول امام الہند مولینا ابو الکلام آزاد مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی تاریخ پر اس سے بہتر کتاب آجتک کسی زبان میں بھی کسی مصنف نے نہیں لکھی۔ شیخ عبد القادر صاحب وزیر تعلیم صوبہ پنجاب کی رائے میں اس کتاب کا ہر ایک مسلمان کے گھر میں ہونا ضروری ہے۔ بیس کے قریب فوٹو اس کتاب میں ہیں۔ مولفہ مولینا عبد السلام صاحب ندوی۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ (ﷲ)

رشد الراشدین شیعہ مذہب کے لغو اور لایعنی سوالات اور اعتراضوں کا خود ان کی کتاب سے جواب دیا گیا ہے۔ قیمت ایکروپیہ۔

شرح درود کبریت احمر یہ درود شریف حضرت غوث اعظم عبد القادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ کا لکھا ہوا ہے۔ جس کی علامہ عصر جناب مولوی عبد المالک صاحب سابق شیرال ریاست بہاولپور نے کی ہے قیمت ۱۲ر

ہدایت الہدایت یہ کتاب حضرت امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے عربی میں لکھی تھی اس میں اخلاق و آداب۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو نہایت خوبی سے بیان کیا گیا ہے۔ ہم نے اس کتاب کا اردو ترجمہ کرایا ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت ۱۲ر

امین و مامون علامہ جرجی زیدان ایڈیٹر رسالہ الہلال مصر

ملنے کا پتہ۔ منیجر صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ منڈی بہاؤالدین (پنجاب)

کا تاریخی ناول ہے۔ جس میں خلفائے عباسیہ کے دربار کے حالات اور اس زمانہ کی تاریخ بہت خوبی سے بیان کی گئی ہے۔ قیمت عہ

فقرائے اسلام } اُن پیشوایان دین کے سبق آموز حالات جنہوں نے فقر و فاقہ کے باوجود اسلام کے اصول و ارکان کو استوار و مستحکم کیا اپنے اوپر تکلیف برداشت کر کے تبلیغ اسلام کی۔ مصنفہ مولینا عبد السلام صاحب ندوی عہ

حضرت ابو ایوب انصاریؓ } ہجرت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی میزبانی کا جس بزرگ کو سب سے پہلے فخر حاصل ہوا وہ آپ کی ذات ستودہ صفات تھی۔ اس کتاب میں آپ کے حالات اور مزار کا فوٹو درج ہے۔ قیمت ۶ر

حیات رابعہ } حضرت رابعہ بصری کے حالات زندگی قیمت چار آنے ۔ (۴ر)

ذکر حبیب } عہد حاضرہ کے محبوب الٰہی حضرت پیر حیدر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جلال پوری کے حالات، کرامات و ملفوظات۔ قیمت تین روپے (سے)

مشاہیر اسلام } مختلف صوفیائے کرام علمائے عظام شہدائے ملت غازیان شمشیر بکف اور مجاہدین و سلاطین کے حالات زندگی۔ قیمت حصہ اول (سے) حصہ دوم (سے)

برزخ } موت کے بعد اور قیامت سے پہلے انسان پر کیا گزرتی ہے۔ اسکا جواب آپ کو کتاب برزخ میں ملیگا جو ایک گریجویٹ نے لطیف پیرایہ میں لکھی ہے قیمت ۱۲ر

انور پاشا } سیف اللہ شہید غازی انور پاشا کے حالات زندگی۔ از مولانا محمود احمد صاحب دہلی۔ ۸ر

اسلامی سپاہیانہ زندگی } اس کتاب میں تاریخی واقعات سے ثابت کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نکبت و افلاس کا باعث یہ ہے کہ انہوں نے سپاہیانہ زندگی کو چھوڑ کر شاہانہ اور امیرانہ زندگی اختیار کرلی ہے۔ پھر اس مرض کا علاج تجویز کیا ہے۔ قیمت عصر

اکابر قوم } مسلمان عالموں۔ فقیروں۔ امیروں اور لیڈروں میں جو خرابیاں ہیں انکو بیان کر کے انکی اصلاح کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ قیمت ۶ر

تاریخ افغانستان } سید جمال الدین افغانی کی مشہور عربی تاریخ متعلقہ افغانستان کا اردو ترجمہ افغانی تاریخ پر بہترین کتاب ہے۔ قیمت عہ

مہدی سوڈانی } جنرل گارڈن اور لارڈ کچنر کی معرکۃ الآرا لڑائیوں اور حضرت کے روحانی تصرف اور بزرگوں کے کمالات میں نہایت دلچسپ کتاب ہے قیمت ایک روپیہ (عہ)

دختر سمرنا } خالدہ خانم وزیر تعلیم ترکی گورنمنٹ نے تسخیر سمرنا کے حالات کو ناول کے پیرایہ میں لکھا ہے چونکہ آپ خود ہی میدان جنگ میں موجود تھیں اس لئے چشم دید واقعات لکھے ہیں۔ ساتھ ساتھ محبت و عشق کی چاشنی بھی ہے عہ

دختران شمشیر } تمام زمانوں اور قوموں کی بہادر جانباز اور حوصلہ مند خواتین کے حالات جنہوں نے میدان جنگ میں تلوار کے جوہر اور تخت حکومت پر انتہائی تدبر جرأت اور شجاعت کا ثبوت دیا۔ اس نادر تالیف میں آپ یہ دیکھکر حیران ہوں گے کہ صنف نازک نے کیونکر اپنے زور بازو سے حکومتوں کے تختے الٹے۔ کیونکر نئی حکومتیں قائم کیں اور کس طرح زبردست لشکروں کا ماہروئی کیا تو مقابلہ کیا (عہ)

حیات امام مالک } حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی قیمت ۳ر

حیات امام مسلمؒ } حضرت امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی۔ قیمت ۴ر

آئینہ خودشناسی } خداشناسی و خودداری کا سچا رہبر تصوف کے بے نظیر اور لاجواب مسائل۔ قیمت چھ آنے (۶ر)

میلاد النبیؐ } یعنی سرور کائنات فخر موجودات حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی۔ قیمت بارہ آنے (۱۲ر)

حیات سعدی } حضرت شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی کے حالات۔ ہر مرد۔ عورت۔ بچے۔ بوڑھے کے پڑھنے اور اس پر عمل کرنے کے قابل ہیں۔ قیمت ۵ر

حضرت فضل الرحمن } گنج مراد آبادی کے حالات زندگی قیمت دو آنے (۲ر)

ملنے کا پتہ:- منیجر صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ منڈی بہاؤ الدین (پنجاب)

حالات مولانا روم حضرت مولانا روم کے مفصل حالات زندگی اور فرقہ مولویہ کے رقص کا نظارہ قیمت ۱۲/

اسلامی کہانیاں قیمت حصہ اول چار آنے (۴/)
" " دوم چار آنے (۴/)

یادرفتگاں اس کتاب میں پنجاب کے جلد اولیائے کرام وصوفیائے عظام کے حالات درج ہیں ۱۲/

شمس تبریز مولانا روم کے مرشد خواجہ شمس الدین تبریزی کے حالات وخوارق عادات۔ قیمت ۶/

سیرۃ النعمان یعنی امام نعمان بن ثابت کے حالات زندگی قیمت چار آنے .. (۴/)

ذوالنون مصری حضرت ذوالنون مصری کے بہترین حالات۔ قیمت چار آنے (۴/)

میر درد دہلوی ہندوستان کے مشہور صوفی اور اہل دل شاعر کے حالات۔ قیمت دو آنے (۲/)

تیغ کمال اگر آپ کو غازی اعظم مصطفٰے کمال کی سواعمری یونان کے خلاف مسلمانوں کی کوشش اور فتح منظر دیکھنے ہیں تو اس کتاب میں دیکھیے۔ قیمت ۸/

یاسمین شام تسخیر شام۔ ہلال وصلیب کے معرکہ آرائی کے واقعات حضرت عمرؓ کے وقت کی داستان حسن وعشق کا دلچسپ افسانہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (۱/۸)

عروس کربلا کربلا کے تاریخی واقعات پہلے ہی سے کچھ کم دردانگیز نہیں۔ اسپر مولانا راشد کے قلم گوہر ریز نے قیامت ڈھادی ہے۔ قیمت ایک روپیہ (عہ)

جوہر قدامت مغربی تعلیم اور مشرقی تربیت کا مقابلہ۔ دو بہنوں کی پرتکلف داستان ناول کے پیرایہ میں لکھی گئی ہے ۸/

مودودہ ایک لڑکی کی نہایت دردانگیز کہانی۔ مسلمانوں کو اپنی اصلاح کے لیے اس کتاب کا مطالعہ از حد مفید ہے۔ قیمت ۸/

فطرت نسوانی لڑکیوں کی میں بہترین کتاب ہے جو فرانسیسی زبان میں لکھی گئی تھی اور اسکا ترجمہ یورپ کی تمام زبانوں میں ہوا۔ مصر کے اخبار الہلال نے اسکا عربی ترجمہ شائع کیا اور ہم نے اردو کا لباس پہنایا۔ قیمت ۸/

الرسالۃ والنبوۃ مولفہ مولوی عبدالمالک صاحب جس میں خدا کی ہستی اور حضرت رسول محمد صلعم کی نبوت اور رسالت کو دلائل عقلیہ سے ثابت کیا گیا ہے قیمت ۴/

شرح قصیدہ غوثیہ مؤلفہ مولوی عبدالمالک صاحب سابق شیرمال ریاست بہاولپور۔ قصیدہ غوثیہ حضرت غوث الثقلین جس کے یمن وبرکت سے مشکلات دینی ودنیوی حل ہوتی ہیں۔ آجتک اس کے حل کا حوصلہ کسی بزرگ نے نہیں کیا بنظر شکل دریا بکوزہ بندے۔ قیمت ۸/

درس محبت محبت خدا ومحبت رسول صلعم کے بیان کے بعد ان امور پر بحث کی گئی ہے جن کی وجہ سے اہل سنت والجماعت کو دیگر فرق ومسلک پر تفوق وامتیاز حاصل ہے از سجادہ نشین جلالپور شریف قیمت ۴/

رسالہ علم لدنی حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ قیمت ۴/

آداب المریدین شیخ الاکبر حضرت محی الدین ابن عربی قدس سرہٗ کی تصنیف ہے۔ پیر ومرید کے تعلقات اور آداب پر بہترین کتاب ہے مترجمہ مولوی غلام ربانی صاحب بی۔ اے قیمت ۳/

میزان عمل مولفہ حضرت امام غزالی کا اردو ترجمہ خواہشات اور روح کی جنگ۔ تزکیہ نفس۔ جملہ فضائل کی تفصیل۔ غرض دنیا جہان کی کل کا۔ یا ہونکی یہ کتاب کلید ہے ۸/

سات ستارے اس کتاب میں سرزمین پنجاب کے سات درخشندہ سیاروں کے حالات نہایت تحقیق سے درج کیے گئے ہیں۔ قیمت ۱۳/

دربار علم مولفہ مولانا حضرت عبدالماجد صاحب جس میں ارکان اسلام۔ اسرار وفلسفہ نہایت تفصیل وشرح سے درج ہیں۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (۱/۸)

فلسفہ خواب خواب کا فلسفہ قدیم وجدید بیان کیا گیا ہے اس موضوع پر اردو کی یہ پہلی کتاب ہے ۱۰/

تحقیق الروح اس میں روح کے متعلق مفصل بحث لکھی ہے ۴/

انسان کامل انسان کامل کی تعریف اور کامل و اکمل انسان کے صفات بمصنفہ عارف ربانی حضرت سید عبدالکریم رحمۃ اللہ علیہ۔ ترجمہ اردو قیمت ۸/

سوانح احمدی حضرت سید احمد بریلوی اور ان کے رفیق کار سید اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے حالات جہاد اور سکھوں کے ساتھ معرکہ کی جنگ۔ آپکے خرق عادات اور روحانی تصرفات کا ذکر قیمت دو روپیہ

ملنے کا پتہ:- منیجر صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ پنڈی بہاؤالدین (پنجاب)

المسئلۃ الشرقیہ مصطفےٰ کمال پاشا کی تصنیف یہ کتاب سیاسیات مشرق کے اسرار کا محرم راز ہے۔ مترجمہ نیاز فتحپوری قیمت دو روپے۔

عرفان کی پہلی تجلی حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات۔ قیمت ۶ر

قسطاس المستقیم حضرت امام غزالی کی اس نام کی عربی کتاب کا ترجمہ۔ تصوف کی اعلیٰ پیمانہ کی کتاب ہے قیمت دس آنے

حیات داغ حضرت داغ دہلوی کے باتصویر حالات قیمت ۱۲ر

نفحات یہ کتاب حکیم الامۃ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی نایاب تصنیف ہے جس کا اردو ترجمہ کرایا گیا ہے۔ تصوف میں بڑے پایہ کی کتاب ہے قیمت ۱۰ر

فوٹو جلالپور شریف جلالپور شریف کے شہر کا عام نظارہ اور حضرت قبلہ عالم پیر حیدر شاہ صاحب کے روضہ شریف کا دلفریب خاکہ قیمت سادہ ۶ر رنگین ۱۲ر

ابن یمین شعرائے ایران میں سعدی اور ابن یمین نے اخلاقی شاعری میں خصوصیت کے ساتھ نام پیدا کیا ہے۔ فارسی شاعری میں تصوف اور اخلاق کا جو ذخیرہ موجود ہے وہ زیادہ تر انہیں دونوں بزرگوں کا جمع کیا ہوا ہے شیخ سعدی کا نام تو بچہ بچہ کی زبان پر ہے لیکن ابن یمین اس بارہ میں بہت بدقسمت تھے۔ ملک کو مولینا عبدالسلام ندوی کا مشکور احسان ہونا چاہیے جنہوں نے اردو لٹریچر میں ابن یمین کے حالات جمع کردئے ہیں۔ ان کے اخلاق۔ مذہب ۔۔۔ تعلقات۔ محاسن و جائداد اور شاعری سے بحث کی ہے۔ حجم ۲۲۰ صفحات۔ قیمت ۱۲ر

مجموعہ وظائف خاندان چشت اہل بہشت نظامی کا سلسلہ مع دیگر وظائف جو روزمرہ معمول سے پڑھے جاتے ہیں قیمت مکمل مجموعہ مجلد ۱ر مجموعہ وظائف خورد ۳ر

تفسیر سورۂ یوسف یہ دس سورہ کی مکمل تعبیر ہے۔ سورہ یوسف کو اللہ تعالیٰ نے احسن القصص کہا ہے قیمت ۸ر

پھل ہر قسم کے پھل دار بوٹے اور درخت و باغات لگانے کے طریقے اور پھل محفوظ رکھنے کی ترکیبیں ایک آرائش گریجویٹ کی لکھی ہوئی۔ قیمت ۸ر

صابن سازی صابن بنانے کے آسان سہل اور کم قیمت نسخے۔ قیمت ۲ر

رشوت رشوت کے اقسام۔ رشوت کیونکر پکڑی جاتی ہے اور اس کی اصلاح۔ ایک ریٹائرڈ مجسٹریٹ کلکٹر کے مشاہدات۔ قیمت چھ آنے ... (۶ر)

سید جمال الدین افغانی موجودہ ترک احرار یا اتحاد کی تحریک کے سب سے پہلے بانی کے حالات۔ قیمت تین آنے (۳ر)

حیات حالی حضرت مولانا حالی کے باتصویر حالات ۶ر

کالا پانی وہابیوں کے مشہور مقدمہ میں جبکہ بہت سے علمائے کرام کو حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی تھی مولوی محمد جعفر صاحب تھانیسری نے مقدمہ کے حالات اور اپنے زمانہ قید کے حالات کو قلمبند کیا ہے قیمت ۸ر

ترکاریاں ترکاریوں کی کاشت اور اُسے تجارتی اغراض کے فائدہ اُٹھانے کے علم، زمانہ حال کی تحقیق کے بعد لکھی گئی ہے۔ قیمت آٹھ آنے (۸ر)

ہر ایک مرغی سونے کا انڈا دے سکتی ہے

بغیر طلسم کسی شخص میں مرغیوں کے ذریعے سے سونے کے انڈے حاصل کرنے کا ملکہ پیدا ہو جائے۔ اگر آپ مرغیوں کے ذریعے سے دولت کمانا چاہتے ہیں تو

کلید مرغی خانہ

کا مطالعہ کیجئے۔ ۔۔۔ مرغی کی تجارت ایسی تجارت ہے جس کے ذریعہ سے بہت کم سرمایہ لگا کر ہزاروں روپیہ ماہانہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں مرغیوں کی تجارت۔ انڈوں کی تجارت۔ مرغیوں کی پرورش۔ مرغیوں کا علاج اور ان کے ذریعے دولت کمانا بتایا گیا ہے۔ نہایت مفید کتاب ہے۔

ناپسند ہو تو واپس کر دیجئے

اس کے مصنف سرکاری مرغی خانہ کے سپرنٹنڈنٹ ہیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کتاب کس قدر جامع اور مفید ہوگی۔ بلند قسم مرغیوں کی تصویریں بھی درج ہیں جو رنگین اور فوٹو بلاک سے تیار کرائی گئی ہیں اور مرغیوں کے ڈربوں کے فوٹو بھی دئے گئے ہیں۔ قیمت فی جلد مجلد تین روپے چار آنے ... (۳؍۴)

ملنے کا پتہ: منیجر صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ۔ منڈی بہاؤالدین (پنجاب)

ہندوستانی اکاڈیمی صوبہ متحدہ الہ آباد کے مطبوعات

ازمنہ وسطیٰ میں ہندوستان کے معاشرتی اور اقتصادی حالات

(از علامہ عبداللہ یوسف علی ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل ایم۔ سی۔ بی۔ ای) مجلد عہ غیر مجلد عہ

(۱) مغلوں سے پہلے عرب و ہندوستان کے تعلقات زیر طبع {از مولنا سید سلیمان صاحب ندوی}

(۲) مسلمانوں کے تمدن پر ہندوؤں کا اثر :- از مولنا محمد امین صاحب عباسی

(۳) ازمنہ وسطیٰ کا ہندوستانی تمدن - {از رای بہادر مہامہو پادھیا پنڈت گوری شنکر ہیراچند صاحب اوجھا}

(۴) ہندی شاعری از ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی

(۵) ناتن . جرمن ڈراما ...... {مترجمہ مولنا محمد نعیم الرحمان صاحب ایم۔ اے۔ ایم۔ آر۔ اے۔ یس}

(۶) ترقی زراعت .... {از خانصاحب مولوی محمد عبد القیوم ڈپٹی ڈائرکٹر زراعت . الہ آباد}

پتہ - ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد (صوبہ متحدہ)

عملیات روحانی کا زندہ کرشمہ

ہزاروں میں سے چند شہادتیں

جناب حکیم محمد علی صاحب:- متعلم سنہ یافتہ یونانی و ڈاکٹری طبیہ کالج دہلی چوک فرید امرتسر تحریر فرماتے ہیں۔ کہ قبل ازیں میاں سراج الدین صاحب جو میرے خاص دوست ہیں۔ ان کی بیوی کے لئے آپ سے بتیاں لے گئے۔ جن سے ان کو بہت فائدہ ہوا۔ روزانہ میں پانچ پیچش کے صرف دو دست رہ گئے۔ اور باقی بتیوں کے استعمال سے کلی صحت ہو گئی۔ اب اور مریض آپ کی طرف اور بھیجے جاتے ہیں ●

جناب عبد المجید صاحب نیشاپوری بازار کوئٹہ تحریر فرماتے ہیں:- کہ میں نے چار عدد بتیاں عملیات جلادی ہیں۔ اب پہلے سے مریضہ کو افاقہ معلوم ہوتا ہے۔ پانچویں بتی سے امید ہے کہ صحت کلی ہو جائے گی۔ [illegible] روپے بذریعہ منی آرڈر ارسال ہیں۔ رسید سے مطلع فرماویں۔ اور کوئی کار خدمت میرے لائق ہو تو تحریر فرمائیں ●

جناب ایم۔ ایس۔ عباسی۔ ہوٹل مانی سٹریٹ چمبر لین سٹریٹ ملا بمبئی تحریر فرماتے ہیں:- کہ مریضہ کو افاقہ معلوم ہوتا ہے اور عملیات بذریعہ وی پی ارسال فرماویں مشکور ہونگا۔ باقیماندہ عملیات سے امید ہے کہ آرام ہو جائیگا ●

جناب ایم۔ اے حمید باغبانپورہ لاہور سے تحریر فرماتے ہیں کہ میں حکیم کریم الدین صاحب انارکلی لاہور کو قبل ازیں صحیح معنوں میں عامل نہیں سمجھتا تھا۔ اور عام اشتہاریوں کی طرح گردانتا تھا لیکن اب مشکل و مصیبت میں لا علاج مریض آسیب کے متعلق آزمایا گیا جس سے پورا یقین ہو گیا۔ کہ حکیم صاحب علم و عمل میں اکمل ہیں

نوٹ:- اگر آپ کسی بیماری میں مبتلا ہوں جس پر دوا اثر نہیں کرتی۔ جادو۔ نظر بد۔ یا کسی سے ناچاقی ہو گئی ہے۔ یا بے روزگاری یا کسی مقدمہ سے حیران ہو چکے ہوں تو بذریعہ عملیات مدد لے سکتے ہیں۔ ہدیہ عملیات محصول پیشگی بذریعہ وی پی بھیجے جائیں گے۔ آپ کسی قسم کی مصیبت میں مشورہ لینا چاہتے ہیں تو فی مشورہ پیشگی ایک روپیہ۔ بذریعہ وی پی ایک روپیہ چھ آنہ علاوہ خط و کتابت جوابی ہو۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔ خط و کتابت کرتے وقت اخبار کا حوالہ دیں ●

المشتہر

منیجر دفتر عامل حکیم کریم الدین۔ انارکلی۔ لاہور

دوشیزہ

عورت اور مرد کی خانگی (گھریلو) زندگی پر لاجواب تصنیف

ہر پڑھے لکھے انسان کے پاس ہونی چاہیئے

جناب مرزا فریدوں بیگ صاحب لکھتے ہیں :-

میں نے اس فن پر جس قدر کتابیں اردو زبان میں شائع ہو چکی ہیں سب پڑھی ہیں۔ اور میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ دوشیزہ کی گرد کو بھی نہیں پہنچتیں۔ دوشیزہ ایک کتاب ہے۔ جو سماجی زندگی پر اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ بلکہ انگریزی کتابوں میں بھی وہ باتیں موجود نہیں جو آپ نے اس کتاب میں لکھی ہیں۔ اس کتاب کے پڑھنے سے دل میں آپ کے اس عظیم الشان کام کی وقعت بڑھ جاتی ہے جسے مدنظر رکھ کر آپ نے یہ کتاب لکھی ہے۔ ہندوستان کی آئندہ نسلیں آپ کو دعا دیتی رہیں گی۔ اور آپ کے اس لاجواب کام کی ہمیشہ دل سے قدر کریں گی۔ میرے خیال میں اس کتاب پر آل انڈیا ویدک کانفرنس اور پنجاب یونیورسٹی کو انعام دینا چاہیئے۔ میاں بیوی۔ لڑکا لڑکی۔ بچہ بڑھا۔ ہر شخص کے متعلق اس کتاب میں وہ تمام باتیں لکھی ہیں جن کا جاننا ضروری ہے۔ میرے دل سے آپ کے حق میں دعا نکلتی ہے۔ جب اس کا دوسرا حصہ طبع ہو تو مجھے فی الفور بھیج دیجئے۔"

اگر آپ چاہتے ہیں کہ مرد و زن ہر قسم کی امراض اور خرابیوں سے محفوظ رہیں۔ آپ حسین و جمیل۔ تندرست و توانا نظر آئیں۔ آپ کے بچے، لڑکے اور لڑکیاں صحیح طور پر تربیت حاصل کریں تو اس کتاب کا مطالعہ کیجئے۔

قیمت صرف پانچ روپے۔ رعایتی تین روپے آٹھ آنے (۳/۸ روپے) محصول ڈاک ۸/

ملنے کا پتہ :- مینیجر نیرنگِ خیال بک ڈپو۔ بارود خانہ لاہور

ہندوستان اس سے پہلے کوئی ایسی شاندار کتاب شائع نہیں کر سکا!

جناب چغتائی کا اردو پر غیر فانی احسان

کا

دوسرا ایڈیشن

[illegible] کا پہلا ایڈیشن [illegible] ختم ہو گیا

مرقع چغتائی کی مختصر تفصیل

دیباچہ [illegible] ڈاکٹر [illegible] نے لکھا ہے۔ تعارف نامہ حضرت علامہ سر اقبال نے
سخنہائے گفتنی جناب چغتائی کے قلم سے مصوری کے محاسن پر علمی تبصرہ ہے
ہندوستان کے [illegible] تمام مکمل دیوان غالب اور [illegible] انتخاب کلام غالب ہے
ایسا صحیح اور خوشخط نسخہ آج تک شائع نہیں ہوا
جس کی لکھائی چھپائی اور حسن ترتیب کی مثال ہندوستان ایک صدی تک پیش نہ کر سکے گا

یہ مرقع پچاس رنگین شاہکاروں کا ایک شاندار مجموعہ ہے

Twenty-one Coloured Plates reproduced in 4 colours by a world famous firm in Europe
Two : : : Coloured Outline Plates Classical work of Chughtai.
Two : : : Reproductions of Chughtai's most fascinating pencil sketches
Nine : : Colour Illustrations And the rest Illuminated plates on tints.

Bound in Imitation Morocco, marked with beautiful design on face and back in gold, workmanship of a European firm Enclosed in a handsome box

All the 300 pages printed on Japon Vellum & high class Chromo one sided thick Art paper with highly decorated and artistic borders SIZE 12 x 10.

علم و ادب اور ہندوستانی مصوری کی اس عظیم الشان [illegible] لیکر فوراً آرڈر بھیجئے کیونکہ اسکے بعد کوئی ایڈیشن شائع نہ ہوگا

باوجود ان سب خوبیوں کے قیمت صرف [illegible] روپیہ

ملنے کا پتہ -

مینجر رسالہ نیرنگ خیال بارود خانہ لاہور

REGD. No L. 17

The Nairang-i-Khiyal, Lahore.

جلد ۹ (جملہ حقوق محفوظ) نمبر ۶۵

نیرنگِ خیال ہندوستان بھر کے علمی ادبی رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا اور سب سے زیادہ مقبول ہے

چیف ایڈیٹر حکیم محمد یوسف حسن — تعداد اشاعت پانچ ہزار — ایڈیٹر حنیف ہاشمی

قیمت فی پرچہ ۵؍ وہیلر کمپنی کے بک سٹالوں پر ۵؍

قیمت سالانہ مع محصول ڈاک تین روپیہ آٹھ آنہ ممالک غیر سے آٹھ شلنگ

فہرست مضامین

بابت ماہ نومبر ۱۹۲۹ء

کریمی پریس لاہور میں باہتمام میر قدرت اللہ پرنٹر چھپا اور حکیم محمد یوسف حسن پبلشر نے دفتر نیرنگ خیال بیرون خزانہ لاہور سے شائع کیا

دنیائے ادب کا شاہکار

شاہکار ایک ایسا لفظ ہے جو زمانہ حال کی ایجاد ہے۔ انگریزی میں اسے ماسٹرپیس کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ کسی چیز کا انتہائی کمال۔ پس اردو رسائل کے متعلق اگر اس لفظ کے استعمال کی تلاش ہو تو وہ سالنامۂ نیرنگ خیال ہی ہو سکتا ہے۔ کہنے کو تو ہر شخص اپنی چیز کی تعریف کرتا ہے۔ کس نہ گوید کہ دوغ من ترش است۔ لیکن جو لوگ آنکھیں رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ نیرنگ خیال کا یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے۔ سالنامہ کا ۱/۲ حصہ لکھا جا چکا ہے یعنی ابھی تک صرف بہتر صفحے لکھے جا چکے ہیں۔ اور ابھی ہمیں ۱۴۰ صفحات کے برابر مضامین کی تلاش و جستجو ہے ہم بھرتی کے مضامین سے رسالہ کو بھرنا نہیں چاہتے۔ بلکہ ان اصحاب کے مضامین لینا چاہتے ہیں جن کے مضامین ہی ایک رسالہ کے سالنامہ کو شاہکار بنا سکتے ہیں۔ جسقدر سالنامہ لکھا جا چکا ہے اُس پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیائے ادب کے کون کون سے آبدار موتی اسے چمکا رہے ہیں۔ سالنامہ میں جناب سلطان حیدر صاحب جوش کا ایک اچھوتا مضمون ہے طلسم ازدواج یہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بیحد دلچسپ۔ جناب سید حسن برنی نے ابن بطوطہ کی سیاحت پر ایک ایسا مضمون لکھا ہے جسمیں ابن بطوطہ کے کارناموں کو نہایت واضح طریق سے بے نقاب کیا گیا ہے۔ یہ مضمون فرانسیسی زبان کی اُس مشہور کتاب سے اخذ کیا گیا ہے جسمیں مسلمان جغرافیہ دانوں پر علمی پیرایہ میں روشنی ڈالی گئی ہے ایرانی ادبی تہذیب کی ٹکر پر مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے مخصوص رنگ میں روشنی ڈالی ہے۔ یہ مضمون ہماری سالنامہ کی کامیابی کیلئے کافی ہے۔ مولانا مسعود الرحمن صاحب ندوی نے سپاہی کے عنوان سے افسانہ لکھا ہے۔ ہندی علماء کی عربی زبان میں لسانی خدمات کی ایک لاجواب مثل ہے۔ حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی نے قلی شہزادہ کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا ہے۔ جو عبرت و موعظت کی جیتی جاگتی تصویر ہے مرولی پیل حضرت شوکت تھانوی کا ایک مزاحیہ مضمون ہے جسے پڑھکر اگر آپ بے اختیار ہنستے نہ چلے جائیں تو سالنامہ کی قیمت واپس کر دینے کا ہم پختہ وعدہ کرتے ہیں۔ سکوت ایک روسی افسانہ ہے۔ بینظیر موثر اور دلچسپ اسے جناب انیس الدین احمد ایم اے علیگ نے سالنامہ کیلئے بڑی کاوش سے لکھا ہے۔ گلدستۂ عشق۔ ایک محققانہ مضمون ہے۔ ہندوستان کے مشہور ادیب جناب آغا حیدر حسن صاحب کا لکھا ہوا۔ ایسی ایسی لاجواب چیزیں صرف نیرنگ خیال میں ہی شائع ہو سکتی ہیں۔ کشمیر جنت نظیر ایک مضمون ہے کشمیر کے متعلق جسے جناب صوفی محمد حسین صاحب بی اے نے اپنے سفر کشمیر کے دوران میں اس حسن و خوبی سے لکھا ہے کہ اگر وہ کسی انگریزی رسالے کے لئے ایسا مضمون لکھتے تو گراں قدر معاوضہ حاصل کر سکتے تھے۔ اس قسم کی چیزیں اردو رسالوں میں شاذ و نادر ہی شائع ہوتی ہیں۔

آپ جانتے ہونگے دہلی کے مشہور ادیب مولانا سید جالب جو اردو اخبار نویسی کے "باوا آدم" تسلیم کئے جاتے ہیں۔ یہ نیرنگ خیال کا ہی کارنامہ ہے کہ مولانا سید جالب سے مضمون حاصل کیا اور وہ بھی افسانہ گلاب کنور جو وقائع نگاری کا بہترین مرقع ہے۔ مرزا عاشق علی بیگ خیال نے ایرانی پیغمبر کے عنوان سے مانی جسے ایک جہان صرف مصور کی حیثیت سے جانتا ہے۔ پر ایک ایسا مضمون لکھا ہے جس سے مانی کی پیغمبری پر روشنی پڑتی ہے۔ اور کسی کی کہانی اور میری زبانی ایک فسانہ ہے جسے پروفیسر عندلیب شادانی ایم اے نے اس انداز سے لکھا ہے کہ شاید آپ یہ ورق پھاڑ کر اپنی جیب میں رکھ لیں (وقت فرصت

کام آنے کے لیے۔ اور رباعیات خیام کا جواب اس نادر الوجود قلمی نسخہ سے ہمیں مولانا نجیب اشرف صاحب ندوی مدیر معارف نے روشناس کرایا ہے۔ آپ کا یہ قیمتی مضمون جن مشکلات سے ہم نے حاصل کیا ہے وہ ہمیں جانتے ہیں۔ اس کے بعد بارش کا پہلا قطرہ ایک ادبی ڈرامہ ہے۔ جسے خاکسار نے لکھا ہے۔ اور اگر میں اس کے متعلق یہ لکھدوں کہ ۱۹۲۹ء کے ادبی مضامین میں یہ سب سے اول نمبر پر ہے تو آپ اسے مبالغہ نہ سمجھئے گا۔ آوائی۔ ایک تامل زبان کی شاعرہ کا تذکرہ ہے۔ جسے جناب مولوی عبدالرزاق صاحب ارشد۔ ایچ سی ایس۔ اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل حیدر آباد دکن نے سالنامہ کے لئے لکھا ہے۔ یہ مضمون بے حد دلچسپ اور نئی ہے۔ اور [illegible] کہ آپ اسے کم از کم دوبار پڑھیں۔ عبدالرزاق صاحب وہی مشہور ادیب ہیں جنھوں نے طلسمات افسانہ نامی کتاب حیدر آباد سے شائع کی تھی

نظم حصہ میں اس قدر مضامین اتنی بڑی بڑی ہستیوں کے آغا حیدر حسن اور خواجہ حسن نظامی مرزا فرحت اللہ بیگ اور سید جالب دہلوی۔ سلطان حیدر جوش اور نجیب اشرف ندوی۔ مولوی عبدالرزاق صاحب ارشد اور سید حسن برنی وغیرہ ذرا فہرست پر نظر ڈالیے۔ اور دل پر ہاتھ رکھ کر فرمائیے کہ کیا ہندوستان کا کوئی علمی ادبی رسالہ ایسی شاندار فہرست پیش کر سکتا ہے۔ اور یہ فہرست یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ اس میں اضافہ ہوگا اور اس قدر زیادہ کہ یہ فہرست بھی دب جائے گی۔ جو ہم شائع کر رہے ہیں۔ اسلیے اگر میں یہ لکھدوں کہ میں ادبی دنیا کو چیلنج دیتا ہوں کہ ہر رسالہ اپنی اپنی انتہائی کوشش کر کے دیکھ لے اور وہ ہم سے بازی نہ لیجا سکے گا تو اس کو تعلی نہ سمجھا جائے بلکہ اسے ایک حقیقت سمجھا جائے

ناظرین نیرنگ خیال سے صرف اتنی گذارش ہے کہ ہماری اس قدر محنت و کوشش اور آپ کے قلمی معاونین کی اتنی بڑی کاوش کی سرپرستی اختیار کیجئے۔ یہ آخری اطلاع ہے۔ اگلے مہینہ کی پہلی تاریخ سے سالنامہ کا وی پی مع محصول ڈاک ایک روپیہ آٹھ آنہ میں روانہ ہونا شروع ہو جائے گا۔ مگر آپ نے ابھی تک آرڈر نہیں بھیجا پھر اگر آپ کو یہ نادر موقعہ مل سکا تو شکایت معاف۔ آپ جو نیرنگ خیال کی معاونت و سرپرستی کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں۔ آپ کی وہ خواہش بھی پوری نہ ہو سکے گی۔

اس لیے میری درخواست ہے کہ اس شاندار سالنامہ رسالہ نیرنگ خیال کی خریداری کی درخواست آج ہی بھیج دیجئے ——

حکیم محمد یوسف حسن
چیف ایڈیٹر

شذرات

کسی قوم کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرنے کے لئے گزشتہ اقوام عالم کی ترقی و تنزل کی داستانوں سے زیادہ کوئی چیز مؤثر نہیں ہو سکتی۔ آج وہ قومیں جن کے ہاں کوئی تاریخ نہیں موہوم افسانوں اور علم الاصنام کی بے سر و پا داستانوں کے ذریعے اپنی تاریخ مرتب کر رہی ہیں۔ جہاں دنیا کی اکثر اقوام موجودہ کا یہ حال ہے وہاں مسلمان اپنی شاندار اور قابل صد فخر تاریخ سے دن بدن ناواقف ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی تاریخی ناواقفیت اور جہالت کا نتیجہ ہے کہ اسلام کے متعلق نت نئی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں وقت کی اہمیت اور نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے لاہور میں ایک مجلس اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے نام سے قائم کی گئی ہے۔ اسکے دو شعبے ہیں۔ ایک شعبے کا کام تاریخ اسلامی کے مختلف پہلوؤں پر اعلیٰ درجہ کے محققانہ مضامین شائع کرنا۔ اور دوسرے شعبے کا کام تعلیم یافتہ مسلمانوں میں اسلام کی تاریخ اور تمدن کے مطالعہ کا شوق پیدا کرنا اس دوسری غرض کو پورا کرنے کے لیے ماہ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں شہر لاہور میں تقاریر کا سلسلہ جاری کیا جائیگا۔ اس انسٹیٹیوٹ کے سکرٹری خواجہ عبدالوحید صاحب اور صدر جناب سید محمد عبداللہ صاحب ایم اے ہیں۔ انسٹیٹیوٹ نے اس عظیم الشان کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔ جس کی طرف ارض ہند میں چند انفرادی مساعی کے سوا بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ حالانکہ یہ کام افراد کی بجائے ایک منظم جماعت کا ہے اور تاوقتیکہ چند اہل درد اپنے تئیں اسکے لئے وقف نہ کر دیں۔ اور دیگر افراد قوم حسب استطاعت ان کا ہاتھ نہ بٹائیں یہ شجر بار ور نہیں ہو سکتا۔ ہم خوش ہیں کہ ان اغراض و مقاصد کو لیکر ایک جماعت میدان میں آ گئی ہے۔ لیکن ساتھ ہی قوم کی بے حسی اور جمود کو دیکھکر یہ بھیانک خیال بھی آئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کہیں یہ پھول ہماری تغافل شعاری سے کملا کر نہ رہ جائے۔ تاوقتیکہ اہل علم حضرات کی طرف سے اشتراک عمل اور معاونت کا ہاتھ نہ بڑھایا جائے۔ اس کام کا بوجہ احسن انجام پانا امر محال نظر آتا۔ کیونکہ اب اصلاح چند افراد یا ایک جماعت کے بس کی بات نہیں رہی۔ اس کی طرف من حیث القوم متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔ ضروری ہے کہ ہر وہ شخص جو دل میں قوم کا کچھ درد رکھتا ہے۔ ہر ممکن ذریعہ سے اس انسٹیٹیوٹ کو کامیاب بنانے کی کوشش کرے۔ عنقریب انسٹیٹیوٹ کی طرف سے تقاریر کا سلسلہ جاری ہونے والا ہے۔ جس کا اعلان متعدد اخبارات میں ہو چکا ہے ان تقاریر میں حصہ لیا جائے۔

ہم انسٹیٹیوٹ کے ارباب کو ان کے عزم و ارادے پر مبارکباد دیتے ہوئے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ وہ صرف تقاریر پر ہی اکتفا نہ کریں۔ بلکہ جلد از جلد اسلامی تاریخ و تمدن پر تصانیف کا ایک سلسلہ بھی شروع کر دیں۔ کوشش کر کے انہیں اسلامی درسگاہوں میں نصاب مقرر کرایا جائے

اس میں شک نہیں کہ اسلامی درسگاہوں میں دیگر مضامین کے ساتھ دینیات کی تعلیم بھی دیجاتی ہے۔ لیکن

اس بے اعتنائی غفلت اور بے توجہی پر تعجب ہی کہ اس کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ ضرورت ہے کہ اس نصاب پر نظر ثانی کی جائے۔ اور پرانے نصاب اور نظام کی بجائے ضروریات زمانہ کے مطابق جدید نصاب و نظام مقرر کیا جائے ◆

انسٹنٹ ریڈر لٹریچر کمپنی کی کتاب بک آف نالج کی جلد ۱۱-۱۲ کے صفحہ ۳۰۳ میں رسول اللہ صلعم کے متعلق ہو ناقابل اعتراض فقرے تھے اور جن پر ملک کے اسلامی رسائل میں بار ہا لکھا جا چکا تھا خوشی کی بات ہے۔ کہ انجمن بمبئی کی ایک اسلامی انجمن کی کوششوں سے نہ صرف وہ فقرے بلکہ پورا مضمون کمپنی نے نکال دیا ہے اور اس کی جگہ پروفیسر صلاح الدین خدابخش کے قلم سے دوسرا مضمون لکھوا کر کتاب میں داخل کیا ہے۔

یہ واقعہ ہمیں یقین دلاتا ہے کہ اگر ندوہ یا اسلامی انسٹیٹیوٹ یا کوئی اور اسلامی انجمن اس کام کا بیڑا اٹھائے تو اسلام کے متعلق اس تمام زہریلے لٹریچر کا بہت جلد خاتمہ ہو سکتا ہے۔ جو دانستہ یا نادانستہ طور پر غیر مسلم مضمون نگاروں کی قلم سے ٹپک پڑتا ہے۔ آج سے بیس سال پیشتر مولانا سلیمان ندوی کی نظامت میں ندوۃ العلماء کے تحت میں ایک شعبہ "تصحیح اغلاط اسلامی" کا قائم ہوا تھا۔ جس کی کوشش سے مارسیڈن صاحب اسکولوں کے کورس میں اپنی ایک داخل شدہ کتاب تاریخ ہند سے قابل اعتراض فقروں کو نکالنے پر مجبور ہو گئے تھے کیا ارکان ندوۃ العلماء اور دیگر اسلامی انجمنیں اس شعبہ کے قیام کی طرف توجہ کریں گی۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا مدت سے یہ خیال تھا کہ علی گڑھ میں اردو کا ایک مرکزی کتب خانہ قائم کیا جائے کانفرنس گزٹ میں اس کے متعلق چند تجاویز بھی کی گئی تھیں مگر عملاً اس سلسلہ میں کوئی قابل تذکرہ کام اب تک نہیں ہوا تھا۔ گزشتہ سال جب کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہمیر پور تشریف میں منعقد ہوا تو اس کے متعلق ایک رزولیوشن اجلاس میں پاس ہوا جس سے اندازہ ہوا کہ لوگ اس مفید تجویز کو پسند کرتے ہیں۔

یہ رزولیوشن حسب ذیل ہے۔

> یہ کانفرنس اردو زبان کے تحفظ و ترقی کے لیے یہ ضروری سمجھتی ہے کہ ایک مرکزی کتب خانہ قائم کیا جائے جس میں اردو کی تمام کتابیں جو ابتدا سے اب تک تالیف یا ترجمہ ہوئی ہیں۔ ترتیب زمانی کے لحاظ سے فن وار جمع کی جائیں تاکہ اس کتب خانہ سے اردو زبان کی مکمل تاریخ مرتب ہو سکے اور ابتدا سے اب تک اس زبان میں عہد بعہد جو تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اور جو تدریجی ترقی و وسعت اردو نے اختیار کی ہے۔ اس کا صحیح اندازہ کیا جا سکے۔
>
> اور چونکہ کانفرنس کے پاس ایک وسیع و شاندار عمارت اور عملہ موجود ہے اور علی گڑھ مسلمانوں کا تعلیمی مرکز ہے اسلیے مناسب ہوگا کہ یہ مرکزی کتب خانہ مسلم یونیورسٹی کے پہلو بہ پہلو کانفرنس کی شاندار عمارت میں قائم کیا جائے اور صاحب استطاعت مسلمان و مصنفین اپنی تصنیفات اور ذاتی ذخیرے اس لائبریری کے قائم کرنے میں مدد دیں۔

اس رزولیوشن سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اگر اس کے مطابق یہ کتب خانہ قائم ہو گیا تو تمام ناظرین اور خصوصاً مصنفوں کیلئے

اس کا وجود نہایت قیمتی ثابت ہوگیا - کانفرنس نے ایک وسیع کمرہ اس کام کے لئے مخصوص کر دیا ہے - اور کچھ کتابیں جمع کرنے سال رواں کے بجٹ میں کتابوں کی خریداری کے لئے ایک خاص رقم بھی حسب گنجائش رکھی ہے - لیکن کتابخانہ کے ارباب کی طرف سے جو گشتی چٹھی شائع ہوئی ہے اس سے ظاہر ہوسکتا ہے کہ جو کچھ اب تک ہوا ہے - وہ کام کی اہمیت اور عظمت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں

ابتدا میں کانفرنس کے پاس اسقدر رسائل نہیں ہو سکتے کہ کثیر سرمائے سے اردو کی کتابیں فراہم کرسکے - ہاں جو لوگ اپنی مادری زبان سے کچھ بھی دلچسپی رکھتے ہوں - وہ اس کام میں امداد دیں -

ہم زندہ دلان پنجاب کے سامنے یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ ہر صاحب تصانیف اپنی تصانیف کا ایک ایک نسخہ کتابخانہ کیلئے بھجوا دے - اور اگر اہل مطابع بھی اپنے مطبوعات کی ایک ایک جلد ارسال کردیں تو کتابوں کی تعداد میں ہزاروں کا اضافہ ہوسکتا ہے - اس صورت میں ہندوستان کی اس مرکزی لائبریری میں ایک حصہ "پنجاب ملک" کے نام سے بن سکتا ہے - ہمیں امید ہے اہل پنجاب جو اردو کی خدمت میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں اس موقعہ پر بھی زندہ دلی کا ثبوت دیے بغیر نہ رہیںگے - اگر ناظرین اگرچہ سر دست اور کچھ نہیں کرسکتے تو کم از کم اتنا کریں کہ اپنی وہ کتابیں جو پڑھ چکے ہوں مرکزی کتابخانہ کیلئے بھیجدیں - اور اگر کوئی صاحب کسی رقم سے مدد کرنا چاہیں تو اس امر کی تصریح کردیں کہ یہ رقم مرکزی کتابخانہ کیلئے بھیجی جارہی ہے

علمی حلقوں میں یہ خبر نہایت مسرت و امتنان سے سنی جائیگی کہ مجدد العصر علامہ اقبال کی شہرہ آفاق کتاب "پیام مشرق" کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوگیا ہے - ہرچند یہ کتاب گذشتہ دو سال سے نہ مل سکتی تھی اور ضرورت تھی کہ اسی وقت اس کا تیسرا اڈیشن شایع کیا جاتا تاہم ہم اپنے کرم دوست شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ کے ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنی کاروباری سیاسیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اتنی دیر بعد تو اس طرف توجہ کی - اقبال جس پیام کا حامل ہے - اسکے متعلق کچھ کہنا آفتاب عالمتاب کو چراغ دکھانا ہے لیکن اس قدر کہے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ اس زمانہ دار و گیر میں جب کہ مغرب مشرق کی روحانیت تہذیب و تمدن اور مذہبی روایات کو پامال کردینے پر تلا ہوا ہے - اور تمام طاغوتانہ طاقتیں اسکی پشت پر ہیں - اگر کوئی اسکی قیادت کرسکتا ہے تو یہ صوفی منش فلسفی ہے جو پیغمبری تو کرتا ہے لیکن پیغمبر نہیں کہا جاسکتا - کون انکار کرسکتا ہے کہ مشرق قریب میں اس وقت جو زندگی کی لہر نظر آرہی ہے - اس کا تب و تاب اس قلزم زخار سے نہیں

اگر افغانستان آج ایک آزاد اور دول مغرب کے مقابل حکومت ہے - تو وہ علامہ اقبال کا ہی رہون منت ہے جنہوں نے امان اللہ خاں کو پیام عمل دے کر بیدار کردیا - اور اس نے غیر ملکی اقتدار کی زنجیریں تار عنکبوت کی طرح توڑ کر پھینک دی - جدید مشرق کی آرزوں اور امیدوں کا مصدر پیام مشرق ہے - ہر وہ شخص جو مشرق اور مشرق کے ساتھ اسلامی علم کو بلند دیکھنا چاہتا ہے - پیام مشرق کو حرز جان بنائے - اور علامہ ممدوح کے گراں قدر خیالات سے مستفید ہو -

ایڈیٹر

زورِ قلم

(خاص برائے نیرنگِ خیال)

(ادبِ عربی کے نامور ادیب سلامہ موسیٰ کے ایک مضمون "الادب للجموع" کا اردو ترجمہ)

ہوٹل، یکم جولائی ۱۹۲۹ء

محترمی! کیا آپ ایسے مصیبت زدہ پہ مہربانی فرما سکتے ہیں جو اپنی زندگی سے بیزار، اسبابِ بیزاری سے ناآشنا اور طریقِ شکوہ سے ناواقف ہونے کے باعث کوئی دم آرام نصیب نہیں، نیند آفت ہے تو بیداری قیامت، غرض کیا عرض کروں صبح ہوتے ہی خوشی سے دفتر جاتا ہوں مگر واپس آتا ہوں تو اندوگیں، شام ہونے بھی نہیں پاتی کہ بے چین ہو کر قہوہ خانہ کی طرف نکل جاتا ہوں، وہاں کی پُرلطف صحبتوں کا کیا کہنا، مگر میں تنہا اپنے خیالات میں سرگرداں رہتا ہوں، کبھی کبھی کچھ پی کے غم غلط کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر آہ! اس میں بھی نشہ سے چور اور رنجور ہو لینے تک وہی ناکامی و نامرادی سایہ فگن رہتی ہے۔ اس کے بعد پریشان کن اور وحشت انگیز خوابوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ شاید یہ عقلِ باطن کی تحلیل کا کرشمہ ہو جو مجھے کروہاتِ زندگی سے نجات کا موقع دے رہی ہے یا یہ وہ باتیں ہیں جو بہت ہی جلد میرا خاتمہ کرنے کو ہیں۔ س

بہار شریف، ۳ جولائی ۱۹۲۹ء

مکرمی، خط ملا، آپ کی تمام تکلیفیں کسی دردِ نہاں کا نتیجہ ہیں۔ اور وہی دردِ نہاں آپ کے پاکیزہ جذبات کو پامال کئے ہوئے ہے، میرے خیال میں، اس کی تفتیش اور دفعیہ دونوں ممکن ہیں، کیا مہربانی فرما کر آپ بتائیں گے کہ:۔

کیسے خاندان میں اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں؟

کیا اپنی بیوی سے ناخوش ہیں؟

آپ کے بچے ہیں؟

شادی کس طرح ہوئی تھی؟

اپنے کام جی لگا کر انجام دیتے ہیں؟ یا کوئی دوسرا کام کرنا چاہتے ہیں، م۔۔۔

ہوٹل ۵ جولائی ۱۹۲۹ء

محترمی، جواب ملا، کمالِ شکریہ کے بعد گزارش ہے، آپ ایسی باتیں پوچھتے ہیں جس سے کسی کو مطلع کرنا نہیں چاہتا ہوں، مگر کیا کروں طبیعت میری چنچل رہتی ہے۔ آغازِ مراسلت میں نے ہی کیا۔ اس لئے آپ سے اپنے اسرارِ سربستہ کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں +

حضرت! مجھے بیوی کی محبت میں ذرہ برابر شک نہیں، وہ میرے بچوں کی ماں ہے، میری اور ان کی خدمتگزار ہے۔ پھر آپ ہی فرمایئے اپنے مونس و غمگسار اور اپنے بچوں کی ماں سے کوئی کس طرح ناخوش ہو سکتا ہے!

میں اپنی خدمت کو ناپسند کرتا ہوں، مگر پسند بھی کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہی مجھے اپنے ان خیالات سے جو کاٹے کھاتے ہیں، باز رکھتی ہے، رہی طبیعت کے موافق خدمت اسے ظاہر کرنے پر آپ بہت ہنسینگے۔ کیونکہ میری طبیعت ترکِ ماسوا کی طرف بہت مائل ہے، اس لئے نہیں کہ

[illegible] محبت کی تمنا ہے۔ بلکہ صرف اس
[illegible] سے کہ تنہائی میں دنیا پر حکیمانہ نگاہیں ڈالوں،
[illegible] یہ بھی خیال ہوتا ہے، کہ اگر میں کاشتکار ہوتا تو
[illegible] خوش نصیب ہوتا +

ماشاء اللہ میرے دو بچے بھی ہیں، شادی کے پہلے
میں سمجھے ہوئے تھا کہ بیوی مالدار ہوگی، اس لئے میری
بیکار ہونے کی پروا نہ تھی مگر شادی کے بعد دیکھا تو
ایک بھکارن ہے، خیر یہ بھی چنداں تکلیف دہ نہیں،
کیونکہ میری تنخواہ معقول ہے۔ مگر ستم تو یہ ہے کہ بعض وقت
گو اس کی حالت سے آزردہ ہو کر قصد تغافل ہی مارا
پھرتا ہوں، س.....

بہار شریف، ۱۰- جولائی ۱۹۲۹ء

کرمی، آپ کا خط پڑھا، باتیں سمجھ میں آگئیں، اس
سے پہلے آپ نے اپنے خواب پریشان کا بھی تذکرہ کیا
تھا۔ کیا کوئی خواب بتانا پسند کرینگے؟ آپ لکھتے ہیں
کہ "میرے خیالات مجھے کاٹے کھاتے ہیں"۔ اس کا
مطلب؟ اور ہاں ذرا یہ بھی بتائیے کہ آپ کو کاشتکاری
کیوں محبوب ہے۔ اور کاشتکار خوش نصیب کیوں
ہوا ہے، م.....

ہوگلی، ۹- جولائی ۱۹۲۹ء

مکرمی، آخری خواب پریشاں یہ ہے: "کیا دیکھتا
ہوں کہ مجھے برہنہ گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اور پھانسی کے
لئے پولیس کے ساتھ میں بکتا جا رہا ہوں" دوستو! مجھے
[illegible] تو سمجھو میں اسی کا حقدار تھا، اے اللہ! میں مصیبتوں
سے [illegible] تیری طرف لوٹ رہا ہوں ——— آیا اور
[illegible] جب تختے پر چڑھ گیا تو مجھے اپنی بیوی
[illegible] تھے، بس

نیند ٹوٹ گئی اور گھبرا کر اٹھ بیٹھا +

دوسرا خواب یہ ہے: "میرے بچے کھو گئے ہیں
میں انہیں ڈھونڈ رہا ہوں، وہ ہوگلی سے بہت دور ملے
دونوں کو گلے لگا کر کہہ رہا ہوں "بیٹا! یہی خود سری ہے
اب ہم تینوں آزاد ہیں۔ چلو آزادی کے پورے پورے
مزے لوٹیں" +

رہے تخیلات، نہ پوچھئے۔ بیحد ہیں بے شمار ہیں۔
کبھی موٹے کپڑے پہن کر گوشہ نشین ہو جاتا ہوں اور
کبھی دہقانی کاشتکار ہو کر ہل جوتتا ہوں +

کاشتکاری کا خیال صرف اس وجہ سے رہتا ہے
کہ کاشتکار اوروں کی پروا نہیں کرتا، فقیرانہ زندگی بسر کرتا
ہے ننگے پاؤں پھٹے پرانے کپڑے پہنتا ہے، تاہم وہ
گرہست مانا جاتا ہے، مگر میں کدو کاوش کا محتاج، اور کسی
ایسے محترم آدمی کی مثال بننے پر مجبور ہوں۔ جو اپنے فرائض
بڑی تن دہی سے انجام دے کر بچوں کی پرورش کرتا ہے
یہ سب خیالات بے وقوفی اور طبعی قلت عقل کے
کرشمے ہیں، ——— س....

بہار شریف، ۱۲- جولائی ۱۹۲۹ء

کرمی، گزشتہ خطوط سے بیحد باتوں کا پتہ مل گیا۔ اب
مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے، کہ آپ نے مجھ سے "بیوی
مجھے محبوب ہے" محض غلط بیان کیا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ
آپ کو اس غریب سے کچھ بھی محبت نہیں ہے، قتل ہی
سہی، مگر اس سے قطع تعلق کی آرزو آپ کی دامنگیر
ہے۔ دیکھتے ہیں؟ اپنی بیوی کو مار ڈالنے کے جرم میں
پھانسی کا بھی فیصلہ کر لیا ہے، اور پھانسی پر لٹکتے ہوئے
اس کے جنازہ کو دیکھ رہے ہیں، آپ کو جب [illegible]
تو بہت خوش ہوئے، حالانکہ [illegible] ہو گئے تھے [illegible]

شاہ عبدالرحمن سیوانی

سلیم ندوی

ناظر بریلوی

صرف اس لئے کہ وہ دونوں اب بغیر ماں کی زندگی گزار رہے ہیں
آپ مجبور ہو کے کیوں دلدادہ ہیں؟ صرف اس لئے کہ بیوی
سے علیحدہ ہو جائیں۔ مگر اصلی وجہ فلسفی بننے کی آرزو یا ان کرتے
ہیں کبھی آپ کاشتکار بننا چاہتے ہیں۔ یہ کیوں؟ اس لئے
کہ وہ جس طرح چاہتے ہیں شادی کرتے ہیں۔ طلاق دیتے
ہیں، اور آپ کے مدنظر بھی یہی ہے کہ بیوی سے الگ
ہو جائیں، کیا غلط ہے؟ ۔ م .....

ہوگلی، ۱۴۔ جولائی ۱۹۲۹ء

محترمی! یہ بڑا ستم ڈھایا، میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں
کہ مجھے بیوی سے محبت ہے۔ میرے دل میں اس طرح
کا بدترین خیال کبھی پیدا نہیں ہوا۔ کہ اسے قتل کر ڈالوں۔
میں بلند اخلاق ہوں اور اپنے واجبات سے باخبر، آپ
ہی کے کہنے کو مان لوں، کہ میں بیوی سے کڑھتا ہوں، مگر
اس سے علیحدہ ہو جانے میں بچوں کی خیرخواہی مفقود ہے
وہ اس کے بغیر کیسے جئیں گے۔ میری عقل کھوئی نہیں۔

میرا خیال ہے کہ اس کی توضیح میں آپ سے غلطی ہوئی
اور پھر وہی مسئلہ پیش نظر ہے، میں زندگی بھر بدبختی میں
رہونگا۔ فلسفہ میں خود سے ناآشنا ہو ہو کر عبث قہوہ خانوں
میں وقت برباد ہوگا۔ بہرحال آپ کا ممنون ہوں، اگرچہ
میرا عقدہ حل ہونے سے رہا، س ....

بہار شریف، ۱۷۔ جولائی ۱۹۲۹ء

کرمی، مجھے اعتراف ہے کہ آپ بلند اخلاق اور اپنے
واجبات سے آشنا ہیں۔ اور یہی اصل وجہ ہے، کہ اس
طرح کے جذبات آپ کے سینہ میں موجزن ہیں، میں
اس وقت آپ کا قصہ بیان کرتا ہوں:- سات سال
پہلے آپ خوبرو، نوجوان امنگوں سے بھرپور اور اپنی
[illegible] خوشگوار زندگی کے منتظر تھے، پھر آپ کی مرضی کے
خلاف آپ کے والدین نے اپنی رواسطے سے ایک
لڑکی سے بیاہ دیا، مگر تحت کی رات اپنے مزاج کے
یکسر غیر موافق پایا، یہ خیال بیس ہی سال کی عمر میں آپ کے
دل پر جم گیا تھا، مگر آپ اپنے جنسی جذبات پر غالب نہ آ
سکے جہاں یہ پیچیدگی ہوئی۔

سات سال ہوگئے، مگر بنا کی طرح یہ جذبہ آپ کے
دل میں موجود رہا آپ اپنے واجبات سے آشنا اور اعلیٰ
کے دلدادہ ہیں۔ مگر موجودہ احترام کی کمی کے باعث اس
سے چھٹکارا پانا ہی بہتر سمجھتے اور بھاگ کر کسی خانقاہ میں
پناہ لینا چاہتے ہیں، جہاں اطمینان سے فقیرانہ زندگی بسر
کریں یا کسی دور و دراز دنیا کی طرف جانا چاہتے ہیں،
جہاں کاشتکاروں کی سی زندگی بسر کریں کیونکہ بچوں کے
خیال سے بیوی کو طلاق دینا بھی پسند نہیں کرتے بیشک
آپ نیکوکار باپ اور مخلص شوہر ہیں، جس وجہ سے طلاق
ناگوار ہے۔ اس کے بعد آپ کا خیال بیوی کی موت کی
طرف چلا جاتا ہے، کہ اگر یہ مر جائے تو نہایت آسانی
سے سبکدوشی نصیب ہو۔ مگر وہ مرتی بھی نہیں۔ اس وقت
آپ فکر میں ڈوب جاتے ہیں۔ اور اس کے قتل کا ارادہ
بھی نہیں کرتے، کیونکہ پھانسی کا ہولناک منظر آنکھوں کے
سامنے آجاتا ہے۔

حقیقتاً آپ شریف ہیں، اور یہی شرافت واجبات
سے باخبر ہونے نے تو آپ کو موجودہ بدبختی میں ڈال رکھا
ہے۔ اگر آپ برے ہوتے تو شادی کے بعد بیوی کو طلاق
دی ہوتی۔ اور اس کی پروا آپ کو کچھ نہ ہوتی۔ مگر آپ کی
شرافت نے اس کے عوض کہ نفس کے مقابل میں محبت
ترک کر دیں، ایسے واجب سمجھ پر مجبور کیا۔ کیا اب بھی نہیں
سمجھے کہ آپ کو اپنی بیوی سے محبت نہیں؟ م

مونگیر ۲۰۔جولائی ۱۹۲۹ء

محترمی! میرے خیال میں اب اس کا اعتراف واجب ہوگیا کہ بیوی کی محبت "نفس کا دھوکا تھا، بلکہ صرف ازدواجی حقوق ادا کرنے کو میں اس کے ساتھ رہتا ہوں مگر محبت کا نہ ہونا اس کو بھی نہیں بتاتا ہے، کہ میں اس سے کرتا ہوں +

بہر حال کیا میری قسمت میں یہی ہے کہ قیامت تک اسی طرح زندہ رہوں؟ میری مشکلکشائی نہیں ہوسکتی؟ آہ ــــ! میں آرام کا علم نہیں جانتا۔ ہاں! اپنے سے بے خبر ہو جانے کے وقت کی خبر معلوم نہیں، س۔۔۔۔

بہار شریف ۲۲۔جولائی

مکرمی، اس وقت جب آپ نے اعتراف کرلیا، کہ مجھے بیوی سے محبت نہیں ہے۔ تو یقیناً آپ کا عقدۂ مشکل آسان ہوگیا۔ آپ جانتے ہیں کہ انسان اپنا راز نہیں چھپا سکتا ہے، آپ نے ایک مدت تک چھپانے کی ناحق کوشش کی جس سے آپ کو تکلیفیں پہنچتی رہیں۔ میری رائے ہے کہ اپنی بیوی سے کہہ دیجئے، کہ میں تمہیں پسند نہیں کرتا۔ اور ناراضمندی کے اسباب بھی پوری صراحت سے بتا دیجئے، جب وہ حقیقت حال کا مطالعہ کرے گی، تو یقین ہے کہ عذرخواہ ہوگی، اس کے المدار ہونے کی خبر یہ بیاہ ہوجانے کی حالت بھی کہہ سنائیے۔ جس میں آپ بالکل ناکام رہے۔ نیز تمام گذشتہ واقعات جو شادی کے بعد افسانہ بن کر رہ گئے، ان سے بھی باخبر کردیجئے۔ اس کے بعد درخواست کیجئے کہ مختلف ذرائع سے اپنے میں محبوبیت پیدا کرے۔ مثلاً طبعی خوبصورتی سے شوہر کی دلربا و دلستانہ نہیں تو ناز و سنگار ہی سے سہی۔ رعنائی و دلربائی پیدا کی جائے۔ اچھے کپڑے پہنے۔ پڑھنا لکھنا سیکھے، آپ کو منت کش خادم نہ رکھے، بلکہ خود ناشتہ کھانا قہوہ وغیرہ کا انتظام کر لیا کرے، یقین ہے کہ یہ سب میلان طبع کے باعث ہوں گے۔ کیونکہ ہم سب حیوانوں ہی میں ہیں کھانے پینے ہی پر تو ہماری ساری مسرتوں کا دارومدار ہے؟

میں آپ کی شرافت کے متعلق برابر کہتا جا رہا ہوں مگر اس وقت یہ کہنے کی اجازت دیجئے، کہ آپ کی شرافت کوتاہ ہے۔ کیونکہ آپ صرف عرف و عادت کی نگہداشت کرتے ہیں۔ مگر کچھ آگے بڑھ کر نگہداشت انسانیت کے خواہاں ہیں، نہ ترقی انسانیت کے آرزومند، آپ کو طلاق و فراق سے لوگوں کی ملامتیں ڈراتی ہیں، مگر یہ تو بتلائیے، کہ لوگوں کی ملامت کیا ہے اور اس کی قدر ہی کیا؟ ہمیں لوگوں کی نگہداشت کرنی کیسی؟ +

ہرگز نہیں ــــ میں عرف و عادت کی نگہداشت کے بدلے آپ کو انسانیت کی نگہبانی پر ابھارتا ہوں، کیونکہ اس سے جو شکایت آپ کی ہے، تمام لوگوں کی بھی ہے، یہاں تک کہ متمدن ممالک میں بھی ازدواج کا عقدۂ لاینحل صورت اختیار کئے ہوئے ہے، اور ہمارا کیا پوچھنا؟ ہم ہندوستانی تو عورتوں کی جہالت کے باعث مصیبتوں کے دن کاٹ رہے ہیں سچ کہتا ہوں یہاں عورتوں کی نسائیت غایب کردی جائے، تو زیادہ تر ایسی جاہل عورتوں سے ہماری معاشرت رہے گی جو "گونہ بھیل" کی عورتوں سے بھی جہالت میں کہیں آگے نکل جائیںگی +

آپ کی تحریر سے آثار شرافت نمایاں ہیں، اسمیں شک نہیں بیوی بچوں کے واجبات کی شناخت بیوی سے نفرت کرنے میں مانع ہے مگر آپ پر قوم کا بھی حق واجب ہے۔ کیسی قوم کا؟ جو آپ ہی کی طرح مبتلائے مصائب ہے۔ اگر آپ ادیب ہیں تو میری آرزو ہے کہ

کوئی ایسا افسانہ لکھئے جس میں "تحلیل نفسی" کے علاوہ موجودہ ہندی ازدواجی زندگی کے عیوب پر جس کے پالے آپ پڑچکے ہیں پوری طرح روشنی ڈالی جائے۔ کیونکہ آپ کے وہ جذبات جو سینہ میں موجزن ہیں، اور جن کے باعث دل میں ایک سوز پنہاں ہے، اس کو ظاہر کرنے پر یقیناً مجبور کریں گے۔ جب آپ ایک فصل سے دوسری فصل لکھنا شروع کریں گے تو آپ کی عقدہ کشائی ہوگی۔ اور واقعی آرام و عافیت ملیں گے۔ کیا آپ ایسے موضوع پر قلم فرسائی کرنا پسند کریں گے ——— ؟"

مگر آپ کا "ادب" ادب کشوف" ہونا چاہئے۔ جس سے ناظرین اچھی طرح سچی حقیقتوں کی شناخت کرلیں۔ اس کے لئے فن نامہ نگاری کا مطالعہ لازمی ہے، تاکہ اپنے پوشیدہ دلی جذبات کو ظاہر کرنے کے طریقے معلوم ہوجائیں نیز قدریں اجتماعیہ کی بھی حاجت پڑیگی، مثلاً آپ کی ناپسندیدہ شادی مال و ثروت کے لالچ سے گلے پڑی۔ اب سوال ہے کہ آخر مال و دولت کی تمنا کیوں دامنگیر ہو؟ کیا کسی ایسی منظم اور اجتماعی ہیئت کی ایجاد ناممکن ہے۔ جس کے باعث دل کا غلبہ محبت پر نہ ہوسکے ؟

لیجئے اپنا سوال ساری قوم کا سوال سمجھئے۔ اور اپنے خاص موضوع کا سبق تمام ازدواجی موضوع سے لیجئے، کہ کس طرح طریقۂ ازدواج منظم ہوسکتا ہے، اور کس طرح محبت کی نگہداشت ہوسکتی ہے، نیز کس طرح دو میاں بیوی چین کی زندگی بسر کرسکتے ہیں، یہی سبق آپ کے حزن و ملال کی بیخکنی کریگا، اور یہ بھی سمجھادیگا۔ کہ آپ کی بیوی اس بارہ میں بے گناہ ہے، وہ بیچاری تو ایک پرزہ ہے۔ جس کی حرکت مشین کی حرکت پر موقوف ہے۔ اور اس مشین پر کچھ زور نہیں، م۔۔۔۔

ہوگئی، ۲۲ر جولائی ۱۹۲۹ء

محترمی۔ بے شک آپ نے میرے لئے ایک ایسا دروازہ کھول دیا، جس میں اپنی عافیت کی امید کرتا ہوں بلکہ کچھ کچھ عافیت محسوس بھی ہونے لگی ہے۔ پہلے خیالات کو منتشر چھوڑ دیتا تھا۔ اب بیٹھتا ہوں تو انہیں اچھی طرح ضبط کر کے عام صلاح و بہبود کی طرف نظر ڈالتا ہوں، اور اس کی فکر ہوتی ہے کہ لوگوں کو کس طرح زندگی بسر کرنے اور ازدواج و تناسل کا کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے، خلاصہ یہ کہ میں اپنی بدبختی میں عام بدبختی کا علاج پاتا ہوں ٭

مگر ——— چونکہ آپ صراحت کا مطالبہ کرتے ہیں ——— اب زیادہ تر میرے ذہن میں خوبرویوں اور نازک اداموں کا تصور رہتا ہے۔ جس کے بعد بیوی یاد کر کے تلخ زندگی کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ اب ہمارے خواب بدل گئے ہیں۔ خوبرویوں سے ملتا جلتا ہوں، مگر فتنہ کا خوف دامنگیر رہتا ہے، تو کیا یہی غرض تھی کہ مجھے ایک کشمکش سے نکال کے دوسری میں ڈال دیں ؟

آپ نے ہدایت کی ہے کہ اپنا یا کسی دوسرے کا افسانہ لکھوں، اس کے لئے مستعد ہوں ——، س۔۔۔۔

بہار شریف ۲۶۔ جولائی ۱۹۲۹ء

مکرمی، بڑی خوشی ہوئی، کہ آپ اچھے اچھے خواب دیکھنے لگے۔ اور نئی امیدوں پر جس میں کچھ شک نہ ہو آپ کا نفس سایہ فگن بننے لگا۔ میرا خیال ہے کہ جس سر میں خوبرویوں کا سودا ہوتا ہے، اس میں حسینوں ہی کے جھرمٹ کا تصور بندھا رہتا ہے۔ اور وہ سلیم الحواس بھی ہوتا ہے۔ وہ نہیں دیکھ سکتا، کہ مجھ پر جور و جفا کی جارہی ہے۔ مجھے پھانسی دی جارہی ہے، ہاں! بت! ہوگا تو مجنوں طور مجنوں کہلائیگا۔ آپ طبعاً نفس کی نگہداشت کرتے ہیں، یہ ممکن نہیں

کہ اپنی آبرو کو ناپاک کیجئے، اس لئے میری تمنا ہے، کہ "فنونِ جمیلہ" کی طرف نگاہ ڈالئے یعنی آپ کے لئے ممکن ہے، کہ "جوشِ شباب" اور "نسوانی محبت" سے دو قدم آگے بڑھ کر مصوری، شاعری وغیرہ کی محبت پیدا کریں، یقین ہے کہ اس میں آپ اپنے نفسانی امراض کا بہترین علاج دیکھینگے +

اب کہیں آپ یہ اعتراض نہ کریں کہ "ادب و فنونِ جمیلہ" کی خواہش ابتدا میں تو ہوئی نہیں۔ اس سن و سال میں ہم کیا خاک ہوگی ؟ میں مانتا ہوں، اور میرا ایمان، کہ جو ادیب ہونا چاہے اور "فنونِ جمیلہ" کی محاجس کے سر میں ہو اسے بچپن ہی سے اس کی تعلیم حاصل کرنی چاہئے۔ تاکہ دوسرے جذبات و کشاکش سے الگ تھلگ رہ سکے مگر یقین کریجئے، کہ انسان طبعاً نیکو کار ہوتا ہے۔ آپ لوگوں کی خدمت کر کے سعادت دارین حاصل کر سکتے ہیں۔ یعنی یہ ممکن ہے، کہ "نسوانی محبت" سے بڑھ کے تمام لوگوں کی محبت پیدا کر لیجئے +

آپ اپنی نفسانی قوت کو کراہت کی قوت سمجھتے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ محبت کی قوت ہے، اسے "حبِ الناس" و "فنونِ جمیلہ" اور ادب میں استعمال کیجئے، اگر سب سے پہلے افسانہ قلم بند کیجئے، م۔ ۔۔

ابو یوسف بہاری

پنکھڑیاں

مغرب اور مشرق کے جواہر رقم ادیبوں کی ادبی کاوشوں کا لاجواب مرقع ہے تخیل کی پرواز کے ساتھ پند و موعظت کا گرانمایہ شاہکار ہے۔ فلسفہ۔ جوشِ عمل۔ اخلاق۔ محبت اور قانون فطرت کے متعلق سینکڑوں قیمتی چیزیں لکھی گئی ہیں۔ یہ چیزیں قلم سے نہیں خونِ دل سے لکھی گئی ہیں آپ اس کتاب کو منگوا کر لطف اٹھایئے۔ اسمیں حضرت نظامی فردوسی ایم اے۔ جناب تاثیر۔ جناب چغتائی جناب عبد الشکور ایم اے۔ جناب امیر حسن صاحب نازؔ۔ جناب مولانا عبد المجید صاحب سالک جناب سید امتیاز علی صاحب تاج۔ جناب ایم اسلم۔ جناب پطرس جناب مظفر حسین صاحب شمیم کے علاوہ ہندوستان کی متعدد ادیب خواتین نے مضامین لکھے ہیں۔ حجم ۸۰ صفحات قیمت صرف ۱۰ ار خریدارانِ نیرنگِ خیال سے صرف ۸ر پتہ:۔ منیجر رسالہ نیرنگ خیال۔ بارود خانہ۔ لاہور +

حق بحقدار

(ایک عجیب افسانہ جسے پانچ آدمیوں نے ملکر نیرنگ خیال کیلئے لکھا)

(موسم گرما کی ایک بیقرار شام کو، پھول باغ، کی سیر و تفریح کے ساتھ ساتھ دلچسپی کے موضوعات بھی اسی طرح بدلتے رہے، جس طرح ہوا کے گرم اور سرد جھونکے! بالاخر ہم، پانچوں، باغ کی ایک تکیہ دار بنچ پر بیٹھ کر چمن ادبیات کی خوشہ چینی میں مصروف ہو گئے۔ تبصرہ ہوا۔ تنقید رہی۔ کسی کو سراہا گیا کسی کو ٹھٹھوں میں اڑا دیا گیا۔ اور پھر دفعتہً مجدت طرازیوں پر اُتر آئے۔ چنانچہ وہیں کے وہیں بالاتفاق منظور ہو گیا کہ ایک ایسا طبعزاد افسانہ لکھا جائے جو پانچ ابواب پر مشتمل ہو اور جس کا ہر باب موجودہ احباب میں سے علیحدہ علیحدہ ہر ایک کی دماغی کاوشوں کا مرہون منت ہو۔ پلاٹ بنا۔ اور بذریعہ قرعہ اندازی ابواب تقسیم ہو کر دو دن میں افسانہ تیار کر دیا گیا۔ ۔ ۔)

پہلا باب

شمیم بلہوری کے قلم سے

ریاست نجف گڈھ میں نواب نثار علی خانصاحب کی رفیع الشان کوٹھی ایک اجنبی کے لئے جیسی کچھ باعث دلچسپی ہوسکتی ہے۔ اُس کا اندازہ وہی شخص خوب کرسکتا ہے جس کو ایک مرتبہ اُس کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو۔ اس کا طرز تعمیر عمارت کی خوبصورتی۔ جائے وقوع۔ اور گرد کے دلچسپ مناظر اپنے اندر ایسی دلکشی رکھتے ہیں کہ ہر اجنبی کیلئے جاذب توجہ بن جاتے ہیں +

ماہ مارچ سنہ ۱۹ء کی ایک نزہت بخش صبح کو میں ایک اجنبی کی حیثیت میں سفری لباس پہنے اوسط طبقہ کا آدمی بنا ہوا اس سر بفلک کوٹھی کے سامنے بیرونی زینہ کی ایک سیڑھی پر پاؤں رکھے۔ جوتے کے تسمے باندھ رہا تھا کہ یکایک مجھے اپنے عقب میں کسی راہگیر کی آواز یہ کہتے سنائی دی:-

"خدا کی قسم بعض بات کہنے میں آتی ہے تو کہی جاتی ہے ان امیر آدمیوں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ جتنی مرغی موٹی ہوتی ہے۔ اُسیقدر انڈے کم دیتی ہے۔ ذرا دیکھئے تو۔ برسیں گزر گئیں۔ کوٹھی پر سفیدی ہی نہیں کرائی گئی۔ فرش دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہفتوں سے جھاڑو کا منہ نہیں دیکھا۔ دیواروں پر بارش کے پانی کے نشان اور سیاہی دور سے نظر آتی ہے۔ اگر یہ قصر عالی شان میری ملکیت ہوتا۔ اور میں اسے ایسی ردّی حالت میں چھوڑ دیتا۔ تو واللہ میں فرط غیرت سے کٹ جاتا۔ اور مارے شرم کے میری جان پر بن آتی۔ ۔ ۔"

اس شخص کے الفاظ کا بے تکلپن اور طرز ادا ایسا طنزیہ تھا۔ کہ مجھے بڑا تاؤ آیا۔ میں نے کوٹھی پر ناقدانہ

نگاہ ڈالی تو معلوم ہوا۔ کہ سوائے معمولی صفائی کے اُس میں کوئی ظاہری عیب نظر نہ آتا تھا۔ میں نے معترض کیطرف مُڑ کر دیکھا تو ایک شخص ردّی سی ترکی ٹوپی پہنے سڑک پر نظر آیا۔ میری زبان سے نکلا "میاں خدائی فوجدار صاحب تم نے یہ غور نہیں کیا کہ مالک مکان کے پاس شاید فالتو رقم نہ ہوگی۔ جو وہ کوٹھی پر صرف کرتا۔ اگر فرش صاف نہیں ہے تو تمہیں کیا۔ دیوار پر سیاہی ہے تو بلا سے۔ تم آخر اعتراض کرنے والے کون ؟"

معترض نے مُنہ بنا کر جواب دیا "واہ صاحب واہ۔ ان باتوں سے کیا مطلب۔ اگر مکان بنایا ہے۔ تو سب ہی کرنا پڑیگا۔ آخر رائے عامہ بھی کوئی چیز ہے یا نہیں۔ جو شخص خرابی دیکھیگا۔ ضرور ٹوکیگا"۔

"اچھا۔ یہ بات ہے۔ تو تم نے اپنی ٹوپی کی بھی خبر لی۔ کہنے کو تو ترکی ٹوپی ہے۔ مگر پھُندنا ندارد۔ اسقدر دقیانوسی اور موسم خوردہ کہ رنگ تک نہیں پہچانا جاتا۔ کولھو کے پیندے کی طرح چاروں طرف کیٹ ہی کیٹ۔ تین انچ پسینہ میل اور تیل چڑھا ہوا ہے۔ اور دن بدن اوپر ہی بڑھ رہا ہے ... ارے توبہ۔ اسی کو ٹوپی کہتے ہیں۔ آخر تم نے اسکو کیوں نہیں بدلا۔ ایک نئی کیوں نہیں خرید لیتے"۔

معترض کا منہ سُرخ ہوگیا۔ کہنے لگا "میں اتنا پس انداز ہی نہیں کر سکتا"۔

"نہیں بچا سکتے۔ تو اس سے کیا۔ بہر حال رائے عامہ بھی کوئی چیز ہے۔ جو شخص دیکھے گا تو ضرور کہے گا"۔

"بڑے آئے ٹوپی پہ اعتراض کرنے والے۔ دوسرے کی بات بہت بُری لگتی ہے۔ بڑا خراب اور بدتمیز آدمی معلوم ہوتا ہے"۔

"میں نے کہا کیا۔ اور جواب کیا دیا۔ بیوقوف کہیں کا"۔ معترض صاحب بڑبڑاتے ہوئے چل دیئے۔

میں بھی چلنے والا تھا۔ کہ عقب سے دبے ہوئے قہقہہ کی آواز نے چوکنا کر دیا۔ پیچھے مُڑ کر دیکھا تو ایک ضعیف العمر خادم صاف کپڑے پہنے۔ کاندھے پر تولیا ڈالے دکھائی دیا جو محراب کی آڑ میں کھڑا ہوا تمام باتیں سُن رہا تھا۔ سامنے آتے ہی کہنے لگا "حضور۔ گستاخی معاف ہو۔ میں آپ کو جانتا نہیں لیکن یقین مانیئے۔ اس وقت آپ نے وہ جواب دیا ہے کہ حضرت کے دانت کھٹے کر دیئے۔ دل میں یاد کرتے ہونگے۔ کہ کسی سے پالا پڑا تھا۔ ایسے پاجی کا جواب یونہی دینا چاہیئے۔ واللہ حضور کی باتوں نے طبیعت خوش کر دی۔ بڑا ہی پاجی، بدمعاش اور لفنگا آدمی تھا"۔

"ضرور تھا" میں نے جواب دیا۔ "اور ذرا سا بیوقوف بھی"۔

"جی حضور۔ بیوقوف کی باتوں کا جواب اسی طرح ہونا چاہیئے۔ دیکھئے نا۔ مُنہ کی کھا کر چلتا بنا۔ کیا میں حضور سے یہ سوال کر سکتا ہوں۔ کہ آپ اودھ کے رہنے والے ہیں کیا ؟"

"نہیں۔ میں وہاں کا رہنے والا تو نہیں۔ مگر عرصہ تک لکھنؤ میں قیام ضرور رہا ہے"۔

"مجھ سے غلطی ہوئی۔ بہر حال مجھے حضور کے لب ولہجہ سے کچھ خیال ہوا تھا۔ معزز آدمیوں کا لب ولہجہ اس قدر یکساں ہوتا ہے۔ کہ کہیں بھی چھپائے نہیں چھپتا۔ اگر حضور کو زحمت نہ ہو۔ تو آیئے۔ میں آپ کو محل کی چند نادر تصاویر دکھاؤں۔ غالباً آپ کو تصاویر سے ضرور شوق ہوگا"۔

"خیر۔ شوق تو کیا ہے۔ لیکن عمدہ تصویر دیکھ کر روحانی مسرت ضرور ہوتی ہے"۔

"پھر تو حضور ان کو دیکھکر بہت خوش ہونگے۔ بیوی بیگم صاحبہ کے

آنے میں ذرا دیر ہے۔ اس وقت مکان میں میں اور میری بڑھی بیوی کے علاوہ کوئی ہے بھی نہیں۔ اچھا تو آئیے"۔
یہ دعوت اتنی پُرخلوص تھی کہ میں تیار ہوگیا۔ اور اُس کے پیچھے محل میں داخل ہوا۔ ڈیوڑھی سے گزر کر بڑا کمرہ نظر آیا۔ جس کے سامان کی بے ترتیبی دیکھ کر میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ روش پر گرد و غبار، کمروں میں کڑی کے جالے۔ دروازے بند۔ غرضکہ ہر سمت ماتمی ظلمت کا سماں تھا۔ کچھ دور روش پر چل کر خادم نے ایک کمرہ کا دروازہ کھولا۔ جہاں چوبی اور دیوار میں بنی ہوئی الماریوں میں کتابوں کی موجودگی اس امر کی شاہد تھی کہ یہ کتب خانہ ہے۔ چند میز اور کرسیوں کے علاوہ زیادہ کچھ سامان بھی نہ تھا۔ یہاں پہنچکر ضعیف خادم نے مودبانہ انداز سے میرے شانہ پر ہاتھ رکھ کر دیوار کی سمت اشارہ کیا۔ "دیکھئے حضور، اس تصویر کو ملاحظہ فرمائیے۔ یہ کشمیر کے یکتائے روزگار ماہر فن ماسٹر عبدالصمد سکرو کا نادر شاہکار ہے۔ جس میں دربار اکبری کی جبروتی شان کو دکھایا گیا ہے۔ اس کے پہلو میں دوسری تصویر مانی ہند ماسٹر عبدالغفور بنگلوری کی وہ بے پناہ تصویر ہے۔ جس نے ہند کے ایک گوشے سے دوسرے گوشہ تک اپنی عمدگی کی دھوم مچادی تھی۔ اس پر مرحوم نواب صاحب پچاس ہزار روپیہ خرچ کیا تھا۔ اور تیسری بہزادِ ثانی حاجی رحمت اصفہانی کی وہ معرکتہ الآرا تصویر ہے۔ جس نے شاہ ایران محمد علی قاچار کے والد کو برسوں اپنا گرویدہ رکھا تھا۔ اور اسی کے پاس چوتھی ہمارے مرحوم آقائے نامدار نواب نثار علی خاں صاحب..."
میں فرطِ حیرت سے خاموش تھا۔ ضعیف خادم بڑے اطمینان سے دیوار کی طرف اشارہ کئے تصاویر کی تعریف میں رطب اللساں تھا۔ اور وہاں دیوار کی سفیدی کے علاوہ اللہ کا نام تھا۔ تصویر تو تصویر، تصویر کا سایہ تک نظر نہ آتا تھا۔ میں حیران و ششدر بڈھے خادم کا منہ تک رہا تھا۔ اور دل میں خیال کر رہا تھا۔ کہ یہ شخص کچھ پاگل ہے۔ لہذا اُس کی دل شکنی کیوں کی جائے۔ کہنے لگا "واللہ تصاویر ایسی نادر الوجود ہیں کہ تعریف نہیں ہوسکتی۔ سبحان اللہ بنانے والوں نے اظہارِ کمال کی حد کردی۔ ہر تصویر اپنی نظیر آپ ہے..."
"جی اور کیا۔ حضور دیکھیں... یہ تو خاص طور پر بے مثل ہے"۔ وہ دو تین قدم آگے بڑھ کر کہنے لگا "اس کو دیکھ کر آپ مدت العمر یاد رکھیں گے"۔
ضعیف خادم کے الفاظ کا خلوص اور صداقت آمیز لب و لہجہ ایسا صاف اور دور از تصنع تھا۔ کہ میں بار بار آنکھیں مل مل کر دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ مگر نہ وہاں حاجی رحمت اصفہانی کا شاہکار نظر آتا تھا۔ نہ میاں بنگلوری کے کمال کا نمونہ۔ آخرکار میں نے دل میں فیصلہ کرلیا کہ یہ شخص کچھ مخبوط الحواس ہے۔ اُس نے کسی زمانہ میں ان تصاویر کو دیکھا ہے۔ اُن کا نقش دماغ پر باقی ہے۔ دیوار پر کچھ نہیں،... خادم نے کہا۔
"تو حضور۔ آپ سب تصاویر ملاحظہ فرما چکے۔ یہی اس محل کے نگارخانہ کی زیبائش۔ حضور ان کی عمدگی میں ذرا کلام نہیں۔ خیر محل تو جو پہلے تھا۔ اب وہ بات کہاں مگر تصاویر اب تک اصلی حیثیت میں برقرار ہیں"۔
"بھلا ان تصاویر کی ندرت و عمدگی میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔ مگر تمہاری گفتگو سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب آجکل شاید ریاست میں موجود نہیں"
"آہ۔ حضور۔ نواب نثار علی خاں صاحب کا تو انتقال ہوچکا۔ اب تو یہ اُن کی بہو نورالسراج بیگم کی ملکیت ہے"۔

"نہیں جی۔ مجھے یہاں سب کی زبانی یہی معلوم ہوا۔ کہ یہ نواب صاحب کا ذاتی محل ہے۔۔"

"حضور کو بالکل صحیح معلوم ہوا۔ مگر ولیعہد صاحب نواب وقار علی خاں کی شادی پر یہ بہو بیگم کو عطا کیا گیا تھا۔ اور اس کے علاوہ کچھ جاگیر بھی۔ مگر حالات نے ایسا پلٹا کھایا۔ ۔ ۔ کہ ولیعہد صاحب یہاں سے سلطنت برطانیہ کی امانت کے لئے ریاست کی کچھ فوج کے ساتھ محاذ فرانس پر گئے۔ اور بعد ازاں یہ اطلاع ملی۔ کہ وہ کسی معرکہ میں کام آگئے۔ اس صدمہ نے نواب نثار علی خانصاحب کی زندگی بھی کم کر دی۔ اور وہ بہت جلد رحلت فرما گئے۔"

باتیں کرتے ہوئے وہ دروازے بھی بند کرتا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے کمرہ میں اندھیرا ہو گیا۔ میں نے سوال کیا:۔

"تو کیا ہز ہائنس مرحوم نے اپنی بہو کے۔ لئے۔ رتقہ بالکل نہیں چھوڑا"۔

"حضور۔ نوجوان بیٹے کی اچانک موت کا صدمہ ایسا جانکاہ تھا کہ نواب صاحب کوئی وصیت نامہ بھی نہ لکھ سکے۔ اصل وجہ یہ ہے۔ موجودہ والی ریاست نواب صاحب مرحوم کے رشتہ میں بھتیجے اور مرشد آباد کے رہنے والے ہیں۔ جو محض ولیعہد صاحب مرحوم کی وفات کی وجہ سے وراثتاً ریاست کے مالک ہو گئے ہیں۔"

یہ الفاظ اُس نے بہت آہستہ سے کہے۔

"تو کیا وہ اپنی بیوہ بھاوج کی کوئی امداد نہیں کرتے"

"حضور معاف کیجئیگا۔ مجھے ان قصوں سے کیا سروکار ہے میں تو ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ میں نے فضول خاندانی معاملات بیان کر کے آپ کی سمع خراشی کی۔ میں کبھی ایسا نہیں کرتا۔ مگر سلسلۂ گفتگو نے خدا معلوم بات کہاں سے کہاں پہنچا دی۔ کہ میں اتنا کچھ عرض کر گیا۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں"۔

دوسرا باب

نظر برلیوی کے قلم سے

جیسے ہی کمرہ سے باہر نکلا۔ میں نے ایک کمسن خادمہ کو جو صاف ستھرا لباس پہنے ہوئے برآمدے میں کھڑی تھی اپنی طرف حیرت و استعجاب کے ساتھ گھورتے ہوئے دیکھا۔ میرا رہنما جو دروازہ بند کرنے کو مجھ سے کچھ پیچھے رہ گیا تھا۔ تیزی سے آگے بڑھا اور خادمہ سے کہنے لگا:۔

"میں جناب کو بڑے کمرے کی تصویریں دکھا رہا تھا"

خادمہ جس کے چہرے سے تشویش کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ یہ سُنکر اور متفکر نظر آنے لگی۔ اُس نے میرے رہنما کی طرف ایک خشمناک نظر ڈال کر مجھ سے کہا:۔

"شیخ جی نے یہ نہایت نازیبا حرکت کی ہے۔ اُن کو کوئی حق نہیں تھا کہ جناب کو محل کے اندر کی سیر کرائیں۔ اگر سرکار کو معلوم ہو جائے تو ہم لوگوں پر نہ معلوم کیا عتاب نازل ہو۔ سنیے! وہ دیکھئے صدر دروازے کی گھنٹی بج رہی ہے۔ سرکار کی سواری آگئی۔ خدا کے لئے آپ کہیں چھپ جائیں تاکہ سرکار کی نظروں سے اوجھل رہیں"

میں نہایت عجلت کے ساتھ برآمدے کی سیڑھیوں سے اُتر کر بائیں باغ میں صنوبر کے ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ فواروں کا پانی حوضوں میں۔ اور حوضوں کا پانی آبشاروں کے ذریعہ ایک تختے سے دوسرے تختے میں بہ رہا تھا۔ باغ کی فضا پانی کی ہلکی ہلکی پھوار۔ اور پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو سے معمور ہو رہی تھی صحن چمن جس کا

چپہ چپہ ایامِ دیرینہ کی خوشگوار یادگار کا سرمایہ دار تھا۔ تصورِ ماضی کے دھندلے پردوں کو چیر کر سالہا سال پیشتر کا شباب آفریں منظر آنکھوں کے سامنے پیش کرنے لگا آبشاروں کے شور نے دل کے لئے تخیل کی دنیا از سرِ نو آباد کی اور تختۂ نرگس کی آہو فریب سطح بیتاب تمناؤں کی آماجگاہ بن گئی۔ پھولوں میں کسی شاہدِ رعنا کی جلوہ پاشیاں تھیں۔ اور عنبر بیز نکہت میں اُس کی پُر اسرار سرگوشیاں +

کسی آنے والے کے پاؤں کی آہٹ نے مجھے دفعتاً چونکا دیا۔ خادمہ میرے پاس کھڑی ہوئی مجھ سے کہہ رہی تھی:۔

"آپ نے شیخ جی کو اُن کی غلطی سے آگاہ تو نہیں کر دیا"+

"کیسی غلطی"

"وہی تصویروں کی بابت۔ بیچارے آنکھوں سے معذور ہو گئے ہیں"+

"کیا بصارت جاتی رہی؟"

"جی ہاں۔ ایک سال سے زیادہ عرصہ ہوا جب ریاست کے موجودہ وارث نواب غضنفر علی خاں صاحب نے اس کمرے کی تصویریں اُتروا کر فروخت کر ڈالیں۔ وہ تصویریں جن کو شیخ جی اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھتے اور سب کو نہایت فخر و مباہات کے ساتھ دکھایا کرتے تھے بشکر ہے کہ اس واقعہ سے پیشتر اُن کی بینائی جاتی رہی تھی۔ نہیں تو ان تصویروں کی جدائی اُن پر نہایت شاق گزرتی۔ بیچارے آجتک حقیقت سے بے خبر ہیں اور یہی سمجھتے ہیں کہ تصویریں کمرے میں لگی ہوئی ہیں"+

شیخ جی کے نابینا ہو جانے کا علم ہونے پر میں آج کے واقعات کی تحیر زا ندرت پر غور کر رہا تھا کہ برآمدے سے کسی کے سُبک قدموں کی آہٹ سُنائی دی۔ اور ساتھ ہی کسی حسینہ کی لوچدار اور ترنم ریز آواز زینہ کی طرف سے آئی اور ایک لطیف و نازک تموّج پیدا کر کے فضائے نیلگوں کی پہنائیوں میں ڈوب گئی۔ میرے عالمِ تخیل کا سردہ جو مدت سے محو خواب تھا برق وش تیزی کے ساتھ بیدار ہوا اور فضائے دل پریم کے پُر کیف نغموں سے مست و سرشار ہو گئی۔ وہ شعلۂ حُسن جس نے عرصہ ہوا۔ میرے خرمنِ ہستی کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا اور جس کی جلوہ آرائی کے تصدق سے اب تک میری بزمِ خیال منور تھی اپنی تمام شباب آفرینیوں کے ساتھ کار فرما تھا۔ دل چاہا کہ ایک سچے پرستارِ حسن کی طرح قدموں پر گر کر ہدیۂ نیاز پیش کروں۔ لیکن میری صبر آزما مصلحتوں نے رخصت نہ دی اور میں دل کے اندر اضطراب کی دنیا چھپائے ہوئے وہیں کا وہیں کھڑا رہا قدموں کی آواز زینہ کے بالائی حصہ پر پہنچکر یکایک ختم ہو گئی میں نے خادمہ سے کہا:۔

"آپ کی بیگم صاحبہ کی آواز نہایت سُریلی اور شیریں ہے۔ لیکن پیشانی شکن آلود رہتی ہے"+

"تعجب ہے آپ نے کیسے پہچانا! مزاج غیر معمولی طور پر آج برہم ضرور ہے۔۔۔۔۔ میں آپ کی ذکاوت کی معترف ہوں خصوصاً اس وجہ سے کہ آپ اس حصۂ ملک کے لئے ایک اجنبی کی حیثیت رکھتے ہیں"+

"آپ نے مجھ کو اجنبی کیوں سمجھا"+

"آپ کے لب و لہجہ سے"!

صدر دروازے کی برقی گھنٹی بجی اور چند لمحے کے لئے فضا میں ایک ارتعاش پیدا کر کے خاموش ہو گئی۔ شیخ جی جو بیگم صاحبہ کے پاس اوپر کی منزل پر تھے نیچے آئے اور

اور خادمہ سے کہنے لگے۔

"وہی نواب غضنفر علی خاں ہیں سرکار سے ملاقات کرنے آئے ہیں۔ سرکار بھی ابھی تشریف لاتی ہیں تم کو اوپر طلب فرمایا ہے"۔

"اچھا میں جاتی ہوں۔ تم نواب صاحب کو لاکر ملاقات کے کمرے میں بٹھا دو"۔

واقعات جو میرے محل میں داخل ہونے کا سبب ہوئے اور اُس کے بعد کے حالات جن کے زیر اثر مجھ کو روپوشی اختیار کرنا پڑی اس نوعیت کے تھے کہ میرا محل کے اندر زیادہ ٹھہرنا بالکل غیر متوقع۔ لیکن جس وقت شیخ جی نواب صاحب کی پذیرائی کے لئے صدر دروازے پر گئے۔ میں نے اپنے دل میں ایک عجیب خواہش کا احساس کیا اور فوراً فیصلہ کر لیا کہ جس ڈرامے کے ابتدائی حصے میں اس وقت تک میں اتفاقاً شریک کر لیا گیا تھا اُس کو اختتام تک پہنچا ہوا دیکھوں۔ ارادے نے عملی صورت اختیار کی۔ میں نے ایک جست لگائی اور اُس کھڑکی کے ذریعہ سے جو پائیں باغ میں کھلتی تھی۔ ملاقات کے کمرے میں داخل ہو کر ایک الماری کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔

تیسرا باب

دیوانہ بہ کار خویش ہشیار

یہ کمرہ وسیع اور کشادہ تھا۔ مگر اپنی مستقل اداسی سرد سامانی پر زبان بے زبانی سے کھلے لفظوں میں نوحہ خواں۔ اس کی چہار دیواری کے اندر نور کی بجائے ظلمات۔ اور روشنی کی جگہ ایک دھندلی فضا طاری و ساری تھی۔ میں نے آنکھوں پر ہاتھ پھیرا۔ نظریں گاڑیں۔ تو بمشکل تمام معلوم ہوا کہ ایک طرف کرسی پہ کوئی انسانی وجود زینت فروز ہے۔ میانہ قد۔ دوہرا جسم۔ گندمی رنگ۔ لکھنو تراش کی دوپلی ٹوپی بانکی ادا سے زیب سر۔ کاکلیں بل کھائی ہوئی۔ آنکھوں میں کاجل کی تحریر۔ ہونٹوں پر پان کی دھڑی۔ ایک ہاتھ میں سفید سفید کاغذوں کا بنڈل دبا ہے۔ اور دوسرے کی انگلیاں منہ کو "بایاں" سمجھ کر تھاپ دینے میں مصروف ہیں۔ صورت سے دل کی دھڑکن اور جگر کی بیقراری عیاں ہے۔

ابھی میں اپنی جائے پناہ سے اس طرح چوری چھپے اُن کے حلیہ کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ سامنے والا دروازہ کھلا۔ اور ایک خاتون نقاب پوش۔ متانت و سنجیدگی در آغوش۔ بہزار ستان و شکوہ داخل ہوئیں۔ میں فوراً اوٹ میں ہو گیا۔ میرے خیال میں جابین میں انتہائی دکھے پن اور بیرُخی کے ساتھ کچھ رسمی طور پر علیک سلیک ہوئی جو با وجود لمرشکے سکونِ مطلق کے سماعت پذیر نہ ہو سکی۔ مگر اب میں نے ہمہ تن گوش ہو کر سنا۔ وہ فرما رہے تھے۔ "بیگم صاحبہ! میں حسب ارشاد حاضر ہوا ہوں۔ بلکہ سر میں آپ کی خدمت کا سودا بھی لئے ہوئے حالانکہ میرے خیال میں یہ ہزار درجہ بہتر تھا کہ فریقین برضا و رغبت معاملات اپنے اپنے وکلاء کے سپرد کر دیتے"۔

"بیشک امناسب تو یہی تھا"۔

"جی ہاں مجھے کامل یقین تھا کہ آپ میری تجاویز اور ارادوں سے ناواقف نہیں"۔

"میں ——— اچھی طرح واقف ہوں۔ بلکہ خوب اچھی طرح جانتی ہوں نواب صاحب اگر آپ نے یہ تجویز کیوں پسند فرمائی ہے ——— اور یہ تو قدرتی بات تھی کہ آپ کو میرے منہ در منہ اپنے شرائط پیش کرنے میں

شرم دامنگیر ہوتی"۔

"آپ یہ کیا فرماتی ہیں بیگم صاحبہ! ان باتوں سے معاملہ کو الجھانا مقصود ہو تو دوسری بات ہے۔ ورنہ میں تو غیر جانبدارانہ طور پر فریقین کے حقوق کی نگہداشت کرتے ہوئے سودا طے کرنے آیا ہوں"۔

"کونسا سودا؟ ۔جی جی! بلکہ یوں نہ کہئے کہ آپ میری معصومیت اور کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے تشریف لائے ہیں"۔

"پھر وہی الجھن کی باتیں! میں بے تکلف عرض کرتا ہوں کہ میری تجویز اگر آپ برادر مرتبہ مناسب سمجھیں تو قبول فرمائیں۔ ورنہ صاف انکار کردیں۔ میں اس مکان کا کرایہ مبلغ تین ہزار روپیہ سالانہ دینے کے لئے تیار ہوں۔ یہ آپ کے مصرف اور ضروریات کے خلاف بہت زیادہ وسیع ہے اور اس کا رکھ رکھاؤ آپ کی آمدنی کے مقابلہ میں نہایت گراں۔ اور پھر ان باتوں کے علاوہ مجازاً اس کو کرایہ پر اٹھانے کا حق بھی حاصل نہیں ——— بہرحال یہ بیانمند جو جناب کو اس شرط کی پابندیوں سے آزاد کرنے پر آمادہ ہے تین ہزار سالانہ کی رقم پیش کرتا ہے۔ اب فرمائیے کہ اس سے بڑھ کر اور کیا کوئی واجبی ۔ ۔ ۔"

"بڑھ کر؟ ——— واجبی؟ ——— نواب صاحب آپ ہی ایک مکین کرایہ دار ہیں اور خود جو چاہے کرایہ تجویز کرنے پر قادر۔ اس کو کون مناسب سودا کہہ سکتا ہے۔ ویسے مکان تو پندرہ ہزار سالانہ پر اٹھنے کی حیثیت سے کسی طرح کم نہیں"۔

"ممکن تھا! بشرطیکہ عام طور پر اس کو کرایہ پر اٹھانے کا آپ کو حق حاصل ہوتا اور ہر شخص کو آزادانہ گفت و شنید کی گنجائش! ——— مگر آپ جانتی ہیں کہ ان حقوق سے آپ محروم ہیں"۔

"اور آپ اپنی اتنی تو سوچئے۔ لاکھ سالانہ کی آمدنی کے باوجود ——— جو ایمان کی پوچھئے تو اس وقت اگر میرے جنت مکانی زندہ ہوتے تو ان ہی کی میری ملک ہوتے۔ اور باوجود اس کے کہ آپ اپنی نادار و مفلسی پر ایسی بڑی بڑی باتیں بناتے وقت آپ نے۔ مجھے میرے موروثی مکان کا کرایہ پیش کرتے ہوئے صرف تین ہزار سالانہ کی حقیر رقم پیش کی ہے ——— افسوس ہے بلاتیز کا غلام ہے نواب صاحب ——— واللہ شرم کا"۔

"بیگم صاحبہ۔ اس کو بیجا اشتعال سمجھئے۔ قانون پھر قانون ہے جس حصول حقوق کے علاوہ آپ سے اور کچھ مطالبہ نہیں کرتا۔ اور کچھ بعید نہ کہ اس میں ایک ایسا بھی ہے جس کو میں آپ پر قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔ بہرحال میں کرایہ کی رقم عرض کرچکا"۔

"اور فرض کیجئے کہ میں اس کو قبول کرنے سے انکار کردوں اور مکان کسی دوسرے کو کرایہ پر دیدوں تو کیا ممکن ہے کہ آپ اس پابندی کو مجھ پر عائد کرنے سے گریز کر جائیں"۔

"آپ امتحان کیجئے؟ ——— اتنی ہمت کرکے دیکھ لیجئے"۔

"کاش اس وقت میرے وارث زندہ ہوتے ۔ ۔"

"زندہ مردوں کا کیا ذکر انہی کے نہ ہونے سے تو یہ صورت پیدا ہوگئی ہے ——— اچھا بیگم صاحبہ میں باادب درخواست کرونگا کہ معاملہ کو بس زیادہ طول نہ دیجئے آپ کو میری شرائط منظور ہیں؟ ——— ہاں یا نہیں! صاف صاف جواب دیکر قصہ پاک کیجئے ——— مگر لٹنا ہے تو جلد"۔

بیگم چند لمحوں کے لئے بالکل خاموش ہوگئیں۔ مگر دفعتہً پہلو بدل کر مردانہ ہمت سے کہنے لگیں "اچھا مجھے منظور

ہے ——— منظور ہے اور بجز اس کے چارہ کار ہی کیا
ہے"؟

"جزاک اللہ! مجھے واقعی بہت مسرت ہوئی کہ آپنے
دانشمندی سے کام لے کر مناسب فیصلہ فرمایا۔ میں اس
خوشی میں رقم تجوزہ کو دو چند کرکے قصہ ختم کرتا ہوں"۔

"توبہ کیجئے۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ آپ نے ایک تجویز
پیش کی۔ میں نے اس کو بخوشی یا بمجبوری منظور کر لیا۔ اب نہ
تو آپ کو اس میں کسی ترمیم کا حق حاصل ہے اور نہ مجھے
کوئی بخشش یا رعایت گوارا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ کاغذات
اپنے ہمراہ لیتے آئیگے۔ اگر آپ لائے ہوں تو بسم اللہ۔
لائیے میں دستخط کردوں۔ میرے ملازم بطور گواہ اپنے
دستخط کر دینگے"۔

"مسودہ تو اپنے ساتھ لایا ہوں۔ غالباً دستاویز نویس
یہاں موجود ہوگا۔ میں اس سے بتاکید گیارہ بجے تک پہنچ
جانے کے لئے کہہ آیا تھا"۔

"کم از کم مجھے تو اس کی موجودگی کی خبر نہیں۔ دیکھئے دریافت
کراتی ہوں۔ (منہ پھیر کر) کوئی ہے؟"

"حاضر سرکار"

"کوئی اور صاحب تشریف رکھتے ہیں؟"

"قربان جاؤں سرکار۔ اور تو کوئی نہیں ہے"۔

"عجب نامعقول آدمی ہے۔ ابھی تک نہیں آیا۔
مگر میرے پاس اقرار نامہ کا مسودہ موجود ہے۔ مختصر سی
عبارت ہے۔ اگر بار خاطر نہ ہو تو میں خود ہی اشامپ پر
خانہ پُری کرتا ہوں۔ دس پندرہ منٹ کی دیر ہوگی"۔

"آپ کی خوشی۔ قلم دوات وہ سامنے میز پر موجود ہے
اس کی تکمیل کے بعد آپ مجھے مطلع فرما سکتے ہیں میں حاضر
ہو کر ضروری دستخط وغیرہ کر دوں گی"۔

"شکریہ! آپ کو بڑی زحمت ہوگی"۔

بیگم صاحبہ کے چلے جانے کے بعد نواب صاحب کی
باچھیں کھل گئیں۔ اپنے جوش مسرت کی روک تھام کی
بے سود کوشش میں اُن کی زبان سے کھلے الفاظ میں
نکل گیا: "شیطان کے حوالے قطامہ! دیکھ تو تیرے
غرور کا سر کیسا نیچا کرتا ہوں۔ رسی جل جائے گر بل نہ جائے!
اب بھی وہی اینٹھ کی باتیں ہیں۔ اور وہی مغرورانہ انداز
——— لیکن اس سلسلہ میں مجھے بارہ ہزار سالانہ
کی بچت ہوئی۔ اس لئے آپ شکریہ کی مستحق ضرور ہیں"۔

اس طرح کبھی تو دستاویز نویس کی غیر حاضری پر
جھنجھلا کر ——— اور کبھی اپنی فتح و کامرانی پر بغلیں بجا کر بڑے
بانکے نواب غضنفر علی صاحب نے باطمینان تمام دستاویز
کے صفحات پر خامہ فرسائیاں شروع کر دیں۔

چوتھا باب

تسلیم ندوروی کے قلم سے

میں الماری کی اوٹ میں چھپا تمام معاملات کو
خاموشی سے سن رہا تھا۔ دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ میری
نگاہوں کے سامنے پھر گیا۔ آہ! فانی انسان چند دن
کی زندگی پر کس قدر نازاں اور آپے سے باہر ہو جاتا ہے
وہ یہ خیال نہیں کرتا کہ بہت ممکن ہے آنے والی سانس
حیات مستعار کی آخری سانس ہو۔ اور اس کے بعد پھر
اُسے کبھی دنیا کی لذات، اس کی دلچسپیاں، یہاں کی شان
شکوہ اور امارت سے تاحشر دوچار ہونا نصیب نہ ہو سکے
یہی بہو بیگم صاحبہ جن کے ایک ادنیٰ اشارہ پر ابھی چند
سال پیشتر امیر و غریب، آقا و غلام ہر ایک سر نیاز خم کرتا

اور حکم بجالانا اپنے لئے کونین کی دولت سے بڑھکر تصور کرتا تھا۔ آج خود ایک مفلس قلاش موجودہ نواب کی تعمیل ارشاد کے لئے جس کو قسمت نے زبردستی اُسی کی جائداد کا وارث بنا دیا تھا مجبور محض نظر آ رہی تھی ❖

یہ واقعات کچھ اس طرح مجھ پر اثر انداز ہو رہے تھے کہ میں اپنی کمینگاہ سے نکلکر جلد از جلد خود کچھ عملی کام کرنا چاہتا تھا۔ بیوی بیگم صاحبہ بالاخانہ پر جا چکی تھیں۔ نواب صاحب لکھنے میں ہمہ تن مستغرق تھے میں نے خیال کیا کہ اگر کسی طرح دستاویز نویس کی حیثیت سے کمرہ میں پہنچ جاؤں تو بس کام بن جائے۔ ابھی اسی اُدھیڑ بن میں تھا کہ سڑک پر کسی گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ میں نے موقع کو غنیمت سمجھا۔ اور معاً اسی آواز کے ساتھ اوٹ سے نکل کر کمرہ میں پہنچ گیا۔ نواب صاحب کچھ اس طرح لکھنے میں مصروف تھے کہ اُنہیں میری موجودگی کا قطعی علم نہیں ہوا۔ میں چاہتا تھا کہ آگے بڑھ کر ایک فرشی آداب بجالاؤں کہ میرے ذہن میں ایک نئی ترکیب آئی۔ میں دبے پاؤں دروازہ کی طرف بڑھا۔ اور اُس کو کھولتے ہوئے ذرا کھانس کر تاکہ نواب صاحب خود بخود میری طرف مخاطب ہو جائیں۔ کہنے لگا:۔

"حضور! فدوی حاضر ہے" ❖

میری آواز نے بجلی کا سا کام کیا۔ ایک عجیب تحیّر خیز تعجیل کے ساتھ نواب صاحب مڑ لے اور مجھ کو کمرے میں دیکھکر کچھ سراسیمہ سے ہو گئے۔ چہرہ فرطِ حیرت سے متغیر ہو گیا۔ بالآخر کسیقدر طیش میں آکر فرمایا:۔

"آپ کون صاحب ہیں؟"

"حضور نے مسٹر نسیم بیرسٹر سے فرمایا تھا کہ ایک دستاویز نویس ٹھیک گیارہ بجے 'عشرت محل' پر حاضر ہو جائے۔ مجھے انتہائی افسوس ہے کہ چند خاص مجبوریوں کے باعث تعمیل ارشاد میں چند منٹ کا توقف ہو گیا"

"آخاہ! آپ دستاویز نویس صاحب ہیں؟ بخدا آپ کے چہرہ سے تو دستاویز نویس ہونا پایا نہیں جاتا"

"اللہ حضور کا سایہ قایم رکھے۔ سب آپ ہی کی جوتیوں کا طفیل ہے" ❖

"اچھا، اچھا، آئیے، تشریف لائیے۔ آپ کی آمد سے بھی فائدہ ہی کہ دستاویز آپ کے روبرو مکمل ہو گئی۔ نصف تو کر چکا ہوں۔ نصف آپ کر لیجئے" ❖

تعمیل ارشاد میں میں نے کرسی آگے سرکائی اور لکھنے میں مشغول ہو گیا۔ نواب صاحب کو ایک پل قرار نہیں تھا۔ سیماب وش اِدھر اُدھر کمرہ میں ٹہل رہے تھے کبھی کھڑکی کے پاس جاتے کبھی الماری کا قفل کھڑکھڑاتے اور کبھی میرے قریب سے گزر جاتے ❖

ابھی بمشکل پانچ منٹ لکھنے میں صرف ہوئے ہونگے کہ نواب صاحب میری پشت کی جانب آکر کھڑے ہو گئے اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کسیقدر متعجبانہ لہجہ میں بولے:۔

"اُف مجھے دھوکا تو نہیں ہوتا۔ مگر نہیں، واللہ! میں نے تمہاری تحریر ضرور کہیں دیکھی ہے۔ میری نگاہیں بخوبی اس سے آشنا معلوم ہوتی ہیں۔ مگر کب، اور کہاں؟ (ذرا سوچ کر) افسوس کمبخت دماغ کچھ کام نہیں دیتا"

"غالباً خاندانی کاغذات میں حضور کو اتفاق ہوا ہوگا خلد آشیاں نواب، نثار علی صاحب مرحوم کے وقت میں بارہا یہ خاکسار بھی کاغذات مرتب کرنے کے لئے حاضر ہوا ہے" ❖

"کیا واقعی تم کو مرحوم سے نیاز حاصل تھا"

"جی حضور۔ بھلا خادم غلط عرض کر سکتا ہے یقین نہ

عجیب اتفاق ہے۔ اسی کمرہ میں اور اسی جگہ یہ خاکسار تو لکھنے میں مشغول تھا اور جنت مکان نواب نثار علی صاحب مرحوم دستاویز کا مضمون ٹہل ٹہل کر بولتے جاتے تھے"۔

میری اس گفتگو سے نواب صاحب کو کافی دلچسپی پیدا ہوگئی تھی۔ تھوڑی دیر تک کسی خیال میں محو خموش کھڑے رہے۔ پھر کسیقدر لاپروائی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا۔

"واقعی عجیب مشابہت ہے! کیا میں دریافت کرسکتا ہوں کہ اُس وقت تمہاری طلبی کا کیا مفہوم تھا"؟

"کیوں نہیں، سرکار کو سب کچھ اختیار ہے۔ اور پھر حضور سے پردہ ہی کیا۔ لیجئے میں خود ہی عرض کئے دیتا ہوں، اُس وقت اُس خاکسار کی طلبی محض ایک وصیت نامہ مرتب کرنے کے لئے ہوئی تھی"۔

وصیت نامہ کا لفظ سنتے ہی نواب صاحب کی ساری شوخیاں ماند پڑگئیں۔ چہرہ اُتر گیا۔ لبوں سے ایک آہ سرد نکل گئی۔ تاہم استقلال و سنجیدگی میں لغزش نہ ہوئی میں برابر لکھنے میں مشغول رہا اور جلد ہی دستاویز مکمل کرکے نواب صاحب کے ملاحظہ کے لئے پیش کردی۔

نواب صاحب دستاویز کو پڑھتے اور زیر لب گنگناتے جاتے تھے۔ میں پس پشت مؤدب کھڑا رہا۔ جب دیکھا کہ نواب صاحب ہمہ تن پڑھنے میں مستغرق ہوگئے ہیں۔ دبے پاؤں تجوری کی طرف سرکا۔ پہلے تو کچھ جھجک ہوئی۔ لیکن جلد ہی سکون قایم کرکے قدرے بلند آواز سے کہنے لگا:۔

"ملاحظہ ہو حضور، خلد آشیاں نواب نثار علی صاحب مرحوم اپنے خفیہ کاغذات اسی جگہ رکھا کرتے تھے"۔

نواب صاحب نے خشمگیں نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ آنکھیں خون ہوگئیں۔ چہرہ تمتما اُٹھا۔ اور پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ بالآخر قلم انگلیوں میں دابے طیش میں اُٹھ کر میری طرف بڑھے اور فرمانے لگے:۔

"غضب خدا کا آخر تم وہاں کیا کر رہے ہو؟ تم کو کیسے معلوم ہوا ——؟"

"اے حضور، یہ خاکسار تو پہلے ہی عرض کرچکا ہے کہ آنجہانی نواب صاحب مرحوم ضروری کاغذات مرتب کرنے کی خدمت اسی فدوی سے لیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی اتفاق ہوا اس خاکسار نے بچشم خود خلد آشیانی کو کاغذات اسی تجوری میں رکھتے دیکھا ہے۔ رفع استعجاب کے لئے حضور والا خود ملاحظہ فرمالیں۔ دیکھئے کھٹکا یہاں سے کھلتا ہے۔ اس بٹن کو دبائیے"۔

"بس رہنے دیجئے" نواب صاحب نے اور زیادہ غضبناک ہوکر فرمایا۔ لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ تیر از کمان رفتہ کا معاملہ تھا۔ بٹن کے دبتے ہی تجوری کا پٹ کھل چکا تھا۔ ایک بڑا لفافہ سربمہر اوپر ہی رکھا تھا۔ میں نے اُس کو اُٹھاتے ہوئے نواب صاحب سے مخاطب ہوکر عرض کیا:۔

"حضور والا! ملاحظہ فرمائیے۔ کچھ کاغذات یہاں موجود ہیں —— غالباً وصیت نامہ —— !"

ابھی پورا جملہ بھی میری زبان سے ادا نہیں ہوا تھا کہ نواب صاحب کے چہرہ کا رنگ متغیر ہونے لگا۔ کہاں تو وہ غصہ، وہ طیش، اور کہاں وصیت نامہ کا لفظ سننے اور لفافہ پر نظر پڑتے ہی تمام نشہ ہرن ہوگیا۔ غصہ تو جیسے کبھی آیا ہی نہ تھا۔ تیزی سے ہاتھ لپکا کر فرمانے لگے "کیا وصیت نامہ" لیکن خدا معلوم کونسا ایسا ہوّا اس لفافہ میں بند تھا کہ جناب کا دست مبارک مانند بید لرز رہا تھا۔ بدقت تمام لفافہ کو لیا۔ اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور فرمانے لگے:۔

درحقیقت معلوم تو وصیت نامہ ہی ہوتا ہے! اگر واقعی ایسا ہے تو پھر اس کا پڑھا جانا لازمی ہے۔ اور چونکہ میں ہی مرحوم نواب صاحب کا ایک جائز وارث ہوں لہذا اس کو جلد از جلد پڑھنا میرا اولین فرض ہے"۔

دینے کو تو لفافہ میں نے دے دیا لیکن اب ڈر تھا کہ کہیں اس کو جیب میں رکھ کر نواب صاحب فوراً بیک بینی و دوگوش مجھے یہاں سے نکل جانے کا حکم نہ صادر فرما دیں میں ابھی اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ وہیں کھڑکی کے پاس کھڑے کھڑے ہمارے نواب نے لفافہ کو چاک کر دیا۔

"یہ تمہاری تحریر تو نہیں ہے؟" بے ساختہ نواب صاحب کی زبان سے نکلا۔ اور عجیب مشکوک و خوفزدہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے۔

"حضور کو سہو ہوا۔ اس خاکسار نے یہ عرض کیا تھا کہ ایک وصیت نامہ جنت مکان نواب صاحب مرحوم کی ہدایات کے مطابق اس نے مرتب کیا تھا۔ عرض کرنے کا یہ مقصد تھوڑے ہی تھا کہ وہ یہی ہے۔ اور پھر حضور ہی خیال فرمائیں کہ بغیر دیکھے یہ کیونکر کہا جا سکتا تھا کہ یہ وہی ہے جو اس خاکسار نے تحریر کیا تھا؟"

بتعجیل ممکن نواب صاحب نے کاغذ نکال کر برابر کیا اور ایک ایک لفظ کو بغور پڑھنے لگے۔ آخری جملہ پر پہنچ کر چہرہ کا رنگ فق ہو گیا۔ بشرہ سے پریشانی کا اظہار ہونے لگا کچھ دیر محویت کے بعد فرمانے لگے:۔

"کیا تم اس کے مضمون سے واقف ہو؟ میرا خیال ہے کہ تم کو ضرور علم ہوگا"۔

"نہیں حضور! اس خاکسار کو قطعی علم نہیں ہے"۔

"آہ! اس وصیت نامہ کا غیر منصفانہ مضمون کچھ سمجھ میں نہیں آتا تیس لاکھ سالانہ کی رقم ایک عورت کے لئے! جو شادی کے وقت ایک حبہ کی بھی مالک نہ تھی اور اسی پر بس نہیں۔ بیس لاکھ مزید رقم کا اضافہ اُسکی تا حین حیات۔ نہ معلوم اس لکھنے کا کیا مفہوم ہے۔ عجیب معمہ ہے۔ اسقدر گرانقدر رقم ——— اتنی کثیر و نا معقول آمدنی ——— ایک بیوہ عورت کے لئے؟ اور وہ بھی کس کی جیب سے؟ میری ——— خاص میری جیب سے۔ گویا میری ریاست کا ایک بڑا جزو۔ معاذ اللہ کسقدر برباد کن مضمون ہے۔ اب اس صورت میں کیونکر زر باقیماندہ میں چالیس لاکھ سے شان ریاست کو برقرار رکھ سکوں گا۔ کاش مجھے کوئی سمجھا سکتا!"

میں اب تک خاموش کھڑا نواب صاحب کے حالات پر غور کر رہا تھا۔ عجیب عبرت انگیز منظر تھا۔ کبھی کمرہ پر نظریں پڑتیں۔ اور کبھی نواب صاحب کے چہرہ پر۔ افسوس! اس دنیا کے انقلابات کتنے عجیب و حیرت خیز ہیں۔ رنج و راحت کی تبدیلیاں کبھی سرعت برق کی رفتار سے عمل پیرا ہوتی ہیں۔ اور کبھی اسقدر آہستہ کہ کسی کو ان کا علم تک نہیں ہوتا۔ یہی کمرہ جہاں چند سال پیشتر اثر آفریں نغمۂ موسیقی اپنی سحر آگیں فسوں ریزیوں سے پژمردہ دلوں کو دعوت مسرت دیا کرتا تھا۔ جس کی فضائے نکہت بیز عطر میں ڈوبی ہوئی مشام جاں پر مروحہ جنبانی کیا کرتی تھی آج کس مپرسی کی حالت میں اپنے مکیں کے لئے بھی باعث رنج و محن ہو رہا تھا۔ نواب صاحب کی نگاہوں سے امید و بیم، حرمان و آرزو کا مشترکہ جذبہ عیاں تھا۔ میں نے تشفی بخش لہجہ میں کہنا شروع کیا:۔

"حضور کا اقبال بلند ہو۔ جس اللہ نے حضور کو یہ مرتبہ دیا وہی ترقی بھی دیگا۔ یہ تشویش کیسی۔ اگر پچاس لاکھ کی رقم بہو بیگم صاحبہ کے لئے وصیت نامہ میں لکھی ہے۔ رہتے

دیکھئے۔ بقیہ کل جائداد پر تو حضور ہی قابض و متصرف ہونگے
جہاں تک اس خاکسار کو خیال ہے۔ خلد آشیانی کی جائداد
کا اندازہ پانچ کروڑ کا تھا"۔
"تم بکتے ہو! ذرا ان شرائط کو دیکھئے تو قدر عافیت
معلوم ہو۔ پچاس لاکھ کی رقم کا ایسی منضبط شرائط کیساتھ
نکل جانا۔ کیا صبر آزما نہیں ہے؟ اسی کو اقبال کہتے ہیں!
خوش نصیبی کے یہی لچھن ہیں؛ لاحول ولا قوۃ الا باللہ!
دیکھئے تو سہی، محض ایک خشک خطاب۔ اور تیس لاکھ کی رقم
میرے لئے رہ جاتی ہے۔ اب تم ہی بتاؤ اس کو کیا کروں؟
اوڑھوں یا بچھاؤں یا ریاست پر صرف کروں"؟
عجیب طرح کے وحشت خیز و دردناک تخیلات نواب
صاحب کے ذہن میں پیدا ہو رہے تھے۔ دونوں مٹھیاں
کسی ہوئی تھیں۔ چہرہ پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا
بالآخر میں نے دبی زبان سے دریافت کیا:-
"حضور والا، گواہ کون لوگ ہونگے"؟
"اجی یہی بڈھا خادم"
"کون، نابینا شیخ جی؟"
"جی ہاں! کافی ہے (قدرے بلند آواز سے) کوئی ہے؟"
"حاضر حضور"!

پانچواں باب

شاہ عبدالرحمٰن سیوانی کے قلم سے

کامل ایک منٹ تک سکوت طاری رہا۔ نواب صاحب
وصیت نامہ پر جھکے ہوئے اپنی نامراد آرزوؤں اور تمناؤں کا
بھیانک نقشہ کھنچی ہوئی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ میں
اُن کی پشت پر کھڑا اپنے مچلتے ہوئے جذبات اور بھڑکتے
ہوئے ہیجان قلبی کو سنبھال رہا تھا۔ میرے دل کی گہرائیوں
سے یہ صدا آ رہی تھی کہ اس وقت تمہارے سامنے وہ ہستی
ہے جو خود غرضی اور بوالہوسی کا بدترین نمونہ ہے۔ آخر نواب
نے سکوت توڑا۔
"تم چاہتے کیا ہو؟"
"حضور میں کیا عرض کروں مفلسی بھی بُری ہوتی ہے"
"بیشک۔ بیشک۔ بفرض محال اگر اس منحوس پرزۂ
کاغذ پر عمل درآمد ہوا۔ اور ہونا ناگزیر ہے۔ تو میں بھی مفلس
ہو جاؤں گا۔ اتنی بڑی ریاست بات کی بات میں میرے
ہاتھ سے نکل جائیگی۔ اور کل جائداد کی وارث بہو بیگم صاحبہ
بن بیٹھینگی۔ لیکن ایک بار بہو بیگم کو یہاں آکر دم لونگا۔ صرف
چوبیس گھنٹے کا التواء اُن کی ساری شان کو میٹ دینے
کے لئے کافی ہے"۔
میں اُن کی شرمسار اور نیچی نگاہوں پر نظر جمائے
کھڑا تھا۔ جو کبھی تو اقرار نامہ پر گڑ جاتیں۔ اور کبھی وصیت نامہ
پر ٹھہر جاتی تھیں۔ اس وقت میرا دماغ اُن کے احساسات
اور جذبات کی صحیح ترجمانی اور عکاسی کر رہا تھا۔ چوبیس گھنٹے
کا التواء اس ناپاک طینت شخص کے لئے یقینی معنی خیز تھا
وصیت نامہ کا فیصلہ مستحکم اور اٹل تھا۔ اس کا کالعدم کر دینا
اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ مگر فطری شر اور جبلی بدی اُنکو
مجبور کر رہی تھی کہ وہ ایسی چال چلیں جن سے اُن کے غیر
منفعل ضمیر کو بظاہر ندامت نہ ہو۔ ریاست تو ہاتھ سے جا
رہی تھی۔ محل پر تسلط کا جن سوار ہوا۔ اگر بہو بیگم کو وصیت نامے
کا علم ہو جاتا۔ تو وہ اپنا رفیع الشان محل نواب صاحب کو کرایہ
پر کیوں دیتیں؟
"حضور میں کچھ کچھ سمجھ گیا"!
"بیشک اس عجیب و غریب دریافت کے یقینی تم

انعام کے مستحق ہو۔ میں بہو بیگم سے تمہاری کارگزاری کا ضرور ذکر کرونگا۔ وہ تم کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیں گی۔ خاطر جمع رکھو"۔

"تو یہ نہیں ہو سکتا۔ اس خدمت کو میں خود بھی بوجہ احسن انجام دے سکتا ہوں۔ حضور کی تکلیف کی ضرورت ہی کیا ہے"۔

"میرے قول اور وعدے کا پاس بیگم صاحبہ ضرور کرینگی"

"چہ خوش! بیگم صاحبہ کی نظروں میں آپ کے قول و قرار کی کیا وقعت؟"

"بس خاموش! بڑے بدتمیز معلوم ہوتے ہو.... اچھا پھر کیا چاہتے ہو؟"

"صرف دو ہزار نقد"۔

"دو ہزار کی گرانقدر رقم۔ اور صرف ایک دن کے التوا کے لئے۔ جس میں کسی کا کوئی ہرج نہیں!"

"یہ استغناء بہو بیگم صاحبہ۔ نواب صاحب! اس عظیم الشان محل کا کرایہ مبلغ پندرہ ہزار روپیہ سالانہ سے کسی طرح کم نہیں ہو سکتا۔ یہ ماننے کی بات نہیں۔ کہ بیگم صاحبہ اس کو بخوشی صرف تین ہزار روپیہ پر آپ کو دینگی۔ المختصر ایک طرف تو یہ یکتائے روزگار عالی شان قصر ہے اور دوسری طرف صرف دو ہزار روپیہ کی حقیر سی رقم ان دونوں میں جو پسند خاطر ہو"۔

"گستاخ!.... نامعقول....!"

"چالاک.... غاصب....!"

غیر ارادی طور پر یہ کلمات میرے منہ سے نکل تو گئے مگر معاً خیال آیا۔ کہ نواب صاحب جامہ سے باہر ہو جائیں گے اور یہ سارا کھیل بگڑ جائیگا۔ لیکن شاید میرے لب و لہجہ میں مقابلہ اور دھمکی کے ساتھ ساتھ آمرانہ انداز بھی تھا۔ کیونکہ ان کے بشرے پر شکن تک نہ پڑی۔ بلکہ مجھ کو نہایت متین اور سنجیدہ نگاہوں سے گھورنے لگے۔

"ہاں تو تم مسٹر نسیم کے مختار ہو؟ اچھا یہ تو بتاؤ۔ کہ جب تم اس خفیہ تجوری سے واقف تھے۔ تو نواب صاحب کے انتقال کے بعد ہی فوراً تم نے یہ راز کیوں نہیں بتایا؟"

"نواب نثار علی خاں آنجہانی کے بعد میں نے کبھی اس محل میں قدم نہیں رکھا۔ اور جب کاغذات اور دستاویزات کی دیکھ بھال کی گئی تو وکلا نے مجھ کو طلب نہیں کیا"۔

میرے اس جواب سے نواب صاحب کو اطمینان سا ہو گیا۔ انہوں نے جیب سے کیمخت کا ایک زرنگار بٹوہ نکالا۔ اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے کرنسی نوٹ میز پر پھیلا دیئے۔

"یہ لو تمہاری مجوزہ رقم موجود ہے۔ شمار کر لو۔ اور مہربانی سے وصیت نامے کو بدستور لفافہ میں رکھ کر اسی تجوری میں رکھ دو۔ تکلیف تو ہو گی۔ کل آ کے اس کو بہو بیگم صاحبہ کے حوالہ کر دینا۔ اب کسی ملازم کو آواز دو کہ بہو بیگم صاحبہ کو اطلاع کی جائے کہ میں ان کا منتظر ہوں۔

ابھی نواب صاحب کا جملہ ختم ہونے نہ پایا تھا۔ کہ ہمارے عقب میں خفیف سی سرسراہٹ ہوئی۔ اور کسی نے باریک ترنم ریز آواز میں کہا "میں موجود ہوں۔ میں اس لئے حاضر ہوئی ہوں۔ کہ تھوڑی دیر میں میرے مہمان آنے والے ہیں۔ کاغذات تیار ہوں۔ تو لایئے میں دستخط کر دوں۔ کیونکہ پھر مجھے آپ سے باتوں کا موقع نہیں ملیگا"۔

"جی ہاں۔ کاغذات تیار ہیں۔ ہمارے مابین جو شرائط طے پا چکی ہیں۔ وہ مجھے بسر و چشم منظور ہیں۔ منشی جی ذرا شیخ جی اور خادمہ کو بلوا لو"۔

بہو بیگم صاحبہ برقعہ پوش پردے کی اوٹ سے نکل کے تمکنت اور وقار کے ساتھ داخل ہوئیں۔ ان کے

کمرہ میں قدم رکھتے ہی میں احتیاطاً ایک گوشہ میں سرک گیا تھا جہاں کسیقدر تاریکی تھی تعمیل حکم میں جوں ہی میں برقی گھنٹی کی طرف بڑھا مجھے یہ محسوس ہوا کہ بیگم صاحبہ میری طرف تجسسانہ انداز سے دیکھ رہی ہیں۔ جب میں گھنٹی کا بٹن متعدد بار دبا کر مڑا۔ تو وہ کھڑکی میں کھڑی پائین باغ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اُن کی ظاہری ادا سے بے اعتنائی حقارت اور نفرت عیاں تھی۔ ممکن ہے یہ محض میرا خیال ہو لیکن یہ خیال میرے لئے باعث اطمینان و مسرت تھا۔ میں اُسی تاریک گوشہ میں پردہ سے لگا کھڑا تھا۔ اور نواب غضنفر حسین کاغذات کو اُلٹ پلٹ رہے تھے۔ حالانکہ وہ پہلے ہی مرتب کئے جا چکے تھے۔ اُن کے چہرہ سے دنائت اور خود غرضی ہویدا تھی۔ مگر ساتھ ہی گھبراہٹ اور حسرت برس رہی تھی ؀

"جب تک آپ کے گواہ آئیں۔ آپ اقرار نامہ کو خود ایک نظر دیکھ لیتیں تو مناسب ہوتا مضمون مختصر سا ہے اور اس کا مسودہ آپ کے قانونی مشیر مسٹر نسیم کا تجویز کردہ ہے"

بیگم صاحبہ میز کے پاس آئیں اور اقرار نامہ پڑھنا شروع کیا۔ ابتدائی چند سطریں اُسی بے پروائی سے پڑھ گئیں۔ اس کے بعد یک بیک رُک گئیں اور زیادہ روشنی کے لئے کھڑکی کے قریب جا کے کاغذ کو بغور دیکھنے لگیں۔ پہلے تو میری سمجھ میں نہیں آیا لیکن پھر اپنی تحریر کا خیال آیا۔ اور میں پسینے پسینے ہو گیا ؀

وہ کاغذ کو ہاتھ میں زور سے بھینچتے ہوئے بسرعت نواب صاحب کی طرف بڑھیں۔ اور گھبراہٹ اور خوف کی لرزتی ہوئی آواز میں مخاطب ہوئیں :-

"یہ تحریر۔۔ یہ تحریر کس کی ہے ؟"

مصنوعی اطمینان کے لہجہ میں "میری عینک" کہتے ہوئے نواب نے سنہری عینک لگائی۔ اور اُس صفحہ کو دیکھا۔ جو اُن کی طرف بڑھایا گیا تھا ؀

"میں نے لکھا ہے۔ آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ یہ بالکل درست اور بے کم و کاست اصلی مسودے کی نقل ہے کیا آپ کو کچھ شبہ......"

"شبہ! نہیں نہیں . . میں تو اس کو پوچھتی ہوں یہ کس نے لکھا ہے.... یہ...... یہ ؟"

نواب کے دل میں چور تو تھا ہی۔ بہو بیگم کے اس بظاہر بے محل متجسس لب و لہجہ سے گھبرا اُٹھے ؀

"آپ کے بیرسٹر مسٹر نسیم کے محرر نے"

"اور وہ محرر کہاں ہے"

"یہیں موجود ہے۔ وہ کیا سامنے کھڑا ہے۔ دستاویز پر اُس کے دستخط بھی ضروری ہیں۔ مگر آپ کو اس محرر کی شخصیت سے کیا سروکار ؟"

اس وقت میں اپنی جگہ پر گم سم کھڑا بیم و رجا کے دریائے بے پایاں میں غوطے کھا رہا تھا۔ جیسے برسوں کا ہجراں نصیب عاشق کسی کشتی میں سوار پُر خطر سمندر کے خارا شگاف امواج اور بے پناہ تلاطم سے مقابلہ کرتا ہوا اپنی نازآفریں معشوقہ سے ہم کنار ہونے کے بیتاب شوق میں دھڑکتے ہوئے دل سے ساحل کے قریب پہنچتا ہے۔ کہ اچانک کشتی گرداب تباہی میں پڑ کے ڈوبنے لگتی ہے۔ اور ساری ہنگامہ آفریں تمنائیں اور طوفان خیز ولولے حسرت و یاس کے سرد جھونکوں سے سراب بے ثبات کی طرح مٹ جاتے ہیں۔ اُس وقت میں دل ہی دل میں اپنے طرز عمل پر نادم و مشوش تھا۔ کہ دیکھئے اب واقعات کونسا پہلو اختیار کرتے ہیں۔ بہو بیگم نے ہاتھ سے مجھ کو۔ میں مجنونانہ انداز سے لڑکھڑاتا ہوا مگر ایک مقناطیسی کشش کے زیر اثر

روشنی میں اُن کے بالکل قریب پہنچ گیا ۔

میری تبدیل ہیئت اور نرالی وضع قطع دنیا کی آنکھوں میں خاک ڈال چکی تھی۔ مگر میری شریک حیات کو فریب نہیں دے سکی۔ ایک مرتبہ بیگم نے مجھکو بغور دیکھا۔ نقاب اُلٹ دی۔ آنکھیں چار ہوئیں۔ ایک آہ کی۔ اور میرے بازوؤں میں گرتی ہوئی فرش پر گرنے لگیں۔ میں نے جھٹ اُن کو اپنی مضطرب آغوشِ تمنا میں لے لیا۔ اور نیچی نظریں کئے اُس ملائک فریب چہرہ پر جذبات محبت کی جان بخش بوچھاڑ دے کر ہوش میں لانے کی تدابیر کرنے لگا ۔

پانچ ادیب

جلوۂ امروزہ

(از جناب مستطاب مولانا نکہت شاہجہانپوری ۔ بی ۔ اے)

ازلبِ پیرِ مغاں تازہ پیام است امروز ‏ — جز رہِ میکدہ ہا راہ حرام است امروز

پارہ پارہ شدہ آں خرقۂ تزویر و ریا ‏ — نشۂ یکرنگی و اخلاص بجام است امروز

بزمِ فطرت شدہ آراستہ زآئین دگر ‏ — حُسنِ ساقی بہ سرِ جلوۂ [illegible] است امروز

سیرِ ہر طور نہ پابستۂ کوہ آمدہ است ‏ — دیدہ بخشائے منوّر در و بام است امروز

مہر با ذرہ نہادست بنائے عشرت ‏ — نور افشاں ہمہ جا ماہِ تمام است امروز

بہرہ اندوز مشو از خس و خاشاکِ جہاں ‏ — پختہ مغز است [illegible] است امروز

ایکہ آزادی و پابندِ خودی وقت شناس ‏ — خوفِ صیاد نہ اندیشۂ دام است امروز

غمِ فردا چہ خوری حاصلِ ہستی دریاب ‏ — پائے بردار کہ منزل دو سہ گام است امروز

مجو آسودگی از عنبر و عودِ کہنہ ‏ — بوئے زاں طرۂ مشکیں بمشام است امروز

مرحبا رسم وفا کوشی رنداں نکہت

"چشم بر روئے نگار و لبِ جام است امروز"

نکہت

رباعیاتِ حضرت ابو سعید ابو الخیرؒ

(مترجمہ حامد حسن قادری لکچرر سینٹ جانسن کالج ۔ آگرہ)

مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

چو فقر اندر لباس شاہی آمد بتدبیر عبید اللہی آمد

فقر و تصوف نے جسم کی طرح مختلف ملبوسات و اوضاع اختیار کئے ہیں ۔ اسی طرح روح فقر و مضامین تصوف کی دنیائے شاعری میں مختلف اصناف سخن میں جلوہ گر ہوا ہے ۔ سب سے پہلے یعنی غزل سے بھی پہلے فقر و تصوف کے مضامین جس صنف شعر میں اہل بصیرت کے سامنے آئے وہ رباعی ہے ۔ اور جس بزرگ ہستی نے صنف رباعی کو اس برگزیدہ موضوع کے لئے پسند کیا وہ حضرت مولانا شاہ ابو سعید ابو الخیر قدس سرہ ہیں ؞

تصوف بصنف رباعی رسید بفیضان طبع شہ بوسعید

نامور شعرائے متصوفین مثلاً حکیم سنائی ۔ خواجہ عطار ۔ مولانا رومی ۔ شیخ سعدی ۔ خواجہ حافظ وغیرہ سب شاہ ابو سعید کے بعد کے بزرگ ہیں ۔ ایک نام البتہ شاہ صاحب کے نام کے ساتھ لیا جاسکتا ہے ۔ اور وہ بابا طاہر عریاں ہمدانی کا ہے کہ یہ بزرگ شاہ صاحب کے ہمعصر تھے ۔ رباعی گو تھے اور اپنی رباعیوں میں مضامین تصوف بھی لکھے ہیں لیکن نہ اس کثرت و وسعت کے ساتھ جیسے شاہ صاحب نے ۔ اور نہ اس وزن میں جو رباعی کے لئے مخصوص ہے ؞

شاہ ابو سعید ابن ابو الخیر ۹۶۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۰۴۹ء میں انتقال فرمایا ۔ شاہ صاحب ہی نے سب سے پہلے رباعی کو اپنے اظہار خیالات کے لئے منتخب کیا ۔ اور ساڑھے چار سو کے قریب ایسی رباعیاں یادگار چھوڑیں جو ہر نوع کے مضامین فقر و فنا ۔ جذب و سلوک ۔ کشف و معرفت ۔ وحدت وجود و وحدت شہود وغیرہ کا معدن و گلشن ہیں ؞

اکثر رباعیاں حسن بیان و خوبی مضامین کے لحاظ سے اس درجہ بلند ہیں کہ ترجمہ منظوم کی رسائی قاصر ہے ۔ اور اس قدر لطیف کہ بار ترجمہ کی متحمل نہیں ہوسکتیں ۔ جی چاہا کہ بعض رباعیات کا ترجمہ اردو رباعیوں میں کروں لیکن مجھے اعتراف عجز و قصور ہے کہ اصل کی خوبی قایم نہ رکھ سکا ۔ شاہ صاحب کی پہلی رباعی ہے ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

یہ رباعی اپنے محاسن میں اتنی مکمل اور ایسی دلچسپ ہے کہ غالباً ہر رباعی گو کا جی چاہتا ہوگا کہ اس طرح کی رباعی فارسی یا اردو میں پیدا کرے چنانچہ سرمد علیہ الرحمہ نے ایک رباعی نکالی ؎

باز آ باز آ از فکر باطل باز آ از وہم و خیال خام اے دل باز آ
خوشنود مشو ز فکر دنیا ہرگز نہ وصل بماند و نہ واصل باز آ

لیکن اہل ذوق جانتے ہیں کہ اس رباعی کا شاہ صاحب کی رباعی کے آگے کیا رتبہ ہے۔ اب اگر میں اپنی سعی باطل ان بزرگوں کے افکار عالیہ کے سامنے پیش کروں تو۔ سورج کو چراغ ہے دکھانا

لیکن بمقتضائے الاشیاء تعرف باضدادہا اپنی دو رباعیاں بھی سُنائے دیتا ہوں ؎

(۱) باز آ باز آ کفر ظاہر باز آ — باز آ از راہ فسق ناجہر باز آ
فرداست چو ناگزیر باز آمدنت — امروز اے دل بطیب خاطر باز آ

(۲) باز آ ز ہوائے نفس کافر باز آ — از شرک علانیہ و از سب باز آ
ہر وقت ز عمر وقت باز آمدن است — اول چو نہ باز آمدی۔ آخر باز آ

شاہ ابوسعید ابوالخیر کی رباعی مذکورہ کا ترجمہ اُردو رباعی میں اتنا بھی نہ ہو سکا۔ اس لئے میں نے اُردو ترجمہ کی کوشش ہی چھوڑ دی اب شاہ صاحب کی چند رباعیاں مع اپنے اردو ترجمے کے پیش کرتا ہوں + (حامد حسن قادری)

رباعیات حضرت ابوسعید ابوالخیر

(۱)

از بار گنہ شد تنِ مسکینم پست
یارب چہ شود اگر مرا گیری دست
گر در عملم آنچہ ترا شاید نیست
اندر کرمت آنچہ مرا باید ہست

(۲)

گر دور فتادم از وصالت بضرور
دارد دلم از یاد تو صد نوع حضور
خاصیتِ سایۂ تو دارم کہ مدام
نزدیک توام اگرچہ می افتم دور

(۳)

آنرا کہ فنا شیوہ و فقر آئین است
نہ کشف و یقیں نہ معرفت نہ دین است
رفت او ز میاں ہمیں خدا ماند خدا
اَلفقرُ اِذا تمّ ھو اللہ این است

ترجمہ از حامد حسن قادری

(۱)

تیر ہوس و ہوا کا آماج ہوں میں
یارب مددے کہ بے نوا آج ہوں میں
مجھ میں وہ عمل نہیں جو لائق ہو ترے
تجھ میں وہ کرم ہے جس کا محتاج ہوں میں

(۲)

گو دور ہوں۔ رنجور ہوں۔ مجبور ہوں میں
ہر وقت تری یاد میں مسرور ہوں میں
خاصیتِ سایہ آگئی ہے مجھ میں
ہوں پاس ہی۔ گو پڑا ہوا دور ہوں میں

(۳)

کر لیتا ہے سالک جو رہ فقر کو طے
پھر کشف و یقین و دین نہیں کوئی شے
مٹ جائے خودی۔ خدا ہے صرف خدا
اَلفقرُ اِذا تمّ ھو اللہ یہ ہے

(۴)

آں آتشِ سوزندہ کہ عشقش لقب است
در پیکرِ کفر و دیں چو سوزندتب است
ایماں دگر و کیشِ محبّت دگر است
پیغمبرِ عشق نہ عجم نہ عرب است

(۴)

وہ آگ جہاں میں عشق جس کا ہے لقب
ہے پیکرِ کفر و دیں میں اک سوزِ عجب
ایماں بھی جدا عشق کا مذہب بھی جدا
پیغمبرِ عشق خود عجم ہے نہ عرب

(۵)

دوراز تو فضائے دہر بر من تنگ است
دارم دلکے کہ زیرِ صد من سنگ است
عمریست کہ آتش زماں را عار است
جانیست کہ بردنش اجل را ننگ است

(۵)

فرقت میں فضائے دہر ہے مجھ پر تنگ
دل سے مرا بارِ غم سے گویا تہِ سنگ
اک عمر ہے سو عار، زمانے کے لئے
اک جان ہے۔ وہ اجل کو بھی باعثِ ننگ

(۶)

گر سبحۂ صد دانہ شماری خوب است
در جامِ مے از کف گذاری خوب است
گفتی چہ کنم۔ چہ تحفہ آرم بر دوست
بے درد میا ہر آنچہ آری خوب است

(۶)

یہ ذکر یہ شغل روز و شب بھی اچھے
جامِ مے و جلسہ طرب بھی اچھے
دل درد سے خالی ہے تو پھر کچھ بھی نہیں
ہو درد جو دل میں تو یہ سب بھی اچھے

(۷)

در ہجرانم قرار می باید و نیست
آسایشِ جانِ زار می باید و نیست
سرمایۂ روزگار می باید و نیست
یعنی کہ وصالِ یار می باید و نیست

(۷)

فرقت میں مجھے قرار ہوتا۔ سو نہیں
تبدیل یہ حالِ زار ہوتا۔ سو نہیں
سرمایۂ زندگی میسر ہوتا۔ سو نہیں
یعنی کہ وصالِ یار ہوتا۔ سو نہیں

صبح مفارقت

بگو جبریل را از من پیامے
وُلے تاب و تب ما خاکیان ہیں

پر آں پیکر نوری ندادند
بنوری ذوق مجوری نداند
(اقبال)

نوجوان "زمردپر" فردوس سماوی سے صحرائے بابل کے ایک راہب کے پاس جو انسانوں کو درس بقا دیتا ہے ابدیت کا راز سیکھنے آتا ہے۔ راہب کی ملائک فریب لڑکی عذرا اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔

زمردپر۔ وقت آ گیا ہے عذرا کہ میں تجھ سے رخصت ہو جاؤں۔ مدتوں میں تیرے باپ کے حضور میں دو زانو بیٹھا لیکن آج اس نے درس کی تکمیل کر دی۔ لطف و نوازش سے مجھے اجازت دے کہ میں ستاروں کی مملکت کو جہاں سے میں آیا تھا، پھر پلٹ جاؤں۔

عذرا۔ تو نے اپنی خواہش کے مطابق وہ نایاب علم حاصل کر لیا ہے، جس کے فرشتے متلاشی ہیں۔ لیکن خیال کر کیا تجھے کسی مزید شے کی تمنا تو نہیں؟

زمردپر۔ نہیں!

عذرا۔ بالکل نہیں! اپنے دل کی گہرائیوں میں اتر جا۔ کیا وہاں کوئی محبوب تمنا تو مخفی نہیں مخفی او خائف کہ کہیں وہ پژمردہ نہ ہو جائے۔

زمردپر۔ میرے لئے تسکین کا آفتاب طلوع ہو چکا ہے ستارے اس کی روشنی میں غائب ہو چکے ہیں۔ اور میں نے وہ علم حاصل کر لیا ہے جو زندگی بخشتا ہے۔

عذرا۔ پھر تو تمام کائنات میں تو ہی ایک شادمان ہستی ہے۔ آہ۔ اب مجھے پہلی بار محسوس ہوا ہے۔ کہ یہ دلبس ہیں تیرے دن کس عذاب سے گزرے ہیں۔ اگرچہ ہم نے تیرے آرام کی خاطر وہ سب کچھ مہیا کیا جو ہم کر سکتے تھے۔

زمردپر۔ اسقدر تلخ کلامی نہیں عذرا! صرف مسکرا دے اور مجھے رخصت ہونے کی اجازت دے۔

عذرا۔ مسکرا دے! لیکن میرے دوست یہ تمہارا وطن فردوس نہیں ہے۔ مسکراہٹ اس دنیا میں جہاں سرگشتہ آرزوئیں "محبوب" کے گرد منڈلاتی ہیں اور مسرت رفتہ کی یاد کبھی بھی بے اشک آہیں بھرنا بند نہیں کرتیں۔

زمردپر۔ عذرا مجھے بتا میری کس بات نے تجھے آزردہ کر دیا ہے؟

عذرا۔ کیا تیرے لئے آغوش صحرا کے (۲) نخلستان کو چھوڑنا جس نے اس فیاضی سے تجھ پر اپنے سائے رنگیت نثار کئے اسقدر آسان ہے؟ کیا تو محسوس نہیں کرتا ہو ان جھلملاتے ہوئے سایوں میں کس طرح گزار رہی ہے۔ اور خشک پتے ناکام امیدوں کی روحوں کی طرح فضا میں چکر لگاتے ہیں۔۔۔ جبکہ تو موسم سے رخصت ہو رہا ہے اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے ہوئے ہے؟

زمردپر۔ یہ بیابانی نخلستان میرے لئے دوسری

تھا۔ کیونکہ یہاں میں نے دوبارہ جنم لیا ہے۔ اس کی
محبت میرے دل سے کبھی نہ جائے گی +

عذرا۔ جب تو ہمارے مویشی سبزہ زار میں چرانے لیجاتا
تھا تو دوپہر کی تپش سے بچانے کے لئے وہ بالا بلند
درخت تیرے تھکے ہوئے اعضا کے لئے اپنا
خنک سایہ پھیلا دیتا +

زمرد پر۔ میں تیرا احترام کرتا ہوں اے خدا کے
گلستان۔ جب دیگر طلبا تیرے سائے میں
پتوں کی سرسراہٹ اور بھونروں کی آواز کیساتھ
اپنا سبق یاد کریں تو مجھ کو بھی یاد رکھنا +

عذرا۔ اور ہمارے دلکش چشمہ سار "حسن صحرا" کو بھی
فراموش نہ کر جس کا تیز اور شفاف پانی نغمہ گوں
الفت کی ایک ندی ہے +

زمرد پر۔ آہ۔ میں اس کو ہمیشہ یاد رکھونگا۔ میری جلا
وطنی کی محبوب رفیق جو ریگستان کو ایک خانہ بدوش
چھوکری کی طرح اپنے غیر مختتم فرض کو مسکراتے ہوئے
ادا کرتی اور دھیمے سروں میں ایک سادہ راگ
گاتی ہے +

عذرا۔ لیکن میرے دوست میں تجھے یاد دلاتی ہوں۔
تیرا ایک اور رفیق بھی تھا جس کے خیالات کسی
موہوم اُمید پر تجھے جلا وطنی کے تفکرات فراموش
کرانے میں معروف تھے +

زمرد پر۔ اُس کی یاد میری زندگی کا جزو بن چکی ہے!

عذرا۔ مجھے وہ دن یاد ہے۔ جب تو پہلے پہل یہاں
آیا تو لڑکا ہی سا تھا۔ اور ہمارے باغ کی باڑ کے
پاس کھڑا تھا۔ تیری آنکھوں میں مسکراہٹ تھی +

زمرد پر۔ اور میں نے تجھے پھول چنتے دیکھا تو صبح کی
دیوی کی طرح دکھائی دی گویا نور سے نہا کر نکلی ہو۔ سفید لباس
میں ملبوس تھی۔ اور میں نے کہا:۔
"مجھے اجازت دے کہ تیرے لئے پھول چننے کا فخر
حاصل کروں" +

عذرا۔ اور میں نے حیرانی سے پوچھا تم کون ہو۔ اور تم
نے مسکینی سے جواب دیا کہ خدائے آسمان اور بادشاہ
کے ایک مقرب خاص کے بیٹے ہو۔ اور میرے باپ
سے وہ مخفی سحر سیکھنا چاہتے ہو جو مُردوں کو زندہ کر
دیتا ہے +

زمرد پر۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں آقا بھی انسانوں کا ستم جو
فرشتوں کے رقیب ہیں۔ مجھے شاگردی میں قبول کرنے
سے انکار نہ کر دے +

عذرا۔ لیکن جب میں نے تمہاری سفارش کی تو وہ مجھ سے
انکار نہ کر سکا۔ اسقدر محبت ہے اُس کو اپنی لڑکی سے!

زمرد۔ تین بار حاسد انسانوں۔ نے مجھے ہلاک کر دیا۔ اور
تینوں بار تو نے اپنے باپ کو میرے جلانے پر آمادہ
کیا۔ تیرے لئے بھی میری ممنونیت اور شکر گزاری
کے جذبات مردہ نہیں ہو سکتے +

عذرا۔ ممنونیت! ان سب کو فراموش کر دے۔ مجھ کو
بالکل غم نہ ہوگا۔ کیا تو صرف الطاف و احسان ہی
یاد رکھ سکتا ہے؟ ان سب کو فنا ہو جانے دے
اگر دن بھر کے مطالعہ کے بعد شام کی تنہائی میں کوئی
کا کوئی مبہم سا ارتعاش تیرے دل کو کپکپا دیتا تھا
تو اس کو یاد رکھ ــــ الطاف و احسان کو نہیں!
کسی کے گذرتے ہوئے بیابانی گیت کا کوئی بول
تیری کتابوں کی عبارت میں آ کر الجھ جاتا اور اگر کسی
آنچل کا پلّو تیرے مطالعہ کو خوشی سے مرتعش کر دیتا

تو اپنی فردوس میں فرقت کے لمحوں میں اسے یاد رکھ، کہ صرف
الطاف و احسان؟ حُسن و محبت ————؟

زمرد پر۔ بعض جذبات الفاظ کی قدرت سے باہر
ہوتے ہیں ۔

عذرا۔ ہاں۔ ہاں۔ میں جانتی ہوں۔ میری محبت نے
تیرے دل کے عمیق ترین تار کو چھیڑ دیا ہے اور مجھے
تیرے حجاب کے مقابلہ میں بولنے کی جرأت پیدا ہوئی
ہے۔ مجھ سے جُدا نہ ہو! یہاں ہی رہ! شہرت سے
سے مسرت حاصل نہیں ہوتی۔ میرے دوست!
تو فرار نہیں کر سکتا ہے۔ کیونکہ تیرا راز اب میرا راز
ہے ۔

زمرد پر۔ نہیں! نہیں عذرا!

عذرا۔ کس طرح "نہیں"؟ مجھ سے جھوٹ نہ بول!
محبت کی نگاہ پاکیزہ اور آسانی ہوتی ہے۔ آئے
دن سر اُٹھاتے ہوئے اک نگاہ سے۔ ہاتھوں
کی حرکت سے میری محبت ہمکلام ہوتی۔ جس طرح سمندر
اپنی لہروں سے کلام کرتا ہے۔ میری اچانک
آواز سے تیرے رگ و پے میں ارتعاش کی ایک
لہر دوڑ جاتی تھی۔۔۔ کیا میں نے یہ کبھی نہیں دیکھا!
میں تجھے جانتی ہوں اور اس لئے تو ہمیشہ کے لئے
میرا اسیر ہے۔ ملک الموت بھی ان زنجیروں کو نہیں
توڑ سکتا۔

زمرد پر۔ کیا یہ صرف اسی کے لئے تھا عذرا کہ وطن
اور عزیزوں سے دور ان سالوں میں نے جانفشانی
سے مطالعہ کیا؟

عذرا۔ کیوں نہیں؟ کیا صرف علم ہی گرانمایہ ہے؟ کیا
کیا محبت ارزاں ہے؟ اس لئے کو ضایع نہ جانے
دیکھ یہ اعتراف کرنے کی جرأت کر کہ عورت کا دل
اس تمام ریاضت سے جو مرد طاقت و علم اور شہرت
کے لئے کرتا ہے گراں بہا ہے ۔

زمرد پر۔ میں نے فرشتوں سے عہد کیا تھا کہ میں
اُن کے لئے لافانی زندگی کا علم لاؤں گا ۔

عذرا۔ لیکن یہ سچ ہے کہ تمہاری نگاہیں کتابوں کے سوا
اور کسی شے کے لئے۔ تھیں؟ کہ تو نے میرے
حضور میں پھولوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے کبھی
اپنے مطالعہ کو ترک نہیں کیا۔ اور شام کے وقت
کبھی اس موقع کا منتظر نہیں رہا کہ میرے پھولوں
کی کیاریوں کو پانی دینے میں میری مدد کرے۔ وہ
کیا بات تھی جس کے لئے تو گھاس پر میرے ساتھ
بیٹھتا اور وہ گیت گاتا جو ستاروں کی انجمن سے
یہاں آیا تھا۔ جبکہ تاریکی چشمے کے کناروں پر چھا
جاتی۔ جس طرح محبت اپنی المناک تنہائی پر چھا
جاتی ہے۔ کیا اس ظالمانہ سازش کی تجویز تمہاری
فردوس میں کی گئی تھی؟ کیا یہ تمام محض میرے باپ
کے دل تک رسائی حاصل کرنے کے لئے تھا؟
——— اور کامرانی کے موجب تو رخصت ہونے
لگے تو ارزاں اور ناکارہ ممنونیت کسی فریب خوردہ
دربان کے سامنے ایک حقیر سکّہ کی طرح پھینک جائے؟

زمرد پر۔ کیا فائدہ تھا مغرور عورت حقیقت کو جاننے کا؟
اگر میں نے ایک جذبات انگیز عقیدت کے ساتھ
تیری پرستش کرنے میں غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ تو
اس کی کافی سزا مجھ کو مل چکی ہے۔ اب یہ پوچھنے کا
وقت نہیں ہے کہ میری محبت سچی ہے یا جھوٹی!
میرا کارنامہ حیات میرا منتظر ہے۔ اگرچہ

اس وقت سے میرا دل ایک سُرخ شعلے کا مسکن ہوگا۔ جو خدا کو عبث ہو کھانے کی کوشش کریگا۔ مجھے اُس فردوس میں واپس جانا ہے جو اب میرے لئے کبھی فردوس نہ ہوگی۔ اس سے پیشتر کہ میں مسرت کا خیال دل میں لاؤں مجھے فرشتوں کو جدید الہیت کا درس دینا ہے۔ جسے میں نے نہایت جانفشانی سے حاصل کیا ہے۔ معاف کر دے مجھے عذرا۔ اور دیکھ کہ میرے دل کا غم اس داغ سے دوگنا ہو رہا ہے۔ جو میں مجبوری تجھے دے رہا ہوں +

عذرا۔ عفو! تو نے میرے دل کو غضبناک کر دیا ہے یہانتک کہ اب وہ بجلی کے گولے کی طرح سخت او شعلہ خیز ہے۔ تو اپنے کام اور اپنی شان و شوکت کے لئے واپس جا سکتا ہے۔ لیکن میرے لئے اب کیا رکھا ہے۔ یاد ایک خار ناسہ ہے اور تلخی ندامت میری رنج حیات کو کھا جائے گی۔ تو ایک راہگیر کی مانند آیا۔ دھوپ کے لمحوں میں میرے باغ کے سائے میں بیٹھا۔ اور وقت گزارنے کے لئے تو نے اُس کے تمام پھول چن کر اُن کا ہار بنا لیا۔ اب جبکہ تو رخصت ہو رہا ہے تو نے اسکو نوچ کر پھولوں کو خاک پہ گرا دیا ہے۔ آہ لعنت ہو تیرے علم پہ جو تو نے حاصل کیا ہے۔ یہ ایک بوجھ ہے جس میں اگرچہ اور بھی تیرے برابر کے شریک ہونگے کبھی ہلکا نہ ہوگا۔ اُلفت کے فقدان سے یہ تیرے لئے ایسا ہی اجنبی ہوگا جس طرح خنک ستارے دو شیرہ رات کی بے داغ تاریکی کے لئے +

(ماخوذ) حنیف ہاشمی

خمار بادہ

(امریکہ کی ایک مشہور افسانہ نگار ڈافن بوکس کے ذاتی محسوسات)

میں سادہ الفاظ میں اپنی دو سال کی غلامی کی روداد بیان کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ خوفناک ترین غلامی کی روداد جبکہ میں نے خود اپنے تئیں پابند سلاسل کیا تھا اور آفتاب زندگی کی جاں بخش شعاعوں سے محروم ہو کر خود غرضانہ کیف اندوزی کے تاریک اور سرد زنداں میں محبوس ہو گئی تھی ٭

دو سال تک میں منشیات کی غلام رہی۔ کیا آپ جانتے ہیں یہ غلامی کس قدر خوفناک ہے؟

سب سے پہلے اخلاقی فرائض کا تمام تر احساس مفقود ہو جاتا ہے حق و باطل کے درمیان کوئی تمیز نہیں رہتی۔ سلامت ذہن اور آزادی کے ساتھ دماغ باقی کہاں ہے۔ اور اس کے ساتھ جھوٹ اور فریب کی بھوک بڑھتی جاتی ہے ٭ صفائی اور پاکیزگی کا احساس نہیں رہتا اور یہ بھی ناگزیر۔ نہانے اور منہ دھونے میں اب وہ جسمانی مسرت و انبساط نہیں رہتا۔ اب یہ ایک جسمانی عذاب بن جاتا ہے۔ اور جسم کو پانی لگنے سے مریض کی طرح ہو جاتا ہے بعد کا احساس بھی کلی طور پر زائل ہو جاتا ہے۔ خورش و خواب محض ایک بہیمانہ مقصد یعنی منشیات کے حصول کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اعصاب ناکارہ ہو کر عجیب چیزیں نظر آنے لگتی ہیں ہر گھڑی شور کی آواز آتی ہے۔ اور کسی چیز کتاب یا کرسی کے چھونے سے تو گی کا احساس ہوتا ہے۔ اور وہ چیزیں بھی جو ہماری اچھی طرح دیکھی بھالی ہوتی ہیں اجنبی معلوم ہوتی ہیں ٭

میرے ساتھ یہ تمام واقعات نہایت سبک رفتاری سے پیش آئے اور مجھے ان کا احساس تک نہ ہوا اور منشیات کی پہلی خوراک شوق و استفسار کے ان جذبات کے ساتھ ہی چکھا جن سے پہلا تازہ سگریٹ یا کسی نئی طرز کی چائے کو پیا جاتا ہے ٭

میں اب افسانہ نگار ہوں اور یہی میرا ذریعہ معاش ہے۔ اس طبقہ کی روایات کے مطابق ابتدا میں مجھے بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ دنیا میں میرا اور میری بیوہ ماں کا کوئی بھی ساتھی نہ تھا اور ہمارا گزارہ زیادہ تر میری آمدنی پر ہی تھا۔ لیکن اگرچہ ہمارے پاس دولت نہ تھی۔ ہم سب خوش تھیں۔ اور ہمیں ایک دوسرے سے انتہائی محبت تھی۔ اور اگر کسی اور شخص کیلئے میرے دل میں گہرے جذبات تھے تو وہ وہ شخص تھا جس کے ساتھ مجھے ایک دن شادی کرنے کی امید تھی۔ اس کا نام جم تھا اور وہ نو آبادیات میں اپنی قسمت بنا رہا تھا ٭

خوش قسمتی میرے پاس اچانک طور پر آئی۔ میرا ایک مسلسل افسانہ منظور کر لیا گیا۔ اور دوسروں کے لئے تقاضے شروع ہو گئے اور میں بہت جلد اس قابل ہو گئی کہ لندن کے قریب شہر میں ایک مکان لے سکوں۔ جہاں میری ماں آرام کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔ میں بہت محنت اور جانفشانی سے کام کرتی۔ لیکن سیر و تفریح کے لئے بھی وقت نکال لیتی۔ شام کے وقت رقص کرنے یا تھیٹر میں چلی جاتی اور اس طرح میرے ایام مصروفیت اور تفریح میں گزر جاتے ٭

اس کامیابی پر میرا اول ذوق و شوق سے اسقدر بڑھ گیا کہ میں صلاحیت سے زیادہ کام کرنے لگی۔ یہ بات قدرتی لیکن احمقانہ تھی۔ انکار کرنے کی بجائے میں نے ہر قسم کے تقاضوں کو پورا کرنا شروع کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے خیالات کا انتشار پہلے پہل محسوس کیا۔ لیکن مجھے ایک رات اچھی طرح یاد ہے میں ایک لفظ تک نہ لکھ سکتی تھی۔ میرا تخیل کام نہ کرتا تھا ... مجھے قطعاً کسی قسم کا شعور نہ تھا۔ اور صبح مجھے افسانہ

کی ایک قسط دینا تھی +

لیکن میں نے اس وقت اس کا کچھ خیال نہ کیا۔ کیونکہ میں اس کا کچھ علاج نہیں کر سکتی تھی۔ میں محفلِ رقص میں چلی گئی جو اس شام میری ایک سہیلی نے آراستہ کی تھی۔ وہ نہایت زندہ دل اور شگفتہ مزاج عورت تھی۔ اس کی گفتگو نہایت امید افزا ہوتی تھی۔ لیکن اس کی طبیعت کا سمجھنا بہت مشکل تھا۔ اگر آج وہ بہت خوش و خرم ہوتی تو کل سراپا حسرت و یاس بن جاتی۔ اس شام وہ فرحت و انبساط کی شعاعوں سے منور تھی۔ اور اس کی موجودگی میں میں بھی دماغ سے ایک بوجھ سا اترتا محسوس کر رہی تھی +

میں اسے بتانا چاہتی تھی کہ میری کیا حالت ہے۔ میں اس کے پیچھے پیچھے اس کی خوابگاہ میں گئی اور اسے بتایا کہ میرے خیالات کس قدر منتشر اور پریشان ہیں۔ اس کا سلوک میرے ساتھ نہایت مشفقانہ تھا +

"تم اعتدال سے زیادہ کام کرتی ہو" اس نے کہا "تمہیں آرام کرنا چاہئے۔ تمہیں نیند کی ضرورت ہے۔ میرے پاس ایک دوائی ہے۔ میرا خیال ہے یہ تمہارے لئے بہت مفید ہوگی۔ رات کو ایک سفوف کھا لینا۔ اور تم آگ کی سی تیز رفتاری کے ساتھ کام کر سکو گی" میں نے پڑیہ کو بیگ میں رکھ لیا۔ اور اطمینان کے ساتھ خوشی خوشی واپس آگئی۔ اس رات بہت سردی تھی۔ گھر آ کر میں نے آگ جلائی۔ رات کو تنہائی اور سکوت میں میں اپنے سر کو ہلکا محسوس کر رہی تھی۔ اور میں بہت تھکی ہوئی تھی۔ میں حیران تھی کہ کیا یہ ممکن ہے کہ صبح یہ سفوف کھائے بغیر میں اخبار کے لئے افسانہ کی قسط لکھ سکوں گی۔ لیکن پہلے شکوک اور ایڈیٹر کے برافروختہ ہونے کا وہ خوف میرے دل میں پھر واپس آگیا۔ اور جس سے ہر وہ مرد و عورت جو اخبار کے لئے لکھتا ہے اچھی طرح واقف ہے۔ میں کام کو اگلے دن پر نہ چھوڑ سکتی تھی۔

میں نے سفوف گھول کر دوائی کو اپنی زبان پر ڈالا۔ پانی کے بڑے بڑے گھونٹ پیئے اور بیٹھ کر انتظار کرنے لگی +

کوئی شدید کیفیت رونما نہ ہوئی۔ مجھے آہستہ آہستہ آسانی کے حیران کن جذبات کا احساس ہو رہا تھا۔ اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ میرے دماغ کی پیچیدہ الجھنوں کو مخفی انگلیوں سے کھولا جا رہا ہے۔ میں ہر چیز کو بڑھتے ہوئے ادراک کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ لیکن میرے اردگرد کی اشیاء میرے شعور سے علیحدہ تھیں اور میں اپنے تئیں ایک مختصر سے پیمانہ کی کائنات کو خدا محسوس کر رہی تھی ——— میں نے قلم ہاتھ میں لیا اور قابلِ رشک سلاست، بیک روی اور اطمینان کے ساتھ لکھنا شروع کیا +

جب میں نے کام ختم کیا۔ دھوپ کی ایک موج میرے کمرے میں آ رہی تھی۔ اور ایک قسط مکمل ہو چکی تھی۔ مجھے بالکل تھکن محسوس نہ ہوتی تھی۔ اور میری قوت ادراک بہت تیز تھی۔ میرے خیالات مجتمع تھے۔ مجھے اس وقت سے زیادہ زندگی کا احساس کبھی نہ ہوا تھا۔ اور اس وقت میں ہر کام کے لئے مستعد تھی +

جو کچھ میں نے لکھا اسے ٹائپ کرانے کے لئے لے گئی۔ مسودے کی تصحیح کی۔ اسے اخبار کے دفتر میں دیا۔ اور آ کر سو گئی۔ اس دن میں شام تک سوتی رہی۔ رات کو شکم سیر ہو کر کھانا کھایا۔ اور پھر سو گئی۔ اگلے دن میری طبیعت اسقدر سبک تھی کہ میں نے تفریح کے لئے دیہات میں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسوقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی: روزنامہ کے افسانوں کے حصہ کا ایڈیٹر میرے افسانے کی اس قسط سے اسقدر خوش ہوا تھا کہ اس نے ایک اور ہفتہ وار اخبار کے لئے جو اسی قوم سے متعلق تھا۔ مجھ سے ایک مسلسل افسانے کی درخواست کی۔ اس سے میرے سر میں اسقدر ہوا سمائی کہ بیوقوف بن کر میں نے فوراً منظور کر لیا۔ یہ روپے کی محبت نہ تھی۔ یہ صرف اپنے اور اپنی ماں کے لئے

سکون و اطمینان حاصل کرنے کی آرزو اور ناقابل تسخیر آرزو تھی۔ آہ۔ میں جانتی تھی کہ میں حماقت کا ارتکاب کر رہی ہوں۔ میں اپنی اس حماقت پر فتح پا سکتی تھی۔ لیکن جو چیز میرے دل کو پاش پاش کئے دیتی تھی وہ میری یہ کمزوری تھی کہ میں اس دوائی کے بغیر رہ سکتی تھی جو افسانے کے اس طلسمی عطیے کی مانند تھی جو برکت بنکر آتا اور لعنت بن کر رہتا ہے۔

اب میں بار بار اُس گندی دُکان میں جاتی جہاں ہیروئن اور کوکین فروخت ہوتی تھی بعض اوقات دکان کی مالکہ اتنی قیمت مانگتی جو میں ادا نہ کرسکتی۔ اس صورت میں میں مختلف ذرائع بروئے کار لاتی۔ میں آنسو بہاتی، دھمکیاں دیتی۔ مجنونانہ آہ و بکا کرتی۔ یہاں تک کہ وہ مجھے ضرورت کے مطابق دیدیتی اور دوسرے دن میں اپنا یا کسی اور کا کوئی زیور لیکر آتی۔ میں اپنے اُن دوستوں کی جنہیں کبھی مجھ پر کوئی شبہ بھی نہ ہوسکتا تھا چھوٹی چھوٹی چیزیں مثلاً گھڑی۔ کلائی بند۔ انگشتری اور مالا وغیرہ اڑا لیتی لیکن اس سے بیشتر میں اپنی اس تمام ملکیت سے جو علیحدہ کیجا سکتی تھی جُدا ہوچکی تھی۔ یہاں تک کہ میں نے اپنا بستر اور کمرے کی قالین بھی رہن رکھ دی تھی۔

مجھے پہلا صدمہ اُس وقت محسوس ہوا۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ میرا تخیل اب محرکات سے بھی کام نہیں کر سکتا۔ اور دماغ کی بجائے نظام عصبی محرک ہوتا ہے۔ معمولی سی آواز مجھ خوفناک شور بنکر سنائی دیتی تھی۔ گھنٹی بجنے پر میری چیخیں نکل جاتیں اور دروازے چرچرانا میرے لئے ایک بے پناہ عذاب ہوتا۔

اس روپے پر بھی میرا دل بہت کڑھتا تھا جو مجھے ہوٹل یا کرائے پر خرچ کرنا پڑتا۔ لباس کی طرف میری قطعاً کوئی توجہ نہ تھی۔ میں خیال کرتی تھی کہ میں اچھی خاصی ہوں۔ لیکن ایک دن جب میں اپنی شکل و صورت کا مطالعہ کرنے میں خاص طور پر دلچسپی لے رہی تھی۔ میں نے آئینہ میں ایک ادھیڑ عمر کی بدصورت عورت کا چہرہ دیکھا۔ میرے رخساروں پر زار زار آنسو بہنے لگے۔ اِس وقت میری وفادار خادمہ جو گھر کا تمام کام کاج کرتی تھی اندر داخل ہوئی۔ اور مجھے اپنی علیحدگی کی اطلاع دی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ میرے پاس سے کیوں جانا چاہتی ہے اُس نے کہا کہ وہ اس گندگی آلائش اور بے ترتیبی کو برداشت نہیں کر سکتی جن میں میں رہتی ہوں۔ اُس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ایک ہفتہ سے میں نے غسل نہیں کیا۔ اور میں اپنا اور اپنے لباس کا کچھ خیال نہیں رکھتی۔ یہ ضرب بہت کاری تھی۔ اور اس نے میرے حسیات سے مردہ ضمیر کو بھی پاش پاش کردیا تب رو پڑی۔ میں نے آنسو بہائے۔ اور نشہ باز کے لئے آنسو بہانا کوئی بڑی بات نہیں۔ میں نے اُسے بتایا کہ میرے متعلق اُس کا اندازہ غلط ہے۔ میں صرف زیادہ کام کرنے سے درماندہ سی ہو رہی ہوں۔

"آپ کام نہیں کرتیں" اُس نے صاف صاف کہدیا "آپ تباہی اور بربادی کی طرف جا رہی ہیں۔ اگر کوئی اور آپکو یہ بات نہیں بتا سکتا تو میں کہتی ہوں"۔

اس کے علاوہ اور بھی مشکلات تھیں۔ بنک سے مجھے ٹیلیفون پر اطلاع ملی تھی کہ میرا حساب ختم ہوچکا ہے۔ اس سے میں بہت گھبرائی۔ وہ ایک اخبار کے دفتر میں جس میں میرے مضامین شایع ہوا کرتے تھے۔ گئی۔ میں نے ہیروئن کھائی جب میں دفتر میں پہنچی۔ مجھے یکایک غش آگیا۔ میں گھر واپس آگئی۔ میرے پاس ذرا بھی ہیروئن نہ تھی۔ اور یہ سوال درپیش تھا کہ میں کس طرح حاصل کرسکتی ہوں۔ میں نے چند دوستوں سے ٹیلیفون پر بات کی اور اُن کو یہ افسانہ گھڑ کر سنایا کہ میں بیمار ہوں۔ اور مجھے اپنی ماں کو مدد دینے کے لئے کچھ روپیہ کی ضرورت ہے۔ اس طرح میں تقریباً ایک سو ڈالر حاصل کرسکی۔ ان میں سے ۵۰ میں نے اپنی ماں کو بھیجدیئے

اور اس پر بھی مجھے افسوس آتا رہا۔ اور باقی چند منٹ کے علاوہ تمام منشیات پر صرف کئے۔ ہیروئن سے اب مجھ پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ اس بار میں نے کوکین استعمال کی کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا تھا کہ میں کیا سے کیا ہوگئی ہوں۔ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ یہ بجلی کی گونج کی طرح دیر پا نہ ہوگا +

میری ماں نے مجھے بتایا کہ جم لندن آ رہا ہے۔ میں نے بڑے تکلف سے غسل کیا۔ کوکین کی ایک چٹکی کھائی۔ اس سے میرا دماغ کام کرنے کے قابل ہوگیا۔ میں نے خوبصورت فراک جو جم کو مرغوب تھا پہنا۔ اس کے کنارے پر پھولوں کے ہار کاڑھے ہوئے تھے۔ جم آٹھ بجے کے قریب آیا وہ قد میں پہلے سے زیادہ لمبا۔ زیادہ چوڑا اور طوالت و بسالت میں زیادہ مردانہ وار تھا۔ اُس نے مجھے اپنی آغوش میں لیکر بار بار چوما —— آہ۔ یہ انکشاف کسقدر خوفناک تھا۔ میں یہ برداشت نہ کر سکتی تھی کہ وہ میرے جسم کو چھوئے۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ مجھے اُس سے محبت نہ تھی بلکہ میرے جسم کو منشیات کے کثرت استعمال نے خشک کر دیا تھا وہ اُس کے صحت مند اور تندرست جسم سے چھوتے ہوئے شرماتا تھا۔ میں نے اپنا منہ ہاتھوں سے چھپا لیا اور خوب رُوئی۔ ذلت کے اس لمحے میں مجھے اپنی انتہائی روحانی ذلت کا احساس ہوا۔ میں نے اپنا منہ پونچھا۔ دوبارہ پوڈر لگایا۔ اور ہم دونوں کھانے پر چلے گئے۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اس شام کوکین نہ کھاؤنگی

کھانے کے دوران میں میری حالت بہت اچھی رہی۔ اگرچہ بے قرار تھا۔ لیکن میں نے اپنے تئیں کھانے پر مجبور کیا۔ کیونکہ نشہ باز صرف اعلیٰ درجہ کے کھانوں کا لطف اُٹھا سکتا ہے۔ اور شراب اس کے لئے پانی کی مانند ہوتی ہے کھانے کے بعد ہم نے رقص شروع کیا۔ اور اس وقت اپنا رقص کے بین وسط میں میں نے محسوس کیا کہ میں ٹھنڈی ہو رہی ہوں۔ سانس نہیں لے سکتی۔ اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا ہے +

"میری طبیعت اچھی نہیں ہے"۔ میں نے کہا "تم مجھے فوراً گھر لے چلو"۔ اس وقت میں کوکین کی ایک چٹکی کیلئے زندگی اور موت کے بعد مستقبل کی ہر اُمید سے ہاتھ دھونے کے لئے تیار تھی۔ مجھے گھر آنا یاد نہیں۔ لیکن بعد میں مجھے پتہ لگا کہ میں جسم بے جان کو آنسو ٹکٹکی لگائے بیٹھی تھی۔ اور جم شکستہ دل ہو کر میرے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ ابھی تک مجھے اتنا ہوش تھا کہ میں جم کو اپنے منشیات استعمال کرنے کا علم نہ ہونے دوں۔ میں اُس کو ملاقات کمرے میں زبردستی بٹھا کر خوابگاہ میں گئی جہاں میں کوکین رکھتی تھی۔ لیکن وہ میرے پیچھے پیچھے آیا۔ ابھی میں نے سفوف کی چٹکی بھری ہی تھی کہ اُس کا ہاتھ میرے کندھوں پر تھا۔ "تم کیا کر رہی ہو؟" اُس نے دہشت سے پوچھا +

"کیا کر رہی ہوں؟" میں نے اُس کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔ "کچھ بھی نہیں۔ کونین کی ایک خوراک کھاتی ہوں" +

"کونین؟" اُس نے میرے چہرے کو حیرانی سے تکتے ہوئے کہا۔ اور فوراً میرے اس ہاتھ کو پکڑ لیا جسمیں اس چمکدار ذرّوں والے قیمتی سفوف کی ڈبیہ تھی۔ جسے عام طور پر "برف" کہا جاتا ہے +

اُس نے اس کو اچھی طرح دیکھا اور حقیقت حال اُس پر آشکارا ہوگئی۔ اُس نے کھڑکی کھولی اور ڈبیہ باہر پھینک دی۔ اور مجھے کمرے میں واپس لے آیا۔ یہ دس منٹ میرے لئے بڑی مصیبت کے تھے۔ وہ میرے انکار یا اصرار پر قطعاً کان نہ دھرتا تھا۔ اُس نے کہا کہ اسکو تو پہلے ہی شک ہوگیا تھا۔ جب اُس نے مجھے پہلے دیکھا تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ جو کچھ میں نے کیا سو کیا۔ اُسے مجھ سے اب بھی محبت ہے۔ لیکن وہ میری اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ میں

اُس کے سامنے دلفریب انداز میں مسکرائی اور وعدہ کیا کہ میں اپنی اصلاح کر دونگی لیکن اس وقت میرے ذہن میں یہ خیال گشت لگا رہا تھا کہ میں کوکین کس طرح حاصل کروں. میں بہانہ کر کے اُس کے پاس سے اُٹھی۔ اور بھاگ کر باغ میں چلی گئی اور خاک میں اُس ڈبیہ کو تلاش کرنے لگی۔ اُس نے مجھے وہاں پھر آ پکڑا۔ اور کھینچ کر اندر لے گیا *

وہ مجنونانہ خواہش پھر عود کر آئی۔ میں اُس سے لڑتی تھی آہ و بکا کرتی اور دیوانگی سے مارتی لیکن وہ بھی اپنی ضد پر قایم رہا۔ اور اس تمام رات مجھے مرنے نہ دیا *

صبح کو اُس نے ڈاکٹر کو بلایا۔ اور اس کے بعد کے چھ مہینے ایسے عذاب و عقوبت کے گزرے کہ خدا کرے کسی انسان کو خواہ وہ کسقدر ہی ذلیل کیوں نہ ہو دیکھنا نصیب نہ ہوں۔ وہ مجھے نرس کے گھر میں جانے نہ دیتا تھا۔ اُس نے گھر پر ایک نرس کو بلا لیا۔ اور وہ دونوں میری زندگی اور ہوش و حواس کے لئے جد و جہد کرنے لگے۔ یہاں تک کہ میں اُن کے کہنے پر چلنے لگی *

اب میں اس زبردست اور خوفناک خواہش پر قابو پا نا سیکھ گئی تھی جو میرے دماغ کو پاش پاش کر کے میری نگاہوں کو تیرہ و تار کر دیتی تھی۔ میں بتدریج صحت کی تدابیر پر عمل کر رہی تھی۔ میں چیخ و پکار کے بغیر اپنا منہ دھو سکتی تھی۔ اور بالوں میں کنگھی اور برش کر سکتی تھی *

چند مہینے کے بعد میں صحت یاب ہو گئی تھی *

میں اپنے ملاقات کے چھوٹے کمرے میں جس کو اُس نے پھولوں سے بھر دیا تھا۔ بیٹھی تھی۔ میں تنہا تھی اور اپنے اردگرد کی چیزوں کو حیرانی سے تک رہی تھی۔ میرے دل میں مستقبل کا خیال تھا۔ اور میں سوچ رہی تھی کہ میں کب دوبارہ لکھنے کے قابل ہونگی۔ میں اپنا منہ دیکھنے لگی۔ اس وقت میری نظر ایک چھوٹی سی ڈبیا پر پڑی جو ایک کمرے میں پڑی تھی۔ میں کبھی اس کو رکھ کر بھول گئی تھی۔ اس کو دیکھ کر میرے دل میں خوفناک جذبات پیدا ہوئے۔ جب میں نے چمکدار ذرّوں کا باریک سفوف دیکھنے کے لئے ڈھکنا اُٹھایا تو میرے ہاتھ کانپنے لگے *

یہ کوکین تھی کوکین جو میرے لئے صحت کے حیرت افزا جذبات، طاقت و قوت، تحریک اعصاب و ذہن مہیا کرتی رہی تھی۔ نا دانستہ طور پر میں نے ایک چٹکی بھری۔ یہ نہایت نازک موقعہ تھا۔ مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ میں ہمیشہ کے لئے غلام بن کر رہوں یا آزاد عورت۔ میرے چہرے پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے آ گئے۔ کوکین کھانے کی خواہش اپنے تمام جنوں کے ساتھ مجھ پر طاری ہو گئی۔ میرا منہ خشک اور کلا بند ہو گیا۔ مایوس ہو کر دو زانو ہوئی۔ اور کسی ایسی ہستی کے حضور میں دعا مانگی جو مجھ سے باہر تھی۔ —— یہ لمحہ خوفناک طور پر آہستہ آہستہ گزر گیا۔ بتدریج دماغ کا تناؤ کم ہوا۔ اور میری جان کا عذاب رخصت ہوا۔ تب ہوش آیا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک پتے کی مانند کانپ رہی ہوں *

لیکن میں اپنے اوّلین خوفناک ترین جنگ میں کامیاب ہو گئی ہوں۔ اور اس وقت سے ہر کوشش آسان ہے *

کیا یہ خواہش اب بھی میرے دل میں پیدا ہوتی ہے؟

ہاں اکثر اوقات اور نہایت خوفناک طور پر۔ لیکن اس کا نہایت شدت سے مقابلہ کرتی ہوں۔ اور میں دعا مانگتی ہوں کہ ایک دن آئے گا۔ میرے دل سے یہ خواہش قطعاً دور ہو جائے گی *

لیکن میں نے کہہ دیا "تم سے شادی نہ کرونگی" اگرچہ مجھے منزلِ مقصود تک پہنچنے کی قوی امید ہے۔ اس

کے لئے ایک مدّت درکار ہے +

یہ میرے ذاتی تجربات ہیں۔ جو میں اُن لوگوں کو بتانا چاہتی ہوں جو میری طرح منشیات کے غلام رہے ہیں۔ وہ متواتر مقابلہ کرتے رہیں۔ یہانتک کہ اُن کو موت کے تاریک غار سے انسانی زندگی کی روشنی کا راستہ مل جائے۔ میں اس مقابلہ میں کامیاب ہوں گی۔ ضرور کامیاب ہونگی۔ لیکن ایسے لمحے بھی ہوتے ہیں جب میری روح بھٹکنے لگتی ہے +

(ماخوذ)

حنیف ہاشمی

کلام ارشد

پختہ کار بنا دیتی ہے آخر میں خامی بھی ۔۔۔ مقبولِ خاصانِ عشق اب ہے مجھ سا عامی بھی

حسنِ خداداد اصنام ڈھونڈ رہا ہوں کعبہ میں ۔۔۔ ذوقِ کفر بھی رکھتا ہوں، جذباتِ اسلامی بھی

بھول نہ اے سرگرم کار پہلے اٹھانا پڑتا ہے ۔۔۔ سعیٔ حصولِ مقصد میں اندوہ ناکامی بھی

میرے ضبطِ نہاں کی اکثر ہوتی رہتی ہے ۔۔۔ اشک آلود آنکھوں سے غمّازی بھی نمامی بھی

اے دل تیری خودداری، لب انگیز بھی کرلیگی ۔۔۔ عشقِ رسوا کار میں ہے ذلّت بھی بدنامی بھی

شیخ ہوسنا کی پر تو رندوں کی حیراں کیوں ہے ۔۔۔ میخانہ میں کارِ ثواب ہے بادہ آشامی بھی

ملک و ملّت تک محدود رسمِ حسن و عشق نہیں ۔۔۔ اپنی عالمگیری سے ہے بین الاقوامی بھی

دنیا کے خیر و شر میں روز فرشتے لکھتے ہیں ۔۔۔ ذکرِ ناکارہ کے ساتھ آپ کا نامِ نامی بھی

آن کی جفاؤں کی تاویل اپنی خطاؤں کا اقرار

ہے آئینِ عشق مگر ارشد خود الزامی بھی

ارشد تھانوی

سرمایہ داری

(خاص برائے نیرنگ خیال)

ہندو کیا ہیں؟ مسلم کیا ہیں؟ جھوٹی ذاتیں پاتیں ہیں
سب دولت کے الجھاؤ ہیں، سب دولت کی باتیں ہیں

مندر، گرجے، اونچے اونچے جگمگ جگمگ کرتے ہیں
نور عبادت کرنے والے بھوکے ننگے مرتے ہیں

تعمیریں ہیں خیراتیں ہیں، پیچ اور تعمیر نہ ہوتے ہیں
یوں دامن سے خون کے دھبّے دولت والے دھوتے ہیں

مذہب کیا ہیں؟ راہگزر ہیں اک منزل کو جاتے ہیں
پنڈت، ملّا آپ بھٹک کر اوروں کو بہکاتے ہیں

روسی ہیں یا افریقی ہیں، ہندو یا عیسائی ہیں
دولت کے برچھوں کے زخمی سارے بھائی بھائی ہیں

بے تعریفیں یہ تقسیمیں سرمائے کی گھاتیں ہیں
گورے کالے سب اُس کے ہیں جس کے دن او راتیں ہیں

تاثیر

(حقوق محفوظ)

"طلسمِ راز"

(از جناب مولانا محمود الحسن صاحب خسترو، سابق پرنسپل جمالیہ عربک کالج مدراس)

نالۂ دل فگار ہوں، آہِ جگر گداز ہوں
شرحِ الم سناؤں کیا، پیکرِ سوز و ساز ہوں

کھو گیا دل تو کیا ہوا، جانِ حزیں گئی تو کیا
کشتۂ بیخودی کہ میں، خود سے بھی بے نیاز ہوں

موت و حیات کا گزر. عالمِ کیف میں کہاں
مستِ خمارِ بادۂ نرگسِ نیم باز ہوں

میری خودی و بےخودی، ہو دو نیو دپر نہ جا
مجھ کو فسانہ مت سمجھ، میں ہی طلسمِ راز ہوں

محرمِ رازِ عشق کو، دیر و حرم سے کام کیا
محوِ طوافِ شعلۂ شمعِ حریمِ ناز ہوں

چاہیئے عشق کے لئے، حوصلۂ وفا طلب
میں تو فریب خوردۂ جانِ بہانہ باز ہوں

خسترو! حریمِ عشق میں، میری حقیقت اور ہے
جلوہ گہِ مجاز میں، آئینۂ مجاز ہوں

خسترو

شاعر!

تری نغمہ سرائی مہبطِ پیغامِ یزدانی
ودیعت ہے تری تخمیر میں ادراکِ روحانی

تری فطرت میں ہے مستور اک ہنگامہ آرائی
تری ہر تان ہے معمورِ اعجازِ مسیحائی

ہے تیری خامشی گویا سکوت ارتعاش انگیز
نوا پیرائی تیری اشہبِ جذبات کو مہمیز

ترے دستِ تخیل نے وہ کھینچی حسن کی تصویر
کہ جس پر ہوگئی قائم وجودِ عشق کی تعمیر

اشارے پر ترے اے مصدرِ لمعاتِ موسیقی!
فضائے آسمانی میں ہوا رقص ہم آہنگی

بہ یک آہنگ ہے تیرا تصوّر لامکاں پیما
بہ رنگِ عرصۂ محشر ترے جذبات کی دنیا

حجابِ معنیٔ کون و مکاں ہے تیری خاموشی
تجھے زیبا نہیں الفاظ سے رسمِ ہم آغوشی

محمد میاں جاذب دہلوی

"آغازِ بہار"

پھر سے ہے چشمِ جہاں میں مئے عشرت کا خمار
پھر فضا دہر کی ہے آئینہ پردازِ بہار

پھر سے دنیا میں نئی انجمن آرائی ہے
پھر فلک دیدۂ اختر سے تماشائی ہے

پھر چلی سرد ہوا۔ آئے ہیں دن پینے کے
پھر سے پیدا نئے آثار ہوئے جینے کے

پھر کھلے پھول چٹکنے لگیں کلیاں ہر سو
پھر ہوئے مرغ نوا سنج ثناخواں ہر سو

پھر مرا مرغِ تخیل ہوا گرمِ پرواز
پھر ہوا از سرِ نو جوشِ جنوں کا آغاز

پھر کوئی آگ نشیمن میں لگا دے لا کر
پھر سے بجلی کوئی خرمن پہ گرا دے آکر

پھر مرے روتے ہوئے دل کو رُلاتی ہے بہار
پھر سے بھولے ہوئے دن یاد دلاتی ہے بہار

پھر ہیں اک بزم میں بیٹھے ہوئے یارانِ وطن
پھر ہم باغ میں ہیں سارے رفیقانِ چمن

پھر مری آنکھ کے آگے وہی اگلے دن ہیں
پھر وہی عیش کے جلسے ہیں وہی ہم سن ہیں

وہی محفل ہے وہی دور وہی ہمدم ہیں
وہی ساقی ہے تقاضے بھی وہی پیہم ہیں

وہی غارت گرِ ایماں سرِ محفل پھر ہے
میرے پہلو میں تڑپتا ہوا اک دل پھر ہے

مظفر حسین شمیم۔ از کلکتہ

ریختی

(از جناب رنجور عظیم آبادی مرحوم)

غرض سرمہ لگانے سے۔ نہ مطلب پان کھانے سے
ہوئی خاصی فرنگن اختری تعلیم پانے سے

بُوا! فرصت نہیں ہے مجھکو جنکی مدح گانے سے
اُنہیں کیواسطے میں ہوں بری سارے زمانے سے

بہن! بازار سے کیوں دال اور آٹا منگاتی ہو
تمہیں درکار جو ہو۔ لو ہمارے مودی خانے سے

زلیخا کی طرح کیوں مول لوں اِک دردِسر۔ باجی
کوئی یوسف سہی۔ میں باز آئی دل لگانے سے

عوض پاجامہ وشلوار کے میں گون کیوں پہنوں
مجھے کیا نفع انگلش لیڈیوں کا منہ چڑھانے سے

نہ بابا۔ میں انہیں بیٹی نہ دونگی کچھ بھی ہوجائے
پناہ اللہ کی اقبال مرزا کے گھرانے سے

کہاں ممکن کہ بی بی کو وہ نظروں سے جُدا رکھیں
وہ دیکھو۔ آرہے ہیں پیارے مرزا زچہ خانے سے

دیا جب دیدہ ودانستہ سوکن پر امامی کو
تو اب کیا فائدہ۔ اے اصغری آنسو بہانے سے

بجا ہے۔ تم نے اُس قحبہ کو دیکھا بھی نہیں اب تک
ہٹو۔ کیا فائدہ بیکار بھی باتیں بنانے سے

کسی کی نوج اُسکی سی محترم کی ہو پیدائش
اُسے ہے کام روز و شب بس اک آنسو بہانے سے

میاں رنجور یوں سو بار آئیں اپنی مرضی سے
مگر ممکن نہیں آپا کہ وہ آئیں بلانے سے

(غیر مطبوعہ) — رنجور

جذباتِ بسمل

(جناب بسمل الہ آبادی)

ساز ہستی کا عجب جوش نظر آتا ہے
اک زمانہ ہمہ تن گوش نظر آتا ہے

حسرتِ جلوۂ دیدار ہو پوری کیونکر؟
وہ تصور میں بھی روپوش نظر آتا ہے

شانۂ یار پہ بکھری تو نہیں زلفِ دراز
ہر کوئی خانماں برباد نظر آتا ہے

عاشقِ زار کی فریاد میں تاثیر نہیں
یہ سمجھ سوچ کے خاموش نظر آتا ہے

موسمِ گل نہ رہا دل نہ رہا جی نہ رہا
پھر بھی وحشت کا وہی جوش نظر آتا ہے

پھر ذرا خنجرِ قاتل کو خبر دے کوئی
خونِ بسمل میں وہی جوش نظر آتا ہے

غزل

(مشاعرۂ آل انڈیا سکندرہ راؤ ضلع علی گڑھ)

ہمیں تو آجتک اک زعم تھا جذباتِ پنہاں پر
یہ کیسے خون کے قطرے رُکے ہیں آ کے مژگاں پر

فلک پر چشمِ حسرت خاک سر پر ہاتھ داماں پر
مری تصویر یوں کھینچی گئی ہے بابِ زنداں پر

تجھے بھی کچھ خبر ہے سونیوالے بامِ غفلت کے
بہت کچھ رات بھاری ہو گئی بیمارِ ہجراں پر

مری دیوانگی بھی کس قدر ہشیار رہتی ہے
کسی جانب اُٹھاؤں ہاتھ پڑتا ہے گریباں پر

زہے تقدیر معراجِ محبت آج حاصل ہے
کہ میّت میرے دل کی اُسنے اُٹھوائی ہے پیکاں پر

کسی کو قید سے شاید رہائی دی ہے ظالم نے
جنازہ آج اک رکھا ہوا ہے بابِ زنداں پر

گذشتہ عہد کے بھی کتنے بھولے لوگ ہوتے تھے
سمجھ رکھی تھی معراجِ جنوں چاکِ گریباں پر

یہ کیوں چادر اُڑھا دی چارہ گر نے دیکھکر نبضیں
یہ کیا وقت آ پڑا یا رب مریضِ شامِ ہجراں پر

مٹا دے ہاں مٹا دے اے فلک تو میری تربت بھی
یہ داغِ بدنما ہے دامنِ گورِ غریباں پر

اُدھر تارے ہوئے بے نور مرغانِ سحر بولے
اِدھر چھائی سفیدی چہرۂ بیمارِ ہجراں پر

نکلتی ہیں جو فرطِ غم سے ابر آہیں اسیروں کی
گریں گی بجلیاں بن کر یہی اک روزِ زنداں پر

ابر انصاری گنّور ضلع بدایوں

رسایل کی ڈائری

جامع ازہر کی تجدید و اصلاح کا دور

جامع ازہر مصر اس وقت دنیا کی سب سے پرانی درسگاہ ہے۔ اس کا سنگ بنیاد حکومت مابلہ کے ایک نوجوان سپہ سالار جوہر کے ہاتھوں نے رکھا تھا۔ جب خلفائے فاطمیہ کا دارالحکومت شمالی افریقہ سے مصر میں منتقل ہوا تو اس مدرسہ کی ترقی کی مخصوص صورتیں پیدا ہو گئیں۔ لیکن دولت فاطمیہ کے شیعہ ہونے کی وجہ سے عالم اسلام نے اس طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ لیکن جب دولت ایوبیہ کا دور آیا جو سنی دولت تھی تو وہ تمام اسلامی ممالک کا مرکزی جامع بن گیا۔ یہاں تک کہ اس کو ترقی کے بلند ترین مدارج حاصل ہوئے۔ لیکن جب ترقیوں کا بلند ترین معیار پورا ہو چکا تو اس کا ردعمل بھی شروع ہوا۔ اور رفتہ رفتہ اس کی تعلیمی، اخلاقی اور انتظامی حالت میں انحطاط شروع ہوا۔ یہ اس دور میں سے گزر رہا تھا کہ مغربی علوم و فنون اور خیالات و معتقدات کا ایک سیلاب مشرق کی طرف بڑھتا ہوا آیا جس سے مشرقی مدارس کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں۔ مشرق میں ہر جگہ جدید و قدیم کی جنگ شروع ہو گئی۔

ہندوستان میں جدید و قدیم خیالات کے علما نے ایک   کی طرف قدم بڑھایا۔ ایک جدید ادارۂ "ندوۃ العلما" کے نام سے قایم کر کے اس معرکہ آرائی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ لیکن مصر میں کسی ایسے جدید ادارے کی بنیاد رکھنا مشکل تھا۔ اس لئے وہاں کے روشن خیال علما نے یہی فیصلہ کیا کہ جامع ازہر ہی کی تجدید کی جائے۔ اس کی قدامت پسند علما نے مخالفت بھی کی۔ لیکن پھر بھی جامع کے چند نوجوانوں کو تعلیم جدید کے لئے یورپ بھیجا گیا۔ اور اس سے ابتدائی دور میں چند نہایت قابل اشخاص پیدا ہوئے۔ اس کے بعد اس کے بعد ازہر کی ریاست شیخ محمد عبدہٗ کو دی گئی۔ جنہوں نے اس کی اصلاح کی بڑی کوشش کی۔ شیخ محمد عبدہٗ کی اصلاحات کا اہم ترین کارنامہ نصاب تعلیم اور طریق تعلیم کی اصلاح ہے۔ اُنھوں نے ریاضی، تاریخ، جغرافیہ وغیرہ کو نصاب میں داخل کر دیا۔ اور انگریزی، فرانسیسی اور فارسی کا ایک عظیم الشان کتب خانہ قایم کیا۔

ان کے بعد   زغلول پاشا کے زریں عہد کی اصلاحات میں امتحانات کا تقرر ہے۔ اس اصلاح کا نتیجہ نہایت اہم اور مفید ثابت ہوا۔ اب   کی بجائے سینکڑوں طلبہ ہر سال فارغ التحصیل ہونے لگے۔ لیکن قدیم و جدید کی معرکہ آرائی ان چند اصلاحات سے دور نہ ہو سکی۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے ازہر سے اپنے مقاصد کی تکمیل سے مایوس ہو کر ایک جدید مدرسے "دارالعلوم" کی بنیاد ڈالی۔ حکومت چاہتی تھی کہ سرکاری مدارس میں علم ادب کی تعلیم کے لئے ازہر کے فارغ التحصیل طلبا کا تقرر کیا جائے۔ لیکن

وہ جدید طریقِ تعلیم سے نا آشنا تھے۔ اس کے بعد قضات کا مسئلہ حکومت کے سامنے پیش ہوا۔ ازہر کے طلبا اس کے بھی نا اہل ثابت ہوئے۔ چنانچہ حکومت نے "مدرسہ قضاۃ شرعی" کے نام سے ایک مدرسہ کھولا اور یہیں کے فارغ التحصیل طلبا عہدۂ قضا پر مامور ہونے لگے۔

جامع ازہر کے ساتھ حکومت کی اس معاندانہ روش کا انجام نہایت تلخ ثابت ہوا۔ لیکن مصر کی خوش قسمتی سے گذشتہ سال سے ازہر کی باگ ایک روشن خیال عالم شیخ محمد مصطفیٰ مراغی کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ وہ ازہر کے فارغ التحصیل عالم ہیں اور انگریزی زبان بھی جانتے ہیں۔ اور اس سے پہلے سوڈان اور مصر میں حکومت کے معزز عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں۔ انہوں نے ازہر کو ہاتھ میں لیتے ہی نئے ولولہ کے ساتھ تجدید و اصلاح کا کام شروع کر دیا ہے۔ اور ساتھ ہی حکومت کی اس معاندانہ روش کو بھی روکنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ جو مدت سے جاری تھی۔ وزارت اوقاف نے فیصلہ کیا تھا کہ "دارالعلوم" اور مدرسہ قضا شرعی کے نمونہ پر وعظ و پند کے طریقوں کی تعلیم کے لئے ایک نئے مدرسے "وعظ و ارشاد" کی بنا ڈالی جائے۔ حکومت نے اس کے بجٹ کی منظوری بھی دے دی تھی۔ لیکن عین موقع پر شیخ مراغی نے مدافعت کر کے اس تحریک کا خاتمہ کر دیا۔

اس وقت شیخ مراغی اصلاح جامعہ کے متعلق جو اہم قدم اُٹھانے والے ہیں اس کا مجمل سا خاکہ یہ ہے کہ ازہر اعلیٰ تعلیم کے لئے مخصوص کر کے جدید یونیورسٹی کے اصول و معیار پر لایا جائے۔ جامع اس صورت میں تین شعبوں پر مشتمل ہو گا (۱) کلیہ شرعیہ اسلامیہ (۲) کلیہ لغتہ عربیہ (۳) ... ان تینوں کالجوں میں قدیم و جدید مشرقی اور مغربی علوم اور زبانوں کی تعلیم بھی دی جائیگی نظم و نسق درس و تدریس اور امتحانات بھی جدید اصول پر ہونگے۔ ازہر کے اس جدید قالب میں حقیقی اسلامی ذہنیت اور اسلامی روح موجود ہو گی جس کو وہ ثقافت اسلامی کے نام سے موسوم کریں گے۔ (ملخص از معارف)

ترکی اور جنگ عظیم

جنگ عظیم میں ترکی کی شرکت ایک ایسا امر ہے جس پر سیاسی حلقوں میں اب تک بحث و تمحیص رہتی ہے کہ وہ کیا وجوہات تھیں جن کی بنا پر ترکی نے اتحادیوں کا ساتھ دینے کی بجائے جرمنوں کی رفاقت اختیار کی۔ اب تک اسی موضوع پر مختلف آرا کا اظہار کیا جا چکا ہے۔ اور عوام الناس میں یہی خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں ایک جرمن بربریت و درندگی کا مجسمہ تھے۔ دوسری طرف اتحادی امن و امان کے فرشتے تھے لیکن خالدہ ادیب خانم کے ایک ترکی مضمون سے جس کا ترجمہ "جامعہ" دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس خیال کی تردید ہوتی ہے۔ وہ لکھتی ہیں:-

"جنگ عظیم کے اعلان پر ان دنوں ترکی میں کوئی یہ خیال بھی نہ کرتا تھا کہ اس کا نتیجہ ایسی عالمگیر تباہی کی شکل میں نکلیگا

اس تباہی کی ذمہ داری پہ میں بحث نہ کرونگی۔ اگر جرمنی کو معاشی اور فوجی ترقی اور اُس کا مادی فلسفۂ جنگ کے معین تھے تو اب یہ بھی تو معلوم ہو چکا ہے کہ اتحادیوں کی طرف ایسی ہی مادی اسباب اور اتنی ہی جارحانہ تیاریاں عرصہ سے جاری تھیں"۔

"اپنی شمولیت جنگ کی وجہ بتانے سے پہلے میں قارئین کرام کی توجہ تین خاص کتابوں کی طرف منعطف کرانا چاہتی ہوں۔ جن سے واقعات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ پہلی کتاب تو پروفیسر آرل کی تصنیف بغداد ریلوے ہے جو ۱۹۲۳ء میں شایع ہوئی تھی۔ مصنف غیر متعصب آدمی ہے حق بات معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اور ایسے زمانے میں اس نے کتاب لکھی ہے جب دونوں طرف سے پروپیگنڈہ کے بادل چھٹ چکے تھے۔ اس لئے معاملات کو صاف صاف دیکھتا ہے اور چونکہ کتاب خاص معاشی ہے۔ اس لئے جو شخص اس معمہ کو سمجھنا چاہتا ہے جس کی وجہ سے یہ کشمکش ہوئی۔ اُسے اس کتاب میں نہایت اچھی اور غیر جانبدار سند ملیگی۔ دوسری کتاب روسی سفارتخانہ قسطنطنیہ کے ترجمان اوّل منڈلسٹن کی تصنیف ہے۔ سلطنت عثمانیہ۔ یہ کتاب ۱۹۱۷ء میں شایع ہوئی تھی۔ مصنف نے نوجوان ترکوں کی بابت بہت زیادہ مواد جمع کیا ہے۔ اور اُن اسباب کی بابت جنہوں نے ترکی کو جرمنی کی طرف شریک جنگ کرایا۔ اس مصنف کا بس ایک مقصد ہے اور اُس نے اپنا تمام مواد اسی بات کو ثابت کرنے کے لئے جمع کیا ہے۔ اور اسے ہر طرح توڑ مروڑ کر اسی کام کے لئے استعمال کیا ہے۔ اس کا نقطۂ نظر کم و بیش وہی ہے۔ جس پر ان دنوں میں ساری دول اتحادی نہایت شدت کے ساتھ اندھے پن اور تنگ دلی سے یقین رکھتی ہے! ان

مصنف کے دلائل کی روح یہ ہے کہ ترکی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے چاہئیں۔ ترکوں کو معمولی انسان نہ سمجھنا چاہئے اور نوجوان ترکوں کو تو ارمنیوں کے قتل کے باعث عادی مجرم جاننا چاہئے"۔

منڈلسٹن کی کتاب کے مخالف ایک تیسری کتاب ہے، اس کا نام "اسباب جنگ" ہے اور یہ یوفی چے دیچ کی تصنیف ہے اور حال میں ہی پیرس سے شایع ہوئی ہے۔ اس میں اُن سیاسی رجحانات کا ذکر ہے جو جنگ سے پہلے دنیا پر چھائے ہوئے تھے۔

میں خود جنگ کی مخالف ہوں اور شرکت جنگ کی حمایت نہیں کرتی۔ لیکن اگر کوئی ان نوجوان ترک قائدوں کی ذہنی کیفیت سمجھنے کی کوشش کرے تو اسباب بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔ " پہلا سبب تو خود مختاری کی خواہش تھی یعنی غیر ملکیوں کے مراعات کو مٹا دینے کی خواہش نوجوان ترکوں نے بہت خواہش کی۔ اتحادی دول کی ہمدردی حاصل کریں۔ لیکن بے سود۔ اتحادی انہیں غیر جانب دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کے عوض کچھ دینے کو تیار نہ تھے۔ دوسرا سبب کا موروثی اور جائز خوف۔ یہ اور بات ہے کہ روس کو قسطنطنیہ دینے کا وعدہ ۱۹۱۴ء میں کیا گیا یا ۱۹۱۵ء میں۔ نوجوان ترک یہ ضرور جانتے تھے کہ روایتی اور سیاسی اعتبار سے روس انگلستان کا دشمن ہے اور اسے پھانسنے کے لئے انگلستان ترکی کو ضرور نرم چارہ کی طرح استعمال کرے گا۔ تیسرا سبب ترکی کی افسوسناک مالی حالت تھی۔ غیر جانبدار رہنے کے لئے بھی ترکی کو مالی مدد درکار تھی۔ اور یہ مالی مدد انگلستان سے نہ مل سکتی تھی۔ دور حاضر کے ایک معروف مدبر نے مجھ سے بیان کیا کہ جب انگلستان نے ہمارے جہاز ضبط

گئے اور اُن کے دام دینے سے بھی انکار کیا تو حکومت پر جنگ کے موافق عنصر کا بہت اثر پڑا۔ اور وہ اس طرح ڈھل گئی۔ چوتھا سبب اتحادیوں کا کھلم کھلا اور متعصبانہ طور پر عیسائیوں کی حمایت کرنا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پانچواں سبب جرمنی کو ترکی کی کمزوریوں سے پوری پوری ذہنی و نفسی واقفیت تھی اور اس نے صحیح لمحہ کے انتخاب میں نہایت ہوشیاری سے کام لیا"۔

نوجوان ترکوں نے عوام کو اتحادیوں کے خلاف اُبھارنے میں اپنی تمام تر کوششیں صرف کردیں لیکن تعجب کی بات ہے ترکی رائے عامہ اس وقت اتحادیوں کے خلاف ہوئی اور نوجوان ترکوں کے دلائل کو اس نے اس وقت صحیح تسلیم کرنا شروع کیا۔ جب نوجوان ترک برسر اقتدار نہ رہے۔

۱۹۱۴ء میں عام آبادی ہی نہیں بلکہ خود اتحاد و ترقی کے اکثر اہل فکر و بااثر لوگ جنگ کے مخالف تھے۔ صرف انور پاشا اپنی مختصر سی جمعیت کے ساتھ جنگ کے لئے اڑے ہوئے تھے۔ جمال پاشا وزیر بحر سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے اس خیال کے جواب میں کہ مجھے ڈر ہے حکومت جنگ کی طرف جا رہی ہے۔ وہ ہنسے اور مجھے بتایا کہ اُن کے پاس اسقدر قوت موجود ہے کہ وہ جنگ کے مانچو سمجھا کر جنگ میں شریک نہ ہونے دیں۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ اگر اُنہیں ناکامی ہوئی تو وہ وزارت سے مستعفی ہو جائینگے یہ بات شروع اکتوبر کی ہے۔ لیکن اس مہینہ کی اٹھارہ کو ترکی جنگ میں شریک ہوگیا۔ لیکن جمال پاشا نے استعفےٰ نہ دیا۔ وہ روسی محاذ پر افسر لشکر مقرر ہوئے۔ وہ خوب بشاش تھے۔ اور اپنی رائے میں تبدیلی کے وجوہ بیان کرتے تھے۔ اُن کی خاص دلیل وہی روس والی دلیل تھی اُنہیں یقین تھا کہ اگر اتحادی جیتے تو قسطنطنیہ روس کے ہاتھ چلا جائے گا۔ اور چونکہ غیر جانب داری کی صورت اتحادی کوئی کافی ضمانت نہیں دیتے۔ اس لئے ترکی فوج کا یہ فرض اول ہے کہ روس کے مخالفوں کی مدد کرے اگر جرمنی اور ترکی کامیاب رہے تو وہ مکمل طور پر آزاد ہو جائیگی اور غیر ملکی مراعات کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائیگا۔

"اگر اتحادی اُس وقت مراعات کے ہٹا دینے پر راضی ہو جاتے۔ اور قسطنطنیہ کی بابت کوئی یقین دلا دیتے تو خوجی جماعت ترکی کو جنگ میں گھسیٹ سکتی"۔

ایلومنیم کے برتن

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کے سہ ماہی رسالہ سائنس میں جناب حامد علی خاں صاحب بی اے جائنٹ ایڈیٹر ہمایوں کا ایک مضمون اس عنوان سے شایع ہوا ہے۔ عوام میں یہ خیال عام طور پر مشہور ہے کہ ایلومنیم کے برتنوں کو کھانے پینے کی چیزوں کے لئے استعمال کرنا مضر صحت ہے اس مضمون میں بتایا گیا ہے کہ اس دھات کے برتن پہلے پہل ۱۸۹۲ء میں بنائے گئے۔ اس کے بعد جوں جوں اس کی قیمت میں کمی ہوتی گئی۔ اس کی تجارت کو بھی فروغ ہوتا گیا۔ غالباً ۱۹۱۲ء یا ۱۹۱۳ء میں کسی شخص نے اس کے استعمال کے متعلق سوال اٹھایا اور کچھ عرصہ بعد یہ خیال لوگوں

کے دلوں میں اچھی طرح جاگزیں ہو گیا کہ ان برتنوں میں کھانا پکانا واقعی صحت کے لئے مضر ہے۔ اور اکثر نے اسکا استعمال ترک کر دیا۔ امریکہ کے علمی رسالے سائنٹفک امریکن کے دفتر میں ایلومنیم کے برتنوں کے متعلق بہت سے استفسارات موصول ہوئے۔ مسٹر ایلبرٹ اے۔ حالکاس اس کے متعلق تمام تحقیقی شہادتیں سننے پر مامور کئے گئے اور ایلومنیم کی صنعت کے مرکز نیو کینگٹن کا سفر اختیار کیا گیا۔ اور آخر نتیجہ اخذ کیا گیا کہ اس کے مضرت رساں ہونے کے متعلق جسقدر افواہیں ہیں غلط ہیں۔ انگلستان کے ایک مشہور طبی رسالے "لانسٹ" نے تجربہ سے ثابت کیا کہ پانی اور مختلف اغذیہ پکنے کے دوران میں اس دھات پر لوہے سے زیادہ اثرانداز نہیں ہوتیں جو مدت ہائے مدید سے کھانا پکانے کے برتنوں کے لئے مستعمل ہوتا چلا آیا ہے۔

یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ ایلومنیم کے نمکوں کی طرح لوہے کے نمک بھی بمقدار کثیر انسان کے جسم کے لئے مضر ہیں۔ لیکن ہم یہ کسی طرح ثابت نہیں کر سکتے کہ پکانے کے معمولی عمل کے دوران میں لوہا اور ایلومنیم اس شدت سے اثر پذیر ہوتے ہیں کہ اس سے قابل حل نمکوں کی ایک مضرت رساں مقدار پیدا ہو جائے"۔

اس رسالے کا خیال ہے کہ چونکہ کھانا پکانے کے دوران میں اس دھات کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ اور

. . . .

یہ خیال بھی غلط ہے کہ اس سے کسی قسم کا زہر پیدا ہوتا ہے اور چونکہ یہ برتن اعلیٰ درجہ کے موصل حرارت ہیں۔ جس سے وقت اور ایندھن دونوں بچتے ہیں۔ اس لئے انہیں استعمال کرنا چاہئے۔ ممالک متحدہ امریکہ میں حفظ صحت کے ایک بہت بڑے قید خانے کے صدر ڈاکٹر میکائی نے بتایا ہے کہ ایلومنیم کے برتنوں میں کسی قسم کے مضر خواص موجود نہیں ان کے تجربہ خانہ میں اس کے متعلق استفسارات موصول ہوئے ان کے جواب وہ ہمیشہ یہی دیتے ہیں:-

"پکانے کے عمل سے خوراک میں ایلومنیم کی جو مقدار حل ہوتی ہے اس کے متعلق خود ہم نے جو تجربے کئے ہیں ان سے یہ ظاہر ہوا ہے کہ ایلومنیم کی یہ حل شدہ مقدار اس قدر قلیل ہوتی ہے کہ اگر خوراک کے دس لاکھ حصے کئے جائیں تو اس میں ایلومنیم کا بمشکل ایک حصہ موجود ہوگا۔ ایلومنیم کی اتنی مقدار یوں بھی کھانے پکانے کی چیزوں میں پائی جاتی ہے۔ بلکہ پینے کا جو پانی کیمیائی طریق سے صاف نہ کیا گیا ہو اس میں عام طور پر ایلومنیم کی اس سے کہیں زیادہ موجود ہوتی ہے۔ اس امر کا ذکر میں نے اس لئے کیا ہے کہ پانی صاف کرنیکا عام کیمیائی طریق یہی ہے کہ ایلومنیم اور چونے کو پانی میں حل کر دیا جائے جس سے پانی میں ایلومنیم کی مقدار اور بھی بڑھ جاتی ہے"۔

ان قابل اعتماد شہادتوں کے بعد اس دھات کے برتنوں کے استعمال میں کسی قسم کا تامل نہیں ہو سکتا۔ اور یہ برتن اقتصادی اور طبی نقطۂ خیال سے اس ترقی یافتہ دور میں ہر طرح قابل ترجیح ہیں۔

مسئلہ تولیدِ صنف

عرصہ دراز سے اس امر پر غور کیا جا رہا تھا کہ کیا ہم حسب خواہش لڑکا یا لڑکی پیدا کر سکتے ہیں۔ طب کے ارتقا کے ساتھ ہمیشہ اس مسئلہ پر غور کیا گیا۔ یونان و مصر و ہندوستان کے اطبا نے مختلف نظریئے قایم کئے جو پانسو کے تگ بھگ ہیں۔ ذیل میں ہم اطباء جدید کی ساعی و افکار کے نتائج پیش کرتے ہیں جو مشیر الاطباء اکتوبر میں شایع ہوئے ہیں:-

امریکہ کے ایک ڈاکٹر شاک وید نے اس امر کی خصوصیت سے تفتیش کی ہے۔ اس نے مختلف خاندانوں اور جانوروں کی نگرانی کی۔ ان میں سے ایک تجربہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر کے ایک دوست نے اُسے بتلایا کہ میں بتلا سکتا ہوں کہ اب کے میرے ہاں لڑکا ہوگا یا لڑکی۔ اس کی وجہ آپ نے بتائی کہ استقرارِ حمل کے زمانہ میں میری بیوی خوب کام کرتی ہے تو اُس کے ہاں لڑکا ہوتا ہے۔ مگر جب وہ غیر معمولی سُست ہو جاتی ہے تو اُس کے ہاں لڑکی پیدا ہوتی ہے ٭

اس قسم کے تجربات سے ڈاکٹر نے حسب ذیل نتائج اخذ کئے ہیں ٭

اگر عورت تندرست اور قوی ہو اور وظیفہ طبعی کے وقت جوشش طبع ہو تو عموماً لڑکا پیدا ہوگا۔ خصوصاً اگر اُسکا شوہر نسبتاً کم قوی ہو۔ یا کسی وجہ سے اُس کے قویٰ کمزور ہوں ٭

(۲) اگر عورت نسبتاً کمزور ہے وظیفہ طبعی کے وقت کم متوجہ ہوتی ہے تو لڑکی پیدا ہوگی۔ خصوصاً جب مرد قوی اور عورت کسی وجہ سے مضمحل ہو ٭

ان کے علاوہ چند اور مشاہدات بھی قابل ذکر ہیں:-

۱۔ زراعت پیشہ عورتوں کے ہاں زیادہ تر لڑکے ہوتے ہیں کیونکہ وہ قوی ہوتی ہیں ٭

۲۔ مذہبی خیالات کی عورتوں کے ہاں زیادہ تر لڑکیاں ہوتی ہیں۔ کیونکہ ان میں خاص جذبات کم ہوتے ہیں ٭

۳۔ شہروں کی راحت طلب عورتوں کے ہاں زیادہ تر لڑکیاں ہوتی ہیں۔ کیونکہ عام طور پر کم کام کرنے کی وجہ سے اُن کے اعضا قوی نہیں ہوتے ٭

۴۔ اگر اٹھارہ بیس سال کی عورت کی شادی تیس پینتیس سال کے مرد سے کی جائے تو لڑکیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ اور اگر بیس پچیس سال کے مرد سے پچیس سے پینتیس سال کی عمر کی عورت سے شادی کی جائے تو لڑکے زیادہ ہوتے ہیں ٭

ان تمام مشاہدات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ عورت کے قوی ہونے کی صورت میں لڑکا اور کمزور ہونے کی صورت میں لڑکی ہوتی ہے ٭

ایجنٹ

کردار　ایک نوجوان مرد

ایک شوخ و شریر حسین لڑکی

منظر: گرمی کی ایک صبح۔ شاہراہ کا ایک خاموش گوشہ

ایک شوخ و حسین لڑکی دلربائی کے انداز میں اپنے لباس پر خود فروشانہ نگاہیں ڈالتی ہوئی آتی ہے اور بنچ دیکھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ اسی کی عمر کا ایک خوش پوشاک و خوش صورت نوجوان مرد آتا ہے۔ جیسے ہی وہ قریب آتا ہے۔ وہ ایک پاؤں سے دوسرے کا جوتا اتارتی ہے۔ اور چہرے سے جانکاہ درد و تکلیف ظاہر کرتی ہے۔ وہ اس کے قریب آکر ٹھٹک جاتا ہے۔ اور اس کے پاؤں کی طرف دیکھتا ہے

مرد (تملق سے) کس قدر حسین پاؤں ہے!

لڑکی تمہارے لیے یہ حسین ہو سکتا ہے۔ لیکن میری تو جان عذاب میں ہے

مرد۔ کیوں کیوں۔ خیر باشد۔ ہوا کیا ہے؟

لڑکی۔ پتہ نہیں۔ میں ساحل پر سیر کر رہی تھی کہ یکایک ایڑی میں شدت سے درد ہونے لگ گیا

مرد۔ شاید کسی گھونگے نے کاٹ لیا ہو

لڑکی۔ ہنسی اڑانی تمہیں خوب آتی ہے۔ یہیں درد ہو رہا ہے

مرد۔ متاسف ہوں۔ معاف کر دیجیے

لڑکی۔ میرا خیال ہے کیل ہے کوئی۔

مرد۔ لاؤ تو دیکھوں؟

(وہ اپنا جوتا دیتی ہے)

لڑکی (شرماتے ہوئے) صرف ایک جوتے سے میں کہانی کی ملکہ معلوم ہوتی

مرد۔ اور میں افسانوں کی مملکت کا شاہزادہ! (جوتے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے) اندر سے تو بالکل نرم ہے۔ تم لڑکیاں ہمیشہ تنگ جوتے کیوں پہنتی ہو

لڑکی (غضبناک ہو کر ایک پاؤں پر کھڑے ہوتے ہوئے) تمہارا مطلب کیا ہے کہ میرے جوتے بہت تنگ ہیں

مرد۔ تم کہتی ہو پاؤں دکھتا ہے

لڑکی۔ اور اگر وہ بڑے ہوتے تو مجھے پاؤں کے ساتھ باندھنے پڑتے

مرد۔ لیکن عورتیں آرام کو نمائش پر قربان کر دیتی ہیں۔

لڑکی۔ تم ایک دفعہ مجھے جھوٹی لیاش ہی کیوں نہیں کہہ دیتے۔ فیصلہ ہو کہیں

مرد (احتجاج کرتے ہوئے) میری اچھی لڑکی۔ میں

. . . . . .

لڑکی۔ میرا جوتا دے دو۔ میں یہاں ایک منٹ بھی نہ ٹھہروں گی (جوتا پہنتی ہے)

مرد۔ ٹھہرو۔ دیوانی نہ ہو

لڑکی (ہنستے ہوئے) تم سے زیادہ ناہموار و ناتراش میں
نے کسی مرد کو نہیں دیکھا۔
مرد۔ ایک منٹ ہی ٹھہریئے۔ میں آپ کو کچھ نہیں کہتا
لڑکی۔ بات کرنے میں اتنی سختی۔ نہ کوئی ملائمت نہ
کوئی لجاہٹ
مرد۔ میں معافی چاہتا ہوں
لڑکی (بیٹھتے ہوئے) تم سے بات کرنے کا کیا فائدہ
اصلاح کی تو کوئی امید ہی نہیں
مرد۔ کیا اسقدر بُری بات ہے؟
لڑکی۔ بدترین۔ تم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ کسی لڑکی سے
بات کس طرح کیجاتی ہے۔ تمہاری تربیت تو کسی
نے کی ہی نہیں۔ ذرا اپنے پر ایک نظر تو ڈالو۔ یہ بھی
پتا نہیں کہ لباس کس طرح پہنا جاتا ہے
مرد (اپنے لباس کو محسوس کرتے ہوئے) کیوں کیا ہے
میرے لباس کو ——؟
لڑکی۔ کیا تم اپنے آپ کو خوش پوشاک سمجھتے ہو۔ ذرا ٹکٹائی
تو دیکھو اپنی!
مرد۔ بہترین دوکان سے پانچ روپیہ میں خریدی ہے
لڑکی۔ اور وہ بہائے کاج کا سفید پھول۔ گورکن
معلوم ہوتے ہو۔ گورکن
مرد (حیران ہوکر دلچسپی کے ساتھ) میری کوئی چیز درست
بھی ہے یا نہیں۔
لڑکی۔ تمہاری ناہموری اور بداخلاقی کی باتیں ہیں۔
مرد۔ کسی نے کبھی میرے اخلاق پر اس قسم کی نکتہ چینی نہیں کی
لڑکی۔ کیونکہ کسی میں کبھی اسقدر جرأت نہیں ہوئی۔ کہ
بے تکلفی سے تمہیں سچی بات کہہ سکے۔ اسمیں شک نہیں۔
کہ سوسائٹی میں رہتے ہوئے ہو لیکن معاف رکھنا ابھی
تمہیں آداب معاشرت طرز گفتگو اور —— حسن
اخلاق سیکھنا ہے۔
مرد۔ میرا خیال نہیں کہ . . .
لڑکی۔ یہی بات دیکھ لو۔ جب میں یہاں آکر بیٹھی تو تکلیف
میں تھی۔ میرے پاؤں میں شدت سے درد ہو رہا تھا
جب تم نے مجھ سے بات کی۔ تو اتنا بھی نہ ہو سکا۔ کہ
ٹوپی کا کنارہ چھو لیتے۔
مرد۔ لیکن میں خیال نہیں ——
لڑکی۔ اسی بات کا تو رونا ہے۔ تم خیال نہیں کرتے۔ اور یہ
اخلاق کا ہی پہلو ہے جس پر عورت کی نظر سب سے پہلے پڑتی ہے
مرد۔ متاسف ہوں —!
لڑکی۔ جب تم نے بات شروع کی تو بجائے اس کے کہ
میں یہ محسوس کرتی تم ایک نرم دل شریف مرد کی طرح
تکلیف کے موقعہ پر خواتین کی مدد کرتے ہو۔ تم نے الٹا
مجھ پر جھوٹ کا الزام لگانا شروع کر دیا۔
مرد (ثبات کے ساتھ) لیکن اکثر عورتیں اپنے پاؤں سے
چھوٹا جوتا پہنتی ہیں
لڑکی۔ اس قسم کی باتوں سے تم کسی عورت کے دل میں
جگہ حاصل نہیں کرسکتے
مرد۔ میں نے تو کوئی بری بات نہیں کی۔
لڑکی۔ دنیا وہ مرد تلاش کرتی ہے۔ جو آداب مجلس و معاشرت
سے آگاہ ہو۔
مرد۔ تمہیں ادب و آداب کا جنون معلوم ہوتا ہے

لڑکی۔ ہاں۔ اس لیئے کہ یہ نہایت اہم چیز ہے آداب ہماری
تعمیرِ معاشرت کی بنیاد ہے۔

مرد۔ میں آداب سے آگاہ ہوں

لڑکی۔ معاف رکھنا میں تو ماننے کو تیار نہیں۔

مرد۔ کیوں۔؟

لڑکی۔ میں ثابت کر سکتی ہوں۔

مرد۔ کس طرح؟

لڑکی۔ فرض کرو ہم کسی خاص تقریب میں شریک ہو رہے
ہیں۔ اسی تقریب میں جو مالی یا معاشرتی طور پر تمہارے
لئے مفید ہو۔ میزبان عورت تمہارا تعارف اپنی بوڑھی
خالہ سے کرانا چاہتی ہے۔ اسی موقعہ پر تمہیں آ جاتی ہے
چھینک۔ بتاؤ تم اس وقت کیا کرو گے۔؟

مرد۔ کروں گا کیا؟ چھینک دوں گا۔ بس!

لڑکی (خوش ہو کر) بس بس دیکھ لیا نہ۔ میں نے تو پہلے
ہی کہہ دیا تھا۔ غلط!

مرد۔ (خفیف ہو کر) اچھا تم کیا کرو گی پھر؟

لڑکی۔ میں کیا کروں گی؟ میں تعارف کرتے ہوئے سنجیدگی
کیساتھ جھکونگی۔ ایک طرف ہو کر اپنا رومال نکالونگی
اور پھر چھینکونگی۔ اور ہر شریف مرد اسی طرح کریگا

مرد۔ بس صرف چھینک کی بات ہی ہے نا۔ اور تو نہیں ہے؟

لڑکی۔ کبھی تم نے یہ کہہ کر کہ "آج بہت اچھا موسم ہے"
گفتگو شروع کی ہے۔ اور پھر چپ کر رہے ہو۔ اور کہنے
کو کوئی بات نہ ہو۔

مرد۔ ممکن ہے

لڑکی۔ تم جانتے ہو مہمانوں کو کس طرح ملنا چاہیے۔ اور
جب وہ تمہارے پاس آئیں تو ان کے آرام و آسائش
کیلئے کیا کرنا چاہیے۔ جب تمہارے دوست تم سے
ملاقات کرنے آتے ہیں تم کیا کرتے ہو؟

مرد۔ کرتا کیا ہوں سگار پیش کرتا ہوں۔ پینے کیلئے کچھ منگاتا
ہوں۔ اور وہ اکثر پی لیتے ہیں۔

لڑکی۔ یہ تو کافی نہیں۔ اگر کسی خاتون کے سامنے پر تمہارا
پاؤں پڑ جائے تو پھر؟

مرد۔ پھر کیا۔ میں بہت ہی خوش ہوں!

لڑکی (سر ہلاتے ہوئے) اچھا میں پھر پوچھتی ہوں۔ فرض
کرو تم کسی نوجوان خاتون کے ساتھ جا رہے ہو آگے
سے مل جاؤں میں۔ اور میں تمہاری بہت دوست
ہوں۔ لیکن دوسری لڑکی مجھے پسند نہیں کرتی۔ تم
کیا کرو گے؟ تم مجھے ملو گے یا نہیں؟

مرد۔ اگر تم زیادہ حسین ہوئی تو ——————

لڑکی۔ ہرگز نہیں۔ حسن کا اس سے کچھ تعلق ہی نہیں۔
یہ آداب کا سوال ہے۔ تم جانتے ہو آداب کیا ہیں؟

مرد۔ اور ابھی تو تم نے کہا تھا۔ تعمیرِ معاشرت کی بنیاد ہے۔

لڑکی۔ بنیاد بھی ہے۔ لیکن زرہ بکتر ہے۔ جو ہمیں مشکلات
سے بچاتی ہے۔ یہ تمام شکوک اور تذبذب کا ازالہ
کرتے ہیں۔

مرد۔ تم کس قسم کی عورت ہو؟

لڑکی۔ کسقدر ناہموار ہو تم! تم اس طرح توقع رکھتے ہو
معلوم کرنے کی۔

مرد۔ اور کس طرح معلوم کر سکتا ہوں۔

لڑکی۔ نہایت مہذب گفتگو اور تربیت یافتہ اطوار سے

کمال ہوشیاری سے مجھے اس موضوع پر لے آؤ۔

مرد- میں ان معمولی باتوں پر اسقدر وقت ضائع نہیں کرتا

لڑکی- پھر تم کبھی بھی سوسائٹی میں کامیاب نہ ہوگے تاوقتیکہ تم سیکھو۔

مرد- اچھا سکھائیے مجھے۔

لڑکی- ابھی آئس کریم کیلئے کانٹا استعمال کیا جاتا ہے چھری؟ کیا تم روٹی کو مکھن جڑا جاتا ہے۔ تم نہیں جانتے۔ جب تم تربوز کھاتے ہو تو بیجوں کو کیا کرتے ہو۔ ونڈسر نیوں؟ تم نہیں جانتے۔ اور میں جانتی ہوں۔ تم زندہ کس طرح رہتے ہو۔ ضیافت پر بیٹھے ہوئے شرم نہیں محسوس کرتے۔

مرد- آج سے کرنے لگوں گا۔

لڑکی- نہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم ذرا منہ اس طرف کرو۔ اور میں تمہیں بتاتی ہوں کہ ان اہم سوالات کا جواب کیا ہے دیکھو اب دیکھنا مت

(وہ مرد دوسری طرف پھیر لیتا ہے۔ وہ قمیص کا دامن اٹھا کر اندر سے ایک کتاب نکالتی ہے)

لڑکی- یہ ہے یہ "آداب معاشرت" یہ ۱۴۴ صفحے کی کتاب ہے جسمیں آداب مجلس پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ سوسائٹی میں کسطرح اٹھنا بیٹھنا چاہیے ۲۷ رنگین تصویریں بہترین کاغذ پر کلید اور مشکل الفاظ کا فرہنگ ساتھ ہے۔ مراکو کے چمڑے کی جلد اور سنہری کنارہ قیمت صرف تین روپے

مرد- میرے خدا۔ کتابوں کی ایجنٹ!

دل کے ٹکڑے

(۱) ذرا اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دے۔ اُسے کیوں گرا رکھا ہے جو روز ازل سے تیرا ہے اور ہمیشہ تیرا ہی رہے گا۔

(۲) ابھی یہ گھونگٹ نہیں ہے۔ میرا ساقی چھان چھان کر مجھے شراب حسن پلاتا ہے۔

(۳) جس دن یہ پردہ اٹھ جائے گا۔ اس دن چہرہ دیکھنے کو باقی ہی کیا رہ جائے گا۔ اور پھر کہاں جا کر رہے گی۔ میرے دل کی تلاش کر کے تھک جانے والی بے چینی!

(۴) ابھی دن باقی ہے کھیل ختم کرنے کا وقت نہیں آیا۔ اس لیے تم پردہ میں جا کر چھپ جاؤ۔ اور میں تم کو تلاش کرنے کیلئے نکلتا ہوں

چاک پر چڑھی ہوئی مٹی نے کہا۔ اے کمہار دیکھ تو سہی۔ تیرے کپڑے میلے ہو رہے ہیں۔

چاک کو گھماتے ہوئے کمہار نے کہا۔ میرے کپڑے میلے ہوتے ہیں تو ہوں۔ میں تجھے جو روپ دینا چاہتا ہوں اس میں اگر مجھے کامیابی ہو گئی تو مجھے خوشی ہو گی۔

مٹی بولی۔ "اور اگر ناکامیابی ہوئی تو!

کمہار کچھ سوچ میں پڑ گیا تھوڑی دیر میں اسکے چہرہ پر رونق آ گئی اور اس نے جواب دیا " مجھے صبر آ جائے گا کہ تجھ کو بنانے کی کوشش میں میرے کپڑے میلے ہوئے ہیں۔

کمہار کا ہاتھ اب اور بھی بےفکری کے ساتھ کام کر رہا تھا۔

(ہندی)

اعظم کریوی

۱/۳

حصہ سالنامہ نیرنگ خیال میں مندرجہ ذیل مضامین لکھے جا چکے ہیں ۔ اندازہ لگائیے کہ سالنامہ کس قدر لاجواب اور دلچسپ ہوگا اور اردو ادب میں اسکا رتبہ کتنا بلند

مضمون	مصنف
(۱) طلسم ازدواج	از جناب سلطان حیدر صاحب جوش
(۲) متقدمین شعرائے لاہور	حضرت سخن بہاری
(۳) بنت پٹولہ	از جناب سید حسن برنی بی اے ایل ایل بی علیگ
(۴) پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر	مرزا فرحت اللہ بیگ
(۵) سنیاس (افسانہ)	مسعود الرحمٰن صاحب ندوی
(۶) نقلی شہزادہ	حضرت خواجہ حسن نظامی
(۷) سودیشی ریل	حضرت شوکت تھانوی
(۸) سکوت (ایک افسانہ)	از جناب انیس الدین احمد رضوی (ایم اے) علیگ
(۹) گلدستہ عشق	از جناب آغا حیدر حسن صاحب (ایم آر اے ایس لندن)
(۱۰) کشمیر جنت نظیر	از جناب صوفی محمد حسین صاحب بی اے
(۱۱) گلاب کنور	از جناب مولٰنا سید جالب صاحب دہلوی
(۱۲) ایرانی پیغمبر	مرزا عاشق علی بیگ صاحب خیال
(۱۳) کسی کی کہانی میری زبانی	پروفیسر عندلیب شادانی ایم ۔ اے
(۱۴) رباعیات خیام کا جواب	مولٰنا نجیب اشرف صاحب ندوی ۔ ایم اے
(۱۵) بارش کا پہلا قطرہ	حکیم محمد یوسف حسن ۔ چیف ایڈیٹر
(۱۶) آوائی	از جناب مولوی عبدالرزاق ارشد ایچ سی ایس اکاؤنٹنٹ جنرل حیدرآباد

آج ہی درخواست بھیج دیجیے قیمت صرف عہ ۔ محصول ڈاک ۴ر خریداران نیرنگ خیال سے عہ مع محصول

مینجر رسالہ نیرنگ خیال بارود خانہ لاہور

۲/۳

مندرجہ ذیل احباب نیرنگ خیال کے سالنامہ کے بقیہ صفحات کو پر رونق اور کار آمد بنانے کیلئے زبردست علمی ادبی مقالات لکھنے میں مصروف ہیں۔

(۱) علامہ سر اقبال مدظلہ العالی
(۲) پروفیسر محمد دین صاحب تاثیر ایم اے
(۳) پروفیسر احمد شاہ صاحب بخاری ایم اے پطرس
(۴) جناب سید امتیاز علی صاحب تاج
(۵) جناب محمد عمر صاحب نور الٰہی
(۶) جناب حامد اللہ افسر صاحب بی اے
(۷) جناب جلیل احمد صاحب قدوائی بی اے
(۸) حضرت آغا حشر کاشمیری
(۹) جناب ضیاء الدین صاحب شمسی
(۱۰) جناب لطیف الدین احمد صاحب
(۱۱) جناب مالک رام صاحب بی اے
(۱۲) غیر معروف فرلمٹ
(۱۳) ڈاکٹر اعظم کریوی
(۱۴) پروفیسر غلام مصطفےٰ صاحب تبسم بی اے
(۱۵) ابوالاثر حفیظ جالندھری
(۱۶) حنیف ہاشمی۔ ایڈیٹر نیرنگ خیال
(۱۷) حکیم محمد یوسف حسن چیف ایڈیٹر
(۱۸) مولانا عبدالمجید صاحب سالک ایڈیٹر انقلاب

نیرنگ خیال کے سالنامہ کی خریداری کیلئے آج ہی آرڈر دیجئے قیمت عہ محصول ۴ر

مینجر رسالہ نیرنگ خیال بارود خانہ لاہور

میاں بیوی

کے لئے

پانچ نئی کتابیں

شب عروسی سے پہلے اور شب عروسی کے بعد ان کا مطالعہ جاری رکھیے

عیش ونشاط	ہ/
دولہا دلہن	عہ/
میاں بیوی	عہ/
مرد عورت	عہ/
زن وشوہر	عہ/

ہر پڑھے لکھے مرد کو جس کو شادی کرنا ہے یا جو شادی شدہ ہے۔ ان کتابوں کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے مگر آپ اپنا گھر جنت بنانا چاہتے ہیں تو ان کتابوں کو ضرور پڑھیے گا +

پانچوں کتابوں کا حجم پانچ سو صفحات ہوگا پانچوں اکٹھی منگانے سے بجائے سوا چھ روپیہ کے ساڑھے پانچ روپیہ علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

مینجر یوسفیہ کتبخانہ بارود خانہ لاہور

بیچین کر دینے والے خطوط

کسی عمل سے نہیں بلکہ انتہا سے زیادہ محبت میں ڈوبے ہوئے خطوط

جو نئے شادی شدہ دولہا دولھن نے محبت کے جذبات میں فنا ہو کر ایک دوسرے کو لکھے تھے۔ ان خطوط کے مجموعہ کا نام ہے

دولہا دلہن کے خطوط

یہ خطوط نئے دولہا دولہن میں محبت کا رشتہ بھی تو پیدا کر سکتے ہیں۔ ہر خط محبت کے جذبات میں ڈوبا ہوا ہے ان خطوط کے بغور مطالعہ کے بعد فریقین ایکدوسرے کو ایسے دلچسپ خط لکھ سکتے ہیں۔ جو بڑے بڑے انشا پرداز بھی نہیں لکھ سکتے [illegible]

جنت کے خطوط

مرنے کے بعد کی کیفیت اور جنت کی سرگذشت پڑھ لیجئے یہ خطوط انسان کو نیکی کی طرف رجوع کرتے ہیں یہ خطوط چوٹ کھائے ہوئے دلوں کا علاج ہیں۔ اس کے علاوہ انسان کو مرنے کے خوف سے اطمینان دلانے کیلئے ایک بہترین مجموعہ ہیں۔ قیمت ۸/ ۰ ملنے کا پتہ

مینجر یوسفیہ کتبخانہ بارود خانہ لاہور

وہ جو دوکاندار ہیں
وہ جو دوکاندار بنکر روپیہ کمانا چاہتے ہیں

اگر کم سے کم سرمایہ لگا کر زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور معمولی سرمایہ لگانے کے بعد چند دن میں اپنے سرمایہ کو ڈھائی گنا دوگنا اور چوگنا کرنے کی تمنا رکھتے ہیں وہ کتاب **فن دوکانداری** صرف ایک مرتبہ بغور پڑھ لیں اس کتاب کا مطالعہ انہیں اس درجہ کامیاب بنا دیگا کہ وہ مرتے دم تک بھی شاید اتنے کامیاب نہ ہو سکتے اس کتاب کے پڑھنے کے بعد کم سرمایہ کی دوکان میں لاکھوں روپیہ کا مال گاہکوں کو دکھائی دینے لگتا ہے۔ گاہک خود دوکان کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں قیمت فی جلد ۱۲؍

ٹوٹے ہوئے موٹروں کو درست کرنا
ہر قسم کے موٹر کو چلانا

اگر آپ سیکھنا چاہتے ہیں اور موٹر کے معاملہ میں اس درجہ کمال حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ آپ ایک مکینیکل انجنیر سے زیادہ ماہر ثابت ہوں اور موٹر چلانے میں بھی آپکو کمال حاصل ہو جائے

تو آپ
تعلیم موٹر

کو مطالعہ میں رکھیں یہ کتاب نہ صرف آپ کو ایک قابل موٹر ڈرائیور بنا دیگی بلکہ آپ ایک اعلیٰ درجہ کے موٹر انجنیر بن جائینگے۔ اس کے علاوہ پرزوں اور دیگر تجویزوں کی تصاویر بھی درج ہیں قیمت ۸؍

ملنے کا پتہ منیجر یوسفیہ کتبخانہ بارود خانہ۔ لاہور

ایک روپیہ میں دس ناول
ولولہ انگیز افسانے

(۱) بیر فرتوت (۶) بھائی بہن
(۲) خواب پریشان (۷) فریب دولت
(۳) تیر از کمان جستہ (۸) عیار طبیب
(۴) تازیانہ عبرت (۹) ثمرہ محبت
(۵) اشتہاری شادی (۱۰) چاندنی چوک میں

زندگی کی صبح شام
کے نام سے مشہور ہے

یہ وہ سچے عیش و محبت سے لبریز افسانے ہیں جنکے پڑھنے کے بعد دنیا کے تمام اور دنیا والے اور ہی نظر آنے لگتے ہیں دلچسپ ہیں مفید ہیں عشق و محبت کے جذبات سے لبریز ہیں قیمت ایک روپیہ

ایک روپیہ میں گیارہ ناول

(۱) بنت الرشید (۷) ترکی ٹوپی
(۲) انجام ہوس (۸) خونی کھوپری
(۳) کرشمہ تعلیم (۹) صلۂ طاعت
(۴) نیرنگئ تقدیر (۱۰) پاداش گناہ
(۵) عروج و زوال (۱۱) چاہ کندہ را چاہ
(۶) انتقام قدرت در پیش

یہ گیارہ افسانے وہ افسانے ہیں جنکو بے انتہا پسند کیا گیا ہے جو اپنی دلچسپی اور عبارت آرائی کیساتھ مؤثر بھی ہیں اور نتیجہ خیز بھی۔ ان افسانوں کے مجموعہ کا نام درس عبرت ہے۔ قیمت ایکروپیہ

ملنے کا پتہ۔ منیجر یوسفیہ کتبخانہ بارود خانہ لاہور

سرورق اور تمام تصویریں وکٹوریہ پریس لاہور

نیرنگِ خیال ہندوستان بھر کے علمی ادبی رسائل میں سب سے زیادہ مستقل خریدار رکھتا ہے

(اس لئے ہمیشہ نیرنگِ خیال میں اشتہار دو)

عید مُبارک

نیرنگِ خیال کے ہزارہا مستقل خریداروں اور لاکھوں ناظرین کی خدمت میں

ایڈیٹر نیرنگِ خیال ہدیہ عید مُبارک

"نیرنگِ خیال عید نمبر"

پیش کرتا ہے۔ گر قبول افتد زہے عز و شرف

عید نمبر ۱۹۳۰ء

جلد ۱۰ فروری و مارچ ۱۹۳۰ء نمبر ۶۸ و ۶۹

چیف ایڈیٹر .... حکیم محمد یوسف حسن

قیمت فی کاپی ایک روپیہ (عہ) .... ویلر بُک سٹال پر ایک روپیہ چار آنہ (عہ)

چندہ سالانہ تین روپیہ چار آنہ (عہ) مع محصولڈاک جس میں یہ عید نمبر بھی شامل ہے

کریمی پریس لاہور میں باہتمام میر قدرت اللہ پرنٹر چھپا۔ اور حکیم محمد یوسف حسن پبلشر نے دفتر نیرنگِ خیال اردو خانہ لاہور سے شائع کیا۔

اشفاق احمد خوشنویس بریلوی

فہرست مضامین

فروری و مارچ سنہ ۱۹۳۰ء

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)

فروری کا نیرنگ خیال

جنوری کے نیرنگ خیال میں ہم نے صاف اور واضح الفاظ میں لکھ دیا تھا کہ عید نمبر فروری و مارچ کا مشترکہ نمبر ہوگا ۔ ہر سال یہی ہوتا ہے ۔ لیکن باوجود اس اعلان کے بھی کم از کم دو سو درخواستیں دفتر میں فروری نمبر کے لئے پہونچیں جنہیں بذریعہ خط جواب دے دیا گیا اور بقایا نصف جو آخری دنوں میں موصول ہوئیں ان کا جواب نہ دیا جا سکا ۔ اس لئے یہاں پھر واضح کیا جاتا ہے ۔ نیرنگ خیال سال بھر میں صرف ایک نمبر مشترکہ شائع کرتا ہے ۔ اور وہ عید نمبر ہوتا ہے ۔ یہ فروری اور مارچ کا رسالہ ہے جس کی قیمت ۸ر ماہوار کے چندہ کے حساب سے دو ماہ کی قیمت ۸ر رہتی ہے ۔ گویا ہم ناظرین کو ۸ر کے معاوضہ میں ایک روپیہ کا رسالہ پیش کرتے ہیں اور ناظرین کو ۸ر کا فائدہ رہتا ہے ۔ اس کے حساب یکم اپریل کو نیرنگ خیال شائع ہوگا ۔ انشاء اللہ تعالیٰ ۔ **منیجر**

ناول ثریا

ناول ثریا ۔ جو نیرنگ خیال بک ڈپو سے شائع ہوا تھا ۔ اس کے ٹائیٹل پر جو یہ لکھا ہے کہ جملہ حقوق بحق نیرنگ خیال محفوظ ہیں ۔ وہ غلط ہے ۔ بلکہ جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ پڑھنا چاہیئے ۔ (ایڈیٹر)

شذرات

اگر ہر اچھی کتاب کا دیباچہ لکھنا ضروری ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ رسائل کے ہر خاص نمبر پر بھی ابتدائی اوراق میں کچھ ذکر نہ کیا جائے۔ نیرنگ خیال کے خاص نمبر کتابوں۔ اچھی اور پسندیدہ کتابوں کی طرح مقبول و معروف ہیں جس طرح سے شائقین اچھی کتابوں کو سنبھال کر رکھتے ہیں اسی طرح سے ان خاص نمبروں کو حفاظت سے رکھا جاتا ہے اس قدر دانی کا باعث وہ مضامین ہوتے ہیں۔ جو مختلف اہل قلم کے سوچ بچار اور تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ درحقیقت یہ مضامین بڑی بڑی کتابوں سے بھی زیادہ قیمتی اور وقیع ہیں۔ سالنامہ نیرنگ خیال ۱۹۳۰ء جو دسمبر ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا تھا۔ گذشتہ سال کے سالنامہ سے بقدر ایک ہزار کے زائد چھاپا گیا تھا۔ لیکن حالت یہ ہے کہ کم از کم سال کے بقیہ سات مہینوں کے لئے ہمارے پاس کوئی کاپی پبلک کی مانگ کو پورا کرنے کے لئے باقی نہ ہوگی اس کا باعث صرف یہ ہے کہ ڈیڑھ روپیہ جیسی قلیل رقم میں ایسی مصور کتاب کہاں سے مل سکتی ہے؟ سالنامہ نیرنگ خیال تو گویا درجنوں کتابوں کا کام دیتا ہے اس لئے لوگ اسے ذوق و شوق سے خریدتے ہیں۔ گذشتہ سال ہم نے عید نمبر بھی ایک ہزار زائد چھاپا تھا۔ لیکن امسال مطبع والوں نے غلطی سے عید نمبر اسی تعداد میں چھاپ دیا ہے۔ جس تعداد میں معمولی نمبر شائع ہوتا ہے۔ اس لئے عید نمبر ۱۹۳۰ء کے جلد ہی نایاب ہو جانے کا پورا پورا امکان ہے اور لطف یہ ہے کہ اس عید نمبر کے لئے جس قسم کے مضامین مہیا کئے گئے ہیں۔ وہ واقعی عدیم النظیر ہیں۔ اس عید نمبر میں مولینا عبدالمجید صاحب سالک بی اے مدیر انقلاب نے عرب کے حدی خوانوں کی شاعری کے عنوان سے سات دلفریب گیتوں کا ترجمہ کیا ہے۔ دراصل یہ ترجمہ نہیں ایک مستقل تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ مولانا سالک خواہ کتنے ہی مصروف کیوں نہ ہوں۔ پھر بھی بقول مولینا سالک "نیرنگ خیال اپنا خراج ضرور وصول کر لیتا ہے" ہم اس فقرہ کو ان دیرینہ تعلقات پر محمول کرتے ہیں۔ جو نیرنگ خیال اور مولینا سالک کے درمیان چھ سالوں سے قائم ہیں۔ اور انشاء اللہ ہمیشہ قائم رہیں گے۔

اس مضمون کے علاوہ مولینا سالک صاحب کی ایک مقبول نظم نعرۂ جہاد کے عنوان کی تحت بھی درج کی گئی ہے۔ مولینا سالک کی یہ نظم بہت مقبول ہو چکی ہے۔ لیکن آج اسے اس لئے بھی شائع کرنے کی ضرورت تھی۔ کہ ہم ایک تصویر نعرۂ جہاد بھی شائع کر رہے ہیں۔ آج اس نظم کے ساتھ پورا پورا انصاف ہوا ہے۔

میر ولی اللہ صاحب بی اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ نیرنگ خیال کے ان قلمی معاونین میں سے ہیں۔ جن پر نیرنگ خیال فخر کر سکتا ہے۔ آپ نے ہمیشہ نیرنگ خیال کے لئے دلچسپ نظمیں۔ بلند پایہ علمی مضامین اور...... بہت کچھ لکھا ہے۔ اس عید نمبر میں بھی انہوں نے نیرنگ خیال کے علم دوست طبقہ کیلئے مصر قدیم کے عنوان سے ایک بلند پایہ علمی مقالہ لکھا ہے۔

عید نمبر میں دو طویل افسانے درج ہیں۔ جو یقیناً ایک پورے ناول کے برابر ہیں۔ ایک تو ملک نصیر الدین ہے جسے انگریزی میں پروفیسر محمد حبیب اللہ صاحب بی اے آکسن نے لکھا تھا۔ اور جناب محمد عطاء الرحیم صاحب ایم اے ایل ایل بی نے اسے اردو کا جامہ پہنایا ہے معلوم ہوا ہے کہ عطاء الرحیم صاحب پروفیسر موصوف کے تمام افسانوں کا ترجمہ کتابی صورت میں شائع کر رہے ہیں۔ دوسرا افسانہ موت کا سفر ہے۔ یہ جناب فیض الدین احمد صاحب ایم اے نے لکھا ہے۔ قیصر ولیم کی باجبروت شخصیت جب سلطنت کی باگ ڈور چھوڑتی ہے۔ تو بجھتی ہوئی شمع کی طرح ایک بار اپنی پوری چمک دکھانا چاہتی ہے۔ اس افسانہ میں بھی قیصر ولیم کی آخری کوشش کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ افسانہ بے حد عجیب ہے۔
سید سجاد حیدر صاحب ملک کے مشہور انشا پرداز ہیں۔ ہم جناب سید اظہار الحق صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی وکیل کے ممنون ہیں کہ انہوں نے

سجاد حیدر صاحب پر ایک مقالہ عید نمبر کے لئے لکھا ۔

مزاحیہ مضامین نیرنگ کا طغرائے امتیاز رہے ہیں۔ چنانچہ یہ عید نمبر بھی مزاحیہ مضامین سے لبریز ہے ۔ ایسے کو تیسا - جناب چودھری سراج الدین صاحب نے لکھا ہے۔ یہ ایک مزاحیہ لطیفہ ہے۔ جن اشخاص کو کسی فوجی کی رعونت اور اکھڑپن کا تختہ مشق بننا پڑا ہوگا۔ وہ اسے مزے لے لے کر پڑھینگے لیکن تمام فوجی ایسے نہیں ہوتے - ان میں حلیم اور بردبار بھی ہوتے ہیں۔ تنک مزاج اور کنوار بھی ۔

اُف تمہ - مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی نے لکھا ہے۔ گو یہ مضمون آپ کا کوئی تازہ مضمون نہیں۔ لیکن ناظرین نیرنگ خیال کے لئے یقیناً ایک نئی چیز ہے - فرحت صاحب کے مضامین اس وقت ملک میں بے حد مقبول ہیں - کچھ کچھ ایک مزاحیہ مضمون ہے - جو جناب رشید احمد صاحب صدیقی پروفیسر مسلم یونیورسٹی کی قلمی ایجاد ہے۔ اگر آپ لغویات اور قریات کو پہلو بہ پہلو دیکھنے کے خواہشمند ہوں تو پروفیسر صاحب کے مضامین کا بغور مطالعہ فرمایا کریں - ہمیں امید ہے کہ کچھ دن بعد اقلیدس - الجبرا - فلسفہ - اور ادب لطیف کے ملاپ سے جو لٹریچر پیدا ہوگا وہ صرف صدیقی صاحب کی لازوال کوششوں کا ہی نتیجہ ہوگا۔ نکم الملت حضرت کال الکل - ایک بہت بڑے پیٹو کی سچی داستان ہے۔ جسے جناب نظامی قدوسی صاحب ایم اے نے لکھا ہے۔ ہم صرف اسقدر لکھنا چاہتے ہیں۔ کہ اس مضمون کے راوی جناب نظامی قدوسی صاحب بھی حضرت اکال الکل کے بڑے بھائی نہیں تو چھوٹے بھائی ضرور ہیں ۔ گرما گرم ربا - ایک لاجواب مزاحیہ مضمون ہے - جو نیرنگ خیال کے مشہور قلمی معاون جناب ادیب ملیح آبادی کے قلم سے لکھا گیا ہے۔ "ادیب" کے مضامین بہت مقبول ہیں - اور اکثر اصحاب متذکرہ ہیں - کہ آپ کے چہرہ سے نقاب اٹھا دیا جائے - لیکن جو معشوق اس پردہ زنگاری میں ہے - اس کا لطف پس پردہ ہی خوب ہے - بلاشبہ ادیب صاحب کا یہ مضمون مزاحیہ مضامین میں اول نمبر پر آتا ہے ۔

بالکل - جناب پطرس صاحب کا مزاحیہ شاہکار ہے - پطرس فطرت نگاری میں ہندوستان بھر کا ایک ہے - پطرس کا یہ تازہ ترین مقالہ امید ہے کہ ملک میں بے حد مقبول ہوگا - ناظرین یہ سنکر خوش ہوں گے۔ کہ پطرس کے تمام مضامین کا مجموعہ کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ کتاب خریدنے کو پیسے تیار رکھئے تفصیل کسی دوسری جگہ ملاحظہ ہو ۔

صرف ایک نمبر میں چھ مزاحیہ مضامین شائع کرنا صرف نیرنگ خیال کی خصوصیت ہے - بھائی شوکت تھانوی شاید ابھی سے آئندہ سال کیلئے سودیشی ریل کا بدل تجویز کر رہے ہیں - ورنہ وہ عید نمبر میں ضرور جلوہ فروز ہوتے - جناب ملا رموزی صاحب بھی بصیغہ وی پی اس وقت تشریف لے آئے ہیں - جب عید نمبر کی کتابت قریب الاختتام ہے - کوشش کروں گا کہ یہ مضمون بھی درج ہو جائے ورنہ دوسرے نمبر کی زینت تو ضرور ہوگا ۔

خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت کا مضمون شاہی پہلوان "ایک تمدنی مقالہ ہے - جس میں قدیم اودھ کے شاہی خاندان اور پہلوانوں کے تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے - اس قسم کے مضامین رسائل کی جان ہوتے ہیں - لیکن ایک بات میں ہمیں عشرت صاحب سے اختلاف ہے کہ کوئی نامور پنجابی پہلوان وہاں کشتی لڑنے گیا تھا - حقیقت یہ ہے کہ پنجاب کے ادنےٰ درجہ کے اور گمنام پہلوان جنہیں یہاں ناموری حاصل نہیں ہوتی وہ ہندوستان میں جا کر کافی شہرت حاصل کر لیتے ہیں - ورنہ پنجاب میں اس نام کا کوئی نامور پہلوان نہیں سنا گیا - جس کا عشرت صاحب نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے ۔

ڈاکٹر اعظم کریوی صاحب کا مضمون سلطان ٹیپو شہید ایک تاریخی مقالہ ہے - جو مفید معلومات سے لبریز ہے - اور سلطان ٹیپو شہید پر ایک جدید زاویہ سے روشنی ڈالتا ہے ۔

قاسم پاشا ایک ترکی ڈرامہ ہے - ہم جناب خان صاحب حاجی محمد غلام حسن خان صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اسے نیرنگ خیال کے لئے مرتب فرمایا - اس میں میدان جنگ کے خونریز مناظر کے ساتھ حسن و عشق کی داستان رزم میں بزم کا نقشہ دکھاتی ہے ۔

لیلےٰ کے خطوط - ہندوستان کے نامور ادیب جناب قاضی عبدالغفار صاحب جو اس سے پیشتر کہکشاں اور نقیب میں لکھا کرتے تھے - کا لاجواب ادبی شاہکار ہے - قاضی صاحب چھ سات سال سے چپ ہو کر گوشۂ تنہائی میں پڑے تھے - انھیں دوبارہ بزم ادب میں جلوہ افروز کرنے کا فخر نیرنگ خیال کو حاصل ہوا ہے - لیلیٰ کے خطوط کیا ہیں - عبرت و موعظت کے باب ہیں - ملک کی تمدنی اور معاشرتی خرابیوں کو اگر ان الفاظ میں نقش کیا جائے - تو ملک میں اصلاح کا دور جلد شروع ہو سکتا ہے - اس قسم کی جراتمندانہ کوششیں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں - جہاں وہ کمزوریاں ہیں جو معاشرتی کمزوریوں کو بے نقاب کرتے ہیں - یا قاضی عبدالغفار صاحب نے بلند ترین ادبی معیار کو مدنظر رکھتے ہوئے نیرنگ خیال کے عید نمبر میں ان خطوط کے ذریعہ سے کی ہے - جسے امید ہے کہ ملک اسی نقطۂ نظر سے مطالعہ کرے گا - جس نیت سے وہ لکھے گئے ہیں - یقین ہے کہ قاضی صاحب اس سلسلہ کو قائم رکھیں گے ✦

حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ العالی کو نیرنگ خیال سے جو انس ہے - یہ اس کا نتیجہ ہے کہ ہر خاص نمبر کے لئے ہمیں ان سے ایک مضمون مل ہی جاتا ہے - عرب شاہ سوار ایک تصویر پر اظہار خیال ہے - تصویر بھی دیکھئے اور مضمون بھی - خطوط اور الفاظ کے نقوش کا یکساں لطف اٹھائیے ✦

دہلی کی نسوانی زبان کے یکتا ماہر جناب آغا حیدر حسن صاحب نے تصاویر عید کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے - یہ نادر مضمون ایک وسیع سلسلہ کی ایک قسط ہے - دیکھئے آغا صاحب نیرنگ خیال میں اس سلسلہ کو مکمل کرتے ہیں یا کوئی دوسرا سلسلہ عنایت فرماتے ہیں ہم عنقریب آغا صاحب کے ایک مضمون کو مصور شائع کریں گے ✦

انارکلی کے چند باب اس سے قبل نیرنگ خیال کے صفحات پر نمایاں ہو کر ملک سے تحسین و آفرین کا خراج وصول کر چکے ہیں - ہمارے خیال میں جسقدر استفسارات انارکلی کے ڈرامہ کے متعلق دفتر نیرنگ خیال میں موصول ہوتے رہے - شاید آج تک کسی کتاب کے لئے موصول نہ ہوئے ہوں گے - (ہم نہیں کہہ سکتے کہ لٹریری مضامین کے متعلق آرڈروں کی رفتار شاید انارکلی سے کبھی بڑھ جائے) ناظرین یہ سنکر مسرور ہوں گے کہ واقعی اب انارکلی کاپی کتابت کے لئے دیدی گئی ہے - ایک دو ماہ میں اس کا شاندار ایڈیشن آپ کو پیش کر سکیں گے - انارکلی کا یہ منظر آپ کے لئے نیا ہے - اسے پڑھئے اور دیکھئے کہ مغلیہ خاندان کا شہزادہ عشق و محبت کی دیوانگی میں کیا کچھ کر بیٹھتا ہے - باپ شفقت پدری اور فرائض سلطنت کے درمیان کس کشمکش میں مبتلا ہے - ماں شفقت مادری اور شوہر پرستی کے درمیان اپنے پیارے بیٹے کی آرزوؤں کو بر لانے کے لئے کیا تجویزیں سوچتی ہے - دلآرام اپنی ناکام محبت کا کیسا خوفناک انجام دیکھتی ہے - یہ ڈرامہ انسانی الفاظ میں نہیں جذبات کی مصوری میں لکھا گیا ہے ✦

جناب نظامی قدوسی ایم اے نے حکیم الملت حضرت اکال الاکل کی داستان لکھ کر ملک کے کثرت خوری کے عادی بیشتر حضرات پر احسان عظیم کیا ہے - اس مضمون کا حقیقی لطف تو شاید وہ چند معدودے اصحاب اٹھا سکیں گے - جو حضرت اکال الاکل کی شخصیت سے ذاتی طور پر متعارف ہیں - لیکن ہم ناظرین خیال کو اس حقیقت سے آشنا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں - کہ اس مضمون کے راوی حضرت نظامی قدوسی ایم اے بھی اس جماعت سے تعلق رکھتے ہیں جنھیں کثرت خوری کا مرض الفربہ معتبر بنا رہی ہے ✦

حضرت محمد دین صاحب تاثیر ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور کا افسانہ دوہری شرط لاجواب ہے - تاثیر صاحب کا ترجمہ مصنف کے حقیقی خیالات کو بے نقاب کر رہا ہے - تاثیر صاحب اب نیرنگ خیال کے لئے متعدد مضامین اور کتابیں لکھ رہے ہیں - جنھیں ہم وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہیں گے ✦

صیغۂ ادارت کی طرف سے نیرنگ خیال میں کچھ درج نہیں - جناب حنیف ہاشمی صاحب نے "اسلام کا شاندار مستقبل" کے عنوان سے ایک مضمون ڈیڑھ مہینے میں لکھا تھا - لیکن وہ اسقدر ضخیم تھا - کہ ہم نے اسے ایک کتابی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے - جونہی کہ حنیف نظر ثانی کے بعد اسے بھیج

نعرۂ جہاد

مجاہدین و شہدا

(از جناب راجہ عبدالمجید صاحب سالک بی اے)

تمھیں سے اے مجاہدو! جہان کا ثبات ہے　　　شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے
تمھاری مشعلِ وفا فروغِ شش جہات ہے　　　تمھاری ضو سے پُرضیا تبینِ کائنات ہے
کواکبِ بقا ہو تم جہاں اندھیری رات ہے

یہ نکتہ بے نظیر ہے معارف و نکات میں　　　کہ فرق ہے تمھاری اور عوام کی ممات میں
تمھارا امتیاز ہے دوام میں ثبات میں　　　جدا ہو کائنات سے تو محو اس کی ذات میں
بقا ہے جس کی ذات کو وہ اللہ کی ذات ہے

مجاہدوں کے بازوِ فلک فگن عجیب ہیں　　　بہادروں کے پنجہ ہائے تیغ زن عجیب ہیں
یہ جسم ہائے خونچکان و بے کفن عجیب ہیں　　　مجاہد و شہید کے یہ بانکپن عجیب ہیں
حیات بھی حیات ہے تو موت بھی حیات ہے

زکوٰۃ دے اگر کوئی زیادہ ہو تونگری　　　بکھیر دے اناج اگر تو فصل ہو ہری بھری
چھٹیں جو چند ڈالیاں نمو ہو نخلِ تاک کی　　　کٹیں جو چند گردنیں تو قوم کی ہو زندگی
لہو جو ہے شہید کا وہ قوم کی زکات ہے

بلائیں جن کی قوم لے تمھیں وہ شہ سوار ہو　　　تمھیں وہ سرفروش ہو تمھیں وہ جاں سپار ہو
تمھیں دفاع و احترام دین کے ذمہ دار ہو　　　جو تم نہ ہو تو امن کی بنا نہ استوار ہو
تمھاری تیغ ضامنِ نظامِ کائنات ہے

سالک

دُرِ شاہوار

عرب کے حُدی خوانوں کی شاعری

صحرائے عشق کے ہنگامہ خیز جذبات

(از جناب مولانا عبدالمجید صاحب سالک بی اے مدیر روزنامہ انقلاب)

عرب کے ہر بدو اور ہر جمال کو حدی کے چند ولولہ انگیز گیت ضرور یاد ہوتے ہیں۔ جب قافلہ صحرا کی بے پایاں وسعت کو طے کرتا چلا جاتا ہے۔ اور اونٹوں کی رفتار میں کسیقدر سستی آجاتی ہے اور محمل گراں ہونے لگتے ہیں تو ریگستان کے یہ عشق آموز فرزند حدی کے گیت گانے لگتے ہیں۔ تمام کاروان کے قلوب میں ان گیتوں سے نئے نئے ارمانوں کی امنگیں برانگیختہ ہو جاتی ہیں اور عرب کے تحمل پیشہ(۱) اونٹ بھی ان کو سنتے ہی سبک گام اور تیز خرام ہو جاتے ہیں۔ ذیل میں ان چند گیتوں کا آزاد ترجمہ درج کیا جاتا ہے:-

موسمِ گرما کا قمرِ عُریاں

جب تو ایک تاریک خلوت خانے میں اپنے اترے ہوئے اور بکھرے ہوئے ریشمیں لباس میں سے اٹھتی ہے۔ اے میری راحتِ جان! جب تو اٹھتی ہے اس حال میں کہ تیرے سر پر، جسم پر کنگنی اور مالا کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ تو موسمِ گرما کے اس عریاں اور سبک خرام چاند کے مانند ہوتی ہے جس کی درخشانی ساری کائنات پر تنہا حکمرانی کرتی ہے!

پیغام

صبح تیرے لئے مبارک ہو! اے آتشیں رکاب کے سوار! تیرا سفر کامیاب ہو!

اگر اس حسین پری چہرہ کے خیمے کے پاس تیرا گذر ہو تو میرے آقا! اس نازنین سے ہمارا حال ضرور پوچھنا! آہ! اب

تیرے سپاہیوں کی جانسوز نگاہیں کیوں [illegible] درختاں ہیں۔ اگرچہ تو باوفا ہے ؟

میرا عشق ایک [illegible] چھری کے مانند کیوں ہے ؟

تیرا حسن انسانوں کی عقل کو کیوں پریشان کر رہا ہے ؟

اور تیرا پرشکن ابرو انہیں زنجیروں میں کیوں جکڑے ہوئے ہے ؟

میرا باغ کیوں ویران ہے ؟

میری شاخوں کے زرد و خشک پتے زمین کی بھائی پر کیوں بکھرے پڑے ہیں ؟

تیرا مرغزار جس میں معطر گلبنوں کی شمیم کھیل رہی ہے۔ میرے ہی لئے کیوں بند ہے ؟

میرا جسم میری بے پناہ آرزوؤں کا مرکز کیوں بنا ہوا ہے ؟ قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے مجھے شراب کو ہمارے کیوں پاتے ہیں ؟

پیغام قمر

چاند نے تیرا نیلے حریر کا نقاب مستعار لے لیا۔ اور مجھے ایک پیغام پہنچایا !

میں نے اپنے سفید گھوڑے کو قتل کر دیا۔ اور رات کے خرمن میں آگ لگا دی تاکہ تیری آغوش میں پہنچ جاؤں

تو میرا انتظار کرتی رہی جس طرح سوسن کی ایک کیاری سایہ دار قالین پر پڑی ہو !

میرے ہونٹ تیری گردن کے لذیذ بوسوں سے شیریں اور تیرے پاؤں کی حنا سے تلخ ہو [illegible]

ساحری

اے ریگستان کی کٹیلی ! میں سعید کے عشق میں تجھے جلاتی۔ وہ چیتے کے بازو کی طرح سبک اور قوی ہے !

اے نیاز فر کی جڑ ! مجھے تجھے کٹیلی کے ساتھ ملاتی ہوں۔ تاکہ سعید میری آرزو میں دیوانہ ہو جائے۔

اے عناب کے پودے ! اپنی شاخیں لے کر آ اور آگ کا ایک شعلہ بلند کر تاکہ میرے جمال کا تصور [illegible] میں پائدار ہو جائے !

اے آتشیں سیب ! اگر دنیا جہان کی عورتیں مل بھی جائیں۔ تو اسے مجھ سے جدا کرنے پر قادر نہ ہو سکیں !

اے ریحان ! میرا محبوب میرے ہونٹوں پر اس طرح گر جائے جیسے شکستہ پر عقاب گر جاتا ہے۔ اور پھر اٹھ نہیں سکتا !

اے بنفشی انجیر ! میرا شوہر بہت بوڑھا ہے۔ ماالشداس پر خواب غفلت طاری کر دے !

اے دنیا جہان کے پودو ! ایک کمسن سال اور غیور آدمی کی عقل و خرد پر مہر لگا دو۔ اور مجھے سعید کی آغوش کے حوالے کر دو جو چیتے کے بازو کی طرح سبک اور قوی ہے !

عیش میں طیش

ایک دن میں نے تجھے بہت ناراض کر دیا!

تو اپنے دریا نما گیسوؤں کو لئے ہوئے غصّے میں آگ ہو کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ تو نے اپنے لباس کی پیاری آستینیں چڑھالیں!

تیری اُنگلی پر انگشتری کے نگینے آنکھوں کی طرح چمکنے لگے۔ اور تو نے میرا مقابلہ کیا!

تیرے پاؤں شگوفوں سے بندھے ہوئے تھے۔ تیری ایڑیوں میں پھولوں کے گجرے اُلجھ گئے تھے۔ تو کانپ رہی تھی۔

اور ایسی خوبصورت نظر آتی تھی۔ جیسے چاندی کی تلوار!

لیکن مجھے تیرے غصّے کو فرو کرنے کا افسوں یاد تھا۔ میں نے زیرِ لب وہ افسوں پڑھا۔ پیارے غزالہ! تیری آنکھیں ایک تاریک

دریا میں تاروں کی طرح چمکنے لگیں اور تیرا چہرہ رات کی جھیل میں ڈوبا ہوا چاند بن کر رہ گیا!

نوحہ

میرا دل شعلوں کی لپیٹ میں آگیا!

وہ نازک و نازنیں عزیزہ کے مزار میں مدفون ہے!

کھجور کا نخلِ نورس کٹ کر گر پڑا!

انگورِ رنگیں کی بیل پامال ہو گئی!!

عزیزہ کی صہبائے حیات بہ کر خاک میں مل گئی!!!

میں بہت شجاع و بہادر ہوں۔ لیکن موت نے میری شجاعت کا بھرم کھول دیا!

کھجور کا نخلِ نورس کٹ کر گر پڑا!

انگورِ رنگیں کی بیل پامال ہو گئی!!!

عزیزہ کی صہبائے حیات بہ کر خاک میں مل گئی!!!

اُس کی دونوں چھاتیاں ایک وحشی غزالہ کے بچوں کی مانند تھیں!

میں اُن کو سیب سے تشبیہ دیتا تھا! میرے ہاتھ اُن کے مس سے کبھی نہ تھکتے تھے!

وہ میری مادیاں تھیں۔ کوئی اور سوار اُس پر قابو نہ پا سکتا تھا!

کھجور کا نخلِ نورس کٹ کر گر پڑا!

انگورِ رنگیں کی بیل پامال ہو گئی!!

عزیزہ کی صہبائے حیات بہ کر خاک میں مل گئی!!!

(خاص) سالک

نہ بھولنے والی راتیں

میری گزشتہ رات آنکھ جھپکے بغیر گزری ۔

جہاں تک میری یاد کام کرتی ہے۔ میری زندگی میں سات راتیں یوں بے خوابی سے گزری ہیں۔ میری عمر بھر پھولوں کے بستر پر بسر ہوئی۔ عیش کی بے خوابی والی راتیں بے تعداد گزری ہیں۔ لیکن یاد کھٹکے والے کانٹے ہی رہتے ہیں۔ یہ راتیں سب کی سب آج میری آنکھوں کے سامنے پرچھائیں کی طرح پہلو بہ پہلو کھڑی ہیں۔ جیسے کسی حبیب ڈائن نے چاند کی ٹکیا کو دونوں ہاتھوں کی پھیلی ہوئی انگلیوں کے اوک میں لے لیا ہو ۔

پہلی رات وہ تھی جب عین آغازِ شباب میں، جب آرزوؤں کی شراب امیدوں کے ساغر سے باہر چھلک رہی تھی، جب یہ وسیع دنیا، یہ بیکراں تاریکیوں کا سمندر، میرے سنہری محلوں کا ایک چمکتا ہوا گنبد معلوم ہوتی تھی۔ ایک گیند تھی جسے میں چمپئی رہوار کا سوار شہزادہ دائیں بائیں ٹھکرا رہا تھا۔ عین آغازِ شباب میں میری سالگرہ کے دن میری دایا روتی میرے قدموں پر لپٹ گئی اور سسکیوں اور آہوں سے ترک ترک کر بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگی کہ میں چمپئی رہوار کا شہزادہ نہیں ہوں نہیں نہیں افسانوں کی طرح اس دائی کا لڑکا بھی نہیں ہوں جسے شہزادے کی جگہ نزع رسیدہ ملکہ کے پہلو میں ڈال دیا گیا ہو۔ بلکہ ایک لاوارث یتیم ہوں جس کی گزری ہوئی زندگی آنے والی زندگی سے کہیں زیادہ چمکدار تھی ۔

یہ پہلی رات تھی جب میں غم کے بھیانک چہرے کو تھرائی ہوئی آنکھوں سے تک رہا تھا ۔

اور پھر دوسری رات آئی اور تیسری اور یونہی ہوتے ہوتے وہ رات بھی آئی! اور کئی عیش کی بے خوابی والی راتیں بھی آئیں جب نغموں کی گونج اور رنگوں اور شرابوں کے خمار آنکھوں کے ڈوروں کو سنہری زنجیریں بنا دیتے ہیں اور تھکی ہوئی پلکیں رات بھر یکجا ہونے سے محروم رہتی ہیں ۔

اب چوتھی اور پانچویں اور چھٹی غم کی راتیں آئیں جو بھیانک اور ڈراؤنی ضرور تھیں۔ مگر نہ اس رات کی طرح جب میں پہلے پہل غم کے روبرو ہوا۔ جب میں یوں بے حس پڑا تھا جیسے کسی کو مسلتے ہوئے چکی کے پاٹوں نے چکنا چور کر دیا ہو ۔

ایک ایک کر کے میری غم کی راتیں گذر گئیں۔ اس لاوارث معصوم کی طرح جو رات بھر چاند کی طرف بانہیں پھیلا پھیلا کر بلکتا رہے اور صبح کی گود میں اپنی آہوں کی تھپکیوں سے خاموش ہو کر سو رہے ۔

پھر وہ رات بھی آئی جب میرا دل خوشیوں کی ساری شراب چھلکا چکا تھا اور تم نے اپنی خمور نگاہوں سے اس تہی جام کو دیکھا اور وہ لبریز تھا۔ اور پھر بہت سی راتیں بھی آئیں۔ اور ان عیش کی بے خوابی والی راتوں میں وہ رات بھی آئی جب تم نے مجھے رات بھر نہ دیکھا۔ اور وہ رات بھی جب تم مجھے دیکھتے تھے اور میری نگاہیں پلٹ پلٹ جاتی تھیں ۔

اور ان راتوں میں وہ راتیں بھی آئیں جب میں پھر چمپئی رہوار کا شہزادہ تھا اور تم چمپئی رہوار کی شہزادی۔ اور ہم دونوں اپنے مرمری محلوں کے قرمزی فصیلوں والے باغوں میں گھومتے گھومتے رات کو صبح اور صبح کو رات کر دیتے ۔

آخر وہ رات آئی جسے میں غم کی آخری رات سمجھا کہ وہ غم کی پہلی رات کی طرح تاریک تھی، اور جب میں اُس کے بھیانک چہرے کو پتھرائی ہوئی آنکھوں سے تک رہا تھا۔ مگر تم پھر پہنچیں، رہوار پر سوار ہو کر آ گئے اور ہم پھر سرمست بانہوں میں بانہیں ڈال کر راست اور رات کو صبح کرنے لگے۔

لیکن آج رات کا شمار نہ بھول جانے والی خوشیوں کی راتوں میں اور نہ یاد رہنے والی غم کی راتوں میں ہے۔ ہم دونوں اُسی رہوار پر سوار قرمزی فصیلوں والے مرمری محلوں میں گھوم رہے ہیں لیکن میرا خوشیوں کی شرابیں لٹانے والا دل تہی جام ہے اور تم اسے اپنی محو نگاہوں سے بدستور دیکھ رہے ہو!

کیا یاد رہنے والی غم کی راتوں اور خوشیوں کی بھول جانے والی راتوں کی طرح یہ رات بھی گزر جائیگی؟! ——

یحییٰ کشافی

کمال آسودگی

مطربۂ حیا انداز کے گلے کو پہلی حرکت ہوئی۔ اُس نے اپنا پہلا گیت الاپا۔ اُس کے گانے میں کچھ نہ تھا۔ گو عشق کی بہجت افزینیاں اُس کے بول کچھ نہ تھے مگر مسرات محبت کی بارش ——— وہ اثر آسودگی جو غیر ارادی تبسم کا موجب بن جاتا ہے تو وہ تبسم کچھ نہیں ہوتا۔ مگر ایک راز!

اس کا نغمۂ بہار بنا ——— اس موسم کا گیت تھا جس میں اُٹھتے ہوئے سورج کی شعاعیں کائنات کو اپنے لباس منور کے خنک وبہجت میں ملبوس کر دیتی ہیں، جب شام کی ابتدائی گھڑیوں میں بلند ہوتے ہوئے چاند کی کرنیں عالم کو اپنی مہتابی چادر کے منبسم مسرت کا جامہ پہنا دیتی ہیں!

ہاں، محبت کی پہلی مسرت اس کی اس غزل سرائی میں متشکل تھی۔ عشق کی غیر پرلذتوں نے اس کے بولوں کی صورت اختیار کر لی تھی! یہ گھڑی وہ گھڑی تھی جب ایک معمولی انسان فرشتہ بن جاتا ہے۔ اور اُس کے قدموں میں پَر لگ جاتے ہیں۔ اُس کا گیت اس حالت کا آئینہ تھا کہ محبت اوّلاً ایک خواہش مسرور سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی!

کہا جاتا ہے کہ جہاں کہیں اور جب کبھی فضائے بسیط کا یار اس قسم کے زمزمے ہو جاتے ہیں تو موسیقی محبت کا استاد کامل وہیں کہیں چھپا ہوتا ہے۔ چنانچہ جس وقت اور جہاں یہ طرب سازی محبت ہوا کی موجوں کو نئی روح بنا رہی تھی "استاد کامل" ایک کُنج میں پوشیدہ سُن رہا تھا۔ گانے کے آخری بول ابھی فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی اور پھر فوراً ہی اعتراف حالت میں سرِ تسلیم خم کرتا نظر آیا۔ وہ یہی راگ اس سے قبل بھی صد ہا بار سُن چکا تھا۔

بہار جا چکی تھی اور اب خزاں کا موسم تھا۔ استاد کامل اپنے حلقے کے نو واردوں کو کبھی فراموش نہیں کرتا۔ موسم کے تغیر کے ساتھ اسے اپنے اس نئے شاگرد کی تلاش میں نکلنا لازمی تھا۔ اس کا تجربہ تھا اور وہی اب بھی دیکھا کہ اب اس مغنیہ دوشیزہ

کہ لب خود بخود کشادہ نہیں ہو جاتے، اور اس کے برق تبسم کی جگہ اب اس کی آنکھوں سے، نرگسی پھول موسم بہار شبنم آلود ہو جاتے ہیں۔

"مایوس نہ ہو کہ تیرا نغمہ کامل نہ ہوا، تیرے گیت مدفون ہو گئے۔ سبق محبت کا "استاد کامل" تجھے حکم دیتا ہے کہ پھر گانے لگ تیرا نغمہ اب مکمل ہے ——— کیونکہ محبت کا "استاد کامل" تو "غم" ہے"!

وہ مغنیہ پھر لحن طراز ہوئی، مگر اس کے اس دوسرے گیت میں کچھ نہ تھا۔ مگر محبت کی مایوسیاں اور ناکامیاں ——— آنکھوں میں چھلک رہی تھی اور ہونٹوں پہ پریشان خیال تڑپ رہا تھا! "استاد کامل" قریب نہ ہو گیا کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گانے کی کوئی ہلکی سے ہلکی گنگناہٹ اور خاموشی سے خاموش مرکی بھی اس کے سننے سے رہ جائے۔ آخر ان کے ساتھ گانے والی کے چہرے پہ طمانیت کی لہر دوڑ گئی۔ "استاد کامل" بھی مطمئن ہوا کہ ارتقائے محبت کی "مسرت" تو اس کا "راز" ہے!

نغمۂ عشق کا "استاد" جب رخصت ہونے لگا تو اس سے کہا "جو محبت غم میں لذت نہ پائے نہ وہ تو گویا ادھوری ہے، مرجھائی ہوتی ہے، وہ لوگ ہیں اس کی پرورش کرتے۔ جنا حاقت ہے عشق کی تو ہنگامہ پرور صرف دلوں کے چڑھاوے چڑھتے ہیں۔ وہ بھی اس کی کامرانی ہے"!

وہ مطربہ اب بھی گاتی ہے، وہ مغنیہ اب بھی الاپتی ہے، لیکن اب اس کا نغمہ نغمۂ مسرت نہیں، اب اس کا ترانہ سوگواری میں، وہ تو اب محبت کے گیت محبت ہی کو سناتی ہے ——— کہ اب اسے اپنے دل کا علم ہے تو نہ مسرت کا مرادف ہے نہ غم کا ہم معنی، بلکہ ایک کیفیت ہے جس کا کوئی نام نہیں!

ل۔ احمد

عورت

(ٹیگور کے جذبات میں)

(۱)

اے عورت! تو صرف خدا ہی کی صنعت نہیں، بلکہ انسان کی صنعت بھی ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے دلوں سے تجھے حسن بخشتے رہے ہیں۔ شاعر تیرے لئے تخیل زرّیں کے تاروں سے نقاب بنتے رہتے ہیں۔ مصور تیرے پیکر کو جامۂ تازہ دیتے رہتے ہیں، سمندر اپنے موتی دیتا ہے، کانیں اپنا سونا، باغ اپنے پھول، تجھے آراستہ کرنے کے لئے، تجھے پہنانے کے لئے، تجھے زیادہ قیمتی بنانے کے لئے!

انسانوں کے دل کی آرزو نے اپنے جلوے سے تیرے شباب کو منور کر دیا ہے۔ تو نصف عورت ہے اور نصف خواب!

---

(۲)

اے حسین عورت! تو ایک نظر سے ان نغموں کی تمام دولت کو جو شاعروں کی بانسریوں سے نکلتے ہیں تباہ کر سکتی ہے!

لیکن تو ان کی تعریفوں پر کان نہیں دھرتی۔ اس لئے میں تیری تعریف کرتا ہوں۔ تو مغرور سروں کو اپنے قدموں پر جھکا سکتی ہے +
لیکن جن کو تو پرستش کے لئے منتخب کرتی ہے وہ تیرے بے نیاز شہرت محبوب ہیں۔ اس لئے میں تیری پرستش کرتا ہوں +
تیرے ہاتھوں میں یہ کمال ہے کہ تو ان کے اشارے سے شاہانہ شان و شوکت میں جاہ و جلال کا اضافہ کر سکتی ہے +
لیکن تو ان سے گرد جھاڑنے اور اپنے جھونٹے سے گھر کو صاف کرنے کا کام لیتی ہے۔ اس لئے تیرا رعب مجھ پر چھایا ہوا ہے +

---

(۳)

پیاری! اپنی حلاوت حسن کی زنجیروں سے مجھے آزاد کر دے +
میں تیری لطف و محبت کے غلافوں میں لپٹا ہوا تجھ میں گم ہو گیا ہوں +
اپنے سحر سے مجھے آزاد کر دے اور میری محبت مجھے واپس دے کہ اپنا آزاد دل تجھے نذر کر سکوں +

حامد حسن قادری (ملکپور جانسن کالج آگرہ)

کسی کی یاد میں

جب ہم آنکھیں جھکا کر غور کرتے ہیں تو ہمارا خیال ایام رفتہ کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ گویا ایک پریشان خواب دیکھ رہے۔ جو ہو بہو کسی کی تصویر پنہاں سے مشابہ ہے +

اور گردو پیش کے شور سے ان پاکیزہ خیالات میں کچھ بھی انتشار نہیں پیدا ہوتا بلکہ دھندلی تصویر اور بھی زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ ہم بیتاب ہو کر آہ بھرتے ہیں اور کہتے ہیں

'یہ تو سب پہلے ہی دیکھ چکے ہیں یہ سب ماضیات میں سے ہے۔ مگر علم نہیں کب اور کہاں دیکھا ہے'

پیاری! . . . . جب میں نے تیرے چہرے کو پہلی بار دیکھا تھا۔ ہمارے خیالات بھی ایک دوسرے کے لئے ایسے ہی تھے جیسے دو آئینے آمنے سامنے دھرے ہوں اور ایک کا دوسرے میں عکس پڑ رہا ہو۔ اگرچہ مجھے معلوم نہیں ہے کہ کب اور کہاں ایسا ہوا +

مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ میں تجھ سے بارہا ملا ہوں۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے کے دل میں صرف پنہاں ہی نہیں بلکہ بول چال میں بھی شریک رہے ہیں ———

(ٹیگور)

شمیم عمری

ہلال عید

"ہلال عید" ہے جلوہ فروش گردوں پر
نشاط ریز ہوا جنبشِ ہر واژوں پر

"ھلال" ہے یا گلستانِ چرخ کی مالن
پہن کے نیلگوں ساری بہ نازِ صبر شکن

لگا کے "کشتی زر" میں سرور و عیش کے پھول
جو کر رہی ہے زمانہ کو پیش بہرِ قبول

یا سطحِ بحرِ فلک پہ ہے "آرزو کا صدف"
یا "مارِ چرخ" نے "من" رکھ دیا ہے غرب طرف

یا بحرِ عیش میں قسمت کی "کشتی سیمیں"
رواں ہے "منزلِ مقصد" کی سمت با تمکیں

یا وا ہوا درِ خم خانہ نشاط و سرور
یا "بابِ راحت" فردوسِ انبساط و سرور

یا دستِ "ساقی گردوں" پہ ہے چھلکتا جام
یا کوئی حور شمائل کھڑی بر لبِ بام

یا چرخ پر ہے نمایاں خوشی کا گہوارہ
یا "نورِ حسن کا" پرواز میں ہے طیارہ

یا دستِ "مانی" قدرت کا شاہکار ہے یہ
یا "بوستانِ مسرت" کی نو بہار ہے یہ

یا ہے "نہالِ تمنا" کی تازہ تر کونپل
یا "نازنینِ مسرت" کے پیر کی چھاگل

یا انبساط و مسرت کی اک نظر ہے یہ
یا درد و غم کی "کنکھی" پئے جگر ہے یہ

یا ظلمتِ شبِ غم میں ہے چشمۂ حیواں
یا خرمی کے گلِ تر پہ "تیتلی" ہے عیاں

یا ہے سرور کے پرچم کا "فتح خیز ھلال"
جو ہر تیرہ نصیباں ہے موجبِ اقبال

یا ہے یہ عشرتِ فردا کی مختصر تمہید
دلوں میں کرتی ہے پیدا جو جوششِ امید

دعا گزار ہے رعنا بہ پیشِ ربِ مجید
"ہلال عید" ہمیں دے مسرتوں کی نوید

"ہلال عید" ہو مسعود بہرِ ملک و وطن
شگفتہ غنچۂ آزادی ہو بہ باغِ زمن

ہوں کامیاب مقاصد میں لیڈرانِ قوم
مثالِ مہرِ درخشاں ہوں اخترانِ قوم

ہمارے ملک کو حاصل ہو کامل آزادی
ہو پیدا سازِ شکستہ سے نغمۂ شادی

ہوں اہلِ ہند امینِ گنجِ رستگاری کے
درِ مراد ملے اشکِ حزن کے بدلے

جہانِ قلب کی یارب ہو اس سے آبادی
کہ بزمِ ہند میں روشن ہو "شمع آزادی"

عابدہ بیگم رعنا

ہلالِ عید

مخلوق عالم منتظر بود — پریشاں بر فلک تار نظر بود
بپا شد شور تبریک و مسرت — کہ حسن ماہ عالم جلوہ گر بود

عجب حیراں تحیر خیز گشتم — کہ چوں من روئے ماہ عید دیدم
نہ یابم در رخش تاب مسرت — نگاہش ساکن و خاموش دیدم

بہ گفتم "چوں دلت من خستہ دیدم — چرا پائت بہ حسرت بستہ دیدم
نہ داری در نظر تاب مسرت؟ — بہ غم ابروئے تو پیوستہ دیدم؟"

بحسرت گفت با من ماہ عالم — "وفور عیش در عالم نہ یابم
بہ مسلم جلوہ پنہاں نہ بینم — جلالِ ملت بیضا نہ دیدم

بہ ہر چشمے چراغ نور جویم — بہ ہر روئے سرور عید جستم
نمی یابم بہ عالم راز دانے — نہ با کس حال قلب زار گفتم

نہاں در سینہ ام راز نہانے — نہ دارم حاجت شرح و بیانے
طلسم عقل چراغ شعلہ در بر — نمی آید بہ لب آہ و فغانے

اگر در سینہ تپش درد داری — بیا سوئے دلم با آہ و زاری
ببیں در چشم من تمہید حسرت — بجو از من وفور بے قراری

بہ درد قلب غمگیں راز داں شو — مثال آہ سوزاں سرگراں شو
اگر در سینہ روح قلب داری — بیا با من ہم آہنگ فغاں شو

بلقیس جمال
بریلوی

ہلال عید

غریب خوردہ ہماری طرح نہیں کوئی
نہ ہوگا ہم سا خراب وفا کہیں کوئی

شراب دہر کی زرکاریوں نے لوٹ لیا
ہمیں زمانے کی عیاریوں نے لوٹ لیا

شکوہ و جاہ، زر و بخت و دولت و اقبال
دیا نہ ساتھ کسی نے، کہاں ہو اجبال

عروس تیغ و قلم سے نباہ ہو نہ سکا
کہ تخت و تاج جہاں اہل شاہ ہو نہ سکا

بہار علم و ہنر نے کہاں فروغ دیا؟
ہماری گود میں پل کر ہمیں کو داغ دیا

یہ انقلاب! کہ بیگانہ ہو گئے اپنے
نصیب ہی یہ ستم ہے کہ سو گئے اپنے

خدا نے پھیر لیں آنکھیں، وفا کہیں نہ رہی
فلک فلک نہ رہا اور زمیں زمیں نہ رہی

ہلال عید پرانی روش پہ قائم ہے
وفا شعار ہے یہ، اس کا لطف دائم ہے

مزا شراب کہن کا چکھا ہی جاتی ہے
ہم اہل ہوں کہ نہ ہوں عید آ ہی جاتی ہے

اختر انصاری دہلوی

حسرت عید

(از مولوی محمد فاروق صاحب دیوانہ ایم۔ ایس۔ سی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ)

حسرت دید رہی جاتی ہے
دل کی اُمید رہی جاتی ہے

اُن کو انکار گلے ملنے سے
اور مری عید رہی جاتی ہے

(مرسلہ حامد حسن قادری)

عید کے دن ایک تصویر کے دو رُخ

منم کہ یافتہ ام ذوق صحبت غم را
بہ صبح عید دہم وعدہ شام ماتم را

آج عید ہے۔ جس کو نازک خیالوں نے "سیلاب نشاط" اور "طوفانِ مسرت" کے کیف پرور نام دے رکھے ہیں دنیا کے ہر گوشہ میں فرزندانِ اسلام خوشیاں منا رہے ہیں۔ در و دیوار سے مسرت و بہجت کی صدائیں آ رہی ہیں بچے بوڑھے، عورت، مرد سب کے سب سرور و شادمانی کے نشے سے مخمور ہیں۔ مگر میرے کم بخت دل کی حسرت پرستیاں ملاحظہ ہوں۔ کہ اس مسرت بخش تقریب پر بھی کتاب ماضی کی ورق گردانی کر کے درس عبرت لے رہا ہے۔ اور قصہ ہائے پارینہ کی یاد سے "داغہائے سینہ" کو تازہ کر رہا ہے

سب سے پہلے چشم تصور کے سامنے مغل شاہنشاہ کا باعظمت دربار آتا ہے۔ عید کا دن ہے۔ بادشاہ تخت زرنگار پر جلوہ افروز ہے۔ امراء زرق برق لباس میں اپنی اپنی جگہ مؤدب بیٹھے ہیں۔ تمام دربار پر انوار نشاط و شادمانی محیط ہیں۔ کہ ملک الشعراء اٹھتا ہے۔ مجرا عرض کرتا ہے۔ اور ایک پُرجوش آواز میں تہنیت عید کا قصیدہ پڑھنے لگتا ہے۔ جس کا کیف انگیز مطلع ہے

صبح عید کہ در تکیہ گاہِ ناز و نعیم
گدا کلاہِ نمد کج نہاد و شہ دیہیم

یہ مطلع کس قدر خوبی کے ساتھ بتا رہا ہے۔ کہ بادشاہ سے لیکر گدا تک سب ایک ہی نشہ میں سرشار ہیں +

پردہ اٹھتا ہے۔ وہ شان و شوکت رخصت ہو جاتی ہے۔ نہ دہلی ہے نہ تخت زرنگار۔ رنگون کا ایک گوشہ ہے اور شام کا وقت۔ ایک مصلے پر خاندانِ مغلیہ کی آخری یادگار ابوظفر بہادر شاہ نماز مغرب میں مصروف ہیں۔ نماز سے فارغ ہوتے ہیں تو ایک خواجہ سرا خدمت میں حاضر ہو کر مجرا بجا لاتا ہے۔ اور مبارکباد عرض کرتا ہے۔ ظلِ سبحانی اُس سے دریافت فرماتے ہیں کیسی مبارکباد؟ وہ عرض کرتا ہے۔ جہاں پناہ عید کا چاند نکلا ہے۔ یہ سنکر گردش فلک کے ستائے ہوئے بادشاہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ اور وہ ایک حسرت آمیز حیرت کے ساتھ پوچھتا ہے۔ ہیں، کیا مغلیہ سلطنت کی تباہی کے بعد بھی، عید کا چاند نکلتا ہے" اس ذرا سے جملے میں درد و حسرت کے طوفان پنہاں ہیں +

ان دونوں واقعات کا تقابل کسقدر حسرت خیز ہے۔ سچ ہے خوشی کا دارومدار دل پر ہے کئی ایسی غم نصیب ہستیاں ہیں جن کو ہلال عید پیغام مسرت نہیں دیتا۔ بلکہ

سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

ان کے عہد ماضی کی یاد سے ان کے زخموں پر نمکپاشی کرتا ہے۔ اور وہ علامہ اقبال کے لفظوں میں ایک حسرت کے ساتھ کہہ اٹھتے ہیں ؎

پیام عیش و مسرت ہمیں سناتا ہے
ہلال عید ہماری ہنسی اڑاتا ہے

یا بعض سوختہ ساماں اس طرح اظہار درد کرتے ہیں ؎

ہمارے غمکدۂ عشق میں خوشی کیسی
یہ تیری چھیڑ مہ عید ناگوار ہے آج

ریاض بی اے

عید کا چاند

کل شام کے وقت اپنے کمرے میں بیٹھی مطالعہ کر رہی تھی کہ کہیں سے "نظر آگیا! نظر آگیا" کی آوازیں سنیں دل میں سوچا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے ان بچوں کو کیا نظر آیا جو اس قدر خوشی سے آوازیں نکال رہے ہیں۔ باہر نکل کر دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا۔ دل میں سوچا کہ شاید ایسی خوشی میری قسمت میں نہیں ہے۔ پھر بھی اُن بچوں کی طرح کوٹھے پر چڑھی اور سارے آسمان پر نظریں دوڑانی شروع کیں۔ پھر بھی کچھ نہ دیکھا۔ پھر خیال کیا کہ شاید میرے ساتھ کوئی ڈھونڈنے والا نہیں اس لئے مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ خیر اب تو اچھی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا۔ ہا ہا! اب مجھے بھی نظر آگیا۔ وہ نیا چاند اُن اونچے اونچے درختوں کی چوٹیوں پر سے مسکراتا ہوا نظر آتا ہے۔ چاند کو دیکھتے ہی دل میں ایک قسم کی روشنی سی پیدا ہوئی اور دل کو مسرت حاصل ہوئی اور اقبال کے مندرجہ ذیل شعر گاتی ہوئی کوٹھے پر سے نیچے اتر آئی ؎

غرۂ شوال! اے نورِ نگاہِ روزہ دار
آ کہ تھے تیرے لئے مسلم سراپا انتظار
تیری پیشانی پہ تحریر پیام عید ہے
یعنی تیری شام صبح عیش کی تمہید ہے

سکینہ

دُوہری شرط

(افسانہ)

(از جناب محمد دین صاحب تاثیر۔ ایم۔ اے)

چھوٹے چھوٹے عذابوں میں سے سب سے بڑا عذاب یہ کسی ایسے شک کا دل میں بیٹھ جانا ہے۔ جو کبھی رفع نہ ہو سکے جسے کوئی تحقیق جھوٹا یا سچا ثابت نہ کر سکے۔ بالخصوص اگر۔ . . . لیکن خیر۔ گڑے مردے اکھاڑنے کا کیا فائدہ؟—

پھر اندنوں تو فیشن ہی اور ہے۔ پچھلے دنوں میں شرابی ارذل الخلائق سمجھا جاتا تھا۔ جُواری سے کوئی بات نہ کرتا تھا۔ مگر اب یہ عیب عیب نہیں۔ تہذیب کی نشانی ہے۔ اجی کلاٹ صاحب پیتے ہیں۔ بڑے لاٹ صاحب ریس پہ شرط بدتے ہیں۔ سب نقطۂ نظر کی بات ہے +

ہم بھی ٹھہرے نئی روشنی کے آدمی۔ گھروالی کے خوف سے کچھ کر تو سکتے نہیں۔ ہاں گفتگو میں ضرور گھڑدوڑ کا چرچا رہتا ہے۔ اس سے پوچھ، اُس سے سوال کر بالکل اپٹوڈیٹ رہتے ہیں: "کیوں بھئی مردان جیتا تھا؟"۔ "کہو۔ فنز پہ لگی تھی کہ کولس پہ؟"۔ "آج بڑے دشاش پھر رہے ہو کسی باہر والے پہ رقم لگائی ہوگی!"— گو جیتتے کسی کو نہیں سُنا لیکن سب نے کچھ نہ کچھ بدا ہوتا ہے +

پھر بھی پانچوں انگلیاں ایک سی نہیں ہوتیں۔ ہزاروں میں سے ایک سہی۔ مگر ہمارا نائی اس عیب سے بری تھا +

"نا۔ صاحب۔ میں نے کسی پہ رقم نہیں لگائی میری توبہ۔ جُوا ہے جُوا۔ آخر سؤر کے گوشت اور جوئے میں کیا فرق ہے؟ دونوں حرام۔ دونوں کی ایک جا ممانعت آئی ہے۔ اور پھر میری تو اس ریس کے ہاتھوں زندگی تلخ ہو چکی ہے"

"زندگی! تلخ؟"

"ہاں صاحب۔ ایسی ریس کی ٹھیس لگی ہے کہ زندگی تلخ ہو چکی ہے! یوں ہوا کہ ایک گاہک آئے۔ بڑے شریف آدمی! آپ کی طرح بھرے بھرے سے اُستر یوں چلے جیسے ٹھنڈی سڑک پہ گھوڑا۔ ہاں صاحب! دبی تپلی گالوں کو تو کھینچ کھینچ کر ہاتھ رہ جاتے ہیں۔ میں بڑی پریت سے خط بناتا رہا۔ جب کام ختم ہوا تو ایک جیب میں ہاتھ ڈال دوسری میں اندر دیکھ باہر ٹٹول۔ کہنے لگے کہ میاں نبتیا۔ یار تو دونوں ہاتھ خالی ہیں۔ ہاں ایک ریس کی رمز بتائے دیتے ہیں۔ خاص اندر کی پتے کی بات ہے۔ کل ہی دوہری شرط۔ چھپا اور سینڈی تیتنی ہیں!— آپ تو دوہری شرط جانتے ہیں ایک کی بجائے دونوں کو جیتنا ہوتا ہے۔ ایک رہ جائے تو خاک سیاہ نہیں تو چاندی +

مجھے تو گھڑدوڑ کی کچھ خبر نہ تھی۔ ایک برادری کے آدمی کے پاس گیا۔ دور نزدیک سے بھائی ہی تھا۔ اور بے تکلف دوست۔ اسے ان سب باتوں کا شوق تھا۔ گوروں کا کام بناتا تھا۔ یہ بھی خاص ہی لوگوں کا وصف ہے۔ یہ گورے! خوش ہوں تو انعام نہیں تو ڈیم فول بوائین! تو کہیں نہیں گیا۔ بس تو بھی دسیوں بھائیوں کی رُوکھی سوکھی ہی بہت ہے

آپ کی تعمیل سب حضرت کرتے ہیں۔ نائی نہیں۔ آدمی سمجھتے ہیں
ہاں۔ تو میں نے ایک دس روپے کا نوٹ اُن کے ہاتھ پر
رکھا اور کہا کہ چھپا اور سنڈی پر لگا دے۔ ہاں صاحب۔ ایک
دو کا کیا لگانا۔ آئے تو معقول رقم آئے۔ "تاکید کر دی۔ وہ
لے لیا اور آکر بستر پر پڑ رہے +

لیکن نیند کیسے؟ رات بھر اور پھر صبح کو۔ انہی دو
دو گھوڑوں کا تصور جما ہوا تھا۔ اس توجہ سے "تصورِ شیخ" کرتا
تو کچھ پا لیتا۔ اس یک خیالی میں ایک گاہک کے ٹیڑھا ہاتھ
لگ گیا۔ تھی تو تھنسی جو چھٹی۔ لیکن لہو تو نکلا۔ ایک کے بال
اُلٹے تھے۔ مانگ نکال دی۔ اور شیخ رحیم بخش۔ وہ بڑے
فیشن ایبل رہتے ہیں۔ پہلے سیدھے سادے پھرا کرتے تھے
کوئی کہہ نہ سکتا تھا کہ کوئی امتحان پاس ہیں۔ اُن کی داڑھی
تراش رہا تھا۔ مونچھیں بھی چٹ ہو گئیں۔ ہیں وضعدار آدمی۔
اُنھوں نے اُسی دن سے ہیٹ لگا لی۔ سوٹ پہن لیا۔
میں منٹ منٹ پر باہر جھانکتا۔ ذرا اخبار والے کی آواز
آئی اور لپکا۔ بڑی معرکے کی ریس تھی۔ سب روزانوں نے
دو دو ضمیمے نکالے تھے۔ آخر خبر آئی چھپا جیت گیا۔ اور شرط
آٹھ پر ایک تھی۔ دوسری کا آدھا آ گیا +

آخر نج نے کیسے دوپہر گذری اور دوسری کا نتیجہ نکلا۔
اخبار میرے ہاتھ میں تھا اور میں ورق اُلٹنے کی جرأت سکتا
تھا! سیٹنی ہی جیتا! اور میں ایک پر۔ سو سمجھئے ذرا آٹھ
ایک اور میں ایک۔ کتنے سو کی رقم بنتی ہے۔؟ اب۔۔۔
بس میرے دل کی حالت میں ہی جانتا ہوں۔ بالکل بچوں
کی طرح ایک سانس ہنستا اور چلّاتا تھا۔ دیوانوں کی طرح
اُچھلتا کودتا تھا +

اسی دوران میں وہ ہمارے دوست بھی آ پہنچے۔ اور
ایک دس روپے کا نوٹ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ کہنے لگے "بھئی
بڑا افسوس ہے۔ میرے دماغ ہی سے بات نکل گئی۔
تمہارے نام کی شرط لگانی یاد ہی نہ رہی!"

کیا پوچھتے ہو صاحب۔ بس میرے پاؤں تلے سے
زمین نکل گئی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ ایسے ایک
اور صدمے سے دل کی حرکت بند ہو جاتی +

ہوش آیا تو پوچھا: "تو کیا بھول گئے؟"۔ "ہاں بھئی
بڑا افسوس ہے یاد ہی نہ رہا" +

آج تک مجھے یقین نہیں آتا کہ اُسے یاد رہا یا نہیں رہا!
کہئے زندگی تلخ ہوئی یا نہ ہوئی؟ ۔۔ جب کبھی اُسے ملتا ہوں
عجب عجب خیالات گزرتے ہیں۔ گھور گھور کر کن انکھیوں سے
پھر پھر کے اسے دیکھتا ہوں۔ دل کی گہرائیوں تک نظر نہیں جا
سکتی کبھی اطمینان نہیں ہو سکتا۔ دوست ہے کہ بدنیت؟
یہ نیا بوٹ اس نے جو پہن رکھا؟ کوٹ تو نیا تا ہی ہے! غرض
سچ جھوٹ کبھی نہیں کھلے گا! زندگی اور کس طرح تلخ
ہوتی ہے؟ ــــــــــ

(ماخوذ)

تاثیر (ایم۔ اے)

تصاویر

تصویر آج کتابوں۔ اخباروں اور رسالوں کا جزو بن گئی ہے۔ اور اس بدعت حسنہ کو ہندوستان میں پورے زور کے ساتھ شروع کرنے کا بار ہماری گردن پر ہے اس لئے اگر نیرنگ خیال اس باب میں ترقی کی تمام منزلیں جلد جلد طے کر جائے تو چنداں تعجب خیز نہ ہوگا۔ اب تصاویر ہر رسالہ کی زینت ہوتی ہیں۔ تعداد میں بھی اب کوئی رسالہ پیچھے رہنا نہیں چاہتا فرق کوئی باقی ہے تو صرف ذوق صحیح کا۔

زیر نظر عید نمبر کی تصاویر بھی بجائے خود خوب ہیں۔ عید نمبر کی خصوصیت سے علاوہ اسلامیہ کے متعلق تصاویر کی تعداد زیادہ ہے۔ ترکی کے ہر دلعزیز لیڈر غازی مصطفےٰ کمال پاشا کا وہ مجسمہ جو فن مجسمہ سازی کا ایک لاجواب نمونہ ہے۔ عید نمبر کی زینت ہے۔ یہ مجسمہ اٹلی کے ماہرین نے تانبے کی زمین پر تیار کیا ہے۔ اس مجسمہ میں ترکی لیڈروں کا وہ گروہ نمایاں کیا گیا ہے جن کی شبانہ روز جانفشانیوں سے ایک قوم اور ملک نے آزادی کا منہ دیکھا ہے۔ وسط میں غازی مصطفےٰ کمال پاشا کھڑے ہیں۔ داہنی طرف غازی عصمت پاشا اور بائیں طرف فیضی پاشا چپ سادھ رہیں۔ مجسمہ کو بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی خاص بات ہے۔ جو کارنامے ان حضرات نے سرانجام دیئے ہیں۔ وہ شاید جنات سے بھی نہ ہو سکتے۔

ایک تصویر شاہ ایران کی ہے جس میں وہ فوجی طلبا کو سندیں تقسیم کر رہے ہیں۔ ایران بھی ترکی کے نقش قدم پر ترقی کی طرف تیزی سے قدم اٹھائے جا رہا ہے۔ انشاء اللہ دونوں قومیں دس بیس سال میں ہر طرح سے مضبوط و محفوظ ہو جائیں گی۔

ترکوں کے متعلق یورپ کی خبر رساں ایجنسیاں آئے دن یہ پروپیگنڈہ کرتی رہتی ہیں۔ کہ وہ بے دین ہو رہے ہیں۔ حالانکہ یہ باتیں بالکل بے سروپا ہیں۔ ترک نہ صرف اپنے دین پر قائم ہیں۔ بلکہ اس کے شیدائی ہیں۔ حال ہی میں رسالہ ایشیا کا ایک نمائندہ ترکی کی سیر سے واپس آیا ہے۔ اس نے ایک مبسوط مضمون کے ذریعہ ترکی کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ظاہری آنکھ سے دیکھیں تو ترک یکسر تبدیل ہو چکے ہیں۔ لباس۔ چال ڈھال میں وہ بالکل اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی اندرونی زندگی ابھی تک وہی ہے۔ ترک ابھی تک سادہ۔ مہمان نواز۔ شراب سے متنفر اور نمازی ہے۔ نامہ نگار لکھتا ہے کہ مسجدیں نمازیوں سے بھری ہوتی ہیں۔ ہم ایک تصویر شائع کر رہے ہیں۔ جس میں عرشہ جہاز پر ترک غازی نماز پڑھ رہے ہیں اور انھوں نے انگریزی ٹوپیاں پہن رکھی ہیں۔ انگریزی ٹوپی نے ترکوں کی نماز پر مطلقاً اثر نہیں ڈالا۔ جس طرح سے ہندوستانی مسلمان پتلون پہن کر نماز نہیں پڑھ سکتے۔ ترکوں میں یہ بات نہیں۔ وہ پتلون اور انگریزی ٹوپی پہن کر بھی پکے نمازی ہیں۔

ایک عرب شتر سوار۔ عربوں کی موجودہ صحرائی زندگی اور ان کے تمدن کی شارح ہے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب کا مضمون اس کی تشریح کے لئے کافی ہے۔

دنیا کا پہلا انسانی جوڑا۔ اظہار ندامت۔ یہ رنگین مرصع جوڑا واقعی مصوری کا لاجواب کمال ہے۔ انسان کے جنت سے نکالے جانے اور ممنوعہ شجر کا پھل کھانے کے بعد اس جوڑے پر برہنگی اور ندامت کا رنگ چڑھا ہے۔ یہ اس کی مظہر ہے اس موضوع پر آج تک جسقدر تصاویر شائع ہو چکی ہیں انھیں سب سے بہتر ہے۔

فرضِ جہاد۔ جہاد اسلامی زندگی کا ایک روشن پہلو ہے۔ جہاد صرف مظلوموں کی حفاظت اور دین کی آزادی کے لئے جائز ہوتا تھا۔ اس تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ اعلان جہاد کے وقت مسلمان کسقدر مسرور اور جوش میں ہوتے ہیں۔ عورتیں۔ بچے۔ بوڑھے۔ جوان۔ مصافی اور غیر مصافی تمام کے تمام ایک ہی رنگ میں رنگے ہوتے ہیں۔ اس تصویر کے ساتھ سالک صاحب کی نظم سونے پر سہاگہ ہے۔ یہ تصویر عید نمبر کی جان ہے۔

مریم زمانی۔ دہلی کے ایک سفر میں عجائبات فروخت کرنے والی ایک دوکان پر ہمیں یہ تصویر ہاتھی دانت پر نقش شدہ دستیاب ہوئی۔ ہم نے اسے خرید لیا۔ اور آج اسے ناظرین نیرنگ خیال کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ بالکل اسی سائز پر یہ تصویر ہے۔ دیکھئے کس قدر باریک کام ہے۔ اور اندازہ کیجئے کہ کس مشکل سے کام کیا گیا ہوگا۔

(بقیہ مضمون دیکھو صفحہ ۱۶۱ پر)

مصرع بسملہ

ایک علمی مقالہ

(از جناب میر ولی اللہ صاحب ... بی اے ایل ایل بی)

شیخ نظام الدین ابو محمد الیاس یوسف بن موید مطرزیؒ یعنی شیخ نظامی گنجوی بہت باکمال شاعر تھے۔ اصل میں تفرش علاقہ قم کے تھے۔ لیکن آپ کے والد بزرگوار گنجہ علاقہ آذربائیجان میں آکر سکونت پذیر ہوئے تھے آپ کا خمسہ عوام و خواص میں مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے خمسہ کے علاوہ بھی آپ نے قریب بیس ہزار اشعار لکھے ہیں اتابک قزل ارسلان کو آپ کے ساتھ بہت عقیدت تھی۔ حضرت اخی فرخ زنجانی قدس سرہٗ کے مرید تھے۔ آخر عمر میں خلوت نشین ہو گئے تھے۔ ابتدا میں بھی گو دربار شاہی سے تعلقات تھے لیکن حرص و ہوا سے بالکل پاک تھے۔ آپ سلطان طغرل بن ارسلان کے عہد میں ۵۹۶ھ میں اور بقول بعض ۶۰۲ھ یا ۶۰۶ھ میں فوت ہوئے اور گنجہ میں مدفون +

آپ کا خمسہ (یا پنج گنج) ان کتابوں پر مشتمل ہے:۔

(۱) مخزن الاسرار (۲) سکندر نامہ (۳) ہفت پیکر۔ (۴) شیریں و خسرو (۵) لیلیٰ و مجنوں +

خمسہ نظامی کے جواب میں کئی شاعروں نے خمسے لکھے خصوصاً مخزن الاسرار کے جواب میں تو صدہا شاعروں نے طبع آزمائیاں کیں۔ قبول عام کی اس سے زیادہ اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ مخزن الاسرار سلطان بہرام شاہ ابن داؤد شاہ والیٔ ارزنجان کے کہنے پر لکھی گئی تھی یہ ۵۵۹ھ میں مکمل ہوئی +

یہ مثنوی بحر سریع مطوی موقوف (مفتعلن مفتعلن فاعلات) میں ہے کہا جاتا ہے کہ نظامی سے پہلے اس وزن میں مثنوی نہیں لکھی گئی +

مخزن الاسرار کا پہلا شعر یہ ہے ؎

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
ہست کلید در گنج حکیم

نظامی سے پہلے بسملہ کو ایک مصرع بنا کر اس پر دوسرا مصرعہ بھی غالباً کسی شاعر نے نہیں لگایا تھا۔ یہاں ہم اُن مثنویوں کا ذکر کریں گے جو مخزن الاسرار کے جواب میں لکھی گئی ہیں۔ اور جن کے پہلے شعر میں مخزن الاسرار کے پہلے شعر کی طرح مصرع بسملہ موجود ہے +

(۱) مطلع الانوار۔ امیر خسرو دہلوی کی لکھی ہوئی ہے۔ آپ کا آبائی وطن ترکستان ہے۔ آپ کے والد چنگیزی فتنے میں ہندوستان آ گئے۔ اور دہلی میں پہنچ کر سلطان محمد تغلق شاہ کے دربار سے تعلق پیدا کیا۔ آخر کو کفار سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ امیر خسرو ان کے قائم مقام ہوئے۔ شیخ نظام الدینؒ اولیا کی صحبت

میں رہ کر اشغالِ دنیوی سے قطع تعلق کر لیا۔ اور سیر سلوک میں
مشغول ہو گئے خمسہ نظامی کے جواب میں خمسہ لکھا۔ جو بہت
مشہور ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ کے کل اشعار کی تعداد چار لاکھ
کے بہ پانچ تھی (؟) ۲۵ سال کی عمر میں ۷۲۵ھ میں فوت ہوئے
اور شیخ نظام الدین اولیا کے مقبرہ میں (بمقام دہلی) دفن ہوئے
(طوطی شکر مقال) آپ کا مادہ تاریخ وفات ہے۔

کہا جاتا ہے کہ آپ نے خمسہ ۶۹۸ھ میں ختم کیا اور
سلطان علاء الدین کے نام سے منسوب کیا۔ مطلع الانوار دو ہفتے
میں ختم ہوئی۔ اشعار کی تعداد (۳۳۱۰) ہے ۶۹۸ھ میں لکھی گئی
جیسا کہ مطلع کے ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے۔

از اثرِ اخترِ گردوں خرام
شد بدو ہفتہ این نامہ کامل تمام
در ہمہ بیت آوری اندر شمار
سی صد و دہ بر شمر و سہ ہزار
سال ز ہجرت چو کہن گشتہ بود
از پس شش صد نود و ہشت بود

پہلا شعر اس طرح ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم — خطبۂ قدس است بملک قدیم

(۲) **گلشن ابرار**۔ مولانا کاتبی کی تصنیف ہے۔ نام آپ کا
محمد ہے۔ ترشیز کے علاقے کے رہنے والے تھے۔ ابتدا میں
نیشاپور آئے۔ اور مولانا سیمی سے کتابت سیکھی۔ بہت خوشنویس
تھے۔ کاتبی تخلص اختیار کرنے کی یہی وجہ ہے۔ نیشاپور سے
نکل کر ہرات آئے سلطان بائسنغر کے کہنے پر کمال الدین
اسماعیل کے ایک قصیدہ کا جواب لکھا۔ معاصرین کے حسد نے
وہاں بھی نہ رہنے دیا۔ وہاں سے چل کر استر آباد گیلان اور شیروان
کی طرف پھرتے رہے۔ شاہانِ وقت جو کچھ انعام و اکرام کرتے
تھے فقرا میں تقسیم کر دیتے تھے۔ شیروان سے آذربائیجان چلے
گئے وہاں اسکندر بن قرا یوسف کی تعریف میں ایک قصیدہ
لکھا۔ اس نے چنداں التفات نہ کیا۔ ناراض ہو کر ایک ہجو لکھی
اور اصفہان چلے گئے۔ اور خواجہ صاین الدین کی صحبت میں رہ کر
علم تصوف حاصل کیا۔ پھر استر آباد میں چلے گئے۔ وہاں کے
بزرگ اور حاکم آپ کی قدر کرتے تھے۔ اسی فراغت
کے دنوں میں آپ خمسہ نظامی کے جواب میں مصروف ہوئے۔
مخزن اسرار کا جواب لکھا جسے لوگوں نے بہت پسند کیا
آپ ۸۳۸ھ میں فوت ہوئے۔ قبر آپ کی استر آباد میں ہے
آپ کے مدحیہ قصائد، غزلیات، مقطعات اور مثنویاں بہت
مشہور ہیں۔ بدر شیروانی سے آپ کا مشاعرہ ہوا۔ بدر کے حق میں
کہتے ہیں ؎

لقب کاتبی دارم اے بدر [illegible]
محمد رسید اسم از آسمان [illegible]
محمد مرا نام ہست و تو بدر [illegible]
بانگشت از ہم ترا بدر [illegible]

آتشکدہ میں ان کے چند اشعار نمونے کے طور پر [illegible]
ان میں سے یہ شعر مجھے بہت پسند آیا

خوش است گفتن در [illegible] ماجرا [illegible]
بشرط آنکہ نباشد [illegible]

گلشن ابرار اس طرح شروع ہوتی ہے [illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم — تاج حکومت [illegible]

(۳) **تحفۃ الاحرار**۔ مصنفہ مولانا جامی [illegible]
نام آپ کا نور الدین عبد الرحمن تھا۔ ولایت جام [illegible]
والے تھے۔ آپ خرد [illegible]
تحصیل علم و ادب میں [illegible]
سعد الدین کاشغری [illegible]
تھے۔ انہی کی صحبت [illegible]

ایک ہزار روپیہ سفر خرچ بھیجا۔ چنانچہ غزالی عازم جونپور ہوا۔ وہاں جا کر خانِ زماں کی تعریف میں ایک ہزار بیت کا قصیدہ لکھا۔ اور ایک ہزار اشرفی انعام پایا۔ خانِ زماں کے قتل ہو جانے غزالی شاہنشاہ اکبر کے پاس آ گیا۔ اور ملک الشعرائی کا خطاب حاصل کیا۔ سنہ ۹۸۰ھ میں راہیِ ملکِ بقا ہوا۔ شیخ فیضی نے تاریخ وفات کہی ہے ؎

قدوۂ نظم غزالی کہ سخن ہمراز طبعِ خدا داد نوشت
نامۂ زندگیِ او ناگاہ آسماں بر ورقِ باد نوشت
عقل تاریخ وفاتش بدو طور سنۂ نہ صد و ہشتاد نوشت

لطیفہ یہ ہے کہ جہاں بظاہر الفاظ بھی سنہ ۹۸۰ھ لکھا ہے۔ وہاں بطریق ابجد بھی سنہ ۹۸۰ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس قسم کی تاریخ کو تاریخ صوری و معنوی کہتے ہیں۔

غزالی نے مخزن الاسرار کے وزن میں مشہد الانوار مرآۃ الصفا، نقش بدیع اور قدرت آثار وغیرہ مثنویات لکھی ہیں۔ اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہست نہاب از پئے دیو رجیم

ایک اور شعر میں آپ نے مصرع بسملہ پر مصرع لگایا ہے ؎

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وارثِ ملک است محمد حکیم

(۶) **مجمع الابکار**۔ عرفی کی ہے۔ جمال الدین یا محمد حسین عرفی شیرازی ایران سے نکل کر فتحپور پہنچا۔ سب سے پہلے شیخ فیضی (برادر شیخ ابوالفضل) سے تعارف ہوا۔ فیضی اچھی طرح پیش آیا۔ اور کچھ عرصہ تک عرفی کے تمام اخراجات کا کفیل ہوا۔ آخر کچھ شکر رنجی ہو گئی۔ اور عرفی نے حکیم ابوالفتح سے رابطہ پیدا کیا حکیم صاحب کی سفارش سے خانخاناں تک رسائی ہو گئی (۳۶) سال کی عمر میں بمقام لاہور سنہ ۹۹۹ھ میں راہگزائے عالم جاودانی ہوا۔ عرفی نے ایک قصیدہ میں لکھا تھا ؎

بکاوش مژہ از گور تا نجف بروم اگر بہند ہلاکم کنی دگر بہ تتار

آخر یہی ہوا۔ میر صابر اصفہانی نے لاہور سے اُن کی ہڈیوں کو نجف اشرف پہنچا دیا۔ عرفی کے قصائد مشہور عوام ہیں۔ اور حقیقت یہی ہے کہ قصیدہ گوئی میں اس نے کمال کیا ہے۔ دیوان غزلیات بھی ہے۔ جو اتنا مشہور نہیں۔ اور جس کے ایک حصہ پر الحاقی ہونے کا شک کیا جاتا ہے۔

تذکرہ آتشکدہ آذر میں لکھا ہے۔ کہ "مثنوی در برابر مخزن الاسرار گفتہ کہ شاید بر بیوقوف مشتبہ شود اما اسرار ما بر میداند کہ بسیار بد گفتہ ۔ ۔ ۔ مثنوی ناتمامے در بحر خسرو شیرین دارد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مجمع الابکار کا پہلا شعر یہ ہے ؎

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم موج نخست است ز بحر قدیم

آزاد بلگرامی نے خزانۂ عامرہ میں جہاں اس شعر کا ذکر کیا ہے اپنا ایک شعر بھی مصرع بسملہ پر پیش کیا ہے۔ وہو ہذا ؎

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم تیغ رسید تاب رسول کریم

(۷) **مرکز ادوار**۔ شیخ فیضی فیاضی کی ایک مثنوی ہے۔ ابوالفیض آپ کی کنیت تھی۔ شیخ مبارک ناگوری کے بیٹے اور شیخ ابوالفضل علامی کے بڑے بھائی تھے۔ دونوں بھائی دربار اکبری کے مشہور رکن تھے۔ پہلے فیضی تخلص کرتے تھے۔ بعدہٗ اپنے بھائی کے خطاب (علامی) کے وزن پر فیاضی تخلص کر لیا۔ آپ ایک سو ایک کتابوں کے مصنف بتائے جاتے ہیں۔ آپ کی بے نقط تفسیر کو کون شخص نہیں جانتا۔ غزالی مشہدی کے بعد آپ ملک الشعرا ہوئے۔

سنہ ۱۰۰۴ھ میں پچاس سال کی عمر میں فوت ہوئے۔ آپ کے کتب خانہ میں بارہ ہزار کتابیں تھیں۔ آپ نے سنسکرت کی کئی کتابوں کا ترجمہ فارسی میں کیا ہے۔ حافظہ اس غضب کا تھا کہ اعجاز کی حد تک پہنچا تھا۔

شہنشاہ اکبر کے حکم سے خمسہ نظامی کا جواب لکھنا شروع کیا۔ لیلیٰ مجنوں کے مقابلہ میں نل دمن لکھی۔ مخزن الاسرار کے جواب

مرکز ادوار، شیریں خسرو کے جواب میں سلیمان بلقیس اور اسکندر نامہ کے جواب میں اکبر نامہ اور ہفت پیکر کے جواب میں ہفت کشور لکھی لیکن آخری تین کتابیں مکمل نہ ہوسکیں +

مرکز ادوار اس طرح شروع ہوتی ہے +

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کرد خدا رحمت خود را تمیم

(۹) مثنوی شانی تکلو۔ شانی شاہ عباس ماضی کے دربار سے متعلق تھا۔ بادشاہ اس پر بہت مہربانی کرتا تھا۔ اور آخر زندگانی میں شانی مشہد مقدس میں جا کر گوشہ نشین ہو گیا۔ سرکار شاہی سے اسے برابر وظیفہ ملتا رہا جس پر بسر اوقات کرتا رہا۔ تاریخ وفات "بادشاہ سخن" (۱۰۲۳ھ) ہے +

سرو آزاد میں ان کے اشعار کا جو انتخاب دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بہت خوش گو شاعر تھے ؎

چہ خوش است بادرد زلف اسر شکوہ باز کردن
گلہ ہائے روز ہجراں بشب دراز کردن

لذت آزار اگر این است پیکان مرا
ہیچ اجرے نیست در محشر شہیدان ترا

قاصد آمد کہ بسوئے اوفرستم ہمچوں نفس باز لبیں باز نیامد

شاہ عباس کی مدح میں ایک مثنوی لکھی ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ماہچہ رایت امید و بیم

(۱۰) منبع الانہار۔ ملک قمی کی مثنوی ہے۔ ملک قمی ۹۸۷ھ میں قزوین سے ہند میں آیا تو بادشاہان دکن خصوصاً ابراہیم عادل شاہ نے اس کی بہت قدر کی۔ ملا ظہوری اس کا داماد تھا۔ سال وفات ۱۰۲۴ھ ہے۔ ملا ظہوری اس سے ایک سال بعد فوت ہوا +

جب اکبری فوج نے قلعہ احمد نگر کا محاصرہ کیا۔ تو ملک قمی شاہ مراد اور عبد الرحیم خان خاناں کے پاس آیا۔ اور اُن کی مدح میں قصیدے لکھے۔ انہوں نے اپنے ساتھ لے جانے کو کہا مگر اُس نے نہ مانا۔ ملک قمی نے منبع الانہار مخزن الاسرار کے جواب میں لکھی ہے۔ جس کے صلہ میں کہا جاتا ہے کہ عادل شاہ نے اسے ایک شتر بار سونا عطا کیا۔ ذہنی کاشی نے اسی کے متعلق کہا ہے ؎

در مدح و ثنائے شہنشاہ دکن
منبع ورم دار اگر نہ گنج مخزن
بپسند کہ بہر یک شتر زر گیرم
خون دو ہزار ہمت بہ در گردن

ملک قمی کا یہ شعر بہت مشہور ہے اور حقیقت میں خوب کہا ہے

گفتم کہ عار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

ملک طیفور کا ایک شعر ہے

خونچکان است ملک تیغ ستم سے ترسم
کہ بپے آخر بدر خانہ قاتل برود

تخلص کی شراکت کی وجہ سے لوگ یہ شعر ملک قمی کا بتاتے تھے طیفور نے ہندوستان میں بھی قاصد بھیجکر ملک قمی لکھوا منگوایا کہ یہ شعر طیفور کا ہے۔ اتنے خرچ اور تکلیف کے بعد طیفور اس شعر کا مالک بنا۔ منبع الانہار کا پہلا شعر یہ ہے ؎

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اھدنا الصراط المستقیم

(۱۱) دیدۂ بیدار۔ حکیم شفائی اصفہانی کی ہے۔ حکیم صاحب کا نام شرف الدین حسین۔ باپ کا نام حکیم ملا۔ طبیب حاذق تھے۔ آپ کی قرابادین مشہور ہے۔ شاہ عباس ماضی ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ ایک دفعہ حکیم صاحب جاتے تھے کہ شاہی سواری سامنے سے آگئی۔ بادشاہ نے اُترنا چاہا۔ لیکن حکیم صاحب نے منع

منع کیا۔ تاہم تمام امرا اُتر پڑے۔ اور جب تک حکیم صاحب نظر میں رہے پیدل چلتے رہے +

حکیم صاحب ہجوئیں بہت کہتے تھے۔ ایک مریض سے فیس وصول نہ ہوئی تو اُس کو یہ رُباعی لکھ بھیجی ؎

گر سام نریمانی دگر رستم گرد
جلّاب مرا بمفت نتوانی بُرد
یا قیمت آں چو خوردۂ باید داد
یا در عوض آنچہ ریدۂ باید خورد

آپ کے بعض بعض شعر نہایت خوبصورت ہیں ؎

ایں جورِ دیگر است کہ آزار عاشقاں
چنداں نمیکنی کہ بہ بیداد خو کنند

دیدی کہ خون ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نداد کہ شب را سحر کند

ما ہیم و حسرتے کہ علاجش نے کنند
صد روز وصل از شبِ ہجراں درازتر

سال وفات ۱۰۳۰ھ ہے۔ دیدۂ بیدار کے علاوہ اور مثنویاں بھی ہیں۔ مثلاً نمکدانِ حقیقت اور مہر و محبت وغیرہ۔ کہتے ہیں کہ آپ نے خمسہ کے جواب میں خمسہ لکھا۔ دیدۂ بیدار کا مطلع یہ ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم　　　　تیغ الٰہی است بدست حکیم

(۱۲) **دولت بیدار**۔ مصنفہ ملا شیدا۔ ملا صاحب طائفہ تکلو سے تھے۔ آپ کے والد مشہد مقدس سے ہندوستان میں آئے۔ ملا شیدا فتحپور میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں جہانگیر بھی احدیوں میں آپ کا نام تھا۔ خان خاناں کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا۔ اور گرانقدر صلہ حاصل کیا۔ کچھ مدت خان خاناں کیساتھ رہے۔ اس کے بعد شہزادہ شہریار بن جہانگیر کی خدمت میں رہے اور پھر شاہجہان کے عہد میں شاہی دربار سے تعلق رہا۔ آخرکار ملازمت شاہی سے مستعفی ہوکر کشمیر چلے گئے۔ اور گوشۂ عزلت اختیار کر لیا۔ شاہی وظیفہ وہاں بھی برابر پہنچتا رہا۔ ہجو کی طرف زیادہ مائل تھے۔ طالب آملی اور میر الٰہی وغیرہ کی ہجوئیں لکھیں اور بد اخلاق مشہور ہوئے۔ کہتے ہیں کہ آپ کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچتی ہے۔ جب آپ کا یہ شعر

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جو ہرے
حُسن را پرور دگارے عشق را پیغمبرے

شاہجہان بادشاہ نے سُنا تو ناراض ہوا۔ ملا صاحب نے مولانا جامی کا یہ شعر سند میں پیش کیا +

از صراحی دوبار قلقل نے　　　　پیش جامی بہ از چہار قل است

مخزن الاسرار کے جواب میں مثنوی دولت بیدار لکھی جسکا مطلع یہ ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم　　　　آمدہ سرچشمۂ فیض عمیم

(۱۳) **حسن گلوسوز**۔ زلالی خوانساری کی تصنیف ہے۔ زلالی زیادہ تر مثنوی کہتے تھے۔ آتشکدۂ آذر میں اُن کی سات مثنویوں کا ذکر ہے۔ (۱) محمود و ایاز (۲) آذر و سمندر (۳) شعلۂ دیدار (۴) میخانہ (۵) ذرّہ و خورشید (۶) حسن گلوسوز (۷) سلیمان نامہ

اِن مثنویوں کو سبعہ سیارہ اور ہفت آشوب کہتے ہیں +

سروِ آزاد میں لکھا ہے کہ ان کی بہترین مثنوی محمود و ایاز ہے کہ اس پر زلالی نے ثمر وقت خرچ کیا۔ یہ کتاب ۱۰۰۱ھ میں شروع ہوئی۔ اور ۱۰۲۴ھ میں ختم۔ ان کی مثنویوں کو ان کے مرنے کے بعد شیخ عبدالحسین داماد شیخ علی نقی کرہ نے ہندوستان میں مرتب کیا۔ اور ملا طغرائی مشہدی نے نثر میں اس مجموعہ کا دیباچہ لکھا۔ ۱۰۲۴ھ میں فوت ہوئے۔ مصرع تاریخ یہ ہے ع

از جہاں رفت زلالی بجناں۔ حسن گلوسوز کا پہلا شعر یہ ہے ؎

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم　　　　تیر شہاب است بدیو رجیم

سبعہ سیارہ کے دیباچہ میں مصرع ہسبتہ پر چند اور شعر بھی دیئے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پنجۂ اعجاز عصائے کلیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سرو سہی پوش، باغ نعیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ابروئے خوش قبلۂ حسن قدیم

(۱۴) **مثنوی سلیم** - مرزا محمد علی طرشتی سلیم۔ ابتدا میں مرزا عبداللہ وزیر لاہجان کے ساتھ رہتے تھے۔ لاہجان کی تعریف میں ایک مثنوی لکھی۔ آخر شاہجہان کے عہد میں ہندوستان آئے اور اسی مثنوی کو تغیر و تبدل کر کے کشمیر سے منسوب کیا کشمیر کی پہاڑی کے متعلق کہتے ہیں ؎

نہانا کہ فراست ایں کوہ خونخوار
کہ دارد بر کمر زیں راہ زنار
بسا مان رفتن ایں راہ زشت است
مجو، بشنو کہ ایں راہ بہشت است

ہندوستان پہنچکر سلیم میر عبدالسلام مشہدی کے ندیم ہوگئے۔ جو شاہجہانی امرا میں سے تھے۔ لوگوں میں مشہور ہے کہ سلیم دوسرے شاعروں کے خیالات اُٹھا لیا کرتا تھا۔ چنانچہ ملا دارستہ نے اسکے متعلق کہا ہے ؎

دخلے کہ نکردی بکلام اللہ است بیتے کہ بزدہ تو بیت اللہ است

لطف یہ ہے۔ کہ سلیم دوسروں پر یہی گلہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

دیوانِ کہ بست از سخنانم تہی سلیم
تہمانہ بر من ایں ستم از دست صائب است

کشمیر میں تھے۔ کہ ۱۰۵۷ھ میں اس عالم فانی سے کوچ کر گئے ڈل کے کنارے پر تخت سلیماں کے دامن میں مدفون ہوئے۔ آپ کی ایک چھوٹی سی مثنوی ہے۔ جو مخزن کے بحر میں ہے۔ شروع اس طرح ہوتی ہے ؎

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہست عصائے رہ طبع سلیم

(۱۵) **مثنوی آلہی** - میر آلہی اسد آباد علاقہ ہمدان کے سادات میں سے ہیں۔ بہت عرصہ مغان میں حکیم شفائی اور آقا رضی کی صحبت میں رہے۔ آخر کار ہندوستان آگئے اور ملازمان شاہجہانی میں نام درج ہوگیا۔ بہت خوش خلق اور درویش مزاج آدمی تھے۔ لوگ ان کی بڑی عزت کرتے تھے ✦

۱۰۶۴ھ میں فوت ہوئے۔ غنی کشمیری نے آپکی تاریخ وفات اس مصرع سے نکالی ہے کہ برد آلہی زجہاں گوئے سخن شاہجہان کی تعریف میں ایک مثنوی لکھی ہے۔ مطلع یہ ہے ؎

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قافلہ سالار کلام حکیم

(۱۶) **مثنوی ادہم** - مرزا ابراہیم ادہم ارتیمان علاقہ ہمدان کے سید تھے۔ آپ کے والد میر رضی بھی شاعر تھے۔ ادہم ماں کی طرف سے صفوی نژاد تھے۔ شروع جوانی میں ہی ہندوستان آئے۔ شاہجہان کا زمانہ تھا۔ دربار تک رسائی ہوگئی۔ سید ہونے کی وجہ سے لوگ عزت کرتے تھے۔ لیکن آپ کی طبیعت میں رندی اور بے باکی بہت تھی۔ اور قدرے جنون بھی تھا۔ علانیہ مناہی کا ارتکاب کرتے تھے اور اعیان سلطنت سے شوخی اس لئے بدنام ہوگئے۔ اور عزت بھی نہ رہی۔ تقرب خاں نے انہی باتوں سے تنگ آکر انہیں قید کردیا ۱۰۶۰ھ میں شاہجہان آباد میں فوت ہوئے۔ مثنوی کا پہلا شعر یہ ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم راہ حدوث است بسوئے قدیم

(۱۷) **مثنوی طاہر وحید** - مرزا احمد طاہر وحید قزوینی شاہ عباس ثانی کے زمانے میں شاہی دفتر میں کام کرتے تھے۔ اعتمادالدولہ وزیر اعظم ان کا بڑا قدردان تھا۔ اس کے قتل کے بعد سید علاؤالدین وزیر اعظم مقرر ہوا۔ اُس نے بھی ان کے عہدہ کو بحال رکھا۔ رفتہ رفتہ یہ بادشاہ کے وقائع نگار ہوگئے۔ شاہ سلیمان کے زمانے میں بھی یہ وقائع نگار رہے اور آخر ترقی کرتے کرتے منصب وزارت تک پہنچ گئے۔ جب سلطان حسین مرزا (۱۱۰۵ھ) میں

تخت نشین ہوا۔ تو یہ مورد عتاب شاہی ہوئے اور مرتے دم تک درباری تعلقات سے علیحدہ رہے۔ نوے سال عمر پائی۔ تذکرہ میں لکھا ہے کہ آپ کے اشعار کی تعداد نوے ہزار تک پہنچتی ہے دو مثنویاں لکھی ہیں ایک "انہ دنیا نہ" اور دوسری "مخزن الاسرار" کے مقابلہ میں۔ مطلع اسکا یہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم　　ہست نہالے ز ریاض قدیم

اور بہت شاعروں نے بھی مصرع بسم اللہ پر طبع آزمائیاں کی ہیں لیکن سب کا ذکر طوالت سے خالی نہیں۔

ایبٹ آباد　　میر ولی اللہ

غزل

نجانے کتنی معنی خیز ہیں خاموشیاں میری　　سنی دنیا نے سو سو رنگ سے اک داستاں میری

نہ پوچھ اے لذت ذوقِ رہائی کیا گزرتی ہے　　نظر اٹھ اٹھ کے رہ جاتی ہے سوئے آشیاں میری

لبوں سے میرے ٹکراتا ہے اب دعویٰ انا الحق کا　　الٰہی خیر دنیا ہو نہ جائے رازداں میری

نگاہِ یاس کی بیداد کا مجھ سے گلہ کیوں ہو　　نہیں جو میرے قابو میں وہ نظریں ہیں کہاں میری

سنورنے دو ابھی کچھ اور دنیا کو سنورنے دو　　پڑیگی ایک دن اس پر نگاہِ امتحاں میری

نہ گھبرا اے دلِ وحشی۔ نہ گھبرا دیر ہی کیا ہے　　وہ ابر اٹھا۔ وہ رت بدلی۔ وہ ٹوٹیں بیڑیاں میری

جہاں کو میں نے کیوں دیکھا تھا عبرت کی نگاہوں سے　　یہی دنیا مری دنیا تھی لیکن اب کہاں میری

فرشتے کیوں لکھیں اس زحمتِ بیجا سے کیا حاصل
مرے قاتل کے دامن پر لکھی ہے داستاں میری

لکھنؤ　　م۔ رضا

ملک ہزبر الدین

(افسانہ)

از جناب پروفیسر محمد مجیب۔ بی۔ اے (آکسن) علیگڑھ

باب اوّل

چھ سو برس سے زیادہ زمانہ ہوچکا کہ سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں ملک ہزبر الدین ایک بہت ہی نامور اور سردار تھا۔ اودھ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا اور وہیں بود و باش اختیار کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ کسی شخص کی تعلیم اُس وقت تک کامل نہ سمجھی جاتی تھی جبتک کہ اس کو تلوار چلانا نہ آتا ہو۔ اس فن میں ملک ہزبر الدین اس فن میں یگانہ روزگار اور یکتائے زمانہ شمار کیا جاتا تھا۔ اوائل عمری ہی میں اقبالمندی نے اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور فتحمندی کا سہرا اس کے سر پر باندھا گیا۔ ابھی بمشکل سے تیس برس کا ہوگا کہ شہنشاہ کی فوج میں یکہزاری منصب جلیلہ ملک کو عطا ہوا۔ اس کے علاوہ بہت سے نیز گاؤں اور کئی ایکڑ زمین ملک اپنے قبضہ میں لے آیا۔ اس کی کامیابی کسی کی سفارش یا خوشامد کی مرہون احسان نہ تھی۔ ملک زمین ہو یا منصب جو کچھ بھی اس کو ملا وہ اپنی بے نظیر شجاعت اور غیر محدود قوت کی وجہ سے ملا۔ ایک دو دفعہ نہیں بلکہ متعدد بار بڑی بڑی اور دور دور کی مہموں پر وہ جا کر داد دلاوری اور شجاعت پا چکا تھا۔ مگر علائی فوج میں ہو یا غنیم کی صفوں میں اس کو اپنا مقابل کبھی نہ ملا۔ خوف ڈر کس چڑیا کا نام ہے وہ اس سے بالکل ناواقف تھا۔ اس لئے کہ خوف پیدا ہوتا ہے اپنی کمزوری کے احساس سے اور اس کا تجربہ اس کو ابتک نہیں ہوا تھا ؂

اتنی شہرت کے علاوہ اللہ نے اُس کو قوٰی بھی ایسے دیئے تھے کہ ہزاروں میں بھی وہ الگ نظر آتا تھا۔ اس کے لمبے اور مضبوط ہاتھ اُس کے تاتاری النسل ہونے کا پتہ دیتے تھے۔ پابندی کے ساتھ ورزش اور اچھی غذا کی وجہ سے اسکا جسم ایسا بن گیا تھا کہ لوگ دیکھتے اور عش عش کرتے۔ اور پھر یہ بھی اس زمانہ میں جبکہ لوگ قوت جسمانی کی خوبیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ اور اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ ورزش کے لئے وقف کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ ملک گورا چٹا آدمی تھا۔ کشادہ پیشانی پر گھنی ہوئی سیاہ بھویں، دراز اور بل کھائی ہوئی سیاہ زلفوں کے بیچ میں مردانہ حسن کی ایک بے نظیر تصویر پیش کرتی تھیں۔ اس کی نیلگوں آنکھیں دیکھنے والے کو ہشیار کرتی تھیں کہ بہردار اس سے مت اُلجھنا یہ بگڑ بیٹھا تو بس قیامت ہوجائے گی۔ اس کی گھنی بھوری داڑھی چہرہ کے چاروں طرف جو سنگدلی کے علامات تھے ان کو چھپائے ہوئے تھی۔ اس سے کہ ہزبر الدین ہر صفت موصوف ہونے کے باوجود نہایت ہی سنگدل آدمی تھا۔ ملتے بیکس اور کمزور کو کچلنے میں کوئی باک نہ تھا۔ بیرحمی توجیہ فوجی زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ تھی۔ مگر جو اس سے بھی بڑی خرابی اس میں پیدا ہوگئی تھی وہ ناخدا ترسی تھی اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بات اتنی بڑھ گئی کہ جلیبی ہو یا آوارگی اسکا دامن اس قسم کی ہر معصیت سے بالکل پاک۔ جس طرح اُس نے جوانی کاٹ دی تھی وہ بہت سے مدعیان زہد و تقوٰی کے لئے سبق آموز تھی۔ وہ لامذہب تھا۔ لیکن مذہب کا اثر اس پر صرف اتنا تھا کہ وہ مشین کی طرح چند کام کرلیتا تھا جس طرح وہ اس ہستی کے احکام کی تعمیل کرتا تھا کہ جس کو بادشاہ کہتا تھا اسی پابندی کے ساتھ وہ اس ہستی کی پرستش کرتا تھا کہ جس کو وہ خدا کہتا تھا۔ بس گو خدا کا نام اُس کی زبان پر رہتا۔ لیکن خدا کا ڈر کبھی اُس کے دل میں نہ آیا تھا۔ روزہ نماز کی پابندی اس لئے تھی کہ ہر شخص اس کا پابند تھا۔ دنیا اس کے لئے کوئی معمہ تھی۔ ایمان بالغیب کی لذتوں سے محروم تھا۔ اور صرف پیش نظر چیزوں کے باوجود کا قائل تھا چونکہ ابتک اس کو نفع اور نقصان صرف روپیہ کی صورت میں نظر آتا تھا۔ اس لئے اس کی سمجھ کی طرح اس کے ہمدردی کے جذبات بھی محدود تھے۔ اس خامی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ابھی ملک کی عمر دس سال ہی کی تھی کہ ماں باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اس حادثۂ جانکاہ کے بعد کون سی مصیبت تھی جو اس نے نہ جھیلی۔ اور کونسی کڑی تھی جو اُس نے نہ اُٹھائی۔ اس کشمکش حیات میں بقائے نسب کے اصول پر گو بالآخر کامیابی اس کو ہوئی مگر ظالموں اور جابروں سے لڑتے لڑتے وہ سب سے زبردست سنگدل ہوکر رہ گیا تھا۔ زندگی کو وہ نہایت ہی خود غرضانہ نقطۂ نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اپنے فائدہ کے علاوہ کسی اور کا خیال کبھی اُس کے ذہن میں نہیں آیا۔ مذہب اُس کی دانست میں صرف پابندی

صوم و صلوٰۃ اور ادائیگی زکوٰۃ کا نام تھا۔ خدا کے ان احکام کی تعمیل کے بعد پھر اس اللہ کے بندے کو بھولے سے بھی خدا کا خیال دل میں نہ آتا تھا۔ دوسروں سے محبت یا صرف ہمدردی اُس کے خیال میں فضول سی چیزیں تھیں۔ اس احساس نے کہ وہ سب سے زیادہ طاقتور انسان ہے اور گل کھلایا۔ اُس نے اپنی طاقت کا پورا فائدہ اُٹھانا شروع کیا۔ اس کی گفتگو گالیوں سے لبریز ہوتی بات بات پر پیس کھاتا۔ کمزوروں کو وہ جس حقارت سے دیکھتا اُس کی نہ کوئی حد تھی نہ حساب۔ اُس کے ہمسایہ اُس سے ڈر کر اُس کے سامنے جھک جاتے تھے۔ مگر دل میں سب اُس سے نفرت کرتے تھے۔ لیکن ملک ان کی محبت یا نفرت ہر ایک سے بے نیاز تھا۔ رفتہ رفتہ خوف کی وجہ سے لوگوں نے اس کے گھر آنا جانا بند کر دیا۔ تنہائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب کوئی بدنصیب اس کے چنگل میں پھنستا تو ملک کا سارا غصہ اُس بیچارہ پر نکلتا کسی کے دل میں خواہ کچھ ہی ہو۔ لیکن کیا مجال کہ کوئی زبان تک ہلا سکے۔ خیر کوئی کچھ یا نہ کہے مگر واقعہ یہی تھا کہ ہنر الدین کی تمام زمین ظلم و جور ہی کا پھل تھی۔ کتنے لوگ طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کئے گئے اور کتنے مر بھی ڈالے گئے تاکہ ملک کی ملکیت میں اضافہ ہو۔ مغلوب الغضب کی بے پناہ قوت کے سامنے ہر شخص ایک دوسرے کو سکوت کے عالم میں دیکھتا۔ اور کچھ نہ کر سکتا۔ اس لئے کہ ہر شخص جانتا تھا کہ اگر ملک نے کسی بات کا ارادہ کر لیا تو اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جائے وہ اُس کو کر کے چھوڑتا ہے۔

ملک کے صرف دو دوست تھے۔ ایک تو اُس کی بی بی زبیدہ خانم اور دوسرا زبیدہ خانم کا بھائی فخر الدین۔ موخر الذکر ایک خاموش گوشہ نشین آدمی تھا جس کو صرف کتابوں سے شوق تھا اور ملک اس کو نہایت ہی حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا لیکن زبیدہ خانم وہ عورت نہ تھی کہ کوئی شخص اس کی تحقیر کر سکے انتہا یہ کہ ہنر الدین اس کا خاوند ہونے کے باوجود اس پر پوری طرح قابو نہ پا سکا۔ زبیدہ خانم دیکھنے میں نحیف، لاغر اور پردہ نشین عورتوں کی طرح ہمیشہ بیمار نظر آتی تھی۔ عمر بھی تیئیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ مگر اس کی ذات میں ایک عجیب برقی اثر، اس کی گفتگو میں شیرینی۔ اور اس کی معصوم نگاہوں میں وہ کشش تھی کہ ہر ایک اس کا گرویدہ تھا۔ اس کی ہر دلعزیزی کسی تعلیم یا تربیت کی وجہ سے نہ تھی۔ قدرت نے اُس کو کچھ ایسی طبیعت ودیعت کی تھی۔ جو اُس سے

ایکبار ملتا عمر بھر اُس کا کلمہ پڑھتا۔ اپنے گھر کی چار دیواری کی محدود دنیا میں وہ ہر چیز سے محبت کرتی اور ہر چیز اُس سے محبت کرتی ہوئی نظر آتی۔ جب اُس کی چھت کے کونوں میں ابابیلوں نے گھونسلا بنایا تو وہ بجائے خفا ہونے کے خوش ہوئی۔ ہر شام جب اُس کے ننھے مہمان اُس کے خوبصورت سر کا طواف کر کے آتے تو وہ اُن کو کھانے کے لئے دانہ اور پانی دیتی۔ جانور محبت کی نگاہ کو انسان سے زیادہ پہچانتے ہیں۔ ابابیلیں بھی زبیدہ خانم کے نازک سفید ہاتھوں پر بیٹھ کر دانہ کھاتیں۔ جب کوئی غریب عورت بھیک مانگتی اُس کے دروازہ پر آ نکلتی تو اُس کو کھانے کپڑے اور پیسہ کے علاوہ محبت کی ایک شاداب نگاہ بھی ملتی جس سے اُس کی جسمانی اور روحانی دونوں مسرتوں کا انتظام ہو جاتا۔ اس کے وسیع محبت کے دائرہ میں وہ دبلے اور غلیظ کتے بھی تھے جو گاؤں کی سڑکوں پر گری پڑی ہڈیوں اور روٹیوں کے ٹکڑوں کے سہارے گھوما کرتے تھے اور وہ غریب فاقہ کش انسان بھی جن کو ملک ہنر الدین نے اُن کی زمین ضبط کر کے دربدر کی بھیک منگوائی۔ زبیدہ خانم کا ہاتھ سخاوت میں اسقدر کھلا ہوا تھا کہ کھلیان یا تجوری دونوں پُر ہوتے ہی خالی ہونا شروع ہو جاتے۔ الغرض ہر ذی روح خواہ وہ انسان ہو یا جانور۔ کوئی ایسا نہ تھا جس کے زبیدہ خانم کے دردمند دل میں جگہ نہ ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چرند پرند اور آدمی ہر ایک زبیدہ پر اپنی جان قربان کرنے کو تیار تھا۔ انتہا یہ کہ اُس کی مسحور کرنے والی نگاہوں نے ہنر الدین پر بھی وہ جادو کر رکھا تھا کہ زبیدہ خانم کے ان تمام سخاوت کے کارناموں کو دیکھتا اور اُف تک نہ کر سکتا۔ بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا۔ کہ میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے موزوں نہیں۔ مگر دراصل بات نہ تھی اول اول آپس میں بہت جھگڑے رہے۔ جس آدمی نے اپنے اطراف کے ملک پر تسلط کر لیا ہو وہ ایک عورت سے سوائے غلامی کے کیا اُمید رکھ سکتا ہے۔ چنانچہ جب اُس نے دیکھا کہ زبیدہ خانم اُس کی مرضی کے خلاف چلتی ہے۔ تو اُس نے اپنی بی بی کو نیک کرنے کی پوری کوشش کی لیکن اُسکو مطلق کامیابی نہیں ہوئی۔ ہنر الدین کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ کہ اُس کو اپنے ارادہ میں ناکامیابی ہوئی۔ جھنجھلاہٹ اور غصہ میں اُس نے کونسا ظلم تھا۔ جو نہیں کیا۔ گالیاں دیں۔ گھونسے مارے۔ ٹھوکریں لگائیں۔ غرض سپاہیانہ زندگی میں جو کچھ فوج کو قابو کرنے کے لئے سیکھا تھا۔ سب کا عمل غریب زبیدہ خانم

پہنچ گیا۔ کبھی اس کو کئی کئی دن کے فاقے کرائے اور غریب معصوم لڑکی کو قریب المرگ کر دیا۔ لیکن شاباش ہے اُس بی بی کی ہمت کو کہ ہر مصیبت کے ہنستی رہی۔ اور تکلیف کے زمانہ کو اس خندہ پیشانی سے کاٹ دیا جیسے پر ایک خلش تک نہ آنے دی۔ بلکہ تکلیف کی زیادتی نے اس میں محبت کی قوت کو اور بڑھا دیا اور ملک ہزبرالدین کے اس کام نے مرض میں تخفیف کرنے کے بجائے مرض کو اور زیادہ کر دیا۔ ملک اس عجیب بات کو مطلق نہ سمجھ سکا۔ یہاں اس کا ایک ایسی قوت سے مقابلہ تھا کہ جو اس کی حد ادراک سے بالاتر تھی۔ اگر کوئی نفرت کا جواب نفرت سے اور تحقیر کا جواب گھونسہ سے دیتا تو ہزبرالدین یقینی طور پر کامیاب ہو جاتا۔ لیکن وہ پریشان تھا کہ اس کو وہ خوبصورت کا کیا کرے کہ جو اس کے ہر ظلم کا جواب محبت اور اُلفت سے دیتی ہے۔ بالآخر مجبور ہو کر چپ ہو رہا اور اپنی ہار مان لی۔ زبیدہ کے لئے اُس نے قرالنفس کی صراط مستقیم بالکل صاف تھی۔ وہ اپنے خاوند کے گناہوں کے خیال سے کانپ اُٹھتی تھی اس لئے کہ اس کو ذرا ذرا سی بات کی خبر تھی۔ گو اپنے خاوند کے افعال اُس نے کبھی پسند نہ کئے۔ مگر ملک کی طرف سے زبیدہ خانم کے دل میں سوائے محبت کے دوسرے جذبات موجزن نہ تھے۔ نفرت کا جذبہ قدرت نے اُس کو ودیعت ہی نہیں کیا تھا۔ اس کے علاوہ ملک ہزبرالدین کی جوانی اور مردانہ حسن میں ایسی بہت سی باتیں تھیں کہ کوئی بھی عورت اس سے محبت کرنے پر مجبور ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اس کے خلاف جو باتیں مشہور تھیں وہ حاسدوں کی افترا پردازی پر بہت آسانی سے محمول کی جا سکتی تھیں اس لئے کہ شاہی فوج میں اس کو جو عزت حاصل تھی وہ تمام فوجی سرداروں کے لئے باعث رشک تھی۔ شراب کا وہ عادی نہ تھا۔ گو جو کچھ بھی زبیدہ خانم نے تہیہ کر لیا تھا کہ اپنے خاوند کو صراط مستقیم پر لے آئے۔ مگر یہاں زبیدہ خانم کو بھی مات ماننی پڑی۔ اس لئے کہ گو شادی کو پانچ برس ہو چکے تھے۔ مگر ہنوز روز اوّل تھا۔ زبیدہ اس لئے ہمیشہ مغموم رہتی اور اس کو ایسا معلوم ہوتا کہ اُس کے اور اُس کے خاوند کے درمیان ایک ایسی لوہے کی دیوار حائل ہے کہ زبیدہ تمام کوششوں کے باوجود اسے بیچ سے نہ ہٹا سکی۔ اب ہارے کا ہتھیار دعا اور [illegible] سے نا اُمید ہو کر صرف دعا کا خیال تھا۔ خدا میں زبیدہ خانم کا یقین اسی حد تک تھا جتنا کہ ایک مسلمان گورکی [illegible] میں ہو سکتا ہے جب شب کی گہرائیوں میں ایک عالم ونیا دا فیہا سے بےخبر ہوتا، اُس وقت یہ بخت کی پوٹ اپنے خاوند کے پلنگ کی پٹی پکڑ کر اپنے خدائے حلیم وبصیر سے دعا مانگتی کہ "اسے نوجوان رحیم و کریم ہے میرے خاوند کے دل میں بھی تھوڑا سا رحم ہی ڈال دے۔" گو دعا ہو یا دوا ملک ہزبرالدین پر ایک کارگر نہ ہوتی۔ اپنی بی بی کی ہر بات کو وہ برابر برداشت کرتا رہا اور اُس کی عزت بھی ہمیشہ ملک کے دل میں رہی۔ مگر ایک دفعہ جو راستہ اُس نے اختیار کر لیا تھا اُس سے سرمو کبھی نہ ہٹا۔ چونکہ اُس کو کبھی کسی سے زیر ہونے کی نوبت نہ آئی تھی۔ اس لئے قوت کے گھمنڈ میں اور نشہ جوانی سے چور ہو کر اُس کے لئے خدا کا وجود غیر واقعی اور مبالغہ سے زیادہ نہ تھا ◆

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اس لئے کہ ہمارے افسانہ کا تعلق ملک ہزبرالدین اور زبیدہ خانم کے خانگی تعلق سے نہیں۔ ہمارے افسانہ کا ہیرو ملک ہے۔ نہ کہ خانم۔ قدرت نے ملک ہزبرالدین کو ظلم و جبر کے قعر مذلت سے نکالنے کے لئے اُس جاں نثار محبت کرنے والی بی بی کے نازک ہاتھ کو پیدا کیا تھا مگر ملک نے اس سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ چنانچہ پردۂ مستقبل سے بالکل نئے قسم کے واقعات ظہور پذیر ہوئے ◆

باب دوم

اپریل کے مہینہ میں خاصی گرمی شروع ہو گئی تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ [illegible] ایک ابر کا چھوٹا سا ٹکڑا بھی آسمان پر نظر نہ آیا۔ آفتاب کی تمازت میں دوپہر [illegible] سے چونکہ ترقی ہوتی گئی تھی۔ ہرے بھرے درختوں کی سرسبز پتیاں کھلی اور جلی جا رہی تھیں خشکی اور گرمی کی وجہ سے زمین گرم ہو کر تڑخ گئی تھی۔ بلتے ہوئے اور ہموار میدان پر جوں جوں گرم ہوا کے بگولے چلنے شروع ہوئے موسم سرما کے خوبصورت اور نازک پھول کمھلائے۔ مرجھائے۔ اور یکے بعد دیگرے خشک ہو گئے ◆

شام سے کچھ قبل ہزبرالدین اپنے بلند جنگی گھوڑے پر سوار ہوا۔ اور کام کی نگرانی کو نکل پڑا۔ شہر سے ایک میل دور اس کا ایک کھیت تھا جس کے جوتنے کا اس نے اُس روز حکم دیا تھا۔ کئی سال تک خالی پڑا رہنے کے بعد اس سال اس کھیت کی باری آئی تھی۔ ملک آج کے دن کچھ بہت خوش تھا

صبح کا وقت تمام حساب صاف کرنے میں صرف ہوا اور ملک نے دیکھا کہ زبیدہ خانم کی فیاضیوں کی وجہ سے نہ صرف تمام سال کی آمدنی خرچ ہو چکی ہے۔ بلکہ وہ مقروض بھی ہو گیا ہے۔ زبیدہ سے کچھ کہنا لاحاصل تھا۔ اس کا جواب پہلے ہی سے معلوم تھا۔ ملک جھنجھلایا ہوا بیٹھا تھا سر شام خبر آئی کہ ستے کھیت پر کسانوں نے ٹھیک کام نہیں کیا۔ بندر کی بلا طویلے کے سر۔ فوراً گھوڑا کسوا کر چل پڑا وہاں پہنچ کر خبر کی تصدیق ہوئی۔

ملک کو اپنے گھونسوں اور ٹھوکروں کے اثر میں اتنا ناز تھا کہ مزدوروں کو اس نے ایک پیسہ بھی اجرت کا نہ دیا۔ مزدور بھی جہاں تک ان سے بن پڑتا کم سے کم کام کر کے دیتے تھے۔ آج بھی ایسا ہی ہوا۔ تین آدمی صبح سے اس کھیت پر بھیجے گئے مگر شام کو جو دیکھا تو زمین پر ہل کی صرف چند دھاریاں نظر پڑیں۔ چنانچہ اس وقت بھی ایک آدمی چھوٹی سی لکڑی لئے اپنے دونوں ساتھیوں کو ایک شعبدہ دکھا رہا تھا جس کو اس نے ایک شادی کے موقع پر دیکھا تھا۔ تینوں مزدور خوش خوش قہقہے لگا رہے تھے کہ اتنے میں ملک چیختا اور گالیاں دیتا ہوا پہنچا۔ وہ کیا آیا ان بیچاروں پر بجلی گر گئی۔

"مردود۔ جب تک تمام کھیت کا کام ختم نہ کر لو گے اس وقت تک تم کو یہاں سے ہلنے نہ دونگا۔ اچھا ہے بھوکے رہو اور رات بھر یہیں مرو"

آن کی آن میں مزدور اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے وہ ملک اور اس کی حرکتوں سے خوب واقف تھے۔ خیریت ہو گئی کہ اس نے صرف الفاظ پر اکتفا کی۔ اگر کہیں وہ جواب دیتے یا جھگڑا کرتے تو رات بھر سر سہلاتے اور کام بہر صورت کرنا پڑتا۔ کام جلد از جلد ہو رہا تھا۔ ایک آدمی ہل میں بیل جوڑے ہوئے نہایت سرعت سے اس کو چلا رہا تھا۔ بقیہ دو کھیت کے کنارہ کی جھاڑی کو درست کر رہے تھے۔ الغرض دن بھر کے تساہل کے بدلہ میں مزدور نہایت پھرتی سے کام کر رہے تھے۔ کھیت چھوٹا تھا۔ اور کام دو گھنٹہ سے زیادہ کا نہ تھا۔ اور یہ ناممکن تھا کہ دو گھنٹہ تک برابر گالیاں دیئے چلا جائے۔ مگر ملک تھا زبان کا پکا جو بات اس کے منہ سے ایک دفعہ نکل گئی پھر کیا مجال کہ اس میں رد و بدل ہو جائے چنانچہ اس نے اپنا گھوڑا ایک بڑ کے درخت کی جڑ سے باندھ دیا۔ اور اس ٹیلہ پر جہاں کہ مزدور بیٹھے تھے خود جا کر بیٹھ گیا۔ اور ان کا کام غور سے دیکھنے لگا۔

آفتاب افق مغرب میں اپنی رات کی خوابگاہ کی طرف جا رہا تھا۔ اور بہت بڑا معلوم ہوتا تھا۔ شام کی سیاہی چھائی جا رہی تھی۔ اور آس پاس کی روغنی درختوں کے جھنڈ میں سے ٹمٹماتی نظر آتی تھی۔ اتنے میں ماہتاب اپنی سرخ گیند لئے نمودار ہوا۔ جوں جوں یہ اوپر چڑھتا گیا۔ آہستہ آہستہ اس میں روشنی بڑھتی گئی۔ ہزبرالدین اپنے کام میں بہت دلچسپی لے رہا تھا۔ یکایک اس کی توجہ ایک طرف منتقل ہوئی۔ ہل چلانے والا مزدور بھاگ گیا تھا۔

" او سور تھک گیا! اگر کھیت کو پورا کرنے سے پہلے رکا تو میں تیری ہڈیوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دونگا"

"حضور میں تھکا نہیں۔ بلکہ یہاں کوئی چیز ہے۔ ایک انسانی ڈھانچ ہے۔ شاید یہ قبر ہے"

"چلاؤ ہل اس پر سے۔ ہل چلا دو اس پر سے۔ یا گاؤں میں اور قبرستان نہیں جو ہر احمق میرے کھیتوں میں آکر مرے دفن ہوتا ہے۔ چلاؤ ہل اس پر سے اور اس ذلیل لاش سے کہہ دو کہ کسی اور جگہ چلی جائے"

ہزبرالدین کے ان الفاظ کا غریب مزدور پر ذرا بھی اثر نہ ہوا اور وہ خوف کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ ڈھانچ خالی چشم خانوں سے اس کو دیکھ رہا ہے۔ اس کو ایک دفعہ ایسا بھی معلوم ہوا کہ گویا اس ڈھانچ نے حرکت کی۔ ہزبرالدین کی لعنتیں اور ملامتیں بے سود تھیں۔ اس مزدور پر اس قدر خوف طاری تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں اس کے قابو میں نہ رہے۔ دوسرے دونوں مزدور بھی اس کے پاس آکر کھڑے ہوئے اور ان میں سے ایک نے دبی زبان سے قبر کی عظمت بتائی اور کہا "ایک دن ہم کو بھی مرنا ہے۔ لیکن مردے کی تعظیم ان لوگوں کے لئے ایک بے معنی سی چیز ہے۔ جو زندہ انسان کی تعظیم نہیں جانتے۔ ہزبرالدین غصہ میں لال ہو گیا اور بجلی کی طرح کھیت میں پہنچ کر ہل والے مزدور کو اس زور سے گھونسہ مارا کہ وہ چکرا کر گر پڑا۔ بقیہ دو کو حکم ملا کہ وہ اپنے کام میں لگ جائیں۔ ملک نے اس ڈھانچ کو اس کا سر پکڑ کر باہر نکالا۔ اور ہل چلے ہوئے کھیت میں سے گھسیٹ کر اس ٹیلے کے نیچے لا کر ڈال دیا۔ اس متن چلی بہار ری کا اثر عجب جادو کا سا ہوا۔ اور مزدوروں کا دل بڑھ گیا۔ دو چار لاتوں کے اثر سے وہ گرا ہوا آدمی بھی ہوش میں آگیا۔ اور ہل چلانے میں مصروف ہو گیا۔ اپنے سے زیادہ گنہگار کی موجودگی نے اس کے پراگندہ حواس کو بحال کر دیا۔ حافظہ پر کام کرنے

والے دونوں آدمیوں نے بھی جائز طور پر اس ہیبت ناک واقعہ کو اخلاقی جرم سے آزاد سمجھا۔ اور ہزبر الدین مزدوروں کو اپنے کام میں لگا کر پھر اسی جگہ اسی ٹیلے پر آبیٹھا جس کے نیچے وہ ڈھانچ پڑا ہوا تھا۔

وہ مختصر سا ڈھانچ تھا اور غالباً زیادہ عرصہ کا نہ تھا۔ کم از کم تمام ہڈیاں قائم تھیں۔ سر، پسلیاں ٹوٹی نہیں لٹک گئی تھیں۔ کیونکہ وہ سطح جہاں سے وہ چھوٹے ٹکڑے علیحدہ ہوئے تھے بالکل ہموار تھی۔ ظاہر تھا کہ وہ آدمی سینہ کے کسی مہلک زخم کی وجہ سے مرا تھا۔ لیکن ہزبر الدین کو اس کے موت کے اسباب دریافت کرنے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر بھی وہ اس کی طرف نہایت غور سے دیکھتا رہا۔ اور دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ "یہ کس کا ڈھانچ ہو سکتا ہے؟" ہزبر الدین کو اپنی شکلوں کی یادداشت پر بہت ناز تھا۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ کون اپنے واقف کاروں کے ڈھانچوں کو پہچان سکتا ہے؟ وہ مڑ کر ڈھانچ کے پاس گیا اور اس کی کھوپری کو جسم سے علیحدہ کیا۔ اور اپنی آنکھوں کے سامنے رکھ کر بغور دیکھنے لگا۔ بے نور اور خالی آنکھوں کے گڑھوں نے اس سے ایک دردناک درخواست کی۔ اور اپنے آرام و سکون سے لیٹنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن ہزبر الدین کی مادہ پرست تیز آنکھوں نے واقعات کے اندرونی معنوں کو نہیں سمجھا۔ اس نے اس کھوپری کو ہاتھ میں لے کر چاند کی روشنی میں اچھالا۔ اور جونہی وہ نیچے آئی اس کو لپک لیا۔ پھر مزدوروں کو گالیوں کے طومار کے ساتھ وہ اس کھوپری کو اور جسم کو ٹھوکریں مار مار کر قریب کی جھاڑی میں ڈال آیا۔ اتنی دیر میں مزدور اپنا کام کر چکے تھے۔ ملک نے کھیت اور احاطہ بندی کا معائنہ کیا۔ پھر وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور چاند کی روشنی اور آموں کے پتوں کے سایہ سے ملی جلی دھوپ چھاؤں میں واپس گھر آگیا۔

باب سوئم

جولائی کے مہینہ میں شام کا وقت تھا۔ سارے دن بوندا باندی ہوتی رہی لیکن شام کے وقت آسمان صاف ہو گیا اور تازی تازی خوشگوار ہوا چلنے لگی۔ ملک ایک تپائی باہر لایا اور اپنے کچی مٹی کے بنے ہوئے عالی شان مکان کے بڑے دروازہ کے سامنے بیٹھ گیا۔ یہاں بیٹھ کر اس نے اپنی ڈاڑھی میں تیل لگا کر کنگھا کرنا شروع کیا۔ اتنے میں لوگ ملاقات کے لئے آنے شروع ہوئے۔ سب سے پہلے اسی کا برادر نسبتی فخر الدین آیا۔ ملک نے اس کو کنگھا اور تیل پیش کیا جس طرح کہ ایک ڈاڑھی والا دوسرے کو پیش کرتا ہے۔ فخر الدین نے رسمی شکریہ کے ساتھ وہ لے لیا۔ یہی ایک شخص تھا۔ جو ہزبر الدین سے بغیر کسی غرض کے ملتا تھا۔ اور لوگ کسی نہ کسی مطلب کی وجہ سے ملتے تھے۔ لیکن اس مرتبہ تو فخر الدین بھی ایک وجہ سے آیا تھا پہلے تو وہ اہل تپ گاؤں کے معاملات اور فصل کی حالت کا تذکرہ کرتا رہا۔ بعد ازاں اپنے مطلب پر آیا۔ اس نے کہا کہ "ایک غریب بیوہ گاؤں کے دوسرے سرے پر چیچک کی مریض ہے کیا آپ اپنی بیوی اس بات کی اجازت دینگے کہ وہ اس بیچاری کی مزاج پرسی کر آئے۔ ملک نے سختی سے کہا "نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ مرض اڑ کر لگنے والا ہے۔ اور پھر میں یہ بھی کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ میری بیوی اپنے سے کم درجہ کی بیوہ عورتوں سے ملنے دوں مگر وہ جائے گی ضرور"۔

"تو وہ جا سکتی ہے۔ اور مجھ کو پریشان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اس قسم کی باتوں میں مجھ سے صلاح لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سمجھے؟"

فخر الدین خوب سمجھتا تھا۔ وہ آہستگی سے اپنی ہمشیرہ کے کمرہ میں چلا گیا اور اس سے کہا کہ وہ تھوڑی دور چلنے کے لئے تیار ہو جائے۔ تھوڑی دیر میں یہ چھوٹا سا جلوس ہزبر الدین کے گھر کے دروازہ سے نکلا۔ سب سے آگے آگے فخر الدین ایک ٹٹو پر سوار تھا۔ اس کے پیچھے بند پالکی میں زبیدہ خانم گزری۔ اس نے اپنے ہمراہ چند دواؤں کی بوتلیں رکھ لی تھیں۔ پالکی کے ساتھ ساتھ ایک بڑھیا ماما چل رہی تھی۔ اور پیچھے پیچھے چھ مضبوط آدمی تلوار اور لاٹھیوں سے مسلح آرہے تھے۔ ہزبر الدین کا نہایت ہی سخت حکم تھا کہ اس کی بیوی جب کبھی باہر جائے تو اس ساز و سامان کے ساتھ نکلے جو اس کے مرتبہ کے لئے ضروری تھا۔

لیکن ہزبر الدین اپنی عدیم الفرصتی کی وجہ سے اس جلوس کو نہ دیکھ سکا آج کا دن عدالت کے لئے مخصوص تھا۔ اور اہل معاملہ اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ وہ اس عدالتی ضلع کا افسر اعلیٰ تھا۔ گاؤں کے پنچوں کے فیصلہ کے خلاف اپیلیں اس کی عدالت میں سنی جاتی تھیں۔ اگر کسی کی یہاں بھی تسلی اور تشفی نہ ہوتی تو وہ شہنشاہ کے دربار میں فریاد لیکر جاتا۔

ملک کے عہدۂ عدالت کے ماتحت چوبیس گاؤں تھے ۔

باوجودیکہ بزرگ ملک اپنے زمانہ کا بہترین منصف خیال کیا جاتا تھا جہاں اُس کا ذاتی تعلق نہ ہوتا وہاں اس سے زیادہ غیر جانبدار منصف ملنا ممکن نہ تھا۔ اس کو کسی طاقتور یا کمزور کا خوف نہ تھا۔ رشوت اس نے عمر بھر میں ایک دفعہ بھی نہیں لی۔ وہ اپنے قوی اور مضبوط ہاتھ سے بڑے اور چھوٹے ہر ایک مجرم کا یکساں فیصلہ کرتا تھا۔ اس کے منصفانہ فرائض بہت قسم کے تھے۔ معمولی چوروں اور ادنیٰ درجہ کے مجرموں کو گاؤں کا چوکیدار پکڑ لیا کرتا تھا۔ لیکن جو ٹھگ اور قزاق چوکیدار کی بساط سے باہر ہوتے اُن کو ملک خود جا کر گرفتار کرتا تھا۔ جو لوگ فرمانِ شاہی کی خلاف ورزی کرکے شراب پیتے تھے اُن کو جرمانہ کرنا اور دُرّے لگوانا بھی ملک کے فرائض میں داخل تھا۔ زمین کا لگان مقرر کرنا۔ بیت المال سے حاجتمندوں اور اپاہجوں کو روپیہ تقسیم کرنا۔ مدرسوں میں تعلیم کی نگرانی کرنا۔ بیع و شرع۔ طلاق اور وراثت کے مقدموں کا فیصلہ کرنا۔ الغرض رفاہِ عام کی تمام خدمات اس کے سپرد تھیں۔ اس کی عدالت میں درخواست دینے کے لئے اسٹامپ کی ضرورت نہ تھی۔ اور نہ وکیلوں کے پیروی کرنے کی حاجت۔ خدا کے پانی اور خدا کی ہوا کی طرح اس کا انصاف بھی ہر طالب کو بغیر کسی معاوضہ کے ملتا تھا۔ اس کے دا ہنے جانب مدعی آکر بیٹھتے اور بائیں جانب مدعا علیہ۔ ہر مدعی سے دریافت کرتا کہ اس کو کیا نقصان پہنچا۔ اور مدعا علیہ سے جواب طلب کرتا۔ پھر دونوں کی طرف سے شہادتیں پیش ہوتیں اور ملک کا فیصلہ اسی وقت صادر ہو جاتا تھا۔ سچ ہے سوم بھالا بوت ریت ... اس نے کسی مقدمہ کو چھ مہینہ کے لئے نہیں ٹالا۔ بزرالدین اپنے انصاف اور عدل میں مثال کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ ہر شخص کو اُس کا حق دینے میں اس کو نہایت ہی خوشی ہوتی تھی۔ اس قاعدۂ کلیہ میں صرف وہ معاملات مستثنیٰ تھے کہ جن کا تعلق اُس کی ذات سے تھا۔ مگر اس کا انصاف ہزار برائیوں کے مقابلہ میں بھاری تھا۔ اور اس کی نجات کے لئے یہ اعمالِ نیک بہت کافی تھے۔ جو لوگ کہ دوسروں کی عیب جوئی کرنے کے بجائے اُن کی پردہ پوشی کیا کرتے ہیں وہ اکثر کہا کرتے تھے "ملک جیسا کچھ بھی ہو مگر وہ اتنا ظلم کرتا نہیں جتنا کہ لوگوں کے مظالم سے بچاتا ہے"۔

گذشتہ ہفتہ اوّل تو جرائم بھی زیادہ ہوئے اور پھر مقدمے بھی معمول سے زیادہ دائر ہو گئے۔ اس لئے ملک کے چاروں طرف اہلِ مقدمہ کا ایک بڑا مجمع تھا۔ مگر اس کا اصول یہ نہ تھا کہ جس بات کو انصاف آج چاہے اُس کو کل پر اُٹھا رکھے۔ اس وجہ سے باوجود بہت دیر ہو جانے کے وہ برابر کام میں لگا رہا۔ یہاں تک کہ جب اُس نے آخری مقدمہ کا فیصلہ سنایا اُس وقت تقریباً رات آدھی جا چکی تھی۔ اُس کی بیوی اب تک نہیں آئی تھی۔ وہ کام کی وجہ سے خستہ بھی ہو گیا تھا۔ اور اُس کو تیز بھوک لگ رہی تھی۔ اُس نے کھانے کے لئے غل مچایا۔ کھانا جو اتنی دیر سے رکھا ہوا تھا لایا گیا لیکن زبیدہ خانم کی سن رسیدہ ماما دسترخوان بچھاتے وقت کانپ رہی تھی بزرالدین کو بھوک کی وجہ سے یہ احساس بھی نہ رہا کہ اُس نے کتنا زیادہ کام کیا۔ اور اب اُس کو ایک ہفتہ تک عدالتی کام سے فرصت ہو گئی۔ گرما کو دیکھ کر اُس نے پوچھا۔ "کیا بات ہے۔ کس نے تجھ کو تکلیف پہنچائی"۔ ملک کی باتوں اور اُس کے قوی جثہ کو دیکھ کر ماما کی ذرا ڈھارس بندھی اور کہنے لگی "سرکار کوئی بات نہیں اس چیچک کی مریضہ کے بچنے کی اب کوئی اُمید نہیں۔ خانم نے کہہ دیا ہے وہ جلدی واپس آئیں گی۔ اور مجھے کھانا کھلانے کے لئے اوّل ہی روانہ کر دیا۔ راستہ میں وہ کھیت پڑتا ہے جس پر آپ نے اس سال ہل چلوا کر پیاز بویا ہے۔ جب میں وہاں سے گزری تو میں نے کھیت کے دوسرے سرے پر ایک اجنبی آدمی کو دیکھا کہ وہ ان چھوٹے چھوٹے پودوں کو اُکھاڑ رہا ہے باڑھ میں کھڑی ہو کر اُس کو دیکھتی رہی۔ مگر اس نے ان تمام پودوں کو جمع کر کے اُس ٹیلہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ پھر اُس نے ایک پیاز کو اُس کے نازک پودے سے جھٹکا مار کر توڑا پھر اُس کو چاندنی میں اونچا اُچھال کر لپک لیا۔ میں نے اُس سے چلا کر پوچھا کہ وہ کون ہے۔ اور کیوں اس طرح میرے آقا کی پیاز کو اُکھاڑ رہا ہے۔ مگر اس کے جواب میں وہ اجنبی محض بڑبڑایا۔ اُس کی بڑبڑاہٹ ایسی مہیب اور دہشتناک تھی۔ کہ خوف سے میرا دل بیٹھنے لگا۔ پھر وہ میری طرف غصہ سے مُڑا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک پستہ قد سیاہ رنگ کا آدمی ہے۔ ڈاڑھی اُس کی سفید ہے اور اُس کے سینہ پر ایک سُرخ نشان مجھے نظر آیا۔ میں ڈر کر بھاگی ایک ضعیف عورت کر ہی کیا سکتی تھی۔ میرے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ اور میں راستہ میں کئی جگہ گر پڑی لیکن میں نے جب تک آپ کے دامن میں پناہ نہ لی

میں نے دم دیا۔ اب آپ ہی ہیں کہ جو ہم غریبوں کو چوروں کے نرغہ سے پناہ دیں گے۔ اس لئے کہ ہم سب لوگ ان سے عاجز آ گئے ہیں"۔

اس تمام واردات کے سنانے میں وہ بڑھیا کئی کئی بار کانپ اُٹھی۔ مگر ہزبر الدین کے تیز کانوں نے بڑھیا کے اخیر جملے کے مطلب کو بھانپ لیا۔ اسی شام کو اُسے خبر ملی تھی کہ ایک گروہ بزدل چوروں کا بستی کے پاس آ گیا ہے کہ جو صرف باغوں اور کھیتوں میں چوری کر کے گزر کرتا ہے۔ یہ ضرور اُسی گروہ کا ایک آدمی ہوگا۔ ملک نے سوچا کہ اس کو پکڑ لینا چاہئے تاکہ اس کو تمام گروہ کے حالات قبول کرائے جائیں۔ اُس نے فوراً تلوار کمر سے باندھی۔ ترکش میں تیر رکھے۔ بائیں ہاتھ میں کمان اور داہنے ہاتھ میں نیزہ لے کر روانہ ہو گیا۔ ملا نے پوچھا "سرکار کیا میں گھوڑے کے لئے آواز دوں؟"

"نہیں گھوڑے کی کیا ضرورت ہے۔ ملک ہزبر الدین پیادہ دس سواروں کے برابر ہے۔ اس کے علاوہ گھوڑے کی ٹاپ کی آواز سے وہ چوکنا ہو کر بھاگ جائیگا۔ میں جس طرح کھڑا ہوں اسی طرح جاؤنگا"۔

ملک کے روانہ ہوتے ہی ایک عجب مکاری کا تبسم اس بڑھیا کے ہونٹوں پر نمودار ہوا اور وہ خود اندھیرے میں جا کر غائب ہو گئی۔

باب چہارم

وہ اجنبی آدمی ابھی تک اپنی حیرت انگیز تفریح میں مشغول تھا۔ پیاز کی گانٹھوں کو اونچا آسمان کی طرف اُچھالتا۔ اور گرنے سے قبل اُن کو لپک لیتا ہزبر الدین اس فکر میں تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو اُس کا شکار پنجے میں آ کر ہاتھ سے نکل جائے۔ وہ چپکے چپکے پیچھے سے اُس کے قریب آیا۔ چاندنی روشنی ایک رُخ سے اس اجنبی آدمی کے چہرہ پر پڑ رہی تھی وہ آدمی اپنی جگہ سے ہزبر الدین کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن ہزبر الدین اس اجنبی آدمی کی ہر بات کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اور اس بات کو معلوم کرنے کی کوشش میں تھا کہ وہ کس طرح کا آدمی ہے تاکہ اگر وہ فراری ہو جائے تو بعد میں شناخت کرنے میں آسانی ہو۔ جیسا کہ خادمہ نے بتایا تھا۔ وہ ایک پستہ قد سیاہ آدمی تھا اور اس کی ڈاڑھی گھنی اور سفید تھی اس کے کپڑے سفید تھے۔ مگر میلے ہو چکے تھے۔ لیکن ملک اس بات کی شناخت نہ کر سکا کہ وہ کپڑے کس قسم کے تھے۔ وہ ننگے سر تھا۔ اور اُس کی گردن اُس کے کپڑوں کے مقابلہ میں بہت ہی سیاہ معلوم ہوتی تھی جسم اُس کا نہایت ہی لاغر اور نحیف تھا۔ ہاتھوں میں سوائے پوست و استخوان کچھ نہ تھا۔ اُس کے چست لباس میں اُس کی پسلیاں صاف نظر آ رہی تھیں ہزبر الدین نے سوچا کہ یا تو فاقوں نے اس کو چوری پر مجبور کیا ہے اور یا بڑھاپے میں اس کو کام نہ ملا کرنا پڑا۔ اور کھانے کو کم ملا۔ اب وہ صرف بارہ قدم کے فاصلہ پر اس اجنبی سے تھا۔ اور اس کمزور آدمی کا بھاگ جانا تقریباً ناممکن تھا۔ ملک نے زور سے کہا "تو کون ہے اور یہاں کیوں بیٹھا ہے" قدرتی طور پر وہ اجنبی آدمی مڑا اور کسی نے ملک کے کان میں کہا "تم اس کو جانتے ہو؟" اس بھیانک شکل سے جو ہزبر الدین کے سامنے تھی ایک کمزور آدمی تو کم از کم بیہوش ہو جاتا۔ یہ ایک عمر رسیدہ آدمی کی شکل تھی جس کے تمام چہرے بشرے سے تکلیف و تفکر کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی پیشانی اور رخسار پر خون کے نشانات تھے۔ خون کی ایک باریک سی دھار اُس کے منہ سے نکلکر ڈاڑھی پر بہہ رہی تھی۔ بائیں طرف دل سے ذرا اوپر ایک بہت ہی ہیبت ناک خنجر کا زخم تھا جس سے اُس کی دو پسلیاں کٹ گئی تھیں۔ نیز قلب کی حرکت کی وجہ سے اس زخم میں سے خون کی ایک بڑی دھار نکل رہی تھی۔ اس کے دونوں بازو انتہائی مایوسی کے عالم میں دونوں طرف پڑے ہوئے تھے۔ اور وہ بائیں ہاتھ میں ابتک ایک پیاز لئے ہوئے تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اور آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ لیکن پتلیاں اوپر کو چڑھ گئی تھیں۔ اور صرف سفیدی نظر آتی تھی۔ وہ آدمی نہ تو کچھ بولا اور نہ اُس نے کچھ جنبش کی۔ لیکن عجیب خوفناک سکوت کے ساتھ ہزبر الدین اور چاند کو دیکھتا رہا۔

کوئی اور شخص ہوتا تو ذرا تامل کرتا۔ مگر ملک نے یہ سبق ہی نہیں پڑھا تھا۔ فوراً ہی اُس نے اس عجیب الخلقت ہستی کو پہچان لیا کہ یہ اُس کا مُردہ دشمن ہے۔ اور اپنے نیزہ کا نشانہ لے کر پوری طاقت سے اُس آدمی کے دل پر پھینکا۔ اس کے بعد وہ ذرا اپنی حرکت پر غور کرنے کے لئے رُک گیا۔ اس کے سامنے ایک آدھ گز اونچا ٹیلا تھا جس پر بیٹھ کر اُس نے اس کھیت کی جوتائی کی نگرانی کی تھی۔ اس کے دوسرے جانب پیاز کے پودوں کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ جو اس اجنبی آدمی نے توڑ کر جمع کئے تھے۔ اس کے آگے اُس کا تاتاری بھالا پڑا ہوا تھا۔ ملک نے اس کو نہایت ہی قوت سے پھینکا تھا۔ وہ آدھا نرم

زمین میں گڑ گیا تھا۔ لیکن وہ اجنبی آدمی غائب ہو گیا۔ ممکن ہے یہ سب اُسکے وہم و گمان کا نتیجہ ہو۔ مگر ملک نے اپنے خطا نہ ہونے والے نیزہ کو اس اجنبی کے زخم دل میں سے گزر کر دوسری جانب گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس اجنبی کا غیر مادی جسم دو حصّوں میں منقسم ہو کر ہوا کی طرح غائب ہو گیا۔ جس طرح دھواں ہوا میں مل کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں چلا گیا +

ملک مردانہ وار ٹیلے پر سے ہو کر پیاز کے ڈھیر کی طرف بڑھا۔ زمین میں سے اپنا نیزہ نکالا۔ اس پر جو مٹی لگی تھی اُس کو صاف کیا۔ اور غور سے دیکھنا شروع کیا کہ کہیں نیزہ کی نوک خراب تو نہیں ہو گئی +

یہ ہوا کیا؟ وہ اجنبی کہاں چلا گیا۔ اور یہ کون آدمی تھا؟ اس قسم کے بہت سے خیالات ملک کے دل میں آنے۔ وہ اپنے بھالے کے سہارے جھک کر کھڑا ہو گیا۔ اور ایک عمیق بحر تفکر میں مستغرق ہو گیا۔ فوراً ہی ایک بادل آیا اور اُس نے چاند کو تقریباً ڈھک دیا۔ ملک نہایت ہی غور سے سوچ میں پڑ گیا۔ "ہاں وہ آدمی کون تھا۔ اور کہاں چلا گیا" اُس نے آہستہ آہستہ صورتوں کو دل میں دُہرایا اور آخر کار اُس کو صحیح آدمی کا پتہ لگ گیا کہ وہ کرم نرائن اُس کا پُرانا کاشتکار تھا۔ اس خیال نے اُس کے دل میں ایک عجیب قسم کا ہیجان پیدا کر دیا۔ یہ عمر میں پہلا موقع تھا کہ اُس کو خوف محسوس ہوا۔ وہ تھرّانے اور کانپنے لگا۔ اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا +

کرم نرائن نامی واقعی ہزبرالدین کے گاؤں کا ایک کاشتکار تھا۔ وہ بڈھا ہو گیا تھا۔ ہر شخص اس سے محبت کرتا تھا۔ اس لئے کہ وہ نہایت ہی رحم دل اور بھلا مانس آدمی تھا۔ بچّے اور بڑے آدمی سب اُس کو یکساں چاہتے تھے۔ بڑے آدمیوں کے لئے وہ نئے نئے کھیل تجویز کرتا۔ اور بچّوں کے لئے وہ طرح طرح کے کھلونے بنایا کرتا تھا۔ گھر کی سب بیبیاں اُس سے خوش تھیں اس لئے کہ اپنے ہر ضرورتمند ہمسایہ کی مدد کرنے میں اُسے ذرا بھی دریغ نہ تھا اُس کی بیوی بچّے اور سب عزیز اُس کے سامنے مر چکے تھے اور یہ اکیلا سب کا سوگوار تھا۔ چنانچہ اب اس کی محبت اپنے ہم پیشہ کاشتکار اور اُنکے اہل وعیال پر منتقل ہو گئی تھی۔ اوائل عمر میں تو اُس کے پاس بہت زمین تھی مگر آخر میں چونکہ پوری زمین پر کاشت کرنا اُس کے اختیار سے باہر تھا اِس لئے اُس نے اپنی زمین کا بیشتر حصّہ اپنے کاشتکار بھائیوں کے نوجوان اور طاقتور بچّوں کو دے ڈالا تھا۔ اور ان کو انہماک کے ساتھ اپنے کام میں مشغول دیکھ اور یہ محسوس کر کے کہ وہ کسقدر مشقت اور تندہی سے کام کر رہے ہیں کرم نرائن کا دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتا تھا۔ قوت جو ضعیفی نے اُس سے چھین لی تھی اب واپس تو ملنے سے رہی۔ مگر دوسروں کو اس قوت سے فائدہ اُٹھاتے دیکھ کر یہ بوڑھا مگر نیک آدمی نہایت ہی خوش ہوتا۔ اپنے گزارہ کے لئے اُس نے دو چھوٹے کرزرخیز کھیت رکھ لئے تھے۔ جو اُسکی زائل شدہ اور گھٹی ہوئی قوت پر برداشت سے زیادہ بار ڈالے بغیر تھوڑا سا غلّہ پیدا کر دیتے تھے۔ جوانی اور طاقت کے زمانہ میں جو لوگوں پر احسانات کئے تھے۔ اُس کے بدلے میں لوگ اب جبکہ وہ بڈھا ہو گیا تھا۔ اُس کی عزت کرتے تھے۔ اور اُس کی ہر طرح کی مدد کو تیار تھے۔ جو انسان بوتا ہے وُہی کاٹتا ہے۔ الغرض گاؤں کا ہر نوجوان کرم نرائن کو اپنے باپ کی طرح سمجھتا تھا۔ یہ کوئی کم بات نہ تھی۔ اس لئے کہ جہاں کرم نرائن کا پسینہ گرتا وہاں گاؤں کا بچّہ بچّہ اپنا خون بہانے کو تیار تھا۔ اور یہ کوئی زبانی جمع خرچ نہ تھا۔ اگر کوئی موقع آتا تو لوگ عمل کر کے بھی دکھا دیتے۔ لیکن دس برس سے زیادہ ہو گئے تھے کہ کرم نرائن یک لخت غائب ہو گیا تھا۔ وہ دور دراز تیرتھ کی غرض سے روانہ ہوا اور پھر واپس نہیں آیا لوگوں نے یقین کر لیا کہ مصائب سفر کی وجہ سے وہ کہیں مر کر رہ گیا۔ کسی کو اس بات کا گمان تک نہ تھا کہ وہ بیچارہ قتل کر دیا گیا صرف ہزبرالدین اس حقیقت سے آگاہ تھا +

یہ وہ زمانہ تھا کہ ہزبرالدین ترقی کے زینہ پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا مگر ابتک مشہور نہ ہوا تھا۔ اس کی نیّت کرم نرائن کے کھیتوں پر تھی مگر کرم نرائن ان کھیتوں کو جن پر کہ اس آخری عمر میں اس کی زندگی کا دارومدار تھا ایک تہائی قیمت میں دے ڈالنے کو تیار نہ تھا۔ ہزبرالدین نے اس مشکل کو ایک جرم کے ارتکاب سے حل کیا جب کرم نرائن تیرتھ کے لئے [illegible] اُس کے پیچھے پیچھے چلا گرمی کا موسم تھا۔ دن کو تیز دھوپ ہوتی تھی اُس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ رات کو سفر کرے گا اور [illegible] لیٹ کر آرام کرے گا۔ رات کے وقت سفر کرنے میں اُس کو کسی قسم کا خوف نہ تھا۔ اس لئے کہ نہ اُس نے کسی کو کبھی نقصان پہنچایا تھا۔ اور [illegible]

دس برس مقتول نے آرام کی نیند بسر کی اب ملک نے اس کو ناوابستہ اس کی آرامگاہ سے باہر کھود کر پھینک دیا۔ ملک نے سوچا کہ اس کا بھوت اب تمام عمر مجھ کو تنگ کرے گا۔ اس خیال کے آتے ہی اس کی تیوری پر بل پڑ گئے اور اس کا چہرہ غصہ سے تمتمانے لگا۔ ابتک اس کو نیکی کی بھلائی اور بدی کی برائی کا اچھی طرح احساس نہیں ہوا تھا۔ گناہوں کی پاداش اور اعمال بد کا خمیازہ اُس کے لئے محض بے معنی چیزیں تھیں۔ ابتک اس مظلوم مقتول کی طرف سے ملک کے دل میں حزن و ملال یا صرف ہمدردی اور تاسف کے جذبات پیدا ہوئے ۔

یہ تو ناممکن تھا کہ وہ تمام رات اسی طرح کھڑا کھڑا گذری ہوئی زندگی پر تصور کرے۔ رات زیادہ ہو چکی تھی چنانچہ اُس نے گھر واپس جانے کا ارادہ کیا۔ ملک نے غصہ میں آکر اپنے داہنے ہاتھ کی مٹھی بند کی اور اپنے ہاتھوں کی مچھلیوں کو محسوس کیا۔ اپنی طاقت کے خیال سے اس کو پھر وہی اطمینان حاصل ہو گیا۔ اپنے نیزہ کو سنبھال کر وہ پھر گھر آنے کے لئے مڑا۔ دفعتاً اُس کو کسی آدمی کے خشک پتوں پر چلنے کی آہٹ آئی۔ اس آواز کی طرف نگاہ اُٹھا کر دیکھتا تھا کہ اُس نے وہ کچھ دیکھا جس سے اُس کا خون منجمد سا ہو گیا اور وہ اپنی جگہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ ابر کے سیاہ ٹکڑے آہستہ آہستہ بعد اُفق میں جا چکے تھے۔ اور چاند نے ایک عرصہ کی پردہ نشینی کے بعد اپنے رُخِ روشن سے جو نقاب اُتار کر پھینکی تو ملک ہزبرالدین کے منہ کے سامنے آکے نہایت ہی دلربایانہ انداز سے تمام دنیا کو منور کر دیا۔ ملک کے سامنے پچیس یا پچاس قدم کے فاصلہ پر ٹیلے کے اُس طرف وہ بڑ کا درخت تھا کہ جہاں ملک نے اپنا گھوڑا باندھا تھا اور جس کے سائے میں اُس نے پنجوں کے بل چل کر اس اجنبی تک پہنچنے کی کوشش کی تھی۔ اب پھر کوئی آدمی اسی جگہ الٹی سوکھی پتیوں پر چل رہا تھا ۔

ملک اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ کوئی شے بڑ کے درخت کے سائے سے نکل کر روشنی میں آئی۔ یہ عجیب ہیبتناک اور ڈراؤنی چیز تھی۔ جسکے اعضا انسان کے سے ضرور تھے۔ مگر قد ان سے دگنا تھا۔ کپڑا ذرا سا بھی جسم پر نہ تھا۔ مگر تمام بدن پر لمبے لمبے سیاہ گھونگھر والے بال اُگے ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے اُس کی صورت اور زیادہ خوفناک ہو گئی تھی۔ چاند کی تیز روشنی میں بڑ کے سبز پتوں کے مقابلہ میں اس کا سیاہ جسم نہایت ہی ڈراؤنا معلوم ہوتا تھا۔ اور جس وقت ملک نے دیکھا کہ اُس کا سایہ غائب ہے تو اُس کی جان سی نکل گئی۔ اس کا جسم نہایت ہی فربہ اور مضبوط تھا اُس کے بائیں ہاتھ میں ایک انسان کی کھوپری تھی۔ اور اُس کی سرخ سرخ آنکھوں سے ایک عجیب تیز روشنی نکل رہی تھی ۔

اس بلا نے ملک کی طرف گھورنا شروع کیا۔ اور ملک بھی اپنی آنکھیں اُس کی طرف سے نہ ہٹا سکا۔ اس کی نگاہ میں خدا جانے کیا جادو کا اثر تھا کہ ملک جہاں کھڑا تھا وہیں رہ گیا۔ اور ایک قدم سرکنے کی بھی قوت اُس میں نہ رہی۔ جنبش کرنا تو کجا۔ خیال کی قوت بھی گویا اُس سے سلب ہو گئی چنانچہ دونوں ایک دوسرے کو کھڑے دیکھتے رہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اُس بلا نے ملک کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ٹیلہ پر سے ہو کر نیچے اُترا۔ یہاں آکر اُس نے ایک لمحہ کے لئے ہزبرالدین کی طرف سے نگاہ ہٹا کر اس کھوپری کی طرف دیکھا اور اس کو نہایت ہی اونچا اُچھال کر لپک لیا ۔

ملک میں برداشت کی قوت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ اس بلا کا ٹھکانا تھا کہ دھم سے وہ غش کھا کر زمین پر گر گیا۔ اور کئی ایک پیاز کے پودے اُس کے گرنے سے کچل گئے ۔

باب پنجم

ملک کی یہ حالت کچھ زیادہ دیر قائم نہ رہی۔ اس لئے کہ آنکھ کھول کر اُس نے ہر چیز کو جیسا کا ویسا ہی پایا۔ ابر کے سیاہ ٹکڑے اسی طرح بعد اُفق میں تھے۔ اور چاند بھی جہاں کا وہیں تھا۔ صرف وہ بلا نظروں سے غائب تھی۔ یہ معلوم کر کے ہزبرالدین کو بہت ہی جلدی ہوش آگیا۔ دفعتاً اُٹھ کر بیٹھا اور آنکھیں ملنے لگا۔ پھر ایک دم سے کھڑا ہو کر اُس نے اپنا نیزہ سنبھالا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ملک نے خود اس خیال میں جتنا یا کہ کچھ ہمت بندھے۔ مگر وہ بغیر کسی ارادہ کے تیز تیز دوڑنے لگا۔ راستہ میں کرم نرائن جس کے منہ اور سینہ سے خون جاری تھا۔ ملک کو ہر شیشے پر بیٹھا نظر آتا تھا۔ وہ ہر درخت کے سائے سے ڈرتا تھا کہ وہ بلا نہیں

نکل آئے۔ وہ نہایت ہی تیز ٹیلوں پر سے کودتا ہوا اور خندقوں کو پھلانگتا ہوا چلا جا رہا تھا ॰

"چور چور۔ پکڑو مت جانے دو" ایک مکان سے آواز آئی۔ ملک نے پہچانا کہ یہ وہی مزدور ہے جس نے اُس کے کھیت پر ہل چلایا تھا۔ اور جس سے ملک نے کرم نرائن کی قبر پر زبردستی ہل چلوایا تھا۔ آبادی کے قریب پہنچ کر ملک ذرا آہستہ ہوا۔ سڑک کے دونوں جانب مکان بنے ہوئے تھے۔ گو سب کے سب اس وقت مشغول بخواب تھے۔ گر انسانوں کے قرب سے ملک کی ذرا ڈھارس بندھی۔ سامنے سے کوئی شخص نہایت ہی خوش الحانی کے ساتھ ایک فارسی کی غزل گاتا ہوا آ رہا تھا کہ جسکو ملک نے فوراً پہچانا کہ اُس کا برادر نسبتی فخرالدین ہے۔ اُس نے ملک کو دیکھتے ہی کہا "میں زبیدہ کو ابھی گھر چھوڑ کر آیا ہوں۔ میری خواہش تو یہی تھی کہ تم بھی میرے ساتھ سیر کے لئے چاندنی رات میں چلو۔ مگر میں تم کو اس لئے مجبور نہیں کرتا کہ تم نے ابتک کھانا نہیں کھایا ہے" ॰

"اور میں تھک بھی گیا ہوں" فخرالدین نے جواب دیا "مگر یہ خیال رکھنا کہ میرے پیاز کے کھیت کی طرف مت جانا۔ مجھے آج وہاں ایک نئی قسم کا جانور نظر آیا۔ وہ دو پاؤں پر چلتا ہے۔ اور کچھ کچھ ریچھ سے مشابہ ہے" ملک کی خواہش یہ تھی کہ بغیر اپنی کمزوری کا اظہار کئے فخرالدین کو خطرہ سے آگاہ کر دے۔ "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا" فخرالدین نے جواب دیا۔ "ریچھ سے مشابہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو کچھ ایسا ہوگا" اور آن کی آن میں فخرالدین کی جگہ وہی پیاز کے کھیت والی بلا کو ملک نے کھڑا پایا۔ وہی قد ویسے ہی بال اور بالکل ویسی ہی خوفناک سُرخ آنکھیں ॰

یہ کیا ہو گیا اس بات پر ملک نے بالکل غور نہ کیا۔ دل ہی دل میں یہ ضرور سوچا رہا کہ فخرالدین کی یہ حرکت یعنی کہ اس بلا کی صورت اختیار کرنا ایک نہایت ہی ذلیل اور رکیک حرکت تھی۔ تجربہ نے اس کو یہ بات بتا دی تھی کہ یہ بلا کوئی مادی چیز نہیں۔ نہ تو سایا تھا اور نہ اس کے پاؤں کے نشانات ہوتے تھے۔ شاید اس کو کوئی مادی نقصان بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ صرف اس بلا کی آنکھوں کی طرف اس کو نہیں دیکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ وہ ڈرتا تھا کہ آنکھیں چار ہوتے ہی وہ از خود رفتہ ہو جائے گا۔ چنانچہ دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر اُس نے نہایت تیزی سے دوڑنا شروع کیا۔ چونکہ آدمی تھا تنومند اس لئے جس طرف سے گزر گیا سڑک دہل اُٹھی۔ جو لوگ کہ ہلکی نیند سونے کے عادی تھے وہ چونک کر اُٹھ بیٹھے کہ کیا بات ہے۔ اور جو لوگ گہری نیند سو رہے تھے وہ بھی چونکے۔ مگر دوسری طرف کی کروٹ لے کر سو رہے۔ ملک کو کسی کے سونے یا جاگنے کی پرواہ نہ تھی۔ وہ اپنی جان بچانے کے لئے بھاگ رہا تھا۔ اور اس کو اتنی فرصت نہ تھی کہ دوسروں کے ذرا ذرا سے آرام کا خیال کرے۔ آخرکار وہ اپنے بڑے مکان کے قریب پہنچ گیا اور باغ کے دروازہ سے گزر کر وہ دیوانہ وار مکان کے دروازہ میں داخل ہونے لگا۔ گو وہ اندر سے مقفل تھا۔ "سرکار ابھی کھولتی ہوں" اندر سے ماما نے آواز دی۔ ملک نے کنجی کے تالے میں گھومنے کی آواز کو سنا اور دروازہ کھل گیا۔ "بی بی ابھی آئی ہیں اور انہوں نے تمام نوکروں کو آپ کی تلاش میں بھیجدیا ہے۔ اور مجھ کو یہ حکم تھا کہ دروازہ کے پاس بیٹھی رہوں تاکہ آپ کے آتے ہی دروازہ کھول دوں جی ہاں بی بی اپنے ہی کمرہ میں ہیں" ॰

"اچھا اچھا تو ابھی جا اور کسی کو قاضی صاحب کے پاس ابھی بھیج دے اور کہلوا دینا کہ ملک ہزبرالدین نے قاضی صاحب کو قرآن شریف لیکر بلوایا ہے" ماما حکم کی تعمیل میں دس پندرہ قدم چلی اور پھر مڑ کر کہنے لگی:

"سرکار چور کا کیا ہوا پکڑا گیا کہ نہیں؟"

"نہیں میرے پہنچنے سے پہلے وہ بھاگ گیا۔ خیر کل صبح دیکھا جائیگا۔"

ملک دونوں پٹ پکڑے دروازہ پر کھڑا تھا ॰

"سرکار وہ چور تو تھا نہیں اور نہ وہ بھاگا" یہ کہتے ہی ماما کی خمیدہ کمر سیدھی ہونی شروع ہوئی اور اُس کا قد لمبا ہو گیا۔ اور اُس نے کہا "وہ تو کچھ ایسا تھا کیا آپ نے نہیں دیکھا؟" پھر وہی ہوا۔ ماما غائب ہو گئی۔ اور اس کی جگہ وہ بلا موجود تھی۔ ملک کی زبان سے نہایت ہی گندی گالی نکلی۔ اور اُس نے فوراً ہی دروازہ بند کر لیا۔ اس لئے کہ اپنے گھر میں وہ اس بلا کو نہیں آنے دینا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ زبیدہ خانم جو اُس کے لئے فرشتۂ رحمت تھی اُس کے قرب سے بھی ملک کو تقویت ہوئی۔ کامل پانچ برس جس بچاری نے دعا کرتے کرتے کاٹ دیئے۔ آج ضرور وہ اس کی مدد کر سکے گی۔ یہ سوچ کر وہ تیزی سے لکڑی کے زینہ پر چڑھا اور اپنی بی بی کے خوابگاہ میں پہنچا

یہ کمرہ ہر طرح کی آرائش اور زیبائش سے مزین تھا۔ شہنشاہ دہلی کے محلات کو دیکھ کر ملک نے اپنی پوری قوت اور دولت اس کمرہ کے خوشنما بنانے میں صرف کر دی تھی۔ دروازوں اور چوکھٹوں پر نقش و نگار دہلی کے بہترین کاریگروں نے کھودے تھے۔ دیواروں پر اس قدر اعلیٰ سفید روغن تھا کہ ہوبہو سنگ مرمر کا گمان ہوتا۔ اس پر پھول پتیاں ہندوستان کے اعلیٰ ترین مصوروں سے بنوائے تھے۔ ہندوستانی تہذیب کے مطابق فرش پر کرسیوں اور میزوں کا سہارا نہ تھا۔ بلکہ بیٹھنے کے لئے دو خوشنما قالین بچھے ہوئے تھے۔ بیچ کا قالین ٹھیک کمرہ کے برابر تھا۔ اور اس کے اوپر ایک چھوٹا قالین کمرہ کے بیچ میں نہایت ہی سلیقہ سے بچھا دیا گیا تھا۔ شمال کی جانب دو دروازہ تھے۔ اور جنوب کی جانب ایک دریچہ۔ مغربی دیوار کی طرف زبیدہ خانم کا خوبصورت چرخہ رکھا ہوا تھا۔ اور اس کے مقابل میں حاجی کا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ اس پلنگ کے پائے چاندی کے تھے اور یہی ایک چیز تھی جو اس کے والدین زبیدہ کو جہیز میں دے سکے۔ خانم بیٹھی ہوئی چرخہ کات رہی تھی۔ اور روئی سے سفید تاگہ بن رہا تھا۔ اس کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ چرخہ کے چلنے کی آواز کمرہ میں ہر جگہ آ رہی تھی۔ اسی آواز نے اکثر راتوں کو ملک کے لئے لوری کا کام دیا۔ اور اسکو میٹھی نیند کی گود میں ڈال دیا۔

ملک کے داخل ہوتے ہی خانم مسکرائی اور کہنے لگی:۔

"میں پریشان تھی کہ تم کہاں چلے گئے۔ میں نے ہر ایک ملازم کو آپ کی تلاش میں بھیجا۔ شاید آپ کو ان کی مدد کی ضرورت ہو۔ مگر مجھے اس کا یقین تھا کہ میرے دلیر اور بہادر شوہر کو کسی کا ڈر نہیں۔ صرف یہ ضرور ہے کہ رات زیادہ ہو گئی ہے۔ اور آپ نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔" ملک پاؤں لٹکا کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ آج کے واقعات نے اس کو لرزہ بر اندام کر دیا تھا۔ گو بیوی خانم کے پاس بیٹھ کر اس کی پریشانی میں کمی تھی اور وہ اپنے آپ کو۔ اور وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی سخت کوشش کر رہا۔ مگر دیئے کی دھندلی روشنی میں بھی زبیدہ نے تاڑ لیا کہ اس کا شوہر بالکل سفید پڑا ہوا ہے۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی ہے۔ اور ہاتھ کانپ رہے ہیں۔ خانم نے دریافت کیا "بات کیا ہے؟ کیا تمہاری طبیعت خراب ہے؟ میں نے تم کو کبھی ایسا نہیں دیکھا"

ملک نے اشارہ کیا کہ دروازہ بند کر دو۔ اس کے بعد زبیدہ خانم ملک کے قدموں کے قریب قالین پر بیٹھ گئی۔ ملک نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا کہ کہیں وہ بلا کسی کونہ میں نہ چھپی ہوئی ہو۔ اس کے بعد اس نے اپنی شریک زندگی کی طرف نہایت ہی محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ خانم مسکرائی اور کہنے لگی "مگر تم ہو کیسے؟ کیا میں کھانا منگواؤں؟ تم بھوکے ہو گے میں بھی بھوکی ہوں۔" ملک نے اشارہ سے خانم کو کہا کہ وہ اس کے پاس بیٹھی رہے۔ وہ خانم کو ایک منٹ کے لئے بھی اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"نہیں کھانے کی کوئی جلدی نہیں۔ آج مجھے ایک عجیب سانحہ ہوا۔"

"اچھا اس لئے تم اس قدر سہمے ہوئے ہو۔ مجھے بتاؤ کہ تمہارے ہر رنج میں مجھے شریک ہونے کا حق ہے۔"

ملک سامنے کو جھک گیا۔ دونوں زانو پر کہنیاں رکھ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں سر کو پکڑے تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا۔ زبیدہ اس کی طرف تعجب سے دیکھتی رہی۔ اتنے میں اس نے تمام واقعہ سنانا شروع کیا۔ پہلے اس زخمی آدمی کا حال سنایا کہ جس کی خبر مالی نے دی تھی۔ اور جس کی طرف اس نے اپنا ایرہ پھینکا۔ پھر اس سیاہ بال والی بلا کا تذکرہ کیا جو برگد کے درخت کے نیچے سے نکلی اور جس کے قدموں پر مالک غش کھا کر گر پڑا۔ کچھ حصہ اس نے نہایت ہی صفائی کے ساتھ چھپا لیا یعنی کرم نرائن کا قتل۔ اس زخمی آدمی کی کرم نرائن کے ساتھ تعجب خیز مشابہت اور فخرالدین اور مالا کا بلا کی صورت میں تبدیل ہو جانا۔ اس قصہ کے دوران میں وہ کئی جگہ اٹکا۔ چونکہ واقعہ ہولناک تھا۔ اس لئے اس کے الفاظ ایک تصویر کھینچ کر اس کے سامنے رکھ دیتے تھے۔ اس کی تکلیف سے اس کے ہونٹ اور زبان خشک ہو جاتے تھے۔

تھوڑی دیر تک کمرہ میں بالکل سکوت رہا۔ زبیدہ خانم سر جھکائے کسی خیال میں غرق تھی۔ ملک بدرالدین بھی عمر بھر میں ایک نئی بات سوچ رہا تھا۔

"خانم تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا خدا کبھی قتل کے گناہ کو بھی معاف کر دیتا ہے؟"

"کیوں نہیں؟ گنہگار کو خون بہا دینا چاہئے۔ خدا کے احکام کی خلاف ورزی اگر کوئی بندہ کرتا ہے۔ خدا توبہ اور استغفار سے معاف کر دیتا ہے۔"

لیکن حقوق العباد کی خلاف ورزی خدا کبھی معاف نہیں کرتا۔ جب تک کہ اس گناہ کا کفارہ نہ ادا کیا جائے۔ اس کے لئے صرف روحانی تکلیف ہی نہیں جسمانی تکلیف بھی ہم کو برداشت کرنی چاہیئے۔ اگر ہم نے کسی کو رنج پہنچایا تو خود کو بھی اتنا ہی رنج برداشت کرنا چاہیئے۔ اگر کسی کی کوئی جان لے۔ تو اس کے کفارہ میں اپنی جان دینی چاہیئے۔ یقیناً بالفور صاحب کی صفائی صرف تکلیف برداشت کرنے سے ہی ہو سکتی ہے گناہ دھل جانے کے بعد ہم مثل معصوم بچوں کے ہو جاتے ہیں۔ ہر گناہ کی سزا مقرر ہے اس کو برداشت کرنے کے بعد ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے۔ گناہ کی پاداش ضرور بھگتنی پڑتی ہے۔ اور اس سے بچنا محال ہے۔ خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں۔ لیکن اس کے رحم سے نا امید ہونا کفر ہے ٭

زبیدہ کی آنکھیں امید اور خوشی سے چمکنے لگیں۔ مسٹر لوٹلٹ نے کہا شاید بقیہ حصہ کا قیاس کر لیا ہے۔ اس نے خیال کرنا شروع کیا کہ زبیدہ کا یہ مقصد تھا کہ وہ قاضی کے سامنے اپنے جرم کا اقبال کر لے۔ اس نے اپنی بی بی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا چاہا۔ مگر زبیدہ ایک دم سے کھڑی ہو گئی۔ اور دروازہ کی طرف چلنے لگی ٭

"مگر میں نے اس کو قتل تھوڑی کیا ہے!" ہزبرالدین نے اپنے آپ سے کہا۔ گو وہ سمجھ رہا تھا کہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے۔ زبیدہ نے مڑ کر کہا:۔

"میں ابھی کھانا منگواتی ہوں۔ اس سے کچھ جسم میں طاقت آئیگی تم پریشان نہ ہو۔ آفتاب کی اوّل شعاع کے ساتھ ساتھ آپ کی تکالیف کا خاتمہ ہو جائے گا۔" کچھ قدم چلنے کے بعد پھر خانم نے کہا "یہ تم نے عجب چیز دیکھی" ہزبرالدین کانپنے لگا۔ یہ دیکھ کر کہ زبیدہ کا سایہ غائب تھا۔ اب اسکو یاد آیا کہ کسقدر پھرتی سے اس نے اپنا ہاتھ چھڑایا تھا۔ اب اس نے کہنا شروع کیا "دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کا ہم کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا" اس کا قد بڑھنا شروع ہوا۔" اور وہ جو شے بڑ کے سائے سے نکل مہتاب کی روشنی میں رونما ہوئی کیا وہ ایسی تھی؟" دفعتاً نازک اندام زبیدہ کی جگہ وہی بلا ملک کو نظر آئی۔ وہی خوفناک آنکھیں۔ وہی گھونگھر والے بال اور اب بھی اس کے ایک ہاتھ میں نیزہ اور دوسرے ہاتھ میں انسان کی کھوپڑی تھی ملک نے آنکھیں بند کرنا چاہیں۔ مگر ذرا دیر ہو گئی۔ اس بلا کی طرف دیکھنا تھا کہ اس کو اپنے اوپر بالکل قدرت نہ رہی اور وہ نہایت ہی بے بسی کی حالت میں اس کو دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر میں وہ بلا غائب ہونا شروع ہوئی۔ سب سے پہلے جسم کا رنگ تبدیل ہوا۔ اور ہوا میں غائب ہونا شروع ہوا اور آہستہ آہستہ ملک کو اس بلا کی پس پشت جو دیوار تھی وہ نظر آنے لگی۔ مگر اب بھی ان سرخ آنکھوں کا جادو ملک کو اپنے قابو میں کئے ہوئے تھا۔ اور ملک اس سے اپنی نگاہ نہیں اٹھا سکتا تھا آخرکار وہ سرخ آنکھیں بھی غائب ہو گئیں اور ملک غش کھا کر گر پڑا ٭

باب ششم

زبیدہ علی الصباح اپنے بھائی کے ہمراہ گھر واپس آئی۔ اس کی ماما اور اس کے چھ نوکر بھی اس کے ساتھ آئے۔ چیچک کی مریضہ کی حالت اب پہلے کی نسبت اچھی تھی۔ اپنے کمرہ میں جا کر اس نے اپنے خاوند کو تیز بخار میں مبتلا پایا۔ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ جیسے کہ کسی کو غور سے دیکھ رہی ہوں۔ ملک میں اتنی قوت نہ تھی کہ کسی سوال کا جواب ٹھیک سے دے۔ وہ ہذیان کی حالت میں تھا اور اس کی گفتگو بے ربط اور بے معنی تھی ٭

"کرم رائن کرم رائن۔ او بلا میں تم دونوں میں سے کسی سے بھی نہیں ڈرتا۔ ذرا درخت کے سائے سے باہر نکل آؤ میں اکیلا تم دونوں کیلئے کافی ہوں۔ میں تیری ان مردہ آنکھوں سے بھی نہیں ڈرتا۔ ذرا میری کمان لاؤ۔ میں ان دونوں کو اپنے تیر کا نشانہ بنانا چاہتا ہوں۔ میں ضرور . . نہیں میں میں نے یہ نہیں کیا۔ میں تم سب کو یقین دلاتا ہوں۔ کرم رائن۔ کرم رائن۔ کیا تو مجھے معاف نہیں کرے گا۔ تو میری طرف کیوں اس طرح دیکھ رہا ہے؟ تو بڈھا تو ہو ہی گیا تھا۔ تیرا مرنے کا وقت تو ویسے بھی قریب ہی تھا۔ خدا کی لعنت تجھ پر" ٭

زبیدہ سخت پریشان تھی۔ وہ بیماری کی وجہ بالکل نہ سمجھ سکی۔ اس کے دل میں ایک خیال آتا تھا۔ ایک جاتا تھا۔ پہلے تو وہ یہ ڈری کہ اسکا خاوند اس حالت میں کہیں کچھ ایسی بات نہ کہہ ڈالے کہ جو اس کو نقصان پہنچائے

چنانچہ اُس نے اپنے بھائی کو بستی کے حکیم کے پاس بھیجا۔ نوکروں کو کمرہ کے باہر نکالا اور نیچے جاکر رات کے واقعات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس کو ناکامیابی ہوئی۔ ماما بہت دیر تک کھانا لئے جاگتی رہی۔ مگر یکلخت اس پر غنیداس بلا کی طاری ہوگئی کہ اُس کو صبح تک اپنے سر پیر کا ہوش نہ رہا۔ اُس نے بیان کیا کہ سرکار نے کھانا رات نہیں کھایا۔ اس لئے کہ کھانا اور برتن جیسے کہ ویسے ہی رکھے ہوئے تھے۔ چوکی دار بھی ایک جگہ بیٹھا بیٹھا سوگیا۔ اور اُس کو کچھ علم نہیں کہ رات کو کیا ہوا۔ الغرض کوئی بات نہ معلوم ہوسکی اور زبیدہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس کا خاوند شب میں کسی چیز سے ڈر گیا۔ اور بخار اور سرسام کی حالت میں مکان واپس آیا۔ ان خیالات کو ملک نے تمام عمر سینہ میں دبا کر رکھا۔ گویا آخر انھوں نے ملک کو مغلوب کر دیا۔ لیکن اصلی واقعات صرف ملک کو معلوم تھے اور وہ بیہوش پڑا تھا۔

آخر وہ اپنے کمرہ میں واپس آئی۔ بخار اُس کو اب [illegible] تھا۔ مگر ہوش و حواس درست تھے۔ وہ پٹی کے پاس بیٹھ گئی اور ملک کے ہاتھ کو پکڑ کر اُس کی ہتھیلی پر اپنا سُرخ رخسار رکھ دیا۔ بخار پہلے سے بہت کم تھا اُس نے نبض پر ہاتھ رکھا۔ بخار برابر کم ہو رہا تھا۔ ملک کا چہرہ تکلیف سے زرد پڑ گیا تھا۔ کمرہ کے کونہ سے دیا اُٹھا کر اُس نے اپنے خاوند کو بغور دیکھنا شروع کیا۔ آنکھیں بند تھیں اور سانس جلدی جلدی چل رہا تھا دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند تھیں اور چہرہ پر غصہ کے آثار نمایاں تھے۔ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بڑی مہم پر جانے کا ارادہ کر رہا ہے۔ اور دشمن کو مغلوب کرنے کی ترکیب سوچ رہا ہے مگر دیکھتے ہی دیکھتے وہ تمام غصہ کے آثار غائب ہو گئے اور اُس کا رُواں رُواں کانپنے لگا۔ ایسا معلوم ہوا کہ اپنے سے بڑی قوت سے مغلوب ہو کر وہ انتہائی یاس اور مجبوری کے عالم میں پڑا ہوا ہے اور کسی کی ہمدردانہ نگاہ کا متلاشی ہے مگر ہر ایک نے اس کو اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ گو وہ بیہوش پڑا تھا۔ مگر جو کچھ اُس کے خاوند کے دل میں گزر رہا تھا۔ زبیدہ کے دل کو ایک ایک بات کا علم ہوتا جاتا تھا۔ یہ ملک وہ پُرانا ملک نہ تھا۔ آج اس کو اپنی کمزوری کا احساس تھا۔ کمزوری کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انکساری اور اپنے جیسے کمزور انسانوں سے محبت اور ہمدردی اُس کے دل میں پیدا ہوگئی۔ وہ مغرور اور سنگدل انسان جس کی عزت کہ زبیدہ کے دل میں تھی بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ اُس کی جگہ ایک بے بس اور کمزور انسان نے لے لی تھی۔ وہ لوہے کی دیوار جو کہ ان پانچ برس تک ان دونوں کے درمیان حائل تھی آج ایک بیک موم کی طرح پگھل گئی۔ اس لئے کہ آج اُس کا مصیبت زدہ خاوند اسی ہمدردی کا متلاشی تھا جس ہمدردی کو زبیدہ اس پانچ برس کے عرصہ میں اُس کی نذر کرنے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔ ایک عجیب حالت زبیدہ کے اوپر طاری ہوگئی۔ اور اُس نے ملک کو اس محبت سے دیکھنا شروع کیا جس طرح ایک ماں اپنے بیمار بچے کو دیکھتی ہے۔ اُس کے دل نے اُس کو بتایا کہ اُس کا خاوند تھوڑی دیر کا مہمان ہے۔ زندگی کے انکشافات اس قدر جلد جلد ہوئے کہ ملک کی طبیعت ان تبدیلیوں کو برداشت نہ کر سکی۔ اس کے ساتھ ہی زبیدہ نے اس بات کو محسوس کیا کہ وہ اور اُس کا خاوند دونوں آج کے دن محبت کے حبل المتین میں مضبوطی سے باندھ دیئے گئے ہیں۔ اور کوئی چیز انکو جدا نہیں کرسکتی۔ وہ اُٹھی اور گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر اُس نے اپنے قریب المرگ خاوند کے سینہ پر سر رکھدیا۔ اور آنسوؤں کی لڑیاں اُس کی حسین آنکھوں سے جاری ہوگئیں۔ محبت کی رنگینی اور نزاکت کے اظہار کے لئے جامہ الفاظ کا بار نہایت ہی گراں تھا۔ چنانچہ الفاظ سے زیادہ بولتا ہوا کام ان آنسوؤں نے دیا اور ہر ایک اشک واردات قلب کی ایک الگ الگ داستان کہنے لگا۔ اتنے میں ہزبرالدین کو ہوش آیا۔ اور اُس نے آہستہ آہستہ اپنی بیوی کے سر پر اپنا مضبوط ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ زبیدہ کے تشنۂ محبت لبوں پر مسکراہٹ آئی اور ملک نے اپنے دل میں ایک عجیب تقویت سی محسوس کی۔ اور کہا:-

”میں نے عجیب خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ تم بھی اس بلا کی صورت میں تبدیل ہوگئی ہو جس کو میں نے بڑ کے درخت کے نیچے دیکھا“ اتنا کہتے ہی اُس کی آواز بھرانے لگی۔ اور دو خوشنما اشک اُس کی نیلگوں آنکھوں میں چمکنے لگے۔ اس کے بعد تو آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ یہ گریۂ بے اختیار ملک کی زندگی میں اوّل اور آخر تھا۔ زبیدہ فوراً ان الفاظ کے معنی سمجھ گئی کہ وہ رات کسی چیز سے ڈر گیا۔ لیکن یہ ملک کی معمولی ڈر نہ تھا۔ اس لئے کہ اُس کا تمام جسم بید کی طرح کانپ رہا تھا۔ اُس نے فوراً تاڑ لیا کہ گذشتہ زندگی کی برائیوں کے خیالات اُس کے دل میں چھپے ہوئے اُس کے مضبوط قوٰی کی بیخکنی کر رہے تھے۔ اور ملک اس سے بیخبر رہا۔ آج اس احساس نے ایک طرف تو دبی ہوئی محبت کو بازکردیا۔ اور دوسری طرف اس کو پیام اجل بھی سنادیا۔ دوا اور [illegible] رکھی

وقت زبیدہ کو ان باتوں کے خیال اور ان پر تاسف کرنے کی فرصت نہ تھی۔

اُس نے دروازوں اور کھڑکیوں کو کھولا۔ صبح کی سہانی روشنی سے کمرہ منور ہو گیا۔ باد نسیم کے جھونکوں کے ساتھ ہی مُلّی موذن کی آواز سنائی دی جو دن میں پانچ دفعہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ تمام بزرگی اور عظمت صرف خدا کو زیبا ہے۔ اور کوئی اُس کا شریک نہیں۔

"اللہ اکبر۔ اللہ اکبر"

صبح کی روشنی اور اس جانفزا پیام سے ملک کے چہرہ پر روشنی سی آئی۔ نبض رفتہ رفتہ درست ہو گئی اور بخار جاتا رہا۔ وہ اسی خیال سے خوش تھا کہ اُس کو صحت ہو گئی۔ مگر زبیدہ خانم خوب سمجھ رہی تھی کہ یہ صحت قبل الموت ہے۔

"اب جبکہ تمہاری طبیعت درست ہے تو مجھے تم کل کیفیت سناؤ۔ اپنی محبت کا واسطہ دیکر کہتی ہوں کہ مجھ سے تم کچھ نہ چھپاؤ۔ اس سے کہ مجھ سے زیادہ تم سے کون محبت کرتا ہے۔"

آہستہ اور دردناک لہجہ میں ملک نے اپنی کہانی سنائی۔ لیکن نقاہت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ کئی دفعہ اُس کو دم لینے کے لئے رکنا پڑا۔ اب بھی وہ یہی سمجھتا رہا کہ زبیدہ خانم نے بلا کی صورت صرف خواب میں اختیار کی تھی۔ مگر اس نے پورا قصہ بے کم و کاست سنا دیا۔ انتہا یہ کہ کرم نزان کے قتل کا واقعہ بھی بیان کیا۔ گناہ کے خیال نے اُس کو اس بات پر آمادہ کر دیا تھا کہ مصائب اور پاداش کے گہرے سمندروں سے وہ تیر کر بخشش اور نجات کی خوشنما زمین پر جا نکلے۔ تو زائیدہ نیکیوں نے اس میں ایک نئی جرأت بھی پیدا کر دی تھی۔ اور وہ ہر جھوٹ کو نہایت ہی حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اوّل تو اُس کو اپنی کمزوری اور لاعلمی کا احساس ہوا اور دوم اُس نے یہ تہیہ کر لیا کہ حیات بعد الممات میں نجات حاصل کرے۔ ان وجوہات سے اس کا ایمان خدا ارادتی اور قدم روح پر نہایت ہی مضبوط ہو گیا۔ مگر اب بھی شب کے واقعات یاد آ آ کر پریشان کرتے تھے۔ اُس نے زبیدہ سے اس کا مطلب سمجھنے کے لئے چھوٹے بچوں کی طرح بہت سے سوالات کئے۔

"میں تم کو کیسے بتاؤں؟" زبیدہ نے جواب دیا۔ "مجھے خود نہیں معلوم کہ یہ بھید کیا ہے؟ ایک آدمی جو کہ انسان کے سر سے کھیلتا ہے وہ پیاز سے کھیلنے والے آدمی کو قتل کروا ڈالتا ہے۔ اور پھر اُس کے بھوت کو قتل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ خدا اس وجہ سے اس بلا کو نازل کرتا ہے۔ اگر خدا نخواستہ تم بغیر توبہ کئے مر جاتے (اس خیال سے وہ کانپ اٹھتی ہے) تو تمہاری صورت اس بلا کی سی ہو جاتی۔ اور جس چیز کو تم دیکھ لیتے وہ بھی بلا کی صورت اختیار کر لیتی۔ ہر شخص دوسروں کو اپنے خیال کے موافق دیکھتا ہے۔ اگر غور کرو تو بھوت، موت، زندگی، ہر چیز بے حقیقت ہے (اشکوں سے بھری ہوئی خوبصورت آنکھوں کے سامنے اُس کو دنیا اپنی تاریک اور دردناک رنگ میں نظر آئی) اپنے تخیل کے موافق ہم کام کرتے ہیں۔ اور اس پر خوشی یا افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں معلوم"۔

"مگر مجھے اپنے گناہوں کی پاداش میں کیا کرنا چاہئے؟" یہ پہلا موقع تھا کہ ملک نے اپنی بی بی سے کسی ضروری بات پر صلاح لی ہو۔

"دے ڈالو" کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے اندر آجاؤ" حو بھی ہو۔ فخر الدین حکم کے ہمراہ اندر آیا۔ زبیدہ نے کہا:-

"بھائی جلدی کرو۔ مجھے ایک وصیت نامہ نہیں۔ بلکہ دستاویز لکھ دو جس کی رُو سے میرے شوہر نے تمام زمین اپنے پرانے مالکوں کو یا اُن کے وارثوں کو واپس دے دی۔ اس کا گھر اور اُس کا روپیہ گاؤں کے غربا اور یتیموں کی امداد کے لئے وقف کر دیا گیا۔ اور جو اس کے مقروض ہیں۔ ان کو وہ تمام روپیہ معاف کر دیا گیا"۔ گو زبیدہ خانم نے ایک ایک پائی دے ڈالی مگر ملک چپکا پڑا دیکھتا رہا۔ اُس کو یقین تھا کہ انصاف اب بھی پورا نہیں ہوا۔ فخر الدین دور لکھنے بیٹھ گیا۔ جب لکھ چکا اور دستخط ہو چکے تو اُس نے حکیم کو چلنے کا اشارہ کیا اور دونوں اس دستاویز کو قاضی کے پاس لے گئے۔ وہ جانتے تھے کہ ملک ہریرالدین گو موت کے منہ میں پڑا ہوا ہے۔ مگر چونکہ اُس کو صحت کا علم نہیں۔ اس لئے یہ دستاویز شرعاً باطل جائز ہے۔ اُس کی بیوی نے خود اپنے آپ کو محروم الورث کر دیا۔

زبیدہ حکیم کے کمرہ میں داخل ہوتے ہی نقاب منہ پر ڈال کر ایک کونے میں بیٹھ گئی تھی۔ اب حکیم کے جاتے ہی پھر ملک کے قریب آئی۔ ملک نے کہا "تم نے مجھ سے کہا تھا کہ جان کا کفارہ جان ہے۔ تو کیا میں اپنے آپ کو قاضی

کے حوالہ کردوں"۔ اس کو ابتک اپنی موت کا علم نہ تھا۔ زبیدہ نے جواب دیا

"مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ چونکہ اسلامی عدالت سے انصاف نہیں دیا گیا۔ اس لئے خدا نے خود ہی انصاف کردیا۔ اور اب چھپانے سے کیا حاصل کہ تم صرف تھوڑی دیر کے مہمان ہو۔ ملک کی پریشان نگاہوں سے بچنے کے لئے اُس نے اپنا منہ ہاتھوں سے چھپانا چاہا۔ ملک بدر الدین اسی طرح خوش وخرم اطمینان کے ساتھ لیٹا رہا۔

"اللہ کا شکر ہے۔ اب زندگی میرے لئے وبال ہوگئی۔ میں آرام کا خواہشمند ہوں۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے زندگی اُس کی مایوسیاں اور اُس کی کشاکش سب کا خاتمہ چند لمحوں میں ہوجائے گا۔ دیکھو! اس نے مشرق کی طرف نگاہ اُٹھائی۔ تمہاری چشمِ گریاں پوری اُتری۔ سورج کی پہلی کرن میرے اوپر سے زندگی کے بوجھ کو اُتار رہی ہے۔ مگر صرف ایک بات کا افسوس ہے۔ وہ یہ کہ اب جبکہ تم سے محبت شروع ہوئی تو تم سے اتنی جلدی جدا ہو رہا ہوں۔ یہ خیال بہت تکلیف دہ ہے۔ میرے بعد تم کیا کروگی اور کس طرح زندگی بسر کروگی"۔ مستقبل کے خیال سے پریشان ہو کر اُس نے زبیدہ خانم کا ہاتھ نہایت ہی مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"آپ فکر نہ کریں میں شہد کی مکھیوں کی طرح زندگی بسر کردوں گی۔ جو پھولوں سے شہد لیتی ہیں تو اُن کو تباہ نہیں کرتیں۔ مادۂ تولید بھی دے جاتی ہیں۔ یعنی کہ میں محنت کروں گی اور زندگی کے دن کاٹ دونگی۔

جب فخرالدین قاضی کے پاس سے واپس آیا تو اُس نے اپنی ہمشیرہ کو اپنے مرحوم خاوند کی پٹی پکڑے ہوئے پایا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں کوئی چیز ایک ریشمی رومال میں بندھی ہوئی تھی۔ اور آنکھوں سے طوفان اشک جاری تھا۔

"وہ تو چل بسے اب میں یہاں رہ کر کیا کروں۔ تجہیز و تکفین کا انتظام آپ کر دیجئے"۔ اپنے مرحوم خاوند کے چہرہ پر سے چادر سرکا کر وہ کچھ دیر تک سکوت کے عالم میں دیکھتی رہی۔ پھر یکبارگی کوشش کرکے اُس نے اپنے آپ کو وہاں سے ہٹایا۔ اس سے پہلے کہ اُس کا بھائی اُس کو روک سکے۔ وہ کمرہ سے باہر نکل کر سیڑھیوں سے اُتر چکی تھی۔

فخرالدین نے انتہائی کوشش کر ڈالی۔ مگر زبیدہ خانم کا کہیں پتہ نہ چلا۔

باب ہفتم

ان واقعات کو دو برس کا عرصہ گزر چکا تھا۔ کہ ایک دن فخرالدین صبح اُٹھ کر تفریح کے لئے اپنے گھوڑے پر روانہ ہوا۔ چونکہ کسی خاص جگہ جانا نہ تھا اس لئے جدھر منہ اُٹھا چل دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ دہلی کے اُس حصہ میں پہنچ گیا جہاں عام طور پر غربا کے مکانات ہیں۔ فخرالدین علم کا دلدادہ شیدا تھا۔ اس نے ملک کے مرنے اور بہن کے گم ہوجانے کے بعد اُس نے سوچا کہ دنیا میں تو اب کوئی رہا نہیں جس سے محبت کی جائے۔ تو اب یہی بہتر ہے کہ زندگی طلب علم میں بسر کردی جائے کہ علاوہ خیر و برکت کے اس کا قدرتی رجحان بھی اس طرف تھا۔ ہم خرما و ہم ثواب۔ اس نے دہلی سے بہتر شہر سکونت کے لئے نہیں ہوسکتا تھا کہ جہاں شہنشاہ کی مقناطیسی کشش سے کھنچ کر ملک کے علما آتے تھے۔ اور یہیں بود و باش کرلیتے تھے۔ چنانچہ دہلی آکر فخرالدین نے کئی علما سے راہ رسم پیدا کرلی۔ اور اُن کے حلقۂ اثر میں شامل ہونے کا اُس کو شرف حاصل ہوا۔ اس علم کی کان میں آکر وہ رنج و الم ایک حد تک بھول گیا۔ مگر خدا جانے کیا وجہ تھی کہ آج وہ بغیر کسی ظاہری وجہ کے مغموم رہا اور دہلی میں پہلی دفعہ اس کا دل گھبرایا۔ شادی اُس نے ابتک نہ کی تھی۔ تنہائی ہر جگہ اُس کے ساتھ ساتھ تھی۔ اور آج نہیں معلوم کیوں پرانے زمانہ کی یاد آ آ کر اُس کے دل کو مسل رہی تھی۔ زندگی آج بالکل بے معنی اور بار عبث معلوم ہو رہی تھی۔ ان خیالات میں وہ اتنا مستغرق تھا کہ لگام بھی اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور گھوڑے کو کامل آزادی مل گئی کہ جہاں چاہے جائے۔ اور جس رفتار سے چاہے چلے۔ چلتے چلتے گھوڑا ایک نہایت ہی تنگ و تاریک گلی میں مُڑ گیا۔ فخرالدین اپنے خیالات میں اتنا محو تھا کہ اُس نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس تنگ گلی میں جانے سے کیا فائدہ؟ شاید وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔

یہ وہ گلی تھی جہاں دہلی کے مزدور اور قلی رہا کرتے تھے۔ جن کے لئے صبح مشقت اور تکلیف کا پیام لاتی اور شام دن بھر کی محنت کے بعد اتنی قلیل مزدوری جس سے پیٹ بھی پوری طرح نہیں بھرتا۔ شہر کے امرا کے آرام اور عیش سے بے نیاز وہ زندگی کے فضول اور تکلیف دہ بوجھ کو سال بسال اور دن بدن کھینچتے تھے آرام کی لذتوں سے بے خبری۔ زہد و تقویٰ۔ اور آنے والی زندگی

کا خیال جہاں پر امیر و غریب کو اپنے اعمال کی سزا یا جزا ملے گی یہی وہ چیزیں تھیں جن کی وجہ سے وہ تمام تکالیف اور مصائب کے باوجود یہ لوگ صبر اور شکر سے زندگی کے دن کاٹ رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف نیچے نیچے جھونپڑے بانس کے بنا کر ان پر مٹی تھوپ دی گئی تھی ان مکانوں کے مکین دن بھر کی محنت کرنے کے بعد آ کر ان میں شام کو پڑ جایا کرتے تھے۔ ان مکانوں کے بیچ میں آوروں کے مقابلہ میں سب سے خراب ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ اس کی مٹی کی دیوار قریب قریب برسات میں بہ گئی تھی۔ اس کے سامنے چند سفید پوش آدمی جمع تھے ●

"کیا بات ہے؟" فخرالدین نے چلتے چلتے پوچھا ●

"کوئی خاص بات نہیں" ایک سفید پوش سفید ریش بڈھا اپنے عصا کو ٹیک کر اٹھا۔ اور اس نے جواب دیا۔ ایک گمنام سی عورت اس مکان میں رہا کرتی تھی کل شب اس کا انتقال ہو گیا۔ مچھلیاں بیچ کر وہ اپنا گذارہ کرتی تھی۔ علی الصباح اٹھ کر وہ ماہی گیروں سے مچھلیاں خرید کرتی تھی اور تمام دن دہلی کے بازاروں میں گھوم پھر کر ان کو بیچتی۔ شام کو واپس آ کر اپنا کھانا پکایا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ ہم لوگ اس مرحومہ کے بارہ میں کچھ نہیں جانتے۔ نہ تو کوئی اس کا رشتہ دار تھا نہ کوئی جان پہچان اور نہ کوئی اس کا دوست۔ کسی اچھے خاندان سے ضرور اس کا تعلق ہوگا۔ اس لئے نقاب ہمیشہ اس کے چہرہ پر رہا کرتی تھی۔ اور کسی نے اس کی صورت آج تک نہیں دیکھی۔ وہ کس ملک سے آئی ہم اتنا ہی کم جانتے ہیں جتنا کہ اس ملک کی بابت ہمارا علم محدود ہے جہاں کہ وہ اب چلی گئی" بڈھے کی آنکھیں سخت کوشش کے باوجود اشکوں سے نم تھیں۔ اور سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے اپنی کانپتی ہوئی آواز میں وہ کہنے لگا۔

ایک زمانہ تھا کہ میں بھی صاحب اولاد تھا۔ میری لڑکی نہایت ہی خوبصورت تھی۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی تھی۔ اور اس مرحومہ کی طرح وہ بھی کہیں لاوارث مر گئی ہوگی۔ شریف اجنبی! نماز جنازہ کا وقت آ گیا ہے۔ ذرا ٹھیرو۔ اور اس مرحومہ کی بخشش کی دعا کرو۔ دنیا کا کام تو چلتا ہی ہے۔ پھر لینا"

فخرالدین مرکب پر سے اترا۔ لوگ اس کو راستہ دینے کے لئے ہٹ گئے۔ کوٹھری جس میں فخرالدین داخل ہوا۔ تنگ و تاریک ہونے کے علاوہ بمشکل سے تین گز مربع ہوگی۔ ایک کونے میں مٹی کا چولھا بنا ہوا تھا۔ اور اس کے پاس سیلی ہوئی زمین پر ایک کمبل میں لپٹی ہوئی وہ مرحومہ پڑی ہوئی تھی۔ اس کے قدموں کے پاس ریشمی رومال میں بندھا ہوا اس کا تمام دنیاوی اثاثہ تھا ●

اس رومال کو دیکھ کر فخرالدین کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا۔ کانپتی ہوئی انگلیوں سے اس نے رومال کو کھولا۔ اندر چیز جس نے کہ اس کے تار نگاہ کو کسی منٹ تک جذب کئے رکھا۔ وہ ایک چاندی کی انگشتری تھی جس پر گلاب کا پھول منقش تھا۔ سات آٹھ برس آن واحد میں واپس چلے گئے اور فخرالدین کی آنکھوں میں وہ سماں پھر گیا۔ جبکہ اس کی ماں نے اپنی بیٹی کی شادی کے وقت یہ انگوٹھی اس کو تحفہ میں دی تھی ●

فخرالدین کے منہ سے ایک زور کی چیخ نکلی اور وہ بے تاب ہو کر لاش کے پاس آیا۔ کمبل منہ پر سے سرکاتے ہی دیکھا کہ زبیدہ خانم کے لبوں پر مسکراہٹ ہے اور وہ ہمیشہ کی نیند آرام سے سو رہی ہے ●

ہمیشہ رہے نام اللہ کا ●

(ترجمہ)

محمد عطاء الرحیم ایم اے۔ ایل ایل بی (علیگ)

سیّد سجاد حیدر

(از جناب سید اظہار الحسن صاحب بی اے ایل ایل بی۔ وکیل)

ادیب جمیل سید سجاد حیدر بی۔اے نہٹور ضلع بجنور کے ایک ممتاز خاندان سادات کے چشم و چراغ ہیں جس کے اکثر افراد صاحب عزت و حشمت ہیں لیکن جو شہرت اور عزت سید سجاد حیدر کو حاصل ہوئی۔ وہ کسی دوسرے کا مقدر نہ تھی۔ بچپن کے حالات زیادہ معلوم نہیں لیکن کالج میں پہنچنے کے بعد ہی سے بقول حضرت سعدیؔ بالائے سرش ز ہوشمندی، ستارہ بلندی چمکنے لگا تھا۔ شبلیؒ جیسے باکمال استاد اور مولانا محمد علی اور حسرت موہانی جیسے صاحب ذوق رفیقوں کے فیض صحبت نے سید صاحب کی ہونہار طبیعت کے ساتھ سونے پر سہاگہ کا کام کیا اور بالآخر سید صاحب نے دنیائے ادب میں وہ پذیرائی حاصل کر لی جس پر ہر ایک ادیب کو بجا طور پر ناز ہو سکتا ہے ✦

آپ کی شادی ضلع بلند شہر کے ایک معزز خاندان میں ہوئی ہے۔ اور اردو ادیبوں میں یہ فخر تنہا آپ کو حاصل ہے کہ آپ کی بیگم صاحبہ بھی دنیائے ادب میں بلند مرتبہ رکھتی ہیں۔ محترمہ نذر سجاد صاحبہ عالم نسواں کا ایک گوہر درخشندہ ہیں اور ادب اردو متعدد تصانیف کے لئے آپ کے رشحات قلم کا ممنون ہے ✦

علی گڑھ کالج نے اپنے پچپن سالہ دور حیات میں جتنے باکمال پیدا کئے۔ اُن میں سید صاحب کا درجہ بہت ممتاز ہے کالج کی زندگی آپ نے نہایت ناموری کے ساتھ گزاری۔ انجمن اردوئے معلیٰ اور یونین وغیرہ کی خدمات آپ سے وابستہ رہیں۔ شاعری کا آغاز بھی اسی زمانہ سے ہوا۔ اور کالج کی چہل پہل اور روایتوں کے درمیان اُس کی پرورش ہوئی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد آپ برطانوی سفارتخانہ سے متعلق ہو کر بغداد تشریف لے گئے۔ لیکن ادبی ذوق نے وہاں بھی اس غریب الوطن کا ساتھ نہ چھوڑا۔ "زیارت ام از بغداد" کے اکثر مضامین ہندوستان کے اردو رسایل بڑے فخر سے شائع کرتے رہے۔ تبیع الملک کا ماتم ارض عراق نے کیا۔ "بنزئی جاپان بنزئی" کی مشہور رزمیہ نظم بھی سواحل دجلہ و فرات کے حصہ میں آئی ✦

علی گڑھ کالج کے سابق طلبہ کو جو وابستگی اپنی مادر تعلیمی کیساتھ ہوتی ہے وہ کچھ انہیں کے لئے مخصوص ہے۔ سید صاحب کو بھی اُلفت کالج سے بہرہ وافر ملا ہے۔ جس کا اظہار مختلف پہلوؤں سے ہوتا رہتا ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے آغاز سے سال گزشتہ تک آپ رجسٹرار اور شعبہ اردو کے اعزازی ریڈر رہے اسی دوران میں آپ نے مرحوم اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے حق میں مسیحائی کی۔ نہ صرف ایسوسی ایشن مذکور آپ کی ان تھک کوششوں سے از سر نو زندہ ہو گیا بلکہ اُس کی اپنی "لاج" بھی واپس مل گئی۔ اسی زمانہ میں آپ ممالک ترکیہ کی سیاحت کے واسطے تشریف لے گئے۔ وہاں کے اکثر مشاہیر سے آپ کے دوستانہ تعلقات ہیں ✦

سید صاحب مغربی تہذیب کو پسند فرماتے ہیں۔ لباس قطعی انگریزی ہوتا ہے۔ البتہ کبھی کبھی ترکی ٹوپی زیب سر فرما لیتے ہیں۔ طرز معاشرت میں بھی انگریزی تہذیب کی جھلک بہت نمایاں ہے قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمایئے کہ آپ ایک ایسے محکمے سے وابستہ کر دیئے گئے جس سے آپ کی ادب دوستی کو قطعی کوئی مناسبت نہیں۔ یعنی آپ ڈپٹی کلکٹر ہیں ✦

معارف (علی گڑھ) اردوئے معلیٰ۔ مخزن (دور اول) زمانہ علی گڑھ میگزین۔ ہمایوں سہیل اور نیرنگ خیال کے صفحات اکثر آپکے

نوکِ قلم سے مزین ہوتے رہتے ہیں۔ "خیلستان" "حکایات و اقتباسات" "ثالث بالخیر" "زہرا" اور "جلال الدین خوارزم شاہ" آپ کی مستقل تصانیف ہیں۔ خیلستان اور حکایات آپ کے متفرق مضامین اور افسانوں کے مجموعے ہیں ان میں سے بعض طبعزاد ہیں۔ اور بعض ترکی وغیرہ سے ملخص اور ماخوذ۔ "جلال الدین خوارزم شاہ" مشہور ترکی ادیب نامق کمال بے کے معرکۃ الآرا ڈرامہ کا بے مثل ترجمہ ہے۔ "ثالث بالخیر" اور "زہرا" بھی ترکی کے تراجم ہیں۔ اگرچہ سید صاحب فنِ شعر میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے ہیں لیکن اس صنف میں ہنوز کوئی مستقل تصنیف آپ کی شایع نہیں ہوئی ہے۔ اور نہ غالباً آپ ایسی کوئی تصنیف شایع کرنا پسند فرماتے ہیں۔

میر سوز مرحوم نے ایک دفعہ شاعروں کی کثرت کے سلسلہ میں کہا تھا ؎

ڈھونڈھتے ہیں پر تخلص بھی نیا ملتا نہیں

سید صاحب نے اس مقولہ کو بالکل غلط ثابت کر دیا ہے۔ کم از کم میری نظر سے نہیں گزرا کہ اردو کے کسی اور شاعر کا تخلص "یلدرم" ہو اس سے آپ کی جدت پسندی کے علاوہ اس شغف کا بھی اظہار ہوتا ہے جو آپ کو ترکی زبان و ادب سے ہے +

سید صاحب ہندوستان کی ان چند معدودے ہستیوں میں سے ہیں جن کو ترکی زبان و ادب میں دستگاہ حاصل ہے۔ آپ نے ترکی ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ترکی ادیبوں کے دلکش اور اچھوتے خیالات نے سید صاحب کی بیچین طبیعت پر خاص اثر کیا۔ یہاں تک کہ ترکیت نے آپ کی تصانیف میں مرکزی حیثیت حاصل کر لی۔ اردو داں طبقہ کو ترکی ادب سے روشناس کرانے کا فخر تنہا سید صاحب کو حاصل ہے۔ آپ کے بیشتر مضامین اور تصانیف ترکی سے ماخوذ و ملخص ہیں +

اب سے کچھ عرصہ قبل اردو میں ادب لطیف کا عنصر بالکل نہ تھا۔ یا نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس معاملہ میں بھی اب ار دو یلدرم کا ممنون ہے۔ اس رنگ کو سچ پوچھو تو آپ نے چار چاند لگا دیئے بقول ایک ناقد کے

"اس وقت ملک میں جتنے نمونے ادب لطیف کے موجود ہیں ممکن ہے ان کے متعلق اختلاف آرا ہو سکے۔ لیکن سید صاحب کی تصانیف کے متعلق کبھی دو رائیں نہیں ہو سکتیں"+

سید صاحب ایک مخصوص رنگ کے مالک اور صاحبِ طرز استاد ہیں۔ آپ کا تتبع آسان کام نہیں اور یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص آج تک آپ کی کامیاب تقلید نہ کر سکا آپ کی عبارت نہایت صاف، شگفتہ، پُر زور اور دلچسپ ہوتی ہے۔ کوئی مضمون یا افسانہ اٹھا لیجئے ناممکن ہے کہ آپ اس کو ختم کئے بغیر چھوڑ دیں۔ جملوں کے اندر روانی اور جوش کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سلاست بھی ہاتھ سے جانے نہیں پاتی۔ موقع اور محل کا لحاظ بھی رہتا ہے۔ بندش بھی چست ہوتی ہے۔ اندازِ بیان کی رنگینی عبارت کو اور بھی دلاویز بنا دیتی ہے۔ غرض آپ کی تحریریں انشا پردازی کی جان اور فصاحت و بلاغت کا اچھا نمونہ ہوتی ہیں +

آپ کے مضامین تخیل سے مالا مال ہوتے ہیں۔ آپ جس خیال کو لیتے ہیں اس کی مکمل تصویر ناظرین کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ پڑھنے والا یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ اسی ماحول میں ہے جس میں کہ خود مصنف ہے اور یہی تصنیف کا کمال ہے۔ ذیل میں آپ کے مضمون "ہجوم میں تنہائی" سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

"دوست دوست سے، محبوبہ عاشق سے یا بالعکس محبوبہ عاشق سے جدا ہو رہا ہے۔ اپنا ئے جا رہے ہیں گلدستے پیش کئے جا رہے ہیں۔ لنگر اٹھا۔ جہاز آہستہ آہستہ ساحل سے ہٹنا شروع ہوا۔ رخصت کرنے والوں کی ساحل اور ڈوک پر صفیں کھڑی ہو گئیں۔ رومال کبھی آنکھوں پر جاتے ہیں کبھی ہلتے ہیں۔ کوئی مسکرا مسکرا کر جانے والے کو ساحل پر بلا رہا ہے۔ جانیوالا ساحل

کہ دوست کو اشارے سے ڈک پر آنے کی دعوت
دیتا ہے۔ پرنشہ وداع ' حزین فراق دونوں یہاں موجود
ہیں۔ جہاں ہر طرف مصافحے ' معانقے ہو رہے ہوں۔
وہاں اپنا ہاتھ جیب میں ہونا بھی دل پر عجیب اثر
کرتا ہے۔ میں ہجوم میں تنہا ہوں" +

"ان سینکڑوں رومالوں میں سے میرے لئے
ایک بھی جنبش نہیں۔ اور نہ میرا ہاتھ رومال کو اسکے
آرام کی جگہ سے کسی کے لئے باہر لانے کی کوشش
کرتا ہے" +

"جس طرح کسی دوسرے سیارہ کا باشندہ ہمارے حرکات
کو بے پروایانہ انداز سے دیکھتا ہوگا۔ اسی طرح میں
اس ہجوم کی حرکات پر نظر ڈال رہا ہوں۔ انداز بے
پروایانہ ہو۔ مگر نظر رشک آمیز ہے" +

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ محض چند جملوں میں اس زبردست ادیب نے
کتنی کامیابی سے مصوری کی ہے۔ جہاز کے ساحل چھوڑنے کی مکمل
تصویر پیش نظر ہو جاتی ہے۔ کیا " ہجوم میں تنہائی" کی اس سے بہتر
مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ آخری فقرہ بجائے خود ایک تصویر ہے +

مزاح ( ) کا عنصر بھی آپ کے
مضامین میں بہت نمایاں ہوتا ہے۔ اور جس خوبی سے آپ اس کو
نباہتے ہیں وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ ظرافت کے پیرایہ میں واقعات
کا نقشہ کھینچنا بلکہ فطرت کی مصوری کرنا آپ کا خاص انداز ہے۔ لیلیٰ
مجنوں کے واقعات بہت فرسودہ ہو گئے ہیں۔ اور اب ان میں لطف پ
یدا کرنا آسان کام نہیں۔ لیکن سید صاحب نے "اسیرِ آلام
جاہلیت" کے دسار کو کچھ اس طرح سے بیسویں صدی کے "متمدن" دور
سے متعلق کر کے پیش کیا ہے کہ بے ساختہ ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا ہے
شاید لیلیٰ مجنوں پڑھئے اور سید صاحب کے کمال کی داد دیجئے جس میں
یونانی تھیٹر مغربی کلاس زمانہ میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ خاص

طور پر قابل التفات ہے۔ ہر افسانہ کا اقتباس پیش کرنا اور اصل متن
پر ظلم کرنا ہے۔ اس کا لطف اٹھانا ہو تو "خیالستان" ملاحظہ فرمائیے
لیکن میں اس کا آخری جزو یہاں پیش کرتا ہوں جس سے سید
صاحب کی شاعرانہ انشا پردازی کا اندازہ ہو سکیگا +

"قیس کا باپ اپنے "دنیا کی نظر میں دیوانے" بیٹے
کی حالت سے مایوس ہو کر اجابت دعا کی امید میں
آیا۔ وہاں آیا۔ جہاں ہر شخص اپنی عزیز ترین تمنا
لے کر آتا ہے۔ اور جہاں جس ورد کے سامنے "جس چھت
کے نیچے سب سے زیادہ صمیمی، سب سے زیادہ دلی
دعائیں مانگی جاتی ہیں" پیار یا، سب سے زیادہ
قوی امید اجابت کے ساتھ تخت مادی کی طرف جاتی
ہیں (اور نہ مصیبت تو دنیا کے ہر گوشہ میں فریاد قلب
کر رہی ہے) وہاں وہ اسے لیکر آیا تھا۔ خو خشوع و
خشوع سے دعا مانگی اور قیس سے بھی کہا کہ اپنی قابل
رحم حالت سے نجات پانے کے لئے دستِ دعا
اٹھائے" +

"اور قیس نے دستِ دعا اٹھائے۔ اور انتہائے
مصیبت' غایت تضرع سے' اعماق دل سے نکلنے
والی صدا سے' دعا مانگی" مگر کیا؟ وہی جو اس نے
سیکڑوں برس پہلے مانگی تھی۔ اور جو ہر قیس طبیعت جو
وہ کہیں ہو اور کسی زمانہ میں ہو' مانگیگا:-
"میں جس مصیبت میں مبتلا ہوں' خدا کرے وہ کبھی کم نہ ہو"

سید سجاد حیدر قدرت کی طرف سے گداز دل لے کر آئے ہیں۔ فطرت
نے آپ کو شاعر پیدا کیا ہے۔ اور شعریت آپ سے جدا نہیں ہو سکتی
آپ نے نثر میں بھی شاعری کی ہے "خارستان اور گلستان" ہو
یا "دل کی سوانح عمری" جو انھوں نے اپنے کاتب خصوصی سید سجاد
حیدر سے لکھوائی۔ پڑھئے کیا آپ اس کو شاعری نہ کہیں گے +

حضرت دل فرما رہے ہیں:۔

"دوسری حسین اور خوبصورت چیز جس نے مجھے اپنی طرف کھینچا وہ شمع تھی۔ یہ نو عروس مجھے گھنٹوں محو رکھ سکتا تھا۔ اور کہیں قریب ہوا تو میں اُس سے ملنے کے لئے بے اختیار اُس کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا"

"لیکن یہ کیا! مجھے روکتے تھے۔ کیوں! کیوں مجھے اس حسین شے سے ملنے نہیں دیتے تھے؟ اس لئے کہ پہلی کی طرح ہر حسین شے شفیق نہیں۔ یہ حقیقت ہے لیکن حقیقت مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ اچھا ہوتا جب ہی معلوم ہو جاتی"

غالباً یہ عبارت کسی ڈرامے سے کم دلچسپ نہیں۔ جناب دل اپنا مغرب کا تجربہ یوں بیان فرماتے ہیں:۔

"مگر مغرب میں سب سے زیادہ ظالم (فریاد۔ فریاد ان کے ستموں سے) وہ تھے جو تیر مارتے تھے۔ برچھیاں کھبوتے تھے۔ لیکن جب میں شکایت کرتے تھے تو صاف مکر جاتے تھے "ہم نے نہیں مارا" پہلے تو میں اسے بناوٹ سمجھا۔ ملتجی نظروں سے اُن کی طرف دیکھا اور عرض کیا "میں آپ کو جھوٹا نہیں بنانا چاہتا لیکن میں نے دیکھا کہ آپ نے تیر مارے""

"میری ملتجی آنکھوں کا اُن آنکھوں سے ملنا تھا کہ سینکڑوں ہزاروں تیروں کی پے در پے بوچھاڑ پڑنے لگی۔ مگر ان کو اس وقت عین اس بوچھاڑ کے وقت بھی اپنی بے تقصیری پر اصرار تھا"

"یہ ہم پر بہتان ہے۔ تیر ویر کیا (اور آنکھوں میں آنسو بھر لا کے) ہم کچھ نہیں جانتے۔ اور ہزاروں تیر برسا دیئے۔ تمہارا ستھ۔ زخمی کیوں نظر آتے ہو۔ کس نے گھایل کیا؟"

اور ایک نظر۔ ایک ترحم انگیز اور ہوش ربا نظر۔ ڈالی تو ایک لاکھ برچھیوں نے مجھے چھلنی کر دیا"

"ہے ہے! اسقدر تڑپو۔ کس بے رحم نے تمہیں خون میں شرابور کر دیا۔ مگر نجریا کی کٹوریاں سے اور بچکے لگا دیئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ حقیقت میں انہیں اپنے ظلموں کی خبر نہیں۔ تیروں کی بوچھاڑ ہو جاتی نہیں کی جاتی بلکہ آپ سے آپ ہوتی رہتی ہے۔ اُف! اُف! خدا ان تیر اندازوں سے پناہ۔ ڈالے کھلے بند فراق زخم لگا کے بھاگ جانے والے "فراق" یا "ٹھگ" ان سے میں سینہ سپر ہو سکتا ہوں اور ہوا ہوں۔ لیکن اس تیسری صنف سے تاب مقاومت نہیں! نہیں بالکل نہیں"

میں نہیں سمجھ سکتا کہ شاعری میں اس سے زیادہ کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اگر یہ شاعری نہیں تو کیا ہے؟

آپ کے مضامین کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کو اپنے گرد و پیش کے حالات پر گہری نظر ڈالنے اور معمولی معمولی واقعات سے اہم نتائج اخذ کرنے کی عادت ہے۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ "انسان کے لئے بہترین مضمون مطالعہ خود انسان ہے" سید صاحب نے بھی اس "مرزا مجنون" کا خوب مطالعہ کیا ہے۔ "چڑا چڑیا چڑے کی کہانی" سب نے اپنے بچپن میں سنی ہوگی۔ سید صاحب نے بھی یہ کہانی اپنے مخصوص طرز میں لکھی ہے۔ اس سے جہاں آپکی جدت پسندی، انوکھے طرز بیان اور زبان پر قدرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے فطرت انسانی کا کتنا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ دو بے زبان جانوروں کی زبانی جبلت انسانی کو بے نقاب کر دیا ہے۔ "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" کسقدر دلکش مضمون ہے کتنا دلفریب انداز بیان ہے۔ کیا یہ آپ کا روزمرہ کا تجربہ نہیں کہ "دوستوں" میں آپکا کسقدر وقت ضایع ہوتا ہے۔ بعض اوقات کتنا بے محل دخل در معقولات

آپ کے نظام میں دیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی آپ خود بھی پریشان ہو جاتے ہیں لیکن آپ مجبور ہیں۔ آپ کو سب برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اور اگر اس پر بھی آپ دوست نہیں ہیں تو آپ خود کو بدقسمت سمجھیں گے یہ ہی معمولی باتیں ہیں جن کو سجاد حیدر نے اپنے اچھوتے انداز میں پیش کر دیا ہے۔ سرسید علیہ الرحمہ نے بھی ایک مضمون میں مہمان نوازی کے طریقوں پر نکتہ چینی کی تھی۔ لیکن دونوں میں فرق محض اتنا ہے کہ سرسید کا مضمون کسی زاہد خشک کا وعظ ہے۔ اور سجاد حیدر کا فسانہ کسی زندہ دل کا چبھتا ہوا فقرہ۔ آپ خود خیال کر لیجئے کہ اثر کس کا زیادہ ہوگا +

محترمہ ز۔ خ۔ ش صاحبہ ضلع علی گڑھ کے مشہور سادات خاندان کی ایک رکن اور دورِ موجودہ کی ایک باکمال اور ادب نواز خاتون تھیں جنھوں نے عین عالم شباب میں سفر آخرت اختیار فرمایا۔ اس سانحۂ جانگزا سے جو ناقابل تلافی نقصان ادب اردو کو پہنچا اُس نے سید صاحب کا قلم اٹھا دیا اور حسن عقیدت کے یہ پھول "ہمایوں" کے صفحات پر بکھیر دیئے گئے +

"وہ عندلیب خوش الحان جس کے عرفاں پاش نغمے اس کے قفس کی تیلیوں سے نکل نکل کر ایک عالم کو مسحور کر رہے تھے یکایک خاموش ہو گئی نغمے فضا میں منتشر ہیں۔ مگر عندلیب ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ساکت وہ حقیقت طراز مگر شیریں آواز سراپردۂ دولت کے پیچھے سے (جہاں سے بے معنی خندہ اور فضول مکالمہ کے سوا کچھ کم سنائی دیتا ہے) سنا رہی تھی کہ صدق و صفا، علم و عرفان، سوز و التہاب، درد و گداز کیا ہیں۔ اور صدق و صفا، علم و عرفان، درد و گداز سوگوار ہیں کہ اُن کی مشاطہ اُن کو دلآویز آرائشوں میں اب پیش نہ کرے گی +

وہ ایک عندلیب تھی جو قفس میں پیدا ہوئی قفس میں جی۔ اور اُس نے قفس ہی میں دم توڑا۔ اس چند گز نیلگوں آسمان کے سوا جو اُس کے صحن خانہ پر حسرت بار رہا۔ اُس نے فطرت کی زیبائش، آفریدہ دست انسان کی آرائش نہ دیکھی۔ آفتاب جو دنیا کو حرارت بخشتا ہے۔ تیلیوں کے لپٹے ہوئے کپڑے سے گزر نہ سکا لیکن خود اُس کے قلب منور نے ایک شمع روشن کی جس نے اُسے باہر کے نور سے بے نیاز کر دیا۔ شمع تخیل؛

وہ اپنی مختصر مگر متجلی زندگی میں اپنے تئیں "خاک نشین ز۔ خ۔ ش" کہا کی۔ آج حقیقتاً وہ خاک نشینی کی آرزومند آسودۂ خاک ہے ع

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

مرزا داغ اور امیر مینائی کے مرثیے نظم میں ہیں۔ مگر آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ یہ مرثیہ نثر یہ بھی کسقدر پرسوز و تاثیر ہے۔ خاتون مرحومہ کی حیات اور تصانیف پر ایک مجمل مگر مکمل تبصرہ ہے۔ بندشوں کی چستی اور موزونیت۔ الفاظ کی برجستگی، عبارت کی بے ساختگی اور روانی سب نے مذکورہ مرثیہ کو کتنا پر اثر بنا دیا ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے ایک دفعہ مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر کی تعریف اپنے ایک شعر میں اس طرح فرمائی تھی ؎

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں بھی مزا نہ رہا

ابوالکلام کی نثر میں کس کو کلام ہو سکتا ہے لیکن اس میں بھی کچھ شبہ نہیں کہ "حسرت" کے رفیق التعلیم یلدرم کی نثر بھی نظم پر فوقیت رکھتی ہے +

"ثالث بالخیر" "زہرا" اور "جلال الدین خوارزم شاہ" ترکی تراجم ہیں اور اُن کا کمال یہ ہے کہ تراجم معلوم نہیں ہوتے۔ کہ اس میدان میں سید صاحب کو خاص مہارت ہے۔ ترکی سے جس قدر نفیس ترجمہ آپ کرتے ہیں وہ آپ اپنا جواب ہے۔ اُن نہیں جاملہ

ترجمہ میں اصل کا لطف باقی نہیں رہا کرتا۔ مگر سید صاحب بعض اوقات ترجمہ کو اصل سے زیادہ دلچسپ بنا دیتے ہیں "جلال الدین خوارزم شاہ" سید صاحب کا تازہ کارنامہ ہے۔ ترکی میں اس ڈرامہ کو کلاسکس کی حیثیت حاصل ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اردو میں بھی اس کی یہ حیثیت برقرار رہیگی اُردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ اس میں ابتک بلند پایہ ڈراموں کی بہت کمی ہے۔ عامیانہ مذاق کے ایک دو نہیں درجنوں ڈرامے موجود ہیں لیکن ذوق صحیح مفقود ہے۔ اور بعض قابل تعریف مستثنیات کو چھوڑ کر قومی خدمت کا خیال مفقود۔ اس طوفان بدتمیزی میں سید صاحب کی یہ کاوش مستحق ہزار تحسین ہے ✦

خدا اس زندہ دل ادیب کو عمر دراز ارزانی فرمائے کہ اسکی ذات سے اُردو ادب کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ کاش ارباب مسلم یونیورسٹی کو اتنی توفیق ہو کہ وہ سید صاحب کی خدمات اُردو ریڈری کے لئے حاصل کریں۔ ایسے لوگ روز روز نہیں ملا کرتے ✦

یاد رکھنا فسانہ ہیں یہ لوگ

محمد اظہار الحسن بی اے

"عشق پروانہ سے سیکھ"

بیاض صبح نے کمال رعنائیوں کے ساتھ اُفق مشرق سے اُٹھ کر ایک عالم کو اپنی جلوہ ریزیوں سے منور کر دیا تھا۔ نسیم صبح نونہالان چمن سے اٹھکھیلیاں کر رہی تھی۔ قدرت کی نور پاشیوں سے صحن چمن موتیوں سے بھرا ہوا تھا۔ چمن کی رنگینیاں دیکھ کر چشم نرگس واقعی پھول جامے میں نہیں سماتے تھے، نمو سحر شفق کی سرخیاں برساتی بادلوں کا ہجوم عجب دلکش منظر پیش کر رہا تھا۔ نوا سنجان چمن سرشار جلووں سے نغموں میں گم تھے کہ ایک بلبل ہزاروں تمنائیں دل میں لئے ہوئے جوش محبت کے ساتھ پرواز کرتی ہوئی ایک غنچہ کے پاس آکر بیٹھ گئی اور خاص زبان رازمیں "درد بھرے" لہجے سے داستان غم کی ابتدا کی ✦

یہ بات غنچہ کو ناپسند آئی اور چلتی ہوئی نسیم سے بلبل کے بارے میں کچھ سرگوشی کی۔ بلبل کو یہ متکبرانہ انداز گراں گزرا اور اُس نے کہا ؎

نازکم کن کہ در ایام بسے چوں تو شگفت

غنچہ کو یہ سننا تھا کہ بے ساختہ ہنسی آگئی اور کہا اے بلبل مجھے تری راست گوئی ہرگز ناگوار نہیں۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ دربار حسن میں سخت کلامی جائز نہیں، ابھی تیرا عشق خام ہے جا اور "حقیقی" پروانہ سے سیکھ" ✦

محمد عبید اللہ غزنوی

(منشی فاضل)

ایسے کو تیسا

(ایک مزاحیہ مضمون)

از جناب چودھری سراج الدین احمد صاحب

ٹھا ٹا ٹا ٹا ٹن ٹن

یہ گھنٹا اسٹیشن سے ۱۱ اپ پنجاب ایکسپریس کی روانگی کی گھنٹی تھی۔ انجن سیٹی دے رہا تھا۔ گاڑی کی سبز اجازتی جھنڈی کے دکھانے پر دائیں بائیں ہل رہی تھی۔ چھابڑی فروش نصف گھنٹہ کی پیہم چیخ پکار کے بعد گاڑی کے سنٹر سے ہٹ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ فیشن ایبل جنٹلمین جو گاڑی کے سٹیشن پر ٹھیرنے کی صورت میں بیکے سرجیبوں میں ہاتھ ڈالے پلیٹ فارم پر مٹر گشت کے عادی ہوتے ہیں۔ بھاگم بھاگ اپنے ڈبوں میں گھس رہے تھے۔ ٹرین آہستگی کے ساتھ سرکی اور ایک لنگی پوش پٹھان کا سرخ و سفید باتاب چہرہ فرسٹ کلاس کی کھڑکی میں ظاہر ہوا۔ اس نے کمرے کے چاروں طرف نگہ دوڑائی اور یہ اطمینان کر کے کہ نشستیں خالی پڑی ہیں۔ فٹ بورڈ پہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔ سرونٹ کلاس کی طرف منہ کر کے اس نے تحکمانہ انداز میں کہا "شیر گل!"

قدرے وقفہ کے بعد ایک گھبرائی ہوئی آواز نے جواب دیا۔

"بلے آقا!"

"سفر دراز است زنہار از نگہداری اسباب غافل نشوی فہمیدی؟"

"بلے آقا!" جواب ملا ۔

اس نے ہتھی کو گھمایا۔ دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا ۔

یہ ۳۵ سالہ مضبوط تن و توش کا آدمی تھا۔ موٹی نوک کی گلدار پشاوری جوتی پاؤں میں تھی۔ لٹھے کی شلوار۔ سفید بوسکی کا لمبا کرتہ اور سیاہ سرج کی واسکٹ جس پر سلمے کا نفیس کام ہو رہا تھا۔ پہنے ہوئے تھا۔ دیکھنے میں وہ ایک خوش پوش شخص تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آزاد سرحدی علاقہ کا کوئی معزز زمیندار یا افغانی قبائل کا کوئی بارسوخ ملک ہے۔ نقدی کا ایک خوبصورت چرمی تھیلا اس کے بائیں پہلو میں جھول رہا تھا۔ بغل میں ایک موٹا ڈنڈا تھا۔ اور بائیں ہاتھ میں ململ کا ایک سفید رومال تھا جس میں آموں کی گٹھلیاں بندھی معلوم ہوتی تھیں۔ اور جن کی نسبت مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ درحقیقت روپے کے ڈھیلے تھے۔ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی میں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ تھا۔ جسے میں نے اس کے اندر داخل ہوتے ہی پہلی نگاہ میں دیکھ لیا تھا ۔

کمرے میں کل چار نشستیں تھیں۔ اور دو مسافر [illegible] دوسرا ایک یورپین۔ جس کی وردی اس کے کسی فوج کے [illegible] لفٹننٹ ہونے کا پتہ دے رہی تھی۔ میں رہتک سے [illegible] ہوا تھا۔ وہ غالباً دہلی سے آ رہا تھا۔ میں نے اسے رستہ [illegible] مغرور اور بدمزاج پایا۔ میرے دریافت کرنے پر کہ اس [illegible] کہاں تھی۔ اس نے اسقدر رکھائی اور بھدے پن سے (چھاؤنی سے) جواب دیا۔ کہ مجھے اس کے ساتھ [illegible] کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ ایک مکروہ شان فرعونی لئے [illegible] نشستوں پر قبضہ جمائے بیٹھا تھا۔ [illegible] ایک عجیب انداز رعونت کے ساتھ [illegible] شکنیں پڑ گئیں۔ میں نے خیال کیا کہ [illegible]

ایسے کالے آدمی کو ثابت نکل جائے۔ میں چپ چاپ اپنی غلامانہ ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھڑکیوں کے ساتھ والی دوسری نشست پر بیٹھ گیا۔ میرے اور اُس کے درمیان دو نشستیں خالی تھیں۔ گو وہ اپنی ساتھ والی سیٹ پر بھی قبضہ کئے بیٹھا تھا اور اُس نے حوالا اپنے اسباب کو بکھیر رکھا تھا۔ بستر بند۔ چھاتا۔ اوور کوٹ اور چند دیگر اشیا کھونٹیوں سے لٹک رہی تھیں۔ سوٹ کیس نشست کے نیچے تھا۔ سیٹ، پھلوں والی ٹوکری۔ توشہ دان گیب سامنے والی سیٹ پر تھے۔ کھڑکی کے ساتھ والی نشست پر وہ بستر بچھائے اپنے: عم تن و۔ فیلڈ مارشل بنا بیٹھا تھا

نووارد نے اندر داخل ہوتے ہی ... دستار و سر سے صافہ اُتار کر انہیں سیٹ پر رکھ دیا۔ ٹکٹ واسکٹ کی جیب میں ڈال لیا اور بیٹھنے کے ساتھ ہی سر کے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سلجھاتے ہوئے ٹھنڈا سانس بھرا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے گاڑی پکڑنے کے لئے غیر معمولی جدوجہد کرنی پڑی ہے +

فوجی افسر کی حالت قابل دید تھی۔ وہ اس کی طرف انتہائی نفرت و حقارت سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر فرسٹ کلاس کا ٹکٹ اندر داخل ہوتے وقت افغان کے ہاتھ میں نہ ہوتا۔ یا اُس کی ظاہری وجاہت مرعوب کن نہ ہوتی۔ تو اُس نے ... گردن سے پکڑ کر باہر نکال دیا ہوتا۔ اور اب بھی وہ یقیناً محض اس لئے چپ تھا کہ اُسے پٹھان کے مقابلہ کی جرأت نہیں تھی۔ ورنہ اس کی حرکات نگاہیں، چہرے کی سُرخی طبیعت کی بیقراری صاف ظاہر کر رہی تھیں کہ پٹھان کی آمد نے اسے آتش زیر پا کر رکھا ہے۔ یہاں تک تو خیر وہ برداشت کر سکتا تھا۔ مگر نووارد کو خدا جانے ذیابیطس کا عارضہ تھا ... کی بیماری تھی۔ وہ ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد اُٹھتا۔ ٹوائلٹ روم میں گھس جاتا اور پھر باہر نکلتا۔ اس ہیئت کذائی میں کہ داہنے ہاتھ سے ... تھامے ہوتا۔ اور بائیں ہاتھ سے استنجے کے ڈھیلے کو زیر استعمال رکھتا۔ اور غضب یہ کہ ایک پاؤں سیٹ پر رکھ کر فوجی افسر کی طرف منہ کئے چار چار پانچ پانچ منٹ تک اسی حالت میں کھڑا رہتا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ فوجی افسر کے غصہ کا پارہ اُوپر سے اوپر چڑھ رہا ہے۔ مگر پٹھان تھا کہ بالکل بے پرواہ۔ ایک عجیب شان تغافل کے ساتھ اپنے شغل میں مصروف تھا +

گاڑی کوٹ نیورا اور فرید کوٹ کے درمیان اُڑی جا رہی تھی۔ پٹھان حسب معمول رفع حاجت کے لئے گیا۔ جونہی اُس نے ڈ... دروازہ بند کیا۔ فوجی لپک کر اپنی سیٹ سے اُٹھا ... میری آنکھوں کے سامنے پٹھان کی پگڑی اور کلاہ اُٹھایا اور اُسے چلتی گاڑی سے باہر پھینک دیا۔ پھر چپ چاپ اپنی سیٹ پر دراز ہو گیا۔ گویا کوئی واقعہ ہی نہیں ہوا۔ پٹھان پانچ چھ منٹ کے بعد باہر نکلا۔ دیکھتے ہی بھانپ لیا کہ اُس کی دستار اور کلاہ موجود نہیں ہیں۔ اُس نے جھک کر دیکھا کہ کہیں گر کر سیٹ کے نیچے نہ جا پڑے ہوں۔ مگر وہاں کچھ ہوتا تو ملتا۔ وہ اُٹھا اور میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ "خو ... ہمارا دستار اور کلاہ کدھر ہے؟"

میں نے آنکھوں کے اشارہ سے جواب دیا کہ اس افسر سے پوچھو +

"ہے او" اُس نے فوجی کی طرف مخاطب ہو کر کہا +

"ہے او" فوجی نے نقل کرتے ہوئے جواب دیا +

"خو ... ہمارا دستار اور کلاہ کدھر گیا؟" اُس نے پوچھا۔

"ام ... نہیں ... جانتا" اُس نے ایک ایک لفظ پر زور ڈالتے اور اُن کے با ... وقفہ دیتے ہوئے کہا۔ اور اُس کا چہرہ انتہائی نفرت اور حقارت کے جذبات سے تاریک نظر آتا تھا۔ گو دل میں ... جرأت سے جسے وہ حق بجانب سمجھتا ہو گا۔ مسرور تھا کیونکہ ... مسرت اُس کے چہرے اور اُس کی آنکھوں میں چمک رہی تھی۔ پٹھان نے اُس کی نیت کو پڑھ لیا۔ اور حقیقت کو معلوم کر لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نگاہیں اس فوجی کے قلب کی گہرائیوں تک اُتر گئی ہیں۔

پٹھان کا چہرہ اس ہتک اور سینہ زوری پر سرخ ہوگیا۔ میں نے خیال کیا کہ وہ اس کا کلا دبوچنے والا ہے۔ مگر خلاف توقع وہ چپ ہوگیا۔ لحہ بھر چپ رہنے کے بعد بیٹھنے کو باہر پھینک کر اس نے ازاربند باندھا اور جھاڑنے اور ایک خاموش انداز میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس وقت رات کے ساڑھے چار بجے تھے +

صبح سوا پانچ بجے گاڑی فیروز پور چھاؤنی پہنچنے پر فوجی افسر اٹھا۔ بوٹ۔ لمبی جرابیں۔ نیکر اور صرف قمیص پہنے وہ گاڑی سے اتر کر ریفرشمنٹ روم میں جا گھسا۔ غالباً وہ بسکٹ کا کوئی جام یا چائے کا ایک پیالا پینے کے لئے گیا تھا۔ پٹھان اسے ریفرشمنٹ روم کی طرف جاتے وقت دزدیدہ نگاہوں سے تکتا رہا۔ جب وہ اندر چلا گیا۔ اور دروازہ اس کے پیچھے بند ہوگیا۔ وہ آہستگی سے اٹھا۔ کمرے کی دو تہوں میں سے ایک کل کردی۔ فوجی کا سامان اوور کوٹ۔ چھاتہ۔ ہیٹ۔ بستر بند۔ سوٹ کیس۔ توشہ دان۔ پھولدان ٹوکری۔ کمبل اور چند ایک دوسری اشیا جن کی مجموعی مالیت اس کی پگڑی اور کلاہ سے تقریباً ستر گنا تھی۔ اکٹھی کرکے انہیں کمبل میں مضبوط باندھا اور ٹوائلٹ روم میں گھس کر چٹخنی چڑھا لی۔ میں حیران تھا کہ اس کا کیا منشا ہے؟ وہ ان چیزوں کو چرانا چاہتا ہے؟ یا اندر جا کر انہیں دیا سلائی دکھائے گا؟

فوجی تقریباً دس بارہ منٹ کے بعد عین اس وقت آیا جبکہ گاڑی روانہ ہونے والی تھی۔ مگر وہ مخمور تھا۔ اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ آتے ہی بغیر ادھر ادھر نظر دوڑائے وہ نشست پر لیٹ گیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ پٹھان ابھی تک اندر تھا +

گاڑی فیروز پور شہر چند منٹ ٹھہری۔ اور چل پڑی مگر پٹھان باہر نہ نکلا۔ میں بڑی بے صبری کے ساتھ نتیجہ کا منتظر تھا۔ اور میری آنکھیں برابر اسی طرف لگی ہوئی تھیں +

چاند کی پچھلی تاریخیں تھیں۔ اس وقت اس کی پتلی سی پھانک افق مشرق سے طلوع ہو رہی۔ گاڑی حسینی والہ سے گزر گئی۔ اب زمین ڈھلوان ہونا شروع ہوگئی تھی۔ ریتلی سطح سرکنڈے اور فراش کی چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں نے دریائے ستلج کی آمد کا پتہ دیا۔ اور دوسرے چند لمحوں میں گاڑی ہیڈورکس گنڈا سنگھ والا سے جہاں جدید فن انجینئری نے دریا مٹھی میں لے رکھا ہے۔ گزر رہی تھی۔ پل کے نیچے مختلف دروں سے دریا کا پانی ایک حشر آسا شور کے ساتھ جھاگ کے بادل پیدا کرتے ہوئے گزر رہا تھا یکایک ٹوائلٹ روم کی کھڑکی کھلی اور فوجی کے سامان کی گٹھڑی ایک طاقتور ہاتھ نے باہر دھکیلی اور پھر اسے پوری قوت کے ساتھ ہوا میں پھینک دیا +

میں نے اسے چاند کی دھندلی روشنی میں ایک دو بار دریا کی زبردست لہروں پر اچھلتے ہوئے دیکھا۔ پھر تاریکی۔ فاصلے کی دوری، اور پانی کی موجیں اس پر چھا گئیں۔ اور وہ دریا کی بے پناہ گہرائیوں میں نگاہوں سے گم ہوگئی +

ٹوائلٹ روم کا دروازہ کھلا اور پٹھان فاتحانہ انداز میں مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا باہر نکلا۔ فوجی بے خبر سو رہا تھا +

پٹھان اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ اور سیٹ کی نشست کے ساتھ سہارا لگا کر کسی گہری سوچ میں مستغرق ہوگیا +

میلوں پر میل گزرتے گئے۔ کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔

گاڑی ۷ بجے لاہور چھاؤنی پہنچی۔ فوجی بدستور سو رہا تھا +

گاڑی ٹھہرنے کے ایک منٹ بعد گارڈ نے اپنی جھنڈیوں کی چھڑیوں سے کھڑکی کو کھٹکھٹایا۔ اور بلند آواز سے۔ لاہور کینٹ پلیز۔ فوجی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ انگڑائی لی۔ اور کھونٹیوں کی طرف نظر دوڑائی حیران ہوا کہ سامان کدھر گیا۔ سامنے سیٹ پر نگاہ ڈالی تو صفائی نظر آئی۔ نیچے جھک کر سوٹ کیس دیکھا۔ ندارد۔ فوری حیرانگی میں ادھر ادھر تاکا۔ پھر پٹھان پر نظر ڈالی جو آنکھیں بند کئے نیم خوابی کی حالت میں سیٹ کے ساتھ پشت لگائے بیٹھا تھا۔ سب سے آخر میری طرف دیکھا اور پوچھا "ہمارا سامان کدھر گیا ہے؟"

میں نے آنکھوں کے اشارہ سے جواب دیا کہ اس پٹھان سے پوچھو۔

"ہے او" اس نے پٹھان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اس تند و غیر مانوس آواز پر پٹھان نے اپنی آنکھیں کھولیں اور فوجی کی طرف غور سے دیکھا۔

"ہے او" اس نے نقل کرتے ہوئے فوری طور پر جواب دیا۔

"ہمارا سامان کدھر گیا؟"

"تمہارا سامان؟" پٹھان نے استفساریہ لہجہ میں کہا۔

"یس - ہمارا سامان - ہمارا اوورکوٹ - ہمارا چھاتہ ——"

"اوہ تمہارا اوورکوٹ —— تمہارا —— چھاتہ؟"

"یس یس - ہمارا کیبل کیس اور باقی سامان؟"

انگریز نے ناراضگی کی امید میں قدرے متانت سے لفظ یس دہراتے ہوئے کہا۔

"اوہ یہ سارا چیز ہمارا دستارا و کلا بیلنے گیا ہے۔ گھبراؤ مت۔ وہ آجائے گا۔ مگر اکیلا نہیں آسکتا۔ وہ انہیں ڈھونڈتا پھرتا ہے۔"

اس گستاخانہ جواب پر جس میں صاف اور صریح اقبال جرم پایا جاتا تھا۔ فوجی کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا۔ نتھنے پھول گئے۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں اور میں نے دیکھا کہ جوش سے اس کا تمام جسم کانپنے لگ گیا ہے۔

"یو۔ ڈیم ——" اس کے منہ سے نکلا۔

پٹھان کود کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ "کافر بچہ۔ تخم سگ اٹھائی گیرا ہے" اور دوسرے لمحہ میں اس کا ہاتھ فوجی کی گردن پر تھا قبل اسکے کہ وہ دوسرے ہاتھ سے کوئی ضرب لگائے۔ فوجی نے دائیں ہاتھ سے اپنے مخالف کی کلائی پکڑ کر گردن اس کی گرفت سے چھڑا لی اور اس کے مکے کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھ کو ہوا میں دبوچ لیا۔ پٹھان نے دونوں ہاتھوں کا جھٹکا دیکر اسے پیچھے کی طرف دھکیلا۔ اور اگر سیٹ کا سہارا نہ ہوتا۔ تو انگریز یقیناً گر پڑتا۔ اسی دھینگا مشتی کے درمیان ان کے بازو ایک دوسرے کی کمر کے گرد حائل ہو گئے اور چشم زدن میں وہ درمیانی سیٹ پر گتھم گتھا تھے۔

مجھے معاملہ کے اس حد تک پہنچنے کی توقع نہ تھی میں بیچ بچاؤ کے لئے اٹھا۔ اور ساتھ ہی پلیٹ فارم پر سیٹی کی آواز سنائی دی۔ وہ ٹرین ابھی کوئی حرکت نہ کرنے پائی تھی کہ کھڑکی کھلی اور بوڑھا پلیٹ فارم سارجنٹ ہانپتا ہوا اندر گھس آیا۔ اس کے پیچھے ایک دست ملائی پھر ایک سپاہی اور ساتھ ہی سیکنڈ گارڈ جو اتفاقاً وہاں سے گزر رہا تھا داخل ہوئے۔

"کیا بات ہے؟" سارجنٹ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں" میں نے جواب دیا۔ "ان دونوں صاحبوں کے درمیان باتوں باتوں میں کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے اور آپس میں الجھ پڑے ہیں۔"

"چھوڑ دو خان —— اور آپ بھی ہٹ جائیں صاحب بہادر" پولیس افسر نے انہیں علیحدہ کرتے ہوئے لجاجت سے کہا کیونکہ اس نے فرسٹ کلاس کے کمرے اور جھگڑنے والے مسافروں کی ظاہری وجاہت کو پہلی نظروں میں بھانپ لیا۔ اور میرے جواب سے اسے تسلی ہو گئی تھی۔ کہ کوئی جرم قابل دست اندازی پولیس وقوع میں نہیں آیا۔

"بگذارید آغا" میں نے بھی آگے بڑھ کر اعتبار جتاتے ہوئے کہا "بگذارید این چنیں کار ہا شایانِ شانِ شما نیست۔"

(چھوڑو صاحب گاڑی دو منٹ میں چھوٹنے والی ہے)

سیکنڈ گارڈ نے صاحب بہادر کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

وہ دونو علیحدہ ہو گئے۔ پٹھان نے اپنی نگاہیں جو جوش تمکنت اور وفور مسرت میں دو ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میری طرف

اُٹھائیں اور داد چاہی۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا۔ غیور پٹھان خوش تھا۔

گاڑی چلنے میں تھوڑا وقت باقی رہ گیا تھا۔ انتہائی گھبراہٹ اور تنگئ وقت میں صاحب بہادر نے بستر لپیٹا اور باقی ماندہ چیزوں کو اکٹھا کرکے ایک قلی کے حوالے کیا۔ اور آنہیں کپڑوں میں گاڑی سے اُتر گیا۔ پٹھان کی فتحمند نگاہیں گیٹ تک اس کا تعاقب کرتی رہیں۔ اور جب وہ افسر بہ حالت میں سر نیچے ڈالے بکلفٹ گھوم کر ڈیننگ روم میں گھس گیا تو پٹھان نے انتقام کی لذت میں مسرت و اطمینان کا سانس بھرتے ہوئے کہا

"خو — بے ایمان کافر ہمارا ساتھ مخول کرتا ہے"۔

لاہور اسٹیشن پر میں بھی اُتر گیا۔ مگر راستہ بھر میں پٹھان کی روح آزادی، غیرت اور حمیت کی تعریف کرتا گیا۔ میرے دل میں بے اختیار اُس کی طرف سے عزت و احترام کے جذبات پیدا ہوئے۔ اس پٹھان کے اندر ایک حقیقی اسلامی روح تھی دانت کے بدلے دانت۔ آنکھ کے بدلے آنکھ۔ یہ خدائی قانون ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تمام فوجی افسر ایسے اکھڑ نہیں ہوتے۔ لیکن بعض فوجی افسر تو اتنے تند مزاج ہوتے ہیں۔ کہ توبہ بھلی۔ ایسے تندخو فوجیوں کا وہی علاج ہے۔ جو اس پٹھان نے کیا۔

سراج الدین احمد
پرائیویٹ سکرٹری دیوان صاحب آف پاکپتن

خمخانہ جذبات

غارت گری نہ پوچھ نگاہِ شباب کی — آنکھوں میں سحر ہے کہ ہے مستی شراب کی
معصومئ نظر، وہ ادائیں حجاب کی — اب تک مری نظر میں ہے جنت نقاب کی
اک بیخودی سی چھا گئی جب یاد آگئیں — کیفیتیں وہ آپ کے عہد شباب کی
موجِ نسیم سے جو لرزتی ہے شمع صبح — تصویر ہے وہی تو مرے اضطراب کی
کیفیتِ تجلئ جاناں کہاں نصیب — آنکھوں میں کٹ گئیں مری راتیں شباب کی
آغوشِ دوست صحبتِ احباب شہر ہے — ہاں نغمہ گر! یہ رات ہے عہدِ شباب کی

اقبال چشم تر کا مداوا تو کیجئے
غماز ہیں جناب کے حالِ خراب کی

محمد عبید اللہ غزنوی

شاہی پہلوان

از جناب خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی

اودھ کی سلطنت میں جہاں تمام ہنرمندوں کی قدردانی تھی شہ زوروں اور پہلوانوں کی بھی پرورش ملحوظ خاطر رہتی تھی ●

آخری شاہ اودھ حضرت میرزا محمد واجد علی شاہ بہادر کے عہد میں میر لطف حسین کیدان تھے۔ ان کے متعلق عجیبوں کی یہ ظنی تھی۔ وہ کہتے تھے ہر فوجی آدمی کے بدن پر مع اسلحہ وچار آئینہ وغیرہ دو من لوہا ہوتا تھا ●

اُس وقت میں پہلوانی کا فن شرفا میں عیب سمجھا جاتا تھا۔ کسرت کرتے تھے مگر اکھاڑے میں جیٹ لنگوٹ باندھ کر اُترنا خلاف شرافت سمجھا جاتا تھا۔ کیدان صاحب کے ایک بھانجے تھے نہایت قوی ہیکل زورآور۔ اُن کا نام میر حسن علی تھا۔ شہر میں شہ زور مشہور تھے ●

کیدان صاحب کا امام باڑہ جامع مسجد کے آگے سالی خانہ کی سرا کے قریب تھا اور وہیں مکان تھا۔ میر علی حسن بھی وہیں رہتے تھے۔ کیدان صاحب نے ایک ہاتھی پاٹھا ان کی سواری کے واسطے مول لے دیا تھا۔ پیراک بھی مشہور تھے۔ جب ان کی شہرت شہر میں ہونے لگی اور دو چار معرکوں میں ان کا نام ہوا تو شدہ شدہ بادشاہ کے کان تک یہ خبر پہنچی۔ ایک مرتبہ بادشاہ نے استفسار فرمایا۔ میر لطف حسین سنتے ہیں تمہارا بھانجا بھی نہایت شہ زور ہے کیدان نے ہاتھ باندھ کر عرض کی خداوند نعمت حضور کے اقبال سے یہ بچہ انشاءاللہ شہ زور نکلیگا ابھی اس کا سن ہی کیا ہے ستو برس کی عمر ہے ●

اُس زمانہ میں قاعدہ تھا کہ شریف لوگ سہ پہر کو پکے پل کے گھاٹ پر پیراکی کے ہنر دکھانے جاتے تھے۔ میر حسن علی بھی اچھے پیراک تھے۔ حسن اتفاق سے بادشاہ اپنے بجرے پر ندہ پالکی سیر کو نکلے تھے اور وہ ملاح کشتی کھیتے تھے ●

جب بجرا پکے پل کے قریب آیا تو سب لوگ دھارے کو چھوڑ کر دریا کے کنارے سلام کے واسطے کھڑے ہو گئے۔ میر حسن علی اُس وقت کھڑی لگا رہے تھے ●

بجرے کو دیکھ کر پل کے بیچ کے در پر ہاتھ ٹیک کر کھڑے ہو گئے۔ بجرا ان کے قریب سے نکلا انہوں نے بجرے کو پیچھے کی طرف سے پکڑ لیا۔ ملاحوں نے ہر چند کھینا چاہا۔ بجرا کسی طرح آگے نہیں بڑھ سکا۔ جب بجرا رک گیا۔ تو بادشاہ نے پیٹھ پھیر کر دیکھا۔ میر صاحب نے بجرے کو چھوڑ کر فراشی سلام کیا۔ اور عرض کیا فدوی کا نام حسن علی ہے۔ کیدان لطف حسین کا بھانجا ہوں بادشاہ ان کی شہ زوری سے بہت خوش ہوئے۔ دوسرے روز دربار میں طلب فرمایا۔ میر حسن علی نے موافق قاعدہ سلطنت کے نیم قد جھک کر سات مرتبہ سلام کیا۔ نذر دی۔ بادشاہ کی طرف سے خلعت ہوا اور وظیفہ مقرر ہو گیا ●

اتفاق سے اسی زمانے میں مدراس سے ایک نامی پہلوان شبیر علی لکھنؤ میں آیا۔ تو اُس نے میر حسن علی کی شہ زوری کی بہت تعریف سنی اور کشتی کا طالب ہوا۔ میر حسن علی نے کہا۔ ہم لوگ کشتی نہیں لڑتے ●

اُس نے بادشاہ کو عرضی دی کہ فدوی اس غرض سے لکھنؤ میں حاضر ہوا ہے کہ میر حسن علی سے کشتی لڑ کے اپنا ہنر دکھائے ●

بادشاہ نے میر صاحب کو وہ عرضی بھیجدی۔ میر صاحب نے عرض کیا خداوند نعمت سیدوں نے آجتک چٹ لنگوٹ باندھ کر کشتی نہیں کی۔ ہاں اگر شیر علی کو شہ زوری کا دعویٰ ہوا تو فدوی حاضر ہے زور آزمائی کی جائے اس میں جس کو خدا غالب کرے ✦

پہلوان نے جواب سن کر عرض کیا بہتر ہے مجھے شہ زوری میں بھی عذر نہیں۔ ایک دیوار میں طاقچہ آر پار کھود اگیا۔ ایک طرف میر حسین علی کھڑے ہوئے دوسری طرف شیر علی پہلوان ✦

ایک نے دوسرے سے پنجہ ملایا جب دونوں خوب کس چکے تو میر حسین علی نے اسقدر زور سے اپنی طرف کھینچا کہ شیر علی کا شانہ اتر گیا اور شانے تک طاق میں کھنچ آیا۔ چاروں طرف سے واہ واہ ہونے لگی۔ میر صاحب نے پہلا کام یہ کیا کہ شیر علی کا بازو بٹھایا اور اس پر اپنے ہاتھ سے مالش کی ✦

اسیطرح پہلوانوں کا ایک گروہ شاہی تنخواہ دار تھا۔ بادشاہ کے ہاں حبشی غلام عرب کے مول لئے گئے تھے۔ ایک ہزار جوانوں کا ایک رسالہ تھا۔ یہ رسالہ بادشاہ کا جاں نثار تھا۔ اور بہت جانباز تھا ✦

بعض سواروں کو کشتی کا شوق ہوا۔ بادشاہ نے اُن کی تنخواہ معقول مقرر کردی اور سواروں کی خدمت سے ان کو معاف رکھا۔

پیر جلیلوں کے تکیئے پر بھیم کا اکھاڑہ تھا۔ بھیم کوئی بڑا زبردست پہلوان تھا جس کا جواب ہندوستان میں نہ تھا۔ شیدی سالمیں اُس کے شاگرد ہوئے۔ آخر بھیم نے اُن کی قوت اور بہادری کا اندازہ کرتے ہوئے اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ بھیم کے مرنے کے بعد شیدی سالمیں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت سی کشتیاں ماریں بڑی شہرت تھی۔ ان کے دو شاگرد نہایت زبردست تھے۔ جو اُن کے بعد اُن کے خلیفہ ہوئے۔ ایک کا نام شیدی لندھور تھا۔ دوسرے کا نام شیدی فولاد ✦

جس زمانے میں شیدی سالمیں بالکل بڈھے اور ضعیف ہو گئے۔ پنجاب سے ایک قوی ہیکل پہلوان جہلم کا رہنے والا انکے اکھاڑے پر آیا اور پوچھا شیدی سالمیں کہاں ہیں۔ یہ اکھاڑے کے باہر بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔ شیدی لندھور نے کہا تم اپنا مطلب کہو۔ اُس نے کہا ہم اُن سے کشتی مانگنے آئے ہیں۔ شیدی لندھور نے کہا اُستاد تو اب بہت بڈھے ہو گئے۔ تم اگر کشتی مانگتے ہو تو اُن کے شاگردوں میں سے جس کو پسند کرو وہ تم سے لڑ سکتا ہے۔ اُس نے کہا نہیں ہم اُسی سے لڑیں گے۔ شیدی لندھور نے کہا دیکھو ہمارا اُستاد وہ بڈھا آدمی ہے جو سامنے بیٹھا ہوا حقہ پی رہا ہے ✦

اُس نے کہا تو اُن سے کہو کہ پہلوان کشتی مانگتا ہے۔ شیدی فولاد نے کہا بابا ہمارا اُستاد بڈھا ہے وہ کیا لڑ سکیگا۔ تم اُس کے شاگردوں سے کشتی لڑو۔ یہ اُٹھ شیدی سالمیں کے پاس گیا اور کشتی مانگی انہوں نے کہا تم دیکھتے ہو کہ میں اب لڑنے کے قابل نہیں رہا۔ جس نے چٹ لنگوٹ اُتار ڈالا۔ تم شیدی لندھور شیدی فولاد سے لڑو۔ اگر ان کو چت کر لوگے تو میں ہار مان لونگا۔ اُس نے پھر واپس آکر فولاد سے کہا کسی طرح اپنے اُستاد کو راضی کرو۔ اُس نے کہا بابا ہمارا اُستاد بڈھا ہے۔ تم سے کہدیا ہمارا اُستاد بڈھا ہے۔ بڈھا ہے۔ اُس نے کہا تو پہلوان کیوں بنا ہے۔ اُس سے کہو کہ ہم سے لڑے یا ہار مان لے تب تو شیدی فولاد کو غصہ آگیا اور اُس نے کہا وہ بڈھا ہی بڈھا ہے، یہ کہتے کہتے اپنے دونوں ہاتھ کی اُنگلیاں اُس کے پیٹ میں اُتار دیں اور پیٹ سے سینے تک چیر کر پھینکدیا۔ پہلوان اُسیوقت مرگیا۔

فوراً یہ خبر مرزا ستیا بیگ کوتوال کو پہنچی وہ اُسیوقت موقع واردات پر پہنچے اور تفتیش کرکے پہلوان کو دفن کرادیا۔ اور رپورٹ سرکار میں بھیجدی ✦

اب حبشیوں کے رسالے کو یہ خبر ملی بہت تشویش تھی کہ خدا جانے کیا حالت ہو۔ سب نے کہا اگر شیدی فولاد سے انتقام لیا گیا تو ہم لوگ بھی مرکر اپنی جان دیدینگے ✦

شیدی سالیس اسیوقت علی نقی خاں کی ڈیوڑھی پر پہنچے اور ان کی بیگم سے سارا قصہ بیان کر کے کہا اب اس کی جان بچانا آپ ہی کا کام ہے۔ یہ حضرت میرزا واجد علی شاہ بہادر کی ساس تھیں۔ جب بادشاہ محل میں تشریف لائے تو باتوں باتوں میں بولیں کیا سنتے ہیں کہ آج شیدی فولاد نے باتوں باتوں میں دو ٹکڑے کر دیا۔ یہ کہکر ہنسنے لگیں۔ بادشاہ نے کہا یہ ہنسنے کا کون موقع ہے ایسے کاموں سے سلطنت کی بدنامی ہوتی ہے۔ اب شیدی فولاد کو پھانسی دینا چاہئے ✦

بیگم صاحبہ نے کہا پھانسی کی تو کوئی بات نہیں ہے اشتعال طبع کی حرکت ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو اُس کے ساتھیوں میں سے اُس کا کوئی عزیز ہو اُسے جان کے بدلے کچھ روپیہ دیکر راضی کر لیا جائے اور خونبہا دلوایا جائے ✦

اس پہلوان کا کوئی خاص عزیز ساتھ آیا تھا۔ عدالت نے بلوا کر اُسے کچھ روپیہ لینے پر راضی کر کے قاضی کے حکم سے قصاص دلوا کر فیصلہ کر دیا ✦

شیدی لندھور بہت گراں ڈیل آدمی تھا۔ کوئی گھوڑا اُسے سواری نہیں دے سکتا تھا۔ اس کی کوئی اولاد نہ تھی ایک بیوی تھی۔ شیدی غلام علی کو اپنا بیٹا بنایا تھا۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ اسقدر گراں ڈیل تھا کہ چوک میں کنارے کنارے چلتا تھا تو بھی آدھی سڑک رُک جاتی تھی اور لوگ اسی کو دیکھنے لگتے تھے۔ جب شیدی غلام علی کا ہاتھ پکڑ کے چلتا تھا۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی بچے کو اپنے ساتھ لئے ہے۔ دس روپے روز کی اس کی چھٹی ہوتی تھی اور دس سیر دودھ۔ دو بکروں کی نہاری ملتی تھی ✦

جب آخری شاہ اودھ معزول ہو کر کلکتہ چلے گئے اور انقلاب سلطنت ہو گیا۔ شیدیوں کا رسالہ چھڑا دیا گیا۔ اور یہ ہزاروں جوان پریشان ہو کر متفرق مقام میں چلے گئے تو شیدی لندھور زندہ تھا۔ تمام نواب زادے شہزادے اپنی اپنی مصیبت میں مبتلا تھے۔ ان کو کھانے کو کون دیتا۔ ان کا ایک شاگرد نان بائی تھا۔ اُس نے کہا اُستاد ایک وقت کا کھانا تو فی الحال میرے یہاں کھا لیا کیجئے۔ اُس نے کہا۔ بابا میں تم پر اپنا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا ہاں اتنا کرو کہ مجھے کچھ دنوں قرض کھلا دو ✦

بھیم کے اکھاڑے سے شاگردوں کو زور دلا کر شیدی لندھور دس بجے پاٹے نالے پر اپنے شاگرد نان بائی کے یہاں گئے تھے۔ وہ ایک روپیہ کا چھبیس سیر آٹا لا کر خمیر اُٹھاتا تھا اور سیر کی چار چار روٹیاں پکاتا تھا۔ اور نہاری وہ اپنے پاس سے کونڈے میں ڈالتا جاتا تھا۔ یہ ایک روٹی کے دو نوالے کر کے کھاتے جاتے تھے۔ بیچ میں دو چار بدھنے پانی کے پی جاتے تھے۔ چھبیس سیر کی روٹی کھانے کے بعد ڈکار لیتے تھے۔ دوسرے وقت فاقہ کرتے تھے۔ جب کسی شاگرد سے کچھ ملتا تھا تو نان بائی کو دیدیتے تھے ✦

کچھ زمانے کے بعد نواب کلب علی خاں بہادر مسند آرائے خلافت رامپور ہوئے۔ لکھنؤ کے تمام اہل ہنر ان کے دربار میں طلب ہوئے بڑے بڑے شرفا شاعر باورچی۔ نواب زادے اکثر ان کے دربار میں نظر آتے تھے ✦

ایک دن نواب برہان الدین حسین خاں نے نواب صاحب سے کہا کہ حضور کے دربار میں تو بہت سے پہلوان ہیں لکھنؤ کا ایک نامی پہلوان جس کا جوڑ خدا نے آجتک پیدا نہیں کیا۔ سلطنت کے مٹ جانے سے تباہ حال ہے۔ اگر حضور اسے بھی اپنے ملازمین میں رکھ لیں تو بہتر ہے۔ نواب نے حکم دیا کہ اسے طلب کر لو۔ انہوں نے کہا کہ حضور کچھ زاد راہ مرحمت فرمائیں تو وہ آسکتا ہے۔ نواب نے فرمایا تین سو روپے بھجوا دو۔ نواب برہان الدین خاں نے اپنے بھتیجے کے پاس تین سو روپیہ بھجوا دیا۔ اور کہا یہ روپیہ شیدی لندھور کو زاد راہ دیکر بھجوا دو ✦

انہوں نے اس کو بلوا لیا اور کہا اُستاد تم کو نواب صاحب

رامپور نے یاد فرمایا ہے۔ ہمارے چچا نے تمہاری تعریف اُن سے کی ہے +

اُنہوں نے کہا تو غلام کو کیا عذر ہے میں تو اس خاندان کا زرخرید ہوں۔ جب آپ حکم دیں۔ اُنہوں نے کہا تین سو روپیہ سفر خرچ کا بھیجا ہے۔ اُس نے کہا میں روپیہ لے کر کیا کرونگا۔ کچھ کپڑے میرے بنوا دیجئے اور کچھ روپیہ اپنی لونڈی کو دیدیجئے اُنہوں نے ان کی پوشاک بنوا دی۔ بیل گاڑی کرایہ پر لے دی۔ کھانے پینے کو پچاس روپے دیدئے۔ کچھ جنس ساتھ رکھ دی باقی روپیہ ان کی بیوی کو بھجوا دیا۔ پانچ روز میں رامپور پہنچ گئے۔ نواب صاحب نے دربار میں طلب فرما کر پوچھا تم کیا تنخواہ لو گے۔ انہوں نے کہا غلام بھی کہیں تنخواہ پاتے ہیں۔ مجھے پیٹ بھر کھانے کو دیجئے۔ موٹا کپڑا ستر پوشی کو ملے۔ اور اپنی لونڈی کو کچھ خرچ بھیجدیا کیجئے۔ روپیہ کا مجھے کیا کرنا ہے +

نواب صاحب نے حکم دیا کہ ایک مہینہ تک ہمارے دسترخوان سے اسے کھانا ملا کرے اور کچھ پوشاک بنوا دی ایک مہینے کے بعد دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ شیدی لندھور کے کھانے میں پانچسو روپیہ صرف ہوا +

نواب کو حیرت ہوگئی چار و ناچار وہی پانچسو روپیہ ماہوار ان کی تنخواہ مقرر کی۔ اس پر بھی مہینے میں دو چار فاقے اس غریب کو ہو جاتے تھے +

نواب کے دربار میں کوئی ایسا پہلوان نہیں تھا کسی شہر میں ان کے مقابلے کی جوڑ نہ ملی۔ شیدی غلام علی کو راجہ شعبان علی خاں نے اپنی سرکار میں سلیم پور بلوا لیا تھا اور بہت قدردانی کرتے تھے۔ ان کی جوڑ کا بھی کوئی پہلوان نہ تھا۔ پانچ روپیہ روزخوراک کے ملتے تھے۔ مشہور ہے کہ اکھاڑے کے قریب ایک پرانی املی کا درخت تھا اُس کے دو ٹہنوں کو چیر کر ایک اینٹ رکھ دی تھی اور کہا کوئی پہلوان اسے نکال دے۔ کسی میں اتنی طاقت نہ تھی جو اینٹ نکال سکتا +

پنجاب سے ایک پہلوان نامی آیا۔ ریاست سلیم پور میں پہنچا اور راجہ صاحب سے عرض کیا کہ میں شیدی غلام علی سے کشتی چاہتا ہوں۔ راجہ صاحب نے منظور کر لیا۔ پہلوان بہ اعتبار قدوقامت شیدی سے بہت بھاری تھا۔ اکھاڑے میں دونوں پہلوان اُترے۔ شیدی نے ہاتھ ملاتے ہی ایک اکھیر ماری۔ پہلوان زمین پر اوندھا گرا اور زمین پکڑ لی۔ شیدی غلام علی نے اُسے گھسے دینا شروع کئے۔ اُس نے کہا یہ خلاف اصول گھسے کیوں دیتے ہو تمہاری انگوٹھیاں میرے جسم میں چبھتی ہیں۔ غلام علی نے کہا بیشک میں انگوٹھیاں اُتارے ڈالتا ہوں۔ لیکن گھسہ دینا تو پہلوانی کا فن ہے۔ پھر اکھاڑے میں پکار کر کہا کوئی پہلوان میرے ہاتھ سے انگوٹھیاں اُتار لے۔ کئی پہلوان اُتر آئے اور انگوٹھیاں اُتارنے لگے۔ لیکن اس وقت انگوٹھیاں کچھ گوشت میں ایسی پیوست ہو گئی تھیں کہ اُتر نہ سکیں۔ آخر میں اس کی انگوٹھیوں پر کپڑا لپیٹا گیا +

اُس نے کہا صاحبو میں ہار مانتا ہوں۔ شیدی غلام علی نے خود انصاف سے کہا کہ نہیں کشتی برابر لکھی جائے + کیونکہ اگر میں چت کر لیتا تو اپنی جیت مان لیتا۔ جب پہلوان نے اس کا موقع نہیں دیا کشتی برابر رکھنا چاہئے +

شیدی لندھور شیدی فولاد کی جوڑ کا کوئی پہلوان ہندوستان میں نہ ملا۔ رامپور کے لوگ لندھور کو دیکھ کر کہتے تھے آدمی نہیں ہے دیو ہے +

نواب کلب علی خاں بہادر کے انتقال کے بعد اس ہنر کی قدردانی نہ رہی۔ پچیس تیس برس کا زمانہ ہوتا ہے کہ پنجاب سے ایک پہلوان سیف اللہ دیو ہیکل آیا تھا جیسے چلنا تک دشوار تھا۔ لکھنؤ میں اس کے جوڑ کا کوئی پہلوان نہ نکلا +

آخر میں سبحان خاں پہلوان فیض آبادی بھی غنیمت تھے۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت تھی۔ سو ڈیڑھ سو اکھاڑ و ان کے

شاگردوں کا تھا۔ بدھو خاں انہیں کے شاگرد تھے۔ شیدی غلام علی پہلوان انہیں کا شاگرد تھا۔ سبحان خاں کے ہاتھ پاؤں کچھ ایسے نہ تھے۔ دُبلے پتلے آدمی تھے۔ شہ زور بھی نہ تھے۔ لیکن پیچیت نامی تھے۔ شاگردوں کو اچھے اچھے پیچ بتاتے۔ بہت زور آور پہلوان ان کے شاگرد ہوئے۔ آخر زمانہ میں لنگوٹ کھول ڈالا۔ اکھاڑے میں بھی نہیں اُترتے تھے۔ ان کا خلیفہ شیدی غلام علی تھا جسے شیدی بدھو نے بیٹا بنایا تھا۔ ایک دن ایک پہلوان آیا اُس نے پوچھا سبحان خاں کہاں ہیں۔ سبحان خاں نے خود جواب دیا وہ تو اس وقت نہیں ہیں آپ اپنا مطلب فرمائیے۔ کہنے لگا ہم اُن سے کشتی مانگنے آئے ہیں۔ آپ نے کہا وہ تو اب ضعیف ہوئے آپ سے لڑنے کے قابل نہیں ہیں اُن کے شاگرد موجود ہیں اُن سے زور کر لیجئے۔ اُس نے کہا نہیں میں تو انہیں سے لڑوں گا اس وقت نہیں ہیں تو کل آؤنگا ۔

دوسرے دن پھر آیا۔ سبحان خاں نے کہا وہ تو نہیں ہیں شاگردوں نے کہا اُستاد یہ تو کوئی گنوار معلوم ہوتا ہے۔ کہئے تو ایک دھپ رسید کروں۔ آپ نے کہا نہیں ایسا کام مجھے پسند نہیں۔ میرا کیا نقصان ہے۔ دو چار دن میں خود تھک کر چلا جائیگا

پھر تیسرے دن آیا تو اس وقت سبحان خاں حسین آباد میں رام سرن حلوائی کی دُکان پر دودھ اور پوریاں مول لے رہے تھے۔ سودا لیکر چلے تو وہی پہلوان آگیا۔ تیور بدل کر کہنے لگا۔ تم خوب مجھے دھوکا دیتے تھے۔ اب تو معلوم ہو گیا سبحان خاں تم ہی ہو۔ میری تمہاری یہیں پر دو ہڑ پیچ ہو گی جس کو خدا دے وہ لے۔ کہنے لگے میں ضعیف آدمی ہوں تجھے شرم نہیں آتی مجھ سے لڑنے کو کہتا ہے۔ اُس نے کہا میں کچھ نہیں جانتا۔ اس وقت تم کو جانے نہیں دونگا۔ یہ سنکر اُنہوں نے پوریاں اور دودھ تو حلوائی کی دوکان میں رکھا۔ یا او کہا بھائی جا تیری شامت آئی ہے بات کرتے کرتے ہاتھ پکڑ کر جو ایک اکھیر مارتے ہیں۔ تو وہ چاروں شانے چت زمین پر آ رہا۔ اور آپ اس کے سینہ پر گھٹنہ ٹیک کر بیٹھ گئے۔ یہ تماشا دیکھ کر حلوائی دکان سے اُتر پڑا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر لینے لگا کچھ بیدھا ہوا ہے۔ یہ خبر سنتے ہی سب شاگرد دوڑے آئے اور بہت غصے میں تھے۔ لیکن سبحان خاں نے فساد کو رفع دفع کر کے اُسے بھگا دیا۔ ایک دن نواب باقر علی خاں رئیس سیش محل نے سبحان خاں سے کہا اب تو تم بڈھے ہوئے اپنے شاگرد شیدی غلام علی کا کچھ کمال دکھاؤ۔ اُس نے کہا بہت خوب۔ نواب کے حکم سے گبند خانے کے دس طرف اکھاڑا کھودا گیا۔ شیدی غلام علی اپنے چار زبردست شاگرد شیدی ہلال۔ شیدی یعقوب۔ شیدی فیروز وغیرہ کو لے کر آیا۔ اور چاروں کو اکٹھا کھڑا کیا۔ دو شاگرد تو اُستاد کی کمر سے لپٹ گئے اور دو کو اُس نے دونوں بغلوں میں دبا کر کمر کو جو جھٹکا دیتا ہے تو یہ دونوں اکھاڑے کی مینڈھ پر جا گرے اور جو دو شاگرد بغل میں دبے ہوئے تھے۔ اُن کو چت کر دیا۔ نوابصاحب نے دیکھکر بہت تعریف کی۔ اب تو لکھنؤ کی سرزمین پہلوانوں سے خالی ہے۔ اور حقیقت میں کوئی اس فن کا قدردان بھی نہیں رہا۔

عشرت لکھنوی

رباعی

دزدیدہ نگاہی کا سبب کیا کہئے ۔ بیگانگیِ حسن طلب کیا کہئے
دل کے گاہک ہیں کیا ہی سیانے گاہک ۔ اندازِ پیام زیر لب کیا کہئے

میرزا یگانہ لکھنوی

مطائبات

گرما و سرما

(نیرنگ خیال کے مشہور مزاحیہ نویس حضرت "ادیب" کے قلم سے)

نیرنگ خیال والوں کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ بارود خانہ میں رہ کر سامان آتشبازی کے لئے مضافات میں آرڈر بھیجتے ہیں۔ چنانچہ کل کی ڈاک سے حکیم صاحب کی ایک چٹھی ہمیں موصول ہوئی کہ عید نمبر کے لئے کوئی مضمون از قسم آرزو بھیجکر شکر گزار فرمائیں۔ کوئی ان حضرت سے پوچھے کہ یہ عید الفطر ہے یا لوہڑی کہ آپ اس کے لئے پٹاخوں، چرخیوں، مہتابیوں، آفتابیوں، پھلجھڑیوں، چھچھوندروں اور اناروں کا بندوبست کر رہے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ان بارود خانہ والوں نے اتنی دور بیٹھے ہوئے بغیر دیکھے یہ خوب سمجھ لیا ہے کہ یہ ادیب صاحب بھی کوئی پکے آتش باز ہیں۔ بہت خوب پہچانا حضرت! اب ہم سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ "چہ خوش شناختی آغا!"

ادھر ہماری مضمون نویسی کی طرز و روش عجیب متضاد اصولوں پر مبنی ہے۔ یعنے ہم اپنے مضمونوں میں کسی ثقیل لفظ کا لانا بے ادبی اور کسی خفیف لفظ کا لانا ادب ناشناسی خیال کرتے ہیں۔ اب ناظرین بآسانی خود سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے مضمون لکھ کر ہم نہ ادیب رہ سکتے ہیں نہ مودب۔ لیکن "الامر فوق الادب" پر عمل پیرا ہو کر اب مجبوراً ہم ادب و قواعد کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ یعنے علم ادب کے اصولوں اور قواعد صرف و نحو کے ضابطوں سے بلند تر ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:۔

ہمارا شہر جسے ہم مصلحتاً (یعنے اپنی رسوائی کے ڈر سے) انگریزی طرز میں پہلے لفظ کا صرف پہلا حرف لے کر "آ" آباد کہتے ہیں سطح سمندر سے ۱۲۰۴ فٹ اونچا ہے۔ گو یہ پیمائش ہم نے خود نہیں کی اور نہ ہماری نگرانی میں ہوئی ہے۔ بلکہ زبانی صاحبان انگریز کی ہی سنا ہے۔ اور جو کچھ زبانی صاحبان انگریز کی سنا جاتا ہے اس سے باور نہ کرنا انگریزی خواں مولاناؤں کی شریعت کی رو سے کفر ہے اور تعزیرات ہند کی رو سے بغاوت۔ پس چونکہ ہم نہ کافر کہلانا چاہتے ہیں اور نہ باغی۔ اس لئے طوعاً و کرہاً ہم اس عدد کو صحیح اور بالکل صحیح سمجھ لیتے ہیں۔ البتہ اتنی شہادت ہمارا دل بھی دیتا ہے کہ یہ شہر سطح سمندر سے کچھ اونچا واقع ہے۔ ورنہ اس کا پانی بہہ کر سمندر میں کس طرح جا ملتا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ پانی ہمیشہ نشیب کی طرف جاتا ہے۔ آ۔ آباد کی ۱۲۰۴ فٹ کی بلندی اس وقت بھی ظاہر ہوتی ہے جبکہ کئی گھنٹوں بلکہ کئی دنوں کی لگاتار اور موسلا دھار بارش کے بعد آپ گھر سے باہر تشریف لے جائیں۔ تو سڑکیں اس طرح صاف ملیں گویا ابھی میونسپل کمیٹی والوں نے چھڑکاؤ کیا ہے (لیکن اس میونسپل کمیٹی کو ہمارے شہر کی میونسپل کمیٹی نہ سمجھیں۔ کیونکہ یہ کمیٹی سڑکوں پر پانی چھڑکنے کو کفایت شعاری کے اصولوں کے منافی اور گویا

نیکس و ہندوں کے مصاحبوں کے لئے نہایت مفید ثابت ہوتی ہے) آب آباد کے مقابلہ میں کسی ایسے شہر کو لیجئے جو سطح سمندر سے ۱۲۰ فٹ اونچا نہ ہو۔ دور کیوں جائیے پشاور کو دیکھئے ایک گھنٹہ کی بارش پورے ایک ہفتہ کے لئے اس قدر کیچڑ مہیا کر دیتی ہے جو نہ صرف پشاوریوں بلکہ بچہ سقہ والے کابلیوں اور درہ خیبر کے نواح والے آفریدیوں، ذکاخیلوں اور مہمندوں کے تمام سیاسی، معاشرتی، اخلاقی، مذہبی، تعلیمی، دیہاتی اور گھریلو ضروریات کے لئے کافی اور کافی سے زیادہ ہوتا ہے۔ بارش کے دن یا بارش سے کئی دن بعد کسی بازار سے نکل جائیے۔ ایسا معلوم ہوگا کہ کیچڑ کا ایک دریا بہہ رہا ہے۔ جس کے دونوں کناروں پر دکانیں اور مکان آباد ہیں۔ گویا سری نگر کا شہر ہے کہ دریائے جہلم کے دور تہ پر تعمیر ہوا ہے +

برخلاف اس کے آب آباد کے پانی کا ہر ایک قطرہ اپنی برادری کے دوسرے افراد سے مل کر نالہ دوڑ سے ہوتا ہوا دریائے انڈس (یعنی دریائے سندھ کے راستے) سیدھا کراچی پہنچتا ہے۔ اور پھر سمندر میں جا ملتا ہے۔ یہ اس لئے کہ اس شہر کا پانی ہمیشہ "تھرو پراپر چینل" چلتا ہے۔ یعنی پہلے گلیوں کی نالیوں میں۔ پھر نالہ جب میں پھر نالہ دوڑ میں۔ پھر دریائے سندھ میں پہنچ کر سیدھا اپنے گھر کی راہ لیتا ہے۔ اگر میدانی علاقوں کے پانی کی طرح یہ پانی بھی ادھر ادھر آوارہ ہو جائے تو کبھی منزل مقصود پر نہ پہنچے۔ کیونکہ قانون قدرت کی رو سے منزل مقصود پر پہنچنے کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے۔ اور وہ ذریعہ ہے یہی تھرو پراپر چینل۔ جو کام آپ تھرو پراپر چینل کریں گے وہ کبھی خراب نہ ہوگا۔ اس راہ پر چلئے تو کوئی سنگ راہ آپ کے مزاحم نہ ہو سکیگا آپ نے دیکھا نہیں کہ گذشتہ گرمیوں میں ہی ہمارے علاقے کا پانی اپنی پراپر چینل کے ذریعہ کراچی تشریف لے جا رہا تھا۔ کہ دو کا پل راہ میں مزاحم ہوا۔ پھر کیا تھا۔ نہ دوڑ کا پل تھا اور نہ وہ اس کی مزاحمت۔ چنانچہ آج تک وہ پل دوبارہ تعمیر ہو سکا۔ بلکہ اس کے پایوں کی بنیادیں بھی ابھی قائم نہیں ہوئیں۔ کیا لیکر سوا سو لاکھا (میم ناقص) کا ہزار ہا روپیہ آج تک روڑی کنکریٹ اور سیمنٹ کی شکل میں شتر مرغان محکمہ مارکنا سری کے پیٹ میں جا کر ہضم ہو چکا ہے

ہمارے باتھ روم نے لحقہ ایک باتھ روم ہے جس میں ایک برتن پڑا ہوا ہے جسے انگریزی زبان میں پس پاٹ کہتے ہیں۔ استعمال نہ ہونے سے اس پس پاٹ میں کئی سوراخ کر دیئے ہیں اور پانی ان سوراخوں سے نکل کر باتھ روم کے فرش سے ہوتا ہوا۔ نالی میں چلا جاتا ہے۔ ایک دن ایک صاحب کہنے لگے کہ اس پس پاٹ کو یہاں رکھنے کا کیا فائدہ ہے۔ پانی یوں بھی فرش پر ہو ہی جاتا ہے۔ مناسب ہے۔ چودھری صاحب نے یہ سن کر فرمایا کہ نہیں رہنے دیجئے ہر کام تھرو پراپر چینل ہونا چاہئے۔ اس پر تمام اصحاب نے چودھری صاحب کی اس ضابطہ پسند طبیعت کی بہت داد دی۔ چنانچہ یہ پس پاٹ اب تک وہیں پڑا پراپر چینل کا کام دے رہا ہے +

آپ نے کبھی غور فرمایا کہ ہماری سرکار ہندوستانیوں کی چیخ پکار کے باوجود مہاتما گاندھی کے چرخہ کاتنے کے باوجود مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی خلافت کمیٹی کے باوجود کانگریس کے ریزولیوشن کے باوجود۔ تلک فنڈ کے چندوں کے باوجود۔ مولانا ظفر کے نکاحات کے باوجود۔ انقلاب کے انکار و حوادث کے باوجود۔ مسلم لیگ اور مسلم اوٹ لک کے باوجود۔ ہماری حریت آموز اور حیات افروز نظموں کے باوجود اور سب سے بڑھ کر سائمن کمیشن اور دہلی بم آؤٹ ریج کے باوجود ہندوستان پر کس طرح بااستقلال حکومت کر رہی ہے؟ بات یہ ہے کہ سرکار جو کام کرتی ہے تھرو پراپر چینل کسی کو ڈاماں ایجی سے تو تھرو پراپر چینل کسی کو انڈیا کونسل کا ممبر بنا کر انگلستان بھیجا ہے تو تھرو پراپر چینل۔ غرضیکہ سرکار کے کسی کام میں آپ بے ضابطگی (یعنی آوارہ گردی) نہ دیکھیں گے۔ آپ نے کبھی کسی سرکاری محکمہ میں

کوئی رخواست دی ہے۔ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس پر پہلا حکم یہ ہوتا ہے کہ "سررشتہ سے کیفیت گزرے"۔ آپ کسی پر نالش کریں تو پہلا فقرہ جو آپ کے عرضی دعویٰ پر لکھا جائے گا یہی ہوگا کہ سررشتہ سے کیفیت گزرے۔ یہ سررشتہ کی کیفیت ہماری سرکار کی پراپر چینل کا سب سے پہلا مرحلہ ہے +

آپ روز روشن میں اعلانیہ کچہری میں تمام حکام وقت کی نظروں میں کسی کو قتل کر کے دیکھ لیں۔ موقعہ پر آپ کو کوئی پھانسی نہیں دیگا۔ پہلے ابتدائی رپورٹ مرتب ہوگی۔ پھر پولیس پہ چھاپ کریگی۔ پھر تفتیش کرے گی۔ پھر چالان مرتب کرےگی پھر وہ چالان پاس ہوگا۔ پھر عدالت میں پیش ہوگا۔ گواہان استغاثہ بلائے جائیں گے۔ وہ آپ کے روبرو بیان دیں گے۔ آپ ان پر جرح کریں گے۔ گویا وہ تمام جھوٹ بک رہے ہیں۔ کمرۂ عدالت میں وقتاً فوقتاً آپ کو "زندہ باد انقلاب" کے نعرے لگانے کی بھی اجازت ہوگی۔ پھر آپ کا بیان ہوگا بیان کے بعد آپ پر فرد جرم مرتب ہوگا۔ اور پھر آپ کا مقدمہ سپرد عدالت سشن ہوگا۔ وہاں پھر وہی گواہ اور پھر وہی بیانات از سر نو لکھے جائینگے از سر نو جرح ہوگی۔ آپ کی صفائی کے گواہ لئے جائیں گے جو بروز وقوعہ آپ کو موقعہ واردات سے پانچسو کوس دور بیان کریں گے وکلا کی بحث ہوگی۔ اسیسروں سے رائے پوچھی جائے گی سشن جج فیصلہ لکھیگا اور آپ کے لئے پھانسی تجویز کرے گا۔ یہ تجویز ہائیکورٹ میں جائے گی۔ آپ کی اپیل بھی وہاں سنی جائے گی جو مسترد ہوگی۔ بعد ازاں حضور لاٹ صاحب آپ کی رحم کی درخواست پر غور فرمائیں گے۔ اور اسے نامنظور کریں گے۔ اس کے بعد آپکے پھانسی پر لٹکائے جانے کی تاریخ مقرر ہوگی۔ اس تاریخ پر لاہور سے پانچ روپے یومیہ پر ایک جلاد منگوایا جائے گا۔ جو آپ کو جناب معلی القاب سپرنٹنڈنٹ صاحب بہادر جیل اور ایک اور حاکم وقت کے روبرو صحیح سالم اور بخیر و عافیت گلے میں رسی ڈال کر ایک کنوئیں میں لٹکا دے گا۔ پھر آپ جتنی دیر چاہیں زندہ لٹکتے رہیں۔ اور زندہ لٹکتے لٹکتے تھک جائیں گے تو بیشک مرجائیں کسی کو اعتراض کرنے کا حق حاصل نہ ہوگا +

یہ راز ہے ہماری سرکار کی حکومت کا۔ اگر آج گورنمنٹ عالیہ تھرو پراپر چینل کام کرنا چھوڑ دے تو کل اس کا خاتمہ ہو جائے گا ہمارا تمام گانا ہی بے سُرا ہو جائے گا۔ اور ہم بے شک نظمیں لکھنا چھوڑ دیں +

اور کیا آپ نے کبھی غور فرمایا کہ اللہ میاں روز ازل سے لیکر آج تک خدائی اور شہنشاہی کر رہا ہے۔ اور کبھی کوئی بچہ سقہ اسے تخت و تاج سے محروم کرنے کے لئے نہیں آیا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ بس یہی ہے کہ اللہ میاں کے تمام کام بھی تھرو پراپر چینل ہوتے ہیں۔ وہ قادر مطلق ہے سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ کسی قاعدے یا ضابطے کا قانوناً پابند نہیں۔ لیکن پراپر چینل والے قاعدے کی خلاف ورزی وہ بھی کبھی نہیں کرتا۔ کبھی آپ نے کوئی ایسا آدمی دیکھا ہے جسے اللہ میاں نے تھرو پراپر چینل پیدا نہ کیا ہو۔ کبھی آپ نے کوئی ایسا واقعہ سنا ہے جو تھرو پراپر چینل نہ آیا ہو۔ کبھی خدا نے کوئی درخت ہوا میں اُگایا ہے۔ کبھی اس نے کسی موتی کو گھڑے کے پانی پر اُسودہ کر دی ہے۔ کبھی اس نے بغیر بادل کے مینہ برسایا ہے؟

پس یقین جانیئے کہ دنیا میں کام کامیابیوں کا راز اسی تھرو پراپر چینل والے قاعدے میں پوشیدہ ہے +

بات سے بات نکل آئی اور ہم کہیں سے کہیں جا نکلے۔ مدعا صرف یہ تھا کہ آب آباد کے پانی کا ہر ایک قطرہ تھرو پراپر چینل بحر ہند میں جا پہنچتا ہے اور اس لئے اس شہر میں لیچڑ کا نام نہیں ہوتا۔ سطح سمندر سے ۴۱۰۰ فٹ بلند ہونے کا ایک تو فائدہ تھا۔ اور دوسرا یہ ہے کہ یہاں گرمی بہت کم ہوتی ہے۔ سردی بہت زیادہ۔ گو ہم نے سائنس سکول میں بھی پڑھی تھی اور ایک مولوی صاحب امام مسجد سے بھی۔ لیکن ابتک سمجھ

سمجھ میں یہ بات نہیں آسکی کہ جو شہر سطح سمندر سے اتنا اونچا ہو جیسے میدانی ملکوں کے مقابلہ میں سورج سے استقدر قریب تو وہاں گرمی کیوں کم ہو۔ اور سردی کیوں زیادہ۔ بہرحال ہم سے زیادہ مملکت خویش خسرواں دانند۔ ہم کو اس سے کیا پڑی ہے ہم تو یہ دیکھ کر خوش ہیں کہ یہاں گرمی زیادہ نہیں ہوتی +

اور شہروں میں بھی گرمی آتی ہے۔ اور گرمی کے بعد سردی سردی آتی ہے اور سردی کے بعد گرمی۔ گرمی اپنے ساتھ گرمی کے سامان لاتی ہے۔ اور سردی اپنے ساتھ سردی کے سامان لیکن ہمارے شہر کے گرمی کے سامان اور شہروں کی گرمی کے سامان اور ہمارے شہر کی سردی کے سامان اور شہروں کی سردی کے سامان سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اور شہروں کی گرمی اپنے ساتھ جسم کو جھلسا دینے والی گرم ہوائیں لاتی ہے۔ آندھیاں۔ پسینہ لاتی ہے اور سن سٹروک جس کی نشانیاں لاتی ہے اور بجلی کے پنکھے۔ رنگا رنگ کے شربت لاتی ہے اور کارخانے کی برف۔ ہمارے شہر کی گرمی ان چیزوں میں سے ایک چیز بھی اپنے ساتھ نہیں لاتی +

ہماری گرمی جو سامان اپنے ساتھ لاتی ہے اس کی صورت بھی ملاحظہ ہو۔ جوہی موسم بہار (جسے شاعر لوگ فصل گل بھی کہتے ہیں) رفتہ رفتہ مصدر کی گردان میں ماضی مطلق پر پہنچا اور گرمی نے ظہور کیا کہ اسی روز علی الصباح جب کہ آپ بستر استراحت پر ابھی آرام فرماتے ہوں گے۔ باہر سڑک سے ایک نہایت مترنم آواز آنے لگی "لو الو جونکاں" +

پس اس روز سے سمجھئے کہ گرمی آگئی ہے اور پنجاب میں اس کی یہی ہے۔ ان جونکوں والے خانہ بدوشوں کو خدا جانے کیسے کہہ دیا ہے کہ آتے۔ آباد کے رہنے والوں کا خون گرمیوں کے شروع میں ہی فاسد ہو جاتا ہے۔ کہ یہ لوگ جوق در جوق یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اور گلی گلی کوچے کوچے پکارتے پھرتے ہیں "لو الو جونکاں" +

دوسرے روز شام کے وقت آپ سیر کو نکلیں گے تو دیکھیں گے کہ چوک میں ایک مداری ڈگڈگی بجا رہا ہے۔ اور شہر کے تمام بیکار لوگ اس کے گرد جمع ہیں۔ یہ مداری ہمارے پولیٹکل مداریوں جیسے بعض ہندوستانی لیڈروں کی طرح کچھ شعبدے دکھائیگا اور کچھ فضول باتیں سنا کر لوگوں کی جیبیں خالی کرائے گا۔ اور تماشا ختم ہونے پر یہاں جب پھر کرکے دل ہی دل میں ہنستا ہوا کسی سرائے کو چلا جائے گا۔ کہ آج خوب الو بنائے۔ کل پھر دیکھیں گے۔ یہ دوسری قسم کا سامان ہے جو ہماری گرمی اپنے ساتھ لاتی ہے +

اس سے ایک دو روز بعد آپ ابھی صبح کی چائے پی رہے ہوں گے کہ ملازم کسی میجیکل پروفیسر کا وزٹنگ کارڈ آپ کے سامنے لا کر رکھ دیگا۔ آپ باہر تشریف لے جائیں گے تو اپنے دفتر میں ایک اچھے خاصے پروفیسر نما جانور سے ملاقی ہونگے۔ جو آپ کو دیکھتے ہی آپ کے سامنے ایک کتاب رکھ دے گا۔ جس میں راجاؤں نوابوں رئیسوں۔ خان بہادروں تمنداروں۔ وکیلوں بیرسٹروں اور ایسوں ویسوں کے بیسیوں سرٹیفیکٹ ہوں گے جن میں لکھا ہوگا کہ ان پروفیسر صاحب نے کیا کیا شعبدے دکھائے۔ اور ان کے کمال فن کی داد دیجئے +

اگر ناظرین ابھی تک نہیں سمجھے تو ہم یہ سمجھانے کی تکلیف گوارا کر لیتے ہیں کہ یہ میجیکل پروفیسر صاحب بھی ذات کے وہی مداری ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پڑھے لکھے ہیں۔ اور موہوم آمدنی کے بھروسے پر چوک میں تماشا نہیں دکھاتے۔ بلکہ اُجرت پہلے مقرر کرکے کسی ہال میں شعبدہ بازی کرتے ہیں۔ ان حضرت کی تشریف آوری پر آپکو اور بھی زیادہ یقین ہو جائیگا۔ کہ گرمی آگئی!

اُسی روز یا اس کے ایک دو روز بعد آپ اپنے دفتر میں بیٹھے کسی پیشہ کے دھندے میں لگے ہونگے کہ ایک نہایت شریف وضع قطع اور مستجع انسان جو سرتا پا انگریزی لباس میں ملبوس

ہوگا۔ ایسی رسیلی آواز سے آپ کو گڈ مارننگ کہے گا کہ آپ فوراً تاڑ جائیں گے کہ کسی بیمہ کمپنی کا ایجنٹ ہے۔ وہ آپ سے کہیگا کہ جناب زندگی کا بیمہ کرا لیجئے (ورنہ مر جانے کا اندیشہ ہے) اور بیمے کے فواید پر بزبان انگریزی اتنی فصیح و بلیغ تقریر کریگا کہ جواب میں آپ کی انگریزی بھی آپ کو جواب دے جائیگی۔ اور آپ کے دلایل بھی اُس کے دلایل کے سامنے پھیکے پڑ جائینگے لیکن آپ کو متردد دیکھ کر وہ کہے گا کہ آپ غور فرمالیں میں پھر حاضر ہوجاؤنگا۔ چنانچہ بھوت کی طرح وہ آپ کے سر پر ایسا سوار ہوگا کہ کوئی دن خالی نہ جائے گا۔ حتی کہ آپ اپنی آمدنی کا ایک معتد بہ حصہ بیمہ کمپنی کی نذر کرنے پر مجبور ہوجائیں گے۔ اِلّا ماشاءاللہ۔ ان حضرت کی آمد گرمی کی آمد کی گویا ایک ساطع دلیل ہے ✦

اسی پر بس نہیں۔ مختلف قومی کالجوں۔ سکولوں مسجدوں مندروں۔ گئوشالوں۔ پاٹھ شالوں۔ انجمنوں۔ سبھاؤں اور یتیم خانوں کے سفیر (جن میں بعض اصلی اور اکثر جعلی اور نقلی ہونگے) چندہ لینے کی غرض سے ایک ایک، دو دو روزانہ کے حساب سے آپ کے پاس تشریف لائیں گے۔ اور باوجود آپ کے تمام حیلوں اور تمام حجتوں کے آپ کو قلاش کرکے چھوڑیں گے۔ پہلے نہیں۔ یہ ایک اور تحفہ ہے۔ جو ہماری گرمیاں ہمارے لئے لاتی ہیں ✦

آپ ابھی کسی چندے والے سے جان چھڑانے کی تجاویز سوچ رہے ہوں گے کہ باہر سے بین کی آواز آئے گی۔ اتنے میں۔ اتنے میں ایک عجیب ہیئت کا انسان آپ کے سامنے آکر بیٹھ جائے گا۔ اور نہایت مؤدبانہ لہجہ میں کہیگا کہ حضور کچھ کیڑے لایا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیے۔ بین بجاتا جائے گا اور مختلف قسموں کے سانپ نکال نکال کر آپ کے سامنے رکھتا جائے گا۔ اور اور جبتک کچھ ربود کر نہ لے گا پیچھا نہ چھوڑیگا۔ یہ ایک اور نشان ہے اس امر کا کہ میدانی ملکوں میں گرمی زوروں پر آگئی ہے ✦

قصہ مختصر یہ کہ گرمی آئی اور ساتھ کیا لائی۔ جونکوں والے۔ مداری میجیکل پروفیسر۔ بیمہ کمپنیوں کے ایجنٹ۔ چندہ جمع کرنے والے اور سپیرے۔ انہی غریبوں پر کیا موقوف ہے۔ گرمیاں آتے ہی پنجاب اور صوبہ سرحد کے نواب۔ خان بہادر۔ ڈپٹی۔ جج۔ منصف۔ وکیل۔ بیرسٹر۔ تاجر۔ ساہوکار۔ سرکس والے (تھیٹر کمپنی کبھی نہیں آئی) تپ دق والے۔ مختلف محکموں کے انسپکٹر ہیڈ ماسٹر اور پروفیسر سیکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں آموجود ہوتے ہیں ✦

جس طرح اور تمام چیزیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک بڑی قسم کی اور ایک چھوٹی قسم کی۔ اسی طرح پروفیسر بھی دو قسم کے ہوتے ہیں ایک بڑی قسم کے اور ایک چھوٹی قسم کے۔ مثلاً اگر دو بھائی سنت اعمال سے پروفیسر ہوگئے تو بڑے بھائی بڑی قسم کے پروفیسر ہوں گے۔ اور چھوٹے بھائی چھوٹی قسم کے پروفیسر۔ ہم آیندہ بڑی قسم کے پروفیسر کو بڑے پروفیسر صاحب اور چھوٹی قسم کے پروفیسر کو چھوٹے پروفیسر صاحب کہیں گے ✦

گزشتہ گرمیوں کا ذکر ہے۔ دروغ برگردن راوی (کار سوئے لاہور است) جولائی کی بائیس تاریخ تھی کہ چھوٹے پروفیسر صاحب کا تار ہمیں اُس وقت ملا۔ جبکہ ہم ایک عدالت میں کھڑے باتوں باتوں میں اپنے موکل کی فیس ہضم کر رہے تھے۔ [illegible] لکھا تھا کہ بدولت شام کی گاڑی سے تشریف لا رہے ہیں اور آپ کے لئے بہت سی کتابیں بھی ساتھ لا رہے ہیں۔ بس [illegible] کیا چاہئے دیوانہ را ہوئے بس است۔ ہمیں اُلو بنانے کے لئے کتابوں کا لینا کافی تھا۔ اور پھر یہ کہ بہت سی کتابیں۔ اس پر مستزاد چھوٹے پروفیسر صاحب کے آنے کی اطلاع تھی جن کے [illegible] ہر وقت چشم براہ رہتے تھے۔ گو بڑے پروفیسر صاحب [illegible] سے آئے بیٹھے تھے۔ لیکن وہ تھے سراسر ایم۔ اے [illegible] تولتے تھے پھر بولتے تھے۔ ہم ہوئے اتنے آباد [illegible] اور بیہودہ شغل۔ لغویات علمی اور واہیات ادبی ہماری

بھلا ہم ان تلی چھی باتوں سے کیا خطا ندوز ہوتے ۔

پس شام ہوتے ہی ہم تمام دینی (؟) اور دنیاوی کام چھوڑ کر سردار صاحب کے موٹر میں چودھری صاحب کو ہمراہ لئے سیدھے سٹیشن پر جا پہنچے (جو شہر سے دس میل کے فاصلہ پر ہے) انتظار کا ایک ایک لمحہ (اگر آپ نے کبھی کسی کا انتظار کیا ہوگا تو معلوم ہوگا) سال سال بھر کا ہوتا ہے۔ بہرکیف انتظار کی گھڑیاں کٹ گئیں اور ریل گاڑی سٹیشن پر پہنچ ہی گئی۔ اب چھوٹے پروفیسر صاحب اور اُن کے ساز و سامان کی کیفیت سنئے کہ علاوہ دیگر سامان اور کتابوں کے آٹھ دس بکسوں کے ایک بکس ہارمونیم باجے کا تھا۔ ایک بکس طبلوں کا۔ ایک تھیلا (قد آدم کے برابر) ستار کا اور دوسرا تھیلا (قد آدم سے بھی زیادہ) دلربا کا۔ یہ دُبلے پتلے جسم کے گندم رنگ سرو قد چھوٹے پروفیسر صاحب رومی ٹوپی بند گلے کی لمبی اچکن وضع کوٹ اور شلوار کے ساتھ (اور باایں ہمہ ساز و سامان) ایک عجیب و غریب چیز نظر آتے تھے ۔

مختصر یہ کہ گرمیوں کے ان دو اڑھائی مہینوں میں یا چھوٹے پروفیسر صاحب تھے اور یا ہمارے یارانِ طریقت۔ چودھری صاحب اور شاہ صاحب اور سردار صاحب۔ دن رات مجلس گرم رہتی تھی۔ چھوٹے پروفیسر صاحب کے علمی اور ادبی لطیفوں۔ اُن کے لطیفے [illegible] ہارمونیم ستار اور دلربا کی تانوں اور موسیقی کے [illegible] اور باریک ترانوں کی آوازیں آج تک کانوں میں گونج رہی [illegible] خصوصاً جب وہ ہمارا یہ شعر

زیرش مراد است و کعبہ مرید ش

مومن دلِ من کافر دلِ من

[illegible] پر مقامات زیر میں گایا کرتے تھے۔ تو ہم پر ایک وجد کی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ ایک تو شعر ہمارا اور پھر گانے والے ہمارے چھوٹے پروفیسر صاحب۔ کبھی کبھی جب شاہ صاحب ہارمونیم پر۔ میاں چھنن ستار پر۔ چھوٹے پروفیسر صاحب (طبلوں کی) جوڑی پر۔ گورکھا بابو وایولن پر بالاتفاق لگ جاتے تھے تو سڑک پر چلنے والے رہرو بھی جھومنے لگ جاتے تھے ۔

یہ چھوٹے پروفیسر صاحب بھی دست قدرت کے ایک عجیب شاہکار ہیں۔ طبیعت استدر متحرک کہ دن بھر ایک لحظہ نہ بیٹھتے تھے۔ انگریزی کتابیں پڑھتے پڑھتے اُکتا گئے تو فارسی کتابیں پڑھنی شروع کر دیں۔ پڑھنا چھوڑا تو لکھنا شروع کر دیا لکھنا چھوڑا تو جوڑی لے کر بیٹھ گئے۔ انگلیوں نے جواب دیا تو ستار لے بیٹھے بس ستار کو ایک کونے میں رکھا تو دلربا کے ساتھ دل بہلانے لگے۔ اُدھر سے دل اُٹھا تو ہارمونیم سامنے رکھ لیا۔ شانِ جبلا مشاغل یہ۔ نہ کوئی ورزش نہ صبح شام کی سیر۔ پھر کھانے پر بیٹھیں تو دو اڑھائی سیر گوشت (صرف بھونا ہوا) اکیلے کھا جائیں۔ ذہانت ایک نعمت اللہ تو تیرہ من ذکاء۔ یہ شاید فارسی کے ایم۔ او۔ ایل ہونے کی برکت ہے۔ ورنہ صرف انگریزی کے ایم۔ اے تو ہم نے اور بھی کئی دیکھے ہیں ۔

ادبی دنیا کے رہنے والے انسانوں کی شکل و شباہت کے متعلق لوگوں کے قیاس عجیب و غریب نوعیت کے ہوتے ہیں آپ نے اگر کسی مصنف کی کوئی کتاب پڑھ لی یا کسی شاعر کی کچھ نظمیں دیکھ لیں۔ یا کسی مضمون نگار کے چند مضمون کسی رسالے میں ملاحظہ فرما لئے تو بس آپ نے فی الفور اُس مصنف یا شاعر یا مضمون نگار کے قد و قامت خد و خال اوضاع و اطوار اور لباس کے متعلق ایک ذہنی تصویر اپنے دل میں کھینچ لی۔ پھر جس وقت آپ اس کا نام سنینگے۔ یا اس کی کوئی تحریر پڑھیں گے تو فوراً وہ موہوم حلیہ آپ کی آنکھوں کے سامنے آ جائے گا۔ یہ مشق بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچیگی کہ آپ کو یہی یقین ہو جائے گا کہ وہ کم بخت مضمون نویس یا شاعر یا مصنف فی الحقیقت اسی شکل کا انسان ہے۔ گویا آپ نے اسے کئی بار دیکھا ہے۔ سوئے اتفاق سے اگر کہیں آپکی اس سے ملاقات ہوگئی تو وہ تمام طلسم ٹوٹ جائے گا۔ اور آپ استغ

مایوس ہونگے کہ نوبہ ہی بھلی۔ آپ نے سُنا نہیں کہ پچھلے دنوں مولانا نیاز۔ علامہ اقبال کو دیکھ کر اسیطرح مایوس ہوئے تھے۔ اور یہ مایوسی ایسی پریشان کن تھی کہ مولانا کے حواس بجانہ رہے۔

اسی طرح ہماری کتابیں خریدنے والے۔ ہماری نظمیں پڑھنے والے اور ہمارے مضمون دیکھنے والے کبھی کبھی ہماری تیرہ بختی سے ہم سے ملنے بھی آجاتے ہیں اور ہمیں دیکھ کر ہمیشہ مایوس ہوتے ہیں۔ اُن میں سے کئی احباب جن کی طبیعت کی اُفتاد قدرے بے تکلف ہوتی ہے۔ ہمارے منہ پر ہمیں کہہ دیتے ہیں کہ... صاحب آپ کو دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی۔ اس وقت یہی جی میں آتی ہے کہ اُن کی بے تکلفی کا جواب ایسا بے تکلفی سے دیا جائے کہ دیوان سوزنی کا نثر میں جواب کہلا سکے۔ لیکن آپ ہی انصاف کریں کہ انسان کس کس سے لڑے اور کہاں تک لڑتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے ابتک حکیم صاحب سے یہ درخواست نہیں کی کہ ہمارا فوٹو رسالے میں چھاپ دیجئے۔ خیال آتا ہے کہ تھوڑی بہت بنی ہے۔ بنی رہے۔

ہم حیران ہیں کہ یہ لوگ یہ غائبانہ تصویریں دل میں کیوں کھینچ لیتے ہیں۔ اور پھر اس بات پر مصر ہوتے ہیں کہ وہ شاعر یا ناثر جب کبھی اُن کے سامنے آئے اپنی واقعاتی صورت کو گھر چھوڑ آئے اور ان کی خیالاتی تصویر بن کر ان کے سامنے پیش ہو۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ادبی فضا میں نشوونما پانے والے ذی روح لینے کتابیں یا نظمیں یا مضمون لکھنے والے انسان تمام تر باغ بہشت سے بھاگے ہوئے حور و غلمان ہوں یا دشتِ نجد سے نکالے ہوئے قیس عریاں۔

مثلاً (آپ انصاف کریں) ہم نے آجتک مولانا...کو نہیں دیکھا (نام لے کر کون لڑائی مول لے) صرف ان کی حسین و جمیل ادبیات کا مطالعہ کیا ہے۔ کیا ہم اُن کے متعلق دل میں یہ خیال کر سکتے ہیں کہ اُن کا پندرہ یا سولہ برس کا بن ہوگا۔ سرو قامت ہونگے (اور قد رعنا میں وہ سج دھج ہوگی کہ قیامت بھی دیکھ کر شہید ہو) رفتار سے کبک دری کو شرمندہ کرتے ہوں گے (اور موج خرام کیا کیا گل نہ کترتی ہوگی) آنکھیں مست ہونگی (اور ہزار ہا میکدے آپ کی چشم نیم باز کی گردش کے ہمرکاب ہوتے ہونگے) صراحی دار گردن سفید صاف اور شفاف ہوگی (پانی پیتے ہونگے تو گلے سے اُترتا نظر آتا ہوگا) رخسار بہشتی پھولوں کا گلدستہ ہونگے (اور اگر ذرا پی لیتے ہوں گے تو چہرہ نرم سے سعدی کی گلستاں بن جاتا ہوگا) پلکیں تیر و خنجر سے خونریز تر ہونگی (اور کبھی سرمہ لگا لیتے ہونگے تو دشنۂ مژگاں کی تیزیِ امتحان کے قابل ہوتی ہوگی) محراب ابرو سجدہ گاہ عشاق ہوگا (اور اسے دیکھ کر عاشقوں کی جبینِ نیاز میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں سجدے تڑپ اُٹھتے ہونگے) سُرخ ہونٹوں کی آب و تاب کے تصور میں لعل بدخشانی ہزاروں کوس دور کان میں پڑا کانپ جاتا ہوگا۔ اُن کے دُرِ دنداں کا خیال آتا ہوگا تو بحرِ اوقیانوس کی پُرسکون گہرائیوں میں کتنے شاہوار موتی امن صدف کے اندر ہی اندر مارے شرم کے پانی پانی ہوجاتے ہونگے۔ سبزۂ خط کی دلآویزی کا وہ عالم ہوگا کہ خود رضوان کبھی اس کو اور کبھی چمن فردوس کے حواشی کو دیکھتا ہوگا (گویا اس اصل سے اُس نقل کا مقابلہ کر رہا ہے) اور ہونٹوں کے نزدیک ضرور ایک تل بھی ہوگا جسے بعض لوگ دیکھ کر حیران ہوتے ہوں گے کہ یہ آگ پر بارود کا دانہ کیسے پڑا ہے۔ اور بعض لوگ دیکھ کر خیال کرتے ہونگے کہ حوضِ کوثر کے کنارے پر حضرت بلالؓ کھڑے ہیں۔ اور بعض نکتہ شناس آدمی اسے صفحۂ عارض پر نقطۂ انتخاب سمجھتے ہونگے۔ اور اگر طبیرغاریابی زندہ ہوتے تو اُسے دیکھ فی البدیہہ یہ کہہ اُٹھتے کہ

یکے خالِ سیہ جا کردہ بر کنج لبِ لعلش
تو گوئی بر لبِ آبِ بقا بنشستہ ہندوئے

اب اگر آتش شوق تیز ہو جائے اور ہم مولانا...کو دیکھنے... چلے جائیں اور وہاں پہنچکر جب انہیں دیکھیں تو

ہماری تمام اُمیدوں پر پانی پھر جائے اور ایک "صدر جہ غیر شاعرانہ" صورت نظر آئے۔ تو فرمائیے اس میں قصور ہمارا ہے یا مولانا ۔ ۔ ۔ ۔ کا ✦

یا مثلاً ہم نے آج تک علامہ ۔ ۔ ۔ ۔ کو نہیں دیکھا (نام لے کر بے ادبی کیوں کریں)، صرف اُن کی فلسفیانہ اور قومی درد سے بھری ہوئی نظمیں پڑھی ہیں۔ تو کیا ہم اُن کے متعلق یہ خیالی نقشہ دل میں بنا سکتے ہیں کہ سن شریف نوے سے متجاوز ہوگا۔ قد فلسفے کے بوجھ سے جھک کر کمان بن گیا ہوگا۔ چلتے ہوں گے تو عصا کے سہارے نہایت آہستہ آہستہ۔ قوم کے درد میں رات دن رو رو کر آنکھیں خراب کر لی ہونگی۔ سر اتنا وزنی ہوگا کہ گردن اُس کے بوجھ سے دب گئی ہوگی۔ چہرہ زرد ہوگا۔ گوشت کا نام نہ ہوگا۔ ہڈیاں نکلی ہوئی ہوں گی۔ سیل اشک کی روانی کے نشان دونوں رخساروں پر نمایاں ہونگے۔ پلکیں جھڑ چکی ہونگی۔ ابرو اتنے لٹک گئے ہونگے کہ جب تک اُن کو دونوں ہاتھوں سے اُٹھاتے نہ ہونگے کچھ دیکھ نہ سکتے ہونگے۔ ہونٹ خشک ہونگے مُنہ میں ایک دانت نہ ہوگا (صرف قوم کا غم کھاتے ہوں گے کھانا کھانے سے بے نیاز ہونگے) ڈاڑھی سفید ہوگی لیکن بال صرف اتنے ہونگے کہ اُنگلیوں پر گنے جا سکیں۔ کمر سے اوپر کا لباس فلسفیانہ ہوگا۔ اور نیچے کا شاعرانہ۔ جس مکان میں رہتے ہونگے اُس کی چھت فلسفیانہ ہوگی اور نیم شاعرانہ۔ متعلقین نصف شاعر ہوں گے اور نصف فلسفی۔ ماتھے سے فلسفیانہ نور کی کرنیں اُٹھ اُٹھ کر دیکھنے والوں کی آنکھوں کو چندھیا دیتی ہونگی۔ چہرے کی شاعرانہ روشنی رات کو دن بنا دیتی ہوگی۔ بات چیت کرتے ہوں گے تو ایسا معلوم ہوتا ہوگا کہ کوئی مصری قاری کلام مجید پڑھ رہا ہے ✦

پھر اگر ہمیں کبھی ۔ ۔ ۔ ۔ جانے کا اتفاق ہو جائے۔ اور ہم علامہ ۔ ۔ ۔ ۔ کے ملنے کا موقع بھی مل جائے۔ تو یہ دیکھ کر کہ وہ ہماری اس ذہنی تصویر کے خلاف ایک ہشاش بشاش خوش صورت۔ خوش وضع درمیانی عمر کے ایک آدمی ہیں ہمارا کیا حق ہے کہ ہم اُن سے روٹھ جائیں۔ اور گھر آ کر اُن کو کوسنا شروع کر دیں؟

بارے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم (لیفٹننٹ بدولت صاحب اور چھوٹے پروفیسر صاحب اور بڑے پروفیسر صاحب ایک دوسرے کو دیکھ کر کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ اور ہوں بھی کیوں ہم مصنف ہیں لیکن قد و قامت مصنفانہ نہیں۔ شاعر ہیں لیکن خد و خال شاعرانہ نہیں مضمون نگار ہیں لیکن وضع قطع اور لباس مضمون نگارانہ نہیں چھوٹے پروفیسر صاحب انگریزی کے ایم۔ اے ہیں۔ لیکن شکل انگریزی نہیں۔ فارسی کے ایم۔ او۔ ایل ہیں لیکن صورت فارسی نہیں)۔ ایک نہایت عظیم الشان کتب خانہ کے مالک ہیں لیکن چہرہ کتابی نہیں۔ فن موسیقی کے ماہر ہیں لیکن قطع و برید قطعاً تان سینی نہیں۔ بڑے پروفیسر صاحب مشہور مصنف ہیں لیکن شکل و صورت بالکل انسانوں کی سی۔ پرانے ایم۔ ایس سی ہیں۔ لیکن خط و خال بالکل غیر سائنٹفک۔ پُرانے اُستاد ہیں لیکن مشاغل بالکل غیر طالب علمانہ ✦

یہی وجہ ہے کہ جب ہم ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں تو ہرگز مایوس نہیں ہوتے۔ بلکہ خوش ہوتے ہیں۔ کہ اگر ہم ایسے ہیں تو یہ بھی بالکل ویسے ہی ہیں۔ والحمد للہ علیٰ ذلک ✦

ہمیں بے حد افسوس ہے کہ گذشتہ گرمیوں کی یہ روح پرور صحبتیں چشم زدن میں گزر گئیں۔ کیا خوب کہا ہے مرقع چغتائی والے غالب نے ؏

گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

گرمیاں گزر گئیں اور سردیاں شروع ہو گئیں۔ جونکوں والے چلے گئے۔ مداری چلے گئے۔ میجیکل پروفیسر چلے گئے۔ بیمہ کمپنیوں کے ایجنٹ چلے گئے۔ چندہ مانگنے والے چلے گئے۔ نواب چلے گئے۔ خان بہادر چلے گئے۔ ڈپٹی چلے گئے۔ جج چلے گئے

منصف چلے گئے۔ وکیل اور بیرسٹر چلے گئے۔ تاجر چلے گئے۔ سادھو فقیر اور سیر کرنے والے چلے گئے۔ تپ دق والے کرائی یہاں ہی مر اور کوئی واپس چلے گئے۔ انسپکٹر ہیڈ ماسٹر اور پروفیسر بیٹھے گئے۔ رہ گیا صرف خدا کا نام اور خدا کے نام لیوا اسے آباد کریں ۔

اب سنئے کہ سردی اپنے ساتھ کیا لائی۔ صرف برف گلیوں میں برف ہے۔ سڑکوں پر برف ہے۔ چھتوں پر برف ہے۔ درختوں پر برف ہے۔ شہر کی پہاڑیوں پر جہاں موسم گرما میں صنف نازک کے بے شمار ریوڑ چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔

اب برف ہے اور صرف برف ہے۔ زمین اور آسمان سفید ہیں۔ بادل سفید ہیں اور تمام فضا سفید ہے۔ وہی آبادی جو گرمیوں میں فردوس بریں کا ایک ٹکڑا نظر آتا تھا اور جس کی سرسبز پہاڑیاں، رنگا رنگ پھولوں کے بے شمار چھوٹے چھوٹے چمن، سرو وصنوبر، دیودار اور یوکلپٹس، سفیدے اور چنار، وادئ کشمیر کے دلفریب مناظر کو بھی شرمندہ کرتے تھے۔ آج سنسان پڑا ہے۔ اور زمہریر کا خطہ بن گیا ہے۔ بند کمروں میں انگیٹھیاں جل رہی ہیں اور بچے، جوان اور بوڑھے ان انگیٹھیوں کے گرد اگرد بیٹھے آتش پرستی کر رہے ہیں۔ کاش وہ لوگ جو اسے آباد میں گرمی بسر کرنے آتے ہیں۔ یہاں کی سردی بھی آکر دیکھیں اور قدر عافیت معلوم کریں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ بہار بھی ایسی ہی خزاں کے بعد آتی ہے۔ جہاں ایسی خزاں نہیں وہاں بہار بھی نہیں۔ میدانی ملکوں کے لوگ تو بہار کا مفہوم ہی نہیں جانتے۔ معلوم نہیں وہ غزلوں میں بہاریہ اشعار پڑھ کر کیا سمجھتے ہونگے۔ ہم سکول میں پڑھتے تھے تو نظم کی کتابوں کے ساتھ سکول ماسٹروں کی بنائی ہوئی ان کتابوں کی فرہنگیں بھی خرید لیا کرتے تھے۔ یہ فرہنگیں ہماری معلومات میں جو اضافہ کرتی تھیں اور ان کے ذریعے اشعار کے سمجھنے میں جو مدد ہمیں ملا کرتی تھی۔ اس کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

عقیق۔ ایک قیمتی پتھر کا نام ہے ۔

لعل رمانی۔ ایک قیمتی پتھر کا نام ہے ۔

یاقوت ایک قیمتی پتھر کا نام ہے ۔

صنوبر۔ ایک درخت کا نام ہے ۔

شمشاد ایک درخت کا نام ہے ۔

لالہ۔ ایک پھول کا نام ہے ۔

ریحان۔ ایک پھول کا نام ہے ۔

یاسمن ایک پھول کا نام ہے ۔

عنبر ایک مشہور خوشبو کا نام ہے ۔

مشک ایک مشہور خوشبو کا نام ہے۔ وغیرہ وغیرہ ۔

اب اس فرہنگ کی مدد سے مندرجۂ ذیل اشعار کو سمجھیے اور ان سے بہرہ اندوز ہونے کی کوشش فرمائیے۔ خاک بھی نہ سمجھئے گا ۔

گر عقیق لب او در دہنم آب شود
عاشق تشنہ محال است کہ سیراب شود

ز غنچہ لعل رمانی چو مے بیند مے خندند
ز رویم راز نہانی چو مے بیند مے خوانند

یاد بادا آنکہ چو یاقوت قدح خندہ زدے
درمیان من و لعل تو حکایتہا بود

چنداں بود کرشمہ و ناز سہی قداں
کاید بجلوہ سرو صنوبر خرام ما

نسیم لطف تو رباغ دامنے بفشاند
دمید نکہت عنبر ز طرۂ شمشاد

چو لالہ جفنم سیلہ خار داری تیرہ رخ   بیا کہ تا بسحر دوش درکنار نہ ما

یکے مست آمد ورفتن سبک روحاں
عزیزدار ریاحین بوستانی را نا ؟

دلبرے چوں تو ندیدیم بنازک بدنی
کشود از شرم گرم بخت یاسمنی

مشک بر داغ دل سوختگاں افشاند ؟
سرمہ چوں از کف مژگاں سیاہش ریزد

بعینہ یہی کیفیت ہے اُن لوگوں کی جنہوں نے بہار کی پہلی بہار کبھی نہیں دیکھی اور بہاریہ اشعار پڑھتے ہیں اور لکھتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔ ہمارے بڑے پروفیسر صاحب اور ہمارے چھوٹے پروفیسر صاحب اور میدانی علاقوں کے دیگر صاحبان بہاریہ نظمیں پڑھتے بھی ہیں اور سُنتے بھی ہیں اور لکھتے بھی ہیں۔ لیکن وہ یقین جانیں کہ اگر ایک دفعہ وہ ایسی بہار جو صحیح معنوں میں بہار کہلا سکتی ہو۔ دیکھ لیں۔ تو پھر بہاریہ اشعار سے جو لطف انہیں حاصل ہوگا۔ وہ پہلے کبھی نہ ہوا ہوگا ؟

لیکن معاذ اللہ اس سے ہماری یہ مراد نہیں کہ یہ حضرات مستقل بہار بھی یہاں آکر گذاریں۔ اور برفانی علاقے بھی بہت ہیں۔ کہیں جاکر رہیں۔ باقی عند التلاقی ؟

ادیب
آے۔ آبادی

غزل

(راؤ بہادر حاجی محمد عبدالحمید خاں منظرؔ باغپت)

ہمیں جب اُٹھ گئے دُنیا سے دورِ آسماں کیوں ہو
خزاں پھر کس لئے آئے بہارِ گلستاں کیوں ہو

خزاں جائے بہار آئے زمانہ کروٹیں بدلے
قسم کھائی ہے ضبطِ عشق کی لب پر فغاں کیوں ہو

وہ بیمارِ ستم بہتر ہے نذرِ تیغ قاتل ہو
دمِ آخر رہینِ منّتِ دردِ نہاں کیوں ہو

تعلق جب نہیں بجلی گرے یا نذرِ آتش ہو
گرفتارِ قفس ہوں مجھ کو فکرِ آشیاں کیوں ہو

جہاں بیٹھے ہیں اُس کو منزلِ مقصود سمجھا ہے
دلِ وقفِ تصوّر کو خیالِ کارواں کیوں ہو

نکلنا ہو نکل جائے جو رہنا ہو تو رہ جائے
کسی کی منتظر قالب میں جانِ ناتواں کیوں ہو

تخاطب حضرتِ منظرؔ سے باتیں مجھ سے کیجائیں
ہماری گفتگو میں اور کوئی درمیاں کیوں ہو

منظرؔ

سلطان ٹیپو شہید

(از ڈاکٹر اعظم کریوی)

انگریزی مورخوں نے سلطان ٹیپو کے متعلق اس قدر غلط بیانی سے کام لیا ہے کہ خدا کی پناہ۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا الزام رہ گیا ہو جو اس پر نہیں لگایا گیا۔ اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ بعض زبردست مسلمانوں سے بھی فارسی میں ایسی کتابیں لکھائی گئیں جن میں ٹیپو کی تصویر نہایت بھیانک کھینچی گئی ہے اور ہر قسم کی برائیاں خصوصاً مذہبی تعصب و جبریہ اشاعت اسلام اس سے منسوب کی گئی ہیں۔ حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جن بادشاہوں نے انگریزی حکومت کی مداخلت ہندوستان میں ناپسند کی ان کو انگریز مورخوں نے خوب بدنام کیا۔ چنانچہ مشہور انگریزی مورخ سرجان کئی جو انڈیا کونسل کے شعبۂ خفیہ کا سکرٹری رہا ہے خود تسلیم کرتا ہے کہ

"ہم لوگوں کا یہ ایک عام طریقہ ہے کہ پہلے کسی دیسی حکمران کی سلطنت پر قبضہ کرتے ہیں اور پھر اُس معزول بادشاہ یا اُس کے جانشین کو بدنام کرتے ہیں۔" (ہسٹری آف دی سپائی وار از سرجان کئی جلد ۲)

انگریز مورخوں نے خاص طور پر مندرجہ ذیل دو الزامات سلطان ٹیپو پر لگائے ہیں:-

(۱) انگریز قیدیوں کے ساتھ سلطان ٹیپو نے اچھا سلوک نہیں کیا۔

(۲) وہ ایک متعصب مسلمان تھا۔

پہلے الزام کے متعلق کپتان بیرڈ (جو سلطان ٹیپو کی قید میں رہا) کے علاوہ اور کسی کی شہادت موجود نہیں۔ جس کا بیان قابلِ یقین نہیں ہو سکتا۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے اس کا بیان سچ مان بھی لیا جائے تو اس ذلیل سلوک کے مقابلہ میں جو انگریزوں نے میسور کی لڑائیوں میں ہندوستانی قیدیوں اور میسور کی رعایا کے ساتھ روا رکھا سلطان ٹیپو کا سلوک لاکھ درجہ بہتر تھا۔ دوسرا الزام تعصب کا ہے جو انگریز مورخوں کے لئے معمولی بات ہے۔ اس الزام کے جواب میں جیمس مل جیسے مورخ کے بیان کو ملاحظہ فرمائیے۔ وہ لکھتا ہے:-

"ٹیپو کی طبیعت میں مذہب کا پہلو خاص طور سے نمایاں تھا۔ اس کے دل پر مذہب کا بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ وہ اپنا زیادہ وقت ہر روز خدا کی عبادت میں صرف کیا کرتا۔ وہ اپنی سلطنت کو "خداداد" کہتا تھا۔ خدا پر اُس کو اتنا بھروسہ تھا کہ اس کا اثر اس کے ہر کام پر پڑا۔ سچ تو یہ ہے کہ جو اسباب اس کی تباہی کا باعث ہوئے ان میں سے ایک

اس کا خدا کی امداد پر حد سے زیادہ یقین تھا
وہ خدا کی حمایت پر اتنا بھروسہ رکھتا تھا کہ اپنی
حفاظت کے دوسرے پہلوؤں کو بھی نظر انداز
کر جاتا تھا۔" (ہسٹری آف انڈیا از جیمیس مِل)

یہ بیان ایک معزز اور نامور انگریز مورخ کا ہے۔ اب ایک معزز محقق ہندو مہاشے سندر لال ایڈیٹر کرم یوگ" اور "بھوشن" کا بیان ملاحظہ فرمائیے۔ جنہوں نے خود میسور جا کر اس معاملہ کی تحقیقات کی۔ بعد میں مشہور ہندی رسالہ "چاند" الہ آباد میں اپنا بیان شائع کرایا۔ سندر لال جی نے لکھا ہے:-

"ہمیں سلطان ٹیپو کے ایسے دو فرمان ملے ہیں جن سے ہم اس کی مذہبی حیثیت کا صحیح طور سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ایک فرمان اس وقت کا ہے جب اس کی جنگ انگریزوں سے جاری تھی۔ اس اعلان میں سلطان ٹیپو نے قرآن پاک کی آیتوں اور حافظؒ کے اشعار لکھ کر دشمنوں کے علاقہ میں بسنے والے مسلمانوں سے التجا کی ہے کہ وہ غیر ملکیوں کی مدد نہ کریں اور دشمنوں کے علاقہ کو چھوڑ کر میسور میں آ جائیں۔ اس اعلان میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ ہندوستان میں غیر ملکیوں کی مدد کرنا مسلمانوں کے لئے سخت گناہ ہے۔ ٹیپو نے اپنے اعلان میں کرناٹک اور بنگال میں انگریزوں کے ظلم و ستم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہندوستانی حکمرانوں کی کمزوری کی وجہ سے وہ چالاک قوم (انگریز) خواہ مخواہ یہ سمجھ بیٹھی ہے کہ سچے دینِ لوگ کمزور اور نا قابل ہو گئے ہیں۔ اس اعلان میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ ہم نے اپنی رعایا اور اہلکاروں کو حکم دیدیا ہے کہ جو لوگ دشمنوں کے علاقہ سے آکر میسور راج میں بسنا چاہیں اُن کے جان و مال کی پوری حفاظت کی جائے اور اُن کی ضروریاتِ زندگی مہیا کی جائیں۔

دوسرا فرمان میسور راج میں رہنے والے عیسائیوں کے متعلق ہے حیدر علی نے اپنے زمانۂ حکومت میں یورپین پادریوں کو عیسائی مذہب کی اشاعت کرنے کی اجازت دیدی تھی۔ جس سے اُنہوں نے سمندر کے کنارے رہنے والے کچھ ہندیوں کو عیسائی بنا لیا تھا جب کمپنی سے جنگ چھڑی تو عیسائی رعایا نے حیدر علی کے خلاف انگریزوں کی مدد کی۔ اپنی اس عیسائی رعایا کے ہاتھوں سلطان ٹیپو کو بھی کئی مرتبہ تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ آخرکار مجبور ہو کر ٹیپو کو ان کی گوشمالی کرنی پڑی۔ اس کی مختصر روداد یوں ہے کہ ایک مرتبہ جب ان عیسائیوں نے دیگر اقوام کے ساتھ خواہ مخواہ کی زیادتیاں کیں تو سلطان ٹیپو نے ان کو حکم دیا کہ وہ یا تو اس کی عملداری سے باہر نکل جائیں یا مسلمان ہو جائیں۔ کہا جاتا ہے کہ ساٹھ ہزار عیسائی مرد عورتیں اور بچے گرفتار کر کے سلطان کے سامنے پیش کیے گئے۔ انہیں مسلمان بنا لیا گیا اور فوج میں جگہ دیدی گئی۔ کرنل مارک ولکس ان قیدیوں کی تعداد تیس ہزار بتاتا ہے۔"

اس بیان میں کئی باتیں غور طلب ہیں۔ پہلا اعلان جنگ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں مذہب کا کوئی سوال ہی نہیں۔ دوسرے فرمان سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اپنی عیسائی رعایا کا حیدر علی اور سلطان ٹیپو کو کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ یہ عیسائی عرصہ تک سلطان ٹیپو کے راج میں آرام اور آزادی کے ساتھ رہ چکے تھے۔ چنانچہ

جب تک ان کی ڈیوڈھیاں رہے نہ پڑیں اُن کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کی گئی۔ اس کے علاوہ سوائے عیسائیوں کے اور کسی غیر مسلم رعایا کا ذکر اس فرمان میں نہیں ہے +

میسور میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ ان کے ساتھ سلطان ٹیپو کا سلوک نہایت شریفانہ تھا۔ چنانچہ سندر لال جی نے لکھا ہے

"اپنی ہندو رعایا کے ساتھ سلطان ٹیپو کے محبت و عنایات کے واقعات سے اس زمانہ کی تاریخ بھری ہے۔ سلطنت کے آخری ایام میں بھی سلطان کے دربار میں ہندو معزز عہدوں پر ممتاز تھے۔ اس کے معتمد وزیروں میں "پورنیا" اور کرشن راؤ برہمن تھے۔ جن میں اوّل الذکر وزیر اعظم تھا۔ ان وزرا کے توسط سے سفیروں کا عہدہ ہندوؤں کو ملا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ مالابار کے ساحل پر رہنے والے نائرقوم کے کچھ لوگوں نے عیسائی مذہب اختیار کرلے یا نہ کرنے کے متعلق سلطان ٹیپو سے مشورہ طلب کیا سلطان نے اس کا یوں جواب دیا۔

"بادشاہ یا راجہ اپنی رعایا کا باپ ہوتا ہے اس حیثیت سے میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ اپنے آبا و اجداد کے مذہب پر قائم رہیں۔ اگر آپ اپنا مذہب بدلنے کے لئے بضد ہیں تو آپ بجائے عیسائی ہونے کے اپنے "راج پتا" (سلطان ٹیپو) کا مذہب اختیار کریں" +

سلطان ٹیپو جگت گرو شنکر آچاریہ شری سچدانند بھارتی کی جو ہندوؤں کے پیشوا تھے بہت عزّت کرتا تھا۔ ان خطوط کو جو سلطان نے جگت گرو کو لکھے۔ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کے دل میں ہندو پیشواؤں کی بہت قدر و منزلت تھی کچھ عرصہ ہوا شری سندر لال جی نے سلطان ٹیپو کے ایک ہندی خط کا ترجمہ شائع کرایا تھا۔ اصلی خط کناری زبان میں ہے۔ اور آجکل میسور کے شاہی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ یہ خط ۱۷۹۳ء کا لکھا ہوا ہے۔ لفظی ترجمہ حسب ذیل ہے :-

مُہر سلطان ٹیپو

"شری یُد پرم ہنسا و شنگری شری سوامی سچدانند بھارتی چند مہاراج کی خدمت میں سلطان ٹیپو کا سلام!

شری مہاراج کے گرامی نامہ سے خیر و عافیت معلوم ہوئی آپ جگت گرو ہیں ہمارے لئے اللہ پاک سے دعا فرماتے رہیئے آپ ایسے بزرگ جس ملک میں ہوں وہاں بارش رحمت ہوتی رہتی ہے۔ آپ اتنے عرصہ تک پردیس میں کیوں رہ گئے؟ جس غرض کے لئے آپ پردیس تشریف لے گئے ہیں۔ اس کو سرانجام دیکر اپنی تپیا استھان پر جلد واپس آنے کی کوشش فرمایئے"

دستخط سلطان ٹیپو

کچھ عرصہ کے لئے جگت گرو اپنی تپیا استھان "شنگری مٹھ" سے پونا چلے گئے تھے۔ یہ خط اسی زمانہ میں جگت گرو کے ایک خط کے جواب میں سلطان ٹیپو نے لکھا تھا۔ اس خط و کتابت سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے کہ اس زمانہ کے جگت گرو سے سلطان کے کیسے مراسم تھے +

منجن گڈھ۔ سرنگاپٹم اور میل کوٹ وغیرہ کے کئی مندروں کو ٹیپو نے جاگیریں عطا کی تھیں۔ ٹیپو کے حرم سرا کے سامنے بنگلور میں شری ونکٹ رامن سوامی کا مندر شری نواس کا مندر اور سرنگاپٹم کے محل کے پاس شری رنگ ناتھ سوامی کا مندر ان مندروں کے علاوہ اور رنگ پٹم کے کئی مندر آج تک سلطان ٹیپو کی مذہبی رواداری کی یاد دلاتے ہیں۔ بقول سندر لال جی "ٹیپو کی بے تعصبی کے متعلق اس سے بڑھ کر ثبوت دینے کی ضرورت نہیں ایسے نیکدل شریف النفس اور بے تعصب سلطان پر اپنی کوتاہ نظری سے جھوٹے الزامات لگانا اس کے اور اپنے ملک کے ساتھ سخت ناانصافی کرنا ہے" +

مستند تاریخ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سلطان ٹیپو اپنی رعایا کا سچا خیر خواہ تھا اور اس کی رعایا بھی اس پر جان د

دل سے فدا تھی۔ وہ کسانوں کا دوست تھا۔ اُس نے اپنی عملداری میں اس بات کی سخت ممانعت کر رکھی تھی کہ کوئی اہلکار ان سے کسی قسم کی بیگار نہ لے۔ لگان وصول کرنے میں بھی سختی کی اجازت نہ تھی۔ بڑا سے بڑا اہلکار بھی اگر رعایا پر ظلم یا سختی کرتا تو سلطان اُس کو سخت سزا دیتا تھا۔ ہر گاؤں میں پنچایت کے ذریعہ سے آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔ اس میں کسی سرکاری اہلکار کو مداخلت کرنے کی اجازت نہ تھی +

حال میں جب کھیتوں کی آبپاشی کے لئے میسور میں کاویری ندی سے ایک نہر نکالی جا رہی تھی تو اُس کی کھدائی میں ٹیپو سلطان کا ایک فارسی فرمان ملا جس سے پتہ چلا کہ سنہ ۹۱ء میں سلطان ٹیپو نے بھی اس مقام پر ایک تالاب تیار کرایا تھا یہ فرمان اس تالاب کا بنیادی پتھر ہے۔ اس سے ایک عجیب بات معلوم ہوئی وہ یہ کہ ٹیپو سلطان نے لاکھوں روپئے خدا کی راہ میں خرچ کئے اور کسانوں کو اجازت دی کہ جو شخص اس تالاب یا نہر کے پانی سے نئی زمین میں آبپاشی کریگا اُس کو اوروں کی طرح زیادہ لگان دینے کے بجائے لگان کم دینا پڑیگا اور سینچی ہوئی زمین اُس کی موروثی سمجھی جائے گی۔ اس فرمان میں اُس نے اپنے اہلکاروں کو قسمیں دی ہیں کہ کوئی اس کار خیر میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرے یعنی نہ ان کسانوں کی اولاد کو کبھی بیدخل کیا جائے اور نہ کبھی لگان بڑھایا جائے۔ افسوس ہے کہ اس فرمان کے دو ہی سال بعد سلطان ٹیپو جنت نشین ہوا۔ اور اُس کا نام صرف تاریخوں میں رہ گیا۔ فارسی فرمان کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔ (یہ ترجمہ ہندی سے لیا گیا ہے)

یا فتاح

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ ۲۰ ذی الحجہ سنہ ۱۲۱۱ھ بروز دوشنبہ علی الصبح قبل طلوع آفتاب ابھی لگن اور نیک ساعت میں اللہ کے فضل اور اُس کے حبیب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں زماں کے خلیفہ سلطان زماں حضرت ٹیپو ظل اللہ (خداوند تعالیٰ اُن کی سلطنت اور خلافت کو برقرار رکھے) نے کاویری ندی پر دار السلطنت کے مقرب میں "محی" نام کے پشتہ کی سنگ بنیاد رکھی۔ شروع کرنا ہمارا کام ہے تکمیل تک پہنچانا اللہ کے ہاتھ میں ہے +

جس مبارک ساعت میں بنیاد رکھی گئی اُس دن سورج، چاند، منگل اور برہسپت (زہرہ اور مشتری) چاروں کا ایک ہی راس میں مبارک قیام تھا۔ اللہ کے فضل سے یہ پشتہ تاقیامت قائم و برقرار رہے +

اس پشتہ کی تیاری میں جو لاکھوں روپے سرکار خداداد نے خرچ کئے وہ صرف اللہ ہی کی راہ میں صرف کئے گئے ہیں۔ قدیم یا جدید کاشت کے علاوہ بھی جو کوئی اس تالاب سے آبپاشی کریگا وہ اُس پیداوار یا رقم کا جو اور رعایا قانوناً سرکار میں جمع کرتی ہے۔ صرف ¼ حصہ سرکار خداداد کو دے باقیماندہ ایک چوتھائی خدا کی راہ میں معاف ہے۔ اور جو کوئی اس پشتہ (تالاب) سے نئی زمین میں کھیتی باڑی کرے گا تو وہ زمین اُس کی اولاد اور وارثوں کے قبضہ میں نسلاً بعد نسلاً اُس وقت تک رہیگی جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں۔ اگر کوئی شخص اس میں رکاوٹ ڈالے یا اس کار خیر میں مداخلت کرے تو وہ کمینہ خصلت ملعون شیطان کی طرح صرف کسانوں ہی کا نہیں بلکہ تمام انسانی نسل کا دشمن سمجھا جائیگا۔

کتبہ سید جعفر

کیا آج دنیا کی کوئی سلطنت اس سے بڑھ کر ایسی فراخدلی و فیاضی کی مثال پیش کر سکتی ہے؟

زراعت کے ساتھ ہی صنعت و حرفت کی طرف بھی سلطان ٹیپو نے خاص توجہ کی۔ میسور میں سوتی، اونی اور ریشمی کپڑوں کی تجنی

شہرت سلطان ٹیپو کے زمانہ میں ہوئی آج ناپید ہے۔ عمدہ سے عمدہ توپ اور بندوقیں بھی سلطان کے سلاح خانہ میں ڈھالی جاتی تھیں۔

ٹیپو جو تعلیم یافتہ اور ادیبوں کا بڑا قدردان تھا۔ بڑے بڑے مولوی اور پنڈت اس کے درباری تھے۔ اس کا ذاتی کتب خانہ قلمی اور نادر کتابوں سے بھرا تھا۔ اس کی عملداری میں چاروں طرف امن و امان اور خوشحالی تھی جو آس پاس کے انگریزی علاقوں میں کہیں نظر نہ آتی تھی۔

اس کی خانگی زندگی نہایت پاک و صاف تھی۔ شراب اور دیگر نشیلی اشیاء سے اسے سخت نفرت تھی۔ اس نے ایک تاکیدی حکم شراب کی خرید و فروخت کے متعلق جاری کیا تھا۔ باوجود اس مخالفت کے اگر کوئی شخص اس حکم کی خلاف ورزی کرتا۔ تو اس کو سخت تنبیہ کی جاتی۔ عورتوں کی بہبودی کا بھی اسے خاص طور سے خیال تھا۔ اگر اس کو پتہ چل جاتا کہ کسی اہلکار نے صنف نازک کو تکلیف پہنچائی ہے تو وہ سخت سزا دیتا۔ مرہٹوں کی جنگ میں کئی مرتبہ چند عورتیں جن میں کچھ سرداروں کی بھی عورتیں تھیں اس کے قبضہ میں آگئیں۔ سلطان نے ان عورتوں کو بڑی عزت کے ساتھ الگ خیموں میں رکھا۔ اور جبکہ جنگ کا سلسلہ جاری ہی تھا اُس نے ان عورتوں کو پالکیوں میں بٹھا کر اپنے سپاہیوں کی حفاظت میں مرہٹوں کے کیمپ میں پہنچا دیا (ٹیپو سلطان از کرنل لیس۔ صفحات ۷۵-۸۱-۹۵-۹۶-۱۲۶ اور ۲۰۳) کیا اس سے بڑھ کر بے تعصبی، نیکدلی اور شرافت کا نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے؟

ان خوبیوں کے ساتھ ہی ٹیپو اپنے باپ کی طرح بہادر اور جفاکش جنرل تھا۔ سترہ برس کی عمر سے اس نے جنگ میں فتحیابی حاصل کی۔ باپ ہی کی طرح وہ اپنے ملک کا سچا عاشق اور غیر ملکیوں کا دشمن تھا۔ اپنے وقت کا وہی ایک ایسا حکمران ہندوستان میں تھا جو غیر ملکیوں کے مقابلہ کے لئے اپنے پاس کافی فوج رکھتا تھا۔ کیونکہ مرہٹوں کی طاقت اس وقت زوال پذیر تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حیدر اور ٹیپو سے بڑھ کر دشمن انگریزوں کو ہندوستان میں ملا ہی نہیں۔ ٹیپو کے خلاف انگریزی مورخوں کی غلط بیانیوں کی یہی خاص وجہ ہے۔ ٹیپو کو خود اُس کے نمکحرام ملازموں نے نقصان پہنچایا۔ سلطان حیدر تو اپنی فوج سے جن لوگوں کو برخاست کر دیتا تھا پھر کبھی ملازم نہ رکھتا تھا۔ اس کے برخلاف سلطان ٹیپو دغابازوں کو سزا دے کر اپنی رحمدلی سے پھر بحال کر دیتا تھا۔ اور یہی نقص اُس کی تباہی کا باعث ہوا۔

سلطان ٹیپو ان تمام اوصاف سے بوجہ اتم بہرہ ور تھا جو ایک خدا ترس و نیک حکمران میں موجود ہونا چاہئے۔ اس کے ملک میں امن و امان و رعایا خوشحال تھی۔ سلطان کی یہ ہر دلعزیزی غیر ملکیوں کو ایک آنکھ نہ بھائی اور انھوں نے ہر طرح سے سلطان کو برباد کرنے پر کمر باندھ لی۔ ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو سلطان ٹیپو شمشیر بکف انگریزوں سے لڑتا ہوا شہید ہوا۔ اور اسی دن انگریزی فوج کا سرنگاپٹم پر قبضہ ہو گیا۔ ٹیپو کو اپنے باپ کی طرح شیر پالنے کا بہت شوق تھا۔ اُس کے محل کے بیرونی حصّہ میں کئی شیر کھلے پھرتے تھے۔ محل کے اندر گھسنے سے پہلے انگریزوں نے ان شیروں کو گولی سے اُڑا دیا۔ ٹیپو کی تمام دولت لوٹ لی گئی اس کا طلائی تخت توڑ ڈالا گیا۔ جواہرات اور موتیوں کے ہار لوٹ لئے گئے۔ صرف محل کے جواہرات کی لوٹ کا اندازہ ۱۱۴۳۲۱۶ پونڈ یا قریباً ۱۲ کروڑ روپے کا کیا گیا۔ ٹیپو کے ذاتی کتبخانہ کی کتابیں سرنگاپٹم سے ولایت بھیجدی گئیں۔ سلطان کے بڑے لڑکے فتح حیدر سلطان کے ساتھ جنرل ہیرس نے وعدہ خلافی کی اور اُس کے بارہ بھائیوں اور اُن کی بیگموں کو قید کر کے رائے ولور کے قلعہ میں بھیجدیا۔

جس وقت سلطان ٹیپو کے مرنے کی خبر کلکتہ میں پہنچی تو دیان

کے انگریزوں نے خوب جشن منائے اور عالی شان جلوس نکالے گئے۔ گورنر جنرل اور اعلیٰ افسروں نے نئے گرجاؤں میں نماز شکرانہ ادا کی۔ سر جان انبس ٹروتھر نے جو اس زمانہ میں کلکتہ کے چیف جسٹس تھے اپنی خوشی کا اظہار ان الفاظ میں کیا:-

"ٹیپو کی طاقت ہی جو ہماری فوجوں کو شکست دینے کے لئے کافی تھی اس زمانہ میں خاص طور سے قابل توجہ تھی۔ اس کے مرتے ہی ہندوستان میں ہمارا (انگریزوں کا) قبضہ ہمیشہ کے لئے ہو گیا۔"

ایسے بے تعصب۔ بہادر اور نیک مسلمان کے خلاف مغربی مورخوں کی غیر ذمہ دارانہ تحریریں نہایت قابل نفرت ہیں۔ سلطان ٹیپو کے دشمن بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ سلطان نے اپنے ملک کی بہبودی اور بہتری کے لئے انتہائی کوشش کی۔ اس کو اپنی رعایا کی اخلاقی اصلاح کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اس نے کبھی کسی کے ساتھ دغا و فریب سے کام نہیں لیا۔ اس کی موت ایک بہادر کی موت تھی۔ ہندوستان کو آزاد کرانے میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ آزادی کے شہیدوں میں اس کا نام ہمیشہ عزت سے لیا جائے گا۔ اگر سلطان ٹیپو چاہتا تو صلح کر کے اپنی اولاد کے لئے تخت چھوڑ جاتا لیکن مرتے مرتے وہ غلامی کی لعنت سے دور رہا۔ سلطان ٹیپو کے لوحِ تربت پر یہ قطعہ تاریخ کندہ ہے

چوں آں مرد میداں نہاں شد ز تیغ
یکے گفت تاریخ شمشیر گم ستد

سلطان ٹیپو کی وفات کے ۲۲ برس بعد اس کی یاد میں کسی شاعر نے ایک نہایت پُر اثر مرثیہ لکھا۔ اخیر بند کا ترجمہ حسب ذیل ہے:-

اللہ! (شمشیر بکف، مرجانا اچھا ہے
جب جنگ کے بادل ہمارے سروں پر
خون برسا رہے ہوں بجائے اس کے
کہ غلامی اور بدنامی کی زندگی بسر کی جائے
اور شرم اور ندامت کی عمر کاٹی
جائے +

اعظم کریوی

خوابِ حیات

(جناب قبیر احمد صاحب از گورکھپور)

خواب میں کہنے لگی مجھ سے نگاہِ دوربیں — زندگی کے خواب سے یہ پھول کھل سکتے نہیں
شاہدِ مقصود کو تو موت کے پردے میں ڈھونڈھ — باخبر ہو اور شوا سے بے خبر زیرِ زمیں

گل نے کہا ایسا رخِ رنگیں کہیں دیکھا نہیں — تیر ستم عطار کے مجھ پر کبھی زیبا نہیں
بلبل زبانِ حال سے اس دم سخن گستر ہوا — اس گلستاں میں کون ہنس کر عمر بھر رویا نہیں

(عمر خیام)

مبتل

قاسم پاشا

ایک ترکی ڈراما جو جرمنی میں تمثیل کیا گیا

(نمان صاحب حاجی محمد غلام حسن خاں ایم آر اے ایس اینڈ ایوان بی ای ای لندن)

۲۸ر جون ۱۹۲۴ء کی رات مجھے برلن کے تھیٹر میں ایک ڈراما دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اسٹیج پر ایک تاریخی واقعہ دکھایا جارہا تھا جو اس زمانہ سے تعلق رکھتا تھا جب ترک اور یونانی ایک دوسرے سے برسر پیکار تھے۔ ترکی اپنے ملک اور قوم اور سب سے زیادہ اپنی عزّت و ناموس کے لئے لڑ رہے تھے لیکن یونانیوں کی طرف وہی جذبہ کار فرما تھا جسے آج سے چند سو سال پیشتر ایک راہب نے صلاح الدین ایوبی کے زمانہ میں اہل مغرب میں مشہور کر کے بیٹے اور مقدس کنواری مریم" کے نام پر پیدا کیا تھا۔ یونانی سینٹ صوفیا پر پھر صلیب نصب کرنا چاہتے تھے۔ اور ان مقاصد کی تکمیل کے لئے مغرب کی مہذب اقوام کے نئے ہر قسم کی خونخواری اور بربریت روا تھی۔ یہ روح عیسائی افراد مرد و زن میں نہایت کامیابی کے ساتھ نفوذ کر چکی تھی۔ اور انسانیت کبریٰ کے اعلیٰ جذبات کو نہایت بے دردی کے ساتھ پامال کرنے والی تھی۔

اس ڈراما میں دکھایا گیا تھا کہ وحشت و بربریت کی اس ہنگامہ خیزی اور شعلہ افگنی کے درمیان کس طرح ایک مقدس پھول کھلتا ہے۔ اور جذبات کی ایک ہیجان آفرین کشمکش اور نیکی اور بدی کی ستیزہ کاری کے بعد کس طرح نیکی کا مرتبہ اونچا ہوتا ہے۔ یہ پھول ڈراما کے بہادر ہیرو قاسم پاشا اور پری جمال نصرانی ہیروئن بلقیس کی محبت ہے جو نفرت و حقارت کی دنیا کے جذبات پر فتح پاتی ہے جو مسلمانوں کے متعلق صلیب پرستوں کے دلوں میں ہوتے ہیں۔ محبت کا قانون بہت بلند ہے۔ جذبہ انسانی ہمیشہ کی لغزش اور آلودگی سے بلند تر۔

ہم تھیٹر کے فراخ اور کشادہ کمرے میں بیٹھے پردہ اٹھنے کا انتظار کر رہے تھے۔ تماشائیوں میں ہر مذہب و ملت کے لوگ تھے۔ ان میں انگریز تھے۔ اطالوی۔ فرانسیسی اور ان میں عرب ترکی اور چند ایک ہندوستانی بھی تھے اور تمام کی نگاہیں اس امر کی منتظر تھیں کہ پردہ اٹھنے پر کیا سین نظر آتا ہے۔

یکایک جرمن اسٹیج کی روایات کے مطابق المانوی موسیقی کے اکھڑے اکھڑے فطری نغموں کے ساتھ پردہ اٹھا۔ ایک عسکری جہاز کے عرشہ پر چند بدوی عرب جنگی لباس میں کھڑے نظر آگئے۔ ان کے لانبے بال کالے تھے اور ان کی آنکھوں میں ایک ... تبسم کی چمک تھی۔ وہ اپنے ڈھیلے لباس میں ملبوس فولادی تلواریں کمر میں باندھے ہوئے تھے۔ ان کے قد و قامت اور تندرست و توانا جسم سے تماشائیوں کے دلوں پر ایک ہیبت طاری ہو جاتی تھی ان صحرائی جنگجوؤں کے دائیں ہاتھ کو ان کے کمانڈر کپتان کا کمرہ تھا۔ جہاز کے اس طرف وحشی سمندر کا طوفانی منظر تھا۔ جو کمانڈر کو کمرہ کی کھڑکی میں سے نظر آتا تھا۔ سمندر کی پرشور لہریں جہاں ایک طرف اس آہنی جہاز کے پہلوؤں سے ٹکراتی تھیں۔ وہاں دوسری طرف نیلگوں آسمان کے کنارے سے

جو میلوں تک محیط تھا۔ چاک دست و گریباں ہو رہی تھیں۔ یہ بہت سے سپاہی عرشہ پر کھڑے آپس میں باتیں کر رہے تھے کہ ان کا کمانڈر قاسم پاشا اپنے کمرے سے باہر آیا۔ اسے دیکھ کر سپاہیوں میں کچھ گھبراہٹ کے آثار سے نمایاں ہوئے اور انہوں نے فوراً اپنے تئیں حسب مراتب ایک قطار میں کھڑے ہو کر جنگی طریقہ پر سلامی اتاری اور قاسم پاشا کی درازیٔ عمر کا نعرہ اس مخلصانہ جوش کے ساتھ لگایا کہ سمندر کی لہروں کا شور کچھ عرصہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ قاسم پاشا نے اپنے جاں نثاروں کی عقیدت کے اس اظہار کا جواب ہاتھ کے اشارے اور سر کو قدرے خم کر کے دیا +

قاسم پاشا کے چہرے پر تھکن اور درماندگی کے آثار نمایاں تھے۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم بھی کھیل رہا تھا۔ اس کا ایک بازو ایک رومال کے ذریعے جو اس کی گردن میں حمائل تھا اس کے سینے پر آویزاں تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی بحری معرکہ میں زخمی ہو گیا ہے۔ قاسم پاشا نے ان سپاہیوں کی قطار کے نزدیک پہنچ کر ایک نوجوان عرب کو جو جہاز کا کوئی عہدہ دار معلوم ہوتا تھا کہا:-

"عبداللہ۔ زخم توقع سے زیادہ گہرا ہے۔ ذرا دیکھو تو سہی" +

قاسم یہ کہہ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نوجوان عبداللہ نہایت ادب کے ساتھ آگے بڑھا اور اپنے ہاتھوں سے جن پر سختی اور مشقت کے نشان ظاہر تھے۔ رومال کھول کر زخم دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک تفکر چھا گیا اور اس نے کہا:-

"اس کی فوراً "مرہم پٹی" ہونی چاہئے" +

"لیکن عبداللہ تم جانتے ہو کل کے معرکے میں ہمارا طبی جہاز پیچھے رہ گیا ہے۔ اس وقت کیا ہو سکتا ہے" +

"نصرانی اسیروں میں شاید کوئی اس قابل ہو کہ اس کام کو انجام دے سکے" +

"ہاں اس کو"

عبداللہ "بچشم بسر و چشم" کہہ کر چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد اسیروں کے محافظ ایک معمر عیسائی اور اس کی نوخیز اور حسین لڑکی کے ساتھ واپس آ گیا۔ معمر عیسائی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اور اس کی لڑکی کے ہاتھ بھی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ عبداللہ انہیں اسیروں میں سے انتخاب کر کے لایا تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ نوخیز نصرانیہ ڈریسنگ کر سکتی ہے۔ لیکن وہ زنداں سے تنہا آنا نہ چاہتی تھی۔ اس وقت عبداللہ اس کی خدمات ہر قیمت میں خریدنے کے لئے تیار تھا۔ وہ جانتا تھا قاسم پاشا کے بازو کا زخم نہایت گہرا ہے۔ اور اگر اس وقت اس کا علاج نہ کیا گیا تو اندیشہ ہے کہیں تمام بازو سے ہاتھ دھونے پڑیں۔ دوسرے قاسم پاشا بھی درد کی شدت سے بیتاب تھا۔ اگرچہ وہ اس کا اظہار نہ کرتا تھا۔ لیکن یہ اس کی آنکھوں اور چہرہ کی درماندگی سے صاف ظاہر تھا۔ اس نے اس لڑکی کو اس امر پر آمادہ کر لیا کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ عرشے تک چلے۔ جہاں کمانڈر جہازراں کا منتظر کھڑا ہے +

یہ حسین نصرانی لڑکی پابند سلاسل میں اسیر ایک عجیب وقار و متانت کے ساتھ عرشہ پر نمودار ہوئی۔ اس کی آنکھیں فرش پر گڑی ہوئی تھیں اور وہ اس مشرقی اور مغربی وضع کے لباس میں ملبوس تھی جو ان عیسائی ممالک میں پہنا جاتا ہے جو جنگ سے پیشتر ترکی حکومت کے زیر اثر تھے۔ اس کے چہرے پر اس وقت تفکر کی زردی چھائی ہوئی تھی جس نے اس کے ملائک فریب حسن کو اور بھی دلفریب بنا دیا تھا۔ عبداللہ نے اسے بتایا کہ کل کی لڑائی میں قاسم پاشا کو ایک زخم آ گیا ہے جس کی مرہم پٹی فوراً کیا جانا ضروری ہے۔ چونکہ طبی جہاز پیچھے رہ گیا ہے اس لئے کمانڈر یہ عزت اسے بخشنا چاہتا ہے۔ لڑکی نے آہستہ سے گردن اٹھا کر اپنے باپ کی طرف دیکھا گویا اجازت طلب کرنا چاہتی ہے +

اس کا جواب اسے [illegible] مفہوم فوراً سمجھ گئی اور سر جھکا اپنی جگہ خاموش کھڑی رہی۔ عبداللہ

نے اپنے سوال کو دہرایا تو اُس نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ کہ وہ ایک بے دین مسلمان کے بازو کو کبھی ہاتھ نہیں لگا سکتی ۔

عبداللہ نے اُسے سمجھایا کہ وہ انکار کر کے اپنے اور اپنے رفیق قیدیوں کے لئے کیا سزا تجویز کر رہی ہے اور اس انکار کے خمیازہ میں انہیں کس قدر عذاب عقوبت جھیلنا پڑے گا لیکن ان تمام دھمکیوں کا اس پر کچھ اثر نہ ہوا اور وہ انکار پر اڑی رہی۔ آخر قاسم پاشا نے خود اسے مخاطب کیا ۔

"اے حسین! یہی تیرا مذہب تجھے خدا کی مخلوق سے اسقدر نفرت سکھاتا ہے کہ ایک انسان کو محض اس وجہ سے ناپاک خیال کریں ہے کہ وہ تیرا ہم مذہب نہیں"۔

بلقیس نے گردن اٹھا کر کہا۔ خدا کے مقدس بیٹے نے جو ہماری نجات کے لئے دنیا میں آیا تھا۔ ایک سامری عورت کو کہا تھا [illegible] ہاں بچوں کے آگے سے اٹھا کر کتوں کے آگے نہیں ڈالی جا سکتیں۔ میری جان عیسائی مجاہدین پر قربان لیکن خداوند نہ لائے کہ انہیں مجروح چھوڑ کر میرے ہاتھ ایک مسلمان کے زخموں کی مرہم پٹی کے لئے تیار ہوں ۔

قاسم پاشا: لیکن پاک ہے وہ خدا جس کا سورج ہم نیک و بد پر یکساں چمکتا ہے جس کی بارش جہاں ایک طرف سنگستانی چٹانوں اور ریگزاروں پر برستی ہے۔ جہاں روئیدگی تک نظر نہیں آتی۔ وہاں وہ لہلاتے ہوئے گلزاروں اور چمنستانوں کو بھی سیراب کرتی ہے۔ اگر ایک طرف وہ اپنے مقبول بندوں کو تخت و تاج دیتا ہے تو اُن کو بھی اس سے قطعاً محروم نہیں کرتا جو اس کی ہستی کے منکر ہیں۔ دیکھ باب عالی کے زیر سایہ عیسائی اور یہودی بھی ہیں لیکن ان سے وہی سلوک کیا جاتا ہے جو مسلمانوں سے روا رکھا جاتا ہے۔ لیکن تو اے نوجوان [illegible] نازنینوں کا سا حسن دیکر اپنے بندوں پر رحمت کرنے والے خدا کا اسقدر تنگدل ہے کہ اس کی مخلوق کو رنج و مصیبت میں مبتلا دیکھتی ہے۔ لیکن تیرا دل ذرا نہیں پسیجتا تو اگر میرے بازو کو ہاتھ لگانا نہیں چاہتی۔ نہ لگا۔ تو اگر مجھے اپنے عقیدے کے مطابق بے دین خیال کرتی ہے تو میں تجھے منع نہیں کرتا۔ تجھے اختیار ہے لیکن خدا کے لئے اپنی سحر کار گفتگو سے مجھے محروم نہ کر۔ اپنی پیاری اور شیریں آواز سے ایکبار مجھے اور عزت بخش کہ اس سے میرے درد میں تخفیف ہوتی ہے۔ بے میں تجھ سے زخموں کی شست و شوئی کی درخواست نہیں کرتا۔ بلاشبہ اور اسکے ترس کا ملتجی ہوں۔ میں تیری عنایت کا تمنائی نہیں ہوں بلکہ تیرے "انکار" سے راضی ہوں ۔

قاسم پاشا یہ کہہ کر آگے بڑھا اور نہایت نرمی و ملاطفت سے بلقیس کے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں اتاریں اور کہا یہ آہنی زیور ان حسین ہاتھوں میں اچھا نہیں لگتا۔ اجازت دے کہ میں اسے اتار کر ایک طرف پھینک دوں"۔

اس کا بلقیس پر نہایت غیر متوقع اثر ہوا۔ اس نے خاموشی کے ساتھ قاسم پاشا کا زخم کھولا اور [illegible] دھو کر پٹی باندھی۔ قاسم پاشا اس کے نرم نرم ہاتھوں کے چھونے سے ایک ناقابل بیان قوت محسوس کر رہا تھا۔ وہ فراموش کر چکا تھا۔ وہ کہاں ہے سمندر کا شور اُسے سنائی نہ دیتا تھا۔ وہ خیال کی وادی میں کھویا ہوا تھا۔ جہاں اُس کا صرف ایک رفیق تھا اور وہ یہ نوخیز نصرانیہ بلقیس تھی۔ بلقیس کو بھی قاسم پاشا کے جذبات کا مبہم سا احساس تھا۔ وہ بھی اس آگ کی خفیف سی تپش محسوس کر رہی تھی جس کے شعلے قاسم پاشا کے دل میں بھڑک رہے تھے لیکن مذہبی تعصب اور اپنے باپ کی موجودگی کا خیال راستے میں حائل تھا۔ اور نسوانی شرم و حیا اُسے اس کے اظہار کی اجازت نہ دیتی تھی ۔

جب بلقیس زخم کی مرہم پٹی سے فارغ ہو چکی تو قاسم پاشا نے دریافت کیا۔ کیا تمہارا کوئی اور رشتہ دار بھی اسیر ہے۔ اس نے

گلنار کرے۔ اس سے زیادہ میری خوش نصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ تیرے ہاتھوں میری جان جائے۔ اور میں شہید الفت کہلاؤں اے حسین و نوخیز تو خوشی سے مجھ پر وار کر کہ میں تیرے ہاتھوں مرنے کو بے قرار ہوں ؛

بلقیس کے بدن پر ایک لرزہ طاری ہو گیا۔ چہرہ سپید ہو گیا۔ زرد ہونٹ خزاں رسیدہ پتوں کی طرح کپکپانے لگے اس کی نگاہیں سامنے ایک تصویر پر جم گئیں۔ اس کے ہاتھ قاسم پاشا کے سر پر جا پڑے اور غیر اختیاری طور پر اس کے بالوں میں پھرنے لگے۔ اس کے پاؤں بے حس ہو گئے۔ اب وہ وفور جذبات سے بیہوش ہو کر گر پڑی ؛

قاسم پاشا نے اسے اپنے مضبوط اور توانا بازوؤں میں اٹھایا اور برہنہ سر و برہنہ پا اسے زنداں کی طرف لے گیا ؛

اسٹیج پر ڈراپ سین گرا لیکن تمام تماشائی خاموش بیٹھے رہے۔ وہ غالباً افسانہ کے باقی ماندہ جزو کے متعلق سوچ رہے ہونگے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ ارغنوں کی تانوں کے ساتھ پردا پھر اٹھا۔ اور تمثیل کا دوسرا سین دکھایا گیا۔ اس جنگی جہاز کے عرشے میں چند سپاہی اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ بلقیس ایک گوشے میں خاموش متفکر بیٹھی تھی۔ نزدیک بوڑھا باپ کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں خشمگیں تھیں۔ وہ غصہ سے کانپ رہا تھا اور بلقیس پر ہاتھ اٹھا اٹھا کر رہ جاتا تھا۔ بلقیس نے اُسے صاف بتا دیا تھا کہ اب وہ مسلمانوں سے نفرت نہیں کر سکتی۔ مسلمان مسلمان اسقدر شریف اور معزز۔ اسقدر وفادار اور جری سزاوار حقارت نہیں۔ ان کی وحشت اور خونخواری اور سنگدلی کی جو داستانیں ہمیں سنائی جاتی ہیں۔ وہ سب بہتان تراشے ہوئے ہیں۔ جس کو ترکوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ان کے دل مہر و الفت اور ہمدردی کے جذبات سے معمور ہیں اور انسانیت کی خدمت اپنے مذہب کا ایک اہم جزو خیال کرتے ہیں۔ وہ اس لئے نہیں لڑتے کہ انہیں خواہش عز و جاہ ہوتی ہے۔ وہ تلوار اٹھانے میں مظلوموں کی حمایت میں جنگ کرتے ہیں۔ بیکس اور لاچار لوگوں کی نجات کے لئے اور اُسے ان سے جن کا خدا اسکا خدا ہے۔ خدا کا اکلوتا بیٹا ان کا محترم پیغمبر ہے کس طرح متنفر ہو سکتا ہے"؛

اسکا بوڑھا باپ نجانے تھا کیا کہے۔ اس کی آنکھوں کی بڑھاپے کا سہارا صرف ایک بلقیس تھی جو اب بے دین ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کا سرمایۂ حیات لُٹ رہا تھا۔ اور وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔ وہ اسیر تھا اور اس کا غضب اس کی جان پر بن رہا تھا۔ اتنے میں قاسم پاشا کا رفیق خاص عبداللہ وہاں سے گزرا بلقیس نے اس سے کہا کہ وہ قاسم پاشا تک اس کی اس درخواست کو پہنچا دے کہ وہ اپنے چچا زاد بھائی زدہ ف سے ملنا چاہتی ہے۔ عبداللہ یہ درخواست لے کر قاسم پاشا کے پاس گیا۔ اس وقت سپہ سالار فوج حنیف نمودار ہوا اور اسیروں کے قتل کرنے کی اجازت چاہی۔ قاسم پاشا یہ سُنکر خاموش ہو گیا۔ اور جواب دیا کہ وہ فی الحال اسیروں کے قتل کو ملتوی رکھنا چاہتا ہے حنیف نے اُسے فوجی قانون کا حوالہ دیا۔ اس سے قاسم پاشا نے برافروختہ ہو کر اسے معزول کر دیا اور ایک فرانسیسی کو اس کا قائم مقام مقرر کر دیا ؛

حنیف نے جا کر سپاہیوں میں یہ آگ لگا دی کہ قاسم پاشا اپنے تئیں ایک عیسائی چھوکری کی محبت میں فروخت کر چکا ہے۔ اس سے سپاہیوں میں بغاوت پھیل گئی۔ تختۂ جہاز پر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ قاسم پاشا باغی سپاہیوں میں گھر گیا۔ لیکن آخر کار اپنے چند جاں نثاروں کی مدد سے اس آگ کو فرو کرنے میں کامیاب ہو گیا ؛

اب پھر جہاز کا پرسکون منظر دکھایا۔ بلقیس اسیطرح تختۂ

جہاز پر بیٹھی تھی۔ زراف اس سے اظہار عشق کر رہا تھا۔ وہ دو زانو ہو رہا تھا۔ اور بلقیس کے ہاتھ اُس کے ہاتھوں میں تھے بلقیس بھی مضطرب تھی۔ لیکن وہ اُسے کہہ رہی تھی پیارے بھائی میں تمہارے لئے صرف اسقدر کر سکتی ہوں کہ جب ہم خشکی پر پہنچیں تو تم خنجر وہ میرے سینے میں بھونک دو۔ زراف نے اس سے پھر وہی التجا کی آنسو بہا کے بلقیس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چومے بلقیس کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے۔ لیکن اُس کے لب شرمندۂ سکوت ہی رہے۔ دونوں اپنے اپنے جذبات میں محو تھے کہ قاسم پاشا اپنے کمیں سے باہر نکلا او کو اظہار محبت کرتے دیکھ کر بدگمانی سے ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا لیکن پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اس نے بلقیس کے پیارے چہرے پر آنسو بہتے دیکھے۔ یقین ہو گیا کہ دونوں ایک دوسرے پر جان دیتے ہیں۔ اس کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا۔ اور اس نے فوراً زراف کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔ بلقیس نے بڑھ کر بچشم تر قاسم پاشا کو اپنی بے گناہی کا یقین دلایا۔ اور بتایا کہ وہ زراف کی محبت کی گنہگار نہیں۔ زراف اُس کا بھائی ہے۔ اور اُسے اُس کے ساتھ صرف برادرانہ محبت ہے۔ اُس نے خدا کے بیٹے اور مقدس کنواری کی قسم کھائی۔ لیکن زراف نے جو پاس کھڑا یہ تمام باتیں خاموشی سے سُن رہا تھا۔ فرش پر سے ایک اندلسی تلوار اُٹھائی اور قاسم پاشا پر اچانک وار کر دیا۔ قاسم پاشا کہ غافل تھا۔ لیکن ہزاروں معرکے دیکھ چکا تھا۔ فوجوں کی قیادت کر چکا تھا۔ اور دست بدست لڑائی لڑ چکا تھا۔ اس نے تلوار کی چمک دیکھ کر میان سے فوراً اپنی طویل تلوار نکال لی اور پیشتر اس کے کہ زراف کا حربہ اُس کے سر پر بیٹھتا۔ وہ تلوار سپر کر چکا تھا۔ اب اُس کی باری تھی۔ تلوار بلند ہو گئی لیکن بلقیس درمیان میں آ گئی +

یہاں پھر ڈراپ سین گرتا ہے۔ اور ناظرین نہایت شوق کے ساتھ منتظر رہتے ہیں۔ پردہ اُٹھنے پر عالم بالکل دگرگوں نظر آیا۔ انقلاب زمانہ کے ہاتھ اس جنگی جہاز پر اب یونانیوں کا تصرف ہو چکا تھا۔ قاسم پاشا اسیر تھا۔ اُس کے غدار سپاہی بھاگ چکے تھے۔ فرانسیسی مفرور نے جسے قاسم پاشا نے سپہ سالار مقرر کیا تھا۔ جہاز یونانیوں کے حوالے کر دیا تھا۔ اور بلقیس کا باپ اب جہاز کا کمانڈر تھا +

زراف آزاد تھا۔ اُس نے پھر بلقیس سے اپنے عشق کا اظہار کیا لیکن اس بار بلقیس نے اسے بتایا کہ اُسے قاسم پاشا سے عشق ہے۔ اس کا دل قاسم پاشا کی محبت کا اسیر ہو چکا ہے۔ اور دنیا کی کوئی طاقت اُسے اُس کی محبت سے باز نہیں رکھ سکتی۔ وہ قاسم پاشا پر اپنی جان تک نثار کر دیگی۔ لیکن بے وفا نہ کہلائیگی اس معصوم لڑکی کے ان الفاظ کا زراف پر اسقدر اثر ہوا۔ کہ اُس نے اُس کی مدد کا ارادہ کر لیا اور اُسے یقین دلایا کہ قاسم پاشا کی جان بچانے اور اُس کی رہائی کی ہر ممکن کوشش کریگا"

بلقیس کے باپ کو جب ان حالات کا علم ہوا اُس نے قاسم پاشا کو ان دونوں کی موجودگی میں طلب کیا اور اُس کے قتل کیے جانے کا حکم دیا۔ اس وقت زراف اور بلقیس کی بیقراری اور گریہ و زاری دلوں کو ہلائے دیتی تھی۔ بلقیس کا باپ قتل پر تلا ہوا تھا۔ زراف دو زانو ہو کر اس سے معافی کی التجا کر رہا تھا۔ بلقیس وفور غم سے بیہوش ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے باپ پر کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ تھیٹر کے تمام تماشائی بڈھا کو نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے کہ وہ ایک بہادر کو صرف اس وجہ سے قتل کرنا چاہتا ہے کہ وہ اس کا ہم مذہب نہیں +

بوڑھا زراف اور بلقیس کی التجاؤں سے اور غضبناک ہو گیا تھا۔ وہ قاسم پاشا کا اور بھی دشمن ہو گیا۔ اُسے اُس کی لڑکی سے عشق تھا۔ وہ بھی اس پر جان دے رہی تھی۔ اُس کے ساتھ اپنے تئیں ہلاک کرنا چاہتی تھی۔ اُس کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ وہ بے دین اور ناپاک تھا۔ وہ صلیب کا دشمن تھا اور اس پر رحم کرنا اپنے

اور خدا کا غضب نازل کرتا تھا +

بوڑھے نے اپنا پستول نکالا۔ زراف اس کو لپٹنے والا تھا کہ اس نے فائر دیا۔ نشانہ تھا دیا شت پر پڑا۔ بیٹھا۔ اور وہ پھر بھی غضبناک ہو کر کھڑا ہوا۔ ہاتھوں کی زنجیریں ایک ہی جھٹکے سے پارہ پارہ ہو گئیں۔ جہاز میں ایک کھلبلی مچ گئی سپاہی ہجوم کر کے تختے پر آ گئے۔ اور زروف نے فوراً قاسم پاشا اور بلقیس کو ایک چھوٹی سی کشتی میں جو اسی مقصد کے لئے پہلے ہی سے تیار تھی۔ سوار کر دیا۔ اور کشتی پانی کو چیرتی ہوئی سمندر کی وادیوں میں چلی گئی +

غزل

خدنگ ناز آئیگا تو ارماں دل سے نکلیگا — کوئی پہنچیگا منزل پر کوئی منزل سے نکلیگا

دمِ کشتن لہو جو گردنِ بسمل سے نکلے گا — وہ بن کر اشکِ خونیں دیدۂ قاتل سے نکلیگا

تھکا ماندہ مسافر لیکے دم منزل سے نکلیگا — ترا تیرِ نظر جاں لیکے میرے دل سے نکلیگا

مری آہوں کے بادل دشت پر ایسا لہو ہونگے — جنازہ حسرتِ دیدار کا یوں دل سے نکلیگا

گرے گی دل پہ کوئی برق نکلی چشمِ قتاں سے — پئے عاشق کوئی فتنہ چہ بابل سے نکلیگا

جو زیرِ رگ چھری پھیریگا قاتل میری گردن پر — مزے لے لیکے ارمانِ شہادت دل سے نکلیگا

ہماری زندگی ہے پیچ و تابِ کاکلِ جاناں — تمہارے گیسوؤں میں پھنسکے دل مشکل سے نکلیگا

اگر ہو خوف رسوائی کا راہِ عشق میں اے دل — تو یہ مقصد کا مشکل سہل ہو مشکل سے نکلیگا

جنونِ عشق میں بیکار ہے اندوہِ ناکامی — کہ حاصل کچھ نہ کچھ اس سعی لاحاصل سے نکلیگا

خیال ساقی و گلشن تصور ابر و صہبا کا — کسی کے دل سے نکلا ہو جو میرے دل سے نکلیگا

تمہارا ناوکِ بیداد گر مضراب ہو جائے — عجب جانسوز نغمہ میرے سازِ دل سے نکلیگا

اگر ہمت مصیبت میں نہ لے اصغر کوئی ہارے
میں آساں ہوں میں آساں ہوں لبِ مشکل سے نکلیگا

سیّد نصیر الدین حیدر اصغر عابدی

موت کا سفر

قیصر ولیم کی آخری خواہش

از جناب انیس الدین احمد رضوی، ایم۔ اے (علیگ)

(۱)

سردیوں کی رات تھی اور میں بجھتے ہوئے کوئلوں کے سامنے اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ کہ اچانک میرے دماغ میں ایک نیا خیال پیدا ہوا۔ میں نے تاریخ کے بڑے بڑے خطرناک واقعات پر غور کرنا شروع کیا۔ اور مجھے نظر آنے لگا کہ ہر ایک ہیرو کے سامنے انجام کار دو راستے پیدا ہو جاتے تھے۔ جہاں پہنچکر ایک یا دوسرے راستہ کو اختیار کرنا اُس کی مرضی پر منحصر ہوتا تھا۔ اُس نے ایک راستہ اختیار کیا۔ اور تاریخ کے صفحات اس انتخاب کے نتائج سے سیاہ ہیں۔ لیکن فرض کیجئے کہ وہ دوسرا راستہ اختیار کرتا۔ کیا انسانی تخیل کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ ان واقعات کی رفتار کا اندازہ لگا سکے۔ جو اس انتخاب کی وجہ سے رونما ہوتے؟ میرے دماغ میں دلچسپ واقعات کا ایک سلسلہ چکر لگانے لگا۔ اور ہر واقعہ اپنے ساتھ اپنے اہم مسائل کو جلو میں لئے ہوئے تھا۔ اگر سیزر جمہوریۂ روما کے سپہ سالار کی حیثیت سے وفادار رہتا۔ اور ریو بکین کی حدود کو تجاوز کرنے سے انکار کر دیتا تو کیا سلطنت روما کی تمام تاریخ مختلف نہ ہو جاتی؟ اگر واشنگٹن اپنے ہم وطنوں کو اس وقت تک صبر کے ساتھ انتظار کرنے پر رضامند نہ کر لیتا کہ برطانی پارلیمنٹ میں لبرل ممبروں کی اکثریت انکے نقصانات کی تلافی کر دیتی ـــــــ تو کیا برطانیہ اور اُس کے تمام ممالک محروسہ آج امریکہ کی عظیم الشان مرکزی طاقت کے اجزائے ترکیبی نہ ہوتے؟ اگر نپولین روسی مہم کا بیڑہ اُٹھانے سے قبل صلح کر لیتا، تو . . . . . وغیرہ وغیرہ ؛

میں انہیں خیالات میں محو تھا کہ میرے دماغ نے زمانۂ حال کی ایک مثال پیش کی۔ اور اُسی طرح نیم بیداری اور نیم خواب کی حالت میں، جبکہ میری نگاہیں سرخ کوئلوں پر جمی ہوئی تھیں میرے متخیلہ کے سامنے تصویروں کا ایک سلسلہ گذرنے لگا۔ جسے عالم رویا سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس میں صحیح واقعات و حقائق کا اضافہ کر دیا جائے۔ تو اس کی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے :-

(۲)

نومبر ۱۹۱۸ء کا مہینہ تھا۔ فضا پر ایک کثیف کہر چھائے ہوئے تھی۔ بلجیم کے چھوٹے سے قصبہ سپا میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اہم ترین واقعہ رونما ہوا ہے ـــــــ ایسا واقعہ، جس نے قصبہ کی تمام آبادی میں ہیجان و اضطراب کی لہر دوڑا دی ہے۔ تمام کاروبار بند پڑا تھا۔ اور قصبہ کے لوگ ایک انتشار کی حالت میں سڑکوں پر گروہ در گروہ کھڑے ہوئے واقعات حاضرہ پر رائے زنی کر رہے تھے۔ ان کے درمیان یا فی جرمن سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد سبزی مائل بھوری وردیاں پہنے ہوئے ادھر اُدھر

گھوم رہی تھی جن میں سے بعض سپاہی طویل جنگی خدمات کی وجہ سے خستہ اور ماندہ نظر آتے تھے۔ ہر شخص انتہائی اضطراب کی حالت میں تھا۔ اور قصبہ کی تمام سڑکیں چھوٹے چھوٹے مجمعوں سے پٹی پڑی تھیں جن کے شور وغل سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اخبار بیچنے والے لڑکے وحشیانہ طور پر ادھر سے ادھر جھپٹتے پھر رہے تھے اور تمام قصبہ چیونٹیوں کے ایک ایسے چھتے کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ جسے اچانک کسی لکڑی سے چھیڑ دیا گیا ہو۔

یکایک تمام مجمع ادھر ادھر ہٹ گیا۔ ایک بہت بڑی موٹر کار جس میں چار فوجی افسر اور دو سویلین بیٹھے ہوئے تھے، درمیان سے گذری۔ یہ افسر اہم ترین شخصیتوں کے حامل معلوم ہوتے تھے کیونکہ یہ سب لوگ بڑی توجہ اور انہماک کے ساتھ ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ شیر کا سا چہرہ رکھنے والا افسر جو باغی سپاہیوں کے مجمعوں پر غصہ اور حقارت کی نظریں ڈال رہا تھا۔ قصبہ کی آبادی کا بچہ بچہ اسے پہچانتا تھا۔ کیونکہ سپاہ اتنی مدت سے جرمنی کی فوجی قوت کا مرکز بنا ہوا تھا۔ یہ مارشل وان برگ تھا۔ اس کے قریب اپنے خیالات میں محو۔ ایک بڑا بحری افسر بیٹھا تھا جس کے منڈے ہوئے چہرہ پر غور و فکر نے بیسیوں جھریاں ڈال دی تھیں یہ مشہور امیر البحر وان اسپ تھا۔ دو اور بڑے جنرل اور دو مدبر سویلین جو حال ہی میں برلن [illegible] آئے تھے۔ اس گروہ کے بقیہ ارکان تھے۔ موٹر کار بڑی شاہراہ سے گڑگڑاتی ہوئی گذری۔ اور ایک دم داہنی طرف مڑ گئی۔ پھر ایک خوبصورت پھاٹک میں سے ہوتی ہوئی ولا فرانیوز کے دروازے کے سامنے جا ٹھہری۔ دروازے کے دونوں سنتریوں نے فوجی طریقہ پر سلام کیا۔ دربان نے دروازہ کھولا۔ اور مشاہیر کا وفد مکان کے اندر غائب ہو گیا۔ در آنحالیکہ عام لوگ حیرت و تعجب کے ساتھ نگاہیں پھاڑ پھاڑ کر مکان کے در و دیوار کو تک رہے تھے۔ کیونکہ قصبہ میں یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ آج جنگ عظیم کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات طے ہوگی۔ اور لوگوں کا خیال تھا کہ قسمت کے فیصلہ کا وقت آ پہنچا ہے۔

وفد کو ایک بڑے کمرہ میں پہنچا دیا گیا۔ جو طلائی اور نقرئی سامان سے آراستہ تھا یہاں سے گزر کر وہ ایک وسیع کمرہ میں داخل ہوئے اور ایک میز کے چاروں طرف بیٹھ گئے۔

"عالی جاہ قیصر جرمن آپ حضرات کے منتظر تھے۔" دربان نے کہا۔ "وہ ابھی تشریف لاتے ہوں گے۔"

یہ کہہ کر وہ خاموشی کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ اور دروازہ بند کرتا گیا۔

معلوم ہوتا تھا کہ یہ جماعت کسی قلبی انتشار کی وجہ سے پریشان ہے۔ اور ہر شخص مستفسرانہ نگاہوں سے دوسرے کو تک رہا تھا یہاں تک کہ امیر البحر وان اسپیر نے اس خاموشی کو توڑا۔

"شاید سب سے بہتر یہ ہوگا" اس نے مارشل وان برگ سے کہا۔ "کہ آپ اس گفتگو کا افتتاح کریں۔ عالی جاہ کو معلوم ہے کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں، وہ ایک وفادار اور صادق دل کی آواز ہوتی ہے۔"

"کیا آپ کا یہ مطلب ہے امیر البحر کہ ہماری معروضات وفادارانہ نہیں ہوتیں؟" برلن کے ایک مدبر نے پوچھا۔

امیر البحر نے اپنے شانوں کو حرکت دی۔

"آپ بغاوت کے مرکز سے تشریف لا رہے ہیں۔ اور فی الحال ہمیں برلن پر کوئی اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ ہمیں صرف اسی قدر معلوم ہے کہ انہی طاقتوں نے جو ہماری پشت پر کام کر رہی تھیں۔ ہمارے معاملات کو تباہی اور بربادی کی طرف دھکیل دیا ہے۔"

"اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ——" مدبر نے غصہ میں چلا کر کہا۔ لیکن وان برگ نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"ہم اس پر کافی بحث و مباحثہ کر چکے ہیں۔" اس نے ترش رو ہو کر کہا۔ "لیکن میں ایک سپاہی ہوں۔ فضول باتوں کو پسند نہیں کرتا۔ اگر آپ کی مرضی ہو تو ہم وان شپ! آپ ہی گفتگو کا آغاز کیجئے۔ ہم

ہم سب آپ کے قول کی تائید کریں گے"۔

"یہ کوئی خوشگوار کام نہیں ہے۔" یہ بات جو ایک طویل القامت قوی الجثہ اور خوبصورت آدمی تھا۔ اور جس کی لمبی بھوری داڑھی سینہ پر لہرا رہی تھی۔ جواب دیا "تاہم اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو ــــــ"

دروازہ کھلا اور ایک شخص اندر داخل ہوا۔ تمام لوگ فوراً سرو قد کھڑے ہو گئے۔ اور ان کے جوتوں کی ایڑیاں ایک دوسری سے ٹکرا گئیں۔ قیصر نے سر جھکا کر سلام کا جواب دیا اور سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کی تیز بھوری آنکھیں ایک کے چہرے سے دوسرے پر پڑ رہی تھیں۔ گویا کہ وہ ان کے پیغام کو پیشتر ہی سے پڑھ لینا چاہتی تھیں۔ اس کے بعد وہ حسرت زدہ چہرے کے ساتھ میز کے پرلے کنارے پر تنہا جا بیٹھا اور کہنے لگا۔

"حضرات! میں نے سنا ہے کہ آپ لوگ اپنے شہنشاہ کی قسمت کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ کیا میں آپ کے غور و فکر کے نتائج دریافت کر سکتا ہوں؟"

"عالی جاہا!" فان اسٹین نے جواب میں کہا۔ "ہم نے پوری توجہ کے ساتھ موجودہ حالت پر غور کیا ہے۔ اور ہم سب ایک بات پر متفق ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر اعلیٰ حضرت یہاں رہے تو حضور والا کی سلامتی سخت خطرے میں پڑ جائے گی۔ بہر حال جو کچھ وقوع پذیر ہوگا۔ ہم اس کے جواب دہ نہیں ہو سکتے"۔

قیصر نے اپنے شانوں کو حرکت دی۔

"اگر جرمنی گرنے والا ہے تو اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ افراد پر کیا گزرے گی"۔

"جرمنی لڑکھڑا سکتا ہے۔ عالی جاہا! لیکن گر نہیں سکتا۔ چھ کروڑ انسانوں کو دنیا کے نقشہ سے محو نہیں کیا جا سکتا۔ عنقریب ہی ملک کے لئے دوبارہ تعمیر کا وقت آ جائے گا۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ ایسے وقت پر اعلیٰ حضرت کی موجودگی کس قدر ضروری ہوگی"۔

"آپ کی کیا رائے ہے فیلڈ مارشل؟" قیصر نے فان برگ سے سوال کیا۔

وان برگ نے اپنے بھاری شانوں کو حرکت دی۔ اور بےچینی کے ساتھ اپنا سر ہلایا۔

"عالیجاہ! آج میں نے ساتوں فوجوں سے رپورٹیں طلب کی تھیں۔ سپاہیوں کی زیادہ تعداد ابھی تک دشمن سے لڑنے کے لئے تیار ہے۔ تاہم وہ اپنے ساتھیوں سے لڑنے سے انکار کرتے ہیں۔ اکثر پلٹنیں ہاتھ سے جا چکی ہیں"۔

"اور بیڑہ، امیر البحر؟"

"اس سے کوئی امید نہیں، عالی جاہا! کیل اور ولہلمس ہیون میں ہر جہاز پر سرخ جھنڈا لہرا رہا ہے۔ اور افسروں کو خشکی پر نکال دیا گیا ہے۔ حالانکہ بغاوت کے آثار بہت کم ہیں۔ تاہم اشتراکی خیالات کے لوگ جہازوں کی کمان کر رہے ہیں"۔

"اور عاملین حکومت کا کیا حال ہے عثمان اسٹین؟"

"وہ اب کسی صورت سے جنگ جاری رکھنے کی تائید نہیں کریں گے۔ عالی جاہا۔ وہ اس سے عاجز آ چکے ہیں اور صرف صلح کا مطالبہ کر رہے ہیں"۔

"کیا وہ ہمارے ہتھیار ڈال دینے کے نتائج و عواقب کو محسوس کرتے ہیں؟"

"ارزبرجر اور اس کی جماعت کے لوگ فرانسیسی ہیڈکوارٹر میں گئے ہوئے ہیں۔ تاکہ جس قدر سہل شرائط ممکن ہو سکیں منظور کرا لیں۔ میرے خیال میں اعلیٰ حضرت یہ شرائط شاید اتنی بری نہ ہوں جتنی حضور والا خیال فرماتے ہیں"۔

"خود کو فریب دینے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہمیں صرف اپنے دل سے ہی پوچھنا چاہئے کہ خود ہماری شرائط کیا ہوتیں۔ اگر ہم فاتح ہوتے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ شرائط ہمارے بیڑے کے، ہماری

نو آبادیات کے۔ اور ہر اُس چیز کے نقصان کے مترادف ہیں جس کی تعمیر میری نگرانی میں گذشتہ پچیس سال کے عرصہ میں ہوئی ہے لیکن آخر کیوں۔ کس وجہ سے یہ خوفناک بلا ہم پر نازل ہوئی؟"

"کیونکہ قوم کی وہ طاقت جو ہماری پُشت پر کام کر رہی تھی۔ ہمارا ساتھ نہ نباہ سکی"۔

"لیکن کیوں نہ نباہ سکی؟" قیصر کی آنکھوں میں غصہ کی چمک نمودار ہوئی۔ اور جواب کے لئے وہ ایک ایک کی صورت دیکھنے لگا۔

"آزمائش بہت سخت تھی، عالی جاہ! انسانی قوتِ برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ وہ اس سے تجاوز نہیں کر سکتے تھے"۔

"غلط!" شہنشاہ نے غصہ میں چلّا کر کہا۔ اور میز پر ہاتھ مارا۔ "اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے ان پر اعتماد نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں غلط اطلاعات بہم پہنچائی گئیں جس طرح خود مجھے غلط اطلاعات بہم پہنچائی گئی تھیں۔ یہاں تک کہ تم پر سے اور مجھ پر سے اور ہر شخص پر سے ان کا اعتماد جاتا رہا"۔

"غلط اطلاعات، عالی جاہ؟"

"ہاں، ہر موقع پر غلط اطلاعات دی گئیں۔ میں اس سے زیادہ سخت الفاظ استعمال کر سکتا ہوں۔ میں آپ لوگوں کو انفرادی حیثیت سے الزام نہیں دے رہا ہوں حضرات۔ میں ان مختلف محکمہ جات کا ذکر کر رہا ہوں جن کی آپ قایم مقامی کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس میں کوئی شک نہیں کہ خود آپ حضرات بھی اس معاملہ میں بے قصور نہیں ہیں۔ اور آپ میں سے ہر ایک نے مجھے ایسی اطلاعات دی تھیں۔ جو غلط تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میری تمام تجاویز قطعی غیر مستحکم بنیادوں پر قایم کی گئی تھیں۔ اگر مجھے ان واقعات کا پہلے ہی سے علم ہوتا۔ جن کو میں اب دیکھ رہا ہوں تو ہم ہر وقت عزت کے ساتھ صلح کر سکتے تھے"۔

مجلسِ شوریٰ کے اراکین بے چینی کے ساتھ پہلو بدلنے لگے اس وقت برلن کے دو شکرہ تبر نے جو ایک پستہ قد، گندم گوں اور چست و چالاک شخص تھا۔ جواب میں ابتدا کی۔

"اعلیٰ حضرت شاید وہ الزام ہمارے سروں پر رکھ رہے ہیں۔ جو انصافاً ہم سے زیادہ معزز سروں پر ہونا چاہئے تھا"۔

"خاموش رہئے!" فان برگ نے سختی کے ساتھ کہا: "ہمیں یہاں پر آپ کی برلن والی گستاخیوں کی ضرورت نہیں"۔

"ہمیں حقیقت کی ضرورت ہے!" مدبر نے جواب میں چلّا کر کہا "جو گذشتہ عرصہ میں شہنشاہِ معظم تک بہت کم پہنچی ہے۔ کیا خود اعلیٰ حضرت نے یہی ارشاد نہیں فرمایا؟"

"نہیں، برونر!" امیر البحر نے غصہ ہو کر کہا۔ "یہاں ہم شہنشاہ معظم کے ارشادات سُننے کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ ذکر مخالفین کی تقریریں۔ لیکن عالی جاہ! حضور والا کا الزام بہت سخت ہے۔ اعلیٰ حضرت کے مشیر کس طرح اور کس وقت ساتھ نباہنے میں ناکامیاب رہے؟"

"ہر موقع پر!" شہنشاہ نے بگڑ کر کہا: "مجھ سے یا قوم سے شاید ہی کوئی ایسا زبردست وعدہ کیا گیا ہوگا۔ جو جھوٹا ثابت نہیں ہوا۔ خود اپنے محکمہ پر غور کیجئے، امیر البحر فان اسپیر۔ کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ آپ کے ارباب حل و عقد نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ اگر ہم فروری ۱۹۱۷ء کے بعد جدید ( ) بحری طریقۂ جنگ پر عمل پیرا ہونگے۔ تو انگلستان کو بھوکا مار دیں گے۔ اور اس طرح فتح حاصل کر لینگے۔ کیا یہی بات بار بار نہیں دُہرائی گئی؟ اب نومبر ۱۹۱۸ء ہے۔ بتلائیے کہ انگلستان کو کہاں بھوکا مارا گیا؟"

"واقعات ہمارے لئے بہت زبردست ثابت ہوئے عالی جاہ!"

"ایک عقلمند مشیر واقعات کی پیش بینی کر لیتا ہے۔ اور آپ، فان برگ، کیا آپ نے اور جنرل لیوڈنڈارف نے مجھے یقین نہیں دلایا تھا کہ جس وقت روسیوں کو شکست ہو جائیگی، اور ہماری مشرقی افواج مغربی محاذ پر آ جائینگی، تو ہم فرانسیسیوں کو پیرس کے پار اور

انگریزوں کو سمندر میں دھکیل دیں گے؟"

"ہم ایسا کرنے میں تقریباً کامیاب ہوگئے تھے، عالی جاہ!"

"آپ کے یقینی مشوروں میں کوئی صحت نہ تھی۔ آپ سب ملکر رہتے تھے کہ ایسا ہوگا اور ویسا ہوگا۔ اور کیا ہر ایک فوجی افسر نے ۱۹۱۴ء میں مجھے یہ یقین دلایا تھا کہ خشکی پر انگریزوں کو بالکل نظر انداز کیا جاسکتا ہے؟ تاہم یہ اخبارات" اس نے اپنا ہاتھ میز پر رکھے ہوئے صندوقچے پر مارا۔ "مجھے بتا رہے ہیں کہ گذشتہ چار مہینہ کے عرصہ میں انہوں نے ہمارے اس سے زیادہ قیدی اور زیادہ توپیں گرفتار کی ہیں۔ جتنی کہ کل اتحادیوں نے ملکر کی ہونگی۔ کیا آپ اس قسم کے غلط اندازوں سے چشم پوشی کرسکتے ہیں؟"

بہادر سپہ سالار نے اپنی نگاہیں نیچی کرلیں۔

"میں نے انگریزوں کو کبھی حقیر نہیں سمجھا، عالی جاہ!"

"لیکن میرے مشیروں نے سمجھا۔ اور امریکہ والے! کیا میرے مدبّروں نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ جنگ میں شامل نہیں ہونگے؟ کیا میرے جہازرانوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ کوئی فوج یورپ تک نہ لاسکیں گے؟ کیا میرے سپاہیوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ یہاں لانے کے لئے ان کے پاس کوئی فوج نہیں ہے؟ اور اب" اس نے صندوقچہ ہاتھ میں پکڑ کر اُٹھالیا اور اُسے ہلا کر کہنے لگا "ان کے دس لاکھ سے زائد آدمی محاذ پر موجود ہیں۔ اور یہ امریکہ کی ہی بڑی توپیں ہیں۔ جو مالی میدی اور کانفلاز کے درمیان سڑکوں پر گولہ باری کر رہی ہیں۔ اور میری مشرقی افواج کی پسپائی کے لئے یہی ایک تنہا راستہ تھا۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ وہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ سب کچھ ہوا۔ کیا یہ تعجب کی بات ہے کہ جب تمام مواعید جھوٹے ثابت ہوں تو قوم کے افراد دل چھوڑ دیں؟"

اس وقت ایک پتلا، دبلا، درشت رو جنرل، جو چشمہ لگائے ہوئے تھا۔ اور اب تک خاموش رہا تھا۔ مکالمہ میں شامل ہوگیا۔ اس کی سرد اور سخت آواز سے تیقن کی بو آتی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ منضبط نظام اوقات اور مقررہ اصول کا پابند ہے۔

"عالی جاہ! یہ الزامات اور ان کے جوابات کا وقت نہیں جو سوال ہمارے پیش نظر ہے۔ وہ فوری اور ضروری ہے۔ اشتراکی عقاید کے لوگ ہم سے صرف چند میل کے فاصلہ پر موجود ہیں۔ اور اگر خدانخواستہ حضور والا ان کے ہاتھوں میں پڑ گئے۔ تو کوئی شخص نتائج کے متعلق پیشین گوئی نہیں کرسکتا۔ حضور والا کی زندگی خطرہ میں ہے۔ اور اعلیٰ حضرت کی ذات کے متعلق تمام ذمہ داری ہمارے سر ہے۔"

"پھر کیا رائے ہے آپ کی، جنرل فان گرونر؟"

"ہم سب اس امر میں متفق ہیں عالی جاہ! کہ حضور والا کو فوراً سلطنت ہالینڈ کی حدود میں داخل ہوجانا چاہئے۔ یہ تجویز جنرل فان ہنڈنبرگ نے پیش کی ہے۔ ہالینڈ کی سرحد یہاں سے صرف چند میل کے فاصلہ پر ہے۔ اور خود حضور والا کی اسپیشل ٹرین اسٹیشن پر موجود ہے"

"اور سرحد کو عبور کرنے کے بعد مجھے کہاں جانا چاہئے؟"

"اتنا تو ہم کرچکے ہیں، عالی جاہ! کہ ہم نے حکومت ہالینڈ کو تار دیدیا ہے۔ ہمیں ابھی تک اس کا جواب نہیں موصول ہوا۔ لیکن ہم انتظار نہیں کرسکتے۔ خود آپ کی گاڑی میں ہر قسم کے آرام آسایش کا سامان مہیا ہے۔ اور اعلیٰ حضرت کے ذاتی خدمتگاروں کو بھی لیجاسکتی ہے۔ باقی تمام امور بعد میں طے ہوسکتے ہیں جس وقت ہم یہ سُن لیں گے کہ حضور والا ایڈن پہنچ گئے۔ اس وقت ہمارے دل و دماغ کو سکون اور اطمینان حاصل ہوسکیگا۔"

شہنشاہ تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ اور بالآخر کہنے لگا۔

"کیا اس کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ میں اپنی قوم کو اور اپنی فوج کو ضرورت کے وقت چھوڑ کر بھاگ رہا ہوں! اس موقع پر میری ذاتی عزت کا بھی خیال رکھنا پڑیگا۔"

"اعلیٰ حضرت!" فان گرونر نے جواب دیا۔ "جبکہ حضور والا

اپنے مشیروں کی ہدایات پر کاربند ہوں گے۔ آپ سے کوئی بازپرس نہیں کی جا سکتی"۔

"کسی شخص کی عزت اُس کے ذاتی معاملات کا ایک جزو ہوتی ہے۔ اور کوئی شخص اپنی ذمہ داری کو کم نہیں کر سکتا" شہنشاہ نے جواب دیا "میرا خیال ہے حضرات کہ میں اب آپ کو رخصت کر دوں۔ آپ نے اپنی پوری قابلیتوں کے ساتھ مجھے مشورہ دیا ہے۔ اور اب باقی امور کا تمام میرے اختیار میں ہے۔ اگر آپ ذرا ٹھہر جائیں فان برگ اور آپ بھی امیرالبحر تو مجھے آپ سے آخری گفتگو کرنی ہے"۔

سپہ سالار اور امیرالبحر کے علاوہ باقی اراکین سلام کر کے کمرے سے باہر چلے گئے۔ شہنشاہ پھر اپنے دونوں سب سے بڑے خادموں کی طرف بڑھا۔ جو تعظیماً سروقد کھڑے ہوئے تھے۔

"تم میں" قیصر نے اپنا ہاتھ بوڑھے سپہ سالار کی آستین پر رکھ کر کہا۔ "اور تم میں امیرالبحر، دو ایسی ہستیاں پاتا ہوں جو میری فوج اور میرے بیڑے کی عزت کی قائم مقام ہیں۔ سب لوگوں میں سے میں تم کو ہی اس اہم مسئلہ پر منصف قرار دیتا ہوں اب مجھے بتلاؤ، جس طرح ایک دوست دوسرے دوست کو مشورہ دیتا ہے۔ کیونکہ اس وقت شہنشاہ اور رعایا کا کوئی سوال نہیں۔ کہ آیا تم مجھے ہالینڈ چلے جانے کا مشورہ دو گے؟"

"ہم ضرور دیں گے" دونوں نے ہم آواز ہو کر کہا۔

"کیا تمہارا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے میری عزت پر کوئی حرف نہ آئیگا؟"

"ہرگز نہیں عالیجاہ، ہمیں اب شرائط صلح طے کرنی ہیں۔ اور چونکہ امریکہ کے صدر نے یہ اعلان کرنے کی جرأت کی ہے کہ وہ حضور والا کے ساتھ گفتگو سے صلح میں حصہ نہیں لیگا۔ جب تک حضور والا تشریف نہ لے جائینگے ہر کام بند رہیگا۔ اعلیٰ حضرت کے لئے ملک کی بہترین خدمت یہی ہوگی کہ اپنے جذبات و احساسات کی قربانی فرما کر اس منظر سے روپوش ہو جائیں"۔

شہنشاہ تھوڑی دیر تک غور کرتا رہا اُس کی آنکھیں آدھی بند تھیں۔ اور اُس کے چہرے پر انتہائی غور و فکر کی وجہ سے گہرے گہرے نشانات پڑے ہوئے تھے۔ آخرکار اُس نے خاموشی کو توڑا

"ہمیں اپنے سبق کے لئے آج سے ایک صدی قبل پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ فرض کرو کہ شہنشاہ نپولین اپنے آپ کو مالک تخت و تاج سمجھ کر تخت سے دستبردار ہونے سے انکار کر دیتا تو کیا ہوتا؟"

"بے نتیجہ جنگ اور وحشیانہ قتل عام جس کا اختتام اُسکی موت یا گرفتاری پر ہوتا"۔

"تم میرا مطلب نہیں سمجھے۔ فرض کرو کہ وہ واٹرلو کے میدان جنگ کو کبھی نہ چھوڑتا۔ بلکہ اپنے پرانے محافظین کے حلقہ میں کھڑا ہو کر ان کے ساتھ فنا ہو جاتا پھر کیا ہوتا؟"

"اس سے کیا حاصل ہوتا، عالیجاہ؟"

"ہاں، فرانس کو سوائے ایک مثال کے کچھ حاصل نہ ہوتا لیکن کیا خود اس کی یاد زیادہ پرعظمت نہ ہو جاتی اور کیا وہ آج ایک مافوق الادراک ہستی کی طرح معلوم نہ ہوتا جس نے ملاء اعلیٰ کی بلندیوں سے اتر کر اس زمین پر قدم رکھا تھا؟ کیونکہ اس وقت سینٹ ہیلینا کی قید و بند کا افسانہ وقوع پذیر نہ ہوا ہوتا جس نے انتہائی کمال کے بعد انتہائی زوال کا مرقع ہماری نگاہوں کے سامنے کھینچ دیا ہے"۔

سپہ سالار نے اپنا بھاری سر ہلایا۔

"اعلیٰ حضرت مجھ سے بہتر تاریخ داں ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے خوف ہے کہ میرے دماغ پر اس وقت بھی کافی بار ہے میں ایک صدی پیشتر لوٹنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا"۔

"اور تم، فان اسپیر؟ کیا تمہیں کچھ کہنا نہیں؟"

"اگر اعلیٰ حضرت جواب پر اصرار فرماتے ہیں تو میرے خیال میں نپولین کو واٹرلو میں جان دے دینی چاہیئے تھی"۔

شہنشاہ نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"تم میرے ہم خیال ہو۔ میں تمہاری بات مانتا ہوں کہ خواہ کوئی راستہ اختیار کروں، میری عزت پر حرف نہ آئے گا۔ لیکن ایک چیز ایسی بھی ہے، جو عزت سے کہیں زیادہ بلند ہے جب کوئی شخص اس سے زیادہ کر گزرتا ہے، یعنی کہ [illegible] قربانی کرتا ہے۔ تو یہی وہ فوق العزت شے ہوتی ہے جس کو ہم شجاعت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ نپولین اس عزت کو حاصل کرنے میں ناکامیاب رہا۔ پھر اب حضرات میں آپ کو وعدہ کرتا ہوں، یقین رکھئے کہ جو کچھ آپ نے مجھ سے فرمایا ہے میں اس پر کافی غور و خوض کرونگا۔ اور اس کے بعد اپنے لائحہ عمل کا اعلان کرونگا۔"

شہنشاہ اپنا سر دونوں ہاتھوں پر رکھ کر بیٹھ گیا۔ اور ان دونوں کے قدموں کی چاپ اور موٹر کار کی گڑگڑاہٹ کی آواز سنتا رہا۔ آدھے گھنٹہ یا اس سے زیادہ تک وہ بغیر حرکت اپنے خیالات میں [illegible] رہا۔ اس کے بعد ایک دم کھڑا ہو گیا اور اپنا چہرہ اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیئے۔

"اے خدا! مجھے ہمت عطا فرما!"

اس کے بعد اُس نے ایک برقی گھنٹی بجائی، اور نوکر حاضر ہوا۔

"کپتان سیگورڈ وان ہان سے کہو، میں ان کا انتظار کر رہا ہوں"

ایک لمحہ بعد ایک نوجوان خوبصورت افسر جس کی آنکھوں سے تیز فہمی اور ذہانت ٹپکتی تھی، کمرے میں داخل ہوا۔ اور سلام کیا۔ یہ شہنشاہ کا اے ڈی کانگ تھا۔

"سیگورڈ!" شہنشاہ کہنے لگا۔ "ممکن ہے کہ ہمیں عنقریب سخت خطرناک لمحات سے دوچار ہونا پڑے۔ لہٰذا اس موقع پر میں تم کو ان تمام ذاتی اطاعت گزاریوں سے آزاد کرتا ہوں۔ جو تم پر واجب تھیں۔ میں نے سنا ہے کہ نواب میکس والئی ریاست بیڈن نے شاید اپنی ہی خواہش پر تمام جرمنی کو میرے حلقۂ اطاعت سے آزاد کر دیا ہے۔"

"مجھے آزاد ہونے کی کوئی تمنا نہیں، عالی جاہ! حضور والا ہمیشہ کے لئے میرے آقا اور میرے شہنشاہ ہیں۔"

"لیکن میں تم کو اپنے حسرتناک انجام میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا۔"

"میں وہی ہونا چاہتا ہوں، عالی جاہ!"

"لیکن اگر اس کے معنی موت کے ہوں؟"

"پھر بھی کوئی پروا نہیں۔"

"جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ حرف بحرف صحیح ہے۔ اگر تم آخر تک میرا ساتھ دو گے۔ تو تم کو موت کا سامنا کرنا پڑیگا۔"

"مجھے اس سے بہتر قسمت کی خواہش نہیں، عالی جاہ!"

شہنشاہ نے نوجوان شخص کا ہاتھ پکڑ لیا، اور چلا کر کہنے لگا۔

"پھر تو اس زبردست مہم میں ہم ایک دوسرے کے شریک ہیں۔ آؤ، یہاں میرے قریب میز پر بیٹھ جاؤ۔ تاکہ ہم اپنی تجاویز پر غور کر سکیں۔ یاد رکھو کہ شرمناک خودکشی تمہارے شہنشاہ کے دورِ حیات کا خاتمہ نہیں کر سکتی۔ مرنے کے اس سے زیادہ شریفانہ طریقے ہیں اور ان کو حاصل کرنا میرا کام ہے۔"

(۳)

اس رات سپا کے ریلوے اسٹیشن پر ایک عجیب منظر پیش نظر تھا۔ حالانکہ سوائے اس کے تین ایکٹروں کے اس منظر کی کسی اور کو خبر تک نہ تھی۔ یہ منظر اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں ہو رہا تھا جس کے دروازے بند تھے اور پردے چھوٹے ہوئے تھے۔ تین آدمی ایک گول میز کے چاروں طرف بیٹھے تھے۔ اور ایک بڑا لیمپ اُن کے سروں پر جل رہا تھا۔ باہر سے گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ اور سیٹیوں کی آواز آرہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ پلیٹ فارم کے شور و غل سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ تمام اسٹیشن پر گڑبڑی اور بے لگامی پھیلی ہوئی ہے۔ تاہم اس تمام شوروغل سے بے نیاز، وہ شخص جس کا عین فرض یہی تھا کہ اسٹیشن کا انتظام کرے۔ کمرے میں میز کے پاس اپنے چہرے پر حیرت و استعجاب کی ایسی علامات

مرتسم کیے ہوئے بیٹھا تھا۔ گویا کہ وہ باہر کی چیخ پکار کی طرف سے بالکل بہرا بن چکا ہے۔ اسٹیشن ماسٹر، بام گارٹن، ایک چست و چالاک نوجوان آدمی تھا ـــــــ ایسا آدمی کہ جس کے کسی فوجی مرکز سے متعلق ہونے کی توقع کی جاتی ہے۔ وہ اپنی پوری توجہ اس امر کی طرف مبذول کئے ہوئے تھا جس کی تشریح اس کے دونوں ملاقاتیوں میں سے زیادہ عمر رسیدہ کر رہا تھا۔ یہ ملاقاتی جو اپنے ساتھی کی طرح بھورے رنگ کی ٹوئیڈ کا ڈھیلا ڈھالا سوٹ پہنے ہوئے تھا ریلوے کے ایک نقشہ کا بڑی توجہ سے معالعہ کر رہا تھا۔ دراں حالیکہ اس کا نوجوان ساتھی اس کے کندھوں پر سے جھک کر دیکھ رہا تھا۔

"صرف ایک جگہ بدلنا پڑیگا، عالی جاہا" اسٹیشن ماسٹر نے کہا۔

"یہی میرا خیال ہے" شہنشاہ نے اپنی انگلی کانوں پر رکھ کر کہا۔ "بس اس مقام سے نکل جائیں، تو پھر ہم محفوظ ہو جائینگے لیکن سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ ہم پہچانے نہ جائیں"۔

"افسوس، عالی جاہا۔ اعلیٰ حضرت کے چہرے سے لوگ اچھی طرح واقف ہیں اور بغیر پہچانے اُن کی نگاہوں سے بچ نکلنا حضور والا کے لئے قطعی ناممکن ہے"۔

"سوچو، مرد خدا، سوچو" شہنشاہ کے نوجوان ساتھی نے بے صبری کے ساتھ چلاّ کر کہا۔ اس معمہ کو تم ضرور حل کر سکتے ہو"۔

بام گارٹن اپنا سر کھجانے لگا، اور اضطرابی کیفیت میں کمرہ میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ یکایک اس کے دماغ میں ایک خیال پیدا ہوا۔ وہ ٹھہر گیا اور میز کی طرف مُڑا۔

"مال گاڑی کا ایک ٹھنڈا ڈبہ ہے، عالی جاہا، جو ابھی ابھی ترکاریوں سے بھرا ہوا الینڈ سے آیا ہے۔ ہم ڈبہ کے ٹھنڈا رکھنے والے آلات کو بند کر دیں گے۔ ڈبہ بالکل بند ہے۔ اور کوئی کھڑکی بھی نہیں۔ اگر اعلیٰ حضرت منظور فرما ـــــــ"

"القابوں کو چھوڑ دو" شہنشاہ نے چاروں طرف مشکوک نظریں ڈالکر کہا۔

"اچھا تو جناب اگر آپ اس ادنیٰ طریقہ پر سفر کرنے کے لئے تیار ہوں تو ہم اس پر "کھولا نہ جائے" کا لیبل لگا دیں گے۔ اور اگلی گاڑی کے ساتھ ہی کیل کو روانہ کر دیں گے"۔

"بہت خوب! اس سے بہتر بات نہیں ہو سکتی۔ البتہ یہ ضرور دیکھ لینا کہ اس میں کچھ کھانے پینے کا سامان بھی رکھ دیا گیا ہے"۔

"اور ایک بستر، عالی ـــــــ ایک بستر جناب"۔

"نا! نا! گھاس پھونس بھی اتنا ہی کام دے سکتا ہے۔ کیا ہم اسی وقت روانہ ہو سکتے ہیں؟"

"آدھ گھنٹہ کے اندر۔ لیکن آپ یہاں پلیٹ فارم پر بغیر نظر آئے کس طرح جائینگے؟"

"اس مشکل کی میں نے پیش بندی کر لی تھی"۔ نوجوان ایڈی کانگ نے کہا اور اپنی جیب سے ایک پٹی نکالی۔

"اگر آپ ایک ایسے افسر کا پارٹ کرنے پر راضی ہوں، جس کے چہرہ پر زخم آ گیا ہے۔ تو میں بآسانی آپ کا بھیس بدل سکتا ہوں"۔

"زخم تو میرے دل پر ہے" شہنشاہ نے کہا۔ "لیکن اس لباس کا کیا ہوگا؟"

"آجکل کے زمانہ میں لوگ اس قسم کی باتوں پر دھیان نہیں دیں گے۔

چند ماہرانہ لپیٹوں کے بعد نوجوان ایڈی کانگ نے پٹی شہنشاہ کے چہرے پر باندھ دی۔ اور وہاں سے پیچ دیکر غاز موچھوں کو بھی اس کے لپیٹ میں چھپا دیا۔

"میرا خیال ہے، جناب، کہ اب آپ محفوظ ہیں"۔

"خوب رہا، سیگورڈ۔ اچھا، بام گارٹن، ہم یہاں انتظار کرتے ہیں، اور جب تم کہو گے، ہم تیار ہو جائیں گے"۔

---

(۴)

چھتیس گھنٹے بعد کیل کے اسٹیشن ماسٹر نے، جو شاہ پسند مشہور تھا، مال گاڑی کے ایک مقفل ڈبہ کا دروازہ کھولا۔ اندر سے ایک متوسط عمر کا آدمی، جس کے چہرہ پر سخت زخم کی وجہ سے پٹی بندھی ہوئی تھی، اور اس کا نوجوان ساتھی، جو ولی عہد، وہی کے ساتھ اس کی خبرگیری کر رہا تھا، نکلے۔ دونوں نووارد بے پرواہ اور سرد مہر نظر آتے تھے۔ لیکن اسٹیشن ماسٹر تیزی کے ساتھ ان کو اپنے کمرہ میں لے گیا، جہاں گرم کافی اور گرم آتشدان کا انتظار کر رہے تھے۔

"میرے لائق کوئی خدمت، عالی جاہا؟ صرف حضور والا کے حکم کی دیر ہے۔"

"آپ کو ابھی معلوم ہو جائے گا،" شہنشاہ نے کہا۔ "اس عرصہ میں آپ یہ رقعہ امیر البحر فان ڈروتھا کے پاس خود لے جایئے یا کسی معتبر آدمی کے ہاتھ بھجوا دیجئے۔ جب وہ آ جائیں تو انہیں یہاں لے آیئے۔"

ایک گھنٹہ بعد ایک حیرت زدہ افسر، جو شاہی محکمۂ بحری کی وردی پہنے ہوئے تھا، اس معمولی کمرہ میں داخل ہوا۔ وفاداری اور اطاعت کے بے پایاں جذبات اس کے جسم کو مرتعش بنائے ہوئے تھے، جس کے گہرے گہرے نقوش اس کے چہرے کے ہر ہر خط میں مرتسم ہو رہے تھے۔ وہ قیصر کے سامنے اپنے گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ لیکن قیصر نے اسے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔

"عزیز امیر البحر، اس قسم کی باتوں کے دن گذر چکے۔ کیا نواب میکس نے یہ اعلان نہیں کیا، کہ میں تاج و تخت سے دستبردار ہو چکا ہوں۔ حالانکہ میں اقرار کرتا ہوں کہ یہ خبر میرے لئے بالکل نئی تھی۔ اب تو میرا تخت یہ ہے۔"

اس نے اسٹیشن کی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"اعلیٰ حضرت بیٹھنے کیلئے ہمارے شہنشاہ ہیں۔"

"ہاں، ہاں۔" قیصر نے سینہ پر ہاتھ مار کر کہا۔ "میں بیٹھنے کے لئے شہنشاہ ہوں۔ خدا نے مجھے یہ امانت عطا فرمائی تھی۔ اور صرف وہی اس بار کو میری گردن سے اتار سکتا ہے۔ لیکن آجکل میں عوام سے کسی نیوفس یا کسی عنایت کا خواستگار نہیں سوائے ایک کے۔ گو وہ سب سے اہم اور سب سے دشوار ہے۔ کیا تمہاری وفاداری اس کی بلندی تک پہنچ سکیگی؟"

"میری وفاداری بڑی سے بڑی بلندی تک پہنچ سکتی ہے عالیجاہا۔ ارشاد تو فرمایئے۔"

"یہ کہ تمہیں میرے ساتھ جان دینی چاہئے۔"

"عالی جاہا، یہ میری سب سے بڑی تمنا ہے۔"

وفادار جہازراں کے چہرے پر عقیدت و محبت کے آنسو بہنے لگے۔ شہنشاہ نے بھی اپنا ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔

"مجھے دغاباز دوست ملے تھے۔ لیکن دنیا میں سچے دل والے بھی موجود ہیں۔ آؤ، امیر البحر، یہاں بیٹھ جاؤ۔ پوسٹ ڈام[1] کے عالیشان محل سے، جہاں ہم آخری مرتبہ ملے تھے، یہ ماحول بالکل جداگانہ ہے۔ لیکن ہمیں تنہائی حاصل ہے جو سب سے زیادہ ضروری ہے۔ میں کیل میں اس غرض سے آیا ہوں کہ اپنا بیڑہ برطانیہ کے خلاف لڑنے کے لئے نکالوں۔"

امیر البحر کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"لیکن، عالی جاہا، ملاح باغی ہو رہے ہیں۔ انہوں نے افسروں کو خشکی پر نکال دیا ہے۔ ہم جہازوں پر ملاحوں کا انتظام کس طرح کریں گے؟"

"وہ آ جائیں گے، وہ آ جائیں گے۔ وہ جرمن ہیں۔ اور اپنے شہنشاہ کو تنہا مرنے کے لئے نہیں جانے دینگے ——— کیونکہ میں خود جا رہا ہوں، امیر البحر، خواہ وہ صرف ایک تارپیڈو کشتی ہی کیوں نہ ہو، جو مجھے لے جائے گی۔"

---

[1] جرمنی کا شاہی محل، جو برلن کے قریب واقع ہے۔

"اور میں اس تارپیڈو کشتی کا کمانڈر ہونگا"، امیر البحر نے چلاکر کہا۔

"اور میں عرشہ پر"، سیکورڈوان مان نے کہا۔

"لیکن حضور والا کی تجویز کیا ہے، عالی جاہ!" امیر البحر نے پوچھا۔ "اعلیٰ حضرت نے اپنے ذہن میں کوئی لائحۂ عمل ضرور معین فرمالیا ہوگا"۔

ہاں، امیر البحر، میں نے اس کی جزئیات تک پر نظر ڈال لی ہے۔ سب سے پہلے کیا تم کوئی ایسا وسیع مکان بتاسکتے ہو، جہاں کئی سو آدمی خفیہ طور پر جمع کئے جاسکتے ہوں؟"

"جی ہاں، عالی جاہ۔ کاونٹ وان والڈارف کے بنگلے سے ملحق اُن کی رقص گاہ ہے، جو حضور والا کی ضروریات کے لئے مناسب ہوگی۔ یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ کاونٹ اعلیٰ حضرت کے وفادار خادم ہیں"۔

"اگر ہم تمام افسروں تک یہ پیغام پہنچاسکیں، او اُن کو وہاں پر جمع کرلیں، تو میں خود اُن سے اعانت اور اشتراک عمل کی اپیل کرونگا"۔

"عالی جاہ! میں اپنے رفقائے کار کے جذبات سے واقف ہوں۔ اُن سے ایسا سوال کرنا بالکل وقت ضایع کرنے کے مترادف ہوگا۔ جرمن بیڑے کے افسروں میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے۔ جو اعلیٰ حضرت کی اطاعت گزاری میں ذرا بھی پس و پیش کرے۔ اعلیٰ حضرت صرف اپنی خواہش کا اظہار فرمادیں۔ وہ جان و دل سے اسے پورا کرنے کیلئے تیار ہیں"۔

"پھر تو اسقدر وقت بچ گیا، اور آجکل ایک ایک گھنٹہ نہایت اہمیت کا ہے۔ محاذ جنگ پر اور ملک کے اندر ہر جگہ فتور نظر آتا ہے۔ ہم کو فوراً کام کرنا چاہئے۔ ورنہ روک دیئے جائیں گے۔ لیکن خلاصیوں کا کیا ہوگا؟"

"مجھے خوف ہے عالی جاہ، کہ وہ نہیں آئیں گے۔ ان کو اس بات کا علم ہو جانا بھی خطرناک ہے کہ حضور والا شہر میں موجود ہیں"۔

"خطرہ کوئی چیز نہیں۔ جب منزل مقصود لازمی طور پر موت ہو تو راستہ کے خطرات کی کون پرواہ کرتا ہے! میں افسروں کے متعلق تمہاری بات مان لیتا ہوں، امیر البحر۔ لیکن کیا ملاحوں میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں، جو وفادار اور قابل اعتماد ہوں؟"

"بہت سے ہیں، عالی جاہ۔ لیکن وہ اقلیت میں ہیں"۔

"وہ ہمارے لئے قاصدوں کا کام دیں گے۔ جسقدر ہوسکیں جمع کرلو۔ اور اُن کے ہاتھ ہر جہاز میں خطوط روانہ کردو۔ ملاحوں سے درخواست کرو کہ اپنے نمائندے اس رقص گاہ میں بھیجیں جس کا تم نے تذکرہ کیا ہے ــــــ بڑے جہاز سے تین، چھوٹے کروزر سے دو، اور چھوٹے جہاز سے ایک۔ انہیں لکھ دو کہ تین بجے اعلیٰ شہنشاہ ان سے گفتگو کرنا چاہتا ہے بلکہ میرا نام ولیم فان ہوہنزولرن لکھنا۔ اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ وہ مجھے کیا کہہ کر پکاریں گے، بشرطیکہ آجائیں"۔

"عالی جاہ، وہ آئیں گے۔ اور حضور کے وفادار افسروں کا ایک دستہ اعلیٰ حضرت کے گرد ہوگا۔ وہ صرف ہمارے مردہ جسموں کے اوپر سے ہوکر حضور والا تک پہنچ سکیں گے"۔

"کسی افسر کی ضرورت نہیں، امیر البحر۔ مجھے صرف ملاحوں پر اعتبار کرنا چاہئے، ورنہ ہمارا معاملہ غارت ہو جائیگا۔ بس تم اور کپتان فان مان، اور کوئی نہیں۔ میرے لئے ایک بند موٹر کار بھیج دینا۔ اور اپنے دوست کاونٹ فان والڈارف کو میری آمد سے مطلع کردینا۔ بس اب تین بجے ملاقات ہوگی۔

(۵)

وقت مقررہ سے بہت پہلے تمام کیل میں ہیجان و اضطراب کی ایک لہر دوڑ گئی۔ شہر میں یہ خبر بجلی کی سرعت سے پھیل گئی کہ شہنشاہ یہاں آیا ہوا ہے۔ اور والڈارف میں مقیم ہے۔ سڑکوں پر لوگوں کے ہجوم جمع ہونے لگے۔ کہیں کہیں کوئی سرخ جھنڈا بھی اُڑتا

نظر آتا تھا۔ تاہم یہ اجتماع مظاہرے کے طور پر نہ تھا۔ ہر شخص کے چہرے سے انتہائی حیرت و استعجاب کے جذبات نمایاں تھے کہ شہنشاہ تمام شہروں کو چھوڑ کر یہاں آیا ہے، جو انقلابی فسادات کا خاص مرکز ہے۔۔۔ گویا کہ اُس نے اپنا سر شیر کے منہ میں دے دیا ہے۔ حیرت! حیرت!! اس کے بعد لوگوں کا تعجب اور ترقی کر گیا، جب ایک کھلی ہوئی موٹر کار، جس میں ایک داڑھی والا افسر امیر البحر کی وردی پہنے بیٹھا تھا، آہستہ آہستہ ہجوم کے درمیان سے گذری، اور افسر بنگلہ میں داخل ہوا۔ اس پتلے دُبلے افسر کو تمام لوگ بہت اچھی طرح جانتے تھے، یہ ہنری قیصر ولیم کا چھوٹا بھائی اور جرمن بیڑے کا سب سے بڑا امیر البحر تھا۔ آخر کیا ہو رہا ہے؟ اس کا مطلب کیا ہے؟ کیا وہ کسی تبدیلی حکومت کی سازش کر رہے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو انہیں بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ انقلاباتِ حکومت استقدر آسانی سے نہیں مٹائے جا سکتے۔ یہ اور اسی قسم کے الفاظ ہجوم کے اندر سے سنائی دے رہے تھے اور تمام ہجوم کی نگاہیں اس عالیشان بنگلہ کے در و دیوار سے لگی ہوئی تھیں۔

اور اب نمائندے جمع ہونا شروع ہوئے۔ دو دو اور تین تین ہو کر، ہجوم کو بمشکل کہنیوں سے ہٹاتے ہوئے وہ آنے لگے گو ہر شخص ان کا مضحکہ اُڑا رہا تھا۔ بہتوں کی گردنوں میں سرخ رومال نمایاں طور پر بندھا ہوا تھا۔ اور اکثر ٹوپیوں پہ سرخ فیتہ لگائے ہوئے تھے۔ بنگلہ کا وسیع ہال، جس میں بہترین ساز و سامان تھا اور بلوط کے تختوں کا فرش لگا ہوا تھا۔ بہت جلد پُر ہونے لگا۔ سٹیج مقفل کی کرسیاں جو قطار در قطار رکھی ہوئی تھیں، ملاحوں سے بھر گئیں، اور ہال میں تِل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ ہر شخص سگرٹ پی رہا تھا، جس کے دھوئیں سے کمرہ کی فضا نیلی ہو گئی تھی۔ ایک ملاح نے انقلابی گیت گانا شروع کر دیا، جس کی صدائے بازگشت رقص گاہ کی اونچی اونچی چھتوں سے ٹکرا کر لوٹنے لگی۔ اس شور و غل کے درمیان شہنشاہ نمودار ہوا۔

گیت کی آواز ایک دم بند ہو گئی، اور ہر شخص کی نگاہ اس پستہ قد لیکن اکڑی ہوئی شکل پہ جم گئی، جس کے بازو پشت کے پیچھے جھول رہے تھے۔ اس پُر خلوص، متفکر چہرے پر جم گئی جو ہال کے ایک طرف ڈائس پر کھڑا ہوا ان کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس وقت نیلے رنگ کا معمولی لانگ ساکوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اور اسی کی شکل محکمۂ بحری کا ایک آدمی معلوم ہوتا تھا، جو اس سے پیشتر اپنے شاہانہ ملبوس فاخرہ میں کبھی معلوم نہ ہوا تھا۔ حاضرین کے دلوں سے ہمدردی اور احترام کے جذبات نکل نکل کر اُس کے قدم چومنے لگے۔ جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے فوراً سرو قد کھڑے ہو گئے۔ اور وہ ملاح جنہوں نے تیز سیٹیوں سے نیچی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا، زبردستی کمرے سے نکال کر باہر پھینک دیئے گئے۔

شہنشاہ آگے بڑھا، اور اپنا ہاتھ معلا جنگلہ پہ رکھ کر کھڑا ہو گیا اُس کا بھائی ہنری امیر البحر فان ڈرو تھا، اور نوجوان سیکورٹی وآن ان اُس کے پیچھے کھڑے تھے۔ اُس نے تقریر شروع کی، تو اُس کی آواز سے جو اُس وسیع ہال میں اس سرے سے اُس سرے تک گونج رہی تھی، استقلال ٹپک رہا تھا۔

"میں جرمنوں سے ایک جرمن کی حیثیت میں مخاطب ہوا ہوں میں نے یہی مناسب سمجھا کہ میں خود یہاں آؤں۔ اور آپ حضرات سے بالمشافہ گفتگو کروں۔ میں سیاسیات پر بحث نہیں کرونگا میرے دماغ میں ملوکیت یا جمہوریت کا کوئی سوال نہیں۔ مجھے صرف ایک خیال ہے۔ اپنی ذاتی عزت کا، اپنے بیڑے کی عزت کا، اور اپنے ملک کی عزت کا۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے حاضرین کے دلوں کو مسخر کر لیا تھا، جس طرح کہ پُر خلوص صداقت ہمیشہ کر لیا کرتی ہے۔ موسم زدہ چہرہ تنکا سمند رسر تا پا اُس کی طرف متوجہ تھا۔ انکی نگاہیں

منتظر کے چہرے پر جم کر رہ گئی تھیں۔

"وہ برلن میں ہتھیار ڈال رہے ہیں۔ کیا یہ کوئی وجہ ہو سکتی ہے کہ ہم یہاں کیل میں سرِ تسلیم خم کر دیں؟ فوج بہت بہادری کے ساتھ لڑ رہی ہے۔ لیکن وہ اب شکستہ ہو چکی ہے۔ اور آئندہ نہیں لڑ سکتی۔ یہ میں نہیں ہوں۔ جس نے فوج کا ساتھ چھوڑ دیا۔ بلکہ خود فوج میرا میرے عزائم کا ساتھ نہ نباہ سکی۔ بیڑہ بھی بہت بہادری کے ساتھ لڑا ہے۔ مگر وہ شکستہ نہیں ہوا۔ اس نے ابھی تک کوئی بڑی لڑائی نہیں لڑی"۔

"اسکیجر ریک!" بہت سی آوازوں نے چلا کر کہا۔

"ہاں، تم نے اسکیجر ریک پر بہت بہادری دکھائی لیکن تمہاری لڑائی برطانی بیڑے سے نہ تھی۔ بلکہ جہازوں کے زیادہ سے زیادہ دو یا تین دستوں سے تھی۔ ہمیں ابھی تک اپنی پوری طاقت کے ساتھ ان سے دو دو ہاتھ کرنا ہیں۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ یہ فضول ہے۔ مجھ سے کہا گیا ہے کہ ان کے جہازوں کی تعداد کی وجہ سے یہ ناممکن ہے۔ لیکن بہادر آدمیوں کے لئے دنیا میں کوئی چیز فضول یا ناممکن ہے؟ اگر کیا بہرحال یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہمارے جہاز بحیرۂ شمالی کی تہ میں پڑے ہوئے ہوں، بہ نسبت اس کے کہ بغیر ہاتھ اٹھائے ان کو دشمن کے حوالے کر دیا جائے؟ اے جرمن بیڑے کے ملاحو! کیا تم سے یہ امید کی جا سکتی ہے کہ تم کھڑے کھڑے تماشہ دیکھو اور تمہاری آنکھوں کے سامنے ایسا ہو جائے یا تم اپنے شہنشاہ کے ساتھ جان دینے کے واسطے آمادہ ہو؟"

اس نے اپنا بازو ملتجیانہ طور پر ایک دلکش انداز میں آگے بڑھایا۔ اس کے بعد مفتخرانہ، مسرت انگیز تبسم اس کے چہرے پر کھیلنے لگا۔ کیونکہ اس نے اپنے مقصد پر فتح پائی تھی آگے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کا ایک جنگل، سرخ اطاعت گزار چہروں کا ایک سمندر، گہری بھرائی ہوئی آوازوں کا ایک طوفان ——— اس کی فتح کا پرچم اڑا رہے تھے۔ بیڑا اپنے قیصر کے ساتھ جان دینے کے لئے تیار تھا۔

"جلدی، ولیم! بہترین موقع ہے!" اس کے بھائی نے چپکے سے کہا۔

"تم میرے ساتھ چلو گے۔ میں جانتا تھا کہ تم چلو گے۔ لہٰذا یہ الفاظ اپنے ساتھیوں تک پہنچا دو کہ وہ کسی کو اپنی مرضی کے خلاف آنے کی ضرورت نہیں۔ وہ ساحل پر کھڑے رہیں۔ لیکن تم اور میں اور تمام سچے جرمنی دل جرمن بیڑے کے موت کے سفر پر ایک دوسرے کے ساتھ روانہ ہوں گے، اور جو کچھ میں نے کہا ہے وہ کرو"۔

بھاری بھاری قدموں کی آواز کمرہ میں گونجنے لگی۔ اور چند لمحات میں کمرہ بالکل خالی ہو گیا۔ ہر دروازہ سے جوش میں بھرے ہوئے ملاح دھکے دے دے کر لڑ لڑ کر، جھگڑ جھگڑ کر نکل رہے تھے۔ کسی نامعلوم طریقہ سے باہر کے ہجوم کو بھی ایک لمحہ میں ہی اندر کا حال معلوم ہو گیا۔ اور اندر کی آگ وہاں بھی اپنا اثر دکھا چکی تھی۔ تمام شہر جوشِ شجاعت اور وفورِ مسرت کا منظر بنا ہوا تھا۔ ہر طرف جھنڈے ہی جھنڈے نظر آتے تھے۔ اور ہر حصہ میں انقلابی سرخ نشان کے ساتھ جرمنی کا لڑائی کا جھنڈا بھی لہرا رہا تھا۔ کم از کم اس امر میں ملاح ضرور مستقل مزاج رہے ——— جنگ کا علم بلند کر دیا گیا۔ لیکن سرخ جھنڈوں کو نہیں اتارا گیا۔ تمام دن اور تمام رات اشتراکیوں کے جلسوں میں گرما گرم مباحثے ہوتے رہے۔ جہاں کئی مرتبہ ایسے لوگوں نے جو قیصر کے ساتھ جانا چاہتے تھے۔ اپنے مخالفین کو نیچا دکھا دیا۔ ولہیلم ہیون سے بھی خبریں آنا شروع ہوئیں کہ یہ جوشِ اضطراب وہاں بھی پھیل گیا ہے، تمام افسر جہاز علی الصبح بلا لئے گئے۔ ملاح اپنی اپنی جگہ پر کام کرنے لگے اور انجنیروں نے جہازوں کی مرمت کے لئے بھٹیاں روشن کر لیں۔ بیڑہ روانہ ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔

———

(۹)

اس کے بعد چند روز تک ہیلگو لینڈ میں سے جہاز مسلسل گزرتے رہے۔ تاکہ اصل بیڑے کے ساتھ، جو جیڈ میں لنگر انداز تھا، شامل ہو جائیں۔ ایک ہلکے کروزر کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے کچھ تاخیر واقع ہو گئی۔ جس نے نیو ورتن برگ کے قریب راستہ مسدود کر دیا۔ لیکن اس کو بہت جلد درست کر لیا گیا، اور تیسرے دن کی شام تک تمام جہاز یا تو جیڈ کے قریب دریا میں جمع ہو گئے یا ولہیلم ہیون کی بندرگاہ میں۔ اسی رات کو نئے جنگی جہاز بے برن کے ایک کمرہ میں مجلسِ مشاورت منعقد کی گئی، جس میں تمام جرمن سردار معہ شہنشاہ کے موجود تھے۔ شہنشاہ نے ایک معمولی جگہ بیٹھنے پر اصرار کیا اور امیر البحر فان ٹرپیز، جو اس واقعہ کی پہلی افواہ سنتے ہی برلن سے بسرعت تمام یہاں آ پہنچا تھا، مجلس کا صدر منتخب کیا گیا۔ تمام نائب امیر البحر اور بڑے بڑے جہازوں کے کپتان، جن کی مجموعی تعداد چالیس تھی، جلسہ میں شریک تھے۔ ہر شخص کے چہرے پر حسرت و یاس، لیکن اسی کے ساتھ استقلال اور ثبات کے آثار ہویدا تھے۔

"میں جہاں تک سمجھا ہوں، عالی جاہ!" فان ٹرپیز نے کہا۔ "حضور والا کے احکامات یہ ہیں کہ لڑائی آخر وقت تک جاری رہیگی"

"ہاں، میری یہی خواہش اور یہی حکم ہے" شہنشاہ نے جواب دیا۔ "بیڑے کو غرق ہونا ہے۔ اور یہ بہتر ہوگا کہ وہ اپنے ساتھ دشمن کے جس قدر جہاز سمندر کی تہ میں لے جا سکے، لیجائے"

"ہمیں نتائج و عواقب سے بھی دوچار ہونا پڑیگا۔ اس کے معنی عالی جاہ کی موت کے ہونگے"

"مجھے اس سے بہتر قسمت کی تمنا نہیں"

"اور پچیس ہزار افسروں اور ملاحوں کی موت کے"

"کیا اس کونسل میں کوئی شخص ایسا ہے، جو موت سے خوف کھاتا ہو؟" شہنشاہ نے سوال کیا۔

جلسہ میں خاموشی طاری رہی۔ سب آمادہ تھے بیڑہ آمادہ تھا۔

"لیکن میں بصد احترام یہ عرض کرونگا" ایک نوجوان نائب امیر البحر نے کہا۔ "کہ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم اس طرح گفتگو کریں گویا شکست لازمی ہے؟ ہم نے اسکیجر ریک پر انگریزوں کو شکست دی۔ کیا ہم دوبارہ ایسا نہیں کر سکتے؟"

"اس کے علاوہ" دوسرے نے کہا۔ "آج ہمارا بیڑہ اس وقت کی نسبت طاقتور ہے، بہت زیادہ طاقتور ہے۔ کیا ہم نے اپنی تعداد میں بے برن اور بیڈن جیسے بڑے اور پندرہ انچ کی توپوں والے جہاز اضافہ نہیں کر لئے۔ حالانکہ اسکیجر ریک میں ہماری تعداد بارہ سے زیادہ نہ تھی؟ اور صنعتِ تیر گیس بھی! کیا یہ اضافہ نہیں ہوا؟ اور آگ نہ لگنے دینے کا نیا انتظام؟ کیا ہم انگریزوں کو دریائے جیڈ میں غرق نہ کر دیں گے؟"

"لیکن یہ بعید از وقت ہے" وان ٹرپیز نے کہا۔ "اگر ہم فتح حاصل کر لیں، تو ہمارا کوئی وطن نہ ہوگا، جہاں ہم لوٹ کر جا سکیں"

اس نے اپنی جیب سے ایک تار نکالا، اور زور سے پڑھ کر سنایا۔

"حکومتِ وقتی اس احمقانہ تجویز کو حقارت کی نظر سے دیکھتی ہے، جو بیڑے نے اچانک حملہ کرنے کے متعلق پیش کی ہے، جس سے جہازوں اور آدمیوں کے غیر ضروری نقصان کے سوا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ اس تجویز کی خبر نے صلح کی گفت و شنید میں خطرناک رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں۔ تمہاری حکومت کی اطاعت شعاری کا یہ تقاضہ ہے کہ تم فوراً جہازوں کو اپنی اپنی لنگرگاہ کو واپس چلے جانے کا حکم دیدو"

افسروں کی زبان سے غصہ اور حقارت کے الفاظ نکل گئے۔ ان کے امیر البحر نے کاغذ پھر اپنی جیب میں رکھ لیا اور کہنے لگا:۔

"حضرات میرا خیال ہے کہ آپ اس امر میں مجھ سے متفق ہونگے کہ ہماری فرمانبرداری ہمارے شہنشاہ اور صرف شہنشاہ کے لئے مخصوص ہے"

"آپ نے اس کا جواب دیدیا ہے کیا؟" قیصر نے دریافت کیا

"نہیں، اعلیحضرت۔ ہمارا فعل خود اس کا جواب دیگا۔ لیکن میں نے ایک پیغام کا مسودہ تیار کیا ہے۔ جس کو اعلیٰ حضرت کی رضامندی پر میں برطانی کمانڈر انچیف کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں۔ اس کا مضمون یہ ہے :-

"جرمن بیڑہ کسی صلح کے لئے راضی نہیں۔ اس کی تجویز ہے کہ وہ فوراً آئے اور اُمید کرتا ہے کہ پیر کے روز ہیلیگولینڈ سے ٹھیک جانب مغرب ستر میل کے فاصلے پر موجود ہوگا۔ بشرطیکہ راستے کی صفائی نے اجازت دی۔ اگر ہم کو دیر ہو جائے تو آپ بلاشبہ ہمارا انتظار کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے"۔

"بہت خوب!" شہنشاہ نے چلّا کر کہا، اور تمام کونسل نے تالیاں بجائیں۔

"پھر یہ ابھی روانہ کردیا جائے؟" امیرالبحر نے کہا۔

"لیکن کیا دشمن اس مقام پر اپنی غوطہ خور کشتیاں نہ لا دینگے؟" ایک کپتان نے پوچھا۔

"ہم مقام کی اسقدر پابندی ہی نہیں کریں گے۔ ہمارے ہلکے کروزر ہمارے مقام تک دشمن کی رہنمائی کرینگے لیکن کپتان مولر آپ نے جو ہمارے بیڑے میں اضافہ کے متعلق اور ماسکیچر تک کے متعلق کہا تھا اس میں غلط فہمی نہ رہنی چاہیئے۔ دشمن بھی اس عرصہ میں غافل نہیں رہے ہیں، اور اُنہوں نے جو کچھ کیا ہے اس کی ہمیں برابر اطلاعات ملتی رہی ہیں۔ اگر ہم جہاز بنا سکتے ہیں۔ اگر ہم ان میں اصلاح کر سکتے ہیں، اور ان کی تنظیم کر سکتے ہیں۔ تو اسی طرح وہ بھی مجبور نہیں ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ انہیں دو بڑے جہازوں کا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ کیونکہ اسلحہ خانہ اور توپوں والے برج کے درمیان کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اب اس کا علاج کر لیا گیا ہے ان کے عرشوں کی حفاظتی دیواریں۔ اور ان کے توپوں والے برجوں کی چھتیں پہلے کی بہ نسبت زیادہ مضبوطی کے ساتھ گولہ باری کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ ان کے گولوں میں پھٹنے کی زیادہ طاقت ہے۔ اُنہوں نے اپنے دستوں میں کئی طاقتور جہازوں کا اضافہ کر لیا ہے۔ میرے پاس ان کے نام موجود ہیں۔ ان میں ریمیلیز، ریزولیوشن، ریناؤن اور ریپلس، سب پندرہ انچ کی توپوں والے ہیں۔ ان کے پاس امریکہ کے جنگی جہازوں کا بھی ایک ستہ ہے اور امریکہ کی بحری تاریخ بتاتی ہے کہ وہ اس فن کے ماہرین میں سے ہیں۔ ہمارے مقابلہ میں دشمن کا پلہ بہتر سے زیادہ بھاری ہے۔ ہم صرف اخیر دم تک لڑنے کی قسم کھا سکتے ہیں۔ سب سے پہلے اپنی طرف سے میں اس کی قسم کھاتا ہوں"۔

اتنا کہ کر اس نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ اور جیسا کہ اس بیان سے ظاہر ہوگا۔ اُنہوں نے شریفانہ طریقوں سے اپنی قسموں کو پورا کر دکھایا۔ جرمن بیڑے کی آخری مجلس مشاورت کے یہ آخری الفاظ تھے اور اس کے بعد حسرتناک اور مایوس چہروں کیساتھ اُنہوں نے ایک دوسرے کو الوداع کہی۔ کپتان اپنے اپنے جہازوں کو لے کر رخصت ہوگئے۔ لیکن امیرالبحر اپنے شہنشاہ کے ساتھ اپنے مستقبل کے متعلق تجاویز سوچنے کے لئے وہیں ٹھہر گیا۔

(۲)

ٹھیک ایک دن بعد برطانی بیڑے کے کمانڈر انچیف کے کمرے میں دو امیرالبحر بیٹھے ہوئے سنجیدہ طور پر گفتگو کر رہے تھے ان میں سے ایک تو وہی کمانڈر انچیف بیٹن تھا، اور دوسرا امریکہ کا امیرالبحر بریڈ مین، جس کے خوبصورت دستے نے وئیومنگ، فلوریڈا، ڈیلاویئر، ارکنساس، اور ٹکساس پر مشتمل تھا۔ دنیا کی تاریخ میں جنگی جہازوں کے سب سے زیادہ خطرناک اجتماع میں آخری اضافہ کیا تھا۔ بیٹن کے کمرے کے کھلے ہوئے سوراخ میں سے ہر شخص ان جہازوں کو لنگر ڈالے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ ان پر امریکہ کا قومی نشان لہرا رہا تھا ان کے پار عظیم الشان جنگی جہاز، دیو قامت کروزر اور ہلکے جہاز طار

درگطار برطانیہ کا جھنڈا اُڑاتے ہوئے وسیع و عریض دریا کا دہانہ بند کئے ہوئے پڑے تھے۔ سب کے پار وہ نیچا غیر آباد ساحل تھا جو منظر کے اعتبار سے غم انگیزی اور ویرانی میں ساری دنیا میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔

بیٹی جس کے خوبصورت چہرے پر ذہنی کشمکش اور غصہ کے آثار نمایاں تھے اپنے رفیق کو جرمن لاسلکی پیغام زور سے پڑھکر سنا رہا تھا۔

"اس سے کیا نتیجہ نکالا بریڈمین؟" اُس نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھکر پوچھا۔

"بظاہر تو بہت اچھی بات معلوم ہوتی ہے۔ اتنی اچھی کہ صحیح ہونے میں مجھے تو شک ہے"۔

"معلوم نہیں۔ بہرحال اُنہیں اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ اور اگر جنگ کا فیصلہ اس کے برعکس ہوتا تو میرے خیال میں ہمیں بھی ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔ وہ چاہیں تو بندرگاہوں میں ہی اپنے جہازوں کے پیندے میں سوراخ کر کے انہیں ڈبو سکتے ہیں ـــــ ورنہ باہر آکر ہماری توپوں سے سوراخ کرا سکتے ہیں۔ گویا اس صورت میں ہمارے بھی کچھ جہاز وہ اپنے ساتھ سمندر کی تہ میں لے جائیں گے۔ مجھے تو یہی بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اور بہادر لوگ سب سے پہلے ہمیشہ اسی کا خیال کرتے ہیں"۔

"شاید ایسا ہی ہو۔ لیکن بہرحال یہ ایک جال بھی ہو سکتا ہے جس میں وہ ہمیں پھانسنا چاہتے ہوں"۔

"ہاں، اگر ہم سے ہو سکا، تو ہم اندھا دھند کانٹوں میں گھسے نہیں چلے جائیں گے۔ ہمارے ہلکے کروزر اس کی نگرانی اور دیکھ بھال کرتے رہیں گے۔ بہر نوع میرے خیال میں ان کے پاس جواب ضرور بھیج دینا چاہئے"۔ اُس نے ایک پنسل اُٹھائی اور ایک کارڈ پر یہ الفاظ لکھے "بہت اچھا۔ ہم وہاں موجود ہونگے۔

"کہئے کیسا رہا؟"

"یہ بالکل ٹھیک ہے"۔

بیٹی نے گھنٹی بجائی اور پیغام ایک نوجوان افسر کو دیکر کہا "زیادہ اشارات اور کوڈ کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈیکن۔ جس طرح ہے۔ ایسے ہی روانہ کر دو"۔

دروازہ بند ہونے کے بعد وہ بحیرۂ شمالی کے بڑے نقشہ کی طرف متوجہ ہوا جس پر پنسل کے اسقدر نشانات اور نقطے لگے ہوئے تھے۔ کہ نقشہ تقریباً بالکل بیکار ہو چکا تھا۔

"اگر ایسا ہی ہے، بریڈمین۔ تو میرے خیال میں ہم کو اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے۔ اور اپنی تیاریاں کر لینی چاہئیں۔ ان بدنصیبوں کو عرشہ مل سکیگا۔ کیونکہ ایک اور دو کا مقابلہ ہے۔ لیکن جٹ لینڈ (اسکیجر ریک) کی لڑائی میں ان کی جو کیفیت میں دیکھ چکا ہوں، اس سے وعدہ کرتا ہوں کہ لڑائی بہت مزیدار ہوگی"۔

ہاں، وہاں اُنہوں نے آپ کو مزا چکھا دیا تھا" بریڈمین نے شرارت سے آنکھ مار کر کہا۔

"ممکن ہے۔ لیکن یہ بھی تو خیال کیجئے کہ اتفاقات کے اوپر منحصر کر دینا بہت دشوار ہوتا ہے۔ جبکہ ہماری طرف یہ حالت ہو کہ بیڑے کو شکست ہونا جنگ میں شکست ہو جانے کے برابر ہے۔ دراصل لیکہ دشمن ایسی بازی ہی نہیں لگاتا۔ ہمیں جٹ لینڈ میں اسی مصیبت کا سامنا تھا۔ ہم شبانہ جنگ کے خطرہ میں اندھا دھند نہیں کود سکتے تھے۔ لیکن اب تو ہمارا ہاتھ کھلا ہوا ہے اور برطانی بیڑے کا ہر شخص فیصلہ کن لڑائی چاہتا ہے"۔

"میں بھی اپنے دستہ کی طرف سے یہی اعلان کرتا ہوں"۔ امیر البحر بریڈمین نے کہا۔

اور دونوں جہازران نقشہ کے اوپر جھک گئے۔

(۸)

اس خطرناک مہم اور عظیم الشان قربانی کا دن آپہنچا۔ جرمن

بیڑہ خلیج ہیلیگولینڈ میں جمع تھا۔ اور نمود سحر سے تھوڑی ہی دیر بعد اپنے آخری خوفناک سفر پر روانہ ہوگیا۔ اس کی غوطہ خور کشتیوں نے دو دن کے عرصہ میں راستہ بالکل صاف کردیا تھا۔ اس عالی شان صف بندی کے آگے آگے ہلکے کروزروں کے دو دستے تھے، جو بیڑے کے پردے کا کام دے رہے تھے۔ ان کے پیچھے وہ سری قطار میں جنگی کروزر تھے ——— ڈرفلنجر، سیڈلٹز، مالٹکے اور فان ڈرٹان ——— وہی پرانا دستہ، جس نے ابتک اسقدر سختیاں برداشت کی تھیں، اور ہر برطانی جہازراں کے دل میں اپنا احترام پیدا کرچکا تھا۔ فان ہپرٹ اس کا کمانڈر تھا۔ ان کی طاقت دیو قامت ہنڈن برگ کے اضافہ سے اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ کا جہاز میکنسن ابھی تک ناکارہ تھا۔ کروزروں کے پیچھے جنگی جہازوں کی عظیم الشان قطار تھی جن میں آگے آگے وہ طاقتور دستہ تھا، جو حال ہی میں بنکر تیار ہوا تھا ——— بے ڈن، جس پر فان اسپیر کا جھنڈا لہرار ہا تھا۔ اور اپنے شہنشاہ کو اپنی پشت پر لئے ہوئے تھا، اور میکن ن، اور دو اور۔ یہ تمام بڑے جہاز پندرہ انچ والی آٹھ آٹھ توپیں لئے ہوئے تھے اور بائیس بحری میل فی گھنٹہ کی رفتار تھی۔ ان کے پیچھے چار کانیگ قسم کے جہاز تھے ——— کانیگ۔ گرس ورکر فرسٹ۔ کران پرنز، اور مارک گراف ——— جن پر بارہ انچ والی دس دس توپیں تھیں پھر چار قیصر قسم کے جہاز تھے جو کانیگ قسم کے جہازوں کی طرح طاقتور، لیکن اُن سے زیادہ تیز رفتار تھے۔ ان کے پیچھے دیگر جہازوں کی بڑی قطار سمندر کے اُفق پر حد نظر تک پھیلی ہوئی نظر آتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ صف بصف چلے آرہے ہیں ——— فریڈرک ڈر گروز، اوسٹ فریز لینڈ تھورنجن، ہیلیگولینڈ، اولڈن برگ، پوزن، اور کئی اور ——— بہت پرانے جہاز بھی مثلاً ڈوئش لینڈ، اور شلسوگ ہالسٹین، جن پر چار چار بھاری توپیں چڑھی تھیں لیکن سولہ بحری میل فی گھنٹہ کی رفتار سے زیادہ نہیں چل سکتے تھے۔ سب کے پیچھے پیچھے تھے۔ اور اپنے ہمراہیوں کی قسمت میں شریک ہونے کے لئے ہانپتے کانپتے گھسٹے چلتے تھے۔ جلدی کی کوئی ضرورت نہ تھی، لہٰذا تمام بیڑہ خراماں خراماں آرہا تھا، درآنحالیکہ دونوں بازوؤں پر تباہ کن کشتیاں دشمن کے حملہ کی حفاظت کے لئے چکر لگا رہی تھیں۔ ان میں انہیں صرف جزئی کامیابی حاصل ہوسکی، کیونکہ پوزن پر ایک انگریزی غوطہ خور کشتی نے حملہ کیا۔ اور اُسے ڈوبتی ہوئی حالت میں بندرگاہ کو واپس چلا جانا پڑا۔ وہ غوطہ خور کشتی (م ۱۶) بھی سمندری توپوں کی گولہ باری سے بالکل تباہ ہوگئی۔

اتحادی بیڑہ کو اپنی موجودہ ملاقات کے لئے صبح سے بہت پیشتر روانہ ہونا پڑا۔ اگر جرمن صف بندی کو خوفناک کہا جاسکتا ہے تو اس کو صرف ہیبت ناک کے لفظ سے متصف کیا جاسکے گا۔ ہلکے کروزروں اور تباہ کن کشتیوں کے بیشمار ہجوم کے علاوہ بیڑے کے ہراول کا رہنما لائن جہاز تھا جس کی پلیٹوں پر گذشتہ لڑائیوں کے نشانات ابھی تک موجود تھے۔ اس کے پیچھے ٹائیگر تھا جس پر ریئر ایڈمرل مالمن کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ پھر آسٹریلیا اور پرنسس رائل تھے۔ ان سے بھی زیادہ خوفناک دو نئے جہاز تھے، جو اپنی مخصوص صفات کی بنا پر علیحدہ علیحدہ کام کرسکتے تھے۔ یہ رینا ؤن اور ریپلس تھے، جن پر پندرہ انچ والی توپیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اور ۳۲ بحری میل کی حیرت انگیز رفتار کے مالک تھے۔ کروزروں کے پیچھے امیرالبحر ٹامس کی کمان میں ہلکے جہازوں کا دستہ تھا۔ جس نے جٹ لینڈ کی لڑائی میں کارہائے نمایاں کئے تھے۔ اور تھوڑی دیر تک جرمن بیڑے کے ایک بڑے حصہ کی مسلسل گولہ باری کی زد میں رہا تھا۔ اس میں وہی پرانے جہاز ———

ملایا، ویلینٹ، وار اسپائٹ، اور برحام ـــــ تھے البتہ کوئین الزبیتھ کا اضافہ ہوگیا تھا، اور پندرہ انچ والی توپیں رکھتے تھے۔ ان کے پیچھے دوہری قطاریں برطانی محکمۂ بحری کا نیابیہ نازدستہ تھا ـــــ ریمیلیز، ریزولیوشن، رایل سَوَرِین، اور رایل اوک، ـــــ جس کی رفتار تئیس بحری میل تھی۔ اور ہر ایک جہاز پر پندرہ انچ والی آٹھ آٹھ توپیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ان کے پیچھے چھ جہازوں کا وہ عالی شان امریکن دستہ تھا جن کے نام پیشتر تحریر کئے جاچکے ہیں۔ ان پر چودہ انچ والی توپیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اور رفتار اکیس بحری میل فی گھنٹہ تھی۔ ان کے دودو کشتوں سے دھوئیں کے تاریک بادل نکل نکل کر یہ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ کوئلے کی مدد سے چلنے والے جہاز ہیں۔ اس طرح علیحدہ علیحدہ دستوں کی صورت میں یہ عظیم الشان بیڑہ سمندر میں روانہ ہوا۔ اور سب سے پیچھے ایروپلین لیجانے والا وہ عجیب الخلقت دیوہیکل جہاز فیوریس تھا جو ایک بہت بڑی کشتی نوح کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ ہر بازو پر محافظت کے لئے بہت دور دور تک بھاری کروزر انفلیکسیبل، نیوزیلینڈ، انڈامیٹیبل وغیرہ تھے درآنحالیکہ ہلکے کروزروں اور تباہ کن کشتیوں کے غول چاروں طرف اُفق کی حد تک پھیلے ہوئے نظر آتے تھے۔ خلیج سے نکل کر بڑے بڑے جہاز چھ قطاروں میں کر دیئے گئے، اور یہ تمام پرعظمت جلوس اٹھارہ بحری میل فی گھنٹہ کی رفتار سے مشرق کی طرف بڑھا ۔

سہ پہر کو دو بجکر تیس منٹ پر دو برطانی ہوائی جہازوں نے ایک جرمن زیپلن کو عرض البلد ۵۶ درجہ ۵ ۵ اور طول البلد ۴ درجہ ۱ مشرقی پر دیکھا اور اس پر ناکامیاب حملہ کیا۔ اس کا تعاقب کرنے پر انہوں نے اسکاوٹ (مخبر) کشتیوں کے گھنے ہراول کو دیکھا، جو جرمن بیڑے کے آگے آگے تھا۔ یہ خبر اتحادی بیڑے کے ہر جہاز میں لاسلکی کے ذریعہ سے پہنچا دی گئی۔ اور ان کو یقین ہوگیا کہ جرمنوں کی مبارزطلبی خالی خولی لن ترانی پر مبنی نہ تھی، بلکہ حقیقتاً وہ دن آپہنچا تھا جب ایک فیصلکن لڑائی اس طویل قضیہ کا خاتمہ کردیگی۔ ہر جہاز پر لڑائی کے جھنڈے بلند کردیے گئے، اور بیٹی نے کم رفتار جہازوں کے پیچھے رہجانے کے خوف کے باوجود بیڑے کی رفتار بیس بحری میل فی گھنٹہ کردی۔ تیز جنگی کروزر بیڑے سے علیحدہ کر کے پوری رفتار کے ساتھ آگے روانہ کردیئے گئے۔ تاکہ اصل بیڑے کے پہنچنے تک دشمن کو روکے رکھیں۔ دن نہایت خوشگوار تھا، لیکن جنوب و مشرق کی سمت سے ایک تیز ہوا فضا میں تموج پیدا کر رہی تھی۔ کروزر انتیس بحری میل فی گھنٹہ کی رفتار سے متلاطم موجوں کے درمیان گونج گرجاتے چیرتے پھاڑتے چلے جارہے تھے، ان کا اگلا حصہ تقریباً پانی کے اندر تھا اور سمندر کی چھینٹیں اُڑ اُڑ کر اُن کے دودکشوں تک پہنچ رہی تھیں دو بجکر چالیس منٹ پر یہ خبر آئی کہ ایک جرمن غوطہ خور کشتی نے ہلکے کروزر فیلکس کو غرق کردیا۔ چند منٹ بعد ہی انجام انکانس منٹ پھر معلوم ہوا کہ زیپلن کو اسکاوٹ جہاز ارتھوسا کی ہوائی توپوں نے تباہ و برباد کردیا ۔

تین بجنے کے تھوڑی دیر بعد ملاحوں کو قہوہ کے ساتھ ہلکی غذا دی گئی اور لڑائی کے بگل بجا دیئے گئے۔ اس وقت اسکاوٹ (مخبر) کشتیوں سے خبریں بڑی کے ساتھ موصول ہو رہی تھیں اور گولہ باری کی آوازیں جنوب و مشرقی سمت سے متواتر آرہی تھیں ہوائی جہاز ۳-۲۰ فیوریس جہاز سے اُڑا۔ اور جرمن بیڑے کے کل طول و عرض کا چکر لگا آیا۔ حالانکہ اس جاسوسی میں اس کا ایک بازو ٹوٹ گیا، تاہم جرمنوں کی پوری قوت کا اندازہ اس نے لاسلکی کے ذریعہ امیر البحر تک پہنچا دیا، جو مخبری کی مصائب اور مشکلات کو مدنظر رکھتے ہوئے حیرت انگیز طور پر درست ثابت ہوا۔ اس پیش بہا خدمت کی وجہ سے محکمۂ پرواز کے لفٹننٹ آدلپور کا مراسلات میں بہت خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا تھا ۔

دونوں عظیم الشان بیڑے اب بڑی سرعت کے ساتھ ایک دوسرے سے قریب تر ہو رہے تھے، اور برطانی ہلکے کروزروں کا

جو تھا دست بہ دست۔ جرمن اسکاؤٹ جہازوں کے نویں دستے سے دست و گریبان تھا۔ یہاں تک کہ جب اصلی برطانی بیڑہ گرجتا ہوا منظر جنگ پر نمودار ہوا ہے تو تمام افق ان چھوٹے چھوٹے جہازوں سے معمور نظر آتا تھا جن کا اکثر حصہ سمندر میں چاروں طرف گرنے والے گولوں کے دھوئیں میں چھپ کر نگاہوں سے پوشیدہ ہو جاتا تھا۔ چار بجے برطانی بھاری کروزروں کے دستے کا نشان بردار جہاز جرمن جنگی کروزروں کے سردار ڈرفلینجر سے دست و گریبان ہو گیا۔ گویا لڑائی اب خاصی اچھی طرح شروع ہو چکی تھی ✦

(۹)

اور یہاں میں ٹھہر جاتا ہوں۔ کیا میرے پرواز تخیل کا انجام یہ ہونا تھا کہ میں اس جنگ عظیم کو، اس بحری مہابھارت کو بیان کروں؟ اس کے برعکس کیا میرے رویا کا مقصد یہ نہ تھا کہ اس مایوس اور غمزدہ انسان کے مختلف انجاموں کا نقشہ کھینچوں جو ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جس کا ایک راستہ بے عزتی کی زندگی کی طرف رہبری کرتا ہے۔ اور دوسرے کی منزل شجاعانہ موت پر جا کر ختم ہوتی ہے؟ تاہم اس کا المناک انجام اس کہیں زیادہ پرعظمت راستے کے اس قدر الجھا ہوا ہے کہ میرا خواب دوسرے کی مدد کے بغیر پہلے سے بمشکل عہدہ برآ ہو سکا۔ لہذا اب میں سوائے ان تفصیلات کے جو تصویر کو حقیقت کا رنگ دینے کے لئے ضروری ہیں۔ باقی کو نظر انداز کر کے، وہ واقعات لکھتا ہوں جو میری تخیل کی آنکھ نے دیکھے ہیں ✦

چونکہ فریقین محاربانہ داؤ پیچ کے بجائے حقیقتاً لڑنے کے متمنی تھے۔ لہذا ہلکے کروزروں کے دستے دشمن کی خبر دینے کے فرائض سے سبکدوش ہو کر ایک دوسرے پر انتہائی شدت کے ساتھ حملہ آور ہو گئے۔ اور پانچ ہزار سے لے کر سات ہزار گز کے دائرہ میں پر جوش محاربات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ چھوٹے چھوٹے جہاز اپنی باہمی لڑائی میں اس قدر منہمک تھے۔ کہ وہ ان بڑے جہازوں کی طرف، جو ان کی کشمکش کے درمیان سے گزرتے تھے اور اپنی ایک ہی ضرب سے کسی ایک کو غرق کر سکتے تھے مطلق دھیان بھی نہ دیتے تھے۔ بحری لڑائی کا پرانا قانون جس کی رو سے بڑے جہاز چھوٹے جہازوں پر گولہ باری نہ کر سکتے تھے ابھی تک برسرعمل تھا اور اسکاؤٹ جہاز اپنے قضیات خود ہی طے کرنے کے لئے چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ لڑائی کے شروع میں جرمنوں کا پلہ بھاری رہا۔ کیونکہ ان کا توپخانہ کامل اور بے عیب تھا۔ اور ان کی تباہ کن کشتیاں بیباکی کے ساتھ لڑائی میں گھس جاتی تھیں۔ برطانیہ کے جہاز ڈیرنگ، ڈریاڈ، کیلیوپ، ڈونیگل اور لنکاسٹر سب کے سب گولہ باری یا تارپیڈو سے ڈوب گئے، اور آنحالیکہ کارنوعا ڈوبتی ہوئی حالت میں بیڑے سے باہر کر دیا گیا۔ دوسری طرف اشٹیٹن اور برلن جنگ کے شروع ہی میں ڈوب گئے تھے اور پلاؤ بیکار ہو چکا تھا۔ وقت گذرتا رہا اور برطانیہ کے تازہ دم ہلکے جہاز اور تباہ کن کشتیاں لڑائی میں آ کر شامل ہوتے رہے۔ یہانتک کہ تعداد کا اور توپوں کا پلہ بھاری جرمنوں کی قوت برداشت سے متجاوز ہو گیا۔ ان کے جہاز اسٹٹگارٹ، موبیحی، اور فریڈرک فرڈٹ گولہ باری سے ڈوب گئے۔ اور برطانیہ کو صرف کارنوعا ان کا نقصان اٹھانا پڑا۔ جسے آخر کار سبجلس برگ نے تارپیڈو سے غرق کر دیا۔ لڑائی گھمسان اور خونریز ہو رہی تھی۔ لیکن اس دن کا مقصد اصلی کچھ اور تھا۔ تباہ کن کشتیوں کے دستے دونوں طرف سے سیدھے دشمن کے بڑے بڑے جہازوں پر حملہ کے لئے بڑھتے اور درمیان میں باہم مقابل ہو کر ہر ایک یہ کوشش کرتا کہ دوسرے کو اس کی منزل تک نہ پہنچنے دے۔ لڑنے والے کتوں کی طرح، جھاگ اور چھینٹوں میں آدھے چھپے ہوئے، وہ سمندر کو چیرتے چلے جاتے، ان کے کنارے ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے اور ان کی توپوں کے شعلے مخالف جہاز کے رنگ و روغن کو اڑا دیتے

تباہ شدہ جہازوں کے جلتے ہوئے تختے ہر طرف تیرتے نظر
آتے تھے۔ کیونکہ تیل کے ذخائر ہر مضروب جہاز کو اس کے ملاحوں
کو چتا کی شکل میں تبدیل کر دیتے تھے۔۔۔۔ما ز فریقین کے لئے
جو بحری قزاقوں کی نسل سے تھے، یہی کفن دفن سب سے زیادہ
مناسب تھا۔ بعض تباہ کن کشتیاں، جرمن یا برطانی جہازوں کے
ہجوم میں سے اپنا راستہ اُبھر کر نکال لیتی تھیں، اور کسی بڑے
جہاز پر حملہ کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھیں، جس کا معاوضہ
کی کامل تباہی کی صورت میں انہیں مل جاتا تھا۔ انگریزی جہاز
مارشل برجیو جٹ لینڈ کی طرح دوبارہ حملہ کیا گیا۔۔۔ اس مرتبہ
وہ اپنے تمام ملاحوں کے ساتھ سمندر کی تہ میں چلا گیا۔ آئیرن ڈیوک کو
بھی سخت نقصان پہنچا۔ اور بیکار ہو کر جنگ سے باہر ہو گیا۔ نیو
یارک اور سابینا آؤن پر بھی حملہ کیا گیا۔ لیکن انہیں اپنے پشتوں
کی مضبوطی کی وجہ سے زیادہ نقصان نہیں پہنچا، اور ان کے معمولی
سامانِ جنگ نے چھوٹے سے بہادر حملہ آور کو لیپا کر دیا +

جرمن بیڑے کو انگریزی بیڑے سے بھی زیادہ نقصان
اٹھانا پڑا۔ کپتان فان ہیز کے جہاز ڈر فلنجر کے پیٹ میں
ایک بہت بڑا سوراخ ہو گیا۔ اور وہ ڈوب گیا۔ قیصرین اور گروو
سر کرفرسٹ بھی ڈوب گئے اور اولڈنبرگ ناکارہ ہو گیا۔
ایک امریکن دستے نے جو کپتان ہکنس کے ماتحت تھا، اس کام
میں امتیاز حاصل کیا۔ دونوں طرف مقتولین و مجروحین کی کوئی خبر
نہ لی جاتی تھی۔ انہیں خود ہی اپنی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی کیونکہ لڑائی
کا خونریز منظر دوسروں کو اپنے اپنے کام کی طرف متوجہ کئے ہوئے تھا +

بیٹی نے اپنے خاص بیڑہ کو دونوں بازوؤں کی طرف اس
امید میں پھیلا دیا تھا کہ ہر جرمن جہاز کے ہر ایک طرف ایک انگریزی
جہاز ہو جائے۔ لیکن فان اسپیر نے اس خطرہ کے انسداد کے لئے
فی الفور اپنی صف بندی توڑ کر جہازوں کو دوہری قطار میں کر لیا
اب گولہ باری کی برابر کی لڑائی تھی، جو سترہ ہزار گز کے فاصلہ سے
شروع ہو کر اس وقت بند ہوئی جب دیووں کے دونوں لشکروں کے
درمیان صرف بارہ ہزار گز کا فاصلہ رہ گیا۔ دونوں بیڑے ایک دوسرے
کے متوازی بڑھ رہے تھے۔ اور کسی ماہرانہ نقل و حرکت کی ضرورت
سوائے اس وقت کے نہ تھی، جب کسی جہاز کو دشمن کے گولوں کا نشانہ
خطا کرنے کی وجہ سے ادھر اُدھر بچنا پڑتا تھا۔ جرمن گولہ انداز اپنے
کام میں زیادہ ماہر اور نشانہ لگانے میں زیادہ چست و چالاک تھے۔
لیکن اس کے مقابلہ میں برطانی توپیں زیادہ بھاری اور زیادہ
ضرر رساں تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ کثرت تعداد کا پلہ بھاری رہا۔ جرمن
بیڑے کے جہاز یکے بعد دیگرے شعلوں اور دھوئیں کی نذر ہو رہے
تھے۔ برطانیہ نے جٹ لینڈ کی لڑائی سے سبق حاصل کر لیا تھا۔
اور حالانکہ جرمنوں کی سی پندرہ انچ والی توپوں کے بھاری گولے
توپخانہ کے برجوں کی چھتوں پر متواتر آ آ کر لگ رہے تھے۔ اور
گولہ اندازوں کا قتل عام کر کے توپخانہ کو بیکار کر جاتے تھے۔ تاہم
ان کے مہلک شعلوں کے لئے کوئی راستہ باقی نہ رہا تھا، جو بارود
خانہ تک پہنچ کر جہاز کو اڑا دیتے تھے۔ عرشہ کی حفاظت [illegible]
ابھی تک دونوں طرف بہت کمزور تھی۔ اور ان جہازوں کی تباہی
کی سب سے بڑی وجہ وہ متواتر گولہ باری تھی، جو جہاز کی تہ تک
توڑ کر رکھ دیتی تھی۔ یہی انجام بہت سے جرمن جہازوں کا ہوا۔۔۔
یہی انجام ٹائیگر، فلیکس ایبل، وایس بیڈن، سیپلیس اور کالنگ
وڈ کا ہوا، جو پیشتر کوئین میری کا ہو چکا تھا +

ایک بھوری شکل، بھورے لباس میں ملبوس، گھٹنوں تک
نشان بردار جہاز کے قریب کھڑی تھی۔ یہ قیصر تھا۔ ایک بہت بڑی طاقت
کی دوربین اس کے ہاتھ میں تھی جس کی مدد سے وہ تمام خوفناک
منظر کا نظارہ کر رہا تھا۔ ساعت بہ ساعت وہ دیکھتا رہا۔ اور محسوس
کرتا رہا کہ کس قدر مہیب بلا زمین پر نازل ہوئی ہے۔ ایک ہی نسل
اور ایک ہی معاشرت کے لوگ، ایک ہی شمالی فرقہ کی اولاد کے
لوگ، اس ہیبت ناک کشمکش میں مبتلا ہیں، جس کا خاتمہ صرف موت

پر ہو سکتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت قیصر کے خیالات کیا تھے؟

اچانک اس کو اپنے باپ کا خیال آیا، اس بارعب شفیق سنہری داڑھی والے دیو قامت انسان کا، پھر اُس انگریزی خاتون کا، جو اُس کی ماں تھی۔ ہاں! خود اس کی رگوں میں آدھا خون اسی قوم کا دوڑ رہا تھا، جو سامنے والے بھورے رنگ کے جہازوں سے اس کے خلاف برسر پیکار تھی۔ آخر کن غیر معمولی وجوہات کی بنا پر، کن منحوس واقعات کے سبب سے، یہ بات ہوئی تھی کہ وہ اس وقت ان کے خلاف خونریز جنگ و جدل میں مبتلا تھا؟ آخر اس کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جب جرمن صنعت و حرفت پیشتر ہی سے اپنی بہترین مساعی کی بدولت دنیا کو فتح کر رہی تھی، اور ما بعد نو آبادیات سے کرۂ ارض کو محصور کئے ہوئے تھی؟ ماضی کے واقعات پر نگاہ دوڑانا اب فضول اور لغو تھا۔ اس قدر عرصہ پیشتر، جس کو کئی سال گزر گئے، ایک غلط راستہ اختیار کیا گیا تھا، اور یہ ہے وہ منزل، جس کی طرف اُس نے رہنمائی کی۔ یہ دیوتاؤں کے شفق کی رنگینی تھی، جو نسلِ انسانی کی تاریخ میں سب سے زیادہ خوفناک شے ہے۔ لوگ اسے ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ تاہم وہ جانتا تھا کہ قسمت کے ہاتھوں میں اُس کی حیثیت ایک کھلونے سے زیادہ نہ تھی۔ جو ازل سے مقرر کردہ اصول کے تحت لامحالہ اسی دہشت خیز راستہ پر آگے بڑھ رہا تھا لیکن پھر کون ذمہ دار تھا؟ —— اس کی ذمہ داری کسی نہ کسی کے سر ہونی لازمی تھی۔ کیا وہ ہاتھ ذمہ دار تھا، جس نے سرویہ کے خلاف احمقانہ اعلانِ جنگ کا مسودہ تیار کیا تھا؟ یا زار روس اور اُس کی قبل از وقت فوجی نقل و حرکت؟ یا فان ٹرپز، اور اُس کی عظیم الشان بحری تجاویز، جو آج اپنا المناک انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہیں؟ یا فان تھلیفن اور اُس کی بلجیم کی حدود میں سے دھاوا کیے جانے کی تجویز جس کی وجہ سے انگلستان کا شریک جنگ ہونا لازمی تھا؟ یا اس کا ماموں ایڈورڈ ہفتم، جو اس کی طرف سے صد درجہ بدگمان رہا؟ یا اس کے صدر السلطنت کا فعل، جب ۱۹۰۲ء میں اس نے نہایت حقارت کے ساتھ انگلستان کی باہمی تجویز کو مسترد کر دیا تھا؟ اس کے ماؤف دماغ میں یہ تمام واقعات اس روح فرسا انجام کے ساتھ کچھ نہ کچھ تعلق رکھتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس کے قدموں پر ایک مجروح نعش پڑی ہوئی تھی، جس کے خون نے اس کے لانبے جوتوں کو گلنار بنا دیا تھا، اس کے بھورے لبادے کے دامن پر اپنی اطاعت شعاری کے داغ ثبت کر دیئے تھے۔ یہ اس کا وفادار ایڈی کانگ سیگورڈ فان مان تھا، جو اپنے قول کے مطابق موت کے لمحہ تک صادق اور سچا ثابت ہوا۔ اور یہ کچلی ہوئی ٹکڑے ٹکڑے لاش بے وقت موت، جب شباب اپنی پوری اُمنگوں کے ساتھ اپنے زرّیں عہد میں سے گزرتا ہوتا ہے، ایک نمونہ تھی اُن ایک کروڑ دوسری لاشوں کا، جن کے لئے تمام دنیا اسے ذمہ دار ٹھہرا رہی تھی۔ اُس کی قوتِ متخیلہ اُس کی نگاہوں کو ایسے ہی زہرہ گداز مناظر پیش کر رہی تھی، اور وہ کانپ کانپ کر لرز لرز کر رہ جاتا تھا۔ اس وقت فان اسپیر کی آمد نے اس کے خیالات کے سلسلہ کو منقطع کر دیا۔ امیر البحر کا شانہ ایک کرچ لگنے کی وجہ سے زخمی ہو گیا تھا، اور اس کا چہرہ سفید اور اُترا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"کیا کیفیت ہے اب امیر البحر؟" شہنشاہ نے سوال کیا۔

"بیڑے میں سے ہم نو جنگی جہاز اور چار بڑے کروزر ضائع کر چکے ہیں۔ ھنڈنبرگ ابھی ڈوبا ہے۔ خود ہمارے جہاز کے توپوں والے دو برج گولہ باری سے اُڑ چکے ہیں، اور ایک اگلے برج کی چھت غائب ہو گئی ہے۔ یعنی ہماری صرف دو توپیں اپنا کام کر رہی ہیں۔ ہم، جیسا کہ عالی جاہ ملاحظہ فرما سکتے ہیں، دونوں سے آگ میں گھرے ہوتے ہیں، اور دو دکش کا بھی صرف ایک حصہ باقی رہ گیا ہے۔ انجن میں پانی بھر چکا ہے، اور آگ جلانے والے

ڈوب رہے ہیں ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے"۔

"اور انگریز؟ میں نے اُن کے بھی بہت سے جہاز ڈوبتے دیکھے ہیں"۔

"اس وقت لڑائی کا محاذ پندرہ میل تک پھیلا ہوا ہے بہت سی ہوائیاں بھی چھوڑی گئی ہیں۔ لیکن اغلب یہ ہے کہ اُن کے بھی اسیقدر جہاز ڈوب چکے ہیں جتنے ہمارے"۔

"اور اب کیا؟"

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے"

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ہم آخر دم تک لڑتے جائینگے"۔

اس وقت ایک ادنیٰ افسر ایک پیغام لئے ہوئے دوڑتا ہوا آیا۔

"تاروں کا سلسلہ ٹوٹ گیا ہے، جناب والا!" اس نے سلام کے بعد بلند آواز سے کہا۔ "لہذا مجھ سے کہا گیا کہ میں خود اس کو آپ تک پہنچادوں"۔

امیرالبحر نے لفافہ پھاڑ کر خط نکالا اور کہنے لگا۔

"بیٹی کی طرف سے ایک لاسلکی پیغام ہے۔ لکھا ہوا ہے:

"آپ کی غیرت اور عزت کو اب اطمینان کلی حاصل ہو چکا ہوگا۔ بلاشبہ کوئی شخص اس سے زیادہ نہیں کر سکتا۔ اب یہ فضول قتل عام کس واسطے ہے! آپ کے پاس صرف پانچ جہاز ایسے باقی ہیں جو لڑ سکتے ہیں۔ میں دور سے ہی آپ کو محصور کر سکتا ہوں۔ اور اس طرح آپ کو اتنے فاصلہ سے ڈبو سکتا ہوں، جہاں تک آپ نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن میں بہادر آدمیوں کو اس طرح مارنے سے نفرت کرتا ہوں۔ اپنی باعزت اور یقینی شکست کا اعتراف کر لیجئے اور اپنا جھنڈا گرادیجئے"۔

"ہرگز نہیں!" شہنشاہ نے کہا۔

"ہرگز نہیں!" امیرالبحر نے دُہرایا۔

لیکن اسی وقت وہ حادثہ وقوع پذیر ہوا جس نے معاملہ کا تصفیہ کردیا۔ بعض کا قول ہے کہ یہ ایک ساتھ کی گولہ باری ڈریڈ ویر نے کی، اور بعض کہتے ہیں کہ لاکن نے۔ بہرحال آٹھ میں سے چار گولے سیدھے بے ترتیبی کے عرشہ پر آکر گرے اور بارودخانہ تک پہنچ گئے۔ ایک دھماکے کے ساتھ قوی ہیکل جہاز پُرزے پُرزے ہوگیا۔ اس صدمہ کے وقت اس بات سے آگاہ ہوکر کہ مستقبل کے چند لمحات کیا انجام لانے والے ہیں، شہنشاہ اور امیرالبحر نے پُرنم آنکھوں کے ساتھ ہاتھ ملائے۔ بہت سے زندہ بچے ہوئے لوگوں نے اس آخری سلام کو دیکھنے کی شہادت دی ہے۔ یہ جرمنی کے شاہی خاندان اور جرمنی کے محکمۂ بحری کی آخری ملاقات تھی۔ عین اُسیوقت جنوبی اُفق کا دامن بہت سے بسرعت آنے والے جہازوں کے دھوئیں سے چاک ہوگیا۔ چھوٹے جہازوں کا ساسا رج دستہ تازہ دم اور کربستہ چلا آرہا تھا۔ یہ جنگ کا اختتام تھا۔

(۱۰)

اس رات کو جب سورج ڈوب چکا تھا اور صرف ایک سُرخ روشنی مغرب میں چھوڑ گیا۔ برطانی امیرالبحر اپنے جہاز پر کھڑا ہوا ہولناک جنگ کے منظر پر متفکرانہ لیکن حسرت بھری نظر پر ڈال رہا تھا۔ ہر طرف تباہ شدہ جہازوں کے ٹکڑے آگ کے شعلوں کی نذر ہوتے نظر آتے تھے۔ اور لوگ بکھرے ہوئے تختوں پر یا امدادی کشتیوں پر تیر رہے تھے۔ تیز رفتار تار پیڈو کشتیاں اِدھر سے اُدھر لوگوں کی جانیں بچانے کا فرض انجام دیتی پھر رہی تھیں امیرالبحر بیٹی خستہ و ماندہ اپنے جہاز کے عرشہ پر کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ ردِّعمل کے انعکاس کی تمام تاریکیوں کا مرقع معلوم ہو رہا تھا۔

"کیا میں یہ تجویز پیش کر سکتا ہوں، جناب والا!" اس کی

دانہنی طرف سے ایک بڑے افسر نے کہا "کہ ہم اس بیڑے کو ہمدردی اور احترام کا پیغام ارسال کردیں؟"

"اس بیڑے میں سے جو کچھ باقی رہ گیا ہے، اس کو" بیتین نے غمزدہ انداز میں مسکرا کر کہا "میں سنتا ہوں کہ ان کا شہنشاہ بھی ان کے نشان بردار جہاز کے ساتھ غرق ہوگیا۔ مرڈوک، میرا منشا یہ ہوگا کہ ہم اپنے جھنڈے ایک بہادر آدمی کے اعزاز میں بلند کریں"

(۱۱)

یہ تھا میرا خواب تہذیبی انتخاب کے متعلق۔ تاہم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ قسمت اس سے زیادہ عقلمند ثابت ہو اور سطح زمین کا راستہ بہ نسبت پہاڑ کی چوٹیوں کے راستہ کے زیادہ بہتر نکلے +

(ماخوذ بہ معذرت)

انیس الدین احمد رضوی
ایم۔ اے (علیگ)

بھول جا

بھول جا! اُس دن کو جس دن اُس نے اپنی نیم باز آنکھوں سے تجھے دیکھا اور تجھ پر بجلیوں کی بارشیں کیں اور تیرے دل میں ایک نہ مٹنے والی خلش پیدا کرکے روپوش ہوگئی +

جب اُس نے اپنی سحر آگیں اور سامعہ نواز موسیقیوں سے ترنم ریزیاں کرکے تیرے دل کے تاریک گوشوں کی ساکن فضاؤں میں ایک ہلکا گرد آمیز ارتعاش پیدا کیا تھا۔ اُس وقت کو اور اُس گھڑی کو جب محبت کی تباہ کن ابتدائی چنگاریاں ایک غیر محسوس طریق پر تیرے صبر و شکیب اور آرام و سکون کے خرمنوں میں پھینکی گئی تھیں۔ بھول جا۔ کیونکہ اُس کی بے نیازیاں تیری نیازمندیوں سے بے نیاز ہیں +

آہ! وہ لمحہ جو بظاہر تیری موت مگر حقیقتاً تیری حیات کی ابتدا تھا۔ اور وہ ساعت جبکہ تیری نگاہ شوق بے تابانہ اُسکی سانولی صورت کی طرف دوڑتی تھی۔ ان سب کو بھول جا۔ اور اُس کی آستاں بوسیوں کا خیال چھوڑ دے۔ کیونکہ اُس کا [illegible] تیرے شوق کی ناصیہ فرسائیوں سے بے نیاز اور بلند و بالا ہے +

بھول جا! ہاں، ہاں، بالکل بھول جا! آغازِ اُلفت کے اُن خوشگوار واقعات کو جن کی خیالی تصاویر یکے بعد دیگرے تیرے سامنے سے گزر رہی ہیں +

تیری بے چینیوں اور بے قراریوں کا جواب اب اُس کا تغافل اور بے پروائیاں ہیں +

"سلطان محمد"
[illegible]

(از مولانا مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی)

خدا اس "اُونہہ" سے بچائے جس کی زبان پر آیا اُس کو تباہ کیا جس گھر میں گھسا اُس کا ستیاناس کیا۔ جس ملک میں پہنچا اُس میں گدھے کے ہل چلوا دیئے۔ ثبوت درکار ہو تو دنیا کی تاریخ اٹھا دیکھ لو کہ اس "اونہہ" نے زمانے کے کیا کیا رنگ بدلے ہیں۔ جنرل گروشی کو نپولین حکم دیتا ہے کہ انگریزوں کی فوج کے پیچھے ابھی پہنچ جاؤ۔ اور پہنچنے سے پہلے پشت پر دباؤ ڈالو میں سامنے سے حملہ کرتا ہوں۔ بلیوشر کے آنے سے پہلے اس فوج کو رگڑ ڈالیں گے جنرل گروشی "اونہہ" کر دیتا ہے۔ صبح نو بجے ناشتہ سے فارغ ہو کر روانہ ہوتا ہے۔ واٹرلو کی لڑائی نہ صرف یورپ بلکہ ساری دنیا کا نقشہ بدل دیتی ہے +

ہندوستان میں بھی اس "اونہہ" کا کچھ کم زور نہیں رہا ہے۔ نادر شاہ چڑھا چلا آ رہا ہے۔ محمد شاہ بادشاہ رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ پرچہ لگتا ہے کہ نادر لاہور تک آ گیا۔ بادشاہ سلامت "اونہہ" کر دیتے ہیں۔ جس کا فارسی ترجمہ تاریخوں میں "این دفتر بے معنی غرق مے ناب اولیٰ" کیا گیا ہے۔ لیجئے ان کی ایک "اونہہ" سے دلی لٹ جاتی ہے۔ خزانہ خالی ہو جاتا ہے تخت طاؤس اڑ جاتا ہے۔ مرہٹے بڑھتے آ رہے ہیں۔ دہلی پر قبضہ کر کے کنج پورہ لوٹ لیتے ہیں۔ احمد شاہ ابدالی کو خبر ہوتی ہے۔ وہ بدلہ لینے چلتا ہے۔ ہلکر اور سیندھیا دونوں ملکر بھاؤ کو سمجھاتے ہیں کہ توپخانہ یہیں چھوڑ دو۔ ہلکے پھلکے ہو کر مقابلہ کرو۔ آمنے سامنے کی لڑائی ابدالی سے مشکل ہے۔ بھاؤ "اونہہ" کر دیتا ہے۔ اس "اونہہ" کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سلطنت ہند کا جو خیال مرہٹوں کو تھا وہ پانی پت کی لڑائی سے خواب ہو جاتا ہے +

پہلے تو جو کچھ تھا وہ تھا آجکل اس "اونہہ" کا ہندوستان میں بڑا زور زوروں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے انتظام کا اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھتا۔ ادھر رعایا کے مطالبات پر گورنمنٹ نے "اونہہ" کی اور ادھر اس "اونہہ" کا جواب بم سے ملا۔ ذرا گورنمنٹ کے انتظام پر رعایا نے "اونہہ" کی اور اس "اونہہ" پر مشین گن کی گولیاں برس گئیں۔ رعایا کی حالت دیکھو تو یہاں بھی اسی "اونہہ" کے نتیجے موجود ہیں۔ مسلمان مسلمان میں جھگڑا۔ ہندو ہندو میں جھگڑا۔ ہندو مسلمان میں جھگڑا۔ شمال جنوب میں جھگڑا مشرق مغرب میں جھگڑا۔ یہاں تک کہ زمین آسمان میں جھگڑا۔ اگر یہاں "اونہہ" کا کچھ عرصہ یونہی دور دورہ رہا تو سوراج ملنا کیا۔ غلامی بھی نصیب ہونی مشکل ہے +

ملک کے بعد اب جلسوں کی کیفیت دیکھو تو وہاں بھی یہی رنگ نظر آئے گا۔ ممبر ہیں کہ بنے ٹھنے گدے دار کرسیوں پر رونق افروز ہیں۔ اسپیکر جوش میں بہہ کر کہیں سے کہیں نکلے جا رہے ہیں۔ ممبروں نے تھوڑی دیر یہ بے سلسلہ گفتگو سنی اور "اونہہ" کر کے آنکھیں بند کر لیں۔ لیجئے ان کے لئے تو جلسہ کی کارروائی ختم ہو گئی جو ممبر ذرا آنکھیں کھولے بیٹھے ہیں۔ وہ بلاٹنگ پر پھول پتے یا گدھے اور آدمیوں کی تصویریں بنا رہے ہیں۔ کوئی ان بھلے آدمیوں سے پوچھے کہ حضرت یہاں آپ سونے اور تصویریں بنانے آئے ہیں۔ یا ملک کے لئے کچھ کام کرنے۔ ووٹ لینے کا وقت آیا اور انہوں نے بے سوچے سمجھے مخالفت یا موافقت میں ہاتھ اٹھا دیا۔ ان کو نہ یہ معلوم

کرنے کی ضرورت کہ اس مضمون پر کیا بحث ہوئی۔ اور نہ یہ جاننے کی حاجت کہ حالات کے لحاظ سے تردید کرنی چاہئے یا تائید۔ یہ تو صرف "اونہہ" کرنے اور ہاتھ اُٹھانے آئے تھے۔ اس فرض کو پورا کر دیا۔ اب جلسہ کرنے والے جانیں اور اُن کا کام جانے۔ ختم جلسہ پر ان لوگوں سے پوچھو تو انشاء اللہ نوّے فیصدی "اونہہ" سے جواب دیں گے۔ جس کے یہ معنے ہوئے کہ جلسہ بیکار، اسپیکر بے وقوف اور سننے والے گدھے"۔

طالب علموں کو دیکھو تو "اونہہ" کا زور سب سے زیادہ انہی میں پاؤ گے۔ سال بھر کھیل کود میں گزار دیا۔ امتحان کا خیال آیا تو "اونہہ" کر دی "ابھی کل سے پڑھیں گے"۔ آخر یہ "اونہہ" یہاں تک کھنچی کہ امتحان آ گیا۔ فیل ہوئے۔ اس فیل ہونے پر بھی "اونہہ" کر دی۔ یہ "اونہہ" بہت ہی بامعنی ہے۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ باپ زندہ ہیں۔ کھانے پینے اور اڑانے کو مفت ملتا ہے۔ اگر وہ بھی مر گئے تو جائداد موجود ہے۔ قرضہ دینے کو ساہوکار تیار ہیں۔ پھر پڑھ لکھ کر کیوں اپنا وقت ضائع کریں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ ابھی ہماری عمر ہی کیا ہے۔ صرف اٹھارہ برس کی ہے۔ اگر مڈل کے امتحان میں دو چار دفعہ فیل ہو چکے ہیں تو کیا حرج ہے۔ تیس سال کی عمر تک بھی انٹرنس پاس کر لیا۔ تو سفارش کے بل پر کہیں نہ کہیں چپک ہی جائیں گے۔ یا کم سے کم ولایت جانے کا قرضہ تو ضرور مل جائے گا۔ اور ذرا کوشش کی تو بعد میں معاف بھی ہو سکے گا +

اس فیل ہونے پر ادھر انہوں نے "اونہہ" کی اور اُدھر ماں باپ نے "اونہہ" کی۔ اس صورت میں "ابا" اور "اماں" کی "اونہہ" کا دوسرا مطلب ہے یعنے یہ کہ "بچہ" ابھی فیل ہوا ہے۔ دل ٹوٹا ہوا ہے۔ ذرا کچھ کہا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ رو رو کر جان ہلکان کر لے۔ یا کہیں جا کر ڈوب مرے۔ غرض اس "اونہہ" نے صاحبزادہ صاحب کی تعلیم کا خاتمہ بالخیر کر دیا +

گھروالی کی "اونہہ" سب سے زیادہ خطرناک "اونہہ" ہوتی ہے۔ کسی ماما پر خفا ہو رہی ہیں۔ وہ برابر جواب دیئے جاتی ہے یہ "اونہہ" کر کے خاموش ہو جاتی ہیں۔ لیجئے نوکر شیر ہو گئے۔ گھر کا سارا انتظام درہم برہم۔ خود ان کے اختیارات سلب۔ گھر کی حکومت ان سے چھین ماماؤں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ کوئی چیز چوری گئی۔ بیگم صاحبہ نے ادھر اُدھر ڈھونڈھا۔ کچھ تھوڑا بہت غل بھی مچایا۔ آخر "اونہہ" کر کے بیٹھ گئیں۔ اب کیا ہے پٹاری میں سے کتھہ چھالیہ غائب۔ خرچ کی صندوقچی میں سے روپے پیسے غائب۔ صندوقوں میں سے کپڑے غائب۔ غرض رفتہ رفتہ سارے گھر کا صفایا ہو گیا۔ ماما نے کوئی رکابی توڑ ڈالی۔ شکایت ہوئی مالکہ نے وہی اپنی "اونہہ" کا استعمال کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں میں الماری کے پیچھے سے شیشے اور چینی کا اتنا ٹوٹا ہوا سامان نکلا کہ خاصے کئی صندوق بھر جائیں۔ بچوں نے کوئلے سے دیواروں پر لکیریں کھینچیں۔ دروازوں پر پنسل سے کیڑے مکوڑے بنائے پہلے تو یہ تھوڑی بہت بگڑیں۔ پھر "اونہہ" کر کے چپ ہو گئیں۔ اب جا کر دیکھو تو تھوڑے دنوں میں تمام مکان نقش و نگار سے "غیرت دہ غارہائے اجنٹہ" ہو گیا +

اب رہے میاں۔ تو ان کی "اونہہ" سب سے زیادہ تیز ہے۔ بیوی کسی بات پر بگڑیں۔ میاں "اونہہ" کہہ کر باہر چلے گئے اب نہ تو میاں کی کوئی عزت نوکروں میں رہی اور نہ بیوی کی۔ مثلاً ماما نے پندرہ دن میں دس روپے کی لکڑیاں جلا دیں۔ میاں کو غصہ آیا۔ اور کیوں نہ آتا۔ محنت کی کمائی اس طرح صنائع ہوتے دیکھ کر کیوں نہ جلے۔ کچھ بڑبڑائے۔ بیوی کی طرف امداد کے لئے دیکھا۔ مگر بیوی نے "اونہہ" کر دی۔ ماما نے یہ رنگ دیکھ دوسرے مہینے میں بیس روپے کی لکڑیاں پھونک دیں۔ ہاں [illegible] بیوی کی یہ "اونہہ" بعض دفعہ وہ کام کر جاتی ہے [illegible] بڑے افلاطون مصلح کار بھی نہیں کر سکتے۔ بیوی [illegible]

نے "اونہہ" کردی چلو لڑائی کا خاتمہ ہوا۔ میاں کسی بات پر بگڑے بیوی نے "اونہہ" کردی۔ میاں کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔ اگر "اونہہ" کی بجائے جواب دیا جاتا تو میاں گھر چھوڑتا اور بیوی کو اپنے میکے جانا پڑتا۔ ہے یہ کہ ہندوستان کے بہت سے گھر اس "اونہہ" ہی نے بچا رکھے ہیں ؞

ہر معاملہ کی دو ہی صورتیں ہیں۔ فتح یا شکست۔ اور دونوں صورتوں میں "اونہہ" نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ شکست پر جس نے "اونہہ" کی۔ اس نے گویا شکست کو شکست نہ سمجھا ایسی شکل میں وہ تلافی کی کیا خاک کوشش کریگا جس نے فتح پر "اونہہ" کی اس نے گویا اپنی محنت کی قدر نہ کی۔ وہ آج نہیں ڈوبا۔ تو کل ڈوبے گا۔ دنیا میں وہی لوگ کچھ کر سکتے ہیں۔ جو فتح کو فتح اور شکست کو شکست سمجھیں۔ اب رہے "اونہہ" والے۔ جو لاپروائی سے شکست اور فتح کو برابر سمجھتے ہیں۔ ان کا بس خدا ہی مالک ہے۔ دنیا سے اگر مٹ نہ جائینگے تو کم سے کم جوتیاں ہمیشہ ضرور کھائیں گے ؞

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں اس "اونہہ" کے مسئلہ ارتقا سے کچھ بحث بھی کردی جائے۔ اور یہ بتایا جائے کہ یہ پہلے کیا تھا اور کیا سے کیا ہوگیا۔ ہم لوگ تقدیر بلا تعلق تدبیر کے قایل ہوگئے ہیں۔ اور اس یقین سے ہم کو یہ فائدہ پہنچا ہے کہ کوئی ذمہ داری ہم پر باقی نہیں رہی۔ اس لئے ہماری کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے کہ اس خالص تقدیر کے مدارج جتنے بڑھائے جا سکتے ہیں۔ اُتنے بڑھا دیں۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ صفت کے تین درجے ہوتے ہیں۔ اس لئے پہلے تو ہم نے اس تقدیر کو ان تین درجوں پر لیجا کر صبر رضا اور تسلیم تک پہنچایا۔ لیکن اس سے بھی جب ہماری سیری نہیں ہوئی تو چوتھا درجہ "اونہہ" کا نکالا۔ تقدیر خالص کا یہ وہ آخری زینہ ہے جہاں اتنا بھی خیال آتا کہ ہم نے اس معاملہ میں تسلیم سے کام کیا۔ یہ گناہ کبیرہ سمجھا جاتا ہے۔ ہماری ہمتوں کی تعریف کرنی چاہئے۔ کہ ہم اس آخری زینہ کو بھی طے کر چکے ہیں۔ اور اگر زمانہ کی یہی حالت رہی تو تھوڑے ہی دنوں میں اس "اونہہ" سے بھی کوئی اونچا مقام نکالکر وہاں پہنچنے کی کوشش کرینگے۔ اور انشاء اللہ ضرور کامیاب ہونگے ؞

میری طرف سے کوئی ہندوستان کے لیڈروں کو سُنادے کہ سوراج حاصل کرنا ہے تو پہلے اپنے بھائیوں میں سے اس "اونہہ" کو نکالو۔ اس کے بعد ہندوستان کیا ساری دنیا تمہاری ہے۔ اگر یہ نہیں ہو سکتا تو خواہ مخواہ چیخ چیخ کر لیو اپنا گلا پھاڑتے ہو۔ ہم "اونہہ" کردیں گے اور تم چیختے چیختے مرجاؤ گے ؞

(دکن پنچ)

فرحت اللہ

ادب لطیف

اے سکھی! تونے کبھی مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی۔ ہائے تجھے کیا معلوم تیری اس عادت نے آج مجھے کتنا دکھ دیا۔ تو ہنس اور ہنسکر مجھ ناکس سے محبت کرتا ہے میری آنکھوں سے پردہ اٹھ گیا۔ میرے بھولے بھالے دل نے سمجھ رکھا تھا وہ میرا اور صرف میرا ہی ہے۔ سکھی تونے میرا دل توڑ دیا۔ مگر میں تجھے الزام نہیں دیتی تجھ سے میں نے بھی کبھی یہ راز دل نہ کہا تھا ؞　اے خدا! میں نے کتنی راتیں رو رو کر کاٹیں۔ مگر اس رونے میں شکر تھا۔ کیونکہ امید کا دیا میرے دل میں ٹمٹماتا تھا۔ مگر اب...... اے سکھی تیری ایک بات نے میری امید کا دیا گل کر دیا۔ اور زندگی کی خوشیاں تاریک ؞

"ثروت"

لیلےٰ کے خطوط

(مشہور ادیب جناب قاضی عبدالغفار خاں صاحب کے قلم سے)

ان صفحات میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ کچھ بہت تشریح و توضیح کا محتاج نہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستان کے مصلحین قوم اور مذہبی رہنما عورت کے متعلق اپنی غفلت شعاریوں کو ایک آئینہ میں دیکھ لیں۔ جو لوگ ہماری اخلاقی زندگی کے ٹھیکہ دار بنے ہوئے ہیں اُن کو صرف اتنا بتا دیا ہے کہ بداخلاقی کی زندگی کے سارے کرشموں کا منبع بھی اُن ہی کی ذات والا صفات ہے۔

مجھ پر ظلم ہوگا اگر ان صفحات کو ناول اور افسانہ سمجھ کر پڑھا جائے۔ اس کاغذی پیرہن میں نسوانی زندگی اور نسوانی جذبات کے چند نقوش پیش کئے گئے ہیں کہ اگر کچھ لوگ اس بدنصیب ملک میں ان نقوش کے معنی سمجھ سکتے ہوں تو سمجھ لیں۔ یہ نہیں کہتا کہ ایک بازاری عورت کی ظاہری اور باطنی زندگی کا یہ عکس مبالغہ سے یکسر پاک ہے۔ مگر یہ ضرور کہتا ہوں کہ حسن فروشی کے بازار میں عورت کی خونچکاں فطرت کا یہ ایک "مطالعہ" ہے۔ جو زبان اردو کی علمی دنیا اور ہندوستانی مسلمانوں کی قومی زندگی میں سوز چشم عبرت کا محتاج ہے +

علم النفس کے نقطۂ نظر سے عورت کی انسانیت کا ٹوٹا ہوا آئینہ بھی اپنے اندر وہ اصلی جوہر محفوظ رکھتا ہے جو عصمت فروشی کی گندگی سے ڈھک جانے کے بعد فنا نہیں ہوتا۔ "لیلیٰ" کے قلم سے جو خطوط میں نے لکھوائے ہیں وہ محض انشاء پردازی کی کوشش نہیں ہے۔ ان خطوط میں اگر آپ دیکھ سکیں تو "لیلیٰ" کا تبسم ایک فوارۂ خون، اس کی بذلہ سنجی ایک فریاد، اس کا فلسفیانہ انداز سخن ایک دکھی کی پکار ہے۔ اس کی شوخی میں زندگی کے مہلک ترین زہر کی تلخی ہے۔ وہ جب اپنی بازاری زندگی کے مشاغل بیان کرتی ہے تو گویا اُن زخموں سے کھیلتی ہے جو اس کے وجود معنوی پر ناسور بن کر رہ گئے ہیں۔ "لیلیٰ" اپنی مختصر داستان میں اپنی اُن لاکھوں بہنوں کی داستان زندگی بیان کرتی ہے جو اس ملک میں مرد کی نفس پرستی پر قربان کی جا رہی ہیں۔

غرضیکہ "لیلیٰ" کے کاغذی پیرہن میں اس کی زندگی کا ایک نقش فریادی ہے جس کی آواز میں جانتا ہوں کہ بہت کم سُنی جائیگی لیکن سُنی جائے یا نہ سُنی جائے میرے ضمیر کے لئے تسکین اسی خیال کے اندر ہے کہ یہ صفحات ... اور علماء کے خلاف یہ ایک فرد قرارداد جرم ہیں۔ جو اپنی قوم کی آئندہ نسلوں کی رہنمائی کے لئے لکھ رہا ہوں۔

پیشہ ور اہل قلم مجھ سے جھگڑا نہ کریں میرا تو یہی خیال ہے کہ ابھی تک اُردو زبان کی علمی ترقی کا دائرہ بہت محدود ہے ... ناول نویسوں اور ناول فروشوں کی غیر محدود تعداد نے اُردو زبان اور افسانہ نگاری کے صحیح مذاق کو اس درجہ مجروح کر دیا ہے کہ ... اور افسانہ نگاری کا فن اہل نظر کے نزدیک ایک معیوب فن سمجھا جانے لگا ہے۔ علم النفس، سائیکالوجی اور "کیریکٹر" ... سے اُردو لٹریچر تقریباً اجنبی ہے۔ پرانی شاعری کی طرح زلف و رخ اور خال و گیسو کا ایک ہی افسانہ ہے جس کو مختلف ...

پر مختلف انداز بیان اور مختلف عبارت آرائی کے ساتھ آرہ دو کا ہر مطبع چھاپ کر شائع کر دیتا ہے۔ نسیاری کی وہ کان پر اردو زبان کی ترقی کے کیسے کیسے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں، مشکل ہے کہ ایک بازاری عورت کی بے سرو پا داستان جن میں دعشق و عاشقی کا پلاٹ ہے، نہ وصل و ہجر کی کیفیات ہیں، نہ رقیبوں کی سازشیں ہیں، نہ ساغر ساقی کے اسرار ہیں اس دنیا میں جو انگریزی ناولوں کے ڈھائی آنہ والے ایڈیشن کے ترجمہ کرنے والی دنیا ہے مقبول ہو۔ پھر اگر کہیں علمائے کرام کی عدالت احتساب کے سامنے ان اوراق کو رکھ دیا گیا۔ تب تو معلوم نہیں، محب اخلاق کے یہ دیوتا کیسے کیسے احکام صادر فرمائیں۔ ان اوراق کے محرر یا مصنف سے زیادہ قابلِ نفرت کون گنہگار ہو سکتا ہے جس نے ایک ناموس باختہ عورت کی خلوت کی داستانوں کو اس طرح عریاں پیش کر کے محراب و منبر کی قندیلوں پر بانس ا ٹھا ہوا۔ اس گستاخانہ پیرایہ میں جبہ و دستار کے اُن لاکھوں عابدوں کو بغاوت کا اشارہ کیا جو بیس بی بیشا بیان نجروں کی چوکھٹ پر نسلاً بعد نسل مجبی رہا کی ہیں۔ مسجد و مدرسہ میں قمر سے آتے ہوئے جھاگ اور گلے کی پھولی ہوئی رگوں سے ان صلوات کا استقبال ہونا چاہیے +

ایک بازاری عورت جو علم کی دولت سے محروم نہیں، ایک تعلیم یافتہ چاہنے والے کے محبت بھرے خطوط کا جواب لکھتی ہے۔ اور اظہار تعشق کے ہجوم سے اُکتا کر اپنی معنوی زندگی کے آلام کو بے نقاب کرتی ہے۔ وہ ان خطوط کے سلسلہ میں صرف اپنی ظاہری زندگی کے کوائف کبھی ہنس ہنس کر، کبھی رو رو کر بیان کرتی ہے، بلکہ بین السطور اپنی معنوی زندگی کو بھی اس طرح واضح کرتی ہے کہ اس کے بیانات میں اہل نظر اس کی مظلومیت کی تصویر بھی دیکھ لیں +

اس سلسلہ کے چند اوراق آج ہدیہ ناظرین ہیں۔ داستان کا عدم تسلسل ان کو شاید بے مزہ کریگا۔ لیکن ان چند خطوط کی اشاعت کا مقصد صرف اتنا ہے کہ جو لوگ اس اشاعت کے مخاطب اصلی ہیں ان کی فصد لینے سے پہلے ایک سوئی چبھو کر دیکھی جائے کہ سوئی اور نشتر کے درمیان وہ کس حد تک بغیر چیخے اس فرد جرم کی ضرب کو برداشت کر سکیں گے +

طبیب جب مریض کے خون کا امتحان کر کے مرض کا پتہ لگانا چاہتا ہے تو صرف ایک ہی قطرہ خون کو خوردبین کے سامنے رکھ کر اُس زہر کو معلوم کر لیتا ہے جو مریض کے سارے نظام میں پھیلا ہوا ہے۔ میں بھی اس تمام نظام معاشرت و تمدن سے ایک صرف ایک قطرۂ خون نکالتا ہوں۔ اور اس کو اُن مقدس ہستیوں کی خدمت میں ہدیہ کرتا ہوں جن کا پہلا فرض یہ تھا کہ وہ مذہب کے اس ناسور کے لئے کوئی مرہم تلاش کرتے۔ نہ یہ کہ اُس کے گھناؤنے منظر سے آنکھ ناک بند کر کے بھاگ جاتے۔ اور ضمیر کو تسلی دینے کے لئے کہہ دیتے۔ کہ ہمارے تمدن کے دامن پر کوئی بدنما داغ نہیں + (قاضی احمد الفقار)

پہلا خط

آپ کی چند سطور مختصر ہیں، مگر ناقابلِ فہم نہیں میری زندگی میں آپ کا یہ خط پہلا خط نہیں ہے۔ صاف کہہ دوں کہ میرے دن اور میری رات کا زیادہ حصہ اسی قسم کی خط و کتابت میں گزرتا ہے۔ یہ زندگی جو میں بسر کر رہی ہوں میرے لئے اب نئی نہیں۔ آپ نے ناحق اپنے مافی الضمیر کو الفاظ کی اُلجھن میں چھپایا۔ یہی تو کہ آپ "رلموہ رسم" پیدا کرنا چاہتے ہیں؟ یہ کیوں نہ کہا کہ آپ بھی حسن کے خریدار ہیں آپ نے شب کے دسترخوان پر میری شرکت اپنے لئے باعث مسرّ

بتائی۔ آپ یہی فرما دیتے کہ آپ کی منزل دسترخوان کی حدود سے آگے ہے کیا نہیں ہے؟ بندہ نواز! کسی دوکان پر جائیں تو تلمیح و استعارہ سے قطع نظر اسودا کیجئے، جیسے کہ سودا ہونا چاہئے! یہ سچ ہے کہ اظہار مقصود میں آپ نے آداب حجاب و حیا کو ملحوظ رکھا۔ مگر میرے لئے اس پردہ کی کیا ضرورت ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں بقول آپکے آج شب کو آپ کی مہمان بنوں۔ مجھے منظور! میری قیمت آپ کو معلوم ہے۔

دوسرا خط

بندہ پرور! گزشتہ شب کی مہربانیوں کا شکریہ اور پھر مزید یادآوری کا شکریہ۔ آپ اپنے اظہار التفات کو اس ناچیز پر کیوں ضائع کرتے ہیں۔ شب کا لطف و التفات ضرور تھیں کہ صبح کو بھی باقی رہے۔ آپ اپنی جگہ پر رہئے اور مجھے میری جگہ پر رہنے دیجئے۔ آپ یوں سمجھیں کہ آپ نے ایک کھلونا خریدا تھا جس سے آپ دل بہلاتے رہے۔ اور میں یہ سمجھوں کہ جو کچھ آپ کی جیب سے نکال لائی وہ میرا سرمایہ تجارت ہے۔ اس کے علاوہ آپ جو کچھ شاعرانہ انداز میں فرماتے ہیں وہ سب محض تضیع اوقات ہے۔ میں آہ سرد اور لب خشک کی منزل سے بہت آگے نکل گئی ہوں۔ جو طلسم جب ایک مرد اور ایک عورت باہم مبتلا ہوتے ہیں۔ میرے لئے محض بے معنی ہے۔ آپ کی جیب اور میرا جسم، یہی دو چیزیں ہیں۔ آپ کے عیش کا مدار آپ کی جیب پر اور میری آسائش کا انحصار میرے جسم کی خوبصورتی پر۔ معاف کیجئے۔ میں نے ایک دنیا دیکھی ہے۔ آپ ابھی نوجوان ہیں۔ اس لئے صاف صاف کہتی ہوں کہ میری کتاب زندگی کا وہ باب ختم ہو گیا جب میں آپکے اظہار التفات سے خوش ہوتی۔ آپ بھی اس جھگڑے میں نہ پڑیئے مجھے آپ پسند کرتے ہیں تو اس کھیل کو کھیل ہی سمجھ کر کھیلئے۔ میں اپنی نسوانیت فنا کر چکی۔ آپ کا جی چاہے تو اپنی جوانی اور اس کے ساتھ اپنا روپیہ خرچ کیجئے۔ مگر انداز عاشقانہ کی شریعت سے مجھے معاف رکھئے۔ میں ایک بازاری شراب ہوں۔ مدہوش کر سکتی ہوں، مگر مجھ سے کسی کیف اعلیٰ کی توقع فضول ہے۔ اگر میری آپکی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا تو شاید کبھی اپنی داستان زندگی کے چند حرف آپ کو سناؤں۔ مگر وہ ایک انجمن ہے جس میں کوئی بیسوں شریک نہیں۔ میرے بستر میں بہت سے شریک ہیں۔ میرا جسم بھی بہت سے دل جلوں کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ مگر میرا ماضی صرف میرا ہی ہے۔ آپ کے پاس روپیہ ہے۔ میرے پاس حسن ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ آپ کے پاس دل بھی ہے۔ شاید ہو، مگر میرے پاس نہیں اس لئے جستجو فضول ہے۔ ساز کے اس تار کو نہ چھیڑیئے جو ٹوٹا ہوا ہے۔ اس میں آپ نغمہ نہ پائینگے۔

تیسرا خط

محبوب عزیز۔ کتنے دن ہوئے۔ جب پہلی دفعہ میں آپ کی "مہمان" تھی۔ کتنے دن ہوئے جب آپ نے اپنی جوانی مجھ پر ضائع کرنی شروع کی تھی۔ میں نے کتنی دفعہ آپ سے کہا کہ وہ اسے ارزاں نہ جانیئے۔ جو نہیں ہے اس کو نہ مانگئے۔ کل رات آپ نے اپنے اظہار عشق کی بہت دیر گرم گرم آنسوؤں اور اچھی ہوئی ہچکیوں سے تائید کی۔ مجھے آپ نے تھکا دیا۔ آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ یہ ہنگامے میرے لئے ایک ذرہ دلچسپ نہیں ہیں۔ [illegible] فروخت کیا کرتی ہوں اور لوگ خریدا کرتے ہیں۔ [illegible] ہا ہے۔ آپ اس حقیقت کو کھولنے پر مصر ہوتے ہیں۔ آپ [illegible] ہزار دفعہ مجھ سے پوچھیگی اور دو ہزار دفعہ یہی جواب پائینگے [illegible] پاس کوئی دوسرا جواب نہیں۔ آج میرا [illegible] آپ یاد فرمائینگے تو میں آؤنگی۔ مگر آپ کو وہ [illegible] شاعرانہ تخیل مجھے رستا ئیگا۔ آپ بچوں کی طرح [illegible] پرچھائیں کو پکڑنا چاہتے ہیں۔ اور وہ ہاتھ نہیں آتی تو مچلتے

بندہ نواز! جس منزل پر ہم دونوں آ گئے ہیں وہی ہمارے سفر کی انتہا ہے۔ اس کے آگے ہمارے راستے جدا ہیں۔ چلئے جہاں تک میں آپ کے ساتھ چل سکوں۔ اس کے آگے جانا ہو تو پھر تنہا جانا ہوگا۔

چوتھا خط

وارفتۂ تخیل۔ آپ منتظر رہے ہونگے۔ اپنے نہ آنے کی وجہ بیان کروں تو تم کہوگے کہ یہ عورت کس درجہ سنگدل ہے۔ مگر کیا کروں واقعات کو چبا چبا کر بیان کرنے کی عادت نہیں۔ شروع ہی سے کوشش کر رہی ہوں کہ تم سیاہ کو سیاہ سمجھو، داغ کو داغ جانو، میرے دامن کے گندہ دھبوں کو اپنی آنکھ سے دیکھو اور میری زنانہ زینت و آرائش سے دھوکہ نہ کھاؤ۔ تمہاری انسانیت کو اپنی انسانیت سے بہتر سمجھتی ہوں۔ اور گو کہ تم سے محبت نہیں کرتی۔ مگر تمہارا بھلا چاہتی ہوں۔ تم نے ابھی دنیا کے نشیب و فراز میں قدم رکھا ہے۔ اگر دھوکہ کھا گئے تو گئے گزرے۔ میرا کیا ہے، تم کو ہاتھ سے کھو بیٹھوں تب بھی دنیا احمقوں سے خالی نہیں۔

پیارے دوست، تمہارے اظہارِ عشق سے متاثر نہیں ہوتی مگر یہ نہ سمجھو کہ میں تمہارے آغوش میں اپنے لئے کوئی راحت نہیں پاتی۔ سوائے ان چند نقرئی اور طلائی سکوں کے جو تمہارے ہاتھ سے میرے ہاتھ میں آتے ہیں۔ بدقسمت بُری سہی پر طبیعت بُری نہیں۔ میری زندگی ناپاک ہے۔ لیکن اس عشوہ فروشی کے بازار میں آنے سے پہلے مجھے علم و تہذیب و شرافت کی اتنی دولت حاصل ہو چکی تھی جتنی کہ عام طور پر شاید اچھے گھرانوں کی بہو بیٹیوں کو بھی حاصل نہ ہوتی ہو۔ اس بیان کو خود فریبی اور پندار پر محمول نہ کرنا۔ جوہرِ اصلی کچھ میرے پاس بھی تھا۔ مگر میرے تغلب کو میری زندگی نے تلخ کام کر دیا ہے۔ میں دل ہی دل میں اپنے وجود سے شرمایا کرتی ہوں۔ مگر اس مکروہ دنیا اور مکروہ تر دنیا والوں نے جہاں پھینکدیا جس گندگی میں ڈال دیا اُسی میں مبتلا ہوں۔ اور اب گناہ کی بھاری زنجیریں میرے پاؤں میں ہیں لیکن یہ نہیں کہ حس باقی نہ ہو۔ حس باقی نہ ہوتی تو میں تم سے اس طرح کی باتیں نہ کرتی۔ تم جب اظہارِ عشق کے ہجوم سے تھک جاتے ہو۔ اور اپنی تقریروں کے جواب میں مجھ سے ایک حرفِ محبت بھی نہیں پاتے تو پھر مجھ سے کیسے کیسے احمقانہ سوالات کیا کرتے ہو۔ کبھی کہتے "لیلیٰ! تم خفا ہو گئیں" "کیا تم کبھی مجھ سے محبت نہیں کر سکتیں" "کیا میری محبت کبھی بار آور نہیں ہو سکتی" "تم اتنی سنگدل ہو" "تم اسقدر بے پروا ہو" "تم اسقدر بے حس ہو" "تمہارے ساز کے کسی تار میں آواز نہیں" "تم ایک تودہ برف ہو" "تم ایک بھاری پتھر ہو" "تم ایک بے جان تصویر ہو" "تم ایک دریا ہو جس کا پانی متحرک نہیں۔ نہ ہو سکتا ہے" "تم ایسی کیوں ہو لیلیٰ! تم ایسی کیوں ہو" پھر تمہیں میری موجودہ زندگی یاد آتی ہے اور تم میرے گلے میں ہاتھ ڈال کر بار بار مجھ سے کہتے ہو "کیا تم اپنے ہر دوست کے ساتھ ایسی ہی ہو؟" "تم نے کبھی محبت کا مزہ نہیں چکھا؟" "کیا وہ خوش نصیب ابھی تک پیدا نہیں ہوا جس کو تم دل سے پیار کر سکو" غرضکہ پیارے دوست، تم نے کتنی راتیں اسی طرح ضائع کی ہیں۔ تم ایک ویرانے میں آبادی ڈھونڈتے ہو۔ ایک ریگستان میں مرغزار چاہتے ہو، تم محبت کی آغوش میں ایک ہمدم و مونس مانگتے ہو، یہ کچھ بھی تمہیں نہیں مل سکتا۔ ہاں، تمہارے آغوش میں ایک نازک جسم سما سکتا ہے۔ تمہارے پہلو میں ایک حسین چہرہ آ سکتا ہے۔ تمہارے شانوں پر معطر بال بکھر سکتے ہیں۔ مگر اس سے زیادہ کچھ نہ مانگو کچھ نہ چاہو!

ایک دن جب تم مجھ سے بار بار پوچھ رہے تھے کہ "آخر تم ایسی کیوں ہو؟" تو شاید میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ کبھی ممکن ہوا تو بتاؤں گی کہ میں ایسی کیوں ہوں۔ اس عرصہ میں کئی دفعہ ایسا ہوا کہ جب تمہاری اس وارفتگی پر میں اپنے نفس کو ملامت کرتی تھی تو خیال آیا کہ لاؤ

آج تمہیں ایک داستان سناؤں۔ مگر دل نے کہا کہ ابھی تو اس نوجوان کی عقل بھی ٹھکانے نہیں۔ یہ وارفتگی کم ہوں اور حواس درست ہوں تو کچھ کہوں۔ تم کو دیکھتی ہوں کہ تمہارے پاؤں اس علمی زمین پر کسی طرح نہیں جمتا۔ تم جس گندہ تالاب کو طوفان خیز سمندر سمجھ رہے ہو۔ اس میں تمہارے لئے پایاب جانا مشکل نہ تھا۔ مگر مگر اس کو کیا کروں کہ تم سمجھتے کہ تم ایک بحر ناپیدا کنار میں ہو۔ در اصل طوفان خیز سمندر اور چھوٹا سا تالاب دونوں یکساں ہیں یہ سب تخیل ہے۔ تم چاہو تو سمندر تالاب اور تالاب سمندر نظر آسکے۔ وہ جو ایک خیال ہوتا ہے۔ وہی اصل ہے۔ باقی سب فروع ہیں۔ تمہارے دماغ میں سمندر بھی ہے اور تالاب بھی۔ اور دراصل دونوں ایک ہیں۔ مگر جب تم آنکھیں بند کرکے اس امر پر اصرار کرو کہ تالاب درحقیقت سمندر ہے۔ تو پھر پانی کا ہر قطرہ تمہارے لئے طوفان خیز ہوگا۔ تم نے بہت سے فلسفی اور حکیم دیکھے ہونگے۔ میں ایک حسن فروش فلسفی ہوں!

کمہار نے ایک خوبصورت آبخورہ بنایا۔ لوگوں نے اسکو جام صہبا بنالیا۔ یا کمہار نے ایک جام صہبا بنایا۔ اور لوگوں نے اسکو آبخورہ سمجھ کر مسجد کی دیوار پر رکھ دیا' تو پھر کیا اس مٹی کی حیثیت بدل گئی؟ جام میں چاہے شراب بھر دیجئے چاہے زمزم عورت کو بیسوا بنا دیجئے یا گھر کی ملکہ۔ تم نے یعنی مردوں نے عورت کو جس طرح استعمال کیا ویسا ہی اس کو بنا دیا۔ ہیرے کی چمک تم نے چھین لی۔ موتی کی آب تم اڑا لے گئے۔ اب رہا کیا ہے کہ تم عشق و عاشقی کی داستان لیکر آئے ہو! . . . .

تم میری اس خرافات سے کسقدر اکتا گئے ہو گے۔ مگر جو کچھ کہی ہوں اس کے پردوں کو اٹھا سکو تو اٹھاؤ اور مجھ سے کچھ عقل سیکھو۔

آج کی شب خالی ہے امیرا یہ خاص مشغلہ ہے کہ جب میرے سوا میری خلوت میں کوئی نہیں ہوتا۔ چاہنے والوں کے ہجوم سے نجات پاتی ہوں اور بستر میں (جو مجھ کمبخت کو بہت کم ملتا ہے) جاکر بیٹھتی ہوں' تو خود اپنے وجود کو اپنے آغوش میں لیتی ہوں۔ اس وقت میں عاشق ہوتی ہوں اور میرا وجود معنوی معشوق۔ گویا ایک دوسرا کوئی ہوتا ہے جس کا سر میں اپنے زانو پہ رکھتی ہوں۔ اور کہتی ہوں لیلیٰ! کم بخت' بدنصیب لیلیٰ' کیا آج فرصت ہے! تھک گئی ہے؟ کچھ ڈھونڈتی ہے؟ کوئی یاد آتا ہے؟ یہ رات تو خالی ہے جا سو جا! کل پھر دوکان لگانی ہوگی' خریدار آئیں گے' سودا چکایا جائیگا' تہی دست قسمت سو جا!

پانچواں خط

آہا! شکر ہے کہ آپ اپنی بیقراری و بے صبری کی لگام کھینچے رہنے کا وعدہ فرماتے ہیں۔ میں شام کو آؤنگی۔ مجھ سے سنئے ایک معقول تدبیر بتاتی ہوں۔ ایک ہی عشوہ فروش پر کبھی قناعت نہ کیجئے۔ مرد کی ہوس کے ترکش میں ایک سے زیادہ تیر رہنے چاہئیں۔ مجھے دیکھئے کہ میں ایک رنگین تتلی کی طرح ہر چمن میں جاتی ہوں اور ہر پھول سے دو باتیں کرتی ہوں۔ آپ بھی شہد کی مکھی طرح جس پھول کو دیکھیں چند لمحے اس کی صحبت میں گذاریں' تاآنکہ زندگی کی صبح' شام ہوجائے! آپ کہاں میرے فلسفہ کی الجھنوں میں پڑ گئے۔ یہ فلسفہ خشک و تلخ اور کبھی کبھی مہلک بنجاتا ہے۔ مجھے دیکھئے کہ میں ایک اب تند و تیزی سے بھری ہوئی مینا ہوں۔ میرا نشہ تیز ہے۔ مگر عموماً دیرپا نہیں۔ میں تہا [illegible] بھرتی ہوں اور کتنے بادہ پرستوں کا بھلا کرتی ہوں۔ آپ بھی ایک ساغر بن کر مجھ سے [illegible] کیجئے۔ یا پھر اس [illegible] کی طرف [illegible] نہ کیجئے کس زمانہ میں جب کہ وہ زمانہ اب [illegible] لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کے قصے پڑھا کرتی تھی [illegible] قلب اس جہان بے اعتباری اور عالم بیوفائی [illegible] دیکھا کرتا تھا۔ مگر معلوم ہوا کہ زندگی کی کشمکش میں [illegible] نہیں کہ از ان تخیل کی شعبدہ [illegible]

جب زندگی کا مدار غذا کے چند لقموں پر ہو اور جسم و روح کا تعلق منحصر ہو معدہ کی اعانت پر۔ جب ہوس پیٹ کے لئے اچھا کھانا مانگے اور جسم کے لئے سامان زینت تو پھر اتنی مہلت کہاں کہ "بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے!"

زندگی کے مکروہات آپ کو تنگ نہیں کرتے، جسم و جان کا اطمینان حاصل ہے معاش کی فکر نہیں۔ کوئی ایسا کام نہیں جسکا ہر روز انجام دینا حصول معاش کے لئے ضروری ہو۔ صبح سے شام تک وقت اپنا ہے اور خالی ہے۔ لیلیٰ مجنوں کی کہانیوں کا خواب دیکھا کیجئے۔ ہضم صحیح ہو، معدہ قوی ہو۔ صحت درست ہو۔ تولید خون کافی ہو تو پھر یہ خواب بہت دلفریب ہے۔ لیکن جب حالت وہ ہو جو میری ہے تو پھر دیکھئے کہ کیونکر گزرتی ہے۔ مجھے دیکھئے۔ میں نے ایک پیشہ ایک وسیلہ معاش اختیار کیا ہے، یا یوں کہوں کہ ایک پیشہ نے مجھے اختیار کر لیا ہے۔ میں تو فروعات میں وقت ضائع کرتی نہیں پھرتی ہوں۔ اگر آپ عورت اور اس کے حسن سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں، جس طرح شکاری محض اس لئے ہرن کے گولی مارتا ہے کہ اس کے بیمانہ قوئی اپنی قوت حیوانی کی مستی کا نظارہ کریں اور اس کا نفس مسرور ہو تو اس چمن میں تنگ داماں نہ ہوجئے، پھول بہت ہیں!

میں جانتی ہوں آپ کہتے ہوں گے کہ یہ عورت کس قدر سخت دل اور بیحیا ہے۔ جناب قیس! آپکی لیلیٰ نے یا قلب سے نہ بیحیا۔ وہ اس غریب دنیا کی ایک شکم پرست بیٹی ہے۔ آپ جو مجھکو درس اخلاق دیا کرتے ہیں۔ اور میرے اپنے تعلقات کو ایک آسمانی برکت سمجھا کرتے ہیں، یہ آپ عشق و عاشقی کرتے ہیں یا اصلاح نفوس و اخلاق کا علم بلند کر کے مکار صوفی کی طرح مجاز و حقیقت اور حقیقت و مجاز کے درمیانی خلا میں کشتی کا جالا پور رہے ہیں۔ اگر میرے حال پر یہ توجہات مصلحانہ ہیں تو عرض کرونگی کہ

ایں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است!

آپ کے آغوش میں مجھ جیسی عورت اپنی عشوہ طرازی کے لاکھوں تماشے دکھا سکتی ہے لیکن اگر آپ پانی کی مچھلی سے کہیں کہ وہ خشکی پر دوڑا کرے یا آپ اگر ہرن سے کہیں کہ وہ پانی کے اندر تیرا کرے تو معاف کیجئے غلطی آپ ہی کی ہوگی۔ جو شخص میخانہ میں جا کر وضو کے لئے پانی مانگے۔ یا مسجد میں جھکر مے گلفام کی سرخی سے نکالے اُس کو دنیا کیا کہیگی!

چھٹا خط

پیارے دوست! تم پوچھتے ہو کہ رات میں کیوں رو رہی تھی۔ تم میرے رونے پر اسقدر حیران ہو کہ گویا تمہارے خیال میں میری آنکھ کے اندر آنسو ہی پیدا نہیں ہوتے۔ اُس نادان کی طرح جو محفل میں ایک ستار اُٹھا کر بجانا چاہتا ہے اور بجا نہیں سکتا۔ پھر جب اُن تاروں میں سے کسی ایک تار کو اسکی انگلی مس کرتی ہے اور وہ سوچتا ہے کہ تار کی جھنجھناہٹ میں یہ آواز کیوں نکلی وہ کیوں نہ نکلی جو اُس کے خیال میں نکلنی چاہئے تھی، وہ نہیں جانتا کہ تاروں کی ترکیب کیا ہے۔ وہ بار بار اُن پر ہاتھ مارتا ہے اور پھر شکوہ کرتا ہے کہ ان سے نغمہ نہیں نکلتا اور محض ایک شور بجتا ہے۔ مگر یہ نادان، نہ اُن تاروں سے واقف ہے نہ اُن کی موسیقی سے آشنا ہے۔ نہیں جانتا کہ کس تار کو چھیڑ رہا ہے اور اُس کی آواز کیا ہوگی۔ تمہیں کیا معلوم کہ میرے سازِ خاموش میں کتنے تار ہیں۔ جب کبھی کسی نادان کی مضراب اُن میں سے ایک کو چھو جاتی ہے تو موسیقی کی ایک بے اختیار چیخ فضا میں گونجتی ہے اور وہ نادان نہیں جانتا ـــــ نہیں جان سکتا ـــــ کہ یہ سوز و ساز کہاں سے آیا۔ تم کیا جانو ـــــ کیا جان سکو ـــــ کہ آنسو کے اندر موسیقی کی ایک دنیا موجود ہے۔ آہ! تم کہ میری آنکھوں کے سرخ ڈوروں کو دیکھ کر مست ہو جاتے ہو۔ میرے آنسوؤں کی موسیقی کو کہاں پاؤ۔ یہ میرا راز ہے۔ عورت زندگی کی موسیقی

اور شعر سے لبریز ہے۔ تمہیں بھی اس کی خبر ہے؟ میرے مہربان! ایک ناداں دوست کی طرح جو نہیں جانتا کہ مجروح کے جسم پر جابجا گھاؤ سے ڈھکے ہوئے کتنے زخم ہیں اور کہاں کہاں ہیں۔ بے خبری سے جہاں چاہتا ہے انگلی رکھ دیتا ہے۔ اور جب اس تکلیف سے مریض چیختا ہے تو حیران ہوتا ہے کہ وہ چیخا کیوں؟ تم کہاں کہاں میرے زخموں کو چھیڑ دیتے ہو اور نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہو؟ پھر اگر میں درد و کرب سے تلملا جاتی ہوں تو پوچھتے ہو کہ "تم روئیں کیوں؟" تم کو خبر نہیں کہ تم میرے شکستہ ساز کے تاروں سے کھیلتے ہوئے، تمہاری طرح بہت سے کھیلتے ہیں۔ کھیلتے کھیلتے کتنے تار توڑ ڈالے جن کی موسیقی ہمیشہ کے لئے ناپید ہوگئی شاید ابھی کوئی تار سالم باقی ہو۔ اس کی جستجو نہ کرو۔ مبادا تمہاری بے حس انگلیاں اُن سے بھی کھیلنا چاہیں! شاید میرے رونے کی کیا مسخر انگیز وجوہ تمہارے خیال میں آئیں۔ تم کہتے ہو "کیا مالی مشکلات درپیش ہیں" "کیا کوئی یاد آیا"۔ "کیا کسی سے کچھ تکلیف پہنچی"۔ میرے حسن پرست دوست! میرے ان آنسوؤں کو بھی ایک ادائے حسن سمجھو اور اس دیو کو جو تمہارے اندر ہے اور ہر مرد کے اندر ہوتا ہے، یوں سمجھاؤ کہ عورت کے آنسو بھی مرد کے لئے ایک کیف رکھتے ہیں۔ عورت کو کبھی کبھی رونا بھی چاہئے کہ آنسوؤں کی جھڑی حسن میں ایک اور جھلک پیدا کرتی ہے، جو بجائے خود مرد کے عالم مستی میں، طرب انگیز ہے! ——

مرد ہر دفعہ عورت سے ایک نئی ادا مانگتا ہے۔ اور اپنے لئے صرف ایک ہی انداز حیوانیت کافی سمجھتا ہے۔ وہ عورت کے ہمیشہ ہنسنے سے بھی تھک جاتا ہے۔ اور ہمیشہ رونے سے بھی اُکتا جاتا ہے۔ وہ ہر کیفیت عارضی چاہتا ہے۔ اُس کی حیوانیت کے نشہ کو جو جانے بہیم کی امداد درکار ہے۔ اے نافہم! تیرے اس نشہ کی آخری گھڑیاں کس قدر کٹھن ہوتی ہیں!!

ساتواں خط

دوست ناآشنا۔ تم کیوں اپنے دل کو دھوکہ دے رہے ہو۔ تمہارا دل بے لگام جا رہا ہے۔ تمہارا ادعائے عاشقی ساری فضا میں گونجتا ہے۔ گویا کہ تمہارے عشق اور میرے حسن کے سوا اس عالم میں کچھ بھی نہیں! یہی دو چیزیں حاصلِ کائنات ہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ تم پہلے آدمی ہو جو میرے ساتھ مبتلائے عشق ہوئے۔ جس نے سب سے پہلے حسن کی قربانگاہ پر اقرار عبودیت کیا۔ کبھی تمہیں سناؤں گی کہ میرے کیسے کیسے عاشقانِ جانباز ہر روز تشریف لاتے ہیں۔ جو عشق کی دوڑ میں تم سے کوسوں آگے جا رہے ہیں۔ بس فہرست میں تم اپنا نام بھی لکھ لو کافی ہے، اور کیا چاہتے ہو؟ مانا کہ تم عاشق صادق ہو۔ مگر خدا کے لئے یہ کیا زبردستی ہے کہ معشوق بھی بننا چاہتے ہو۔ کوئی چاہنے والا زبان سے نہیں کہتا۔ مگر چاہتے سب یہ ہیں کہ جس طرح وہ چاہتے ہیں اُن کو بھی چاہا جائے۔ آخر کیوں؟ معشوق کب آپ کو دعوت دیتا ہے کہ تشریف لائیے اور مجھے چاہنا شروع کیجئے۔ آپ چاہتے ہیں تو چاہئے۔ مگر یہ کیا منطق ہے کہ چونکہ آپ مبتلائے عشق ہیں، لہٰذا دوسرا بھی مبتلا ہو جائے۔ سنو، عزیز دوست، تمہاری سادہ لوحی مجھے عزیز ہے۔ محبت ایک کیف زندگی ہے، ناقابل بیان، اگر تم کو نصیب ہو تو تمہارا یہ ابتلا مبارک ہے۔ مگر مجھ سے فرمائشی محبت کی توقع کیوں ہے؟ گویا کہ تم نے مجھ سے کہا کہ مجھے چاہو، اور میں نے کہہ دیا کہ ہاں میں چاہتی ہوں! لیجئے، دو طرفہ عشق شروع ہوگیا! باورچی کی دوکان پر آپ کھانا کھانے گئے اور اُس سے کہا کہ تو کھا، اب اگر وہ صبح سے شام تک ہر کھانے والے کے ساتھ روٹی کھانے بیٹھ جایا کرے تو سخت بدہضمی کے سوا نتیجہ کیا ہوگا میں تو آج تک یہ بھی نہ سمجھی کہ آخر تمہیں وجہ شکایت کیا ہے۔ کیا میں آتی ہوں تو گھنٹوں تمہارے آغوش میں نہیں رہتی۔ تم مجھے پیار کرتے ہو تو کیا میں تمہیں پیار نہیں کرتی؟ تم حال دل بیان کرتے ہو تو کیا

میں نہیں سنتی؟ ساری مشکل یہ ہے کہ تم تانبے کو سونا سمجھ رہے ہو
تم سے کہتی ہوں کہ میں وہ نہیں جو تم سمجھنا چاہتے ہو۔ اور تم یقین نہیں
کرتے۔ اپنی گناہگار زندگی کو تمہارے سامنے عریاں پیش کرتی
ہوں اور تم آنکھیں بند کر لیتے ہو۔ اپنے وجود کے ناپاک دھبوں
کو دکھاتی ہوں اور تم نہیں دیکھتے۔ پھر مجھے اپنے اضطراب
بے محابا اور اپنی بے اختیاریوں سے پراگندہ خاطر کرتے ہو۔
تم طعنے دیتے ہو کہ تیرا دل سخت ہو گیا ہے۔ اور اس گناہ کی زندگی
میں تو بچیں ہو گئی ہے۔ تمہارے الفاظ خوب ہیں یعنی "اس
پھول نے جو باغوں میں بسا کا ہم نفس ہوتا ایک زہریلی زمین
میں پرورش پائی" تم غلط کہتے ہو۔ یہ پھول کا قصور ہے نہ زمین
کا۔ اُس نے تو ایسی ہی پرورش پائی جیسا کہ ہر پھول پاتا ہے۔
وہ تو اسی زمین میں پیدا ہوا جس میں ہر پھول پیدا ہوا کرتا ہے
لیکن کسی گلچیں نے اس کو سر شاخ سے چن کر گناہگاروں کے
گلے میں ڈال دیا کہ وہ اُن کی سیاہ مستیوں میں روندا جائے اور
کچلا جائے۔ دنیا بیباک اور سفاک موذیوں سے بھری ہوئی
تھی جن کا تمام تر وجود حیوانی عورت کا گلا گھونٹنے کے لئے ہر وقت
تیار رہتا ہے۔ ہماری، ہم عورتوں کی زندگی گویا کہ ہم دنیا میں
تمہاری آرائش اور اپنی آرائش کے لئے آئے تھے، تم، تم
مردوں نے تلخ کر دیا، برباد کر ڈالا۔ دنیا کی لاکھوں کروڑوں
عورتیں جن کو کارساز حقیقی نے گھروں کی رونق، دلوں کی روشنی
آشفتہ حال انسانوں کی راحت، دنیا کے تھکے ہوئے مسافروں کا
سہارا بنایا تھا۔ ان کو زندگی کی بدروؤں میں پھینکنے والے تم ہو! کیا
عورت کی فطرت گناہ کی متقاضی تھی؟ وہ کبھی گناہ کا تقاضہ
نہیں کرتی۔ لیکن ایک درندہ کی طرح مرد کا نفس ہر وقت اُسکی
گھات میں رہتا ہے۔ اور جب معصوم ہرنیاں بے خبر ہوتی
ہیں تو اُن پر اُس درندہ کا پنجہ گرتا ہے، پھر اُس فاختہ کی
طرح جو ابھی ابھی شاہین کے چنگل سے چوٹ کھا کر بھاگی ہو

خدا کی یہ مخلوق اپنے زخم کو چھپانا چاہتی ہے اور نہیں چھپا
سکتی۔ آخر رسوا ہوتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ اُس رسوائی کی عادی
ہو جاتی ہے۔ میں اُس دنیا میں ہوں جہاں ایسے زخم نصیب
بہت ہیں۔ بہت ہیں۔ تم اس دنیا میں ہو جہاں ایسے
ناکو بہت ہیں۔ بہت ہیں۔ اپنے دل سے نہیں پوچھ سکتے
تو ہم سے پوچھو کہ تم لوگ کیا کرتے ہو۔ تمہارے نفس کی تاخت و
تاراج کا زندہ نمونہ ہم ہیں۔ عورت کی فطرت معصوم ہے، تمہاری
فطرت گناہ سے لبریز ہے۔ میں تم سے پوچھتی ہوں تم ہی
ایمان سے بتاؤ کہ جب تم مجھے اپنے آغوش میں پاتے ہو تو اپنی
نفس پروری کے علاوہ کبھی میرے وجود نسوانی کی حقیقی ضرورت
کو بھی محسوس کرتے ہو۔ کبھی یہ بھی خیال آتا ہے کہ یہ کھلونا جس
سے تمہاری دولت کھیل رہی ہے، کھلونا نہ تھا، زندگی کی
ایک مقدس اور منقش تفسیر تھا۔ اگر تم نے اس کھلونے کو توڑ ڈالا
اگر تمہارے جبر نے اُس کا اختیار سب کر لیا تو کھلونے نے غریب
کا قصور کیا؟ اُس پر کیوں خفا ہوتے ہو۔ اُس کو کیوں طعنے دیتے
ہو؟ کتنی عورتیں ہیں جو اپنی زندگی میں خود مرد کی طرف گئی ہوں،
اپنا آغوش کھولے ہوئے گئی ہوں، حتی کہ وہ دوشیزہ جس نے
گناہ کی چار دیواری میں پرورش پائی ہو، وہ بدنصیب بھی، وہ
بے شرم بھی باوجود اپنی آلودگی کے آپکو دعوت نہیں دیتی کہ
آئیے اور میری فطرت کا گلا گھونٹ دیجئے! تم نے خود اُس کے
جسم کی قیمت مقرر کی۔ اور اُس کی روح کو دنیوی طاقت اور
سونے چاندی سے دبا ڈالا اور کچل دیا، جب تم میری طرف
دست طلب بڑھاتے ہو تو اپنے نفس لئیم سے یہ کیوں نہیں
پوچھتے کہ یہ عورت جو اپنی نسوانیت کا اعلیٰ ترین جوہر ندر کئے
دیتی ہے کبھی وہ بھی کسی گھر کا اُجالا ہوتی اور انسان کی ایک نسل
کو اپنی گود میں پالتی! آج شب کو وہ آپ کی بستر کی آرائش ہے
اور کل صبح منتظر ہے کہ آپ اُس کی طرف دیکھ کر ہاتھ اُٹھا دیں

پسند فرمائیں گے!...... حقیقت یہ ہے کہ مرد اپنے ضمیر کو سب دھوکے دیتا ہے، وہ اپنے گناہگار نفس کے مکروہ چہرہ کو بہت سے خوشنما رنگ و روغن سے چھپا لیتا ہے، اپنی ہوس کو عشق کہتا ہے، اس عشق کی قسمیں کھاتا ہے اور اپنے عقل و دماغ کو زبردستی ایک تند شراب پلا کر بیخود کر لیتا ہے، دوسروں سے کہتا ہے، دیکھو! میں مبتلائے عشق ہوں، میں فریب خوردہ حسن ہوں، میں مظلوم ہوں، اور میں ——— پاکباز ہوں! مگر یہ سارا ادعائے الفت ہوس پرستی کا ایک تماشہ ہے جو تم ہم کو دکھاتے ہو۔ خود بھی اس فریب نفس سے دھوکہ کھا جاتے ہو، ہم تمہاری درازدستیوں سے بچ نہیں سکتے، کاش کہ تم خود اپنے فریب سے محفوظ رہ سکتے! اپنی نفس پرست زندگی کا ایک لمحہ صرف کیجئے۔ اور میری اس گزارش پر غور فرمایئے!

تم مجھ سے فرمائش کرتے ہو کہ کچھ آپ بیتی سناؤں۔ وہ کہانی تمہارے لئے بے مزہ ہوگی۔ اپنی ہزاروں لاکھوں بدنصیب بہنوں کی طرح

میں ہوں اپنی شکست کی آواز!

ابھی نہیں! ابھی داستان عشق کے بیان کرنے سے کب فرصت ہے کہ میری کہانی سن سکو۔ میں زندگی کی ایک بگاڑی ہوئی تصویر ہوں جس کے لئے کہیں سے چشم عبرت لاؤ!

(باقی باقی)

ہدیۂ دل

بحضور حضرت باری

خفتہ تابندہ گہر اندر صدف وان صدف در سینۂ دریا نہاں
غوطہ زن خواہد کند آں را ہدف میرسد در قعر بحر بیکراں

گوہر تابندہ را باز آورد
تحفۂ در پیش سلطانے برد

می زنم من غوطہ در دریائے دل زانکہ آں بحر لیست دُر ہا در کنار
گوہر تابندہ دریائے دل می کنم نذرت شہ والا تبار

رب من، آقائے من، مولائے من
کن قبول ایں لؤلوئے لالائے من

عزیز احمد (کلیۂ جامعۂ عثمانیہ)

کچھ کا کچھ!

(از جناب رشید احمد صاحب صدیقی علیگ، مسلم یونیورسٹی علیگڑھ)

(ناظرین معاف فرمائیں اور ایڈیٹر صاحب نیرنگ خیال معافی مانگیں کہ موصوف کے بے پناہ تقاضے سے گھبرا کر لکھنا شروع کیا تھا اور لکھ گیا۔ اگر میرا اور ایڈیٹر صاحب کا یہی حال رہا تو ناظرین دیکھیں گے کہ ہم میں کون پاگل خانہ جاتا ہے اور کون جیل خانہ! خیریت یہ ہوئی کہ مضمون مکمل نہ ہو سکا ورنہ ناظرین کو شاید انتظار کی بھی زحمت نہ اٹھانی پڑتی)

عشاق اور انگریز۔ دو ہی قومیں ایسی ہیں جو تعزیرات ہند سے ڈرتی ہیں اور نہ میونسپلٹی سے۔ انگریز تو ممکن ہے ہوں نہ ڈرتے ہوں کہ تعزیرات ہند اور میونسپلٹی دونوں اُن کی "اُوروہ" ہیں اور ظاہر ہے عشاق یوں نہیں ڈرتے کہ رزق اور موت دونوں سے آزاد ہیں۔ انگریزوں کو آئی سی ایس نے خراب کیا اور عشاق کو شعرا نے۔ چنانچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ہندوستان کو شعرا اور آئی سی ایس کے اثر سے آزاد کر دیا جائے تو بہت ممکن ہے سوراج مل جائے۔ یعنے انگریزوں میں عشاق اور عشاق میں انگریز بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اس سے میرا مطلب صرف یہ ہے کہ انگریزوں کو مرض سے نجات ہو جائے گی اور عشاق گندگی اور نجاست سے محترز رہنے لگیں گے ◆

عشاق کی تاریخ کا پتہ لگانا نہایت دشوار ہے۔ انکی تفتیش اور تدارک نہ سائنس سے ممکن ہے اور نہ میونسپلٹی سے کسی چیز کا پتہ صرف تین ہستیاں لگا سکتی ہیں پولیس، پروفیسر، مولوی لیکن وقت یہ آن پڑی کہ پولیس نے تفتیش کرنے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ عشاق کا مسئلہ پولیس سے نہیں بلکہ محکمہ حفظان صحت سے تعلق رکھتا ہے، مولوی ہر چیز کی ابتدا بابا آدم اور جنت سے کرتا ہے، پروفیسر آکسفورڈ اور کیمبرج سے۔ رفع شر کی خاطر میں نے چاہا تھا کہ مولوی اور پروفیسر دونوں کے بابا آدم کو مشترک قرار دیدوں لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ آکسفورڈ اور کیمبرج میں بابا آدم اور جنت نہیں ملتے، دوسری طرف بابا آدم اور اُن کی جنت میں آکسفورڈ اور کیمبرج کا پتہ نہیں ◆

اس تحقیق و تفتیش کے دوران میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ کہنے لگے میں آپ کے بابا آدم سے واقف ہوں۔ ہم دونوں ہم وطن اور ہم مکتب تھے اور آپس میں نہایت دوستانہ تعلقات رکھتے تھے، بعض جی حضوریوں نے ہم میں اختلاف پیدا کرا دیا، اور اب اس اختلاف نے یہاں تک طوالت اختیار کر لی ہے کہ ایک طرف یونیورسٹیاں قائم کی جانے لگی ہیں۔ اور دوسری طرف ہم کو گالیاں دی جاتی ہیں۔ آپ کو شاید نہیں معلوم کہ مولوی اور پروفیسر دونوں کے بابا آدم کا ایک ثابت کرنا اتنا بعید یا عجب نہیں ہے جتنا مجھے اِن دونوں کا چچا قرار دینا۔ اجی آدم میرے بڑے بھائی تھے لیکن

نہایت سادہ لوح، ضدی اور جاہل، ذرا یہ کرشمہ بھی ملاحظہ فرمائیگا نہ بندوق اپنی، نہ نشانہ اپنا، نہ ارادہ اپنا، نہ مقصد اپنا، صرف اپنے کندھے پر رکھکر بندوق چھوڑ دالی۔ اور یہ نہ سمجھے کہ ان کی اس حرکت سے کتنا بڑا ہنگامہ برپا ہوگیا۔ اب جو کہتا ہوں میاں یہ کیا کیا تو کہتے ہیں ہم خلاصۂ کائنات ہیں۔ میں نے کہا اور پہلے ہولے فرمایا شیطان، میں نے کہا خوب، جنت باشد، یہ دنیا ہو جہاں مولوی اور پیر دفیلہ سے اور تعزیرات ہند اور ملیریا اور تو ہی بچوں سے پالا پڑیگا۔ یونیورسٹی میں تعلیم دیجائے گی۔ اسپتال میں اجابت ہوگی۔ ادا یا ہوا اور چوپائی پر بیویاں ملینگی، دفعہ ۱۴۴ میں چالان ہوگی۔ پیری گنیش آ نیمبر! جھلاکر بولے تو کیا فرق ہے، جہنم کا ایندھن بننے کا میں نے کہا، بھائی جان ایسی بات منہ سے نکالو، شاخ طوبیٰ پر لٹکنے والوں کو حق نہیں حاصل ہے کہ وہ جہنم کے ایندھن کا مضحکہ اڑائیں۔ میں تو خیر جہنم بردوش ہوں، آپ بھی تو اکسفورڈ بدا مال ہیں، تیس جہنم میں چلا جاؤ تنگا، آپ کیمبرج سے کبھی نکل سکیں گے یا نہیں؟ فرمایا استغفراللہ اب میری باری بھی میں نے کڑک کر بس بس یہی منہ سے نہ نکالنا نہ مولوی ہی معلوم ہوتے ہو۔ نہ سمجھتے ہو اور نہ سمجھنے دیتے ہو۔ اور کوئی سمجھاتا ہے تو الف ہوتے ہو۔ ارے میاں استغفراللہ کہنے کا تو وہ وقت تھا جب اپنوں سے سجدہ کرانے کی فرمائش کی گئی تھی، ایک اپنی خاطر ساری جماعت کی جگ ہنسائی کرائی۔ خلاصۂ کائنات، خلاصۂ کائنات یہ بھی کوئی تعلیمی ڈگری تھی۔ کہ جب تک کوئی دے نہ دے اس وقت تک قابلیت کا معیار ہی نہ متنبق ہو سکے، کیا خلاصۂ کائنات ہونے سے پہلے کچھ اور تھے۔ تمہارے اس بےمعنی دیکھا نہ استغفراللہ پر ان کو بھی ندامت ہوتی ہے جس کی پناہ پکڑنے پر اتنے دلیر ہو +

آپ اپنے کو جو جی چاہے کہہ لیجئے لیکن مسئلہ کی نوعیت فصل کھلاڑی کا پیسہ مداری کا سے آگے نہیں بڑھتی۔ کھیل کھیلنے پر آپ مجبور ہیں۔ کمال فن پر آپکو داد ملتی ہے اور آپ خوش ہیں سب آپ کا ہے۔ لیکن یہ آپ کی صریح اور اک تھوڑی سی متعدد گمراہی ہے۔ کمال آپ کا ہوتا تو آپ اپنے کمال کے اظہار پر اتنے جری نہ ہوتے۔ جتنا دوسروں کے کمال کا اعتراف کرنے پر مستعد۔

کچھ ترشرو ہوکر فرمایا۔ تو پھر گویا تیرے کمال کی داد دوں۔ میں نے کہا تمہارے داد دینے نہ دینے سے میری اہمیت میں کوئی فرق نہیں آتا تمہارا خلاصۂ کائنات ہونا دوزخ کے اندیشہ اور جنت کی ہوس پر منحصر ہے دوزخ اور جنت نہ رہے تو تمہارا اشرف المخلوقات ہونا معمل تر ہو جائے یہ تو بالکل ایسا ہے جیسا ہندوستان کا امن برطانوی اقتدار پر ہے۔ انسان ایک مقدس گمراہی میں مبتلا ہے جس کو وہ مذہب قرار دیتا ہے اور جس چیز کو وہ نہ سمجھتا ہے اور نہ سمجھنا چاہتا ہے اس کو مذہب کے حوالہ کر دیتا ہے۔ مذہب کو تم اپنے اور خدا کے درمیان ایک معاہدہ قرار دیتے ہو۔ حالانکہ وہ تمہارے اور خدا کے درمیان زیادہ سے زیادہ صرف ایک مفاہمہ ہے اور معاہمہ کے لئے فریقین کا ہم سطح ہونا ضروری نہیں ہے۔ تم نے خدا کی جو حیثیت تسلیم کرلی ہے، اس کے اعتبار سے تم کو فریق بننے کا اختیار بھی حاصل نہ ہونا چاہئے۔ اس اعتبار سے معاہدہ اور مفاہمہ دونوں بےمعنی الفاظ ہو جاتے ہیں۔ مذہب کی ابتدا انسان کی اوّلین اعترافِ شکست لئے ہوئے تھی، اور یہ گندم فروشی پر اس کا اظہارِ معذرت تھا +

تھوڑی دیر تک۔ تو ہمارے سادہ لوح برادرِ مکرم پیچ و تاب کھاتے رہے لیکن چونکہ ان کو اس کا یقین تھا کہ یہاں ان کی خوشی اور ناخوشی دونوں کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھیں، کچھ سنجیدہ بنے اور اس متفکرانہ لیکن بہ خود غلط طریقہ سے آمادہ گفتگو ہوئے۔ گویا کہ جو کچھ کہہ رہے تھے اس سے کہیں زیادہ ان کا علم ان کے ذہن و دماغ میں محفوظ تھا فرمایا انسان کا کسی چیز کا نہ سمجھنا انسان کی کمزوری کیوں ہو۔ انسان کوئی واقعہ یا اس واقعہ کو سمجھا یہ سب اپنی اپنی جگہ پر مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ انسان کسی چیز کو نہ بھی سمجھے پھر بھی وہ انسان ہے کسی انسان کا پیغمبر، جنرل، یا مصنف یا اس قبیل کی اور کوئی چیز نہ ہونا اس کے انسان بننے کے لئے ضروری نہیں ہے انسان بجائے تو محض انسان ہونیکا

ظرف حاصل کرسکتا ہے۔ میں نے اُن سے زیادہ استغنا کے ساتھ جواب دیا اور اس طور پر گویا وہ میری بات کو مہمل سمجھ کر بھی اس کو مہمل ثابت نہیں کرسکتے تھے میں نے کہا آپ کی دلیل تو ایسی ہی ہے جیسے سی آئی ڈی۔ ہر حال میں سی آئی ڈی ہی خواہ وہ جرم یا مجرم کا پتہ لگا سکے یا نہیں۔ فرمایا اور نہیں تو کیا۔ میں نے عرض کیا گویا انسان ہونا آپ کا پیشہ ہے کام نہیں! یہ جملہ ان حضرت کے ظرف کی ساری وسعت پر محیط ہو کر چھلک گیا۔ سنتے ہی جہالت پر اُتر آئے کہنے لگے بدمعاش اب ذاتیات پر اُتر آیا۔ ابھی تو سی آئی ڈی پر دانت لگے ہوئے تھا۔ اب میں دیکھتا ہوں تیرا دوسرا وار آئی سی ایس پر ہوگا۔ غدار کہیں کا۔ میں نے کہا سی آئی ڈی کے جواز میں کوئی دلیل نہیں پیش کرسکتے تو تم آئی سی ایس کی کب تک خیر منا سکو گے۔ جس سے معاشرت کا بار نہ اُٹھایا جا سکے گا۔ جب کا جوا کیوں گلے میں ڈالے اور پھر سی آئی ڈی اور آئی سی ایس کی تفریق کیوں کرتے ہو۔ فرق تو خان بہادری اور جیلخانہ کا ہے۔ آپ مجھے غدار کہتے ہیں۔ غدار اُسے کہتے ہیں جس نے غدار ہونے یا نہ ہونے کی ذمہ داری لی ہو۔ میں غدار نہ ہوتا تو تم خلاصۂ کائنات کیسے ہوتے لیکن بھائی جان انصاف کیجئے۔ اس کائنات کا جس کا تم خلاصہ قرار دیئے گئے ہو اولیں غدار کون ہے تم یا میں؟ تم مسجود بنائے گئے اور میں مردود۔ لیکن کس بنا پر۔ تم کہو گے مشیت ہی یہی تھی۔ میں کہتا ہوں مشیت الٰہی کو سمجھے نہیں اور یہی نہیں بلکہ تم میں اس کے سمجھنے کی اہلیت ہی نہیں تھی اس لئے کہ خود غرض بھی تھے اور احمق بھی۔ خود غرض یوں کہ تم نے غور تو کیا ہوتا۔ تم میں مسجود ہونے کی کون سی بات تھی کسی کے کہہ دینے سے تم اس منصب کے اہل کب ہوگئے اور احمق یوں کہ سمجھتے تھے کہ دوسرے بھی احمق ہیں۔ بہرحال تم نے خود غرضی اور حماقت سے خان بہادری حاصل کرلی۔ میں نے تم کو سجدہ کرنا تمہارے پیدا کرنے والے کی توہین سمجھی لیکن تم اسکے سوا کر ہی کیا سکتے تھے۔ تمہاری تخلیق کا بنیادی اصول ہی کمزور تھا آستانہ پہلے سے موجود تھا پھر آخر جبیں کہاں سے لائی جاتی وہ تم نے پیش کردی۔ کرنے کو تو فرشتوں نے سجدہ کیا اور تم کو کیا لیکن ایسے آستانہ کی محرومی بھی قابل رحم ہے جو جبینوں کا محتاج ہو۔ میں نے سجدہ کرنے سے انکار کردیا۔ تم اس حقیقت کو کبھی نہ سمجھ سکو گے کہ میرے انکار نے تمہارے خدا کی بہترین صفت اور پوشیدہ ترین راز کو برافگندہ نقاب کردیا۔ میاں آدم نے تو آئینہ کو صیقل کردیا تھا انکار ابلیس نے ان کو شگفتہ بنا دیا۔ انکار ابلیس ایک آئینہ تھا جس میں حقیقت نے پہلی بار حقیقت کو پہچانا۔ لیکن آپ تو ظلوم و جہول قرار دیئے گئے ہیں۔ یہ باتیں کب آپکے ذہن میں آئینگی۔ اچھا یہ سب جانے دیجئے آخر یہ کیوں لازم آتا ہے کہ جبتک کوئی سجدہ نہ کرے اس وقت تک معقول نہ ہو اور جب تک کوئی مسجود نہ ہولے اس وقت تک وہ مقتدر نہیں ہوسکتا۔ میرے سجدہ نہ کرنے سے آپ اشرف المخلوقات کیوں ہوگئے۔ اگر آپکا اشرف المخلوقات ہونا محض اس بنا پر ہے کہ میں مردود ہوں تو آپ کی حالت یقینی قابل رحم ہے اور میرا سجدہ نہ کرنا میرے لئے انتہائی فخر۔ آپ کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ آپ نے اپنا بُرا یا بھلا ہونا دوسروں کے بُرے یا بھلے ہونے پر منحصر رکھا ہے

اخی آدم اب گھبرائے کہنے لگے بھائی ان کو نہیں پکڑتا جس کا یہ سب کھیل ہے۔ آخر یہ اتنی دیر سے مجھی سے کیوں اُلجھا ہوا ہے۔ اخی آدم کی یہ معقول اور ناگزیر پسپائی مجھے پسند آئی۔ میں نے کہا، ذرا قریب آؤ کان میں کہنے کی بات ہے۔ کوئی مولوی نہ سُن لے۔ ورنہ میری اور تمہاری دونوں کی خیر نہیں۔ مجھے تعلیم یافتہ اور تم کو شیطان قرار دیدیگا۔ اخی آدم کے تیور کچھ بدلنے لگے تھے کہ میں نے فوراً کہا بھائی جان اچھی بات ہے۔ میں نہیں آپ ہی تعلیم یافتہ سہی، اتنا سُنکر اس طور پر مسکرائے اور ساتھ ہی ساتھ اظہار انکسار فرمایا جیسے کوئی مبتدی شاعر اپنے کلام کی داد پر اظہار فروتنی کرتا ہو۔

دور دادو دینے والے کو اس حرکت پر خجالت بھی آئے اور غصہ بھی۔ بہرحال اب اخی آدم انتہائی خلوص اور اعتقاد کے ساتھ میری بات سننے کے لئے آمادہ ہوئے۔ مجھے خیال آیا کہ ہندوستان میں سوراج اور تعلیم یافتہ بیویوں کے ہنگامہ سے کسے کب فرصت ہو۔ آ! جو کچھ کہنا ہے ان سے کہدوں۔ آدمی معقول معلوم ہوتے ہیں۔ مریض، مفلس ہیں متعدد بچے اور ایک ہی بیوی ہے ممکن ہے راہ راست پر آجائیں۔ اور بقول شخصے ممکن ہے کسی ایسے سے سابقہ پڑتا جو خود جاہل ہوتے اور بیوی پردہ نہ کرتی ہوتیں۔ یا جس کے ڈرائنگ روم میں آتشدان پر ادھر اُدھر گلدان اور بیچ میں ننگی تصویر رکھی ہوتی۔ چنانچہ میں نے کہنا شروع کیا:۔

"سنو حقیقت یہ ہے انسانیت مکمل نہیں ہے اور نہ مکمل ہو سکتی ہے۔ یہ تمام کائنات عالم **منشار الٰہی اور قدرت الٰہی** کی ابدی اور مسلسل کشمکش تفوق کا نتیجہ ہے۔ خدا! سب سے بڑا "آئیڈیلیسٹ" ہے۔ اور تم جانتے ہو آئیڈیلیسٹ کی سب سے بڑی محرو۔۔۔۔۔"

"اللہ اکبر! اللہ اکبر! اللہ اکبر اللہ اکبر" پاس کی ایک بوسیدہ مسجد سے تکبیر اذان بلند ہوئی۔ اور پھر کچھ نہ سنائی دیا کہ "اخی آدم" اور ابلیس کے مکالمہ یا مجادلہ کا کیا انجام ہوا؟

رشید احمد صدیقی

حقیقتِ عُریاں

اسی انداز پر جاری رہی جو گمرہی میری — نئی اک راہ پیدا ہوسکیگی راہِ منزل سے

یہی دیر و حرم گر منزلِ مقصود تھے میرے — بہت اچھا ہوا آگے نکل آیا ہوں منزل سے

کئی کانٹے الجھتے زندگی برباد ہو جاتی — گذاری ہے مگر دامن بچا کے سخت مشکل سے

موافق بھی چلی گاہے ہوا تو وائے ناکامی — سفینہ جا پڑا گرداب میں ٹکرا کے ساحل سے

نہیں آتی مجھے راتوں کو نیند اکثر نہیں آتی — گزر جاتی ہیں گھڑیاں مشورے کرتے ہوئے دل سے

تلاشِ مدعا ہے بھاگتا ہوں مضطرب ہو کر — کبھی صحرا سے محفل کو کبھی صحرا کو محفل سے

حقیقت کو سمجھ لوں تو کچھ مشکل نہیں لیکن
نگاہیں پار بھی ہوں اشک پردہ ہائے حائل سے

اشک خلیلی

عرب شہسوار

(از حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ العالی)

وہ دیکھو سامنے گھوڑے پر سوار، ایک عرب شہسوار کھڑا ہے۔ کندھے پر بندوق ہے۔ ہاتھ میں ایک باز ہے سر پر عربی رومال ہے۔ آنکھیں ہاتھ کے باز کی طرح چھوٹی چھوٹی ہیں مگر تیز ہیں شکار کو دور سے دیکھ لیتی ہیں۔ سینہ پر کارتوسوں کی پیٹیاں ہیں۔ پاؤں میں عربی چپل ہے +

یہ کون ہے؟ اور اس کے ہاتھ پر باز کیوں ہے؟ اور اس کے سر کا رومال پراگندہ سا کیوں ہوگیا ہے؟ اور اس کے سینہ پر کارتوسوں کی پیٹیاں کس غرض سے بندھی ہوئی ہیں؟ اور اس کے گھوڑے کی شکل کیسی ہے؟

سنو اس کی کمر پر جو بندوق ہے وہ ایک نالی معلوم ہوتی ہے۔ اس وقت پشت پر ہے لیکن یہ اکثر عرب کے سینہ سے لگتی ہے۔ اور یہ ہمیشہ اس کو سینہ سے لگا کر شکار کرتا ہے۔ بندوق کی ایک نال اس کی آنکھ ہے اور بڑی ہی غیور ہے۔ اسکی شرم گوارا نہیں کرتی کہ کوئی اس کو شہسوار کی چھاتی سے لگا ہوا دیکھے۔ انسان ہو یا انسان جب اس کی طرف دیکھتا ہے کہ بندوق کس کی چھاتی سے لگی ہوئی ہے تو یہ زور سے گرجتی ہے اور ایک گولی دیکھنے والے کی طرف پھینکتی ہے۔ اور اسکو مار ڈالتی ہے۔ تاکہ راز کا افشا نہ ہو۔ اس کے سینہ پر جو کارتوس ہیں وہ ان موتیوں اور ہیروں اور سب جواہرات سے اعلیٰ ہیں جن کو عورتیں گلے کا ہار بناتی ہیں۔ یا ہندوستان کے عورت نما رئیس پہنتے ہیں +

عرب سپاہی انہی کارتوسوں سے جواہرات پر قبضہ کرتا ہے۔ اس واسطے کارتوس ہی اس کا سب سے بڑا زیور ہیں۔ اور انہی کارتوسوں سے اس سپاہی کی زیبائش ہے +

ہاتھ پر ایک باز ہے۔ سب پرندوں کا سردار اور شکاری کیا خوب تماشہ ہے شکاری کی آنکھیں شکاری بلپٹ شکاری سینہ شکاری۔ ہاتھ شکاری۔ پاؤں شکاری۔ گھوڑا شکاری۔ اور ہاتھ پر بیٹھا ہوا پرندہ بھی شکاری۔ اس کا گھوڑا جب دوڑتا ہے۔ اور اس کے آہنی نعل پتھروں سے ٹکراتے ہیں تو شعلے برساتے ہیں اور قرآن مجید اس منظر کی قسمیں کھاتا ہے۔ دیکھنا! اس گھوڑے کی پیشانی پر سفید صراحی ہے اور اس میں لکھا ہے کہ زندگی اور ترقی کی شراب اسی صراحی کے اندر ہے۔ عرب سپاہی پا بہ رکاب ہے۔ گھوڑے پر سوار ہے اور پاؤں رکاب میں ہیں اور تم سے کہہ رہا ہے کہ تم دست بہ ٹکٹ ہو کر روپے دیتے ہو۔ ریل کے ٹکٹ خریدتے ہو اور انجن والوں کے محتاج بن کر ایسی سواری میں بیٹھتے ہو جس کی لگام تمہارے ہاتھ میں نہیں ہوتی اور اسی واسطے دہلی کے پاس ریل ٹکرا جاتی ہے اور تم مر جاتے ہو +

ذرا یہ بھی تو دیکھو! یہ شہسوار کیا چپ چاپ کھڑا ہے کچھ سوچ رہا ہے۔ شاید کچھ سن رہا ہے۔ فلسطین کی خبریں اس کے کان میں آتی ہونگی اور یہ خیال کر رہا ہوگا۔ کہ جنگلی جانوروں کا شکار ختم کرو۔ چلو! وطن چلو!! اور یہودی تحریک کے اژدہے سے اپنے مقدس وطن کو بچاؤ۔ ورنہ اژدہا وطن کو نگل جائیگا +

اب کچھ دیر نہیں۔ عرب نے ارادہ کرلیا۔ اب دیکھنا یہ بڑا۔ اب دیکھنا اس کے گھوڑے نے ہوا سے باتیں کیں۔ اب دیکھنا کوئی دم میں موافق خبر آ جائیگی۔ اور اس شہ سوار کی عجیب وغریب باتیں سنائینگی۔ سلام علیکم بس سوار ہم تو یہاں لحاف اوڑھے بیٹھے ہیں۔ تم جاؤ اس سردی میں لڑو۔ ہم تو یونہی لحاف میں بیٹھے بیٹھے باتیں بنالیا کرتے ہیں ●

حسن نظامی

یکم فروری ۱۹۲۰ء

نوائے حزیں

بر آسکے کیا تمنا، رنجور عاشقی ہوں — حسرت کا ہے تسلط، نخچیر بے کسی ہوں

وقف غم والم ہوں - بیگانۂ کرم ہوں

محروم بیش وکم ہوں

بھرتا ہوں سرد آہیں، رہ رہ کے خامشی سے

واقف نہیں ہوں اب تک میں لطف زندگی سے

واعظ کو ہے تنفر، پیر مغاں سے ہے دشمن — اپنے سے خود خفا ہوں سارا جہاں ہے دشمن

حرماں نصیب پاکے سب ہاتھ کھینچ بیٹھے

مجھ کشتۂ وفا سے

صحرائے عاشقی میں، تنہا پڑا ہوا ہوں

رخصت ہوئیں امیدیں، میں ان کا نقش پا ہوں

کیوں طعنہ زن ہے ہمدم کیا پوچھتا ہے کیا ہے — کرتا ہوں ضبط جتنا اتنا ہی بڑھ رہا ہے

یہ زخم جانگزا ہے - یہ درد لا دوا ہے

ہر درد کی دوا ہے

ہے موت اس سے بہتر یہ زندگی نہیں ہے

میں ہوں سبھی کا لیکن میرا کوئی نہیں ہے

مشکل عجیب پڑی ہے، عقدہ کشا ہے کوئی — آئی ہے جان لب پر، معجز نما ہے کوئی

گلشن کا پتہ پتہ - صحرا کا ذرہ ذرہ

شاہد ہے ابتری کا

نیرنگیٔ فلک پر، رو رو کے تھک گیا ہوں

مجبور ہو کے دل پر، الزام دھر رہا ہوں

شیخ افتخار علی فلک

شملہ میں عید

(حضرت آغا حیدر حسن دہلوی ایم۔ آر۔ اے۔ ایس لندن کے قلم سے)

آج اُنتیس تھی عید کا چاند ہمارے ہاں سے دکھائی نہ دے سکتا تھا۔ آدمی بھیجے کہ چاند جاکر دیکھ آئیں۔ لیکن چاند نہ دکھائی دیا۔ آپا جان نے کہا کہ میں اجلی چاندنی بچھوا دوں صبح عید ہوگئی تو فرش کی آٹھا پٹخی میں بڑی دقت ہوگی۔ اور جو نہ ہوئی تو پرسوں تک آدمیوں کے ننگے پیروں اور اللہ رکھے ان سب کے جوتوں سے میلی چوپٹ ہو جائے گی۔ میں نے کہا۔ آپا جان چاندنی کے بچھوانے میں کون سے ہاتھی گھوڑے لگیں گے۔ دم بھر میں آدمی بچھوا دیں گے۔ اور دو تین گھنٹے میں معلوم ہو جائیگا کہ عید کل ہے یا نہیں۔ کیونکہ دلی سے رویت ہلال کا تار ضرور آئیگا۔ بڑی رات گئے چاند کی خبر کا انتظار رہا لیکن کوئی خبر نہ آئی۔ صبح جمعہ تھا الوداع کی نماز اس سے پہلے جمعہ کو ہو چکی تھی میں نے کہا کہ عید اب کے بڑھیا ہوگی۔ ایک روزہ اللہ میاں نے اور رکھوایا۔ جمعہ کو روزہ رکھا۔ سارا دن یونہی گذر گیا۔ کوئی خاص بات قابل ذکر نہ ہوئی۔ تاش بھی نہ کھیلے کہ روزہ مکروہ ہوگا۔ سارے دن میری طبیعت بالکل صاف رہی۔ یہ دن کی دکھن بھی نہ رہی تھی کہ آج ابر کے ٹکڑے آسمان پر آتے جاتے نظر آتے تھے۔ اس لئے چاند دکھائی دینے کی کوئی امید نہ تھی۔ لیکن ہفتہ کی عید یقینی تھی۔ شام کو روزہ کھولنے کے بعد گھر کی صفائی شروع کی۔ ہر چیز کی خوب اچھی طرح جھاڑ پونچھ کی۔ میلی چاندنی اٹھوائی۔ اجلی براق بچھوائی۔ مہندی صبح عید تھی اس لئے نہ لگائی کہ اکثر باہر نکلنا ہوتا ہے۔ لال لال ہاتھ کچھ اچھے نہ معلوم ہوں گے بڑی شرم آئیگی ۔

منیاری یہاں کہاں سے بلوا سکتے جو چوڑیاں پہنتے ساتھ جاپانی ریشمی چوڑیاں نہیں۔ وہی پانچ پانچ ہاتھوں میں ڈال لیں۔ عید کی جیسی خوشی چھٹ پن میں ہوتی تھی کہ مارے خوشی کے نیند اُڑ جاتی اور صبح سویرے اندھیرے منہ اٹھ بیٹھتی۔ اب معلوم بھی نہ ہوئی کہ صبح عید ہے۔ ایک تو دل مرے ہوئے پہلے ہی تھے۔ اب مسلمانوں کی عام حالت نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ عید خوشی خوشی منائی جائے۔ مارے وہم کے سب نے کپڑے بدل لئے کہ اللہ سب جانوں کی خیر رکھے۔ اور پھر ہفتہ کی عید ہی کیا۔ ڈومنیوں کے لئے جی پھڑکتا رہا کہ جب تک وہ عید کا شادیانہ نہ گائیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ عید ہوئی۔ اب دل دلی میں پہنچ گیا۔ اور عید کی بہار یاد آئی کہ ڈومنیوں کا غول ہزاروں دعائیں دیتا گھسا چلا آتا ہے۔ کانوں میں پھولوں کی بالیاں ہیں عطر ملے ہیں۔ پان کلے میں دبائے۔ لاکھی جوڑے ٹھمکاتے گھسٹر گھسٹر کرتی چلی آتی ہیں۔ اللہ رسول کی امان۔ پنجتن پاک کا سایہ دوست آباد دشمن پائمال۔ شادیوں کی گھڑیاں آئیں گھڑی گھڑی کی بلائیں دو۔ ہم آئیں حکیم نہ آئیں۔ ایک عید پہ ہزاروں اور نصیب ہماری دعا ہو۔ صاحبزادوں کی جوڑیاں بنی رہیں۔ سونے کے سہروں بیاہ ہو۔ یہ کہتی ڈیوڑھی سے گھسیں آداب بجالا، دعائیں دیتی سامنے بیٹھ گئیں۔ سارنگی کے کان مروڑ ڈھول شروع کی اور سب نے مل کر عید مبارک باشد۔ عید مبارک باشد الاپنا شروع کیا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گاتیں بجاتیں۔ عید کا انعام لیکر رخصت ہوئیں۔ باہر فقیر چلا رہے ہیں۔ مالی ڈالیاں لا رہے

ہیں پکوڑی والی طرح طرح کی مٹھائیاں خستہ کچوریاں۔ بھوڑیاں املی ڈال سیوں لئے چلی آتی ہے۔ تیسرے پہر کاچھن جوتی کے چمکدار پھلوں سے چھبڑا بھرے چلی آتی ہے۔ آئی سلام کیا۔ عید کی مبارکباد دی اور کیا لو بنانے بیٹھ گئی۔ سب اُس کے چھبے کو گھیر بیٹھ گئے۔ کوئی آلو کے بنوا تا ہے کسی کی رال امرود کے کچالوؤں پہ ٹپکی کسی کے منہ میں کمرک دیکھ پانی بھر آیا کسی کو کیلے کے کچالوؤں پہ رغبت آئی چاروں طرف سے یہی پکار ہے "کھمو! پہلے مجھے بنا دے"۔ وہ تگوڑی پولائی جاتی ہے، چھوکریاں چوطرف سے نرغہ ڈالے ہیں۔ آنکھ بچی اور چھبے میں ہاتھ ڈال چیز اُڑا لی۔ وہ کن انکھیوں سے سب کی طرف دیکھتی جاتی ہے اور وہ نیلے نیلے دیدے بدل جوتی پر غراتی ہے۔ نزدیک بیٹھی ہوئی بڑی بوڑھی سے شکایت کرتی ہو وہ کہتی ہے کہ "نگوڑیوں برس کے برس دن چوری سے باز آؤ۔ وہ بات بناتی ہیں "اوئی دیکھنے کو اُٹھایا تھا اُس کی نیت میں بل ہے خواہ مخواہ چوری کا اوروں پر گمان کرتی ہے"۔ ایک نے سودا لے رو کھن پہ تکرار کی کاچھن سے خالہ پھپی کا رشتہ بڑا ہے اڑ اڑ کر مانگتی ہے۔ وہ گھرکتی جاتی ہے اور سبک سبک دیتی جاتی ہے۔ ایک نے باتوں میں لگایا دوسرے نے کوئی پھل اُڑایا کاچھن بڑی کائیاں ہے۔ کہتی ہے "دیکھو اس کی سند نہیں اپنے اللہ کے ہاں دینہ دار رہیگی"۔ اُس نے جھٹ بات بنا فوراً ڈال دیا "اے ہے میں تو دیکھتی تھی کہ دیکھوں خالہ کتنی ہشیار ہے اوئی صدقے کی تھی کوئی چرانے کی نیت تھوڑی تھی"۔

کاچھن گئی کو ابن آئی تبی کی تھالکیاں تو تنک چڑے مچھلی کے کباب۔ قلمی بڑے تکے گولے کے کباب گولیاں، کلیجی کے کباب لائی۔ سویوں کی مٹھاس سے جی بھرا ہوا سلونے چیز پہ دل چلا، اُس سے مول لے کھایا، اتنے میں دہی بڑے والی جل جیرے کے بتاسے، چھوارے کی چاٹ پکوڑیاں دہی بڑے۔ میوے کی منگوچیاں سونٹھ پانی، سترنگی چٹنی صاف صاف کنڈالیوں میں بھری گھٹری میں دھری لئے چلی آتی ہے۔ آن بیٹھ گئی۔ چٹوؤں کی للودوں چاٹ کی چٹ پٹاہٹ پرم۔ و ت مارا ساری جیب چٹوروں کی نذر کی۔ شام تک چاٹ چوٹ ہاتھ جھاڑ جھوڑ کے بیٹھ گئیں۔ شام کو مالن گجرے کنٹھے پھولوں کی بالیاں بندوں کے دونے لئے چلی آتی ہے۔ سب نے پھول پہنے مالن انعام لے رخصت ہوئی۔ کن. جن آئی، عطر دے اپنا حق لے گئی۔ منہیاری عید سے ایک دن پہلے آئی۔ چوڑیاں پہنائیں۔ چوڑیاں پہن آ کے سلام کیا اُس نے ہزاروں دعائیں دیں۔ "بیوی عمر دراز، برخوردار بھائی جئیں، ہاتھی نشین ہمت لشیں، سونے کے سہرے سے بیاہ ہوئے اُس سے کہ "فہمن صبح آئیو یا اپنی بہو کو بھیجیو۔ میں اُس کے ہاتھ تیری عیدی بھجوادوں گی۔ وہ سلام کر دعائیں دیتی رخصت ہوئی۔ رشتہ کنبہ داروں میل ملاپیوں کے ہاں سے عید کے حصے چلے آتے ہیں۔ کچی سویاں، چھوار ورقن کی چاروں طرف سے مار ہے۔ دائی جنائی آئی۔ کھلونے مٹھائی بچوں کے لئے لائی۔ اپنا انعام لے رخصت ہوئی۔ یا اگر چارکا بھجوایا تو پھر کسی آدمی کے ہاتھ اُس کا انعام بھجوادیا۔ نوکریں، مامائیں انائیں لوکریاں لا رہی ہیں انعام پا رہی ہیں۔ کوئی بچہ جھم جھم کے کپڑے پہنے اترا اشراتا چلا جاتا ہے کوئی لڑکی چھم چھم کرتی بھاگتی ادھر سے اُدھر چلی گئی۔ کوئی پائنچے سنبھالتی کچوریاں کھاکر گلی کوچے چلی۔ کوئی کھڑی چٹکی دھو رہی ہے۔ کوئی بچہ پیپا بجاتا چلا جارہا ہے۔ کوئی سیٹی بجا رہا ہے۔ ایک چلا رہا ہے "بھائی آپا ہماری عیدی دلواؤ"۔ کوئی مہین دبی ہوئی آواز میں کہتی ہے کہ "نانی بی میری عیدی" حلال خوری دروازے کے پاس کو لے سے لگی ہل کھا اٹھلا کے کہہ رہی ہے "دروغن بیوی میری سویاں"، چوکیدار جگائی کا انعام مانگ رہا ہے۔ لڑکے گڈیاں اُڑا رہے ہیں" وہ کاٹا۔ وہ کاٹا" کے غل کے سوا کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ ایک ہے کہ چلاتا ہے وہ بھگایا "پیری ہے بے" دوسرا چلاتا ہے "دیکھ بچ

اچم کی سمجھ نہیں۔ ڈھیل کی ہے۔ ایک پیچ رہا ہے "وہ تھوا بیا! ڈھیل چل پہ اتر آیا" وہ کہتا ہے "بیٹا! ابھی تو دو مرچل بڑھا رہے تھے۔ اپنے باوا کی بٹی کم تاوا لوٹ کے ادوانی تو اترا گئے" بچے ڈورے لوٹتے پھر رہے ہیں۔ چھتوں پہ ایک وسا چوکڑی مچی ہوئی ہے۔ آسمان پہ رنگ برنگ کی شکلیں آدمی اژدہے اڑ رہے ہیں۔ طرح طرح کی گڈیاں بڑھ رہی ہیں۔ کوئی بھیڑیا ہے۔ کوئی چڑا۔ کوئی کانو تو کوئی ستک پارے کی۔ کوئی چوکنی ہے تو کوئی چپ۔ کوئی پری ہے تو کوئی الفن۔ کوئی چاند ہے تو کوئی لال پیلی، گنڈے، پیل منجولے آدھے، پونے اور تارے اُڑ رہے ہیں۔ بگلا دم، چوگدم پیچ لڑ رہے ہیں۔ لونڈے لمبی لمبی جھڑیاں لئے لوٹتے گالی گلوچ کرتے پھر رہے ہیں۔ اودھم مچا ہوا ہے۔ ہائے دلی کے کیا کہنے۔ مجھے چاند اس پیاری کا خیال آیا۔ میں ایک طلسمی دنیا میں گئی۔ وہ وہ مضمون سوجھتے ہیں کہ دفتر کے دفتر لکھتی چلی جاؤں اور سیری نہ ہو۔ گڈیوں کے نام لکھوانے میں مجھے بڑی مدد میاں مسعود حسن خاں نے دی۔ انہیں پتنگ بازی کی بہت ہے۔ اللہ رکھے سب مرد عید کی نماز کو کسی پاس ہی کی مسجد میں چلے گئے۔ وہاں سے واپس آئے تو اماں جان اور آپا جان کو سب نے آداب کیا۔ انہوں نے دعائیں دیں اور عیدیاں دیں۔ عطر پان دیا۔ سب بیٹھے۔ اتنے میں ہم سب نے کپڑے بدلے۔ انہوں نے اور میں نے اپنے حجرے میں اماں جان کو عید کی نذر دی۔ کیونکہ ان کے ہاں کا دستور ہے کہ سب چھوٹے خاندان کے بزرگ کو نذریں پیش کرتے ہیں۔ یہاں اماں جان سے بڑا کوئی بھی نہ تھا۔ اس لئے ہم دونوں نے اپنے پانچ پانچ روپے رومال پر رکھ کر پیش کئے۔

انہوں نے ہاتھ لگا کر روپئے چھوڑ دیئے اور ہمیں جیبوں ہی میں دی۔ ہم سب آپا جان کے حجرے میں آ آداب کر بیٹھ گئے اتنے میں مجھے سارنگی کی آواز آئی۔ میں لپک کر برآمدے میں آئی دیکھا تو ایک پنجابی سارنگی بجا رہا ہے۔ یہاں شبّن کا خدمتگار ایک لڑکا شکور ہے۔ اس سے کہا "اسے بلا" اس نے آواز دی۔ وہ آن پردے کی آڑ میں بیٹھ گیا۔ ہم سب حجرے میں بیٹھے رہے۔ اس سے کہا کہ گا۔ اس نے اردو غزلوں کی مانگ توڑی کہ ہم نے مجبوراً کہا کہ اس سے کہو کہ پنجابی کوئی چیز سنائے۔ اس نے گائی۔ بیچارہ آواز سے لاچار تھا۔ غرض ایک روپیہ دیکر اسے رخصت کیا۔

آپا جان نے آج عید کی وجہ سے شیر خورمہ، میٹھے سلونے برتماڑ، سموسے، الفنس پارے، فیرینی، شامی کباب، سری، ہری مرچوں کا دلمہ، ولایتی بینگن اور مٹر کا سالن پکوایا۔ کھانا کھانے سے پہلے ہونی شدنی ممتاز خاں کو اختلاج کا دورہ پڑا۔ آپا جان بہت گھبرائیں۔ ان کی بہن محمد زمانی بیگم بہت پریشان ہوئیں۔ اللہ رکھے دونوں بھائی اور تینوں بہنیں، اماں جان، وہ اور میں۔ غرض ہم سب کے سب ان کے حجرے میں جا کے بیٹھے میاں شبّن عجیب چاپ لیٹے تھے۔ ہاتھ دل پر دھرا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ہاتھ پاؤں بالکل ٹھنڈے برف۔ سب نے ہاتھ پاؤں سہلاتے۔ گلاب پلایا، خمیرہ مروارید چٹایا۔ اس سے زیادتی میں کمی ہوئی۔ لیکن کھانا ٹھنڈا مٹی ہو کر بے حلاوت ہو گیا۔

آغا حیدر حسن دہلوی

بائیسکل

(از پطرس)

ایک دن مرزا صاحب اور میں برآمدے میں ساتھ ساتھ کرسیاں ڈالے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جب دوستی بہت پرانی ہو جائے تو گفتگو کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور دو دوست ایک دوسرے کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہی حالت ہماری تھی۔ ہم دونوں اپنے اپنے خیالات میں غرق تھے۔ مرزا صاحب تو خدا جانے کیا سوچ رہے تھے۔ لیکن میں زمانہ کی ناسازگاری پر غور کر رہا تھا۔ دور سڑک پر تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک موٹر کار گزر جاتی تھی۔ میری طبیعت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے۔ کہ میں جب کبھی کسی کی موٹر کار کو دیکھوں۔ مجھے زمانے کی ناسازگاری کا خیال ضرور ستانے لگتا ہے۔ اور میں کوئی ایسی ترکیب سوچنے لگ جاتا ہوں جس سے دنیا کی تمام دولت سب انسانوں میں برابر برابر تقسیم کی جا سکے۔ اگر میں سڑک پر پیدل جا رہا ہوں اور کوئی موٹر اس ادا سے گزر جائے۔ کہ گرد و غبار میرے پھیپھڑوں، میرے دماغ، میرے معدے اور میری تلی تک پہنچ جائے۔ تو اس دن میں گھر آ کر علم کیمیا کی وہ کتاب نکال لیتا ہوں۔ جو میں نے ایف اے میں پڑھی تھی۔ اور اس غرض سے اس کا مطالعہ کرنے لگ جاتا ہوں کہ شاید بم بنانے کا کوئی نسخہ ہاتھ آ جائے۔

میں کچھ دیر تک آہیں بھرتا رہا۔ مرزا صاحب نے کچھ توجہ نہ کی۔ آخر میں نے خاموشی کو توڑا۔ اور مرزا سے مخاطب ہو کر بولا

"مرزا۔ ہم میں اور حیوانوں میں کیا فرق ہے؟"

مرزا صاحب بولے "بھئی کچھ ہو گا ہی آخر"۔

میں نے کہا "میں بتاؤں تمہیں؟"

کہنے لگے "بولو"۔

میں نے کہا "کوئی فرق نہیں۔ سنتے ہو مرزا؟ کوئی فرق نہیں ہم میں اور حیوانوں میں — کم از کم مجھ میں اور حیوانوں میں کوئی فرق نہیں! ہاں۔ ہاں میں جانتا ہوں تم مین میخ نکالنے میں بڑے طاق ہو کہو گے حیوان جگالی کرتے ہیں۔ تم جگالی نہیں کرتے ان کے دُم ہوتی ہے۔ تمہاری دُم نہیں۔ لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ ان سے تو صرف یہی ثابت ہوتا ہے۔ کہ وہ مجھ سے افضل ہیں لیکن ایک بات میں میں اور وہ بالکل برابر ہیں وہ بھی پیدل چلتے ہیں۔ میں بھی پیدل چلتا ہوں۔ اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟ جواب نہیں۔ کچھ ہے تو کہو۔ بس چپ ہو جاؤ۔ تم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جب سے میں پیدا ہوا ہوں اس دن سے پیدل چل رہا ہوں۔ پیدل! تم پیدل کے معنے نہیں جانتے پیدل کے معنے ہیں سینۂ زمین پر اس طرح سے حرکت کرنا کہ دونوں پاؤں میں سے ایک نہ ایک پاؤں ضرور زمین پر رہے۔ یعنی تمام عمر میرے حرکت کرنے کا طریقہ یہی رہا ہے۔ کہ ایک پاؤں زمین پر رکھتا ہوں۔ دوسرا اٹھاتا ہوں۔ دوسرا رکھتا ہوں پہلا اٹھاتا ہوں۔ ایک آگے ایک پیچھے۔ ایک پیچھے ایک آگے۔ خدا کی قسم اس طرح کی زندگی سے دماغ سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ حواس بیکار ہو جاتے ہیں تخیل مر جاتا ہے۔ آدمی گدھے

سے بدتر ہو جاتا ہے ۔

مرزا صاحب میری اس تقریر کے دوران میں کچھ اس بے پروائی سے سگرٹ پیتے رہے۔ کہ دوستوں کی بیوفائی پر رو لینے کو دل چاہتا تھا۔ میں نے از حد نفرت اور حقارت کے ساتھ منہ اُن کی طرف سے پھیر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ مرزا کو میری باتوں پر یقین ہی نہیں آتا۔ گویا میں اپنی جو تکلیف بیان کر رہا ہوں وہ محض خیالی ہیں یعنی میرا پیدل چلنے کے متعلق شکایت کرنا قابل توجہ ہی نہیں یعنی میں کسی سواری کا مستحق ہی نہیں۔ میں نے دل میں کہا اچھا مرزا یونہی سہی۔ دیکھو تو میں کیا کرتا ہوں۔ میں نے اپنے دانت پیس لئے اور کرسی کے بازو پر سے جھک کر مرزا کے قریب پہنچ گیا۔ مرزا نے بھی سر میری طرف موڑا۔ میں مسکرا دیا۔ لیکن میرے تبسم میں زہر ملا ہوا تھا۔ جب مرزا سننے کے لئے بالکل تیار ہو گیا۔ تو میں نے چبا چبا کر کہا۔

"مرزا۔ میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں"۔

یہ کہکر میں بڑے استغنا کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگا۔

مرزا بولے۔ کیا کہا تم نے؟ کیا خریدنے لگے ہو؟"

میں نے کہا سنا نہیں تم نے۔ میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ موٹر کار ایک ایسی گاڑی ہے جس کو بعض لوگ موٹر کہتے ہیں بعض لوگ کار کہتے ہیں۔ لیکن چونکہ تم ذرا کند ذہن ہو۔ اس لئے میں نے دونوں لفظ استعمال کر دیئے۔ تاکہ تمہیں سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے"۔

مرزا بولے۔ "ہوں"

اب کی بار مرزا نہیں میں بے پروائی سے سگرٹ پینے لگا بھوؤں میں نے اوپر کو اٹھا لیں۔ سگرٹ والا ہاتھ میں منہ تک اس انداز سے لاتا لیجاتا تھا۔ کہ بڑے بڑے ایکٹر اس پر رشک کریں۔ تھوڑی دیر کے بعد مرزا پھر بولے "ہوں"

میں نے سوچا اثر ہو رہا ہے مرزا صاحب پر رعب پڑ رہا ہے۔ میں چاہتا تھا مرزا کچھ بولے تاکہ مجھے معلوم ہو کہاں تک مرعوب ہوا ہے۔ لیکن مرزا نے پھر کہا "ہوں"

میں نے کہا "مرزا۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ تم نے سکول اور کالج اور گھر پر دو تین زبانیں سیکھی ہیں۔ اور اس کے علاوہ تمہیں کئی ایسے الفاظ بھی آتے ہیں جو کسی سکول یا کالج یا گھر گھرانے میں نہیں بولے جاتے۔ پھر بھی اس وقت تمہارا کلام "ہوں" سے آگے نہیں بڑھتا۔ تم جلتے ہو۔ مرزا اس وقت جو تمہاری ذہنی حالت ہے۔ اس کو عربی زبان میں حسد کہتے ہیں"

مرزا صاحب کہنے لگے "نہیں یہ بات تو نہیں۔ میں تو صرف خریدنے کے لفظ پر غور کر رہا تھا۔ تم نے کہا میں ایک موٹر کار خریدنے لگا ہوں۔ تو صاحبزادے خریدنا تو ایک ایسا فعل ہے کہ اس کے لئے روپے وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وغیرہ کا بندوبست تو بخوبی ہو جائے گا۔ لیکن روپے کا بندوبست کیسے کرو گے؟"

یہ نکتہ مجھے بھی نہ سوجھا تھا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری بولا "میں اپنی کئی قیمتی اشیاء بیچ سکتا ہوں"۔

مرزا بولے "کون کون سی مثلاً؟"

میں نے کہا۔ ایک تو میں اپنا سگرٹ کیس بیچ ڈالوں گا"

مرزا کہنے لگے "چلو دس آنے تو یہ ہو گئے۔ باقی ڈھائی تین ہزار کا انتظام بھی اسی طرح ہو جائے تو سب کام ٹھیک ہو جائیگا"

اس کے بعد ضروری ہی معلوم ہوا۔ کہ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لئے روک دیا جائے۔ چنانچہ میں مرزا سے بیزار ہو کر خاموش ہو رہا۔ گو عقلنا اس مسئلے پر غور کیا تو نہایت ہی مشکل معلوم ہوا۔ یہ بات سمجھ میں نہ آئی۔ کہ یہ باقی لوگ روپیہ کہاں سے لاتے ہیں۔ بہت سوچا۔ آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ لوگ چوری کرتے ہیں۔ اس سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

مرزا بولے۔ میں تمہیں ایک ترکیب بتاؤں۔ ایک بائیسکل لے لو ۔

میں نے کہا۔ وہ روپے کا مسئلہ تو پھر بھی جوں کا توں رہا ۔

کہنے لگے۔ "مفت ۔

میں نے حیران ہوکر پوچھا۔ مفت؟ وہ کیسے ؟

کہنے لگے۔ مفت ہی سمجھو۔ آخر دوست سے قیمت لینا بھی کہاں کی شرافت ہے۔ البتہ تم احسان لینا گوارا نہ کرو تو اور بات ہے ۔

ایسے موقع پر جو ہنسی میں ہنستا ہوں۔ اس میں معصوم بچے کی مسرت۔ جوانی کی خوشدلی۔ اُبلتے ہوئے فواروں کی موسیقی اور بلبلوں کا نغمہ سب ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں یہ ہنسی ہنسا۔ اور اس طرح ہنسا کہ کھلی ہوئی باچھیں پھر گھنٹوں تک اپنی اصلی جگہ پر واپس نہ آئیں۔ جب مجھے یقین ہوگیا۔ کہ یک لخت کوئی خوشخبری سننے سے دل کی حرکت بند ہو جانے کا جو خطرہ ہوتا ہے۔ اس سے محفوظ ہوں۔ تو میں نے پوچھا "ہے کس کی ؟"

مرزا بولے میرے پاس ایک بائیسکل پڑی ہے۔ تم لے لو ۔

میں نے کہا۔ پھر کہنا۔ پھر کہنا ۔

کہنے لگے۔ بھئی! ایک بائیسکل میرے پاس ہے جب میری ہے تو تمہاری ہے تم لے لو ۔

یقین جانئے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ شرم کے مارے میں پسینہ پسینہ ہوگیا۔ چودہویں صدی میں ایسی بے غرضی اور ایثار بھلا کہاں دیکھنے میں آتا ہے۔ میں نے کرسی سرکا کر مرزا کے پاس کرلی سمجھ میں نہ آیا کہ اپنی ندامت اور ممنونیت کا اظہار کن الفاظ میں کروں ۔

میں نے کہا۔ مرزا سب سے پہلے تو میں اس گستاخی اور درشتی اور بے ادبی کے لئے معافی مانگتا ہوں۔ جو حال ہی میں میں نے تمہارے ساتھ گفتگو میں روا رکھی۔ دوسرے میں آج تمہارے سامنے ایک اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ اور امید کرتا ہوں کہ تم میری صاف گوئی کی داد دو گے اور مجھے اپنی بھولی کے صدقے معاف کر دو گے۔ میں ہمیشہ تم کو از حد کمینہ۔ ممسک خود غرض اور عیار انسان سمجھتا رہا ہوں۔ دیکھو ناراض مت ہو۔ انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن آج تم نے اپنی شرافت اور دوست پروری کا ثبوت دیا ہے۔ اور مجھ پر ثابت کر دیا ہے کہ میں کتنا قابلِ نفرت۔ تنگ خیال اور حقیر شخص ہوں۔ مجھے معاف کر دو ۔

میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ قریب تھا کہ میں مرزا کے ہاتھ کو بوسہ دیتا اور اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے سر اُس کی گود میں رکھ دیتا۔ لیکن مرزا صاحب کہنے لگے

واہ اس میں میری فیاضی کیا ہوئی۔ میرے پاس ایک بائیسکل ہے۔ جیسے میں سوار ہوا ویسے ہی تم سوار ہوئے ۔

میں نے کہا۔ "مرزا مفت میں نہ لونگا۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا"

مرزا کہنے لگے۔ بس میں اسی بات سے ڈرتا تھا تم حساس اتنے ہو۔ کہ کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کرتے۔ حالانکہ خدا گواہ ہے احسان اس میں کوئی نہیں ۔

میں نے کہا۔ "خیر کچھ بھی سہی۔ تم سچ سچ مجھے اسکی قیمت بتا دو"

مرزا بولے۔ قیمت کا ذکر کر کے تم گویا مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہو۔ اور جس قیمت پر میں نے خریدی تھی۔ وہ تو بہت زیادہ تھی۔ اور اب تو وہ اتنے کی رہی بھی نہیں ۔

میں نے پوچھا تم نے کتنے میں خریدی تھی ۔

کہنے لگے۔ میں نے پونے دو سو میں لی تھی لیکن اس

زمانے میں بائیسکلوں کا رواج دائم تھا۔ اس لئے قیمتیں زیادہ تھیں"۔

میں نے کہا۔ "کیا بہت پرانی ہے؟"

بولے۔ نہیں۔ ایسی پرانی بھی کیا ہوگی۔ میرا لڑکا اس پر کالج آیا جایا کرتا تھا۔ اور اسے کالج چھوڑے ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے۔ لیکن اتنا ضرور ہے۔ کہ آجکل کی بائیسکلوں سے ذرا مختلف ہے۔ آج کل تو بائیسکلیں ٹین کی بنتی ہیں جنہیں کالج کے سرپھرے لونڈے سستی سمجھ کر خرید لیتے ہیں۔ پرانی بائیسکلوں کے ڈھانچے مضبوط ہوا کرتے تھے۔

"مگر مرزا پورے دو سو روپے تو میں ہرگز نہیں دے سکتا۔ اتنے روپے میرے پاس کہاں سے آئے۔ میں تو اس سے آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا"۔

مرزا کہنے لگے۔ "تو میں تم سے پوری قیمت تھوڑی مانگتا ہوں۔ اوّل تو میں قیمت لینا ہی نہیں چاہتا۔ لیکن۔۔۔۔"

میں نے کہا۔ "نہ مرزا قیمت تو تمہیں لینی پڑے گی۔

اچھا تم یوں کرو۔ میں تمہاری جیب میں کچھ روپے ڈال دیتا ہوں۔ تم گھر جا کے گن لینا۔ اگر تمہیں منظور ہوئے۔ تو کل بائیسکل بھجوا دینا ورنہ روپے واپس کر دینا۔ اب یہاں بیٹھ کر میں تم سے سودا چکاؤں! یہ تو کچھ دوکانداروں کی سی بات معلوم ہوتی ہے۔

مرزا بولے بھئی جیسے تمہاری مرضی۔ میں تو اب بھی یہی کہتا ہوں کہ قیمت ویمت جانے دو۔ لیکن میں جانتا ہوں۔ کہ تم نہ مانو گے۔

میں اُٹھ کر اندر کمرے میں آیا۔ میں نے سوچا استعمال شدہ چیز کی لوگ عام طور پر آدھی قیمت دیتے ہیں۔ لیکن جب میں نے مرزا سے کہا تھا۔ کہ مرزا میں تو آدھی قیمت بھی نہیں دے سکتا تو مرزا اس پر معترض نہ ہوا تھا۔ وہ بیچارہ تو بلکہ یہی کہتا تھا۔ کہ تم مفت ہی لے لو۔ لیکن مفت میں کیسے لے لوں۔ آخر بائیسکل ہے۔ ایک سواری ہے۔ فٹنوں اور گھوڑوں اور موٹروں اور تانگوں کے زمرے میں شمار ہوتی ہے۔ بکس کو کھولا تو معلوم ہوا کہ بہت دو کل چھیالیس روپے ہیں۔ چھیالیس روپے تو کچھ ٹھیک رقم نہیں۔ پینتالیس یا پچاس ہوں جب بھی بات ہے پچاس تو ہو نہیں سکتے۔ اور اگر پینتالیس ہی دینے ہیں۔ تو چالیس کیوں نہ دیئے جائیں۔ جن رقموں کے آخر میں صفر آتا ہے۔ وہ رقمیں کچھ زیادہ معقول معلوم ہوتی ہیں۔ بس ٹھیک ہے چالیس روپے دیدونگا۔ خدا کرے مرزا قبول کر لے۔

باہر آیا چالیس روپے مٹھی میں بند کر کے میں نے مرزا کی جیب میں ڈال دیئے۔ اور کہا۔ مرزا اس کو قیمت نہ سمجھنا۔ لیکن اگر ایک مفلس دوست کی حقیر سی رقم منظور کرنا تمہیں اپنی توہین معلوم نہ ہو تو کل بائیسکل بھجوا دینا"۔

مرزا چلنے لگے۔ تو میں نے پھر کہا کہ مرزا کل ضرور صبح صبح ہی بھجوا دینا۔ رخصت ہونے سے پہلے میں نے پھر ایک دفعہ کہا کل صبح آٹھ نو بجے تک پہنچ جائے۔ دیر نہ کر دینا۔۔۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔ اور دیکھو مرزا میرے تھوڑے سے روپوں کو بھی زیادہ سمجھنا۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔ اور تمہارا بہت بہت شکریہ۔ میں تمہارا بہت ممنون ہوں۔ اور میری گستاخی کو معاف کر دینا۔ دیکھو نا کبھی کبھی یونہی بے تکلفی میں۔۔۔ کل صبح آٹھ نو بجے تک ضرور۔ خدا حافظ"۔

مرزا کہنے لگے۔ ذرا اس کو جھاڑ پونچھ لینا۔ اور تیل ویرہ ڈلوا لینا۔ میرے نوکر کو فرصت ہوئی۔ تو میں خود ہی ڈلوا دونگا۔ ورنہ تم خود ہی ڈلوا لینا۔

میں نے کہا۔ ہاں۔ہاں وہ سب کچھ ہو جائیگا۔ تم کل بھیج ضرور دینا۔ اور دیکھنا آٹھ بجے تک یا ساڑھے سات تک پہنچ جائے۔

اچھا۔۔۔ خدا حافظ۔

رات کو بستر پر لیٹا۔ تو بائیسکل پر سیر کرنے کے مختلف پروگرام

تجویز کرتا رہا۔ یہ ارادہ تو پختہ کر لیا۔ کہ دو تین دن کے اندر اندر اردگرد کے تمام مشہور تاریخی عمارات اور کھنڈروں کو نئے سرے سے دیکھ ڈالونگا۔ اس کے بعد اگلے گرمی کے موسم میں ہو سکا تو بائیسکل پر کشمیر وغیرہ کی سیر کرونگا۔ صبح صبح ہواخوری کے لئے ہر روز باہر جایا کرونگا۔ شام کو ٹھنڈی سڑک پر جہاں اور لوگ سیر کو نکلیں گے میں بھی سڑک کی صاف شفاف سطح پر ہلکے ہلکے خاموشی کے ساتھ ہاتھی دانت کی ایک گیند کی مانند گزر جاؤنگا۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی روشنی بائیسکل کے چمکیلے حصوں پر پڑیگی۔ تو بائیسکل جگمگا اٹھیگی اور ایسا معلوم ہوگا جیسے ایک راج ہنس زمین کے ساتھ ساتھ اڑ رہا ہے۔ وہ مسکراہٹ جس کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں ابھی تک میرے ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ بار بار دل چاہتا کہ ابھی بھاگ کر جاؤں اور اسی وقت مرزا کو گلے سے لپٹا لوں۔

رات کو خواب میں دعائیں مانگتا رہا کہ خدایا مرزا صاحب بائیسکل دینے پر رضامند ہو جائے۔

صبح اٹھا۔ تو اٹھتے کے ساتھ ہی نوکر نے یہ خوشخبری سنائی کہ حضور وہ بائیسکل آگئی ہے۔

میں نے کہا "اتنی سویرے"۔

نوکر نے کہا۔ وہ تو رات ہی کو آگئی تھی۔ آپ سو گئے تھے۔ میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا اور ساتھ ہی مرزا صاحب کا آدمی یہ ڈھبریاں کسنے کا ایک اوزار بھی دے گیا ہے۔

میں حیران تو ہوا کہ مرزا صاحب نے سائیکل بھجوا دینے میں اس قدر عجلت سے کیوں کام لیا۔ لیکن اس نتیجہ پر پہنچے کہ آدمی نہایت شریف اور دیانتدار ہیں۔ روپے لے لئے تھے تو بائیسکل کیوں روک رکھتے۔

نوکر سے کہا۔ دیکھو یہ اوزار یہیں چھوڑ جاؤ اور دیکھو۔ بائیسکل کو کسی کپڑے سے خوب اچھی طرح جھاڑو۔ اور یہ موڑ پر جو بائیسکلوں والا بیٹھتا ہے اس سے جا کر بائیسکل میں ڈالنے کا تیل لے آؤ۔ اور دیکھو۔ ابے بھاگتا کہاں جا رہا ہے۔ ہم ضروری بات تم سے کہہ رہے ہیں ـــــ بائیسکل والے سے تیل کی ایک کپی بھی لے آنا۔ اور جہاں جہاں تیل دینے کی جگہ ہے وہاں تیل دے دینا۔ اور بائیسکلوں والے سے کہنا۔ کہ کوئی گھٹیا سا تیل نہ دیدے جس سے تمام پرزے ہی خراب ہو جائیں۔ بائیسکل کے پرزے بڑے نازک ہوتے ہیں۔ اور بائیسکل باہر نکال رکھو۔ ہم ابھی کپڑے پہن کے آتے ہیں ہم ذرا سیر کو جا رہے ہیں۔ اور دیکھو صاف کر دینا اور بہت زور زور سے کپڑا بھی مت رگڑنا بائیسکل کا پالش گھس جاتا ہے۔

جلدی جلدی چائے پی۔ غسل خانے میں بڑے جوش خروش کے ساتھ "چل چل چنبیلی باغ میں" گاتا رہا اس کے بعد کپڑے بدلے اوزار کو جیب میں ڈالا اور کمرے سے باہر نکلا۔

برآمدے میں آیا۔ تو برآمدے کے ساتھ ہی ایک عجیب و غریب مشین نظر پڑی ٹھیک طرح پہچان نہ سکا۔ کہ کیا چیز ہے۔ نوکر سے دریافت کیا۔ کیوں بے یہ کیا چیز ہے"۔

نوکر بولا "حضور یہ بائیسکل ہے"۔

میں نے کہا بائیسکل؟ کس کی بائیسکل؟

کہنے لگا "مرزا صاحب نے بھجوائی ہے۔ آپ کے لئے"۔

میں نے کہا اور جو بائیسکل رات کو انہوں نے بھیجی تھی۔ وہ کیا ہوئی۔

کہنے لگا۔ یہی تو ہے۔

میں نے کہا کیا بکتا ہے۔ جو بائیسکل مرزا صاحب نے کل رات کو بھیجی تھی۔ وہ بائیسکل یہی ہے؟

کہنے لگا "جی ہاں"۔

میں نے کہا "اچھا" اور پھر اسے دیکھنے لگا۔

"اس کو صاف کیوں نہیں کیا؟"

"حضور دو تین دفعہ صاف کیا ہے"۔

"تو یہ میلی کیوں ہے؟"

نوکر نے اس کا جواب دینا شاید مناسب نہ سمجھا۔

"اور تیل لایا؟"

"ہاں حضور لایا ہوں۔"

"دیا؟"

"حضور وہ جو تیل دینے کے چھید ہوتے ہیں۔ وہ نہیں ملتے۔"

"کیا وجہ؟"

"حضور۔ دُھروں پر میل اور زنگ جما ہے۔ وہ سوراخ کہیں بیچ ہی میں دب دبا گئے ہیں۔"

رفتہ رفتہ میں اس چیز کے قریب آیا۔ جس کو میرا نوکر بائیسکل بتا رہا تھا۔ اس کے مختلف پرزوں پر غور کیا۔ تو اتنا تو ثابت ہوگیا۔ کہ بائیسکل ہے۔ لیکن محض ہیئت سے یہ صاف ظاہر تھا۔ کہ کل اور رہٹ اور چرخہ اور اسی طرح کی اور جدید ایجادات سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔ پہیے کو گھما گھما کر وہ سوراخ تلاش کیا۔ جہاں کسی زمانے میں تیل دیا جاتا تھا۔ لیکن اب اس سوراخ میں سے آمد و رفت کا سلسلہ بند تھا۔ چنانچہ نوکر بولا "حضور وہ تیل تو سب ادھر ادھر بہہ جاتا ہے۔ بیچ میں تو جاتا ہی نہیں۔"

میں نے کہا "اچھا ادھر ادھر ہی ڈال دو۔ یہ بھی مفید ہوتا ہے۔" آخرکار بائیسکل پر سوار ہوا۔ پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہے۔ گھر سے نکلتے ہی کچھ تھوڑی سی اترائی تھی۔ اس پر بائیسکل خود بخود چلنے لگی۔ لیکن اس رفتار سے جیسے تارکول زمین پر بہتی ہے۔ اور ساتھ ہی مختلف حصوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونی شروع ہوئیں۔ ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے۔ چیں۔ چاں۔ چوں کی قسم کی آوازیں زیادہ تر گدی کے نیچے اور پچھلے پہیے سے نکلتی تھیں۔ کھٹ۔ کھڑ۔ کھڑ۔ کھڑڑ کی قبیل کی آوازیں مڈگارڈوں سے آتی تھیں۔ چٹ۔ چٹرخ۔ چٹرخ۔ چٹرخ کی قسم کی سُریں زنجیر اور پیڈل سے نکلتی تھیں۔ زنجیر ڈھیلی ڈھیلی تھا۔ میں جب کبھی پیڈل پر زور ڈالتا تھا۔ زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی اور چڑ چڑ بولنے لگتی تھی اور پھر ڈھیلی ہو جاتی تھی۔ پچھلا پہیہ گھومنے کے علاوہ جھومتا بھی تھا۔ یعنی ایک تو آگے کو چلتا تھا۔ اور اس کے علاوہ دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں کو بھی حرکت کرتا تھا۔ چنانچہ سڑک پر جو نشان پڑ جاتا تھا۔ اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے کوئی مخمور سانپ لہرا کر نکل گیا ہے۔ مڈگارڈ تھے تو سہی لیکن پہیوں کے عین اوپر نہ تھے۔ ان کا فائدہ صرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ انسان شمال کی سمت سیر کرنے کو نکلے اور آفتاب مغرب میں غروب ہو رہا ہو۔ تو مڈگارڈوں کی بدولت ٹائر دھوپ سے بچے رہیں گے۔ اگلے پہیے کے ٹائر میں ایک بڑا سا پیوند لگا تھا جس کی بدولت پہیہ ہر چکر میں ایک دفعہ لمحہ بھر کو زور سے اوپر اٹھ جاتا تھا۔ اور میرا سر پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا۔ جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مکے مارے جا رہا ہو۔ پچھلے اور اگلے پہیے کو ملا کر چوں چوں پھٹ۔ چوں چوں پھٹ ..... کی صدا نکل رہی تھی۔ جب اترائی پر بائیسکل ذرا تیز ہوئی۔ تو فضا میں ایک بھونچال سا آگیا۔ اور بائیسکل کے کئی اور پرزے جو اب تک سوئے ہوئے تھے۔ بیدار ہو کر گویا ہوئے۔ ادھر ادھر کے لوگ چونکے۔ ماؤں نے اپنے بچوں کو سینے سے لگا لیا۔ کھڑڑ کھڑڑ کھڑڑ کے بیچ میں پہیوں کی آواز نے اب چوں پھٹ۔ چچوں پھٹ۔ چچوں پھٹ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ تمام بائیسکل کسی ادق افریقی زبان کی گردانیں دہرا رہی تھی۔

اسقدر تیز رفتاری بائیسکل کی طبع نازک پر گراں گذری چنانچہ اس میں یکلخت دو تبدیلیاں واقع ہوگئیں۔ ایک تو ہینڈل ایک طرف کو مڑ گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں جا تو سامنے کو رہا تھا۔ لیکن میرا تمام جسم دائیں طرف کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ بائیسکل کی گدی دفعتہً چھ انچ کے قریب نیچے بیٹھ گئی۔ چنانچہ جب پیڈل چلانے کے لئے میں ٹانگیں اوپر نیچے کر رہا تھا تو میرے گھٹنے میری ٹھوڑی تک پہنچ جاتے تھے۔ کمر دوہری ہو کر باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ اور ساتھ ہی اگلے پہیے کی اٹکھیلیوں کی وجہ سے سر برابر جھٹکے کھا رہا ✦

گدی کا نیچا ہو جانا از حد تکلیف دہ ثابت ہوا اس لئے میں نے مناسب یہی سمجھا۔ کہ اس کو ٹھیک کر لوں۔ چنانچہ میں نے بائیسکل کو ٹھہرا لیا اور نیچے اترا۔ بائیسکل کے ٹھہر جانے سے یکلخت جیسے دنیا میں ایک خاموشی سی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی ریل کے اسٹیشن سے نکل کر باہر آگیا ہوں ✦ جیب سے میں نے اوزار نکالا۔ گدی کو اونچا کیا۔ کچھ ہینڈل کو ٹھیک کیا اور دوبارہ سوار ہو گیا ✦

دس قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ اب کی بار ہینڈل یکلخت نیچا ہو گیا۔ اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا۔ تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا جو ہینڈل پر رکھے تھے۔ اور جو برابر جھٹکے کھا رہے تھے آپ میری حالت کو تصور میں لائیں۔ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ میں دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو ✦ مجھے اس مشابہت کا احساس بہت تیز تھا جس کی وجہ سے میرے ماتھے پر پسینہ پھوٹ آیا۔ میں دائیں بائیں لوگوں کو کنکھیوں سے دیکھتا جاتا تھا۔ یوں تو ہر شخص میل بھر پہلے ہی سے مڑ مڑ کر دیکھنے لگ جاتا تھا لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کے لئے میری مصیبت ضیافتِ طبع کا باعث نہ ہو ✦

ہینڈل تو نیچا ہو ہی گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گدی بھی پھر نیچی ہو گئی اور میں تمام تن زمین کے قریب پہنچ گیا۔ ایک لڑکے نے کہا۔ دیکھو یہ آدمی کیا کر رہا ہے۔ گویا اس کے نزدیک میں کوئی کرتب دکھا رہا تھا۔ میں نے اتر کر پھر گدی اور ہینڈل کو اونچا کیا ✦

لیکن تھوڑی دیر کے بعد ان میں سے ایک نہ ایک پھر نیچا ہو جاتا۔ وہ لمحے جن کے دوران میں میرے ہاتھ اور میرا جسم دونوں برابر برابر ایک ہی بلندی پر واقع ہوں بہت ہی کم تھے۔ اور ان میں بھی میں یہی سوچتا رہتا تھا۔ کہ اب کے گدی پہلے بیٹھے گی یا ہینڈل؟ چنانچہ نڈر ہو کر نہ بیٹھتا۔ بلکہ جسم کو گدی سے قدرے اوپر ہی رکھتا۔ لیکن اس سے ہینڈل پر اتنا بوجھ پڑ جاتا کہ وہ نیچا ہو جاتا ✦

جب دو میل گذر گئے۔ اور اس آپ بیتی نے ایک مقرر باقاعدگی اختیار کر لی۔ تو فیصلہ کیا کہ کسی مستری سے پیچ کسوا لئے جائیں۔ چنانچہ بائیسکل کو ایک دکان پر لے گیا۔ بائیسکل کی کھڑکھڑ سے دوکان میں جتنے لوگ کام کر رہے تھے سب کے سب سر اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے لیکن میں نے جی کڑا کر کے کہا۔ ذرا اس کی مرمت کر دیجئے ✦

ایک مستری آگے بڑھا۔ لوہے کی ایک سلاخ اس کے ہاتھ میں تھی۔ جس سے اس نے مختلف حصوں کو بڑی بیدردی کے ساتھ ٹھونک بجا کر دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا اس نے بڑی تیزی کے ساتھ سب حالات کا اندازہ لگا لیا ہے۔ لیکن پھر بھی مجھ سے پوچھنے لگا۔ کس کس پرزے کی مرمت کروائیے گا؟"

میں نے کہا۔ بڑے گستاخ ہو تم۔ دیکھتے نہیں کہ صرف ہینڈل اور گدی کو ذرا اونچا کروا کے کسوانا ہے۔ بس اور کیا؟ ان کو مہربانی کر کے فوراً ٹھیک کر دو۔ اور بتاؤ کتنے پیسے ہوئے؟

مستری کہنے لگا۔ ڈگا پوڈ بھی ٹھیک نہ کردوں؟
میں نے کہا ہاں۔ وہ بھی ٹھیک کردو۔
کہنے لگا۔ آپ اچھا کریں۔ تو باقی چیزیں بھی ٹھیک کروالیں۔

میں نے کہا۔ اچھا کردو۔

بولا۔ یوں تھوڑا ہی ہوسکتا ہے۔ دس پندرہ دن کا کام ہے۔ آپ اسے ہمارے پاس چھوڑ جائیے۔

"اور پیسے کتنے لوگے؟"

کہنے لگا "بس تیس چالیس روپے لگیں گے"۔

ہم نے کہا۔ بس جی۔ جو کام تم سے کہا ہے۔ کردو۔ اور باقی ہمارے معاملات میں دخل مت دو"۔

تھوڑی دیر میں پینڈل اور گدی پھر اونچی کرکے کس دی گئی۔ میں چلنے لگا۔ تو مستری نے کہا "میں نے کس تو دیا ہے۔ لیکن پیچ سب گھسے ہوئے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں پھر ڈھیلے ہوجائیں گے۔

میں نے کہا۔ "بد تمیز کہیں کا۔ تو دو آنے پیسے مفت میں لے لئے؟"

بولا۔ جناب آپ کو بائیسکل بھی تو مفت ہی میں ملی ہوگی یہ آپ کے دوست مرزا صاحب کی ہے نا؟ ——— تو یہ وہی بائیسکل ہے۔ جو پچھلے سال مرزا صاحب یہاں بیچنے کو لائے تھے۔ پہچانی تم نے؟ بھئی صدیاں ہی گذر گئیں لیکن اس بائیسکل کی خطا معاف ہونے میں نہیں آتی۔

میں نے کہا۔ واہ مرزا صاحب کے لڑکے اس پر کالج آیا جایا کرتے تھے۔ اور ان کو ابھی کالج چھوڑے دو سال بھی نہیں ہوئے۔

مستری نے کہا۔ ہاں وہ تو ٹھیک ہے لیکن مرزا صاحب خود جب کالج میں پڑھا کرتے تھے تو ان کے پاس بھی تو یہی بائیسکل تھی"۔

میری طبیعت یہ سنکر کچھ مردہ سی ہوگئی۔ میں بائیسکل کو ساتھ لئے آہستہ آہستہ پیدل چل پڑا۔ لیکن پیدل چلنا بھی مشکل تھا۔ اس بائیسکل کے چلانے میں ایسے ایسے پٹھوں پر زور پڑا تھا۔ جو عام بائیسکلوں کے چلانے میں استعمال نہیں ہوتے اس لئے ٹانگوں اور کندھوں اور کمر اور بازوؤں میں جا بجا درد ہو رہا تھا۔ مرزا کا خیال رہ رہ کر آتا تھا۔ لیکن میں ہر بار کوشش کر کے اسے دل سے ہٹا دیتا تھا۔ ورنہ میں پاگل ہو جاتا۔ اور جنون کی حالت میں پہلی حرکت مجھ سے یہ سرزد ہوتی کہ مرزا کے مکان کے سامنے بازار میں ایک جلسہ منعقد کرتا جس میں مرزا کی مکاری۔ بے ایمانی اور دغابازی پر ایک طویل تقریر کرتا کل بنی نوع انسان اور آئندہ آنے والی نسلوں کو مرزا کی ناپاک فطرت سے آگاہ کر دیتا۔ اور اس کے بعد ایک چتا جلا کر اس میں زندہ جل کر مر جاتا۔

میں نے بہتر یہی سمجھا۔ کہ جس طرح ہو سکے اب اس بائیسکل کو اونے پونے داموں بیچ کر جو وصول ہو اسی پر صبر شکر کروں۔ بلا سے دس پندرہ روپے کا خسارہ سہی۔ چالیس کے چالیس روپے تو ضائع نہ ہوں گے۔ راستے میں بائیسکلوں کی ایک اور دوکان آئی۔ وہاں ٹھہر گیا۔

دکاندار بڑھ کر میرے پاس آیا۔ لیکن میری زبان کو جیسے تالا لگا ہوا تھا۔ عمر بھر کبھی کسی چیز کے بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں۔ کہ ایسے موقع پر کیا کہتے ہیں آخر بڑی سوچ بچار اور بڑے تامل کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ "یہ بائیسکل ہے"۔

دکاندار کہنے لگا "پھر؟"

میں نے کہا۔ "لوگے؟"

کہنے لگا "کیا مطلب؟"

میں نے کہا۔ "بیچتے ہیں ہم"۔

دکاندار نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا کہ مجھے یہ محسوس ہوا مجھ پر چوری کا شبہ کر رہا ہے۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ پھر مجھے دیکھا۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کر سکتا۔ آدمی کون سا ہے اور بائیسکل کون سی ہے۔ آخر کار بولا:" کیا کریں گے آپ اس کو بیچکر ؟"

ایسے سوالوں کا خدا معلوم کیا جواب ہوتا ہے۔ میں نے کہا" کیا تم یہ پوچھنا چاہتے ہو۔ کہ جو روپے مجھے وصول ہونگے ان کا مصرف کیا ہوگا ؟

کہنے لگا۔ وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر کوئی اس کو لے کر کریگا کیا ؟

میں نے کہا۔ اس پر چڑھیگا اور کیا کرے گا +

کہنے لگا۔ اچھا۔ چڑھ گیا۔ پھر ؟

میں نے کہا۔ پھر کیا ؟ پھر چلائے گا اور کیا ؟

دکاندار بولا" اچھا ؟ ہوں ۔ خدابخش ذرا یہاں آنا۔ یہ بائیسکل بکنے آئی ہے"+

جن حضرت کا اسم گرامی خدابخش تھا۔ انہوں نے بائیسکل کو دور ہی سے یوں دیکھا جیسے بُو سونگھ رہے ہوں +

اس کے بعد دونوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ آخر میں وہ جن کا نام خدابخش نہیں تھا۔ میرے پاس آئے۔ اور کہنے لگے" تو آپ سچ مچ بیچ رہے ہیں" ؟

میں نے کہا۔ تو اور کیا محض آپ سے ہم کلام ہونے کا فخر حاصل کرنے کے لئے میں گھر سے یہ بہانہ گھڑ کر لایا تھا +

کہنے لگا تو کیا لیں گے آپ ؟

میں نے کہا۔ تمہیں بتاؤ +

کہنے لگا۔ سچ سچ بتاؤں +

میں نے کہا۔ ہاں +

پھر کہنے لگا۔ سچ سچ بتاؤں گا +

میں نے کہا۔ اب بتاؤ گے بھی یا یونہی ترساتے رہو گے ؟

کہنے لگا۔ تین روپے دونگا اس کے +

میرا خون کھول اٹھا اور میرے ہاتھ پاؤں اور ہونٹ غصے کے مارے کانپنے لگے۔ میں نے کہا :-

"او صنعت و حرفت سے پیٹ پالنے والے ننگے انسان۔ مجھے اپنی توہین کی پروا نہیں۔ لیکن تو نے اپنی بیہودہ گفتگو سے اس بے زبان چیز کو جو صدمہ پہنچایا ہے۔ اس کے لئے میں تمہیں قیامت تک معاف نہیں کر سکتا"۔ یہ کہہ کر میں بائیسکل پر سوار ہو گیا۔ اور اندھا دھند پاؤں چلانے لگا +

مشکل سے میں قدم گیا ہونگا۔ کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے زمین یکلخت اچھل کر مجھ سے آ لگی ہے۔ آسمان میرے سر پر سے ہٹ کر میری ٹانگوں کے بیچ میں سے گزر گیا۔ اور اِدھر اُدھر کی عمارتوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اپنی اپنی جگہ بدل لی ہو۔ حواس بجا ہوئے تو معلوم ہوا میں زمین پر اس بے تکلفی سے بیٹھا ہوں گویا بڑی مدت سے مجھے اسبات کا شوق تھا جو آج پورا ہوا۔ اردگرد کچھ لوگ جمع تھے جن میں سے اکثر ہنس رہے تھے۔ سامنے وہ دوکان تھی جہاں ابھی ابھی میں نے اپنی ناکام گفت و شنید کا سلسلہ منقطع کیا تھا۔ میں نے گرد و پیش پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ میری بائیسکل کا اگلا پہیہ بالکل الگ ہو کر لڑھکتا ہوا سڑک کے اس پار جا پہنچا ہے۔ اور باقی کا بائیسکل میرے پاس پڑا ہے۔ میں نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا۔ جو پہیہ الگ ہو گیا تھا۔ اس کو ایک ہاتھ میں اٹھایا۔ دوسرے ہاتھ میں باقیماندہ بائیسکل کو تھاما اور چل کھڑا ہوا۔ یہ محض ایک اضطراری حرکت تھی۔ ورنہ حاشا و کلا وہ بائیسکل مجھے ہرگز اتنی عزیز نہ تھی۔ کہ میں اس کو اس حالت میں ساتھ ساتھ لئے پھرتا +

جب میں یہ سب کچھ اٹھا کر چلا۔ تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ کہ یہ تم کیا کر رہے ہو۔ کہاں جا رہے ہو۔ تمہارا ارادہ کیا ہے۔ یہ دو پہیے کاہے کو ساتھ لے جا رہے ہو؟

سب سوالوں کا جواب یہی ملا۔ کہ دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم یہاں سے چل دو۔ سب لوگ تمہیں دیکھ رہے ہیں۔ سر اونچا رکھو

اور چلتے جاؤ۔ جو ہنس رہے ہیں۔ انہیں ہنسنے دو۔

اس قسم کے بیہودہ لوگ ہر قوم اور ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ آخر ہوا کیا۔ محض ایک حادثہ۔ بس دائیں بائیں مت دیکھو۔ چلتے جاؤ۔

لوگوں کے ناشایستہ کلمات بھی سنائی دے رہے تھے۔ ایک آواز آئی "بس حضرت غصہ تھوک ڈالئے۔" ایک دوسرے صاحب بولے۔ "بیچارا بائیسکل۔ گھر پہنچ کے تجھے مزا چکھاؤں گا۔" ایک والد اپنے لختِ جگر کو انگلی پکڑے لئے جا رہے تھے میری طرف اشارہ کرکے کہنے لگے۔ "دیکھا بیٹا! یہ سرکس کا بائیسکل ہے۔ اس کے دونوں پہیے الگ الگ ہوتے ہیں۔"

لیکن میں چلتا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں آبادی سے دور نکل گیا۔ اب میری رفتار میں ایک عزیمت پائی جاتی تھی۔ میرا دل جو کئی گھنٹوں سے ایک کشمکش میں پیچ و تاب کھا رہا اب بہت ہلکا ہو گیا تھا۔ میں چلتا گیا چلتا گیا۔ حتٰے کہ دریا پر جا پہنچا۔ پل کے اوپر کھڑے ہوکر میں نے دونوں پہیوں کو ایک ایک کرکے اس بے پروائی کے ساتھ دریا میں پھینک دیا جیسے کوئی لیڈر مجلس میں خطوط اٹھاتا ہے۔ اور واپس شہر کو روانہ ہو گیا۔

سب سے پہلے مرزا کے گھر گیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ مرزا بولے۔ اندر آ جاؤ۔

میں نے کہا۔ "آپ ذرا باہر تشریف لائیے۔ میں آپ جیسے خدا رسیدہ بزرگ کے گھر وضو کئے بغیر کیسے داخل ہو سکتا ہوں۔"

باہر تشریف لائے تو میں نے وہ اوزار ان کی خدمت میں پیش کیا۔ جو انہوں نے بائیسکل کے ساتھ مفت ہی مجھ کو عنایت فرمایا تھا۔ اور کہا۔

"مرزا صاحب آپ ہی اس اوزار سے شوق فرمایا کیجئے۔ میں اب اس سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔"

گھر پہنچ کر میں نے پھر علم کیمیا کی اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا۔ جو میں نے ایف اے میں پڑھی تھی۔

پطرس

غزل

فروغِ آتشِ گل صحنِ لالہ زار میں ہے　　خزاں کی نشوونما دامنِ بہار میں ہے

عجیب جوششِ جنوں موسمِ بہار میں ہے　　کہ انتشار گریباں کی تار تار میں ہے

ترے ہی جلوۂ زریں کی رنگ افروزی　　چمن میں دشت میں صحرا میں کوہسار میں ہے

وہ کون ہے جو نہیں ہے فریب خوردۂ حسن　　نگاہِ شوق بھلا کس کے اختیار میں ہے

رواں عدم کی طرف کاروانِ ہستی ہے　　اٹھو کہ عرصۂ گزِ زیست انتظار میں ہے

وفورِ یاس سے جو اہلِ دل کو تڑپا دے　　وہ سوز و ساز مری آہِ دلفگار میں ہے

جس آستاں پہ شہنشاہ سر جھکاتے ہیں　　ظفر کی ناصیہ فرسائی کس شمار میں ہے

سراج الدین ظفر

انارکلی

(ڈراما)

(از جناب سید امتیاز علی صاحب تاج بی اے)

شہزادہ سلیم کا کمرہ محل میں

[اکبر اعظم کو سلیم اور انارکلی کی محبت کا حال معلوم ہو چکا ہے اور اس کے حکم سے انارکلی کو بھرے دربار میں گرفتار کر کے زنداں میں ڈال دیا گیا ہے۔ سلیم کے غم و غصے اور مایوسی کی کوئی حد نہیں۔ وہ اپنے کمرے میں مسند پر پڑا بیٹھا ہے۔ اس کی ماں رانی اس کے قریب بیٹھی اس کو سمجھا رہی ہے]

رانی۔ سلیم۔ اپنے ماں باپ سے خفگی؟ یوں ہی کہیں۔ ہوتا ہے؟ یہ بھی کہیں اولاد کو زیب دیتا ہے؟

سلیم۔ اولاد پر ظلم ماں باپ کو بھی زیب نہیں دیتا۔

رانی۔ اولاد پر ظلم۔ اور پھر تجھ سی اولاد پر۔ کیا کہتا ہے بیٹے؟ ہائے تو کیا جانے۔ تیری آرزو میں ماں باپ نے زندگی کے کتنے دن آہیں بنا کر اڑا ڈالے۔ زندگی کی کتنی راتیں آنسو بنا کر بہا ڈالیں۔ تو نہ تھا تو زندگی مسان کی طرح سنسان اور اجاڑ تھی۔ یہ محل خزاں کی رات کی طرح ویران کھڑے تھے۔ اس ہندوستان کا سہاگ بگڑا جا رہا تھا۔ اور میرے دولھا پھر تو آیا اور زندگی آئی اور بہار آئی۔ میرے چاند ہم ہنس پڑے۔ دنیا ہنس پڑی۔ خود قلعہ پر ہنس پڑے۔ پھر ماں باپ تجھ پر ظلم کریں گے؟ کس دل سے سلیم؟!

سلیم۔ آپ کے نزدیک مجھ پر کوئی ظلم نہیں ہوا۔ تو میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

رانی۔ یہ ظلم کہ انارکلی قید کر دی گئی؟ سلیم [illegible] وہ تیرے قابل ہے؟ تو اگر باپ ہوتا اور [illegible] کے لئے نہ جانے کیا کیا [illegible] میں ہوتیں اور تیرا بیٹا [illegible] کی محبت [illegible] تو کیا تو بھی کچھ نہ کرتا۔ جیسا اب [illegible] کے حق میں محبت نہ سمجھتا؟

سلیم۔ میں اولاد کی خوشی کو اپنی [illegible] پر ترجیح دیتا۔

رانی۔ نوجوان ہے۔ ناتجربہ کار ہے۔ باپ [illegible] جانتا۔

سلیم۔ باپ بنتا انصاف کی آنکھیں [illegible]

رانی۔ سلیم۔ ماں باپ کو اپنی زندگی [illegible] کی طرح عزیز رہتی ہیں۔ [illegible] ہوتا ہے۔ جیسے اولاد کے لئے آسرا [illegible]

گر جاتا۔ پھر تیرا اپنے ماں باپ کی آرزوؤں کو پامال کرنا انہیں کیسے خوش کرے؟ انہیں کیسے نہ معلوم ہو کہ ان کی اولاد آپس ہی میں کشت و خون کر رہی ہے۔

سلیم۔ اگر ماں باپ اولاد کے لئے اپنی تمناؤں کو بھولنا نہیں جانتے تو ان کا اپنی اولاد کی آرزوؤں پر اپنی آرزوؤں کو مقدم سمجھنا بے معنی ہے۔

رانی۔ آج تو کیا کیا کچھ کہہ رہا ہے بچے۔ اس نغمہ سے دل نے ماں باپ کے خلاف اتنا زہر بھر لیا ہے۔ اس لئے کہ وہ نہیں چاہتے تو ایک حرم کی کنیز سے شادی کرے۔ اور دنیا کی نظروں میں اپنے آپ کو تماشا بنا لے۔

سلیم۔ میں خوب جانتا ہوں۔ یہ دنیا کس چیز کی بھوکی ہے۔ دنیا کی نظریں، آپ چاہئے دنیا کی عظیم ترین سلطنت کا تخت و تاج مجھ کو میرے پہلو کی زینت بنا دیجئے۔ پھر بھی دنیا کی یہ سرگوشیاں آپ کے کانوں تک پہنچا دوں گا۔ اس احمق کو دیکھو جس نے سیاست کے پیچھے اپنے آپ کو بیچ ڈالا، چاہئے فردوس سے میرے لئے ایک حور مانگ لائیے۔ پھر بھی میں دنیا کی نظروں میں پہلے سے گرا ہوا دکھائی دوں گا۔ یہ بدنصیب عورت کی دلفریبیوں کو کیا جانے! ——— دنیا اور اس کی نظریں! پھر اگر انارکلی کو اپنا بنا لینے پر یہ دنیا کہے کہ محبت اندھی ہے۔ تو میں دل تھوڑا نہیں کر سکتا ہوں۔

رانی۔ لیکن سلیم۔ ہم اس دنیا کے خادم ہیں۔ ہمیں جو کچھ سمجھایا ہے۔ اسی دنیا نے بنایا ہے۔ ہندوستان کی باگ ہمارے ہاتھ میں دے کر یہ دنیا ——— ہمارے ایک ایک فعل کو تاڑتی رہتی ہے۔ ہم اس دنیا سے بے پرواہ کیسے ہو سکتے ہیں!

سلیم۔ اکبر اعظم اور دنیا کے تعلقات پر کوئی دوسرا فرزند قربان کر دیجئے۔ سلیم کے ہاتھ ہندوستان کی باگ سنبھالنے کے لئے آزاد نہیں۔

رانی۔ سلیم تو جو کچھ کہہ رہا ہے سمجھ نہیں سکتا۔

سلیم۔ میں سمجھ رہا ہوں۔ خوب سمجھ رہا ہوں۔ لے لیجئے مجھ سے سب کچھ لے لیجئے۔ ان محلوں کی عشرت، ہندوستان کی سلطنت، دنیا کی حکومت۔ خزانوں کی دولت سب کچھ لے لیجئے اور مجھ کو اور انارکلی کو ایک دریا کے کنارے تنہا چھوڑ دیجئے۔ جہاں میں صرف اس کو دیکھوں۔ اسی کو سنوں۔ اسی کو محسوس کروں۔ میں اپنی فردوس میں پہنچ جاؤں گا اور ماں باپ کے احسان کی یاد میں میری آنکھیں ہمیشہ پرنم رہیں گی۔

رانی۔ اور اگر تیرا باپ نہ مانے؟

سلیم۔ تو ان سے کہہ دیجئے۔ اگر وہ بادشاہ ہیں تو میں بادشاہ کا بیٹا ہوں۔ اگر ان کی رگوں میں مغلیہ خون دوڑ رہا ہے۔ تو میری رگوں میں راجپوتوں کا لہو بھی بیتاب ہے۔ اور میں جانتا ہوں تلوار سے کیا کیا کام لیا جا سکتا ہے۔

رانی۔ بیٹے سلیم! تجھے کیا ہو گیا؟ تو سلیم ہے نہ؟ میرا بیٹا۔ اور یہ تو بول رہا ہے؟

سلیم۔ سلیم، آپ کا بیٹا! آپ کا اور اکبر اعظم کا بیٹا۔ نامراد اور رسوا بیٹا! بدبخت شہزادہ! (سلیم کے آنسو نکل آتے ہیں)

رانی۔ میری جان! میرا لال! میرا چاند! یہ آنسو! یہ ماں کا لہو!!!

میں تجھے انارکلی دوں گی۔ تیرے باپ سے لے کر تجھے دوں گی۔ اسے تیری ننھی سی دلہن بناؤں گی۔ اسے اپنے سینہ سے لگا کر کلیجہ ٹھنڈا کروں گی۔

سلیم۔ اماں (ماں سے لپٹ جاتا ہے)

رانی۔ (اسے سینہ سے لگا کر) میرا بچہ!

سلیم۔ (ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) وہ مان جائنگے؟

رانی۔ انھیں ماننا ہوگا۔

سلیم۔ وہ آپ سے انکار کر چکے ہیں۔

رانی۔ میں نے انھیں صرف انارکلی کو چھوڑ دینے کو کہا تھا
وہ تنے تھے وہ پھر گئی۔ تو تو پھر اس سے ملے گا۔ اب میں
ان سے کہوں گی۔ کہ وہ انارکلی کو تیرے لئے چھوڑ دیں۔ تو
تسلی رکھ۔ بھروسہ رکھ۔ وہ اسے چھوڑ دیں گے۔

سلیم۔ اگر وہ نہ مانے؟ انھوں نے انکار کر دیا۔

رانی۔ تو انھیں پچھتانا ہوگا۔ (رانی جاتی ہے)

سلیم۔ (سوچتے ہوئے) انھیں پچھتانا ہوگا۔ وہ پچھتائے بھی
تو پھر کیا ہے؟ اور انکار کر دیا تو پھر کیا نہیں۔ آہ انکار!
خداوندا یہ کس آگ کی سوزش ہے۔ کس شعلہ کی جلن ہے۔
انکار۔ نہیں۔ نہیں۔ کچھ ہیب ہو جائے گا۔ کچھ بھیانک
(سوچ میں کھڑا کھڑا یکلخت بیتاب ہو جاتا ہے۔ اور بے اختیاری
سے اس طرف بڑھتا ہے۔ جہاں اس کی تلوار رکھی رہتی ہے)
تلوار۔ ہاں میری تلوار! (ثریا داخل ہوتی ہے)

ثریا۔ شہزادے! میری آپا؟

سلیم۔ (رک کر آہستہ سے) تو ثریا! ــــــ رو رہی ہے؟

ثریا۔ میری آپا کہاں ہیں۔ میرے شہزادے۔ میرے بادشاہ
میری باجی کن دیواروں میں بند ہیں۔ میں ان سے
سر پھوڑ لوں گی۔ مجھے بتا دو۔

سلیم۔ (ثریا کو گھورتے ہوئے) تجھ کو؟ تو بچی ہے۔ نہیں
جا سکتی۔

ثریا۔ خطرے نہ بتاؤ۔ شہزادے صرف راستہ دکھا دو۔

سلیم۔ راستہ؟

ثریا۔ حضور۔

سلیم۔ تو بھی اسی راستہ پر جائے گی؟

ثریا۔ خواہ اس راستے میں ہیبت ترین عذاب ہوں۔

سلیم۔ (لپک کر تلوار اٹھاتا ہے اور اسے نیام سے نکال کر)
دیکھ یہ راستہ ہے۔

ثریا۔ تلوار؟

سلیم۔ زندگی اور موت، دونوں میں انارکلی تک پہنچا سکتی ہے۔

ثریا۔ کیا کہتے ہو شہزادے؟

سلیم۔ میں خود نہیں جانتا۔ لیکن کوئی مدھم آواز میرے
میرے کانوں سے دماغ تک شعلوں میں لرزاں
پکار رہی ہے۔ تلوار راستہ ہے۔

ثریا۔ (سہم کر) وہ مار ڈالی جائیں گی؟

سلیم۔ خدا ہی جانتا ہے۔

ثریا۔ تم انھیں نہ بچاؤ گے

سلیم۔ (سوچ میں سر جھکائے ہوئے) [illegible]

ثریا۔ ہائے نہیں۔ انھیں بچاؤ۔ شہزادے
میں تمہارے پیروں پڑتی ہوں۔ [illegible]
ان سے کہا تھا۔ انارکلی سلیم [illegible]
ناممکن ہے ناممکن ہے۔ تم نے نہیں [illegible]
چھوڑ سکتا ہوں اس محل کو۔ [illegible]
تم نے کیا کہا تھا اگر تو [illegible]
تاروں کے سامنے کہا تھا
خدا کے سامنے کہا تھا۔
ایک بزدل کی [illegible]
ایک کمزور
عورت [illegible]

سلیم۔ [illegible]

جنبشِ گرم سانس ہیں؟

ثریا۔ نہیں تم ان کو بچاؤ گے۔ بس کرو۔ بن کی صورت دکھاؤ گے
تم مرد ہو۔ بات کے دھنی ہو۔ تم اپنا قول پورا کر کے
دکھاؤ گے۔ اُسے قید خانے کے اندھیرے میں پتے کی طرح
کانپ کانپ کر سلیم۔ سلیم کہہ کر دم توڑنے کو نہ چھوڑ دو گے

سلیم۔ (بے قراری سے) چلی جا۔ چلی جا۔ نہیں تو میں کچھ ایسا
کر بیٹھوں گا۔ کہ فطرت خود ششدر رہ جائے گی۔

ثریا۔ کہہ دو۔ وہ بچ جائیں گی۔ اور کہہ دو مجھے نکال دو
یہاں سے۔ اپنے محل سے۔ اس دنیا سے۔ شہزادے
میں ہنستی ہوئی رخصت ہو جاؤں گی۔

سلیم۔ صرف وقت جانتا ہے کیا ہونے والا ہے۔ جا اور انتظار کر۔

ثریا۔ میں اپنی باجی کو دیکھ پاؤں گی؟

سلیم۔ اور یا سلیم کو بھی نہ دیکھنے پائے گی۔

ثریا۔ خدا تمہیں دنیا کی بادشاہت نصیب کرے۔ میں جاتی
ہوں۔ (ثریا جاتی ہے)

سلیم۔ (پیشانی پر ہاتھ رکھ کر فکر میں غرق کھڑا ہو جاتا ہے
کھڑے کھڑے لڑکھڑا جاتا ہے) کیسی گھڑی ہے اور اندھیری کر
جس میں خون کے جلتے ہوئے دھبے ناچ رہے ہیں۔
اور اس پار زرد چہرہ۔ پھٹی ہوئی آنکھیں۔ اور
نزع کی مدھم چیخیں! یا رب یہ کیا ہو گیا۔ کیوں ہو گیا؟
میری انارکلی۔ میری جان۔ میری روح تم کہاں ہو؟
(بے تابی سے کمرے میں پھرنے لگتا ہے۔ منیر داخل ہوتا ہے)

منیر۔ شہزادے تمہیں کیا ہو گیا؟

سلیم۔ (جلدی سے منیر کی طرف بڑھ کر) منیر جلد کہو۔ کیا خبر
لائے؟ میرے لئے ہر طرف مایوسی ہے۔ ہر طرف نامرادی ہے
وہ نہیں مانتے۔ نہ مانیں گے۔ اپنے نامراد دوست
اپنے بدبخت شہزادے کی تنہا امید تو ہے۔ بتاؤ داروغہ

زنداں سے مل لیا؟ وہ مان گیا؟ نہیں مانا تب بھی کہہ دو
وہ مان گیا۔ نہیں تو میرا دماغ پھٹ جائے گا۔ ٹکڑے ٹکڑے
ہو جائے گا۔

منیر۔ (قریب جا کر آہستہ سے) وہ تمہیں انارکلی سے ایک مرتبہ
ملا دینے پر آمادہ ہے۔

سلیم۔ آمادہ؟ سچ ہے۔ یا صرف میرے لئے تسلی؟ پہلے بھی تو
دل لرزتا ہے لیکن منیر تم نے سچ کہا۔ وہ آمادہ ہے؟

منیر۔ ہاں وہ آمادہ ہے۔ لیکن بہت بڑے معاوضے پر۔

سلیم۔ انارکلی کو چھوڑ کر وہ میرا سب کچھ لے سکتا ہے۔

منیر۔ لیکن سلیم میرے دوست۔ میرے شہزادے۔ میں پھر کہوں گا
تم خطروں میں گھرے ہی گھرے ——————

سلیم۔ کچھ نہ کہو۔ منیر اس وقت کچھ نہ کہو۔ میں جنون سے بہت قریب
ہوں۔ مجھے صرف بتاؤ۔ کب؟ کس وقت؟

منیر۔ آج رات کو۔

سلیم۔ تنہائی میں؟ -

منیر۔ اگر تم مجھ سے کام لینے کا وعدہ کرو۔

سلیم۔ (سوچتے ہوئے) مجھ سے۔ میں تجھ سے کام لوں گا۔ خوب
تجھ سے۔ اپنی سمجھ سے۔

منیر۔ اپنی سمجھ سے کیا؟

سلیم۔ (جو کچھ میرے دل میں ہے۔ وہ آخر زبان پر آ جاتا ہے)
وہ ایک قاہر بادشاہ کے انصاف کی محتاج نہ رہے گی۔

منیر۔ (متوحش ہو کر) تمہارا کیا ارادہ ہے؟

سلیم۔ اسی رات صبا رفتار گھوڑے ہم اسے کسی ایسے محفوظ مقام
میں پہنچا دیں گے۔ جہاں کبر کا آہنی قانون نہ پہنچ سکے گا۔

منیر۔ سلیم تم دیوانے ہو گئے ہو

سلیم۔ اگر [illegible] پر چھوڑ دیا۔ تو منیر دیوانہ
[illegible]

منیر۔ لیکن شہزادہ کے پاس سپاہی ؟

سلیم۔ وہ ہمت اور ولی عہد کی تلوار۔

منیر۔ سلیم یہ بغاوت ہے !

سلیم۔ میں اس پر آمادہ ہوں !

منیر۔ (سہم کر) تم اپنے باپ سے۔ ہندوستان کے شہنشاہ سے باغی ہو جاؤ گے ؟

سلیم۔ تمام دنیا ہی باغی ہے۔ بادشاہ خدا سے۔ تحویل اخلاص سے مصلحتیں انصاف سے۔ محبت والدین سے۔ اور اب جو کچھ باقی ہے۔ وہ بھی باغی ہو گا۔ سب کو باغی ہو جانے دو اور دیکھتے رہو کہ آگ اور خون اور موت اور جنون کے اس دیوانے ہنگامے میں سے دمکتا ہوا کیا نکلتا ہے !

منیر۔ تم جانتے نہیں۔ اس کا نتیجہ کیا ہو گا !

سلیم۔ میں جاننا نہیں چاہتا !

منیر۔ کاش مجھے پہلے سے معلوم ہوتا میری اس کوشش کا نتیجہ یہ ہو گا !

سلیم۔ تو معاملات اور بدتر ہو جاتے !

منیر۔ تم نے مجھ سے کہا تھا۔ تم انارکلی سے۔ صرف ایک مرتبہ ملنا اور صرف اس کو دیکھنا چاہتے ہو !

سلیم۔ تب امید متارہی تھی۔ اب بجھ چکی !

منیر۔ میں نے اسی کی اجازت داروغۂ زنداں سے لی تھی۔ اسے شبہ تھا بہت تامل تھا۔ میرے اصرار پر بمشکل اس کو اطمینان دلایا۔ لیکن شہزادے وہ ہوشیار ہو گا۔ ظل الٰہی کے عذاب کا خوف اسے چوکنا رکھے گا۔ بہت چوکنا وہ جیتے جی تمہیں انارکلی تک نہ جانے دے گا !

سلیم۔ (بھڑک کر) میرے جیتے جی وہ انارکلی کو رکھنے نہ پائے گا

منیر۔ سلیم تم تباہ ہو جاؤ گے۔ گرفتار ہو گئے تو ذلیل و رسوا۔ اور فرار ہو گئے تو آوارۂ وطن اور بے نوا !

سلیم۔ (کہیں دور دیکھتے ہوئے) جو آ رہا ہے آنے دو۔ منیر اسے (تم روک سکتے ہو۔ اور نہ اکبر اعظم۔ ایک طرف موت کے خون آلود دانت ہیں۔ اور دوسری طرف غریب الوطنی کے زہر آلود کانٹے۔ اور دونوں کے درمیان تقدیر۔ پُراسرار ششدر اور چپ چاپ۔ کون جانے اس کے ہونٹوں پر تبسم آ جائے۔ یا آنکھوں میں آنسو۔ لیکن موت بھی انارکلی کے لئے اور اس کے پہلو میں شیریں ہو گی۔ منیر وصال کی طرح شیریں۔ (ایک شیریں تصور اس کی آنکھیں ہلکے ہلکے بند کر دیتا ہے۔ ذرا دیر بعد نیم وا آنکھوں سے) مگر میرے دوست آ۔ کچھ مت بول چپ چاپ میرے سینے سے لگ جا۔ مجھے ڈر ہے۔ میرا دل اتنا نہ دھڑک اٹھے کہ تھم جائے۔ میں تسکین چاہتا ہوں !

(سلیم ہاتھ پھیلاتا ہے۔ منیر کچھ دیر اسے دیکھتا رہتا ہے۔ اور پھر دوڑ کر دو زانو ہو جاتا ہے اور اپنے دوست کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا ہے۔ سلیم اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیتا ہے)

پردہ

شکم الملت حضرت اکال الکل

(اس مضمون کے تاریخی اور ماقبل التاریخ واقعات کی صداقت کی ذمہ داری ساادی کی گردن پر نہیں۔ کیونکہ راوی نے یہ تفصیلات ترجمان حقیقت علامہ اقبال۔ مولانا سالک مدیر انقلاب۔ چودھری محمد حسین ایم اے سپرنٹنڈنٹ محکمہ اطلاعات و دیگر بزرگوں کی زبانی سنی ہیں۔ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغ ؛)

یکایک تخلیق کا شور و غل رک گیا۔ اور فضائے اعلےٰ میں ایک قرنا کی سی آواز نے سکوت پیدا کر دیا۔ . . . .

"معدہ لاؤ. . . . . معدہ. . . . جلد ایک انسانی معدہ لاؤ!"

اس حکم سے ایک ساعت کے لئے ملائکہ مبہوت ہو کر رہ گئے اور پھر پہلے سے زیادہ شور برپا ہو گیا۔ کوئی دوڑا جا رہا تھا کوئی دوسرے سے سوال کر رہا تھا۔ کوئی یونہی چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ وہی آواز پھر اٹھی! . . . .

"معدہ لاؤ. . . . . . جلد ایک انسانی معدہ لاؤ!"

اور فضائے اعلےٰ پر پھر ایک سکوت چھا گیا۔ سرگردان انسان ازل نظریں جھکائے کھڑے تھے۔ کہ ایک پُرافشاں شعاع صفوں کو چیرتی ہوئی آگے نکل آئی!

"حضور! انسانی معدے ختم ہو چکے ہیں۔ بلکہ حیوانی معدے بھی! انسان اور حیوان سب ساخت ہو چکے ہیں اور ان کے معدے اپنی اپنی جگہ لگا دیئے گئے ہیں. . . . . ہاں دو اونٹوں کے معدے فالتو پڑے ہیں"؛

آواز آئی ۔ "لاؤ۔ یہی معدے لاؤ۔ یہ آدمی بھی شتر سے کم نہیں ہے۔ اسے بنتے بنتے بہت دیر ہو گئی۔ لاؤ. . اسے دونوں معدے لگا دیئے جائیں . . . یہی اس کا انعام ہے اور یہی اس کی سزا ہوگی"

(۲)

یہ ہے حضرت اکال الکل کی تخلیق کی داستان غرض یہ کمال جو آج انھیں مشہورِ عالم بنا رہا ہے سب خدائے بخشندہ کی دین ہے۔ ورنہ یہ سعادت بزور بازو حاصل نہیں ہو سکتی؛

حضرت اکال الکل دنیا میں کس طرح آئے اور بچپن کس طرح گذارا۔ یہ بجائے خود ایک مستقل قصہ ہے۔ مختصر یہ کہ منہ کھولے ہوئے طعام کے لئے بلبلاتے ہوئے آئے ۔۔ اور طفولیت کے ایام یونہی فریاد کرتے کاٹے۔ پہلے ایک دایہ پھر دو پھر تین پھر چار پھر پانچ اور یہ سلسلہ انتہا ہی کبھی ختم نہ ہوتا۔ اگر ان کا کھلا ہوا دہن روئی کے لقمے سے زبردستی بھر نہ دیا جاتا!۔۔۔ کہتے ہیں کہ جب حضور نے پہلے لقمہ کھایا۔ کوئی دو سال کے تھے ۔ تو فرط انبساط سے وہیں گویا ہو گئے۔ یہ اسی پیش گفتاری کا نتیجہ ہے کہ آج حضرت کا کلام معانی سے دس گز آگے ہوتا ہے۔ اور طالع اپنے ذہن کی کوتاہی کو ان کی لکنت پر محمول کرکے اپنے آپ کو فریب تفوق دے لیتا ہے؛

(۳)

مجھے حضرت کا پہلا کارنامہ یاد نہیں۔ اور سچ تو یہ ہے

کہ ان کا ہر کام کارنامہ ہوتا ہے۔ اور ہر کارنامہ اپنی قسم کا پہلا ہوتا ہے۔ مگر "ملفوظاتِ دستار بندی" کے باب میں ہے وہ جو برات کا قصہ ایک بوڑھے کے متعلق زبان زد عوام ہے اس کے ہیرو بھی حضور ہی ہیں۔ آپ کا سن شریف اس وقت کوئی تین کے قریب ہوگا۔ یا کچھ کم۔ کہ ان کی برادری میں کوئی شادی رچائی گئی۔ برات دوسرے شہر میں اس وقت کے مشہور اکال حضرت بطلینی علیہ الرحمتہ کے گھر جاتی تھی۔ حضرت بطلینی خود کھاتے تھے۔ اور دوسروں کو بھی کھلاتے تھے۔ اور اس طرح شکم سیری کے ساتھ چشم سیری کا حظ (!) اٹھاتے تھے۔ انھوں نے کہلا بھیجا۔ کہ برات میں بوڑھے مریض بچے وغیرہ کوئی نہ ہوں محض مشاہیر اکال ہی ہوں تاکہ ایک باقاعدہ ٹورنامنٹ ہو سکے۔ اور یہاں تک شدت کی کہ اپنے دروازے پر مجاسب طبیب اور ملا مقرر کر دیئے تاکہ وہ نبض دیکھ کر اور نگاہوں سے جانچ کر فقط ان لوگوں کو داخل ہونے دیں۔ جو صحیح معنوں میں شمولیتِ دعوت کی اہلیت رکھتے ہوں۔

ادھر ہمارے حضرت نے کہ ابھی تین سال کے ننھے منے بچے تھے۔ اور سب انھیں پیار سے "اکلیل" پکارتے تھے۔ گھر میں قیامت برپا کر دی۔ "دعوت ہو اور ایسی معرکے کی دعوت ہو۔ اور وہ مدعو نہ ہوں ـــــــ معاذ اللہ!" گھر والوں کی جان عذاب میں آگئی..... آخر ان کے نانا جو اس پیری میں بھی جوانوں کا سا معدہ رکھتے تھے۔ ان کو چوری چوری ایک صندوقچی میں بند کر کے ساتھ لے چلے۔ یہ صندوقچی ہر اکال سے لازم و ملزوم ہے۔ کیونکہ اس میں علم چورن اور نیز ہر اکال کے خاص خاندانی ہاضم نسخے محفوظ ہوتے ہیں۔

برات منزلِ مقصود پر جا پہنچی۔ اور ریل سے اترتے ہی اسباب ہاتھوں میں لئے سیدھی دعوت خانے میں جا گھسی اور "طعام طعام" کا شور برپا کر دیا۔ غرض دیگوں کے منہ کھل گئے اور شوربے کے دریا بہنے لگے اور اس پہلے ہلے میں جو کچھ سامنے آیا دیکھتے دیکھتے صفاچٹ ہو گیا حضرت بطلینی ماہرِ فن تھے۔ گھبرائے نہیں۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کا ردِ عمل کیا ہوگا۔ اور باورچی خانہ سے اور زیادہ مستعدی سے کھانا بھیجنے لگے۔

پلیٹیں آتیں۔ اور خالی ہو ہو کر جاتی تھیں۔ یہ مہمانوں اور میزبانوں کی رسہ کشی کا سلسلہ دیر تک قائم رہا۔ مگر آخر کار کھانے والوں کی نگاہیں اور پھر ہاتھ اور پھر سانس بدلنے لگے۔ ہر کوئی اپنی نشست پر بے چین تھا۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے سے گفتگو کرنے لگے۔ اور جب اس کی بھی تاب نہ رہی تو محض نگاہ بازیاں ہونے لگیں۔

اس تیر از ممکنات لمحے میں حضرت بطلینی ایک نہایت فاتحانہ انداز میں دعوت خانے میں داخل ہوئے اور فاتحانہ تبسم سے فرمانے لگے۔

"حضرات اور جس چیز کی فرمائش ہو بے تکلف کہئے"

(۴)

اس طنز نے دوبارہ ایک سپرٹ پیدا کر دی اور اکالوں کی یہ جماعت کھانے پر پھر پل پڑی۔ مگر یہ حملہ دیر تک جاری نہ رہ سکا اور صفوں میں جا بجا سے نعرے لگے۔ مکمل پسپائی کے آثار دکھائی دینے لگے

آخر یہ جمعیت یہاں تک بے دل ہو گئی۔ کہ ایک شخص اعترافاً بول اٹھا: "یہاں تو اگر ہم سب اپنا خاندان بھی لے آتے تو رہ جاتے" یہ فقرہ گویا ننگا سی تھی

کہ اس نے یکایک ہمارے ہیرو حضرت اکال الکل کے نانا کے دماغ میں الہام کی آگ روشن کر دی۔ ان کی وہ یادداشت جو کھانے کی مصروفیت نے بند کر دی تھی پھر عود کر آئی ـــــ "خاندان" کے لفظ سے خاندان اکالین کے چشم و چراغ حضرت اکلیل کا یاد آ جانا کوئی بڑی چھلانگ نہ تھی۔ آپ کے نانا نے صندوقچی کو دامن میں اچھی طرح چھپا کر اس کا ڈھکنا کھول دیا اور حاضرین کو مخاطب کر کے کہنے لگے:-

حضرات اب پسپائی لازمی نظر آتی ہے۔ اس لئے ہمیں ایک آخری کوشش اور کرنی چاہئے۔ تا کہ مقابلے کا وقت زیادہ شمار ہو سکے۔ میں آپ سب کی توجہ سیدنا و مرشدنا حضرت امام شکمی علیہ الطعام کی کتاب "الطعام وما ینبغی لہٗ" کے بیسویں "مائدہ" کی طرف منعطف کراتا ہوں۔ بڑے بڑے کھوکھلے لقمے بنانے شروع کر دو"

اس غیرت بخش تقریر سے حاضرین میں ایک نئی روح پیدا ہو گئی۔ اور آوارہ نگاہیں پھر پلیٹوں پر جم گئیں:

اِدھر حضرت اکال الکل کا ڈھکنا کھل گیا۔ پھر کیا تھا جو پلیٹ آتی۔ دیکھتے دیکھتے صاف ہو جاتی اور آخر کار وہ وقت آگیا۔ جب طعام بانٹنے والوں کے پاؤں میں سستی آگئی اور ان کے ہاتھ کام کرنے سے رہ گئے۔ ان کی ہمتیں پست ہو گئیں۔ یہ دیکھ کر دیگر حضرات کی جرأت بھی بلند ہو گئی۔ اور چاروں طرف سے "کھانا لاؤ۔ کھانا لاؤ" کے جنگی نعرے بلند ہونے لگے

اب حضرت بطینی خود ہاتھ جوڑ کر سرنگوں کھڑے ہو گئے۔ اور کہنے لگے:-

"حضرات میں اپنی دستارِ فضیلت آپ کے قدموں پر رکھتا ہوں اور آپ کو اجازت دیتا ہوں۔ کہ آپ اپنے میں سے جس کو اہل سمجھیں اس کو دیدیں۔ میرا ذخیرہ بالکل ختم ہو چکا ہے!" ـــــ آخری فقرہ حضرت اکال الکل کے سینے میں تیر ہو کر لگا۔ جس کے پیٹ پر بن جائے وہ ہر مصلحت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ حضرت "اکلیل" صندوقچی سے اچھل کر باہر آگئے اور حضرت بطینی کو ایسی گرسنہ نگاہوں سے تاک کر "اور لاؤ" کا پُرشور نعرہ لگایا۔ کہ وہ اپنا جسم و جان بچا کر بھاگے۔ سب حاضرین نے دستار اکالی حضرت کے نانا کے قدموں میں رکھدی اور انھوں نے بھرے مجمع میں خود اپنے ہاتھوں سے اسے حضرت "اکال الکل" کے سر پر باندھ دیا!

اس مہین شب کے بعد آپ کا نام چار دانگ عالم میں مشہور ہو گیا:

(راوی۔ نظامی قدوسی۔ ایم اے)

نیرنگ خیال کا آئندہ نمبر۔ سہ رنگی۔ یک رنگی تصاویر اور نہایت دلچسپ مضامین سے مرصع ہے۔ ناظرین انتظار کریں

رشحات عالیہ

(از مولانا سیماب اکبرآبادی مدیر "تاج" آگرہ)

دل ہے تو کسی کا اسے کاشانہ بنا دے — کعبہ نہیں بنتا ہے تو بتخانہ بنا دے

ہستی کو مری مستیٔ پیمانہ بنا دے — اے بے خبری حاصل میخانہ بنا دے

دنیا ابھی مانوس نہیں درس وفا سے — اس لفظ کو عنوان صد افسانہ بنا دے

اے برہمن اک دن بت پندار کو اپنے — توڑ، اور چراغ در بت خانہ بنا دے

کاغذ پر وہ دیکھینگے مرے شوق کی پرواز — ہے کوئی، کہ موج پر پروانہ بنا دے

یا کعبہ و بت خانہ میں پہنچا خبر اپنی — یا بے خبر کعبہ و بت خانہ بنا دے

دل ظرف طلب، خون جگر مائل مستی — میں بادہ بناتا ہوں تو پیمانہ بنا دے

رسوا ہو دم صبح نہ راز شب محفل — اے کاش کوئی تربت پروانہ بنا دے

کہدو کہ بہار آئے تو بیکار نہ بیٹھے — دیوانہ بنے یا مجھے دیوانہ بنا دے

خاکستر پروانہ میں جو سوز نہاں ہے — جب چاہے پھر اس خاک سے پروانہ بنا دے

ٹکڑے جو بچیں بت کے انہیں پھینک نہ بتگر — دو چار چراغ در بت خانہ بنا دے

"کن" محشر کونین ہے "دل" دفتر دارین — وہ چاہے تو دو حرف سے افسانہ بنا دے

وہ مستیٔ پندار شکن مانگ رہا ہوں — جو قابل یک سجدہ میخانہ بنا دے

اے شمع یہ پروانے کو ہنس ہنس کے جلانا — کیا ہو جو تجھے بھی کوئی پروانہ بنا دے

دیوانگیٔ عشق بڑی چیز ہے سیماب

یہ اس کا کرم ہے جسے دیوانہ بنا دے

دہلی کا ایک مشہور باتصویر رسالہ ہے
جس میں ان چھ اہم ابواب پر اعلیٰ مضامین بہترین
افسانے شائع ہوتے ہیں قیمت سالانہ دو روپے نمونہ مفت
منیجر رسالہ پیشوا دہلی
مذہب
اخلاق
تاریخ
ادب
اصلاح

دوشیزہ حصہ دوم

اکثر احباب دوشیزہ کا حصہ دوم طلب کرتے ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ حصہ دوم اسقدر ضخیم ہے کہ اس کی تیاری پر کافی وقت خرچ ہوگا۔ دوشیزہ حصہ دوم ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے ابھی چھ سو صفحات کا مواد تیار ہوا ہے - باقی کام ہو رہا ہے - تصاویر بھی اس کے لئے مہیا کی جا رہی ہیں۔

حصہ اول پبلک میں اسقدر مقبول ہوا ہے کہ سینکڑوں تعریفی خطوط موصول ہو چکے ہیں۔ جناب چودھری اللہ رکھا صاحب جھنگ سے لکھتے ہیں۔

"دوشیزہ فی الواقعی اردو زبان میں علم نوجی پر لاجواب تصنیف ہے۔ خاکسار نے اردو ہندی میں اس فن پر متعدد کتب کا مطالعہ کیا ہے۔ مگر وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ ان ہردو زبانوں میں اتنی تحقیق اور عرق ریزی سے کوئی کتاب مرتب نہیں ہوسکی کتاب مذکورہ کی دوسری جلد کا پہلا نسخہ سب سے پہلے مجھ ہی کو دی پی کریں"۔ انشاءاللہ حصہ دوم پہلے حصہ سے زیادہ مقبول ہوگا

منظومات

زمزمۂ تغزل

خلوتِ راز سے ہاں پردہ کشا ہو جانا — دیکھ لے تو بھی قیامت کا بپا ہو جانا

کس سے گم گشتگیٔ شوق کی لذت کہئے — یوں تو ہم جانتے ہیں راہنما ہو جانا

خونِ ارباب وفا کی کوئی قیمت نہ سہی — تم مگر کچھ تو پشیمانِ جفا ہو جانا

دہر ہر صورت و حالت میں ہے تغییر پذیر — فطرتِ درد میں پاتا ہوں روا ہو جانا

ہمہ تن عرضِ تمنا تو نہیں ہوں، ہیں حضور — بات کرنے بھی نہ پاؤں کہ خفا ہو جانا

جوشِ تکمیل ہے موجود تو اے ذوقِ جنوں — اُن نگاہوں کو سکھا ہوش ربا ہو جانا

مہلت اے حسن کہ آپے سے گزرنے دے مجھے — پھر ہر اک ذرہ سے تو جلوہ نما ہو جانا

ہمنشیں پوچھ نہ اُس بزم کا افسانۂ ناز — دیکھ کر آئے ہیں بندوں کا خدا ہو جانا!

مٹ گئے، اور سُہاؔ پردۂ ہستی نہ اُٹھا

ورنہ دشوار نہ تھا کچھ بھی خدا ہو جانا!

(غیر مطبوعہ)

سُہاؔ

ارشاداتِ فانی

(از جناب فانی بدایونی بی اے - ایل ایل بی)

میری آشفتہ حالیاں نہ گئیں　　　دل کی نازک خیالیاں نہ گئیں

عشق بیگانۂ مجاز رہا　　　حسن کی بے مثالیاں نہ گئیں

میری شیوا نگاہیاں جا ہیں　　　تیری رسوا جمالیاں نہ گئیں

دل حریفِ زوالِ غم نہ ہوا　　　عشق کی بے کمالیاں نہ گئیں

موت بھی زندگی کی حد نہ رہی　　　غم کی بے اعتدالیاں نہ گئیں

ہوش میں لاکھ انقلاب آئے　　　عقل کی خستہ حالیاں نہ گئیں

موت بھی آہی جائے گی فانی

تیری محزوں خیالیاں نہ گئیں　　　فانی بدایونی

غیر مطبوعہ

جلوۂ عشق حقیقت تھی حسنِ مجاز بہانہ تھا　　　شمع جسے ہم سمجھتے تھے شمع نہ تھی پروانہ تھا

شعبدے آنکھوں کے ہم نے ایسے کتنے دیکھے ہیں　　　آنکھ کھلی تو دنیا تھی بند ہوئی افسانہ تھا

عہدِ جوانی ختم ہوا اب مرتے ہیں نہ جیتے ہیں　　　ہم بھی جیتے تھے جب تک مرجانے کا زمانہ تھا

دل اب دل ہے خدا رکھے ساقی کو مینخانے کو　　　ورنہ کسے معلوم نہیں ٹوٹا سا پیمانہ تھا

فانی گو کیسا ہی سہی پھر بھی تجھ سے نسبت تھی

دیوانہ تھا، تھا کس کا؟ تیرا ہی دیوانہ تھا　　　فانی بدایونی

رباعیاتِ فراق

(جناب رگھوپت سہائے فراق گورکھپوری)

(۱)

دنیا میں ترے سوا سہارا بھی نہیں
عقبیٰ میں ترے سوا ٹھکانا بھی نہیں
سونپا تجھے جس نے خود کو، خود کو پایا
تیرا جو نہیں ہوا وہ اپنا بھی نہیں

(۲)

پاک نگاہوں سے تجھے دیکھا تھا
غمناک نگاہوں سے تجھے دیکھا تھا
دل تھا وہ، کہ جس نے ہم کو غافل پا کر
بیباک نگاہوں سے تجھے دیکھا تھا

(۳)

او پردۂ غیب میں سنورنے والے
او میری طرف نظر نہ کرنے والے
سینے میں تجھے اُتار لاؤں تو سہی
داغِ دلِ زار ہیں اُبھرنے والے

(۴)

پینا جو نہیں تو خیر پینے کا ہے نام
تر کر لے لبوں کو کیوں ہے رہتا ناکام
پیمانۂ دل کی تہ میں کچھ تو ہے تری
قسمت میں کہاں فراقؔ چھلکا ہوا جام

(۵)

جینا تو نہیں ہے خیر جینے کا ہے نام
رونا تقدیر کا ہے آخر اک کام
اے موت کی نیند ہم بھی جاگے ہیں بہت
آ بھی تو آفتاب اپنا لبِ بام

(عمر خیام)

غزل

(از جناب مستطاب علی حیدر طباطبائی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ بہادر نظمؔ)

اعمال کے سبب سے گراں بار ہو گئے — جو مرحلے تھے سہل وہ دشوار ہو گئے

میکش کے حق میں زہر ہے تمیز نیک و بد — رحمت خدا کی اُن کو جو سرشار ہو گئے

بسمل دل و جگر کو نہ دیکھا تھا اس طرح — نالے تو آج کھنچتے ہی تلوار ہو گئے

قہر و عتاب کی بھی نگاہیں تھیں دلنشیں — پیوست تیر تا لب سوفار ہو گئے

اس رہگذر میں دام نہاں زیرِ دام تھا — آزاد بھی ہوئے کہ گرفتار ہو گئے

بجلی کی طرح کرتے ہیں راہ صراط طے — اس پار سے تڑپ کے ہم اُس پار ہو گئے

مومن بھٹکتے رہ گئے پھندے ہیں سبحہ کے — کافر اسیر حلقۂ زنار ہو گئے

ساقی کی چشم مست کا رندوں سے حال پوچھ — ملتے ہی آنکھ واقف اسرار ہو گئے

مرکز کی طرح جب کوئی ثابت قدم رہا — چکر نصیب کے خطِ پرکار ہو گئے

بدحواسیوں میں نظمؔ شب عمر کٹ گئی

غافل کبھی رہے کبھی ہشیار ہو گئے

نظم طباطبائی

(غیر مطبوعہ)

نکاتِ حیات

(شیخ عبداللطیف صاحب تپش گورنمنٹ کالج لاہور)

رنگینیٔ فضا میں افسانۂ قلق ہوں   آغوش میں افق کی گہوارۂ شفق ہوں
دودِ چراغِ غم کا برہم زدہ نسق ہوں   شیرازۂ فنا کا بکھرا ہوا ورق ہوں

"حل ہی نہیں ہے جس کا وہ نکتۂ ادق ہوں
میں اپنی زندگی کا بھولا ہوا سبق ہوں"

کیا شمع کی زباں سے افشا ہو راز میرا   پروانہ خاک سمجھے سوز و گداز میرا
گوش آشنا نہیں ہے درسِ مجاز میرا   ہے مظہرِ نوائے خاموش ساز میرا

"حل ہی نہیں ہے جس کا وہ نکتۂ ادق ہوں
میں اپنی زندگی کا بھولا ہوا سبق ہوں"

کہتا ہے کوئی چشمِ بیتاب نور مجھ کو   سمجھا کسی نے داغِ دامانِ طور مجھ کو
پایا کہیں حجابِ شانِ ظہور مجھ کو   دیکھا کبھی وجوبِ امکان دور مجھ کو

"حل ہی نہیں ہے جس کا وہ نکتۂ ادق ہوں
میں اپنی زندگی کا بھولا ہوا سبق ہوں"

ارضِ عبودیت کے ذرات منتشر میں   چرخِ الوہیت کی بیگانہ خو نظر میں
ہر شب کی خامشی میں غوغا ہے ہر سحر میں   آہِ شرر فشاں میں قطرات اشک تر میں

"حل ہی نہیں ہے جس کا وہ نکتۂ ادق ہوں
میں اپنی زندگی کا بھولا ہوا سبق ہوں"

رباعیات

(از حضرت مجنوں گورکھپوری بی اے)

(۱)

کیا پوچھتے ہو کہ زندگانی کیا ہے؟ ہم کیا کہیں تم سے یہ کہانی کیا ہے؟
پڑ جائے جو سر پہ جھیل جانا مجنوں غم کہتے ہیں کس کو، شادمانی کیا ہے؟

(۲)

پھر حشر میں کہتے ہیں کہ جینا ہوگا پھر یعنی لہو جگر کا پینا ہوگا
پھر ہجر کی داستاں چھڑیگی مجنوں غم سے پھر داغ داغ سینا ہوگا

(۳)

بے سود ہیں رنج اور خوشی کے جھگڑے رنج اور خوشی ہیں جیتے جی کے جھگڑے
موت آنے دو ہوش کچھ نہ ہوگا مجنوں اک دم میں مٹیں گے زندگی کے جھگڑے

(۴)

تھی عشق کے ہاتھوں زندگانی اپنی کچھ اور ہی تھی پیری و جوانی اپنی
سچ ہے اک روز ہم نہ ہونگے لیکن رہ جائے گی دکھ بھری کہانی اپنی

(۵)

ہر سانس عدم کا ہے فسانہ مجنوں جینا مرنے کا ہے بہانہ مجنوں
اک نقش برآب ہے نمود ہستی اک شعبدہ باز ہے زمانہ مجنوں

(قطعہ)

غزل

(از جناب انڈین شکسپیئر آغا حشر کاشمیری صاحب)

جائینگے وہاں خوش دل دیوانہ جہاں ہو گھر لینگے وہیں ایکبے پری خانہ جہاں ہو

ہوگی کوئی جنت، میری جنت تو وہی ہے خمخانہ و پیمانہ و جانانہ جہاں ہو

منہ چوم نہ لے پھول کے دھوکے میں تمہارا جانا نہ وہاں بلبل دیوانہ جہاں ہو

اے حشر میرے شعر ہیں مستی کا ترانہ

گانا یہ غزل محفل رندانہ جہاں ہو!

غیر مطبوعہ رسالہ وائی۔کے، طارق

بہار تخیل

(از حضرت آغا حشر کاشمیری)

ہاں ساقیٔ مستانہ بھر دے مرا پیمانہ بدمست گھٹا ہے، یا، اُڑتا ہوا میخانہ

ہوتی ہیں شب غم میں یوں دل سے مری باتیں جس طرح سے سمجھائے دیوانے کو دیوانہ

کیا تم نے کیا دل سے کیا دل نے کیا مجھ سے بیٹھو، تو سناؤں میں، اک روز یہ افسانہ

وہ کیوں نہ ہو دشمن، جب قسمت مری دشمن ہے کس طرح کروں یارب، تقدیر سے یارانہ

ہر سمت نظر آتی تھیں، حسن کی تصویریں جب تک کہ جوانی تھی، دنیا تھی پری خانہ

مطرب سے یہ کہتا تھا حشر اپنی غزل سن کے

ہے میری جوانی کا بھولا ہوا افسانہ

مالن کی بیٹی

(علامہ جمیل مظہری کاظمی بی، اے)

جذبات کی دنیا ہلتی ہے لبریز ترنم وادی ہے
آکاس کی کوئی دیوی ہے جو پیڑ پہ بیٹھی گاتی ہے
مل کر پھولوں کے جھرمٹ میں چھپکر پتوں کی گھونگٹ میں
کچھ اپنی دھن میں گاتی ہے اور ڈالی ہلتی جاتی ہے
ہر نخل چمن کا گھوم گیا اور پتہ پتہ جھوم گیا
جب گاتی ہے تو منظر پر مستی بن کر چھا جاتی ہے
پھیلا ہوا رخ پر کاجل ہے سرکا ہوا سر سے آنچل ہے
کمسن ہے اٹھتی کونپل ہے تنہائی میں بھی شرماتی ہے
بل کھائے ہوئے کافر گیسو چہرے کی بلائیں لیتے ہیں
جب چومتے ہیں وہ گالوں کو جھنجھلا کے انہیں سرکاتی ہے
بچپن کا تقاضا ہے شوخی، شوخی کا نتیجہ ہے غیرت
جھک جاتی ہیں آنکھیں شرم سے خود ہونٹوں پہ ہنسی جب آتی ہے
گالوں پہ ہے لالی پھولوں کی، ہاتھوں میں ہے ڈالی پھولوں کی
دیکھو متوالی پھولوں کی، پھولوں کا ہار بناتی ہے
چن چن کے پروتی جاتی ہے دھلکے ہیں شگفتہ کلیوں کو
دھاگا جو الجھ جاتا ہے کبھی، ماتھے پہ شکن پڑ جاتی ہے
آگاہ نہیں خود بینی سے واقف نہیں گھورا گھوری سے
معصوم نگاہیں کیا جانیں نرگس کیوں آنکھ لڑاتی ہے

سانچے میں گلوں کے ڈھلنے دو گلشن کی ہوائیں پلنے دو

منہ بند کلی ہے فطرت کی تھم تھم کر کھلتی جاتی ہے

لولب پہ تبسم لہرایا اک موج اٹھی انگڑائی کی

بادل چھایا بجلی چمکی اب دیکھئے کیا برساتی ہے

کھل کھیلتی ہے شوخی اس کی برسات کے پیارے موسم میں

جب پھول چمن کے کھلتے ہیں فطرت عریاں ہو جاتی ہے

گھر ہے پھولوں کی جنت [illegible] ہیں

[illegible] کو ہنسی سکھلاتی ہے

سوتی ہے چھاؤں میں پیڑوں کی سبزے نے [illegible]

گلشن کی جمال افروز ہوا لوری [illegible]

منظر پہ اداسی چھانے سے گلشن میں خزاں [illegible]

اور پھولوں کے مرجھانے سے دنیا کو سمجھتی جاتی ہے

دن بھر کا تھکا ماندہ سورج جب جھاڑی میں چھپ جاتا ہے

اور کوئل آم کے پیڑوں پر جب شام کا نغمہ گاتی ہے

خاموش فضائے صحرا پر اک نیند سی طاری ہوتی ہے

بہتا دریا تھم جاتا ہے پتی پتی سو جاتی ہے

معصوم دل اس کا پہلو میں کروٹ لے کر جاگ اٹھتا ہے

مغموم نظر اس منظر کی محویت میں کھو جاتی

پھولوں کی یہ شہزادی ہے گلشن پہ حکومت کرتی ہے

یعنی "مالن کی بیٹی" مالا پھولوں کی بنا لے [illegible]

(بقیہ نوٹ متعلق تصاویر)

جودھابائی - یہ رنگین تصویر جناب لالہ کرشن دیال صاحب کا کارنامہ ہے - لالہ کرشن دیال منشی بلاقی داس صاحب مرحوم کے جانشین ہیں - منشی بلاقی داس وہ ہیں جنہوں نے حدیث وتفاسیر اور قرآن مجید کے متعدد ایڈیشن نہایت صحت وعمدگی سے شائع کر کے ہندوستان اور بیرون ہند شہرت دوام حاصل کی تھی - لالہ کرشن دیال کو اسی لئے فنون لطیفہ سے اُنس ہے - آپ کا شغل گو تجارت ہے لیکن طبعاً آپ مصور ہیں - اور جب آپ کو کوئی خیال سوجھتا ہے تو اسے فوراً بناتے جاتے ہیں - آپ کا ذوق قابل تعریف ہے - زیرنظر تصویر جودھابائی کی ہے - اس میں قدیم مصوری اور موجودہ نقاشی دونوں کے کمالات کی دوست ملتا ہے - لالہ کرشن دیال کے نقوش آنکھ کو بھلے معلوم ہوتے ہیں - اور انسان کی توجہ روزمرہ کی طرف کھینچ لیتے ہیں - ہم لالہ کرشن دیال کے کارنامے نیرنگ خیال میں وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہیں گے ؛

عکس - ایک فوٹوگرافی کا کمال ہے - گذشتہ سال میو سکول آف آرٹس کی نمائش میں ہم نے یہ تصویر پسند کی تھی - مگر ہمیں سالنامہ کے لئے تیار ... ہم اسے نیرنگ خیال کے عید نمبر میں ؛ کچھ اپنی دھن میں تاج ... کا ایک جزو ہیں - بلکہ اچھی فوٹوگرافی مصوری ... رکھتی ہے - مسٹر لکا گھوم گیا اور پتہ چلا ... مسٹر رام لال لکھی کو برٹش ایمپائر ایگزبیشن سے ... کے ساتھ ہمسفر رہنے کا فخر حاصل کر چکے ہیں ؛

... سے متعلق ملنا چاہیں وہ ایکس سٹوڈیو میکلوڈ روڈ کے پتہ پر مل سکتے ہیں -

پھیلا ہو ... تفصیل دینے کے لئے جگہ کی قلت ہے ؛

نیرنگِ خیال پکچر البم

یعنی نیرنگ خیال کی ان تصاویر کا انتخاب جو وقتاً فوقتاً نیرنگ خیال میں شائع ہوتی رہی ہیں - اس مجموعہ میں کل تیس تصویریں ہیں جن میں سے دس یکرنگی ہیں - تمام بڑے بڑے اور بہترین بلاک انتخاب کئے گئے ہیں - اور ہر تصویر آرٹ پیپر کے صرف ایک ہی طرف لگائی گئی ہے - یہ مجموعہ اپنی لائبریری میں رکھنے یا آرائش کیلئے چوکھٹوں میں لگوا کر رکھنے کیلئے بہترین اور لاجواب ہے ٹائٹل بھی خوشنما ہے البم جو کلکتہ کے انگریزی سالے شائع کرتے ہیں انکی قیمت ۵ روپیہ ہوتی ہے مگر ہم نے اسکی قیمت صرف ... رکھی ہے اور نظر فریب ہیں - کہ ایک ہی تصویر اس قیمت میں بازار سے دستیاب نہیں ہو سکتی اس مجموعہ کو

ملنے کا پتہ: رسالہ نیرنگ خیال نمبر ۵ بارود خانہ - لاہور -

نیرنگ خیال کا ادبی ضمیمہ

Nairang-i-Khiyal Literary Supplement.

(انتظام کیا گیا ہے کہ نیرنگ خیال میں چند صفحات ہندوستان کی علمی ادبی تحریکوں اور جدید کتب کے متعلق وقف کر دیئے جائیں۔ اسی عنوان کے تحت رسائل کی ڈائری بھی شائع ہوا کرے گی۔ ناظرین ان صفحات کو خاص طور پر توجہ سے پڑھا کریں۔ ہم کوشش کریں گے کہ ملک میں جسقدر اچھی بری کتابیں شائع ہوں ان کا ذکر اس عنوان کے نیچے ضرور کیا جائے)

(۱) پرچہ امتحان کی چوری مولفہ محمد اکبر مرادپوری حجم ۲۰۰ صفحات۔ ملنے کا پتہ میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز بک سیلرز انارکلی لاہور قیمت ۱۲ر

پرچہ امتحان کی چوری میں ایسی کہانیاں لکھی گئی ہیں جن کو ماحول طلبا کے گرد وپیش سے مرتب کیا گیا ہے۔ کہانیاں اچھی ہیں۔ لکھائی معمولی ہے چھپائی و کاغذ گوارا ہے۔ زبان سلیس ہے لیکن طرز بیان موثر نہیں۔ طلبا کے لئے مفید ہوگی۔

(۲) درس حیات۔ از جناب محمد اکبر صاحب مرادپوری بی اے بی ٹی حجم ۲۳۱ صفحات۔ ملنے کا پتہ میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز بک سیلرز انارکلی لاہور۔ قیمت درج نہیں۔ یہی کوئی ۱۲ر ہوگی۔

یہ کتاب پرچہ امتحان کی چوری سے بہتر ہے۔ کیا بلحاظ کتابت و طباعت اور کاغذ کے اور کیا بلحاظ مضامین و طرز بیان کے۔ اس میں طالب علم کو مختلف طریقوں سے بتلایا گیا ہے۔ کہ دنیا میں کامیاب زندگی بسر کرنے کے کیا ذرائع ہیں۔ مشکلات کا مقابلہ۔ کیریکٹر۔ خودداری۔ جدوجہد۔ وقت اور روپیہ کا استعمال وغیرہ متعدد ابواب ہیں طلبا اور غیر طلبا دونوں کے لئے مفید ہے۔

(۳) اردو ٹائم ٹیبل۔ مرزا عبداللہ ایڈورٹائیزنگ کنویسر نارتھ ویسٹرن ریلوے نے انگریزی ٹائم ٹیبل کا اردو ایڈیشن تیار کیا ہے جو لوگ انگریزی زبان سے ناواقف ہوں اور صوبہ پنجاب سندھ اور صوبہ شمال مغربی سرحدی کے تمام اسٹیشنوں اور ٹرینوں کی آمد و رفت کی معلومات حاصل کرنی ہوں۔ انھیں اس کتاب سے ضرور فائدہ حاصل کرنا چاہئے۔ تجارت آفس بیڈن روڈ لاہور سے چار آنہ میں مل سکتا ہے۔

(۴) سوانح نبی کریم۔ جناب محمد حفیظ اللہ صاحب قریشی نے مدارس اسلامیہ کے طلبا کے لئے تیار کی ہے۔ حجم ۲۴۴ صفحات کاغذ لکھائی چھپائی بہت اعلے عرب کے مقدس مقامات کے متعلق چھ فوٹو بلاک کی تصویریں بھی شامل ہیں۔ قیمت صرف دس آنہ جو کہ قریشی بک ایجنسی لاہور سے طلب کیجئے۔

اس کتاب میں مختلف اسباق کے ذریعہ سے عرب کی تاریخ۔ رسوم و عادات۔ حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا عرب میں پیدا ہونا اور دین اسلام کے ابتدائی ایام سے لے کر آنحضرت کی وفات تک کے حالات لکھے گئے ہیں۔ بچوں کے لئے جسقدر کتابیں اس عنوان پر لکھی گئی ہیں۔ ان میں یہ اول نمبر پر ہے۔ ہر اسلامی مدرسہ۔ اور ہر مسلمان کے گھر میں اور ہر مسلمان بچہ کے پاس اس کتاب کا ہونا

ضروری ہے۔

(۵) **یادگارِ عشق** ۔ حضرت ناقب عظیم آبادی نے سرزمین بہار کے ایک مشہور شاعر حضرت شاہ رکن الدین عشق دہلوی ثم اصلاحی عظیم آبادی کے حالاتِ زندگی۔ اُن کی شاعری کی خصوصیات اور ان کے کلام کا ایک دلنواز مجموعہ شائع کیا ہے۔ اس مفید علمی کارنامہ پر جناب مولانا سید سلیمان صاحب ندوی مدیر معارف نے ایک بلیغ مقدمہ لکھا ہے۔ حجم ۹۰ صفحات ۔ کتابت طباعت وغیرہ خوب ہے۔ قیمت ۸؍ ۔ ملنے کا پتہ مولوی سید حسن رضا صاحب مدرس عربی پٹنہ سٹی ۔ اسکول۔ پٹنہ سٹی سے طلب کیجئے۔

(۶) **کائناتِ ادب** ۔ جناب محمد عبدالحمید صاحب حمید میرٹھی ایڈیٹر نظارہ میرٹھ نے یہ کتاب تالیف کی ہے۔ حجم ۲۷۲ صفحات لکھائی چھپائی کاغذ بہترین ہے۔ قیمت درج نہیں۔ لیکن دو روپیہ سے زائد نہ ہو گی۔ ایجوکیشنل بک ہاؤس سول لائن علی گڑھ سے مل سکتی ہے۔

انٹرمیڈیٹ کے طلباء کے لئے اردو میں جسقدر کورس لکھے جا چکے ہیں اُن میں یہ سب سے بہتر ہے۔ ابتدا میں مشہور اساتذہ سابق و حال کے مکتوب ہیں۔ امیر مینائی ۔ اکبر الہ آبادی ۔ ابوالکلام آزاد ۔ مولانا حالی ۔ داغ دہلوی ۔ حضرت ریاض ۔ سر سید احمد ۔ سید سجاد حیدر ۔ مرزا سلطان احمد ۔ غالب ۔ ظفر الملک علوی وغیرہ کے مکتوبات زبان اور طرزِ بیان دونوں کا نادر مجموعہ ہیں اس کے بعد مولانا آزاد ۔ سر سید احمد ۔ حالی ۔ حافظ نذیر احمد ۔ مولانا شبلی ۔ مولوی ذکاء اللہ ۔ شرر ۔ شوکت ۔ یلدرم ۔ محفوظ علی اور ندرت کے گیارہ مقالات درج ہیں۔ حصۂ نظم میں مرزا رفیع سودا سے لے کر علامہ سر اقبال تک کا کلام درج ہے۔ ہمارے خیال میں یو۔پی کے علاوہ اگر پنجاب کے موجودہ اردو کورس کی جگہ کائناتِ ادب کو رائج کیا جائے۔ تو طلباء کے لئے بہت زیادہ مفید ہو سکتی ہے۔

(۷) **کامیابِ زندگی** ۔ مولفہ جناب چودھری غلام حیدر خاں صاحب سابق مدیر زمیندار و صداقت وغیرہ وغیرہ سائز کلاں حجم ۲۰۰ صفحات ۔ کاغذ لکھائی چھپائی خوب ہے۔ ٹائٹل دبیز ۔ قیمت ۱؍ ۔ جو کم ہے۔ ملنے کا پتہ منیجر صداقت بک ڈپو رام کشن بلڈنگ ۔ بیرون شیرانوالہ دروازہ لاہور۔

اس وقت یورپ اور امریکہ میں جو لٹریچر شائع ہو رہا ہے اس کا ۵۰ فیصدی انسان کی دنیاوی کاروباری زندگی اور ان کی معاشی قابلیت کے احیاء کے لئے لکھا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ہندوستان میں ابھی ان اہم ترین عنوانات پر بہت کم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس لئے ملک میں کاروباری آدمیوں کے لئے کوئی لٹریچر موجود نہیں۔ ملک کو چودھری صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے ایسی مفید کتاب لکھ کر ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب ہر لائبریری اور ہر دوکاندار اور ہر کاروباری آدمی کے ہاتھ میں ہونی چاہئے۔ طلباء ۔ نوجوان ۔ اور بوڑھوں کو اس کتاب کی یکساں ضرورت ہے۔ اس میں سرمایہ ۔ اس کا تحفظ ۔ اس کو ترقی دینے ۔ شخصیت کا سرمایہ ۔ پیشہ کا انتخاب ۔ ملازمت ۔ مستقل مزاجی ۔ ذکاوتِ حس اور اس کے مضر نتائج ۔ قوتِ فیصلہ ۔ ترقی اور کامیابی کے گر ۔ اعتمادِ نفس ۔ وقت ۔ جوانی کا چشمہ ۔ کفایت شعاری ۔ مال فروخت کرنے کا فن ۔ قلیل سرمایہ کے خطرات ۔ خوش تدبیری اور معاملہ فہمی ۔ ساکھ اور اعتماد ۔ اشتہار دینے کی خاص قابلیت ۔ ضمیر کا احترام زمانہ کی رفتار وغیرہ کئی درجن عنوانات پر نہایت موزوں الفاظ میں بحث کی گئی ہے۔ مدارس کی لائبریریوں میں ایسی

کتابوں کی ضرورت ہے۔ اور نہ صرف ضرورت ہے۔ بلکہ اگر طلبا کو ایسی کتابیں درسا پڑھائی جائیں تو ان کی ذہنی قابلیت میں بے حد اضافہ ہو۔ اور وہ اپنی زندگی کو پورا پورا کامیاب بنا سکیں۔ دیکھئے ہندوستان کا محکمہ تعلیم ان ضرورتوں کی طرف کب توجہ کرتا ہے۔ ملک میں بیکاروں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اس قسم کی کتابیں بیکاروں کو کاروباری بنا سکتی ہیں۔ اور کاروباری آدمیوں کو ناکامی کے خطرات سے نکال کر یکسر کامیاب۔ ناظرین نیرنگ خیال اس کتاب کو ضرور منگوا کر مطالعہ کریں۔

رسایل

پشاور سے ادیب۔ اور لکھنؤ سے رسالہ ادب کا اجرا اردو رسائل میں ایک شاندار اضافہ ہے۔ ادیب صوبہ سرحد کا ادبی ارگن ہے اس کے ابتدائی پرچے اس کے مستقبل کی ضمانت ہیں۔ لکھنؤ سے اسوقت جسقدر ادبی رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں رسالہ ادب بہترین ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ادب کے قابل کارکنوں نے اگر رسالہ کو مرتب کرنے میں اسی کاوش سے کام لیا تو ادب بہت تھوڑے عرصہ میں مقبول ہو جائے گا۔ لکھنؤ کا ایک دوسرا رسالہ انکشاف بھی مقامی رسایل کو شکست دے کر آگے بڑھ جانے میں ساعی نظر آتا ہے۔

بارہ بنکی سے ایک اور اردو رسالہ اعجاز کے نام سے رئیس احمد ناظر جعفری کی ادارت اور جناب لسان الملک حضرت ریاض خیر آبادی کی ادارت میں شائع ہوا ہے۔ اس کے دو نمبر موصول ہو چکے ہیں۔ ابھی ترقی کی کافی گنجائش ہے۔ دوسرے نمبر میں حضرت چغتائی کی آرٹ پر ایک مضمون نگار سے نقل کیا گیا ہے۔ جسپر نہایت اچھی تنقید کی گئی ہے۔ پہلے نمبر میں ایک مضمون ملک کافور پر بھی خوب ہے۔

رسالہ ہمایوں کا سالگرہ نمبر امسال بھی خوب رہا۔ اس کا ٹائیٹل بھی جاذب نظر تھا۔ لغا دیر کے لئے زیادہ کاوش نہیں کی گئی۔ البتہ مضامین اچھے تھے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ایک ہی شخص کے قلم سے ہوں۔ یعنی ان میں تنوع نہ تھا ہمایوں کے سالگرہ نمبر میں بعض رسائل کی خصوصیات شمار کرائی گئی ہیں۔ جن سے اکثر اہل قلم حضرات کو اتفاق نہیں۔ مثلاً نیرنگ خیال کی خصوصیت اس کی تصویریت قرار دی گئی ہے۔ حالانکہ ہمیں ارزانی اور مضامین کی جاذبیت کا بھی دعوےٰ ہے جس رسالے کو ارزانیت کا تمغہ دیا گیا ہے۔ اس نے چندہ ۱۲ سے بڑھا کر پونے پانچ روپے کر دیا ہے۔ اس وقت رسائل کی منڈی میں نیرنگ خیال کا چندہ سب سے قلیل ہے۔ معزز معاصر نے اپنے لئے اخلاقیت کی خصوصیت انتخاب کی ہے۔ بہتر ہوتا کہ وہ اس کے لئے دوسرے معاصرین کی رائے دریافت کر لیتے۔ ہم نے آج تک ہمایوں کو کبھی ایک اخلاقی پرچہ نہیں سمجھا بلکہ ہم ہمیشہ اسے اس کی نفاست کے لئے پسند کرتے رہے ہیں۔ ہمایوں بلاشک وشبہ ایک نفیس پرچہ ہے۔ ہم ناظرین سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ ہمایوں کا سالگرہ ایک روپیہ میں ضرور خریدیں۔ یقیناً وہ اسے پسند کریں گے۔

نیرنگ خیال کے عید نمبر میں ایک ضمیمہ

نیرنگ خیال کے اس نمبر میں کتابوں کا ایک ضمیمہ شائع کیا جا رہا ہے۔ جسپر غلطی سے ۲ سے ۸۰ صفحات درج ہیں۔ مگر یہ ضمیمہ تمام اشتہارات سے آخر میں لگایا گیا ہے۔ ناظرین اس ضمیمہ کا خاص طور پر مطالعہ کریں۔

لاہور میں سید مبارک علی شاہ گیلانی ایک علم دوست و مرنجاں مرنج بزرگ ہیں۔ آپ کے زیر اہتمام اس وقت لاہور میں ایک اردو پریس گیلانی پریس کے نام سے جاری ہے۔ ہمارے خیال میں گیلانی پریس اس وقت لاہور میں دو چار پرانے پرانے مطبعوں کو چھوڑ کر شاید سب سے بڑا ہوگا۔ سید مبارک علی شاہ صاحب نے نہ صرف ایک شاندار مطبع قائم کیا ہے بلکہ اچھی کتابوں کی اشاعت کا انتظام بھی کر رکھا ہے۔ ان کتابوں کی ایک مکمل فہرست ان صفحات میں درج ہے۔ جو رسالہ کے آخر میں لگائی گئی ہے۔ آپ اس فہرست کا مطالعہ کریں گے۔ تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ اس میں کم و بیش ڈیڑھ سو کتابیں درج ہیں۔ جن میں سے قریباً سوا سو کتابوں کی اشاعت کا اہتمام شاہ صاحب نے خود کیا ہے۔ ان کتابوں میں سب سے بڑا کارنامہ مضامین شرر کو تیرہ ضخیم جلدوں میں شائع کرنا ہے۔ ہندوستان کے نامور ادیب۔ افسانہ نگار اور مورخ مولانا شرر مرحوم کے کارناموں کو چار ہزار صفحات کی ایک مکمل لائبریری میں شائع کرنا اس دور کا ایک لازوال کارنامہ ہے یہ مضامین اسقدر دلچسپ اور مفید ہیں کہ تمام علم دوست حضرات اس نایاب ذخیرہ کو خرید کر اپنی لائبریریوں کو زینت دے رہے ہیں۔ مدارس۔ کتب خانوں۔ اور پرائیوٹ جگہوں۔ نیز تمام علم دوست اصحاب نے اس سلسلہ کو خرید کر قابل مرتب کی ہمت افزائی کی ہے۔ سید مبارک علی شاہ صاحب نے علامہ راشد الخیری کی متعدد تصانیف بھی شائع کی ہیں۔ مہاشہ سدرشن جو پنجاب کے ایک اچھے افسانہ نگار ہیں۔ ان کی بیشتر تصنیفات بھی آپ نے شائع کی ہیں۔ خان صاحب احمد حسین خان صاحب ایڈیٹر رسالہ شباب اردو کی تمام تصنیفات کی آپ پبلشر ہیں۔ الغرض کتابوں کے شائقین حضرات کو ان کتابوں سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہئے۔ ان میں ناول بھی ہیں۔ افسانوں کی کتابیں بھی ہیں۔ علم دوست اصحاب کے لئے علمی ادبی مضامین کے ذخیرے بھی ہیں۔ تاریخ و سوانح بھی ہیں۔ بچوں کے لئے کتابیں بھی ہیں۔ پس ناظرین نیرنگ خیال کا فرض ہے کہ وہ اس ضمیمہ کا بغور مطالعہ فرما کر اس سے فائدہ اٹھائیں ◆

علامہ سر اقبال کی تصنیفات

علامہ سر اقبال کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ہندوستان کا بچہ بچہ اس نام سے واقف ہے۔ علامہ موصوف کی لازوال تصنیفات کے متعلق دفتر رسالہ نیرنگ خیال میں اکثر استفسارات موصول ہوتے رہتے ہیں۔ ان حضرات کی اطلاع کے لئے لکھا جاتا ہے۔ کہ علامہ سر محمد اقبال کی تمام تصنیفات شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور سے مل سکتی ہیں۔ علامہ سر محمد اقبال کے اردو کلام کا مجموعہ جو بانگ درا کے نام سے موسوم ہے۔ منگوا کر ملاحظہ فرمائیے کئی سو صفحہ کا مکمل مجلد دیوان صرف ساڑھے تین روپے میں مل سکتا ہے۔ سر اقبال کا اردو کلام ہندوستان میں اس درجہ مقبول ہے کہ شاید ہی کوئی گھر ہوگا۔ جہاں بانگ درا موجود نہ ہو۔ اور شاید ہی کوئی لکھا پڑھا آدمی ہوگا۔ جس کی زبان پر ڈاکٹر اقبال کا کوئی شعر نہ ہو۔ قوم کی بیداری اور ترقی میں ڈاکٹر صاحب کے کلام کو بہت زیادہ دخل ہے۔ بانگ درا کی لکھائی چھپائی اور کاغذ بے حد نفیس اور مجلد نہایت خوبصورت ہے۔ جس پر سنہری حروف میں کتاب کا نام درج ہے ◆

بانگ درا کے علاوہ زبور عجم جس میں علامہ موصوف کے تازہ ترین افکار کا مجموعہ ہے قیمت مجلد پانچ روپیہ (لعہ)

پیام مشرق۔ اس کتاب میں علامہ سر اقبال نے ان اخلاقی مذہبی اور ملی حقائق کو پیش کیا ہے۔ جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی ترتیب سے ہے۔ مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے۔ یہ کتاب ہر قسم کے انقلاب میں ان کی رہنمائی کرتی ہے۔ جرمنی کے مشہور شاعر گوئٹے کے دیوان کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ کتابت اور طباعت لاثانی ہے۔ مجلد صرف (عہ) میں مل سکے گی۔

اس کے بعد **اسرار و رموز** ہے۔ اسرار خودی اور رموز بیخودی انسانی زندگی کے صحیح مفہوم کو سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہونے کی دعوت ہے۔ اسرار خودی اسلامی تصوف کی حقیقی نیابت اور کلام پاک کی اعلےٰ تفسیر ہے۔ اس کی شاندار تعلیم پر عمل کرنے سے ہی قوم منزل مقصود پر پہونچ سکتی ہے۔ رموز بیخودی میں شعر کے دلفریب پیرایہ میں حقائق ملیہ اسلامیہ کو اس خوبی سے بیان فرمایا ہے۔ کہ پڑھنے والے کو ایسی روحانی مسرت ہوتی ہے۔ جیسے کسی کو گرانبہا کھوئی ہوئی چیز مل جائے۔ دونوں کتابیں یکجا مجلد کرائی گئی ہیں۔ قیمت صرف عہ ہے۔

علامہ سر اقبال کی مندرجہ بالا تصنیفات پر تفصیلی ریویو تو ہم آئندہ اشاعتوں میں کریں گے۔ اس نمبر میں تو صرف یہ جتلانا مقصود ہے۔ کہ علامہ سر اقبال کی تمام تصنیفات جو شائع ہو چکی ہیں ان کے نام زبور عجم۔ بانگ درا۔ پیام مشرق۔ مثنوی اسرار خودی و مثنوی رموز بیخودی ہیں۔ اور یہ کتابیں خاص اہتمام سے بڑی شان سے شائع کی گئی ہیں۔ یہ تمام کتابیں شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ نمبر ۵ سے مل سکتی ہیں۔ ان بڑی بڑی کتابوں کے علاوہ ڈاکٹر اقبال کی دیگر مشہور نظمیں مثلاً شمع شاعر (۱۲) نالۂ یتیم ۲ر۔ فریاد امت ۲ر۔ مکمل ترانہ ۲ر۔ اکبری اقبال ۲ر۔ شکوہ ۲ر۔ جواب شکوہ ۲ر خضر راہ ۱۲ر۔ تصویر درد ۱۲ر۔ طلوع اسلام ۱۲ر۔ ملال ۲ر بھی نہایت خوشخط لکھوا کر شائع کی گئی ہیں۔ یہ تمام چھوٹی چھوٹی کتابیں ایک ہی سائز پر چھاپی گئی ہیں۔ اس لئے ان کو ایک ہی جلد میں جمع کر لینے سے ایک نہایت لاجواب مرقع تیار ہو جائے گا۔ یہ کل گیارہ کتابیں صرف عہ میں مل سکیں گی۔ امید ہے کہ ناظرین نیرنگ خیال علامہ سر اقبال کا کلام جو قوم پرستی اور اسلام پرستی کا جذبہ کامل پیدا کرتا ہے۔ حریت اسلامیہ کا سبق پڑھاتا ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کر دیتا ہے۔

علامہ سر اقبال کی تمام تصنیفات ملنے کا پتہ:۔ **شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ نمبر ۵ لاہور**

ہندوستان کے نامور انشا پرداز ظرافت نگاری کے بادشاہ

پطرس

کے لاجواب مضامین جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ بڑے اہتمام کے ساتھ دارالاشاعت پنجاب کے زیر انتظام کتابی صورت میں شائع ہو رہے ہیں۔ حضرت پطرس کے ان مضامین کے علاوہ جو نیرنگ خیال۔ تہذیب نسواں مخزن۔ راوی۔ اور ہزار داستاں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے تھے نیز تازہ ترین شاہکار جو ابھی کسی اخبار یا رسالے میں شائع نہیں ہوئے۔ اس مجموعہ کی زینت ہیں۔ ناظرین نیرنگ خیال فوراً درخواستیں بھیج دیں تاکہ کتاب شائع ہوتے ہی ان کی خدمت میں پیش کی جا سکے۔

(منیجر نیرنگ خیال بارود خانہ لاہور)

نیرنگ خیال کے خاص نمبروں کے متعلق ضروری اطلاع

پرانے اور نئے عید نمبر پرانے اور نئے سالنامے

ناظرین غور سے مطالعہ کریں

نیرنگ خیال کے ہر معمولی نمبر کی خوبیوں کی طرح سے اس کے خاص نمبر کی خوبیاں خاص نمبروں کے بالمقابل ہمیشہ لاجواب تسلیم کی گئی ہیں نیرنگ خیال کے خاص نمبر کیا ہیں؟ علم و عرفان کا بحر ذخار ہیں۔ ایک ایک نمبر دو دو درجن بہترین کتابوں سے بھی یقیناً بہتر ہے۔ دو دو سو صفحوں میں ہندوستان بھر کے چوٹی کے ادیبوں کے مضامین نظمیں۔ افسانے۔ ڈرامے اور آرٹ و فوٹو کی اعلیٰ پایہ کی تصاویر ہوتی ہیں۔ دو سو صفحوں میں یقیناً ۵۰۰ صفحات کی کتابوں سے زائد مواد ہوتا ہے۔ اس لئے لوگ نیرنگ خیال کے پرانے خاص نمبروں کی ہمیشہ تلاش و جستجو میں رہتے ہیں۔ گذشتہ مہینوں میں ہم نے پرانے نمبروں کے متعلق ایک رعائتی اعلان کیا تھا۔ اب اسے کالعدم سمجھنا چاہئے۔ دفتر میں پڑتال کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ اب نیرنگ خیال کے خاص نمبر کی کیفیت یہ ہے:-

ڈرامہ نمبر	ادبی نمبر	عید نمبر ۱۹۲۶	عید نمبر (۱۹۲۷) ایک روپیہ فی کاپی	عید نمبر ۱۹۲۸ ۱۲ر فی کاپی	عید نمبر ۱۹۲۹ ۸ر فی کاپی
بالکل ختم	بالکل ختم	بالکل ختم	۲۵ کاپیاں	۱۵۰	۳۰۰

سالنامہ نیرنگ خیال ۱۹۲۸ء	سالنامہ ۱۹۲۹ء چھ روپے فی کاپی	سالنامہ ۱۹۳۰ء عمر فی کاپی
بالکل ختم	صرف ۱۰ مجلد کاپیاں	۲۵۰ کاپیاں

سالنامہ ۱۹۲۹ء مجلد کاپی تین روپے معہ محصولڈاک ۔ سالنامہ ۱۹۳۰ء ایک روپیہ آٹھ آنہ معہ محصولڈاک ۔

فی الفور طلب کر لیجئے

ابھی وقت ہے کہ آپ پرانے عید نمبر خرید لیں۔ وقت ہے کہ سالنامہ منگوالیں ورنہ اس کے بعد یقیناً کسی وقت پر بھی دستیاب نہ ہوسکیں گے۔ یہ رعایت صرف چند دن باقی رہے گی ۱۹۳۰ء کے سالنامہ کی تین چار درخواستیں اس وقت بھی بغیر کسی اشتہار کے آرہی ہیں۔ مہینہ دو مہینہ کے اندر اندر سالنامہ ختم ہوجائے گا۔ اس لئے آپ سالنامہ فی الفور منگوالیں۔ اگر آپ کے پاس پرانے عید نمبر نہیں ہیں یا آپ نئے خریدار ہوئے ہیں تو آج ہی انہیں بھی طلب فرما لیجئے۔

ایڈیٹر نمبر جولائی ۱۹۳۰ء میں بڑی شان سے شائع ہوگا ۔

منیجر نیرنگ خیال۔ لاہور

پنڈت ٹھاکر دت شرما ویدّ
موجد امرت دھارا و مصنف ۴۰ درجن طبی کتب ایڈیٹر طبی اخبار دیش اپکارک سے باقاعدہ علاج کرانیوالے اصحاب بھی
۱۲ مارچ سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں
چونکہ امرت دھارا کا اُنتیسواں سالانہ جلسہ ہے اور اس دن کسی بھی دنیا کے حصے سے بھیجے گئے آرڈر پر رعایت ہوگی
یعنی امرت دھارا اور اس کے مرکبات ۳/۴ قیمت پر باقی ادویات و کتب نصف قیمت پر ملیں گی!
وہ اس طرح
کہ جو اصحاب بھی زیر علاج ہیں۔ وہ جتنا روپیہ چاہیں ۱۲ مارچ کو منی آرڈر کردیں جب تک وہ روپیہ ختم نہ ہوگا انکو ادویات پر یہی رعایت ملیگی۔ جو صاحب علاج کروانا چاہتے ہیں۔ وہ فہرستیں و قواعد علاج طلب کریں۔ اور اسکے مطابق حالات لکھکر دوائی تجویز کرائیں مگر ۱۲ مارچ کو کچھ روپیہ ضرور منی آرڈر کردیں پس جب تک وہ روپیہ ہے۔ اسی رعایت کا فائدہ اُٹھائیں!
یہ قاعدہ اسواسطے رکھا گیا ہے کہ علاج کرانے والے اصحاب پیچھے شکایت کرتے ہیں کہ ہم کو جب خبر نہیں کہ کیا دوائی کھانی ہے تو ہم آرڈر اس کا کیسے دے سکتے ہیں یاد رہے کہ منی آرڈر ۱۲ مارچ کو ہونا چاہیے۔ آگے پیچھے بھیجے گئے روپیہ یا خط پر رعایت نہیں ہے۔۔
مندرجہ ذیل فہرستیں مفت منگوائیں
رسالہ امراض مخصوصہ مرداں
اس رسالہ میں مردوں کی خفیہ امراض کی وجہ تسمیہ علامات وغیرہ کا پورا نقشہ کھینچا گیا ہے اور گم شدہ طاقت بحال کرنے کے واسطے اصول و نسخے اخیر میں امرت دھارا اوشدھالیہ کی تیار کردہ ادویات ہیں یہ لکھنا چاہیے کہ شادی شدہ ہیں یا طالب علم ہرگز درخواست نہ کریں ایک آنہ کا ٹکٹ آنے پر بھیجا جاویگا۔
اخبار دیش اپکارک
نمونہ مفت ملتا ہے
رسالہ امرت
مشہور و معروف دوائی امرت دھارا جو ایک ہی دوائی کل امراض کا علاج ہے اس کی کمل تشریح اس رسالہ کے اندر ہے مفت منگوائیں۔
فہرست ادویات
امرت دھارا اوشدھالیہ کی تمام ادویات کی فہرست بھی مفت بھیجی جاتی ہے
قواعد علاج
بذریعہ خط و کتابت علاج کرانا چاہیں تو اسکو پڑھیں یہ فوراً مفت بھیجا جاویگا
سو سالہ عجیب کیلنڈر مفت
خط و کتابت و تار کیواسطے پتہ: امرت دھارا۔ لاہور
المشتہر
مینیجر امرت دھارا اوشدھالیہ۔ امرت دھارا بھون۔ امرت دھارا روڈ۔ امرت دھارا ڈاک خانہ۔ لاہور

میاں بیوی

کیلئے

پانچ نئی کتابیں

شب عروسی سے پہلے اور شب عروسی کے بعد ان کا مطالعہ جاری رکھئے

عیش و نشاط .. .. عہر

دولہا دلہن .. .. عہر

میاں بیوی .. .. عہر

مرد و عورت .. .. عہر

زن و شوہر .. .. عہر

ہر پڑھے لکھے مرد کو جس کو شادی کرنا ہے یا جو شادی شدہ ہے۔ ان کتابوں کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔ اگر آپ اپنا گھر جنت بنانا چاہتے ہیں تو ان کتابوں کو ضرور پڑھئے گا۔

پانچوں کتابوں کا حجم پانچ سو صفحات ہو گا۔ پانچوں اکٹھی منگانے سے بجائے سوا چھ روپے کے ساڑھے پانچ روپے علاوہ محصول ڈاک۔

بیچین کر دینے والے خطوط

کسی مل سے نہیں بلکہ انتہا سے زیادہ

محبّت میں ڈوبے ہوئے خطوط

جو ئے شادی شدہ دولہا دلہن نے محبت کے جذبات میں فنا ہو کر ایک دوسرے کو لکھے تھے۔ ان خطوط کے مجموعہ کا نام ہے

دُولھا دُلھن کے خطوط

یہ خطوط نئے دولہا دلہن میں محبت کا رشتہ قائم کر سکتے ہیں۔ ہر خط محبت کے جذبات میں ڈوبا ہوا ہے۔ ان خطوط کے بغور مطالعہ کے بعد فریقین ایک دوسرے کو ایسے دلچسپ خط لکھ سکتے ہیں جو بڑے بڑے انشا پرداز بھی نہیں لکھ سکتے۔

قیمت ۸ر

جنّت کے خطوط

مرنے کے بعد کی کیفیت اور جنت کی سرگذشت پڑھ لیجئے۔ یہ خطوط انسان کو نیکی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ خطوط چوٹ کھائے ہوئے دلوں کا علاج ہیں۔ اس کے علاوہ انسان کو مرنے کے خوف سے اطمینان دلانے کے لئے ایک بہترین مجموعہ ہیں۔ قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ:-

منیجر یوسفیہ کتب خانہ۔ بارود خانہ۔ لاہور

آپ کے لڑکے غیروں کے مدرسوں میں پڑھتے ہیں

آپ کی لڑکیاں مشن اسکولوں میں جاتی ہیں

مسلمانوں کے اپنے مدرسے اور اسکول نہ ہوں تو اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے۔ ہم آپ کو جہلا کی طرح الزام نہیں دیتے۔ لیکن ان معصوموں کی مذہبی تربیت سے بالکل بے خبر اور بے پرواہ نہ بنئے گھر پر ان کے عقائد اور اعمال کو درست رکھنے کا انتظام کیجئے ان کے خیالات دین سے برگشتہ نہ ہونے دیجئے۔ اور اسلام کی پاک اور عاقلانہ تعلیم انہیں سناتے رہیے۔

اس کے لئے ہم نے زمانہ کی رفتار اور نوجوانوں کی طبیعت کا لحاظ رکھکر ایک سلسلۂ کتب شائع کرنا شروع کیا ہے۔

جو اسکولوں اور کالجوں میں خصوصیت کے ساتھ مقبول ہو رہا ہے۔ اس سلسلہ کی تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

ایک کا نام **اسلام اور عبادت** ہے۔ دوسری کا نام **اسلام اور عورت** ہے۔

تیسری کا نام **اسلام اور مدنیت** ہے۔

کتاب اسلام اور عبادت کی قیمت ۸ر ہے۔ کتاب اسلام اور عورت کی قیمت ۱ر ہے۔

کتاب اسلام اور مدنیت کی قیمت عہ ہے۔

عبد اور معبود کے تعلقات

اپنے مالک اور اپنے خالق کے حضور میں انتہائی عاجزی کے ساتھ گڑگڑانا یوں بھی بہت کچھ تسکین قلب کا باعث ہوتا ہے لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اسطرح گڑگڑانے کی اصلیت اور حقیقت کیا ہے اور اسمیں کیا کیا عجیب و غریب حکمتیں پوشیدہ ہیں تو ظاہر ہے کہ عبادتوں کا لطف دس گنا بڑھ جائیگا طوطے کی طرح چند لفظ رٹ کر زبان سے ادا کر دینے میں بھی اگرچہ ایک راحت اور ایک لذت ہے لیکن اگر عبادتوں کا اصلی مقصد اور مفہوم بھی معلوم ہو تو یقیناً وہ بہت زیادہ پر کیف اور مسرت بخش بن جائیں گی۔

اسلام اور عبادت

کے نام سے جو کتاب مشہور و معروف مصنف جناب ڈاکٹر سعید احمد صاحب نے لکھی ہے اسمیں نماز روزہ حج زکوٰۃ کے اصلی مقاصد بتائے گئے اور بہت ہی مدلل طریقہ پر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ عبادات الٰہی کے ان سے بہتر طریقے اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جہاں ان کے ذریعہ سے ایک طرف عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں اور بندہ اپنے آقا کے حضور میں حاضر ہوتا ہے وہاں ساتھ ہی ساتھ ان سے عبادت کرنے والے کو طرح طرح کے مادی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی دوسری کتابوں کیطرح اس کتاب میں وہی خصوصیت موجود ہے کہ بالکل خشک اور پھیکے مضمون کو حد سے زیادہ دلچسپ بنا دیا گیا ہے۔ اس کتاب کو پڑھ لینے کے بعد ناممکن ہے کہ نماز اور روزے میں دوگنا لطف نہ آئے اسکی قیمت فی جلد ۸ر ہے **منیجر یوسفیہ کتب خانہ بازار حکیماں لاہور**

الزہرا

لڑکیوں کے پڑھنے کے قابل جو کتابیں اس وقت موجود ہیں انہیں یہ دیکھکر کس قدر افسوس ہوتا تھا کہ بنت رسول سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا کے کارناموں سے زنانہ لٹریچر قطعی محروم ہے ضرورت تھی کہ یہ واقعات اس بلبل خوش الحان کے نغموں میں ادا ہوں جس کا قلم تمام ہندوستان کو مسخر کر چکا ہے یعنی علامہ راشد الخیری مدظلہ۔ الحمد للہ کہ مولینا محترم نے اس ضرورت کو ایسے حیرت خیز طریقے سے پورا کیا ہے کہ دنیائے نسواں دنگ رہ گئی۔

مولانا کا قلم بنت رسول کی داستان کہہ نہیں سکتا کہ کتاب کس پایہ کی ہے۔ تاریخ میں ایک بیش بہا اضافہ کے ساتھ الزہرا بتائے گی کہ میاں بیوی کس طرح رہتے ہیں۔ مائیں بچوں کو کیونکر پالتی ہیں۔ دنیا کے ساتھ دین کیونکر میسر آتا ہے۔ الزہرا افسانہ نہیں بنت رسول کے حالات و سوانح ہیں۔ اور یہ واقعات ایسے دردانگیز ہیں کہ پڑھتے پڑھتے ہچکی بندھ جاتی ہے۔ خاتمہ پر ایک مفصل بحث شہادت اہلبیت پر ہے اور میدان کربلا کے واقعات جس طرح ادا کئے گئے ہیں ان کی بابت صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ محرم کا بیان اور مولینا کی زبان قیمت ۱۲/

بنت الوقت

دورجدید کے کرشمے مشنری لیڈیز کی حیرت خیز تبلیغ۔ مغربی تہذیب کی دلدادہ مس فرخندہ کی شرمناک لائف۔ وحید کا اپنے بڑے بھائی مجید کو محروم الارث نہیں جائداد کو حاصل کرنیکے لئے باغیوں میں گرفتار کرانا اور بالآخر مجید کی موت۔ بھیجہ پیاری کہانی اور مولینا کی زبانی۔ بنت الوقت بتائیگی کہ یورپ کی کورانہ تقلید اور نئے تمدن کی اندھا دھند پیروی کس طرح گھروں کو تباہ کرتی ہے قیمت صرف ۸/

منازل السائرہ

جسے پہلی اور دوسری دفعہ خان بہادر مسٹر عبدالقادر صاحب ممبر پنجاب گورنمنٹ نے شائع کیا تھا۔ اور جو آپ ان کی عدیم الفرصتی کے سبب مدت سے تیار نہ ہوسکی تھی ہم نے حصول اجازت کے بعد اور مولانا سے نظر ثانی کرا کے اس کو چھاپ لیا ہے منازل السائرہ میں سائرہ کی زندگی کے مختلف حالات نہایت عجیب اور نصیحت آمیز طریق سے بیان کئے گئے ہیں۔ مولانا کی طرز تحریر کا یہ ایک لاثانی نمونہ ہے اخبارات اس پر بہت اچھی رائیں ظاہر کر چکے ہیں۔ اور اس کی مقبولیت کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ جب تیسرے اڈیشن کے لئے اس کا نسخہ مانگا تو نہ مصنف کے پاس تھا۔ اور نہ پبلشر کے۔ آخر صرف کثیر کر کے دوسرے شخص سے لیا تیسرے اڈیشن میں لکھائی چھپائی۔ کاغذ سب عمدہ ہے قیمت حصہ اول عہ حصہ دوم عہ

سراب مغرب

یہ وہ تصنیف ہے جسکا دنیائے نسواں کو مدتوں سے انتظار تھا اور اردو لٹریچر جیسے واسطے بیچین تھا تعلیم نسواں کے سلسلہ میں اس فیصلہ کی شدید ضرورت تھی۔ کہ کس ذرائع سے مسلمان بچیاں کہاں تک جائز ہیں حضرت مصنف کا فیصلہ قابل دید ہے قصہ اس قدر دردانگیز ہے کہ ہر ہر لفظ کلیجے کے پار ہو جاتا ہے۔ اور آنکھیں روتے روتے طوفان برپا کر دیتی ہیں۔ سراب مغرب کتاب نہیں جادو ہے جس کو پڑھ کر ہر ناظر ساکت رہ جاتا ہے۔ اکرم کے ہاتھوں آبروئے سادات کا انجام فیشن جدید کے نتائج۔ پارٹیز کا حشر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے قیمت

یہ سب کتابیں ملنے کا پتہ:۔ **منیجر یوسفیہ کتب خانہ۔ بارود خانہ۔ لاہور**

تائیدِ غیبی

معصوم قلم علامہ راشد الخیری کی فسانہ نگاری قوم سے قبولیت عام کی سند حاصل کر چکی ہے۔ مگر بہت کم آدمیوں کو معلوم ہوگا کہ جس طرح تصویر غم اتارنے میں مولانائے محترم کا قلم بے نظیر ہے۔ اسی طرح مذاق کا کیرکٹر بھی علامہ محترم بے مثل لکھتے ہیں۔ اس لاجواب فسانہ میں درد و الم کی تصویر کے علاوہ تاریخ اسلامی کا ایک ایسا مرقع آپکو ملیگا کہ بے اختیار آپکی آنکھ سے آنسو نکل پڑیں گے۔ مگر اسکے ساتھ ہی مارے ہنسی کے پیٹ میں بل بھی پڑ جائیں گے۔ تائید غیبی مسلمانوں کو بتائے گی کہ سرزمین اندلس پر وہ کیا کر چکے ہیں۔ کس طرح وقت نے ان کو معراج کمال پر پہنچایا۔ اور کس طرح وہ اپنے اعمال سے فنا ہوئے۔ تائید غیبی میں درد ہے۔ مذاق ہے۔ افسانہ ہے تاریخ ہے اور اس قلم کے جواہر ریزے ہیں جس کا مثل اسوقت ہندوستان میں نہیں۔

قیمت ۸ر

فسانۂ سعید

یہ اپنے رنگ کی وہ کتاب ہے جس کا شکریہ قدردانان اردو ادا نہیں کر سکتے۔ نکاح ثانی اسلام کا مسلمہ فیصلہ ہے لیکن قابلیت سے مولانا نے سعید کے نکاح ثانی کو بے سود ثابت کیا ہے وہ درحقیقت یہ حق رکھتا ہے کہ ہر مسلمان اس کتاب کو پڑھے۔ سعید کی داستان جگر خراش ناظرین کا دل ہلا دیگی۔ اور اس کا انجام بیحد درد انگیز ہے۔ سنگدل باپ نے بھولی بچی پر وہ ستم توڑے ہیں کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ فسانہ سعید معمولی کتاب نہیں۔ ایک درس عبرت ہے جو بتا رہا ہے کہ کس طرح عیش پرست باپ بیوی کی موت کے بعد اولاد کے ساتھ پیش آتا ہے اور ایک کٹر باپ اپنے نفس کے واسطے بیٹی پر کیا کیا مصیبتیں ڈھاتا ہے۔

کتاب کی تعریف فضول ہے۔ علامہ محترم کی تصنیف تعریف سے مستغنی ہے۔ قیمت ۱۰ر

مجالسِ حسنہ

جن عورتوں مردوں کو حضرت خواجہ حسن نظامی کی روحانی و اسلامی اور حکیمانہ باتیں سننے کا شوق ہو وہ یہ کتاب منگا کر پڑھیں جس میں خواجہ صاحب کی وہ تمام باتیں درج کر دی گئی ہیں جو وہ اپنے ملنے والوں سے بطور وعظ و نصیحت یا خوش طبعی کے کرتے ہیں۔ جو شخص اس کتاب کو پڑھے گا ایسا معلوم ہوگا کہ وہ خواجہ صاحب کے سامنے بیٹھا ان کی مجالس کا لطف اٹھا رہا ہے یہ کتاب روزنامچہ کی طرح مقبول ہے خواجہ صاحب کے ہر مرید پر لازم اور فرض ہے کہ وہ ضرور ایک کتاب منگا کر اپنے پاس رکھے اور روزانہ اس کو پڑھ کر لوگوں کو سنایا کرے۔ قیمت صرف دس آنے۔ (۱۰ر)

سب کتابیں ملنے کا پتہ:- منیجر یوسفیہ کتب خانہ۔ بارود خانہ۔ لاہور

گورے اور خوبصورت
ہونے کی شرطیہ اور لاثانی دوا
ایچشن بیوٹی
کیل کانٹے۔ جھریاں اور جھائیں جو آپکے چہرے کو بدنما کئے ہوئے
ہیں اور دن رات آپ اسی فکر میں ہیں۔ کہ کسی نہ کسی طرح یہ کالے
کالے داغ دور ہوکر گورے گورے اور خوبصورت گال ہو جائیں۔ تو آپکو چاہیئے کہ
ایچشن بیوٹی کا استعمال کریں جو چند ہی روز کے استعمال سے مرجھائے ہوئے
چہرے اور مرجھائے ہوئے گالوں کو مثل گلاب کے سرخ بنا دیگی۔ کیل کانٹے اور
اور افراد مفقود ہوکر چہرے کی جلد کو مثل مخمل کے نرم اور ملائم کر دیگی
جس سے آپ ایک قابل قدر حسین دکھائی دینگے۔ اور اگر نازک مزاج
حسین ایچشن بیوٹی کا روزانہ استعمال کریں تو ایچشن بیوٹی اُن کے
حسن کو اور بھی چار چاند لگا دیگی۔ ایک دفعہ آزمائشی آرڈر دیکر
اپنے حسن کو دوبالا کیجیے۔ درجہ اول تین روپے۔
درجہ دوم ایک روپیہ آٹھ آنہ
محصولڈاک علاوہ
عورت کا حسن
عورت کا زیور۔ عورت کا لباس
عورت اگر ان تینوں خوبیوں کی مالک ہو تو خواہ مخواہ نفرت حسین
آپ سے خراج تحسین حاصل کئے بغیر نہ رہے گا۔ ان تینوں
میں سب سے فوقیت لینے والی اگر کوئی چیز ہے تو وہ عورت کا لباس
نئی روشنی نئے زمانے نئے فیشن
کے مطابق جہاں عورت کے حسن کو چار چاند لگا نیوالا لباس ہے۔
وہاں اس کے پہلو بہ پہلو انگیا بھی ہے جس کے زیب تن کرنے
سے عورت کے حسن کی دائمی حفاظت ہو جا سکتی۔
یہ انگیا خاص ریشمی کپڑے سے ولایتی کٹ کے مطابق تیار کی گئی ہے
آج ہی ایک انگیا منگوا کر فائدہ اٹھائیے ہر سائز کی
سٹاک میں موجود ہیں۔ قیمت درجہ خاص ۲؍ درجہ اول عہ
درجہ دوم ۱۲؍
علاوہ محصولڈاک
مشرقی ہاؤس بھاٹی گیٹ لاہور

جسم انسانی کی حیرت انگیز کایا پلٹ

مدت مدید سے ماہرین علم سائنس بڑھاپے اور جوانی کا مادہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ آخرکار سالہا سال کی سرتوڑ کوشش اور ہزارہا تجربات کے بعد ملک جرمنی کے علم جسم انسانی اور علم کیمیا کے بینظیر ماہر ڈاکٹر رچرڈ ویز نے جوانی کے گم شدہ یا سست غدودوں کو بغیر اپریشن کے طاقتور بنانے والا جو مرکب دریافت کیا ہے وہ وریلین ہے۔ وریلین کے استعمال سے جوانی کی غلطی کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ اور بڑھاپے کی تمام علامات دور ہو جاتی ہیں۔ رنگت میں سرخی آ جاتی ہے بینائی بڑھ جاتی ہے بال سیاہ ہونے لگتے ہیں۔ خون کا دورہ تمام جسم میں اور اعضاء رئیسہ میں باقاعدہ ہونے لگتا ہے۔ قوت ارادہ اور یادداشت تیز ہو جاتی ہے۔ اختلاج قلب اور بادی کا موٹاپا نیند کا نہ آنا وغیرہ بھی دور ہو جاتے ہیں۔ غرض وریلین کا چند ہفتے کا استعمال قوت مردمی کو بحال کر دیتا ہے۔ اور ہر کمزور اور بوڑھا آدمی اپنی کھوئی ہوئی طاقت اور جوانی کی سی ہوشیاری کو پیدا کر سکتا ہے۔ **وریلین** کی ۱۰۰ گولیوں کی شیشی کے بکس کی قیمت للعہ اور ۲۰۰ گولیوں کی قیمت للعہ محصولڈاک ہر حال علاوہ ہے۔ وریلین کے موجد نے عورتوں کیلئے بھی ایسا ہی جوہر دریافت کیا ہے جس کا نام **فرلمین** ہے جو ہر گم کردہ شباب عورت کے لئے بہترین چیز ہے۔ معین حمل ہے۔ سیلان الرحم، حیض کے جملہ نقائص کو دور کرتی ہے۔ بانجھ عورتوں کے لئے خاص کر مفید ثابت ہوئی ہے **فرلمین** کی ۱۰۰ گولیوں کے بکس کی قیمت ؎ اور ۲۰۰ گولیوں کے بکس کی قیمت ؎ — **کیسے نووا کریم** — ڈاکٹر رچرڈ ویز موصوف کا ایجاد کردہ ... ہے۔ کسی قسم کا نقصان نہیں دیتا۔ دوسرے علاجوں کی طرح کئی دن استعمال نہیں کرنا پڑتا۔ بلکہ ادھر لگایا۔ ادھر فائدہ دیکھ لیا۔ مرض کا ... جاتا ہے۔ جالیس ... کیلئے خوبصورت ٹیوب میں بھیجا گیا ہے۔ قیمت ؎ علاوہ محصولڈاک ہر حال (**نوٹ**) مندرجہ بالا ادویہ ہم نے ڈاکٹر رچرڈ ویز (برلن جرمنی) سے منگائی ہیں لہٰذا تازہ اور اصلی ادویات براہ راست ہم سے منگائیں اور فائدہ حاصل کریں۔ مشورہ طلب امور کیلئے جوابی خطوط بھیجئے۔ (**شکریہ**) ہم ان حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے مندرجہ بالا ادویات ہم سے منگا کر فائدہ حاصل کیا۔ اور جنکے صلہ میں ہمیں خود بھی اچھا بونس ملا۔ لہٰذا آئندہ چند دنوں کے لئے قیمتوں میں کمی کر دی گئی ہے۔

مینوفیکچرز ایجنٹس:۔ ڈاکٹر زیڈ۔ کے۔ درانی اینڈ سنز دہلی۔

اطلاع

ہندوستانی اکاڈیمی صوبہ متحدہ الہ آباد کی مطبوعات

(۱) ازمنہ وسطیٰ میں ہندوستان کے معاشرتی اور اقتصادی حالات از علامہ عبداللہ بن یوسف علی ایم اے۔ ایل ایل۔ ایم۔ سی۔ بی۔ ای مجلد عہ غیر مجلد عہ

(۲) اردو زبان اور ادب از سید محمد ضامن علی عہ

(۳) مغلوں سے پہلے عرب اور ہندوستان کے تعلقات از مولینا سید سلیمان ندوی۔ قیمت للعہ

(زیر طبع) (۱) مسلمانوں کے تمدن پر ہندوؤں کا اثر از مولینا طفیل ... صاحب عباسی۔ (۲) قرون وسطیٰ کا ہندوستانی تمدن۔ ترجمہ ... بہادر مہامہوپادھیائے پنڈت گوری شنکر ہیرا چند اوجھا (۳) ہندی ... از ڈاکٹر ... ناتن (چھوٹی را) ترجمہ ... ایم اے ... ایس۔ اے

سکریٹری ہندوستانی اکاڈیمی۔ الہ آباد

بڈھے جوان بن گئے

آب و ہوا کی ناموافقت۔ دماغ کی کمزوری۔ نزلہ یا دیگر خرابیوں سے قبل از وقت انسان کے بال سفید ہو جاتے ہیں اور اکثر نوجوان جوانی سے پہلے ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر آدمی جوانی کی حسرت میں گھٹ گھٹ کر صحت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم نے طبی اصول پر بصرف کثیر اور تجربات بسیار کے بعد تمام اسباب کا خیال رکھکر نباتی اجزا سے جو خضاب خوردنی مقوی جسم و دماغ تیار کیا ہے۔ وہ آپ کو صرف تین خوراک میں بوڑھے سے جوان شیر ببر بنا دے گا۔ اور شباب قربان ہوتا ہوا نظر آنے گا۔ اور اگر آپ اپنے گئے ہوئے شباب کی تمام طاقتوں چمکتے ہوئے رنگ اور اٹھتی ہوئی امنگ کو واپس بلانا چاہتے ہیں تو اگر آپ خواہشمند ہوں کہ آپ کا دماغ صحیح ہو جائے کہ ایک مرتبہ کسی تقریر کو سن کر یا ایک کتاب کو پڑھ کر کبھی نہ بھولیں۔ اگر آپ ضعف جوانی کے متعلق امراض میں گرفتار ہوں بھوک بالکل جاتی رہی ہو۔ نزلہ وغیرہ نے پریشان کر رکھا ہو چہرہ مرجھا گیا ہو شباب رخصت ہو گیا ہو۔ بال ایک ایک کر کے سفید ہو جاتے ہیں تو جلد سے جلد

اکسیر شباب مقوی خضاب خوردنی استعمال فرمائیے۔ تجربہ کرنے والوں کا زبردست دعوے ہے کہ بال خواہ کسی وجہ سے وقت سے پہلے یعنی ساٹھ برس سے کم عمر میں سفید ہو گئے ہوں تو اس کے استعمال سے از سر نو سیاہ ہو جاتے ہیں پھر کبھی سفید نہیں ہوتے بینائی اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ عینک لگانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی بے اولادوں کیلئے اس کا کھانا اکسیر ہے مقوی تو یہ اسقدر ہے کہ بڑے بڑے شاہی اور قیمتی نسخے بھی اس کے سامنے ہیچ اور فضول ہیں۔ ناممکن بلکہ قطعی ناممکن ہے کہ اسے استعمال کر کے اپنی قوت کو محسوس نہ کریں آپکے اطمینان کیلئے ہم یہ شرط بھی کرتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ دوا فائدہ نہ کرے یا اس کا اثر چند روزہ ثابت ہو تو قیمت واپس یا دوا دوبارہ مفت بھیجیں گے۔ اب اسقدر مفید اور مستند ہونے پر بھی آپ قدر نہ کریں تو تعجب ہے ایک گولی روزانہ دودھ یا تازہ پانی کے ساتھ بیس دن متواتر کھائیے پرہیز کچھ نہیں ہر عمر اور ہر موسم میں مفید ہے قیمت مکمل کمس سات روپے محصول آٹھ آنہ۔ دس روپے سے زیادہ یکمشت منگانے والے کو چار آنہ فی روپیہ کمیشن بھی دیا جائے گا۔ رسالہ کا حوالہ ضرور دیں۔

دنیا اسکے مفید ہونیکے متعلق کیا کہتی ہے

ایڈیٹر نیرنگ خیال کا ریویو

منیجر کارخانہ خوردنی خضاب حکمی شفاگھر لکھنؤ نے ہمارے پاس خوراک برائے ریویو بھیجا ہم نے حافظ عبدالرزاق ملازم دفتر کو استعمال کرایا۔ حافظ صاحب کا بیان ہے کہ اسکے استعمال سے انہیں بہت تقویت حاصل ہوئی جسم میں چستی و چالاکی پیدا ہو گئی کام کرنیکو دل چاہتا ہے بھوک لگتی ہے کوئی کوئی بال سیاہ بھی معلوم ہونے لگا ہے

اخبار سرفراز ایڈیٹر خواجہ حسن شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ واقعی اس کارخانہ کی بعض ادویہ خصوصاً اکسیر شباب خوردنی زود اثر تعجب خیز بنانے والی ثابت ہوئی ہے اور پبلک کیلئے بہت مفید ہے۔

روزنامہ اخبار ٹریبون کے بابو پی این صاحب لکھتے ہیں کہ مجھے یہ لکھتے ہوئے نہایت خوشی ہوئی کہ آپکے دواخانہ کی چند دوائیں تجربہ کرنیکا اتفاق ہوا ہے آپکی تحریر کے مطابق ہیں خضاب سلی اکسیر شباب بہترین چیز ہے میں نے خود تجربہ کیا اور نفع پایا ایسی مفید دواؤں کی کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں مجھے امید ہے کہ پبلک فائدہ اٹھائیگی اور آپکا کارخانہ ہمیشہ فارغ البال رہے۔

ملنے کا پتہ

منیجر کارخانہ خوردنی خضاب حکمی شفاخانہ لکھنؤ (یو۔پی)

تصنیفات احمد حسین خانصاحب ایڈیٹر رسالہ شباب اُردو لاہور

سیرۃ احمدی یعنی حضور سرور عالم رحمۃ للعالمین کی سوانحعمری اس کتاب میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سوانح عمری کے علاوہ ازواج اور اولاد کا تذکرہ بھی ہے۔ حضور کے طبعی عادات وحالات حضور کی تعلیم اور اس کی فلاسفی نبوت اور معجزات اور انکی فلاسفی۔ تکثیر ازدواج طلاق غلامی (اسلام مذہب سیف نہ تھا (نہ ہے) ان عنوانات پر تفصیلاً بحث علیحدہ علیحدہ باب قائم کر کے کی ہے جو اس کتاب کی خصوصیت ہے۔ نہایت دیدہ زیب کتابت اور طباعت البتہ کاغذ دو طرح کا لگایا گیا ہے۔ **قیمت** درجہ اول ہے ر درجہ دوم عہ ر۔ عاشقان حضور کے قابل مطالعہ ہے جلد طلب فرمایئے تاکہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار نہ کرنا پڑے۔

نظیر بیگم یہ اپنے رنگ کا بےنظیر ناول ہے جس میں ایک بیاہتا کی وفاداری اور رنڈی کی بیوفائی دکھائی گئی ہے۔ شوہر کی جدائی وبیالتفاتی سے عورت مرجاتی ہے۔ آخر میں رنڈی کے مظالم سے شوہر تنگ آکر مجنون ہو جاتا ہے اور بیوی کی قبر کی تلاش میں قبرستان جاتا ہے وہاں ایک نقاب پوش عورت کو پاتا ہے جو دراصل اسکی بیوی ہے۔ مرجانے کے بعد اسے بیوی کیونکر زندہ مل گئی؟ یہ راز کتاب پڑھنے سے معلوم ہوگا۔ عہ ر

حسرت یہ ایک اسم بامسمیٰ ناول ہے جس نے گردش زمانہ تنگی اور اقبال اور ادبار کے دلکش سین اور ایک جان نثار شوہر کی وفاداری اور مستقل مزاجی کو ایسے پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ حسرت کی زندہ تصویر آنکھوں کے روبرو پھر جاتی ہے۔ ایسے ناول بہت کم لکھے گئے ہیں۔ **قیمت** عہ ر

سوزر عورت کی بیادی اور مکاری کی داستان۔ عورت کی بیوفائی۔ دوستوں کی عہد شکنی۔ خود غرضی اور خودکامی کے نتائج رنج اور اندوہ کا فسانہ درد وغم کی کہانی، زمانہ کی ناسازگاری، دنیا کے نشیب و فراز، دوستوں پر بھروسہ کا انجام، بیوفائی اور بے مہری کی داستان۔ عورت کی کرتوت۔ ظالم کا ظلم اور اس کا کیفر کردار ضبط وتحمل کی کامیابی بہت ہی دلچسپ اور دلکش انداز میں دکھائی گئی ہے اس کو پڑھ کر انسان مبہوت ہو جاتا ہے۔ **قیمت** عہ ر

گیتی آرا بُری صحبت کا انجام۔ بدچلنی اور بدمعاشی کے نتائج۔ شراب خانہ خراب کی کرتوت، ایک رئیس کی تباہی۔ یورپین تہذیب کے تباہ کن کرشمے۔ ایک مظلوم عورت کی کامیابی، بیوفا۔ بدمعاش اور بدچلن شوہر کی بدکرداریوں کا انجام شروع سے اخیر تک سوز وگداز اور درد واندوہ سے معمور ہے۔ قیمت بارہ آنے . . . . (۱۲)

آہ یہ فاضل مصنف کے بہترین ناولوں میں سے ایک اعلیٰ پایہ کا دردانگیز ہوشربا اور نتیجہ خیز افسانہ ہے۔ یہ ناول مستورات کو خاص شوق سے پڑھنا چاہیئے تاکہ معلوم ہو کہ وہ لڑکیاں جو خودسر ہو جاتی ہیں اور ناعاقبت اندیش ہیں اور والدین کے حکم سے باہر جاتی ہیں اپنی زندگی برباد کرتی ہیں۔ **قیمت** صرف بارہ آنہ . . . . ۱۲ ر

شمع سحر ایک انگریزی ناول کا قابل قدر اُردو ترجمہ۔ مترجم نے کوشش کر کے قصہ کو ایشیا کے مذاق کے مطابق بنادیا ہے۔ اصل کتاب انگلستان کے ایک مشہور معروف ناولسٹ کی تصنیف ہے اس کتاب کی خوبی کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی فہرست میں شامل ہے جس پایہ کی یہ کتاب ہے اسی پایہ کا یہ ترجمہ ہے۔ پڑھنے سے ترجمہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ اوریجنل تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ **قیمت** صرف بارہ آنہ . . . . . (۱۲ ر)

پری بانو قابل دید عجیب وغریب ناول ہے۔ **قیمت** صرف بارہ آنہ . . . . (۱۲ ر)

آپ بیتی یہ ایک لڑکے کا باپ فوت ہو جاتا ہے ماں دوسرا نکاح کر لیتی ہے بچے کو اس موقعہ پر جو سختیاں اور تکالیف اٹھانی پڑتی ہیں ان کو پڑھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں آخر میں خدا تعالیٰ اپنا فضل کرتا ہے اور کامیاب لائق گریجویٹ بن جاتا ہے۔ نہایت مزیدار لکھا ہے۔ **قیمت** صرف بارہ آنہ . . . . (۱۲ ر)

آئینہ روزگار بچوں کو زیور پہنانا گویا بچہ کی جان ضائع کرنا ہے چور چوری کس طرح سیکھتا ہے اور مال کو کس طرح اُڑاتا ہے اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ کہیں کہیں عیاشی کے بدنتائج بھی معلوم ہوتے جائیں گے۔ یہ مصنف کا پہلا ناول ہے جس میں فسانہ اور ناول کا مزہ آتا ہے۔ واقعی آئینہ روزگار ہے۔ **قیمت** صرف . . عہ ر

نازنین مہ جبین ایک عورت کا آگ میں غسل کر کے دو ہزار سال تک زندہ رہنا اور پھر غسل آتشیں سے ہی زندگی کا ختم ہونا نہایت رقت خیز اور حیران کرنے والا بیان ہے پڑھیں اور متعجب ہوں۔ وحشیانہ زندگی اور وحشیوں کے رسم ورواج بھی اس سے معلوم ہو جائیں گے یہ نہایت ہی دلچسپ اور قابل دید کتاب ہے۔

سادھو کی کرتوت فقیری کے لباس میں عیاشی۔ قزاقی ظلم و ستم کا نظارہ قابل دید **قیمت** . . . ۸ ر

گلبدن ایک غریب کا اتفاقاً۔ لاٹری میں دولت پاکر دولتمند ہو جانا پھر دولت کے نشہ میں آکر اعزا اقربا سے نفرت کرنا اور اپنی لڑکی کی نسبت اپنے بھتیجے سے کر کے اس سے پھر جانا۔ نتیجہ کیلئے ناول دیکھو۔ سراغرسانی کا بہت ہی دلچسپ ناول ہے۔ **قیمت** - ۱۲

مکافات عمل ایک سنسنی خیز اور پُر درد فسانہ۔ محبت کی ماتم

عشق کے چوچلے۔ وصال و فراق کی داستان۔ راز و نیاز کی باتیں اور محبت کی کرشمہ سازیاں۔ قیمت ایک روپیہ - - - عہ/

پارۂ دل ایک دلگداز فسانہ۔ گردش تقدیر کے کرشمے۔ جدائی اور نامرادی کی داستان۔ حسن و عشق کا معاملہ بہت ہی دل سوز اور جگر دوز فسانہ ہے۔ قیمت ایک روپیہ - - عہ/

درد ایک لاجواب ڈی ٹیکٹو ناول جس کے متعلق لوگوں کا خیال ہے کہ پی باتو کے بعد یہ سب سے بہتر ناول ہے۔ اس کو پڑھ کر انسان ہمہ تن درد و سور بن جاتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ - عہ/

وہ عورت جسے بے کر کے دکھایا ایک عجیب و غریب ناول قابل مطالعہ قیمت ۱۲/

واہ سراغرسانی کے ناولوں میں سب سے بہتر ناول ہے۔ انسپکٹر محمود صاحب ہندوستان کے شرلاک ہومز کے کارنامے جو جناب مسٹر ٹامکنس صاحب بہادر ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کے ایماء سے

لکھا گیا ہے اور انہی کے نام نامی پر معنون ہے۔ قیمت - عہ/

سرخ حرف بعض کا خیال ہے کہ یہ فلسفی ناول جو سراپا سوز و گداز ہے۔ بہترین تصنیف میں سے ہے اور یہ بالکل سچ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک دیوانتقام شوہر نے عبرت خیز انتقام کس طرح لیا قابل دید۔ قیمت بارہ آنہ - - (۱۲/)

ابلیس و جمیلہ شیطان کے انسانوں سے ہتھکنڈے لائق دید اور قابل عبرت ناول۔ قیمت صرف - - ۱۲/

اسرار امرتسر ٹائیٹل اور طباعت وغیرہ دیدہ زیب واقعات نہایت دلربا۔ قیمت صرف - - ۹/

کوہ شملہ یہ ناول بھی دیکھنے کے لائق ہے اسے پڑھ کر دنیا کے نشیب و فراز انسان خوب سمجھ سکتا ہے۔ قیمت ۸/

تصویر رسوائی یعنی مسز دا بیگم کی بیوفائی۔ نہایت دلچسپ ناول ہے۔ قیمت آٹھ آنہ - ۸/

تصنیفات عدیم المثال فسانہ نویس منشی پریم چند صاحب بی اے لکھنوی

منشی صاحب کے افسانے اور ناول ہمیشہ اصلاح اخلاق پر مبنی ہوتے ہیں اور ان کا مقصد شریفانہ جذبات کا برانگیختہ کرنا ہوتا ہے۔ ان کتابوں میں فطرت کا دلچسپ مطالعہ نازک ترین جذبات و احساسات کا بیان ہے۔ زندگی کے معموں کو نہایت خوبی سے سلجھایا ہے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ منشی صاحب کی تصنیف آپ پڑھیں اور ان کی جادو بیانی اور سحر نگاری کے قائل نہ ہو جائیں۔ پڑھ کر دیکھئے:

پریم پچیسی حصہ اول و دوم ادیب فطرت نگار کی سب سے پہلی اور سب سے زیادہ مقبول تصنیف جو پہلا ایڈیشن تمام ہونے کے بعد کہیں سے دستیاب نہ ہو سکتی تھی۔ اس مجموعہ میں ماتا، بڑے گھر کی بیٹی، نمک کا داروغہ، رانی سارندھا، بیغرض محسن، آہ بیکس، خون سفید، صرف ایک آواز، کرموں کا پھل، غیرت کی کٹاری، منزل مقصود، وغیرہ خاص طور پر شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ قیمت حصہ اول (عہ/) حصہ دوم (عہ/)

پریم بتیسی حصہ اول و دوم ہندوستان کے بینظیر افسانہ نویس منشی پریم چند کے افسانے ہمیشہ اصلاح خلق پر مبنی ہوتے ہیں اور ان کا مقصد شریفانہ جذبات مثلاً غیرت، حیا، خوف خدا، شجاعت اور آزادی ضمیر وغیرہ کا برانگیختہ کرنا ہوتا ہے۔ پریم بتیسی کے بتیس تازہ ترین قصوں کا مجموعہ ہے۔ ان قصوں میں فطرت کا دلچسپ مطالعہ نازک ترین جذبات و احساسات کا بیان ہندوستانی مناظر قدرت کے پرلطف اسکیچ ہیں۔ زندگی کے معموں کو نہایت خوبی سے سلجھایا ہے۔ اور ان سے

زندگی میں انقلاب پیدا کر دیں گے غیر ممکن ہے کہ کوئی صاحب منشی صاحب موصوف کی تصنیف پڑھے اور آپ کی جادو بیانی اور سحر نگاری کا قائل نہ ہو جائے۔ قیمت حصہ اول ۱۲/ حصہ دوم ۱/

خاک پروانہ منشی صاحب کے تازہ افسانوں کا مجموعہ جن کی شہرت و قبول کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ چینی زبان میں بھی اس کے ترجمے ہوئے ہیں۔ قیمت - عہ/

خواب و خیال منشی پریم چند کے تازہ ترین مختلف افسانوں کا مجموعہ۔ ہر افسانہ پختگی خیالات اور شستگی تحریر کا نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔ اور حقائق حیات کی مصوری کے ساتھ معاشری مسائل کے نہایت اہم پہلوؤں کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ضخامت ۲۰۴ صفحے ٹائٹل رنگین۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ - - - (عہ/)

بازار حسن ادیب فطرت نگار منشی پریم چند کا پہلا ضخیم ناول اردو میں ایک حسین اور ناز و نعم میں پلی ہوئی لڑکی کی سرگزشت جسے اس کے باپ کی گرفتاری کے بعد اس کے عزیزوں نے ایک ادھیڑ غریب شخص سے بیاہ دیا جو کسی لحاظ سے اس کے لئے موزوں نہ تھا

موازنہ اس سے کرکے ہمیشہ رشک کرتی تھی۔ یہاں تک کہ آخر ایک روز شوہر سے لڑائی ہونے کے بعد بازارِ حسن کی زینت بن گئی۔ ایک مخلص قوم نے اسے بہت مشکل سے اس ذلت کے غار سے نکال کر اس راستہ پر لگا دیا جو انسانی زندگی کا منزلِ مقصود ہے۔ ضمناً ان امور پر بھی نہایت خوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ بازارِ حسن کے فروغ کا سوسائٹی پر کس قدر الزام ہے۔ ہندو مسلم اختلافات کے کیسے مضر نتائج نکلتے ہیں اور بازارِ حسن کی اصلاح کے کیا طریق ہیں۔

قیمت حصہ اول عہ، حصہ دوم دعہ،

چوگان ہستی ہندی میں منشی صاحب کا یہی ناول (رنگ بھومی) کے نام سے اس قدر مقبول ہوا کہ تمام پریس نے باتفاق رائے اسے معزز ادب ہندی ادب کا اور منشی پریم چند صاحب کا بہترین ناول قرار دیا ہے۔ منشی پریم چند صاحب نے اس شاہکار کا خود اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ معاشرت کی صحیح مصوری، ورکردار نگاری یکتہ رسی اور فلسفیانہ غور و خوض میں منشی صاحب کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ اور اس ناول میں ان کی یہ تمام خصوصیات اپنے پورے شباب پر ہیں۔ ایک حیرتناک موثر افسانہ جو بے مثال قادر الکلامی سے بیان کیا گیا ہے۔ رسالہ زمانہ میں اتنی سی اطلاع نکل جانے پر کہ یہ ناول جلد شائع ہوگا

ہے فرمائشوں کی بوچھاڑ ہوگئی تھی۔ ابھی ابھی چھپ کر تیار ہوا ہے۔ مایوسی سے بچنے کیلئے فوراً طلب کیجئے۔ **قیمت** حصہ اول عہ حصہ دوم عہ

رام چرچا ہمارے دوست پریم چند صاحب نے یوں تو اردو زبان کو اپنی بے نظیر تصانیف سے مالا مال کر دیا ہے لیکن ان کی یہ کتاب خاص طور پر بچوں کے پڑھنے کے واسطے لکھی گئی ہے۔ اس کی زبان خاص طور پر بلیغ و سادہ ہے۔ طرز بیان ایسا ہے کہ رامائن کے تمام واقعات ننھے ننھے بچے بھی اسے پڑھ کر ذہن نشین کر سکتے ہیں۔ "رام چرچا" میں مریادا پرشوتم سری رام چندر جی مہاراج کی لاثانی زندگی کے پورے حالات۔ واقعات قلمبند کئے ہیں۔ پیدائش۔ شادی۔ بن باس۔ سیتا جی کا ہر جانا۔ لنکا پر حملہ۔ اجودھیا میں واپسی، بھرت ملاپ۔ سیتا جی کا بن باس وغیرہ۔ تمام واقعات نہایت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ بچوں کے علاوہ کم استعداد اصحاب اور عورتوں کے لئے بھی اس کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔ چھوٹی تقطیع۔ حجم ۲۴۶ صفحات۔ سرورق رنگین و مصور۔ قیمت عہ

نرملا ناول۔ قابل دید تازہ تصنیف عہ سوزِ وطن حبِ وطن کے قصے ۱۲ار پریم چالیسی۔ اعلیٰ کہانیاں حصہ اول گوشۂ عافیت حصہ اول ناول عہ ۱۲ار تازہ قیمت عہ ۱۲ار حصہ دوم عہ

تصنیفات بابو تیرتھ رام صاحب فیروزپوری مشہور ناول نویس

فسانہ بنگال بنگلہ زبان کی چیدہ اور پسندیدہ کہانیوں کا ترجمہ شستہ و رفتہ اردو میں کوئی کہانی ایسی نہیں کہ آپ اسے شروع کرکے نامکمل چھوڑ سکیں ۱۳۵ صفحے **قیمت** ۱۲ار

نقلی نواب بڑا دلچسپ اور قابل دید جاسوسی ناول ہے اور نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے۔ قیمت عہ

سنباستان بنگلہ کی پندرہ نہایت دلکش اور مقبول کہانیوں کا مجموعہ جن میں سے ہر ایک پبلک سے تحسین خراج حاصل کر چکی ہے۔ ۱۷۶ صفحے **قیمت** عہ

مصنوعی انسان (اور دوسرے افسانے) نہایت دلچسپ اور مقبول و دلکش کہانیوں کا مجموعہ قیمت ۱۲ار

تصنیفات مہاشہ سدرشن

بنگال ہستی پہلا حصہ ۲۰۴ صفحات کی کتاب نہایت عمدہ کاغذ پر نفیس لکھائی چھپائی کیساتھ شائع ہوئی ہے۔ اس حصہ میں بنگالی زبان کے بہترین کہانیاں لکھنے والے اصحاب کی ۱۳ کہانیوں کا ترجمہ ہے۔ یہ کہانیاں اس قدر پُرلطف پُرسبق اور دلچسپ ہیں کہ پڑھ کر پرندہ دل رقص کرنے لگتا ہے۔ اس کے مطالعہ سے اردو دان اصحاب کو معلوم ہوگا کہ فن قصہ نویسی کیا ہے اور بنگالیوں نے اس فن کو کس قدر عروج پر پہنچا دیا ہے۔ یہ کتاب ہر

ایک عورت مرد کے دیکھنے کی چیز ہے اور اس میں کوئی فقرہ یا سطر ایسی نہیں جو چال چلن پر بُرا اثر ڈالنے والی ہو۔ جو اصحاب کہانیاں لکھنا سیکھنے کے خواہشمند ہوں ان کو اس کتاب کا ضرور بالضرور مطالعہ کرنا چاہیئے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ غلط راستے پر ہولیں اور لکھنے کی عادت انہیں ایسی پڑ جائے کہ پھر بدلنا ناممکن ہو جائے۔ ذیل میں ان اصحاب کے اسمائے گرامی درج کرتے ہیں جن کی کہانیاں اس حصہ میں ترجمہ کرکے داخل کی گئی ہیں تاکہ ان کی اہمیت کا احساس

لوگوں کو بھٹکے اور وہ کچھ اندازہ کتاب کی خوبیوں کا لگا سکیں۔

شاعر رابندر ناتھ ٹیگور، بابو پربھات کمار چیٹرجی ایم اے بیرسٹر، شریمتی ان پورنا دیوی بی اے۔ بابو شرت چندر چیٹرجی۔ بابو شرچندر گھوشال ایم اے۔ بوکیشو چندر گپتا ایم۔ اے بی ایل۔ بابو جلدھر سین، بابو اپیندر ناتھ گانگولی، بابو سریندر موہن کانجی۔ شریمتی نروپما دیوی بابو ہیم ناتھ سرکار، بابو گرجا کمار گھوش۔ قیمت ۔ ۔ ۔ عہ

بنگال نیتیس دوسرا حصہ

یہ اسی کتاب کا دوسرا حصہ ہے۔ اس کی لکھائی چھپائی نہایت اعلیٰ ہے۔ مگر کاغذ ذرا میلا ہے اس کے ۲۳۰ صفحے ہیں اور اس میں ۱۹ کہانیاں ہیں ہم تو نہیں سمجھتے مگر لوگوں کا خیال ہے کہ اس حصہ کی کہانیاں پہلے حصہ کی کہانیوں سے بدرجہا افضل و برتر ہیں۔ ان میں فصاحت ہے ان میں بے ساختہ پن ہے۔ ان میں حسن ہے اور ان سب سے بڑھ کر ان میں تاثیر ہے جو نہایت ضروری عنصر ہر ایک عمدہ اور مفید کتاب کا ہے۔ بہت عمدہ کتاب ہے۔ ذیل میں کہانیوں کے عنوان اور ان کے لکھنے والوں کے اسمائے گرامی درج کئے جاتے ہیں:-

(۱) ایک اندھی کی سرگذشت۔ شاعر مسر رابندر ناتھ ٹیگور۔

(۲) قیس۔ شریمتی سورن کماری دیوی بی اے۔

(۳) بدنصیب۔ اوما موہن گھوش۔

(۴) بدصورت دلہن۔ شریمتی سیتا دیوی بی۔ اے۔

(۵) جب دنیا محبت کے رستہ میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ شریمتی شانتا دیوی بی اے

(۶) سونے کا شیر۔ پربھات کمار بیرسٹر ایٹ لا۔

(۷) فرضی نام۔ پی۔ کے مکھوپادھیائے بی اے۔

(۸) حسن سیرت۔ بابو پرکاش چند۔

(۹) پراثر تعویز۔ بابو کیشو چندر گپت ایم اے بی ایل۔

(۱۰) لال کرتا۔ بابو ہیم ناتھ سرکار۔

(۱۱) غم نصیب۔ بابو شرت چند چیٹرجی۔

(۱۲) انارکلی۔ بابو سریندر ناتھ گپت۔

(۱۳) لکڑی کا گھوڑا۔ بابو گرجا کمار گھوش۔

(۱۴) ملاح کی بیٹی۔ اپیندر ناتھ گانگولی۔

(۱۵) میری ملازمت۔ بابو جلدھر سین۔

(۱۶) گونگی کا عشق۔ شریمتی نروپما دیوی۔

(۱۷) پاداش عمل۔ بابو شرچندر گھوشال۔

(۱۸) نگاہ انتخاب۔ بابو پریم کمار۔

(۱۹) آزاد لڑکی۔ شاعر رابندر ناتھ ٹیگور۔

کہانیوں کی یہ کتاب کہانیوں کے ہر ایک شوقین کو پڑھنی چاہئے۔

قیمت ایک روپیہ بارہ آنہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عہ

گناہ کی بیٹی

یہ پورے ایک سو صفحے کا ناول ہے۔ جسے فطرت نگار سدرشن نے بنگالی زبان کے ایک نادر ناول سے ترجمہ کیا ہے اس میں ایک آوارہ عورت کی بیٹی کے حالات درج کئے گئے ہیں، اور بتایا گیا ہے کہ نیک جذبات ایسے سینوں میں بھی کروٹیں بدلتے ہیں۔ جہاں انسان کو گناہ کے سوائے کسی دوسری شے کی توقع نہیں ہوتی اور روشنی وہاں بھی اپنے جلوے دکھاتی ہے جہاں بظاہر سراسر تاریکی کی حکومت سمجھی جاتی ہے اور کہ دنیا میں نیکی بھی تکلیف پاتی ہے اگر وہ گناہ کے پیٹ سے پیدا ہو۔ اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نیکی کرنا کیا مشکل اور بدی کرنا کس قدر آسان ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ حسن و عشق کی داستان کے ساتھ موت کے لیے ایسے عقدے مصنف نے حل کئے ہیں کہ انسان عش عش کر اٹھتا ہے۔ اس کتاب کا آغاز عشق مجازی سے ہوتا ہے۔ مگر آخر میں وہی عشق عشق حقیقی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ قیمت ۔ ۔ ۱۲؍

وجے سنگھ

یہ بنگال کے مشہور ڈرامانسٹ بابو ڈی۔ ایل رائے کا ناٹک ہے۔ جسے فطرت نگار نے اردو جامہ پہنایا ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ اور کاغذ نفیس ہے اور حجم ۲۰۸ صفحے ہے۔ اس میں سوتیلی ماں کی خصلت بد کا۔ باپ کی محبت کا۔ عورت کی جانبازی کا اور شریف جذبات کا بیان ہے پہلا ہی منظر اس قدر پُر اثر ہے کہ پڑھ کر طبیعت پُر اثر ہو جاتی ہے اور اس کے بعد ہر ایک منظر ایسا دلچسپ ہے کہ جب تک کتاب ختم نہ ہو جائے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ ناٹک بازاری ناٹکوں کی طرح نہیں ہے۔ اس میں انسانی دل کی گہرائیوں اور روحانی بلندیوں کا بیان ہے۔

آپ نے اردو ناٹک بہت دیکھے ہوں گے مگر بنگالی دماغ نے ناٹک کیا بنا دیا ہے یہ دیکھنا ہو تو وجے سنگھ دیکھئے۔ بہت زمانہ گذرا اجودھیا کے رام نے لنکا پر حملہ کیا تھا مگر لنکا پر دوسرا حملہ کب اور کس نے کیا۔ اور کن حالات میں کیا اور کس طرح کیا اور اس کا کیا نتیجہ نکلا۔ یہ باتیں مسلمان تو ایک طرف رہے خود ہندو بھی نہیں جانتے۔ وجے سنگھ ان تمام سوالوں کا جواب ہے۔ پڑھ کر دیکھئے۔ آپ دنگ رہ جائیں گے۔

قیمت اس کی ایک روپیہ ہے جو اسکی خوبیوں کے مقابلہ میں کچھ نہیں۔

عورت کی محبت

۲۰۴ صفحے کا ناٹک ہے۔ کاغذ لکھائی چھپائی عمدہ ہے۔ اس کے مصنف بھی وہی بابو ڈی۔ ایل رائے ہیں۔ اور مترجم فطرت نگار سدرشن۔ یہ کہنے کو تو ایک ناٹک ہے مگر سچ پوچھا جائے تو وعظ و پند کا ایک دفتر ہے۔ اور خوبی یہ کہ جی اکتاتا نہیں۔ طبیعت کہانی میں پھنسی رہتی ہے۔ اور دل پر شرافت کا اثر

ہو جاتا ہے۔ آپنے اُردو میں آج تک جتنے ناٹک دیکھے ہیں اُن میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو اس ناٹک کا مقابلہ کر سکے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ اصلی محبت کیا ہے اور سفلی جذبات کیسے ہوتے ہیں۔ ایک نقاد کی رائے ہے کہ شیکسپیر نے کنگ لیئر میں لیئر کا کیرکٹر بنانے میں جو کمال دکھایا ہے اس سے زیادہ کمال ڈی۔ ایل۔ رائے کا ہے جنہوں نے لالہ سکند رلال جیسا محبت کا فرشتہ دنیا کی آنکھوں کے سامنے پیش کیا ہے کیا عجیب شخص ہے۔ ہر شخص سے نیکی کرتا ہے۔ ہر جگہ نیکی کرتا ہے اور پھر اپنا احسان نہیں سمجھتا سوچتا ہے میں نے اپنا فرض ادا کیا۔ ایسے صاف دل کا آدمی جب اپنے ساتھ دنیا کا ظالمانہ سلوک دیکھتا ہے تو پاگل ہو جاتا ہے۔ یہ حصہ کتاب کی جان ہے۔ شیکسپیر کے لیئر میں پاگل پن میں جو کچھ کہا ہے وہ ایسا بیش قیمت خزانہ ہے جس پر انگلستان فخر کرتا ہے۔ مگر ہماری سنو تو یہ سکندر لال لیئر سے بھی بڑھ گیا۔ اس کی پاگل پن کی باتوں میں وہ دانائی بھری ہے جو روح کی آنکھیں کھول دیتی ہے۔ پڑھ کر دیکھئے کہ آپ خوش ہوں گے کہ آپنے اس کتاب کو پڑھا۔ قیمت عہ

بہارستان یہ دلچسپ کہانیوں کا مجموعہ ہے جس پر پنجاب گورنمنٹ نے ساڑھے سات سو روپیہ انعام دیا قیمت ۱۲ر

فطرت نگار سدرشن صاحب دورِ حاضرہ کے بہترین قصہ نویسوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی شہرت محتاج تعریف نہیں رہی انکی کتابیں پڑھ کر آپ خوش ہوں گے آپ کو فخر ہوگا کہ ہندوستان بھی ایسے مصنف پیدا کرنے لگی ہے۔ ان کی کتابیں عورت، مرد، بچے سب کے پڑھنے کے لائق ہیں۔ اکثر کا ترجمہ گجراتی، سندھی اور مرہٹی زبانوں میں ہو کر مقبول ہو چکا ہے

چندن (کہانیاں) - -	عہ	چلکیاں (مُنتخب) - -	۶ر
بیگناہ مجرم (ناول) - -	عہ	محبت کا انتقام (ناٹک)	عہ
تہذیب کے تازیانے (سیاسی) -	۱۲ر	کنج عافیت (ناول)	۶ر
قوم پرست (دلکش ناول) - -	عہ	قوس قزح (کہانیاں)	عہ
من کی موج (دلی کہانیاں) -	۱۲ر	آنریری مجسٹریٹ (پرلطف کامیڈی)	۴ر
سدا بہار پھول (کہانیاں) - -	۱۲ر	زہر یا آب حیات (ناول) - -	عہ
گلدستہ سخن (انتخاب نظم) -	۸ر	راج سنگھ ناول - - - -	عہ
قدرت کے کھیل (ناول) - -	عہ	سنگیت مہابھارت (ناٹک) -	۸ر
خوش انجام (ناول) - - -	۴ر	چشم و چراغ تازہ تصنیف کہانیاں	۸ر
صبح وطن (کہانیاں) - -	عہ		

بچوں کیلئے دلچسپ کہانیاں آسان عبارت میں

پارس باتصویر حصہ اول (کہانیاں)	۸ر	امرت باتصویر (کہانیاں)	۸ر
پارس حصہ دوئم	۸ر	دنیا کے عجائبات (باتصویر)	۸ر
پارس حصہ چہارم	۴ر	بچوں کیلئے ہتوپدیش - -	۱۰ر
شاہزادہ ساگر - -	۸ر	بچوں کیلئے مہابھارت (باتصویر)	۴ر
پھول وتی (ناول)	۸ر	ہمالیہ رشی کی بیاری (باتصویر)	۶ر
بچوں کیلئے رامائن باتصویر	عہ	رستم و سہراب (ناول) - - -	۸ر

عرض حال

مولانا محمد عبد الحلیم صاحب شررؔ مرحوم میرے محترم بزرگ دوست تھے۔ آپکے بیش بہا مضامین ''مضامین شرر'' کے نام سے سات جلدوں میں شائع کئے ہیں۔ جن دنوں مولانا مرحوم انگلستان تشریف لے گئے آپ کی غیر حاضری میں ہندوستان کے اکثر مطابع نے ان کی پہلی تصنیفات کو بلا اجازت چھاپنا شروع کر دیا۔ گو یہ بھی ایک بڑا بھاری اخلاقی اور قانونی جرم تھا مگر اس پر مزید غضب یہ کیا کہ کاغذ۔ لکھائی اور چھپائی کا کچھ خیال نہ کیا بلکہ غلط سلط چھاپ کر روپے بٹورنے شروع کر دیئے مجھے کتابوں کو اس طرح غارت ہوتے دیکھ کر سخت رنج ہوا۔ اس لئے میں نے باجازت ان کتابوں کو چھاپنا شروع کیا ہے اور قیمت بھی معمولی رکھی ہے۔ اب جبکہ آپ کو یہ کتابیں عمدہ صورت میں اور بازاری مطابع کے نرخ پر ہی ملیں گی تو ردی غلط کتابوں کے خرید سے احتراز فرمائیں۔

آپکا دعاگو۔ سید مبارک علی شاہ گیلانی مولوی فاضل مہتمم لاہور

دلگداز ۱۹۱۳ء۔ ولگداز ۱۹۱۳ء ملیں اعلیٰ مضامین کے قابل دید ہیں	عہ فی جلد
ملک العزیز ورجینیا۔ اسلامی جوش، حسن و عشق و قصہ نہیں جیتی جاگتی تصویریں	۱۲ر
حسن انجلینا۔ روم و روس کی لڑائی۔ کامیاب محبت کا بیان - -	۱۲ر
منصور موہنا۔ عشق و محبت کا دردناک انجام - -	۱۲ر
دلچسپ ہر دو حصہ۔ مولانا شرر کی سب سے پہلی تصنیف -	۱۲ر
دلکش کامل۔ کالج کے اعلیٰ تعلیم یافتوں کا نقشہ - -	عہ
شہید وفا۔ حسرت بھری داستان۔ قصہ نہیں۔ تاریخ	۱۲ر
بدر النسا کی مصیبت نہایت پرلطف و پرعبرت مع ترمیم اضافہ دلکش ناول جلد ۳	۱۲ر
میوۂ تلخ۔ اخلاقی ڈراما جس کے ذریعے تعلیم نسواں کی ضرورتیں دکھلائی گئی ہیں -	۸ر
ڈاکو کی دلہن۔ ایک نہایت دلچسپ انگریزی ناول کا ترجمہ - -	۱۲ر

رسالہ زمانہ کانپور کا ریویو

مضامین شرر

مولانا عبد الحلیم صاحب شرر مرحوم لکھنوی اردو زبان کے ایک مشہور و مستند ادیب تھے۔ وہ اپنے علمی ادبی ذوق اور کارناموں کی وجہ سے ہندوستان بھر میں مشہور ہیں اور ہر ایک علمی مجلس میں ان کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ غالباً وہ سب سے پہلے شخص تھے جنہوں نے اسلامی تاریخ کے اکثر واقعات کو دلکش افسانوں کے سانچے میں ڈھالا۔ شرر مرحوم کے ناول اہل علم کے علاوہ عوام کی بھی دلچسپی اور معلومات میں اضافہ کا موجب ہوئے۔ مناظر فطرت کی تصویر کشی اور واقعات کا نقشہ اتارنے میں ان کو کمال حاصل تھا۔ ماہ ملک حسن انجلینا۔ ملک العزیز ورجینیا وغیرہ ناولوں میں مناظر فطرت، میدان جنگ، مجالس عیش و طرب اور دوسرے واقعات اس انداز سے بیان کئے ہیں کہ پڑھنے والے کی نگاہوں کے سامنے اصل واقعہ اپنی حقیقی شکل و صورت میں آجاتا ہے۔

مولانا شرر مرحوم کی مستقل تصانیف شائع ہو کر ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچ چکی ہیں اور تعلیم یافتہ طبقہ میں کوئی ایسا شخص مشکل ہی سے ملیگا جس نے ان کے ایک دو ناولوں کو نہ پڑھا ہو۔ مگر مولانا مرحوم کے وہ علمی و ادبی مضامین اور تاریخی جواہر پارے جو زیادہ تر "دلگداز" اور کثیر دوسرے ملکی رسائل میں شائع ہو کر مقبول عام ہو چکے تھے۔ ایک مدت تک منضبط و مرتب صورت میں نہ لائے جا سکے بلکہ رسائل کے اوراق پریشاں ہی میں منتشر رہے ایسی صورت میں عام شائقین کو ان کے مطالعہ سے استفادہ کرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ ضرورت تھی کہ ان تمام متفرق مضامین کو ایک جگہ جمع کیا جاتا۔ اور خوشی کا مقام ہے کہ سید مبارک علی شاہ صاحب گیلانی نے اس مفید مگر کار عظیم کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا بیڑا اٹھایا۔ اور مولانا شرر کے تمام متفرق جواہر ریزے حسن ترتیب کے ساتھ ایک سلک میں منسلک کر کے اردو زبان کی ایک بہت بڑی خدمت انجام دی۔ سید صاحب موصوف کی یہ مبارک کوشش اور بلند حوصلگی رسمی داد سے مستغنی ہے۔ ان مضامین کی ترتیب و تدوین بجائے خود ایک بہت بڑا کام تھا۔ اور پھر ان کی طباعت میں ہزارہا روپیہ کا صرفہ برداشت کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ ہر اہل علم کا فرض ہے کہ وہ سید صاحب کی اس علمی خدمت کی کما حقہٗ قدر کرے۔ جس کی بہت آسان صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اس مجموعہ مضامین کو خرید کر "ہم خرما و ہم ثواب" کا لطف اٹھائیے۔ مولانا شرر کے مضامین اپنی نوعیت کے اعتبار سے متعدد جلدوں اور حصوں میں منقسم ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

جلد اول (شاعرانہ و عاشقانہ مضامین) اس جلد کے تین حصے ہیں جن کی قیمت علیحدہ علیحدہ ۸؍ ۔ ۱۲؍ ۔ ۹؍ ہے۔

جلد دوم۔ (تاریخی اور جغرافی مضامین) اس جلد کے بھی تین حصے ہیں۔ قیمت علی الترتیب ۱۲؍ ۔ ۱۰؍ ۔ ۱۴؍ ہے۔

جلد سوم۔ (سیر و سوانح) جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس جلد میں جس کے تین حصے ہیں۔ نامور مردوں اور عورتوں کے حالات ہیں۔ پہلے حصہ میں صرف مردوں کے سوانح حیات ہیں۔ دوسرے و تیسرے حصہ میں عورتوں کے۔ قیمت علی الترتیب ۸؍ ۔ ۱۰؍ ۔ ۱۲؍

جلد چہارم۔ (ادب و تحقیق مسائل) یہ محققانہ علمی و ادبی مضامین کا ایک بیش بہا مجموعہ ہے۔ قیمت ۔ ۔ ۱۲؍

جلد پنجم۔ (اصلاح قوم و ملت) اس میں وہ مضامین ہیں جو قوم و ملت کی اصلاح کیلئے لکھے گئے ہیں اس کی قیمت صرف ۱۲؍ ہے

جلد ششم (تاریخی واقعات پر خیال آرائی) جیسا نام ہے ویسے مضامین بھی ہیں۔ قیمت ایک روپیہ دس آنہ۔ ۱؍۱۰

جلد ہفتم (نظم و ڈرامہ) اس جلد میں مولانا کی مستقل نظمیں۔ ڈراما اور بعض دوسرے متفرق مضامین ہیں۔ قیمت ۔ ۱؍۸

مذکورہ بالا سات جلدیں جو تیرہ حصوں میں منقسم ہیں تقریباً چار ہزار صفحات پر مشتمل ہیں ہر ایک جلد اور ہر حصہ پر علیحدہ علیحدہ تبصرہ کرنے کے لئے ایک دفتر چاہئے۔ پھر بھی ان کی خوبیوں کا احاطہ کرنا دشوار ہے۔ لہٰذا "قیاس کن زگلستان من بہار مرا" کو مد نظر رکھ کر مندرجہ بالا تفصیل ہی کافی سمجھنی چاہئے۔

آخر میں ہم ایک بار پھر سید مبارک علی شاہ صاحب گیلانی کو ان کی اس اہم و قابل قدر علمی و ادبی خدمت پر مبارکباد دیتے ہیں اور ناظرین زمانہ سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ اس بے بہا خزانہ کو جلد از جلد حاصل کر کے مستفید ہوں۔

(ریویو رسالہ "زمانہ" کانپور)

دیگر تصانیف مولانا محمد عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم

تاریخ سوانح عمری اور لیکچر وغیرہ

جنید بغدادیؒ۔ حضرت جنید کے حالات ۔ ۔ ۔ ۔ عمر

ابوبکر شبلیؒ۔ حضرت شبلی کے حالات ۔ ۔ ۔ ۔ عمر

حسن بن صباح۔ بانی فرقہ باطنیہ کے حالات ۔ ۔ ۔ ۶؍

خواجہ معین الدینؒ۔ خواجہ اجمیری کے حالات ۔ ۶؍

ملکہ زنوبیہ۔ سلف کی ایک عربی نژاد ملکہ ۔ ۔ ۔ ۳؍

سکینہ بنت حسینؓ۔ جناب سکینہ بنت امام حسینؓ کے حالات ۳؍

قرۃ العین۔ ایران کی مشہور مجتہد زادی کے حالات ۔ ۲؍

ولادت سرور عالمؐ۔ مولد شریف مصنفہ علامہ ابو الفرج ابن جوزی کا ترجمہ نثر کا نثر میں نظم کا نظم میں مجلد ۸؍

سفرنامہ امام شافعیؒ۔ امام ممدوح کے سفر کے حالات ۔ ۴؍

سرسید کی دینی برکتیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲؍

قانون وراثت اسلام پر مولانا کا ایک لیکچر ۔ ۔ ۴؍

ہندوستان کی موسیقی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۴؍

ثانی اثنینؓ حضرت صدیق اکبرؓ کے حالات ۔ ۔ ۔ ۶؍

ذی النورینؓ۔ حضرت عثمانؓ کے حالات ۔ ۔ ۔ ۱۰؍

ابو الحسنینؓ۔ حضرت علیؓ کے حالات ۔ ۔ ۔ ۔ ۸؍

تاریخی ناول

عزیزہ مصر۔ عہد نبی طولوں کا تاریخی ناول ۔ ۔ ۔ عمر

فتح اندلس۔ اسپین پر عربوں کا حملہ ۔ ۔ ۔ عہ

رومتہ الکبریٰ۔ روم پر گاتھ لوگوں کا حملہ ۔ ۔ ۔ عہ

مفتوح فاتح۔ ایک نہایت دلچسپ تاریخی ناول ۔ ۔ ۔ عمر

فلپانا۔ ارض طرابلس الغرب پر صحابہ کا حملہ ۔ ۔ ۔ عمر

فلورا فلورنڈا۔ عباسیہ کے عہد خلافت کے واقعات عہ

قیس ولبنیٰ۔ مشہور عاشق عرب اور اس کی معشوقہ لبنیٰ ۔ عمر

لعبت چین۔ عہد صحابہ کا تاریخی ناول ۔ عمر

مقدس نازنین۔ ایک حسینہ کا پوپ بن جانا ۔ ۔ عمر

ماہ ملک۔ عورتوں کا عروج اور فتوحات ۔ عہ

یوسف نجمہ کامل۔ جگ بیتی نہیں آپ بیتی ۔ ۔ ۔ عمر

ایام عرب۔ جاہلیت عرب کی مکمل تصویر ہر دو حصہ ۔ ۔ عہ

جویائے حق۔ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری معہ ناول حصہ اول عمر دوم ۱۲؍ کامل للعہ

زوال بغداد۔ شیعہ سنیوں کی نا اتفاقی کا عبرتناک نتیجہ بغداد کی تباہی عمر

شوقین ملکہ۔ دوسری صلیبی لڑائی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عمر

طاہرہ۔ نہایت دلچسپ تازہ ناول ۔ ۔ ۔ ۔ عمر

مینا بازار۔ مولانا کا سب سے اچھا ناول ۔ ۔ ۔ عمر

نیکی کا پھل۔ نہایت دلچسپ آخری تصنیف ۔ ۔ عہ

الفانسو۔ ایک عاشقانہ ناول ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲؍

بابک خرمی۔ سلطنت عباسیہ کے حالات ہر دو جلد عہ

مشاطۂ سخن حصہ دوم۔ حضرت صفد مرزا پوری نے دس سال مسلسل عرق ریزی اور جانفشانی کی جس کا ثمرہ یہ حصہ دوم ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول ... ۲۸۰ صفحہ ملنے کا پتہ ڈاک نواب غلام حسین صاحب قمر۔

فتح الحمید۔ سیپارہ مدہ سیپارہ قرآن مجید کا یہ جو مولوی فتح محمد خان جالندھری نے کیا ہے۔ لکھائی چھپائی عمدہ کاغذ اعلیٰ سرورق رنگین قیمت عہ

اصلاح زبان اردو کی اصلاح۔ قیمت ۱۰؍

تصانیف مصور غم علامہ راشد الخیری دہلوی

محبوبۂ خداوند۔ قرون اولیٰ کے پرجوش مسلمانوں کی جانبازیوں کا عبرتناک مرقع عمر

یاسمین شام۔ حضرت عمرؓ کے دور خلافت اور فتح بیت المقدس کے ولولہ انگیز کارنامے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے ۔ ۔ عہ

صبح زندگی۔ اس کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ پیدائش سے لیکر شادی تک لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کیونکر کرنی چاہئے۔ قیمت ایکروپیہ آٹھ آنے عہ

شام زندگی۔ اس میں سسرال کے زمانہ کی تمام مشکلات کو ایسے موثر طریقے سے سمجھایا گیا ہے کہ سعید لڑکیاں ان مکتہ سے نکلنے کے بعد بھی خوش رہ سکیں عمر

نوحۂ زندگی۔ بیوہ عورت کی زندگی اور اسکے دردناک مصائب قیمت ۱۲؍

بنت الوقت۔ جدید تعلیم یافتہ عورتوں کی ناگفتہ بہ حالت کا خاکہ۔ نئی روشنی کی تعلیم کی خرابیاں قیمت صرف ۔ ۔ ۸؍

سراب مغرب۔ مغربی تمدن کے دھوکوں کا انکشاف کورانہ تقلید فرنگ کے نقائص دلچسپ قصہ کے پیرایہ میں قیمت ۸؍

سات روحوں کے کارنامے۔ موت اور مابعد الموت کی کیفیت عالم ارواح کی سیر قابل دید کتاب ۶؍

الزہرا۔ سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراؓ کی نہایت دلکش اور پرسوز سبق آموز سوانح عمری۔ قابل دید کتاب قیمت صرف ۔ ۱۲؍

عروس کربلا۔ کربلا کے تاریخی سچے واقعات۔ شہادت امام علیہ السلام کی دل ہلا دینے والی داستان۔ قیمت صرف عہ

انگوٹھی کا راز۔ ایک نہایت پردرد دلچسپ ناول ہے۔ قیمت ۔ ۸ر

جوہر قدامت آج سے ۵۰ برس پہلے عورتوں کی کیا حالت تھی اور اب کیا ہے نہایت مفید قصہ قیمت صرف ۔ ۱۲ر

طوفان حیات مسلمانوں کو تباہ کرنے والی رسوم قبیحہ کی اصلاح۔ ایک پرسوز قصہ دلچسپ پیرایہ میں قیمت صرف عہ ر

مجموعہ ۔ لڑکیوں کو تر کہ سے محروم کرنے کی مخالفت میں عبرت انگیز قصے کے پیرایہ میں ۸ر

نشتر زندگی حصہ دوم۔ عجیب و غریب کتاب قیمت صرف ۔ عہ ر

سمرنا کا چاند اگر آپ اردو لٹریچر کا لطف اٹھانا چاہیں تو "سمرنا کا چاند" ملاحظہ فرمائیں جو علامہ راشد الخیری کی بہترین تصنیف ہے۔ ترتیب نسواں کیلئے قابل قدر افسانہ ۔ ۔ ۔ ۱۲ر

آفتاب دمشق عہد صدیقی کا اسلام مسلمانوں کے عظیم الشان کارنامے مسلمانوں نے دمشق اور بصرے وغیرہ شہروں پر قبضہ کرنے اور اسلام کی اشاعت کیلئے جو عظیم الشان قربانیاں کی ہیں ان کا ذکر ایسے دردناک پیرایہ میں کیا ہے جو مصور غم علامہ راشد الخیری کا مخصوص اعجاز ہے۔ ایک مسلمان مجاہد اور مسلمان خاتون کی موت اور ان کے مصائب دیکھئے اور سبق حاصل کیجئے۔ ایک حسینہ کا اسلام پر شیدا ہو کر مسلمان ہونا مقید کیا جانا اور فصیل کے کنگروں سے گرائے جانے پر بھی اسلام سے سرتابی نہ کرنا اس کتاب میں مرقوم ہے۔ جوش اسلامی، حمیت اسلامی کا نمونہ آپ کو اس کتاب کے مطالعہ سے ملے گا۔ قیمت صرف ایک روپیہ چار آنہ ۔ ۱۲عہ ر

سیرۃ الشافعی یعنی حضرت امام محمد بن ادریس شافعی علیہ الرحمۃ کی سوانح عمری اس کتاب کے حصہ اول میں امام شافعی کے حالات ابتدائی مثلاً ان کے نام و نسب ولادت تعلیم و تربیت سفر حجاز و عراق علماء کی مخالفت و عداوت۔ آپ کا شہید ہونا وغیرہ حالات زندگی روز وفات تک درج ہیں۔ قیمت دو روپیہ ۔ ۔ ۔ عا ر

نقش فرنگ قاضی عبد الغفار صاحب ایڈیٹر صباح و جمہور نے یورپ سے واپس آکر ان تاثرات کو قلمبند فرمایا ہے جو دیار فرنگ کی تاریخی یادگاروں۔ دور حاضر کے محیر العقول تمدن اور مدبرین مغرب کی جنگ زرگری کے مناظر سے آپکے قلب پر وارد ہوئے تھے۔ یہ کتاب سفرنامہ نہیں بلکہ ایک دلچسپ دلآویز و دلفریب خیالات ہیں جن سے دل و دماغ دونوں لذت اندوز ہوتے ہیں۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ ۔ ۱۲عہ ر

عذرا امین کے باپ نے حنیف کو ایک صندوقچی دی اور وصیت کی کہ میرا خورد سال بچہ جب بالغ ہو جائے تو یہ صندوقچی کھولی جائے۔ اس صندوقچی میں سے ایک تحریر نکلی جس کے بموجب حنیف و امین افریقہ کے لق و دق جنگلوں میں ایک ایسی عورت کے ملک میں پہنچے جو ہزار سال سے زندہ چلی آتی تھی اور آگ کے شعلوں سے نہایا کرتی تھی اس کے حالات ایسے عجیب و غریب ہیں کہ نہ آنکھوں نے دیکھے اور نہ کانوں نے سنے قیمت ۱۲عہ ر

دیوان شادمان یہ فارسی دیوان سلطان شادمان خان ککہڑ کی تصنیف ہے جو حضرت صاحبقران شاہجہان کے عہد کے نامور شعراء میں سے تھے۔ بڑی مشکل سے ایک نسخہ سلطان جہانداد خان رئیس گکھڑ نے بہم پہنچا کر چھپوایا تھا۔ قدر دانان کتب قدیمہ کے کتب خانوں کیلئے موجب زینت ہے۔ قیمت ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۲ر

عجائب الاسفار یعنی سفرنامہ شیخ ابن بطوطہ جلد اول شیخ ابن بطوطہ ملک مراکو کے رہنے والے تھے ۷۲۵ھ میں دنیا کی سیر کرتے کرتے محمد شاہ تغلق کے عہد میں وہ ہندوستان میں بھی آئے اس میں وہ وہ عجیب و غریب واقعات چشم دید لکھے ہیں جو کسی تاریخ سے نہیں مل سکتے۔ یہ سفرنامہ آج سے چھ سو برس پہلے حالات ہند کا آئینہ ہے عربی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ قیمت ۔ سے ر

بزم آخر جس میں آخری مغلیہ بادشاہ کے زمانہ کے حالات۔ روزمرہ کے ظاہری و مخفی برتاؤ۔ رسمیں۔ خانگی معاملات طرز معاشرت دربار اور سواری کے قاعدے جشن اور نذروں کے قرینے۔ میلوں کے رنگ۔ تماشوں کے ڈھنگ مع تصاویر۔ سواری دربار اور اس سے متعلق دوسرے حالات درج کئے گئے ہیں۔ زبان نہایت ہی عمدہ ہے۔ اس موضوع پر اردو میں لاثانی کتاب۔ قیمت ۔ ۔ ۔ ۱۲عہ ر

سواء السبیل الی معرفۃ المعرب والدخیل یہ کتاب تو ما آرنلڈ صاحب بہادر سابق پرنسپل اورینٹل کالج لاہور نے نہایت محنت و جانفشانی سے مرتب کی ہے اور تمام معرب و دخیل الفاظ جو اجنبی زبانوں سے عربی میں آئے اور عربی جدید کی کتابوں اور اخباروں میں روزمرہ یا زمانہ قدیم کی عربی تصنیفات میں پائے جاتے ہیں۔ ان کی اصلیت معلوم کرنے میں کوئی دقیقہ تحقیق کا باقی نہیں رکھا۔ علمی معلومات کا خزانہ قیمت ۔ ۔ ۔ ۲عہ ر

ایام غدر ایک فرانسیسی خاتون کی بپتا درد بھری آپ بیتی جو سنہ ۵۷ء کے غدر میں ہندوستان میں موجود تھی۔ غدر کے ہولناک حالات۔ دہلی۔ میرٹھ اور کانپور کے خونیں مناظر اور ایک خلق کی ستائی یورپین عورت کی دل خراش سرگذشت۔ یہ کتاب اپنی خوبیوں کی وجہ سے کئی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہے اور اب مولوی سید ظفر حسن صاحب عاصی نے اسے نہایت پرلطف اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ قیمت ۔ ۔ عہ ر

بم کا نسخہ۔ نہایت دلچسپ انگریزی ناول بانس کا ونٹ کا ترجمہ از قاضی محمد عدیل صاحب عباسی مرزاتی رنگین لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ سفید صفحات ۴۰۰ مجلد ایک روپیہ آٹھ آنہ ۔ ۱۲عہ ر

ملنے کا پتہ: منیجر گیلانی الیکٹرک پریس بلڈ ہسپتال روڈ لاہور

REGD. No. L 170

Manufacturing Perfumers

LUCKNOW (and Branches)

اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

A ... ure and Title Printed at the Victoria Press, Ry Road, Lahore.

Regd. No L 1116.

The Nairang-i-Khayal, Lahore,

نیرنگ خیال

ایڈیٹر حکیم محمد یوسف حسن

منیجر رسالہ نیرنگ خیال [illegible]

جلد ۹ (جملہ حقوق محفوظ) نمبر ۶۶

نیرنگ خیال ہندوستان بھر کے علمی ادبی رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا اور سب سے زیادہ مقبول ہے

چیف ایڈیٹر تعداد اشاعت پانچہزار ایڈیٹر

حکیم محمد یوسف حسن حنیف ہاشمی

قیمت فی پرچہ ۵ر - ویلر کمپنی بک سٹال پر ۶

قیمت سالانہ بذریعہ وی پی مع محصولڈاک تین روپیہ چھ آنہ - ممالک غیر سے آٹھ شلنگ

فہرست مضامین

بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۹ء

سنہ ۱۹۲۹ء کا خاتمہ اور سنہ ۱۹۳۰ء کی ابتدا

معزز ناظرین نیرنگ خیال یہ سنکر خوش ہوں گے کہ آج اس پرچہ کے ساتھ نیرنگ خیال کی گیارھویں جلد مکمل ہوجاتی ہے۔ اور جنوری کا پرچہ نیرنگ خیال کی بارھویں جلد کا پہلا پرچہ ہوگا۔

گویا دس سال کی قلیل مدت میں نیرنگ خیال نے جو ترقی کی ہے یا ملک کی جو علمی ادبی خدمت کی ہے اس کی نظیر موجودہ معاصر ڈھونڈھنے سے نہیں ملے گی۔ اور اگر ہم یہ کہیں کہ یہ جو کچھ ترقی رسائل میں نظر آرہی ہے یہ سب نیرنگ خیال کی مساعی کا نتیجہ ہے تو اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے۔

نیرنگ خیال کا چندہ تین روپیہ چار آنہ سالانہ مع محصول ہے۔ اس قلیل چندہ میں ہم نے بہتر رسالہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔ اور سچ پوچھئے تو اس قلیل رقم میں ہم کیا خدمت کرسکتے ہیں۔ یہ محض فضل ایزدی شامل حال رہا ہے جو ہم نے آج تک ہزاروں روپے کا نقصان اٹھا کر رسالہ کو زندہ اور کامیاب بنائے رکھا اور دوسرے رسائل کے لئے زمین صاف کردی۔ چنانچہ بیسیوں رسائل نیرنگ خیال کی قائم کردہ شاہراہ پر چلنے کی کوشش میں زندہ ہیں۔ لیکن سچ پوچھئے تو یہ کامیابی کوئی کامیابی نہیں۔ ایک شخص شبانہ روز کی محنت اور [illegible] کی ہوئی پونجی کی قربانی سے ایک رسالہ کو زندہ رکھتا ہے اور پھر وہ رسالہ اس درجہ قبولیت عامہ کی سند حاصل کرلیتا ہے کہ اب وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہے۔ لیکن ذرا سوچئے کہ اتنے بڑے کام کا صرف یہ نتیجہ ہو کہ رسالہ کسی نہ کسی طرح اپنا خرچ نکال لیتا ہے۔ کوئی تسلی بخش نتیجہ نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ نیرنگ خیال ہمیشہ زندہ رہے۔ اور اس کی مالی حالت اس درجہ ترقی کرجائے کہ وہ ہر قسم کے خطرات کا آسانی کا مقابلہ کرسکے۔ ہم نے یہ حالات اکثر ہمدرد اصحاب کے سامنے رکھے ہیں مگر وہ چندہ بڑھا دینے کے سوا اور کوئی مشورہ نہیں دیتے۔ بعض احباب نے فرمایا کہ سفری ایجنٹ رکھے جائیں جو نئے خریدار بنائیں۔ لیکن ہمارے خیال میں یہ دونوں تجویزیں زیادہ منفعت بخش نہیں ہیں۔ رسالہ کا چندہ بڑھانا نیرنگ خیال کی دیرینہ روایات کے خلاف ہے۔ اور سفری ایجنٹ چنداں مفید ثابت نہیں ہوئے کیونکہ ان کا ذاتی خرچ اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ ہمیں اس سے مشکل سے دو روپیہ دفتر کے پلے پڑیں گے۔ اور ایک ایسے رسالہ کے لئے جس کا سالانہ منافع مشکل سے فی خریدار چار آنہ ہو۔ اور پھر یہ منافع بھی اس صورت میں بالکل ضائع ہوجاتا ہے جب ہمیں ہر ماہ دو اڑھائی سو پرچے خریداروں کو دوبارہ بھیجنے پڑتے ہیں۔ تو آپ ہی بتلائیے کہ نیرنگ خیال کو مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔

ہمارے خیال میں صرف دو تجویزیں ہیں جنہیں ہم ناظرین نیرنگ خیال کے سامنے پیش کرسکتے ہیں۔ اگر ہمارے کرم فرماؤں نے ان پر توجہ کی تو انشاء اللہ نیرنگ خیال کو اس قابل بنا دیا جائے گا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بتائید ایزدی پوری شان و شوکت سے زندہ و سلامت رہے۔ وہ تجویزیں حسب ذیل ہیں:

اول یہ کہ نیرنگ خیال کی اشاعت بڑھانے پر خاص توجہ کی جائے۔ اور ہر خریدار دو چار پانچ نئے خریدار بنائے۔ دوئم یہ کہ نیرنگ خیال بک ڈپو قائم کی جائے اور جسقدر کتابیں دفتر نیرنگ خیال سے شائع ہوں وہ ناظرین خریدتے رہیں۔ اور دوست احباب کو بھی توجہ دلاتے رہیں۔ اگر نیرنگ خیال کی اپنی مطبوعات کی تعداد بیس تیس ہوجائے تو اس کو مالی پریشانیوں سے نجات مل سکے گی۔

خریدار بنانے سے یہ بھی ضروری بات ہے کہ موجودہ خریدار رسالہ کی سرپرستی کا سلسلہ برابر قائم رکھیں۔ یہ دسمبر کا رسالہ ہے۔ آپ جنوری سے لے کر دسمبر تک کے رسائل جمع کر کے صفحات شمار کیجئے۔ ان کی تعداد ۸۱۱ ہے۔ پھر تصاویر دیکھئے۔ پھر مضامین کی نوعیت دیکھئے۔ نیرنگ خیال کے ایک صفحہ پر جس قدر مواد ہوتا ہے بڑے سے بڑے سائز کے رسالہ کے برابر ہوتا ہے۔ اس پر چندہ دیکھئے۔ سوا تین روپیہ سالانہ مع محصول ڈاک۔ کیا یہ بھی کوئی ایسی رقم ہے جو آپ اپنے ملک کے بہترین رسالہ کے لئے وقف نہ کر سکیں۔ بعض احباب دفتری غلطیاں یا ڈاکخانہ کی بے قاعدگیوں سے متاثر ہو کر کبھی کبھی قطع تعلق بھی کر لیتے ہیں۔ یہ سخت نقصان دہ بات ہے۔ آپ نیرنگ خیال سے جو رشتہ قائم کر چکے ہیں وہ دائمی ہونا چاہئے۔ اگر کوئی فروگذاشت ہو تو ہمیں اطلاع دیجئے۔

گذشتہ سال میں ہم نے ۸۱۱ صفحات اور ایک سو سے زائد تصاویر پیش کی ہیں۔ انشاء اللہ آئندہ سال گذشتہ سال سے بہت بہتر ثابت ہوگا۔ اس لئے ہماری التجا ہے کہ جناب اپنے سلسلۂ خریداری کو ہمیشہ قائم رکھئے اور صفحہ ۵۵ کا ملاحظہ فرما کر نیرنگ خیال کی اشاعت دس ہزار تک پہنچانے کی طرف توجہ دیجئے۔

(محمد یوسف حسن چیف ایڈیٹر)

۱/۳

حصہ سالنامہ نیرنگ خیال میں مندرجہ ذیل مضامین لکھے جا چکے ہیں اندازہ لگائیے کہ سالنامہ کس قدر لاجواب اور دلچسپ ہوگا۔ اور اردو ادب میں اس کا رتبہ کتنا بلند ہے۔

(۱) طلسم ازدواج۔ از جناب سلطان حیدر صاحب جوش۔
(۲) متقدمین شعرائے لاہور۔ حضرت سخن بہاری
(۳) ابن بطوطہ۔ از جناب سید حسن برنی بی اے ایل ایل بی علیگ
(۴) پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر۔ مرزا راحت اللہ بیگ۔
(۵) سنیاسی (افسانہ) مسعود الرحمٰن صاحب ندوی۔
(۶) قلی شہزادہ۔ حضرت خواجہ حسن نظامی۔
(۷) سودیشی ریل۔ حضرت شوکت تھانوی۔
(۸) سکوت (ایک افسانہ) از جناب امین الدین احمد صاحب ایم اے علیگ
(۹) گلدستۂ عشق۔ از جناب آغا حیدر حسن صاحب ایم اے ایل ایل بی
(۱۰) کشمیر جنت نظیر۔ از جناب صوفی محمد حسین صاحب بی اے
(۱۱) گلاب کنور۔ از جناب مولینا سید جالب صاحب دہلوی
(۱۲) ایرانی پیغمبر۔ مرزا عاشق علی بیگ صاحب خیال
(۱۳) کسی کی کہانی میری زبانی۔ پروفیسر عندلیب شادانی ایم اے
(۱۴) رباعیات خیام کا جواب۔ مولینا نجیب اشرف صاحب ندوی ایم اے
(۱۵) بارش کا پہلا قطرہ۔ حکیم محمد یوسف حسن چیف ایڈیٹر۔
(۱۶) ... از جناب مولوی عبدالرزاق ارشد ایم سی ایس کونسلٹ جنرل ...
(۱۷) ہم خانۂ آفتاب۔ جناب محمد عمر نور الٰہی صاحب۔
(۱۸) رستم اور سہراب۔ جناب انڈین شیکسپیئر آغا حشر کاشمیری
(۱۹) شہید وطن۔ جناب شیخ محمد ضیاء الدین صاحب ...
(۲۰) محبت کی فریب کاریاں۔ از جناب محمد احمد صاحب
(۲۱) امریکہ کی اقتصادی ترقی۔ غیر معروف جرنلسٹ کے قلم سے۔
(۲۲) ہندی رسائل۔ ڈاکٹر اعظم کریوی۔
(۲۳) باغبان۔ مولانا عبدالمجید صاحب سالک بی اے۔
(۲۴) مضامین کس طرح سے لکھے جاتے ہیں۔ جناب عطیف ہاشمی صاحب
(۲۵) سدا سکھ۔ جناب سدرشن۔
(۲۶) قسمت۔ جناب سید امتیاز علی صاحب تاج۔ بی اے۔
(۲۷) ملہ عارفہ۔ جناب محمد عبداللہ صاحب قریشی۔

آج ہی درخواست بھیج دیجئے۔ قیمت صرف ۱۲ مع محصول ڈاک

شذرات

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ بہت حد تک ڈاکٹر جسٹس سر شاہ محمد سلیمان کی مساعی جمیلہ کی مرہون منت ہے جنہوں نے اپنی وائس چانسلری کے مختصر سے زمانہ میں جامعہ کی بہبودی کے لئے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ قدیم مجلس عاملہ کو بدل کر آپ نے پارٹی بازی کا خاتمہ کر دیا۔ اور افتراق و اختلافات کی بجائے تعاون و یکجہتی کی فضا پیدا کر دی۔ یہ آپ کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ گورنمنٹ نے یونیورسٹی کو پندرہ لاکھ روپے کی رقم مرحمت فرمائی اور سالانہ گرانٹ میں ایک لاکھ پچیس ہزار روپے کا اضافہ منظور کر لیا۔

اظہار تشکر کے طور پر الوداعی پارٹی میں طلبائے جسٹس موصوف کو ایک صندوقچہ پیش کیا ہے اور یونین کا لائف ممبر منتخب کر لیا۔ جسٹس موصوف یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ان کی ہمدردیاں جامعہ سے اب بھی اسی طرح وابستہ رہیں گی جس طرح اب تک تھیں۔

مجلس تحقیقات کے بعد یونیورسٹی میں ہر طرف افسردگی سی چھائی ہوئی تھی۔ اور اراکین جامعہ کے دلوں میں وہ امنگیں اور ولولے نظر نہ آتے تھے جن کی یونیورسٹی میں ضرورت تھی۔ الحمد اللہ کہ اب یہ خزاں موسم بہار میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اور خوش قسمتی ہے کہ وائس چانسلری کا عہدہ نواب مسعود یار جنگ سید راس مسعود صاحب نے منظور فرما لیا ہے۔ جس پر ہم صاحب موصوف اور ارباب جامعہ کی خدمت میں ہدیہ تہنیت پیش کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں اس اہم قومی خدمت کا اہل آپ کے سوا اور کوئی نہ ہو سکتا تھا۔ اور اس مناسبت سے کہ جامعہ کی بنیاد آپ کے جد امجد حضرت سر سید علیہ الرحمۃ کے مبارک ہاتھوں نے رکھی ہے۔ جس قدر آپ کے دل میں اس شجرہ مبارک کو بار آور دیکھنے کی تمنا ہو سکتی ہے شاید کسی اور کو نہ ہو۔ یونیورسٹی میں آتے ہی جو جان فروز اور زندگی بخش دور آغاز ہو گیا ہے۔ اور اب جن مقاصد علیہ کی تکمیل کی امید ہے اس کا اندازہ آپ کی اس افتتاحی تقریر سے ہو سکتا ہے۔ جو ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:-

"مجھے ہمیشہ ان لوگوں کے خیالات پر افسوس ہوتا رہا ہے جو نوجوان طلباء کو آئندہ توقعات کے خوابوں سے روکتے ہیں یہ لوگ نہیں جانتے کہ ان خوابوں کو حصول ترقی کے میدان میں کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ یہ ادارہ خود ایک مخلص انسان کے مقدس خوابوں کا نتیجہ ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ جو قوم ایسے خوابوں کو جامہ عمل پہنانے کی کوشش نہیں کرتی ایک ایسی قوم ہے جو مردہ ہے۔

موجودہ زمانہ کے حالات اور اقوال کے باوجود میں اس بات کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ میری عظیم الشان قوم مردہ ہے۔ میں اس بات کو ماننے سے انکار کرتا ہوں کہ ہم لوگ جو ان آبا و اجداد کی اولاد ہیں جو سلطنتوں کو بنانے والے اور بنی نوع انسان میں امن و نظام قائم کرنے والے تھے اب اپنی قوت فیصلہ کو اس حد تک ضائع کر چکے ہیں کہ اب نیک و بد میں بھی تمیز نہیں کر سکتے۔ اگر میرا عقیدہ نہ ہوتا تو میں اپنی قوم کی دعوت قبول کر کے اس کی طرف سے اس یونیورسٹی کی عنان ہاتھ میں لینے کے لئے ہرگز نہ آتا۔ یہ دعوت میرے پاس ایسے وقت پہنچی جب میں علیل تھا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مجھے اپنی قوم اور تم نوجوانوں کے متعلق میرا یہ عقیدہ نہ ہوتا۔ تو آج آپ مجھے یہاں نہ دیکھتے۔

میں آپ کے پاس بے شمار امیدیں لے کر آیا ہوں اور نہایت ہی مخلصانہ آرزو ساتھ لایا ہوں کہ حتی الامکان آپ کی خدمت بجا لاؤں اور اگر خدا کے فضل و کرم سے میں آپ کی کوئی خدمت انجام

دینے میں کامیاب ہو گیا تو کم از کم میرا یہ خواب پورا ہو جائے گا۔

یہ زمانہ جد و جہد اور مقابلہ کا زمانہ ہے۔ صرف وہی قوم باقی رہ سکتی ہے۔ جو سب سے زیادہ متحدہ طاقت اور سعی سے کام لے گی۔ لازم ہے کہ ہماری یونیورسٹی اپنے ملک کے سامنے اتحاد کی ایک عظیم الشان مثال پیش کرے میں چاہتا ہوں کہ کم از کم چار دیواری کے اندر تو ان اختلافات اور منافرت کے جذبات کو جگہ نہ ملے جو ہمارے ملک میں شدید نقصان پہنچا رہے ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ تعصب اور عدم رواداری کی بنیاد پر کوئی پائدار عمارت نہیں رہ سکتی۔

ایک لحاظ سے ایک حقیقی یونیورسٹی مختصر دنیا ہونی چاہئے لیکن دوسرے لحاظ سے اسے ایسے فیاض دل والی ماں بننا چاہئے۔ جو سب لے ساتھ بحیثیت طلبا یا بحیثیت ملازمین اس میں آئیں اور بلا لحاظ قوم نسل و مذہب ان کے ساتھ محبت کرے۔ اگر خدانخواستہ ہم اپنی یونیورسٹی کو ایسا بنانے میں کامیاب نہ ہوئے۔ تو ہمارا کوئی حق نہیں کہ ہندوستان کے قابل احترام فرزندوں کی حیثیت سے زندہ رہیں۔ اور ہولناک انجام کی ذمہ داری ہمارے اوپر عائد ہو گی۔

میری آرزو ہے کہ ہم اپنے آپ کو ایک بلند ترین مہذب ترین۔ اور اعلےٰ ترین تعلیم یافتہ اصحاب کی ایک ایسی متحدہ فوج بنائیں۔ جسے میرا ملک ان تمام خرابیوں کے دور کرنے میں استعمال کرے۔ جن کی وجہ سے وہ دنیا کے سامنے موجب ملامت بنا ہوا ہے۔ اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے۔ جب ہم ان تمام قوتوں کو جو خدا نے ہمیں عطا کی ہیں۔ کامل طور پر استعمال کریں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس یونیورسٹی کے نوجوان طلبہ تمام دنیا میں بہترین انسان بن جائیں۔ اور کام میں۔ کھیلوں میں۔ اخلاق میں اور راستبازی میں سب میں بہترین کہلائیں۔"

ہمیں قوی امید ہے کہ آپ کی وائس چانسلری کے زمانہ میں جامعہ کو سر و قدیم وہی شہرت حاصل ہو جائے گا۔ جو ایک زمانہ میں ظلمت کدۂ یورپ میں غرناطہ اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کو تھا اور زمانہ حاضرہ میں جبکہ مشرق اپنی زندگی کے اہم ترین ارتقائی منازل طے کر رہا ہے اور عنقریب مشرق و مغرب کے مابین ایک فیصلہ کن جنگ ہونے والا ہے۔ جامعہ ملیہ علیگڑھ ہی اس کی دستگیری کرے گا۔

مسلم یونیورسٹی کے محرک سر سید مرحوم کا مقصد جہاں اس یونیورسٹی کے قیام سے مسلمانوں میں اعلےٰ کریکٹر پیدا کرنا تھا۔ وہاں وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ یہ قوم موجودہ سائنس کا بغور مطالعہ کرے تاکہ میدان عمل میں دیگر اقوام عالم کے دوش بدوش چل سکے۔ مرحوم نے یونیورسٹی میں سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی تھی مگر ان کی زندگی کے بعد اس سوسائٹی پر جمود کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور کسی نے اس طرف توجہ نہ دی۔ اب جناب ڈاکٹر قاسم علی صاحب منصوری نے "کیمیکل سوسائٹی" کے نام سے اس کی تجدید کی ہے اس کے مقاصد کی اشاعت کے لئے ایک رسالہ بھی جاری کیا گیا ہے۔ سوسائٹی کے اراکین کے باقاعدہ اجلاس کئے جاتے ہیں۔ اور سر سید مرحوم کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ اسوقت اس کے آرگن کے تین نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ یہ رسالہ انگریزی اور اردو میں شائع ہوتا ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی ہے کہ وہ اپنے مقاصد بوجہ احسن سرانجام دیتا ہے۔ اور سوسائٹی کی کامیابی اس کے پریزیڈنٹ جناب قاسم علی صاحب منصوری کی کوششیں قابل مبارکباد ہیں ہمیں امید ہے طلبا میں بھی بہت جلد سائنٹفک مشاغل میں دلچسپی لینے اور اس ملک میں سائنس کو ترقی دینے کی تحریک پیدا ہو جائے گی۔ امید ہے جدید وائس چانسلر کی ذات کو

اس سوسائٹی کو نمایاں کامیابی ہوگی۔ اور طلبا کو سائنس کی تعلیم کی تکمیل کے لئے مغربی ممالک میں بھیجنے کا کافی انتظام ہوجائیگا۔

محکمہ دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی میں حسب ذیل فنون کی کتابیں زیر ترجمہ ہیں:
انجنیری ۳۲ - فلسفہ ۱۸ - طب ۱۴ - تاریخ ۲۲ - کیمیا ۔ سیاسیات ۵ - معاشیات ۵ - حیاتیات ۴ - ریاضی ۳ -
گذشتہ سال ۲۰ کتابوں کا مکمل ترجمہ کیا گیا۔ جن کی تفصیل یہ ہے فلسفہ طب ۶ - انجنیری ۳ - سیاسیات ۲ - ریاضی ۲ - معاشیات قانون کیمیا اور حیاتیات ہر ایک ایک - کل ۳۴ کتابیں زیر طبع تھیں جس میں سے ۱۴ تیار ہوگئیں - اس سال کے دوران میں ۴۵۳۲ جدید اصطلاحات وضع کی گئیں اس محکمہ پر اس سال کل ۱۵۹۰۱۹ روپیہ صرف ہوا۔

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کی سالانہ رپوٹ بابت سنہ ۱۹۲۷ء سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سال انجمن کی جانب سے پانچ علمی اور ادبی کتابیں شائع ہوئی ہیں - چھ مزید کتابیں زیر طبع ہیں - اور پانچ طبع ہونے کے لئے تیار ہیں - انجمن کا محفوظ سرمایہ اسوقت ساڑھے پچیس ہزار کے قریب ہے اور ان کو ایک لاکھ تک پہنچانے کی کوشش کی جارہی ہے - انجمن کے دوامی ارکان ایک سو ہیں جن میں سب مذاہب کے لوگ شامل ہیں - ننانوے شاخیں اور کتب خانے اور چھبیس بک ایجنسیاں ہندوستان کے طول عرض میں کام کر رہی ہیں - سال گذشتہ میں عطیات - فروخت کتب و دیگر ذرائع سے انجمن کو تقریباً باون ہزار روپیہ کی آمدنی ہوئی اور چھیالیس ہزار روپے کے قریب جمع ہوا - سال رواں میں آمدنی اور خرچ کا تخمینہ ۴۹ - اور ۴۸ ہزار کیا گیا۔

جاپانی رسم الخط میں ایک لاکھ سے زیادہ مختلف شکل کے حروف ہیں - اس لئے اس کا ٹائپ بنانے میں نہایت مشکل کا سامنا تھا لیکن اس قوم نے جو میدان ترقی میں مغربی اقوام سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں - اپنی ان تھک کوششوں سے اس مشکل کو حل کر لیا ہے - یوں تو جاپان میں کافی عرصہ سے ٹائپ موجود تھا لیکن اب مزید سہولت کے لئے ردوبدل کر کے حروف کی تعداد صرف تین ہزار رہ گئی ہے اور نیا ٹائپ رائٹر بن گیا ہے

انگلستان کے ایک اسکول میں ایک عجیب واقعہ وقوع پذیر ہوا ہے - ایک مدرس نے اپنے اسکول کے ایک طالب علم کو حدود مدرسہ سے باہر سگریٹ پیتے ہوئے دیکھ کر جسمانی سزا دی - لڑکے کے باپ نے مدرس کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا - اور کہا کہ اس نے لڑکے کو سگریٹ پینے کی اجازت دے رکھی ہے اور مدرس کو حدود مدرسہ سے باہر لڑکے پر کوئی اختیار نہیں تھا - حدود مدرسہ کے باہر کوئی بات قابل گرفت نہیں ہوسکتی - عدالت کے جج نے فیصلہ کر دیا کہ کوئی لڑکا زیر تعلیم طالب علم حدود مدرسہ سے باہر بھی کوئی ایسا فعل کرنے کا مجاز نہیں ہوسکتا جس کی ممانعت کر دی گئی ہو اور مدرس ایسی صورت میں جسمانی سزا دینے کا حق رکھتا ہے۔

(ایڈیٹر)

لندن کے آثارِ قدیمہ

(از جناب عبدالحق صاحب - ایم - آئی ایس آئی - ایف - آر - ایس - اے)

شاہی محل

بعض خصوصیات کی وجہ سے "ہامپٹن کورٹ" انگلستان کے تمام شاہی محلات سے بہتر متصور ہو سکتا ہے - یہ "لارڈ ولسے" کے ہاتھوں ۱۵۱۵ء میں تعمیر ہوا - اور ۱۵۲۵ء میں شاہ رفت "ہنری ہشتم" کو بطور نذرانہ پیش کیا گیا۔ ۱۵۲۹ء میں شاہ ہنری اس محل میں اقامت پذیر اور یہ جگہ اُسے اسقدر دلکش معلوم ہوئی کہ اُسے توسیع دینے اور زیادہ خوبصورت بنانے کا تہیہ کر لیا - اس محل میں شاہ ہنری نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ بسر کیا اسی جگہ "ایڈورڈ ششم" "جین سمور" کے بطن سے متولد ہوا۔ "ہنری" نے اسی محل کے گرجا میں اپنی چھٹی بیوی سے شادی کی۔

شاہ ہنری کی وفات کے بعد "ایڈورڈ ششم" اکثر اوقات اس محل میں آکر رہا کرتا تھا - "ملکہ میری" نے اپنی شادی کے بعد چند اندوہگیں ایام اس محل میں گذارے - ۱۶۰۴ء "شکسپیئر" نے اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ اس کے ہال میں چند ڈرامے کئے "چارلس اول" نے اس محل میں اپنے عیال کے ساتھ چند اچھے دن گذارے - مگر دورِ افلاک کی فریب کاریاں دیکھئے کہ اسی محل ۱۶۴۷ء کو پابجولاں لایا گیا - جارج اول اور دوم کے وقت یہ محل جائے عدالت قرار دیا گیا - مگر "جارج سوئم" نے یہاں رہائش اختیار نہیں کی - اس کے وقت میں اس محل کے مختلف کمرے اُمرا و وزرا میں تقسیم ہو گئے - اور بعد ازیں یہ محل کبھی شاہی اقامت کے قابل نہ سمجھا گیا - "وکٹوریہ" کے وقت میں عامۃ الناس کو اس کے اندر جانے کی اجازت دیدی گئی ؎

الغرض اس محل کے ساتھ انگلستان کے کئی بادشاہوں کی تاریخ وابستہ ہے - اور اس کی تفصیلات لاریب دلچسپ ہوں گی ؎

اولین کورٹ

کورٹ انگریزی زبان میں صحن کو کہتے ہیں - جس میں سبزہ زار اُگا ہوا ہو - اور جس کے چاروں طرف عمارت ہو (دراصل یہ طرز تعمیر ایشیائی اقوام کی ایجاد ہے) محل کے عظیم الشان دروازے سے داخل ہو کر پہلے کورٹ میں پہونچتے ہیں - لارڈ ولزے کے وقت میں اس صحن کے چوگرد - دوسو اسی کمرے تھے - جو مہمانوں کے لئے مکلف فرشوں سے سجے رہتے تھے - چونکہ ان ایام میں برقی روشنی نایاب تھی - اس لئے ان کمروں میں چاندی کے شمعدانوں سے روشنی کی جاتی تھی ؎

۱۵۲۷ء میں فرانسیسی سفیر اپنے چار سو ہمرکابوں کے ساتھ اپنے کمروں میں رہا ؎

عام نظارہ

پہلے کورٹ سے عمارت کی عظمت اور وسعت کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے - کہا جاتا ہے کہ تمام حصص عمارت کارہائے ریاست کے لئے اسقدر موزوں ہیں کہ یورپ بھر میں اس کی مثال موجود نہیں - بیرونی طور پر یہ عمارت

اسقدر وسیع معلوم نہیں ہوتی۔ مگر جونہی دروازے کے اندر قدم رکھیں۔ باغ کی وسعت۔ دیوار کی اینٹوں کی یکانگت۔ کھڑکیوں کی کثرت۔ دیکھنے والے کو تصویر حیرت بنا دیتی ہے۔

گھنٹہ گھر اور دوسرا کورٹ

اس کورٹ کا زیادہ حصہ لارڈ وولزے نے بنوایا۔ مگر بعد ازیں اسقدر تبدیلیاں معرض عمل میں آئیں کہ پرانی صورت مسخ ہو گئی۔

اس کورٹ میں بڑے ہال کا بیرونی حصہ تمام شمالی حصہ میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی بڑی بڑی چوکور کھڑکیوں دروازوں اور برجوں نے ایک خاص شان پیدا کر رکھی ہے گھنٹہ گھر کی محراب میں لارڈ وولزے کے بازو کندے ہوئے ہیں اور اس کے نیچے یہ الفاظ رقم ہیں oom inous Michi ۱۵۴۰ء گھڑیال جس کی سوئیاں ستاروں کی رفتار کے ساتھ چلتی ہیں۔ آج سے چالیس سال قبل یہاں لائی گئی تھیں۔

کمرۂ سلاح

یہ ۱۰۰ ۱/۲ فٹ لمبا۔ ۳۰ ۱/۲ فٹ چوڑا۔ اور ۳۰ فٹ اونچا ہے۔ اس کی دیواریں لوہے کے تیروں۔ ڈھالوں اور دوسرے اوزار حرب سے سجی ہوئی ہیں۔ یہاں قریبًا تین ہزار اوزار موجود ہیں۔ شاہ ولیم سوئم کے خیال میں کسی شاہی محل میں ایسا کمرہ موجود نہ تھا جس میں اسقدر اسلحہ ہوں۔

شاہی آرام گاہ

یہ کمرہ ۳۳ فٹ لمبا ۲۳ فٹ چوڑا اور ۲۰ فٹ اونچا ہے۔ اس کی چھت پر نہایت خوشنما تصویر بنی ہوئی ہے۔ جو ویرو کی بہترین سعی کا ثمرہ ہے۔ اس تصویر میں "اینڈمیان" "مارفس" کی گود میں بیٹھا ہوا ہے۔ اور "دیانا" اس کی حالت پر ہنس رہی ہے۔ چھت کے باقی حصے میں سونس اور اس کے خدام کی تصویر بنی ہوئی ہے۔ کمرے میں تمام سامان زینت جوں کا توں رکھا ہے۔ بستر خواب کے قریب ایک پرانی گھڑی پڑی ہوئی ہے۔ جس کو "دانیال کوئر" کے جادو نگار ہاتھوں نے بنایا تھا۔ ایک بار چابی لگانے کے یہ گھڑی سال بھر چلتی ہے۔ اور حیرت کی بات یہ ہے۔ کہ گذشتہ دو صدیوں سے یہ گھڑی اسی کمرے میں پڑی ہے۔

ملکہ کی آرام گاہ

بستر کا قرمزی غلاف "کیرولین" شہزادہ ویلز کی بیوی کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ اس کا چھت "سر جیمس تھارن ہل" نے رنگین تصاویر سے مزین کیا۔ اس تصویر میں "یورورا" سمندر کی گہرائیوں سے سنہرے تخت پر بیٹھی ہوئی رونما ہوئی ہے اس کے قدموں میں "رات" اور "نیند" سو رہی ہیں۔ اس کمرے کے کونے میں شاہ جارج تاج پہنے کھڑا ہے۔ دوسرے کونے میں شہزادی کیرولین آگ تاپ رہی ہے۔ ایک کونے میں جارج دوم شہزادہ ویلز اپنی بیوی کے پاس کھڑا ہے۔

ہال کمرہ

اس کمرے میں آٹھ بڑے بڑے پردوں پر رنگین تصاویر کھچی ہوئی ہیں۔ جو ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کی نمایاں داستان ہیں۔ عظمت اور شان کے لحاظ سے یورپ بھر میں ان پردوں کی نظیر نہیں۔ مشہور مصور "طیمش" نے ان میں برسلز "بلجیم" میں بنایا۔ اور شاہ ہنری نے خرید کر اس محل میں رکھا

ان میں تین پردے "قسمت" "شہرت" اور وقت کی نمائندگیوں کے مظہر ہیں۔ چار پردوں پر سات گناہ کی پہیلیاں بیان کی گئی ہیں ؏

حیرت انگیز گھڑیال

یہ گھڑی ۱۵۴۰ء میں شاہ ہنری ہشتم کے لئے بنوائی گئی اس کا وسط تانبے کے تین ٹکڑوں سے بنا ہوا ہے۔ ہر حصہ کی طوالت مختلف ہے مگر مرکز سب کا ایک ہی ہے درمیانی ٹکڑا وسط سے اُبھرا ہوا ہے۔ ایک علیحدہ ٹکڑے پر چاند کی مختلف شکلیں دکھائی گئی ہیں۔ یہ ٹکڑا چاند کی رفتار کے ساتھ چلتا ہے ؏

تانبے کا دوسرا ٹکڑا ۲۹ حصوں میں منقسم ہے تیسرے ٹکڑے پر بہت دائرے ہیں۔ اور ان ہر بارہ مہینوں کے نام کندہ ہیں۔ ان ہر مہینوں اور دنوں کے ناموں کے ساتھ بارہ بُرجوں کی شکلیں بنی ہوئی ہیں۔ سوئیوں پر سورج کا نشان ہے۔ اس گھڑی کے متعلق عجیب داستان مشہور ہے۔ کہ جب اس محل کا کوئی مقیم مرجاتا ہے تو گھڑی ٹھیک وقت نہیں بتاتی ؏

گورکھ دھندا

یہ چارلس اول کے وقت بنایا گیا۔ اس کا مرکز ڈھونڈنا معمہ ہے۔ ایک جگہ سے نصف میل کا سفر ہوتا ہے۔ ایشیائی گورکھ دھندوں میں چاروں طرف پختہ دیوار ہوتی ہے۔ مگر اس کے چاروں طرف پودوں کا حاشیہ ہے ؏

خطابت

(از مولانا شبیر حسین صاحب - شبیر مارہروی)

خطابت کے معنی ہیں ایک مجمع سے خطاب کرنا اور مسلسل تقریر کرنا۔ تقریر کرنیوالے کو خطیب کہتے ہیں اور تقریر خطبہ کہلاتی ہے۔

ابتدائے آفرینش سے انسان نے تقریر کے بدیع المثال تاثرات کو محسوس کر لیا ہے۔ اور اس کی مقناطیسی اور برقی طاقتوں کے سامنے دنیا ہمیشہ سرِ تسلیم خم کرتی چلی آئی ہے۔ اس کی مدد سے وہ کام انجام پذیر ہوئے ہیں جن کی تکمیل دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتوں سے بھی ناممکن تھی وہ کام نہ تو تیر و تفنگ سے نکل سکتے تھے۔ اور نہ دولت و حشمت سے قدیم اہلِ یونان و روما نے اس فن میں خوب کمال پیدا کئے لیکن اہلِ عرب نے اس فن میں یہاں تک قابلیت حاصل کی کہ تمام متقدمین گرد ہو گئے۔ یونان میں ڈیموس تھینز سب سے فائق تھا۔ اور اہلِ روما میں فصاحت تقریر سیسرو پر ختم ہو گئی تھی۔ لیکن سرزمینِ عرب سے ہزاروں فقید المثال خطیب پیدا ہوئے۔ عرب میں جبلِ عرفات کے قریب عکاظ ایک مقام تھا۔ جہاں ہر سال میلہ ہوا کرتا تھا۔ اس میلے میں فصاحت و بلاغت کی ہنگامہ آرائی ہوتی تھی۔ اور جو شخص ممتاز رہتا تو سب اسے ملکر مبارکباد دیتے تھے۔ اور قبیلہ کی عورتیں اپنے بیاہ کے زیور پہنکر آتیں اور فخریہ اشعار گاتی تھیں ✦

ہر زمانہ اور ہر ملک میں مصلح اور پیغمبر مبعوث ہوئے۔ اور اپنے "جہاد لسانی" سے نظام تمدن کو درست کیا۔ لیکن ان سب پیغمبروں میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "جہاد لسانی" میں بھی ممتاز رہے۔ اور آپ کی فصاحت و بلاغت کا یہانتک اثر بڑھا۔ کہ آپ کی بات کہا گیا۔ اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْر۔ حضرت نبی اقدس کے انتقال کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ خلیفۂ اول مقرر ہوئے اور آپ نے دور و دراز کی زبردست قوتوں کو راہ راست پر لانے کے لئے تقریر فرمائی:-

"میرا ارادہ ایک لشکر تم ہی لوگوں سے منتخب کر کے شام میں اس غرض سے بھیجنے کا ہے کہ وہ ملک کفر [illegible] اسلام آباد کیا جائے۔ اور اس بات کا خیال رکھو کہ خدا کے اس کام میں جسقدر جانفشانی کروگے اسی قدر اللہ [illegible] فرمانبردار بندے اور اس کے پیغمبر کے ارادوں کے پورے کرنے [illegible] ثابت ہوگے۔ اس اللہ کی راہ کے سودے کو جانیں [illegible] ایسا ستا مال پھر کہاں ہاتھ آئے گا۔ تم سے کل [illegible] سب کا بادشاہ خدائے کریم بدلہ دینے والا ہے [illegible] دروازے تمہارے انتظار میں کھلے ہوئے ہیں اور بے کھٹکے جلد ان میں داخل ہو۔ شہادت [illegible] اور غازی کے مکرم القاب تمہارے ناموں کو [illegible] اپنی طرف بڑے شوق سے بلا رہے ہیں [illegible] خدائی خطاب کو اپنے ناموں میں لگاؤ۔ یہ قیامت [illegible] محشر میں بھی تمہارے ناموں کا ساتھ نہ چھوڑے گا۔ [illegible] عرب کے ہر حصہ میں اسی عبارت کے فرمان بھی [illegible] اس فرمان نے تمام عرب میں [illegible] کر دیا"

جنرل طارق کا وہ محیر العقل معرکہ ارباب سیر کی نظروں کو ہمیشہ خیرہ کرتا رہے گا۔ جبکہ اُس نے اسپین کی تسخیر کے لئے فوج ہمراہ لے کر اندلس کے کنارے پر قدم رکھا تو جن جہازوں سے اُترے تھے انہیں آگ لگا دی۔ اور ایک پرجوش تقریر میں سپاہ کو یہ کہکر آمادہ کیا۔ کہ یا تو دشمن پر فتح پاؤ۔ یا مر جاؤ۔ تم واپس جانے کے لئے یہاں نہیں آئے ہو۔

ڈیموستھنیز نے جبکہ اپنی تیغ زبان کے زور سے اہل ایتھنز کو فلپوس شاہ مقدونیہ سے مقدونیہ میں لڑنے کو آمادہ کر دیا۔ تو فیلقوس نے ڈیموستھنیز کی فصاحت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

"اگر میں بھی وہاں موجود ہوتا۔ تو اس کی تقریر سے متاثر جذبات مجھ پر مستولی ہو جاتے کہ میں شمشیر بکف اپنے آپ سے لڑنے کو آمادہ ہو جاتا۔"

قدیم روما میں قیصر کے حضور میں ایک واقعہ گذرا ہے اُس وقت آتش بیان سسرو نے نہ صرف قیصر ہی کو خاموش کر دیا۔ بلکہ کٹیلائن کے حواس بھی منتشر کر دیئے۔ اور بے چارے مجرم کو جیسے بادشاہ ضرور سزا دیتا بری کرا دیا۔

پارلیمنٹ کے مشہور مقرر برک نے وارن ہیسٹنگز گورنر جنرل ہندوستان پر رشوت ستانی کا الزام لگایا۔ اور آخر اپنی پرزور تقریروں سے لارڈ وارن ہیسٹنگز کو مجرم ثابت کر دیا۔

لارڈ ہیسٹنگز اپنے مقدمہ کے حالات میں بیان کرتے ہیں "ایک آدھ گھنٹے تک میں اُس ظالم برک کی طرف دیکھتا رہا جو لفظ اُس کی زبان سے نکلتا تھا۔ کانوں کی راہ دل پر اثر کرتا تھا کہ کچھ حیرت و تعجب کے بعد میں خود اپنے آپ کو دنیا بھر میں کمبخت اور خطاکار سمجھنے لگا۔"

اسی طرح ہزاروں واقعات تاریخ میں مسطور ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ولولہ انگیز تقریروں نے دنیا کی وسیع سلطنتوں کی محکم بنیاد کو متزلزل کر دیا ہے۔ نپولین بوناپارٹ اور اسکندر اعظم کی ندرت اثر تقریر کے نقوش صفحۂ عالم پر اب تک ثبت ہیں۔

یہاں تک تو ہم نے صرف ایسی مثالیں پیش کیں۔ جو طبقہ ذکور سے تعلق رکھتی ہیں۔ اب ہم یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ جریدہ عالم کے اوراق طبقۂ اناث کی نگارین خدمات سے کسقدر مرصع ہیں۔ تمام دنیا کے شعراء صنف نازک کی غنچہ دہنی کا شکوہ کرتے چلے آئے ہیں اور اگر کبھی اُن کے گلابی ہونٹوں میں ذرا بھی جنبش نمودار ہوئی۔ تو بس یہ سمجھ لیجئے کہ ان کی جمیل فتوحات کے لئے یہ کائنات بھی کافی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ہم یہاں شاعرانہ تصنع سے نہیں بلکہ واقعہ نگاری اور تاریخی حیثیت سے "فن خطابت" کی بصیرت افروز مثالیں پیش کریں گے۔

جمادی الاول ۱۲ھ کے گرانبہا اور تابناک تذکرے صفحات تاریخ سے کبھی مٹ نہیں سکتے۔ جبکہ محاصرۂ دمشق کے وقت بی بی خولہ بنت ازور اور بی بی عفیرہ بنت غفار حمیریہ ذلت گرفتاری سے دوچار ہوئیں۔ اور جب حضرت خالد بن ولید کے بڑے لشکر سے کوئی امید استمداد نہ رہی۔ تب تمام جوان۔ بوڑھی اور بچیاں رات کو جمع ہوئیں۔ اور حضرت خولہ بنت ازور نے ایسی تقریر فرمائی۔ کہ انہی نے تمام جماعت میں آگ لگا دی۔ خیموں کی چوبیں لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑیں۔ اور تھوڑی ہی دیر میں تیس بہادروں کو مار ڈالا۔ اتنے میں حضرت خالد بن ولید کا لشکر بھی حضرت خولہ نے ہرقل کے سب سے بڑے جنرل اور رئیس سول کے سپہ سالار بطرس کے گھوڑے کی ٹانگوں میں ایسی تیغ ماری کہ وہ لنگڑا ہو گیا۔ اور حضرت ضرار نے بطرس کے ابسا تک کر

نیزہ مار کر اُس کی روح پرواز کر گئی ۔

اگر ہم عہدِ ماضی کی تاریخ کی ورق گردانی کریں تو ایسے بہت سے واقعات مل سکتے ہیں ۔ لیکن ہم یہاں صرف ایک ہی واقعہ پر اکتفا کرتے ہیں ۔ اور دورِ حاضرہ کی چند مثالیں پیش کر کے بخوفِ طوالت اس مضمون کو ختم کئے دیتے ہیں

اس وقت امریکن خواتین کو فصاحت و بلاغت اور اور ادبیات میں ید طولےٰ حاصل ہے ۔ ورسلطنت ترکی کے پچھلے دور حکومت میں وہاں کی خواتین نے جو تقریریں کی ہیں انہوں نے وہ اثر پیدا کیا ۔ جو بڑے بڑے سیاسی دماغ بھی پیدا نہیں کر سکتے ۔ ایرانی خواتین کے متعلق "پال مال گزٹ" کو ایک مضمون نگار نے لکھا ہے ۔

"کہ ایران میں یہ دستور ہے کہ ہر ایک لڑکی سند لیتے وقت تقریر کرتی ہے ۔ گزشتہ سیشن میں ایرانی لڑکیوں نے جو تقریریں کیں وہ بلحاظ فصاحت و بلاغت ہر طرح قابلِ ستائش ہیں" ـــــــ روسی خواتین کی مسلم کانفرنس نے کثرتِ ازدواج اور قانون وراثت کے خلاف اپنی شعلہ بار تقریروں سے تمام ملک کی توجہ اپنی جانب منعطف کرالی ۔ اور انہی کی تقلید میں ہندوستان کی مسلم خواتین کی کانفرنس نے بھی مسئلہ ازدواج کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ۔

لارڈ ساؤتھ برا کی کمیٹی نے عورتوں کو حق رائے سے محروم کر دیا ۔ اس کے برخلاف مغربی ہند کی خواتین مسز طیب جی اور مسز ٹاٹا کی جوشیلی تقریروں نے ایوانِ وزارت کے کنگروں کو ہلا دیا ۔ اور مغربی ہند کی تمام عورتیں آئینی محاربہ کرنے کو تیار ہو گئی ہیں ۔

دکن کی مشہور شاعرہ اور ہندوستان کی مایۂ ناز خاتون مسز سروجنی نائیڈو نے اپنی سحر کار فصاحت و بلاغت کی داد یورپ والوں سے بھی حاصل کر لی ۔ اہلِ بصیرت کا بیان ہے ۔ کہ اُس کی تقریر سے سامعین پر بھی وجدانیت طاری ہو جاتی ہے ۔

....

....

غزل

دل کو اُن سے سازِ مجبوری جنون کو ساز ہے
اسطرح بابِ نگاہِ شوق کا آغاز ہے

منتخب ہے داغِ دل زخمِ جگر ممتاز ہے
یہ بیانِ دید و شرحِ ماجرائے ناز ہے

یاد ہے وہ تیری خودداری وہ اپنا اضطراب
وہ تمناؤں کی رنگینی جواب تک راز ہے

زندگی بخشِ تمنا ۔ یعنی امیدِ وفا
بے نیازِ فکرِ درماں ہے فدائے ناز ہے

زہد ہے بسملؔ کہ یہ بھی ایک رندانہ ادا
الوداع ساقی و مطرب ! یہ کیا انداز ہے

(بسملؔ قاضی پوری)

فریبِ نفس

(افسانہ)

(خاص برائے نیرنگ خیال)

(از جناب ظہیر احمد صاحب حیدر۔ "آزاد")

پرناچندر پڑھنے کو تو بی۔ اے میں پڑھتے تھے۔ لیکن انگریزی تعلیم ہی پر کیا منحصر تھا۔ نئی روشنی اور مغربی تمدن کی کل چیزوں کو وہ ایک سرے سے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہ کچھ ان کے لواحق و متعلقین اور سب سے بڑھ کر ان کی ماں کا شدید اصرار تھا۔ کہ وہ اپنے مزاج اور طبیعت کے خلاف کالج میں پڑھ رہے تھے۔ اور وہ بھی محض اس وجہ سے کہ وہ اپنی ماں کی مرضی اور خواہش کے خلاف کسی کام کے کرنے کو اپنے دین اور دھرم کی رو سے بہت بڑا گناہ تصور کرتے تھے۔ ورنہ واقعات تو یہی بتاتے ہیں کہ وہ سینٹ پول کالج کلکتہ کی شاندار عمارت میں پڑھنے کی بجائے کسی پنڈت کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں۔ زمین پر بیٹھ کر مذہبی کتب کا درس لیتے رہے۔ وہ سنسکرت زبان کے عاشق تھے۔ اور اگرچہ کالج کے مشاغل سے بہت ہی کم فرصت ملتی۔ تاہم کوئی نہ کوئی سنسکرت کتاب برابر ان کے زیر مطالعہ رہا کرتی۔ پوجا پاٹ اور اپنے مذہب کے احکام کی تعمیل وہ بہت ہی خلوص اور انہماک سے انجام دیا کرتے۔ ان کے دوستوں کا بیان ہے کہ بعض اوقات جاڑے کے ایام میں دو دو بجے شب کے وقت وہ گنگا جی میں اشنان کے لئے گئے ہیں۔ ان کی وضع بالکل قدیمی تھی۔ موٹا کھاتے۔ موٹا پہنتے اور نہایت ہی سادہ اور بے تکلف زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ وہ نئی روشنی کے دشمن تھے اور ان کے خیال میں ملک کی تباہی و بربادی کا اصل راز اسی انگریزی تعلیم کے اندر مضمر تھا۔ وہ جس وقت راجہ رامچندر جی اور سری کرشن جی مہاراج کا زمانہ یاد کرتے تو ان کی چھاتی پر ایک سانپ سا لوٹ جاتا۔ دل میں کہتے۔ وہ زمانہ تو خیر اب آنا مشکل ہے نہ ویسے لوگ اب پیدا ہوں گے۔ نہ ان کی تعلیم پر کوئی چلنے والا ہوگا۔ آج سے سو دو سو سال قبل کی حالت کا مطالعہ کر لیجئے اور دیکھئے کہ ہماری ذہنیت میں کتنا عظیم تغیر پیدا ہو گیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ہماری مذہبی روح اور ہماری روحانی قوت محض انگریزی تعلیم کی بدولت دن بدن فنا ہوتی جا رہی ہے۔ کالج کے طلباء سے انہیں اکثر اس موضوع پر گفتگو کا موقع ملا۔ چونکہ ان میں زیادہ افراد نئی تہذیب کے دلدادہ اور مغربی تعلیم کے عاشق تھے۔ لیکن جب کبھی اس قسم کی بحث چھڑی۔ پرناچند۔ کی مدلل تقریر اور ان کے موثر اسلوب بیان کی وجہ سے ہر شخص کو ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا پڑتا۔ اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ ان لوگوں میں سے کسی نے بھی اپنے اصول کے خلاف گامزن ہونے کی کوشش نہ کی۔

پرناچندر اکثر کہتے کہ ہندوستان کی بھلائی نہ ترک موالات سے ہو سکتی ہے اور نہ شدھی و سنگھٹن سے نہ کانگرس اور کانفرنس سے کوئی مفید نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ اور نہ ہندو سبھا ذات سے۔ تاوقتیکہ نئی روشنی اور جدید تہذیب کا قطعی

طور پر قلع قمع نہ کر دیا جائے۔ جب تک ہماری ذہنیت میں تبدیلی پیدا نہ ہوگی۔ جب تک ہم اگلی تعلیم پر عمل پیرا نہ ہونگے جب تک ہم میں وہی قدیمی روح پیدا نہ ہوگی ان تحریکوں سے سوائے ذلت و پریشانی اور آپس میں نفرت و عناد کا جذبہ پیدا ہونے کے کوئی نتیجہ ظاہر نہیں ہو سکتا

دیہات کی سادہ زندگی انہیں بہت مرغوب تھی جب کبھی وہ مکان آتے اور سیدھے سادے۔ بھولے بھالے کاشتکاروں کے جھرمٹ میں بیٹھکر ہمکلام ہوتے تو انہیں ایک ایسی روحانی مسرت حاصل ہوتی۔ جس کا بیان مشکل ہے کلکتہ کی چہل پہل اور گہما گہمی سے کون ناواقف ہے؟ ڈلہوزی اور چورنگی کے دلچسپ مناظر کس کو محو حیرت نہیں بناتے۔ لیکن پرتاچندر کی آنکھوں میں ان چیزوں کی کوئی وقعت نہ تھی۔ وہ ہوسٹل کی چار دیواری سے شاذونادر ہی باہر آتے۔ انہیں سوائے کالج جانے اور ہوسٹل میں رہنے کے کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا۔ اس لئے نہیں کہ انہیں آبادی سے نفرت تھی۔ یا وہ اپنے ابنائے جنس سے ملنا ناپسند کرتے تھے۔ بلکہ اس لئے کہ انہیں ان تمام باتوں میں تکلف اور تصنع کا رنگ نظر آتا تھا۔ یا دوسرے لفظوں میں یہ کہئے کہ ان کے نزدیک مذہبی تعلیم ان باتوں کے سراسر منافی تھی۔

زمانہ کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے حوصلے کے بموجب جو چاہتا تھا کہتا تھا۔ لیکن اسمیں شک نہیں کہ وہ اپنے مذہب کے بہت پابند۔ اصول کے بہت پکے اور انسانی اوصاف کے لحاظ سے ایک بہت ہی سچے اور راستباز انسان تھے۔

(۲)

دُرگا پوجا کی تعطیل تھی۔ کالج ایک ماہ کے لئے بند تھا کالج کے طلباء سیر و تفریح کی غرض سے مختلف مقامات میں جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ لیکن پرتاچندر نے ابھی تک کہیں جانے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ وہ برابر ہوسٹل ہی میں رہے اور نصف سے زیادہ تعطیل وہیں تن تنہا گذار دی ان کے وقت کا زیادہ حصہ محض مذہبی کتب کے مطالعہ میں گذرتا تھا۔ اور وہ ہمیشہ اسی سوچ میں رہتے تھے کہ پھر وہ اگلی روح ہم میں پیدا ہو سکتی ہے یا نہیں۔ جب اختتام تعطیل کے بہت کم دن باقی رہ گئے۔ تو انہوں نے مکان جانے کا ارادہ کیا۔ اور شام کے اکسپرس میں سوار ہو کر دوسرے دن اپنی بستی گونڈہ میں پہونچ گئے

(۳)

صبح کا وقت تھا پرتاچندر پوجا پاٹ سے فارغ ہو کر کئی ہفتہ قبل کا ایک اخبار اٹھا کر دیکھ رہے تھے ان کی ماتا مسکراتی ہوئی کمرہ میں داخل ہوئیں۔ وہ ایک بیوہ عورت تھیں۔ پرتاچندر کے پتا عرصہ ہوا مر چکے تھے۔ انہوں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "پرتا۔ میں تم سے ایک ضروری بات کہنے آئی ہوں۔ تم ایک تو یونہی تعطیل ختم کر کے آئے ہو۔ اور غالباً کل پرسوں تک چلے بھی جاؤ گے۔ اس لئے جہانتک جلد ممکن ہو مجھے جواب دو۔"

پرتاچندر دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر مودبانہ کھڑے ہو گئے۔ وہ اپنی ماتا کی بڑی عزت کرتے تھے۔ سر جھکائے ہوئے بولے "جی ہاں کیا بتاؤں۔ کالج کے مشاغل سے بہت کم فرصت ملتی ہے۔ کیا کوئی بہت ضروری کام ہے؟"

"ہاں بہت ضروری" ماتا نے چوکی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اتنا ضروری کہ تمہیں آج ہی بلکہ اسی وقت جواب دینا ہوگا"

ماتا کو ہنسی آگئی۔ پرتاچندر بھی مسکراتے ہوئے

کرسی پر بیٹھ گئے ۔

تھوڑی دیر کے بعد ماتا نے کہا۔ "پرنا میری خواہش ہے اور دلی خواہش کہ میں اب تمہاری دلہن بیاہ کر لاؤں۔ دنیا ہنستی ہے کہ ابھی تک لڑکے کا بیاہ نہ کیا۔ میں۔ سچ پوچھو تو شرم سے گڑی جاتی ہوں۔ بات بھی سچی ہے۔ جوالا تم سے چھوٹا ہے۔ ڈیڑھ دو سال چھوٹا ہوگا۔ چیت میں پیدا ہوا تھا۔ ایکے اٹھارھواں لگے گا۔ رام جی کی دیا سے اسکی شادی بھی ہوئی۔ ایک بچہ بھی پیدا ہوا اور تم ہو۔ کہ شادی کے نام سے کوسوں بھاگتے ہو۔ آخر میں کب تک جیتی رہوں گی۔ میری زندگی میں تمہارا بیاہ نہ ہو۔ تو آخر کب ہوگا؟ اتو میں تمہاری ایک نہ مانوں گی۔ اسی کرسمس کی تعطیل میں میں بیاہ کا انتظام کرتی ہوں۔ بدّو بابو کی بیوی کل آئی تھیں۔ راجکماری کی نسبت ذکر آیا مجھے بھی بے حد پسند ہے۔ بات تو یہ ہے ایسی لڑکی ملنی بہت مشکل ہے۔ دیکھو اگر تم نے میری بات نہ مانی تو مجھو بے حد صدمہ ہوگا"۔

پرناچندر شادی کے مخالف تھے۔ کئی پیغام ابتک مسترد ہو چکے تھے۔ ان کا شادی کرنے کا ارادہ نہ تھا۔ اور وہ اس کے متعلق کچھ عجیب و غریب قسم کی دلیل اپنے پاس رکھتے تھے۔ عموماً لوگ طالب علمی کے زمانہ میں شادی کرنا ناپسند کرتے ہیں۔ چونکہ تجربہ نے بتایا ہے۔ کہ شادی کے بعد تعلیم کا جاری رکھنا بہت ہی دشوار طلب امر ہے۔ لیکن پرناچندر کے پاس یہ بھی دلیل نہ تھی وہ اس لئے شادی کے مخالف نہ تھے۔ کہ وہ طالب علم تھے اور ابھی انہیں اپنی تعلیم جاری رکھنی تھی۔ ان کا یہ بھی خیال نہ تھا۔ کہ جب تک چار پیسے وہ اپنی قوت بازو سے حاصل نہ کر سکیں۔ وہ شادی نہیں کر سکتے۔ کچھ یہ بات بھی نہ تھی کہ شادی کے بعد فکر معیشت کے ترددات کا انہیں سامنا کرنا پڑتا۔ وجہ اگر کوئی تھی تو یہ۔ اور جیسا کہ انہوں نے اپنے بے تکلف دوستوں سے بیان بھی کیا۔ کہ موجودہ زمانہ میں جیسی بیوی ملنی چاہئے۔ ویسی بیوی ملنا مشکل ہے انہوں نے اپنی مذہبی کتابوں میں دیکھا تھا۔ کہ اگلے وقتوں کی بیویاں کس درجہ اطاعت شعار کیتنی مطیع اور کیسی فرمانبردار ہوتی تھیں۔ برخلاف اس کے آجکل کے مشاہدات انہیں بتاتے تھے۔ کہ بیوی شوہر کے لئے نہیں بلکہ شوہر دراصل بیوی کے لئے ہوتا ہے۔ شوہر اگر اپنی بیوی کی اطاعت شعاری اور دلجوئی میں کوئی کسر اٹھا رکھے تو ہر جگہ اور ہر سوسائٹی میں بدنام و مطعون ہوتا ہے یہ کھلا مظاہرہ انگریزی تعلیم اور جدید تہذیب کا نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ آج کل بیویاں عموماً پڑھی لکھی ہوتی ہیں اور اس کا لازمی لابدی نتیجہ یہ ہے کہ کھانا پکانا۔ کوٹنا۔ پیسنا تو ایک علیحدہ چیز رہی۔ انہیں اپنے شوہر کو ایک گلاس پانی کا دینا بھی گراں گذرتا ہے۔ وہ اخبارات پڑھتی ہیں انہیں عشقیہ ناولوں سے دلچسپی ہوتی ہے۔ وہ اپنے بناؤ سنگار میں اپنے وقت کا زیادہ حصہ صرف کرتی ہیں اور ان کے دل میں اپنے شوہر کی عزت ایک ستم زدہ اور آفت روزگار عاشق سے زیادہ نہیں ہوا کرتی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ مساوات برتنا چاہتی ہیں۔ اور اگر ان کی فرمائشات و احکام کی تعمیل میں ذرہ بھر بھی بے عنوانی ہوئی تو پھر تو مرد کا ان کے سامنے "سراپا تقصیر" ہو کر رہ جانا ناگزیر ہے

یہی خیالات تھے جن کی بنا پر پرناچندر نے اول تو یہ فیصلہ کیا تھا۔ کہ وہ صنف نازک میں سے کسی فرد کو بھی اپنی زندگی کا شریک نہ بنائیں گے۔ لیکن بالآخر ماتا جی کا اصرار اتنا شدید اور پیہم ہوا کہ انہیں اپنے فیصلے میں ترمیم

کرنی پڑی۔ اب انہوں نے سوچ لیا تھا۔ اور یہ فیصلہ ان کا بالکل قطعی تھا۔ کہ اگر آئندہ شادی کے لئے انہیں مجبور کیا گیا تو وہ اپنی رضامندی ظاہر تو کر دیں گے۔ لیکن عورت کا انتخاب خود ان کے ذمہ ہوگا۔

ہوسٹل کے لڑکوں سے بھی ایک دن انہوں نے دوران گفتگو میں اپنے خیالات کا اظہار کر دیا تھا کہ اول تو حتی الامکان وہ شادی ہی نہ کریں گے اور کاش اس کا کبھی موقع آیا بھی تو ان کی نظر انتخاب محض اس عورت کی طرف جائے گی جو ظاہری وجسمانی ساخت کے لحاظ سے انتہائی بدقسمت عورت کہی جاسکے۔ یہ بات ان کے دماغ میں اچھی طرح جم گئی تھی کہ حسن ہی ایک وہ شئے ہے جس پر عورت کے سارے طلسم کا دارومدار ہے۔ اور یہی ایک وہ چیز ہے۔ جس کی وجہ سے عورت اپنا دام تسخیر پھیلانے کے لئے مجبور ہو جاتی ہے۔ وہ اردو تو نہ جانتے تھے۔ لیکن ایک روز انہوں نے اپنے ایک دوست کی زبانی جب غالب کا یہ شعر سنا۔

حسن اور اس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے۔ غیر کو آزمائے کیوں؟

اور معنی پوچھے تو بہت دیر تک کیفیت میں ڈوبے رہے اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ ان کی یہ کیفیت ان اثرات کے ماتحت ہرگز نہ تھی جس سے متاثر ہو کر شاعر نے یہ تخیل دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

پرناچندر کی اس عجیب وغریب ذہنیت پر ان کے بعض ہم جماعت ان کی تضحیک بھی کرتے اور کہتے کہ صاحب ہزاروں آدمی ایسی ڈینگیں لیا کرتے ہیں لیکن آج تک اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے والا کسی کو بھی نہ پایا گیا۔ کہنے اور کرنے میں آسمان و زمین کا تفاوت اور مغرب و مشرق کا فرق ہے

اس وقت کہہ لیجئے لیکن جب واقعی اس کا موقع آئے گا تو یہ ساری باتیں بھول جایئے گا۔ پرناچندر اس کا جواب اور کچھ نہ دیتے۔ صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتے کہ آپ کو اختیار ہے۔ آپ مانیں چاہے نہ مانیں۔ لیکن کم از کم میں اپنے ارادہ میں راسخ اور فیصلہ میں اٹل ہوں۔ اور اگر میری اور آپ کی زندگی رہی تو دیکھ لیجئے گا۔ کہ پرناچندر اپنے قول اور عہد کا کتنا پکا ثابت ہوتا ہے۔

الغرض یہ تھے وہ خیالات جو پرناچندر اپنی شادی کی نسبت رکھتے تھے۔ آج تک تو ان کی ماتا نے دوست احباب کے ذریعہ انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس بار جب انہوں نے خود اپنی زبان سے اتنی آزادی و بیباکی کے ساتھ گفتگو کی تو پرناچندر سوائے "ہاں" کے "نہیں" کہنے کی جرأت نہ کرسکے۔ انہوں نے کہا۔ میں آپ کے حکم کی تعمیل کے لئے ہر وقت مستعد ہوں۔ لیکن نہیں معلوم جس لڑکی کا آپ ذکر کر رہی ہیں اسے کبھی آپ نے دیکھا بھی ہے یا نہیں؟" ماتا کے لئے پرناچندر کی رضامندی بالکل غیر متوقع تھی۔ انہوں نے خوشی کے لہجہ میں جواب دیا۔ "نہیں میں نے بذات خود تو نہیں دیکھا ہے۔ لیکن سنتی ہوں بہت خوبصورت لڑکی ہے ۱۳۔ ۱۴ سال کا سن ہے پڑھی لکھی۔ سلیقہ مند۔ شگفتہ صورت۔ جب دیکھو یہی معلوم ہوتا ہے۔ مسکرا رہی ہے"

"کم سن! خوبصورت! پڑھی لکھی!! شگفتہ صورت پرناچندر کانپ اٹھے۔ ہرچند وہ اپنی ماتا کی بڑی عزت کرتے تھے۔ لیکن اسوقت انہوں نے صاف بے جھجک ہو کر کہدیا۔ کہ میں تو ایک ایسی لڑکی کو چاہتا ہوں جو ان اوصاف کے بالکل برعکس ہو۔ میں ان کے ہاں شادی نہیں کرتا۔ آپ ان سے کہدیجئے"۔

"تو کیا تمہارا یہ مطلب ہے کہ تم ایک بدصورت اور

اور جاہل لڑکی چاہتے ہو؟" پرناچندر کی ماں نے حیرت و استعجاب کے لہجہ میں پوچھا۔

"ہاں۔ میں ایک حسین اور مہ جبین لڑکی سے شادی کرنے کے بالکل خلاف ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ بھی میری رائے کے موافق ہوں گی"۔

ماں نے خیال کیا۔ اسوقت گفتگو کا ملتوی رکھنا مناسب ہے اور یہ کہتی ہوئی باہر چلی گئیں کہ اچھا کم از کم تم شادی کے لئے تو راضی ہو گئے۔ جدو بابو کے ہاں نہیں۔ دوسری جگہ تیسری جگہ تو تمہیں عذر نہ ہوگا۔

(۴)

بابو جدو نندن سہائے لنگ پور ضلع ۔ دوان کے ایک مشہور و معروف وکیل تھے۔ کلکتہ ہائی کورٹ میں پریکٹس کرتے تھے۔ اور ان کی آمدنی تین چار ہزار روپے ماہانہ سے کم نہ تھی۔ خاندانی آدمی تھے۔ موروثی جائداد بھی اچھی تھی۔ ان کی صرف ایک اولاد راج کماری تھی۔ جو ماں باپ کی آنکھوں کا تارا بنی ہوئی تھی۔ راج کماری کا تیرھواں سال تھا۔ متعدد جگہوں سے شادی کے پیغامات آ رہے تھے۔ لیکن جدو بابو کی نظروں میں سوائے پرناچندر کے اور کوئی دوسرا نہ جچتا تھا۔ پرناچندر کے والد اور جدو بابو ہم جماعت تھے اور خاندانی مراسم ایک عرصہ دراز سے چلے آتے تھے۔ پرناچندر کے والد کے مرنے کے بعد بھی جدو بابو نے اپنی وضع کو اسی طور سے نبھایا اور اپنے اوضاع و اطوار میں کسی قسم کا فرق نہ آنے دیا۔ پرناچندر کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ اور ہمیشہ سے ان کے پسندیدہ کیریکٹر کے ثناخواں تھے۔ ان کی سادگی اور مذہبیات سے دلچسپی انہیں اتنی پسند تھی کہ ان کا خیال تھا کہ راجکماری کے لئے اگر کوئی بہترین رفیق زندگی مل سکتا ہے تو وہ پرناچندر ہیں۔

پرناچندر نے جب اپنی ماں سے صاف صاف انکار کر دیا کہ وہ جدو نندن بابو کے ہاں محض اس لئے شادی کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں کہ وہ ایک بدشکل اور بدصورت لڑکی چاہتے ہیں۔ تو ان کی ماتا کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ پرناچندر کا کالج کھل گیا تھا۔ وہ تو کلکتہ چلے گئے۔ لیکن ان کی ماں کو سخت تشویش تھی۔ کہ آخر وہ جدو نندن بابو کی بیوی کو کیا جواب دینگی وہ ان سے یہ بھی کہنا نہ چاہتی تھیں کہ پرناچندر ایسی عجیب و غریب خواہش اپنے پہلو میں رکھتے ہیں۔ اسی طرح آٹھ دس دن گذر گئے کہ یکایک جدو بابو کی بیوی پھر آموجود ہوئیں۔ ادھر ادھر کی باتیں ہونے کے بعد انہوں نے پھر وہی گفتگو شروع کی اور دریافت کیا۔ کہ آخر پرناچندر سے انہوں نے اس کے متعلق رائے لی۔ یا نہیں؟ پرناچندر کی ماں اول تو کچھ سراسیمہ ہوئیں لیکن آخر انہوں نے مناسب یہی سمجھا کہ واقعہ کی اصلی حالت سے انہیں من وعن آگاہ کر دیا جائے۔ تاکہ آئندہ وہ غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں انہوں نے کہدیا کہ بہن بات یہ ہے کہ تم پرنا کے مزاج سے تو واقف ہی ہو۔ مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرتے کرتے اس کی ذہنیت کچھ عجیب ہو گئی ہے۔ پہلے تو وہ شادی کے لئے راضی ہی نہ ہوتے تھے لیکن جب میں نے بہت مجبور کیا تو وہ یہ کہتے ہیں کہ انہیں ایک ایسی لڑکی چاہئے جو حسین و شکیل ہونے کی بجائے بدصورتی و بدشکلی کا مجسمہ ہو۔ میں کیا کہوں۔ میری تو دلی خواہش تھی۔ کہ میں اس نئے رشتہ کو جہانتک جلد ممکن ہو انجام دوں۔ لیکن اس صورت میں تم خود کہہ سکتی ہو۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں نے تو حتی الامکان انہیں بہت سمجھایا۔ لیکن وہ کسی صورت سے بھی راضی نہیں ہوتے۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ میں اس حالت میں محض بے بس ہوں"

جدو بابو کی بیوی کو پرناچندر کی اس دنیا سے نرالی خواہش کو سنکر حیرت تو ضرور ہوئی لیکن وہ خاموشی کے ساتھ ان کی ماں کی باتوں کو سنتی رہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد بولیں

"اگر پرنا کی یہی خواہش ہے تو اس کا سب سے سہل طریقہ میرے خیال میں یہ ہے کہ وہ ایک بار اپنی آنکھوں سے لڑکی کو دیکھ لیں۔ پسند کرنا یا نہ کرنا ان کے اختیار میں ہے انہیں اس معاملہ میں کوئی دباؤ دینے تو نہ جائے گا۔ غالباً اس میں انہیں کوئی عذر نہ ہوگا"۔

"ہاں اس میں تو انہیں کوئی عذر نہ ہونا چاہئے" ان کی ماں نے ایک مایوسی کا سانس لے کر کہا۔

"تو پھر آج ہی انہیں ایک خط لکھ دو کہ وہ آئندہ اتوار کو کنگ پور براہ راست چلے آئیں۔ اور اپنی آنکھوں سے لڑکی کو دیکھ کر کسی آخری نتیجہ پر پہونچیں"۔

(۵)

اتوار کا دن تھا۔ جدو بابو کے ہاں پرناچندر کا بے چینی کے ساتھ انتظار ہو رہا تھا۔ صبح کی گاڑی سے نہ آنے کی وجہ سے سب کو پریشانی تھی۔ کہ آخر باوجود تار دینے کے پرناچندر ابھی تک کیوں نہ آئے۔ کوئی کہتا گاڑی چھوٹ گئی ہوگی۔ کوئی کہتا ممکن ہے کچھ سوچ کر ارادہ فسخ کر دیا ہو۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ ہر شخص اپنے اپنے خیال کا اظہار کر رہا تھا۔ سارا دن گذر گیا۔ شام ہوگئی۔ لیکن پرناچندر نہ آئے۔ سب کو مایوسی ہوگئی تھی۔ نوکر چاکر سب ہی افسردہ خاطر ہو گئے تھے۔ کہ یکایک شام کی گاڑی سے پرناچندر تشریف لے آئے۔ ان کے آتے ہی سارے گھر میں کچھ عجب چہل پہل ہوگئی۔ دائیاں آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کرنے لگیں۔ کمسن اور خردسال بچے نئے مہمان کو دیکھنے کی غرض سے باہر نکل آئے جدو بابو کی بیوی کھانے پینے کے انتظام میں فوراً مصروف ہوگئیں۔

صبح کے وقت پرناچندر اندر بلائے گئے۔ ایک وسیع اور تکلف کمرہ میں جہاں آرام و آسائش سے زیادہ عیش کا سامان موجود تھا۔ انہیں بٹھایا گیا۔ یہ چیزیں اگرچہ ان کے مزاج کے قطعی خلاف تھیں لیکن مجبوری یہ تھی کہ ان کی حیثیت ایک مہمان کی تھی۔ کچھ بول نہ سکتے تھے۔ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھے تھے اور دل ہی دل میں کہہ رہے تھے کہ اس نئی روشنی نے ہماری معاشرت میں کسقدر انقلاب عظیم پیدا کر دیا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لڑکی جو سرخ ساڑھی اور سپید کرتا زیب تن کئے ہوئے تھی اس کمرہ میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک طشت تھا جس میں کچھ رنگترے کچھ میوے رکھے ہوئے تھے۔ لڑکی نے طشت کو پرناچندر کے سامنے لاکر رکھ دیا اور خود ذرا ہٹکر علیحدہ بیٹھ گئی۔ دائیوں کے کہنے سے معلوم ہوا کہ یہی وہ لڑکی ہے جو پرناچندر سے منسوب ہے۔ چونکہ لڑکی گھونگٹ میں تھی۔ اس لئے پرناچندر نے اس کا چہرہ تو نہ دیکھا۔ لیکن ہاتھ پیر کے اگلے حصہ سے۔ جیسے انہوں نے آتے وقت اتفاقیہ طور پر دیکھ لیا تھا۔ اتنی بات معلوم ہوگئی۔ کہ لڑکی سپید رو یا سانولی نہیں بلکہ سیاہ فام ہے۔ یہ دیکھ کر انہیں یک گو نہ تسلی ہوئی۔ لیکن جب تک وہ چہرہ نہ دیکھ لیتے۔ انہیں پورا اطمینان ہونا مشکل تھا۔ دائیاں جوان معاملات میں بہت زیادہ قیافہ شناس واقع ہوئی ہیں۔ انہوں نے فوراً ان کے چہرہ سے ان کے دل کی بات دریافت کر لی۔ اور لڑکی کے چہرہ سے گھونگٹ کو ہٹا دیا۔ پرناچندر نے اسے دیکھا اور تھوڑی دیر کے لئے بالکل محو حیرت ہوگئے۔ لڑکی قیاس سے زیادہ بدشکل اور بدصورتی کا مجسمہ تھی۔ اس کے سر کے بال کنگھی نہ کرنے کے باعث الجھ الجھ کر سادھوں کی لٹ کی طرح ہوگئے تھے۔ اس کی آنکھیں بڑی تھیں لیکن اتنی بڑی کہ دیکھنے سے بھیانک معلوم ہوتی تھیں۔ سیاہ چہرہ پر بڑے بڑے چیچک کے داغ اور اسپر بڑی بڑی سرخ آنکھیں۔ پرناچندر کی آنکھوں نے آج تک ایسا منظر نہ دیکھا تھا۔ ہونٹ اسقدر باریک کہ بند ہونے کی حالت میں ناک کی نوک سے ٹھوڑی تک بالکل ایک سطح نظر آتی تھی۔ اور کوئی خط۔ کوئی نشیب و فراز

درمیان میں ایسا نہ معلوم ہوتا تھا جس سے دہن کا وجود متعین
کیا جاسکے۔ قد چھوٹا۔ قامت ناموزوں۔ ہاتھ پاؤں۔ بدن
الغرض وہ ایک ایسی لڑکی تھی کہ اسے دیکھتے ہوئے قدرت پر
ناانصافی کا الزام لگانا ہرگز ناروا نہ ہو سکتا تھا۔ بشریت کا
تقاضا تھا۔ کہ پرتاپ چندر بھی تھوڑی دیر کے لئے حیرت و
استعجاب میں آگئے تھے۔ ورنہ ان کی خواہش کے مطابق لڑکی
میں کل اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے۔ پرتاپ چندر نے دل میں
کہا۔ بیشک میں اس لڑکی کو اپنا شریک رنج و راحت بنانے کی
جرأت کرسکتا ہوں۔ اس میں وہ کل اوصاف موجود ہیں۔
جنہیں پرتاپ چندر کی آنکھیں مدت سے ڈھونڈھ رہی تھیں
بے شبہ اس لڑکی کے سبب ان کی مذہبی آزادی میں کسی
قسم کی بھی رکاوٹ پیدا نہ ہوگی۔ انہوں نے اپنے جذبات پر
قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے لڑکی سے پوچھا۔ کہ تمہارا کیا نام ہے
لڑکی نے اپنی گردن کو اونچا کیا۔ اور کچھ اس طور سے پرتاپ چندر کو
گھور کر دیکھا۔ کہ ان کی آنکھیں خود بخود نیچی ہوگئیں۔ پھر
بولی اس کی آواز اتنی گرج دار تھی کہ سارا کمرہ گونج رہا تھا۔
"کیا کہتے ہیں؟"

"تمہارا کیا نام ہے؟" پرتاپ چندر نے سانس کو فرو کرتے ہوئے
دہرایا۔

"میرا نام؟ راجکماری .... نا...... جگدمبا"

راجکماری! جگدمبا!! دو نام؟ پرتاپ چندر سوچنے لگے۔

دائیوں نے بتایا۔ پنڈتوں نے ان کا نام جگدمبا رکھا تھا لیکن
گھر والے انہیں راجکماری کے نام سے پکارتے ہیں"۔

پرتاپ چندر نے دل میں سوچا۔ "راجکماری! یہ نام نامناسب ہے
اگر شادی ہوئی تو میں اسی اصلی نام کو رواج دوں گا جو مقدس
پنڈتوں نے تجویز کیا ہے۔ یہ مذہبی نام ہے اور اگلے وقتوں میں
عورتوں کے ایسے ہی نام ہوتے تھے۔ جگدمبا! کتنا پیارا اور کیا
بھلا نام ہے"۔

لڑکی بلالی گئی۔ پرتاپ چندر سے دریافت کیا گیا کہ وہ اس
نسبت کو پسند کرتے ہیں یا نہیں؟ انہیں کیا عذر ہو سکتا تھا انہوں نے
اثبات میں جواب دیدیا۔

(۶)

اسی دن شام کو پرتاپ چندر رخصت ہوئے۔ تانگہ تیزی کے
ساتھ گذر رہا تھا۔ پرتاپ چندر اپنے خیالات میں مستغرق تھے۔
خیالات کا طوفان تھا۔ جو اُمڈا چلا آرہا تھا۔ وہ اپنی فتح پر
خوش تھے۔ لیکن ساتھ ہی ان کے قلب کی کچھ عجیب حالت تھی۔
ان کا دل اندر ہی اندر بیٹھا جا رہا تھا۔ اور رہ رہ کر جگدمبا
کی خوفناک شکل ان کی آنکھوں میں پھر رہی تھی۔ انہوں نے
آج اپنی عادت اور اصول کے خلاف ان عورتوں کو غور سے
دیکھا۔ جو راستہ میں انہیں گذرتی ہوئی ملیں۔ حالانکہ آج تک
ایسا اتفاق نہ ہوا تھا۔ نہ ان کی یہ عادت تھی اور نہ مذہب
اس کا حکم دیتا تھا۔ لیکن آج ان کی آنکھیں بے اختیار نامحرم
عورتوں کے چہروں پر پڑ رہی تھیں اور وہ سوچ رہے تھے
کہ ان عورتوں میں کیا کوئی ایک عورت بھی جگدمبا کی شکل کے
مشابہ ہے۔ لیکن باوجود تلاش و کوشش کے ایک عورت بھی
انہیں جگدمبا کی شکل و شباہت کی نظر نہ آئی تھی۔

ماں سے مل کر اور اتنا کہنے کے بعد کہ انہوں نے شادی کے لئے
اپنی رضامندی ظاہر کردی ہے وہ کلکتہ چلے گئے۔ دوسرے دن
شام کو خط سے معلوم ہوا کہ شادی کی تاریخ اسی مہینے میں رکھی گئی ہے
اور انہیں شادی کے لئے دو دن قبل رخصت لے کر مکان چلے آنا
ہوگا۔

ہوسٹل میں آنے کے بعد پرتاپ چندر کی کچھ عجیب حالت تھی
وہی ایک خیال۔ ایک تصور۔ ان کے دماغ کی آزادی پر مسلط
ہو رہا تھا۔ جگدمبا کی صورت ہر وقت۔ ہر لحظہ ان کے سامنے تھی

اور وہ لاکھ خیالات کو تبدیل کرنا چاہتے تھے لیکن انہیں اس میں کامیابی نہ ہوتی تھی۔ دو ایک دن تک وہ بادل ناخواستہ کالج گئے بھی لیکن جوں جوں شادی کی تاریخ نزدیک آتی گئی ان کے معمولات میں فرق آنے لگا۔ یہاں تک کہ دو دو تین تین دن تک صبح کا اشنان اور پوجا پاٹ بھی ناغہ ہونے لگا۔ وہ اپنی حالت پر خود متعجب تھے۔ دماغ اور قلب دونوں ان کے اختیار سے باہر تھے۔ وہ کیا کرتے ؟

(۶)

شادی کی مقررہ تاریخ کے صرف پانچ دن باقی رہ گئے تھے رات کا وقت تھا۔ اور رات نصف سے زیادہ حصہ طے کر چکی تھی کائنات ایک سکون مطلق طاری تھا۔ دنیا بے خبر سوتی تھی۔ لیکن پرناچند کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ وہ تخیلات کے ایک بحر بے پایاں میں غوطہ زن تھے۔ دل میں کہتے بیوی تو ان کے معیار نظر کے بالکل مناسب ملی ہے۔ حسن ایک فانی چیز ہے اور نہ انہیں اس کی ضرورت ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ان پر ایسی مجنونانہ کیفیت طاری ہو گئی ہے وہ خود ہی سوال کرتے۔ خود ہی جواب سوچتے۔ لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آتی ؟

انہی خیالات میں پوری رات ختم ہو گئی۔ صبح کاذب کا وقت تھا کہ پرناچند کی ذرا ہی آنکھ لگ گئی۔ اسے چاہے خیالات کا اثر کہو۔ یا دماغی انتشار کا نتیجہ سمجھو۔ انہوں نے خواب دیکھا کہ ایک وسیع اور لق و دق میدان میں وہ تن تنہا کھڑے ہیں۔ صحرا پُرخار ہے۔ اور راستہ سے ناواقفیت ہے۔ کہاں جائیں ؟ کدھر جائیں ؟ وہ یہ سوچ رہے ہیں۔ ناگاہ ایک خونخوار درندہ ان پر حملہ آور ہوا۔ انہوں نے بھاگنا چاہا لیکن یہ فعل عبث تھا جانور قریب آ گیا۔ اور انہوں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ ہو بہو جگدمبا کے بالکل مشابہ ہے۔ قریب تھا کہ وہ انہیں اپنے سینگوں سے اٹھا کر پھینک دے کہ انہوں نے ایک چیخ ماری اور ساتھ ہی آنکھ کھل گئی روشنی گل ہو گئی تھی۔ قریباً دس منٹ تک وہ بے حس و حرکت بستر پر پڑے رہے۔ پھر تکیے کے نیچے سے دیا سلائی نکال کر لالٹین روشن کی اور دیر تک اپنی حالت پر افسوس کرتے رہے ؟

دن رات کے چوبیس گھنٹے تیزی سے گذر رہے تھے۔ یہاں تک کہ اب صرف دو روز پرناچندر کی روانگی کے باقی رہ گئے۔ دن کا وقت تھا۔ لیکن مسلسل کئی راتوں کی شب بیداری کے باعث فطرت نے انہیں تھوڑی دیر کے لئے بے خبر کر دیا تھا غنودگی کا طاری ہونا تھا کہ انہوں نے پھر ایک خواب دیکھا جو اگلے خواب سے بھی زیادہ وحشتناک اور ہولناک تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک تنگ و تاریک کمرہ میں جس کی دیواریں بجائے سفیدی کے خون سے رنگی ہوئی ہیں وہ مقید ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد "کالی دیوی" ایک ہاتھ میں چھرا اور دوسرے ہاتھ میں ایک سر جس سے تازہ خون ٹپک رہا تھا۔ انہیں اپنی طرف آتی دکھائی دی انہوں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ "کالی دیوی" کی موجودہ شکل بالکل جگدمبا کی سی ہے۔ اور وہ کٹا ہوا سر جسے وہ اپنے ہاتھوں میں لئے ہے۔ خود ان کی صورت کے مشابہ ہے۔ وحشت کے عالم میں ان کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو کچھ نہ تھا۔ لیکن دیر تک سینہ بلیوں اُچھلتا رہا ؟

انہوں نے سوچا۔ ماں کو لکھ دوں۔ شادی منقطع کر دیجئے مجھے پسند نہیں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ انہوں نے دوات قلم نکال کر خط لکھنا شروع کیا۔ کئی مسودے بنائے اور چاک کئے۔ ایک سطر بھی نہ لکھی گئی۔ پھر سوچا یہ بات نامناسب ہے۔ شادی کے کل انتظامات ہو گئے ہیں۔ ماتا خوشی خوشی چیزوں کی فراہمی کر رہی ہوں گی۔ انہیں کیا معلوم کہ پرناچندر کے دل پر اس وقت کیا گذر رہی ہے۔ لیکن بہرحال میرا انتہائی خط لکھنا مناسب نہیں ہے۔ ماتا کو تو صدمہ ہو گا ہی۔ لوگ مجھے بھی چھچھورا اور ذلیل تصور کریں گے نہیں میں قطعی خط نہ لکھوں گا ؟

خیالات کا طوفان تھا۔ جب یہ تدبیر نامناسب معلوم ہوئی تو انہوں نے ارادہ کیا کہ خاموشی کے ساتھ وہ کلکتہ کو چھوڑ کر کسی دوسری جگہ چلے جائیں۔ لوگ سمجھیں گے کہ گنگا جی میں اشنان کیلئے گئے ہوں گے۔ پیر چھوٹنا پڑا ہوگا۔ وہیں رہ گئے ہوں گے۔ گھر خبر ملے گی۔ لوگ رو پیٹ کر خاموش ہو جائیں گے۔ مجھ کو کم از کم دماغی تکلیف اور روحانی اذیت سے نجات ملجائے گی۔ اس خیال کا آنا تھا کہ ان کے چہرے پر ایک تازگی کی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے فوراً سامنے کی میز سے ٹائم ٹیبل اٹھایا۔ اور بمبئی جانے کا وقت دیکھنے لگے۔ بمبئی۔ کلکتہ سے بہت دور ہے۔ وہاں کون پرناچندر کو پہچانتا ہے۔ رزق کا مالک خدا ہے۔ اس کا کیا تردد ہے۔ وہاں اطمینان سے زندگی بسر ہو گی۔ رہی ایک ماں کی خیریت سو کسی عنوان سے معلوم کر لی جائے گی ؛

یہ خیال اتنا مستحکم اور یہ تدبیر اتنی مناسب تھی کہ انہوں نے فوراً اپنا سامان اور بستر تک باندھ کر درست کر لیا۔ لیکن معاً خیال آیا کہ یہ بات اخلاقی اور نیز مذہبی حیثیت سے بھی نہایت ہی ناروا ہے۔ زندہ رہ کر اپنے کو مردہ ثابت کرنا ہرگز کسی شریف کا دستور العمل نہیں ہو سکتا۔ نہیں ایسا نہ ہوگا۔ اور میں ہرگز ایسا نہ کروں گا ؛

شادی کے معنی خوشی اور شادمانی کے ہیں۔ لیکن پرناچندر کی شادی در حقیقت سو مصیبتوں کی ایک مصیبت تھی۔ ان کا دماغ جواب دے رہا تھا۔ ان کی طبیعت اینٹھی جاتی تھی۔ اور انہیں اس مصیبت سے نجات دلانے والا کوئی بھی نظر نہ آتا تھا ؛

آخر کار پرناچندر کے یہ کل خیالات عارضی ثابت ہوئے اور انہوں نے چار و ناچار یہ فیصلہ کر لیا کہ جو کچھ بھی ہو۔ وہ اب تو زبان ہار چکے ہیں۔ اور اب انہیں ہر نتیجہ کو برداشت کرنا ہی ہے

(۸)

وقتِ مقررہ پر پرناچندر اپنے مکان پہونچ گئے۔ بارات نہایت ہی تزک و احتشام کے ساتھ کنگ پور کی طرف روانہ ہوئی اسوقت ان کے دل میں نہ خوشی کے جذبات تھے نہ غم کے اور خوف و ہراس کا بھی تسلط دل سے قطعی طور پر اٹھ گیا تھا۔ میدانِ جنگ میں قاعدہ ہے بزدل سے بزدل سپاہی بھی اپنی موت کو بھول جاتا ہے ؛

رسم کے مطابق دولہا دولھن ایک جا بٹھائے گئے۔ اور رونمائی کے لئے ایک بڑا آئینہ لایا گیا۔ پرناچندر کو دولھن کی صورت دکھائی گئی۔ لیکن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ بجائے جگدمبا کے ایک کمسن۔ دبلی پتلی اور پری جمال لڑکی ان کے پہلو میں بیٹھی ہے ؛

بعد میں معلوم ہوا۔ اور یہ راج کماری ہی نے بتایا کہ وہ لڑکی در اصل محلے کے ایک تیلی کی تھی۔ جو قصداً اس لئے دکھائی گئی تھی۔ کہ پرناچندر کو فریب نفس کی حقیقت معلوم ہو جائے ؛

(ظہیر الدین حیدر)

(از جناب محمد ناظم صاحب بی۔ ایس۔ سی۔ میرٹھ)

بجلی یا قدرت کی آتشبازی دراصل ایک قوت ہے جس کی لہریں بادل کے ایک ٹکڑے سے دوسرے ٹکڑے یا زمین۔ اور بادل کے درمیان دوڑتی ہیں۔ بجلی دو قسم کی ہوتی ہے مثبت اور منفی۔ اور ہر چیز میں ایک نہ ایک صورت میں موجود ہوتی ہے پانی کی سطح سے جو ابخرات اٹھتے ہیں۔ ان میں بھی مخلوط ہوتی ہے۔ اور اسی لئے بادل کا ہر گالہ اس کا مسکن ہے جب ایک بادل کی بجلی دوسرے بادل میں سرایت کرتی ہے۔ تو شرارے بلند ہوتے ہیں۔ جسے ہم برق کہتے ہیں۔ بہت سے آدمی اسکو حیرت اور تعجب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور بلا وجہ ڈرتے ہیں حالانکہ جسقدر بجلی کی لہریں بادلوں میں کوندتی ہیں ان میں سے ایک فیصدی سے بھی کم زمین کی طرف رجوع ہوتی ہیں ورنہ سب بادلوں ہی میں رہ جاتی ہیں۔

ایک امریکن محقق کی رائے کے مطابق دنیا میں موت کی ....۲۴ صورتیں ہیں۔ جن میں سے ایک بجلی بھی ہے۔ اگر حساب لگایا جائے تو معلوم ہو کہ اگر ایک موت بجلی سے واقع ہو سکتی ہے تو بیس خودکشی سے۔ بائیس اتفاقیہ صدموں سے۔ چار گرمی کے اثر سے اور اسی طرح سے اور متعدد وجوہ سے لیکن پھر بھی آدمی بجلی سے جتنے خائف ہیں اور چیزوں سے نہیں حالانکہ موت کے یہ تمام دیگر ذرائع قدم قدم پر موجود ہوتے ہیں اور بجلی کبھی کبھی گرتی ہے۔

پرانے خیال کے لوگ کہتے ہیں کہ جب بجلی چمک رہی ہو چاقو سوئی یا اور کوئی دھات کی چیز ہاتھ میں لے کر نہیں نکلنا چاہئے کیونکہ انکا عقیدہ ہے کہ دھاتیں اور بالخصوص فولاد۔ لوہا۔ یا تانبا۔ بجلی کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ لیکن حقیقت میں چھوٹے چھوٹے لوہے وغیرہ کے ٹکڑوں کا بجلی پر کوئی اثر نہیں ہوتا بجلی ہر جگہ گر سکتی ہے۔ اس کا اصول بس یہی ہے۔ کہ سب سے آسان اور چھوٹے راستہ سے قریب ترین چیزوں پر گرتی ہے۔ اسی لئے اونچے اونچے درخت اور بلند عمارتیں زیادہ خطرے میں ہوتی ہیں۔

بجلی سے محفوظ رہنے کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ بہت سے آدمی پروں کے گدوں میں لپٹ کر لیٹ جاتے ہیں اگر وہ کسی تہ خانہ میں جا چھپیں۔ تو زیادہ محفوظ رہ سکتے ہیں جو جگہ چاروں طرف سے لوہے کے تاروں سے گھری ہوئی ہو اس پر بھی بجلی اثر نہیں کرتی۔ جن عمارتوں پر فولاد کا چوکھٹا چڑھا ہو۔ یا اوپر سے زمین تک لوہے کی پٹری پڑی ہو۔ ان کو بھی بجلی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ ان کے علاوہ اور سب مقامات پر بجلی کا اثر ہوتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض پر کم اور بعض پر زیادہ۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ تہ خانے۔ فولاد کا چوکھٹا چڑھی ہوئی عمارتیں اور تاروں سے گھرے ہوئے مقامات کیوں محفوظ ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ تہ خانے بمقابلہ دیگر چیزوں کے بجلی سے زیادہ دور ہوتے ہیں۔ اور وہ عمارتیں اس لئے محفوظ ہیں کہ فولاد کا چوکھٹا یا لوہے کے تار بہت خاموشی اور آسانی سے بجلی کو زمین میں اتار دیتے ہیں۔ اور اس کا اثر ضائع ہو جاتا ہے۔ پیرس کے ایفل ٹاور پر کئی مرتبہ بجلی گری۔ باہر سے لوگوں نے بجلی گرتے ہوئے دیکھی لیکن جو لوگ ٹاور کے اندر تھے ان کو خبر بھی نہ ہوئی کہ یہاں

بجلی گری تھی یا نہیں۔ کیونکہ اسپر فولاد کی پٹریاں لگی ہوئی ہیں جن عمارتوں میں فولاد کے چوکھٹے کے نیچے لکڑی کی چوکھٹیں ہوں وہ زیادہ محفوظ نہیں رہتیں۔ لکڑی۔ پتھر اور اینٹ کے مکانات خطرناک ہوتے ہیں۔ کیونکہ بجلی ان اشیاء میں جذب ہوکر ان کو اسقدر گرم کر دیتی ہے۔ کہ وہ پھٹ جاتے ہیں جب کسی سبز درخت پر بجلی گرتی ہے تو حرارت کی وجہ سے اس کے اندر پانی یا رس جو کچھ بھی ہو بھاپ بنجاتا ہے اور ہوا کے راستے اسقدر وسیع ہو جاتے ہیں کہ درخت پھٹ جاتا ہے۔ چھال جو بمقابلہ اندر کی لکڑی کے زیادہ خشک ہوتی ہے جل جاتی ہے۔ مکانوں کی چھتوں پر سلیٹ یا کھپریل بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے آدمی کے بدن پر کپڑے اور جوتے اسی لئے جل جاتے ہیں کہ ان سب میں بجلی جذب ہو جاتی ہے اور بجلی سوکھی گھاس۔ خشک لکڑی اور دیگر اشیاء کو جو اسے جذب کرتی ہیں جلا دیتی ہے ؛

بجلی ان چیزوں پر زیادہ گرتی ہے۔ جو اس کے اثر کو ضائع کر سکیں۔ جنہیں انگریزی میں کنڈکٹرس کہتے ہیں۔ بمقابلہ خشک درخت اور سوکھی لکڑی کے سرسبز درخت پر زیادہ گرے گی۔ بجلی گرتے گرتے بھی اپنا مرکز بدل دیتی ہے۔ اگر خشک گھاس پر گر رہی ہو اور قریب ہی کہیں کچھ تر گھاس کا ڈھیر ہو تو اپنا راستہ فوراً بدلدیگی اور تر گھاس پر جا پڑے گی۔ مکانات درخت اور پہاڑیاں بمقابلہ قرب وجوار کی زمین کے زیادہ خطرے میں ہوتے ہیں۔ شہروں میں اونچی اونچی عمارتیں اس وقت تک غیر محفوظ ہیں۔ جب تک کہ ان کے نزدیک کوئی فولادی چوکھٹے کی عمارت نہ ہو ؛

کچھ مقامات ایسے بھی ہیں جو بمقابلہ اوروں کے زیادہ خطرناک ہیں۔ اور جہاں ہرگز کسی کو نہ جانا چاہئے۔ مثلاً اگر کسی جگہ کبھی دھات کی بنی ہوئی دو بڑی بڑی چیزیں رکھی ہوں ان کے بیچ میں کھڑا ہونا احتیاط کے خلاف ہے اگر ایک طرف پانی ہو۔ اور دوسری طرف کوئی فولاد یا دھات کی بڑی چیز ہو۔ وہاں کھڑا ہونا بھی ناعاقبت اندیشی ہے کیونکہ بجلی جب ان میں سے ایک چیز پر گرتی ہے تو زمین میں اترنے کے لئے برابر کی دوسری چیز پر کود کر جاتی ہے۔ راستہ میں جو چیز بھی آجائے جلکر خاک ہو جاتی ہے بجلی کے لیمپ کے نیچے جو لوہے کی زنجیر سی لٹک رہی ہو کھڑا ہونا سب سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ بجلی لوہے کی زنجیر پر دوڑتی ہوئی اور لیمپ پر پہونچ کر زمین پر گر پڑتی ہے۔ اکثر دھوئیں پر بھی بجلی اترتی ہے۔ اور اس لئے آگ کے نزدیک کھڑا ہونا بھی اچھا نہیں

جنگلوں میں اونچے پیڑوں کے نیچے پناہ لینے سے یہ بہتر ہے کہ چھوٹے چھوٹے پیڑوں کے قریب رہا جائے کیونکہ بجلی کے علاوہ درخت کے نیچے اور بھی کئی خطرے ہوتے ہیں۔ اگر بجلی گرے اور آدمی درخت کے نیچے ہو تو ممکن ہے کہ اسپر بھی بجلی اثر کر جائے اور اگر اثر نہ بھی کرے تو درخت کے پھٹنے سے جو لکڑیاں اڑیں ان سے چوٹ لگنے کا ڈر ہے۔ اس کے علاوہ شاید کوئی گدھا بھی سر پر آپڑے ؛

پہاڑیوں اور چٹانوں کے قریب جانا بھی اچھا نہیں کیونکہ وہ نزدیک کی زمین سے اونچے ہوتے ہیں۔ اگر پہاڑ پر چڑھ رہے ہوں یا اوپر سے اترتے ہوں تو ایسے وقت کسی غار میں چھپ کر بیٹھ جانا ہی مصلحت ہے۔ کھلے میدان میں اکثر آدمی زمین پر لیٹ جانا بہتر سمجھتے ہیں ؛

عام طور سے بجلی کا قیام $\frac{1}{1000000}$ سے $\frac{1}{1000}$ سیکنڈ تک ہو سکتا ہے۔ آسمان پر جو چمک یا روشنی دکھائی دیتی ہے۔ یہ ہوا یا گیس کی روشنی ہوتی ہے۔ جو بجلی کی وجہ سے جل اٹھتا ہے ورنہ خود بجلی میں چمک نہیں ہوتی۔ لیکن ہوا یا گیس کو اگر معمولی طور سے گرم کریں تو وہ بات پیدا نہیں ہوتی جو بجلی کی حرارت سے پیدا ہوتی ہے۔ اب رہا روشنی کا رنگ۔ وہ گیس بھاپ یا ہوا کی خاصیت پر منحصر ہے۔ مختلف گیس مختلف رنگ کی روشنی دیتے ہیں اگر گیس پارے کا ہے تو سبز رنگ کی روشنی ہو

اگر نائٹروجن گیس ہو جو ہوا میں بقدر اسی فیصدی موجود ہے تو روشنی کچھ زردی لئے ہوئے ہلکے گلابی رنگ کی ہوگی۔

اب یہ تو معلوم ہو گیا کہ جس جگہ بجلی کی چمک دکھائی دے وہاں ہوا بہت گرم ہوگی۔ چنانچہ حرارت کی وجہ سے یہ ہوا اسقدر قوت سے پھیلتی اور چاروں طرف کی ہوا کو دباتی ہے کہ اس سے کڑک کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہ آواز بعض وقت تو ایک فوری دھڑاکے کی سی آواز ہوتی ہے اور کبھی بہت دیر تک گڑگڑاہٹ سنی جاتی ہے۔ آواز میں یہ فرق فاصلہ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ فاصلہ ہو اتنی ہی دیر میں ہم تک آواز پہنچتی ہے۔ بجلی سیدھی نہیں چلتی بلکہ سانپ کی طرح لہراتی ہوئی چلتی ہے۔ اب اس کا یہ کل لہردار راستہ اگر ہم سے قریب قریب ایک ہی فاصلہ پر رہے تو تمام آواز ایک ساتھ ہمارے کانوں میں آتی ہے۔ اور اسی وجہ سے شدید شور سنائی دیتا ہے۔ لیکن اگر بجلی اپنا راستہ اس طرح طے کرے کہ اس کا فاصلہ ہم سے گھٹتا بڑھتا رہے۔ تو ہلکی اور بھاری آواز دیر تک آتی رہتی ہے۔ ایک وجہ گڑگڑاہٹ کی یہ بھی ہے کہ بجلی کی آواز بادلوں۔ اور پہاڑوں سے ٹکر اکر گونج پیدا کرتی ہے۔ جو دیر تک سنائی دیتی ہے۔

روشنی اور آواز دونوں اپنا راستہ ہوا میں طے کرتی ہیں لیکن ان دونوں کی رفتار میں بہت فرق ہے۔ روشنی ایک سیکنڈ میں ۱۸۶۰۰۰ میل تک جاتی ہے لیکن آواز ایک سیکنڈ میں صرف ۱۱۰۰ فٹ پہنچتی ہے۔ اس کا صاف ظاہر ہے کہ بجلی کی چمک دیکھنے کے بعد اس کی آواز سنائی دے گی لیکن پھر بھی بہت سے آدمی آواز سنکر ڈرتے ہیں۔ کہ کہیں بجلی نہ گر پڑے اور یہ نہیں سمجھتے کہ آواز آنے کے بعد بجلی نہیں گر سکتی اگر گرنی ہوتی۔ تو آواز آنے سے پہلے ہی گر چکی ہوتی۔ کیونکہ بجلی یا روشنی کی رفتار آواز سے کہیں زیادہ ہے۔

جنوری میں وی پی وصول کرنیوالوں کیلئے رعایتیں

نیرنگ خیال کے وہ خریدار جن کا سال جنوری میں شروع ہوتا ہے۔ اور وہ تمام خریدار جو اپنی خریداری کا سلسلہ برابر قائم رکھے ہوئے ہیں۔ مندرجہ ذیل رعایتیں حاصل کر سکیں گے۔

(۱) مارچ میں شائع ہونے والا عید نمبر جس کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ انہیں مفت ملے گا۔ اور اس میں ماہوار چندہ کاٹ کر انہیں ۸/ کی رعایت ملیگی۔

(۲) نیرنگ خیال بکڈپو کی مطبوعات رعایتی قیمتوں پر ملیں گی۔ ثریا۔ (چار آنہ رعایت۔ صرف ایک روپیہ میں) پنکھڑیاں ۱۰/ (۸/ میں۔ ۲/ کی رعایت) نیرنگ خیال کا پکچر البم ۱۲/ تصاویر کا مرقع (۴/ کی رعایت (۸/) میں) سالانہ قیمت مع محصولڈاک ۱۲/ خریداروں کو مع محصولڈاک ۸/ میں۔ (۴/ کی رعایت) دوشیزہ علم نوعی پر لاجواب کتاب (رعایتی قیمت ۳/ ہے۔ ۴/ کی رعایت) اسی طرح سے دوشیزہ حصہ دوئم اور ۱۹۳۰ء میں شائع ہونے والی تمام کتابوں پر رعایتیں ملتی رہیں گی۔ ہمارا خیال ہے کہ سال بھر میں آپ کو رسالہ کی قیمت کے برابر رعایت مل سکیگی۔ اور رسالہ آپ کو مفت میں حاصل ہوگا۔

اس لئے اپنی خریداری کا سلسلہ ہمیشہ قائم رکھئے اور جنوری سے دوست و احباب کو بھی خریدار بنائیے۔

(منیجر)

پُراسرار مسافر

(افسانہ)

موٹر ڈرائیور کو اُسی رات دوسری بار مسافروں کا مل جانا ایک مسافر عجیب غیر متوقع معلوم ہوا۔ اِس سے پیشتر اُس کو کبھی یہ اتفاق پیش نہیں آیا تھا کہ اُسے اتنی جلدی سواریاں مل گئی ہوں ابھی وہ اپنی موٹر بازار میں لایا ہی تھا کہ خالی ہوتے ہی وہ بھر گئی۔ اور آٹھ سواریاں اپنی اپنی جگہ پر طمانیت سے بیٹھ گئی۔ ڈرائیور نے عقب سے موٹر کے اندر جھانک کر دیکھا۔ کل آٹھ نشستیں تھیں اور آٹھ آدمی اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔

ڈرائیور نے دل میں کہا کہ بس اب ایک سواری اور مل جائے تو وہ ابھی منزل مقصود کی طرف چل دیئے۔ ابھی وہ اس کا خیال ہی کر رہا تھا کہ نواں آدمی بھی اُس کے پاس اگلی نشست پر آ بیٹھا۔

ڈرائیور نے کرایہ وصول کرتے ہی موٹر کا رُخ شہر سے باہر کی طرف کر دیا۔

یہ ایک سنسان اور خاموش سیاہ رات تھی۔ سڑک پر سوائے دھیمی دھیمی روشنی والی لالٹینوں کی قطار کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ موٹر کے اندر بھی گھُپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ آٹھ مسافر تھے۔ اور آٹھوں خاموش۔ چپ چپ زندہ انسانوں کے سائے معلوم ہوتے تھے جو موٹر کی رفتار کے ساتھ اتنی سی حرکت کرتے کہ اُن کے سر آپس میں کچھ ہلتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ نواں آدمی سامنے والی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا بڑے غور و تفکر سے ٹکٹکی باندھے اندھیرے میں کچھ دیکھ رہا تھا۔ گویا اُسے سڑک پر کسی چیز کی تلاش تھی۔ ڈرائیور اُس کی اِس حرکت پر کچھ پریشان سا ہوا۔

روشنی کی آخری علامت بھی اب پیچھے رہ گئی تھی اور موٹر صنوبر کی سیاہ دیواروں کے درمیان اندھا دھند چلی جا رہی تھی کامل سکوت تھا۔ کوئی مسافر ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالتا تھا۔ اُس نے دل میں کہا۔ یہ مسافر ہیں یا کوئی گروہ۔ یا ٹولی یکایک کانا پھوسی کی طرح ایک آواز تھرتھراتی ہوئی اُس کے کان میں آئی۔

ڈرائیور۔ ٹھیرو میں اُترنا چاہتا ہوں!

ڈرائیور نے موٹر کھڑی کر دی۔ ایک مسافر موٹر سے باہر کودا اور تاریکی میں گم ہو گیا۔ ڈرائیور نے پھر موٹر چلا دی۔ اُس نے کہا کیا یہ شیطان تھا؟ جہاں تک مجھے علم ہے۔ یہاں نہ کوئی سڑک نہ راستہ۔

مسافر حسب معمول پھر خاموش تھے۔ سب کی زبانیں یکسر بند تھیں۔ ابھی تین منٹ بھی نہیں گذرے تھے۔ کہ پھر آواز آئی:۔

"ڈرائیور! ٹھیرو۔ میں اُترنا چاہتا ہوں!

موٹر پھر رُک گئی۔ اور ایک آدمی باہر نکلا۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔ اور موٹر پھر چل دی۔ ڈرائیور حیران تھا۔ یہاں کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں یہ آدمی جا سکے۔ رات زیادہ تاریک تھی وہ یہ دیکھ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس وقت ہے کہاں۔

سامنے سے ایک موٹر تیزی سے آئی اور اس کے پاس سے گذر گئی۔ اُس کی روشنی میں ڈرائیور نے اندر جھانک کر دیکھا۔

کچھ آدمی انسانوں کے سائے معلوم ہوتے تھے۔ جو موٹر کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ اپنے سروں کو خفیف سی حرکت دیتے تھے۔ موڑ گذرنے کے بعد سڑک اور بھی تاریک اور بھیانک نظر آنے لگی ؛

ابھی ایک منٹ ہی اور گذرا ہوگا۔ کہ اندر سے پھر وہی آواز سنائی دی ؛

ڈرائیور ٹھیرو میں اُترنا چاہتا ہوں ؛

یکساں قسم کی آوازیں۔ وہی صنوبر کے گنجان درختوں کی تاریکی میں پھر ایک آدمی باہر نکلا اور گم ہوگیا۔ ڈرائیور نے تاریکی میں اپنا سر باہر نکال کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ تاریکی میں کچھ نہ دیکھ سکا ؛

"یہ کوئی خاص پروگرام ہے۔ جس کو یہ مل کر انجام دے رہے ہیں" اُس نے اپنے دل میں کہا۔ اگر وہ مجھے لُوٹنا چاہتے ہیں۔ تو وہ میں حیران ہوں مجھ سے وہ نقدی بھی تو واپس لینے کی کوشش نہیں کرتے جو وہ کرایہ کی صورت میں ادا کر چکے ہیں ؛

اب موٹر پھر پوری تیز رفتاری سے سڑک کو نگلتی چلی جا رہی تھی۔ ڈرائیور سوچ رہا تھا۔ کہ صرف نصف گھنٹہ میں منزلِ مقصود پر جا پہونچوں گا......

"ڈرائیور۔ ٹھیرو۔ میں اُترنا چاہتا ہوں" ؛

اِس دفعہ ڈرائیور نے دیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی کیونکہ نہ دیکھنا ہی زیادہ محفوظ معلوم ہوا ؛

"کیا یہ اگلی نشست والا آدمی بھی اسی پُراسرار جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ کچھ بولتا چالتا کیوں نہیں"

ڈرائیور کے دل میں ہر گھڑی نئے نئے خیال آتے تھے واقعی سامنے کی نشست والا مسافر برابر تاریکی میں دیکھ رہا تھا اپنا سر ہلائے جُلائے بغیر ؛

کتنی سیاہ اور بھیانک سڑک ہے۔ پھر آواز آئی :-

"ڈرائیور۔ ٹھیرو۔ میں اُترنا چاہتا ہوں"

ڈرائیور کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اندھیرے کمرے کے اندر سے الفاظ ایک ہی طریقے سے ادا کئے جاتے تھے ؛

پانچواں آدمی بھی اسی طرح سے اُتر گیا۔ ڈرائیور بڑھتا چلا گیا۔ اور اُس نے اِدھر اُدھر دیکھنا بند کر دیا۔ وہ موٹر کو اس رفتار سے لئے جا رہا تھا۔ جس کی ممانعت تھی ؛

"اس کا کیا باعث ہے۔ کہ جوں جوں ان کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے۔ میرا خوف بڑھتا چلا جاتا ہے"۔ ڈرائیور برابر گوش بر آواز تھا۔

جب اُس نے چھٹی دفعہ یہ آواز سُنی تو وہ کانپ رہا تھا

ڈرائیور! ٹھیرو۔ میں اُترنا چاہتا ہوں"۔

اور چھٹا آدمی صنوبر کے درختوں کے درمیان تاریکی میں گم ہوگیا۔ ایسی جگہ پر جہاں نہ کوئی گھر تھا نہ سڑک نہ پگڈنڈی بقیہ دو آدمی موٹر کے اندر سایہ کی طرح چُپ چاپ بیٹھے تھے ڈرائیور کے پاس والا نواں آدمی بھی نہ کوئی حرکت کرتا تھا نہ اِدھر اُدھر دیکھتا تھا ؛

ڈرائیور کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کاش اس تنہائی کی تکلیف کو رفع کرنے کے لئے سامنے سے ہی کوئی موٹر آجائے۔ کہ پھر آواز آئی :-

"ڈرائیور! ٹھیرو۔ میں اُترنا چاہتا ہوں"

بار بار ایک ہی قسم کی آواز۔ ایک لمحہ انسان کو دیوانہ بنا دینے کے لئے کافی ہے۔ موٹر تاریک دیواروں میں پھر ٹھیری۔ مسافر اُترا۔ اور ڈرائیور نے دل میں کہا۔ ۹ میں سے گئے سات۔ باقی رہے دو"

اگر انہوں نے کوئی شرارت کی تو میں اس قابل ہوں۔ کہ انہیں ترکی بہ ترکی جواب دے سکوں ؛

موٹر تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔ اندر صرف ایک آدمی بیٹھا تھا۔ خاموش۔ اگلی نشست پر ایک آدمی بیٹھا تھا

جس کی نگاہیں تاریکی میں سامنے گڑی ہوئی تھیں۔ ڈرائیور کے
کان کھڑے ہوگئے۔ جب اس نے اندر سے آخری مسافر کی
آواز سنی۔

"ڈرائیور۔ ٹھیرو۔ میں اترنا چاہتا ہوں"

اس کا لہجہ اور طرز ادا بھی بالکل پہلے سات آدمیوں کے
مشابہ تھا۔ ہر دفعہ اس پُراسرار طریقہ سے ایک ہی قسم کی
آواز کا سننا بہت پُراسرار معلوم ہوتا تھا۔ آٹھواں آدمی بھی
اتر گیا مگر اُس نے جانے سے پہلے کہا۔

خدا حافظ!

کیا؟ ڈرائیور نے تعجب سے کہا۔ اِن دو لفظوں نے
مجھے سخت پریشان کر دیا ہے۔ وہ خوفزدہ ہوگیا۔ گو
مسافر اکثر یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ مگر آٹھ آدمیوں میں سے
صرف آخری آدمی کا ایسا کہنا ضرور کچھ معنی رکھتا ہے۔

"نو میں سے اٹھ گئے باقی رہا ایک"

ڈرائیور نے اپنے آپ کو اطمینان دلانے کے لئے کہا۔
اب ایک آدمی تنہا میرا کیا بگاڑ سکتا ہے؟

اگلی نشست والے آدمی نے ایک لمبا سانس لیا۔ گہرا
مثل آہ سرد کے۔ اور تاریکی سے اپنی نظر ہٹا کر اُس نے
ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ اُس کا چہرہ اس قسم کا تھا کہ ڈرائیور نے
اس سے قبل کبھی نہ دیکھا تھا۔

چپٹا۔ زرد۔ سیاہ اور چمکتی ہوئی شعلہ آنکھیں۔
اُس نے دونوں ہاتھ اپنی چھاتی پر رکھ کر کہا۔

ووڈ لینڈ کا قبرستان اب یہاں سے کتنی دور ہے!

ڈرائیور گھبرا گیا۔ اُس کا سانس حلق میں اٹک گیا اور
اُس نے بڑی کوشش سے اسے بار بار نگلنے کی کوشش کی
اور کہا۔

"پانچ میل! ہم اپنا سفر اچھی طرح سے طے کر رہے ہیں
ہیں نا؟

مسافر قہقہہ مار کر ہنسا۔

ہا۔ ہا۔ تم بہت تیز لے جا رہے ہو۔ مسٹر بٹلر۔

ڈرائیور نے موٹر کی آواز کے ساتھ ملی جلی قہقہہ کی آواز
سنی۔ وہ اپنا نام ایک اجنبی مسافر سے سُنکر خوف سے کانپنے لگا
اُس نے آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھ کو اسٹرڈیوس کہئے۔ ہم اکٹھے سفر کر رہے ہیں"

مسافر نے سرد مہری سے کہا۔ میرا نام موت ہے۔

ڈرائیور نے کہا۔ میں نہیں سمجھا۔ سنا نہیں۔

مسافر نے پھر دُہرایا۔ موت۔

ڈرائیور نے کانپتے ہوئے کہا۔ یہ نام تو کچھ خوشگوار
نہیں۔

مسافر۔ بیشک۔ کیا تم میری کہنی کے نیچے کچھ دیکھتے ہو؟

موٹر کی دھیمی سی روشنی میں ڈرائیور نے دیکھا کہ پستول
کی نالی اس کی طرف نکلی ہوئی ہے۔

ڈرائیور۔ اچھا یہ بات ہے۔ تم صحیح کہتے تھے۔ آپ کا نام گویا
موت ہے۔ اسی لئے آپ قبرستان کا پتہ پوچھتے تھے

مسافر۔ بالکل اسی لئے۔ ہم قبرستان جا رہے ہیں۔

ڈرائیور کے جسم میں کپکپی سی آگئی۔

"ہم" مگر مجھے معلوم نہیں کہ مجھے وہاں سے کب بلاوا
آیا ہے۔

مسافر۔ تم اُس وقت طلب کئے گئے تھے جب میں نے اس
سفر کی تجویز کی تھی۔

ڈرائیور۔ گویا تم نے یہ سفر تجویز کیا تھا۔ اور جو آدمی راستہ
میں اترتے رہے ہیں۔ وہ تمہارے ہمراہی تھے۔

مسافر۔ بالکل۔ تاکہ ہم دونوں کو تنہائی کا موقعہ ملے۔

مسافر اپنا پاؤں لکڑی کے تختے پر مارے چلا جاتا تھا

اور ڈرائیور ایک ایسے جانور کی طرح جو شیر کے پنجرے میں بند ہو کانپ رہا تھا۔

ڈرائیور۔ اگر تم مشتاق ہو۔ تو تمہاری صحیح جگہ بے شک قبرستان ہی ہے۔ لیکن مجھ کو ساتھ لیجانے سے آپ کا مقصد؟ اگر تمہارے پاس پستول کی جگہ خنجر ہوتا تو ہم دیکھتے۔ کہ ہم دونوں میں سے کون وہاں جاتا ہے ؛

مسافر۔ موت نے بہت سے آدمیوں کو دھوکہ دیا ہے۔ کیا تم ایک لمحہ کے لئے بھی محسوس نہیں کر سکتے کہ تمہارے وہاں جانے کا کیا باعث ہے؟

ڈرائیور۔ میں نے کون سا جرم کیا ہے۔ تمہارا مقصد؟

مسافر۔ تمہیں یاد ہونا چاہیئے ؛

ڈرائیور۔ کیا یاد ہونا چاہیئے؟

ڈرائیور کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ موٹر کے شور میں الفاظ کو پورا پورا سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ موٹر دوڑی چلی جا رہی تھی۔ پھر بھی یہی معلوم ہوتا تھا کہ موٹر دہشتناک تاریکی میں ساکن کھڑی ہے ؛

مسافر۔ گویا تمہیں یاد نہیں؟

ڈرائیور۔ نہیں ؛

مسافر۔ اب قبرستان کتنی دور ہے؟

ڈرائیور۔ صرف تین میل۔ مگر کیوں؟

مسافر۔ گویا اب بھی تمہیں کچھ یاد نہیں ؛

ڈرائیور۔ نہیں۔ تم کون شیطان ہو ؛

مسافر۔ چلا کر۔ تم بھول گئے ؛

"مسافر کی آنکھیں بلی کی طرح چمک رہی تھیں" او خدایا میں چاہتا ہوں کہ اُس واقعہ کو بھول جاؤں۔ اور تمہیں یاد تک نہیں آتا ؛

ڈرائیور۔ لیکن کون واقعہ۔ مجھے کچھ بھی یاد نہیں ؛

مسافر۔ سنو۔ ۱۹۱۶ء میں جب تم ایک موٹر ڈرائیور تھے۔ تم نے خندق میں ایک موٹر گرا دی تھی ؛

ڈرائیور۔ اس سے تمہارا مطلب ؛

مسافر۔ گویا تمہیں اقرار ہے ؛

ڈرائیور۔ لیکن اس سے تمہارا مطلب ؛

مسافر۔ عورت پر کیا گذری ؛

ڈرائیور۔ موٹر گھوم گئی اور وہ مر گئی۔ لیکن کون۔ وہ عورت تمہاری..... کیا تھی ؛

مسافر۔ سب کچھ ؛

مسافر۔ میں صرف اُسی کے لئے زندہ تھا۔ اُسی کے لئے میں مصیبتیں اٹھاتا تھا۔ اور جب میں واپس آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ تم نے اُسے مار ڈالا ہے ؛

ڈرائیور۔ لیکن یہ میرا قصور نہ تھا.........

"وحشی اور پُر اسرار آدمی سے وہ آنکھیں چار نہ کر سکتا تھا۔ اُس نے اپنا منہ پرے کر لیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ۱۹۱۶ء کا تمام واقعہ ایک زندہ تصویر کی طرح سے زندہ معلوم ہونے لگا۔ مردوں اور لڑکوں کی بھیڑ سے چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ موٹر سے دھوئیں کا بادل اُٹھتا تھا۔ سفید سفید لباس پر عورت کا خون سُرخ سُرخ دھبے ڈالے ہوئے تھا"

ڈرائیور کا گلا اُس واقعہ کے تصور اور اسکی تصویر آنکھوں کے سامنے نظر آنے سے خشک ہو گیا۔ اس نے تین چار بار تھوک نگلنے کی کوشش کی مگر بے سود۔

مسافر۔ چنانچہ تم نے ہم دونوں کو مار ڈالا۔ میں آج تک موقعہ کے انتظار میں رہا۔ یہانتک کہ آج میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں ؛

ابھی تک یہ منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے تھا چیخوں کی

آوازیں اُس کا دل چھید رہی تھیں۔ اور یہ دیوانہ آدمی یا
بھوت اُسے ہر چیز یاد دلا رہا تھا۔

مسافر۔ اب قبرستان کتنی دور ہے۔

ڈرائیور۔ ایک میل۔

ڈرائیور کے دانت خوف سے کڑکڑا رہے تھے۔

مسافر۔ خوب۔ ہم وقت پر پہونچ جائیں گے۔

موٹر تیزی سے گڑگڑاتی ہوئی پہاڑی سے نیچے اُتری
اور وادی میں سے ہوتی ہوئی۔ اور دوسرے
نشیب کی طرف لپکی۔ مسافر اُس کی رفتار کے ساتھ
ساتھ وقت کا شمار کر رہا تھا۔ قبرستان قریب
آنے والا تھا۔ آسمان پر ایک مدھم سی روشنی
دکھائی دینے لگی۔ ہموار سطح آنے والی تھی۔

مسافر۔ جلدی چلو۔ اب قبرستان کتنی دور ہے۔

ڈرائیور۔ چوتھائی میل۔

ڈرائیور کے سر کے بال کھڑے تھے۔ اُس کی آنکھیں
راستہ دیکھتے دیکھتے پھٹ پڑنے کے لئے تیار تھیں۔
اُسے بار بار سڑک کے کنارے ایک عورت کا
مرجھایا ہوا چہرہ جو ایک طرف جھکا پڑا تھا۔ اس کے سفید
سفید لباس پر خون کے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ اس کی
چیخوں آوازیں دہشتناک رات میں برابر سنائی دے رہی تھی

ڈرائیور سوچنے لگا۔ کہ اگر میں قبرستان کے سامنے
سے بغیر رُکے ہوئے گذر جاؤں۔ تو سامنے قصبہ کی روشنیاں
نظر آنے لگیں گی اور میں اس ظالم بھوت سے بچ جاؤنگا
اب سیاہ لوہے کا جنگلا صاف نظر آنے لگا۔ قبروں کے
پتھر بھوتوں کی طرح کھڑے معلوم ہوتے تھے۔ بالکل قریب
ہی اس شاہراہ کے موڑ پر سیاہ پھاٹک آسمان سے باتیں
کر رہا تھا۔

ڈرائیور جھجکا۔ خوف سے لرزنے لگا۔ جب موٹر سڑک کی
ناہمواریت کی وجہ سے زور سے کھڑکھڑائی۔ قبرستان کے
بڑے دروازہ کا پھاٹک اور اس کی محراب مثل مقناطیس کے
اُسے اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔

مسافر نے چلا کر کہا۔ ہم آن پہونچے۔

سنگین دروازہ کا ایک حصہ موٹر کے سامنے تھا۔
جب دونوں قوتیں زور سے ٹکرائیں۔ تو اُن کی آواز سے
قبرستان گونج اٹھا۔ اُس وقت ایک فتحمندانہ قہقہ کی
آواز سنائی دی۔ جو یا تو قبرستان کے مردوں کی تھی
یا اُس وحشی دیوانے مسافر کی۔

لوگوں نے اسے موٹر کا صرف ایک معمولی حادثہ
سمجھا۔

محمد یوسف حسن چیف ایڈیٹر

جفائے آرزو

وہ کانٹا کہ تھا مجھ کو پیغامِ عشق ‖ مرے دل میں پائی جگہ رہ گیا
مرا خونِ دل تو لیا سارا چوس ‖ مگر خود چبھا کا چبھا رہ گیا

(اختر انصاری دہلوی)

حُسن کی چنگاری

(آرزو لکھنوی کے قلم سے)

(سید انور حسین صاحب آرزو لکھنوی نے اس وقت تک چار ڈرامے لکھے ہیں۔ جن میں سے متوالی جوگن مسیز ادر ریکی کمپنی میں۔ دل جلی بیراگن۔ کورنتھین تھیٹر میں۔ حسن کی چنگاری۔ اولڈ الفریڈ میں۔ اور چاند گہن۔ امپریل تھیٹر میں نکل رہا ہے۔ ان میں سے کوئی ڈرامہ آج تک طبع نہیں ہوا۔

حسن کی چنگاری سید ذاکر حسین صاحب ذاکر نے برائے اشاعت ارسال کیا ہے۔ جس سے ناظرین جناب آرزو کی طرز تحریر اور تخیل کا کسی حد تک لطف اٹھا سکتے ہیں۔ عام رنگ تو وہی ہے۔ جو تیسرے دور کے ڈرامہ نویسوں کا ہے البتہ اشعار کی وہ کثرت نہیں جو ان ڈراموں کی خصوصیت بن گئی تھی۔ اخلاقی پہلو سے پلاٹ قابل اعتراض معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ پہلے سین میں پے در پے ایسے نئے نئے کیرکٹر ظاہر ہوتے ہیں۔ جن کا تسلسل غیر مربوط نظر آتا ہے اور دیکھنے والے صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکتے ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ بہرحال جناب آرزو کی کوششیں کئی پہلو سے کامیاب ہیں۔)

ایڈیٹر

غار

(ایک حسین عورت درہ سے نکلتی ہے)

شرارہ ۔ دولت ۔ دولت ۔ دنیا کی بہترین چیز دولت جسے بادشاہ حکومت سے حاصل کرتے ہیں۔ سوداگر تجارت سے حاصل کرتے ہیں۔ مزدور محنت و مشقت سے حاصل کرتے ہیں۔ اور ڈاکو قتل و غارت حاصل کرتے ہیں مگر حسن کی یہ دولت جو اس وقت میرے قبضہ میں ہے نہ حکومت سے ہاتھ آتی ہے۔ نہ تجارت سے نہ محنت و مشقت سے ملتی ہے۔ نہ قتل و غارت سے ..... پھر کیا اس قدرتی خزانہ سے فائدہ نہ اٹھانا چاہئے۔ ان موتی سے دانتوں یاقوت سے ہونٹوں کو شرم کے صندوقچہ میں بند کر کے عصمت کا قفل لگانا چاہئے ..... کبھی نہیں۔ اگر آج میں اس کندن سے دمکتے ہوئے چہرے کو پرکھنے والی نگاہوں سے بچاتی تو ایک بادشاہ کے دل کو خرید لینے کا موقع کبھی نہ پاتی۔ اس وقت میرے حسن کا لپکتا ہوا شعلہ اس پہاڑی مکان سے نکل کر شاہی محل کی برجیوں سے ٹکرا رہا ہے۔ اور میرے بادشاہ بیگم بننے کا مژدہ سنا رہا ہے۔ مگر ہاں وہ نامہ جو میں نے بڑی کوشش سے بادشاہ کو بھجوایا ہے اُس کا کوئی بھی جواب.......

رکن السلطنت ۔ (داخل ہو کر) جواب آیا ہے۔ اور سلطنت کا وزیر جواب لایا ہے۔

شرارہ ۔ کیوں وزیر کیوں آیا ہے۔ کیا بادشاہ کے پاؤں میں مہندی لگی ہے۔ یا یہاں آنے سے انکار ہے۔

رکن ۔ یہ غلام خاص آن کا رازدار ہے۔ اور بہر جا حاضر

خدمت بجالانے کے لئے دل سے تیار ہے ٭

شرارہ ۔ محبت کا محرم راز دل کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا ؎

اکیلے ہوتی ہیں نازو نیازکی باتیں
پیام بن نہیں سکتی ہیں راز کی باتیں

رکن ۔ مگر وہ عالی مکان اس مقام پر آنے سے مجبور رہے ٭

شرارہ ۔ کیوں ؟

رکن ۔ بادشاہوں کو ہر موقع کے لئے اپنی شان وشوکت کا لحاظ ضرور ہے ٭

شرارہ ۔ بڑی شوکت ۔ بڑی شان ۔ اُس وقت شان و شوکت کا لحاظ نہ ہوا ۔ جب شکار کی تلاش میں اپنے ساتھیوں سے چھوٹ کر جنگل کی ٹھوکریں کھاتا ہوا آیا تھا ۔ اور محبت کی بھیک مانگ کر مجھے اپنے دل کا مالک و مختار بنایا تھا ٭

رکن ۔ تو اعلیحضرت نے اُس خیال کو دل سے نہیں بھلایا ہے لیجئے آپ کے ماہواری اخراجات کے لئے یہ اشرفیوں کا اک توڑا بھجوایا ہے ٭

شرارہ ۔ یہ کسی بازاری عورت کو دو ٭

رکن ۔ کیا آپ کو اس کے لینے سے انکار ہے ٭

شرارہ ۔ مجھے محبت کا گوہر بیش بہا ۔ درکار ہے ٭

رکن ۔ دیکھئے شاہی عطیہ کو شکریہ کے ساتھ لے لیجئے ۔ حقارت کے ساتھ واپس نہ کیجئے ٭

شرارہ ۔ بد تمیز ۔ گستاخ ۔ عطیہ ادنے ملازموں کے واسطے کہا جاتا ہے ۔ برابر والے کے واسطے تحفہ اور ہدیہ کہہ کر پیش کیا جاتا ہے ٭

رکن ۔ میں پھر کہتا ہوں کہ اس ضد میں نفع کے عوض نقصان اُٹھانا ہوگا ٭

شرارہ ۔ اور میں بھی جتائے دیتی ہوں کہ اگر عزت کے ساتھ نہ جاؤ گے تو ذلت کے ساتھ جانا ہوگا ٭

رکن ۔ ذلت ۔ ایک وزیر سلطنت کی ذلت ٭

شرارہ ۔ ہاں ذلت ۔ (کشتی کو ٹھوکر مارکر) بس اُٹھاؤ ۔ ہٹاؤ ۔ لیجاؤ ۔ اپنے بادشاہ سے کہدینا کہ میں وہ عورت نہیں ہوں ۔ کہ تمہارے شاہانہ رعب و داب سے دب کر رہوں گی ۔ اگر مجھ میں طاقت ہے تو اپنا پورا حق لے لونگی ٭

رکن ۔ (جاتے ہوئے) خدا خیر کرے یہ ناگن بری طرح لہراتی ہے ۔ اس کی باتوں سے بوئے شرارت آتی ہے ٭

(سپاہیوں کا کشتی اٹھا کرلے جانا ۔ شداد کا داخلہ)

شداد ۔ غصہ سے کہہ رہی ہے حرارت بڑھی ہوئی
تلوار مار بیٹھے گی تیوری چڑھی ہوئی

شرارہ ۔ ہاں آگئی ہے موت تو ٹالی نہ جائے گی
تلوار کھنچ گئی ہے تو خالی نہ جائے گی

شداد ۔ کس پر کھنچی ہے آخر کب تک کھنچی رہے گی
ہونٹوں کی بات کس سے کھل کر زباں کہے گی

شرارہ ۔ یہ بعد کو معلوم ہوگا ۔ پہلے یہ بتا کہ میں کون ہوں ؟

شداد ۔ میری جان ۔ میرا ایمان ٭

شرارہ ۔ اور اس سے پہلے کیا رشتہ تھا ٭

شداد ۔ بھاوج ٭

شرارہ ۔ بس تو شداد یاد رکھ کہ جب دو رشتے آپس میں اُلجھ جاتے ہیں ۔ تو گرہ پڑجاتی ہے ٭

شداد ۔ پھر ٭

شرارہ ۔ ایک رشتہ اپنی تلوار سے کاٹ دے ٭

شداد ۔ تو کیا اپنے بھائی کو قتل کردوں ٭

شرارہ ۔ نہیں تو خود قتل ہونے کے لئے تیار ہوجا ٭

شداد ۔ مجھے کون قتل کرنے والا ہے ٭

شرارہ - تیرا بھائی - تیرا رقیب - یہ یاد رکھ کہ اگر اس ناجائز تعلق کا بھانڈا پھوٹنے سے پہلے تو زنگ بن کر فولاد کو نہ کھا لے گا - تو ایک روز تیرے بھائی کے غصہ کا بھوت انتقام کی بھوک میں تیری ہڈیاں تک چبا لے گا ؛

شداد - مگر بھائی کھولنے والا کون ہے؟

شرارہ - میں ؛

شداد - او پتھر سے زیادہ سنگدل عورت!

شرارہ - بس ایک دل - ایک محبت!

شداد - مگر اُس محبت کا انعام!

شرارہ - اول کام بعدہٗ انعام!

شداد - نہیں نہیں ایک صرف ایک پیار!

فولاد - (داخل ہو کر) او بدکردار خبردار...... یہ کیا شیطانی ارادہ ہے ؛

شرارہ - دیکھو دیکھو یہ میری آبرو لینے پر آمادہ ہے ؛

فولاد - بول بے ایمان - ؎

پیار کے قابل ترے یا لائق عزت یہ ہے
تیری عورت ہے کہ ترے بھائی کی عورت یہ ہے

شداد - آ جائے جس کے قبضہ میں دولت اُسکی ہے
جس شخص کی بغل میں ہو عورت اُسکی ہے

فولاد - او بے حمیت ایک تو چوری - اوپر سے سینہ زوری -
فرق ڈالا حسن کا فرنے ترے ایمان میں

شداد - ؏ - رہ نہیں سکتی ہیں دو چھریاں کبھی اک میان میں

فولاد - اچھا تو ہوشیار ہو جا ؛

شداد - تو بھی خبردار ہو جا ؛

(دونوں میں تلوار چلنا شداد کا مرنا)

شرارہ - دیکھو دیکھو - تمہارے لئے یہاں ٹھہرنے میں قباحت ہے

فولاد - ہاں میں جاتا ہوں - اس لاش کو کہیں چھپا دینا اور میرے راستہ سے ٹپکتے ہوئے خون کا نشان مٹا دینا ؛

(چلا جانا)

شرارہ - ...... مٹا دونگی! اس خون کے نشان کے ساتھ تیرا نشان بھی صفحۂ ہستی سے مٹا دوں گی - کیونکہ تیری زندگی میرے راستہ کی ٹھوکر - اور تیری موت میری ترقی کے لئے اک زینہ ہے ؛

کوتوال - (داخل ہو کر) یہیں ڈھونڈھو - یہیں تلاش کرو

پیادہ - بیشک سراغرسانوں نے اُس ڈاکو کا مسکن اسی خاکو بتایا ہے ؛

کوتوال - (لاش سے ٹھوکر کھا کر) ہیں! یہ خون کس نے بہایا ہے ؛

شرارہ - یہ خون بھی اُسی ڈاکو نے بہایا ہے - جو اس سے پہلے شاہی ساز و سامان لوٹ کے لایا ہے ؛

کوتوال - وہ کہاں گیا ہے ؛

شرارہ - وہ سامنے والی پہاڑ کی گھاٹی میں چھپا ہے - زمین پر ٹپکتے ہوئے خون کا نشان صاف صاف پتہ دے رہا ہے ؛

کوتوال - (پیادوں سے) جاؤ گرفتار کر لاؤ (شرارہ سے) تو اس سراغرسانی کا انعام اچھی طرح پائے گی - اور ایک ڈاکو اور ہے جو غریب کسان کی عورت کو بھگا کر لایا ہے - اگر اُس کا نشان بھی بتائے گی تو عمر بھر کے لئے مالامال ہو جائے گی ؛

شرارہ - میں اُس کا نشان بھی بتا سکتی ہوں - بلکہ گرفتار کرا سکتی ہوں - لیکن ایک شرط سے ؛

کوتوال - وہ کیا شرط ہے ؛

شرارہ - دونوں کو علیحدہ علیحدہ قید میں رکھنا اور بادشاہ کے سامنے بھی جدا جدا پیش کرنا ؛

کوتوال۔ اس سے تیرا مطلب؟

شرارہ۔ اس میں تمہارا نقصان۔

کوتوال۔ نہیں۔ نقصان تو کچھ بھی نہیں۔

شرارہ۔ بس تو دھوکا دے کر یہاں تک پہونچا دینا میرا کام ہے مگر گرفتار کرلینا۔

کوتوال۔ میرا کام ہے۔ (کوتوال کا جانا)

شرارہ۔ اب میں مردانہ ٹھاٹھ بناتی ہوں۔ اور اپنے کو آپ گرفتار کراتی ہوں۔ فولاد تو جاتے ہی پھانسی پائے گا۔ اور میرا ہاتھ بادشاہ کے دامن تک نہیں بلکہ گریبان تک پہونچ جائے گا۔

(چلا جانا)

جذبات فراق

(از جناب رگھوپت سہائے صاحب فراق۔ گورکھپوری)

رات آدھی سے زیادہ گئی تھی سارا عالم سوتا تھا
نام ترا لے لے کر کوئی درد کا مارا روتا تھا

چارہ گرو یہ تسکیں کیسی میں بھی ہوں اس دنیا میں
ان کے ایسا درد اٹھا کب جن کو پچنا ہوتا تھا

کچھ کا کچھ کہہ جاتا تھا میں فرقت کی بیتابی میں
سننے والے ہنس پڑتے تھے ہوش مجھے تب ہوتا تھا

تارے اکثر ڈوب چلے تھے۔ رات کے رونے والوں کو
آنے لگی تھی نیند سی کچھ دنیا میں سویرا ہوتا تھا

آج فراق بہت یاد آیا غم والوں کی محفل تھی
نام دلوں کے آجاتے تھے برپا ماتم ہوتا تھا

کشش محبت

(از جناب غلام سرور صاحب - ایم اے علیگ - پروفیسر مسلم یونیورسٹی)

(آخری قسط)

کشمیر وادی میں ستمبر کے وسط سے نومبر کے آخر تک موسم خاص طور پر پُر لطف ہوتا ہے - ستمبر کے اخیر میں ہوا میں خوشگوار خنکی پیدا ہو جاتی ہے - جس کی وجہ سے لوگ پہلگام - گلمرگ سونمرگ وغیرہ بلند مقامات سے سری نگر میں آ جاتے ہیں - اور وہاں سے ہوس بوٹ لے کر دریائے جہلم میں ادھر اُدھر چلے جاتے ہیں - اسی موسم میں کشمیر کے مشہور پھل - یعنی کشمیری ناشپاتی - فرانسیسی ناشپاتی (بگو گوشہ) سیب وغیرہ بکثرت ملتے ہیں - سری نگر سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلہ پر گاندربل ایک بہت ہی پُر فضا مقام ہے - سری نگر کی گرمی اور گندگی اور وہاں کے گرد و غبار اور تعفن سے بچنے کے لئے لوگ کشتیاں لے کر اس جگہ مئی کے شروع میں پہونچ جاتے ہیں - اور اچھی جگہ پر قبضہ کر لیتے ہیں - جو لوگ کشمیر جاتے ہیں - وہ گاندربل ہفتہ عشرہ گذارنے کے بغیر شاذ و نادر ہی لوٹتے ہیں - اور بعض تو وہاں سے ٹلنے کا نام ہی نہیں لیتے کیونکہ وہاں کی ہوا لطیف - نظارہ دلفریب اور دریا کا پانی ٹھنڈا اور بالکل شفاف ہے - اس کے علاوہ اس مقام پر ایک صاف پانی کا چشمہ ہے - جس کا پانی بہت ہلکا اور ہاضم ہے دریا کے دونوں جانب دور تک سبزے کا مخملی فرش بچھا ہے سری نگر سے جاتے ہوئے داہنے ہاتھ پر گاندربل کی بستی ہے ادھر کچھ فاصلے سے چنار کے سایہ دار درخت شروع ہو جاتے ہیں سروں پر ان شاندار درختوں کا ٹھنڈا سایہ - پاؤں کے نیچے سبزے کا مخملی فرش اور سامنے دریا کا صاف اور شفاف پانی - سبحان اللہ - روح کو جو بالیدگی ایسے مقام میں نصیب ہوتی ہے - وہ ناقابل بیان ہے - معلوم ہوتا ہے کہ جسم کے ہر ایک مسام سے صحت - طاقت اور راحت جسم میں سرایت کر رہی ہے - بستی کو چھوڑ کر میلوں تک زمین کا ایک چپہ ہریاول سے خالی نہیں ملتا - دُور دُور تک ہری بھری کھیتیاں لہلہاتی نظر آتی ہیں - درخت ہوا میں مستانہ وار جھومتے ہیں - دریا کا صاف اور شفاف پانی اس طرح معلوم ہوتا ہے گویا ایک نقرئی سانپ اٹکھیلیاں کرتا ہوا مرغزار میں سے گذر رہا ہے - دریا کے اوپر کی جانب واسلے کالے کالے پہاڑ سر بفلک کھڑے ہیں - جن میں سے بعض کی چوٹیاں برف سے ہمیشہ ڈھکی رہتی ہیں - ان پر جب سورج کی شعاعیں پڑتی ہیں - تو یہ گمان ہوتا ہے کہ کسی قوی ہیکل دیو نے درخشاں تاج سر پر پہن رکھا ہے ایسے ہی دلفریب مناظر قدرت کی وجہ سے کشمیر کو جنت نظیر کہا جاتا ہے یہ تشبیہ غور کرنے والوں کو بعض اوقات کھٹکتی ہے - اگر جنت سماوی کا نقشہ اس جنت ارضی کی مانند ہے - تو اس کا ملنا نہ ملنا یکساں ہے - جنہوں نے اس جنتِ ارضی کا لطف اٹھا لیا ہے - وہ قدرتی طور پر جنت سماوی میں ایسی خوبیوں کے

متلاشی ہوں گے۔ جس سے وہ پہلے کبھی بہرہ اندوز نہ ہوئے ہوں جس کا منظر ان کی آنکھوں نے نہ دیکھا ہو۔ اور جس کا نقشہ اُن کے تصور میں نہ آیا ہو۔ وگرنہ وہ مذہبی دیوانے عیسائی ہوں یا مسلمان یا ہندو۔ یا اور جو جنت سماوی کو اپنے ہم مذہبوں کی ملکیت شمار کرتے ہیں۔ بہت بُری طرح سے مایوس ہوں گے۔ جو چیز ایک دفعہ کسی نے دیکھ لی اور اس کا لطف اٹھالیا۔ اس کی دلفریبی زیادہ نہیں رہتی وگرنہ ممکن ہے کہ وہ مسخرے جو دوزخ میں بھیجے جائیں گے محض اس خیال پر کہ ایک نئی چیز دیکھیں گے بغلیں بجائیں جس سے سزا کا مطلب فوت ہونے کا خدشہ ہے اور اگر وہاں کا نقشہ کچھ اور ہے۔ جیسا کہ ہر مسلمان کو یقین کرنا چاہئے۔ تو پھر یہ تشبیہ ناقص ہے؛

جسوقت کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُسوقت اس مقام پر کم از کم سو کشتیاں جمع تھیں۔ ان میں سے ساٹھ کے قریب اس قوم کے افراد کے استعمال میں تھیں جن کی تفریح اور عیش و آرام کے لئے دنیا بالعموم اور ہندوستان بالخصوص مخصوص ہے۔ حسب معمول انہوں نے دریا کے اوپر کی جانب چشمہ کے قریب کی بہترین جگہ روک رکھی تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی۔ کہ اپنی کشتی ان کے قریب لیجائے۔

صاحب بہادر کو "چھلے (چلے) جاؤ۔ یو کالا لوگ کا ماپھک (موافق)" کہنے کی زحمت بہت شاذ و نادر اٹھانی پڑتی تھی۔ کیونکہ ان کے بیرے۔ چپراسی۔ مانجی۔ ملازم وغیرہ ان کو اس "خدمت" سے بخوبی سبکدوش کر دیتے۔ جہاں کوئی غریب جگہ کی تلاش میں قریب بھٹکا۔ اور انہوں نے دور سے کٹکھنے کتے کی طرح غرانا شروع کیا۔ نتھنے پھلائے۔ آنکھیں نکالیں۔ دانت دکھلائے اور بھڑ بھڑا کر کشتی سے نکل آئے اور لگے پکارنے۔ چلے جاؤ۔ یہاں جھنٹ صاحب (اگینٹ صاحب) تشٹنٹ صاحب (اسسٹنٹ صاحب) یا لفٹین (لفٹینٹ صاحب) کا کشتی ہے۔ اگر صاحب بہادر کا عہدہ انہیں معلوم نہ ہو تو پھر "بڑے صاحب" کے مبہم القاب سے کام نکال لیا جاتا ہے۔ یہ الفاظ سنکر کسی غریب ہندوستانی کی کیا مجال کہ وہاں ٹھیرنے کی جرأت کرے۔ ذرا سی نارانگی پر سفید خادموں کے لکڑ توڑ جوتوں کی "سیاہ فام" مخدوموں کی ٹانگوں سے الجھ جانے کی داستانیں کسنے نہیں سنیں۔ صاحب بہادر کے رتبے اور ان کی غضبناکی میں نسبت معکوس ہے۔

"بڑا صاحب" عموماً بردبار ہوتا ہے۔ مگر "چھوٹا صاحب" خدا کی پناہ ایک میل سے کاٹنے کو آتا ہے۔ اور اگر خدا نخواستہ اس نسل کا ہو۔ جسے "دوغلا" کہتے ہیں تو اس کی تندی کا کیا ٹھکانا۔ "کالا لوگ" کی دو میل سے بُو سونگھ کر دم ہلاتا۔ اور دانت ہوا میں کٹکٹاتا ہے۔ کوئی ماں کا جایا دانتوں کی نوک سے بچا ہوگا۔ اور نہیں تو منہ کے جھاگ سے تو تواضع ضرور ہو جاتی ہے۔ اس وجہ سے جس مقام پر ان لوگوں کی کشتیاں ہوتی ہیں۔ اس کی فضا دیسیوں کیلئے مسموم ہوتی ہے۔ ہر وقت جان کا خطرہ رہتا ہے۔ اگر جگہ کا متلاشی مسلمان ہے تو دل میں سوچتا ہے کہ اللہ میاں اگر تیری بہشت میں بھی یہ لوگ پہونچ گئے۔ تو اپنا ٹھکانا نہیں وہاں بھی تحفظ حقوق جداگانہ کی درخواست دینی پڑے گی اور اگر ہندو ہوا۔ تو خیال کیا کہ بلا سے جگہ ملے یا نہ ملے۔ جان تو بچی غنیمت ہے صاحب بہادر سو رہے تھے وگرنہ معلوم نہیں کیا حشر ہوتا۔ دوسرے کنارے پر کشتی لگا کر گذارا کریں گے۔ یہ نہ ہو کہ کشمیر آئے ہیں سیر کرنے۔ کہیں بدن کو لالہ زار بنا کر نہ چلیں۔ ہندوستان کے ان حقیقی "خادموں" اور اس کو مہذب بنانے کے اجارہ داروں کی کشتیوں میں سے رات کے وقت جا بجا گانے بجانے کی

آواز آتی ہے۔ گویا دن کی محنت شاقہ کا غم غلط کیا جاتا ہو
گیا ہے۔ بیگ رقص و سرود کی محفلیں جمتی ہیں جو صبح کے دو تین بجے
سے پیشتر ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ ان کو "حوا کی بیٹیاں"
اور "آدم کے بیٹے" غسل کا لباس پہن کر دریا میں کلیلیں بھرتے
ہیں۔ دریائی گہرائی رات کی تاریکی کی طرح راز دار بنتی ہے
عورتوں کے چہرے ہاتھی دانت اور گلاب کی پتیوں کے
بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور مردوں کے چہروں کا
تو یہ عالم ہے کہ گویا ایک موٹے تازے کابلی دُنبے کا خون
ایک ایک میں بھر دیا گیا ہے۔ وہ خون جس کے ایک قطرہ کی
تلاش میں بیچارے ہندوستانی تمام جہان کی مقویات۔
ٹانک اور کشتہ جات استعمال کرتے ہیں۔ اور پھر بھی نصیب
نہیں ہوتا۔ اس کی افراط کا یہ عالم ہے کہ گویا سوئی کے
ذرا سے اشارے سے تتلی بندھ جائے گی۔ کیوں نہ ہو۔
"خادم" ہمیشہ "مخدوم" کی نسبت زیادہ مضبوط اور طاقتور
ہوتا ہے۔ اور ہونا چاہئے تاکہ شب و روز "خدمت" کر سکے
ان "خادموں" کی کشتیوں کے بعد اس قوم کے افراد کی
کشتیاں ملتی ہیں۔ جن کو ہندوستان میں اپنے تمول۔
نظام اور تعداد کی وجہ سے دن دونی رات چوگنی ترقی
حاصل ہو رہی ہے۔ ان میں سے بعضوں کی کشتیاں
ظاہری بناوٹ اور اندرونی سجاوٹ کے لحاظ سے افراد
اوّل الذکر کی کشتیوں پر بھی سبقت لے گئی ہیں۔ جس سے
ان کے مکینوں کی ثروت کا پتہ چلتا ہے۔ مگر صاحب بہادر کی
سی شان کہاں! جماعت موخر الذکر کی کشتیوں کی شناخت
کچھ مشکل نہیں۔ ان سب کی شان امتیاز ہے۔ وہ "قومی
نشان" ہے۔ جسے عرف عام میں "دھوتی" کہتے ہیں۔
اور جس کی پیتل کی گڑوی سے لازم و ملزوم کی نسبت ہے
ہندوستان کے "قومی" جھنڈے پر نہ معلوم چرخے کی تصویر
کیوں تجویز کی گئی ہے۔ بہتر ہوتا کہ اس پر ایک لہراتی ہوئی
گاڑھے کی دھوتی اور ساتھ سے بندھی ہوئی پیتل کی گڑوی کی
تصویر ہوتی۔ چرخہ "مادیت" کو ظاہر کرتا ہے۔ حالانکہ ہندو
ستان کو دنیا میں محض اپنی روحانیت کی وجہ سے امتیاز
حاصل ہے۔ اور اس روحانیت کا اظہار دھوتی اور
گڑوی سے زیادہ ہوتا۔ جو سادگی معاشرت اور ظاہری
صفائی کے نشان ہیں۔ اس کے علاوہ ان دونوں
چیزوں کا تعلق بھارت کے سپوتوں سے چرخے کی نسبت
زیادہ گہرا ہے۔ کیونکہ انکا دخل امیر۔ غریب۔ راجہ پرجا
ہر ایک کی زندگی میں ہے اور چرخے کا واسطہ محض ایک
جماعت سے۔ دھوتی اور گڑوی کا انتخاب ایک اور وجہ سے
بھی موزوں ہوگا۔ جس پر ابھی تک "لیڈروں" نے شاید
غور نہیں کیا۔ یا ممکن ہے انہیں یہ بات سوجھی نہ ہو۔ یہ
مسلمہ امر ہے کہ جب تک ہندو اور مسلمان شیر و شکر نہ ہو جائیں
ہندوستان کو کامل آزادی نصیب ہونا۔ ناممکن ہے
"یہ شیر و شکرپن" ظاہر و باطن ہر دو صورتوں میں ہونا چاہئے
اب مسلمانوں کے ہاں دھوتی کا مدِمقابل تہ بند اور گڑوی کا
مقابل مٹی کا لوٹا ہے۔ جو ان کے حصہ میں ازل سے لکھا ہے
اور ابد تک رہے گا۔ سادگی معاشرت افلاس کا دوسرا
نام ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ سگ زرد برادر شغال۔ سو یہ
نکتہ تہ بند میں ہے۔ اور گڑوی کی طرح مٹی کا لوٹا ظاہری
صفائی کا نشان ہے۔ دھوتی اور گڑوی اور تہ بند اور
لوٹے کا واللہ کیا جوڑ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے
خود ان دونوں قوموں کی مواصلت کا اہتمام کیا ہے۔

اہل ہنود کی کشتیوں کے بعد اس قوم کے افراد کی
کشتیوں کی باری آتی ہے۔ جن سے افلاس دیوی کو کچھ
بہت اُنس ہو گیا ہے۔ مگر باوجود اس کے یہ مسخرے کشمیر فرو

جا پہنچتے ہیں۔ ان کلمہ گو حضرات کی کشتیوں کی تعداد پندرہ سے زیادہ نہ ہوگی۔ ان میں سے صرف دو اچھی قسم کی ہیں باقی محض تیسرے درجہ کی بانچائی والے ڈونگے بعض ڈونگے فرنیچر سے اس طرح بے نیاز ہیں۔

بوسیدگی کا سبب اسلام سے یا افغانستان کے چند علماء کا نوزائیدان سے اور مکتبوں کی ان میں یہ کثرت جس طرح برسات میں مکھیوں اور مچھروں کی۔ پُرانے سالخوردہ نسخوں سے لے کر تازہ بتازہ گو دا ایڈیشن تک نظر آتی ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ نوبت "زیر طبع" نسخوں تک بھی پہونچتی ہے۔ گو کشتیوں کی ظاہری حالت ان کے مکینوں کی مالی حالت پر روشنی ڈالتی ہے۔ مگر اس منچلے پن کو کوئی کیا کہے جو ازل سے مسلمانوں کو سونپا گیا ہے۔ جو کلمہ گو اس وقت گنگا ندھرل میں موجود ہیں۔ انہیں پورا احساس ہے۔ کہ وہ یہاں محض "ہوا کھانے" نہیں آئے۔ لہٰذا ان کی کشتیوں کے ارد گرد مرغیوں کے پروں۔ انڈوں۔ پھلوں۔ اور سبزی کے چھلکوں کی افراط ہے۔ ان کشتیوں کے زمرے میں ایک طرف ہٹ کر ایک بہت عمدہ سیکنڈ کلاس کشتی کھڑی ہے۔ سامنے چنار کا سایہ ہے۔ کشتی کی چھت پر خوشنما پھولوں کے گملے رکھے ہیں اور اوپر سائبان ہے۔ پردے کی خاطر درخت کے سایہ کے نیچے کشتی تک تین طرف قنات لگی ہوئی ہے۔ جس کے اندر آرام کرسیاں اور چھوٹی میزیں رکھی ہیں۔ ان میں سے ایک پر تازہ پھولوں کا گلدستہ اور چند اخبارات ہیں۔ آرام کرسی پر ایک صاحب جن کی عمر چالیس برس کے قریب ہوگی۔ دراز ہیں۔ اور کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔ ان کے قریب ہی دو عورتیں بیٹھی ہیں۔ جن میں سے ایک نوخیز حسینہ ہے اور دوسری مسن عورت۔ اس کشتی سے تقریباً دس گز کے فاصلہ پر نیچے کی طرف اس قطار کی آخری کشتی ہے۔ اس کے مکیں تین نوجوان ہیں۔ جو بہت عمدہ سوٹ پہنے ہوئے کرسیوں پر چنار کے سایہ کے نیچے بیٹھے خوش گپیاں اُڑا رہے ہیں۔ ان تینوں کے خط و خال اور لباس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بفضل خدا متمول گھرانوں کے نونہال ہیں۔ چہروں پر حقیقی خوشی کی جھلک ہے۔ جو فارغ البالی اور بے فکری کا نشان ہے۔ تفکرات زمانہ کے نشانات سے ان کی پیشانیاں آزاد ہیں ایک میز پر چند ناول اور اخبارات ہیں۔ دوسری پر شطرنج تیسری پر پھل اور مٹھائی۔ قریب ہی بیڈمنٹن کا جال تنا ہے جن سے ان کے مشاغل کے دور کا پتہ چلتا ہے ؀

دن کے دو بجے کا وقت ہے۔ سورج اپنے جوبن پر ہے اس کی زریں کرنیں دریا کے شفاف پانی پر گنگا جمنی کیفیت پیدا کر رہی ہیں۔ دریا کے اوپر کی جانب "حوا کی بیٹیاں" اور "آدم کے بیٹے" دریائی رقص میں مشغول ہیں۔ کسی کو قریب جانے کی مجال اور تاب نظارہ نہیں۔ مگر دل کی وحشت اور آنکھوں کی بیتابی کو کوئی کیا کرے۔ قربت سے خطرۂ جان اور دوری باعث پریشانی۔ سچ ہے ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ ایسی سخت ضرورت کے وقت اگر آدمی کا دماغ کام نہ کرے۔ تو اس پر لعنت ہے۔ اس لئے کئی من چلے اپنی کشتی کی کھڑکیوں میں بیٹھے دوربینیں آنکھوں کو لگائے اس نظارہ سے لذت اندوز ہو رہے ہیں اور دوربین کے موجد کو لاکھ لاکھ دعائیں دے رہے ہیں۔ ممکن ہے ایسے موقع پر کئی ضعیف الاعتقاد حضرات کو حضرت سلیمان کی ٹوپی کی خواہش ہوتی ہو۔ "ہندوستانیت" اور سیاہ چمڑی ایسے موقعوں پر جس غیظ و غضب کی مورد ہوتی ہیں وہ بیان سے باہر ہے۔ ظاہری نمود و نمائش کے پرستار اپنی بے کسی اور کمزوری پر غلطاں و پیچاں ہیں۔ اس خوش نصیب

گروہ کی رنگ رلیاں ان کی اپنی فرومایگی کے احساس کو تیز کرتی ہیں۔ کبھی اپنے آپ پر نفرین بھیجی جاتی ہے اور اپنی کالی چمڑی کو کوسا جاتا ہے۔ کبھی قدرت کو بے انصافی کا مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ اور کبھی اس گروہ پر گالیوں کی بوچھاڑ کی جاتی ہے۔ جس نے اپنی طاقت اور حکومت سے دنیا کا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ اور امتیاز نسل کو فروغ دیا ہے۔

الغرض کوئی تو اس نظارہ سے اپنی آنکھیں سینک رہا ہے اور کوئی اپنا دل جلا رہا ہے۔ اور جگر بھون رہا ہے۔ جن دو کشتیوں کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک پر اشوقت رات کی سی خاموشی کا عالم ہے۔ قنات کے اندر روالی کرسیاں خالی پڑی ہیں۔ کشتی کی کھڑکیوں پر پردے کھچے ہوئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سو رہے ہیں۔ دوسری کشتی میں تینوں نوجوان غسل کا لباس پہن کر دریا میں تیرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک تو بالکل تیار کھڑکی کے پاس دوسروں کا منتظر کھڑا باہر جھانک رہا ہے۔ دوسرے اپنا لباس پہن رہے ہیں۔ اتنے میں ساتھ والی کشتی سے کسی بچے کی دلخراش چیخ سنائی دی۔ اور ساتھ ہی کسی وزن دار چیز کے دریا میں گرنے کی آواز آئی یہ چیخ اور آواز کے سنتے ہی کھڑکی والا نوجوان پانی میں بے تحاشا کودا۔ دریا کا بہاؤ چونکہ اس کی طرف تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس سے تھوڑی دور کوئی چیز بہتی ہوئی آ رہی ہے۔ ایک لمحہ کے بعد ایک بچے کا سر پانی کی سطح پر ابھرا اور پھر غائب ہو گیا۔ نوجوان چونکہ بہت ہی مشاق تیراک معلوم ہوتا ہے۔ دو چار ہاتھ مار کر اس جگہ پہونچ گیا۔ اور ڈوبنے والے کو بالوں سے پکڑ کر پانی کی سطح سے اوپر کیا۔ اتنے میں اس کے دونوں ساتھی بھی آگئے تینوں ملکر بے ہوش بچے کو باہر کنارے پر لے آئے۔ اور اسے گھاس پر اوندھا لٹا دیا۔ ساتھ والی کشتی میں ہنگامہ محشر برپا تھا۔ عورتوں کے نالے دلوں کو ہلاتے تھے۔ آس پاس کی کشتیوں میں اس واقعے کی خبر بجلی کی طرح پھیل گئی جس سے اس جگہ ایک مجمع ہو گیا۔ کشتی میں جو صاحب رہتے تھے وہ اپنے نوکروں کے ہمراہ بھاگتے ہوئے آئے۔ حواس باختہ تھے۔ چہرے پر وحشت چھائی ہوئی تھی۔ اس وقت اتفاق سے ایک ہندو ڈاکٹر موقعہ پر آگئے۔ انہوں نے بچے کی نبض دیکھ کر تسلی دی کہ بچے کو بہت جلد ہوش آ جائے گا۔ بیہوشی زیادہ تر خوف کی وجہ سے تھی نہ کہ کسی جسمانی صدمے کی وجہ سے جب انہوں نے بچے کو سیدھا کیا۔ تو اس کا چہرہ دیکھ کر وہ نوجوان جس نے سب سے پہلے پانی میں کود کر اسے پکڑا تھا پکار اٹھا۔ "ہیں نسیمہ"

بیوی اور بچوں کی لاہور روانگی کے بعد ڈپٹی محمد حسین خاں صاحب دورے میں بیمار ہو گئے۔ انہیں کبھی کبھی درد گردہ کی شکایت ہو جایا کرتی تھی۔ لیکن اب کی مرتبہ بہت ہی شدید حملہ ہوا۔ ملازم انہیں بڑی دقت سے دہلی لائے جب افاقہ ہوا۔ تو ڈاکٹروں نے رائے دی کہ دو ماہ کے لئے کشمیر چلے جائیں۔ ورنہ احتمال ہے کہ صحت ہمیشہ کے لئے خراب ہو جائے۔ مجبوراً چھٹی لے کر روانہ ہوئے۔ اور لاہور سے بچوں کو لے کر گاندھربل آگئے۔ ان کو یہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوا تھا۔ کہ یہ حادثہ ہوا۔ نسیمہ کو سخت ہدایت تھی کہ کشتی کے کنگرے پر جو جانب دریا تھا نہ بیٹھے۔ نوکروں کو بھی تاکید کر دی گئی تھی۔ کہ اس کا خیال رکھیں۔ مگر بچپن آخر بچپن ہے۔ ایک مصنف کا قول ہے۔ اگر کسی بچے کو کسی دروازہ کے کھولنے کی ممانعت کر دی جائے تو دنیا کی کوئی طاقت اس کے استعجاب اور اس کی یہ دریافت کرنے کی خواہش کو۔ کہ اس دروازے کے پیچھے کیا ہے

نہیں دبا سکتی۔ ایک روز دوپہر کے وقت جب سب سو رہے تھے تو وہ اپنے کھلونے لے کر چپکے سے کشتی کے کنگرے پر جو دریا کی جانب تھا۔ آبیٹھی۔ اور کھیل میں ہمہ تن مشغول ہو گئی ہاتھ کا جھٹکا لگنے سے ایک کھلونا پانی میں گرا۔ وہ اس کو پکڑنے کیلئے لپکی تو بے اختیار پانی میں گر گئی۔ بادی النظر میں اس کا پانی میں گرنا ایک "اتفاق محض" ہے۔ مگر اس "اتفاق" کو دوسرے "اتفاقات" کے پہلو بہ پہلو رکھنے سے اس خیال کا بطلان ہوتا ہے اس آخری واقعہ کے ذریعہ سے قدرت کو اس زنجیر کی تکمیل منظور تھی۔ جسے وہ ابتک بناتی رہی ہے۔ اور جس سے اسکو دو نفوس کو جکڑنا تھا۔ نسیمہ کا دہلی کے سٹیشن پر ہجوم میں کھو جانا اور شوکت کا اسے اس کے لواحقین تک پہونچانا۔ شوکت کا چور کو مغلوب کرکے زیورات اور نقدی کا صندوقچہ واپس دلانا۔ ڈپٹی صاحب کی اچانک بیماری اور ان کا بچوں کے ہمراہ سفر کشمیر اور قیام گاندھربل۔ شوکت کا تمام وادی کشمیر کی سیر کرنے کے بعد گاندھربل میں ڈپٹی صاحب کی کشتی کے قریب آکر مقیم ہونا۔ نسیمہ کا دریا میں گرنا اور اس کا اسے نکالنا۔ کون ان سب واقعات کو "اتفاقات محض" سے تعبیر کرسکتا ہے۔ یہ تمام فی الحقیقت ایک خاص مقصد کی تکمیل کے مختلف اسباب تھے۔ قدرت اپنا کوئی کام "اتفاق" پر نہیں چھوڑتی۔ بلکہ اسکا ہر قدم طے شدہ انداز پر اٹھتا ہے وہ پہلے سے مقرر شدہ شاہراہ پر گامزن ہوتی ہے چونکہ کوئی طاقت اس کی سد راہ نہیں ہوسکتی۔ لہذا وہ جو کچھ ایک دفعہ ٹھان لے پورا ہو کر رہتا ہے۔ ہر کام کا انجام اس کی منشا کے مطابق لازمی ہے۔ عدم میں اس نے شوکت اور نسیمہ کے خمیر میں محبت کی چنگاری ڈالدی تھی۔ اس چنگاری کے دونوں ٹکڑوں کو جو ان کے دلوں میں ڈالدیئے گئے تھے۔ مقررہ وقت پر ایک دوسرے سے ملنے کی خواہش ہوئی۔ قدرت نے ان کے مواصلت کے لئے اسباب مہیا کئے۔ قدرت اسی طریقہ سے اپنے پروگرام کی تکمیل کرتی ہے جن دو نفوس کی یکجائی اسے مطلوب ہوتی ہے۔ چاہے انکی حیثیت وحالات ظاہری میں بعد المشرقین ہو۔ مگر ان کی مواصلت ضروری ہے۔ اس کا قانون اٹل ہے۔ اس کی طاقت غیر محدود۔ اس کے ذرائع بے شمار۔ اور اس کے ڈھنگ نرالے ہیں۔ اس کلیہ کے تحت میں یہ سب واقعات کوئی نیرنگی معلوم نہیں ہوتے۔ قادر جیسے قریبی عزیز کو حالات و اسباب پیدا کرکے راستہ سے ہٹانا اور شوکت جیسے اجنبی شخص کو اسقدر قریب لانا اس کا اصل مقصد تھا جو اس نے ان واقعات سے پورا کیا۔

اس واقعہ کے دوسرے روز نسیمہ شوکت اور اس کے دوستوں کے لئے پھل۔ پھول اور مٹھائی لے کر آئی۔ ڈپٹی صاحب کو جب اپنی بیوی کی زبانی یہ اتفاقات معلوم ہوئے تو انہوں نے شوکت کا بہت شکریہ ادا کیا۔ ان تینوں کو کھانے پر بلایا۔ ان کو ان سے خاصکر شوکت سے بہت انس ہوگیا۔ دن کا بیشتر حصہ چاروں بحث ومباحثہ سیر و تفریح میں گذارتے۔ کھانا عموماً ایک جگہ کھاتے۔ نسیمہ ان تینوں دوستوں کے لئے بہت ہی شغل و مسرت کا باعث تھی۔ اس کی پیاری پیاری باتیں اور بھولی بھالی صورت ان کو لبھاتی۔ گھنٹوں وہ اس سے بچوں کیطرح کھیلتے رہتے۔ جب ڈپٹی صاحب کی رخصت ختم ہوئی۔ تو روانگی کے وقت انہوں نے ان تینوں کو دہلی آنے کی دعوت دی۔ چونکہ شوکت کو ادھر سے ہو کر جانا تھا۔ اس لئے واپسی پر اس نے ان کے ہاں ایک ہفتہ قیام کیا۔ ڈپٹی صاحب نے اس کی خاطر و مدارات میں کسر نہ اٹھا رکھی۔ دونوں خاندانوں میں جب تعلقات بڑھے تو

آخر اس بات کا فیصلہ ہو گیا جس کے لئے قدرت نے سب جال پھیلائے تھے۔ شادی کے چند روز بعد شوکت نے سلیمہ سے کہا۔ پیاری سلیمہ۔ تم مجھے بتا سکتی ہو کہ تمہارے دل میں میری محبت کب سے پیدا ہوئی؟

جواب۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔ خاموشی۔

شوکت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہی سوال۔

سلیمہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ خاموشی۔

شوکت۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہی سوال۔

سلیمہ۔ (لجا کر) جب سے۔۔۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ خاموشی۔

شوکت۔۔۔۔۔ ہاں۔ ہاں کہو کب سے؟

سلیمہ۔ جب سے آپ کو سٹیشن پر سلیمہ کو گود میں اٹھاتے ہوئے دیکھا۔

شوکت۔ میں بتاؤں مجھے تم سے محبت کب سے ہے؟

سلیمہ۔ فرمائیے۔

شوکت۔ ازل سے۔

(نام و مقام فرضی ہیں)

(ختم شد)

غلام مردد

غزل

نگہ کے بعد ان کی جو ادا ہے	شہیدانِ نگہ کا خونبہا ہے
یہ تمکیں آزمائی۔ بیوفا! کیوں؟	کہ خود داری کا یاں کب ادّعا ہے
تجاہل سے نہ سمجھے ہو تو پوچھو	کبھی مجھ سے کہ ہاں کیا مدعا ہے
مرے ہی گمشدہ دل کا یہ خوں ہے	ستمگر! جسکو تو سمجھا حنا ہے
تغافل جاں گسل۔ عشوہ قیامت	نگہ قاتل۔ جفا صبر آزما ہے
دہن اک رازِ سربستہ تھا تیرا	خموشی ٹوٹنے پر اب کھلا ہے

سراج۔ اس عہد میں تقلید غالب
تجھے سرمایۂ نازش بجا ہے

(سراج مچھلی شہری)

بہار

(از جناب سید عابد علی صاحب عابد بی اے - ایل - ایل - بی)

لالۂ رنگیں سے روشن ہے شبستانِ بہار
لالۂ رنگیں کہ ہے شمع فروزانِ بہار

پتہ پتہ بن گیا تصویر عریانِ بہار
عالمِ ایجاد میں جاری ہے فرمانِ بہار

باغ کی دوشیزہ کلیاں ہیں کہ حورانِ بہار
دامنِ جنت سے ہے دامانِ گل افشانِ بہار

آہ یہ سیلاب رنگ و بو یہ طوفانِ بہار
گلکدوں میں رقص کرلیں نازنینانِ بہار

کاش ہر اک پھول سے پیدا ہو خوشبوئے وفا
کاش میرے خون سے رنگیں ہو دامانِ بہار

بادۂ رنگیں فروغِ حسن - نورِ ماہتاب
مل گئے آخر کو اجزائے پریشانِ بہار

بمکھائی غنچے کے آنچل ہیں دوشِ ناز پر
کوئی دیکھے تو خرامِ گلفروشانِ بہار

اس تکلف اس لطافت سے چلی بادِ نسیم
نغمہ پیرا ہو گئی اک موجِ رقصانِ بہار

ابتدائے فصلِ گل ہے مست کردے ساقیا
ایک موجِ بیخودی ہو زیبِ عنوانِ بہار

پھول چمکے لالہ زاروں میں ستاروں کی طرح
انجمستاں بن گئی بزمِ چراغانِ بہار

میرے دردِ عشق کا آغاز ہے داغِ خزاں
تیرے رنگِ حسن کا انداز ہے جانِ بہار

ہائے حسن سرو قامت پر زمرد کا لباس
رنگ افزائے جنوں ہیں سبز پوشانِ بہار

خوشۂ پرویں گل مہتاب باغ آسماں
ہو رہا ہے چاندنی راتوں میں سامان بہار

چاندنی پھیلی تو ذرے بن گئے چاندی کے پھول
مخزنِ انوار ہے ماہِ درخشانِ بہار

نیلوفر نیلم ہے عابد موتیا الماس ہے
کیا مرصع ہے جواہر سے گریبانِ بہار

فردوس آزادی کی التجا

جہاں کہ قلب اسیرِ غمِ گداز نہ ہو
جبیں رہینِ غمِ آستانِ ناز نہ ہو

شرابِ علم میں رقصاں ہو رنگِ آزادی
جہاں حیاتِ شہیدِ مئے مجاز نہ ہو

ہر ایک لفظ میں پنہاں صداقتِ دل ہو
تپش حیات کی محرومِ سوز و ساز نہ ہو

جہاں نہ نذرِ بیاباں ہو آبجوئے حیات
جہاں کہ نفسِ تخیل سے بے نیاز نہ ہو

اسی بہشت میں میرے وطن کو کر بیدار
مرے خدا وہ کبھی محوِ خوابِ ناز نہ ہو

(ٹیگور) (عزیز احمد)

چاند سے خطاب

اے قمر اے بادیہ پیمائے صحرائے فلک
شاید اس تنہا فلک گردی سے اب تو تھک گیا

بزمِ انجم میں ترا ہمدم نہیں رہبر نہیں
یعنی ہر کوکب ہے ناجنس اور چشمِ بے ضیا

آب چوں در روغن افتد نالہ خیزد از چراغ
صحبتِ ناجنس باشد باعثِ آزارہا

(شیلے) عزیز احمد

دل!

تری افسردگی بھی نغمہ پیمائے صداقت ہے
تری پژمردگی میں رازِ تکمیلِ محبت ہے

جو سچ پوچھو تو سرتاپا تو ہی چشمِ بصیرت ہے
تری تعمیر سے مقصود اظہارِ حقیقت ہے

ترے ہر پردے میں ہے آرزوئے دیدِ حق مضمر
مگر باطل کے ہنگاموں کو کیوں تجھ سے زینت ہے

کبھی خود حسن تیرا، وکبھی تو حسن کی علت
یہ ربطِ ہمہ گر سرمایۂ تشہیرِ وحشت ہے

شجاعت خون بن کر دوڑتی ہے تجھ سے رگ رگ میں
ترا ہی ذرہ ذرہ تشنۂ جامِ شہادت ہے

ترا جوشِ ترنم ہے وجودِ محویت اے دل!
تری ہر لے سے پیدا نغمۂ شیرینِ وحدت ہے

ترے جود و سخا کی ہیں شرر انگیزیاں یہ بھی
مرا ہر اشکِ دیدہ بھی ترا ممنونِ منت ہے

وہ از خود رفتگی تیری وہ تیرا رقص ہے کیسا؟
جو تجھ میں موجزن ہنگامۂ جوشِ مسرت ہے

تری تقریب کیا تیری قرابت ہو گئی ظاہر
تری تخلیق کیا جب خود سراپا تو قدامت ہے

تری ہی ہیں کرشمہ سازیاں ہر دم تغیر کن
غرض نعمت ہے تو میرے لئے نعمت ہی نعمت ہے

(سید امین حسن شارق

اودے پور

(ایک سیاح کے قلم سے)

اس مضمون میں اس ہندوستانی ریاست کی جغرافیائی۔ یا تاریخی اہمیت، دکھانا مقصود نہیں۔ بلکہ ان فطری مناظر پر ایک طائرانہ نگاہ سے پرواز کرنا ہے جنہوں نے اسے وسط ہند کی دیگر ریاستوں کو دلھن بنا دیا ہے۔ مشہور فرانسیسی سیاح پیرلوٹی نے جس کا ہندوستان کا سفر ۱۹۰۲ء میں اختیار کیا تھا اپنی خوبصورت کتاب "ہندوستان انگریزوں کے بغیر" میں اس ریاست کا ذکر نہایت دلکش انداز میں کیا ہے۔ جسے پڑھ کر ہر ایک دل میں اسے دیکھنے کی گدگدی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اودے پور کے ذکر سے پیشتر مشہور قلعہ چتوڑ گڑھ کا ذکر کر دینا ضروری ہے۔ جو راستے میں آتا ہے۔ اور جہاں رانی پدمنی نے اپنے تئیں خود آگ کی نذر کر دیا تھا ہے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس واقعہ میں کہاں تک اصلیت ہے کیونکہ تاریخ ہند کے متعلق اسقدر واقعات کا انکشاف ہو رہا ہے کہ تاریخ کے کسی باب کے متعلق وثوق کے ساتھ کچھ کہنا مشکل ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ علاء الدین خلجی پدمنی پر عاشق ہو جاتا ہے راجہ اور پدمنی کی رضامندی سے اس کا زاہد فریب چہرہ آئینہ میں دیکھتا ہے۔ عشق کی آگ اور بھی بھڑک اٹھتی ہے۔ آخر چتوڑ گڑھ کا محاصرہ کر لیا جاتا ہے۔ راجپوت ہزیمت اٹھاتے ہیں علاؤالدین محل میں داخل ہوتا ہے تو اپنی محبوبہ پدمنی کی بجائے خاک کا ڈھیر صحن میں پڑا پاتا ہے۔ پدمنی کا پتہ پوچھنے پر ایک بڑھیا اس خاک کی ایک مٹھی ہوا میں اڑا دیتی ہے۔ چتوڑ گڑھ کا قلعہ جو ایام رفتہ کی عظمت کا نوحہ خواں ہے قابل دید ہے۔ اسلامی محلات کے کھنڈرات جس سمت اور ہندوؤں کے مندروں کی شکستہ دیواریں ہر طرف بکھری پڑی ہیں۔ کہیں کہیں ان کی مرمت بھی کی گئی ہے۔ اسلامی محل کی ایک محراب بالکل نئی بنائی ہوئی نظر آتی ہے۔ مشہور مینار فتح کو بھی نئے سرے سے قائم کیا گیا ہے جینیوں کے مندروں کے کھنڈرات اور شکستہ دیواروں سے ان کے مذاق کا پتہ چلتا ہے۔ ایک مندر پر جس کا فرش سنگ مرمر کا نہایت خوبصورت گنبد بنا ہوا ہے۔ جس میں مینا کاری کی گئی ہے۔ دیواروں پر مختلف تصاویر ہیں جن میں ناچنے والی عورتوں کی تصویریں خاص طور پر نمایاں ہیں۔ جینیوں کا ایک اور مندر بھی نہایت دلفریب ہے۔

اسکی تعمیر اس طرح کی گئی ہے کہ روشنی اور تاریکی دلکش تناسب سے اندر آتی ہے۔ ان مندروں میں عام طور پر گنیش جی کی مورتی پائی جاتی ہے۔ یہ وہی دیوتا ہے جسے ہم ہاتھی کے سر کے ساتھ دیکھتے ہیں۔

راجپوتانہ لیکن جنگجوؤں کے ملک میں عام طور پر مال تجارت اسلاح تلواریں۔ تلواروں کے دستے۔ نیزے۔ چھڑیاں۔ برچھیاں وغیرہ ہی ہیں۔ اودے پور میں وہاں کی بنی ہوئی تصاویر بھی فروخت ہوتی ہیں۔ یہ زیادہ تر ہاتھیوں۔ چیتوں اور مہاراجوں کی ہوتی ہیں۔

صبح صادق کے وقت دور سے اودے پور کے شہر کا نظارہ نہایت دلفریب اور سحر کار ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے طویل سفید رنگ محل اپنے صبح کے نیلگوں سایوں کے ساتھ سفید شہر پر حکومت کر رہا ہے۔ شہر کے مغرب کی پچولا جھیل سے بھی یہ نظارہ نہایت دلربا ہوتا ہے۔ یہ جھیل بھی کچھ کم دلفریب نہیں۔ دوپہر کے وقت اس کی چمک نہایت خیرہ کن ہوتی ہے۔ درمیان میں سنگ مرمر کے

جزیرے آگ کے شعلوں کی طرح چمکتے ہیں - پانی کی ہلکی ہلکی موجیں ان کے زینوں پر آکر ٹکراتی ہیں - اور سنگترے کے گھنے درختوں کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتی ہوئی واپس چلی جاتی ہیں - شہر کے ارد گرد اونچی نیچی پہاڑیاں ہیں - جن پر سورج غروب ہوتے ہی تاریکی چھا جاتی ہے ؛

اودے پور کی ایک اور دلکش اور قابل دید جگہ وہ والی باغ ہے - جہاں شاہی خاندان کے مردوں کو جلایا جاتا یا جلائے جانے کے بعد ان کی خاک کو دفن کیا جاتا ہے - اس کے چاروں طرف بلند دیواریں بنی ہوئی ہیں - اور درمیان میں پروقار گنبد دار سمادھیں ہیں - اودے پور کے کوچہ و بازار بھی کچھ کم کیفیت انگیز نہیں - کہیں کہیں بازاروں پر محرابیں بنائی بنائی گئی ہیں - شہر کا بڑا بازار بھی اسی بلندی پر واقع ہے - جس پر محل کھڑا ہے

محل کے نزدیک ایک بلند سیڑھیوں والا عظیم الشان مندر ہے - جسے جگر ناتھ کا مندر کہلاتا ہے - یہ بھی جینیوں کی عبادتگاہ ہے - سیاحوں کو صحن کے گرد چکر لگانے اور دیواروں کی تصاویر دیکھنے کی اجازت ہے - صحن کے دروازے ایلورا کے غار کی طرح دونوں طرف پتھر کے دو ہاتھی کھڑے ہیں - دروازے کی محراب پر جس کے آراستہ کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا - وشنو کی مورتی رکھی ہے - مندر کی دیواروں کی میں کھدی ہوئی تصاویر نہایت عجیب و غریب سے نیچے ہاتھیوں کی قطاروں کی تصاویر ہیں - ان کے اوپر گھوڑوں کی جن پر زین وغیرہ رکھی ہوئی ہیں - لیکن سواروں کا نشان نہیں اس کے اوپر کا حلقہ انسانی تصاویر کا ہے - اور اس کے اوپر رقاصہ عورتوں کا جینیوں کے مندر میں رقاصہ عورتوں کی تصاویر ضرور پائی جاتی ہیں - محل کے اندرونی صحن پر زینوں پر چڑھ کر جانا ہوتا ہے - ہر ایک زینے میں تقریباً نو دس انچ کا فاصلہ ہوتا ہے صحن کی دیواروں پر بھی قدیم زمانے کی تصاویر کھدی ہوئی ہیں

ہاتھیوں کو مع ساز و سامان کے آراستہ دکھایا ہے - محل کے دیگر کمروں میں بھی جن کی سفید دیواروں پر مختلف رنگ کے پتھروں سے مینا کاری کی گئی ہے - تصاویر بنی ہوئی ہیں - کہیں پھول پتے اور کھجور کے درخت بھی بنے ہوئے ہیں - پھول اور پتے مختلف رنگ کے شیشوں کے ہیں - یہی پھول پتے محرابوں پر بھی پائے جاتے ہیں - دیواروں پر کاغذ کی بنی ہوئی دلکش اور خوبصورت تصاویر بھی آویزاں ہیں ان کے فریم سونے کے ہیں -

محل کی دوسری جانب جھیل کی آئینہ گوں سطح ہے جس کی آغوش میں سنگ مرمر کے دلفریب جزیرے واقع ہیں - ان جزیروں کے ایوانوں پر بھی شاندار گنبد بنے ہوئے ہیں - جھیل میں پہاڑیوں میں غروب ہوتے آفتاب کا نظارہ بھی بہت صبر آزما ہوتا ہے - جھیل کے ایک جزیرے پر جگمندر کی شاندار محل ہے - اسکے ارد گرد پرستان کی مانند سنگترے اور دیگر ثمردار درخت حلقہ کئے ہوئے ہیں - محلوں اور جواہر نگار کمروں کو دیکھ کر بالکل یہی محسوس ہونے لگتا ہے - کہ وقت کی رو مستقبل کی بجائے ماضی کیطرف الف لیلیٰ کے ماحول میں بہائے لئے جا رہی ہے -

اس جگہ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ جگمندر وہی جگہ ہے جہاں شاہجہاں اس زمانے میں رہتا تھا - جب وہ جہانگیر سے بغاوت کر کے بھاگا تھا - اس جزیرہ کے علاوہ اور کئی جزیرے سبز سبز درختوں کی آغوش میں واقع ہیں - لیکن خوبصورتی اور دلفریبی میں جگمندر سب کا سرتاج ہے - اس کا سنگ مرمر کا فرش - مرمریں دیواریں مرمریں دریچے - سفید محرابیں سب نے ملکر اس کی دلکشی اور دلفریبی کو چار چاند لگا دیئے ہیں - کیلے اور سنگترے کے گھنے اشجار و نیز ایک عجیب کیفیت پیدا کر دیتے ہیں - یہ ایوان اندر سے بھی بہت دلکش ہے - لیکن یہاں ہر ایک کو جانے کی اجازت نہیں اس کے ایک کمرے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں ایک فرانسی آرٹسٹ نے رنگ سازی کی ہے ؛

"ایک سیاح"

پیامِ اقبال

بملازمانِ سلطاں خبرے دہم ز رازے
کہ جہاں تواں گرفتن زنوائے دلگدازے

بہ متاعِ خود چہ نازی کہ بشہرِ دردمنداں
دلِ غزنوی نیرزد بہ تبسمِ ایازے

ہمہ نازِ بے نیازی ہمہ سازِ بے نوائی
دلِ شاہ لرزہ گیرد زگدائے بے نیازے

زستیزِ آشنایاں چہ نیاز و ناز خیزد
دلکے بہانہ سوزے نگہے بہانہ سازے

رہِ دیر تختۂ گل زجبینِ سجدہ ریزم
کہ نیازِ من نہ گنجد بدو رکعتِ نمازے

زتغافلِ تو خامم برہِ تو ناتمامم
من و جان نیم سوزم تو و چشمِ نیم بازے

(پیامِ مشرق)

پسِ پردہ

متحرک تصاویر کا اثر اخلاق پر

متحرک تصاویر کے متعلق اکثر خیال کیا جاتا ہے کہ ان کا اثر اخلاق پر بہت تخریب کن ہوتا ہے اور اس کے ثبوت میں جرائم پیش کیا جاتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ مغرب کے زندان خانوں میں اسوقت ان لوگوں اور خصوصاً نوجوانوں کی کثرت ہے۔ جن کے پابند سلاسل ہونے کی وجہ محض سینما ہے۔ ماضی قریب کا ہی واقعہ ہے کہ یورپ کی ایک عدالت میں مجسٹریٹ کے سامنے ایک ملزم نے ارتکاب قتل کے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے صفائی میں یہ امر پیش کیا تھا کہ عین ارتکاب جرم کے وقت شہرہ آفاق ایکٹر لان چینی کا خوفناک چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آگیا تھا۔ اور اسپر وہ تمام کیفیات طاری ہو کر ارتکاب جرم کا باعث ہوئی تھیں۔ جو سینما کے تاریک کمرے میں اس ایکٹر پر طاری و ساری دکھائی گئی تھیں۔ اس نے بیان کیا کہ اس نظارے کے تصور سے اس کے دل میں قتل کی زبردست خواہش پیدا ہو گئی۔ اور اس نے مجنونانہ طور پر اس کا ارتکاب کر لیا۔ اس سے اس کی مراد محض ان جذبات کی تشنگی کو بجھانا تھا جو اس کے دل میں پیدا ہو گئے تھے۔ اس خاص بیان کے علاوہ مغرب کی عدالتوں میں خوفناک جرائم کے مقدموں میں یہ الفاظ عام طور پر سننے جاتے ہیں کہ "میں نے یہ سینما میں دیکھا تھا" اور یہ الفاظ بعض اوقات ملزم کی بریت یا سزا کی تخفیف کا باعث بھی ہوتے ہیں ؀

بالکل اس کے برعکس اس خیال کو بھی نہایت شد و مد کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ سینما کی تخلیق کا مقصد محض اصلاح اخلاق ہے اور سینما کی تصاویر کے ذریعہ ان اصول اخلاقیات کی اشاعت کی جا سکتی ہے جن کی ترویج بصورت دیگر ناممکن یا محال ہے اس میں شک نہیں کہ پردے پر خوفناک جرائم چوری۔ ڈاکہ۔ قتل و غارت کے واقعات بھی دکھائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے۔ کہ یہ دکھا دیا جائے کہ ان کی پاداش کیا ہے اور یہ کہ ان کا انجام کسقدر عبرت انگیز ہوتا ہے۔ چوری یا قتل کے واقعات میں دکھایا جاتا ہے کہ چور یا قاتل خواہ کسقدر ہی عیار اور چالاک کیوں نہ ہو۔ وہ پولیس کی گرفت سے نہیں بچ سکتا اور آخر اپنے جرم کی سزا بھگت کر ہی رہتا ہے۔ بعض اوقات خودکشی کے واقعات بھی دکھائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کا وقوع پذیر ہونا بھی ملامت نفس یا ایثار کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور اس ایثار یا قربانی اور ملامت نفس کا اثر ذہن پر خودکشی کے واقعہ سے کہیں زیادہ اہم اور دیرپا ہوتا ہے۔ ڈاکو کے لباس میں ایک ایسے کیرکٹر کو پیش کیا جاتا ہے جو امیروں کا تو جانی دشمن ہوتا ہے لیکن غریبوں کی دستگیری کو ہر وقت اپنا فرض اول خیال کرتا ہے۔ ثبوت کے طور پر "رابن ہڈ" کا مشہور فلم پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس میں ڈوگلس فرنیکس کا ایکٹنگ اسقدر پر اثر ہوتا ہے کہ نوجوانوں کے دلوں میں بھی وہی امنگیں اور ولولے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور یہی ولولہ انگیزی ان کی آئندہ زندگی کی اولوالعزمی اور بلند حوصلگی کا

باعث ہوتی ہے۔ یہ امر دیگر ہے کہ بعض لوگ سرے سے ہی اس اصول کے خلاف ہوں لیکن کم از کم ایک جماعت تو یہ عقیدہ رکھتی ہے۔ کہ امیروں کے مال و دولت کو جو غریبوں کا خون چوس چوس کر ان پر طرح طرح کے ستم توڑ کر جمع کیا ہوا ہوتا ہے۔ تاخت و تاراج کیا جائے اور غربا کی اس سے مدد کی جائے۔ کسی کے نزدیک یہ عقیدہ یا اس عقیدہ کی تصویر مخرب اخلاق ہو۔ لیکن اس کے حامیوں کے نزدیک تو اس کا مقصد سوسائٹی کے ایک غلط نظام یا اخلاق کی اصلاح ہے*

ان دو خیالات کے لوگوں کے علاوہ ایک تیسرا گروہ ہے جس کا خیال ہے۔ کہ سینما کی تصاویر نہ مخرب اخلاق ہیں نہ اصلاح اخلاق کا ذریعہ بلکہ ان کا مقصد صرف تفریح طبع اور فرصت کے لمحوں کا ایک دلچسپ مشغلہ مہیا کرنا ہے۔ تاکہ میدان زندگی میں دن بھر کی کدو کاوش کے بعد شام کے وقت تفکرات کا ازالہ کیا جا سکے اور دماغ کو کچھ راحت مل سکے*

ہرچند یہ گروہ سینما کے مخرب اخلاق یا اصلاح اخلاق کے لئے مفید ہونے سے انکار کرتا ہے۔ لیکن وہ اس امر کا اعتراف ضرور کرتا ہے۔ کہ اس کا اثر طبیعت پر اندوہ ربا ہوتا ہے۔ اور اس سے اس غم و تفکر کا ازالہ ہو جاتا ہے جو زندگی کی مشکلات سے ہمارے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر وہ اس امر کو تسلیم کرتا ہے۔ کہ سینما کی تصاویر اصلاح اخلاق کا ذریعہ ہیں۔ کیونکہ اس سے قنوطیت کے جانسوز جذبات کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہمارے خیال میں اس گروہ کو کوئی علیحدہ حیثیت نہیں دی جا سکتی ہے بلکہ اس کو ثانی الذکر گروہ کے ساتھ ہی شمار کیا جا سکتا ہے۔ جس کا خیال ہے کہ سینما اصلاح اخلاق کا ایک کامیاب ذریعہ ہے۔ لیکن اس مضمون میں ہمیں یہ دکھانا مقصود نہیں کہ ان دونوں میں سے کون سا فریق حق بجانب ہے۔ کیونکہ سینما کے مخرب اخلاق یا اصلاح اخلاق کا ذریعہ ہونے کا انحصار زیادہ تر اس کی نوعیت افسانہ کے پلاٹ اور بہت حد تک تماشائی کی ذہنیت پر ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کا اثر اچھا یا برا کس قدر پائدار اور دیرپا ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تھیٹر کے تاریک کمرے میں پردے پر تصاویر کے رقص کا اثر طبیعتوں پر فلسفہ و اخلاق کی کتابوں کی نسبت زیادہ عمیق ہوتا ہے۔ اور اکثر اوقات وہ بات جو دل میں کافی مطالعہ کے بعد بھی جاگزیں نہیں ہو سکتی۔ تاریک کمرے کے مختصر سے لمحوں میں کالنقش فی الحجر ہو جاتی ہے اکثر اوقات مشاہیر اہل قلم کے شاہکار جن کے پڑھنے اور سمجھ کر ذہن نشین کرنے کے لئے ایک مدت درکار ہوتی ہے۔ نہایت تھوڑے عرصہ میں پڑھے اور دیکھے جا سکتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ آج سے پانچ سال پیشتر میں نے ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی کو جس کے پڑھنے کے لئے ایک مدت درکار ہے صرف تین گھنٹوں میں ہیلن آف ٹرائے کے فلم میں دیکھ لیا تھا۔ اور نقش اولیں کچھ عرصہ بعد جب میں نے اس نابینا شاعر کی اصل تصنیف کا مطالعہ کیا۔ یہ ہی راہنمائی کا موجب ہوا۔ صرف یہی نہیں بلکہ بجائے اس کے کہ میں آج سے تین ہزار قبل کے تہذیب و تمدن کی کتب کا مطالعہ کرتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس زمانہ کی معاشرت کو دیکھ لیا۔ یہی امر بالکل رامائن یا مہابھارت کے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ ان ضخیم کتابوں کا مطالعہ کرنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہو سکتا لیکن انکا فلم دیکھنے سے کم از کم ہر ایک شخص یہ جان سکتا ہے کہ ہندوستان قدیم کے عظیم الشان راہنما سری کرشن جی مہاراج اور مہاراجہ رامچندر کی زندگی میں اس کے لئے کیا اسوہ ہے۔ اور وہ ان کے اخلاقی تصورات پر عمل پیرا ہو کر آج اس روشنی کے زمانہ میں بھی کہاں تک کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ سینما کی تعلیمی اہمیت کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان دو کتابوں کے فلم دیکھنے سے اس زمانے کی معاشرت سے بھی ایک حد تک آگاہی ہو جاتی ہے۔ فلموں کے تعلیمی پہلو کو صرف تاریخی اہمیت تک ہی محدود نہیں کیا جا سکتا

بلکہ وہ ہر شعبہ علم و فن میں راہنمائی کر سکتے ہیں۔ افریقہ کے گھنے جنگلوں کی نیم وحشی اقوام کو ان کے قومی اور فطری ماحول میں دیکھا جا سکتا ہے۔ کارخانہ قدرت میں قوائے فطرت کو جو خاموشی کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائگی میں لگے رہتے ہیں۔ مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ سائنس کے دقیق سے دقیق عمل دیکھے جا سکتے ہیں نفسیات کے عمیق مسائل کی گتھیوں کو سلجھایا جا سکتا ہے لیکن یہاں میں اس کی تعلیمی اہمیت سے بحث نہیں کروں گا۔ اس کے لئے ایک مستقل مضمون کی ضرورت ہے۔ جو امید ہے آئندہ کسی محفل میں قارئین کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ لیکن اس کو اخلاق سے مختلف نہ خیال کرنا چاہئے۔ کیونکہ اصلاح اخلاق کی نوبت صحیح تعلیم کے بعد ہی آتی ہے۔ اور فلم کا اصلاح اخلاق کا اثر اس کے تعلیمی اثر کے بعد شروع ہوتا ہے۔ تقریباً دو سال کا عرصہ ہوا۔ امپیریل تھیٹر لاہور میں ایک ہندوستانی فلم کمپنی کا فلم "چیہ و تار" دکھایا گیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ فلم کی تیاری میں بہت سی بے عنوانیوں کا ارتکاب کیا گیا تھا۔ اور مناسب اور موزوں ایکٹروں کی قلت نے اس کو بہت حد تک مضحکہ خیز بنا دیا تھا۔ مثلاً وہی ایکٹر جو اوتار کا پارٹ ادا کرتا تھا۔ دوسرے وقت میں اس وقت کا راجہ بنکر بیٹھ جاتا تھا۔ راجہ کے دربار میں جس طوائف کا رقص ہو رہا تھا۔ اس کے نہایت بدصورت اور اسکے انداز نہایت بھونڈے تھے۔ رانی بجائے نسوانیت کے بجائے ایک پیلتن پہلوان معلوم ہوتی تھی۔ پھر بھی با ایں ہمہ جو اخلاقی سبق وہ فلم تماشائیوں کو دینا چاہتا تھا۔ اس میں وہ ایک حد تک کامیاب تھی۔ سر دربار رانی کی تقریر جہاں ایک طرف مہاراجہ کو ظلم و ستم کے قلع قمع پر آمادہ کرتی تھی۔ وہاں تماشائیوں کے دلوں میں بھی جرات و بہادری کے جذبات ایک ہنگامہ برپا کر دیتے تھے۔ یہ فلم دیکھنے سے تو صاف طور پر یہ سبق ملتا تھا۔ کہ دنیا میں بڑے آدمی کی آمد اسوقت ہوتی ہے جب ہر چہار طرف سیاہ کاری اور ہنگامہ پستی کا اندھیرا چھایا ہوا ہوتا ہے۔ لہذا عقیدہ کے مطابق اس وقت وہ نور مطلق خود انسانی جسم میں جنم لیتا ہے اور ذلیل ... یت کو قعر ذلت سے نکال کر بام عروج پر پہنچاتا ہے۔ ملکہ یہی کیفیت لائٹ آف ایشیا دیکھنے سے دلوں پر طاری ہو جاتی ہے۔

اس فلم میں گوتم کی للی یشودھرا کا پارٹ۔ مس سیتا دیوی ادا کرتی ہیں۔ ... گوتم ... حسن مجسم رانی اور اپنے نوزائیدہ بچے کو چھوڑ کر نکلتا ہے۔ اور شاہی محل کے در و دیوار پر حسرت سے نظر کرتا ہے۔ اسوقت دلوں پر دنیا کی بے ثباتی قطعی طور پر واضح ہو جاتی۔ اور اس گلستان رنگ و بو کی ہر شے ناپائدار نظر آتی ہے۔

میں ایک ایسے نوجوان شخص کو جانتا ہوں۔ جس کے دل میں اس فلم کو دیکھ کر انیس سال کی عمر میں ہی دنیا سے کنارہ کش ہونے کا خیال پیدا ہو گیا۔ اور اس نے یہانتک ترقی کی کہ اس نے تعلیم کو بالکل ترک کر دیا۔ اور اپنے والدین کو مجبور کر دیا۔ کہ وہ اس کی شادی کو کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کر دیں۔

جن لوگوں نے ڈی ڈبلیو گرفتھ اور ڈوروتھی گش کے فلم "ڈینٹن" آف دی سٹارم کو دیکھا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرانس کے فرقہ امرا کے متعلق دلوں میں کس نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور عوام کے ہنگامے کیسقدر حق بجانب اور جائز سمجھے جانے لگتے ہیں۔ مجلس عدالت میں ڈانٹن کی تقریر دلوں کو ہلا دیتی ہے۔ اور ڈانٹن بتاتا ہے کہ انقلاب کے حقیقی معنی کیا ہیں۔ اس کے سحر آفریں الفاظ سے مادام رولاں کے وہ اشعار یاد آ جاتے ہیں۔ جو وہ قتل سے پیشتر آزادی کے مجسمے کو دیکھ کر کہتی ہے۔ آہ۔ کیا کیا جرائم ہیں جن کا ارتکاب آزادی کے نام پر کیا جاتا ہے۔ ڈانٹن یہی بتاتا ہے کہ آزادی کا مقدم کیا ہے اور اس کے حصول کے بعد قوم کس آزمائش میں

پڑ جاتی ہے۔ فلم کی ہیروئن کے۔ مجلس امرا میں یہ الفاظ کہ کیا ان لوگوں میں کوئی بھی شریف آدمی نہیں اور ہوقت ایک نوجوان امیر نمودار ہوتا ہے۔ اور تلواروں کے سائے میں اسے اس مجلس عیش سے نکال لے آتا ہے۔ اسوقت نوجوانوں کے دل میں شرافت اور صنف نازک کی ہمدردی کے جو جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کی اہمیت کا اندازہ لگانا مشکل ہے *

انگلینڈ میں کچھ عرصہ ہوا "ڈان جان" کا فلم دکھایا گیا تھا۔ اس میں "ہیرو" کا پارٹ جان بیری مور ادا کرتا ہے "ڈان جان" کی فراخ مشربی کو دیکھ کر نوجوانوں کو رشک آتا ہوگا۔ اور وہ خیال کرتے ہوں گے کہ ڈان جان کی بجائے خود ہوتے لیکن اس ہیرو کی طبیعت میں ایک عجیب سوز و گداز بھی پیدا ہو جاتا ہے طبیعت عمل پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ مجھے ایک تماشائی نے فلم کے وقفے میں کہا "میں ڈان جان ہوں۔ ڈان جان"۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے کیرکٹر نے لوگوں کے دلوں پر کسقدر اثر کیا ہوگا ظالم اور جابر شاہ روم اور اس کی پر کالہ آتش بہن کے کیرکٹر کو دیکھکر ان کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے ڈان جان کی ہیبت افزا صورت مجھے کبھی فراموش نہ ہوگی وہ نظارہ کسقدر قابل عبرت ہے جب اس کی محبوبہ کی شادی کے گھنٹوں کی آواز کلیسا سے آتی ہے اور وہ اپنے تئیں ایک کمرے میں بند کر لیتا ہے۔ گھنٹوں کی آواز برابر آئے جاتی ہے۔ اس کو بالکل سکون میسر نہیں ہوتا ہے آخر وہ ایک طویل تلوار اور اپنی ابروؤں پر شکنیں لئے ہوئے باہر نکلتا ہے اور پیہم جنگ و جدل اور شمشیر باری کے ساتھ اپنی محبوبہ کو لے بھاگتا ہے۔ اسوقت نوجوانوں کو اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ محبت کے لئے اپنے تئیں کسقدر موت اور ہلاکت کے منہ میں ڈالدینا روا ہے۔ اور فتح ہمیشہ حقیقی محبت کی ہوتی ہے *

ماری کوریلی کا ناول "سارو ز آف سیٹن" ایک قابل قدر شاہکار میرے خیال میں ہر ایک نوجوان مرد اور عورت کو ایک بار ضرور پڑھ لینا چاہئے طبیعت پر اس کے اخلاقی اثر کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا فلم بھی تیار کیا جا چکا ہے۔ جیافرے ایک نوجوان ہے جس پر شیطان اپنا سایہ ڈالتا ہے۔ اور اسے صادق محبت کے راستے سے برگشتہ کر کے اوباشی اور عیاشی کے راستہ کو لے جاتا ہے۔ یہاں سے اس کے غم و الم کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کی روح سوسائٹی کی رنگین لیکن تنگ فضاؤں میں گھبراتی ہے۔ اس کا دم گھٹتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ یہاں محبت کا جذبہ مفقود ہے ہر طرف خود غرضی اور خود پرستی کی حکومت ہے۔ اس کی محبوبہ جو اس کی برگشتگی کا باعث ہوتی ہے کسی اور سے محبت کرنے لگتی ہے بلکہ اس پر منکشف ہو جاتا ہے۔ اس سے محض اس لئے محبت کی گئی تھی کہ "شیطان" سے آرزو کی تکمیل ہو سکے۔ ماری کوریلی کا شیطان بھی انسانی ہے۔ وہ ملٹن کے لوسیفر یا ڈانٹے کے منبع ظلمت کی مانند نہیں بلکہ وہ ہماری سوسائٹی میں ہمارے درمیان رہتا ہے۔ اور ہمیں راہ حق سے برگشتہ کرتا ہے۔ اس فلم کا آخری سین بھی ناقابل فراموش ہے۔ جیافرے کی نیک دل محبوبہ جو اپنا سب کچھ اس کے لئے نثار کر دیتی ہے۔ بستر مرگ پر پڑی ہے۔ اس کے دل میں جیافرے کا تصور ہے۔ شیطان آ کر اس کو بھی بہکاتا ہے۔ لیکن کامیاب نہیں ہوتا۔ دوسری طرف جیافرے بدی کی تاریکی سے گھبرا کر بھاگتا ہے۔ شیطان اس کا تعاقب کرتا ہے۔ اور اسے کسی جگہ چین نہیں لینے دیتا۔ آخر وہ اس جگہ آتا ہے۔ جہاں اس کی محبوبہ بیمار پڑی ہے۔ آہ یہ شخص سیاہ کاریوں اور جفا پیشیوں کے بعد آتا ہے اور نیکدل لڑکی اس کو واپس لینے کے لئے تیار ہوتی ہے *

بازآ - بازآ - ہر آنچہ کردی بازآ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست
صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

جماعت اس کی طرف بڑھتا ہے - اس کے ہر چہار طرف تاریکی ہوتی ہے - بدی بڑھی چلی آتی ہے - جفا رسیدہ لڑکی وحشت بھری نگاہوں سے دیکھ کر اس کا سر چھاتی پر رکھتی ہے ظلمت رک جاتی ہے کیونکہ روشنی کی حکومت ہوتی ہے - شیطان دروازے پر کھڑا انتظار کرتا ہے کہ لڑکی کہتی ہے -

"تیری بادشاہت آئے" - "ان الملک للہ"

شیطان فرار ہو جاتا ہے - یہ سین اطالوی شاعر گیٹے کے شاہکار فاؤسٹ کے بالکل اس سین کے مماثل ہے - جہاں مارگریٹ نمودار ہوتی ہے میں نظر آتی ہے - فاؤسٹ ایک طرف کھڑا ہے - اس اثنا میں گیٹے کا شیطان "میفسٹوفلیس" نمودار ہوتا ہے اور مارگریٹ پکار اٹھتی ہے کہ اس کا یہاں کیا کام ہے - یہ جگہ تو مقدس ہے - یہاں نور کی حکومت ہے - ظلمت یہاں غلبہ نہیں پا سکتی - اور شیطان بھاگ جاتا ہے ؛

گیٹے کے فاؤسٹ کا فلم بھی اپنی اہمیت اور درس آموزی کے لحاظ سے کچھ کم نہیں ہے - مجدد العصر علامہ اقبال نے صرف ایک شعر میں وہ سب کچھ کہدیا ہے - جس کو اس ڈراما میں دکھایا گیا ہے

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

آہ کسقدر ترغیب و تحریصات ہوتی ہیں - نیکی کے راستے میں فاؤسٹ خدا کے نیک بندے کی گمراہی کا باعث کیا ہوتا ہے اور تاریکی نور سے دست و گریباں ہو کر تھوڑی دیر کے لئے کسطرح اس پر چھا جاتی ہے لیکن فتح اس میں آخر نور کی ہی ہوتی ہے -

مجھے ایک اور فلم یاد ہے - غالباً اس کو روس پروپیگنڈے کے جواب میں بنایا گیا ہے - لیکن میرے خیال میں اشتراکیت کا مخالف ثابت ہونے کی بجائے وہ اس کا حامی ظاہر ہوتا تھا - فلم کا نام محب وطن تھا - اس میں زار روس کا پارٹ ایمل جیننگ کرتا ہے زار روس کی مجنونانہ حرکتوں اور اس کی بے عنوانیوں کو اسطرح آشکار کیا گیا تھا - کہ لوگ ہر قسم کے انقلاب کو حق بجانب خیال کرنے لگتے تھے - اور طبیعت پر ایک غیر فانی نقش قائم ہو جاتا تھا - شہنشاہیت میں اس عقیدے کو خاص اہمیت دی جاتی ہے کہ بادشاہ خدا کی طرف سے ہوتا ہے - چنانچہ زار روس کا تعاقب کیا جاتا ہے - اور وہ محل میں تنہا ہوتا ہے تو وہ بھاگ کر اپنے آبا و اجداد کے تخت پر چڑھ جاتا ہے اور با آواز بلند کہتا ہے - "کون ہے جو مجھے آسمانی حقوق سے محروم کر سکتا ہے" -

اس وقت ان تمام امرا کی گردنیں جھک جاتی ہیں جو بغاوت پر آمادہ ہوتے ہیں - لیکن ایک سپاہی آگے بڑھتا ہے جس کو ایک بار زار روس نے بے وجہ مارا تھا - اور اس کی گردن پکڑ کر گلا گھونٹ دیتا ہے - زار کی موت بہت دردانگیز ہوتی ہے - دل پہلوؤں میں خون ہو جاتے ہیں - قاتل کے منہ پر قتل کی سیاہی نمودار ہو جاتی ہے - اس سے کہیں زیادہ دردناک سین وہ ہے جہاں محب وطن کونٹ پیلن اپنے تئیں اس سپاہی سے ہلاک کرا دیتا ہے - وطن کی محبت میں وہ زار روس کو قتل کراتا ہے - لیکن زار کے سے دوست کے بعد وہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر دیتا ہے ؛

اس فلم میں ایک دوست اور ایک محب وطن کے کیریکٹر کو اسطرح دکھایا گیا ہے کہ اس کی مثال کسی اور جگہ ملنی دشوار ہے کونٹ کی دوستی اس کے جذبہ حب الوطنی پر غالب نہیں آ سکتی اور اس کا حب الوطنی کا جذبہ بعد میں اس کی دوستی کے جذبات کو مردہ نہیں کر سکتا - اور کونٹ اپنی زندگی کو دوستی کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیتا ہے ؛

(حفیظ ہاشمی)

رسائل کی ڈائری

شادی خانہ آبادی

مشہور انگریزی رسالہ ایشیا بابت ماہ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں ایک دلچسپ مضمون "میرے دیور کی دلہن" شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کی مصنف کلکتہ کے متمول زمیندار کی لڑکی اور مجسٹریٹ کی بیوی شدھا منرودار ہیں۔ اس مضمون میں انہوں نے ذاتی تجربات بیان کئے ہیں کہ انہیں اپنے دیور کی لئے دلہن انتخاب کرنے میں کس قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اور یہ امر کس قدر مشکل تھا کہ وہ اس کے لئے ایک [illegible] بیوی کا انتخاب کر سکیں۔ ہم ذیل میں اس مضمون کا ملخص پیش کرتے ہیں:۔

آہ۔ وقت کس تیز رفتاری سے گزر جاتا ہے۔ یہ کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ جب میں شرم سے سہمی ہوئی گھونگھٹ نکالے اپنے سسرال آئی۔ جب میں مکان میں داخل ہوئی۔ شگون کے طور پر مجھ پر زیورات پھول اور چاول نچھاور کئے گئے۔ اور منہ دکھائی کی رسم بڑی شان و شوکت سے ادا کی گئی۔ جب میں گھر کی عورتوں میں سہمی بیٹھی تھی۔ ایک ننھا سا لڑکا آیا۔ میرے پاؤں کو چھو کر ایک قیمتی گلوبند زبردستی میرے ہاتھ میں دے کر بھاگ گیا۔ مجھے بتایا گیا یہ میرا چھوٹا دیور ہے۔ اس کی عمر قریباً نو سال تھی اور میں بارہویں کو ختم کرکے تیرہویں میں تھی۔ ہم عمری اور کم سنی کی وجہ سے اس وقت سے ہی اس کی محبت میرے دل میں جاگزیں ہو گئی۔ میں اس کو اپنے بھائی کی طرح پیار کرتی تھی ہم اکٹھے کھیلا کرتے۔ پتنگ اڑاتے ہم کھیل کھیل میں اپنے باغ کے صحن میں چلے جاتے اور گولیاں کھیلتے۔ میرا ننھا سا بھتیجا باغ کے دروازے پر کھڑا ہو کر پہرہ دیتا۔ اور جب کوئی غیر مرد آتا نظر آتا تو فوراً اپنی چچی کو خبردار کر دیتا اور وہ باغ کے اندر جا چھپتی۔ لیکن آہ۔ وہ دن بھی آیا جب میں باہر نہ نکل سکتی تھی۔ میں گھر میں رہتی اور اپنے گھونگھٹ میں سے اپنے دیور کو تمام ان مشاغل میں محو دیکھتی جن میں کبھی میں بھی اس کی رفیق ہوا کرتی تھی۔ اس وقت میرا دل بچپن کی آرزوؤں اور امیدوں سے بھر جاتا اور ماضی کی تصویر اپنی تمام تر دلکشی کے ساتھ میری آنکھوں میں پھر جاتی۔ آہ یہ ایام بھی گزر گئے۔

اس بات کو پندرہ سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے میرا دیور جب کھڑا ہوتا ہے تو مجھ سے بھی کئی انچ اونچا ہوتا ہے۔ میں اس کو اب بھی اسی طرح پیار کرتی ہوں اور اسے بھی مجھ سے وہی محبت ہے۔ لیکن اب اس کی شادی کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس نے انتخاب کی تمام ذمہ داری مجھ پر رکھ دی۔ اور میری ساس نے بھی ان امور کو مجھ پر چھوڑ دیا۔ ہماری اپنی ذات کے لوگوں میں سے متواتر رشتوں کے پیام آتے تھے۔ اور چونکہ میں ان باتوں سے بالکل ناآشنا تھی۔ اور یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ میں نہ جانتی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ آجکل سوسائٹی میں اپنی دلہن خود انتخاب کرنے کا رواج ہو چلا ہے۔ لیکن میرا دیور اس کو پسند نہیں کرتا۔ اسے مجھ سے اس قدر محبت اور بھروسہ ہے۔ میں جانتی ہوں لڑکی میں تین صفات کا ہونا ضروری ہے۔ قابلیت، حسن، خاندانی نجابت اور جنم پتری کا [illegible] کے مطابق ہونا ہے۔ پہلے تین صفات کا نظر انداز کر دینا ممکن ہے۔ لیکن بنگالی ہندوؤں میں آخری صفت کا ہو[نا] ہر حالت میں لازمی ہے۔ دولت و ثروت، حسن، حفظ صحت قابلیت و ذہانت کے ہوتے ہوئے بہترین رشتے محض

اس وجہ سے وجود میں نہیں آتے کہ لڑکے اور لڑکی کی
جنم پتری آپس میں نہیں ملتی۔ یہ ایک طویل کاغذ پر زعفران
سے سنسکرت میں لکھی ہوتی ہے اور پیدائش سے لیکر
تادم مرگ کے تمام واقعات خوشحالی و مصیبت کامیابی
اور ناکامرانی و دولت و افلاس۔ تندرستی اور بیماری
سفر، شادی، بچوں، تمام کا ذکر ہوتا ہے۔ جنم پتری کے
مقابلہ کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دونوں کے واقعات
زندگی کو دیکھا جائے کہ ان میں کہاں تک مماثلت پائی جاتی
ہے۔ اس سے ہمارا مقصد ہوتا ہے شادی کے بعد کی زندگی
خوشی اور مسرت سے لبریز ہو +

جب رشتہ کا پہلا پیغام آیا میں مضافات کلکتہ
میں تھی۔ اور اتفاق سے انفلوئنزا سے بیمار پڑی تھی۔ میرا
خاوند دو دن کی چھٹی لے کر آگیا تھا جس لڑکی سے رشتہ
کی تجویز ہو رہی تھی وہ بردوان کے کسی مشہور و معروف
ڈاکٹر کی لڑکی تھی اور کہا جاتا تھا وہ بہت حسین تھی لڑکی
والوں نے ہمیں تار دیا کہ وہ لڑکی کو لے کر باغ عدن کے
نواح کو جا رہے ہیں اور وہاں ہمارا انتظار کریں گے۔
میرا خاوند لڑکی کے حُسن کا شہرہ پہلے ہی سُن چکا تھا
اس لئے اُس نے مجھے مجبور کیا کہ میں لڑکی کو دیکھنے
جاؤں۔ مجبوراً مجھے جانا پڑا۔ کیونکہ جب وہ لوگ ہمارے
لئے باغ میں آئے تھے۔ تو اُن کو مایوس کرنا مناسب نہ
تھا۔ چنانچہ میں نے اپنی والدہ اور اپنی دو بھاوجوں کو
ساتھ لیا اور باغ عدن کو چلی گئی۔ ابھی ہمیں گئے ہوئے
تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ ایک کرائے کی موٹر کچھا کچھ
بھری ہوئی آئی اور ہم سمجھ گئے کہ وہ لوگ لڑکی کو لے کر
آ رہے ہیں۔ میرا خاوند ہم سے علیحدہ ہو گیا۔ اور اُدھیڑ
عورتوں کے پاس جو مرد تھے پیچھے رہ گئے۔ اور باقی خواتین
آہستہ آہستہ ہماری طرف بڑھیں۔ اُن کے درمیان میں
ایک نوعمر لڑکی ارغوانی رنگ کی ساری میں ملبوس تھی جس کے
متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ حُسن و لطافت میں یکتا ہے مجھے
اُسے دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی۔ اُس کی عمر تقریباً چودہ سال
تھی۔ گول چہرہ۔ چھوٹی چھوٹی گہری آنکھیں۔ چپٹی ناک
باریک ہونٹ اور اونچے نیچے دانت۔ اس کے بال جلدی
میں سنوارے گئے تھے۔ اور وہ لاابالی سے بنارس کی
ایک بیش قیمت ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ اس کے ساتھ
کی عورت جس کو چار بچے لپٹے ہوئے تھے اُس کی ماں
تھی۔ آداب مجلس کے لحاظ سے میں نے اپنے انداز
اطوار سے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں لڑکی کو ناپسند کرتی
ہوں۔ لیکن اُن لوگوں نے ہماری نگاہوں سے بھانپ لیا کہ
ہمیں یہ رشتہ پسند نہیں۔ چنانچہ شرفا کے دستور کے مطابق
اُنہوں نے مجھ سے "نہیں" سننے کی زحمت گوارا نہ کی۔
لیکن میں حیران تھی کہ اس لڑکی کو کس طرح حسن مجسم کہا گیا
تھا۔ بعد میں مجھے بتایا گیا کہ رشتہ کرانے والے ہر ایک
لڑکی کے متعلق یہی کہتے ہیں کہ وہ حسن صورت و سیرت میں
اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ کیونکہ ہر رشتہ ہونے پر اُن کو دونوں
طرف سے کافی انعام مل جاتا ہے +

میں نے اور میرے خاوند نے تین اور خوبصورت
اور شریف خاندان کی لڑکیوں کے متعلق سنا اور وہ تحقیق کر کے
گھر آگئے۔ پہلی لڑکی کو ہم اسی شام کلکتے پہنچ کر وکٹوریہ میموریل
میں ملے۔ غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی کرنیں وکٹوریہ
میموریل کی مرمریں سیڑھیوں پر تڑپ رہی تھیں۔ آنکھوں
پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہم نے ہر چہار طرف نظر دوڑائی۔
اور لوگوں کے ہجوم میں اپنے ملاقاتیوں کو تلاش کرنے
کی کوشش کی۔ خوش قسمتی سے میرا خاوند لڑکی کے

کے بھائی کو پہچانتا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ میرے خاوند کے پاس آگیا اور ہم عورتوں کے پاس چلے گئے۔ لڑکی گلابی رنگ کی ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ وہ دلہن کی طرح موتیوں اور ہیرے کی مالا پہنے ہوئے تھی لیکن آہ مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرانی ہوئی کہ اُس کا رنگ قدرے سیاہ تھا۔ ہم لوگوں کے معیارِ حسن میں نکھرے ہوئے رنگ کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ اس کے نقش و نگار متناسب تھے۔ لیکن ٹھوڑی نیچی ہونے کی وجہ سے چہرے میں دلکشی اور دلفریبی نہ تھی۔ لڑکی کے ساتھ اُس کی دادی اور ماں تھیں دادی ہمارے ساتھ نہایت خوش خلقی سے پیش آئی۔ لیکن لڑکی کو بات کرنے کا کوئی موقعہ نہ ملا۔ میں نے والد اور بھاوجوں کو دادی کے ساتھ باتیں کرنے میں چھوڑا خود سنگ مرمر کی سیڑھیوں کی تعریف کرتے ہوئے لڑکی کو ساتھ لے کر ذرا دور نکل گئی۔ افسوس لڑکی کو میں نے کچھ زیادہ دلکش نہ پایا وہ زیادہ بات نہ کرتی تھی۔ میرے تمام سوالات کا جواب "ہاں" یا "نہ" میں دینے پر اکتفا کرتی۔ وہ پھولوں کو پسند کرتی تھی اُس نے رنگون کے ایک شوالے کے باغ میں ہی تعلیم پائی تھی۔ اسکول میں اُس کا دل خوب لگتا تھا۔ رنگون بھی اسے پسند تھا۔ لیکن کلکتہ اُس کو زیادہ اچھا لگتا تھا۔ وہ سنیما بھی جاتی تھی۔ جیکی کوگن کا پارٹ اُسے بہت بھاتا تھا۔ گانے سے اُسے محبت ہے اور وہ ٹیگور کی گیتان جلی کے گیت خاص طور پر گاتی تھی۔

پندرہ منٹ میں میں نے معلوم کر لیا کہ اسکا مذاق کیسا ہے۔ لیکن بہت سست معلوم ہوتی تھی اور دانتوں میں پیس پیس کر بات کرتی تھی۔ اس کی ذہنی قابلیت بھی اسقدر نہ تھی جسقدر مجھے توقع تھی۔ اس کے علاوہ چہرہ بھی دلفریب نہ تھا۔

اس بار مجھ سے پوچھا گیا کہ لڑکی کے متعلق میری کیا رائے ہے۔ میں حیران تھی کیا جواب دوں کہ خوش قسمتی سے وہ لوگ اور بات پوری ہوئے بغیر ہم جدا ہو گئے۔ بعد میں میں نے اُنہیں خط لکھ دیا کہ ہمیں ذرا کم عمر لڑکی چاہئے کم عمری کا بہانہ کیا بہتر ہو دل موتا ہے۔ کیونکہ چہرے مہرے یا رنگ کے متعلق کچھ کہنے سے خاندان کی بڑی بدنامی ہوتی ہے اور آئندہ رشتہ کرنے میں مشکلات کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

تیسری لڑکی جسے مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ میری بھاوج کی رشتہ دار تھی۔ ہم اُن کے گھر گئے اُنہوں نے کھانے اور مٹھائی سے ہماری خاطر تواضع کی۔ یہ لوگ بہت خوش خلق اور شریف تھے۔ میں نے ایک لڑکی کو گہرے رنگ کے کپڑے پہنے فرش پر بیٹھے دیکھا اس کا رنگ بھی گورا تھا لیکن نقش و نگار منگولوں کے سے تھے جب وہ مجھے سلام کرنے کھڑی ہوئی وہ قد میں مجھ سے بھی نکلتی ہوئی تھی میں نے اُس وقت کچھ کہنا مناسب نہ جانا میں عجیب مشکل میں تھی۔ ان لوگوں نے ہماری خاطر مدارات میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا تھا۔ اس صورت میں منہ پر انکار کس طرح ہو سکتا تھا۔

شیر افگن کا قتل اور جہانگیر

(جناب مولانا عبدالباری صاحب آسی)

کسقدر تعجب کی بات ہے کہ جہانگیر کی سوانح حیات میں سے جو واقعہ سب سے زیادہ مشہور اور زبان زد خلائق عالم ہے اس کی بنا کذب و افترا پر ہے۔ اس کے شباب کا افسانہ عشق اور نورجہاں کے تیر نظر سے مجروح ہو کر شیر افگن کو قتل کر کے اس کو اپنی حرم میں داخل کرنا ایک ایسا واقعہ بن چکا ہے۔ جس کی صحت کے متعلق آج شاید کسی کو بھی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو لیکن جسقدر بھی اس واقعہ پر غور کیا جائے اسی قدر ہی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ کہ یہ کسی مناسب افسانہ طراز دماغ کی اختراع ہے جس کو بعد کے موخین نے بلا کسی قسم کے غور و خوض کے تسلیم کر لیا اور اسپر ان مزید الفاظوں کی بنا رکھی جو آج جہانگیر کے متعلق مشہور ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مہرالنسا اپنی ماں کے ساتھ شاہی محل میں جاتی ہے۔ اس وقت اس کی عمر چار پانچ سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اسوقت جہانگیر کی عمر غالباً سات یا آٹھ سال ہوگی۔ اب ہر صاحب عقل سلیم فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس عمر میں عشق و محبت کا کسقدر امکان ہو سکتا ہے۔ اور کیا یہ ممکن ہے سات سال کا شہزادہ شادی کی ضد کر کے بیٹھ جائے۔ اور اکبر سا جہاندیدہ فرمانروا اس معاملہ کو اسقدر اہم سمجھے کہ کم عمر مہرالنسا کی شادی فوراً علی قلی خاں سے کر دی۔

دوسرا امر جس پر غور کرنے سے واقعہ کی حقیقت آشکارا ہو سکتی ہے۔ یہ ہے کہ جہانگیر ۱۶۰۵ء میں سریر آرائے حکومت ہوتا ہے اور مہرالنسا سے اس کی شادی ۱۶۱۱ء میں ہوتی ہے۔ اسی مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنے عرصہ جہانگیر کیا کرتا رہا۔ اگر اسے اپنی ہوس رانیوں کی تکمیل ہی مقصود تھی۔ تو اس نے فوراً علی قلی خاں کو کیوں نہ مروا دیا۔

اس کا جواب غالباً یہ دیا جائے گا۔ کہ موقع کا منتظر تھا یا نہیں تھا۔ تو اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص عالم شہزادگی میں ہی ابوالفضل جیسے مقتدر اور ذی اثر حاکم کو مروا سکتا ہو تو ایک معمولی شخص کو جو راستہ کا پتھر سمجھ کر ہٹا نہ سکتا تھا۔ پھر جہانگیر صرف ایک عیش پرست عادل و نیک مزاج بادشاہ ہی نہیں تھا۔ وہ ایک قابل اور مورخ بھی تھا۔ اچھی بری باتیں وہ اپنے تزک میں نہایت بے غرضی اور غیر جانبداری کے ساتھ لکھتا ہے۔ جہاں وہ ایک طرف ابوالفضل کے قتل کے واقع کو فخریہ بیان کر سکتا ہے۔ تو شیر افگن کے واقعہ کو چھپانا ایک امر محال نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ تاریخ فرشتہ کا مصنف مولانا ذکاءاللہ مولف کارنامہ جہانگیری۔ مولف ما جہانگیری اور بعض یورپی مورخین اس واقعہ کا ذکر تک نہیں کرتے۔

جہانگیر بر سر حکومت ہوتے ہی علی قلی خاں کو شیر افگن کا خطاب دیتا ہے۔ اس سے بھی یہ واقعہ خلاف عقل ثابت ہوتا ہے کیونکہ رقیب کو اسقدر لطف و نوازش کا سزاوار نہیں گردانا جا سکتا۔

اصل واقعہ ہے کہ شیر افگن نے حکومت بردوان کی عنان حکومت ہاتھ میں لیتے ہی رعایا پر ظلم و تعدی کا باب وا کر دیا تھا اور اس کے ظلم و ستم کی داستانیں دربار تک پہنچنے لگی تھیں۔ جہانگیر نے قطب الدین خاں حاکم بنگالہ کو تحقیقات کا حکم دیا اور شیر افگن نے یہ دیکھ کر کہ اب اس کی بے اعتدالیاں اور بے عنوانیاں طشت از بام ہونے والی ہیں۔ قطب الدین کے قتل کی سازش کی

سالنامہ خریدنے کا ڈرامہ

اگر آپ مایوس ہونا نہیں چاہتے۔ تو فی الفور آرڈر بھیج دیجئے۔ تاکہ آپ کی کاپی محفوظ کر لی جائے۔ اور بذریعہ وی۔ پی آپکے مکان پر مع محصولڈاک [illegible] میں بھیجدی جائے۔ اگر ابھی تک آرڈر نہیں دیا تو آج ہی لکھئے:

مینیجر رسالہ نیرنگِ خیال بارودخانہ لاہور

سالنامہ کی درجنوں خصوصیات میں سے صرف دو پر ایک طائرانہ جھلک

اقبال تاثیر جوش
عزیز صفی افسر
جگر یگانہ فراق
ریاض جلیل ظریف
رواں بسمل ذوقی
یلدرم مجذوب تپش
تمام شعراء کا
کلام تازہ ۔ غیر مطبوعہ
سالنامہ کی
زینت ہے ؛

سالنامہ نیرنگ خیال کا تصویری مرقع
مختصر بیان

ٹائیٹل ۔ ۵ رنگ کا بلاک (رنگیں)
شمع فروزاں ۔ چغتائی کا شاہکار (چار رنگ رنگین بلاک)
پیشکش ۔ فرانسیسی مصور کا لاجواب کارنامہ (پانچ رنگ کا رنگین بلاک)
جنت ارضی ۔ ایک بنگالی مصور کا کمال (تین رنگ کا 〃 〃 〃)
محمل لیلےٰ ۔ ایک دہلوی مصور کا شاہکار (〃 〃 〃 〃 〃)
تخیلات شباب ۔ جوانی کی راتیں اور (چار رنگ کا 〃 〃 〃)
نگاہ ناز ۔ راجپوت اور مغل طرز کی ملاوٹ ۔ (تین رنگ کا 〃 〃 〃)
انتظار نامہ ۔ ایک پرانی راجپوت قلم کی تصویر (تین رنگ کا 〃 〃 〃)
قصر یاط کا ساحر ۔ ایک اطالوی مصور کے قلم سے (تین رنگ کا 〃 〃 〃)
اے خدا تو ہم پر بہشت کے دروازے کھول دے ۔ چار رنگ تصویر

تمام بلاک بڑے بڑے اور بالکل نئے بنوائے گئے ہیں ۔ اس کے علاوہ ہیں ۔ یک رنگ درجنوں ؛

نیرنگِ خیال کی اشاعت دس ہزار تک پہونچانے کی تیاریاں

اس ورق کو پھاڑ کر اپنی جیب میں رکھ لیجئے

نیرنگِ خیال کے ہر خریدار کا اس کام میں ہاتھ بٹانا ملک کی علمی ادبی خدمت کرنا ہے

ناظرین نیرنگ خیال کو معلوم ہے۔ کہ نیرنگ نے چھ سال کی قلیل مدت میں عدیم النظیر قربانیوں اور شبانہ روز محنت و جانفشانی کے بعد پرچہ کو یہاں تک پہونچا دیا ہے۔ کہ اب وہ ہندوستان بھر کے تمام علمی ادبی رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے لیکن بات یہ ہے کہ اس کا چندہ بے حد قلیل ہے۔ عہ سالانہ جس میں سے ۱۲ محصولڈاک پر خرچ ہو جاتے ہیں اور سال بھر میں کبھی خریدار کو ایکبار اور کسی کو کئی بار رسالہ گم ہو جانے کی وجہ سے دوبارہ دینا پڑتا ہے۔ یہ چندہ کچھ بے فائدہ نہیں بچتا۔ اسپر گذشتہ سال میں اپنی جن کا یہ آخری نمبر ہے آپ کو ۸۰۰ صفحات اور ایک سو کے قریب تصویریں پابندی اوقات کے ساتھ اس قلیل چندہ میں پیش کی گئی ہیں۔ جو فی زمانا ایک محیر العقول کارنامہ ہے اس وقت نیرنگ خیال کا چندہ سب سے کم ہے۔ اور جن رسائل نے اسکی تقلید کرنی چاہئے انہوں نے چند ہی مہینوں کے بعد چندہ بڑھانے میں ہی عافیت دیکھی۔ ہم بڑی مشکل سے کام چلا رہے ہیں اس لئے سب سے زیادہ ضروری سوال نیرنگ خیال کی بنیادوں کو استحکم کرنا ہے۔ جس سے یہ پرچہ ہمیشہ چلتا رہے۔ اور ملک میں جو زندگی اس نے پیدا کی ہے وہ سر سبز رہے اس کے صرف دو ذریعے ہیں۔ ایک نیرنگ خیال کی اشاعت بڑھانا۔ دوئم دفتر نیرنگ خیال سے کتابیں شائع کرنا تاکہ اس کی مالی حالت بہتر ہو سکے۔ چنانچہ آج ہم ہر خریدار سے نہایت ادب سے التماس کرتے ہیں۔ کہ وہ ایک تو خود نیرنگ خیال کی سرپرستی کے سلسلہ کو (ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کے باوجود) مستقل کر دیں۔ دوئم اپنے حلقہ اثر۔ احباب دوستوں اور عزیزوں سے ایک دو چار پانچ خریدار بہم پہونچائیں؛

آپ نے ذرا سی توجہ کی اور یہ تعداد پوری ہو گئی۔ آپ ان اصحاب سے ولی منظوری حاصل کریں جن کو وی پی بھیجنے کی آپ اجازت دیں گے۔ دوئم جو اصحاب دوسرے مقامات کے ہوں۔ ان کے نام خود خط لکھدیں کہ وہ وی پی وصول کرلیں۔ قطرہ قطرہ بہم شود دریا۔ آپ اپنا فرض ادا کیجئے۔ باقی اصحاب بھی انشاء اللہ توجہ فرمائیں گے؛

نام خریدار	کس ماہ سے	سالانہ چندہ کے علاوہ اور کوئی کتاب دیکھنی ہو
(۱)		
(۲)		
(۳)		
(۴)		
(۵)		

(دوسری طرف بھی ملاحظہ فرمائیے) آپ کا نام و پتہ۔

نیرنگ خیال کی مطبوعات خریدئے اس سے دو فائدے ہیں

ایک تو نیرنگ خیال کی مالی حالت مضبوط ہو جائیگی اور وہ ایک مستقل چیز بن جائیگی

دوسرے آپکو بہترین مفید اور ارزاں لٹریچر۔ رعایتی قیمت پر ملے گا

ناظرین نیرنگ سے التماس ہے کہ وہ اس ورق کو پھاڑ کر اس کی پشت پر پانچ ایسے دوست و احباب کے نام و پتے صاف خوشخط لکھیں جن سے آپ نے نیرنگ خیال کی خریداری کی منظوری حاصل کرلی ہو۔ آپ صرف اتنے ہی نام لکھیں جن پر آپ کو بھروسہ ہو۔ اس کے علاوہ آپ خود اپنے اور اپنے دوست و احباب کے لئے نیرنگ خیال بک ڈپو کی مطبوعات بھی خریدیے جنکی قیمتوں میں خریداروں کے لئے رعایتیں کردی گئی ہیں۔ نیرنگ خیال کے ہر خریدار کو یہ کتابیں خریدنی لازمی ہیں ملک کے اچھے لٹریچر کی اشاعت میں اسی طرح سے امداد مل سکتی ہے۔ جن چیزوں کی جناب کو ضرورت نہ ہو۔ اُن کو کاٹ دیجئے :-

نام کتاب	اصلی قیمت	رعایت نیرنگ خیال کے خریداروں سے ملے
دوشیزہ	صہ؍	۸؍
ثریا (ناول) (از نذر سجاد حیدر صاحبہ)	۱۲؍	عہ؍
پنکھڑیاں	۱۰؍	۸؍
نیرنگ خیال پکچر البم	۱۲؍	عہ؍
سالنامہ نیرنگ خیال ۱۹۳۰ء	۱؍۸؍	۱؍۲؍
عید نمبر ۱۹۲۷ء	۱؍۲؍	۱۲؍
عید نمبر ۱۹۲۸ء	عہ؍	۸؍
عید نمبر ۱۹۲۹ء	عہ؍	۸؍
صفت اکسیر (کشتہ سازی)	۶؍	۲؍۸؍
جڑی بوٹی	۲؍۱؍	عہ؍

محصول ڈاک بذمہ خریدار

آپ کا نام و پتہ ——————————————

انڈیا نیو ایجاد پیٹنٹ
لیمپ
سیکڑوں لیمپ ایجاد ہو کر چند روزہ ثابت
ہوئے مگر ایسا لیمپ دنیا میں ایجاد ہوا ہے
اور نہ انڈیا میں کوئی ایجاد کر سکتا ہے
ایل ایچ ایم اینڈ کمپنی ماڈوی
نمبر ۳ بمبئی
اکسیر اٹھرا
محافظ جنین و اطفال
جن عورتوں کے بچے ایام حمل میں ضائع ہو جاتے ہیں یا سوکھ سوکھ کر مر جاتے ہوں ان
کے لئے یہ دوائی اکسیر کا حکم رکھتی ہے علاوہ ازیں عورتوں کے امراض مخصوصہ کیلئے تیر بہدف
ہے چونکہ ہزار ہا مریضہ صحتیاب ہو چکی ہیں۔ اس لئے بفضل خدا ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں
کہ اس دوائی کے استعمال سے پوری صحت ہو جاتی ہے اور پھر آئندہ کے لئے کسی قسم کی کوئی شکایت
نہیں رہتی۔ فائدہ نہ ہونے کی صورت میں۔ قیمت واپس۔ صرف پانچ روپیہ علاوہ محصول
بواسیر کے مریضوں کو مژدہ
بفضل خدا بواسیر کا جو مریض بھی ہماری
دوائی استعمال کرتا ہے صرف سات یوم میں صحتیاب
ہو جاتا ہے جس کے مسّے خشک ہو جاتے ہیں اور پھر خون کبھی نہیں گرتا بلکہ مریض کو یہ معلوم ہوتا
ہے کہ مجھے بواسیر کبھی نہیں ہوئی تھی۔ فائدہ نہ ہونے پر قیمت واپس دی جائے گی۔ قیمت
قیمت صرف تین روپیہ (۳) علاوہ محصول ڈاک
مسیح باہ
فی زمانہ ضعف باہ۔ جریان و کثرت احتلام کی شکایت عام دیکھنے میں آتی ہے۔ جن کے
مریض جگہ جگہ بھٹکتے پھرتے ہیں۔ یا اشتہاری حکیموں سے تنگ آ کر اس راز کو پوشیدہ رکھتے
ہیں۔ جس سے کہ ان کی زندگی ضائع ہو جاتی ہے ہم نے خلق خدا کی بہتری کیلئے تاکہ امراء تو
امراء غربا بھی مستفید ہو سکیں۔ یہ اعلان کیا ہے کہ صرف پندرہ یوم دوائی کے استعمال سے خواہ
مخلوق ہو یا کوئی باہ کی تکلیف میں مبتلا ہو بشرطیکہ پیدائشی نامرد نہ ہو کامل مرد ہو جاتا ہے
زیادہ تعریف خلاف تہذیب۔ آزمائش شرط۔ فائدہ نہ ہونے پر قیمت واپس
قیمت ڈھائی روپیہ مع محصول ڈاک
ملنے کا پتہ:۔ مسیح باہ لاہور

آسمان صحافت درخشاں ستارے

جن کی کرنوں سے آپ کی علمی ادبی معلومات روشن ہو سکتی ہیں

نام کتاب	خلاصہ مضامین	قیمت
کیمیائے سعادت	یعنی علامہ امام غزالی رح کی تصنیف لطیف کا اردو ترجمہ۔ گزشتہ علمی تحقیق اور زمانہ حاضرہ کی جدید توضیح کا امتیازی طریق استدلال۔ حیات نفس، فلسفہ عذاب، قبر، روز حشر، بہشت و دوزخ کا انکشاف حقیقت	۴؍
رقعات غالب	اس کتاب میں نجم الدولہ دبیر الملک نواب مرزا اسد اللہ خاں غالب مرحوم اردو کے دلچسپ مکاتیب ہیں جو انہوں نے اپنے احباب کو لکھے	۸؍
جدید زبان اردو کے دلچسپ مضامین	یعنی اہل زبان ماہرین اردو کی دلچسپ تحریروں اور اطریچر کا قابل قدر مجموعہ حجم ۸۰ صفحہ	۴؍
مولانا حالی کے ادبی مضامین	یعنی مولوی الطاف حسین حالی پانی پتی کے بعض دلچسپ ادبی مضامین کا مجموعہ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۸۰ صفحہ	۵؍
سر سید کے اخلاقی مضامین	یعنی آنریبل سر سید احمد بانی مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے بعض نایاب اخلاقی مضامین کا گلدستہ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۸۸	۵؍
مولوی نذیر احمد کے علمی مضامین	مولوی نذیر احمد مولف ترجمۃ القرآن وغیرہ کے مضامین کا قابل قدر مجموعہ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۲۸	۸؍
مولانا شبلی کے تاریخی مضامین	یعنی علامہ شبلی کے بعض قابل قدر تاریخی مضامین تاریخی معلومات سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۱۲۸	۸؍
تاریخ شاہان اسلام ہند	زمانہ سلف کے مسلمان بادشاہوں کی مختصر تاریخ و گزشتہ ہزار سال کے فرمانروایان ہند کا مختصر حال	۱۲؍
ہندوستان کی شہزادیاں	ہندوستان کے گزشتہ ہندو اور مسلمان شہزادیوں کے دلچسپ اور قابل عمل حالات تاریخی واقفیت پیدا کرنے کی مفید کتاب۔	۸؍
دام خیال	اہل ہند کی قدیم تہذیب کا دلچسپ نمونہ اور علم و ادب کا مرقع نہایت ناول صفحات ۱۰۰	۵؍

نوٹ ۔ براہ کرم فرمائش کے ساتھ رسالہ نیرنگ خیال کا حوالہ ضرور دیں۔

دین محمدی کیلنڈر ۱۹۳۰ء رنگین چھپائی۔ ۲ کے ٹکٹ ارسال فرما کر طلب فرمائیں۔

ہر سہ اشیاء مفت۔ جنتری آفتاب عالم ۱۹۳۰ء ۳ کے ٹکٹ ارسال فرما کر طلب فرمائیں۔

ڈائری ۱۹۳۰ء ۴ کے ٹکٹ ارسال فرما کر طلب فرمائیں۔

ملک دین محمد اینڈ سنز نمبر ۲۲۳ تاجران کتب کشمیری بازار لاہور

بڈھے جوان بن گئے

آب و ہوا کی ناموافقت ... کی کمزوری نزلہ دیگر خرابیوں سے قبل از وقت انسان کے بال سفید ہو جاتے ہیں اور اکثر نوجوان جوانی سے پہلے ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر آدمی جوانی کی حسرت میں گھٹ گھٹ کر موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ہم نے طبی اصول پر بہ صرف کثیر اور تجربات طبیبا کے بعد تمام اسباب کا خیال رکھ کر نباتاتی اجزا سے جو خضاب خوردنی مقوی جسم و دماغ تیار کیا ہے وہ آپ کو صرف چند خوراک میں بوڑھے سے جوان بنا دیگا اور شباب قربان ہوتا ہوا نظر آئے گا۔ اور اگر آپ اپنے گئے ہوئے شباب کی تمام طاقتوں چمکتے ہوئے رنگ اور اشتہائی اکتنگ کو واپس بلانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ خواہشمند ہوں کہ آپکا دماغ صحیح ہو جائے۔ کہ ایک مرتبہ کسی تقریر کو سن کر یا ایک کتاب کو پڑھ کر کبھی نہ بھولیں۔ اگر آپ ضعف مردانہ کے متعلق امراض میں گرفتار ہوں۔ بھوک بالکل جاتی رہی ہو نزلہ وغیرہ نے پریشان کر رکھا ہو۔ چہرہ مرجھا ہو۔ شباب رخصت ہو گیا ہو۔ بال ایک ایک کرکے سفید ہونے جاتے ہیں۔ تو جلد سے جلد **اکسیر شباب** مقوی خضاب خوردنی استعمال فرمائیے۔ تجربہ کرنے والوں کا زبردست سے زبردست دعویٰ ہے کہ بال خواہ کسی وجہ سے وقت سے پہلے یعنی ساٹھ برس سے کم عمر میں سفید ہو گئے ہوں۔ تو اس کے استعمال سے از سر نو سیاہ ہو جاتے ہیں۔ پھر کبھی سفید نہیں ہوتے بینائی اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ عینک لگانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی

بے اولادوں کے لئے اس کا کھانا اکسیر ہے۔ مقوی تو یہ دوا اس قدر ہے کہ بڑے بڑے شاہی اور قیمتی نسخے بھی اس کے سامنے ہیچ اور فضول ہیں۔ ناممکن بلکہ قطعی ناممکن ہے کہ اسے استعمال کرکے اپنی قوت کو محسوس نہ کریں۔ آپ کے اطمینان کے لئے ہم یہ شرط بھی کرتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ دوا فائدہ نہ کرے یا اس کا اثر چند روزہ ثابت ہو تو قیمت واپس یا دو چند یا سہ بارہ بھیجیں گے۔ اب اس قدر مفید اور سستہ ہونے پر بھی آپ قدر نہ کریں تو تعجب ہے۔ ایک گولی روزانہ دودھ یا تازہ پانی کے ساتھ بیس دن متواتر کھائیے۔ پرہیز کچھ نہیں۔ ہر عمر اور مزاج میں مفید ہے۔ قیمت مکمل بکس **سات روپے** محصول ۸ دس روپے سے زیادہ قیمت منگانے والے کو ۴ فی روپیہ کمیشن بھی دیا جائیگا۔ اخبار کا حوالہ ضرور دیں

ملنے کا پتہ

منیجر کارخانہ خوردنی خضاب حکمی شفاخانہ لکھنؤ (یوپی)

ایڈیٹر نیرنگ خیال کا ریویو

دنیا کے مفید ہونے کی تصدیق ...

منیجر کارخانہ خوردنی خضاب حکمی شفاخانہ لکھنؤ نے ہمارے پاس برائے ریویو بھیجی۔ ہم نے حافظ عبدالرزاق صاحب کو استعمال کرایا۔ حافظ صاحب کا بیان ہے کہ اس کے استعمال سے انہیں بہت فائدہ ہوا جسم میں چستی پیدا ہو چکی ہے۔ کام کو دل چاہتا ہے بھوک کھل گئی ہے کوئی بال سیاہ بھی معلوم ہونے لگا ہے

اخبار سرفراز ایڈیٹر خواجہ ... صاحب لکھتے ہیں کہ واقعی اس کارخانہ کی بیشتر ادویہ خصوصاً اکسیر شباب خوردنی زود اثر متحیر بنانے والی ثابت ہوئی ہے اور پبلک کے لئے بہت مفید ہے۔

روزانہ اخبار ٹریبیون کے ... بی اے صاحب لکھتے ہیں کہ مجھے لکھتے ہوئے نہایت خوشی ہوتی ہے کہ ... شفاخانہ کی چند دواؤں کا تجربہ کیا ... آپکی تحریر کے مطابق ہی خضاب خوردنی اکسیر شباب بہترین چیز ہے۔ میں نے ... کیا اور مفید پایا۔ ایسی مفید ادویات کو ... پر مبارکباد دیتا ہوں۔ جس سے پبلک کو ... فائدہ پہنچے۔ اور امید رکھتا ہوں کہ ... ہمیشہ فارغ البال رہے۔